الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں

۱۹۷۶ء

خدا نے اپنی دنیا کا نظام انتہائی محکم بنیادوں پر بنایا ہے۔ کوئی درخت کبھی طلسماتی طور پر نہیں اگتا۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ایک آدمی چھلانگ لگا کر اچانک اس سرے سے اس سرے پر پہنچ جائے۔

ایک ایسی دنیا میں ہم ایسے "بزرگ" کی پیدائش کا انتظار کر رہے ہیں جو طلسماتی طور پر واقعات کو ظہور میں لائے۔ ہم ایسے "قائد" کی تلاش میں ہیں جو ایک بڑا سا مظاہرہ کر کے آناً فاناً قوم کے لئے نیا مستقبل پیدا کر دے۔

جو لوگ اس قسم کی امیدوں پر جی رہے ہیں انھیں جاننا چاہئے کہ خدا کی اس دنیا میں ایسے طلسماتی واقعات کا ظہور ممکن نہیں۔ اگر انھیں طلسمات ہی کے سہارے زندہ رہنا ہے تو ان کو اپنی پسند کے مطابق دوسری کائنات بنانی پڑے گی۔

فہرست

قرآن	سمندر کا سبق	۷
	جب دین کو دنیادارانہ زندگی میں ڈھال لیا جائے	۵۱
حدیث	اتحاد کی برکتیں	۴
	کیا ہم اس امتحان کی تیاری کر رہے ہیں	۱۷
تاریخ	خدا کا گھر پیدا ہو کر رہا	۵
	ایک خاندانی جھگڑا جو تاریخ پر چھا گیا	۲۴
دعوت	دعوت الی اللہ	۴۲
	دنیا کو بتانے والے کا انتظار ہے	۱۱
	مبارک کام	۱۹
تعمیر ملت	اتفاقی غلطی کا نتیجہ نہیں	۴۱
	وہ صنعتی دور میں بے زمین ہو گئے	۴۰
	سیاست کے ساتھ یہ کام نہیں ہو سکتا	۵۶
جدید تحقیقات	زندگی بعد موت	۴۵
صنعتی تمدن	توازن فطرت کا مسئلہ	۵۸
عالم اسلام	ریاض میں فقہ اسلامی کی کانفرنس	۲۴
	آواز پھیل رہی ہے	۵۵
معلومات	اسکاٹ لینڈ جھیل میں حیاتیاتی تلاش	۹
	نظام شمسی	۳۲
	اگر آپ دلدل میں پھنس جائیں	۲۳
اقتصادیات	صنعتی تمدن کا حکمراں تیل	۳۱
	زیادہ پیداوار حاصل کیجئے	۳۹
	گھڑیاں کی تجارت	۵۰
اشاعت اسلام	افریقی صدر کا قبول اسلام	۱۲
دیگر مذاہب	تھیاسوفیکل سوسائٹی: ایک تعارف	۱۵
	تین مذاہب کانفرنس	۱۸
	کیا تاریخ مذہب کی طرف لوٹنے والی ہے	۶۱
خواتین	حادثات ہیرو بنادیتے ہیں	۴۹
مطالعہ کتب	مصحف تاشقند	۲۰
ادب	صفات جس سے ہم نے فائدہ نہیں اٹھایا	۸
	عربوں کا جاہلی ادب	۵۲
	لطیفہ	۵۳
تعارف و تبصرہ:	اسلامی فقہ — سالنامہ تنویر	۶۲
سوال و جواب	سورہ کہف کی تلاوت	۶۳

یہ اللہ کا فضل خاص ہے کہ الرسالہ نے انتہائی مختصر مدت میں حیرت انگیز طور پر غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے۔ نہ صرف ملک کے مختلف حلقوں میں بلکہ ملک کے باہر بھی اس کا استقبال اس طرح ہوا ہے گویا لوگ زبان حال سے کہہ رہے ہوں:

للہ الحمد ہر آن چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

اس سلسلہ میں ایک خوشی کی خبر الرسالہ کا عربی ایڈیشن ہے۔ پچھلے شمارہ میں ہم نے کہا تھا کہ الرسالہ کے کام کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ یہ پرچہ کم از کم پانچ زبانوں میں جاری ہو: اردو، ہندی، عربی، فارسی اور انگریزی۔

اللہ کا شکر ہے کہ اردو کے بعد عربی میں الرسالہ کے شائع ہونے کا نہایت معقول انتظام ہو گیا ہے۔ اور یہ انتظام بھی اس مقام پر ہوا ہے جو عالم عرب کا علمی ذہنی مرکز ہے یعنی قاہرہ میں۔ پچھلے اکتوبر۔ نومبر کے دوران راقم الحروف کو دوبارہ قاہرہ جانے کا اتفاق ہوا۔ مصر کے معروف ناشر المختار الاسلامی کی پیش کش پر ان سے باقاعدہ طور پر یہ معاہدہ ہو گیا ہے کہ الرسالہ کے تمام اہم مضامین کا عربی ترجمہ سہ ماہی مجلہ کی شکل میں مستقل طور پر شائع کیا جائے۔ یہ گویا ایک قسم کا کتابی سلسلہ ہوگا جو سال میں چار شماروں کی صورت میں پیش کیا جائے گا۔ انشاء اللہ دو تین ماہ کے اندر اس کتابی سلسلہ کا پہلا شمارہ شائع ہو جائے گا۔ الرسالہ کے اردو مضامین کو عربی میں منتقل کرنے کا کام ایک مصری استاذ انجام دیں گے جو عربی ادیب ہونے کے ساتھ اردو بھی اچھی جانتے ہیں۔

المختار الاسلامی (قاہرہ) سے یہ معاہدہ بھی طے پایا ہے کہ وہ محترم مولانا وحید الدین خاں صاحب کی مؤلفات کے انگریزی ترجمے شائع کریں۔ یہ کام اگلے پانچ چھ ماہ میں انشاء اللہ شروع ہو جائے گا۔ یاد رہے کہ المختار الاسلامی مولانا محترم کی تمام کتابوں کا عربی ترجمہ شائع کر رہا ہے۔ اس سلسلہ میں الاسلام یتحدی، الدین فی مواجہۃ العلم، حکمۃ الدین اور الاسلام فی العصر الحدیث شائع ہو کر عالم عرب میں انتہائی مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ اول الذکر کتاب کے عربی میں غیر قانونی ایڈیشنوں کے علاوہ اب تک آٹھ ایڈیشن قاہرہ، بیروت اور کویت میں شائع ہو چکے ہیں اور اس کا ترجمہ ترکی زبان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ راقم الحروف نے الریاض (سعودی عرب) میں اسلامی فقہ کانفرنس میں شرکت کے دوران ایک ترکی ذمہ دار سے یہ معاہدہ کیا ہے کہ مولانا موصوف کی تمام کتابیں ترکی میں ترجمہ ہوں۔ الاسلام یتحدی کے علاوہ الدین فی مواجہۃ العلم کا ترکی ترجمہ پہلے ہی شروع ہو چکا ہے۔

"الرسالہ میں سیاسی چاشنی نہیں ہوتی"۔ اس شکایت کے بارے میں ہم کہیں گے کہ الرسالہ کا مقصد تو سیاسی ذوق کو ختم کرنا ہے۔ پھر وہ خود کس طرح سیاسی غذا کا دسترخوان بن سکتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہماری ملی صحافت نتیجہ خیز نہ ہونے کی واحد سب سے بڑی وجہ اس کا سیاسی ذوق ہی تھا۔ دینی اور تعمیری کام کے لئے سیاست سے زیادہ قاتل اور کوئی چیز نہیں ہے اور ہم اس سے مکمل طور پر دور رہنا چاہتے ہیں۔ یہ کوئی وقتی حکمت عملی نہیں ہے بلکہ ایک سوچی سمجھی راہ ہے جس پر ہم برسہا برس سے عامل ہیں۔ (ظفر الاسلام خاں)

اتحاد کی برکتیں

ایک حدیث ہے:

قال صلی اللہ علیہ وسلم، قال اللہ عز وجل:

انا ثالث الشریکین مالم یخن احدھما صاحبہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں دو شریکوں کے ساتھ تیسرا ہوتا ہوں جب تک ان کا ایک ساتھی دوسرے کے ساتھ خیانت نہ کرے۔

مطلب یہ ہے کہ کوئی گروہ اسی وقت تک خدا کی مدد کا مستحق رہتا ہے جب تک اس کے افراد باہم ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوں۔ اس کے برعکس جب وہ ایک دوسرے کے بدخواہ بن جائیں، جب ان کے درمیان خیانت کی فضا پیدا ہو جائے تو خدا کی مدد ان سے اٹھ جاتی ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خدا سے تعلق کا معیار بندوں سے تعلق ہے۔ اگر خدا کے ساتھ کسی کا تعلق درست ہے تو لازماً بندوں کے ساتھ بھی اس کا تعلق درست ہوگا۔ جس کا تعلق بندوں کے ساتھ درست نہ ہو، سمجھنا چاہئے کہ خدا کے ساتھ بھی اس کا تعلق درست نہیں، خواہ وہ بظاہر کتنا ہی زیادہ خدا کی باتیں کرتا ہو

خدا کا کلمہ ان کے حق میں پورا ہو کر رہا

حضرت موسیٰ علیہ السلام (۱۴۰۰ - ۱۵۲۰ ق م) کی آمد سے ساڑھے تین ہزار برس پہلے جزیرہ نما عرب کے فلسطین اور شام کے علاقے کے کچھ عرب، جن کو "عمالیق" کہا جاتا تھا، مصر میں داخل ہوئے اور یہاں کے مقامی حکمرانوں کے آپس کے اختلاف سے فائدہ اٹھا کر مصر کی سلطنت پر قابض ہو گئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام (۱۷۹۶ - ۱۹۰۶ ق م) جب نوجوانی کی عمر میں فلسطین سے مصر پہنچے تو اس وقت مصر پر ان کے انھیں ہم قوموں کی حکومت تھی۔ ایک عورت کی پیدا کردہ بعض ابتدائی مشکلات کے بعد آپ کو مصر میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ آپ ایک شاندار شخصیت کے مالک تھے اور آپ کے اندر غیر معمولی انتظامی صلاحیت تھی۔ مصری حکمرانوں کو نسلی قربت کی وجہ سے آپ کی صلاحیتوں کے اعتراف میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ آپ کے زمانہ کے عرب بادشاہ اپوفیس نے آپ کے دین کو قبول نہ کرتے ہوئے بھی حکومت کا تمام کاروبار آپ کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد حضرت یوسف نے اپنے والد حضرت یعقوب (اسرائیل) اور دیگر اہل خاندان کو مصر بلا لیا۔ یہ لوگ تقریباً چار سو سال تک مصر کی حکومت پر چھائے رہے۔ مصر کے آئینی حکمران اگرچہ اب بھی مشرک عمالیق تھے مگر حکومت پر عملاً بنی اسرائیل ہی کا قبضہ تھا۔

بنی اسرائیل ابتداءً جب مصر آئے تو ان کو یہاں کی انتہائی زرخیز زمینوں میں بسایا گیا اور حکومت کے اعلیٰ ترین مناصب ان کے لئے مخصوص رہے۔ گویہ اکثریت کے اوپر اقلیت کی حکومت تھی۔ بائبل کے بیان کے مطابق یعقوب (اسرائیل) کا گھرانا جو ملک مصر منتقل ہوا، ان کی تعداد حضرت یوسف کو ملا کر ۶۸ تھی۔ توالد و تناسل نیز تبلیغ کے ذریعے دور قدیم کے ان "مسلمانوں" کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ پانچ سو برس بعد جب حضرت موسیٰ نے مردم شماری کرائی تو صرف ان کے مردوں کی تعداد چھ لاکھ سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اگرچہ اس زمانہ کی مصری آبادی کے قطعی اعداد و شمار معلوم نہیں ہیں، تاہم تخمینی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مصر کی اس زمانے کی آبادی میں بنی اسرائیل کی تعداد تقریباً دس فی صد ہوگی۔

حضرت یوسف نے ۱۱۰ سال کی عمر پائی۔ آپ کے تین چار سو سال بعد مصر میں عرب حکمرانوں کے خلاف ردعمل ہوا لمبے خون خرابے کے بعد بالآخر قبطی غالب آئے۔ بیرونی حکمرانوں کو تخت سے بے دخل کر دیا گیا اور مصر پر ایک قبطی خاندان کی حکومت قائم ہو گئی جس کے حکمرانوں نے "فرعون" کا لقب اختیار کیا۔

قبطی حکومت کے قیام کے بعد اگرچہ ڈھائی لاکھ عربوں کو مصر سے نکال دیا گیا تھا۔ تاہم بنی اسرائیل اب بھی وہاں رکھے گئے تاکہ نئے حکمرانوں کے لئے بیگار کا کام دے سکیں۔ بائبل کے الفاظ میں: "مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انھوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب خدمت کھیت کی کروا کے ان کی زندگی تلخ کی۔ ان کی ساری خدمتیں جو وہ ان سے کراتے تھے مشقت کی تھیں" خروج ۱: ۱۳-۱۴

حضرت موسیٰؑ تشریف لائے تو بنی اسرائیل اسی دورِ مشقت سے گزر رہے تھے۔ آپ نے قبطی فرعونی تہذیب کے مقابلہ میں مغلوب حیثیت اختیار کرنے کے بجائے خود ان کے اوپر اقدام کا طریقہ اختیار کیا۔ آپ نے دعوت دینی شروع کی کہ دینِ خداوندی کو اختیار کرو، ورنہ تم سب کے سب تباہ کر دیئے جاؤ گے۔ یہ چیز فرعون کے غصہ میں صرف اضافہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے لیے مصری زندگی آپ کے آنے کے بعد تلخ تر ہوگئی۔ حتیٰ کہ اس میں مزید یہ اضافہ ہوا کہ شاہی حکم کے تحت بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والے بیٹوں کو قتل کیا جانے لگا تاکہ ان کی نسل دھیرے دھیرے مصر سے ختم ہو جائے۔ قدیم مصری آثار کی کھدائی کے دوران ۱۸۹۶ میں ایک کتبہ ملا ہے جس میں حضرت موسیٰؑ کے زمانے کا فرعون منفتاح فخر کے ساتھ کہتا ہے "اور اسرائیل کو مٹا دیا گیا، اس کا بیج تک باقی نہیں"

اس وقت بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے شکایت کی: "آپ کے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے جارہے تھے اور اب آپ کے آنے کے بعد بھی ستائے جارہے ہیں" (اعراف - ۱۲۹)

اس انتہائی نازک مرحلہ میں بنی اسرائیل کو جو جواب دیا گیا، وہ قرآن کے الفاظ میں یہ ہے:

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰی مُوْسٰی وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ یونس - ۸۷	اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کو وحی کی کہ تم دونو اپنی قوم کو مصر میں ٹھہراؤ اور اپنے گھروں کو مرکزِ عمل بنالو[۱] اور نماز قائم کرو اور مومنین کو بشارت دے دو

اس آیت میں جو پروگرام دیا گیا ہے، اس کو حسب ذیل طریقے پر بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ جہاں ہو، وہاں جمے رہو۔ اپنے اندر خوف و انتشار کو جگہ مت دو۔ یہ وہی چیز ہے جس کو حضرت مسیحؑ نے ان لفظوں میں کہا تھا: جب تک عالم بالا سے تم کو قوت کا لباس نہ ملے اس شہر میں ٹھہرے رہو (لوقا ۲۴: ۴۹)

۲۔ اپنے گھر کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنالو، یعنی باہمی اتحاد، اندرونی استحکام، آپس کے صبر و نصیحت اور ذاتی ذرائع پر انحصار، یہ وہ چیزیں ہیں جن پر تمھیں موجودہ حالت میں اپنی توجہات کو مرتکز رکھنا چاہیے۔

۳۔ نماز قائم کرو یعنی اللہ سے اپنے تعلق کو مضبوط کرو، اس کی یاد، اس سے مانگنا، اس کے آگے اپنے آپ کو بالکل جھکا دینا، ان صفات کو زیادہ سے زیادہ اپنے اندر پیدا کرو۔

۴۔ یہی وہ طریق عمل ہے جس میں تمھارے لیے دنیا و آخرت کی تمام خوش خبریاں چھپی ہوئی ہیں۔ پوری یکسوئی کے ساتھ اس کی تکمیل میں لگ جاؤ۔ اس سہ نکاتی پروگرام کو مختصر طور پر اس طرح کہہ سکتے ہیں ــــ استقامت، داخلی تعمیر، تعلق باللہ۔ اس پروگرام پر عمل کرنے کا بالآخر جو نتیجہ نکلا، وہ قرآن کے الفاظ میں یہ ہے:

اور جو لوگ کمزور کر دیئے گئے تھے، ہم نے ان کو زمین کے مشرق و مغرب کا مالک بنا دیا جس میں ہم نے برکت دی ہے۔ اور تمھارے رب کا بہترین کلمہ بنی اسرائیل کے لئے پورا ہو کر رہا اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کو اس کی صنعتوں اور اس کے عمارتوں کے ساتھ مسمار کر دیا۔ اعراف - ۱۳۷ ◘

---

[۱] تبوآ لقومکما بمصر بیوتا کا ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے: ساکن کنید قوم خود را بہ شہر مصر در خانہا
قبلہ کا لفظ قبلۃ کا اسم نما ہے۔ اس کا اصل مفہوم ہے "مرکز توجہ"۔ کہتے ہیں قبلت الماشیۃ الوادی: جانور وادی کی طرف متوجہ ہوئے



ظاہری حالات خواہ کتنے ہی سخت ہو جائیں ایک نئی زندگی کا امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے

وھو الذی مرج البحرین ھٰذا عذب فرات وھٰذا ملح اجاج وجعل بینھما برزخا وحجرا محجورا   فرقان — ۵۳

اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے۔ ایک لذیذ و شیریں، دوسرا تلخ و شور، اور دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے۔ ایک رکاوٹ ہے جو انھیں گڈمڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔

یہ کیفیت ہر اس جگہ رونما ہوتی ہے جہاں کوئی بڑا دریا سمندر میں آکر گرتا ہے۔ اس کے علاوہ خود سمندر میں بھی مختلف مقامات پر میٹھے پانی کے چشمے پائے جاتے ہیں جن کا پانی، سمندر کے نہایت تلخ پانی کے درمیان بھی اپنی مٹھاس پر قائم رہتا ہے۔ ترکی امیر البحر سیدی علی رئیس (کاتب رومی) اپنی کتاب مرآۃ الممالک میں، جو سولھویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے، خلیج فارس کے اندر ایسے ہی ایک مقام کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ وہاں آب شور کے نیچے آب شیریں کے چشمے ہیں جن سے میں خود اپنے بیڑے کے لئے پینے کا پانی حا کرتا رہا ہوں۔ موجودہ زمانہ میں جب امریکی کمپنی نے سعودی عرب میں تیل نکالنے کا کام شروع کیا تو ابتداءً وہ بھی خلیج فارس کے انھیں چشموں سے پانی حاصل کرتی تھی۔ بعد میں ظہران کے پاس کنویں کھود لئے گئے اور ان سے پانی لیا جانے لگا۔ بحرین کے قریب بھی سمندر کی تہ میں آب شیریں کے چشمے ہیں جن سے لوگ کچھ مدت پہلے تک پینے کا پانی حاصل کرتے رہے ہیں۔

یہ تو ہے آیت کا ظاہری مضمون، جو اللہ کی قدرت کے ایک کرشمے سے اس کے الٰہ واحد اور رب ہونے پر استدلال کر رہا ہے۔ مگر اس کے بین السطور سے بھی ایک لطیف اشارہ ایک دوسرے مضمون کی طرف نکلتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ انسانی معاشرے کا سمندر خواہ کتنا ہی تلخ و شور ہو جائے، اللہ جب چاہے اس کی تہ سے ایک جماعت صالحہ کا چشمۂ شیریں نکال سکتا ہے اور سمندر کے آب تلخ کی موجیں خواہ کتنا ہی زور مار لیں، وہ اس چشمہ کو ہڑپ کر جانے میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔

تفہیم القرآن جلد ۳، صفحہ ۴۵۸ □

صحافت: ایک امکان جس سے ابھی تک ہم نے فائدہ نہیں اٹھایا

غزوۂ خندق (۶۲۷ء) کے موقع پر جب ابوسفیان کی سرداری میں مشرکین کی ۱۰ ہزار فوج مدینہ کے قریب پہنچی اور وہاں دیکھا کہ شہر کے گرد تقریباً چھ کیلو میٹر لمبی خندق کھدی ہوئی ہے جس کی گہرائی تقریباً ڈھائی میٹر اور چوڑائی تقریباً تین میٹر ہے۔ یہ منظر دیکھ کر ابوسفیان کی زبان سے نکلا:

واللہ ان ھذہ المکیدۃ ما کانت العرب تکیدھا

خدا کی قسم یہ ایک ایسی تدبیر ہے جس کو عربوں نے اب تک نہیں کیا تھا۔

اسلام کی ابتدائی ہزار سالہ تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ مسلمان جب زندہ تھے تو وہ نئی نئی تدابیر اختیار کرنے میں ساری دنیا سے آگے تھے۔ اور جب ان کو زوال ہوا تو یہ حال ہو رہا ہے کہ وہ طریقے جو سو برس پہلے دریافت ہو کر دنیا میں رائج ہو چکے ہیں، مسلمان آج بھی ان کو استعمال کرنے سے محروم ہیں۔

محرومیوں کی اسی فہرست میں ایک چیز وہ ہے جس کو صحافت کہتے ہیں۔ بظاہر ہمارے یہاں ہزاروں کی تعداد میں اخبار نکلتے ہیں مگر یہ سب شخصیتوں یا اداروں کے "بلیٹن" ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی حقیقی معنوں میں اخبار نہیں کہا جا سکتا۔ جدید صحافت اللہ کی ایک عجیب نعمت ہے۔ ماضی میں اس کی ایک ہلکی سی مثال شاعرانہ قصائد میں پائی جاتی ہے۔ ایک معیاری قصیدہ میں مناظر فطرت، رومان، ادب، رجز، سماجی اور نفسیاتی اشارے غرض ہر چیز ہوتی ہے۔ ہر ذوق کا آدمی اس میں اپنی دل چسپی کا سامان پا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے میں قصائد سب سے زیادہ لوگوں میں پھیلتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں صحافت اس کی زیادہ ترقی یافتہ علمی شکل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسا صحیفہ وجود میں لایا جائے، جو اپنے تنوع مضامین اور اپنے غیر جانب دارانہ انداز کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ لوگوں میں پڑھا جائے۔ اس طرح ایک کثیر المطالعہ صحیفہ وجود میں لانے کے بعد اپنی بات کو اس کے بین السطور میں شامل کر دیا جائے۔ جدید صحافت مکمل طور پر ایک تبلیغ ہے مگر وہ مکمل طور

◄◄◄

عرب جاہلیت میں شعر کی حیثیت تقریباً وہی تھی جو موجودہ زمانے میں اخبار کی ہے۔ موزوں نغمے اس زمانے میں عام طور پر پسند کئے جاتے تھے۔ ایک شخص اگر دلچسپ واقعات اور پر جوش مضامین کو عمدہ عربی زبان میں نظم کر دیتا تو وہ فوراً لوگوں کی زبان پر رواں ہو جاتے اور عمومی مجالس میں پڑھے جانے لگتے۔ گویا شعر اس زمانہ میں کسی خیال کی اشاعت کا ایک ذریعہ تھا جس طرح موجودہ زمانہ میں اخبار ہے۔

کعب بن اشرف ایک شاعر تھا۔ بدر میں قریش کی شکست کے بعد اس نے پر جوش اشعار کہے جو قریش اور دوسرے لوگوں میں فوراً پھیل گئے۔ اسی طرح عبد اللہ بن ابی وغیرہ اسلام کے خلاف اشعار لکھ کر عوام میں شائع کیا کرتے تھے۔ ان کے رد میں حسان بن ثابت نے نظمیں لکھیں جنھوں نے اس زمانہ میں گویا جوابی اخبار کا کام کیا اور مسلمانوں کے موقف کو عمومی مجالس تک پہنچانے کا ذریعہ بنے۔ سیرۃ ابن ہشام اس قسم کے اشعار سے بھری ہوئی ہے۔

الرسالہ جنوری ۱۹۸۴

پر اس تبلیغ سے مختلف ہے جو مناظر اور واعظین عموماً اختیار کرتے ہیں اور ہمارے اخبار جس کی ایک صحافتی نقل ہیں۔

ضرورت ہے کہ اعلیٰ معیار کا ایک ہفت روزہ اخبار اردو، ہندی، انگریزی اور دوسری زبانوں میں نکالا جائے۔ اخبار میں جائز حدود کے اندر وہ سب کچھ ہو جو ایک عام ہندوستانی جاننا چاہتا ہے —— اس میں ہفتہ بھر کی عالمی خبروں کا خلاصہ ہو۔ ملک کی تعمیری سرگرمیوں کا مختصر تعارف ہو۔ جدید دنیا کے سبق آموز واقعات ہوں۔ ہندو، عیسائی اور دوسرے فرقوں کی مذہبی سرگرمیوں کا تذکرہ ہو۔ اخلاقی اور سماجی اصلاح پر مختلف لوگوں کے خیالات ہوں۔ سائنس اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں انسانی ترقیات کا جائزہ ہو اور پھر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں وہ باتیں ہوں جو ہم مسلمانوں کی اصلاح اور دوسروں تک اسلام کا پیغام پہنچانے کے لئے اخبار میں لانا چاہتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ بےلاگ انداز اور علمی اسلوب میں ہو، نہ کہ مناظرہ بازی اور قصیدہ نگاری کے انداز میں۔ اخبار کا انداز وہ ہو جو عمومی حلقۂ مطالعہ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اور مقصد وہ ہو جس کو دعوت دین اور احیائے ملت کے الفاظ میں ظاہر کیا جاتا ہے۔

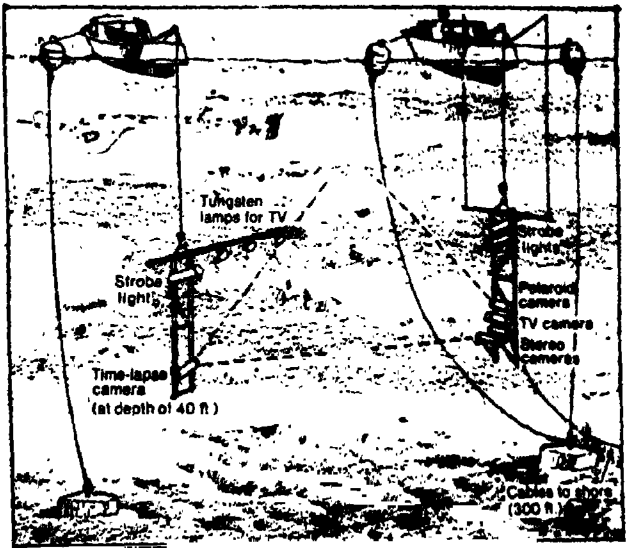
یہ کام اگر سو برس پہلے شروع ہو گیا ہوتا تو وہ چیز جس کو آج ہم "خبرنامہ" کے طور پر سوچ رہے ہیں، وہ شاید اب "انقلاب نامہ" بن چکا ہوتا۔ ضرورت ہے کہ اس مقصد کے لئے مشترک سرمایہ سے ایک ادارہ قائم کیا جائے اور اس کو تجارتی سطح پر چلایا جائے۔ اس قسم کا ایک اخبار تجارتی اور اصلاحی دونوں اعتبار سے صدفی صد کامیاب ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس کو ضروری سرمایہ اور باصلاحیت افراد حاصل ہو جائیں۔

الرسالہ جنوری ۱۹۷۷



مریخ پر زندگی کی تلاش کی خبروں نے اتنی زیادہ شہرت پائی کہ دنیا بھر میں کوئی شخص بھی اس سے بےخبر نہ رہا۔ مگر ٹھیک انھیں دنوں (جولائی — اکتوبر ۱۹۷۶) اسی قسم کی ایک اور گم نام کوشش میں سائنس داں مصروف تھے۔ یہ اسکاٹ لینڈ کی لاش نیس (Loch Ness) نامی جھیل میں قدیم زمانہ کے ڈینوسار کی تلاش تھی۔ دونوں مہموں کا مقصد ایک تھا۔ زندگی کی پیدائش کے بارے میں علمائے حیاتیات کے نظریہ کی تصدیق۔ جدید علماء کا کہنا ہے کہ طبیعی حالات کا ارتقاء خود اپنے اندرونی حالات کے تحت زندگی کو وجود دیتا ہے۔ اس مفروضہ کا تقاضا ہے کہ زمین کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی زندگی کی قسمیں موجود ہوں۔ اس سلسلے میں مریخ سائنس دانوں کی سب سے بڑی امیدگاہ تھا۔ مگر وائکنگ اول اور دوم نے بالآخر جو چیز ثابت کی ہے وہ یہ کہ معلوم کائنات میں کوئی دوسرا مقام نہیں

اسکاٹ لینڈ کی جھیل میں نظریہ ارتقاء کے حیاتیاتی آثار کی تلاش



کائنات "ارتقائی" تشریح کو قبول نہیں کرتی۔ اگرچہ سمندر کی تہوں سے لے کر خلائی کرّوں تک اس کے لئے بے شمار تحقیقات جاری ہیں۔

جہاں ہماری جیسی زندگی پائی جاتی ہو۔

اس نظریہ کے مفروضات میں سے ایک مفروضہ یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں بہت بڑے بڑے بے ہنگم جانور زمین پر پائے جاتے تھے جو بعد کو ختم ہوگئے۔ مگر ابھی تک اس مفروضہ کے ثبوت میں صرف متحجر ہڈیوں کے ٹکڑے ہی سائنس دانوں کو دستیاب ہوسکے ہیں۔ تاہم قیاس کیا جاتا ہے کہ اس قدیم نسل کا کم از کم ایک فرد لاش نیس نامی جھیل میں موجود ہے۔ اس سلسلے میں ۱۹۷۲ اور ۱۹۷۵ میں تحقیقاتی مہمیں جاتی رہی ہیں۔ ۱۹۷۶ میں امریکی انجینروں اور سائنس دانوں کی ایک ٹیم زیادہ بڑے پیمانہ پر ساز و سامان سے لیس ہو کر اس جھیل پر پہنچی۔ اس ٹیم کو نیویارک ٹائمز اور اکیڈمی آف اپلائیڈ سائنس (بوسٹن) سے مالیاتی تعاون ملا تھا۔ اس پر تقریباً ۷۵ ہزار ڈالر خرچ ہوئے۔ مگر صرف اس رقم سے اس کے تمام اخراجات کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس ٹیم میں حصہ لینے کے لئے ماہرین نے رضاکارانہ طور پر اپنے اوقات دیئے تھے۔ اس کے علاوہ مہم کا اکثر ساز و سامان عطیہ کے طور پر ملا تھا۔

۸ نومبر ۱۹۷۶ کو بوسٹن سے جو آخری رپورٹ دی گئی ہے، اس کے مطابق یہ ٹیم مفروضہ حیوان یا اس کے آثار دریافت کرنے میں ناکام رہی۔

اس مہم پر جو مشینی کشتیاں استعمال کی گئیں وہ جدید ترین سامانوں سے لیس تھیں۔ زیر آب کیمرا، پانی میں کام کرنے والا ٹیلی وژن، ٹیپ ریکارڈر، پانی کی تہوں میں دیکھنے والی دوربین وغیرہ۔ نیز ان کشتیوں کی مدد کے لئے فضا میں ہیلی کاپٹر بھی مسلسل موجود رہتے تھے □

دنیا کو کسی بتانے والے کا انتظار ہے

جولائی ۱۹۷۶ کی چھ تاریخ تھی اور شام ۶ بجے کا وقت۔ میں شہر کی ایک سڑک سے گزر رہا تھا۔ اتنے میں ایک اجنبی دکان دار نے آواز دے کر مجھے روکا۔

"مرنے کے بعد کیا آدمی پھر اسی جیون میں واپس آتا ہے" اس نے پنجابی زبان میں سوال کیا۔

"نہیں"

"پھر کہاں جاتا ہے"

"اپنے مالک کے پاس چلا جاتا ہے حساب دینے کے لئے"

"اور اس کے بعد"

"اس کے بعد نرک میں جاتا ہے یا سورگ میں"

یہ جواب سن کر بوڑھے دکان دار نے اپنی سیٹ پر پہلو بدلا اور خاموش ہو گیا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ اب کچھ اور بولنا اس کی سوچ میں خلل ڈالنا ہوگا۔ میں چند منٹ تک اس کے اگلے سوال کا منتظر رہا اور اس کے بعد آگے بڑھ گیا۔

اسی قسم کا ایک واقعہ مشہور امریکی مشنری بلی گراہم نے لکھا ہے۔ وہ اپنی کتاب "دی سیکرٹ آف ہیپی نس" میں لکھتا ہے کہ دنیا کے ایک عظیم سیاست داں نے ایک بار اس سے کہا:

I am an old man. Life has lost all meaning. I am ready to take a fateful leap into the unknown. Young man, can you give me a ray of hope.

"میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ زندگی نے اپنی تمام معنویت کھو دی ہے۔ عنقریب میں نامعلوم دنیا کی طرف ایک فیصلہ کن چھلانگ لگانے والا ہوں۔ اے نوجوان شخص! کیا تم مجھے امید کی کوئی کرن دے سکتے ہو"

یہ موت ہر آدمی کا پیچھا کر رہی ہے۔ بچپن اور جوانی کی عمر میں آدمی اسے بھولا رہتا ہے۔ مگر بالآخر تقدیری فیصلہ غالب آتا ہے۔ بڑھاپے میں جب اس کی طاقتیں گھٹ جاتی ہیں تب اسے محسوس ہوتا ہے کہ اب بہرحال کچھ دنوں کے بعد وہ مر جائے گا۔ اس وقت وہ مجبور ہوتا ہے کہ سوچے کہ "مرنے کے بعد کیا ہونے والا ہے"۔ اسے تلاش ہوتی ہے کہ وہ کوئی امید کی کرن پالے جو موت کے بعد آنے والے حالات میں اس کو روشنی دے سکے۔

یہ زندگی کا اہم ترین سوال ہے، اس سے باخبر کرنے کے لئے اللہ نے اپنے تمام پیغمبر بھیجے۔ مگر آج جو لوگ پیغمبر کے وارث ہیں، وہ خود بھی شاید اس حقیقت کو بھول چکے ہیں۔ پھر ان سے کیا امید کی جائے کہ وہ دوسروں کو اس حقیقت سے باخبر کرسکیں گے۔

موت کے بعد انسان کے ساتھ کیا پیش آتا ہے اسی کو بتانے کے لئے قرآن بھیجا گیا ہے۔ حاملین قرآن کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ دنیا کو اس حقیقت سے باخبر کریں۔ اگر وہ اس کام کو نہ کریں تو قیامت کے دن جب قوموں کا حساب ہوگا وہ اس بات کے مجرم قرار پائیں گے کہ ان کے پاس انسانیت کے لئے اہم ترین خبر تھی مگر انھوں نے لوگوں کو اس سے آگاہ نہ کیا ◻

... الاسلام تجاول في مساجد افريقيا الوسطى بينما الشيخ ...
يستمع الى ... وهو ينطق بشهادة لا اله الا الله محمد رسول الله

وسطی افریقہ کے صدر مملکت نے اسلام قبول کرلیا

اگرچہ مسلمان اپنی دعوتی ذمہ داریوں سے مجرمانہ حد تک غافل ہیں، پھر بھی دین حق اپنے زور پر لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں تازہ ترین اہم خبر پچھلے دنوں افریقہ سے آئی، جہاں جمہوریہ وسطی افریقہ کے صدر جنرل بوکاسا نے اپنے وزیر اعظم، نائب صدر، خاندان اور کئی وزراء سمیت اسلام قبول کرلیا۔

۲۵ شوال ۹۶ ۱۳ھ (۱۸ اکتوبر ۱۹۷۶) بروز دوشنبہ صدر بوکاسا نے اپنے ملک کے دارالسلطنت بانگی کی مسجد میں لیبیا کے صدر معمر القذافی کی موجودگی میں بوقت ظہر "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کے انقلابی کلمات پڑھ کر خاتم النبیین کے دین کو قبول کرلیا۔ انھوں نے اپنا نام صلاح الدین احمد بوکاسا رکھا ہے۔ ان کا قدیم نام جان بیڈل بوکاسا تھا۔ لیبیا کے ممتاز عالم اور جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ کے سکریٹری جنرل شیخ محمود صبحی نے صدر بوکاسا کو کلمۂ شہادۃ پڑھایا اور وضو کا طریقہ بتایا۔ اس کے بعد صدر قذافی نے صدر بوکاسا کو قرآن پاک کا ایک نسخہ پیش کیا اور انھیں نصیحت کی کہ وہ اس کو صبح و شام پڑھا کریں۔ دونوں سربراہوں نے ساتھ ہی نماز ظہر ادا کی اور "اللہ اکبر، اللہ اکبر" کے نعروں کے درمیان بانگی کی سڑکوں سے گزرے۔ اس تاریخی واقعہ کے بعد جمہوریہ وسطی افریقہ کے ہزاروں باشندوں نے اسلام قبول کرلیا۔

صدر بوکاسا ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ریاست لوبانگی کے گورنر تھے۔ ان کی وفات بوکاسا کی ولادت کے چھ سال بعد ہی ہوگئی۔ کچھ دنوں کے بعد ان کی والدہ بھی چل بسیں۔ بوکاسا کی پرورش ان کے دادا اور چچا نے کی۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم کیتھولک اسکولوں میں حاصل کی۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد ۱۹۳۹ء میں فرانسیسی فوج میں بھرتی ہوگئے اور دوسری عالم گیر جنگ میں صدر ڈیگول کے تحت نازیوں کا مقابلہ کیا۔ فرانس میں بوکاسا نے وائرلیس (لاسلکی) کے خبیر (اکسپرٹ) اور استاد کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۵۹ میں وسطی افریقہ واپس آئے۔ ان کے چچا وسطی افریقہ کے آزاد ہونے کے بعد ملک کے پہلے صدر تھے، انھوں نے ۱۹۶۱ء میں بوکاسا کو مسلح افواج کو وجود میں لانے کی ذمہ داری پر مامور کیا۔ ۱۹۶۴ء میں بوکاسا فوج کے رئیس الارکان (چیف آف اسٹاف) ہوگئے۔ ۱۹۶۶ میں فوجی انقلاب لاکر بوکاسا نے صدارت سنبھال لی۔ وہ مغربی نفوذ کے سخت مخالف ہیں۔ اور

ان کی تعلیم عیسائی اسکولوں میں ہوئی، وہ فرانس کی فوج میں شامل ہوئے انھوں نے غیر اسلامی نظام کے تحت اقتدار کی کرسی کو قبول کیا مگر کوئی چیز بھی ان کے لئے حق کی قبولیت میں مانع نہ بن سکی۔



المشير صلاح الدين احمد بوكاسا

اسی لئے اگست ۱۹۷۲ء میں انھوں نے اپنے ملک میں تمام سینما گھر بند کر دیئے۔ کیونکہ مغربی فلمیں عوام کے اخلاق کو برباد کر رہی تھیں۔ انھیں دنوں انھوں نے چوروں کی سزا ہاتھ کاٹنا مقرر کیا۔ اسرائیل کے سلسلہ میں ان کا موقف بہت سخت ہے۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء میں انھوں نے اپنے ملک کے تعلقات اسرائیل سے ختم کر دیئے تھے۔

صدر بوکاسا کا ملک جمہوریہ وسطی افریقہ اپنے نام کے مطابق بالکل افریقہ کے وسط میں واقع ہے۔ نقشہ میں اس کو چاڈ، کانگو، سوڈان اور کامیرون کے درمیان دیکھا جا سکتا ہے

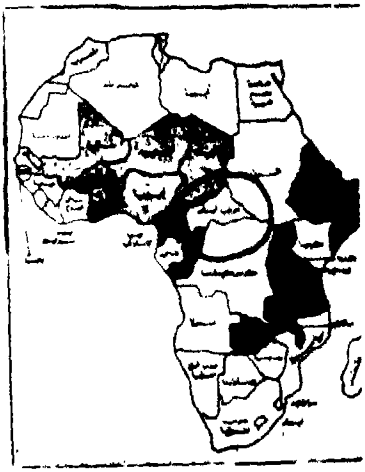
الخبر الذی أهملناه !

صدر بوکاسا اگرچہ اب مشرف باسلام ہوئے ہیں، لیکن برسوں سے خود اپنی فطرت کے تحت وہ بعض اسلامی احکام تک پہنچ گئے تھے۔ ۱۹۷۱ میں صدر موصوف نے اپنے ملک میں کئی ایسی سزائیں رائج کیں جو کہ اسلامی "حدود" سے بڑی حد تک مشابہ تھیں۔ اس خبر کو عالمی صحافت نے "قدیم دور وحشت کی طرف واپسی" کا نام دیا تھا، اور مسلم ملکوں کی صحافت نے اسے اہمیت کے قابل ہی نہیں سمجھا۔ اس سے متاثر ہو کر راقم الحروف نے مصر کے روزنامہ "الاخبار" میں "الخبر الذی أهملناه" (جس خبر سے ہم نے اعراض برتا) کے عنوان سے مضمون شائع کیا تھا۔ مضمون میں صدر بوکاسا کی رائج کردہ سزاؤں کی تفصیلات دیتے ہوئے میں نے لکھا تھا عجب کہ اہل اسلام خود اسلامی حدود جاری کرتے ہوئے شرماتے ہیں، دوسرے لوگ اپنی عقل سلیم سے اسلامی تعلیمات تک پہنچ رہے ہیں۔

ظ۔ أ۔ خ

وسطی افریقہ کی آبادی تین ملین ہے جس میں پانچ فی صد مسلمان ہیں۔ پہلی بار وہاں پہلی صدی میں اسلام عرب تاجروں کے ذریعہ پہنچا تھا۔

وسطی افریقہ کے دارالسلطنت بانگی میں لیبیا ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرا رہا ہے۔ اس مسجد کا نام "مسجد صلاح الدین بوکاسا" ہوگا۔



وسطی افریقہ کا رقبہ ۲۲۷،۱۱۰ مربع میل ہے۔ آبادی ۲۲۷۰۰۰ ۔ دارالسلطنت بانگی ہے۔ سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ آب و ہوا گرم مرطوب ہے۔ یہ بنیادی طور پر زرعی ملک ہے۔ مشینیں وغیرہ باہر سے منگائی جاتی ہیں۔ اس کی برآمدی اشیاء روئی، ہیرا، کافی، لکڑی وغیرہ ہیں۔

وسطی افریقہ پر فرانسیسی قبضہ کا آغاز ۱۸۸۹ میں ہوا تھا۔ ۱۳ اگست ۱۹۶۰ کو اسے آزادی ملی۔ ستمبر ۱۹۶۰ سے وہ اقوام متحدہ کا ممبر ہے۔ فروری ۱۹۷۲ میں موجودہ صدر ساری عمر کے لئے صدر مقرر ہوئے تھے۔

انگریزوں کے برعکس، فرانسیسی اور دوسرے یورپی مستعمرین کا اقتدار جہاں رہا۔ انھوں نے مقامی باشندوں کی تعلیم کی بالقصد حوصلہ شکنی کی۔ چنانچہ وسطی افریقہ میں پہلی یونیورسٹی، آزادی کے بعد ۱۹۷۰ میں قائم ہوئی۔ ۱۹۷۱ء میں ملک کے اندر ۷۷۸ پرائمری اسکول تھے جن میں طلبہ کی تعداد ۲۱۷،۸۵۵ تھی۔ اعلی تعلیم کے لئے بیرونی ممالک میں جانے والے طلبہ کی تعداد ۶۰۰ تھی۔ ۱۹۷۲ء میں اس کا مرکزی بجٹ ۱۶۸۰ ملین فرانک تھا □

ایجنسی کی شرائط

۱۔ کم از کم دس پرچوں پر ایجنسی دی جائے گی۔
۲۔ کمیشن پچیس فی صد
۳۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوں گے۔
۴۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ ہوں گے۔
۵۔ غیر فروخت شدہ پرچے واپس لے لئے جائیں گے۔

منیجر الرسالہ، ۱۰۳۶ کشن گنج، دہلی ۔ ۶

تھیوسوفیکل سوسائٹی : ایک تعارف

الرسالہ کے مضامین میں ہم زیادہ سے زیادہ تنوع پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خیال ہے کہ مختلف مذاہب اور روحانی اور اخلاقی تحریکوں کے تعارف کا بھی ایک سلسلہ رکھا جائے۔ زیر نظر مضمون اسی کے تحت شائع کیا جا رہا ہے۔ اگر ناظرین نے پسند کیا تو یہ سلسلہ آئندہ بھی انشاء اللہ جاری رہے گا۔

تھیاسوفیکل سوسائٹی ۱۷ نومبر ۱۸۷۵ کو نیویارک میں قائم ہوئی۔ اس وقت کرنل ہنری اسٹیل اولکاٹ (امریکی) اس کے صدر اور میڈم ایچ پی بلاوٹسکی (روسی) اس کی سکریٹری تھیں۔ چند سال کے بعد انھیں نیویارک چھوڑنا پڑا کیونکہ سوسائٹی کا دفتر جس مکان میں تھا۔ اس کا کرایہ وہ ادا نہ کر سکے۔ اس کے بعد وہ لوگ ہندستان چلے آئے۔

۱۶ جنوری ۱۸۸۰ کو وہ بمبئی کے ساحل پر اترے۔ یہاں وہ تقریریں کرتے اور غیر ملکی اخبارات و رسائل میں مضامین لکھ کر اپنا خرچ چلاتے۔ ۱۸۸۲ میں وہ جنوبی ہند پہنچے۔ وہاں انھوں نے مدراس کے پاس قصبہ اڈیار میں ۲۷ ایکڑ زمین خریدی۔ بعد کو ڈاکٹر اینی بسانت سوسائٹی کی صدر ہوئیں تو انھوں نے مزید ۲۱ ایکڑ زمین خرید کر اس میں شامل کی اور سوسائٹی کے صدر دفتر کی عمارتیں بنائی گئیں۔

سوسائٹی کی بنیادی کتابیں دو ہیں:

SECRET DOCTRINE (پوشیدہ اصول)

THE KEY TO THEOSOPHY (تھیاسوفی کی کنجی)

ان کا عقیدہ ہے کہ قدیم زمانہ کے سات اشخاص اب بھی زندہ ہیں۔ وہ انسانی بہبود کے لئے لگاتار کام کر رہے ہیں۔ سوسائٹی کو ان کا آشیرواد حاصل ہے۔ اس وقت سوسائٹی کے ممبروں کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔

سوسائٹی میں ہر مذہب کے لوگ پائے جاتے ہیں حتی کہ وہ بھی جو کسی مذہب کو نہیں مانتے۔ اپنے بیان کے مطابق سوسائٹی کا مقصد سچائی کی تلاش اور انسانی برادری ہے۔

اس کے بڑے بڑے لیڈر جو اب تک ہوئے ہیں، وہ یہ ہیں۔

H.P. Blavatsky	1831-1891
H.S. Olcott	1832-1907
Dr. Annie Besant	1847-1933
Subramanyam Aiyar	1842-1924
C.W. Leadbeater	1847-1934
W.Q. Judge	1851-1896
C. Jinarajadasa	1875-1953
N. Sri Ram	1889-1973
Dr.G.S. Arundale	1878-1945

سوسائٹی کے قیام کے وقت اس کے ممبروں کی تعداد صرف پندرہ تھی۔ اب تقریباً ساٹھ ملکوں میں پھیل گئی ہے اور ۱۲۷ شہروں اور قصبات میں اس کی شاخیں قائم ہیں۔ سوسائٹی کے بانی مشرقی دانش سے متاثر تھے اور انسان کے اندر از سر نو روحانی بیداری لانے کے لئے اس کو قائم کیا تھا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ ایک ہندستانی مہاتما کے چیلے ہیں جن کی روح جیون مکت ہو کر ہمالیہ کے اوپر مقیم ہے۔ سوسائٹی کا صدر مقام اڈیار اب پھیل کر شہر بن گیا ہے۔ اس پرسکون مرکز میں دنیا



بھرے لوگ "اندرونی طاقت" حاصل کرنے کے لئے آتے رہتے ہیں۔ ہندوؤں کے لئے بنارس، مسلمانوں کے لئے مکہ اور یہودیوں کے لئے یروشلم کی جو حیثیت ہے۔ وہی تھیاسوفی کے پیروؤں کے لئے اڈیار کی ہے۔ مسز اینی بسانت نے ہندستان کی سیاسیات میں شامل ہو کر غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ برنارڈ شا نے ان کو دنیا کی "سب سے بڑی خاتون مقرر" کہا تھا۔ اب اس کے چھٹے صدر جان بی۔ ایس۔ کوٹس (پیدائش ۱۹۰۷) ہیں۔ یہ ایک انگریز ہیں اور بیک وقت چار عالمی زبانوں میں لکچر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں: فرانسیسی، ہسپانی، جرمن اور انگریزی۔ مسٹر کوٹس نے ایک انٹرویو میں کہا: ہم نے مشرقی دانش اور مغربی اقدار کو ملا کر ایک دنیا بنانے کی کوشش کی ہے۔ ہم روحانیات میں ایک اقوام متحدہ کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ سوسائٹی کے چھٹے صدر مسٹر کوٹس نے کہا: "تھیاسوفیکل سوسائٹی کی تعلیم اور کتابوں نیز دوسرے عوامل کے ذریعہ مغرب میں علوم مخفیہ سے دل چسپی بہت بڑھی ہے۔ مگر ایک خطرہ باقی ہے۔ اپنی اندرونی قوتوں کی تلاش میں انسان اب بھی روحانیت کے بجائے نفسیات پر زیادہ زور دے رہا ہے۔ ہم انسانیت کو اس سے بچاتا ہے اور لوگوں کو بتاتا ہے کہ علوم مخفیہ کو حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ خود غرضانہ زندگی کو ترک کر دیا جائے۔"

تھیاسوفیکل سوسائٹی کے مقصد کو مندرجہ ذیل شکل میں بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ نسل، عقیدہ، جنس، فرقہ یا رنگ کے امتیاز کے بغیر عالمی انسانی برادری قائم کرنا۔

۲۔ مذہب، فلسفہ اور سائنس کے تقابلی مطالعہ کی حوصلہ افزائی کرنا۔

۳۔ انسان کے اندر فطرت کے مخفی قوانین اور طاقتوں کا پتہ لگانا۔

تھیاسوفیکل سوسائٹی کی بانی بلاواتسکی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خارق عادت واقعات ظہور میں لانے پر قادر تھیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ ۱۸۸۰ میں ایک بار وہ شملہ میں مقیم تھیں۔ وہ کچھ لوگوں کے ساتھ جنگل میں پکنک منانے کے لئے گئیں۔ وہاں چائے تیار کی گئی تو اتفاق سے ایک نیا مہمان آگیا جس کے لئے پیالی اور پلیٹ موجود نہ تھیں۔ انھوں نے اپنی مخفی قوتوں کے ذریعہ ہوا سے ایک پیالی اور پلیٹ منگوائی جو ٹھیک اسی سائز اور ڈیزائن کی تھی جس کا ایک سٹ ان لوگوں کے پاس پہلے سے موجود تھا۔ یہ پیالی اور پلیٹ اب بھی اپنی اصل حالت میں تھیوسوفی کے مرکز اڈیار میں موجود ہے۔

اسی طرح اور بھی قصے مشہور ہیں مثلاً وہ مرکز میں لگے ہوئے مختلف گھنٹوں میں سے کسی بھی گھنٹہ کو بغیر خارجی ذریعہ کے محض اپنی مخفی قوت سے بجا سکتی تھیں۔ بلاواتسکی مہاتما موریا کو اپنا گرو بتاتی تھیں جو عرصہ ہوا مر چکے تھے۔ مگر بلاواتسکی کے بیان کے مطابق ان کی روح ہمالیہ کے اوپر موجود تھی۔ کوئی شخص اس مہاتما کی روح سے تعلق قائم کرنا چاہتا تو وہ بلاواتسکی کے ذریعے کر سکتا تھا۔ وہ اپنی بات بلاواتسکی سے کہتا۔ بلاواتسکی اس بات کو مخفی ذرائع سے مہاتما کی روح کو پہنچاتیں۔ مہاتما کی روح اس کا جواب دیتی۔ یہ جواب ایک کاغذ پر انگریزی زبان میں اچانک چھپ جاتا۔ وغیرہ

جے۔ کرشنا مورتی نے اپنی نوجوانی کی عمر میں ۱۹۲۵ میں تھیوسوفیکل سوسائٹی میں شرکت کی تھی۔ وہ ایک نہایت غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مسز اینی بسانت نے بچپن ہی میں ان کو ان کے خاندان سے لے لیا اور ان کو اعلیٰ تعلیم

جدید انسان
روحانیت میں از سرِ نو دلچسپی
[redacted] مگر اس کی روحانی تلاش
[redacted] کے بجائے نفسیات
کی طرف لے جا رہی
ہے

دلائی۔ وہ تھیوسوفیکل سوسائٹی کے ایک مشہور فرد بن گئے۔ مگر ۱۹۳۰ میں ان کو سوسائٹی سے اختلاف ہوگیا۔ انھوں نے سوسائٹی چھوڑ دی۔ ان کا کہنا تھا کہ سچائی کو کسی تنظیم کے ذریعہ حاصل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ تنظیم آزادانہ تلاش کے بجائے تعصب کا ذہن پیدا کرتی ہے تاہم آج بھی کرشنا مورتی کے جلسوں میں شرکت کرنے والے سب سے زیادہ تھیوسوفیکل سوسائٹی کے لوگ ہی ہوتے ہیں۔

میڈم بلاواتسکی ۱۸۷۳ میں پانی کے جہاز کے ذریعہ پادرے امریکہ جا رہی تھیں۔ ان کے پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ بندرگاہ پر ایک غریب عورت حسرت وافسوس کے عالم میں پڑی ہوئی ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کا شوہر امریکہ میں مزدور ہے۔ اس نے اپنے چھوٹے بچے کے ساتھ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا تھا تاکہ امریکہ میں اپنے شوہر کے پاس جا سکے۔ مگر عین وقت پر جہاز کے ذمہ داروں نے بتایا کہ اس کا ٹکٹ جعلی ہے۔ کسی نے اس کو دھوکا دے کر اس سے پیسے وصول کئے اور اس کو جعلی ٹکٹ دے دیا۔ بلاواتسکی نے فوراً اپنا فرسٹ کلاس ٹکٹ واپس کیا اور تیسرے درجہ کا ڈھائی ٹکٹ لے کر عورت اور اس کے بچے کے ساتھ معمولی کلاس میں سفر کر کے امریکہ پہنچیں

کیا ہم اس امتحان کی تیاری کر رہے ہیں

شفیق احمد صاحب
انبالہ والا دہلی

قیامت کے دن انسان کے قدم اپنی جگہ سے ہٹ نہ سکیں گے یہاں تک کہ اس سے پانچ باتوں کے بارے میں سوال نہ کر لیا جائے:

- عمر کن کاموں میں لگائی ؟
- اپنی جوانی کہاں صرف کی ؟
- مال کہاں کہاں سے کمایا ؟
- مال کہاں کہاں صرف کیا ؟
- جو علم حاصل ہوا اس پر کہاں تک عمل کیا ؟

راوی: حضرت ابن مسعودؓ ——— ترمذی

مدینہ میں تین مذاہب کی کانفرنس

پیغمبر اسلامؐ نے مسجد کے اندر غیر مسلموں کو اپنے طریقے کے مطابق عبادت کرنے کی اجازت دی۔ آج پیغمبر کے ماننے والوں کا یہ حال ہے کہ انھیں یہ بھی گوارا نہیں کہ دوسرے لوگ مسجد میں آکر خدا کی بتائی ہوئی عبادت کا طریقہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔

ہجرت کے دسویں سال نجران (یمن) کے عیسائیوں کا وفد مدینہ آیا تھا۔ اس وقت مدینہ اسلام کا مرکز بن چکا تھا۔ تاہم یہودی بھی بڑی تعداد میں وہاں موجود تھے۔ ۶۰ ممتاز عیسائیوں کا وفد جب مدینہ پہنچا تو یہودی بھی آکر ان سے ملنے لگے۔ اس طرح گویا وقت کے تین بڑے مذاہب کی کانفرنس بن گئی۔ اسی لئے ڈاکٹر ہیکل نے اس کو "موتمر الادیان الثلاثہ" کا نام دیا ہے۔

(حیاۃ محمد، صفحہ ۲۴۴)

ابن اسحاق نے اپنی سیرت میں لکھا ہے:

قدم علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفد نصاریٰ من نجران ستون راکباً فیھم اربعۃ عشر رجلا من اشرافھم، فدخلوا علیہ مسجدہ حین صلی العصر وقد حانت صلاتھم فقاموا فی مسجدہ، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعوھم فصلوا الی المشرق

آپ کے پاس نجران کے عیسائیوں کا وفد آیا۔ یہ لوگ ۶۰ سوار تھے۔ ان میں ۱۴ کی تعداد میں ان کے ممتاز افراد تھے۔ یہ لوگ مسجد نبوی میں عصر کے وقت پہنچے (یہ غالباً اتوار کا دن تھا) جب کہ ان کی نماز کا وقت ہوگیا تھا۔ وہ مسجد نبوی میں اپنی نماز ادا کرنے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ ان کا رخ (مسلمانوں کے برعکس) مشرق کی جانب تھا۔ (لوگوں نے روکنا چاہا) آپ نے فرمایا، انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو

الرسالہ جنوری ۱۹۷۷

اس طرح ایک طرف اسلام نے اپنی رواداری اور حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا۔ دوسری طرف عیسائیوں اور یہودیوں نے یہ کیا کہ وہ آپس میں اور مسلمانوں کے خلاف مناظرانہ انداز سے مذہبی بحثیں کرنے لگے۔ ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہوا تو یہودیوں نے کہا: ابراہیمؑ یہودی تھے، عیسائیوں نے جواب دیا: تم غلط کہتے ہو، ابراہیمؑ عیسائی تھے۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نرمی کے ساتھ انھیں بتایا: ابراہیمؑ کے بارے میں کیوں اس قسم کی بحثیں کر رہے ہو، تورات اور انجیل تو ان کے بعد اتری ہیں۔ پھر وہ یہودی یا عیسائی کیسے ہو سکتے تھے۔ حقیقت یہ کہ ابراہیم نہ یہودی تھے نہ عیسائی۔ وہ تو سچے موحد اور خدا کے تابعدار تھے۔ (آل عمران — ۶۷)

اس طرح کی بحثیں مدینہ کی اس مجلس میں جاری رہیں۔ ایک بار یہودیوں نے آپ سے کہا: محمد! کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی بھی عبادت کرنے لگیں جس طرح عیسائی لوگ عیسیٰ کی کرتے ہیں۔ نجران کے ایک عیسائی نے

یہ سن کر کہا: ہاں ہم بھی آپ سے جاننا چاہتے ہیں۔ اس لئے بتائیے کہ آپ کا مقصد کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: خدا کی پناہ کہ میں اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کی طرف بلاؤں۔ خدا نے مجھے اس کام کے لئے نہیں بھیجا۔

ابن ہشام نے لکھا ہے کہ اہل نجران جب مدینہ آئے اور یہود ان کے پاس جمع ہوئے تو دونوں نے ایک دوسرے کو غلط ثابت کرنا شروع کیا:

فقال رافع بن حرملة ما انتم علی شئ وکفر بعیسی و بالانجیل، فقال رجل من اهل نجران من النصاری للیهود ما انتم علی شئ وجحد نبوة موسی وکفر بالتوراة

رافع بن حرملہ یہودی نے کہا تم کسی چیز پر نہیں ہو اور عیسیٰ اور انجیل کا انکار کیا۔ نجران کے ایک عیسائی نے کہا تم کسی چیز پر نہیں ہو اور موسیٰ اور توراۃ کا انکار کیا۔

پیغمبر اسلام نے دیکھا کہ گفتگو اور دلائل امر حق کو واضح کرنے میں ناکام ثابت ہو رہے ہیں تو آپ نے مباہلہ کا طریقہ اختیار فرمایا۔ قرآن میں حکم آیا کہ "جو لوگ اب بھی آپ سے بحث جاری رکھے ہوئے ہیں، جب کہ علم حق تمہارے پاس پہنچ چکا ہے تو ان سے کہہ دو کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بھی لائیں اور تمہارے بیٹوں کو بھی اور اپنی عورتوں کو بھی اور تمہاری عورتوں کو بھی۔ پھر خدا سے کہیں کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہے، اس پر خدا کی لعنت ــــــ" (آل عمران۔ ۶۲) آپ نے وفد کے ارکان سے یہ کہا اور اسی کے ساتھ فاطمہ، علی، حسن اور حسین کو لے کر میدان میں پہنچ گئے۔ مگر نجران کے عیسائیوں کو اس معاملہ میں شریک ہونے کی ہمت نہ پڑی۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ہم ابھی آپ کے مذہب کو نہیں مانتے، البتہ اسلامی حکومت کی سیاسی ماتحتی قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔

سر ولیم میور نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"سارے واقعہ میں محمدؐ کے ایمان کی پختگی بھی نمایاں ہے نیز ان کے اس عقیدہ کی شہادت کہ ان کا تعلق عالم غیب سے جڑا ہوا ہے۔ اور اس لئے حق تمام تر انھیں کے ساتھ ہے"

(لائف آف محمد، صفحہ ۲۶۰)

مبارک کام

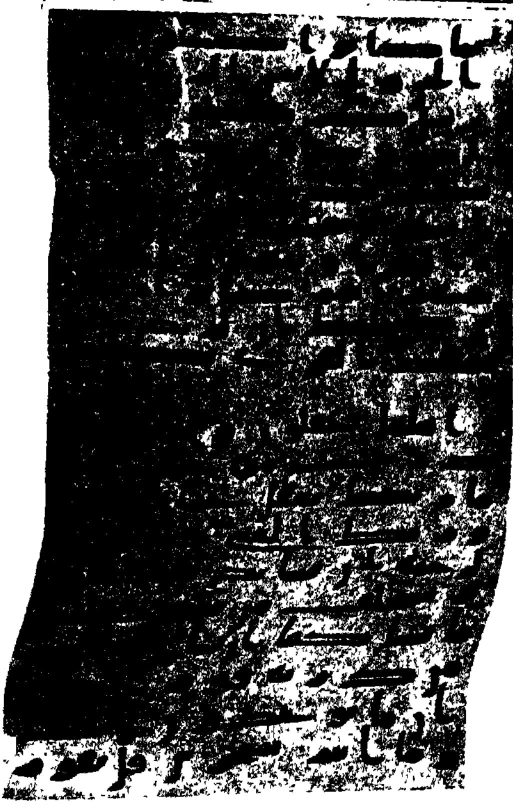
اخبار پرتاپ (۱۲ اکتوبر ۱۹۷۶) نے اپنے اداریتی نوٹ میں محمد علی کلے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

"محمد علی جیسے کم ہی کھلاڑی ہوتے ہیں۔ باکسنگ نے اسے کروڑپتی بنا دیا۔ اب اس کے دماغ میں اسلام کی سیوا کا سودا ہے۔ یہ مبارک کام ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسلام کی سیوا سے بھی یہ اسی طرح منحرف تو نہیں ہوتا جیسے اپنے ریٹائر ہونے کے اعلانوں سے ہوتا ہے۔"

کیسی عجیب بات ہے۔ مسلمان وہ تمام کام کرتے ہیں جن کو دوسرے نامبارک سمجھیں۔ البتہ وہی ایک کام کرنے کے لئے نہیں اٹھتے جو نہ صرف یہ کہ ان کا سب سے بڑا مذہبی فرض ہے۔ بلکہ اغیار تک جس کو پیشگی مبارک کہنے کے لئے تیار ہیں۔

مطالعہ

حضرت عثمان نے اپنی خلافت کے دوسرے سال ۲۵ھ میں جمع قرآن کا کام کیا۔ صدیق اکبر کا تیار کرایا ہوا مصحف، جو حضرت حفصہ کے پاس محفوظ تھا، اس کو انھوں نے منگوایا، اور زید بن ثابت کی نگرانی میں اس کے چھ نسخے تیار کرائے۔ ایک ایک نسخہ شام، بصرہ، کوفہ، مکہ اور مدینہ والوں کے لئے خاص کیا اور حکم دیا کہ اس کے سوا جو مصاحف ہیں وہ محو کر دیئے جائیں۔ اور ایک نسخہ خود اپنے پاس رکھا۔ اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ قرآن کی قرأت میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا مثلاً یزید نخعی کہتے ہیں کہ ہم ولید بن عقبہ کے زمانہ میں ایک مسجد میں تھا۔ ایک شخص نے آواز دی: جو شخص ابوموسیٰ کی قرأت پر قرآن پڑھتا ہو وہ باب کندہ کے حلقہ میں آجائے۔ دوسرے نے آواز دی: جو ابن مسعود کی قرأت پر قرآن پڑھتا ہو وہ دار عبداللہ کے حلقہ میں آجائے۔ دونوں سورہ بقرہ کی ایک آیت میں مختلف تھے۔ ایک اتموا الحج والعمرۃ للبیت پڑھتا تھا۔ دوسرا اتموا الحج والعمرۃ للہ۔ اس طرح کے اختلافات کثرت سے پیدا ہو گئے تھے اور لوگ اپنی پسندیدہ قرأت



مصحف عثمانی
محفوظہ تاشقند
کا
ایک صفحہ

یہ نسخہ ۳۵۳ صفحات پر مشتمل ہے۔
ہر صفحہ کا سائز ۵۳ x ۶۸ سنٹی میٹر ہے۔
اور ہر صفحہ میں دس سطریں ہیں۔
بالمقابل عکس میں سورہ انعام
رکوع ۱۶ کی ابتدائی چند آیتیں
نظر آسکتی ہیں۔

کے خلاف پڑھنے والوں کی تکفیر کرنے لگے تھے۔

حضرت عثمان کے یہ نسخے چونکہ ام المصاحف کی حیثیت رکھتے تھے، لوگوں نے انتہائی اہتمام کے ساتھ ان کی حفاظت کی۔ بعد کو وہ خلفاء اور سلاطین کے خزانوں میں قیمتی تبرک کی حیثیت سے رکھے گئے۔ پھر سیاسی انقلابات اور حکومتوں کی تبدیلی کے نتیجہ میں وہ ادھر سے اُدھر ہوتے رہے۔ قاہرہ کے مجلہ "الدنیا دکل شئ" نے اپنی اشاعت ۴ اگست ۱۹۳۸ء میں لکھا تھا:

مصحف عثمانی کا ایک نسخہ ترکی فوجیں مدینہ سے ترکی لے گئیں۔ وہاں سے وہ جرمن شہنشاہ ولیم ثانی تک پہنچا، اور ایک معاہدہ کے مطابق یہ نسخہ دوبارہ واپس ہو کر حکومت حجاز کو مل گیا۔ ابن جبیر نے لکھا ہے کہ وہ اپنی سیاحت کے دوران ۵۸۰ھ میں مدینہ پہنچے تو وہاں مسجد نبوی میں عثمانی مصحف موجود تھا۔ بعض معاصر محققین نے لکھا ہے کہ مدینہ میں مصحف عثمانی ۱۳۳۴ھ تک موجود تھا۔ اس کے بعد ترک اسے آستانہ لے گئے۔ (۲۰)

قرآن کا وہ نسخہ جو حضرت عثمان نے اپنے لئے خاص کیا تھا، بعض روایتوں کے مطابق وہ آپ کے بعد آپ کے خاندان میں محفوظ رہا۔ پھر بنی امیہ کے ساتھ وہ اندلس پہنچا۔ اندلس میں جب حکومت اسلامی ختم ہوئی تو وہ فاس منتقل ہو گیا۔ ابن بطوطہ کے بیان کے مطابق آٹھویں صدی ہجری میں وہ فاس میں موجود تھا اور اس پر خون کا نشان تھا۔ بعض دوسرے لوگ اس بیان کی صحت پر شک کرتے ہیں۔ ابن کثیر نے فضائل القرآن (صفحہ ۴۹) میں لکھا ہے کہ مصحف عثمانی کا ایک نسخہ میں نے دمشق میں دیکھا ہے۔ یہ نہایت عمدہ لکھا ہوا تھا۔

تاشقند کا موجودہ نسخہ تیمور کے زمانے سے سمرقند میں تھا۔ ۱۸۶۸ء میں جب روس کا غلبہ سمرقند میں ہوا تو زار کے حکم کے تحت وہ پیٹرس برگ کے میوزیم میں منتقل کر دیا گیا۔ ۱۹۱۷ء کے اشتراکی انقلاب کے بعد مسلمانوں نے لینن سے اس کی واپسی کی درخواست کی، چنانچہ لینن کے حکم کے تحت واپس ہو کر وہ تاشقند پہنچا۔

حضرت عثمان کے مصحف خاص کے محفوظ رہنے میں جو لوگ شک کرتے ہیں، ان کے شک کی بنیاد متعدد امور پر ہے۔ برزنجی نے اپنی کتاب نزہۃ الناظرین میں لکھا ہے کہ اس وقت چار نسخے موجود ہیں (مکہ، مدینہ، قاہرہ اور پٹرو گریڈ میں) اور چاروں کے بارے میں مصحف عثمانی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، حیرت انگیز بات ہے کہ چاروں نسخوں میں آیت قرآنی فسیکفیکھم اللہ پر سرخ نشان ہے۔ حالانکہ اس قسم کا نشان کسی ایک ہی نسخہ پر ہو سکتا ہے۔ (زیر نظر کتاب کے مصنف کا خیال ہے کہ بعد کو لوگوں نے اپنے نسخوں پر بطور تبرک مندرجہ بالا آیت پر سرخ نشان لگا لیا) اسی طرح بعض روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مصحف عثمانی میں آیت ولات حین مناص (ص-۳) کو ولاتحین لکھا گیا تھا جبکہ موجودہ تینوں مصاحف میں ولات حین لکھا ہوا ہے وغیرہ۔

مصنف کی یہ کوشش قابل داد ہے کہ انھوں نے نہایت محنت سے دونوں قسم کے دلائل اور روایتیں جمع کر دی ہیں۔ تاہم آخر میں انھوں نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ

تاریخ المصحف العثمانی طشقند (عربی)
تالیف: الشیخ اسماعیل مخدوم
المطبعۃ الرسمیۃ فی المطبعۃ الحکومیۃ، طشقند
۱۹۷۱ء، صفحات ۵۲

الرسالہ جنوری ۱۹۸۸ء

جہاں تک تاشقند کے میوزیم کا موجودہ نسخہ اصل عثمانی نسخہ ہے، اس کے خیالات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ ابن قتیبہ نے مصحف عثمانی کا طوس تک پہنچنا بیان کیا ہے۔ تاریخ سمرقند سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان کے ایک عزیز جن کا نام سعید تھا اس نسخہ کو لے کر سمرقند لے آئے۔

۲۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ انھوں نے بصرہ میں مصحف عثمانی کو دیکھا تھا۔ قیاس ہے کہ تیمور نے اس کے بعد جب بصرہ پر قبضہ کیا تو وہ اس نسخہ کو سمرقند لے آیا۔ اس کے بعد سے یہ نسخہ مسلسل سمرقند میں رہا۔ پھر ۱۹۱۷ کے اشتراکی انقلاب کے بعد تاشقند منتقل ہوا:

ان هذا المصحف الموجود عندنا هو احد المصاحف العثمانية التى بعث بها الى الامصار ان لم نقل انه نفس المصحف الامام اذ دعوى ذلك يحتاج الى نصوص صريحة (صفحہ ۳۰)

"یہ مصحف جو آج ہمارے پاس ہے، اگر یہ وہی مصحف نہ ہو جو حضرت عثمان کے زیر تلاوت تھا تو کم از کم وہ ان مصاحف میں سے ایک ضرور ہے جو آپ نے تیار کرا کر مختلف شہروں کو روانہ فرمایا تھا۔ کیونکہ اس کو حضرت عثمان کا ذاتی مصحف قرار دینے کے لئے ہمارے پاس صریح دلائل موجود نہیں ہیں۔"

اس مصحف میں کل ۷۰۶ صفحات تھے۔ اب صرف ۵۰۲ صفحات باقی رہ گئے ہیں۔ بقیہ کو لوگ تبرک کے طور پر نکال لے گئے۔ (۲۹) اگر انھیں معلوم ہوتا کہ یہ تبرک نہیں بلکہ اسلام کی تاریخی دستاویز ہے تو وہ ہرگز ایسا نہ کرتے ــــ مذہب کے غلط تصور نے مذہب کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے □

الرسالہ جنوری ۱۹۷۷

نیاز فتحپوری

جب آپ دلدل میں پھنس جائیں ؟

۱۹۰۹ء میں میرا تعلق ریاست باگڑی کدورہ (بندیل کھنڈ) سے ہوگیا تھا۔ نواب ریاض الحسن خاں کا عہد حکومت تھا۔ اس وقت میرے بہنوئی محمد سلیمان خاں موودھا (ضلع ہمیرپور) کے تھانہ میں مامور تھے۔ اور میں ہر پندرہویں دن اپنی بہن کو دیکھنے وہاں چلا جاتا تھا۔ فاصلہ صرف دس بارہ میل کا تھا جسے میں گھوڑے پر طے کرتا تھا۔

میں شام کو کدورہ سے چلا۔ میں جاگیر بیری کے قریب پہنچا جو کدورہ سے صرف تین میل دور تھی۔ تو آفتاب غروب ہوچکا تھا اور رات کا دھندلکا شروع ہوگیا تھا۔ جاگیر بیری ایک اونچی پہاڑی پر دریا کے کنارے واقع ہے اور موودھا جانے کے لئے اس دریا کو عبور کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس دریا کے دونوں کناروں پر دور دور تک ریت پھیلی ہوئی ہے۔ میں ریت کے اس حصے کو معمولاً پیدل طے کرتا تھا تاکہ گھوڑے پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ لیکن اس مرتبہ دیر ہوجانے کی وجہ سے میں گھوڑے پر سوار رہا اور اس کو تیز تیز چلانے لگا۔

اس دریا کے متعلق مشہور تھا کہ اس کے کناروں پر کہیں کہیں چور بالو بھی پائی جاتی ہے۔ چور بالو سے مراد وہ ریتیلا حصہ ہے جو بظاہر صاف اور مسطح نظر آتا ہے لیکن پانی کی سطح سے قریب تر ہونے کی وجہ سے اس کے نیچے دلدل ہوجاتی ہے اور اس پر پاؤں رکھتے ہی آدمی ہو یا جانور اندر دھنسنے لگتا ہے۔ اس مرتبہ چونکہ مجھے جلدی تھی اس لئے معمولی راستہ سے ہٹ کر میں نے مختصر راستہ اختیار کرنا چاہا۔ اور گھوڑے کو اسی طرف ڈال دیا۔ تھوڑی دور چل کر مجھے ایک ریتیلی تنگنائے ملی۔ اور میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی تاکہ وہ اسے پھاند کر گزر جائے۔ میں تاریکی میں اس کی چوڑائی کا صحیح اندازہ نہ کرسکا۔ زیادہ سے زیادہ میں اسے تین گز کا سمجھتا تھا۔ حالانکہ وہ چھ گز سے کم نہ تھا۔ میرے ایڑ لگانے پر گھوڑے نے جست تو کی، لیکن وہ اس فاصلہ کو عبور نہ کرسکا۔ اور اس کے اگلے پاؤں ریتیلے حصے کے اندر ہی رہے۔ اس کے بعد دفعتاً گھوڑا اندر دھنسنے لگا تو مجھے پتہ چلا کہ میں چور بالو میں پھنس گیا ہوں۔ چور بالو سے بچاؤ کا صرف ایک ہی طریقہ ہے، وہ یہ کہ اس سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں نہ مارے جائیں (اس طرح آدمی اور اندر دھنستا چلا جاتا ہے) بلکہ اپنے آپ کو بالو پر چت یا پٹ ڈال دیا جائے۔ گھوڑا سینہ تک دھنس چکا تھا اور میں بھی اس کے ساتھ گھٹنوں گھٹنوں بالو کے اندر غرق تھا۔ غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ گھوڑے کو بچانا تو ممکن نہیں اس لئے اس کے ساتھ اپنی جان کیوں گنوائی جائے۔ میں نے آہستہ آہستہ اپنے دونوں پاؤں رکاب سے الگ کرکے اوپر نکالے اور فوراً چور بالو پر بے حس و حرکت لیٹ گیا۔ اتفاق کی بات کہ اس وقت بیری کے دو راجپوت گھر لوٹتے وقت میرے پاس سے گزرے۔ اور میں نے انہیں آواز دی —— وہ دونوں دوڑے ہوئے آئے اور انہوں نے اپنی پگڑی کھول کر اس کا سرا میری طرف پھینکا کہ اسے مضبوط پکڑ لوں۔ اور جب میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا تو انہوں نے مجھے آہستہ آہستہ گھسیٹنا شروع کیا۔ اور میں اس چور بالو سے نکل گیا۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ گھوڑے کو کیوں کر نکالا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے یہ ترکیب نکالی کہ پگڑی کا ایک سرا پھندا بنا کر اس کی گردن میں ڈالا جائے اور اس کو بھی گھسیٹا جائے۔ میں لگام کا جھٹکا دینے لگا۔ مگر گھوڑا تھک کر اس قدر بے جان ہوگیا تھا کہ جھٹکے سے بھی اس کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوتی۔ اور آخرکار وہ دھنستے دھنستے غائب ہوگیا □

مؤتمر الفقہ الاسلامی

مکتوب ریاض
ظفر الاسلام خاں ایم اے

سعودی عرب کے دار السلطنت الریاض میں اکتوبر ۱۹۷۶ء کے آخری ہفتہ میں اسلامی قانون کے بارے میں ایک اہم بین اقوامی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ساری دنیا سے تقریباً ۱۵۰ علماء و مفکرین اسلام نے شرکت کی۔

آٹھ دن کی فکر انگیز مقالوں اور مناقشات کے بعد اسلامی فقہ کانفرنس ۳۱ اکتوبر کو ختم ہوئی۔

کانفرنس کی اہم قراردادیں حسب ذیل ہیں:

— اسلامی ملکوں میں شریعت اسلامیہ کو فوری طور پر نافذ کرنے کا مطالبہ۔

— اسلامی فقہ اکیڈمی کا قیام جو کہ اسلامی قوانین کی جدید تدوین کے علاوہ عصر حاضر کے پیدا کردہ مسائل کا حل تلاش کرے گی اور اس میں تمام عالم اسلامی کے ممتاز علماء و مفکرین شامل ہوں گے۔ یہ اکیڈمی کانفرنس کی دعوت دینے والی جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیۃ (الریاض) میں قائم کی جائے گی۔

— مسلم ممالک میں سود کا فوری طور سے خاتمہ، اور بینکاری اور دوسرے اقتصادی امور کو اسلامی قانون کے مطابق ڈھالنا۔

— جامعۃ الامام محمد بن سعود میں اقتصادی ریسرچ کا مرکز قائم کرنا۔

— مدارس کی تعلیم میں اسلامی علوم و ثقافت کو کافی حصہ داخل کرنا۔

— ایک دائمی مرکز کا قیام جو اسلام کے خلاف استشراقی، الحادی اور صلیبی فکری حملوں پر نظر رکھے اور ان کا توڑ کرے۔

— اسلامی انسائیکلوپیڈیا کو تیار کرنا۔

— عالمی اسلامی صحافتی ادارہ کا قیام جو کہ پرچوں اور روزناموں کے ذریعے اسلامی قضایا کو ابھارے اور عمدہ اسلامی کتابوں کا ترجمہ کرے۔

— اسلامی تعلیمی ریسرچ کے لئے جامعۃ الامام محمد بن سعود اور دوسری اسلامی یونیورسٹیوں میں دائمی مراکز کا قیام جو کہ عمدہ کتابیں تیار کرے تاکہ اسلامی مدارس میں تدریسی کتابوں کا خلا پورا ہو سکے۔

کانفرنس پہلی ذی القعدہ (۲۴ اکتوبر ۱۹۷۶ء) کو شروع ہوئی تھی۔ پہلے اجلاس کا افتتاح سعودی ولی عہد الامیر فہد بن عبد العزیز نے کیا۔ انھوں نے کانفرنس کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ان کا ملک اس کانفرنس کی قراردادوں کو نافذ کرنے کے لئے تیار رہے۔

دوسرے دن کانفرنس کے اعضاء کو (جو کہ ۲۹ ملکوں سے آئے تھے) چار کمیٹیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ پہلی کمیٹی نے کانفرنس کے ایجنڈا کے مندرجہ ذیل مسائل پر غور کیا:

— اسلامی شریعت کی تطبیق ہر زمان و مکان کے لئے واجب ہے۔

— شریعت کے بارے میں پیدا کئے ہوئے شبہات۔

— مسئلہ اجتہاد۔

دوسری کمیٹی

—— اسلام میں نظام قضاء (عدالت)

—— حدود شرعیہ کی تطبیق کا سوسائٹی کے امن و امان پر اثر۔

تیسری کمیٹی:

—— سوسائٹی کے لئے اسلام کا اقتصادی نظام۔

—— اسلامی بنک۔ نظریہ و تطبیق میں۔

چوتھی کمیٹی:

—— ذرائع ابلاغ اور ان کا اسلامی قدروں کے پھیلانے اور محفوظ رکھنے میں اثر۔

—— اسلامی تعلیم کا سوسائٹی پر اثر۔

—— فکری اور اسلام دشمن حملے۔

اگلے چار دنوں تک کمیٹیوں نے صبح کے جلسوں میں الگ الگ اپنے موضوعات پر بحث کی اور اپنی قرار دادیں کو قرار دادیں تیار کرنے والی کمیٹی کے حوالے کر دیا۔ اور وفود زیارت مسجد نبوی کے ما قبیین نے جمعہ کے دن فوجی جہاز کے ذریعہ سعادت حاصل کی۔

شام کے جلسوں کو عام اجتماعات کے لئے رکھا گیا تھا جس میں تمام اعضاء اور سعودی یونیورسٹیوں کے طلباء، اساتذہ اور دوسرے دلچسپی رکھنے والے لوگ شریک ہوتے تھے۔ موصول ہونے والے مقالات میں سے پانچ مقالات کو اس موقع پر پڑھنے کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔

پہلے دن کے اجلاس میں مولانا وحید الدین خاں صاحب کا مقالہ تھا جو کہ بعض مصروفیات کی وجہ سے کانفرنس میں شریک نہ ہو سکے۔ تاہم انھوں نے اپنا مقالہ بھیج دیا تھا۔ ان کی نیابت میں راقم الحروف نے یہ مقالہ پڑھا۔ یہ مقالہ، جس کا عنوان وجوب تطبیق الشریعۃ الاسلامیۃ فی کل زمان و مکان تھا کانفرنس میں پیش ہونے والا سب سے عمدہ مقالہ تسلیم کیا گیا۔ مقالہ

مساء الاثنين ٢/١١/١٣٩٦هـ

● كلمة سماحة الشيخ عبد العزيز بن باز

محاضرتان عنوانها : « وجوب تطبيق الشريعة الإسلامية في كل زمان ومكان » لكل من الاستاذ : الدكتور عبدالسلام الترمانيني ، والاستاذ وحيدالدين خان .

مساء الثلاثاء ٣/١١/١٣٩٦هـ

● كلمة لسماحة الشيخ عبدالله بن حميد .

● محاضرة للاستاذ جمال المرصفاوي « نظام القضاء في الإسلام » .

مساء الخميس ٥/١١/١٣٩٦هـ

● محاضرتين بعنوان « الغزو الفكري والتيارات المعادية للاسلام » لكل من الدكتور « عبد الستار السعيد » والدكتور المهدي بن عبود .

لقاء قمة على المستوى الفكري!!

ختم ہونے کے بعد لوگ اس کی مطبوعہ کاپیاں حاصل کرنے کے لئے ٹوٹ پڑے اور تھوڑی دیر میں سارا ذخیرہ ختم ہو گیا۔ کانفرنس میں شریک ہونے والے اعضائے بکثرت مجھ سے ملاقات کی اور مقالے کو سراہتے ہوئے مولانا موصوف کو اپنی عقیدت وسلام پہنچانے کی درخواست کی۔ محمود زالرباحی (ڈائرکٹر جنرل الدار التونسیۃ للنشر جو کہ تونس کا سب سے بڑا اشاعتی ادارہ ہے) نے کہا کہ یہ مقالہ اس پورے سال کا سب سے عمدہ مقالہ تھا (ھذا اعظم بحث لھذہ السنۃ) ترکی کے نمائندے محمد امین سراج نے کہا کہ "خدا کی قسم تم نے اس مقالہ سے ہمارے دلوں کو ٹھنڈک پہنچائی" (واللہ انك قد اثلجت صدورنا بھذا البحث) دوسرے لوگ جنھوں نے مقالہ کو سراہا اور سلام پہنچانے کو کہا ان میں سے کچھ نام یہ ہیں:

احمد الحمانی (الجزائر کی وزارت امور دینیہ میں المجلس الاسلامی الاعلیٰ کے ڈائرکٹر)۔ محمد صلاح الدین المستاوی (ایڈیٹر جوہر الاسلام۔ تونس)۔ ڈاکٹر محسن عبد الحمید (پروفیسر بغداد یونیورسٹی)۔ مصر کے ڈاکٹر احمد شلبی۔ انور الجندی۔ رجب البنا (الاہرام) ڈاکٹر عبد الصبور شاہین۔ ڈاکٹر عبد اللہ شماتہ، ڈاکٹر علی محمد جریشہ۔ ڈاکٹر محمد احمد عاشور (ایڈیٹر الاعتصام)۔ کویت کے ڈاکٹر جمال الدین عطیہ (ایڈیٹر المسلم المعاصر)۔ زین الدین الرکابی (ایڈیٹر المجتمع)۔ عبد الرحمٰن الولایتی (ایڈیٹر البلاغ)۔ عبد اللہ العقیل (ڈائرکٹر امور اسلامیہ وزارت اوقاف)۔ سعودیہ کے شیخ محمد محمود الصواف (رابطۂ عالم اسلامی)۔ شیخ ابو بکر الجزائری (استاذ مدینہ اسلامی یونیورسٹی)۔ احمد محمد جمال (عضو مجلس الشوریٰ) مراکش سے عبد الرحیم بن سلامہ (صدر جمعیۃ التضامن الاسلامی)۔ ڈاکٹر عبد المنعم البدراوی (پروفیسر معہد الادارۃ الوطنی) ترکی سے پروفیسر اسماعیل حقی اور ڈاکٹر مصطفیٰ بیلکا۔ امریکا سے عمر فاروق عبد اللہ (شیکاگو یونیورسٹی)۔ جامعۃ الامام محمد بن سعود اور مدینہ یونیورسٹی کے متعدد اساتذہ وطلبا نے بھی اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا۔ بہت سے لوگوں نے کہا کہ ہم استاذ وحید الدین خاں کی کتابوں کے ذریعے اپنے ملکوں میں الحادی اور کمیونسٹ خطرات کا مقابلہ کر رہے ہیں اور ایسی ہی کتابیں موجودہ دنیا میں اسلام کو پیش کر سکتی ہیں۔

سعودی ذرائع ابلاغ (اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی وژن) نے خصوصیت سے مقالہ کا ذکر کیا۔ اور قاہرہ کے روزنامہ الاہرام نے اپنی ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۶ کی اشاعت میں مقالہ کا واضح خلاصہ پیش کیا۔ انشاء اللہ آئندہ اس مقالہ کا اردو ترجمہ الرسالہ میں شائع کیا جائے گا۔ عربی زبان میں کئی جرائد اس کو شائع کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ کتابچہ کی شکل میں وہ قاہرہ سے عنقریب شائع ہونے والا ہے۔

کانفرنس میں ہندوستان سے بلائے جانے والے

نمائندے یہ تھے۔

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

۲۔ مولانا سید اسعد مدنی

۳۔ مولانا سعید الرحمٰن ندوی

۴۔ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی

۵۔ مولانا وحید الدین خاں

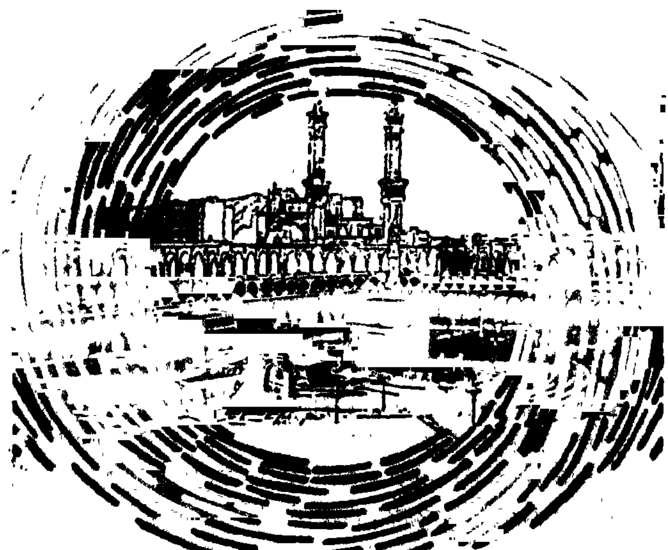
ان میں اول الذکر اور دونوں آخر الذکر شریک ہوسکے جس کا کانفرنس کے اعضاء کو شدید افسوس رہا۔ راقم الحروف کو لیبیا کی طرف سے دعوت ملی تھی۔

کانفرنس کے ساتھ ساتھ جامعۃ الامام محمد بن سعود نے اسلامی کتابوں کی نمائش کا بھی انتظام کیا تھا جس میں ۱۶ ملکوں کے ناشرین نے شرکت کی۔

کانفرنس اپنی جگہ بہت اہم تھی اور عمدہ اور طویل تیاریوں کی وجہ سے مکمل طور سے منظم و پرسکون تھی۔ سعودی عرب کے ممتاز اسلامی ہفت روزہ "الدعوۃ" نے اس کانفرنس کو لقاء قمۃ علی المستوی الفکری (اسلامی فکر کی چوٹی کانفرنس) سے تعبیر کیا۔

کانفرنس کے آخر میں ہم لوگوں نے اصرار کرکے یہ قرارداد بھی پاس کی کہ جامعۃ الامام محمد بن سعود میں کانفرنس کا دائمی آفس کھولا جائے جس کی ذمہ داری قراردادوں کو نافذ کرنا اور کرانا ہو۔ جامعہ کے ذمہ داروں سے مجھے یہ احساس ملا کہ وہ لوگ عزم صادق سے اس امانت کو نبھانے والے ہیں۔

لبیک اللہم لبیک



کعبہ

وہ مرکزی نقطہ جس کے گرد دنیا بھر کے خدا پرستوں کا عبادتی دائرہ قائم ہوتا ہے۔

ہندستان سے ریاض کی موتمر میں شرکت کرنے والوں میں حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی (ایڈیٹر بعث الاسلامی) مولانا اسحاق جلیس ندوی (ایڈیٹر تعمیر حیات) کے علاوہ ریاض پہنچنے [illegible] مولانا سید اسعد مدنی کا سفرنامہ [illegible] الجمعیۃ (۱۸ - نومبر) میں قسطوں میں شائع ہوا ہے یہاں مکمل صورت میں نقل کیا جا رہا ہے

۲۴ اکتوبر: اتوار یکم ذیقعدہ کی شب میں نائجیریا کے کچھ لوگ اس کمرے میں بھیج دیئے گئے جس میں ہم حضرت مولانا اسعد مدنی کے ہمراہ قیام فرما تھے۔ رات کو چار بجے جب ہم لوگوں کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہ لوگ قبلہ کی طرف پشت کرکے نوافل پڑھ رہے ہیں۔ چنانچہ ان کو صحیح رخ بتایا گیا۔ پھر فجر ہونے پر حضرت مولانا کے ہمراہ ہم سب نیچے اترے کہ شاید باجماعت نماز کا بندوبست ہو۔ ہر طرف دیکھا مگر سب لوگ کمروں میں ہی تھے۔ کوئی نہیں نکلا تھا۔ آخر ہم لوگوں نے اپنے کمرے میں آکر جماعت کی۔ نماز فجر کے بعد مولانا اسعد صاحب ٹہلنے کے لئے تشریف لے گئے ان کی واپسی تک ہم لوگوں نے انتظار کیا اور اس کے بعد ناشتہ کے لئے بیٹھے۔

ناشتہ کے بعد ہم لوگ نیچے گئے جہاں حضرت مولانا مدظلہ العالی اور دوسرے لوگوں نے سب کمیٹیوں میں اپنے نام لکھائے۔ اس کے بعد مختلف مندوبین سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا جو بہت دیر تک جاری رہا۔ دوپہر کا کھانا کھاکر ہم لوگوں نے کچھ دیر آرام کیا کیونکہ تیسرے پہر افتتاح ہونا تھا۔

۳½ بجے افتتاح کا وقت مقرر تھا۔ جب ہم موتمر کے ہال میں پہنچے تو تقریباً ہال بھرا ہوا تھا اور تمام لوگ ولی عہد کے لئے چشم براہ تھے وہ ابھی نہیں پہنچے تھے۔ غالباً چار پانچ منٹ کا وقت ہوگا جب وہ تشریف لائے۔ ان کی تقریر کے ساتھ کانفرنس کا آغاز ہوا جو چالیس منٹ تک جاری رہی۔ ان کے بعد وزیر تعلیم سعودی عرب نے تقریر کی۔ آخر میں تمام مندوبین کی جانب سے ترکی مندوب ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن نے تقریر کی۔ اور ساڑھے پانچ بجے کے قریب یہ افتتاحی اجلاس ختم ہوا۔

۲۵ اکتوبر۔ صبح کی نماز کے بعد حضرت مولانا اسعد مدنی نائجیریا کے مندوب ملی لقانی کے ہمراہ سیر کو تشریف لے گئے۔ واپس آکر غسل کیا۔ ناشتہ سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد حضرت مولانا ابوظبی کے قاضی القضاۃ شیخ احمد عبدالعزیز آل مبارک سے ملنے تشریف لے گئے آدھے گھنٹے تک ان سے ملاقات رہی اور مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ وہاں سے واپس آکر حضرت نے کانفرنس میں شرکت کے لئے تیاری شروع کی۔ اور سب کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لئے روانہ ہوئے۔

کانفرنس کی تیسری سب کمیٹی اقتصادی مسائل پر غور کرنے کے لئے بنی ہے۔ اس میں حضرت مولانا تقریباً دو گھنٹے تک شریک رہے۔ حضرت مولانا نے اس اجلاس میں جو مقالہ پیش فرمایا تھا مصری علماء کی گفتگو میں بھی کم وبیش وہی دلائل تھے۔ مگر وہ ارتجالاً احادیث وفقہ سے ایسے نظائر پیش کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔

دوپہر میں اعضاء مکتبہ جامعۃ الریاض دیکھنے گئے ہم لوگوں نے کھانے سے فراغت پاکر کچھ دیر آرام کیا عصر کے وقت بیدار ہوئے۔ نماز پڑھی۔ چائے پی، کچھ لوگ کمرہ میں آگئے۔ کچھ ادھر ادھر چلے گئے۔ حضرت مولانا اسعد مدنی سید یوسف سید ہاشم الرفاعی سے ملنے کے لئے تشریف لے گئے اور تقریباً آدھے گھنٹے تک وہاں ٹھہرے۔

عشاء کی نماز کے بعد جناب طیب صاحب سے ملاقات ہوئی
پہلے وہ مصری سفارت خانے میں تھے۔ اب یہاں لگے ہیں۔ جدہ کے
ہندوستانی سفارت خانے نے انھیں ہم لوگوں کی خبر گیری کے لئے مامور
کیا تھا کہ کون کون آیا ہے، کہاں ٹھہرا ہے۔ بہت دیر تک مولانا
اسعد سے گفتگو فرماتے رہے۔ اس کے بعد جلسۂ عام میں شرکت کے
لئے تشریف لے گئے وہاں کچھ مقالات اور شیخ ابوبانہ کی تقریر ہوئی۔

۲۶ اکتوبر:۔ صبح کے معمولات سے فراغت کے بعد آٹھ بجے
بحثات میں شرکت کی اور پونے ۱۰ بجے کے قریب تمام مندوبین ایک
جگہ جمع ہو گئے اور پھر تمام مہمانانِ حکومت کاروں کے ایک قافلہ
کی صورت میں قصر ملکی کی طرف روانہ ہوئے اور تقریباً ۱۰ منٹ میں
سب وہاں پہنچ گئے۔ سب کو ایک بہت بڑے اور شاندار ہال میں
بٹھایا گیا جہاں سب کی قہوہ سے مدارات کی گئی۔

ساڑھے دس بجے کے قریب امیر فہد (جو ولی عہد سلطنت
اور نائب رئیس الوزراء ہیں اور جنھیں جلالۃ الملک شاہ خالد
اپنی جگہ قائم مقام بنا کر مصر گئے ہیں) تشریف لائے اور سب سے
فرداً فرداً مصافحہ ہوا۔ ولی عہد امیر فہد سے جب سب لوگ فرداً
فرداً ملاقات کر چکے تو اس کے بعد دو مختصر تقریریں ہوئیں۔ ایک
مصری مندوب نے اپنی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ بینکوں سے
سودی کاروبار ختم کر دو یہ حرام ہے اور تم اللہ کے یہاں جوابدہ
ہو۔ اس پر انھوں نے فرمایا دعا کرو اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔
ایک دوسرے معزز نے دعائیہ تقریر کی اس پر انھوں نے بھی
دعائیہ کلمات فرمائے۔

اس کے بعد پھر چائے اور قہوہ کے دور چلے۔ پہلے قہوہ آیا
پھر چائے چلی، پھر قہوہ آیا۔ اس میں خود امیر فہد بھی شریک رہے
یہ ختم ہوا تو امیر فہد نے تقریر فرمائی۔

امیر فہد کی مختصر تقریر اسلامی نظام، اسلامی محاسن، اس
کی افادیت اور اسی قسم کے موضوعات سے متعلق تھی۔ اور فرمایا کہ
اس طرح کی کانفرنس جب یہاں یا کسی اور جگہ ہوگی تو ہم حاضر
ہیں انشاء اللہ ہم اپنا تعاون دیں گے۔

مندوبین کی طرف سے جواب میں الازہر کے قاضی القضاۃ
اس پر جناب حسن کامل مبارک نے معذرت اور شکر کے بعد کہا کہ تم
لوگوں کو چاہئے کہ تمام ملک و اقوام مسلمین کو شریعت حقہ کے نفاذ پر
توجہ دلاؤ، تمہاری آواز بھی سنی جاتی ہے۔ اور یہ تمہاری ذمہ داری
بھی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ تم اللہ تعالیٰ کے یہاں سرخرو ہوگے
اور اس کا اجر بھی ملے گا۔

شام کو جلسۂ عام ہوا۔ اس کا اہتمام ایک بہت بڑے
ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ حاضرین بھی بہت بڑی تعداد میں تھے۔

۲۷ اکتوبر:۔ حضرت مولانا اسعد مدنی کا مقالہ پہلے ہی
شائع ہو چکا تھا۔ صبح کو جب بحثات کے جلسے ہوئے تو ان میں
حضرت مولانا کے مضمون کا خلاصہ پڑھا گیا۔ اس کے بعد اس
پر بحث مباحثہ ہوا۔

شام کو امام محمد بن سعود یونیورسٹی کے مدیر کلیات کی طرف
سے عصرانہ تھا اس کے بعد برج ریاض میں مغرب کی نماز اور رات
کا کھانا کھایا۔ یہ برج سولہ منزلہ ہے اور امریکہ کے بعد دنیا
کا سب سے بڑا برج بتایا جاتا ہے۔ مسقف مدور حصہ کی ہر طرف
کم از کم پچاس پچاس فٹ ہوگی اور اس کے بعد کھلا ہوا ہر طرف
کم از کم پچاس فٹ چوڑا حصہ ہے۔ مسقف حصہ ایر کنڈیشنڈ ہے
وہیں مغرب کی نماز باجماعت ہوئی بعد ازاں وہیں ضیافت کا
اہتمام ہوا۔ سنا ہے یہ اطلاع بھی ملی کہ تمام وفود کو عمرہ کے لئے لے
جایا جا رہا ہے۔

۲۸ اکتوبر:۔ ناشتے کے بعد بحثات (کمیٹیوں) کی میٹنگیں
شروع ہو گئیں اور بعد میں ہم لوگ عمرہ کی تیاری میں مصروف
ہو گئے۔ بعد عصر شیخ عبد الفتاح ابو غدہ کے یہاں عصرانہ تھا یہاں
ایک ڈاکٹر صاحب نے بائبل پر تفصیل کے ساتھ بتایا کہ حضرت
عیسیٰ علیہ السلام کے تین سو سال بعد تک بائبل کی کوئی تاریخ
نہیں ہے۔ پھر سو سال بعد کچھ لوگوں کا ایک اجتماع ہوا اور
کیتھولک مذہب شروع ہوا اور مختلف لوگ مختلف قسم کے نسخے
لے کر بیٹھ گئے۔ لیکن جب قسطنطین اول کی ماں نے عیسائیت قبول
کرنے کے لئے کہا گیا تو اس نے حکم دیا کہ انجیلوں کو جلا دیا جائے
ملک اور اصل عیسائی مذہب کون سا ہے۔ شش سے کے بعد

شمالاً ڈیڑھ گھنٹے چل کر گئے اور تقریباً سو خیمے انجینیوں کے بیٹھ گئے
جن میں سے چار نشیٹ کے مؤتمر تھے تقریباً سات سو حاضرین کے
اتفاق رائے سے چار نسخے مانے گئے باقی رد کر دیے گئے۔ ایک بزرگ
شخص نے جن کا اثر شام اور ترکستان پر تھا وہ موحد تھا اور حضرت
عیسیٰ علیہ السلام کو بشر مانتا تھا اس نے اختلاف رائے کیا۔ آخر یہ اجتماع
ختم کر دیا گیا۔ اس کے بعد عقیدہ ان سالوں کا اجتماع ہوا جس میں اس
موحد کو خارج کر کے نصرانیت اور صاحب الفضل قرار دیا گیا اور ان ہی
یہودیوں کی سازش سے کیتھولک سے پروٹسٹنٹ اور شاخ در شاخ ہوتے
چلے گئے۔ ظہور اسلام کے بعد اسلام کے خلاف سازشوں میں مصروف
ہو گئے اور تمام صلیبی جنگوں میں ان کا ہاتھ رہا ہے۔ یہی عیسائیوں کو
ابھارتے رہیں ان سے خفیہ معاہدے کرتے اور ان کو قرض دے کر ان
کے لشکروں کو مسلح کرتے اور لڑائیاں کراتے رہے۔

آج کا جلسۂ عام بہت پُر جوش تھا۔ اس میں مستشرقین کے بارے
میں مقالہ تھا کہ کس طرح اسلام کو مسخ کر کے اشتباہات پیدا کرنے مشکوک
ڈالنے عقائد میں تزلزل پیدا کرنے اور نوجوانوں میں بد اخلاقی پھیلانے
اور مغربی تہذیب میں جذب کرنے کا کام پورے انہماک، لگن اور جوش و
جذبہ کے ساتھ کرتے ہیں نیز ممالک اسلامیہ کو برباد کرنے کی فکر میں
لگے رہتے ہیں۔

دوسرا مقالہ صیہونیت پر تھا۔ تاریخی، فکری اور عملی طور پر اس
تحریک کے تحت کیا کچھ ہوا ہے اور کتنے خطرات اس تحریک میں مضمر ہیں
حاضرین میں سے کم و بیش ہر شخص اس پر بولنے کے لئے بے چین تھا، چنانچہ
لوگ وقت لے لے کر بولے۔ سب کے اندر بڑا جوش و خروش پایا جاتا تھا
لوگ جلسہ ختم نہیں کرنا چاہتے تھے۔

۲۹ر اکتوبر: آج جمعہ تھا۔ صبح ہی سے حضرت مولانا کو متعدد
ٹیلیفون آتے رہے۔ صبح صادق کے بعد ہی جب ہم حضرت مولانا اسعد مدنی
کے ہمراہ نیچے اترے تو دیکھا کہ ہال عمرہ کے لئے جانے والوں سے بھرا تھا۔
اسی وقت فجر کی نماز جماعت سے ہوئی۔ اس کے بعد وہ لوگ روانہ ہوئے۔
حضرت مولانا عمرہ کے لئے تشریف نہیں لے گئے۔ چونکہ آپ کراچی قیام
کرنا ہے اور فریضۂ حج بھی ادا کرنا ہے۔ حضرت مولانا ناشتہ سے فارغ
ہو کر نہا دھو کر ڈاکٹر عبدالحنان کے ساتھ شہر تشریف لے گئے۔ یہاں
یہ طریقہ ہے کہ زوال سے قبل اذان دے کر خطبہ شروع کر دیتے ہیں اور
زوال ہوتے ہی نماز جمعہ شروع ہو جاتی ہے۔ نماز کے بعد محمود نقشبندی
صاحب کے یہاں دوپہر کی دعوت میں تشریف لے گئے اور ہوٹل واپس آ گئے۔

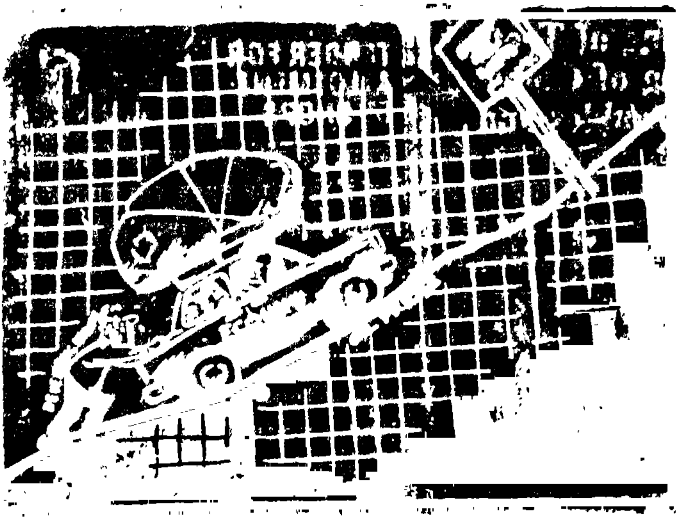
عصر کے بعد نیچے اترے تو مغرب کی نماز میں ندوی حضرات
سے ملاقات ہوئی۔ یہ حضرات کل تشریف لائے ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن
ترکی سے بھی ملاقات ہوئی۔ ابھی ان کے ساتھ بیٹھے ہی تھے کہ شیخ محمود صواف
تشریف لے آئے۔ ہم نے گزشتہ شب کے مستشرقین سے متعلق مقالہ پر
مبارکباد دی۔ یہاں سے اٹھنے کے بعد قطر کے نمائندے سے ملاقات ہوئی
اور مختلف امور پر گفتگو ہوتی رہی۔

۳۰ر اکتوبر: آج موتمر کا اجلاس عام تھا۔ اس میں تجاویز
پر غور و بحث تھی۔ تجاویز سارا کین کو تقسیم کی گئیں اور چند منٹ ان کے
مطالعہ کے لئے دیئے گئے۔ پھر ان کی اجمالی منظوری لے لی گئی۔ اس کے
بعد ایک ایک جزء پر بحث و ترمیم اور ووٹنگ کا سلسلہ شروع ہوا
اور تقریباً ڈھائی گھنٹے یہ سلسلہ چلا۔ آخر میں تجاویز کو ایک پانچ نفری کمیٹی
کے سپرد کیا گیا کہ وہ اس پر مزید غور و بحث کر کے اس کو آخری صورت دیدے۔

ظہر کے وقت جلسہ ختم ہوا۔ عصر کے وقت ہم لوگ ایک پہاڑی آبادی
کو دیکھنے گئے اور مغرب بعد امیر منطقہ ریاض امیر سلمان بن عبدالعزیز کی
طرف سے ضیافت کا اہتمام تھا۔ ریاض سے کئی میل دور کھلے میدان
میں خیمے لگا کر قالین وغیرہ کا پرانے طرز پر انتظام کیا گیا تھا۔ خود امیر نے
سب کا استقبال کیا۔ قہوہ اور چائے چلی۔ اسی اثنا میں اذان ہو گئی۔
سب نے جماعت سے نماز پڑھی، پھر برابر کے خیموں میں چلے گئے جہاں
پہلے سے دستر خوان بچھے تھے اور عربی اور اسلامی طریقہ پر زمین پر بیٹھ کر
کھانا کھایا گیا۔ متعدد اقسام کے نہایت لذیذ کھانے تھے۔ کھانے کے
بعد قہوہ کا دور چلا اور پھر سب وہاں سے رخصت ہو کر ہوٹل واپس آ گئے۔

۳۱ر اکتوبر: عصر کے بعد الوداعی اجلاس ہوا، جس میں تو متعدد
قراءت پڑھی گئیں۔ وزیر تعلیم سعودی عرب اور مدیر جامعہ امام محمد ابن سعود
الاسلامیہ نے تقریریں کیں۔ وفود کی طرف سے بھی تقریریں ہوئیں۔ ایک
قصیدہ ہوا اور شیخ احمد بن باز کی دعا پر جلسہ ختم ہوا۔

بعد عشاء جامعہ کے طلباء کی طرف سے جلسہ اور کھانے کی دعوت تھی
کھانے کے بعد یہ مجلس چار بجے ختم ہوئی □ (روزنامہ الجم



نرخ کی لائن پر زیر ترقی ممالک کی اقتصادی گاڑی کی مشکل چڑھائی

صنعتی تمدن کا حکمراں: تیل

عربوں کے پاس علاؤالدین کا چراغ ہے، وہ جب چاہتے ہیں اس چراغ کے ذریعہ افراط زر کے دیو کو بلا لیتے ہیں!



"تیل کی قیمت میں اگر دس فی صد بھی اضافہ ہوا تو ہندستان کا درآمدی بل ۱۲۵ کروڑ روپے سالانہ تک بڑھ جائے گا" کے. ڈی. مالویہ (مرکزی وزیر پٹرولیم) نے کہا۔ ہندستان میں تیل کا موجودہ خرچ سالانہ ۲۴ ملین ٹن ہے۔ تیل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں نے ان تمام ملکوں کی اقتصادیات کو شدید طور پر متاثر کیا ہے جو تیل کے معاملہ میں خودکفیل نہیں ہیں، جن کو ضرورت ہے کہ اپنی صنعتی اور تمدنی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لئے باہر سے تیل خریدیں۔

اقوام متحدہ میں امریکی ترجمان نے کہا کہ تیل کی قیمتوں میں مزید اضافہ کے لئے اوپیک ممالک کے پاس کوئی جواز نہیں۔ اگر وہ موجودہ قیمتوں کو برقرار رکھیں جب بھی، اندازہ کے مطابق ۱۹۷۷ میں ان کے پاس تقریباً ۵۰ بلین ڈالر فاضل موجود ہوں گے۔ □

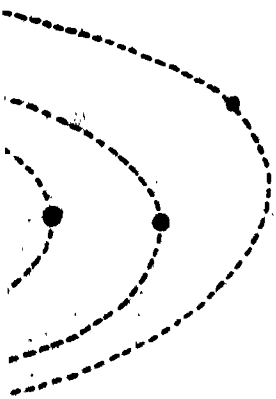
کائنات کا عظیم اور حیرت انگیز کارخانہ گواہی دے رہا ہے کہ اس کا کوئی چلانے والا ہے

آدمی اگر کائنات کی وسعتوں پر غور کرے تو اس کو اپنا وجود اتنا حقیر نظر آئے گا کہ اپنی بڑائی کا کوئی بھی خیال اس کو مضحکہ خیز حد تک بے معنی معلوم ہوگا۔

نظام شمسی، اجرام سماوی کے اس مجموعہ کو کہتے ہیں جس کے درمیان ایک روشن ستارہ ہو اور اس کے گرد غیر روشن سیارے مخصوص مدار میں گھوم رہے ہوں۔ معلوم نظام شمسی ابھی تک صرف ایک ہے جس میں ہماری زمین واقع ہے۔ تاہم فلکیات دانوں کا قیاس ہے کہ اس قسم کے مزید ایک ملین نظام شمسی کائنات میں ہو سکتے ہیں۔

نظام کہکشاں اس مجموعہ کو کہتے ہیں جس میں روشن ستارے ایک مخصوص نظام کے اندر گردش کر رہے ہوں۔ ہماری قریبی کہکشاں جو رات کے وقت سفید دھاری کی شکل میں دکھائی دیتی ہے، اس کے اندر تقریباً ایک کھرب ستارے ہیں، ہمارا نظام شمسی اسی میں واقع ہے۔

سورج ہماری کہکشاں کی پلیٹ پر اپنے تمام سیاروں کو لئے ہوئے ۱۷۵ میل فی سکنڈ کی رفتار سے دوڑ رہا ہے۔ ہماری کہکشاں اتنی وسیع ہے کہ اس تیز رفتاری کے باوجود کہکشاں کے مرکز کے گرد ایک چکر پورا کرنے میں ہمارے نظام شمسی کو ۲۰ کروڑ سال لگ جاتے ہیں۔ اس قسم کی ایک بلین سے زیادہ کہکشائیں وسیع کائنات میں پائی جاتی ہیں اور ہر کہکشاں کے اندر



اس خاکہ میں درمیان میں سورج ہے۔ اس کے گرد نظام شمسی کے نو سیاروں کو بیضوی دائرہ میں گردش کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ سورج سے ان سیاروں کا فاصلہ بالترتیب یہ ہے:

عطارد (مرکری)	۳۶ ملین میل
زہرہ (وینس)	۶۷ "
زمین	۹۳ "
مریخ (مارس)	۱۴۲ "
مشتری (جوپیٹر)	۴۸۴ "
زحل (سیٹرن)	۸۸۶ "
یورینس	۱۷۹۰ "
نیپچون	۲۸۰۰ "
پلوٹو	۳۶۸۰ "

کئی ملین انتہائی بڑے بڑے ستارے ہیں۔

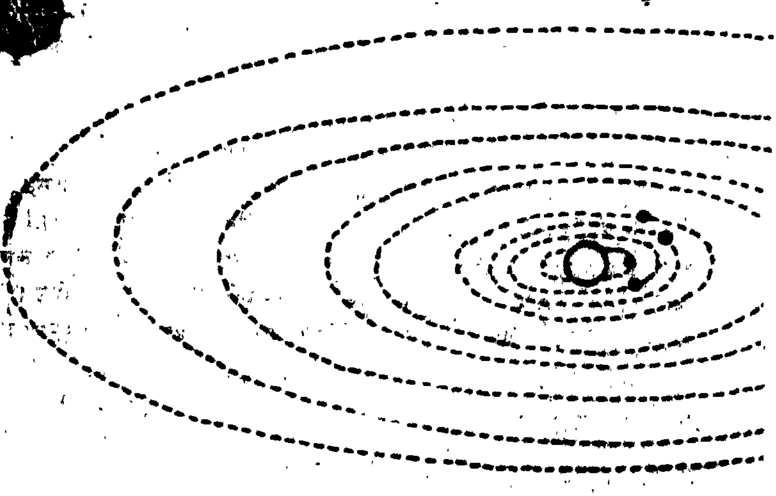
کہکشاں کے اندر ستارے اتنے بعید فاصلوں پر واقع ہیں کہ ہمارے سورج سے قریب ترین ستارہ کی روشنی جو ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکنڈ کی رفتار سے سفر کر رہی ہو زمین تک اس کو پہنچنے میں چار سال سے بھی زیادہ وقت لگ جاتا ہے۔

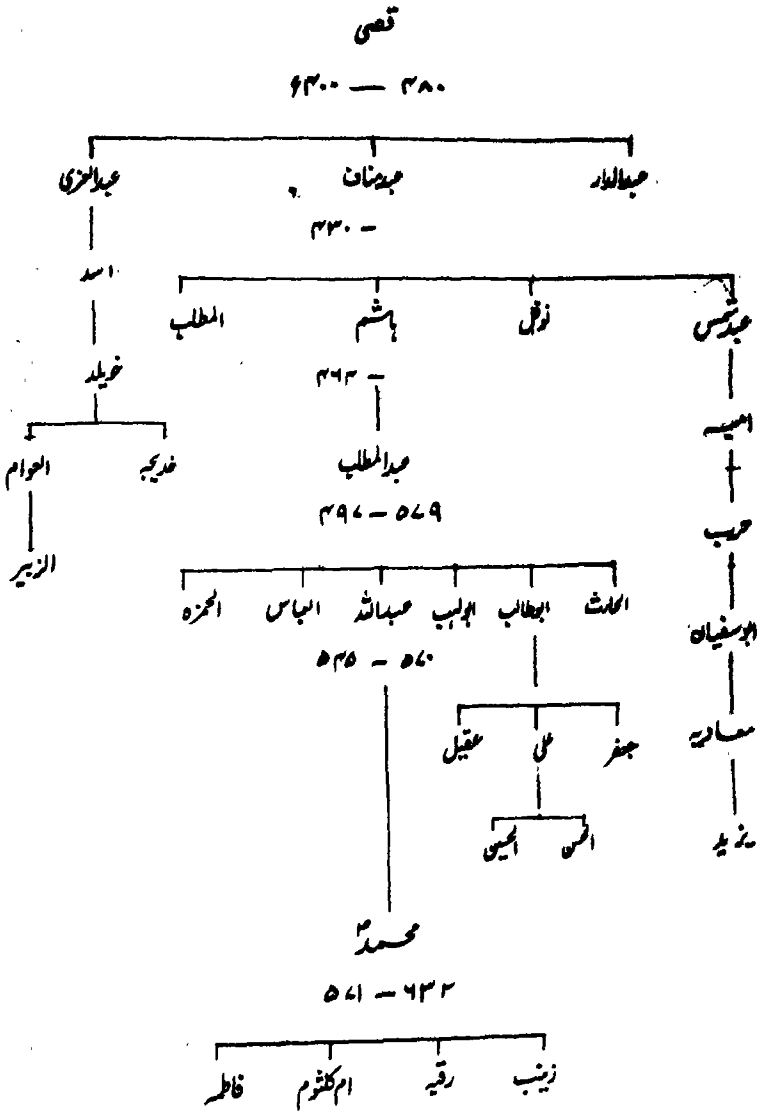
اجرام سماوی کے اتنے بڑے نظام کو کیا چیز تھامے ہوئے ہے، فلکیات دانوں کا کہنا ہے کہ وہ اجرام سماوی کی باہمی کشش ہے۔ ہماری کہکشاں کی چوڑائی فلکیاتی پیمائش کے قاعدہ کے مطابق ایک ملین سال نور ہے یعنی ۵،۸۶۵،۶۹۲،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ میل۔ سورج اس کہکشاں کا نسبتاً چھوٹا ستارہ ہے جس کی حرارت چودہ ملین ڈگری سنٹی گریڈ ہے۔ سورج کے گرد نو سیارے ہیں۔ اس کے علاوہ بے شمار چھوٹے چھوٹے سیارچوں کا ایک حلقہ بھی اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ اکثر سیاروں کے ساتھ چاند بھی ہیں۔ ہماری زمین کا چاند ۱، مریخ ۲، جوپیٹر ۱۳، سیٹرن ۱۰، یورینس ۵، نیپچون ۲۔ اس کے علاوہ ایک لاکھ ملین وزدار ستارے بھی نظام شمسی کا حصہ ہیں۔ مریخ کا فاصلہ زمین سے ۴۹ ملین میل ہے۔

سورج کا قطر ۸۶۴،۰۰۰ میل ہے۔ نظام شمسی کے مادہ (ماس) کا ۹۹ فی صد حصہ سورج پر مشتمل ہے۔ سورج کا مادہ زمین کے مادہ سے ۳۰۰،۰۰۰ گنا زیادہ ہے۔

اندرونی سیارے (مرکری، وینس، مریخ، زمین) تقریباً ایک حجم کے ہیں۔ اس کے بعد چار بڑے سیارے جوپیٹر، سیٹرن، یورینس اور نیپچون ہیں۔ پلوٹو، جو سب سے آخر کا سیارہ ہے، اس کا حجم تقریباً زمین کے برابر ہے۔

کائناتی گردش کا نظام ناقابل قیاس حد تک حیرت انگیز ہے۔ چاند اپنے سیارے کے گرد گھوم رہا ہے۔ سیارہ سورج کے گرد، سورج اپنے پورے نظام کو لئے ہوئے کہکشاں کی پلیٹ پر گردش کر رہا ہے۔ پھر کہکشاں اپنی ساری وسعتوں اور بے شمار ستاروں کے ساتھ وسیع تر دائرہ میں گردش کر رہی ہے۔ یہ گردش اتنی عجیب ہے کہ بعض اوقات ایک پورا کہکشانی نظام گردش کرتے ہوئے دوسرے کہکشانی نظام کے اندر سے گزر جاتا ہے اور کوئی حادثہ پیش نہیں آ[illegible]





محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان

ایک خاندانی جھگڑا جو پوری تاریخ پر چھا گیا

جنگ قادسیہ (۱۴ ھ) میں جب دونوں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے کھڑی تھیں، ایرانی لشکر سے ان کا ایک مشہور پہلوان گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا۔ اسلامی لشکر سے عاصم بن عمرو اس کے مقابلہ کے لئے باہر آئے۔ ابھی ایک دو وار ہی ہوئے تھے کہ ایرانی شہ سوار بھاگا۔ عاصم بن عمرو نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ اپنے لشکر کی صف اول کے قریب تک جا چکا تھا کہ عاصم بن عمرو پہنچ گئے۔ انھوں نے اس کے گھوڑے کی دم کو پکڑ کر اس کو روک لیا۔ سوار کو اس کے اوپر سے اٹھایا اور زبردستی اپنے گھوڑے پر اپنے آگے بٹھا لیا اور اس کے بعد گھوڑا دوڑاتے ہوئے اپنے لشکر میں آگئے۔

اس قسم کے بہادر لوگ صفین و جمل (۳۶ ھ) کی باہمی لڑائیوں میں ۹۰ ہزار کی تعداد میں کٹ گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر خلافت راشدہ کے آخر میں آپس کی لڑائیاں شروع نہ ہو گئی ہوتیں تو طاقت و قوت کا بے پناہ سیلاب جو عرب سے اٹھا تھا، ایشیا، افریقہ اور یورپ کے تمام علاقوں کو توحید کا علاقہ بنا دیتا۔ صرف آسٹریلیا اور امریکہ ہی عملی طور پر اس سے مستثنیٰ رہ جاتے جو وسیع سمندروں کے دوسری طرف قدیم زمانہ میں ناقابل عبور تھے۔

وہ کیا چیز تھی جس نے اس سیلاب کے رخ کو باہر کے بجائے خود اپنی طرف موڑ دیا۔ یہ کہنا بڑی حد تک صحیح ہوگا کہ یہ ایک خاندانی جھگڑا تھا جس نے بڑھ کر قومی جھگڑے کی شکل اختیار کر لی اور بالآخر ساری اسلامی تاریخ پر چھا گیا۔

۲۰۷ء میں سیل عرم سے یمن میں عام تباہی آئی۔ یہاں کے باشندوں نے اپنے وطن کو چھوڑ کر دوسرے علاقوں کا رخ کیا۔ ان میں سے قبیلہ خزاعہ مکہ آیا اور حضرت اسمٰعیل (۱۹۳۷-۲۰۷۴ ق م) کی اولاد کو بے دخل کر کے مکہ پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد مقامی باشندے ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ تقریباً ڈھائی سو سال تک قبیلہ خزاعہ مکہ پر قابض رہا۔ قصی بن کلاب پہلا شخص ہے جس نے قریش کی بکھری ہوئی طاقت کو دوبارہ منظم کیا اور ۴۴۰ء میں لڑ بھڑ کر خزاعہ سے مکہ کی سرداری چھین لی۔

قصی نے خانہ کعبہ کی مرمت کی۔ رفادہ، سقایہ، حجابہ اور قیادہ کے عہدے قائم کئے۔ قومی نشان کے طور پر لوا ربنایا۔ قومی اسمبلی قائم کی جس کو دار الندوہ کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد قدرتی طور پر قصی کو تمام قبائل قریش کی سرداری حاصل ہو گئی۔

قصی کے بعد قریش کی سرداری ان کی اولاد میں جاری رہی۔ تاہم تیسری نسل میں قصی کے خاندان میں سرداری پر جھگڑا شروع ہو گیا۔ قصی کا پوتا ہاشم نہایت لائق اور شاندار شخصیت کا آدمی تھا۔ اس نے تجارت کر کے نہ صرف اپنے مال میں اضافہ کیا بلکہ قریش کو بھی بین اقوامی تاجر کے مقام پر پہنچا دیا۔ اس نے اپنے بھائیوں کی مدد سے شاہ غسان، شاہ حبش، امرائے یمن اور عراق و فارس کی حکومتوں سے تجارتی معاہدے کئے اور خصوصی مراعات حاصل کیں۔ وہ قیصر روم سے یہ پروانہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ قریش کا تجارتی مال شام و فلسطین میں بغیر کسی ٹیکس کے

وہاں ہوتا رہے گا۔ اب قریش کے تجارتی قافلے گرمی کے زمانہ میں شام کی طرف جانے لگے، کیونکہ وہ ٹھنڈا اور شاداب علاقہ تھا اور جاڑے میں یمن کی طرف سفر کرنے لگے جو گرم علاقہ ہے۔ (قریش - ۲) ہاشم کے حسن تدبر سے قریش کی اقتصادیات نے بہت تیزی سے ترقی کی اور نتیجۃً سارے قبیلہ میں ان کی عظمت قائم ہوگئی۔

ہاشم کی اس عزت و ترقی نے خاندان کی دوسری شاخ کے اندر ان کے خلاف منافست پیدا کر دی۔ ہاشم کے بھائی عبد شمس اور ان سے زیادہ ان کے بیٹے امیہ کو ہاشم کی سرداری ناپسند تھی۔ امیہ نے اس کو اپنے چچا سے چھیننے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے حتی کہ اسی رنج و غم میں وہ ایک بار مکہ چھوڑ کر شام چلے گئے اور دس سال تک وہاں پڑے رہے۔

ہاشم کے بعد دوبارہ ان کے بیٹے عبد المطلب اپنی وجاہت و صلاحیت کی بنا پر قریش کے سردار ہوگئے اور امیہ کی اولاد اس سے محروم رہی۔ اس طرح سرداری قصی کی ہاشمی شاخ میں چلتی رہی اور اس کی اموی شاخ کو حاصل نہ ہو سکی۔

۸ھ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار اصحاب کے ساتھ فتح مکہ کے لئے روانہ ہوئے تو آپ نے ایک موقع پر اپنے چچا عباس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ابوسفیان کو لے کر راستہ میں کسی گھاٹی پر بیٹھ جائیں تاکہ ابوسفیان، جو بدر کے بعد قریش کے سب سے بڑے لیڈر تھے، اسلامی فوج کو گزرتے ہوئے دیکھیں۔ حضرت عباس نے ایسا ہی کیا۔ جب وہ ابوسفیان کو لے کر ایک تنگ پہاڑی راستہ کی طرف گئے اور وہاں بیٹھنے کے لئے کہا تو ابوسفیان کو اندیشہ ہوا۔ ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا :

غدراً یا بنی ھاشم — بنی ہاشم! کیا غداری کا ارادہ ہے۔

اس کے بعد جب دس ہزار کی تعداد میں مسلح فوج سامنے سے گزری، تو ابوسفیان پر ہیبت طاری ہوگئی۔ انھوں نے کہا:

لقد اصبح ملک ابن اخیک الغداۃ عظیما — تمہارے بھتیجے کی حکومت آج بہت عظیم ہوگئی۔

خاندان عبد مناف کی ان دو شاخوں میں یہ چپقلش اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ زمانۂ جاہلیت میں یمن کا ایک شخص کچھ سودا لے کر مکہ آیا۔ ایک شخص نے اس کا سودا خریدنے کے لئے لیا اور پھر اس کو نہ قیمت دی اور نہ سودا واپس کیا۔ وہ ایک ٹیلہ پر چڑھ کر چیخنے لگا۔ یہ واقعہ عرب آن کے انتہائی خلاف تھا، چنانچہ بنو ہاشم کے کچھ لوگ اس کی مدد کے لئے اٹھے۔ انھوں نے آپس میں عہد کیا کہ مکہ میں اگر کسی مسافر اور اجنبی کو ستایا گیا تو وہ اس کی پوری حمایت کریں گے۔ بنو ہاشم کے ساتھ اس معاہدہ میں بنو اسد، بنو زہرہ، بنو تیم بھی شریک ہوگئے۔ مگر عبد شمس کا خاندان بنو ہاشم کے خلاف اپنی جلن کی وجہ سے معاہدہ میں شریک نہیں ہوا۔

اس طرح کے واقعات جو تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں، وہ بنو امیہ اور بنو ہاشم کے درمیان اسی خاندانی کشمکش کو ظاہر کرتے ہیں۔

قصی بن کلاب کے خاندان کی دو شاخوں میں سرداری کی منافست جاری رہی، اکثر چھوٹے چھوٹے جھگڑے بھی ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ہاشم کے خاندان میں پیغمبر پیدا ہوگئے۔ اب اموی خاندان کی جلن اپنے شباب پر پہنچ گئی۔

پہلے انھوں نے نبوت کی مخالفت کرکے بنی ہاشم کو زیر کرنا چاہا۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام مخالفین کو شکست دے کر مکہ پر قبضہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ظاہر ہو گیا کہ نبوت کی مخالفت کی فضول ہے۔ ابوسفیانؓ اور ان کے لڑکے معاویہ اور دوسرے امویوں نے اسلام قبول کر لیا۔ تاہم یہ احساس لوگوں کے اندر باقی رہا کہ نبوت کے بعد سیاسی اقتدار بنی ہاشم کے ہاتھ میں نہ جانے دیں گے۔

حضرت عمرؓ اپنے بعد علی بن ابی طالب کو خلافت کے لئے موزوں ترین شخص سمجھتے تھے۔ مگر اسی اندیشہ کی بنا پر وہ آنجناب کو نامزد نہ کر سکے۔ حضرت عثمان جو خاندان امیہ کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے، ان کی شہادت کے بعد جب حضرت علیؓ کو خلیفہ بنایا گیا تو بنو امیہ کے لئے یہ بالکل ناقابل برداشت تھا۔ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد قصاص کے مسئلہ نے ان کو فوری طور پر ایک کامیاب سیاسی حربہ دے دیا۔ اس جذباتی نعرہ پر انھوں نے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو اپنے گرد اکٹھا کر لیا۔ اگرچہ وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے کہ خلیفہ چہارم کو منصب خلافت سے ہٹا دیں۔ تاہم معاویہ بن ابی سفیان بن حرب بن امیہ نے اپنی گورنری سے فائدہ اٹھا کر مملکت اسلامی کے نصف سے زیادہ حصہ کو سیاسی طور پر کاٹ لیا۔ حضرت عثمان کی شہادت کے نام پر عوام میں ایسی آگ بھڑکائی کہ کچھ لوگوں نے مجنونانہ طور پر حضرت علی کو قتل کر دیا۔ جنگ جمل اور جنگ صفین جس میں ۹۰ ہزار مسلمان کٹ گئے اور دس سال کے لئے اسلامی توسیع کا سیلاب رک گیا، وہ دراصل امویوں اور ہاشمیوں کی اسی خاندانی لڑائی کا شاخسانہ تھا جس نے پوری ملت مسلمہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

حسن بن علی اس راز کو اچھی طرح سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ امیر معاویہ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو گئے۔ انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی حسین بن علی کو بھی مشورہ دیا کہ خلافت کے معاملہ سے بالکل الگ ہو جائیں کیونکہ لوگ اس کے لئے تیار نہیں ہیں کہ نبوت اور خلافت دونوں کو علوی خاندان میں جمع ہوتا برداشت کر لیں۔ مگر حضرت حسین کی رائے یہ تھی کہ حق کے لئے جان دے دینا باطل کے آگے سر جھکانے سے زیادہ بہتر ہے۔ انھوں نے خلافت کی راہ میں اپنی جان دے دی۔ یہ واقعہ ۶۱ھ کا ہے۔

اس کے بعد اموی حکومت قائم ہو گئی۔ مگر بنو امیہ کو بنو ہاشم کے خلاف جو بغض و عناد تھا، وہ ان کے انتظام ملکی میں ظاہر ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ ان کا ذہن یہ بن گیا کہ ہاشم کی اولاد کا خاتمہ کر دو تاکہ مستقبل میں کوئی خلافت کا دعوے دار باقی نہ رہے۔ ان وجوہ سے وہ فضا پیدا نہ ہو سکی جس میں بنو ہاشم اپنی سیاسی حق تلفی کو بھول جاتے۔ اندر اندر ان کے دل میں مخالفت کی آگ سلگتی رہی۔ یہاں تک کہ ۱۳۲ھ کے خاتمہ نے یہ دوسرا انقلاب دیکھا کہ بنو عباس نے ایرانیوں کی مدد سے بنو امیہ کا خاتمہ کر دیا۔

بنو امیہ کا فتنہ انتہائی شدید تھا۔ مگر وہ تمام تر سیاسی تھا۔ اس لئے سیاست کے ساتھ اس کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر بنو ہاشم سے یہ جوابی غلطی ہوئی کہ خلافت کو اپنا حق ثابت کرنے کے لئے انھوں نے خلافت کو عقیدہ کا مسئلہ بنا دیا۔ اس غلطی نے ایک سیاسی قضیہ کو مذہبی حیثیت دے دی اور اس امکان کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا کہ دوسرے سیاسی

جھگڑوں کی طرح یہ جھگڑا صرف وقتی نقصان پہنچائے اور بعد کی نسلوں کے لئے محض تاریخ کا موضوع بن کر رہ جائے۔ سیاست کو مذہب بنانے کی اس غلطی نے اسلام کو جو نقصانات پہنچائے ان کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر وضع حدیث کا فتنہ سب سے پہلے اسی محرک کے تحت شروع ہوا۔ بے شمار حدیثیں دونوں طرف سے گھڑی گئیں ایک طرف جو ہاشم نے حضرت علی کی فضیلت میں یہ حدیث نکالی:

انا مدینۃ العلم وعلی بابھا — میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں

دوسری طرف فریق ثانی نے ایک روایت گھڑی اور کہا کہ پوری حدیث دراصل اس طرح ہے:

انا مدینۃ العلم وابوبکر اساسھا وعمر حیطانھا وعثمان سقفھا وعلی بابھا

میں علم کا شہر ہوں، ابوبکر اس کی بنیاد ہیں، عمر اس کی دیوار ہیں، عثمان اس کی چھت ہیں، علی اس کا دروازہ ہیں

اس قسم کی چیزوں سے اسلام کو جو عملی نقصان پہنچا، اس کی تلافی اب ممکن نہیں۔ تاہم یہ اللہ کا بہت بڑا فضل ہے کہ اس نے اپنی رحمت خاص سے قرآن کو محفوظ کر دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان جھگڑوں اور ان کے پیدا کردہ فتنوں میں دین حق گم ہو جاتا اور اللہ کے بندے قیامت تک کے لئے بے آمیز سچائی کو جاننے سے محروم ہو جاتے ■

حدیث

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

حدیث نبوی کو ہم ایک طرح کا روزنامچہ اور اس ۲۳ سالہ زندگی کا بولتا ہوا مرقع کہہ سکتے ہیں جو آپ نے نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد اس کرۂ ارض پر گزاری۔ یہ محتاط ریکارڈ ہمیں بتاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح زندگی گزارتے تھے اور آپ کے شب و روز کے معمولات کیا تھے۔ اسی طرح ہم اس سے اخلاق نبوی کی باریکیاں عادات و رجحانات، جذبات و خیالات، قول و عمل کی وہ تفصیلات جان سکتے ہیں جو ہم عہد ماضی بلکہ حال کی بھی بہت سی معاصر شخصیتوں کے متعلق نہیں جان سکتے۔ اس کے ذریعہ کوئی بھی انسان اپنے نبی کو اس طرح جان پہچان سکتا، آپ کی صحبت سے مستفید اور آپ کے انفاس قدسیہ سے فیض یاب ہو سکتا ہے کہ گویا وہ آپ کی مجلس میں حاضر ہے اور وہ آپ کی باتیں سن رہا ہے اور آپ کے ساتھ رہ رہا ہے۔ یہ طریقہ حفاظت و تعارف ان تمام خطرات و مفاسد سے پاک ہے جو تصویر کشی اور مجسمہ سازی میں پائے جاتے ہیں اور جن کی وہ پچھلی امتیں بری طرح شکار ہوئیں، جنھوں نے اپنے پیغمبروں اور روحانی پیشواؤں کی یاد قائم رکھنے کے لئے تصویر کشی اور مجسمہ تراشی کا سہارا لیا اور بالآخر کھلی بت پرستی میں ملوث ہو گئیں۔ (منصب رسالت، ۲۱۱)

زیادہ دودھ حاصل کیجئے

ایک گائے کے کئی بچے ہوں تو سب میں دودھ یکساں نہیں ہوگا۔ کسی میں کم ہوگا، کسی میں زیادہ۔ یہ ایک عام مشاہدہ ہے۔ اگر آپ ایک گائے کے بچوں میں سے زیادہ دودھ والے بچے کا انتخاب کریں اور پھر اس کے بعد اس کے بھی مختلف بچوں میں سے جس کا دودھ زیادہ ہو، اس کو لیں تو کئی نسلوں کے بعد شاید آپ ایک ایسی گائے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں جو ابتدائی ماں کے مقابلہ پر دگنا دودھ دیتی ہو۔ تاہم اس عمل میں آپ کو ایک سو برس لگ جائیں گے۔ مگر پنجاب اگریکلچرل یونیورسٹی میں جو تجربے کئے گئے ہیں ان سے معلوم ہوا ہے کہ یہی مقصد دو نسلی گائے (CROSS-BRED) کے ذریعے صرف چھ مہینے میں حاصل کیا جا سکتا ہے۔

لیکن گائے سے زیادہ دودھ لینے کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں، اسی کے ساتھ خوراک کا مسئلہ بھی نہایت اہم ہے۔ خوراک کا مطلب یہ نہیں کہ گھاس بھوسہ کھلا کر کسی نہ کسی طرح آپ جانور کا پیٹ بھر دیں۔ اس کے لئے متوازن خوراک انتہائی ضروری ہے۔ یعنی ہری گھاس، بھوسہ، دانہ اور اسی کے ساتھ ضروری معدنیات۔ مثلاً گائے کی خوراک میں اگر آپ زنک شامل نہ کریں تو اس کے دودھ میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح کیلشیم اور فاسفورس وغیرہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ ایک ہیکٹر زمین سے ۱۰ دودھیلے مویشیوں کے لئے سال بھر تک متوازن چارہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

خدا نے اپنی اس دنیا میں انسان کے لئے بے حساب امکانات رکھ دیئے ہیں۔ مگر انسان اپنی بے دانشی یا محنت کی کمی کی وجہ سے ملے ہوئے امکانات کا پورا فائدہ نہیں اٹھا پاتا

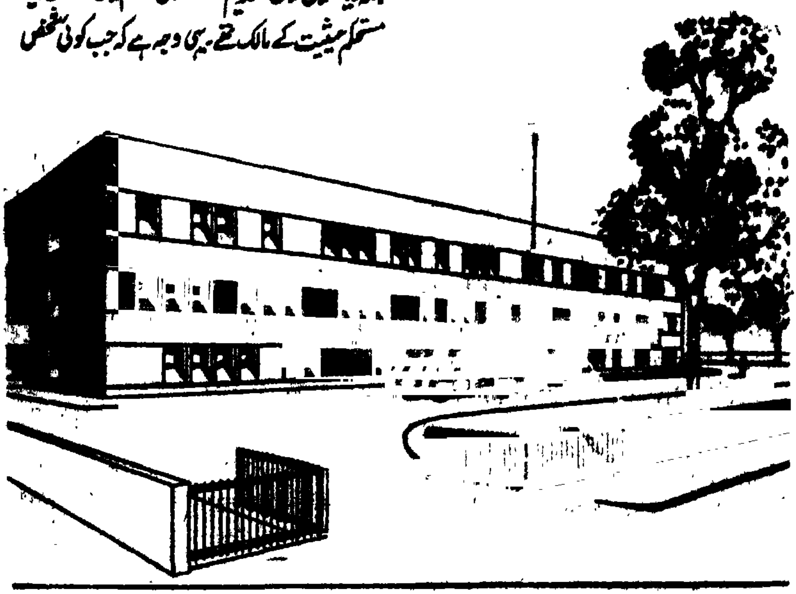
مسٹر بی۔ ایم۔ برلا نے ایک بار اپنی تقریر میں کہا تھا کہ اگر پیداوار بڑھانے کی کوشش کی جائے تو موجودہ صدی کے خاتمہ تک ہندستان دنیا کے سب سے زیادہ مضبوط اور خوش حال ملکوں کی فہرست میں شامل ہو سکتا ہے اور اس کی فی کس آمدنی جو اس وقت صرف ایک سو ڈالر سالانہ ہے، بڑھ کر تین سو ڈالر سالانہ تک پہنچ سکتی ہے۔ انھوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ جاپان کے پاس اگرچہ لوہا اور کوئلہ نہیں۔ مگر ۱۹۴۷ میں اس کی لوہے کی پیداوار نصف ملین ٹن تھی اور ۱۹۷۶ میں ۱۲۰ ملین ٹن پہنچ چکی ہے جب کہ ہندستان کے پاس ہر قسم کے خام ذخائر ہیں۔ پھر بھی یہ حال ہے کہ ۱۹۴۷ میں اس کی لوہے کی پیداوار ۱ء۲۵ ملین ٹن تھی اور آج ۵ ملین ٹن ہے۔ (ہندستان ٹائمس، ۵ مئی ۱۹۷۶)

حقیقت یہ ہے کہ اصل مسئلہ وسائل کا نہیں بلکہ وسائل کو استعمال کرنے کا ہے۔ کسی شخص یا قوم میں کرنے کا جذبہ پوری طرح ابھر آئے تو صفر سے شروع کر کے بڑی بڑی کامیابیوں تک پہنچنا ممکن ہو سکتا ہے، اور اگر کرنے کا جذبہ نہ ہو تو وسائل کی افراط کے درمیان بھی کسی کامیابی کی امید نہیں کی جا سکتی۔ ہر آدمی اپنی کامیابی کا راز خود اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے، اگرچہ اپنی بے خبری سے وہ اس کو اپنے باہر ڈھونڈ رہا ہے ◻

زرعی دور کے زمین دار صنعتی دور میں بے زمین ہوکر رہ گئے

دل کے مریضوں کے لئے ہندوستان کا دوسرا سب سے بڑا مستقل میڈیکل یونٹ کان پور میں کھلا ہے۔ ۷ نومبر ۱۹۷۶ کو اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ شری نرائن دت تیواری نے اس کا افتتاح کیا۔ سنگھانیا انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی کی اس تین منزلہ عمارت پر ۲۱ لاکھ روپے خرچ ہوئے ہیں۔ یہ رقم اس کو جے۔ کے ٹرسٹ نے فراہم کی تھی۔ یہ ٹرسٹ شری لکشمی پت سنگھانیا (1910-1974) نے قائم کیا تھا جو ہندوستان کے بڑے صنعت کاروں میں شمار ہوتے ہیں۔

یہ اس قسم کے دوسرے بے شمار واقعات میں سے نسبتاً ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ اس تازہ مثال کو ہم نے یہ واضح کرنے کے لئے دہرایا ہے کہ موجودہ زمانہ میں کیا تبدیلی ہوئی ہے۔ پچاس برس پہلے ملک کی اقتصادی بنیاد زراعت پر قائم تھی۔ مسلمانوں کے پاس بہت بڑی بڑی زمینیں بلکہ ریاستیں تھیں۔ قدیم اقتصادی نظام میں مسلمان ایک مستحکم حیثیت کے مالک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص



کی نئی صنعتی نظام کے لئے وقت گزرنا اس کو ہر قسم کے ذرائع و وسائل فراہم ہو جاتے تھے۔ جاگیردارانہ نظام بڑے بڑے ادارے اسی قدیم دور میں قائم ہوئے اور زمینداری متعلقہ داروں اور نوابوں کے طبقہ ہی نے ان کو زمین اور سرمایہ فراہم کیا تھا۔

آزادی کے بعد ایک نیا انقلاب آیا۔ ملک زرعی دور سے نکل کر صنعتی دور میں داخل ہو گیا۔ مسلمان مختلف وجوہ سے، اس دور میں اپنی جگہ نہ بنا سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کوئی مسلمان صنعتکار اگر کسی نئی منصوبہ کو لے کر اٹھتا ہے تو اس کا منصوبہ "مفلس کے چراغ" کی طرح ٹمٹماتا رہتا ہے یہاں تک کہ دھیرے دھیرے بجھ جاتا ہے۔ دوسری طرف جن قوموں نے صنعتی نظام میں اپنی جگہ بنائی ہے ان کے اجتماعی منصوبوں کو غذا دینے والے فنڈ ان کے قریب ہی مل جاتے ہیں۔ ان کا منصوبہ نہ تو فیل ہوتا اور نہ ان کو بھیک مانگنے کے لئے باہر جانا پڑتا۔

یہی تبدیلی قدیم دور میں اس وقت ہوئی تھی جب انسان شکار خوری کے دور سے نکل کر زراعتی دور میں داخل ہوا۔ اس وقت جن قوموں نے زمانہ کی تبدیلی کو سمجھا اور زراعت کے طریقے اپنائے، وہ دوسروں سے آگے بڑھ گئیں۔ جو قوموں نے اس فرق کو نہیں سمجھا اور شکار خوری کے طریقہ پر قائم رہیں، وہ زندگی کے میدان میں پیچھے دھکیل دی گئیں۔

جنگلی قبائل، جو اب بھی دنیا کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں وہ اسی گزرے ہوئے دور کی یادگار ہیں۔ یہ شکار اور مویشیوں پر گزر کرتے ہیں۔ متمدن زندگی میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ حتیٰ کہ اپنی تعلیمی کمی کی وجہ سے وہ اپنے اس پچھڑے پن کا شعور بھی نہیں رکھتے ◻

حکومت رہیں۔ گڈوانی ہندوستان کے شہری اور ملک کے ڈائرکٹر جنرل رہ چکے ہیں۔ انھوں نے اپنی ایک کتاب میں ٹیپو سلطان (۱۷۵۱-۱۷۹۹) کے حالات ناول کی شکل میں بیان کئے ہیں۔ اس تاریخی ناول کا نام ہے "ٹیپو سلطان کی شمشیر"۔ یہ کتاب انھوں نے ہندوستان، برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، ترکی اور ایران کے کتب خانوں اور عجائب گھروں میں اٹھارہ سال تک تحقیق کرنے کے بعد تیار کی ہے۔

مسٹر گڈوانی نے ٹیپو سلطان کو "سچا اور کامل قوم پرست" قرار دیا ہے۔ ان کا فیصلہ ہے کہ "ٹیپو اٹھارہویں صدی کا واحد ہندوستانی حکمراں ہے جس نے کسی بھی وقت اپنے ہم وطنوں کے خلاف جنگ میں انگریزوں کا ساتھ نہیں دیا"۔

مسٹر گڈوانی نے لکھا ہے کہ "۱۷۹۲ کے سرنگاپٹم کے محاصرہ میں ٹیپو نے انگریزوں کے ساتھ صلح کی جو بات چیت شروع کی وہ محض اپنے جنرل میر صادق کی پیدا کردہ غلط فہمی کی بنیاد پر تھی۔ حالانکہ اس وقت برطانوی جنرل کارنوالس اپنی فوجوں کے زبردست جانی نقصان کی وجہ سے پسپائی کی تیاریوں میں مشغول تھا"۔

سلطان ٹیپو کا یہ اقدام وقتی طور پر اس کے جاسوسی نظام کی کمی کا سبب ہو سکتا ہے۔ تاہم ٹیپو کی شکست یا اٹھارہویں صدی کے آخر میں مشرقی اقوام کی مغربی اقوام کے مقابلہ میں پسپائی اس قسم کی کسی جزوی یا اتفاقی غلطی کا نتیجہ نہ تھی۔ یہ دراصل جدید قوتوں میں مغرب کی سبقت اور مشرق کی پسماندگی تھی جس نے ایک کو غالب اور دوسرے کو مغلوب کر دیا

دعوت الی اللہ

انسان کو خدا نے آزاد پیدا کیا ہے۔ مگر یہ آزادی لامحدود نہیں ہے۔ فرد کی آزادی موت کے وقت ختم ہو جاتی ہے اور بحیثیت مجموعی پوری نسل انسانی کی آزادی قیامت کے روز ختم ہو جائے گی۔ دنیا کی اس زندگی کے خاتمہ کے بعد آخرت کی زندگی شروع ہوتی ہے۔ وہاں انسان کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ ایک وہ جنھوں نے اپنی دنیوی زندگی کی آزادی کو خدا کی مرضی کے تابع رکھا ہوگا۔ ایسے لوگ جنتوں میں داخل کئے جائیں گے۔ دوسرے وہ لوگ جنھوں نے آزادی کے اس لمحہ کو خدا سے بے خوف ہو کر گزارا ہوگا۔ ایسے لوگ جہنم میں دھکیل دیئے جائیں گے۔ یہ تقسیم دائمی ہوگی۔ جہنم والے ہمیشہ کے لئے آگ میں جلتے رہیں گے۔ جنت والے ہمیشہ کے لئے آرام اور خوشی کے باغوں میں رہیں گے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی تقریباً سو برس کی زندگی ایک دائمی انجام پر ختم ہونے والی ہے۔ اور انجام بھی ایسا کہ یا تو شدید ترین عذاب ہے یا اعلیٰ ترین انعام — یہ صورت حال زندگی کے مسئلہ کو انتہائی سنگین بنا دیتی ہے۔ اس غیر معمولی سنگینی کے باوجود دنیا میں یہ تمام حقیقتیں آدمی کی نگاہ سے اوجھل رہتی ہیں۔ خدا، فرشتے، جنت، دوزخ، کسی بھی چیز کو وہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتا۔ اس لئے یہ ممکن تھا کہ قیامت میں جب تمام باتیں کھلیں تو آدمی یہ کہہ دے کہ خدایا، ہم کو معلوم ہی نہ تھا کہ زندگی کا بالآخر یہ انجام ہونے والا ہے۔ ایسا ہی تھا تو آپ نے ہم کو بتانے کا انتظام کیوں نہ کیا۔

مسئلہ کی اسی نزاکت کی وجہ سے خدا نے یہ اہتمام کیا کہ جب انسان کو پیدا کیا تو اس کے ساتھ پیغمبر بھی بھیجنے شروع کئے۔ ہر بستی اور ہر نسل میں خدا نے اپنے پیغمبر اٹھائے۔ ان کے اوپر وحی بھیجی اور کتاب اتاری۔ تاکہ وہ لوگوں کو کھول کھول کر زندگی کی حقیقت سے آگاہ کر دیں۔ یہ سلسلہ آدم سے لے کر مسیح تک چلتا رہا۔ یہاں تک کہ خدا نے فیصلہ کیا کہ آخری رسول بھیجے اور اس کے اوپر آخری آسمانی کتاب اتار کر اس کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دے۔ اس طرح ساتویں صدی سے انسانی تاریخ میں نیا دور شروع ہوا جب کہ خدا کی کتاب (قرآن) تو محفوظ حالت میں موجود ہے۔ مگر اس کو لوگوں کے سامنے بیان کرنے کے لئے پیغمبر نہیں آرہے ہیں۔

پھر ختم نبوت کے بعد جو انسان پیدا ہو رہے ہیں اور پیدا ہو کر مر رہے ہیں، ان کو باخبر کرنے کا کیا انتظام خدا نے کیا ہے۔ اس کا جواب امت محمدیہ ہے۔ اللہ کے آخری رسول نے اپنی امت پر دین کی گواہی دی۔ اس کے بعد امت محمدیہ کو ہمیشہ کے لئے ذمہ دار بنا دیا گیا کہ وہ قیامت تک پیدا ہونے والے لوگوں کے سامنے اس کی گواہی دیتی رہے، تاکہ قیامت کے روز جب قوموں کا مقدمہ پیش ہو تو وہ وہاں کھڑی ہو کر یہ کہہ سکے کہ ہم نے ان لوگوں تک حق کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ اس کے باوجود جن لوگوں نے اس کو اختیار نہیں کیا، وہ اپنے عمل کے خود ذمہ دار ہیں۔

یہی وہ کام ہے جس کو قرآن میں دعوت الی اللہ کہا گیا ہے۔ امت محمدیہ کی لازمی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کام کے لئے اٹھے۔ وہ کسی بھی حال میں اس سے بری الذمہ نہیں ہو سکتی۔ حتیٰ کہ ذاتی عبادت بھی، خواہ وہ کتنی ہی زیادہ مقدار میں ہو اس کو خدا کی پکڑ سے بچانے والی نہیں بنے گی۔ اگر وہ اس کام کو انجام نہ دے اور دنیا کی قوموں کو آنے والے دن سے نہ ڈرائے تو وہ بھی آخرت میں دوسری قوموں کے ساتھ پکڑی جائے گی۔ دوسری قوموں کا جرم اگر یہ ہوگا کہ انھوں نے قرآنی زندگی اختیار نہیں کی تو وہ اس بات کی مجرم قرار پائے گی کہ اس نے خدا کے بندوں کو خدا کی مرضی سے آگاہ نہیں کیا۔ اور دوسرا جرم، کسی بھی حال میں، پہلے جرم سے کم نہیں ہے۔

یہود جس جرم میں معتوب و مغضوب ہوئے، وہ یہی تھا کہ ان کے پاس خدا کی جو الہامی امانت تھی، اس کو انھوں نے چھپایا اور لوگوں کو اس سے خبردار نہیں کیا۔ تورات کے حاملین نے جو غلطی کی، وہی غلطی اگر قرآن کے حاملین کریں تو ان کے ساتھ کوئی دوسرا معاملہ نہیں ہوگا۔ خدا کا قانون ان کو بھی اسی طرح اپنی لپیٹ میں لے لے گا جس طرح وہ پچھلی قوموں کو لے چکا ہے۔ خدا کی کسی قوم کے ساتھ، خصوصی رشتہ داری نہیں ہے۔ اس سے بڑی کوئی بھول نہیں ہو سکتی کہ کوئی گروہ اپنے کو خدا کا خصوصی رشتہ دار سمجھ لے۔

مسلمانوں کو آج اہلِ عالم کے سامنے وہی فریضۂ دعوت انجام دینا ہے جو رسول نے اپنے زمانہ میں لوگوں کے اوپر انجام دیا تھا۔ یعنی قرآن کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانا۔ جس طرح زکوٰۃ کی ادائگی کے بغیر سارا مال ایک مسلمان کے لئے حرام رہتا ہے، اسی طرح اس فریضہ کو انجام دینے سے پہلے ہمارے لئے جائز نہیں ہے کہ ہماری زندگی میں کسی اور چیز کا حصہ ہو۔ ہمارے لئے کوئی خوشی اس وقت تک خوشی نہیں ہے اور کوئی عافیت اس وقت تک عافیت نہیں ہے جب تک ہم پیغام رسانی کے اس کام کو انجام نہ دے لیں یا کم از کم اس میں اپنے آپ کو لگائے ہوئے ہوں:

- ہمیں قرآن کا ترجمہ بہترین اہتمام کے ساتھ، دنیا کی تمام زبانوں میں فراہم کرنا ہے۔
- رسول اور اصحاب رسول کی زندگیوں پر جدید اسلوب میں کتابیں تیار کر کے تمام دنیا کے لوگوں تک پہنچانا ہے۔
- پیغمبر کے اقوال (حدیث) کے ترجمے دنیا کی تمام زبانوں میں تیار کرنا ہے۔
- اسلام کی تاریخ (نہ کہ فتوحات کی تاریخ) کو مرتب کر کے شائع کرنا ہے۔
- جدید زبان اور عصری اسلوب میں اسلام کو مدلل کرنا ہے۔
- وہ تمام عملی تدبیریں اختیار کرنا اور معاون ادارے قائم کرنا ہے جو کسی دعوت کو مؤثر انداز میں لوگوں تک پہنچانے کے لئے ضروری ہیں۔

پھر یہ کام سادہ معنوں میں محض تقریر و تحریر کا کام نہیں ہے۔ بلکہ خدا کی نمائندگی کا کام ہے۔ اس کو اسی اہتمام کے ساتھ کرنا ہے جس کا وہ متقاضی ہے۔ اس کے لئے ہم کو اسی قدر سنجیدہ بننا ہے جتنا ایک اہم سرکاری پیغام کو پہنچانے والا سنجیدہ ہوتا ہے۔ خیر خواہی اور دل فگاری کے ان تمام تقاضوں کو اس میں شامل کرنا ہے جو اس قسم کی سنگین خبر کے ایک حامل سے متوقع ہے۔ پھر یہ بھی لازمی ہے کہ جس جہنم سے آپ دوسروں کو ڈرانے جا رہے ہیں خود اس سے کانپتے ہوں، جس جنت کی خوش خبری دوسروں کو

وسیلہ ہو یہ خود اس کے مخالف ہوں۔ اگر یہ باتیں نہ ہوں تو آپ کی دعوت و تبلیغ ایک قسم کا مشغولہ ہوگا۔ کوئی بھی شخص اس کو اس قابل نہیں سمجھے گا کہ اس پر غور کرے۔

ہماری جدید تاریخ کا ایک بہت بڑا سوال یہ ہے کہ پچھلے تقریباً دو سو برس کے عرصے میں سارے عالم اسلام میں بے شمار بڑی بڑی تحریکیں اٹھیں۔ ان کو کام کرنے کے بے پناہ مواقع ملے۔ مگر ان کی کوششوں کے حقیقی نتائج صفر کی حد تک کم تھے۔ یہ ناکامی انھیں اس کے باوجود ہوئی کہ ان کو اپنے پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے ہر قسم کے بہترین وسائل ملے۔ علم و تقدس، اخلاص، شخصیت، قربانی، تعداد، سرمایہ، غرض وسائل و ذرائع کی کوئی ایسی قسم نہیں جو وافر مقدار میں ان کو حاصل نہ ہوئی ہو۔ مگر ان کی طوفان خیز کوششوں کے نتائج کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے صرف ملت کے قافلہ کو پیچھے لے جانے کا کام انجام دیا ہے۔

جو لوگ خدا کے قائل نہ ہوں، یا اس کو زندہ اور فعال نہ مانتے ہوں وہ اس واقعہ کی کوئی بھی خود ساختہ توجیہ کر سکتے ہیں۔ مگر خدا پر ایمان کا تقاضا ہے کہ اس پورے واقعہ کو ہم سنت اللہ کے تحت سمجھیں اور اس کو براہ راست خدائی معاملہ قرار دیں۔

اس حیثیت سے غور کیا جائے اور اس سلسلہ میں قرآن کو رہنما بنایا جائے تو بلا کسی اشتباہ کے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہماری تحریکوں کی ناکامی کی وجہ صرف یہ تھی کہ انھوں نے وہ اصل کام نہ کیا جس پر خدا نے امت مسلمہ کے لئے نصرت اجتماعی کا وعدہ فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری نصرت کا وعدہ اس شرط پر کیا ہے کہ ہم اس کی نصرت کریں یعنی بندوں کو خدا کے تخلیقی منصوبہ سے باخبر کرنے کے لئے خدائی مشن میں شریک ہوں۔ ہماری مہم دنیوی حقوق کے لئے احتجاج اور مطالبہ کی مہم نہ ہو بلکہ انذار آخرت کی مہم ہو۔ ہم دوسروں کے مقابلہ میں دعوتی تحریک اٹھائیں، نہ کہ سیاسی اور اقتصادی تحریک۔

یہی وہ اصل بات ہے جس نے موجودہ زمانے میں ہماری تمام کوششوں کو حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ کا مصداق بنا دیا ہے۔ ہم نے دنیوی سیاست کے لئے تحریکیں اٹھائیں، اس لئے آسمانی نصرت ہم کو حاصل نہ ہوسکی۔ اب اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنے آپ کو بربادیوں سے بچائیں تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ ہم اقوام عالم کے سامنے داعی بن کر کھڑے ہوں۔ سیاسی اور معاشی جھگڑے ترک کرکے جنت اور جہنم کو اصل مسئلہ بنائیں اور اس سے لوگوں کو آگاہ کریں۔ خدا کی نصرت کو کھینچنے کی واحد صورت یہی ہے۔ اور جب تک خدا کی نصرت حاصل نہ ہو، ہم کو کسی قسم کی کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔

اہل اسلام کی سربلندی، قرآن کی صراحت کے مطابق ایک خدائی انعام ہے۔ یہ ایک معلوم بات ہے کہ انعام کسی خاص عمل کے صلہ میں دیا جاتا ہے۔ پھر اہل اسلام کا وہ کون سا عمل ہے جو ان کو اس انعام کا مستحق بناتا ہے۔ وہ وہی ہے جو خود امت مسلمہ کی بعثت کا مقصد ہے۔ یعنی اہل عالم کے سامنے دین کی گواہی دینا۔ لوگوں کو خدا کی مرضی سے باخبر کرنا تاکہ آخرت میں کوئی خدا کے اوپر حجت قائم نہ کر سکے۔ یہی وہ عمل ہے جو اہل اسلام کے لئے خداوندی انعام کا استحقاق پیدا کرتا ہے۔ اگر ہم اس مطلوب کام کو نہ کریں تو دوسرا کوئی بھی ہنگامہ ہم کو انعام کا مستحق نہیں بنا سکتا۔ دوسرے ہنگامے تو سزا کا مستحق بناتے ہیں نہ کہ انعام کا۔

الرسالہ جنوری ۱۹۷۷

زندگی بعد موت

قرآن میں ہے، خدا تم کو اپنی نشانیاں دکھائے گا تو تم آخرت کو پہچان لوگے (نمل ۔ آخر) موجودہ زمانہ میں بعض مظاہر کے علمی مطالعے سے زندگی بعد موت پر جو دلائل قائم کیے جا رہے ہیں، وہ ممکن ہے اسی قسم کی نشانیوں کا ظہور ہو۔ ہماری موجودہ دنیا اور موت کے بعد کی دنیا کے درمیان شاید بعض روزن کھلے رکھے گئے ہوں تاکہ انسان اپنی زندگی کے اگلے مرحلہ میں داخل ہونے سے پہلے اس سے آگاہ ہو جائے ——

۲۰ جون ۱۹۷۶ کی ملاقات میں شری مول چند جی (پیدائش ۱۸۸۸) نے اپنی اہلیہ کا واقعہ بتایا۔ یہ پہلے ملتان کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۴۷ میں دہلی آگئے۔ اب ایسٹ پٹیل نگر نئی دہلی میں اپنے لڑکے کے ساتھ مقیم ہیں۔ ان کی اہلیہ شریمتی تکسی بائی (۱۸۹۰ — ۱۹۶۵) بڑی نیک اور مذہبی خاتون تھیں۔ وہ ملتان میں ۱۹۱۹ میں بیمار ہوئیں۔ حالت خراب ہوئی۔ یہاں تک کہ ایک روز نبض کی حرکت اور سانس رک گئی۔ لوگوں نے سمجھ لیا کہ ان کی موت ہو چکی ہے۔ ناک میں روئی ڈال دی گئی اور آخری رسوم کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ یہ کیفیت تقریباً پندرہ منٹ رہی۔ اس کے بعد اچانک ان کے اندر حرکت ہونے لگی، انھوں نے آنکھ کھول دی اور دوبارہ "زندہ" ہو گئیں۔

"میں کہاں تھی" انھوں نے اٹھتے ہی کہا۔ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ میں نے دیکھا کہ چند آدمی آئے ہیں اور مجھ کو لے کر ایک سرنگ جیسے گول راستہ سے روانہ ہوئے ہیں۔ چلتے چلتے ہم لوگ ایک جگہ پہنچے۔ یہاں راج دربار لگا ہوا تھا۔ اس پاس ایسے سندر باغیچے تھے، ایسے جو کبھی دیکھنے میں نہیں آئے تھے۔ وہاں ایک رعب دار آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ایک بہت بڑی کتاب پھیلی ہوئی تھی جس پر لوگوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ لانے والوں نے میرا نام بتایا تو وہ بولا "تم غلط آدمی لائے ہو، اس کو جلدی لوٹا دو"۔ اس طرح میں دوبارہ یہاں واپس آگئی۔

یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ "دوسری دنیا سے واپسی" کا یہ تجربہ بہت سے لوگوں کو پیش آیا ہے۔ حتی کہ جدید نفسیات میں یہ ایک مستقل مطالعہ کا موضوع بنتا جا رہا ہے۔ امریکہ میں بارہ سالہ لڑکی کا واقعہ ریکارڈ کیا گیا ہے۔ وہ ایک بار مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھی۔ اس نے حیرانی و پریشانی کے عالم میں اپنے والدین کو بتلایا: "موت کی وادی میں میری ملاقات اپنے چھوٹے بھائی سے ہوئی۔ وہ بڑی محبت کے ساتھ مجھ سے ملا۔ میں اس کی دنیا سے واپس نہیں آنا چاہتی تھی۔ مگر مجھ کو دوبارہ یہاں واپس بھیج دیا گیا"۔ اس نے کہا "یہ ملاقات میرے لیے بڑی عجیب تھی کیونکہ میرا تو ابھی تک کوئی بھائی نہیں"۔ لڑکی کے والدین یہ بات سن کر حیران رہ گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ لڑکی کا ایک بھائی تھا جو چھوٹی عمر میں مر گیا تھا اور لڑکی کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتلایا گیا تھا۔

موجودہ تجرباتی سائنس نے موت یا دوسری دنیا کے مسئلہ کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا تھا کہ وہ محض ایک تصوراتی چیز ہے، سائنسی طریقے سے اس کا مطالعہ نہیں کیا

جا سکتا۔ مگر موجودہ زمانہ میں ایسے واقعات سامنے آئے ہیں کہ علما کو اپنے سابقہ خیال پر نظر ثانی کرنی پڑی۔ حتی کہ موت اور دوسری دنیا کے مسئلہ کا سائنسی مطالعہ کرنے کے لئے موجودہ زمانہ میں ایک مستقل علم وجود میں آ گیا ہے۔ خصوصاً امریکہ میں اس موضوع پر زبردست تحقیقات ہو رہی ہے اور اس کے نتائج کتابوں اور رپورٹوں کی شکل میں شائع کئے گئے ہیں۔ جو امریکی علما اس موضوع کی تحقیق میں لگے ہوئے ہیں۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

لیڈی ڈاکٹر الزبتھ کیوبلر روز
ڈاکٹر ڈانیال فریڈم
ڈاکٹر رابرٹ گبن
ڈاکٹر چارلس گرفیلڈ
ڈاکٹر کارلس اوسس
ڈاکٹر رابرٹ ڈین ڈی کیسل
پروفیسر ایلنڈر ہیرالڈسن
پروفیسر آئن سٹیونسن

جو تجربات اور مشاہدات جدید انسان کو موت کے بعد زندگی کو ایک واقعہ ماننے پر مجبور کر رہے ہیں، ان میں سے ایک مرے ہوئے شخص کی دوبارہ واپسی ہے۔ ایسے بہت سے واقعات ریکارڈ کئے گئے ہیں جب کہ ایک ایسا شخص جس کو طبی طور پر مردہ قرار دے دیا گیا تھا، دوبارہ اس دنیا میں واپس آ گیا اور حاضرین کو ایسے تجربات بتائے جو دوسری دنیا کی موجودگی کا ثبوت دے رہے تھے۔ مثلاً اپنے مرے ہوئے رشتہ داروں سے ملاقات۔

عام مشاہدہ ہے کہ آدمی نزع کے وقت اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو پکارنے لگتا ہے۔ اس وقت اگرچہ وہ غشی کے عالم میں ہوتا ہے، پاس بیٹھے ہوئے زندہ لوگوں کی اسے خبر نہیں ہوتی۔ مگر مرے ہوئے اعزہ اور دوستوں کو وہ اس طرح آواز دیتا ہے جیسے وہ انھیں دیکھ رہا ہو۔ جیسے وہ اس کے قریب کھڑے ہوں اور اس کو اگلی دنیا میں لے جانے کے لئے اس کے پاس آ گئے ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ جب آدمی اپنے مرے ہوئے اعزہ کو پکارنے لگے تو سمجھنا چاہئے کہ اس کا آخر وقت آ گیا۔

۵۰ سالہ ڈاکٹر روز نے ایک ہزار سے زیادہ ایسے

"کیا موت کے بعد بھی زندگی ہے" اس سوال نے آج کل نئی وسعت اختیار کر لی ہے۔ امریکہ کے ماہرین نفسیات اس سوال کی سائنسی تحقیق کر رہے ہیں۔ بہت سے لوگ جن کی "طبی موت" واقع ہو چکی تھی، ان کو نئے طریقوں سے از سر نو زندہ کیا گیا اور ان سے انٹرویو لئے گئے۔ حیرت انگیز بات ہے کہ موت کے تجربہ کے بارے میں ہر ایک نے ملتی جلتی باتیں کہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہمیں ایسا محسوس ہوا گویا ہماری روح جسم سے نکل کر باہر تیر رہی ہے۔ وہ ایسے لوگوں سے بھی ملے جو ان سے پہلے مر چکے تھے، وغیرہ

بین اقوامی شہرت کی خاتون محقق ڈاکٹر راس کا کہنا ہے کہ تجربات نے غیر مشتبہ طور پر ثابت کر دیا ہے کہ موت کے بعد آدمی زندہ رہتا ہے۔ کچھ دوسرے لوگ ابھی شبہ کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر موڈی نے ایک کتاب اس موضوع پر لکھی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ تجربات داخلی نوعیت کے ہیں اور سائنسی ثبوت کے معیار کو نہیں پہنچتے۔

اس مسئلہ پر امریکہ میں کثرت سے کتابیں چھپ رہی ہیں اور کانفرنس اور سمینار منعقد کئے جا رہے ہیں۔

از رسالہ جنوری ۱۹۷۷

لوگوں کا قریب سے مشاہدہ اور مطالعہ کیا جو عالم نزع میں گزر رہے تھے اور گویا موجودہ دنیا اور اگلی دنیا کے درمیان پہنچ چکے تھے۔ ان لوگوں نے انھیں بتایا کہ نزع کی حالت میں ان کے کئی ایسے دوست اور رشتہ دار ان کے پاس آئے جو پہلے مر چکے تھے۔ تاکہ سفر آخرت کے وقت ان کی امداد کر سکیں۔ یہ لوگ اگر اس دنیا میں اپنے بدن کے کسی عضو سے محروم تھے تو نزع کی حالت میں انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے ان کا بدن ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ مثلاً جو شخص لنگڑا تھا اس کو محسوس ہوا کہ اس کے دونوں پاؤں صحیح و سالم موجود ہیں۔

اسی طرح خواب نے بھی زندگی بعد موت کے بارے میں تجرباتی ثبوت فراہم کیا ہے۔ ایسے متعین واقعات علم میں آئے ہیں جب کہ ایک شخص کی ملاقات خواب میں کسی مردہ شخص سے ہوئی اور اس نے خواب دیکھنے والے کو بعض ایسی تفصیلات اور معلومات بہم پہنچائیں جن سے صرف مرا ہوا شخص ہی باخبر ہو سکتا تھا۔

ڈاکٹر کیسل نے شمالی کیرولینا کے ایک امیر شخص کے بارے میں بتایا کہ اس کے چار بیٹے تھے۔ وہ کسی بات پر تین لڑکوں سے ناراض ہو گیا اور ایک وصیت نامہ کے ذریعہ اپنے ان تین لڑکوں کو جائداد میں حصہ پانے کے حق سے محروم کر دیا۔ جب وہ مر گیا تو اس کے جلد ہی بعد اس کے چوتھے لڑکے نے خواب میں اپنے باپ کو دیکھا جس کو از روئے وصیت تمام جائداد مل رہی تھی۔ خواب میں اس کے باپ نے اپنی پسندیدہ برساتیوں میں سے ایک برساتی اوڑھ رکھی تھی۔ وہ سراپا احتجاج دکھائی دیتا تھا اور دوران گفتگو بار بار برساتی کا کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ نیند کھلی تو لڑکے نے اپنے باپ کی اس کوٹ کو جو اس نے خواب کے دوران پہن رکھا تھا نکالا اس کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ جیب میں باپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک وصیت نامہ موجود تھا۔ اس پر گواہوں کے دستخط بھی تھے۔ اس کے تحت پچھلی وصیت کو منسوخ کرتے ہوئے بقیہ تینوں لڑکوں کو بھی حق دیا گیا تھا کہ وہ اپنے حصہ کی جائداد وصول کر سکتے ہیں۔ باپ نے موت سے تھوڑی دیر پہلے جائداد کی وراثت کے بارے میں اپنا فیصلہ بدل لیا تھا۔ اس نے دوبارہ اپنا وصیت نامہ تیار کرایا اور اس کو مکمل کر کے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا۔ پھر اس سے پہلے کہ اپنے تمام لڑکوں کو اس تبدیلی فیصلہ سے آگاہ کرے، انتقال کر گیا۔

اسی طرح ایک عورت کا واقعہ ریکارڈ کیا گیا ہے۔ اس کا آپریشن کیا گیا۔ آپریشن کے دوران وہ مکمل طور پر بے ہوش تھی۔ مگر بعد کو اس عورت نے ڈاکٹروں کو ایک سرجیکل غلطی سے آگاہ کیا جس کو فوراً درست کیا گیا۔ اس کے علاوہ آپریشن کے دوران آپریشن کرنے والا عملہ جو گفتگو کر رہا تھا اس کا کچھ حصہ بھی اس نے انچارج کے سامنے دہرایا اور عملہ نے اس کی تصدیق کی۔

ڈاکٹر گرفیلڈ نے بتایا کہ حال ہی میں ایک بوڑھی عورت کا معائنہ کر رہا تھا۔ یہ عورت ہڈی کے کینسر کی مریض تھی۔ اس کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ ہم نے مریضہ کے درد کو دور کرنے کی جتنی تدبیریں کیں سب بے سود ثابت ہوئیں۔ اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے اس کو بہت افاقہ ہو گیا ہو۔ میں نے عورت سے اس کی اچانک تبدیلی کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ ابھی اس کی مردہ ماں اس سے ملنے آئی تھی اور اس کو بتا گئی ہے کہ بہت

جلد ہی مطلق یکتا ہو جائیں گی۔ چنانچہ اس سے مرن گفتگو کے بعد وہ بہت پُرسکون ہو گئی اور تھوڑی دیر کے بعد مر گئی۔

یہ اور اسی طرح کے دوسرے بہت سے واقعات ہیں جن کی وجہ سے اب علماء کی ایک جماعت نے دوسری زندگی کو بطور واقعہ تسلیم کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ موت کے بعد ایک اور زندگی کا وجود ہے۔ ہم اس حقیقت کو سائنسی تجربات کے ذریعہ جان سکتے ہیں۔

مغربی دنیا میں علم الموت (Thanatalogy) اب ایک مستقل فن بن گیا ہے جس پر سائنسی انداز سے تحقیقات ہو رہی ہیں۔ اس علم کے گرد اور بھی کئی علوم وجود میں آئے ہیں، مثلاً عمری سائنس (Gerantalogy) مستقبل کی سائنس (Futuralogy) وغیرہ۔

-Dr Karlis Osis, American Society of Psychical Research, New York;
-Dr Elisabeth Kubler-Ross (USA);
-Dr Raymond A.Moody Jr.: Life After Life(USA,1976);
-"Life After Death", Newsweek, July 12, 1976;
-Time, January 7, 1974.

امریکی میگزین ٹائم (۷ جنوری ۱۹۷۴) نے لکھا تھا:

موت زندگی کا خاتمہ نہیں وہ اگلی زندگی میں داخلہ کا دروازہ ہے

"زیادہ دن نہیں گزرے، موت کے بارے میں بحث زیادہ تر ان مخصوص کتابوں کا موضوع ہوتی تھی جو یورپ میں تیار ہوتی تھیں اور وہاں سے امریکہ درآمد کی جاتی تھیں۔ اچانک طور پر موت امریکہ کا بہت زیادہ مقبول موضوع بن گیا ہے۔ حتیٰ کہ وہ علمی اختصاص کا ایک موضوع ہے۔ مینی سوٹا یونیورسٹی کو فخر ہے کہ اس نے موت کے مطالعہ کا ایک مرکز قائم کیا ہے۔ یو۔ سی۔ ایل۔ اے نے اپنے یہاں ایک لیبورٹری قائم کی ہے جس کا مقصد زندگی کو نقصان پہنچانے والے حالات کا مطالعہ کرنا ہے۔ تقریری اجتماعات میں اب موت کا موضوع، جنس اور سیاست جیسے سدا بہار موضوعات سے تجاوز کرنے لگا ہے۔ ٹائم میگ کے ایک مضمون میں کہا گیا ہے کہ کتابوں کی ایک نئی قسم وجود میں آئی ہے جس کو علم الموت کی کتابیں کہا جاتا ہے۔" □



دلی میں یا اس کے قریب ہمیں ایک ایسی جگہ کی ضرورت ہے جہاں اسلامی مرکز، الرسالہ اور رسالہ بک ڈپو کے دفاتر قائم کیے جا سکیں۔ اس سلسلہ میں جو لوگ کسی قسم کا تعاون کر سکتے ہوں، براہ کرم ہمیں مطلع فرمائیں

—— الرسالہ

حادثات ہیرو بنا دیتے ہیں

فریدہ خانم ایم اے

۳۱ اگست ۱۹۷۶ کا واقعہ ہے۔ دہلی کے روزری اسکول (نزد ریڈیو کالونی) کے میدان میں لڑکے جمع تھے۔ اتنے میں ایک کالا سانپ نکلا اور ایک چھ سالہ بچے کو لپیٹ لیا۔ بچہ چیخنے لگا اس کے ساتھی بھی چیختے ہوئے بھاگے۔ چیخ پکار اسٹاف روم تک پہنچی اور اسکول کی استانیاں بچہ کی طرف دوڑیں۔ مگر اس کا خوفناک حال دیکھ کر سب سہم گئیں۔ اتنے میں ایک استانی خاموشی کے ساتھ آگے بڑھی۔ اس کے ہاتھ میں صرف ایک اخبار تھا۔ اس نے اخبار کو سانپ کے منھ پر رکھا اور پوری طاقت سے اس کو پکڑ کر بچے کے پاؤں سے الگ کر دیا۔ لڑکا فوراً قریب کے ہندو راؤ اسپتال میں لے جایا گیا، جہاں وہ چند دن کے علاج سے اچھا ہو گیا۔ سانپ کو اسپتال کی لیبورٹری میں پہنچا دیا گیا جہاں وہ زندہ حالت میں موجود ہے۔

استانی کا نام مسز جان ہے۔ اور بچہ کا نام راجن کپور۔

مسز جان نے اس سے پہلے کبھی سانپ نہیں دیکھا تھا۔ انھوں نے اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا: "مجھے یقین نہیں آتا کہ میں نے اس موذی سانپ کو اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیا تھا۔ اب تو مجھے اس کو سوچ کر بھی ڈر لگتا ہے"

یہ در اصل "حادثہ" تھا، جس نے مسز جان کو اس حیرت ناک بہادری کے لئے آمادہ کیا۔ حادثات آدمی کو ہیرو بنا دیتے ہیں۔

مولانا محمد علی (۱۹۳۱ – ۱۸۷۸) جب بیتول جیل میں نظر بند تھے، ان کی اہلیہ جیل خانہ میں ان سے ملاقات کے لئے گئیں۔ انھوں نے اپنے شوہر مولانا محمد علی سے کہا: "تم ہماری فکر نہ کرنا۔ خدا ہی پہلے بھی رازق تھا اور اب بھی وہی رازق ہے۔ تم صرف ایک واسطہ تھے۔ اور خدا بلا واسطہ بھی دے سکتا ہے اور دوسرا واسطہ بھی پیدا کر سکتا ہے" اس کے بعد انھوں نے کہا "رہا تمھارا کام، سو اگر اجازت ہو تو میں اسے کرتی ہوں"

مضامین محمد علی، جلد اول، صفحہ ۸۴ – ۸۳

چنانچہ انھوں نے کام شروع کیا اور دو سال کے عرصے میں ۴۵ لاکھ روپے کا چندہ خلافت تحریک کے لئے جمع کر لیا۔ یہ ۴۵ سال پہلے کا واقعہ ہے جب کہ "لاکھ" کا مطلب اس سے بہت زیادہ تھا جو آج سمجھا جاتا ہے □



گھڑیال کی تجارتی اہمیت

شکار خور جانور نہ ہوں تو دنیا ہمارے لئے ناقابل رہائش بن جائے

انسان کی قبریں ہم جگہ جگہ دیکھتے ہیں۔ مگر جانوروں کا کوئی قبرستان ہمیں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ حالانکہ انسان کے مقابلہ میں جانوروں کی تعداد ناقابل قیاس حد تک زیادہ ہے اور ان میں سے کروڑوں ہر روز مرتے بھی رہتے ہیں۔ اس کی وجہ جانوروں میں شکار خور (Predators) کی موجودگی ہے۔ جانوروں میں بے شمار ایسے جانور ہیں جو اپنے دوسرے ابنائے جنس کو زندہ یا مردہ حالت میں اپنی خوراک بناتے رہتے ہیں، اس کی وجہ سے فضا کا توازن (Ecological Balance) برقرار رہتا ہے۔ اگر ایسے جانور دنیا میں نہ ہوں تو صرف چند دنوں میں خشکی اور سمندر دونوں جانوروں کی لاشوں سے بھر جائیں اور اس کی وجہ سے اتنا تعفن پھیلے کہ بالآخر انسانی نسل کا بھی خاتمہ ہو جائے۔

گھڑیال بھی انھیں شکار خور جانوروں میں سے ایک ہے۔ قدیم زمانہ میں گھڑیال کو "مردم خور" سمجھا جاتا تھا۔ مگر زیادہ صحیح لفظوں میں وہ ایک ایسا جانور ہے جس کا کام یہ ہے کہ انسان دشمنوں کو اپنی خوراک بناتا رہے۔ شمالی ہند کے دریاؤں میں جو لاشیں پھینکی جاتی ہیں، ان کو گھڑیال ہی ٹھکانے لگاتے ہیں ورنہ تھوڑے ہی دنوں میں تمام دریا زہریلے ہو کر رہ جائیں۔ اسی طرح دریاؤں کو مردہ مچھلیوں کا تالاب بن جانے سے جو چیز بچاتی ہے وہ بڑی حد تک ان دریاؤں میں گھڑیالوں کی موجودگی ہے۔ جمنا کے کنارے بیٹھ کر ایک شخص نے اندازہ لگایا تو اس نے دو گھنٹے کے اندر ۹۵ گھڑیال شمار کئے۔ مگر ان کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔

گھڑیال تجارت کا ذریعہ بھی ہیں۔ چمڑے کی بین اقوامی مارکٹ میں گھڑیال کی کھالوں کی مسلسل مانگ رہتی ہے ۱۲ فٹ کے ایک گھڑیال کی کچی کھال کی قیمت ۸۰۰ روپے ہے۔ گھڑیال کے چمڑے کا بنا ہوا ایک ہینڈ بیگ پانچ ہزار روپے تک فروخت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا گوشت، اس کی چربی، اور اس کے جسم کے بعض اجزاء بھی اچھی قیمتوں پر فروخت ہوتے ہیں۔

حکومت ہند نے گھڑیالوں کے پالنے کے لئے خصوصی اسکیم بنائی ہے۔ پایا گیا ہے کہ وہ ایسے مقامات پر زیادہ

الرسالہ جنوری ۱۹۷۷

بہتر طور سے پرورش پاتے ہیں جہاں کم سردی پڑتی ہو۔ حکومت کا پہلا مرکزی گھڑیال فارم اڑیسہ میں بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مدراس اسنیک پارک ٹرسٹ نے ایک "کروکوڈائل بنک" مہابلی پورم (ٹامل ناڈو) میں بنایا ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا گھڑیال فارم سموتا کان (SAMUTAKAN) تھائی لینڈ میں ہے۔ یہاں کے ذخیرۂ آب میں ۱۶ ہزار گھڑیال ہیں۔ حکومت تھائی لینڈ ان کے تیار شدہ چمڑوں کو فروخت کرتی ہے اور یہ اس کے لئے زر مبادلہ حاصل کرنے کا ایک مستقل ذریعہ ہے۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ فطری حالات میں گھڑیال کے صرف ایک فی صد انڈوں سے بچہ حاصل ہوتا ہے کیونکہ ان کے انڈوں اور بچوں کو مختلف قسم کے جانور مچھلیاں اور چڑیاں کھا جاتی ہیں۔ گھڑیال کے انڈے انسانوں کی خوراک بھی بنتے ہیں۔ انڈمان کے بازار میں ان انڈوں کی بہت مانگ ہے۔

گھڑیال کے فارم میں انڈوں کا تحفظ ممکن ہو جاتا ہے اور اس طرح گھڑیال کی نسل کو بہت بڑھایا جا سکتا ہے۔ گھڑیال کے چمڑوں کو تیار کرنے کے لئے اسمال اسکیل انڈسٹری قائم کی جا سکتی ہے۔ اس قسم کے فارم ہر اس ریاست میں قائم کئے جا سکتے ہیں جہاں پانی کے بڑے ذخیرے، جھیلیں اور تالاب ہوں۔ یہ مقامات سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز بھی بن سکتے ہیں۔ کرناٹک اور راجستھان کے بعض ذخائر آب میں گھڑیالوں کی موجودگی نے ان مقامات کو سیاحوں کے لئے پرکشش بنا دیا ہے۔ یہی کام اگر سائنٹفک طریقوں سے کیا جائے تو یہ فائدہ زیادہ بڑے پیمانہ پر حاصل کیا جا سکے گا ◻

جب خدا کے دین کو دنیا دارانہ زندگی میں ڈھال لیا جائے

اسلام کا مطلب یہ ہے کہ زندگی خدا اور آخرت کی یاد میں ڈھل جائے۔ یہاں بندہ اپنے رب سے روحانی سطح پر ملاقات کرتا ہے۔ مگر جب اسلام کے ماننے والوں کو زوال ہوتا ہے تو اسلام کی روح غائب ہو جاتی ہے اور صرف اس کے دنیوی پہلو باقی رہ جاتے ہیں۔ اسلام اپنی سطح سے اتر کر ماننے والوں کی سطح پر آ جاتا ہے ——— نظر نہ آنے والے خدا سے خوف و محبت کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔ البتہ نظر آنے والے خداؤں (احبار و رہبان) کی تقدیس و تمجید زوروں پر شروع ہو جاتی ہے۔ خدا کے لئے تنہائیوں میں رونا اور خاموشیوں میں اس سے گڑگڑانا باقی نہیں رہتا۔ البتہ لاؤڈ اسپیکر کے اوپر قرآن و اسلام کے ہنگامے خوب ترقی کرتے ہیں۔ نماز لوگوں کے دلوں کو روشن نہیں کرتی۔ البتہ مسجدوں کی روشنیاں پورے شباب پر پہنچ جاتی ہیں۔ روزہ سے صبر اور پرہیزگاری نکل جاتی ہے، البتہ افطار و سحر کی دھوم خوب بڑھ جاتی ہے۔ عید میں شکر اور سجدہ کی روح نہیں ہوتی۔ البتہ کپڑے اور میلے کے تماشے خوب رونق پکڑتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ خدا کے دین کو اپنی دنیا دارانہ زندگی میں ڈھال لیا جاتا ہے

عربوں کی قبل از اسلام تاریخ کو جاننے کا زیادہ قابل اعتماد ذریعہ قرآن ہے نہ کہ قدیم جاہلی ادب

ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری (۱۹۷۳-۱۸۸۹) نے عربوں کے جاہلی ادب پر ایک کتاب لکھی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قدیم عربوں کی زندگی کو جاننے کا زیادہ بہتر ذریعہ قرآن ہے نہ کہ جاہلی ادب، جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ یہاں ان کے خیالات کا خلاصہ نقل کیا جاتا ہے۔

میں عرب جاہلیت پر تحقیق کرنے بیٹھوں گا تو امرؤالقیس، نابغہ، اعشیٰ، زہیر، قس بن ساعدہ اور اکثم بن صیفی کے اشعار کی راہ ہرگز اختیار نہ کروں گا۔ میں جاہلی زندگی کو قرآن میں تلاش کروں گا۔ کیوں کہ اس سے زیادہ سچا نقشہ زمانہ جاہلیت کا اور کوئی نہیں پیش کرسکتا۔

ہمارے پاس جاہلیت کے اشعار کا جو ذخیرہ موجود ہے، اس سے عربوں کی ایک ایسی زندگی کی تصویر ملتی ہے جو خاموش، بے بنیاد، کھوکھلی، مذہبی احساس سے یکسر خالی ہے۔ اگر ایسا نہیں تو امرؤالقیس، طرفہ اور عنترہ کی شاعری میں یہ جذبہ کیوں نظر نہیں آتا۔

قرآن بالکل دوسرا نقشہ پیش کرتا ہے۔ کیا قرآن نے روم اور ایران کے درمیان لڑائی کا ذکر نہیں کیا ہے، جس نے عرب قوم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک روم کی خیر خواہی کا دم بھرتا تھا۔ دوسرا ایران کی طرف داری کرتا تھا۔ یہ چیز موجودہ جاہلی ادب کے ماننے والوں کا یہ گمان باطل غلط ثابت کرتی ہے کہ عرب قوم دنیا سے بے تعلق قوم تھی۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کس طرح ان لوگوں کی روم و ایران کی سیاست میں دلچسپی لینے کا تذکرہ کرتا ہے۔

سورۂ قریش میں بیرونی دنیا سے عربوں کے اقتصادی تعلقات کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ دونوں سفر بیرونی دنیا کی طرف ہی ہوتے تھے۔ ایک شام کی طرف، دوسرا یمن، ایران اور حبشہ کی طرف۔ رسول عربی کی سیرت بھی ہمیں بتاتی ہے کہ عرب قوم نے آبنائے باب المندب سے ہو کر ملک حبش کی طرف ہجرت کی تھی۔ یہی سیرت ہمیں بتاتی ہے کہ یہ قوم حیرہ ہوتی ہوئی بلاد ایران تک ایک طرف، اور شام و فلسطین ہوتی ہوئی مصر تک دوسری طرف پہنچ گئی تھی۔

امرؤالقیس کا کلام پڑھئے یا کسی اور شاعر کا، آپ جاہلی ادب کا سارا انبار الٹ ڈالئے، عربوں کی اقتصادی زندگی پر ایک لفظ ایسا نہیں ملے گا جو ان کے اقتصادی تعلقات کے بارے میں رہنمائی کر سکے۔

قرآن نے عربی قوم کو دو طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک سرمایہ داروں کا طبقہ جو دولت پر نثار اور سود خواری میں منہمک ہے۔ دوسرا تہی دستوں کا۔ قرآن صاف لفظوں میں دوسرے طبقہ کی پشت پناہی کرتا ہے اور سود خوار طبقہ سے کہتا ہے کہ خدا اور رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ یہ بات صراحتہً اس فساد کا پتہ دیتی ہے جو عربوں کی اقتصادی زندگی میں موجود تھا۔ جاہلی ادب کی نظم و نثر میں وہ کون سی جگہ ہے جہاں غریبوں اور امیروں کے درمیان طبقاتی کشمکش کی کوئی جھلک نظر آتی ہو۔ وہ ادب کیسا ادب ہوگا جو ان تکلیفوں کی

ھ کا سے نہ کرے جو غریبوں کو اپنی غریبی کی وجہ سے برداشت کرنا پڑتی تھیں۔ جو اپنے زمانے کی تمدنی، اجتماعی اور اقتصادی زندگی کی ترجمانی سے معذور ہو۔

قرآن میں ہم بار بار بخل اور طمع کی مذمت دیکھتے ہیں۔ اس قسم کی آیتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عرب دولت کو حقیر سمجھنے والے اور روپیہ کوٹنے والے نہ تھے، جیسا کہ جاہلیت کی شاعری سے ظاہر ہوتا ہے بلکہ ان میں اگر فیاض لوگ تھے تو بخیل بھی تھے۔ جو دولت لٹانے والے تھے تو لالچی بھی تھے۔ اور حق یہ ہے کہ عربوں کی زندگی واقعۃً ایسی ہی تھی۔ کیونکہ مکہ اور مدینہ کی زندگی کی اصل بنیاد تجارت تھی۔ اور قدیم قوموں میں جہاں کہیں بھی تجارت کا ذکر ہے، اسی کے ساتھ سود، بخل، لالچ، ظلم کا بھی ذکر ہے۔ یہ نقائص مال کے جمع کرنے سے وابستہ ہیں۔ درآں حالیکہ جاہلی ادب میں ان کا ئی ذکر نہیں۔ قرآن ناقابل تردید انداز میں مکہ، مدینہ اور طائف کی وہی تصویر پیش کرتا ہے جو دوسرے لمانہ شہروں، ایتھنز، روم اور کارتھیج (قرطاجنہ) کی تصویروں سے ملتی جلتی ہے۔

جاہلی ادب کے نام سے جو چیز ہمارے پاس جود ہے وہ صرف صحرا اور بادیہ کی عربی زندگی کا لرکرتی ہے اور وہ بھی نامکمل۔ ہم زمانہ جاہلیت اشعار میں کہیں بھی نہ تو سمندر کا ذکر پاتے ہیں، اس کی طرف کوئی اشارہ۔ گویا کہ زمانہ جاہلیت میں رب قوم سمندر کے علم سے ناواقف تھی اور ان کو سمندر ے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ مگر قرآن عربوں پر یہ احسان تا ہے کہ "خدا نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کر دیا اور تمہارے لئے سمندر میں منافع ہیں" اسی طرح قرآن احسان رکھتا ہے کہ "سمندر سے تم تازہ گوشت حاصل کرتے ہو" یہ کھلا ہوا ثبوت ہے کہ عرب ان چیزوں سے واقف تھے۔ جاہلیت کے اشعار میں یہ چیز کہاں مل سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایام جاہلیت کی صحیح تصویر اس بے نتیجہ ادب میں، جس کو لوگ جاہلی ادب کہتے ہیں، ڈھونڈنے کے بجائے قرآن میں تلاش کرنا چاہئے۔

(الادب الجاہلی) □

لطیفہ

مرزا غالب (۱۷۹۷ — ۱۸۶۹) جس مکان میں رہتے تھے، اس مکان میں چھت کے اوپر ایک کمرہ تھا اور اس کمرہ سے ملی ہوئی ایک تنگ و تاریک چھوٹی سی کوٹھری تھی۔ گرمی کے موسم میں وہ ٹھنڈی رہتی تھی۔ سخت موسم میں مرزا اسی کوٹھری میں بیٹھتے تھے۔

ایک بار رمضان کا مہینہ تھا، سہ پہر کے وقت مرزا غالب اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ اس کوٹھری میں بیٹھے ہوئے چوسر کھیل رہے تھے اور تفریح کر رہے تھے۔ اتنے میں مفتی صدرالدین خاں آزردہ وہاں آگئے۔ کوٹھری میں لہو ولعب کا منظر دیکھ کر انھوں نے مرزا سے کہا: ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان کو قید کر دیا جاتا ہے۔ آج اس حدیث کی صحت پر شبہ ہو گیا۔

مرزا غالب فوراً بولے: "مولانا! حدیث بالکل صحیح ہے۔ بات یہ ہے کہ شیطان جہاں قید کیا جاتا ہے وہ یہی کوٹھری ہے۔"

مذکورہ عربی اخبار
کے دو صفحات
میں سے ایک صفحہ
کا جزوی عکس
یہاں دیا جارہا ہے

المركز الإسلامي العالمي يظهر للوجود

في احسن صورة العملية . ولم يكن غريبا عنها هذه الصحوة لانه يصدر من نفس تلك الاعماق التي صدر منها صوت جمال الدين الافغاني ومحمد عبده ومحمد اقبال ذلكم هو المفكر الهندي المسلم وحيد الدين خان . ورئيس تحرير مجلة (الرسالة) الشهرية بلغتي ومنتخب المؤلفات الاسلامية العلمية الفذة من مثل « الاسلام يتحدى » و « الدين في مواجهة العلم » و « حكمة الدين » و « الاسلام والعصر الحاضر » وغيرها من الكتب التي لم تترجم بعد الى اللغة العربية . وهو مؤسس مدرسة ... (الدعوة) :

التصاعدية كنموذج لابد منه لاية نهضة اسلامية ناجحة .

وهو يدعو المسلمين الى ... توجيهم تحليلي في هذه الدنيا والذي يركز — اولا : في الاصلاح ... . وثانيا : في ... بعقيدة على النفس (الدعوة) . لان ... مكانة بعد النبي ... ببلاغ الرسالة الى الشعوب الاخرى ولا ... التي ... العربي . صلى الله عليه وسلم . ... عن الوجوب ... على عاتقها .

والمحنة ... الدين خان ... [illegible]

وهو يضع ، بالتالي ، اعتبارا محددا امام المسلمين ، اننا لن نصل وفق المنهجية الحضارية المطلوبة عن نقل تصورات عن تحقيق النهضة ... والرسالة ... . نحو بحث اساسي ... لوضع المسلمين الثقافية والعملية والاقتصادية بعد الجهد الذي ... طيلة القرون الماضية . والقول ان ... في ... هو : [illegible]

... الذي طرا على ... القوة ... العالمية الى القوة ... على ... الحديثة . ... الهندي المسلم ... العصرة ... في ... العصر ... الوطنية ... [illegible]

الرسالہ کا ذکر
عرب اخبارات میں

آواز پھیل رہی ہے

طرابلس (لیبیا) کے کثیر الاشاعت اخبار الفجر الجدید نے اپنے ہفتہ وار ایڈیشن میں اسلامی مرکز اور اس کے ترجمان ماہنامہ الرسالہ کا تعارف شائع کیا ہے۔ بڑے سائز کے دو مکمل صفحات میں شائع شدہ اس تعارف میں "الرسالہ" کی بابت تحریر ہے:

"قد صدرت بدلهي مجلة (الرسالة) الشهرية باللغة الاردية وستلحقها مجلات بالعربية والانجليزية عما قريب"

(اسلامی مرکز کے آرگن کے طور پر) دہلی سے ماہنامہ الرسالہ جاری ہوا ہے۔ عنقریب عربی اور انگریزی جرائد بھی جاری کئے جائیں گے

تبصرہ میں مختلف قسم کی تفصیلات دیتے ہوئے آخر میں کہا گیا ہے:

"ان مناصرة المركز الاسلامي لا يحتمها فقط الشعور الاسلامي المشترك بل هي واجب ملقى على عاتق الامة العربية قبل غيرها لانها مسئولة عن الدعوة وتبليغ الرسالة بالدرجة الاولى و نصرة الله لها لن تتحقق الا بتأديتها الأمانة والرسالة على خير وجه ومن هنا فان مناصرة المركز الاسلامي للدعوة والبحوث هو عين الجهاد في سبيل الله"

اسلامی مرکز کی مدد کرنا صرف مشترک اسلامی جذبہ ہی کا تقاضا نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا فریضہ ہے جو امت عربیہ کے کاندھوں پر دوسروں سے پہلے عائد ہوتا ہے۔ کیونکہ دین کی دعوت و تبلیغ کے لئے وہ درجہ اولی ذمہ دار ہے۔ اللہ کی نصرت کا استحقاق اس کے لئے اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس امانت کو بہتر طریق پر لوگوں تک نہ پہنچا دے۔ اسلامی مرکز کی اعانت اللہ کی راہ میں اعانت ہے۔"

الفجر الجدید کے ہفتہ وار ایڈیشن میں شائع شدہ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اسلامی مرکز کا قیام پچھلے چھ سال کے غور و فکر اور منصوبہ بندی کے بعد عمل میں آیا ہے۔ یہ مرکز فی الحال معمولی وسائل سے شروع کیا گیا ہے۔ حتی کہ اس کے پاس اپنی مستقل عمارت بھی نہیں ہے۔ مگر اس کے پیش نظر جو عظیم مقصد ہے، اس کا حق ہے کہ اس کو امت کا ہر قسم کا تعاون ملے تاکہ وہ اپنے پروگرام کی تکمیل کر سکے۔

ساتویں صدی میں جب اللہ نے اپنے نبی کو بھیجا تو زندگی کا نظام شرک کی بنیاد پر قائم تھا۔ قرآن نے اپنے معجزانہ ادب اور علمی استدلال کے ذریعہ اس بنیاد کو منہدم کیا۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکا کہ خدا کا دین ایک برتر نظام کی حیثیت سے دنیا میں اپنی جگہ پا سکے۔

موجودہ زمانہ میں ایک نیا انقلاب آیا ہے جس نے زندگی کے نقشہ کو دوبارہ بدل ڈالا ہے۔ قدیم زمانہ میں انسانی فکر کی بنیاد اگر شرک تھی تو موجودہ زمانہ میں الحاد ہے۔ جب تک اس ملحدانہ فکری بنیاد کو منہدم نہ کیا جائے، خدائی بنیاد پر زندگی کی نئی تعمیر نہیں کی جا سکتی۔ اسلامی مرکز اور الرسالہ کا مقصد اسی فکری مہم کی منصوبہ بندی کرنا اور اس کو موثر انداز پر چلانا ہے

نائجیریا کا سبق

سیاست کے ساتھ دینی خدمت کا کام نہیں کیا جا سکتا

"میری کوششوں کی وجہ سے دسمبر ۱۹۶۳ سے لے کر مارچ ۱۹۶۵ تک تقریباً دو لاکھ (۱۸۶۹۳۰) مشرکوں نے اسلام قبول کیا۔ ان میں سے بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو سماجی زندگی میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔"

یہ نائجیریا کے سابق وزیر اعظم الحاج احمد و بلو (۱۹۶۶ — ۱۹۱۰) کے الفاظ ہیں جو انھوں نے ۱۳۸۴ھ (۱۹۶۴) کی موتمر اسلامی (قاہرہ) میں تقریر کرتے ہوئے کہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ افریقہ کی لگ بھگ ۲۲ کروڑ آبادی میں دس کروڑ ۸۰ لاکھ مسلمان ہیں۔

اگر مسلم ملکوں کی مدد شامل حال ہو تو افریقہ کے مشرک قبائل میں تیزی سے اسلام پھیل سکتا ہے۔ اور اس کا ثبوت خود میری وہ کامیابیاں ہیں جن کا میں نے ابھی حوالہ دیا"

احمد و بلو کو اسلام کی خدمت کا یہ جذبہ اپنے دادا عثمان ڈان فوڈیو سے ملا تھا۔ ۱۹ ویں صدی میں جب پرتگال، فرانس اور برطانیہ نے افریقہ کے علاقوں میں گھسنا شروع کیا تو افریقہ میں اس کے رد عمل کے تحت بہت سے مصلحین اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھیں میں سے ایک عثمان ڈان فوڈیو بھی تھے۔ انھوں نے گزشتہ صدی میں مسلمانوں کی اصلاح اور استعماری طاقتوں کے خلاف جہاد کی زبردست تحریک چلائی۔ دریائے نائجیریا کے کنارے کنارے دور تک انھوں نے اسلام کا جھنڈا لہرا دیا تھا۔ ۱۸۳۳ میں ان کے انتقال کے بعد ان کے جانشینوں نے یہ مہم جاری رکھی۔ نائجیریا کی راجدھانی لاگوس سے لے کر شمال میں سکوٹو شہر تک مقابلے جاری تھے۔ تاہم آخری فیصلہ انگریزوں کے حق میں ہوا۔ انھوں نے ۱۸۰۶ میں سلطان محمد طاہر اور ان کے ساتھیوں کو شکست دے کر نائجیریا پر قبضہ کر لیا۔

احمد و بلو انھیں روایات کے درمیان موجودہ صدی کے آغاز میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ سوکوتو کے امیر قبیلہ تھے۔ ابھی وہ دس سال کے تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ ان کی ماں ایک دیندار خاتون تھیں۔ قدیم رواج کے مطابق پہلے انھیں قرآن حفظ کرایا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے عربی مدرسہ میں داخلہ لیا اور ۲۱ سال کی عمر تک دینی تعلیم سے فراغت حاصل کر لی۔ ۱۹۲۶ میں مغربی تعلیم کے لئے کاسینا کالج میں داخل ہوئے اور انگریزی زبان اور ریاضیات کی تعلیم مکمل کی۔ خاندانی وراثت کے تحت ان کو سکوتو کا امیر بنایا گیا۔ ۱۹۳۴ میں سلطان حسن نے ان کو شہر رباح کا گورنر مقرر کیا۔ ۱۹۳۸ میں جب سلطان حسن کا انتقال ہوا تو نئے سلطان ابوبکر نے احمد و بلو کو سوکوتو کے "سار دونا" کے منصب پر سرفراز کیا۔ ۱۹۴۸ میں انھوں نے لندن کا سفر کیا اور آزادی کے مسائل پر حکومت برطانیہ سے گفتگو کی۔

۱۹۶۳ کی مردم شماری کے مطابق نائجیریا میں ۲۶ ملین مسلمان ہیں، عیسائی ۱۹ ملین اور دوسرے قبائل ۱۰ ملین ہیں۔ شمالی نائجیریا میں زیادہ تر مسلمان آباد ہیں اور جنوبی نائجیریا میں زیادہ تر عیسائی۔ احمد و بلو شمالی نائجیریا کے لیڈر تھے۔ وہ مغربی استعمار کے خلاف جنگ میں پیش پیش رہے۔ ۱۹۶۰ میں نائجیریا آزاد ہوا تو وہاں ایک فیڈرل گورنمنٹ بنی۔ اس حکومت کے فیڈرل پرائم منسٹ

ابوبکر تفاوا بلیوا (۱۹۱۲ - ۱۹۶۶) تھے۔ احمدو بلو
شمالی نائجیریا کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ یہ ایک مخلوط
حکومت تھی جس میں مختلف پارٹیوں کے نمائندے اور
اور مسلمان اور عیسائی دونوں شریک تھے۔ احمدو بلو
مسلمانوں کی اصلاح و تعمیر اور عیسائیوں میں اسلام
ا اشاعت کا کام پوری توجہ سے شروع کیا۔ اس کے
تائج بھی نکلنے شروع ہوئے۔ مگر انھیں زیادہ کام کرنے
موقع نہیں ملا۔ ۱۵ جنوری ۱۹۶۶ کو ۲۵ فوجی افسروں
نے مل کر بغاوت کر دی۔ اس بغاوت میں ابوبکر تفاوا بلیوا
احمدو بلو اور بہت سے مسلمان اور عیسائی مارے گئے۔
اس کے بعد نائجیریا میں فوجی حکومت قائم ہوگئی جس کے
سربراہ جنرل اردنسی تھے۔ مگر انھیں بھی صرف چھ ماہ
حکومت کرنے کا موقع ملا۔ ۲۹ جولائی ۱۹۶۶ کو دوسری
فوجی بغاوت ہوئی اور وہ بھی ختم کر دیے گئے۔

نائجیریا میں دو مسئلے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کی تعداد
نی صد ہے۔ مگر تعلیم، اقتصادیات اور تنظیم میں پیچھے
نے کی وجہ سے عملاً اکثر شعبوں پر عیسائی چھائے ہوئے ہیں۔
ضرورت ہے کہ انھیں تعلیمی اور اقتصادی اعتبار سے بلند
جائے تاکہ وہ ملک میں اپنا جائز مقام پا سکیں۔ دوسرا
یہاں کے عیسائیوں اور خاص طور پر ۱۰ ملین مشرک قبائل
اسلام کی اشاعت ہے۔ یہ دونوں کام احمدو بلو نے
کر دیے تھے۔ مگر ان کی شہادت سے جو سبق ملتا ہے
یہ کہ تعمیر و تبلیغ کا کام سیاست کو لے کر نہیں کیا جا سکتا
بلکہ اگر سیاست سے الگ ہو کر کام کر رہے ہوتے تو
۲۰-۲۵ برس میں نائجیریا کی تاریخ بدل دیتے۔ مگر سیاست
رزار نے انھیں بھی ختم کر دیا اور ان کے تعمیری اور اصلاحی
سکا ■

جنوری ۱۹۶۷

م۔ احمد ایم اے

[redacted]

صحت مند انسان اپنے مسائل کا حل جذبات سے بالا ہو کر اس طرح کرتے ہیں جیسے یہ ریاضی کے سوال ہوں۔

ایک سیاست داں نے ایک کیمیا کے متلاشی سے کہا: تانبے کو سونا بنانے کا سب سے آسان اور کامیاب طریقہ یہ ہے کہ تانبے کے اوپر سونے کا ملمع چڑھا دو۔

سیٹھ مایا رام اپنا دل بلا سوچے ہوئے دینے کو تیار ہیں۔ مگر ادھار دینا ہو تو خوب سوچ سمجھ کر دیں گے۔

ایسی بھی مچھلیاں ہوتی ہیں جو صرف گندے پانی میں پروان چڑھتی ہیں۔

تعصب زدہ انسان خود اپنے ذہن میں اپنی ایک دنیا بنا لیتا ہے، وہ دن کی روشنی میں سامنے کھڑے ہوئے پہاڑ کو نہیں دیکھتا اور اس کے وجود سے انکار کر دیتا ہے۔

گاندھی جی کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کو جوشیلی تقریر کرنا نہیں آتا تھا۔

انسان کی فطرت افسانہ پسند ہے۔ وہ حقیقت کو بھی بہت جلد افسانہ بنا دیتی ہے۔

مجبوری سے آدمی مظلوم تھا، موقع ملتے ہی ظالم بن گیا ■

توازن فطرت کا مسئلہ

آدمی جب سانس لیتا ہے تو وہ آکسیجن اندر لے جاتا ہے اور کاربن خارج کرتا ہے۔ نباتات کے لئے اس کے برعکس اصول ہے۔ وہ کاربن لیتے ہیں اور آکسیجن خارج کرتے ہیں۔ اس دو طرفہ عمل کے ذریعے فطرت کا توازن قائم رہتا ہے۔ مگر انسان اپنے اندھادھند عمل سے اس توازن کو بگاڑ رہا ہے۔ اس نے خشکی اور تری میں فساد پیدا کر رکھا ہے۔

روایتی اقتصادیات میں اب تک یہ پڑھایا جاتا رہا ہے کہ اگر وسائل کی قلت نہ ہو یا وسائل حسب دل اغراض کے لئے استعمال کے قابل نہ ہوں تو وہ اقتصادیات کے دائرہ بحث میں نہیں آئیں گے۔ اس سلسلہ میں ہوا کی مثال دی جاتی ہے کہ یہ ایک مفت وسیلۂ فطرت ہے، اس لئے یہ اقتصادی تحقیق کے دائرہ سے باہر ہے لیکن آج ٹوکیو کی سڑکوں پر تازہ ہوا خریدنی پڑتی ہے اور لندن کے اوپر کی ہوا کو صاف کرنے کے لئے لاکھوں پونڈ خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ توازن فطرت اور اقتصادیات آج ایک دوسرے سے کتنا قریب ہو چکے ہیں۔ ایک ماہر ماحولیات نے کہا: "ممکن ہے تحفظ فطرت ہی مستقبل کا مذہب بن جائے۔"

ایشیا میں ایک نہایت مضرت رساں زرعی طریقہ جنگل کاٹ کر کھیتی کرنے ہے۔ ایک اور نقصان دہ طریقہ گھریلو جانوروں کو پنچایتی زمینوں پر چرنے کے لئے چھوڑنے کا ہے۔ قدیم ترین زمانے سے یہاں کے غریب لوگوں نے اپنا یہ حق سمجھا ہے کہ وہ بکریوں کے ریوڑ رکھیں جب کہ انھیں کھلانے کا کوئی انتظام ان کے پاس نہ ہو۔ اس کا نتیجہ انسان کے ہاتھوں وجود میں آنے والے ریگستان کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ ہندستان میں بہت سی زمین خستہ حالت میں نظر آتی ہے اور کچھ پیدا نہیں کرتی۔ اس کی وجہ محض انسانوں اور جانوروں کے ذریعے اس کا حد سے زیادہ استعمال ہے۔ تقریباً دس کروڑ مویشی جن میں سے بیشتر ناکارہ ہیں وہ اس ملک کے قدرتی سرمایہ پر زندہ رہتے ہیں۔ گیر کے محفوظ جنگل پر کئے گئے ایک سروے سے ثابت ہوا تھا کہ جب یہاں کی زمین مویشی کے کھروں اور انسانوں کے پیروں تلے روندی نہیں جاتی تو گھاس کی سالانہ فصل تقریباً ۴۰۰۰ کلوگرام فی ہیکٹر بیٹھتی ہے، لیکن دیہات کے اردگرد کی زمین پر جہاں مویشی پھرتے ہیں، یہ فصل صرف ۴۷۵ کلوگرام فی ہیکٹر ہوتی ہے۔ گویا زمین کے مناسب انتظام سے ہندستان اب کی نسبت دس گنی زیادہ گھاس پیدا کر سکتا ہے۔

یہ بے معنی بات ہوگی کہ کسی بھوکوں مرتے آدمی سے یہ کہا جائے کہ وہ استحصال کے بجائے تحفظ کرے۔ درختوں کو جو بھاری پیمانے پر ایندھن کے لئے استعمال کیا جاتا ہے وہ نباتات اور مٹی کے لئے زبردست نقصان ہے۔ مگر اکثر جگہوں پر درختوں کی کٹائی صرف اسی صورت میں رک سکتی ہے جب لوگوں کو مٹی کا تیل مفت سپلائی کیا جا سکے۔ جنگلات ہمارے سیارہ کی صحت کے

اتنے ہی ضروری ہوسکتے ہیں جتنا کہ ماہرین توازن
فطرت بتاتے ہیں۔ مگر یہ ایک انتہائی مشکل کام ہے کیونکہ
میں بتایا گیا ہے کہ دنیا میں صرف ۲ ارب بیرل تیل
ذخیرہ اور رہ گیا ہے اور مانگ کا یہ حال ہے کہ دن
بدن بڑھتی جارہی ہے۔

حکومت ہند نے ۱۹۵۲ میں ایک قومی جنگلاتی
پالیسی وضع کی تھی جس میں یہ سفارش کی گئی تھی کہ ۳۰
فی صد زمین جنگلات کے نیچے رہنی چاہئے جو اس کے
تحفظاتی و پیداواری اعمال کے لئے ضروری ہے۔
مگر چونکہ اکثر ریاستوں نے اس کو سنجیدگی کے ساتھ قبول
نہیں کیا اس لئے ملک میں ۲۰ فی صد سے بھی کم زمین جنگلات
کے نیچے ہے۔ اس سے بہت سے دوسرے نقصانات
ہوتے ہیں اور جن میں زیر زمین آبی وسائل کا نقصان
بھی شامل ہے۔ ان کے علاوہ صرف سیلابوں سے
ہونے والا نقصان ہر سال بڑھتا جارہا ہے۔ ایک
تخمینے کے مطابق یہ نقصان گزشتہ ۲۵ سال میں ۳۵
ارب روپے کا ہوا ہے۔ جنگلات کاٹ کر جو زمین زیر
کاشت لائی جارہی ہے، وہ اکثر زراعت کے لئے غیر موزوں
ہے۔ اس سے زیادہ موجودہ زمین پر زیادہ گھنی کھیتی کر کے
حاصل کیا جاسکتا تھا۔ (ترجمہ) ■

الرسالہ کوئی کاروبار نہیں۔ اس کا مقصد اسلام کا احیاء اور ملت کی تعمیر ہے۔

ملت اسلامیہ کے مستقبل کو بدلنے کے لئے اس قسم کی اشاعتی مہم جتنی ضروری ہے، اتنی ہی یقینی یہ بات ہے کہ الرسالہ جیسے پرچہ کو تجارتی بنیادوں پر نہیں چلایا جاسکتا۔

الرسالہ کی مہم کو مسلسل جاری رکھنے اور اس کو کامیابی تک پہنچانے کی صورت صرف یہ ہے کہ ہم کو خصوصی معاونین کی ایک معقول تعداد حاصل ہوجائے۔ قومی اصلاح کا یہ کام خصوصی تعاون ہی کے ذریعہ انجام پاسکتا ہے۔

تعاون کی صورتیں

۱۔ کچھ لوگ اس کے لئے تیار ہوجائیں کہ پانچ سال تک وہ الرسالہ کا زر تعاون کم سے کم ایک ہزار ایک روپیہ سالانہ ادا کریں گے۔

۲۔ ایک معقول تعداد ایسے لوگوں کی تیار ہو جو پانچ سال تک الرسالہ کا زر تعاون کم سے کم ایک سو ایک روپیہ سالانہ ادا کرے

نوٹ: زر تعاون کی ان دونوں صورتوں میں وہ لوگ بھی شریک ہوسکتے ہیں جو مجوزہ رقم کو یکمشت دینے کے بجائے ماہانہ اقساط کی صورت میں ادا کریں۔

کسی صاحب ذوق کے مطالعہ کی میز اس سے خالی نہ ہو

پندرہ روزہ
ترجمان (دہلی) مرکزی جمعیۃ اہل حدیث
کا آرگن ہے۔ دسمبر ۱۹۷۶ء میں اس نے حج نمبر
شائع کیا ہے۔ اس شمارہ میں ماہنامہ الرسالہ پر
تبصرہ شامل ہے۔ یہ تبصرہ معاصر ترجمان کے شکریہ کے
ساتھ یہاں نقل کیا جاتا ہے

"مولانا وحیدالدین خاں کی شخصیت علمی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ موصوف ایک اچھے اسلامی مفکر ہیں۔ آپ کے سوچنے اور لکھنے کا انداز بڑا مؤثر و دل کش ہوتا ہے۔ جب دنوں ہفت روزہ الجمعیۃ آپ کی ادارت میں نکل رہا تھا موصوف کے مؤثر و دل کش و معیاری انداز تحریر و اسلوب نگارش نے اس پرچہ کو بڑا مقبول بنا دیا تھا۔ ہم لوگ اس کے ہر نئے شمارہ کا انتظار کیا کرتے تھے۔ اب موصوف نے الرسالہ کا اجرا کیا ہے۔ اس کا پہلا شمارہ اس وقت میرے سامنے ہے ہر لحاظ سے پسندیدہ و معیاری۔ اس کے اجرا کا مقصد کیا ہے اسے خود مولانا کے لفظوں میں پڑھئے۔ فرماتے ہیں۔

(الرسالہ ماہ اکتوبر صفحہ ۳ کی عبارت نقل کرنے کے بعد)

"اسی کے ساتھ موصوف نے اسلام کے تعارف پر متعدد زبانوں میں معیاری کتابیں شائع کرنے، مکتبہ قائم کرنے وغیرہ کا ایک بڑا خوش کن و امید افزا پروگرام ذکر فرمایا ہے اس میں شک نہیں کہ اس وقت مؤثر اور مثبت اور معیاری انداز میں اسلام کے تعارف کی بے حد ضرورت ہے۔ یہ مذاہب پر تقابلی مطالعہ کا دور ہے اور غیر مسلموں کی بڑی تعداد اسلام کو جاننا چاہتی ہے۔ خدا مولانا کے عزائم میں برکت دے اور ان عزائم کی تکمیل مقدر فرمائے۔

"اس بات کو واضح کر دینے کے بعد کہ الرسالہ مولانا وحیدالدین خاں صاحب کی نگرانی میں نکل رہا ہے میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ پرچہ ہر لحاظ سے معیاری ہے اور اس لائق ہے کہ اسے ضرور منگایا جائے اور کسی صاحب ذوق کے مطالعہ کی میز اس سے خالی نہ رہنے پائے۔ مولانا کی سرپرستی اس کے معیاری ہونے کی گارنٹی ہے۔

کسی گروہ کو طاقت ور بنانے والی سب سے بڑی چیز باہمی اعتراف ہے
اگرچہ یہی وہ چیز ہے جو کسی گروہ میں سب سے کم پائی جاتی ہے

کیا تاریخ دوبارہ مذہب کی طرف لوٹنے والی ہے۔

۱۷۸۹ میں جب جارج واشنگٹن کو امریکہ کا پہلا صدر چنا گیا تو ایک گھوڑ سوار پیغام بر نے یہ خبر انھیں پہنچائی تھی۔ ریاست ورجینیا میں واقع موصوف کے مکان تک پہنچنے میں اس امریکی افسر کو سات دن لگ گئے تھے۔ اس کے برعکس ۲ نومبر ۱۹۷۶ کو جب امریکہ کا ۳۹ واں صدارتی انتخاب ہوا تو ووٹنگ ختم ہونے کے صرف چند منٹ بعد ساری دنیا نے جان لیا کہ مسٹر جمی کارٹر کو امریکہ کا نیا صدر چن لیا گیا ہے۔

۱۹۳۲ کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ وہائٹ ہاؤس میں بیٹھے ہوئے ایک صدر کو اپنے حریف سے شکست کھانی پڑی۔ اس واقعہ کا ایک حیران کن پہلو یہ ہے کہ جمی کارٹر (پیدائش ۱۹۲۴) کی اس تاریخی کامیابی میں بڑا دخل مذہب کا ہے۔ جمی کارٹر اپنی انتخابی تقریروں میں یہ بتانا کبھی نہیں بھولتے کہ وہ ایک راسخ العقیدہ عیسائی ہیں۔



ان کی تقریریں روحانیت اور بائبل کے اقتباسات سے بھری ہوتی تھیں۔ وہ صاف لفظوں میں کہتے تھے کہ وہ موجودہ مسائل کا حل مذہب کی روشنی میں کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم امریکہ کے موجودہ مایوس معاشرہ کو مذہب کے اندر امید کی نئی کرن دکھانے کی قیمت ۲۵ ملین ڈالر تھی۔ جمی کارٹر کو اپنی انتخابی مہم کی کامیابی کے لئے نہ صرف یہ بھاری رقم خرچ کرنی پڑی بلکہ انھوں نے دوڑ دھوپ کا بھی ریکارڈ توڑ دیا۔ انھوں نے چار لاکھ ۶۱ ہزار میل کے ہوائی سفر کئے۔ ۱۰۲۹ شہروں میں گئے اور ۱۴۹۵ تقریریں کیں۔ پچھلے پانچ برس سے وہ روزانہ اوسطاً ۶۰۰ آدمیوں سے مصافحہ کر رہے تھے۔

یہاں ایک امریکی اخبار کا کارٹون نقل کیا جا رہا ہے۔ اس کارٹون میں ترازو کے ایک طرف فورڈ اور ریگن ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اقتدار اور الحاد۔ دونوں نے مشترکہ طور پر اپنا وزن ایک پلہ میں ڈال دیا ہے۔ دوسری طرف کارٹر ہیں جو اپنے ہاتھ میں مقدس بائبل لئے ہوئے ہیں۔ شدید مقابلہ کے باوجود کارٹر کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے۔

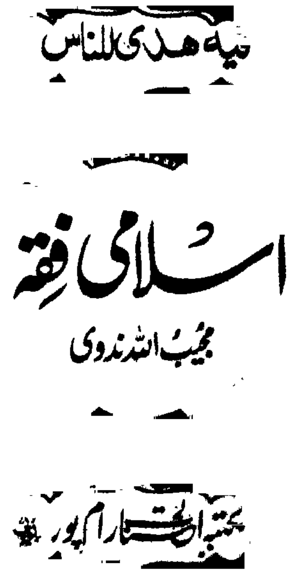
بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں دنیا کے سب سے زیادہ "ترقی یافتہ" ملک میں یہ واقعہ ہونا کہ ایک شخص مذہب کا نام لے کر الکشن جیت جائے، دراصل دنیا میں ایک نئی تبدیلی کا اعلان ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ انسان مادی ترقی کی آخری انتہا پر پہنچ کر دوبارہ فطرت کی طرف لوٹ رہا ہے۔ چنانچہ اس کا رخ مذہب کی طرف ہو چکا ہے۔ اب یہ مذہب کے نمائندوں کا امتحان ہے کہ وہ اس نئے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں یا دوبارہ اسے ضائع کر دیتے ہیں۔

تعارف وتبصرہ [redacted]

اسلامی فقہ

از مولانا مجیب اللہ ندوی
صفحات ۸۰۰، قیمت مجلد مع کور ۲۵ روپے
پتہ: مکتبہ الحسنات، رام پور، یوپی

کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ عبادات، دوسرا معاشرت، تیسرا معاملات۔ اس طرح اس کتاب میں زندگی کے تمام امور سے متعلق اسلامی احکام کی تفصیل آگئی ہے۔



اسلامی فقہ پر اردو زبان میں متعدد مختصر اور مطول کتابیں موجود ہیں، تاہم یہ کتاب بعض پہلوؤں سے ممتاز ہے۔ ہند و پاک کے مسلمان زیادہ تر حنفی المسلک ہیں، اس لئے یہ کتاب اگرچہ اصلاً اسی مسلک کے مطابق لکھی گئی ہے، تاہم اس میں دوسرے متداول فقہی مسالک مثلاً مالکی، شافعی اور حنبلی کا ذکر بھی آگیا ہے۔ دوسرے یہ کہ فقہی تنگی کے بجائے اس میں بعض مسائل خصوصاً معاملات میں حسب ضرورت دوسرے مسالک کو بھی ترجیح دی گئی ہے۔ پھر یہ کہ ہر بیان کے آغاز میں قرآن وحدیث کے حوالے بھی دئے گئے ہیں تاکہ قاری کا ذہن اصل اسلامی ماخذ سے جڑا رہے۔ اس طرح کی دوسری خصوصیات نے اس کتاب کو اپنے موضوع پر ایک مفید اور جامع کتاب بنا دیا ہے۔

سالنامہ تنویر

صفحات ۹۶
جامعہ دار السلام، عمرآباد، ضلع شمالی ارکاٹ

یہ جامعہ دار السلام کے طلبہ کا رسالہ ہے۔ جامعہ میں طلبہ کی انجمن کے تحت طلبہ کو تحریر کی مشق کرائی جاتی ہے اور تعلیمی سال کے اختتام پر سب کی طرف سے ایک میگزین شائع کیا جاتا ہے۔ یہ اسی قسم کا ۱۹۷۶ کا شمارہ ہے۔ اب تک یہ میگزین قلمی ہوتے تھے۔ اس سال اسے عمومی افادیت کے پیش نظر شائع کر دیا گیا ہے۔ سالنامہ میں دینی، علمی اور اصلاحی مضامین ہیں نیز غزلیں شامل ہیں۔

طلبہ کے میگزین نکالنے کا رواج بہت مفید ہے۔ مگر زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ اس قسم کے میگزین میں طلبہ اور طلبہ کے مسائل کا جائزہ شامل ہو۔

سوال: بہت سے لوگ جمعہ کے دن سورہ کہف پڑھتے ہیں اور اس کا بہت ثواب بتاتے ہیں، اس سلسلہ میں آپ کی تحقیق کیا ہے۔

جواب: متعدد روایتوں میں سورہ کہف کو جمعہ کے دن پڑھنے کی فضیلت بتائی گئی ہے۔ مگر یہ تمام روایتیں ضعیف ہیں۔ قوی روایت صرف وہ ہے جس کو احمد اور مسلم نے قتادہ سے نقل کیا ہے:

من حفظ عشر آیات من اول سورۃ الکہف

عصم من الدجال

جس شخص نے سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیتوں کو محفوظ رکھا وہ دجال سے محفوظ رہے گا۔

اس روایت میں نہ تو "پڑھنے" کا ذکر ہے نہ "جمعہ" کے دن کا۔ صرف یہ کہا گیا ہے کہ سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیتوں میں جو تعلیم دی گئی ہے، جو شخص ان کو ذہن نشین کرے گا اور ان کو اپنی زندگی میں ملحوظ رکھے گا، الدجال کے ظہور کے وقت اس کے فتنہ سے بچ جائے گا۔

اب سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیتوں کو دیکھئے۔ غور کیا جائے تو ان میں دو اسوہ ملتا ہے۔ ایک پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ جو لوگوں کو خدا پرست بنانے کی کوشش میں اپنے کو ہلاک کئے دے رہے تھے۔ (کہف — ۶) دوسرے آپ سے قبل کے کچھ صالح نوجوان (اصحاب کہف) کا اسوہ جنھوں نے یہ دیکھ کر کہ وہ لوگوں کے درمیان اپنے دین کو بچا نہیں سکتے، بستی سے نکل کر غاروں میں جا چھپے (کہف — ۱۰)

کہ سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیتوں کا سبق یہ ہے کہ جب زمین پر فتنہ کی حالت پیدا ہو جائے اور خدا کی خلاف ورزی ہونے لگے، تو اہل ایمان کے لئے دو ہی راستے ہیں — اول یہ کہ غافل اور سرکش لوگوں کو اللہ کا پیغام پہنچائیں اور اس میں اپنی پوری طاقت صرف کر دیں۔ دوسرے یہ کہ اگر وہ دیکھیں کہ معاملہ اس نوبت کو پہنچ چکا ہے کہ دوسروں کی اصلاح کے بجائے وہ خود اپنے آپ کو آزمائش میں مبتلا کر لیں گے تو ایسی حالت میں انہیں چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو عوام الناس سے الگ کر لیں اور کسی گوشے میں سمٹ کر زندگی کے بقیہ ایام پورے کر کے مر جائیں — پہلی صورت اقدام کی ہے، دوسری تحفظ کی۔

۱۔ اگر آپ کو الرسالہ پسند ہے تو فوراً سالانہ تعاون کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیے۔ تاکہ آپ تعمیر و اصلاح کی اس تاریخی مہم میں شریک ہو سکیں جو اس ماہنامہ کے ذریعہ شروع کی گئی ہے۔

۲۔ الرسالہ کا سالانہ زر تعاون بھیجتے ہوئے آپ اپنے عزیزوں اور دوستوں کے پانچ پتے ہمیں بھیج سکتے ہیں۔ ہم ان کو نمونہ کا پرچہ مفت روانہ کر دیں گے۔

——— منیجر الرسالہ۔

Single Copy Rs. 2.00

Regd. No. D [illegible]
[illegible]
JANUARY - [illegible]

AL-RISALA MONTHLY

1036 KISHANGANJ, DELHI-110006 (INDIA)

الاسلام

از: مولانا وحید الدین خان

صفحات ۲۴۰ ــــــ قیمت مجلد ۱۵ روپے

اسلام اور مسائل حاضرہ کا ایک جامع مطالعہ

اپنے موضوع پر اس نوعیت کی پہلی کتاب

ابواب:
- جدید مسئلہ کیا ہے
- حقیقت دین
- ارکان اربعہ (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ)
- صراط مستقیم
- اسوۂ نبوت
- تحریک اسلامی، سیرت کی روشنی میں
- موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکیں
- تعمیر ملت
- دعوت الی اللہ
- دعوت اسلامی کے جدید امکانات

رسالہ بک ڈپو ۔ ۱۰۳۶ کشن گنج دہلی ۶

محمد احمد پرنٹر پبلشر مسئول نے جے۔ کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر "دفتر الرسالہ" ۱۰۳۶ کشن گنج دہلی سے شائع کیا

الرسالہ

★ سرپرست ★

مولانا وحید الدین خاں

"ہماری قوم جاہل ہے، آپ اس [illegible] دور کرنے کے لئے کیوں نہیں اٹھتے"

"آپ نے خود کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے"

"میں تو بد قسمتی سے کوئی تعلیم حاصل نہ کر سکا"

"پھر آپ یہ کیجئے کہ فوراً کسی تعلیمی ادارہ میں داخلہ لے لیجئے۔ اگر آپ نے پڑھ لیا تو قوم کا کم سے کم ایک جاہل کم ہو جائے گا"

دو شخصوں کی یہ گفتگو بتاتی ہے کہ موجودہ حالات میں ہمارے کرنے کا کام کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ دوسروں کو تلقین کرنے کے بجائے ہر شخص اپنے کام میں لگ جائے۔ زندہ قوم کی علامت یہ ہے کہ اس کا ہر شخص "میں کیا کروں" کے سوال پر سوچتا ہے۔ اس کے برعکس جب قوم کے افراد "دوسرے کیا کریں" کے سوال پر بحث کرنے لگیں تو سمجھنا چاہئے کہ قوم مرچکی ہے۔ اس قسم کی حرکت موت کی حرکت ہے نہ کہ زندگی کی حرکت۔

جلد ا شمارہ ۵	زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے۔ بیرون ہند سے ۱۰ ڈالر۔ فی پرچہ دو روپیہ	فروری ۱۹۷۷

خصوصی تعاون سالانہ : کم سے کم ایک سو ایک روپیہ

فہرست

اداریہ • ہمارا پروگرام ۳
قرآن • داعیِ حق کے اوصاف ۸
حدیث • خدائی قانون میں جانب داری نہیں ۳۳
حقیقت دین • اسلامی تحریک آخرت کے لئے اٹھتی ہے نہ کہ سیاست کے لئے ۴
دین آخرت طلبی کا نام ہے ۱۲
دعوت و تعارف • سب سے زیادہ ضروری کام ۶
انھیں کیا کرنا تھا، وہ کیا کر رہے ہیں ۲۴
تاریخ • ابولہب کو یہ بات غیر اہم نظر آئی ۱۲
تعمیر ملت • حقائق کا مقابلہ الفاظ سے نہیں کیا جا سکتا ۱۸
جدید تحقیقات • آسمان کا مشاہدہ پلانیٹیریم میں ۱۶
اشاعت اسلام • حکمرانوں کا قبول اسلام ۲۸
نفسیات • وہ اپنے وطن سے دور نہ تھا ۲۳
آدمی اپنے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے ۳۰
اسلام اور عصر حاضر • جدید سائنس قرآن کا علم کلام ہے۔ ۳۴
عربی پریس • لمثل ھذا فلیعمل العاملون ۲۶
اسلامی دنیا • یونان میں مسلمان ۲۴
معلومات • قدیم انسان کی تلاش ۴۸
دیگر مذاہب • انھوں نے ناموافق کو اپنے لئے موافق بنالیا ۴۷
ادب • لطیفہ ۱۰
لفظ ادب کی تحقیق ۵۴
صحت و طب • اس کا ارادہ اس کی بیماری پر غالب آیا ۲۰
ملکی ترقیاں • برآمدی تجارت کی ترقی کے لئے بندرگاہ کی ترقی ۳۲
اقتصادیات • کھمب کی کاشت ۲۱
شخصیات • ڈاکٹر حسین ظہیر ۵۵
سیاحت • روداد سفر ۵۷
تعارف و تبصرہ • حلیۃ النبی ۵۹
سوال و جواب ۶۱

اداریہ

اسلامی مرکز، جس کے آرگن کے طور پر الرسالہ جاری کیا گیا ہے، اس کا کوئی بھی تعلق سیاست سے نہیں ہے۔ اس کا مقصد تمام تر تعمیری اور اصلاحی ہے۔

ہمارا یہ خیال کہ دین کا کام سیاست سے الگ ہو کر کرنا چاہئے، کوئی نیا اور وقتی نہیں ہے۔ مولانا وحیدالدین خاں صاحب، جن کی خصوصی سرپرستی اور نگرانی میں الرسالہ جاری کیا گیا ہے، تقریباً ۲۰ سال سے اس نقطۂ نظر کی وکالت کرتے رہے ہیں جس کا ثبوت موصوف کی مطبوعہ کتابوں اور چھپے ہوئے مضامین میں موجود ہے۔

پچھلے دس برس سے مولانا موصوف ہفت روزہ الجمعیۃ میں اس نقطۂ نظر پر جو کچھ لکھتے رہے ہیں، وہ سارے لوگوں کو معلوم ہے جس کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ تاہم موصوف کی قدیم مطبوعہ تحریروں میں سے ایک تحریر زیر نظر شمارہ میں نقل کی جا رہی ہے۔ اس تحریر میں دیکھا جا سکتا ہے کہ انھوں نے سترہ سال پہلے، دین کی سیاسی تعبیر و تشریح کو "فتنہ" قرار دیتے ہوئے، کس طرح اس کے خلاف انتباہ دیا تھا۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم سیاست کو دین سے خارج سمجھتے ہیں۔ جو چیز زندگی سے خارج نہ ہو، وہ دین سے کس طرح خارج ہو سکتی ہے۔ ہمارا مقصد صرف اس نکتہ پر زور دینا ہے کہ دینی پروگرام کو لازماً سیاسی پروگرام کے ہم معنی نہ ہونا چاہئے۔ اسلام کا مقصد سیاسی نظام قائم کرنا نہیں ہے اور نہ یہ کہ سیاسی اقتدار حاصل نہ ہو تو اس کے ماننے والے وقت کے حکمرانوں کے خلاف اپوزیشن کا کردار ادا کرتے رہیں ہمارا کام لوگوں کو آخرت کے مسائل کی طرف متوجہ کرنا ہے نہ کہ دنیا کے مسائل کی طرف۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ کسی وقت خاص میں جو سیاسی اور اجتماعی حالات ہوں ان سے مسلمان متاثر ہوں جس طرح دوسرے لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ مگر ہمارا رویہ محض ان خارجی اثرات کا نتیجہ نہ ہونا چاہئے بلکہ خود اپنے اسلامی فکر کے تحت بننا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ خارجی اثرات کو ہمیں برداشت کرنا ہے تاکہ ہم اپنے اصل مقصد — پیغام خداوندی کی اشاعت کا کام صحیح طور پر جاری رکھ سکیں۔

قرآن میں تمام عبادات سے زیادہ صبر و استقامت پر زور دیا گیا ہے۔ اس کی حکمت یہی ہے۔ صبر کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی ناخوش گوار صورت پیش آئے تو جوابی ذہن کے تحت نہ اٹھ کھڑے ہو، بلکہ اپنے جذبات پر قابو رکھ کر غور کرو۔ تمہارا منصوبہ ردعمل کی نفسیات کا نتیجہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ اپنی علیحدہ ایجابی فکر کے تحت بننا چاہئے۔

موجودہ حالات میں ہمارا سوچا سمجھا ہوا پروگرام یہ ہے:

۱۔ مسلمانوں کے اندر قرآنی طرز فکر پیدا کرنا، تعلیم اور دوسرے اشاعتی ذرائع سے۔

۲۔ اپنے حقوق کے لئے احتجاج اور مطالبہ کی مہم ترک کرنا اور تعمیر و استحکام کے طریقہ کو رواج دینا۔

۳۔ غیر مسلموں میں اسلام کا تعارف، لٹریچر اور دوسرے ذرائع سے۔ ■

(ظفرالاسلام خاں)

سترہ سال پہلے کی بات ہے۔ راقم الحروف نے "تاریخ سے سبق" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا تھا۔ اس میں سیاسی پارٹیوں کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اسلامی تحریک کو سیاسی انداز سے نہیں چلایا جا سکتا۔ موجودہ زمانہ میں انسان عام طور پر اس انداز میں سوچتا ہے کہ سماج کے سیاسی اور اقتصادی ڈھانچہ کو کس طرح بدلا جائے اور اس کو کس طرح نئی بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ ماحول میں اس طرز فکر کا رواج اسلام کے خادموں کے لئے "فتنہ" کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر ہم نے اس سے بچنے کی کوشش نہ کی تو ہم خدا کے دین کو سیاست بنا کر رکھ دیں گے —— اور اس کے بعد ان تمام نتائج سے دوچار ہوں گے جو سیاسی تحریکوں کے لئے مقدر ہیں۔"

(زندگی رام پور، ذی الحجہ ۱۳۷۹ھ)

اس کے بعد اگلے سال بدایوں (یوپی) میں مسلمانوں کا ایک بڑا دینی اجتماع ہوا جس میں دوبارہ اظہار خیال کا موقع ملا۔ اس موقع پر راقم الحروف نے ۱۶ اپریل ۱۹۶۱ کی نشست میں ایک مفصل تقریر کی۔ یہ تقریر اسی زمانہ میں "قرآن کا مطلوب انسان" کے عنوان سے رسالہ زندگی رام پور میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا ایک حصہ یہاں رسالہ مذکور کے قدیم فائل سے نقل کیا جا رہا ہے

۱۰ برس پہلے

اسلامی تحریک آخرت کے سوال کو لے کر اٹھتی ہے نہ کہ سیاست کے سوال کو

" یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تمام چیزوں کو اس ڈھنگ پر بنایا گیا ہے کہ ایک ہی چیز سے آدمی نصیحت بھی حاصل کر سکتا ہے اور وہی بیک وقت اس کے لئے فتنہ میں پڑنے کا بھی ذریعہ ہے —— یہی حال خدا کی کتاب کا بھی ہے۔ بلاشبہ قرآن کتاب ہدایت ہے۔ مگر قرآن سے آدمی کو وہی کچھ ملے گا جو وہ اس سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔

قرآن کے ذریعہ بے راہ ہونے کی ایک صورت وہ ہے جس کو قرآن میں مضاہات کہا گیا ہے (توبہ۔ ۳۰) مضاہات کے معنی عربی زبان میں ہیں: مشاکلۃ الشیٔ بالشیٔ (لسان العرب) یعنی کسی چیز کو دوسری چیز کے ہم شکل قرار دینا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیوی مصالح کی بنا پر اجنبی خیالات سے متاثر ہو کر ایک غیر قرآنی بات کو قرآنی بنا کر پیش کیا جائے۔

مضاہاۃ کی یہ خرابی آدمی کے اندر خاموشی کے

اور اس کے بعد ان تمام نتائج سے دوچار ہوں گے جو سیاسی تحریکوں کے لئے مقدر ہیں

ساتھ داخل ہوجاتی ہے۔ یہ خیال کہ جو بات لوگوں سے کہنی ہے وہ ایسی ہونی چاہئے جو لوگوں کے ذہن سے قریب تر ہو تاکہ وہ اس کو قبول کرسکیں اور دوسرے یہ کہ بات کو ایسے الفاظ اور اصطلاحات میں پیش کیا جائے کہ وقت کا معیارِ فکر اس کی اہمیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو، وقت کے علمی خیالات کے ساتھ وہ پہلو بہ پہلو جگہ لے سکے۔ یہ طرز اگرچہ بذات خود غلط نہیں ہے مگر بعض مرتبہ آدمی کے ذہن میں خدائی تعلیمات کی ایسی تصویر بنادیتا ہے جو اصل تعلیمات سے زیادہ وقت کے نظریات سے مطابقت رکھنے والا ہو۔ خدائی تعلیمات سے جزوی مشابہت تو ضرور اس میں موجود رہتی ہے مگر درحقیقت وہ اسلامی الفاظ اور اصطلاحات میں غیر اسلامی خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے۔

اگر بے جا جسارت نہ ہو تو میں عرض کروں گا کہ تصوف جو بعض محققین کے نزدیک یونانی لفظ تھیوسوفیا (THEOSOFIA) کی تعریب ہے، وہ بھی اسی نوعیت کا ایک واقعہ ہے جو دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں محض خارجی اثرات کے تحت اسلام کے اندر داخل ہوگیا۔ ہمارے قدیم بزرگ جب اسلام کا پیغام لے کر عرب کے باہر دوسرے ملکوں میں گئے تو انھوں نے اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پایا جہاں کچھ مخصوص افکار و اشغال لوگوں کے ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے اور مذہب اور مذہبی زندگی کا تصور ان کے بغیر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان افکار و اشغال کی پشت پر ایک زبردست فلسفہ بھی موجود تھا۔ ان چیزوں نے کچھ دعوتی مصلحت اور کچھ انفعالی تاثر کے تحت ہمارے بزرگوں کو آمادہ کیا کہ وہ اسلام کو اس رنگ میں پیش کریں جس سے لوگ پہلے سے مانوس تھے۔ اس طرح نبوت کے دو سو سال بعد اسلام کی متصوفانہ تعبیر ہماری تاریخ میں داخل ہوگئی۔

اب قدیم روحانی انداز میں سوچنے کا زمانہ ختم ہوچکا ہے اور ہم ایک ایسی دنیا میں سانس لے رہے ہیں جب کہ ہر طرف معاشی اور سیاسی تحریکوں کا زور ہے۔ آج کا انسان عام طور پر اس انداز میں سوچتا ہے کہ موجودہ سماجی ڈھانچہ کو بدل کر کسی اور بنیاد پر دنیا کا نظام چلایا جائے۔ یہ اسی قسم کا ایک نیا فتنہ ہے جس سے ہمارے پیش روؤں کو سابقہ پیش آیا تھا۔ وہ اگر تعبیر روحانیت کا فتنہ تھا تو یہ تعبیر مادیت کا فتنہ ہے۔ اب اگر ہم نے اس فتنے کو نہ پہچانا اور اس سے اپنے دین کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہ کی تو ہم بھی دین کی تعبیر میں اسی قسم کی غلطی کریں گے جو اس سے پہلے صوفیائے کرام سے ہوچکی ہے، اور پھر قرآن کی ایک نئی تفسیر کرکے قدیم روحانی تصوف کی طرح اسلام کو جدید سیاسی تصوف بنا کر رکھ دیں گے اور اس کے بعد ان تمام نتائج سے دوچار ہوں گے جو سیاسی تحریکوں کے لئے مقدر ہیں" ■

وحید الدین خاں

(مطبوعہ ماہنامہ زندگی رام پور۔ ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ)

سب سے ضروری کام یہ ہے

دسمبر ۱۹۷۶ کا واقعہ ہے۔ دہلی کے انگریزی اخبار انڈین اکسپرس نے ایک باتصویر خبر شائع کی جس کا عنوان تھا

کیا ونود کو مرجانا چاہئے۔

تصویر میں کنٹھ بلی نامی سبزی فروش کو اپنے دس سالہ لڑکے ونود کے ساتھ دکھایا گیا تھا۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ ونود دل کا مریض ہے۔ اس کے علاج کے لئے اس کا باپ اپنے وطن اننت ناگ (کشمیر) سے دہلی آیا۔ یہاں ڈاکٹروں نے بتایا کہ ونود کا مرض سنگین ہے اور اس کے علاج میں دس ہزار روپے خرچ ہوں گے۔ اب غریب کنٹھ بلی پریشان ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ علاج کا یہ بل کہاں سے ادا کرے اور اپنے بچے کی زندگی کس طرح بچائے۔

اس خبر کا چھپنا تھا کہ اخبار کے دفتر میں ہر طرف سے روپے آنا شروع ہو گئے۔ صرف تین دن کے بعد ۹ دسمبر کی اشاعت میں اخبار کو اعلان کرنا پڑا کہ "ونود فنڈ" بند کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس فنڈ میں اب تک ۲۵ ہزار روپے آچکے ہیں جو کہ علاج کے علاوہ باپ اور بیٹے کی دوسری ضرورتوں کے لئے بھی کافی ہیں۔

عجیب بات ہے کہ ٹھیک اسی زمانہ میں اسلامی مرکز کے آرگن ماہنامہ الرسالہ نے بھی ایک تجربہ کیا۔ انگریزی اخبار کی پکار تھی "ونود کو بچاؤ" الرسالہ نے آواز لگائی کہ "انسانیت کو بچاؤ" انگریزی اخبار نے

Rich and poor come
Vinod's aid in big w



کنٹھ بلی اور اس کا لڑکا ونود غم اور بیماری کے بوجھ سے دبے ہوئے دارالسلطنت میں داخل ہوئے تھے۔ مگر اخبار میں شائع شدہ ان کی صرف ایک اپیل پر قوم نے ان کو اتنا زیادہ تعاون دے دیا کہ اب ان کے چہرے پر خوشی اور کامرانی کی شادمانی کے سوا اور کچھ نہیں ——

کہ انسانیت کے قافلہ کو آنے والے دن سے آگاہ کیا جائے

ایک بچہ کی چند روزہ دنیوی زندگی کو بچانے کا نعرہ دیا تھا۔ الرسالہ نے بتایا کہ سارے انسانوں کی زندگی خطرہ میں ہے۔ لوگ نہایت تیزی سے آخرت کے دائمی عذاب کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مرنے سے پہلے انہیں پیغمبر خدا کی یہ چیتاونی پہنچا دی جائے:

انتم الیوم فی عمل ولاحساب وستکونون غداً فی حساب ولا عمل

آج تم کو عمل کا موقع ہے اور تمہارے اوپر حساب نہیں ہے، آنے والی دنیا میں تم کو حساب دینا ہوگا اور عمل کا موقع نہیں ہوگا۔

یہ صحیح ہے کہ لفظی تعریف کے خطوط بھیجنے میں لوگوں نے ہمارے ساتھ بخل نہیں کیا۔ مگر جہاں تک حقیقی تعاون کا سوال ہے، ہر طرف سے ایک ہی خاموش صدا آ رہی ہے:

زر می طلبی سخن دریں است

حال ہی میں نہرو کے شیدائیوں نے بمبئی میں دس کروڑ روپے کے خرچ سے ایک عظیم الشان نہرو مرکز قائم کر دیا مگر اسلام کے شیدائیوں میں اسلامی دعوت کا مرکز قائم کرنے کا کوئی حوصلہ نہیں۔

مگر یاد رکھئے، یہ صرف دوسروں کو آگ سے بچانے کا معاملہ نہیں ہے بلکہ خود اپنے آپ کو بچانے کا معاملہ بھی ہے۔ آخرت کی حقیقت سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے اگر ہم نہیں اٹھتے تو ہم نہ صرف اپنے فرض کو چھوڑ رہے ہیں، بلکہ یہ ثبوت بھی دے رہے ہیں کہ ہم کو آنے والے ہولناک دن کا یقین نہیں۔ اس دوہرے جرم کے بعد آخر وہ کون سی چیز ہوگی جو اس دن کی پکڑ سے ہم کو بچا سکے جب مالک کائنات کی عدالت قائم ہوگی۔ جب نہ کسی کے لئے وکیل بازی کا موقع ہوگا اور نہ کوئی مادی سہارا کسی کے کام آسکے گا۔ والامر یومئذ للہ

مسلمان خدا کی طرف سے اس ذمہ داری پر مقرر کئے گئے ہیں کہ وہ تمام اہل عالم کو یہ بتا دیں کہ ان کا رب ان سے حساب لینے والا ہے۔ اس تقرر نے ان کے حال اور مستقبل کو اس کار خاص کے ساتھ باندھ دیا ہے۔ خدا کی نظر میں ان کی قیمت صرف اس وقت ہے جب کہ وہ خدائی پیغام رسانی کی اس خدمت کو انجام دیں۔ اگر وہ اس کے لئے نہ اٹھیں تو خدا کے نزدیک وہ اپنی قیمت کھو دیں گے۔

اس ذمہ داری کو چھوڑنے کے بعد کوئی بھی دوسرا عمل ان سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بعد خدا ان کو ان کے دشمنوں کے حوالے کر دے گا۔ ان کے اوپر دوسری قومیں غلبہ حاصل کر لیں گی۔ حتی کہ دوسری بنیادوں پر اٹھائی ہوئی ان کی اسلامی تحریکوں پر بھی رولر چلا دیا جائے گا۔ خود ساختہ خیالات کی بنا پر اگرچہ وہ خوش فہمیوں میں مبتلا رہیں گے۔ مگر حالات کی بے رحم زبان چیخ رہی ہوگی کہ ان کا خدا ان کو چھوڑ چکا ہے۔

اقوام عالم کے سامنے اللہ کے دین کی گواہی دینے کے لئے اگر مسلمان نہیں اٹھتے تو ان کی کوئی قیمت خدا کے نزدیک نہیں ہے، نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں ——

یہود کی تاریخ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔

اسلام کے داعی کے اندر کیا اوصاف ہونے چاہئیں

شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود

جامعہ ازہر مصر کے شیخ ڈاکٹر عبدالحلیم محمود نے نومبر ۱۹۷۶ء میں ہندستان کا دورہ کیا۔ اس سلسلے میں وہ جامعہ ڈابھیل (سورت) بھی گئے۔ یہاں اساتذہ طلبہ اور مقامی لوگوں پر مشتمل ایک اجتماع ہوا جس میں تقریباً دس ہزار لوگوں نے شرکت کی۔ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی بڑی تعداد میں شریک تھے۔ اس موقع پر شیخ الازہر نے ۱۱ نومبر کو جو عربی تقریر کی تھی اس کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

(بعد حمد و صلوٰۃ) کون سی شرطیں ہیں جن کا پایا جانا داعی کے اندر ضروری ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ داعی بصیرت کے ساتھ دعوت پیش کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: قل ھذہ سبیلی ادعو الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی من المسلمین یعنی داعی کے اندر پہلی چیز جس کا پایا جانا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ دعوت کے سلسلے میں اسے پوری بصیرت حاصل ہو اور بلاشبہ بصیرت علم کو بھی متضمن ہے یعنی داعی کو دعوت کے طریقے اور انداز سے بھی واقف ہونا چاہیے، اسے قرآن کا علم ہونا چاہیے اسے حدیث سے واقفیت ہونی چاہیے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ۔ اللہ نے فرمایا لا یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون۔ آنحضورؐ نے فرمایا۔ اطلبوا العلم ولو کان بالصین اور فرمایا طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ۔ معلوم ہوا کہ دعوت کے

" موجودہ زمانہ میں اسلام کے بارے میں بہت سے شبہات پیدا ہوگئے ہیں ان شبہات سے واقفیت اور ان کے جواب سے واقفیت اسلام کے ایک داعی کے لئے ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ان کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان کتابوں میں اس قسم کے شبہات کا کافی وشافی ردّ موجود ہے:

الاسلام یتحدی	وحیدالدین خاں
حقائق الاسلام واباطیل الخصوم	عباس محمود العقاد
الاسلام والعصر الحدیث	ڈاکٹر اسماعیل
الوحی المحمدی	رشید رضا مصری "

سلسلے کی پہلی چیز یہ ہے کہ اُسے علم بالقرآن اور علم بالسنت حاصل ہو۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرمایا اور آنحضورؐ نے اس کی شرح فرمائی۔ آپ کی اس شرح کو ہم سنت سے تعبیر کرتے ہیں اور احادیث کی بہترین کتابوں میں سے یہ صحاح ستہ کی کتابیں ہیں جن کے مؤلفین نے بڑی محنت کے بعد ان کو جمع کیا ہے۔ امام بخاریؒ امام مسلم اور دوسرے مصنفین محض اللہ کی رضامندی کے لئے تدوین و ترتیب میں لگے رہے۔ بہترین کتابوں میں سے جو ایک مسلمان کی عادت و اخلاق کی پوری شرح کرتی ہے، ریاض الصالحین ہے جو امام نودی کی مصنفہ ہے۔ اس کتاب میں ضعیف اور موضوع حدیثیں نہیں ہیں بلکہ یا تو صحیح حدیثیں ہیں یا حسن جو ایک مسلمان کے عمل کے لئے کافی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح سے قرآن کے شارح اپنے قول سے تھے اسی طرح آپ اس کے شارح اپنی زندگی کے اعتبار سے بھی تھے۔ آپ کا اخلاق قرآن تھا جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کان خلقہ القرآن۔ معلوم ہوا کہ داعی کو یہ ضرورت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے بھی واقف ہو اور اس کے لئے اسے سیرت ابن کثیر کا مطالعہ کرنا چاہئے جو سیرت کی بہترین کتاب ہے۔ نیز دعوتی کام کرنے والوں کو چاہئے کہ وہ احیاء علوم الدین کا مطالعہ کریں۔ امام غزالی نے اپنی اس مبارک کتاب میں ہر ایک چیز کو نہایت جامع طریقے سے بیان کیا ہے جس کی ایک داعی کو ضرورت پڑتی ہے۔ اس میں فقہ بھی ہے، اخلاق بھی ہے، سلوک بھی ہے قلب اور اعمال کی صفائی کے سلسلہ کی ہدایات بھی ہیں، احیاء العلوم کے بارے میں شبہہ کیا جاتا ہے کہ اس میں موضوع اور بے اصل حدیثیں بھی ہیں لیکن امام عراقی کی تخریج کے بعد اب یہ ایسی کتاب بن گئی ہے کہ اس پر ہر مسلمان کو فخر کرنا چاہئے اور بہت سی وہ حدیثیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ضعیف ہیں امام زبیدی نے اپنی شرح میں ثابت کیا ہے کہ ان کو ضعیف کہنا درست نہیں ہے بلکہ وہ دوسری سند اور دوسری روایات کے اعتبار سے قوی ہیں اور جن احادیث کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کی کوئی اصل نہیں ہے مرتضیٰ زبیدی جو ایک بڑے محدث ہیں نے ان کی اصل کو دریافت کرلیا ہے لیکن موجودہ زمانے میں دعوت کے سلسلے میں بہت سے شبہات پیدا ہو گئے ہیں اس لئے ان شبہوں سے واقفیت اور ان کے جواب سے واقفیت ایک داعی کے لئے ضروری ہے اور اس سلسلہ میں الاسلام یتحدی (علم جدید کا چیلنج) مصنفہ: وحیدالدین خاں، حقائق الاسلام واباطیل الخصوم مصنفہ عقاد، الاسلام والعصر الحدیث مصنفہ ڈاکٹر اسماعیل، الوحی المحمدی مصنفہ رشید رضا کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ داعی کے لئے موجودہ زمانے میں اسلام پر کئے جانے والے نئے نئے اعتراضات اور اس کے جوابات سے آگاہی ازبس ضروری ہے اور ان کتابوں میں شبہات کا کافی اور شافی طور پر رد ہے

دوسری شرط جو داعی کے لئے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ دعوت دینے والے کے قلب میں صرف اللہ کا خوف ہو وہ کسی سے نہ ڈرے اور بغیر خوف لومة لائم فریضۂ دعوت و تبلیغ کو انجام دیتا رہے نیز تیسری شرط جس کا داعی میں پایا جانا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ وہ دعوت کا کام حکمت اور موعظت کے ساتھ انجام دے

ماحول کی پوری رعایت رکھے۔ ہر طبقہ کے ساتھ اور ہر فضا میں اس طریقے کو اختیار کرے جو طریقہ کہ دعوت کی کامیابی کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ و الموعظۃ الحسنۃ میں فرمایا ہے۔ حالات اور زمانہ کے اعتبار سے دعوت کا وہ طریقہ اختیار کرے جو انسانی مزاج کے مطابق اور حالات کے موافق ہے حکمت و موعظت کا وہ اسلوب اختیار کرے جو قلب کو داعی کی طرف مائل کرے، احساسات کو ابھارے اور انسان کو اللہ کی طرف متوجہ کرے۔

فرمایا گیا وجادلھم بالتی ھی احسن۔ نرم خوئی اور نرم گوئی دعوت کی اساسی شرطوں میں سے ہے۔

فرمایا گیا۔ ولوکنت فظا غلیظ القلب لانفضوا من حولك

آیت مذکورہ میں دوسری بات جو فرمائی گئی وہ عمل صالح ہے اور عمل صالح سے مراد ہر وہ عمل ہے جو اسلامی ہے شریعت اسلامیہ کے مطابق ہے اسلام کے مزاج سے میل کھاتا ہے، اور عمل کی غرض و غایت اللہ کی ذات ہے۔ موضوع اور نیت ہر اعتبار سے اسلام کے مطابق ہے۔ اگر نیت خالص نہ رہی یا اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی اور مقصود رہا تو اس عمل کو نہ اسلامی کہا جائے گا اور نہ اس کا نام عمل صالح رکھا جائے گا۔ اس بات پر موجودہ زمانہ میں تنبیہ حاصل کرنا ضروری ہے کہ جو عمل نیت اور موضوع کے اعتبار اسلامی ہوگا وہی عمل صالح کہلائے گا۔ تیسری اور آخری بات جو اس آیت میں فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ نزال انني من المسلمين۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا ان تسلم قلبك یعنی اللہ کے لئے تمہارا دل جھک جائے۔ یہی اسلام ہے۔ جس چیز کا اللہ نے حکم دیا ہے اُسے کرو اور جس چیز سے منع کیا ہے اس سے رک جاؤ یعنی تمہارے اندر عبدیت اور خضوع کی پوری شان نمایاں ہو۔ یہ ہے اسلام اور اللہ کو واحد جانو۔ سر تمہارا اللہ ہی کے لئے جھکے اور ہر معاملے میں اسی کی اطاعت و انقیاد ہو۔ یہی اسلام کے حقیقی معنی ہیں۔ ■

(الجمعیۃ، ۱۱ نومبر ۱۹۷۵ء)

لطیفہ

گاما پہلوان (۱۹۵۸-۱۸۷۶) کو ۲۰ سال کی عمر میں "رستم ہند" اور اس کے بعد رستم زماں کا خطاب ملا تھا۔ ایک بار جلسہ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر محمد اقبال صدر تھے۔ گاما بھی جلسہ میں موجود تھے۔ لوگ بول چکے تو آخر میں ڈاکٹر اقبال نے اعلان کر دیا کہ گاما اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔

گاما پہلوان کھڑے ہوئے۔ کچھ دیر انھوں نے جسم کو حرکت دی، ہاتھ اِدھر اُدھر ہلایا اور کہا "بھائیو! ورزش کیا کرو"

جب وہ اپنی مختصر تقریر ختم کرکے بیٹھے تو دیکھنے والوں نے یہ دیکھا کہ گاما پہلوان کی نہ صرف پیشانی پر قطرات نمایاں تھے بلکہ کرتا بھی بھیگ چکا تھا ■

الرسالہ کے شائقین سے گزارش ہے کہ وہ پرچہ بذریعہ وی، پی طلب نہ فرمائیں۔ بلکہ اپنا زرتعاون منی آرڈر کے ذریعہ بھیج دیں یہ طرفین کے لئے سہولت کا باعث ہے۔

جو لوگ سالانہ یا شش ماہی زرتعاون بیک وقت ادا نہ کر سکیں، وہ ہر مہینہ دو روپے کا ٹکٹ لفافہ میں رکھ کر بھیج دیں۔ پرچہ انھیں روانہ کر دیا جائے گا۔

خریدار حضرات براہ کرم اپنے خطوط میں خریداری نمبر کا حوالہ ضرور تحریر فرمائیں

خط وکتابت کے وقت یا زرتعاون بھیجتے ہوئے اپنا پتہ صاف اور حتی الامکان انگریزی میں تحریر فرمائیں۔

الرسالہ نہ صرف ملک کے مختلف حصوں میں پڑھا جاتا ہے بلکہ ملک کے باہر بھی عرب دنیا اور دوسرے علاقوں میں جاتا ہے۔ تاجر حضرات الرسالہ میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیں۔

ابولہب کو یہ بات غیر اہم نظر آئی

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جب نبوت ملی اور خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ لوگوں کے درمیان حقیقت کا اعلان کرو تو آپ صفا کی پہاڑی پر چڑھے ۔ اس زمانہ میں کسی بڑے خطرے کے اعلان کے لئے مکہ میں اسی بلند مقام کو استعمال کیا جاتا تھا۔ آپ نے پکار کر لوگوں کو جمع کیا۔ جب لوگ جمع ہوگئے تو آپ نے ایک مختصر تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا:

• لوگو آگاہ ہو جاؤ، جس طرح تم سوتے ہو، اسی طرح تم مروگے اور جس طرح تم جاگتے ہو اسی طرح دوبارہ زندہ کئے جاؤگے۔ اس کے بعد یا ہمیشہ کے لئے جنت ہے یا ہمیشہ کے لئے جہنم"

یہ آخرت کی حقیقت کا اعلان تھا جو دنیا پرست لوگوں کو سنایا جا رہا تھا۔ مگر آپ کے چچا ابولہب کی دنیوی فکر کے لئے یہ پیغام آخرت اتنا غیر مانوس ثابت ہوا کہ وہ فوراً مجلس سے اٹھ گیا اور چلا کر کہا:

تبالک سائر الیوم الھذا جمعتنا

تمہارا برا ہو۔ کیا تم نے یہی بات سنانے کے لئے ہم کو جمع کیا تھا۔

دین کو جب دنیوی سانچہ میں ڈھال کر پیش کیا جائے تو وہ بہت جلد لوگوں میں مقبول ہو جاتا ہے۔

دین آخرت طلبی کا نام ہے

مہاتما گاندھی بھی سوشلزم کو مانتے تھے، اور کمیونسٹ بھی۔ دونوں میں فرق یہ تھا کہ گاندھی جی اعتقادی سوشلزم کے قائل تھے اور کمیونسٹ جبری سوشلزم کے۔ کمیونسٹوں کا سوشلزم عوام میں پھیل گیا، جب کہ گاندھی جی کے سوشلزم کو صرف چند ہی لوگ قبول کر سکے۔ وجہ بالکل سادہ ہے: کمیونسٹوں کا نظریہ عوام کی فکری سطح سے قریب تھا۔ اس کے برعکس گاندھی جی کا نظریہ، نسبتاً زیادہ بہتر ہونے کے باوجود، عوام کے لئے ناقابل فہم تھا۔ اس کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے تھے جو سماجی مسائل پر زیادہ گہرائی کے ساتھ سوچتے ہوں۔

یہی صورت حال مذہب کے ساتھ بھی پیش آتی ہے۔ کوئی مذہبی تحریک عوام میں مقبول ہو رہی ہو تو اس کا لازمی مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ صداقت پر مبنی ہے۔ بالکل ممکن

ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ عوام کی فکری سطح سے قریب ہے۔ رمضان کے مہینے میں ان دکانوں پر زیادہ بھیڑ ہوتی ہے جو سحری افطار کے لذیذ کھانے فروخت کرتی ہیں۔ اس کے برعکس جو شخص روزہ کا فلسفہ بیان کر رہا ہو، اس کے حلقہ میں بہت کم آدمی دکھائی دیں گے۔ کیوں۔ اس لئے کہ لذیذ کھانے کی طلب ہر ایک میں ہوتی ہے۔ جب کہ فلسفیانہ غور و فکر سے لوگوں کے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔

جو مذہب "زردہ اور ریبانی" میں ثواب کا راز بتائے، وہ بہت جلد لوگوں کی حمایت حاصل کرے گا۔ کیونکہ مذہب کی یہ قسم عوام کی فکری سطح سے انتہائی قریب ہے۔ اس کو اختیار کرنے کے لئے ان کو اپنی زندگی کا ڈھانچہ توڑنے کی ضرورت نہیں۔ جو مذہب کشف و کرامت کی داستانیں اپنے ساتھ لئے ہوئے ہو، عوام اس کی طرف دوڑ پڑیں گے کیونکہ عجوبہ پسندی ساری دنیا میں سب سے زیادہ عام انسانی صفت ہے۔ اسی طرح جو لوگ سیاسی اصطلاحوں میں مذہب کو بیان کریں یا جلسوں اور نعروں والا مذہب تقسیم کرتے ہوں وہ بہت آسانی سے لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیں گے۔ کیوں کہ یہ سب وہی چیزیں ہیں جن سے لوگ پہلے ہی سے مانوس تھے۔

دین کی اصل آخرت ہے۔ دینی زندگی کا مطلب ہے ایسی زندگی جس میں ساری توجہ آخرت کی کامیابی اور ناکامی کی طرف لگی ہوئی ہو۔ مگر لوگ ہر زمانہ میں دنیادارانہ مشاغل کی سطح پر ہوتے ہیں۔ اگر دین کو انہی دنیوی زندگی کے ضمیمہ کے طور پر پیش کیا جائے تو اس کو قبول کرنے میں انہیں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں دین ان کو ٹھیک اسی سطح پر مل رہا ہوتا ہے جس سطح پر وہ خود پہلے سے ہیں۔ اس کے برعکس جب دین کو آخرت طلبی کے روپ میں پیش کیا جائے جو اس کی حقیقی صورت ہے تو وہ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کیوں کہ اس کو اپنی فکری سطح سے بہت اونچا پاتے ہیں، اس لئے اسے رد کر دیتے ہیں۔

قدیم مکہ میں جن لوگوں نے نماز کا مطلب یہ بتلایا کہ بیت اللہ میں جمع ہو کر تالی پیٹیں اور سیٹی بجائیں (انفال - ۳۵) ان کو عوامی مقبولیت حاصل کرنے میں دیر نہیں لگی۔ جنھوں نے خدا پرستی کا کمال یہ بتایا کہ حاجیوں کو پانی پلایا جائے اور مسجد حرام کی خدمت کی جائے (توبہ - ۱۹) ان کو بھی بہت جلد عوام الناس کی تائید حاصل ہو گئی کیونکہ یہ باتیں ان کی فکری سطح سے قریب تھیں۔ وہ اپنے مقررہ دنیوی ڈھانچہ کو توڑے بغیر اس مذہب کو اپنی زندگی میں شامل کر سکتے تھے۔ اسی طرح جن لوگوں نے مذہب کا خلاصہ یہ بتایا کہ احبار و رہبان (بزرگوں) کا دامن تھام لو (توبہ - ۳۱) وہ بھی عوام میں خوب مقبول ہوئے کیونکہ ان کا مذہب لوگوں کی دنیادارانہ زندگی سے کوئی ٹکراؤ پیدا نہیں کرتا تھا۔ اس طرح وہ اپنے محبوب دنیوی مشاغل میں مصروف رہتے ہوئے یہ اطمینان کر سکتے تھے کہ انھوں نے اپنی نجات اور کامیابی کا یقینی انتظام کر لیا ہے۔

مگر مذہب کی دعوت جب پیغمبر اسلام کی زبان سے بلند ہوئی تو بالکل مختلف صورت حال پیش آئی۔ یہاں جو مذہب پیش کیا جا رہا تھا، وہ لوگوں کی دنیا پرستانہ زندگی کے سانچہ میں نہ تھا بلکہ اس کو توڑ کر اپنی جگہ بنانا چاہتا تھا۔ آپ کا مذہب مکہ والوں کو آخرت کی طرف دوڑنے کا تقاضا کر رہا تھا نہ کہ دنیا کی طرف۔ اس لئے بالکل فطری تھا کہ جیسے ہی آپ اس کو پیش کریں، لوگ اس کا انکار و استہزا کرنے لگیں۔

انھیں کیا کرنا تھا اور وہ کیا کر رہے ہیں

بیسویں صدی کے آغاز میں یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ یورپ اپنی تمام مادی ترقیوں کے باوجود ایک احساس ناکامی سے دوچار ہے۔ اس کو نظر آ رہا ہے کہ اس کی سائنس اور ٹکنالوجی نے اس کو مشینیں اور سواریاں تو دیں، مگر اس کو وہ فلسفۂ حیات نہ مل سکا جو اس کو یقین کی دولت عطا کرتا۔ انگریز فلسفی بریڈلے (۱۸۴۶ - ۱۹۲۴) نے موجودہ صدی کے ربع اول میں کہا تھا:

" دنیا کو ایک نئے مذہب (New Religion) کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایک ایسا عقیدہ چاہئے جو تمام انسانی مفادات کا تعین کرے اور ضروری تناسب کے ساتھ اس کے جواز کی بنیاد ہو، اور اسی کے ساتھ وہ شعور عطا کرے جس سے انسان اس پر اعتماد کے ساتھ قائم ہو سکے "

Essays on Truth and Reality, P.446

اس کے بعد خود مغربی ممالک میں ایسے لوگ اٹھے جنھوں نے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ ان کے پاس خدا کی جو امانت ہے وہ یورپ کی اس فکری کمی کو پورا کر سکتی ہے، وہ اس کو لے کر اٹھیں اور اہل عالم تک اس کو پہنچا کر اپنا خدائی فریضہ ادا کریں۔ لارڈ بی۔ ایچ۔ کے۔ لوتھین (۱۸۸۲-۱۹۴۰) چالیس سال پہلے ہندستان آئے تھے اور ۱۹۳۸ میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقسیم اسناد کے جلسہ کی صدارت کی تھی۔ اس موقع پر انھوں نے اپنے خطبہ میں کہا تھا:

"یورپ اپنے سیاسی، معاشی، تمدنی اور عائلی مسائل کا تسلی بخش حل دریافت کرنے میں ناکام ہو چکا ہے۔ آپ حضرات کا دعویٰ ہے کہ اسلام زندگی کا مکمل دستور العمل ہے اور اس میں اجتماعی مسائل کا بہترین حل موجود ہے۔ میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ بلاد مغرب میں جا کر وہاں کے باشندوں کو اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کریں" (خطبہ تقسیم اسناد)

منٹگمری واٹ (- ۱۹۰۹) نے اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں مسلمانوں کی غیرت کو پکارا۔ پیغمبر اسلام کی سیرت پر اپنی کتاب میں انھوں نے لکھا:

" دنیا بہت تیزی سے ایک ہوتی جا رہی ہے اور اس ایک دنیا میں یہ رجحان بڑھ رہا ہے کہ اس کے اندر اتحاد اور یکجہتی ہو۔ اس رجحان کی وجہ سے یقیناً وہ دن آئے گا جب کہ یہاں اخلاقی اصولوں کا ایک ایسا نظام ہوگا جو نہ صرف عالمی جواز رکھتا ہوگا بلکہ فی الواقع وہ ساری دنیا میں تسلیم کیا جا چکا ہوگا۔ مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ محمد تمام نوع انسانی کے لئے ایک کلی اور اخلاقی نمونہ ہیں۔ یہ کہہ کر وہ دنیا کو دعوت دے رہے ہیں کہ وہ ان پر اسے قائم کر سکے۔ اب تک یہ معاملہ دنیا کی بہت کم توجہ اپنی طرف مائل کر سکا ہے۔ مگر اسلام کی قوت کی وجہ سے یہ بالآخر اہمیت حاصل کرے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا محمد کی زندگی اور تعلیمات میں سیکھنے کے قابل کچھ اصول ہیں جو مستقبل کی دنیا کو واحد اخلاقی نظام عطا کر سکیں۔

الرسالہ فروری ۱۹۸۳

دنیا کو ابھی تک اس سوال کا آخری جواب نہیں دیا گیا ہے۔ مسلمانوں نے محمد کے بارے میں اپنے دعوے کی تائید میں اب تک جو کچھ کہا ہے وہ اس سلسلے میں بس ایک ابتدائی بیان کی حیثیت رکھتا ہے اور بہت کم غیر مسلم اس سے مطمئن ہو سکے ہیں۔ تاہم یہ موضوع ابھی کھلا ہوا ہے۔ دنیا کا ردعمل محمد کے بارے میں کیا ہوتا ہے، یہ کسی حد تک اس پر منحصر ہے کہ آج کے مسلمان اس کے لئے کیا کرتے ہیں۔ انھیں اب بھی یہ موقع حاصل ہے کہ بقیہ دنیا کے سامنے اپنے مقدمہ کو زیادہ بہتر اور مکمل طور پر پیش کریں۔ کیا مسلمان یہ دکھا سکیں گے کہ ایک متحدہ دنیا کی اخلاقیات کے لئے محمد کی زندگی ایک آئیڈیل انسان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر مسلمان اپنے مقدمہ کو بہتر طور پر پیش کر سکیں تو عیسائیوں میں وہ ایسے لوگ پائیں گے جو اس کو سننے کے لئے تیار ہیں" (صفحہ ۳۳۴)

Montgomery Watt
Mohammad As Model for Universal Morality

اس طرح کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مگر کیسی عجیب بات ہے۔ مسلمان اس پوری مدت میں مغربی قوموں سے سیاسی لڑائی تو لڑتے رہے جس میں مغرب صریح طور پر ان کے اوپر برتری رکھتا تھا۔ مگر فکری اور اعتقادی میدان جو مغربی قوموں کا کمزور گوشہ تھا وہاں ان پر کوئی جدوجہد نہ کی۔ نادانی کی ایسی عجیب و غریب مثال شاید پوری تاریخ میں کوئی دوسری نہیں ملے گی۔

فکری اور نظریاتی طاقت کی اہمیت کیا ہے، اس کی ایک مثال یہاں ہم خود جدید مغربی تاریخ سے پیش کریں گے۔ پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴) کے دوران روس میں کمیونسٹوں کا غلبہ برطانیہ عظمیٰ کے لئے ایک سوالیہ نشان تھا۔ کیونکہ یہ برطانوی سلطنت کے "مشرقی حصہ" کے لئے خطرہ کے ہم معنی تھا۔ نومبر ۱۹۱۸ء میں انگریز فوجی افسروں کا ایک وفد صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے سمرقند پہنچا۔ اگرچہ بظاہر یہ بتایا گیا تھا کہ یہ ایک تجارتی وفد ہے اور وسط ایشیا کی کپاس کا سودا کرنے جا رہا ہے۔ وفد کے ممبران یہ تھے:

کرنل بیلی (Colonel F.M. Bailey)

کرنل ایتھرٹن (Colonel P.T. Etherton)

میجر بلیکر (Major L.V.S. Blacker)

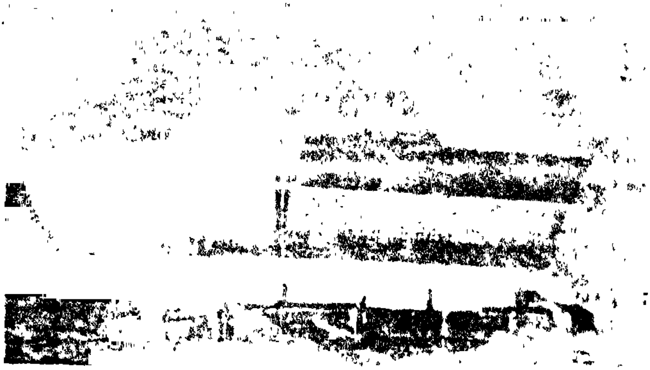
واپسی کے بعد کرنل ایتھرٹن نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے "وسط ایشیا کے قلب میں"

In the Heart of Central Asia

انھوں نے اپنی اس کتاب میں جو باتیں لکھیں، ان میں سے ایک یہ تھی:

The new set of ideas of the Bolsheviks was potentially much more of a menace to English domination in the orient than all of the Czar's armies in the past.

یعنی بالشویکوں کے نظریات بالقوہ طور پر برطانیہ کے مشرقی مقبوضات کے لئے اس سے زیادہ بڑا خطرہ ہیں جتنا کہ ماضی میں زار کی تمام فوجیں ہو سکتی تھیں۔ (۹۲-۹۳)



نہرو سنٹر
میں
پلانیٹیریم
کی عمارت

آسمان کا مشاہدہ پلانیٹیریم میں

ہندستان کی جدید تاریخ پر نہرو خاندان کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ اس کے کسی بھی صفحہ پر اسے دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، اندرا گاندھی اور سنجے گاندھی کے بغیر جدید ہندستان کو سمجھا نہیں جاسکتا۔

ہندستان کی تاریخ کے اس پہلو کو واضح کرنے کے لئے جو ادارے ملک میں قائم ہوئے ہیں، ان میں ایک جدید شان دار اضافہ بمبئی کا نہرو سنٹر ہے جو ۴ر۴ ہیکٹیر رقبہ میں تعمیر کیا گیا ہے۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی نے نومبر ۱۹۷۲ میں اس کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ ابتداءً اس کا بجٹ ۵ر۳ کرور تھا۔ مگر ۱۹۷۸ میں جب وہ آخری طور پر مکمل ہوگا تو اندازہ ہے کہ اس کی لاگت ۱۰ کروڑ روپے تک پہنچ جائے گی۔

نہرو سنٹر میں مختلف قسم کے علمی اور ثقافتی شعبے قائم ہوں گے۔ لائبریری، میوزیم، لکچر ہال، آرٹ گیلری، ڈراما اکیڈمی، آڈیٹوریم، ہاسٹل، منی ڈزنی لینڈ، ہابی ورکشاپ وغیرہ۔ نہرو سنٹر کی تمام سرگرمیاں تحقیقی نوعیت رکھنے والی (RESEARCH ORIENTED) ہوں گی۔

بمبئی کے اس نہرو سنٹر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک پلانیٹیریم (planetarium.) بنایا گیا ہے یعنی آسمانی مشاہدہ گھر۔ یہ ایشیا میں اپنی قسم کا سب سے بڑا اور دنیا کے بہترین پلانیٹیریموں میں سے ایک ہے۔ یہ نہرو پلانیٹیریم ۶۵ر۱ کروڑ روپے کی لاگت سے تیار ہوا ہے۔ اس رقم میں مسٹر کے کے برلا کا عطیہ ایک کروڑ روپیہ ہے۔ پلانیٹیریم کے ایڈوائزری بورڈ میں ملک کے جو نامور سائنس داں شامل ہیں، ان میں مسٹر ایم۔ ایف۔ حسین کا نام بھی ہے۔

یہ پلانیٹیریم نہ صرف عام مشاہدین کے لئے اس بات کا ذریعہ ہوگا کہ وہ ایک ہال کے اندر بیٹھ کر "آسمانی سیر" کرسکیں۔ بلکہ ریسرچ کے طلبہ کے لئے علم افلاک اور خلائی سائنس کے ہر شعبہ کے مطالعہ میں مددگار ثابت ہوگا۔

اس پلانیٹیریم کا خاکہ اور منصوبہ ہندوستانی ماہرین نے تیار کیا تھا، اور وہ ہندوستانی فرموں کے علاوہ جرمن ڈیموکریٹک ریپبلک کے سامان اور ٹکنیکل تعاون سے بنایا گیا ہے۔ اس پلانیٹیریم میں بیٹھ کر آپ نہ صرف آج کے آسمان کو دیکھ سکتے ہیں بلکہ ۲۷ ہزار سال پہلے اور ۲۷ ہزار سال بعد تک کے آسمان کا مشاہدہ بھی منٹوں میں کرسکتے ہیں۔ پلانیٹیریم کے منصوبوں میں سے ایک منصوبہ یہ ہے کہ نوجوانوں میں علمی نقطۂ نظر (SCIENTIFIC APPROACH) پیدا کرنے کے لئے خصوصی پروگرام رکھے جائیں۔ اس مقصد کے لئے پلانیٹیریم میں مختلف قسم کے سائنسی شو دکھائے جائیں گے جو چھوٹے بچوں سے لے کر یونیورسٹی کے طلبہ تک کے لئے ہوں گے۔ ملک کے مختلف حصوں کے لوگ اس میں شریک ہوں گے۔

بمبئی کی رات کا آسمان منٹوں میں آپ کے لئے قطب جنوبی یا قطب شمالی کا آسمان بن سکتا ہے جہاں ستارے نہ ڈوبتے ہیں نہ نکلتے ہیں۔ یہاں آپ شہابیے، دمدار ستارے، سورج، چاند، شمسی نظام، حتیٰ کہ کہکشاؤں اور سحابیوں کو اس طرح دیکھ سکتے ہیں گویا کہ آپ آسمانی فضا میں شامل ہو کر پوری کائنات کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ ایک زمینی سال کو اس گنبد نما "آسمان" میں ۱۰ منٹ میں پورا کر دیا جاتا ہے۔ یہ اور اسی طرح کے دوسرے مناظر کو دکھانے کے لئے اس میں جو پروجیکٹر لگے ہوئے ہیں ان کی تعداد مجموعی طور پر ۱۱۰ ہے۔

اس قسم کا ایک پلانیٹیریم بنانے کے لئے مختلف علوم درکار ہوتے ہیں مثلاً فلکیات، بصریات، الکٹرانکس، انجینیرنگ وغیرہ ——— آسمان کا سائنسی مشاہدہ کرنا ہو تو بہت سے علوم ضروری ہو جاتے ہیں

الرسالہ فروری ۱۹۷۷

حقائق کا مقابلہ الفاظ سے نہیں کیا جا سکتا

نواب واجد علی شاہ فروری ۱۸۵۶ تک اودھ کے حکمران تھے۔ ان کو "سلطان عالم" کا خطاب حاصل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب ملک کے بیشتر حصوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ ہوگیا اور خبریں آنے لگیں کہ انگریزی فوجیں لکھنؤ کی طرف بڑھ رہی ہیں تو نواب اودھ کی عورتیں محل میں نواب کے گرد جمع ہوگئیں اور دشمن کو کوسنا شروع کیا: "موئے فرنگیوں کی توپوں میں کیڑے پڑیں"۔ نواب اودھ کے محل کا یہ واقعہ بظاہر ایک انوکھا واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن غور سے دیکھئے تو موجودہ زمانے میں ہمارے لیڈروں کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔

پچھلی صدیوں میں جب مغربی قومیں اسلامی ملکوں پر چھا گئیں تو اس کے مقابلہ کے لئے ساری مسلم دنیا میں بے شمار لیڈر اٹھ کھڑے ہوئے۔ مشرق کے اوپر مغرب کا یہ غلبہ، اپنی نوعیت کے اعتبار سے، ایک سائنسی واقعہ تھا نہ کہ سادہ معنوں میں محض ایک سیاسی واقعہ۔ مگر اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمارے درمیان جو لوگ اٹھے وہ سب شاعر تھے یا خطیب۔ یہ غالب قومیں سائنس اور ٹکنالوجی کے زور پر آگے بڑھ رہی تھیں، مگر ان کو مغلوب کرنے کے لئے ہمارے لیڈروں کے پاس جو چیز تھی، وہ صرف پُرشور الفاظ کا طوفان تھا۔ نواب اودھ نے مشین کا مقابلہ اگر عورتوں کے کوسنے سے کرنا چاہا تھا تو لیڈروں نے مشین کا مقابلہ شاعری اور خطابت کے ذریعے کرنے کی کوشش کی۔ ان دونوں چیزوں میں ظاہر کے اعتبار سے تو ضرور فرق ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں۔

مولانا محمد علی (۱۹۳۱ - ۱۸۷۱) کی تقریر و تحریر کا نقشہ رشید احمد صدیقی نے ان لفظوں میں کھینچا ہے:

"کس بلا کے بولنے اور لکھنے والے تھے۔ بولتے تو معلوم ہوتا ابوالہول کی آواز اہرام مصری سے ٹکرا رہی ہے۔ لکھتے تو معلوم ہوتا کروپ کے کارخانے میں توپیں ڈھل رہی ہیں یا پھر شاہجہاں کے ذہن میں تاج کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے۔ میں نے ان کو اسٹیج پر آتے اور بولتے ہوئے سنا ہے۔ اور محمد علی کو داد دینے سے پہلے انیس کو داد دی ہے:

ضیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے"

جمال الدین افغانی (۱۸۹۷ - ۱۸۳۸) کی تقریر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ ۱۸۶۸ میں وہ ہندستان آئے تھے اور زیادہ تر حیدرآباد میں مقیم رہے۔ یہاں انھوں نے ہندستانیوں کے ایک مجمع میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

یا اهل الهند، وعز الحق وسر العدل، لوکنتم، وانتم مئات الملائین، ذبابا لکان طنینکم یصم آذان بریطانیا العظمی ویجعل فی آذان کبیرهم المستر غلادستون وقرا، ولوکنتم، وانتم مئات الملائین من الیهود قد مسخکم الله فجعل کلا منکم سلحفاة وخضتم البحر واحطتم بجزیرة بریطانیا العظمی لجررتموها الی القعر وعدتم الی الهند کم احرارا (۷۰)

اے ہندستان والو، عزت حق اور راز عدل کی قسم، تم جو

سیکڑوں ملین کی تعداد میں ہو، اگر تم مکھیاں ہوتے تو تمھاری بھنبھناہٹ برطانیہ عظمیٰ کے کانوں کو بہرا کر دیتی، اور مسٹر گلیڈاسٹون کے کان اس سے شق ہو جاتے۔ اور اگر تم یہودی ہوتے اور بغداد نے تم کو مسخ کر کے تم میں سے ہر ایک کو چوہا بنا دیا ہوتا اور تم سمندر کو تیر کر جزیرہ برطانیہ پہنچ جاتے تو تمھارے بوجھ سے جزیرہ غرق ہو جاتا اور تم آزاد ہو کر اپنے ملک میں واپس آتے۔

۱۹۴۶ء میں اقوام متحدہ نے تقسیم فلسطین کا اعلان کر دیا، اور یہودیوں کی حکومت تسلیم کر لی۔ اسرائیل کو اقوام متحدہ کا ممبر بھی نامزد کر دیا گیا

شیخ حسن البنا (۱۹۴۸ - ۱۹۰۶) اپنی بارعب شخصیت اور پرزور خطابت کی وجہ سے اس وقت مصر کے انتہائی مقبول قائد بن چکے تھے۔ انھوں نے اس مسئلہ پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

"اے اہل مصر! کل ہی کی تو بات ہے کہ ہیضہ کی وبا میں مصر کے چالیس ہزار افراد نے دست و قے میں مبتلا ہو کر جان دے دی، اور تم نے اسے برداشت کر لیا۔ اب کیا تم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ ہمارے چالیس ہزار آدمی اور بھی، ہمارے محبوب فلسطین کی آزادی کی خاطر خاک خون میں لوٹ کر شہادت کا درجہ حاصل کر لیں۔"

اس قسم کے خطیب سارے عالم اسلام میں پیدا ہوئے۔ اس پوری مدت میں کوئی لیڈر ایسا نہ اٹھا جو علمی تجزیہ اور سائنسی ذہن سے مسلح ہو۔ ہر ایک کے پاس بس شعر و خطابت کا طوفان تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ جس طرح عورتوں کے کوسنے سے انگریزی فوجوں کی توپ میں کیڑے نہیں پڑ سکتے تھے۔ شعراء اور خطباء کی لفاظیوں سے ملت کی تعمیر بھی ممکن نہ ہو سکی۔ ڈیڑھ سو سالہ بلند بانگ کوششوں کا انجام اس کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ ■

اس کا ارادہ

اس کی بیماری پر

غالب آیا

ڈاکٹر مسلمہ خانم

کلاس میں صحت کی بات چھڑ گئی۔ ماسٹر صاحب صحت کے اصول لڑکوں کو سمجھا رہے تھے۔ اتنے میں ایک طالب علم کھڑا ہو گیا: "ماسٹر صاحب!" وہ بولا "اجازت ہو تو ایک بات دریافت کروں۔"

"ضرور"

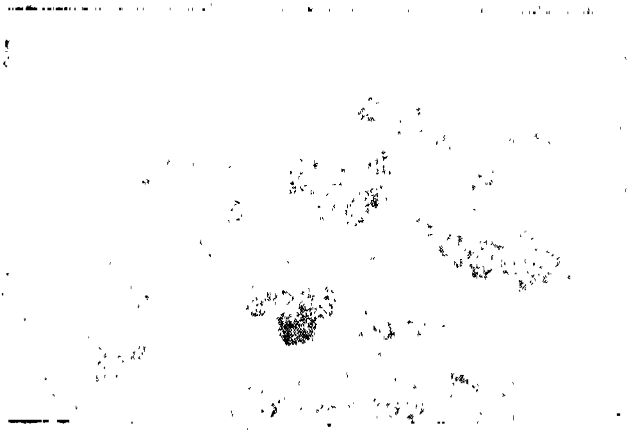
"ماسٹر صاحب اس عمر میں آپ کی اتنی اچھی صحت ہے، اس کا راز کیا ہے؟"

اس کے بعد ماسٹر صاحب نے اپنی کہانی بیان کرنی شروع کی۔ انھوں نے کہا: "یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ میں تم سے بھی چھوٹا تھا اس وقت میں کلکتہ میں تھا، میری صحت بہت خراب ہو گئی، میں اتنا دبلا اور کمزور ہو گیا کہ چلنا پھرنا مشکل ہو گیا ڈاکٹر بھی میرے علاج سے مایوس ہو گئے۔ ایک روز ڈاکٹر نے کہا "اس کو گھر لے جاؤ۔ اب یہ بچ نہیں سکتا تاکہ یہ مرے تو اپنے ماں باپ کے پاس مرے۔"

"ڈاکٹر کو میری موت پر اتنا یقین تھا کہ اس نے میرے سامنے ہی یہ بات کہہ دی۔ مجھے ڈاکٹر کی بات سن کر بہت غصہ آیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا "مجھے زندہ رہنا ہے" اور میں نے اس کے فوراً بعد زندگی کی جدوجہد شروع کر دی۔

"میں نے سوچا کہ سب سے پہلا کام مجھے یہ کرنا ہے کہ اپنے دماغ سے اس خیال کو نکال دوں کہ میں بیمار ہوں یا مرجانے والا ہوں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ ہو مجھے بہرحال جینا ہے۔ اس کے بعد نہ میں کسی ڈاکٹر کے پاس گیا اور نہ کوئی دوا کھائی، البتہ اپنی زندگی کو نہایت منظم کر لیا۔ میں روزانہ صبح کو کھلی ہوا میں ورزش کرتا، روزانہ نہاتا، روزانہ اپنے بدن پر تیل کی مالش کرتا اور دن رات کے سارے اوقات کو ایک نظام کے تحت گزارتا۔

میرا ارادہ میری بیماری پر غالب آیا۔ میں دھیرے دھیرے اچھا ہونے لگا۔ میرے چہرے پر موت کے پیلے پن کے بجائے زندگی کی سرخی دوڑنے لگی۔ اب میں ایک تندرست نوجوان تھا جس کی صحت پر لوگ رشک کرتے تھے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، میں بچپن سے جوان ہوا اور جوانی کے بعد اب بڑھاپے کا دور شروع ہو گیا ہے لیکن ڈاکٹر کے اندازہ کے خلاف نہ صرف یہ کہ میں زندہ رہا بلکہ پھر کبھی بیمار نہیں ہوا۔ میں نے طے کیا تھا کہ مجھے زندہ رہنا ہے اور قدرت نے یہ الفاظ صحیح ثابت کر دکھائے۔" ■



Mushrooms sprouting in a bed of wet paddy straw.

کھمب کی کاشت بھیگے ہوئے پیال میں —

کھمب ایک مفید زراعت ہے اور پروٹین حاصل کرنے کا قیمتی ذریعہ بھی

کھمب (MUSHROOM) نہایت مفید غذا ہے، باہر کے ملکوں میں اس کو بہت شوق سے کھایا جاتا ہے۔ تاہم ہندوستان میں ابھی زیادہ تر پنجاب کے علاقہ میں اس کو مقبولیت حاصل ہو سکی ہے۔

عوام میں مشہور ہے کہ جہاں کتا پیشاب کرے وہاں کھمب پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی لئے کچھ لوگ اس کو ککرمتا بھی کہتے ہیں۔ مگر یہ بالکل غلط ہے۔ کھمب قدرت کا ایک قیمتی نباتاتی عطیہ ہے اس کا کتے کے پیشاب سے کوئی تعلق نہیں۔

کھمب کی اہمیت یہ ہے کہ وہ نباتاتی پروٹین حاصل کرنے کا اہم ذریعہ ہے اور سستا بھی۔ وہ گھر کے صحن میں بھی اگایا جا سکتا ہے، حتیٰ کہ بانس کی ٹوکری میں بھی۔

چند برس پہلے کھمب ایک مہنگی غذا تصور کی جاتی تھی۔ کیونکہ وہ زیادہ مقدار میں دستیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اب پنجاب کے علاقہ میں اس کی پیداوار کافی ٹھیک رہی ہے۔ پنجاب اگریکلچرل یونیورسٹی نے اس سلسلے میں کافی دلچسپی لی ہے اور اس کا مائیکروبیالوجی کا شعبہ کسانوں کو کھمب پیدا کرنے میں خصوصی مدد دے رہا ہے۔

کھمب کی پیداوار حاصل کرنے کے لئے صرف ایک شیڈ اور کچھ معمولی سامان درکار ہوتا ہے جو بآسانی دستیاب میں مل جاتا ہے۔ کھمب کی مانگ بیرونی علاقوں میں بھی کافی ہے۔ پٹیالہ کے کسانوں نے کھمب کی پیداوار کے ساتھ کیننگ یونٹ بھی لگائی ہے۔ وہ اپنی پیداوار کو کلکتہ اور مدراس کے بازار میں بھیج کر کافی نفع حاصل کر رہے ہیں۔

ہماچل پردیش میں کھمب کے فارم ہیں۔ ہماچل یونیورسٹی کا زرعی شعبہ سولان میں اپنی زمین پر کھمب کی کاشت کر رہا ہے اور اس سلسلے میں قیمتی تحقیقات کی ہیں جو کسانوں کے لئے بہت مفید ہو سکتی ہیں۔ ڈوجی اور چال کے کسان اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ۲۰۰ کسانوں نے کھمب کی کاشت کی تربیت حاصل کی ہے جن میں سے ۵۰ کسانوں نے باقاعدہ

طور پر اس کی کاشت شروع کردی۔

کھمب بہت نازک پودا ہے۔ وہ بہت جلد خراب ہوجاتا ہے اس لئے اس کی کاشت اسی وقت مفید ہے جب کہ اس کی نکاس کا فوری اور معقول انتظام موجود ہو۔ پنجاب کے شہروں میں اب عام طور پر کھمب کی فروخت ہونے لگی ہے۔ کھمب کی بہت سی قسمیں ہیں۔ فی الحال پنجاب کے کسان دو قسم کے کھمب کی کاشت پسند کرتے ہیں۔ ان کی کاشت اپریل سے اگست تک کی جاتی ہے۔

کھمب کی پیداواری لاگت فی کیلو گرام تقریباً ڈھائی روپے ہے جب کہ بازار میں ایک کیلو کھمب ۱۰ سے ۱۵ روپے تک فروخت ہوتا ہے۔ بڑے شہروں میں مثلاً دہلی میں اس کی قیمت ۳۰ روپے کیلو تک ہے۔

اگر جدید اصولوں کے مطابق پیکنگ کا انتظام ہو تو کھمب کے لئے بیرونی ملکوں میں بھی اچھا مارکٹ مل سکتا ہے۔ جن لوگوں کو کھمب کی کاشت سے دلچسپی ہو انہیں مزید معلومات کے لئے ہماچل یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی سے رابطہ قائم کرنا چاہئے۔ اس کے علاوہ حکومت نے خاص اس مقصد کے لئے ایک مستقل ادارہ ہماچل پردیش میں قائم کر رکھا ہے۔

The Mushroom Institute
College of Agriculture
Solan,
Distt: SIRMUR
Himachal Pradesh

کھمب اپنی اصل کے اعتبار سے نباتات ہی کی ایک قسم ہے۔ اس کا رنگ سفید اس لئے ہوتا ہے کہ دیگر پودوں کی طرح اس میں سبز نباتاتی مادہ (کلوروفل) نہیں ہوتا۔ کلوروفل نہ ہونے کی وجہ سے وہ سورج کی شعاعوں کی

الرسالہ فروری ۱۹۷۷

مدد سے اپنے لئے غذا نہیں تیار کرسکتا۔ وہ مردہ نباتاتی چیزوں سے اپنے لئے غذا حاصل کرتا ہے۔ اس کا شمار ان پودوں میں ہوتا ہے جو اپنی غذا خود تیار نہیں کرتے بلکہ دوسروں کی تیار غذا پر گزر کرتے ہیں۔ اس قسم کے پودوں کا ایک فائدہ یہ ہے کہ وہ مردہ نباتاتی مواد کو تحلیل کرکے اس کی کاربن ڈائی آکسائڈ کو نکال دیتے ہیں اور اس طور پر پودوں کے لئے کھاد مہیا کرتے ہیں۔

کھمب (کلاہ باراں) کی تقریباً سات ہزار قسمیں شمار کی گئی ہیں۔ فرانس، امریکہ، یونان اور اٹلی میں لوگ بہت شوق سے اس کو کھاتے ہیں۔ کھمب کی بعض قسمیں زہریلی ہوتی ہیں جو دواؤں میں کام آتی ہیں۔

کھمب یا کلاہ باراں میں غذائیت کا تناسب کیا ہے، اس کو مندرجہ ذیل نقشہ سے سمجھا جاسکتا ہے:

پانی	۲،۸۹	فی صد
نائٹروجن کے مرکبات	۰،۱۳	فی صد

نائٹروجن مرکبات کا تقریباً ⅔ حصہ فوراً ہضم ہوکر جزو بدن بن جاتا ہے۔

کاربوہائی ڈریٹ	۲۲،۳	فی صد
شکر	۰،۱	فی صد
چربی	۴۴،۰	فی صد
معدنیات	۳۱،۳	فی صد

(معدنیات میں زیادہ تر پوٹاشیم اور فاسفورک ترشہ پایا جاتا ہے)

اس تناسب سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دیگر تازہ ترکاریوں کی نسبت کلاہ باراں میں غذائیت کس قدر زیادہ ہے۔ صرف پیرس میں سایہ دار مقامات پر ڈیڑھ لاکھ من کھمب پیدا کیا جاتا ہے۔ ■

مولانا محمد فاروق خان
ایم اے

وہ اپنے وطن سے

دور نہ تھا

نہیں آئے۔ اسے عرصہ ہوگیا تھا۔ وطن کے احباب اور دوستوں کی ایک ایک تصویر اس کے ذہن کے پردے پر دھندلی ہوتی چلی گئی تھی۔ پھر بھی یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ اپنے وطن کو یکسر فراموش کرچکا ہوگا۔ وطن کے نقوش بہت گہرے ہوتے ہیں۔ ان کا مٹنا آسان نہیں ہوتا۔ کوئی خاص وجہ تھی کہ وہ وطن جانے کے لئے اس طرح بے چین دکھائی نہ دیتا تھا جس طرح بالعموم لوگ وطن کے لئے بے چین دکھائی دیتے ہیں۔ اس نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا تھا یا اُسے کوئی ایسی چیز حاصل ہوگئی تھی کہ اضطراب اور پریشانی کے بجائے اس کے چہرے سے ایک خاص طرح کا سکون اور اطمینان جھلکتا تھا۔ کچھ لوگ کہتے کہ وہ بالکل بے حس ہوگیا ہے۔ بعض لوگ اسے بے مروت بتاتے۔ کیونکہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس نے اپنے وطن عزیز کو یکسر فراموش کررکھا ہے۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اُسے پاگل اور مجنوں قرار دیتے تھے۔

ایک دن اس کے منہ سے ایک ایسی بات نکلی جس نے ثابت کردیا کہ اس کے بارے میں لوگوں کے اندازے غلط ہیں، لوگوں نے اسے سمجھنے میں غلطی کی ہے وہ بے حس نہ تھا۔ اس کے احساسات تو حد درجہ نازک تھے۔ وہ اتنا حساس تھا کہ اس پر رشک آئے۔ کسی نے اس سے پوچھا تھا: آپ وطن کیوں نہیں جاتے ہو کیا وطن میں آپ کا کوئی نہیں؟

اس نے کہا: یہ بات نہیں ہے۔ وطن سے بے نیاز کون ہوسکتا ہے۔ میں بھی اس سے بے نیاز اور بے پروا نہیں ہوں۔ لیکن عام طور پر لوگ اپنے وطن کو پہچاننے میں غلطی کرجاتے ہیں۔ مجھے وطن کی خبر مل گئی ہے۔ میں نے وطن کو جان لیا ہے۔ وطن میں میرا دل بھی لگتا ہے۔ میں جب بھی نماز پڑھتا ہوں اور سجدہ میں جاتا ہوں تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنے وطن پہنچ گیا۔ اب میں نے اپنے حقیقی وطن کو پہچان لیا ہے۔ جب بھی مجھے وطن کی طرف رُخ کرنا ہوتا ہے، اپنے کو حالت سجدہ میں لے جاتا ہوں۔ کسی وطن میں جو سکون اور راحت مل سکتی ہے وہ سکون مجھے سجدہ سے حاصل ہوجاتا ہے۔

بات تو اس نے گہری کہی مگر اُسے سمجھنے والے تھوڑے ہیں۔ آدمی کا اصل وطن دور نہیں ہوتا۔ پھر بھی اکثر لوگ بے وطن ہوتے ہیں اور غریب الوطنی کی زندگی گزارتے ہیں۔ جب تک آدمی کی روح بیدار نہ ہو، آدمی کو وہ سجدہ میسّر نہیں ہوتا جس کو صحیح معنوں میں سجدہ کہا جاسکے جو اُسے غریب الوطنی سے نجات دے سکے۔ ایسا شخص غریب الدیار ہی رہے گا۔ اس کے دوست اور احباب اسے غریب الوطن بنانے میں مددگار ثابت ہوں گے۔ اُسے وطن کی خبر ہونے نہ دیں گے ◼



یونان میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً دولاکھ ہے۔ یہ اصلاً ترک ہیں اور زیادہ تر یونان کے شمال مشرقی علاقہ میں آباد ہیں۔ یہ علاقہ بحر ابیض کے کنارے واقع ہے۔ اس کا مرکزی مقام کموتینی (کوملجنہ) ہے

یونانی مسلمانوں کے مسائل تقریباً وہی ہیں جو دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے ہیں۔ وہ اپنے دین پر پختہ ہیں۔ تاہم نئی نسل میں اعتقادی کمزوری پیدا ہو رہی ہے اور اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ ان میں ایسے مصلحین نہیں اٹھ رہے ہیں جو اسلام کے جوہر کو سمجھیں اور اس کو مؤثر انداز میں ان کے سامنے پیش کریں۔

یہ مغربی تراقیا کے مسلمانوں کا حال ہے۔ باقی وہ لوگ جو اس سے ۸۰۰ میل دور جزیرہ رودس میں رہتے ہیں، وہ بڑی حد تک اسلام سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔ کیونکہ جزیرہ سے ترک اقتدار ختم ہونے کے بعد پچھلے پچاس برس سے ان میں اسلام کا کوئی کام نہیں ہو رہا ہے۔ جزیرہ رودس

الرسالہ فروری ۱۹۷۷

ترکی میں جو یونانی غیر مسلم آباد ہیں
ان کی معاشی حالت اچھی ہے
مگر یونان میں جو ترک مسلمان ہیں
ان کا حال اس کے برعکس ہے

میں اب بھی پانچ مسجدیں ہیں جو عثمانی دور کی یاد دلاتی ہیں۔ مگر یہ مسجدیں اس طرح ویران پڑی ہوئی ہیں گویا ان کو عبادت الٰہی کے لئے بنایا ہی نہیں گیا۔

شہر کوملجنہ میں چھوٹی مساجد کے علاوہ پندرہ بڑی مسجدیں ہیں۔ یہاں ہر مسجد میں پنج وقتہ نمازیں ہوتی ہیں۔ تراقیا کی ہر ولایت میں ایک مفتی ہوتا ہے جو نکاح، طلاق، میراث، معاملات شرعی اور مساجد و مدارس کے انتظام کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

تراقیا میں تین مسلم جماعتیں ہیں۔ ان میں بڑی جماعت اتحاد مسلمی الیونان ہے جو ۱۹۳۲ میں قائم ہوئی تھی۔ اس کے بانی شیخ مصطفی صبری آفندی تھے جو عثمانی خلیفہ سلطان وحید الدین کے زمانہ میں شیخ الاسلام تھے۔ اس کے ممبروں کی تعداد تقریباً پانچ ہزار ہے۔

اس جمعیۃ نے یونانی مسلمانوں کی مختلف خدمات انجام دی ہیں۔ مثلاً جنگ اول اور ثانی کے زمانہ میں سیکڑوں اسلامی اوقاف (دکان، مکانات، باغات وغیرہ) حکومت یا افراد کے قبضہ میں چلے گئے تھے۔ ان کو دوبارہ حاصل کیا۔ ترکی زبان میں اسلامی کتابوں کی

اشاعت بھی یہی ادارہ کرتا ہے۔ جمعیۃ اتحاد مسلمی الیونان ایک پندرہ روزہ جریدہ نکالتی ہے جس کا نام المحافظہ ہے۔ یہ دنیا کا واحد ترکی جریدہ ہے جو عربی رسم الخط میں شائع ہوتا ہے۔

ترک نوجوانوں کی انجمن (تورک گنجلر بیرلگی) وسائل ذرائع کے اعتبار سے یونانی مسلمانوں کی سب سے بڑی تنظیم ہے۔ مگر اس پر اسلامیت سے زیادہ قومیت غالب ہے۔

یونان کے مسلمان، وہاں کے دستور کے مطابق، یونانی پارلیمنٹ کے لئے اپنے تین نمائندے منتخب کرتے ہیں جو حکومت کے سامنے مسلم مسائل کو پیش کرتے ہیں۔ یہ انتخاب ہر چار سال کے بعد ہوتا ہے۔

مغربی تراقیا میں ۲۰۰ سے زیادہ اسلامی مدرسے ہیں جن میں مسلمان طلبہ عصری علوم کے ساتھ اسلامی علوم پڑھتے ہیں۔ ان میں اساتذہ زیادہ تر مسلمان ہیں۔ یہاں سے فراغت کے بعد مزید تعلیم کے لئے یہ طلبہ یونان اور ترکی اور دوسرے ملکوں کی یونیورسٹیوں میں جاتے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ جو یونانی غیر مسلم ترکی میں رہتے ہیں ان کے مقابلہ میں یونان میں رہنے والے مسلمانوں کی اقتصادی حالت بہت خراب ہے۔ یونانی مسلمانوں کی اکثریت یا زراعت پیشہ ہے یا حیوانات کی پرورش سے گزر اوقات کرتی ہے۔ تجارت اور صنعت میں ان کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ■

البلاغ (کویت) ۲۲ ستمبر ۱۹۷۶

لمثل هذا فليعمل العاملون

في مطلع رمضان .. شهر القرآن .. (١٣٩٣هـ) .. جاءت الأنباء باعلان الرئيس « برنارد بونجو » رئيس جمهورية الجابون ، اعتناقه للاسلام لأنه راى فيه ، كما جاء في بيانه : نور الفطرة وجلال العدالة والمساواة ..

اما الاسلام .. فان دعاته في افريقيا عشرات .. وفي بعض الاقطار افراد يعدون على الأصابع .. !!

ومع هذا يعرف الاسلام طريقه الى القلوب .. ولا يطفى نوره على الناظرين ، مهما تكاثرت السحب ، واكفهرت الآفاق !!

عجب الناس من اسلام رئيس جمهورية افريقية .. طائعا مختارا مستجيبا لله ورسوله لا تحركه رغبة ، ولا تدفعه رهبة ..

ولكن العجب ما يلبث ان يتبدد حين يتامل الانسان حقيقة الاسلام ويعرف خاصته ، التي ترهب أعداءه..!

انه الدين الذي يخاطب الفطرة .. ويناجى العقل .. ويحرك الشعور ..

انه الدين الذي لا طلاسم فيه ولا مجاهيل .. ولا خرافات ولا اباطيل .. فاذا ما انزاحت الغشاوة عن البصيرة .. وانجابت سحب الزيف عن الفطرة ، فانها تعرف طريقها الى الاسلام وشيكا .. وتسرع اليه راغبة مشتاقة .. وتنزع الى رحابه راضية مطمئنة ..

انها صورة فريدة من الاستجابة لم تتبدل في كل جيل وقبيل .. منذ عهد النبوة .. حين كان الناس ينقلبون من النقيض الى النقيض .. بتاثير آية يسمعونها .. وحكمة يتلقونها .. فيصبحون آخر النهار من جند الاسلام .. بعد ان كانوا في اوله من اعدائه الألداء ..!!

هكذا فعل الاسلام في حمزة .. وعمر .. واسيد بن حضير .. وخالد بن الوليد .. وعمرو بن العاص.. وغيرهم من الأبطال الذين كسبهم الاسلام جنودا اوفياء .. بل كسبتهم الانسانية مضحين شرفاء .. ممن تفتحت بصائرهم على نور الاسلام في ومضة خاطفة ، بعد ان كانوا عنه متباعدين ..

بل هي المعجزة الاسلامية التي جعلت التتار يعتنقون الاسلام ويدافعون عنه ، بعد ان اقبلوا من قبل يدمرون حاضرة الخلافة ، ويحاولون هدم حضارة الاسلام !!

بل هذه الحضارة الغربية .. رغم اضوائها وزخارفها لم تستطع ان تحول بين افراد انقياء ينتمون اليها.. وبين الاستضاءة بنور الاسلام والاستظلال بظلاله ..

ففي كل يوم يكسب الاسلام انصارا في هذه العواصم الحضارية في اوربا وأمريكا .. لا يحجب عنهم ضياء الاسلام ، ما يرونه من ضعف المسلمين وتغلب الأعداء عليهم .. لانهم يعلمون ان حقائق الاسلام شيء .. وواقع المسلمين شيء آخر ..

تلك خاصة الاسلام في ذاته .. انه دين زاحف منتشر .. يحمل في طبيعته خصائص القوة والوضوح والتاثير في القلوب .. متى برئت من العلل والأهواء ..

ان الحق تبارك وتعالى قد وعد باظهار الآيات التي تؤكد دائما ان الاسلام حق .. وانه وحي من السماء لا هوى من الأرض .. : (سنريهم آياتنا في الآفاق وفي انفسهم حتى يتبين لهم انه الحق ، او لم يكف بربك انه على كل شيء شهيد) ..

وان انتصار الاسلام .. عقيدة مؤثرة ، ودينا يستحوذ على القلوب .. لآية من آيات الله في هذا العصر ، الذي تتداعى فيه الامم على امة الاسلام ، والذي تشتد فيه الحرب الخبيثة لانتقاص ديار الاسلام واذلال أتباعه..

في وسط هذا الظلام تاتي اضواء البشائر .. فنرى العقيدة الاسلامية تعرف طريقها الى القلوب .. نقية صافية .. قوية شامخة ، تؤكد ان الاسلام حقا هو دين الانسانية ، الذي يحقق لها الأمن والطمأنينة وياخذ بايديها الى حمى الخير والسلام ..

ولكن هذه القوة الذاتية للاسلام ، لا تعفى الامه الاسلاميه من واجبها في الدعوة اليه ، وفي جلاء الحقائق امام الانسانية ، حتى تختار طريقها وتعرف سبيلها ..

ان اسلافنا الامجاد قد قاموا بواجبهم خير قيام .. في الدعوه الى الاسلام .. فسعدوا به واسعدوا الانسانيه .. وبقي علينا ان ندرك المسئولية التي يلقيها علينا ديننا الحنيف حتى نكون اهلا لهذا التكريم الذي لقيه الجيل الاول من هذه الامه .. جيل الصحابة الكرام الذين نجد وصفهم في قول الحق سبحانه :

(كنتم خير امه اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله) ..

ولمثل هذا فليعمل العاملون ..

الرسالة فبراير ١٩٧٧

! دعوت دینے والوں کو

اس کے لئے

کام کرنا چاہئے

رمضان ۱۳۹۳ھ کے آغاز میں یہ خبر آئی تھی کہ جمہوریہ گابون کے صدر برنارڈ بانگو نے اسلام قبول کر لیا۔ انھوں نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ میں نے اسلام کو اس لئے اختیار کیا کہ اس میں مجھے فطرت کا نور اور اخوت اور مساوات کی عظمت نظر آئی۔

اسلام کے مبلغین افریقہ میں دس بیس ہوں گے۔ اور بعض علاقوں میں تو ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ اس کے باوجود اسلام دلوں تک پہنچنے کے لئے اپنا راستہ پا رہا ہے۔ اس کی روشنی دیکھنے والوں کے لئے مخفی نہیں۔ کیونکہ اسلام وہ دین ہے جو فطرت کو مخاطب کرتا ہے، جو عقل کو پکارتا ہے اور شعور کو حرکت میں لاتا ہے۔ یہ ایسا دین ہے جس میں طلسماتی چیزیں اور مجہول باتیں نہیں۔ اس میں خرافات اور اباطیل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بصیرت سے پردہ ہٹتا ہے اور فطرت کے اوپر سے مصنوعی بادل چھٹتے ہیں بہت جلد انسان اسلام کا راستہ پہچان لیتا ہے۔

اسلام کا یہی معجزہ ہے جس نے تاتاریوں کو اسلام کا حلقہ بگوش بنا دیا اور وہ اس کی حمایت کرنے والے بن گئے۔ حالانکہ وہ دارالخلافہ کو برباد کرنے آئے تھے اور اسلامی تہذیب کو مٹا ڈالنا چاہتے تھے۔

موجودہ مغربی تہذیب اپنی تمام چمک دمک کے باوجود اپنے اندر کے صاف ذہن لوگوں کو اس سے نہ روک سکی کہ وہ اسلام کے نور سے اپنے لئے روشنی حاصل کریں۔ چنانچہ یورپ اور امریکہ کے تہذیبی مراکز سے اسلام ہر دن اپنے اعوان وانصار پا رہا ہے۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان کمزور ہیں اور دشمنوں نے ان کے اوپر غلبہ حاصل کر رکھا ہے۔ مگر یہ واقعہ ان کے لئے اسلام کی طرف آنے میں رکاوٹ نہ بن سکا۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اسلام کی سچائی الگ چیز ہے اور مسلمانوں کی عملی حالت دوسری چیز۔

اسلام کا ایک مؤثر عقیدہ کی حیثیت سے زندہ رہنا اور اس کا ایسا دین ہونا جو دلوں کو مفتوح کرلے یہ موجودہ زمانہ میں اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ جب کہ قومیں اس کی دشمن بنی ہوئی ہیں اور بلاد اسلام کو ڈھانے اور اہل اسلام کو ذلیل کرنے کے لئے جنگیں برپا کئے رہتی ہیں۔

مگر اسلام کی یہ ذاتی قوت امت اسلامیہ کے لئے اس کی دعوتی ذمہ داریوں سے معافی کا سبب نہیں بن سکتی۔ ہم کو ہر حال انسانیت کے سامنے حق کو واضح کرنا ہے تاکہ وہ اپنے طریقے کو پکڑلے اور اپنے راستہ کو پالے۔

ہمارے بزرگ اکابر اپنے فرائض کی ادائگی کے لئے پوری طرح اٹھے انھوں نے دنیا کو اسلام کی دعوت دی۔ انھوں نے خود اس سے برکت حاصل کی اور دوسروں کو برکت دی۔ اب یہ ہمارے اوپر ہے کہ ہم اس ذمہ داری کو سمجھیں جو دین حق نے ہمارے اوپر ڈالی ہے تاکہ ہم اس عزت کے مستحق بنیں جو اس امت کے مثالی لوگوں — صحابہ کرام — کو ملی۔

یہ ہے وہ کام جو کرنے والوں کو کرنا چاہئے۔

تین سال کے اندر دو عیسائی حکمرانوں کا قبول اسلام

کئی سو سال کے وقفہ کے بعد اسلام دوبارہ اپنی اس تاریخی قوت کو دہرا رہا ہے کہ ملکوں کے حکمراں خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔ الرسالہ کے پچھلے شمارہ میں سنٹرل افریقہ کے صدر بوکاسا کے قبول اسلام (اکتوبر ۱۹۷۶) کا واقعہ شائع ہو چکا ہے۔ تاہم اس نئے تاریخ ساز عمل کا آغاز جس نے کیا وہ جمہوریہ گابون کے صدر البرٹ برنارڈ بونگو ہیں جنھوں نے ۲۹ ستمبر ۱۹۷۳ کو اسلام قبول کر لیا تھا اور اپنا اسلامی نام عمر بونگو رکھا۔ گابون، جنوبی افریقہ کا ساحلی ملک ہے جو اٹلانٹک کے کنارے واقع ہے۔

صدر عمر بونگو کے قبول اسلام کے بعد ان کے خاندان کے تمام افراد مسلمان ہو گئے۔ اس کے علاوہ کابینہ کے اکثر وزراء، حکمراں پارٹی کے ارکان، ملک کی ممتاز شخصیتیں اور عام باشندوں میں ہزاروں لوگ مسلمان ہو چکے ہیں اور برابر ہوتے جا رہے ہیں۔ مسلم ممالک سے گابون کے نہایت قریبی تعلقات قائم ہیں۔ صدر عمر بونگو نے کہا:

"براعظم افریقہ میں اسلام کا مستقبل روشن ہے"

صدر عمر بونگو ۳۰ دسمبر ۱۹۳۵ کو فرانس ویل (گابون) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد سرکاری ملازمت پر رہے۔ ۱۹۶۰ میں گابون کو فرانس سے آزادی ملی تو وہ وزارت خارجہ کے ایک افسر تھے۔ ۱۹۶۲ میں وہ وزارت



جمہوریہ گابون کے صدر عمر بونگو

میں داخل ہوئے اور مختلف ترقیاں کرتے ہوئے دسمبر ۱۹۶۷ میں جمہوریہ گابون کے صدر منتخب ہوئے۔

صدر عمر بونگو کے قبول اسلام کی تقریب میں گابون کی راجدھانی لیبرویل میں ایک خصوصی جلسہ کیا گیا تھا جس میں سعودی عرب، لیبیا، خلیج عرب کی ریاستوں کے وفاق کے وفود نے شرکت کی۔ لیبیا سے آنے والے وفد کے سربراہ شیخ محمود صبحی نے صدر بونگو کو کلمہ شہادت پڑھایا۔ انھوں نے اپنی فرانسیسی تقریر میں کہا:

"میں ایک کیتھولک عیسائی تھا۔ میں نے انجیلوں کا مطالعہ کیا ہے، اور مختلف مذاہب کی کتابیں پڑھی ہیں۔ میں نے دیکھا کہ تمام ادیان انسانی فطرت سے دور ہیں۔ میں نے اسلام کا مطالعہ کیا تو میں نے پایا کہ یہی وہ دین ہے جو انسان کو عزت بخشتا ہے اور مختلف انسانوں کے درمیان تفریق نہیں برتتا۔ وہ انسانیت کا احترام سکھاتا ہے"

صدر عمر بونگو نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ ملک کی تعمیر کے لئے ہمارے یہاں تجربہ کار افراد اور ماہرین کی بہت

PRESIDENT OMAR BONGO
BOITE POSTALE 546
LIBERVILLE
REPUBLIC OF GABON

ہے۔ ۱۹۷۵ میں جب صدر بونگو ہندستان آئے تھے تو
ان انھوں نے بعض مجالس میں ذکر کیا کہ ان کو ایک لیڈی ٹیچر
ضرورت ہے جو ان کے گھر کی خواتین کو اسلامی تعلیم دے اور
ن کی دینی تربیت کرسکے۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان ایک مذہبی
لک ہے اور یہاں کوئی خاتون اس کام کے لئے مل سکیں تو
یں ان کو ترجیح دوں گا۔ مگر ان کے گھر کی زبان فرانسیسی ہے۔
ان کو ایسی خاتون کی ضرورت تھی جو عربی اور فرانسیسی جانتی
ہو۔ مگر ہندستان سے ایسی کسی خاتون کا انتظام نہ ہو سکا۔

گابون کا رقبہ ۲ لاکھ ۶۷ ہزار مربع کیلو میٹر ہے۔
آبادی ایک ملین ہے۔ صدر عمر بونگو کے قبول اسلام سے پہلے
یہاں مسلمانوں کی مجموعی آبادی تقریباً ۲۵ ہزار تھی۔ اب
اس تعداد میں کافی اضافہ ہو چکا ہے۔

گابون اپنے گھنے جنگلات کے لئے بہت مشہور ہے
ملک کی اہم پیداوار لکڑی ہے۔ سمندر اور خشکی سے
پٹرول بھی نکالا جاتا ہے۔ تیل صاف کرنے کا کارخانہ
پورٹ جینتی میں قائم کیا گیا ہے۔ مگر اس کارخانہ میں حکومت
کا سرمایہ صرف ۵ فی صد ہے۔ بقیہ سرمایہ دوسروں کا ہے۔

گابون کو اگست ۱۹۶۰ میں فرانسیسی اقتدار سے
آزادی مل گئی تھی۔ مگر اقتصادی آزادی حاصل کرنے کا
کام ابھی باقی ہے۔ حکومت کے عہدوں پر زیادہ تر فرانس
کے تعلیم یافتہ عیسائی قابض ہیں۔ ملک کا سارا نظم یہی چلاتے
ہیں۔ عیسائی مشنریاں بھی کثیر تعداد میں ملک کے اندر
پھیلی ہوئی ہیں اور منصوبہ کے تحت منظم طور پر اپنے تبلیغی
مشن میں مصروف ہیں۔ اسپتال، اسکول، کالج، کھیل
کے میدان، کلب، غرض جدید زندگی کی سرگرمیوں کے تمام
ادارے انھوں نے قائم کر رکھے ہیں اور ان کے ذریعے
عیسائیت کی تبلیغ میں مصروف ہیں۔

۱۱ فروری ۱۹۷۷

صدر عمر بونگو نے ملک کی ہمہ جہتی ترقی کے لئے
ایک جامع منصوبہ بنایا ہے اور اس سلسلہ میں عرب حکومتوں
سے تعاون کی درخواست کی ہے۔ مگر اصل مشکل یہ ہے کہ
عرب ممالک زیادہ سے زیادہ انھیں پٹرو ڈالر دے سکتے
ہیں جب کہ گابون کو اس وقت جس چیز کی ضرورت ہے
وہ "انسان" ہیں نہ کہ ڈالر۔ اس کو ہر فن کے ایسے ماہرین
درکار ہیں جو ملک کے ترقی پذیر معاشرہ کے مختلف شعبوں کا
چارج لے سکیں۔ اور اس معاملہ میں عرب ممالک کا حال
یہ ہے: ع۔ او خویشتن گم است کرا رہبری کند

گابون، اسی قسم کے دوسرے افریقی ممالک کی طرح، ایک
نئے تاریخی موڑ پر کھڑا ہے۔ زراعتی شعبے، تجارتی منصوبے،
صنعتی تنظیمیں، تعلیمی درس گاہیں، سائنسی تحقیقات
اور حکومتی دفاتر سے لے کر خالص مذہبی اداروں تک
ہر کام کے لئے اس کو تربیت یافتہ کارکنوں کی ضرورت ہے۔
کچھ افراد، اپنی فطرت کی آواز پر، دین حق میں شامل ہو گئے
ہیں۔ خوش قسمتی سے یہ ملک کے حکمراں افراد ہیں اور اگرچہ
ملک کے تقریباً تمام شعبوں پر عیسائیوں اور فرانسیسیوں کا
قبضہ ہے، یہ نومسلم حکمراں مسلمانوں کو موقع دے رہے ہیں
کہ وہ وہاں آئیں اور ہمہ گیر جد و جہد کے ذریعے ملک کے
مستقبل کو بدل ڈالیں۔ مگر مسلم ممالک کے رہنماؤں اور
مفکروں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کا محبوب مشغلہ
یہ ہے کہ اپنے اپنے ملکوں کی حکومتوں کا تختہ الٹنے کی فکر میں
لگے رہیں۔ اور اگر عملاً اس کے مواقع نہ ہوں تو "قنوت نازلہ"
پڑھنا شروع کر دیں ۔۔ وقت آگیا ہے کہ سطح ارض پر اسلام
کی تاریخ دوبارہ لکھی جائے۔ مگر یہاں کسی کو کرنے کا کوئی
کام نظر نہیں آتا ـــــ مسلم قائدین کے سیاسی ذوق نے
موجودہ زمانہ میں اسلام کو کتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے!

آدمی اکثر اپنے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے

۱۔ سید محمد بن یوسف حسینی جونپوری (۱۵۰۴-۱۴۴۳ء) اپنے زمانہ کے ایک مسلمہ بزرگ تھے۔ اللہ کی ذات پر انھیں اس قدر یقین تھا کہ انھوں نے اعلان کر دیا: "انسان اگر اس دنیا میں دیدار الٰہی سے مشرف نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کو قلب یا چشم سر سے خواب یا بیداری میں نہ دیکھے تو مومن نہیں۔" اُن کے سیرت نگاروں کا اتفاق ہے کہ وہ "صدق و عزیمت میں پایۂ بلند رکھتے تھے۔ بڑے قوی الاستعداد، صاحب تاثیر بزرگ تھے، دعوت الی اللہ، ہجرت فی سبیل اللہ، ایثار و زہد اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب میں ان کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

مگر اس تمام نیکی اور بزرگی کے باوجود اُن سے یہ غلطی ہوئی کہ انھوں نے دعویٰ کیا کہ وہ وہی "مہدی موعود" اور "مہدی آخر الزماں" ہیں جن کے متعلق حدیثوں میں خبر دی گئی ہے، وہ فرقہ مہدویہ کے بانی ہوئے۔ اُن کی بزرگی اور تقدس اس قدر مسلم تھا کہ جب انھوں نے یہ دعویٰ کیا تو اس وقت کے ہندستان میں، جس میں افغانستان بھی شامل تھا، زبردست ہلچل پیدا ہو گئی۔ علماء و سلاطین سے لے کر عوام تک وہ گفتگو کا موضوع بنے ہوئے تھے۔ مگر بعد کے نتائج ثابت کرتے ہیں کہ ان کا یہ دعویٰ محض وہم پر مبنی تھا

۲۔ محمد حامد (۱۸۸۵-۱۸۴۴ء) جو بعد کو مہدی سوڈانی کے نام سے مشہور ہوئے، ایک خالص عرب نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد اُن کا رجحان تصوف کی طرف ہو گیا۔ انھوں نے ایک مسجد بنائی اور اس میں گوشہ نشین ہو کر تعلیم اور عبادت میں مشغول ہو گئے۔ چونکہ شخصیت پُرکشش پائی تھی۔ اُن کے مریدوں اور شاگردوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ کافی مشہور ہو گئے۔ یہ شہرت اور مقبولیت اُن کے لئے غلط فہمی کا باعث بن گئی۔ ایک مورخ لکھتے ہیں:

لما کثر اتباعه و مریدوه اعتقد انه المهدی المنتظر ثم اخذ ینشر دعوته و وزع منشورات علی الناس بانه المهدی المنتظر۔ (جمال الدین الافغانی۔ صفحہ ۱۲۶)

جب اُن کے پیروں اور مریدوں کی تعداد بڑھ گئی تو وہ سمجھنے لگے کہ میں ہی مہدی ہوں پھر انھوں نے اپنی دعوت پھیلانی شروع کی اور لوگوں میں مشہور کیا کہ مہدی موعود وہی ہیں۔

اس زمانہ میں سوڈان پر انگریزوں کا غلبہ تھا اور وہ وہاں مظالم کر رہے تھے۔ "مہدی" ہونے کی حیثیت سے انھیں اس فتنہ کو ختم کرنا ضروری تھا۔ اس طرح اُن کی خانقاہی زندگی میدان جنگ کی زندگی میں تبدیل ہو گئی۔ انھیں ابتدائی کامیابیاں ہوئیں مگر انگریزوں نے بالآخر اُن کے گروہ کو شکست دی اور انھیں کچل کر ختم کر دیا۔ "مہدویت" پر انگریزیت غالب آگئی۔

۳۔ ابوالکلام آزاد (۱۹۵۸-۱۸۸۸ء) کو قدرت نے غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ مگر اُن کی درج ذیل سطریں صرف یہ ثابت کرتی ہیں کہ وہ اپنے بارے

میں شدید غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے :

"افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سر و سامان نہ کر سکا۔ غالب کو تو صرف اپنی شاعری کا رونا تھا۔ نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی۔

بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت و الم کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے، مذہب، علوم و فنون، ادب و انشار، شاعری کی کوئی ایسی وادی نہیں جس کی بے شمار راہیں مبدا رفیاض نے مجھ نامراد کے دل و دماغ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن و ہر لحظہ بخششوں سے دامن مالامال نہ ہوا ہو۔ بجدیکہ ہر روز اپنے آپ کو عالم معانی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کر دیتی ہیں لیکن افسوس جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گراں بار کیا اسی نے شاید سر و سامان کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالہ کر دیا گیا۔"

۴۔ ابوطیب احمد بن حسین متنبی (۳۵۴ - ۳۰۳ھ) کوفہ کے ایک غریب گھر میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ کوفہ میں بھشتی کا کام کرتا تھا۔ متنبی بچپن سے بلند حوصلہ آدمی تھا اور بڑا بننے کا شوق رکھتا تھا۔ اس کا یہ جذبہ اولاً اس کو شاعری کی طرف لے گیا، کیونکہ اس زمانہ میں شہرت، دولت اور مرتبہ حاصل کرنے کا سب سے آسان ذریعہ شاعری تھا۔ مگر شاعر بننا اس کی طبیعت کو پوری طرح تسکین نہ دے سکا۔ اب اس نے بادشاہ بننے کا خواب دیکھا اور لوگوں کو اپنی خلافت کی بیعت پر ابھارنا شروع کیا۔ بیعت کا معاملہ پورا ہوا چاہتا تھا کہ علاقہ کے گورنر کو اس کے منصوبے کی اطلاع ہو گئی اور اس نے اس کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ جیل خانہ سے اس نے گورنر کے نام ایک قصیدہ لکھ کر روانہ کیا اور اس میں معافی کی درخواست دی۔ گورنر نے اس کو رہا کر دیا۔

مگر بڑا بننے کا ذہن اب بھی اس کے اندر سے ختم نہ ہو سکا۔ اب اس نے ایک اور تدبیر کی۔ اس نے شام میں نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ اپنی جادو بیانی اور اپنے ادبی زور سے بہت سے لوگوں کو اپنا معتقد بنانے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ متنبی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا۔ آپ ہی نے تو میری آمد کی بشارت دی تھی اور فرمایا تھا لا نبی بعدی۔ اس حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ مگر متنبی نے اعراب میں تغیر کر کے یہ مطلب نکالا : میرے بعد "لا" نامی شخص نبی ہوگا اور میرا نام آسمان میں "لا" ہے۔ اس نے قرآن کے مقابلہ میں اپنا کچھ کلام بھی پیش کیا۔

اس کے دعوے کو شہرت ہوئی تو اسے اخشدیہ کے نائب امیر حمص نے گرفتار کر لیا۔ متنبی پریشان ہو گیا اور دعوے نبوت سے توبہ کر کے رہائی حاصل کی۔ اب اس کے معتقدین کا حلقہ بھی ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد وہ مختلف بادشاہوں کی مدح کر کے دولت کماتا رہا۔ مگر اس کا سرداری کا مزاج اسے بار بار خود اپنے ممدوح سے ٹکرا دیتا تھا۔ بالآخر عضد الدولہ (شیراز) نے اس کو قتل کرا دیا۔ حالانکہ اس سے پہلے متنبی نے اس کی مدح کر کے اس سے انعام و اکرام حاصل کیا تھا۔

اوپر کی تصویر: خام لوہا شپ لوڈر کے ذریعہ ٹینکر میں بھرا جارہا ہے



نیچے کی تصویر: جدید بندرگاہ کا عمومی منظر

برآمدی تجارت کو ترقی دینے کے لئے بندرگاہ کو ترقی دینا ضروری

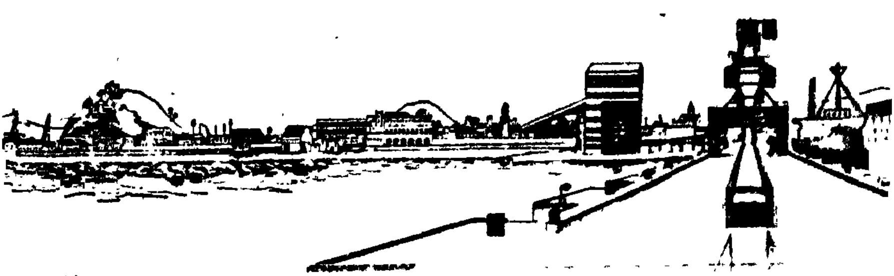
تجارتی نقل و حمل، قدیم زمانہ میں، خشکی اور تری سے ہوتی تھی۔ موجودہ زمانہ میں اگرچہ اس میں تیسرے ذریعے (فضائی) کا اضافہ ہوگیا ہے، تاہم آج بھی بین الاقوامی تجارت کا سب سے بڑا ذریعہ سمندری جہاز رانی ہی ہے۔

۱۹۴۷ میں ہندستان میں پانچ بڑی بندرگاہیں تھیں جن میں سے ایک وسکھا پٹنم کی بندرگاہ تھی۔ جاپان جو ہندستان میں خام لوہے کا سب سے بڑا خریدار رہے اس کو خام لوہے کی برآمد اسی بندرگاہ سے ہوتی تھی۔ مگر بڑھتی ہوئی برآمد اور نئے طریقوں کی ایجاد کے بعد یہ بندرگاہ ناکافی نظر آنے لگی۔ ۶۵-۱۹۶۴ء میں پہلی بار اس میں اتارنے چڑھانے کے مشینی آلات لگائے گئے۔ اس سے خام لوہے کی برآمدی تجارت کو کافی ترقی ہوئی۔

مگر اب سمندری جہاز رانی میں زبردست تبدیلیاں ہوگئی ہیں۔ اشیاء کے نقل و حمل کے لئے بہت بڑے بڑے جہاز استعمال ہونے لگے ہیں۔ ان جہازوں کو بندرگاہ پر لانے کا انتظام اور ان پر سامان لادنے اور اتارنے کے لئے نئے نئے طریقے رائج ہوگئے ہیں۔ ان حالات میں دوبارہ ضرورت تھی کہ وسکھا پٹنم کی بندرگاہ کو وقت کی ضرورتوں کے مطابق بنایا جائے۔

۸ ردسمبر ۱۹۷۶ کو شپنگ اور ٹرانسپورٹ کے مرکزی وزیر ڈاکٹر جی۔ ایس۔ ڈھلون نے وسکھا پٹنم میں جس آؤٹر ہاربر کا افتتاح کیا ہے وہ اسی ضرورت کی تکمیل ہے۔ جدید تعمیر کے بعد وسکھا پٹنم کی بندرگاہ دنیا کی دوسری اور ایشیا کی سب سے لمبی اور گہری بندرگاہ ہوگئی ہے۔ یہ جدید بندرگاہ جاپان کے تعاون سے تعمیر کی گئی ہے۔ اسی کی ایک علامت کے طور پر وسکھا پٹنم کی رسم افتتاح میں پنڈال کے اندر بڑی تعداد میں جاپانی موجود تھے۔

جدید بندرگاہ میں ایک لاکھ ڈی ڈبلو ٹی کی صلاحیت کے جہاز داخل ہوسکیں گے اور ان پر ۸ ہزار ٹن فی گھنٹہ



کی رفتار سے مال بھرا جاسکے گا۔ حکومت کے سامنے منصوبہ ہے کہ اس صلاحیت میں مزید اضافہ کیا جائے۔ اور دو لاکھ ڈی ڈبلیو ٹی تک کے جہاز کی گنجائش پیدا کی جائے۔

تیل کے ٹینکر جو باہر سے ہندستان کے لئے تیل لاتے ہیں وہ بھی اسی بندرگاہ پر کھڑے ہوسکتے ہیں منصوبہ ہے کہ تیل کے لئے ایک علحدہ "آئل جٹی" مہیا کی جائے۔

وسکھاپٹنم کی اس بندرگاہ کی تعمیر کا کام فروری ۱۹۷۲ میں شروع ہوا تھا۔ اس بندرگاہ کو آسٹریلیا کی بندرگاہ کا مقابلہ درپیش تھا۔ جو جاپان کے لئے خام لوہے کا دوسرا بڑا مارکیٹ ہے۔ مگر جدید بندرگاہ کی تعمیر کے بعد یہ مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ ابتداءً اس منصوبہ پر ۳۶ کروڑ ۹۷ لاکھ روپے کے خرچ کا اندازہ کیا گیا تھا۔ جس میں فارن ایکس چینج کی رقم ۸ کروڑ ۲۷ لاکھ روپے کے بقدر تھی۔ مگر منصوبہ کی تکمیل تک اخراجات کی مقدار ۹۷ کروڑ ۲۶ لاکھ (زرمبادلہ: ۱۱ کروڑ ۴ ۶ لاکھ روپے) تک پہنچ گئی۔

آندھرا پردیش کے ساحل پر واقع بندرگاہ کی یہ جدید تعمیر زیادہ تر ملکی مہارت اور ملکی ذرائع کی مدد سے کی گئی ہے۔ ہندستان نہایت تیزی سے صنعت اور ٹکنالوجی میں مکمل خودکفالتی دور کی طرف جا رہا ہے۔ اس بندرگاہ کے افتتاح کے موقع پر وسکھاپٹنم ٹرسٹ نے اعلان کیا کہ خام لوہے کی میکینکل ہینڈلنگ کے منصوبہ کی اس کامیابی کے بعد طے کیا گیا کہ آندھرا یونیورسٹی میں خاص اس موضوع کے مطالعہ کے لئے ایک "چیئر" قائم کی جائے گی۔ یونیورسٹی کے اس شعبہ کا مقصد اشیا کے چڑھانے اتارنے کے کام (—— —— ——) کا خصوصی مطالعہ کرنا ہوگا۔ ★

شفیق احمد انبالوی الاصلی

خدائی قانون میں جانب داری نہیں ہوتی

قبیلہ مخزوم کی ایک عورت چوری کے جرم میں گرفتار ہوئی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔ قبیلہ کے لوگ سخت پریشان کہ اس کو سزا سے کیسے بچائیں۔ خود نبی اکرمؐ سے سفارش کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ آخر کار حضرت اسامہؓ کو کسی طرح راضی کیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ چونکہ آپ حضرت اسامہؓ کو بہت محبوب رکھتے ہیں اس لئے ان کی بات مان لی جائے گی۔ حضرت اسامہؓ نے جب یہ بات کہی تو سن کر آپ سخت ناراض ہوئے غصہ سے آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا، اور فرمایا:

"اسامہؓ! کیا تم حدود اللہ کے معاملہ میں سفارش کرتے ہو؟"

پھر سب لوگوں کو جمع کیا، خطبہ دیا اور فرمایا:

"تم سے پہلی قومیں اسی لئے تباہ ہوگئیں کہ جب کوئی معزز آدمی جرم کرتا تو اسے چھوڑ دیتے تھے اور جب معمولی آدمی جرم کرتے تھے تو سزا پاتے تھے۔ خدا کی قسم! اگر محمد کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔" ★

انسانی تجربات انسان کو سچائی کے دروازہ تک پہنچا چکے ہیں۔ اب
دین حق کے حاملین کو یہ کرنا ہے کہ وہ اٹھیں اور سچائی کے بند دروازہ
کو کھول دیں۔ تاکہ انسانی قافلہ خدا کی رحمتوں کی دنیا میں داخل ہو جائے
جہاں ان کا رب ان کا انتظار کر رہا ہے۔

کا فرض

کا معیار

اسلامی ریاست ابتداءً مدینہ میں ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں قائم ہوئی۔ اس وقت سے لے کر ۱۹ویں صدی کے اختتام تک شریعت اسلامی زمین کے بڑے حصہ پر بلا اختلاف جاری رہی ہے۔ ان تیرہ صدیوں میں اگرچہ سماجی زندگی میں بڑے بڑے انقلابات ہوئے، مگر کبھی یہ سوال نہیں اٹھا کہ شریعت اسلامی مخصوص وقت کے لئے تھی وہ ہر زمان و مکان کے لئے موزوں نہیں۔ مدینہ کی ابتدائی ریاست، ایک سادہ عرب ریاست تھی جس میں پیغمبر اسلام نے اسلامی قانون کو جاری کیا۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں شام، مصر، عراق، ایران، فلسطین کے متمدن علاقے اس کے تحت آگئے۔ مگر عمر فاروق اور علی مرتضیٰ کو نئے حالات پر اسلامی شریعت کو منطبق کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ دور عباسی میں ایک طرف اسلامی سلطنت کا سیاسی رقبہ اتنا وسیع ہو چکا تھا کہ آسمان پر بادل کا ٹکڑا دیکھ کر ہارون الرشید کو یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ امطری حیث شئت فسیأتینی خراجك (جہاں چاہے برس، تیرا خراج مجھ کو پہنچے گا)۔ دوسری طرف یونان، مصر، ہند، چین کے علوم از سر نو زندہ ہوئے اور اسلامی معاشرہ علم و فن کے اعتبار سے ایک نئے دور میں داخل ہو گیا۔ مگر قاضی ابو یوسف وقت کی اس سب سے بڑی اور سب سے زیادہ متمدن سلطنت کا نظام اسلامی شریعت کی بنیاد پر چلانے میں پوری طرح کامیاب رہے۔ اس کے بعد مغلوں اور ترکوں کا دور آیا اور ایشیا، افریقہ اور یورپ کے بڑے ... اسلام کے ماتحت آگئے۔ مگر اول الذکر کے عہد میں فتاویٰ عالمگیری اور مؤخر الذکر کے عہد میں المجلۃ العثمانیہ کا ترتیب پانا بتا ... ہے ... انھوں نے شریعت کو اپنے بڑھتے ہوئے قانونی مسائل کے لئے عاجز نہیں پایا۔

پھر کیا وجہ ... کہ بیسویں صدی ہی میں ہم یہ آواز سنتے ہیں کہ "شریعت اسلامی ہر زمان و مکان کے لئے موزوں نہیں"۔ اس کی وجہ مستشرقین کا پروپیگنڈا نہیں، جیسا کہ بعض لوگ سادگی سے سمجھتے ہیں، بلکہ اس کی وجہ وہ عالمی فکری انقلاب ہے جو جدید سائنس کے زور پر پیدا ہوا ہے۔ ہر دور کا ایک رئیسی طرز فکر ہوتا ہے۔ اس کے تحت آدمی کے خیالات بنتے ہیں، اور ہر معاملہ میں اسی کے مطابق فیصلے کئے جاتے ہیں۔ چند سو برس پہلے دنیا کا رئیسی طرز فکر مابعد الطبیعیاتی بنیادوں پر قائم تھا۔ پچھلے تمام معلوم زمانوں سے یہی طرز فکر چلا آرہا تھا اور اسی کی بنیاد پر رائیں قائم کی جاتی تھیں۔ سائنس نے تاریخ میں پہلی بار اس طرز فکر کو اس کے مقام سے ہٹا دیا اور طبیعیاتی انداز فکر کو رئیسی حیثیت دے دی۔ مذہب اور جدید دور کے ...

موجودہ زمانہ کے تمام مسائل درحقیقت اسی تبدیلی فکر کا شاخسانہ ہیں۔

قدیم زمانہ میں فلسفہ کو علوم کی ملکہ (کوئن آف آرٹس) کہا جاتا تھا۔ جدید سائنس کے ظہور کے بعد فلسفہ نے اپنا یہ مقام کھو دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس کے پاس جو فنی اتقان (Technical Perfection) تھا وہ فلسفہ کو یہ خصوصیت حاصل نہیں۔ سائنس کی اس خصوصیت نے جدید دنیا میں اس کو تمام علوم پر غالب کر دیا اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر وہ طرز فکر پیدا ہوا جس کو ماحولی اصالیت (پازیٹوزم) کہا جاتا ہے — یعنی محسوس و مشہود واقعات کی بنیاد پر رائے قائم کرنا۔ قدیم مابعد الطبیعیاتی طرز فکر کے لئے اس میں کوئی استبعاد نہ تھا کہ وہ روح کو آسمان سے نازل شدہ ایک ماورائی چیز کہے، اور اس مفروضہ کی بنیاد پر انسانی حرکات کی توجیہ کرے مگر جدید ذہن نے چاہا کہ "دوسرے امور کی طرح" وہ اس کو بھی کیا تی اصطلاحات میں بیان کرے۔ اس نے کہا کہ "روح" طبیعی اور کیمیاوی مادوں کے عمل اور رد عمل سے پیدا ہونے والی ایک وقتی کیفیت ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے ہوا سے دو شاخوں کی رگڑ سے آواز پیدا ہوتی ہے۔

غیر طبیعی واقعات کی توجیہ طبیعی اصطلاحوں میں کرنے کا یہ ذہن مذہب تک پہنچا۔ مذہب کا آسمانی رشتہ کا مشاہدہ سائنسی ذرائع سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ البتہ مذہب کے وہ خارجی مظاہر انسان کے مشاہدہ میں آ رہے تھے جو ہر دور میں انسانی سماج کے اندر مذہب کے نام سے پائے جاتے رہے ہیں۔ اس لئے انھیں خارجی مظاہر کو مذہب کے سمجھنے کا مدار قرار دے دیا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب الٰہیات (تھیالوجی) کے بجائے انسانیات (انتھروپالوجی) کے مطالعہ کا موضوع بن گیا۔ اب انسانی سماج، مذہب کو جاننے کا ماخذ تھا، جب کہ اس سے پہلے مذہب آسمان سے ماخوذ سمجھا جاتا تھا۔ یہ تبدیلی کوئی معمولی تبدیلی نہ تھی۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے ریاض کی یونیورسٹی (ذوقعدہ ۱۳۹۹) جو شریعت اسلامی کے موضوع پر ہو رہی ہے۔ مورخین کی جماعت اس کو "فرنیچر" کی تاریخ کے خانہ میں ڈال دے اور آئندہ اس کا مطالعہ فرنیچر کے عنوان کے تحت کیا جانے لگے۔

آج جب ایک شخص کہتا ہے کہ "مذہب و شریعت زمانی چیزیں ہیں" تو اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہوتا ہے کہ مذہب و شریعت سماجی حوالہ کے تحت پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ معلوم بات ہے کہ سماجی حوالہ کے تحت پیدا ہونے والی چیزیں زمانی ہوتی ہیں۔ لباس اور فرنیچر ہر زمانہ میں یکساں نہیں ہو سکتے۔ اس لئے مذہب و شریعت بھی قدرتی طور پر ایک زمانی ظاہرہ ہے۔ اس کے برعکس اگر انسان مذہب کا مطالعہ اس نظر سے کرتا کہ اس کا مصدر وہی لازوال حقیقت الٰہی ہے جو نباتات کی روئیدگی، حیوانات کی پیدائش اور ستاروں کی گردش کو کنٹرول کر رہا ہے تو اس کو نظر آتا کہ مذہب ایک ابدی حقیقت ہے جس طرح طبیعیات اور حیاتیات کے قوانین ابدی ہیں۔ مگر مذہب کو سماجی علوم کے مطالعہ کا موضوع بنانے کی وجہ سے سارا معاملہ الٹ گیا۔

[illegible] انسانی کا ایک [illegible] اسلام کے [illegible]
[illegible] اس مذہب کے [illegible]

اسلام کے مطلوبہ رخ کی طرف موڑ دیں۔ مگر بد قسمتی سے ہمارے مصلحین معاملہ کی اصل نوعیت کو سمجھ نہ سکے۔ انھوں نے اس پورے معاملہ کو استعمار کا پیدا کردہ ایک سیاسی مسئلہ سمجھا اور دو سو برس کی انتہائی قیمتی مدت صرف سیاسی معرکہ آرائیوں میں ضائع کر دی گئی۔ دور جدید کو سمجھ کر اس کے حسب حال احیائے اسلام کی جدوجہد کی منصوبہ بندی ہم نہ کر سکے۔

یہ چیلنج جو موجودہ زمانہ میں اسلام کو پیش آیا، کسی قدر بدلی ہوئی شکل میں اسلام کے ابتدائی دور میں بھی اس کے ساتھ پیش آ چکا ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں اسلام کا مقابلہ جس دنیا سے ہوا، وہ شرک کی دنیا تھی۔ مختلف ملکوں اور قوموں میں خدا کے رسول آتے رہے۔ انھوں نے متفقہ طور پر لوگوں کو توحید کی طرف بلایا۔ مگر عالمی رائے عامہ نے دعوت توحید کو رد کر دیا اور زندگی کے تمام شعبے شرک کی بنیادوں پر قائم ہو گئے۔ اس زمانہ میں شرک اتنا طاقتور تھا کہ توحید کی آواز بلند کرنے والوں کو آرے سے چیر دیا جاتا تھا۔ جس نظام میں اقتصادیات دیوتاؤں کے نام پر لگنے والے بازاروں سے وابستہ ہو گئی ہو، اور جہاں ایک بادشاہ حکومت کرنے کا حق یہ کہہ کر حاصل کرتا ہو کہ وہ فلاں دیوتا کی اولاد ہے، وہاں توحید کے پیغام کو کس طرح برداشت کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت اللہ نے اپنے آخری رسول کو بھیجا اور اس کو لیظہرہٗ علی الدین کلہ کی نسبت عطا فرمائی۔ اللہ کی اس نصرت کے بل پر اسلام کے نمائندے توحید کا پیغام لے کر اٹھے اور اس طاقت کے ساتھ اس کو پیش کیا کہ انسانیت کا قافلہ ایک نئی راہ پر چل پڑا۔ لندن کی ایک تازہ انسائیکلو پیڈیا (۱۹۷۴) میں "اسلام" کے مقالہ نگار نے اس حقیقت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے: اسلام نے تاریخ کے رخ کو بدل دیا:

ISLAM CHANGED THE COURSE OF HUMAN HISTORY

اسلام نے انسانی تاریخ پر کیا انقلابی اثرات ڈالے۔ یہ ایک علیحدہ اور مستقل موضوع ہے۔ تاہم مثال کے طور پر میں ایک واقعہ کا ذکر کروں گا۔ آرنلڈ ٹائن بی نے لکھا ہے کہ فطرت کی طاقتیں اول روز سے زمین پر موجود تھیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس کی تسخیر صرف حالیہ سائنسی انقلاب کے بعد ہو سکی۔ پھر وہ خود ہی جواب دیتا ہے کہ اس تسخیر کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ شرک (مظاہر پرستی) کا عقیدہ تھا جو پچھلے تمام زمانوں میں مسلسل انسان کے اوپر ایک غالب فکر کی حیثیت سے چھایا رہا ہے۔ شرک کے عقیدہ نے فطرت کی طاقتوں کو دیوتا بنا دیا۔ مشرک انسان کے نزدیک یہ طاقتیں پرستش کا موضوع تھیں نہ کہ تسخیر کا موضوع۔ یہ تمام تر عقیدۂ توحید کا کرشمہ ہے کہ انسان نے ان طاقتوں کو اپنی ہی قسم کی مخلوق کی نظر سے دیکھا اور ان کو مسخر کیا۔

بد قسمتی سے موجودہ زمانہ کے مسلمان جدید الحاد کے مقابلہ میں وہی رول ادا نہ کر سکے جو ان کے اسلاف نے قدیم شرک کے مقابلہ میں ادا کیا تھا۔ ورنہ آج نہ صرف یہ کہ ہم دفاع کی پوزیشن میں نہ ہوتے بلکہ خود انسانیت کی تاریخ بھی دوسری ہوتی۔ جس طرح ہزار برس پہلے ہمارے اسلاف نے اللہ کی تائید سے دنیا کی تاریخ بدل دی تھی۔

تاہم اللہ ہر امر پر غالب ہے۔ وہ عالم انسانی کے واقعات پر مستقل نظر رکھتا ہے، اور اپنے فیصلہ کے تحت

حق کا احقاق اور باطل کا ابطال کرتا رہتا ہے۔ وہ کام جس کو کرنے میں مسلمان ناکام ثابت ہوئے اس کو اللہ نے، حیرت انگیز طور پر، خود مغربی اقوام کے ہاتھوں انجام دلا دیا ہے۔ مغربی سائنس کی بعد کی تحقیقات نے وہ تمام نظریاتی بنیادیں منہدم کر دیں جو مذہب و شریعت کو بے اصل یا زمانی ثابت کرنے کے لئے علم جدید نے وضع کی تھیں۔

انسان کو غلط راہوں میں بھٹکنے سے بچانے کے لئے قرآن نے دو انتہائی بنیادی باتوں کی نشان دہی کی تھی۔ ایک یہ کہ انسان کو چاہئے کہ وہ حقیقت کا غیبی طور پر اقرار کرے، اگر اس نے اصرار کیا کہ اس کو حقیقت کا براہ راست مشاہدہ کرایا جائے تو وہ سچائی کو نہیں پا سکتا (هُدًى لِلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ)

دوسرے یہ کہ انسان کو چاہئے کہ وہ اس امر واقعہ کا اعتراف کرے کہ وہ اپنی زندگی کا قانون خود اپنے علم کے ذریعہ دریافت نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اپنا قانون خود وضع کرنے کی کوشش کرے گا تو یہ صورت واقعہ کے سراسر خلاف ہوگا۔ (وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ)

موجودہ دور میں ان دونوں باتوں کو مذہبی خوش اعتقادی پر محمول کیا گیا۔ کہا گیا کہ ان کے پیچھے کوئی علمی بنیاد نہیں ہے۔ مگر سائنس کی بعد کی دریافتوں نے حیرت انگیز طور پر ثابت کیا ہے کہ انسان کے لئے واحد قابل عمل موقف وہی ہے جو قرآن میں بتایا گیا تھا۔ اس کے سوا کوئی دوسرا موقف، علمی طور پر، اس کے لئے ہو ہی نہیں سکتا۔

یہود نے تین ہزار برس پہلے اپنے نبی سے کہا تھا کہ ارنا اللہ جهرة۔ ٹھیک یہی بات موجودہ زمانہ میں علم کے نام پر دہرائی گئی۔ سائنسی ذرائع کے استعمال سے جب ایسے بے شمار مخفی حقائق انسان کے علم میں آئے جن کو وہ اس سے پہلے نہیں جان سکتا تھا، تو کہا گیا کہ سائنس نے انسانی حواس کی محدودیتوں کی تلافی کر دی ہے اور اب ہر موجود چیز کو انسان کے براہ راست مشاہدہ میں آجانا چاہئے۔ سائنسی ذرائع کے استعمال کے بعد بھی اگر کوئی چیز ہمارے مشاہدہ میں نہیں آتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ جب معلوم ہوا کہ سائنسی آلات خوردبینی کیڑوں سے لے کر بعید ترین اجرام تک کو دیکھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، مگر مذہبی حقائق ان کے مشاہدہ میں نہیں آئے، تو سمجھ لیا گیا کہ ان کی کوئی واقعی حقیقت نہیں۔

مگر بیسویں صدی کا آغاز اس ذہن کے خاتمہ کے ہم معنی بن گیا۔ روشنی کی تعبیر ذرات ([illegible]) سے کرنے کے سلسلے میں ناکامی نے بتایا کہ کائنات میں ایسی حقیقتیں ہیں جن کو طبیعی اصطلاحوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایٹم کے ٹوٹنے سے معلوم ہوا کہ اشیاء ابتدائی سائنسی اندازوں سے بہت زیادہ پیچیدہ ہیں۔ ہم جتنی چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں، ان سے کہیں زیادہ تعداد ان چیزوں کی ہے جو ہمارے آلات کی گرفت میں نہیں آتے۔ حتیٰ کہ بلیک ہول تھیوری کے مطابق خود کثیف اجسام کا بھی صرف ۳ فی صد حصہ ہمارے لئے قابل مشاہدہ ہے، بقیہ ۹۷ فی صد حصہ وہ ہے جس کو ہم کبھی نہیں دیکھ سکتے۔

جب کائنات اس سے زیادہ اشیاء کا مجموعہ ہے جو ہمارے براہ راست مشاہدہ میں آتی ہیں تو بقیہ ناقابل

مشاہدہ چیزوں کو جاننے کا ذریعہ کیا ہے۔ یہاں سائنس داں کو ذرائع علم میں مشاہدہ (OBSERVATION) کے ساتھ استنباط (INFERENCE) کا اضافہ کرنا پڑا۔ پہلے دور کی علامت اگر نیوٹن تھا تو دوسرے دور کی علامت آئن سٹائن ہے۔ اس سلسلہ میں آئن سٹائن کے نظریات کا خلاصہ ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:

IN DEALING WITH THE ETERNAL VERITIES, THE AREA OF EXPERIMENT IS REDUCED AND THAT OF CONTEMPLATION ENHANCED

اس طرح سائنس نے گویا اس واقعہ کا اعتراف کر لیا کہ انسان کے لئے ایمان بالغیب (ظواہر کو دیکھ کر حقائق کو ماننا) کا طریقہ اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

نظریۂ علم (THEORY OF KNOWLEDGE) میں یہ تبدیلی کوئی معمولی تبدیلی نہیں ہے۔ اس نے سچائی کا وہ دروازہ کھول دیا ہے جو دو سو برس سے بند پڑا ہوا تھا۔ سائنس نے جو کائنات دریافت کی تھی، وہ حیرت انگیز طور پر ایک انتہائی بامعنی کائنات تھی۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اپنی ایک توجیہہ (EXPLANATION) مانگ رہی تھی۔ مگر توجیہہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک استنباطی چیز ہے نہ کہ مشاہداتی۔ اس لئے سائنس انیسویں صدی کے آخر تک اس سے گریز کرتی رہی۔ اب "استنباط" کو سائنسی علم کے زمرہ میں داخل کرنے کے بعد سائنس نے استنباطی توجیہہ کی صداقت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ نیوٹن کے الفاظ کو دوبارہ دہرایا جا سکے کہ نظام عالم کے پیچھے ایک خدائی بازو (DIVINE ARM) کام کر رہا ہے۔ حرکت، زندگی، حسن، معنویت، حکمت، عظمت اور پراسرار خواص کا وہ مجموعہ جس کو کائنات کہا جاتا ہے، اس کی کوئی توجیہہ اس کے سوا نہیں تھی کہ اس کو ایک زندہ اور باشعور خدا کی کارفرمائی تسلیم کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ استنباطی استدلال کو ایک جائز طریق استدلال ماننے کے بعد پوری کی پوری سائنس قرآن کا علم کلام بن گئی ہے۔ وہ قرآنی عقائد کو علمی سطح پر ثابت کر رہی ہے۔ کمی جو ہے وہ صرف یہ کہ سائنس کی دریافتوں کو ابھی تک قرآنی کلامیات کے طور پر مرتب نہیں کیا گیا۔

یہاں مثال کے طور پر میں صرف ایک حوالہ دوں گا۔ جدید سائنس نے دریافت کیا ہے کہ کائنات کی ہر چیز اپنا ایک جوڑا رکھتی ہے۔ مقناطیس کے ایک ٹکڑے کو کاٹیں تو وہ فوراً اپنا ایک ساؤتھ پول اور نارتھ پول پیدا کر لے گا۔ اسی طرح ہر چیز جوڑے جوڑے کی شکل میں اپنے وجود کو برقرار رکھتی ہے۔ پارٹیکل کا اینٹی پارٹیکل۔ ایٹم کا اینٹی ایٹم، حتی کہ ورلڈ کا اینٹی ورلڈ۔ اینٹی ورلڈ کو ملائے بغیر ہم موجودہ ورلڈ کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ یقین کیا جاتا ہے کہ موجودہ دنیا کے اندر ایک اور حیرانی دنیا موجود ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ مزید یہ کہ دوسری دنیا (اینٹی ورلڈ) ہماری موجودہ دنیا کے مقابلہ میں کچھ زیادہ خواص رکھتی ہے۔ مثلاً ہماری دنیا فانی ہے جب کہ دوسری دنیا (اینٹی ورلڈ) کے اندر بقا کی صلاحیت ہے۔ وغیرہ

یہ حیرت انگیز طور پر قرآن کی تصدیق ہے۔ قرآن میں کہا گیا تھا: وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ۔ یعنی دنیا کی تمام چیزوں کو ہم نے اس طرح بنایا کہ جوڑے کے بغیر کسی چیز کا وجود ممکن نہیں۔ تاکہ تم غور

کرکے اس حقیقت تک پہنچو کہ پورے عالم کا علم ایک جزو کا بھی ضروری ہے اور وہ آخرت ہے۔

یہی موجودہ زمانہ کی تمام سائنسی دریافتوں کا حال ہے۔ یہ دریافتیں حقیقتہً عالم کون کے اندر چھپے ہوئے "آلاء اللہ" کا ظہور ہیں۔ یہ اس پیشین گوئی کی تکمیل ہے جو قرآن میں تیرہ سو برس پہلے کی گئی تھی: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ۔

جدید دریافتوں کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس نے آخری طور پر متحقق کر دیا ہے کہ انسان اپنی زندگی کا قانون خود دریافت نہیں کرسکتا۔

یہ بات اب غیر مشتبہ طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ انسان کے ذرائع اس کو صرف جزوی علم تک پہنچاتے ہیں۔ اس واقعہ کا سب سے زیادہ معنی خیز پہلو یہ ہے کہ جو باتیں ہمارے علم تک نہیں آتیں وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس سے بہت زیادہ اہم ہوتی ہیں جو ہمارے علم میں آرہی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ معلوم ہوا ہے کہ ریڈیم کے الکٹران ٹوٹتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک وقت آتا ہے جب کہ ریڈیم کا ٹکڑا ایک غیر تابکار عنصر (سیسہ) کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ الکٹران کیوں ٹوٹتے ہیں۔ وہ کون سی طاقت ہے جو بے شمار الکٹران میں سے ایک الکٹران کے لئے ایک وقت خاص میں قضا کا حکم بن کر آتی ہے۔ اس اہم ترین سوال کے بارے میں سائنس دانوں کی تمام قیاس آرائیاں غلط ثابت ہوئی ہیں۔ حتی کہ ایک سائنس داں کو کہنا پڑا کہ "یہ شاید خداؤں کے اختیار میں ہے، خواہ وہ جو بھی ہوں"۔

یہی تمام اشیاء کا حال ہے۔ ایک سائنس داں کے الفاظ میں:

THE IMPORTANT IS UNKNOWABLE, AND THE KNOWABLE IS UNIMPC:TANT

(جو اہم ہے وہ ناقابل دریافت ہے اور جو قابل دریافت ہے وہ اہم نہیں)

یہ بات جو سائنسی دنیا کے بارے میں دریافت ہوئی ہے، یہ اس مسئلہ کے بارے میں انتہائی اہمیت رکھتی ہے جس کو ہم "انسانی قانون کا مسئلہ" کہتے ہیں۔ کیونکہ انسان، ریڈیم کے ایک ٹکڑے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ پیچیدہ وجود ہے۔ پھر جب ہم دھات کے ایک ٹکڑے کے قانون کو صحیح طور پر دریافت نہیں کرسکتے تو انسانی زندگی کا قانون کس طرح معلوم کرسکتے ہیں۔

سائنس نے بتایا ہے کہ انسان کی ہستی اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے جیسا کہ قدیم زمانہ میں سمجھا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کا تعلق ساری کائنات سے ہے۔ وہ بیک وقت علم الاحیاء سے لے کر فلکیات تک اور نفسیات سے لے کر اقتصادیات تک بے شمار علوم کا موضوع ہے۔ دوسرے لفظوں میں، انسان کو صحیح طور پر جاننے کے لئے ساری کائنات کا علم ضروری ہے۔ مگر ٹھیک اسی وقت ہماری تحقیق نے بتایا کہ انسان کچھ ایسی لازمی محدودیتوں کا شکار ہے جس کی وجہ سے اس کے لئے ممکن نہیں کہ وہ حقیقت کو اس کی وسیع اور کلی شکل میں دیکھ سکے۔ انیسویں صدی میں قانون انسانی کے مطالعہ کو "سوشل انجینیرنگ" سے تعبیر کیا گیا تھا گویا جس طرح ایک انجینیر

لوہے کی ایک مشین کے لئے پائدار اور غیر متبدل قوانین وضع کرتا ہے، اسی طرح ماہرین قانون انسانی زندگی کے لئے بھی ایک قانونی ڈھانچہ بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ مگر قانون انسانی کا کوئی متفقہ معیار دریافت کرنے میں کامل ناکامی ہوئی۔ حتیٰ کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں ہم ایسی کتابیں پڑھتے ہیں جن کا ٹائٹل ہوتا ہے:

قانون اپنی تلاش میں Law in quest of itself

علم قانون (JURISPRUDENCE) طویل تلاش کے بعد بالآخر یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو رہا ہے کہ خالص علمی طریق پر زندگی کا قانون انسان کے لئے قابل دریافت (Discoverable) نہیں ہے۔ ہماری حیاتیاتی اور ذہنی محدودیتیں ([illegible]) ہماری راہ میں فیصلہ کن طور پر حائل ہیں۔ جارج وائٹ کراس پیٹن نے اعتراف کیا ہے کہ قانونی معیارات کا کوئی متفقہ مجموعہ پانے کی صورت عملاً اگر کوئی ہے تو صرف یہ کہ وحی آسمانی کو قانون کا ماخذ مان لیا جائے!

انیسویں صدی میں مغرب میں سماجی قانون کے جتنے فلسفے پیدا ہوئے، سب کسی نہ کسی طرح اس کے دعوے دار تھے کہ سماجی قانون، طبیعی قانون کی طرح، خلقی ([illegible]) طور پر سماج کے اندر موجود ہوتا ہے۔ ہمارا کام صرف اس کو "دریافت" کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں سماجی قانون بھی اسی طرح ابدی ہے جس طرح بھاپ اور بجلی کے قوانین۔ یہ تمام فلسفے سماجی قانون کو دریافت کرنے میں ناکام رہے۔ تاہم میں کہوں گا کہ اصولی طور پر ان کا موقف صحیح تھا۔ ان کی غلطی یہ تھی کہ وہ ایک صحیح چیز کو غلط جگہ تلاش کر رہے تھے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ انسانی زندگی کا قانون بھی، طبیعیات وحیاتیات کے قوانین کی طرح، ابدی طور پر مقرر ہے۔ مگر اس قانون کو معلوم کرنے کی جگہ وحی الٰہی ہے نہ کہ وہ انسانی علوم جن کے متعلق ہم خود دریافت کر چکے ہیں کہ وہ جزوی معلومات کے سوا ہمیں کچھ نہیں دیتے۔

انسانی قانون کو الٰہی ذریعہ سے قابل اخذ ماننے کا مطلب، دوسرے لفظوں میں، اس کو کائناتی قانون کی سطح پر رکھنا ہے۔ یعنی جس منبع سے ساری کائنات اپنا قانون لے رہی ہے وہیں سے انسان بھی اپنا قانون اخذ کرے۔ یہ چیز انسانی قانون کو ابدیت کے خانہ میں ڈال دیتی ہے۔ کائناتی قانون کے متعلق معلوم ہے کہ وہ مسلمہ طور پر غیر متغیر ہے۔ پانی جس قانون تجاذب کے تحت دو گیسوں کے ملنے سے وجود میں آتا ہے اور جس قانون حرارت کے تحت اس کے مالیکیول جدا ہو کر بھاپ کی شکل میں اڑنے لگتے ہیں۔ وہ ہر مقام اور ہر زمانہ میں یکساں ہیں۔ پھر خدا کے قوانین جب طبیعیات اور حیاتیات کی دنیا میں ابدی ہیں تو انسانی معاشرہ کے لئے اس کے قوانین غیر ابدی کس طرح ہو سکتے ہیں۔ ایک ہی ماخذ سے نکلے ہوئے دو قوانین دو الگ الگ نوعیت کے نہیں ہو سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ قانون کو خدا سے ماخوذ ماننا ہی اس کو زمان ومکان کی حدبندیوں سے ماورا ثابت کر دیتا ہے۔

قانون کائنات کی ابدیت اس کے باوجود ہے کہ اس کے اندر بے شمار قسم کے تغیرات ہر آن مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں۔ قدیم زمانہ کا انسان ستاروں کی بابت عقیدہ رکھتا تھا کہ دن کے وقت ان کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یہ

رات کی قندیلیں ہیں جو آسمان پر دیوتاؤں کے لئے جلائی جاتی ہیں۔ اسی طرح چاند کے گھٹنے بڑھنے کو وہ حقیقی سمجھتا تھا۔ سورج کے متعلق اس کا خیال تھا کہ وہ صبح کو "نکلتا" اور شام کو "ڈوبتا" جاتا ہے۔ یہ تغیرات آج "آنکھ کا دھوکا" ثابت ہو چکے ہیں۔ تاہم جدید انسان نے دوسرے اس سے بھی زیادہ بڑے بڑے تغیرات کا مشاہدہ کیا ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ ان ظاہری تغیرات سے قوانین کی ابدیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حیاتیات کی دنیا، جدید تحقیق کے مطابق، مسلسل تغیرات کا شکار رہتی ہے۔ علم الخلایا نے بتایا ہے کہ انسانی جسم کے تمام اعضاء بال اور ناخن سے لے کر گوشت اور خون تک ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود کسی سائنس داں نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ حیاتیات اور عضویات کے علم کو ہر سال بدلا جائے، اور ان کو بار بار "نئے حالات" کے مطابق مدون کیا جاتا رہے۔ کیوں کہ گہرا مطالعہ بتا رہا تھا کہ تغیرات کے ماورا جو انسانی وجود ہے، وہ تبدیلیوں کے باوجود، ایک حالت پر باقی رہتا ہے اور ایک ہی مستقل قانون کے تحت عمل کرتا ہے۔

اب ہم اپنی گفتگو کے آخری حصہ پر آتے ہیں: "کیا کوئی براہ راست قرینہ بھی موجود ہے جو اس دعوے کی صداقت ثابت کرتا ہو کہ انسان کو اپنا قانون خدا کے ابدی سرچشمہ سے اخذ کرنا چاہئے؟" جواب یہ ہے کہ کم از کم دو ایسے قرینے یقینی طور پر موجود ہیں۔ ایک انسانی فطرت، دوسرے انسانی ساخت کے قوانین کا تجربہ۔

لارڈ ایکٹن نے بجا طور پر کہا تھا:

POWER CORRUPTS AND ABSOLUTE POWER CORRUPTS ABSOLUTELY

(اقتدار بگاڑتا ہے اور کامل اقتدار بالکل بگاڑ دیتا ہے)

انسان کے بارے میں ساری تاریخ کا تجربہ ہے کہ جب بھی انسان کو مطلق اختیار حاصل ہوا ہے، اس نے ظلم و فساد پیدا کیا ہے۔ انسان کی ساخت بتاتی ہے کہ وہ کسی برتر اقتدار کے ماتحت رہ کر ہی صحیح کام کر سکتا ہے۔ لامحدود اختیارات لازماً اس کو بگاڑ کی طرف لے جاتے ہیں۔

یہ بات اس سے پہلے صرف اخلاقی اصطلاحوں میں کہی جاتی تھی۔ مگر اب خود علم الحیات سے اس کا ثبوت ملنا شروع ہو گیا ہے۔ امریکہ کے مشہور بیالوجسٹ پروفیسر بی۔ ایف۔ اسکنر اور ان کے ساتھیوں نے اس مسئلہ کا مطالعہ خالص حیاتیاتی سائنس کی روشنی میں کیا ہے اور اپنے نتائج تحقیق کو تازہ مطبوعہ کتاب BEYOND FREEDOM AND DIGNITY میں درج کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ انسان اپنی ساخت کے اعتبار سے اس قابل نہیں کہ وہ آزادی کا تحمل کر سکے:

WE CAN'T AFFORD FREEDOM

وہ اپنی تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسان کو لامحدود آزادی نہیں بلکہ پابند نظام (Controlled Culture) چاہئے۔ یہی اس کی حیاتیاتی فطرت کے زیادہ مطابق ہے ——— حیاتیاتی سائنس کے یہ تجربات قرآن کے اس بیان کی بالواسطہ طور پر تصدیق کر رہے ہیں: یَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ

اس کے بعد جب ہم انسانی قانون سازی کے تجربات کا مطالعہ کرتے ہیں، تو اس سے بھی یہی قرینہ حاصل ہوتا ہے کہ انسان اپنا قانون دریافت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یہاں میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق چند تقابلی مثالیں دوں گا۔

۱۔ شرعی قانون میں سود کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ جب کہ وضعی قانون میں اس کو تجارتی سودے پر قیاس کرتے ہوئے جائز سمجھا گیا ہے۔ اگر اسے الگ طور پر دیکھا جائے تو تجربہ پوری طرح شرعی قانون کی برتری ثابت کرتا ہے۔ سود کی حرمت کی بنا پر مسلم ملکوں میں ایک ہزار سال تک اقتصادی نظام چلتا رہا۔ مگر کبھی یہ نوبت نہ آئی کہ ایک طرف دولت کا انبار ہو اور دوسری طرف افلاس کا انبار۔ جدید اقتصادی نظام جو سود کی بنیاد پر قائم ہے اس نے انسانی سماج میں پہلی بار یہ غیر متوازن صورت حال پیدا کی ہے۔ اور موجودہ نظام کے اندر اس کا کوئی حل نہیں۔

لین دین کی تمام شکلوں میں سود واحد طریقہ ہے جو دولت کی گردش کے عمل کو یک طرفہ بنا دیتا ہے۔ سود کی یہی وہ خصوصیت ہے جس سے مل کر جدید صنعتی نظام ایک استحصالی نظام میں تبدیل ہو گیا۔ اور نتیجۃً موجودہ صدی کی وہ دو سب سے بڑی برائیاں وجود میں آئیں جن میں سے ایک کا نام اشتراکی جبر اور دوسرے کا نام دوسری عالمی جنگ ہے۔ مارکس اور انیسویں صدی کے دوسرے معاشی مفکرین جنھوں نے انفرادی ملکیت کی تنسیخ میں اقتصادی عدل کا راز تلاش کیا وہ اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے کہ صنعتی نظام کو جس چیز نے استحصال کا نظام بنایا ہے، وہ اس کے ساتھ سودی سرمایہ کاری کا جوڑ ہے نہ کہ انفرادی ملکیت کا جوڑ۔ اگر وہ اس راز کو پا لیتے تو وہ سود کی منسوخی کی وکالت کرتے۔ اس کے بجائے انھوں نے ملکیت کی منسوخی کا طریقہ اختیار کر کے کوئی مسئلہ حل نہیں کیا۔ البتہ انسانیت کے ایک بڑے حصہ کو تاریخ کے سب سے بڑے اجتماعی عذاب میں اس طرح قید کر دیا کہ وہ اس سے نکلنا چاہے بھی تو نہ نکل سکے۔

تاہم ہٹلر نے سود کی اس شناعت کو محسوس کر لیا تھا۔ یہودی سرمایہ دار، دوسری عالمی جنگ سے پہلے، جرمنی اور دوسرے یورپی ملکوں کی معاشیات پر پوری طرح قابض ہو گئے تھے۔ ہٹلر نے اس مسئلہ کا بغور مطالعہ کیا تو اس کی سمجھ میں آیا کہ یہودیوں کے اقتصادی غلبہ کی وجہ سود ہے۔ اگر سود کو قانونی طور پر ناجائز قرار دے دیا جائے تو یہودی سرمایہ داری اسی طرح ختم ہو جائے گی جس طرح کسی ذی حیات کے جسم سے اس کا خون نکال لیا جائے۔ مگر اس کا بڑھا ہوا انتقامی جنون بعد کو اسے اقتصادی حل کے بجائے فوجی حل کی طرف لے گیا اور اس نے نہ صرف جرمنی بلکہ سارے یورپ سے یہودیوں کے استیصال کے لئے تاریخ کی ہولناک ترین جنگ چھیڑ دی۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد یورپ کے بچے کھچے یہودی امریکہ پہنچ گئے۔ پچھلے تیس برس میں اس قوم نے امریکہ کے سودی اداروں کو اپنے ہاتھ میں لے کر امریکہ کی اقتصادیات پر دوبارہ اسی طرح قبضہ کر لیا ہے جس طرح انھوں نے اس سے پہلے یورپ کی اقتصادیات پر قبضہ کیا تھا۔ چنانچہ نازی جرمنی کی طرح امریکہ میں بھی ان کے خلاف نفرت کا آغاز ہو چکا

حتیٰ کہ سمجھ بوجھ رکھنے والے لوگ محسوس کرتے ہیں کہ عجب نہیں کہ مستقبل میں امریکہ میں بھی اس کے خلاف کوئی "بغاوت" پیدا ہو جائے۔

یہی صورت حال ایک اور شکل میں "زیر ترقی ممالک" میں پیش آرہی ہے۔ یہ ممالک اپنی ترقیاتی اسکیموں کے لئے ترقی یافتہ ممالک سے قرض لینے پر مجبور تھے۔ یہ قرضہ، موجودہ اقتصادی نظام کے تحت، انہیں سودی شرائط پر ملا۔ سود کی اقتصادی کرامات کے نتیجہ میں قرضوں کی یہ رقم بڑھتے بڑھتے اب اتنی زیادہ ہو چکی ہے کہ کئی مدیون ملک اپنی سالانہ قسطوں کی ادائیگی کے لئے خود دائن ملکوں سے دوبارہ قرض لینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اکثر ملکوں کا یہ حال ہے کہ اگر انہیں یہ سارے قرضے مع سود ادا کرنے پڑیں تو وہ مکمل طور پر دیوالیہ ہو جائیں۔

۲۔ شریعت اسلامی کا تصور سزا اس بنیاد پر قائم ہے کہ انسان ایک با اختیار مخلوق ہے۔ وہ بالقصد اپنے ارادے کے تحت جرم کرتا ہے اس لئے مجرم کو ایسی سزا دینا چاہئے جو دوسروں کے لئے عبرت (نکال) بن سکے۔ یعنی اس کے انجام کو دیکھ کر ڈر جائیں اور آئندہ جرم کرنے سے باز رہیں۔ اس کے مطابق شریعت خداوندی میں قاتل کی سزا قتل مقرر کی گئی۔ مگر اٹھارویں صدی کے آخر میں یورپ میں جرمیات (Criminalogy) کا ایک نیا فلسفہ وضع ہوا۔ اس کے مطابق جرم کوئی ارادی واقعہ نہ تھا، بلکہ اضطراری واقعہ تھا۔ اس کے اسباب حیاتیاتی ساخت، ذہنی بیماری، معاشی تنگی، سماجی حالات وغیرہ میں بتائے گئے۔ کہا گیا کہ مجرم کو مجرم کے بجائے مریض سمجھنا چاہئے۔ اور سزا دینے کے بجائے اس کے "علاج" کا انتظام کرنا چاہئے۔

اس نظریہ نے جدید دنیا میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ اکثر ملکوں میں جیل خانوں کے بجائے اصلاح خانے بنائے گئے اور اخلاقی جرائم کی حد تک سنگین سزاؤں کو ختم کر دیا گیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی ہر ملک میں دفاعی اہمیت کے جرائم کے لئے سنگین سزائیں بدستور جاری رہیں اور یہ واقعہ اس نظریہ کے علمبرداروں کی بے یقینی ثابت کرنے کے لئے کافی تھا۔ تاہم انسانی فطرت کے بارے میں بعد کی تحقیقات اور عملی تجربوں نے مزید اس نظریہ کی غلطی واضح کر دی ہے۔ خوش حال اور "صحت مند" معاشروں میں لوگوں کے اندر جرائم کا رجحان اس سے بھی زیادہ پایا گیا جو نسبتاً غریب اور غیر صحت مند معاشروں میں نظر آتا ہے۔ "معالجاتی" تدبیریں جرائم کو روکنے میں ناکام ثابت ہوئیں۔ جن ملکوں میں سزاؤں میں تخفیف کے اصول کو جاری کیا گیا، وہاں اس کے بعد جرائم کی رفتار بہت بڑھ گئی۔ کئی ملکوں مثلاً سری لنکا اور ڈیلاویر (Delaware) میں سزائے موت کو ختم کرنے کے بعد دوبارہ اس کو بحال کرنا پڑا۔ چنانچہ ماہرین قانون اب اپنے سابقہ نظریہ پر نظر ثانی کے لئے مجبور ہو رہے ہیں۔ ایک ماہر قانون نے کہا ہے: "لوگوں میں یہ عام تاثر ہونا کہ کسی بھی شخص کو قتل کرنا ملزم کو موت کی سزا کا مستحق بناتا ہے اپنے اندر بہت بڑی مانع قدر (Detterent Value) رکھتا ہے۔"

اس کے برعکس شرعی قانون کی افادیت کا زندہ ثبوت وہ ممالک ہیں جہاں آج بھی شرعی سزا نافذ ہے۔ مثال کے طور پر سعودی عرب۔ یہ ایک معلوم واقعہ ہے کہ یہاں، مہذب ممالک کے مقابلہ میں جرائم کی تعداد انتہائی حد تک کم ہے۔

۴۔ اسی طرح ایک مثال عورت مرد کے درمیان تعلقات کا مسئلہ ہے۔ اسلامی شریعت کے نزدیک مرد اور عورت ایک دوسرے کا تکملہ (Complements) ہیں۔ بعضکم من بعض (آل عمران) اس کے برعکس جدید تہذیب کا دعویٰ ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کا مثنیٰ ([illegible]) ہیں۔ شرعی نقطۂ نظر کا تقاضا ہے کہ دونوں صنفوں کا دائرہ کار الگ الگ ہو۔ چنانچہ شریعت اسلامی میں مقرر کیا گیا کہ، اصولی طور پر، عورت کا دائرہ کار گھر اور مرد کا دائرہ کار باہر ہوگا۔ جب کہ مغربی فکر کا تقاضا تھا کہ عورت اور مرد دونوں ایک ہی میدان عمل میں سرگرم ہوں۔ دونوں میں کسی قسم کی کوئی تفریق و تقسیم نہ رکھی جائے۔

مغربی ملکوں میں انیسویں صدی میں مساوات مرد و زن کے اصول کو رائج کیا گیا۔ مگر سو برس تک عمل ہونے کے باوجود ایسا نہ ہو سکا کہ عورت کسی بھی شعبہ میں مرد کی جگہ لے سکتی۔ اس تجرباتی ناکامی نے لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ مسئلہ کا از سر نو جائزہ لیں۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں اس مسئلہ پر مغربی ممالک، خصوصاً امریکہ میں غیر معمولی تحقیقات ہوئی ہیں۔ یہ تحقیقات حیرت انگیز طور پر شرعی نقطۂ نظر کی تصدیق کر رہی ہیں۔ حتیٰ کہ اب قطعی طور پر ثابت ہو گیا ہے کہ نہ صرف دونوں کی نفسیات الگ الگ ہیں۔ بلکہ دونوں کے درمیان فیصلہ کن قسم کے حیاتیاتی فرق ([illegible]) پائے جاتے ہیں۔ اپنی فطری ساخت کے اعتبار سے دونوں ایک ہی کام کے لئے موزوں نہیں۔

پھر دونوں نظریات کی بنیاد پر جو خاندانی اور معاشرتی زندگی بنتی ہے، وہ بھی اب مکمل طور پر سامنے آ چکی ہے۔ مرد و عورت کے بارے میں شرعی اصول پر زمین کے ایک بڑے رقبہ میں تیرہ صدیوں تک عمل ہوتا رہا۔ مگر زندگی کے نظام میں کسی قسم کی کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہوئی۔ جب کہ مغربی زندگی میں "مساوات" کے جدید اصول کے انطباق نے پورے معاشرہ کو بگاڑ دیا ہے اور خاندانی زندگی بالکل منتشر ہو کر رہ گئی ہے۔

عورت کو گھر کے باہر کے امور سپرد کرنے کے نتیجہ میں مغرب میں جو بے شمار مسائل پیدا ہوئے ہیں، ان کی تفصیل پیش کرنے کا موقع نہیں۔ یہاں میں اس کے صرف دو پہلوؤں کا ذکر کروں گا۔ ایک، بچوں کا اپنے سرپرستوں کی تربیت سے محروم ہونے کا مسئلہ۔ مغربی سماج میں یہ صورت عام ہے کہ باپ اور ماں دونوں کے بیرونی کام پر چلے جانے کی وجہ سے بچوں کو اپنے فطری مربیوں کے درمیان رہنے کا موقع نہیں ملتا۔ مزید یہ کہ عورت مرد کے آزادانہ اختلاط کے نتیجہ میں بار بار نئی صنفی دلچسپیاں وجود میں آتی ہیں اور طلاقوں کی کثرت سے وہ چیز پیدا ہوتی ہے جس کو اجڑے گھروں کا مسئلہ کہا جاتا ہے۔ اس طرح جو بچے اپنے سرپرستوں سے محروم ہو کر پرورش پاتے ہیں ان کی شخصیت کا فطری ارتقاء نہیں ہو پاتا۔ چنانچہ بچوں میں کثرت سے ایک نئی قسم کی نفسیاتی بیماری پیدا ہو رہی ہے جس کو امریکی ڈاکٹروں نے آٹزم ([illegible]) کا نام دیا ہے۔ جسمانی طور پر بظاہر تندرست بچے ذہنی اعتبار سے عجیب و غریب قسم کے امراض کا شکار ہوتے ہیں۔ مثلاً وحشت زدگی، ساتھیوں سے لڑنا، اسکول کا کام نہ کرنا۔ تشدد پسندی وغیرہ۔ ان کے علاج کی ہر تدبیر اب تک ناکام ثابت ہوئی ہے۔

الرسالہ فروری ۱۹۰۷

دوسرا مسئلہ بڑوں سے متعلق ہے۔ بچے اپنے سرپرستوں سے محروم ہورہے ہیں۔ بڑے اپنے عزیزوں اور مخلصوں سے۔ فرانس کی ایک رپورٹ کے مطابق فرانس میں انسانوں کی ۲۵ ملین آبادی میں سات ملین کتے ہیں۔ یہ کتے اپنے مالکوں کے ساتھ اس طرح رہتے ہیں جیسے وہ ان کے قریبی عزیز ہوں۔ پیرس کے نہایت مہنگے ہوٹلوں میں یہ منظر اب عجیب نہیں رہا کہ ایک مرد یا عورت اپنے کتے کے ساتھ ایک ہی میز پر کھانا کھا رہے ہیں۔ "فرانسیسی لوگ اپنے کتوں سے کیوں اپنوں جیسا معاملہ کرتے ہیں" جمعیۃ رعایۃ الحیوان (پیرس) کے ایک مسئول سے جب یہ پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا: "وہ چاہتے ہیں کہ محبت کریں۔ مگر وہ انسانوں میں ایسے لوگ نہیں پاتے جن سے وہ محبت کرسکیں"۔

عورت مرد کے درمیان فطری توازن توڑنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے انسان منتشر ہوگئے۔ ماں باپ، بھائی بہن، بیوی بچے، یہ سب انسان کی فطری ضرورتیں ہیں۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ وہ اپنے لئے اس قسم کے افراد نہیں پاسکے تو انھوں نے کتے سے محبت شروع کر دی۔ کیونکہ کتے میں کم از کم اتنی خصوصیت یقینی ہے کہ وہ کبھی ساتھ نہیں چھوڑتا! کبھی بے وفائی نہیں کرتا۔

انسانی تجربات انسان کو سچائی کے دروازے تک پہنچا چکے ہیں۔ اب حاملین قرآن کو یہ کرنا ہے کہ وہ اٹھیں اور سچائی کے بند دروازہ کو کھول دیں، تاکہ انسانی قافلہ خدا کی رحمتوں کی دنیا میں داخل ہوجائے جہاں ان کا رب ان کا انتظار کر رہا ہے۔

آخر میں ایک شبہ کا جواب دے کر اس گفتگو کو ختم کروں گا۔

طرابلس کے ندوۃ الحوار الاسلامی۔ المسیحی (فروری ۱۹۷۶) میں مسیحی موقف یہ تھا کہ دین صرف روحانی اقدار کا مجموعہ ہے۔ مسلم موقف یہ تھا کہ دین ایک مکمل نظام ہے۔ اس سلسلہ میں ایک مسیحی نمائندہ (ڈاکٹر شولیکل) نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ جدید زندگی کے بہت سے مسائل ہیں جن کے بارے میں دینی کتابوں میں قوانین نہیں ملتے۔ مثال کے طور پر سٹی پلاننگ۔ ایسی حالت میں دین کو مکمل نظام کے طور پر کس طرح نافذ کیا جاسکتا ہے۔

اس قسم کے شبہات اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ قانون کے مختلف حصوں کو الگ الگ کرکے نہیں دیکھا جاتا۔ چنانچہ خلط مبحث کی وجہ سے معاملہ کی پوری نوعیت واضح نہیں ہوتی۔ اسلامی نقطۂ نظر سے قانون حیات کے تین مختلف حصے ہیں:

۱۔ شریعت

۲۔ فقہ

۳۔ تمدنی ضوابط

دین میں اساسی قانون کا جو حصہ ہے، اس کو شریعت کہتے ہیں۔ قرآن اور سنت ثابتہ اس شریعت کا ماخذ ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول نے زندگی کے وہ بنیادی قوانین بتادیئے ہیں جن پر انسانی زندگی کا نظام صحیح طور پر قائم ہوسکتا ہے۔ یہ قوانین اسی طرح غیر متبدل ہیں جس طرح طبیعیات اور حیاتیات کے قوانین غیر متبدل ہیں۔

خدا سے تعلق بندوں کے ساتھ انصاف کی سب سے بڑی ضمانت ہے

فقہ، ایک معنی میں شریعت کے بنیادی قانون کی زمانی تعبیرات کا نام ہے۔ بنیادی انسانی قانون بلاشبہ ناقابلِ تغیر ہے۔ مگر زندگی کے نقشوں میں تبدیلی کی وجہ سے بار بار اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ بدلے ہوئے نقشہ میں اسلام کے ابدی قانون کو منطبق کیا جائے۔ فقہ اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے۔ خلافت عباسیہ کے زمانہ میں جب اسلام کو وسعت حاصل ہوئی اور زندگی کے نقشے بدل گئے تو قاضی ابو یوسف (۷۳۱ - ۷۹۸ء) سامنے آئے اور انھوں نے وقت کی عظیم ترین سلطنت کے تمام امور پر اسلامی قوانین کو منطبق کر کے دکھا دیا کہ اسلام کس طرح اپنے اندر گنجائش رکھتا ہے کہ ہر دور کی ضرورتیں پوری کر سکے۔

تاہم فقہ میں اساسی شریعت کے برعکس زمانی عنصر پایا جانا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر فتاویٰ قاضی خان میں ایک جزئیہ ہے کہ کوئی شخص قسم کھا لے کہ میں ہوا میں اڑوں گا اور اڑ نہ سکے تو اس پر کفارہ واجب نہیں۔ کیونکہ ہوا میں اڑنا انسان کے لئے ممکن نہیں۔ ظاہر ہے کہ موجودہ زمانہ کا فقیہ اس قسم کا فتویٰ نہیں دے گا۔ فقہ کو ہر زمانہ کے حالات سے موافق بنانے کے اسی عمل کا نام اجتہاد ہے۔ شریعت اجتہاد کے ذریعہ ثابت کرتی ہے کہ وہ کس طرح دائمی طور پر قابلِ عمل ہے۔ فقہی اجتہاد اگرچہ اساسی طور پر شریعت کا پابند ہے، مگر وہ کسی سابق فقہ کا پابند نہیں۔ کیوں کہ فقہ صرف اجتہاد اسلامی کا ریکارڈ ہے وہ بجائے خود شریعت نہیں۔

قانون کا تیسرا حصہ وہ ہے جس کے لئے میں نے "تمدنی ضوابط" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سلسلے میں شریعت نے ہمیں کسی قانون کا پابند نہیں کیا ہے۔ بلکہ تمدنی ضرورتوں کے مطابق انسانی مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے ہر قسم کی ضابطہ بندی کی آزادی دی ہے۔ سورہ سبا کے دوسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ان بندوں کا ذکر کیا ہے جن کو بڑی بڑی مادی ترقیاں دی گئی تھیں۔ معدنیات کو تصرف میں لانے کا فن، ہوائی سفر کی قدرت، بعید مقامات تک خبر رسانی کی صلاحیت، فن تعمیر، انجینیرنگ، زراعت، شہری پلاننگ وغیرہ میں ان کو غیر معمولی مقام حاصل تھا۔ مگر اس سلسلے میں کوئی "صنعتی شریعت" یا "تکنیکل فقہ" ان کو نہیں دی گئی۔ صرف یہ حکم دیا گیا کہ خدا کے شکر گزار رہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمدنی امور میں ضوابط مقرر کرنے کا معاملہ شریعت سے متعلق نہیں ہے۔ یہ کام آدمی کو خود اپنے علوم (سائنس) کے ذریعہ انجام دینا ہے۔ البتہ اس کے اس عمل میں خدا کی شکر گزاری کی روح جاری و ساری رہنا چاہئے جو خود اس بات کی سب سے بڑی ضمانت ہے کہ اس کی قانون سازی ظلم اور فساد کے اجزاء سے پاک رہے گی

اس مقالہ کا عربی ترجمہ (وجوب تطبیق الشریعۃ لکل زمان ومکان) المجتمع کی اسلامی فقہ کانفرنس میں [illegible] اکتوبر [illegible] کو [illegible] پڑھا۔

الرسالہ فروری ۱۹۸۰

مطالعہ کتب

دنیا کی علمی اور ثقافتی تاریخ پر یونیسکو نے ایک کتاب چھاپی ہے۔ یہ کتاب چھ جلدوں میں ہے اور ہر جلد کے دو حصے ہیں۔ ترتیب میں دنیا بھر کے ممتاز ماہرین سے مدد لی گئی ہے۔ ہمارے سامنے چھٹی جلد کے دوسرے حصہ کا عربی ترجمہ ہے جو ۲۰ ویں صدی کے تطور المجتمعات سے متعلق ہے۔

ہندوازم کے باب کے تحت مولف لکھتے ہیں۔

"ہندوازم کی اصلاح میں مغرب کا بڑا حصہ ہے۔ خود گیتا جو ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں مقبول ہوئی وہ ان کے بڑے حصہ تک انگریزی ترجمہ کے ذریعہ پہنچی تھی۔ گیتا کی تعلیمات پر پہلا مقدمہ جو مہاتما گاندھی نے لکھا وہ اس کے منظوم ترجمہ پر تھا جو سر اڈون ارنلڈ نے کیا تھا جس کا نام تھا THE SONG CELESTIAL (1885)۔ گیتا کا مشہور ترجمہ جو اینی بسنٹ نے سانگ آف گاڈ کے نام سے کیا تھا، ایک نسل سے زیادہ تک وہ ہندوازم کے تمام طلبہ کا لازمی رفیق ہوتا تھا۔ اگرچہ تلک نے گیتا کی تشریح مراٹھی زبان میں لکھی تھی، اسی طرح گاندھی نے گیتا کی تشریح گجراتی زبان میں لکھی تھی مگر وہ عام ہندستانیوں تک انگریزی ترجمے کے ذریعہ پہنچی۔ ہندوازم پر جدید عہد کی اکثر کتابیں انگریزی میں لکھی گئیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انگریزی زبان کا ہندستان میں [illegible] وہ چیز تھی جس نے ہندو اصلاحی تحریک [illegible] کو ممکن بنایا۔

عرصہ تک یہ صورت حال تھی کہ ہندو مذہب کی اہم کتابیں ان لوگوں کی دسترس سے باہر تھیں جو سنسکرت نہ جانتے ہوں۔ چنانچہ صرف تھوڑے سے لوگ جن کی اکثریت برہمن تھی ان کتابوں سے واقف تھے۔ وید اور اپنشد کے ترجمے ہندستان کی مقامی زبانوں میں موجود نہ تھے۔ یہی حال ان بڑی بڑی شرحوں کا تھا جن پر ہندو فلسفہ کی بنیاد قائم ہے۔ میکس مولر کی الکتب المقدسۃ فی الشرق (۱۸۷۵) جو ۱۹ ویں صدی کے ربع آخر میں انگریزی میں شائع ہوئی اس نے ان نصوص کو تعلیم یافتہ ہندوؤں تک پہنچایا۔ اسی طرح ہندو فلسفہ کی شرح پر انگریزی کتابیں شائع ہوئیں۔ مثلاً ویویکانند کی تقریریں، اروبندو کے مقالات اور ان کی کتاب الحیاۃ المقدسۃ ۱۹۱۹۔ ۱۹۲۱ء، رادھا کرشنن کی کتاب انڈین فلاسفی (۱۹۲۳)۔ اسی طرح ہندوازم پر اکثر اہم کتابیں انگریزی میں لکھی گئیں اور ہندستان کی سیاسی وحدت اور ایک زبان کا وجود میں آنا۔ اگرچہ وہ اجنبی تھی، اس نے اس کو ممکن بنایا کہ قومی تحریک ملک کے تمام گوشوں تک پہنچ سکے۔

یہ دو چیزیں ہندو احیاء کے لئے لازمی تھیں (صفحہ ۳۴۸-۴۹)۔ گویا یہ چیزیں ان کے لئے ناموافق صورت حال (DISADVANTAGES) کی حیثیت رکھتی تھیں [illegible] موافق صورت حال [illegible]

تاریخ البشریۃ

التطور العلمی والثقافی

المجلد السادس، الجزء الثانی

صفحات ۸۰۴، ۱۹۷۱ء

الہیئۃ المصریۃ العامۃ للتالیف والنشر قاہرہ

الرسالہ جنوری ۱۹۷۷ء

قدیم انسان کی تلاش

ایل ایس بی لیکی
ترجمہ: ابن حنیف

"وہ مجھے مل گیا۔ مجھے مل گیا۔"

"خیریت! کیا مل گیا ہے تمھیں؟" میں نے اپنی بیوی سے پوچھا۔

"وہ! وہ آدمی! ہمارا آدمی۔ وہ جسے ہم تلاش کر رہے تھے۔ جلدی آؤ، میں نے اس کو ڈھونڈ لیا ہے۔" میری نے جواب دیا۔

اس روز میں سر درد کی وجہ سے باہر نہ جا سکا تھا اور صبح سے ہی کیمپ میں پڑا تھا لیکن اب میرا درد گویا جادو کے زور سے غائب ہو چکا تھا اور پھر ہم گاڑی میں بیٹھے کوہستانی گھاٹی کے تنگ راستے سے نیچے اتر رہے تھے۔ ذرا دیر بعد ہم پتھروں کے ایک ڈھیر کے پاس گھٹنوں کے بل جھکے میری کا خزانہ دیکھنے لگے۔

دانت ایک چٹان سے باہر کو نکلا ہوا تھا۔ ہمارے خیال میں ان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی دریافت سے وہ جستجو ختم ہونے کو تھی جس میں ہم نے ۲۸ برس بتا دیئے تھے۔ تانگانیکا کی دور دراز گھاٹی اولڈووائی اس انسان کی باقیات سمیٹے ہوئی تھی جو اب تک سب سے قدیم تھے اور پیشتر ازیں اس کی ہڈیاں کبھی نہیں پائی گئیں۔ مارے خوشی کے ہماری چیخیں نکل گئیں۔ بالآخر ہماری تمام تر امیدیں، مشقتیں اور قربانیاں بارآور ہو گئی تھیں اور ہم نے اپنی دریافت کو کھودنا شروع کر دیا۔

چیزوں کی تلاش میں ہمارا طریقہ کار بڑا سیدھا سادہ ہے مگر ساتھ ہی بہت تکلیف دہ بھی۔ طریقہ یہ ہے کہ ہمیں گھاٹی کی ڈھلوانوں پر کبھی اوپر کی طرف اور کبھی نیچے کی جانب پیٹ کے بل رینگنا پڑتا ہے اس حال میں کہ ہماری آنکھیں زمین سے بمشکل چند انچ کے فاصلے پر ہوتی ہیں۔ جہاں کہیں کوئی ننھا سا متحجر استخوانی ٹکڑا بھی نظر آ جائے فوراً رک جاتے ہیں اور کسی عمدہ برش یا دانتوں کے خلال سے بہت احتیاط کے ساتھ اس کی تفتیش کرتے ہیں اور یہ سب کچھ گرمی میں کرنا پڑتا ہے بعض اوقات گرمی ایک سو دس درجے فارن ہیٹ تک پہنچ جاتی ہے۔

ہم ٹھان چکے تھے کہ اس کاسہ سر کا کوئی بھی اہم ٹکڑا ضائع نہ جانے دیں گے چنانچہ کئی ٹن سنگریزے اور مٹی چھان ڈالی اور انیس دن کی کاوشوں کے بعد قریبًا پوری کھوپڑی ہاتھ آ گئی۔ نچلا جبڑا البتہ نہ پایا جا سکا اس نرم چٹان کے سکڑنے اور پھیلنے کے عمل کی وجہ سے یہ نئی دریافت شدہ کھوپڑی چار سو ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ڈاڑھوں اور انیاب کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ کھوپڑی جس انسان کی تھی وہ اٹھارہ سال کی عمر کا رہا ہوگا۔ میں نے اسے "زنجنتھروپس" یا "مشرقی افریقہ کا آدمی" کا نام دیا ہے۔ اس کے سپاٹ یا چپٹے کاسہ سر میں جو دماغ تھا وہ موجودہ انسانی مغز سے غالبًا آدھا

.....چٹان میں دبی ہوئی ایک "کھوپڑی" ملتی ہے۔ پتھروں سے کاٹ کر نکالنے میں اس کے ریزے ریزے ہو جاتے ہیں۔ کئی ٹن سنگریزے اور مٹی کو چھاننے کے بعد جب "کھوپڑی" کو حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تلاش کرنے والوں کو کھوپڑی کا صرف ایک حصہ ملا ہے اور وہ بھی چار سو ٹکڑوں کی شکل میں۔

اسی قسم کی وہ "دریافتیں" ہیں جن سے علماء ارتقاء کے نزدیک یہ ثابت ہو گیا ہے کہ کروڑوں برس پہلے کچھ "انسان نما" حیوان بستے تھے جو موجودہ انسان کی ابتدائی کڑی تھے۔

تھا۔ علاوہ ازیں کھوپڑی کے بالکل سامنے کٹاؤدار ایک استخوانی اُبھار ہے جو دائیں سے بائیں کو چلا گیا ہے اس قسم کا اُبھار بعض انسان نما مخلوق میں پایا گیا ہے۔ موجودہ نسل انسانی ارتقاء کی جس منزل کو پہنچ چکی ہے کوئی شبہ نہیں کہ زنجنتھروپس اس سے کافی پیچھے تھا لیکن ہیں نے اس میں کم از کم بیس خصوصیات ایسی دیکھی ہیں جن کی وجہ سے وہ جنوبی افریقہ میں دریافت شدہ انسان نما مخلوق کی نسبت موجودہ انسان سے کہیں زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔

"انسان" سے حقیقی مراد ہے کیا؟ میرے نزدیک انسان محض وہ قدیم بوزنہ نما مخلوق نہیں ہے جو سیدھی ہو کر چلتی تھی اور جس کے ہاتھ بھی تھے بلکہ صحیح معنوں میں انسان ہونے کے لئے ضروری تھا کہ وہ سوجھ بوجھ اور عقل بھی رکھتا ہو اور اپنے استعمال کے لئے بھدے سے اوزار گھڑ لینے کی صلاحیت بھی، اور آلات بنانے کی اہلیت ہی ایک ایسا نکتہ ہے جو اس بات سے قطعی جداگانہ ہے کہ صرف نوکدار لکڑیوں یا تیز نوکیلے پتھروں سے کام نکال لیا جائے جو قدرتی طور پر بنے بنائے دستیاب ہو سکتے تھے جس جگہ قدیم زنجنتھروپس اپنے بھدّے گھر بنا کر رہتا تھا، وہاں سے ہمیں اوزار بھی ملے اور یہ اوزار اس کھوپڑی کی دستیابی سے کئی سال قبل ہمارے ہاتھ لگے تھے۔ ان میں کھالیں صاف کرنے اور جانوروں کی لاشیں کاٹنے کے بدوضع سنگی آلات شامل ہیں۔ علاوہ ازیں قبر نما ایسے پتھر بھی ہیں جن سے ہڈیاں توڑ کر گودا نکالا جاتا تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ زنجنتھروپس اپنے اوزار تراشنا جانتا تھا۔ آج تک جتنی بھی قدیم انسانی کھوپڑیاں پائی گئی ہیں۔ زنجنتھروپس کی

داڑھیں ان میں سب سے بڑی ہیں لیکن اس کے اگلے دانت نسبتاً چھوٹے اور کُند ہیں۔ چنانچہ اُن کی مدد سے زنجنتھروپس خرگوش یا اتنے ہی بڑے دوسرے جانوروں کی کھالیں اور سور ہرگز ہرگز چیر پھاڑ نہیں سکتا تھا لیکن اس کے مسکن سے جو ہڈیاں ملی ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے جانور اس کی خوراک تھے ضرور۔ ان سب باتوں کا صرف ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ زنجنتھروپس نے اپنی خوراک میں جب گوشت شامل کیا تو یقیناً اس نے اوزار بنانا شروع کر دیئے تھے۔ میں اولڈووائی پہلی بار ۱۹۳۱ء میں آیا تھا اور بیل گاڑی کو یہاں پہنچنے میں سات دن لگے تھے۔ راستے میں جنگلی جانوروں مثلاً ہاتھیوں، زیبروں، گینڈوں، زرافوں، ہرنوں اور چھوٹے خوشنما کولی چودہ انچ اونچے بارہ سنگھوں کی کمی نہ تھی۔ اکثر جانور ہم سے شاذ ہی خوف کھاتے تھے۔ اس وقت جب ہم نے گھاٹی کے کنارے پڑاؤ ڈالا تو پہلی رات ہمارے نئے "ہمسائے" ہمیں دیکھنے آئے۔ رات کو کیمپ کے پاس میں نے کچھ ہلچل محسوس کی۔ یہ چلنے پھرنے والے کون ہو سکتے ہیں؟ میں تحقیق کرنے باہر نکلا۔ اندھیرے میں مجھے سبز آنکھیں نظر آئیں۔ یہ گیارہ شیر تھے کچھ پاس اور کچھ ذرا پرے۔ اصل میں وہ اس حملے کی تفتیش کرنے آئے تھے جو ہم نے اُن کے علاقہ پر کیا تھا اور بلّی کے پورے خاندان میں شیر کو سب سے زیادہ متجسس طبیعت ملی ہے۔ ہمارے ان میزبانوں نے ہمیں کبھی نقصان نہ پہنچایا ان کی خوش اخلاقی کے جواب میں ہمارا رویّہ بھی اُن کے ساتھ ہمیشہ شائستہ رہا۔

ایک روز میں نیروبی اپنے مکان پر تھا کہ اولڈووائی سے میری نے مجھے ریڈیو فون پر بتایا۔

"ہمیں ایک پاؤں ملا ہے۔ ہاں پاؤں کہہ رہی ہوں۔ شاید یہ بھی زنجنتھروپس کی طرح ایک اور ہیجان انگیز دریافت ہے۔"

"حیران کن خبر ہے، کیا کچھ پا چکی ہو؟"

"کافی حصہ، ایڑی اور ٹخنے کی ہڈیاں اور کچھ دوسری بھی، کب آ رہے ہو انھیں دیکھنے؟"

"بس آیا۔"

اور اس طرح مجھے دنیا بھر میں اب تک معدوم شدہ سب سے قدیم (HOMINID) کی متحجر ہڈیوں کا علم ہوا۔ یہ نوع اس "باقاعدہ خاندان" کا رکن تھی جس میں انسان اور انسان نما مخلوق شامل ہے۔ ہماری پارٹی کو اولین چیتے کے دانت تلاش کرتے کرتے بالکل صحیح حالت میں ایک دانت ملا، مگر یہ کسی چیتے کا نہ تھا۔

"بعونہٗ اولیٰ"، میری چلائی۔

سطح سے نیچے خندق میں ہنسلی کی ایک ہڈی کھوپڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، انگلیوں کی ہڈیاں، پاؤں کی اہم ہڈیاں اور نچلے جبڑے کا بڑا حصہ ہاتھ لگا۔ اس جبڑے کے دانت بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ محفوظ تھے۔ یہ جگہ وہاں سے کوئی ڈھائی سو گز پرے تھی جہاں زنجنتھروپس ملا تھا مگر زنجنتھروپس کی جگہ اوپر تھی۔ اس کی نچلی پہلی داڑھیں گھسی ہوئی تھیں تیسری داڑھوں کی علامات تک سرے سے غائب تھیں گویا زنجنتھروپس سے پہلے کا یہ رکاز کسی گیارہ بارہ سالہ بچے کا ہے۔ سر کی ہڈیوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس بچے کی موت تشدید کا نتیجہ تھی۔ ضرب شدید لگنے کی وجہ سے ہڈی تڑخنے کے نشانات

موجود ہیں۔ وہاں چٹانیں بھی نہ تھیں کہ اُن پر سے گر کر اتنا بڑا گھاؤ کھا کر مرا ہو۔ بہر حال وار کسی کند ہتھیار سے کیا گیا تھا۔

تاحال ہمارے پاس اتنی معلومات نہیں ہیں کہ زنجنتھروپس سے بھی زیادہ قدیم اس بچے کو ہم (صحیح معنوں میں) انسان کہہ سکیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ زنجنتھروپس سے مختلف قسم کی نوع تھی۔ لیکن جہاں آج بچہ رہتا تھا وہاں سے ہمیں سادہ گھڑ، باقاعدہ گھڑے ہوئے اوزار ملے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھوؤں، گربہ ماہی اور نسبتاً باآسانی پکڑ لئے جانے والے آبی پرندوں کی باقیات بھی دستیاب ہوئیں۔ گویا زنجنتھروپس سے پہلے کی یہ مخلوق اچھی یا ماہر شکاری نہ تھی۔ البتہ وہ سُست رفتار جانوروں اور پایاب پانیوں میں رہنے والے پرندوں کو دوسرے جانوروں کے مقابلے میں زیادہ آسانی کے ساتھ پکڑ بھی سکتے تھے اور مار بھی سکتے تھے۔

زنجنتھروپس اور اس کے "پیشرو بچہ" کی قدامت کے تعین پر ماہرین ابھی کام کر رہے ہیں۔ ویسے ہم دونوں میاں بیوی صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ زنجنتھروپس چھ لاکھ سال قبل رہتا تھا۔ گو ہمیں اس بات کا بھی پورا پورا یقین ہے کہ وہ اس سے بھی کہیں زیادہ قدیم ثابت ہوگا اور پھر مجھے زنجنتھروپس کی قدامت کے سلسلے میں کیلیفورنیا یونیورسٹی کے جیالوجیکل ڈپارٹمنٹ کے ڈاکٹر گارنس نے یہ اطلاع دی کہ:

"اولڈووائی کے رکازوں کے زمانے کی پوٹاشیم ارگون پر تجربے ابھی جاری ہیں (تاہم) ابتدائی نتائج بے حد چونکا دینے والے ہیں۔ زنجنتھروپس اور زنجنتھروپس سے قبل کا طفل" بہت ہی قدیم ہے۔ میرے رفیق کار ڈاکٹر جیک ایورنڈن اور میں نے فی الحال ان نمونوں کی قدامت ساڑھے سترہ لاکھ برس مقرر کی ہے۔ ہم دونوں کو یقین ہے کہ یہ مدت اولڈووائی کی ابتدائی آدمی کی صحیح قدامت کے قریب ہے۔

جب ہمیں کوئی اہم چیز مل جاتی ہے تو میرے ساتھی مجھے یہ کہہ کر چڑھاتے ہیں

"اچھے نصیب ہیں۔"

اور اس بات کو میں بلا تامل مان لیا کرتا ہوں کیونکہ قسمت اکثر یاوری کر جاتی ہے مگر ان کامرانیوں میں اس حقیقت کو بھی تو پورا دخل ہے کہ میں ۲۵ برس سے سخت محنت جستجو اور کھدائی میں لگا ہوا ہوں۔ میری نے جزیرہ روسنگا (جھیل وکٹوریہ) میں اپنی ایک اور عظیم دریافت کا سُراغ لگا لیا۔ لیکن اس سے پہلے ہم وہاں سو سے زیادہ مقامات پر مقدر آزمائی کر چکے تھے۔ ایک ڈھلوان کا بڑی توجہ سے معائنہ جاری تھا کہ اچانک میری کو ایک دانت نظر آیا جو ایک خاکستری رکاز کا نقطہ یا دھبہ سا لگ رہا تھا۔ چٹان کریدی تو ایک دانت اور برآمد ہوا اور پھر کچھ اور بھی کئی دنوں بعد جا کر ہم اپنا یہ گورکھ یکجا کر سکے۔ یعنی وہ ہڈیاں جوڑیں یہ ــ پروکونسل افریکنس (PROCONSUL AFRICANUS) کی قریب قریب مکمل کھوپڑی تھی اور یہ وہ مخلوق تھی جو ڈھائی کروڑ سال قبل وہاں رہتی تھی۔ کئی سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اسی مخلوق کو انسان اور بوزنے کی مشترکہ طور پر جد امجد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ پہلا موقع تھا کہ کسی محقق کو کسی اولین میمون نما مخلوق کی کھوپڑی کا تقریباً مکمل نمونہ ملا تھا اور انسانی ماضی کے مطالعہ کے لئے ایک نئی راہ سامنے آگئی ہے۔

یہ دریافت اس قدر اہم تھی کہ ہم نے اُسے فی الفور بذریعہ ہوائی جہاز لندن لے جانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے نیروبی سے میری کو جہاز میں سوار کرایا۔ نازک کھوپڑی روئی کی تہوں میں لپٹی ایک صندوقچے میں رکھی تھی اور یہ صندوقچہ میری کی گود میں تھا نیوز ریلوں کے فوٹوگرافر اور اخباری نمائندے لندن میں میری کی راہ تک رہے تھے۔ ہوائی اڈہ کی پریس کانفرنس کے موقعہ پر دو جاسوس کھوپڑی کی سخت نگرانی کا فریضہ انجام دینے میں مصروف تھے اور کسی وقت بھی انھوں نے پروکونسل افریکنس کے کاسہ سر کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ پروکونسل اور زنجنتھروپس بر سہا برس کے شدائد اور شکست روی کا ثمر تھے۔

ہماری سب سے سنسنی خیز دریافت جبڑے کا وہ ایک حصہ ہے جو فورٹ ٹرنن (کینیا) کے ہرے بھرے نشیبی علاقہ سے ملا۔ یہ ایک کروڑ ۴۰ لاکھ سال پرانا ہے۔ پروکونسل اور زنجنتھروپس کے مابین ارتقائے انسانی کے سلسلے میں ایک بڑی خلیج حائل ہے، اور یہ خلیج دو کروڑ برسوں تک پھیلی ہوئی ہے لیکن جس مخلوق کا یہ ایک کروڑ ۴۰ لاکھ سال قدیم جبڑا ہے وہ اس خلیج کو پاٹ رہی ہے یا یوں سمجھئے کہ پل کا کام دیتی ہے۔ ہم نے پروکونسل اور زنجنتھروپس کی اس درمیانی مخلوق کو کینیا پتھکس ورکری کا نام دیا ہے۔ کینیا پتھکس 'انسان' ہرگز ہرگز نہ تھا، لیکن انسان کی طرف ہماری رہنمائی ضرور کرتا ہے۔ اس کے اوپر والے جبڑے میں وہ گہراؤ یا نشیب موجود تھا جو ایک لازمی انسانی خصوصیت ہے۔ یہ جھکاؤ اوپری ہونٹ کی حرکت کو کنٹرول کرنے والے پٹھے کے لئے لنگر کا کام دیتا ہے۔ اور یہی پٹھا یا عضلہ ہے جو انسانوں کو بولنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے۔ یعنی ایسی انسانی قوت گویائی جو خالی خولی آوازوں سے مختلف ہوا کرتی ہے۔ ایک بات اور بھی ہے کہ پروکونسل کے انیاب (ڈاڑھوں) اور سامنے کے دانتوں کے درمیان والے دانت لمبے اور نوکیلے تھے۔ لیکن کینیا پتھکس کے انیاب چھوٹے بھی تھے اور انسانی دانتوں سے بہت مشابہ بھی۔

کینیا پتھکس اور انسان میں ان کے علاوہ اور مشترک خصوصیات کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن جب کینیا پتھکس کی ہڈیاں اور زیادہ مل جائیں گی تو اس مماثلت کے بارے میں مزید تفصیل سے بتایا جاسکے گا۔

"چلی انسان" کی دریافت اس قدر اہم اور چونکا دینے والی ہے کہ زنجنتھروپس اور اس کے پیشرو بچہ کی بازیافت سے کسی طرح کم نہیں۔ ۱۸۶۴ء میں دنیا کو پہلی بار پتہ چلا کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب دھرتی پر 'حجری دور کا تمدن' جاری وساری تھا۔ چار لاکھ سال قبل کے اس دور کو چلیئن CHELLEAN کا نام دیا گیا ہے کیوں کہ اس عہد کی اشیا رسب سے پہلے فرانس کے ایک مقام چلس (CHELLES) سے ملی تھیں۔ 'چلی تمدن' کی خاص بات یہ ہے کہ اس وقت کے سنگی اوزار آسانی شناخت ہوجاتے ہیں اور ساتھ ہی ایک الجھن یہ کہ گو افریقہ، ایشیا اور جنوب مغربی یورپ کے اکثر حصوں سے اس زمانے کی باقیات تو مل جاتی ہیں لیکن "چلی آدمی" کی کھوپڑی کسی کو بھی نہ ملی قیام اولڈووائی کے ابتدائی ایام میں ہی میں نے "چلی آلات" برآمد کرلئے تھے۔ یہ ہمیں پرت نمبر ۲ سے ملے تھے۔ ۱۹۶۰ء میں وہ سطح بھی ہم نے برآمد کرلی جہاں 'چلی انسان' رہتا تھا لیکن ان لوگوں کی کوئی ایک بھی ایسی متحجر ہڈی دستیاب نہ ہوسکی جس سے پتہ چلتا کہ وہ کس طرح کے تھے؟

بعض اوقات میں سوچا کرتا ہوں کہ تقدیر ہمارے ساتھ دل لگی کرتی رہتی ہے کیونکہ جونہی ہم اپنے قبل تاریخ کے پُراسرار آدمی کی تلاش کرتے وہ نظر آجاتا تا۔ ایک روز میں اپنے شریک کار ماہر ارضیات رے پکرنگ کے ساتھ گھاٹی کا دورہ کر رہا تھا۔ پرت نمبر ۲ میں مجھے ایک ایسی جگہ دکھائی دی جو اس سے پہلے کبھی نظروں میں نہ آئی تھی۔ اگلی صبح سویرے میرا سب سے چھوٹا بیٹا فلپ اور میں جھاڑیوں سے ہوتے اس مذکورہ مقام کو چل دیئے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا:

"یہ جگہ کچھ ایسی ہے کہ یہاں سے ہمیں کھوپڑی ملے گی۔" ابھی الفاظ میرے منھ ہی میں تھے کہ میری نگاہ کچھ استخوانی ٹکڑوں پر جا پڑی جو ایک تنگ سی دراڑ میں پڑے تھے۔ میں وہیں گھٹنوں پر بیٹھ گیا۔ یہ کھوپڑی تھی انسانی کھوپڑی، جذبات کے مارے میرے منہ سے بات بھی ٹھیک سے نہیں نکل رہی تھی۔ آخر ہمیں وہ کچھ مل ہی گیا تھا جس کی کھوج میں اَن گنت ماہرین اثریات ایک صدی سے بھی زیادہ مدّت سے سرگرداں تھے۔ یہ "چلی انسان" تھا۔ خاصی تفصیل سے پتہ چل چکا ہے کہ کوئی چار لاکھ سال قبل "چلی انسان" کس طرح رہتا تھا۔

اولڈووائی اور فورٹ ٹرنن میں رکازوں کی بھر مار ہے۔ اولڈووائی میں انسانی ہڈیوں سے مشابہ ہڈیوں کا کوئی شمار نہیں۔ لیکن جانوروں کی ہڈیاں بھی ناپید نہیں برسوں کی تلاش و جستجو کے دوران ہمیں گینڈے جتنے بڑے سور، مشرقی افریقہ کے سیاہ گینڈے سے تقریباً دگنی جسامت والے گینڈوں اور بھیڑوں کی متحجر ہڈیاں ملیں۔ کاندھے تک ان بھیڑوں کا قد ۶ فٹ تھا اور سینگوں کا دور بارہ فٹ، ۱۹۶۲ء میں ہم نے ایک ایسے بن مانس کی ہڈیاں بھی ڈھونڈ نکالیں جس سے بڑے اور قدیم بن مانس کی باقیات اب تک اور کہیں بھی نہیں ملی ہیں۔ ہماری عجیب ترین دریافتوں میں سے ایک کا نام "ڈائنوتھیریم" ہے۔ یہ انوکھی قسم کا مخصوص ہاتھی تھا جس کی سونڈ اس کے نچلے جبڑے میں لگی ہوئی تھی۔ اولڈووائی سے ہمیں دیوپیکر جانوروں کے متحجر ڈھانچے بھی ملے اور بہت ہی چھوٹے جانوروں کے بھی۔ ہم نے ہزاروں چھوٹے چھوٹے جانور اکٹھے کئے مثلاً چوہے، پرندے، کیڑے مکوڑے کھانے والے چوہوں سے مشابہ جانور اور چھپکلیاں وغیرہ، ان میں سے کچھ تو اتنے ننھے منے ہیں کہ ان کے جبڑوں کی چھ ہڈیاں ایک ساتھ میرے انگوٹھے کے ناخن پر آسکتی ہیں۔

۱۹۶۱ء کی دو ماہ کی کھدائی کے دوران فورٹ ٹرنن سے ہمیں کوئی بارہ سو رکاز ملے۔ ان میں سے اکثر جانور سائنس کی دنیا کے لئے بالکل نئے ہیں۔ چھوٹے قد کا ایک زرافہ ہے جو قد و قامت میں بچھڑے جتنا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ موجودہ زمانے کا براہ راست مورثِ اعلیٰ ہو۔

جزیرہ روسنگا رکازوں کے لحاظ سے سب سے زیادہ پُراسرار ہے اور یہاں کی یہ پُراسراریت کیڑے مکوڑوں پھلوں اور پھولوں کے رکازوں میں مضمر ہے جو بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ محفوظ ملے ہیں۔ کسی ہڈی یا سونڈ کے رکاز کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ یہ رکاز صحیح معنوں میں اصل ہڈی یا سونڈ ہی ہو بلکہ ہوتا یہ ہے کہ رکاز بننے والی چیز کی شکل سر تا سر معدنیات میں تبدیل ہو جاتی ہے لیکن اصل صورت اور تمام ترجزئیات برقرار رہتی ہیں۔ متحجر ہونے کا عمل انتہائی سُست ہوتا ہے۔

ہمیں روسنگا سے قدرت کے بہت سارے عجوبے ہاتھ آئے مثلاً تتلیوں اور پتنگوں کے ہیل روپ مکھیاں

کائنات کی ارتقائی تعبیر کے لئے اُن کے جوش وخروش کا حال یہ ھے کہ چند ہڈیوں کی تلاش میں وہ پوری ایک صدی لگا دیتے ھیں

کیڑے کا ایک رُوپ، ایک بڑی چھپکلی کا سر جس کی زبان اب بھی اس کے منھ سے باہر نکلی ہوئی ہے اور ان سے بھی زیادہ عجیب یہ کہ پھولوں کی متحجر مکھیاں، گری دار میوے اور پھل بھی دستیاب ہوئے۔ ہم نے کچھ متحجر پھلوں کے اندرونی حصے دیکھنے کے لئے ہیرے تراشنے والے قلموں سے انھیں کاٹا۔ ان رکازی پھلوں کی تمام اندرونی جزئیات اور بیج بالکل محفوظ تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے آج کل کا کوئی تازہ سیب کاٹ دیا گیا ہو۔

۱۹۶۲ء میں اولڈووائی میں ایک اور معمے سے سابقہ پڑا اور میرے نزدیک یہ سب سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ جس سطح پر ہمیں زنجنتھروپس ملا تھا اس سے کافی نیچے سب سے نچلی پرت پر پتھر کے بنے ہوئے بڑے بڑے گول حلقے دستیاب ہوئے۔ ان میں سے بعض تو درحقیقت ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ بیس لاکھ سال پہلے یہ جگہ جھیل کا کنارہ تھی اور اس وقت اس قسم کے پتھر یہاں موجود نہ تھے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ وہاں کیوں کر وجود میں آئے۔ ایسے کون سے عوامل تھے جنھوں نے یہ قطعی اور بالکل گول سنگین دائرے یا حلقے بنائے اور کس لئے بنائے؟ کیا انھیں گھر کہا جا سکتا ہے؟ کیا یہ ہواؤں نے تراشے؟ ■

ادب کی تحقیق

ایک حدیث کے الفاظ ہیں:

ادبنی ربی فاحسن تادیبی

(میرے رب نے میری تربیت کی اور بہت اچھی تربیت کی)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ادب کا لفظ قدیم عرب میں بھی مستعمل تھا۔ تاہم اس میں اختلاف ہے کہ ادب (بمعنی لٹریچر) کس لفظ سے نکلا ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ یہ اَدْبٌ سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں دعوت کا بلاوا۔ تاہم فرانسیسی مستشرق پروفیسر نلینو کی رائے اس لفظ کے اشتقاق کے بارے میں دوسری ہے۔ وہ اس کو دأب (بمعنی عادت) سے مشتق مانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ لفظ ادب، مفرد سے نہیں بلکہ دأب کی جمع سے نکلا ہے۔ دأب کی جمع اَدْآب ہے جو تبدیل ہو کر آداب ہو گئی ہے، جس طرح بئر اور رئم کی جمعیں اَبْآر اور اَرْآم سے بدل کر آبار اور آرام ہو گئی ہیں۔ ان کے نزدیک دأب کی جمع آداب کا استعمال اس قدر عام ہو گیا کہ اہل عرب اس جمع کی اصل اور جو کچھ اس میں تبدیلی ہوئی ہے، اس کو بھول گئے۔ ان کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ آداب ایسی جمع ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے اور اس جمع سے انھوں نے اس کا واحد بجائے دأب کے ادب نکال لیا اور ادب کا عادت کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اس کے بعد یہ لفظ اپنے اصلی معنی سے دوسرے مختلف معنوں میں منتقل ہوتا رہا۔

"میں خدا کو مانتا ہوں۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ میں نے زندگی میں جن بہترین انسانوں کا تجربہ کیا وہ سب خدا کو نہ ماننے والے لوگ تھے"

ڈاکٹر سید حسین ظہیر (۱۹۰۰ — ۱۹۷۵) ہندستان کے چوٹی کے سائنس داں تھے۔ ان کا شمار ڈاکٹر رمن، ڈاکٹر وکرم سارابائی، ڈاکٹر کھورانا، ڈاکٹر بھابھا، ڈاکٹر سیتھا جیسے لوگوں میں ہوتا ہے۔ وہ ملک کے اندر اور ملک کے باہر بے شمار سائنسی تنظیموں کے بڑے عہدے دار تھے۔ ان کو پدم وبھوشن کا خطاب بھی ملا تھا۔ اپنے سیاسی ذوق کی وجہ سے جنگ آزادی کے زمانہ میں انھیں جیل جانے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ ذاتی طور پر وہ انتہائی شریف اور اعلیٰ کردار کے آدمی تھے۔ غریب طالب علموں کی فیس اپنی جیب سے دیا کرتے تھے۔

۱۹۶۲ء میں ہندستان کی شمالی سرحد پر ایک پڑوسی ملک سے مسلح جھڑپوں کے بعد انھوں نے اپنے ایک رفیق ڈاکٹر امرجیت سنگھ کو تار دیا جو الیکٹرانکس کے ماہر تھے اور برلش میں کام کر رہے تھے اس میں ولولہ انگیز الفاظ کے ساتھ کہا گیا تھا کہ ہندستان واپس آکر مادر وطن کی خدمت کریں، وہ واپس آگئے۔ ڈاکٹر ظہیر اس وقت کاؤنسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کے ڈائرکٹر جنرل تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر سنگھ کو اس کے الیکٹرانکس کے شعبہ کا ڈائرکٹر بنا دیا۔ ان کے پالنی کے انسٹی ٹیوٹ میں ڈاکٹر ظہیر ایک بار گئے۔ ڈاکٹر سنگھ نے دوران ملاقات میں بتایا کہ ایک پروجکٹ کے سلسلہ میں بعض برآمدی مشینری اور آلات کی شدید ضرورت ہیں۔ رخصت ہوتے وقت ڈاکٹر ظہیر نے پوچھا اس کے لئے کتنا زرمبادلہ درکار ہوگا؟" انھوں نے تخمینہ بتایا۔ ڈاکٹر ظہیر نے حکومت پر زور ڈال کر وہ مشنری باہر سے منگوا دی۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔ مہینے کے دوسرے سنیچر کا دن تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا دفتر ضابطہ کے تحت بند تھا مگر وہ خود حسب معمول دفتر میں آئے ہوئے تھے۔ ایک نوجوان عورت، جس کے شوہر کو ملازمت سے برخاست کر دیا گیا تھا، ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لئے ریسپشن ہال میں کیر ٹیکر سے درخواست کر رہی تھی اور وہ اُسے روک رہا تھا۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب کسی کام سے باہر نکلے۔ عورت تیزی سے ان کے سامنے آئی اور غصہ میں برا بھلا کہنا شروع کر دیا: "یہ کون سی حکومت ہے کہ میں ایک گھنٹہ سے یہاں بیٹھی ہوں اور آپ کے لوگ مجھے آپ سے ملنے نہیں دیتے۔" ڈاکٹر ظہیر نے اس کی باتوں کو سن کر نہایت نرمی سے کہا: آپ کو جو تکلیف پہنچی اس کے لئے میں معافی چاہتا ہوں۔ آپ اپنی شکایت تحریری طور پر مجھے دے دیں۔ میں آپ کا کام کرنے

کی پوری کوشش کروں گا۔"

۱۹۶۵ء میں وہ ایک سرکاری کام کے سلسلہ میں سری نگر گئے ہوئے تھے جس دن وہ دہلی لوٹنے والے تھے۔ موسم کی خرابی سے ان کے جہاز کی پرواز ملتوی ہوگئی۔ چونکہ دوسرے دن ان کو ایک ضروری میٹنگ میں شامل ہونا تھا۔ انھوں نے طے کیا کہ وہ کار سے پٹھانکوٹ جائیں اور وہاں سے ٹرین کے ذریعہ دہلی کا سفر کریں۔ مگر وقت پر کار فراہم نہ ہو سکی، انھوں نے ٹیکسی سے اپنا سفر شروع کیا۔ ٹیکسی بھی راستہ میں خراب ہوگئی۔ اب انھوں نے ایک جیپ لی۔ پٹھانکوٹ پہنچ کر معلوم ہوا کہ ٹرین میں جگہ نہیں مل سکتی۔ اب وہ جیپ ہی کے ذریعہ دہلی کے لئے روانہ ہوگئے۔ ڈرائیور تھکا ہوا تھا، اونگھنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کو مجبور کیا کہ وہ پچھلی سیٹ پر آرام کرے اور خود جیپ چلانے لگے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی مگر ۶۵ سال کا یہ انسان ساری رات جیپ چلاتا رہا۔ صبح کو وہ ایک ہزار کلومیٹر کا سفر طے کرکے ٹرین سے پہلے دہلی پہنچ چکا تھا۔

اس قسم کی بے شمار خوبیوں کے باوجود ڈاکٹر ظہیر خدا اور مذہب کے قائل نہ تھے۔ ایک بار اُن کے ایک رفیق کار نے اپنے دادا کے انتقال کے بعد کچھ رسوم ادا کرنے کے لئے چھٹی کی درخواست دی تو انھوں نے یہ لکھ کر واپس کردی "مجھے کامل یقین ہے کہ اگر روح کوئی چیز ہے تو آپکے دادا کی روح آپ کے سائنسی کام کو دیکھ کر زیادہ خوش ہوگی۔ بجائے اس کے کہ آپ اس کے لئے کوئی رسم ادا کریں۔"

۲۲ دسمبر کو انتقال سے کچھ پہلے ڈاکٹر ظہیر کو زکام ہوگیا تھا۔ اس کا ذکر انھوں نے ڈاکٹر اختر حسین

> **اگر لوگوں کو معلوم ہو کہ کل اُن کا کیا انجام ہونے والا ہے، تو ان کا آج اُن کے لئے بے لذت ہو جائے۔ یہ آنے والے کل سے بے خبری ہے جس نے لوگوں کے آج کو ان کے لئے لذیذ بنا رکھا ہے۔**

دلکھنؤ) کے نام ایک خط میں کیا۔ مکتوب الیہ نے اپنے جواب میں دعائیہ کلمات کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ "خدا کی ذات بالاتر ہے اور وہ جو کچھ کرتا ہے اچھا کرتا ہے" ڈاکٹر ظہیر نے دوبارہ اپنے جواب میں لکھا:

Since I do not believe in God, I do not believe in his supermacy also. It is only the good work done by good human beinge which became supreme over the bad work done by the bad human beings.

چونکہ میں خدا پر یقین نہیں رکھتا، میں اس کی بالاتری کا بھی قائل نہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ اچھے آدمیوں کا کیا ہوا اچھا عمل ہی سب سے بڑی چیز ہے جو بُرے آدمیوں کے بُرے عمل پر فوقیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین نے جواب میں جو خط لکھا اس میں یہ جملہ بھی تھا:

I do confess that in my experience of last 20 years, the best human beings I have found are those who do not believe in God.

میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے ۲۰ سال کے تجربہ میں بہترین انسان وہی لوگ تھے جو خدا کو نہیں مانتے تھے ■

ادسفر

دلّی سے تقریباً سو میل کے فاصلہ پر "زمینداروں" کا ایک قصبہ ہے۔ پچھلے دنوں یہاں چند بار جانے کا اتفاق ہوا:

۱۔ مئی ۱۹۷۳
۲۔ جولائی ۱۹۷۳
۳۔ جولائی ۱۹۷۵

یوپی کے اس قصبہ میں کبھی مسلمانوں کا بڑا جاہ و جلال تھا۔ مگر زمینداری کے خاتمہ کے بعد اب دنیا بدل چکی ہے۔ قدیم وضع کی چوپالوں میں اب بھی یہاں قہقہے گونجتے ہیں۔ اگرچہ یہ چوپالیں اب زیادہ تر وقت گزاری کی بیٹھک ہو کر رہ گئی ہیں۔ جب کہ زمینداری کے زمانہ میں وہ اس علاقہ کے اقتدار کا مرکز تھیں۔ یہاں ایک درجن مسجدیں ہیں۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ کئی سو سال کے اقتدار کے باوجود یہاں کے لوگوں نے بستی میں کوئی درس گاہ قائم نہیں کی اور نہ کوئی بڑی جامع مسجد بنائی۔ نہ صرف نماز جمعہ بلکہ عید کی نماز بھی اس چھوٹے سے قصبہ میں ایک سے زیادہ مقام پر ہوتی ہے۔

یہ قصبہ ایک ٹاؤن ایریا ہے۔ یہاں ایک ہائی اسکول ہے جو ۱۹۶۲ء میں قائم ہوا تھا۔ طلبہ کی تعداد پانچ سو سے زیادہ ہے۔

"اس اسکول میں مسلمان طالب علم کتنے ہوں گے۔" میں نے اسکول کے ایک استاد سے پوچھا۔

"تقریباً پچاس" انھوں نے جواب دیا۔

"یعنی پچاس فی صد" میں نے دوبارہ سوال کیا۔

"نہیں صرف پچاس"

گویا قصبہ کے مسلمان جو یہاں کی دس ہزار آبادی میں نصف کے حصہ دار ہیں، تعلیم میں ان کا حصہ دس فی صد سے زیادہ نہیں۔ اگر آپ بازار میں نکلیں اور تجارتوں میں مسلمانوں کے تناسب کا اندازہ لگائیں تو وہ اتنا کم ہوگا کہ حسابی غلطی کے الزام سے بچنے کیلئے ہی ان کو صفر سے زیادہ کہا جاسکتا ہے۔ محرومیوں کی اس فہرست میں صرف یہاں کی زرخیز زمینیں مستثنیٰ ہیں جن کے بڑے حصے پر اب بھی مسلمان قابض ہیں۔ لیکن اگر اس تلخ حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ بیشتر نے اپنی زمینیں جنس یا بٹائی پر دے رکھی ہیں تو یہ اندیشہ بہت زیادہ بعید از قیاس نہیں کہ مستقبل میں زمینوں کے ساتھ بھی وہی قصہ پیش نہ آجائے جو اپنی غفلت سے بقیہ چیزوں میں پیش آچکا ہے۔

"آپ اپنی زمینوں پر خود کھیتی کیوں نہیں کرتے" اگر آپ ان میں سے کسی سے سوال کریں تو وہ جواب دے گا کہ ہم کو جنس یا بٹائی پر دینے میں جو فائدہ ہے، وہ خود کھیتی کرنے میں نہیں ہو سکتا۔" یہ جواب بظاہر صحیح ہے۔ مگر انتہائی کوشش کے باوجود شاید ہی ان میں سے کوئی شخص یہ ماننے کے لئے تیار ہو کہ موجودہ نظم جہاں ان کو یہ فائدہ دیتا ہے، وہیں وہ ایک بہت بڑی چیز ان سے چھین رہا ہے، اور وہ جدوجہد کا حوصلہ ہے۔ موجودہ انتظام کے تحت ایک باپ اپنی اگلی نسل کو تن آسانیوں کی وراثت دے رہا ہے۔ حالانکہ اگر وہ انھیں مشقت اور جدوجہد کی وراثت دیتا تو یہ ان کے حق میں زیادہ بہتر تھا۔ تاہم ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے اس راز کو سمجھ لیا ہے۔ سایہ کے نیچے مونڈھوں پر بیٹھ کر وقت گزارنے کے بجائے وہ ٹریکٹر کی سیٹ پر زندگی کا امتحان دینے کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ انھوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے کہ دنیا میں وہی لوگ اپنے لئے جگہ بناتے ہیں جو وقت کے حقائق کا سامنا کرنے اور ان کے مقابلے میں زندگی کا ثبوت دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ تن آسانیوں نے کبھی کسی قوم کے لئے زندگی کا حق تسلیم نہیں کیا ہے۔

> کوئی معقول بات آدمی کی سمجھ میں اس وقت تک نہیں آتی جب تک اپنی نامعقولیت کی قیمت ادا کرنے کے لئے اس کی جیب میں پیسے موجود ہوں۔

اور یقیناً یہ قصبہ اس عام قانون سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔

دوسری مسلم بستیوں کی طرح یہاں بھی آپس کا اختلاف مسلمانوں کی قوت کو کمزور کر رہا ہے۔ نئے انقلاب نے مسلمانوں سے بہت سی چیزیں چھین لی ہیں۔ تاہم ایک چیز اب بھی پوری طرح موجود ہے اور وہ خود ان کا اپنا وجود ہے۔ اس وجود کو متحدہ شکل میں باقی رکھنا ہی ہماری زندگی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ مگر جو لوگ آپس میں لڑ رہے ہوں، وہ کچھ ایسے نشے میں ہوتے ہیں کہ کسی طرح بھی اس حقیقت کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ سب سے زیادہ اندوہناک بات یہ ہے کہ لڑائی نہ کرنے کی بات کسی کی سمجھ میں اس وقت تک آتی ہی نہیں جب تک اس کے پاس لڑائی کی قیمت ادا کرنے کے لئے پیسے موجود ہوں۔ حالاں کہ اسی پیسے کو اگر وہ اپنی تعمیر و ترقی میں لگائے تو خود فریق مخالف کو مغلوب کرنے کے لئے بھی اس سے زیادہ کارگر کوئی حربہ نہیں۔ بہترین صلاحیتیں بے سود مقابلوں میں ضائع ہو رہی ہیں۔ حالاں کہ وہ تجارت یا اور کوئی تعمیری کام کرکے زیادہ بڑے پیمانہ پر اپنے مقصد کو حاصل کر سکتے ہیں۔

قصبہ میں کوئی قابل ذکر اسلامی مدرسہ نہیں۔ یہاں مسلمانوں کے پاس بڑی بڑی زمینداریاں تھیں۔ وہ کئی سو برس تک اس تاریخی قصبہ کے اقتدار پر چھائے رہے۔ انھوں نے اپنی عظمت کے نشان کے لئے عالی شان حویلیاں اور چوپالیں بنائیں۔ مگر اپنے دین کی حفاظت و فروغ کے لئے وہ کوئی دینی درس گاہ اپنی بستی میں قائم نہ کر سکے۔

دینی درس کا لفظ موجودہ زمانہ میں کچھ بدنام سا ہوگیا ہے۔ حالاں کہ یہ دینی درس گاہیں ہر دور میں مسلمانوں کا دینی اور تہذیبی مرکز رہی ہیں۔ دور نبوت میں "صفہ" اسی قسم کی ایک درس گاہ تھی جس سے وہ لوگ تربیت پاکر نکلے جنھوں نے سارے عالم میں علوم نبوت کی اشاعت کی۔ پھر یہی دینی درس گاہیں ہیں جہاں اسلامی دور حکومت کے وزراء و قضاۃ تیار ہوتے تھے۔ یہی دینی درس گاہیں ہیں جنھوں نے وہ علماء و مصنفین پیدا کئے جنھوں نے ہر دور میں اسلام کی فکری اور علمی نمائندگی کی۔

مئی ۱۹۷۳ء میں قصبہ کے لوگوں نے باہم مشورہ سے ایک مدرسہ کا قیام منظور کیا تھا۔ جولائی ۱۹۷۵ء میں دوبارہ ایک اجتماع میں طے کیا گیا کہ مقامی مکتب کو ترقی دے کر ایک بڑا دینی مدرسہ بنایا جائے۔ اس کے وسائل کی فراہمی کے لئے بھی مختلف لوگوں نے فیاضانہ پیش کشیں کیں۔

۱۳ جولائی کی ایک نشست میں، جس میں بستی کے اکثر ممتاز افراد شریک تھے۔ مدرسہ کے لئے چھ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی۔ متفقہ طور پر طے پایا کہ ہر شخص کے پاس جتنے کھیت یا باغ ہیں۔ ایک روپیہ فی بیگھہ سالانہ کی شرح سے وہ مدرسہ کی امداد کرے گا۔

اس قسم کا فیصلہ کسی بستی میں ایک معیاری درس گاہ کو وجود میں لانے کے لئے کافی ہے۔ مگر آپ کو تعجب نہ ہونا چاہئے اگر میں آپ کو یہ خبر دوں کہ یہ فیصلہ اس عام انسانی کمزوری سے مستثنیٰ نہ رہ سکا جس کو کسی نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

لوگوں میں حماقت کی اتنی کمی نہیں جتنی مستقل ارادہ کی *

* الرسالہ فروری ۱۹۷۷ء

تعارف وتبصرہ:

حلیۃ النبی

از مولانا سید احمد قادری

صفحات ۸۰ ۔ قیمت ایک روپیہ

پتہ: مکتبہ الحسنات رام پور۔ یوپی

یہ کتاب، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیہ وسراپا سے متعلق ہے۔ کتاب کافی جامع ہے اور احادیث وسیر کی مستند کتابوں کو سامنے رکھتے ہوئے لکھی گئی ہے۔

تاہم بعض مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فاضل مصنف نے غالباً حلیۂ پاک اور نعت نبوی میں فرق نہیں کیا۔ مثال کے طور پر "خوشبوئے بدن" کے عنوان کے تحت یہ شعر نقل کیا گیا ہے:

ولو ان رکبا یمموہ لقادھم
نسیم شذاہ واستدل بہ الرکب

اگر سواروں کی کوئی جماعت آپ کا قصد کرتی تو آپ کی نسیم عطر زا اس کی رہبری کرتی اور وہ جماعت آپ کا پتہ لگا لیتی (۷۲) یا مثلاً یہ کہ "جب آپ دراز قامت اشخاص کے ساتھ چلتے تو ان سے اونچے ہو جاتے اور جب ان سے الگ ہوتے تو آپ کے قد کا اعتدال لوٹ آتا۔ یہ اس لئے کہ کوئی نفس صورۃً بھی آپ سے نہ بڑھے، جیسا کہ معنیً نہیں بڑھ سکتا تھا (۵۹-۵۸) اس قسم کے اقتباسات نظم ونثر میں نعت ہیں نہ کہ حلیہ رسول۔

بعض مقامات پر ادبی فروگذاشت نظر آتی ہے مثلاً آپ کی نعت میں ابوطالب کی طرف یہ شعر منسوب کیا جاتا ہے:

وابیض یستسقی الغمام بوجہہ

اس کا ترجمہ کتاب میں ان الفاظ میں درج ہے: "بدلیاں آپ کے چہرے کے طفیل میں پانی برساتی تھیں"۔ صحیح ترجمہ یہ ہوگا: آپ کے چہرے کے وسیلے سے بارش کی دعا کی جائے۔

کتاب کا آغاز اس جملہ سے ہوتا ہے: "شیفتگان حسن وجمال جس طرح شمع رخ کے پروانے ہوتے ہیں اسی طرح سنبل زلف کے دیوانے بھی، وہ نرگس چشم کے بھی بیمار ہیں، اور سرو قامت کے وارفتہ بھی۔ وہ حسن کی ہر ادا پر جان چھڑکتے ہیں۔" اسی طرح دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: "آپ نہ صرف یہ کہ مجموعی حیثیت سے حسن وجمال کے بے مثال پیکر تھے بلکہ ہر ہر عضو حسن کے ایسے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا جس کی کہیں نظیر نہیں۔ آفتاب آپ کے چہرے پہ قربان، ماہتاب آپ کی پیشانی پر صدقے، ہلال نو آپ کے ابرو کا فدائی، نرگس آپ کی آنکھوں کی بیمار، سنبل آپ کے گیسو کی آشفتہ، سرو آپ کی قامت کا شیفتہ، در شہوار آپ کے دانتوں پر نثار، غرض کائنات کی ہر حسین شے آپ کے جمال پر قربان تھی۔ آپ کائنات کی وجہ تخلیق، اس کی جان اور اس کی روح تھے اس لئے آپ کی محبوبیت نہ صرف جانداروں پر اثر انداز تھی، بلکہ شجر وحجر سب آپ کی محبت میں گرفتار تھے۔

ہمچوں تو تازمینی رنیا بیا لطافت
گیتی نشاں ندادہ ایزد نیا فریدہ"

کتاب کے اسی اسلوب کی بنا پر اس کے دیباچہ نگار مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے: "اس رسالہ کے مصنف ماشاء اللہ عالم بھی ہیں، شاعر بھی ہیں۔ اس لئے شعر وادب کی زبان حسن وعشق میں انھوں نے اہل شوق کے لئے حلیۂ مبارکہ کی ایک ایک چیز کو پوری تفصیل کے

ساتھ بیان فرمایا ہے:

"قدیم زمانہ ادب و شاعری کا زمانہ تھا۔ اس لئے سیرت و شمائل کی کتابوں کے لئے یہ اسلوب پسند کیا جاتا تھا۔ اب تاریخی ذوق کا زمانہ ہے۔ جدید انسان کے لئے سب سے زیادہ اہمیت کی بات یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کی زندگی کا ہر پہلو معلوم و منضبط ہے۔ آپ ہر اعتبار سے ایک تاریخی شخصیت ہیں۔ آج کے انسان کے لئے زیادہ مؤثر طریقہ یہ ہوگا کہ ادب و شاعری کے بجائے تاریخ کی زبان میں سیرت و شمائل کی کتابیں لکھی جائیں۔ نیز پیغمبر کی شان کے قریب تر بات بھی یہی ہے کہ آپ کی شکل و شباہت کو تاریخی شخصیت کے حلیہ کی حیثیت سے پیش کیا جائے نہ کہ "محبوب کے سراپا" کی حیثیت سے۔

فاضل مصنف نے یہ کتاب ۴۴۔۱۹۴۵ میں لکھی تھی جب کہ وہ ایک نوجوان ادیب تھے۔ اب پختگی کی عمر کو پہنچنے کے بعد غالباً وہ خود بھی "چشم شہلا" اور "گیسوئے پرخم" کی زبان اس موضوع کے لئے پسند نہیں فرمائیں گے۔

آج

اسلام کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اسلام کا پیغام تمام بندگان خدا تک پہنچانے کے لئے ایک دعوتی مرکز کا قیام عمل میں لایا جائے

الرسالہ اسی مقصد کے لئے جاری کیا گیا ہے

دہلی یا کسی دوسرے مناسب مقام پر ہم کو ایک ایسی جگہ کی ضرورت ہے جہاں الرسالہ اور اس سے متعلق دوسرے تمام شعبوں کے دفاتر قائم کئے جا سکیں۔

اس سلسلے میں جو لوگ تعاون کر سکتے ہوں براہ کرم ہمیں مطلع فرمائیں

—— الرسالہ ——

سوال و جواب

ایک صاحب قاہرہ سے لکھتے ہیں:

"آپ کی کتاب جو یہاں حکمۃ الدین کے نام سے شائع ہوئی ہے اس پر ایک جدال پیدا ہوگیا ہے۔ کچھ لوگ اس کے سخت مؤید ہیں اور کچھ لوگ سخت مخالف۔ قاہرہ یونیورسٹی کے طلبا کے درمیان اس کتاب کے بارے میں سیمینار بھی ہو چکا ہے۔ مخالف گروپ کا کہنا ہے کہ آپ نے جہاد ہی کو ختم کر دیا ہے اور دین کو صوم و صلوٰۃ میں محدود کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں یہاں کے جرائد میں بعض تنقیدی مضامین بھی شائع ہوئے ہیں۔"

جواب

جہاد بلاشبہ اسلام میں افضل ترین عبادت ہے۔ مگر جہاد کو قتال کے معنی میں لینا اتنا ہی غلط ہے جتنا اس کو دین کی فہرست سے خارج کرنا۔ حقیقت یہ ہے کہ امت محمدی کا جہاد، دعوت ہے۔ قرآن میں شہادت حق کی راہ میں قوت صرف کرنے کو جہاد کہا گیا ہے (حج - آخر) دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے کہ قرآن کے ذریعہ لوگوں کے اوپر تبلیغی جہاد کرو (فرقان - ۵۲) قرآن میں دعوت کا حکم آیا تو خود اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک بھاری حکم (مزمل - ۵) قرار دیا۔ دعوت و تبلیغ کو اتنا بڑا کام بتایا گیا کہ اس میں پوری طرح لگنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ہلکان کرے (لعلک باخع نفسک) موجودہ زمانہ میں اٹھنے والی تحریکوں سے جو غلطیاں ہوئیں ان میں سے ایک غلطی سرفہرست ہے کہ انھوں نے جہاد کا مطلب قتال یا سیاسی معرکہ آرائی سمجھ لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاد کا میدان، دعوت کے بجائے سیاست بن گیا اور مومنانہ سرفروشی کے جذبہ کی تسکین کے لئے اس دنیا میں صرف دو کام باقی رہ گئے ـــ اگر موقع ہو تو تلوار زنی ورنہ تقریر بازی۔ مصر، الجزائر اور ہندستان اس کی نمایاں مثال ہیں۔ ان علاقوں میں جب "استعمار" یا "باطل اقتدار" کے خلاف جنگ و پیکار کے مواقع تھے تو لاکھوں مجاہدین اپنے جان و مال کی قربانی دیتے رہے، اور جب اس کا موقع ختم ہوگیا تو اب انھیں اس کے سوا کوئی کام نظر نہیں آتا کہ مفروضہ طاغوتی سیاست کے خلاف تحریر و تقریر کے لفظی طوفان برپا کرتے رہیں، اور جب اس کا موقع بھی باقی نہ رہے تو گوشہ گیر ہو کر ختم خواجگان کے ورد شروع کر دیں!

جہاد ہی وہ طاقت ہے جس سے اسلام اس زمین پر قیام و استحکام حاصل کرتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اتنے بڑے پیمانہ پر جذبہ جہاد کے استعمال کے باوجود اسلام کو اس دور میں قیام و استحکام حاصل نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاد کا جذبہ اپنے نکاس کا صحیح راستہ نہ پا سکا اور غلط سمت میں بہہ کر ضائع ہو گیا۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے ایک بڑے دریا کا پانی بے پناہ مقدار میں بہہ کر سمندر میں جا گرے اور اس کے ساحل کے دونوں طرف کھیتیاں پانی نہ ملنے کے باعث سوکھ کر ختم ہو رہی ہوں۔ صرف اس لئے کہ دریا کے پانی کو ان کھیتوں کی طرف موڑنے کا انتظام نہ ہو سکا تھا۔

دعوت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگوں کے کان میں کچھ الفاظ ڈال دیئے جائیں یا ان کی غلط روش پر تنقید کر دی جائے ـــ حقیقت یہ ہے کہ دعوت ایک انتہائی قربانی کا عمل ہے۔ اپنا وقت، اپنے جذبات، اپنا مال، غرض اپنا سب کچھ قربان کرنے کے بعد وہ چیز وجود میں آتی ہے جس کو دعوت کہتے ہیں۔ قرآن میں حکم ہے کہ مدعو کے لئے داعی کے دل میں انتہائی خیرخواہی ہو، جو بات کہی جائے وہ قول بلیغ کی زبان میں اور مخاطب کی

اپنی ناقابلِ فہم اصطلاحوں میں ہو۔ مدعو کی طرف سے ہر قسم کی ایذا پر مکمل صبر کیا جائے۔ مدعو کی طرف سے کسی اجر کی توقع نہ رکھتے ہوئے اپنا مال اور اثاثہ اس راہ میں خرچ کیا جائے۔ مدعو کی طرف سے اعراض پر جھنجھلانے کے بجائے اس کی ہدایت کے لئے دعائیں کی جائیں، ہر ممکن طریقے سے مدعو کی تالیف قلب کی جائے۔ دعوتی کام کو مسلسل تا عمر جاری رکھا جائے۔ ایسا ایک عمل اگر اس کے پورے آداب کے ساتھ شروع کیا جائے اور اس کا مکمل حق ادا کیا جائے تو یہ اتنا بڑا اور اتنا نفس کش عمل ہے کہ بڑے سے بڑے انسان کی شخصیت اس کی ذمہ داریوں سے بلبلا اٹھے اور کبھی اس کی ادائگی کی طرف سے اپنے کو سبکدوش نہ سمجھے۔

اس دعوتی عمل کے ظہور کے لئے قدیم زمانہ میں جو طریقے رائج تھے، اب ان میں بے شمار نئے طریقوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اس لئے موجودہ زمانہ میں دعوتی کام نے بھی "تدابیر اور ذرائع" کے اعتبار سے نئی وسعت اختیار کر لی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوت و تبلیغ کا جہاد آج اتنا وسیع الاطراف ہو چکا ہے کہ "پٹرو ڈالر" کی مہیب دولت بھی اس کا حقیقی بل ادا کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ حیرت انگیز بات ہے کہ اس زمانی فرق کو دیگر مذاہب، مثال کے طور پر عیسائیت نے خوب سمجھا اور اس کو بھرپور طور پر اپنے دین کی تبلیغ و اشاعت کے لئے استعمال کیا۔ مگر مسلمان اس میدان میں اس قدر پیچھے ہیں کہ جدید امکانات کا انھیں شعور تک نہیں۔ حتیٰ کہ دعوتی کام ان کو اتنا معمولی نظر آتا ہے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے پھسپھسے کام کو جہاد کس طرح کہا جا سکتا ہے!

Single Copy Rs. 2.00

Regd. No. D (D) 532
REGD. R. N. No. 28822/76
FEBRUARY 1977

AL-RISALA MONTHLY

1036 KISHANGANJ, DELHI-110006 (INDIA)

الاسلام

از: مولانا وحیدالدین خاں

صفحات ۲۴۰ ——— قیمت مجلد ۱۵ روپے

اسلام اور مسائل حاضرہ کا ایک جامع مطالعہ

اپنے موضوع پر اس نوعیت کی پہلی کتاب

ابواب:

جدید مسئلہ کیا ہے
حقیقت دین
ارکان اربعہ (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ)
صراط مستقیم
اسوۂ نبوت
تحریک اسلامی، سیرت کی روشنی میں
موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکیں
تعمیر ملت
دعوت الی اللہ
دعوت اسلامی کے جدید امکانات

رسالہ بک ڈپو - ۱۰۳۶ کشن گنج دہلی ۶

محمد احمد پرنٹر پبلشر مسئول نے جے۔کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپواکر "دفتر الرسالہ" ۱۰۳۶ کشن گنج دہلی سے شائع کیا

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خان

خدا

کی اس دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں
ناممکن صرف یہ ہے کہ تم [illegible] ناممکن
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے ۔ فی پرچہ دو روپے
شمارہ: ۵ مارچ ۱۹۷۷
خصوصی تعاون سالانہ: کم سے کم ایک سو ایک روپے

فہرست

اداریہ		۳
قرآن	اسلامی زندگی کیا ہے	۴
سیرت	آپ دعوت دیتے رہے اور ہر قسم کا ظلم سہتے رہے	۵
	پیغمبر خارجی حالات کو نظر انداز کر کے اپنے کام کا آغاز کرتا ہے	۷
آخرت	وہ دنیا جو ہر قسم کی کمیوں سے پاک ہوگی	۹
تاریخ	طارق کا اسپین میں داخلہ محض ایک پر جوش اقدام نہ تھا	۵۲
	خدا کی مدد اس طرح بھی آتی ہے	۱۲
اشاعت اسلام	سامراجیت اس کے لئے قبول اسلام میں رکاوٹ نہیں بنی	۲۰
نفسیات	وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا	۵۷
	خاموش آوازوں کو سنئے	۳۹
اسلام اور عصر حاضر	علم کلام جدید	۳۴
اسلامی دنیا	یوگوسلاویہ میں اسلام	۳۰
فقہ	عقود فاسدہ کا مسئلہ	۵۸
آپ بیتی	غلطی کا اعتراف	۴۹
دعوت حق	جب شاہ جاپان نے مبلغین اسلام کو دعوت دی	۸
ادب	لطیفہ	۷
	سبعہ معلقہ	۳۸
اقتصادیات	پپیتہ: ایک نفع بخش تجارت	۱۶
تعمیر ملت	سیاست کے لئے جوش تعمیر کے لئے سرد مہری	۱۱
	کبھی شکست بھی فتح ثابت ہوتی ہے	۱۹
دیگر مذاہب	بائبل کی زبان سے	۲۸
جدید تحقیقات	پولیو ویکسین کی دریافت	۲۹
شخصیات	حسن البنا اور فلسطین	۱۴
خواتین	عورت کا مرتبہ اسلام میں	۴۰
	پردہ	۶۰
عربی پریس	الاہرام قاہرہ کا تبصرہ	۳۲
ملکی ترقیاں	اس کام کے لئے اس ملک کو بہترین تجربہ گاہ جانئے	۴۲
معلومات	قدیم زمانہ میں انسان کس طرح لکھتا تھا	۵۶
	تمدن سے دور، زندگی سے قریب	۱۸
تعارف و تبصرہ	پرلوک کی چھایا میں	۶۲

اداریہ

قدیم زمانہ میں کسی بات کو دلچسپ بنانے کے دو طریقے تھے، موزوں کلام اور تمثیلی پیرایۂ بیان۔ دونوں طریقوں میں دلکشی کا عنصر بلاشبہ کافی تھا۔ مگر اسی کے ساتھ یہ خرابی بھی تھی کہ ان سے حقیقت پسندانہ ذہن نہیں بنتا۔ شعر اور حکایت دونوں ہی ایک حقیقی بات کو غیر حقیقی زبان میں بیان کرتے ہیں۔ اس لئے یہ بالکل فطری ہے کہ اس قسم کی چیزیں پڑھنے والے کے اندر حقیقت پسندانہ مزاج پرورش نہ پا سکے۔

جدید صحافت اس ضرورت کو کسی کمی کے بغیر پورا کرتی ہے۔ جدید صحافت میں حقیقت نگاری کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی بات کو ایسا دلکش بنا دیا جاتا ہے کہ پڑھنے والا کسی قسم کی خیال آرائی میں پڑے بغیر پوری تحریر کو دلچسپی کے ساتھ پڑھتا چلا جائے۔

بدقسمتی سے مسلم صحافت ابھی اس صحافتی دور میں داخل نہیں ہوئی۔ جدید عربی صحافت نے ظاہری اور تزئین میں کافی ترقی کی ہے۔ مگر جہاں تک معنوی پہلو کا تعلق ہے وہ ابھی تک جدید صحافت کے معیار کو نہیں پہنچی۔ الرسالہ مسلم صحافت کے اس خلا کو پُر کرنے کی ایک کوشش ہے۔ الرسالہ کو ہم تفریحی یا تجارتی صحافت تو نہیں بنا سکتے تاہم مقصدیت کو برقرار رکھتے ہوئے ہم اس کو مکمل طور پر جدید صحافت کی سطح پر لانا چاہتے ہیں۔ ہمارا مقصد ہے: جدید دنیا کے واقعات وحقائق کا اسلامی نقطۂ نظر سے مطالعہ اور اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے فرائض کو عصری اسلوب میں بیان کرنا۔ مختلف حلقوں نے جس طرح الرسالہ کی تحسین کی ہے، وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہے۔

اس سلسلہ میں ہم اپنے قارئین کو یہ خوش خبری سنانا چاہتے ہیں کہ الرسالہ کے معنوی حسن کے ساتھ اس کے ظاہری حسن کا سامان بھی اعلیٰ شکل میں فراہم ہو گیا ہے۔ الرسالہ کی کتابت اور طباعت کے لئے الحمد للہ پہلے ہی سے عمدہ انتظام تھا۔ اب ایک ممتاز خطاط اور آرٹسٹ (جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے) نے یہ ذمہ داری قبول کر لی ہے کہ وہ مضامین کی سرخیاں لکھیں گے اور صفحات کی تزئین کریں گے۔ اس کے بعد انشاء اللہ الرسالہ معنوی اور ظاہری دونوں اعتبار سے جدید مسلم صحافت کا معیاری نمونہ بن جائے گا۔

فکر

فاما من طغی

فان الجحیم ھی الماوی

خاف مقام ربہ و نہی النفس

عن الھوی فان الجنۃ ھی الماوی

> سو جس نے سرکشی کی اور دنیوی زندگی کو اختیار کیا، اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو خواہش سے روکا، اس کا ٹھکانا جنت ہے۔ النازعات

غیر اسلامی زندگی یہ ہے کہ آدمی کی سرگرمیوں کا رخ دنیا کی طرف ہو جائے — اس کو اپنے مادی مفادات سے دلچسپی ہو، وہ اپنے دنیوی مستقبل کی تعمیر میں لگا ہوا ہو۔ وہ انھیں چیزوں کے لیے متحرک ہوتا ہو جس میں اس کے دنیوی معاملات درست ہوتے ہوں، جس میں اس کی شخصیت چمکتی ہو، جس میں اس کے احساس برتری کو تسکین ملتی ہو۔

اس کے برعکس اسلامی زندگی آخرت رخی زندگی (AKHIRAT ORIENTED LIFE) ہوتی ہے۔ مومن کی دلچسپیوں کا مرکز آخرت ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ اخروی مستقبل کی فکر میں رہتا ہے۔ اس کو خدا کے یہاں سرخرو ہونے کا شوق رہتا ہے نہ کہ دنیا میں اپنی امیج بنانے کا۔ اس کی توجہ، اس کی تمنائیں، اس کی سرگرمیاں سب آخرت کے گھر کو بنانے کی طرف لگی رہتی ہیں۔ مختصر یہ کہ غیر مومن دنیا میں زندگی گزارتا ہے اور مومن آخرت میں۔ غیر مومن مرنے کے بعد اپنی آخرت کو دیکھے گا اور مومن دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کے عالم میں پہنچ جاتا ہے۔

آپ دین کی دعوت دیتے رہے اور ہر قسم کا ظلم سہتے رہے

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

منیب صحابی بنی سلیم کے کہتے ہیں کہ (ایام جاہلیت میں) میں حج کو گیا تھا۔ عرفات کے میدان میں دیکھا کہ ایک جوان سرخ عبا پہنے ہوئے یہ کہتا جا رہا ہے۔

"یا ایھا الناس وحدوا اللہ تفلحوا
یا ایھا الناس قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا"

اے لوگو! ایک اللہ کو مانو، فلاح پاؤ گے۔ اے لوگو! لا الٰہ الا اللہ کہہ لو کامیاب ہو جاؤ گے۔ ایک شخص اس کے پیچھے پتھر مارتا ہے اور کہتا جاتا ہے۔ یا ایھا الناس لا تسمعوا انہ کذاب

اس کی بات نہ سنو، یہ بڑا جھوٹا ہے۔ میں نے پوچھا یہ شخص کون ہے؟ کہا گیا کہ وہ شخص قریش کا ایک جوان ہے، جو پیغمبری کا دعویٰ کرتا ہے۔ دوسرا پتھر مارنے والا اس کا چچا ابولہب ہے۔

ایسے متعدد واقعات پیش آئے۔ ۲۳ برس تک آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم دین کی دعوت دیتے رہے اور طرح طرح کے مظالم سہتے رہے بار بار اللہ کی طرف سے تاکید آتی رہی۔ واصبر وما صبرک الا باللہ ولا تحزن علیھم ولا تک فی ضیق مما یمکرون ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: ولا تستوی الحسنۃ ولا السیئۃ ادفع بالتی ھی احسن۔ صبر کرو اور تحمل کرو، غمگین نہ ہو، تنگدل نہ ہو، بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں ہوتی، پتھر کا جواب پتھر سے اور گالی کا جواب گالی سے مت دو بلکہ پتھر کا جواب پھول سے دو، گالی کا جواب تعریفوں سے دو یا واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما، جب جاہلوں سے مقابلہ ہو جائے تو سلام کہہ کر چلے جاؤ۔ مکہ کی تیرہ سالہ زندگی ایسے ہی گذری۔ کفار ظلم کرتے رہے اور آپ صبر کرتے رہے۔ اس کے بعد مدینہ ہجرت فرمائی۔ ہر چیز قربان کی، اپنی راحت اور گھر بار چھوڑا۔

آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم صرف توحید کی تبلیغ کرتے رہے۔ کسی کا مال نہیں چھینا، کسی کی عزت پر حملہ نہیں کیا۔ فقط لا الٰہ الا اللہ کی دعوت دی۔ ۲۳ سال ہر طرح سمجھایا، اصلاح کی، آخر حجۃ الوداع میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریباً ایک لاکھ ۲۵ ہزار صحابہ کرام کے مجمع میں اونٹ پر بیٹھ کر ایک عظیم الشان خطبہ دیا جو بہت طویل تھا۔ گویا ۲۳ برس کی تعلیم کا خلاصہ پیش کر دیا۔ پھر تین مرتبہ فرمایا: "الا ھل بلغت"؟ کیا میں نے اللہ کے احکام پہنچا دیئے؟ سب نے ایک زبان ہو کر تین مرتبہ کہا "قد بلغتنا ونصحتنا"۔ بے شک آپ نے اللہ کے احکام کی تبلیغ کی۔ اس پر تین مرتبہ آپ نے فرمایا: "اللھم اشھد" اے اللہ تو گواہ رہ کہ میں نے تبلیغ

آخرت جو ہر قسم کی کمیوں اور خرابیوں سے پاک ہو گی

کسی درخت پر کوئی پتھر اٹکا ہوا ہے ، آپ اس کے نیچے سے گزرے ، یکایک پتھر آپ کے اوپر گرا اور آپ کا سر ٹوٹ گیا، کیا آپ اس درخت پر خفا ہوں گے اور اس سے لڑائی کریں گے ۔ نہیں، بلکہ خاموشی سے اپنا سر پکڑے ہوئے گھر چلے جائیں گے یا اسپتال جا کر اپنا علاج کرائیں گے ۔ اس کے برعکس اگر کوئی آدمی جان بوجھ کر آپ کے اوپر ایک پتھر کھینچ مارے اور آپ کا چہرہ زخمی ہو جائے تو آپ اس کے اوپر برس پڑتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کا بھی سر توڑ ڈالیں جس طرح اس نے آپ کا سر توڑا ہے اور اگر خود اس کا سر توڑ نہیں سکتے تو معاملہ کو عدالت میں لے جاتے ہیں اور وہاں اس کو قانون کے مطابق سزا دی جاتی ہے ۔

اسی طرح ایک اور مثال لیجئے ۔ آم کا ایک بڑا درخت ہے جس پر فصل کے موقع پر ہزاروں کی تعداد میں پھل آتے ہیں ۔ یہ پھل پکتے ہیں اور ایک ایک کر کے گر جاتے ہیں یا توڑ لئے جاتے ہیں ۔ خود آم اپنے ایک پھل کو بھی نہیں کھاتا ۔ مگر کوئی شخص کبھی یہ کہتا ہوا نہیں سُنا گیا کہ " افسوس کہ آم نے اتنے پھل پیدا کئے مگر وہ خود اپنے پھل کو نہ کھا سکا ۔" اس کے برعکس ایک آدمی زندگی بھر کی کمائی سے اپنے لئے ایک شاندار مکان بنائے اور مکان کی تعمیر مکمل ہوتے ہی مر جائے تو ہر دیکھنے والا شخص کہے گا کہ کیسا افسوسناک ہے یہ واقعہ کہ آدمی نے محنت کر کے ایک گھر بنایا اور اس کے اندر رہنا اس کو نصیب نہ ہوا ۔

معلوم ہوا کہ درخت اور انسان میں بہت بڑا فرق ہے، درخت کوئی "برائی" کرتا ہے تو اس کو اس برائی کی سزا نہیں دی جاتی ۔ اسی طرح درخت کوئی "نیکی" کرتا ہے تو یہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اس کو اس کی نیکی کا انعام دیا جائے ، جب کہ انسان کے لئے ہم دونوں چیزیں چاہتے ہیں ۔ ہمارا ذہن پکارتا ہے کہ انسان کوئی برا عمل کرے تو اس کو ضرور اس کی سزا دی جائے اور انسان کوئی اچھا عمل کرے تو ضرور اس کو اس کا انعام ملے ۔

سارے انسانوں کی فطرت یہی مانگ رہی ہے اور تمام علوم متفقہ طور پر اس کی اہمیت کی تصدیق کرتے ہیں ۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ یہی چیز اس دنیا میں حاصل کرنا ممکن نہیں ۔ ہٹلر نے ایک ایسی جنگ چھیڑی جس میں پانچ کروڑ آدمی ہلاک ہو گئے ۔ کیا کوئی بھی حکومت ہٹلر کو اس کے اس جرم کی سزا دے سکتی ہے ۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتے ہیں کہ ہٹلر کو گولی مار کر ختم کر دیں حالانکہ یہ جرم اتنا بڑا ہے کہ ہٹلر اگر پانچ کروڑ بار زندہ ہو اور ہر بار گولی مار کر ہلاک کیا جائے تب بھی اس کی سزا مکمل نہیں ہو گی ۔ پھر یہ معاملہ ہٹلر اور اسٹالن جیسے ظالموں کا ہی نہیں ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک معمولی آدمی بھی جب کوئی جرم کرتا ہے تو اس کے جرم کے اثرات اتنے وسیع ہوتے ہیں کہ نہ کوئی دنیوی عدالت اس کے سارے پہلوؤں کی تحقیق کر سکتی اور نہ کوئی جیل خانہ اس کو اس کے جرم کی پوری پوری سزا دے سکتا ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص

الرسالہ، مارچ ۱۹۷۷ء

جو اس دنیا میں کوئی جرم کرتا ہے، وہ اپنے جرم کی حقیقی سزا پائے بغیر مر جاتا ہے، حالانکہ ساری انسانیت پکار رہی ہے کہ اس کو اس کے جرم کی پوری پوری سزا دی جائے۔

یہی معاملہ انعام کا بھی ہے۔ ایک شخص کو اقتدار ملے مگر اقتدار پا کر وہ فرعون نہ بنے بلکہ عام انسانوں کی طرح اپنے کو ایک انسان سمجھے اور اقتدار کو لوگوں کی حقیقی خدمت میں لگائے، کیا اس دنیا میں اس کو اس عمل کا بدلہ دیا جا سکتا ہے۔ ایک شخص اپنی محنت سے دولت کمائے اور اس دولت کو غریبوں اور محتاجوں کی ضرورتیں پوری کرنے میں صرف کر دے، کیا اس کو اس عمل کا انعام دینا ممکن ہے۔ ایک شخص علم میں کمال پیدا کرتا ہے اور اس علم کو انسانیت کی تعمیر میں لگا دیتا ہے، کیا اس کو اس خدمت کا معاوضہ دیا جا سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک شخص کے ایک چھوٹے سے نیک عمل کا انعام دینا بھی اس دنیا کے محدود حالات میں ممکن نہیں۔ جس طرح ایک برا عمل بے شمار طریقوں سے انسان کے لئے مصیبت بنتا ہے۔ اسی طرح ایک نیک عمل بے شمار طریقوں سے انسانیت کے لئے خیر و فلاح کا باعث ہوتا ہے۔ کون ہے جو اس کے اعداد و شمار جمع کر سکے اور اس کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دے۔

اسی کے ساتھ ایک بات اور بھی ہے۔ اس دنیا میں آدمی بیماری، بڑھاپا، موت اور اس طرح کے دوسرے ناموافق قوانین سے بندھا ہوا ہے۔ بالفرض کسی کے حسن عمل کا اندازہ کر کے اس کے لئے اس کے کارناموں کے مطابق ایک "جنت" بنا دی جائے، جب بھی وہ اس سے حقیقی طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ بے شمار انسانوں کا تجربہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں بالفرض کسی کو مسرت مل جائے، جب بھی وہ چند لمحات سے زیادہ اس کا لطف نہیں اٹھا سکتا۔ ہر انسان اپنے لئے ایک "جنت" چاہتا ہے۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں جنت نہیں بن سکتی۔ جنت بنانے کے لئے کوئی اور دنیا درکار ہے جو موجودہ دنیا کی محدودیتوں اور نقائص سے پاک ہو۔

یہ صورت حال پکار رہی ہے کہ موجودہ دنیا نامکمل ہے اور اس دنیا کی تکمیل کے لئے ایک اور دنیا وجود میں آنی چاہئے۔

لطیفہ

ابوبکر محمد ابن درید (۲۲۳-۳۲۱ھ) لغت، ادب اور انساب کا امام مانا جاتا ہے۔ وہ شراب پیتا تھا اور عطیوں اور بخششوں میں بہت مال صرف کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس کے یہاں ایک سائل آیا اور اس سے کچھ مانگا۔ اس وقت ابن درید کے گھر میں شراب کے ایک مٹکے کے سوا اور کچھ نہ تھا چنانچہ اس نے وہی مٹکا سائل کو دے دیا۔ خادم نے شراب صدقہ کرنے پر شرعی اعتراض کیا تو وہ بولا "اس کے سوا میرے پاس اور کچھ نہیں ہے"۔ پھر اس نے قرآن کی یہ آیت پڑھی۔ لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون "جب تک تم اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے خرچ نہ کرو نیکی کا مقام ہرگز نہیں پا سکتے"۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ جلد ہی اس کو شراب کے دس مٹکے ہدیہ پیش کئے گئے۔ ابن درید نے اپنے خادم سے کہا: "دیکھو ہم نے ایک مٹکا دیا تھا اور ہمارے پاس دس مٹکے آ گئے"۔

جب شاہ جاپان نے ترکی کے سلطان سے درخواست کی کہ اسلام کی اشاعت کے لئے جاپان میں اسلام کے مبلغ بھیجے

جاپان میں بدھ ازم کا آغاز اس طرح ہوا کہ کوریا کے راجہ نے شاہ جاپان (کیاٹو) کو ۵۳۹ء میں ایک تحفہ بھیجا۔ یہ تحفہ دو چیزوں پر مشتمل تھا۔ گوتم بدھ کا مجسمہ اور ان کی تعلیمات کا ایک مختصر صحیفہ۔ کوریا کے راجہ نے لکھا کہ یہ سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ جو میں آپ کو بھیج سکتا ہوں۔ اس طرح بدھ ازم ایک مذہبی تحفہ کی شکل میں چھٹی صدی عیسوی میں جاپان میں داخل ہوا۔ اور تھوڑے دنوں بعد شہزادہ شوٹوکو (۵۷۴ – ۶۲۱) کے زمانہ میں جاپان کا سرکاری مذہب بن گیا۔

(مین اینڈ ہز گاڈ MAN AND HIS GOD)

عجیب بات ہے کہ یہی واقعہ اب سے پچاسی برس پہلے جاپان میں اسلام کے حق میں پیش آیا۔ مزید اس اضافہ کے ساتھ کہ اس بار شہنشاہ جاپان نے خود یہ فرمائش کی تھی کہ اسلام کو اس کے ملک میں بطور "تحفہ" بھیجا جائے۔ یہ ۱۸۹۰ء کا واقعہ ہے جب کہ عالم اسلام میں بے شمار بڑی بڑی شخصیتیں موجود تھیں۔ مگر اس پیش کش کے جواب میں کچھ نہ کیا جا سکا۔ حالاں کہ اگر بروقت اس سے فائدہ اٹھایا جاتا تو آج نہ صرف جاپان بلکہ شاید ایشیا کی تاریخ دوسری ہوتی۔

جاپان کا پرانا قومی مذہب شنتو ہے۔ مگر اس کی کوئی مقدس کتاب نہیں۔ یہ مذہب سے زیادہ قومی روایات کا ایک مجموعہ ہے۔ کنفیوشس مذہب تیسری صدی میں چین سے اور بدھ مت چھٹی صدی عیسوی میں کوریا سے جاپان آئے۔ جاپان کی بیشتر آبادی انھیں تینوں مذاہب کو مانتی ہے۔ سولھویں صدی کے نصف آخر میں عیسائی مذہب پرتگیزیوں کے ذریعے جاپان میں داخل ہوا۔ اور بہت سے جاپانیوں کو مسیحی بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ مگر یہ پرتگیزی استعماری ذہن کے تحت جاپان میں داخل ہوئے تھے۔ مذہب کی آڑ میں انھوں نے جاپان کی سیاست پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ چیز جاپانیوں کو بے حد ناگوار تھی۔ پہلا پرتگیزی مشنری فرانسس زیویر ۱۵۴۹ میں جاپان میں داخل ہوا تھا۔ اس کے پچاس سال بعد مسیحیوں کے خلاف جاپان میں دارو گیر شروع ہوگئی۔ یہاں تک کہ ۱۶۱۲ میں ایک سخت فرمان جاری کیا گیا جس کے مطابق نہ کوئی مسیحی باہر سے آسکتا تھا اور نہ جاپان کا کوئی شہری مسیحی مذہب اختیار کر سکتا تھا۔ اس کے بعد ہزاروں عیسائی قتل کر دیئے گئے۔ ہزاروں نے عیسائیت کو چھوڑ کر دوبارہ اپنے آبائی مذہب کو اختیار کر لیا۔ عیسائیت کے مقدس نشان صلیب اور مسیح و مریم کے مجسموں کو توڑ ڈالا گیا۔ ۱۸۵۳ تک عیسائیت کو جاپان سے بالکل ختم کر دیا گیا تھا۔

مگر اٹھارویں صدی میں یورپ میں جو فکری انقلاب آیا اس نے صورت حال کو دوبارہ مغرب کے موافق کر دیا۔ اس صدی میں یورپ نے سیاسی اور سماجی علوم کی ازسرنو تدوین کی۔ اس نے ثابت کیا کہ فرد کی آزادی وہ سب سے بڑی چیز ہے جو کسی سماج یا ریاست کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ اس فکری سیلاب نے ساری دنیا میں ان لوگوں کو دفاع کی پوزیشن میں ڈال دیا جو فرد کی آزادی کو ختم یا محدود کر کے اپنا سماجی نظام بنائے ہوئے تھے۔

الرسالہ مارچ ۱۹۷۷

ایسی تمام قومیں اپنے حق میں استدلال کی طاقت سے محروم ہو گئیں۔ ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ وہ مغرب کے فکری یلغار کے آگے ہتھیار ڈال دیں۔

شہنشاہ میجی کے عہد سلطنت (۱۹۱۲ - ۱۸۶۸) میں ایک طرف جاپانی شہروں کی تعمیر کے لئے یورپ اور امریکہ کے عمارتی نقشے درآمد ہونا شروع ہوئے۔ دوسری طرف وہاں کے نظریات و افکار بھی جاپان پہنچے جن میں آزادی رائے کا نظریہ سر فہرست تھا۔ اس کے اثر سے سابق فیصلے پر نظر ثانی ہونے لگی۔ ۱۸۷۳ میں خلاف مسیحیت قانون کو منسوخ کر دیا گیا۔ ۱۸۸۹ میں مغربی طرز کا دستور بنا جس میں جاپانیوں کے لئے مذہبی آزادی کا اعلان کیا گیا۔ اب پھر یورپ اور امریکہ کے عیسائی مشنری جاپان پہنچنے لگے، اور عیسائیت کی تبلیغ دوبارہ شروع ہوئی۔ تاہم بے پناہ سرمایہ خرچ کرنے کے باوجود عیسائی مذہب اختیار کرنے والوں کی تعداد میں کوئی نمایاں اضافہ نہ ہو سکا۔

زمانہ کے فکری دباؤ کے تحت قانون میں تبدیلی تو ہو گئی۔ مگر جاپان کے ہوش مند لوگ اب بھی خائف تھے کہ عیسائیت کو تبلیغ کی آزادی دینا ملک میں مغربی استعمار کے داخلہ کا سبب نہ بن جائے۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخر میں جب عیسائیت کے خلاف قانون کو ختم کیا گیا، اسی زمانہ میں حکومت جاپان نے کچھ ایسی حفاظتی تدبیریں بھی کیں جن سے عیسائیت کو سیاسی خطرہ کی حد تک جانے سے روکا جا سکے۔ انھیں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ شہنشاہ جاپان (میجی) نے ۱۸۹۱ میں ترکی خلیفہ سلطان عبد الحمید ثانی (۱۹۱۸ - ۱۸۴۲) کے نام ایک خصوصی مکتوب روانہ کیا۔ اس نے اپنے تعلق کا اظہار کرتے ہوئے سلطان ترکی کو لکھا تھا: "ہم دونوں مشرقی بادشاہ ہیں۔ ہماری اور ہماری قوم کی مصلحت یہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے قریب ہوں۔ اور ملتے رہیں۔ اور ہم دونوں کے درمیان تعلقات مضبوط ہوں تاکہ ہم مغربی قوموں کا مقابلہ کر سکیں جو تمام مشرقی سلطنتوں کو ایک نظر سے دیکھتی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے یہاں مذہبی آزادی ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر مغربی قومیں اپنا مذہب پھیلانے کے لئے جاپان میں اپنے مبلغین بھیج رہی ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ آپ لوگ ایسا نہیں کرتے۔ ہم پسند کریں گے کہ آپ اپنے مبلغین یہاں بھیجیں جو آپ کا مذہب اسلام یہاں کے لوگوں کو بتائیں۔ اس طرح امید ہے کہ آپ کے اور ہمارے درمیان معنوی رشتہ قائم ہو گا۔"

شہنشاہ جاپان کی طرف سے خط ملنے کے بعد سلطان عبد الحمید نے شیخ الاسلام، ناظر المعارف اور دوسرے علماء اور اہل فکر کو جمع کیا اور پوچھا کہ اس معاملہ میں کیا کیا جائے۔ لوگوں نے رائے دی کہ آستانہ (ترکی) میں جو اسلامی مدارس ہیں، ان سے کچھ علماء منتخب کئے جائیں اور ان کو جاپان بھیجا جائے۔ اس مجلس میں سید جمال الدین افغانی (۱۸۹۷ - ۱۸۳۸) بھی شریک تھے۔ آخر میں سلطان نے کہا کہ آپ بھی اپنی رائے دیں۔ انھوں نے کہا: یہ علماء تو خود مسلمانوں کو اسلام سے دور کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔ پھر وہ جاپانیوں کو اسلام سے قریب کرنے کا سبب کیسے بنیں گے۔ بہتر یہ ہے کچھ لوگوں کو باقاعدہ تربیت دے کر تیار کیا جائے جو موجودہ زمانہ کی رعایت سے اسلام کی تبلیغ کی خصوصی صلاحیت رکھتے ہوں۔ پھر ان کو جاپان میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے بھیجا جائے۔ اس وقت سلطان صرف یہی کر سکے

سلطان نے شہنشاہ جاپان کے جواب میں شکریہ کا خط بھیج دیں اور یہ لکھ دیں کہ آپ کی رائے بہت مناسب ہے۔ ہم جلد ہی اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ سلطان نے کچھ تحفہ تحائف کے ساتھ ایک خط شہنشاہ جاپان کو بھیج دیا۔ (حاضر العالم الاسلامی، از امیر شکیب ارسلان)

فرانسس زیویر (۱۵۵۲–۱۵۰۶) جب ۱۵۴۹ء میں گوا سے جاپان پہنچا تو مخالف حالات کے باوجود اس نے جاپانی زبان سیکھی اور مسیحیت کی تبلیغ شروع کی۔ مگر موافق حالات کے باوجود عالم اسلام میں کوئی جاپانی زبان سیکھنے کے لئے نہ اٹھا۔ سید جمال الدین افغانی اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے اس کام کے لئے موزوں ترین شخص تھے۔ سلطان عبدالحمید ان سے بے پناہ عقیدت رکھتا تھا۔ اگر وہ سلطان سے کہتے کہ آپ ایک ادارہ قائم کر دیجئے۔ میں اس کو چلاؤں گا اور اس میں جاپانی زبان میں اسلامی کتابوں کے ترجمے اور جاپان میں تبلیغ کرنے والے افراد تیار کروں گا تو سلطان فوراً راضی ہو جاتا۔ مگر جمال الدین افغانی کو اپنے سیاسی مشاغل سے فرصت نہ تھی۔ ان کے نزدیک سب سے بڑا کام یہ تھا کہ انگریزی اور فرانسیسی استعمار کو "قبر میں اتار دیا جائے"۔ وہ مغربی قوموں کا سیاسی اقتدار ختم کرنے کے لئے بے چین تھے۔ ایسی حالت میں کفر و شرک کو دنیا سے ختم کرنے کی بے چینی ان کے اندر کس طرح پرورش پاتی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی (۱۹۷۷–۱۸۹۲) کے دادا مفتی محمد مظہر کریم صاحب اپنے وقت کے ایک ممتاز عالم تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں علما نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا جو فتویٰ دیا، اس پر ان کے بھی دستخط تھے۔ اودھ کے دوسرے علما مثلاً مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی عنایت احمد (مؤلف علم الصیغہ) وغیرہ کے ساتھ انھیں بھی حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ملی۔

قید کے زمانہ میں کوئی کام نہیں تھا۔ چنانچہ مولانا مظہر کریم صاحب نے ایک ضخیم عربی کتاب کا اردو ترجمہ کر ڈالا۔ وہاں کے انگریز افسر کو اس کی خبر ملی تو اس نے اس کو "ایک علمی کارنامہ" قرار دیا، اور اتنا خوش ہوا کہ حکومت سے ان کے حق میں پرزور سفارش کی۔ اس سفارش کے بعد اگرچہ فوری طور پر ان کی رہائی نہ ہو سکی تاہم ان کی قید کی میعاد میں کافی کمی کر دی گئی ——— سیاسی حریف کی حیثیت سے انگریز مولانا مظہر کریم کا دشمن تھا، علمی اور تعمیری کام کرنے والے کی حیثیت سے وہ ان کا دوست بن گیا۔

یہ چھوٹا سا واقعہ ہماری جدید تاریخ کی تصویر ہے۔ جن میدانوں میں ہمارے لئے کام کے مواقع تھے وہاں کام کرنے سے ہم کو کوئی دلچسپی نہیں ہوئی، اور جس میدان میں کام کا موقع نہیں ہے، وہاں ہم اپنا سر ٹکرا رہے ہیں۔ مزید نادانی یہ کہ اس لاحاصل کام کا نام ہم نے جہاد رکھ لیا ہے۔

فریدہ خانم
ایم سلیم

سیاست کے لئے جوش

تعمیر کے لئے سرد مہری

فاطمہ بیگم (۱۸۹۰ — ۱۹۵۸) مولوی محبوب عالم اڈیٹر پیسہ اخبار لاہور کی صاحبزادی تھیں۔ ان کی شادی راجہ عبدالعزیز صاحب (ضلع ہزارہ) سے ۱۹۲۱ میں ہوئی۔ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے جب ۱۹۴۱ میں اعلان کیا کہ وہ طالب علموں کے لئے سیاسی تعلیم کا مدرسہ (سکول آف پالیٹکس) جاری کرنا چاہتے ہیں تو فاطمہ بیگم نے اس اسکول کے لئے لاہور میں اپنی ذاتی جائداد سے قیمتی زمین عطیہ کے طور پر دے دی اور منصوبہ پر فوری عمل درآمد کے لئے اپنے ہائی اسکول میں کچھ کمروں کا بندوبست کر دیا۔ جو کہ انھوں نے لاہور میں لڑکیوں کے لئے کھولا تھا۔ انھیں گوارا نہ ہوا کہ باضابطہ عمارت بننے تک نوجوانوں کی سیاسی تربیت کا کام ملتوی رہے۔

یہ حالیہ تاریخ کا ایک نسبۃً چھوٹا سا واقعہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیاسی کاموں کے لئے لوگوں کے اندر کتنا جوش و خروش تھا۔ مرد تو مرد عورتوں تک میں سیاست کے نام پر جوش و خروش پیدا ہو جاتا تھا۔ سیاست کے لئے وہ کسی بھی بڑی سے بڑی قربانی کے لئے تیار ہو جاتی تھیں۔

الرسالہ مارچ ۱۹۷۷

[illegible] کے لئے نہیں [illegible] شک نہیں کہ مسلمانوں کی موجودہ دور میں نہایت عالی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

دیہات میں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض خاندانوں کا حال یہ رہتا ہے کہ لڑائی جھگڑے کے نام پر ان کے افراد بہت جلد گرم ہو جاتے ہیں۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اپنے کھیتوں اور باغوں میں محنت کرنے اور اپنے مکانات کو درست کرنے کے لئے ان کے اندر کوئی جوش نہیں پیدا ہوتا۔ ایسے خاندان ہمیشہ ناکام اور برباد رہتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض دوسرے خاندان ہوتے ہیں جو لڑائی جھگڑے کے موقع پر خاموشی سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ ان کے گھر والوں کو سارا شوق یہ رہتا ہے کہ خوب تعلیم حاصل کریں۔ کھیتوں اور باغوں کو ترقی دیں۔ عمدہ مکان بنائیں۔ بچوں کو اخلاق اور تہذیب سے آراستہ کریں۔ ایسے لوگ ہمیشہ محفوظ اور مطمئن رہتے ہیں۔ کوئی آندھی ان کے درخت کو نہیں اکھاڑتی اور کوئی سیلاب ان کی دیواروں کو گرانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

دیہاتی کسانوں کی اسی مثال پر قوموں کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ جو قومیں تعمیری اور اصلاحی حیثیت سے اپنے کو مضبوط اور مستحکم بناتی ہیں، ان کی زندگی کے تمام شعبے درست رہتے ہیں۔ اس کے برعکس جو قومیں جلسہ بازی اور سیاست بازی میں اپنی قوتیں صرف کرتی ہیں ان کو نہ اقتصادی اور سیاسی استحکام حاصل ہوتا اور نہ وہ چیز جس کو سیاست کے نام سے وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ■

[redacted] اس طرح بھی آتی ہے

تاریخ کی کتابوں کی یہ روایت مشہور ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے زمانے میں ایک بار جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے۔ اچانک ان کی زبان سے نکلا: یا ساریۃ الجبل (اے ساریہ پہاڑ کی طرف) ساریہ ایک فوجی سردار تھے اور ان کی سرکردگی میں مسلح افواج ایران کے کسی مقام پر لڑ رہی تھیں۔ اس جنگ کے دوران ایک موقع ایسا آیا کہ دشمن کا پلّہ بھاری ہوگیا اور اندیشہ پیدا ہوگیا کہ وہ مسلمانوں کو گھیرے میں لے کر ان کا خاتمہ کردیں گے۔ اس وقت بہترین فوجی حکمت عملی یہ تھی کہ پیچھے ہٹ کر پہاڑ کی اوٹ لے لی جائے تاکہ دشمن کے مقابلہ کا مسئلہ صرف ایک طرف سے رہ جائے۔

مگر بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ صاحب معاملہ اپنے مخصوص حالات میں گھرا ہونے کی وجہ سے بے لاگ طور پر سوچ نہیں پاتا۔ اور یہ بات اس سے اوجھل رہ جاتی ہے کہ اس ہنگامی موقع پر اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس وقت اللہ کی مدد خارج سے ہوتی ہے۔ یہی صورت مذکورہ بالا معاملہ میں پیش آئی۔ اللہ نے حضرت عمر فاروق کو مدینہ میں وہ بات سجھا دی جو حضرت ساریہ سے ایران میں اوجھل ہورہی تھی۔ اسلامی فوج کا قاصد بعد کو جب جنگ کی خبر لے کر آیا تو اس نے بتایا: اے امیر المومنین، ہم شکست کھانے کے قریب تھے کہ ہم نے فضا سے آواز سنی یا ساریۃ الجبل اس آواز سے ہم ہوشیار ہوگئے۔ ہم نے اپنے لشکر کی پیٹھ پہاڑ کے قریب کردی اور اللہ نے دشمن کو شکست دی اور ہم کو فتح یاب کیا۔

اس طرح کے اور واقعات بھی تاریخ کی کتابوں میں آئے ہیں۔ مثلاً اموی خلیفہ ہشام بن عبد الملک (متوفی ۱۲۵ھ) کے زمانے میں افریقہ میں بربری قبائل سے مقابلہ میں اسلامی فوج کو شکست ہوئی۔ اس فوج میں زیادہ تر شام کے لوگ تھے اور فوج کی تعداد کم تھی۔ ہشام کو خبر پہنچی تو اس نے قسم کھائی کہ اگر میں زندہ رہا تو اہل بربر پر ایک لاکھ آدمیوں کا لشکر بھیجوں گا اور یہ سب میرے تنخواہ دار فوجی ہوں گے۔ اس کے بعد پھر ایک لاکھ بھیجوں گا، اور برابر بھیجتا رہوں گا، یہاں تک کہ میرے اور میرے بیٹوں اور پوتوں کے سوا کوئی باقی نہ رہے۔ پھر ان میں بھی قرعہ ڈالوں گا۔ اور اگر میرے نام پر قرعہ نکلا تو میں خود لڑنے کے لئے نکلوں گا۔" اس کے بعد ہشام نے بشر بن صفوان گورنر افریقہ کے بھائی حنظلہ بن صفوان کلبی کو پچاس ہزار فوج دے کر روانہ کیا۔

اس جنگ کے دوران خلیفہ ہشام بیمار پڑ گیا۔ مگر اس کا دل برابر میدان مقابلہ کی طرف لگا ہوا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن شدت مرض میں اس کی زبان سے نکلا: "حنظلہ! میسرہ کے دونوں لشکروں میں سے پہلے ایک سے جنگ کرو۔" پاس بیٹھے ہوئے لوگ سمجھے کہ خلیفہ ہذیان کی حالت میں بڑبڑا رہا ہے۔ مگر دمشق کی آواز حنظلہ کو افریقہ میں پہنچ گئی۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ پہلے اس لشکر سے نپٹے جو مقام قرن میں تھا۔ ایک لشکر کو ختم کرنے کے بعد دوسرے لشکر پر حملہ کیا جو مقام اصنام میں تھا اور فتح پائی۔ دو لشکروں کو اس طرح الگ الگ شکست

* دینے کا یہ واقعہ ۱۲۴ھ کا ہے

ایجنسی کی شرائط

۱۔ کم از کم دس پرچوں پر ایجنسی دی جائے گی۔

۲۔ کمیشن پچیس فی صد

۳۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوں گے۔

۴۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ ہوں گے۔

۵۔ غیر فروخت شدہ پرچے واپس لے لئے جائیں گے۔

منیجر الرسالہ ۱۰۳۶ کشن گنج، دہلی ۔ ۶

ہر قسم کی کتابیں

قرآن، دینیات اور دوسرے موضوعات پر

کسی بھی ادارہ کی چھپی ہوئی

ہم سے طلب کیجئے

محصول ڈاک بذمہ خریدار ——— روانگی بذریعہ وی پی

۱۰۳۶ کشن گنج — دہلی ۱۱۰۰۰۶

شیخ حسن البناء اور فلسطین

۱۹۴۷ء کی بات ہے ہم لوگ جامعہ ازہر میں پڑھتے تھے۔ اقوام متحدہ نے فلسطین کی تقسیم کا اعلان کر دیا اور یہودیوں کی حکومت تسلیم کر لی۔ ساو ما قوام متحدہ کا ممبر بھی نامزد کر دیا۔ اس غلط تقسیم، ناروا اعلان، سراسر ظلم و عدوان اور صریح زیادتی کے خلاف ہر شخص نے آواز اٹھائی۔ لیکن کسی سے عملی اقدام کی جرأت نہ ہو سکی۔

مصر نے تمام سیاسی جماعتوں اور تحریکوں کو اکٹھا کر کے فلسطین کی آزادی کے لئے ایک کانفرنس بنائی۔ عرب لیگ صرف اجلاس ہی بلاتی رہ گئی۔ دمشق، قاہرہ، بغداد، بیروت اور عمان کی مسلم جماعتوں نے مظاہرے اور اس غلط تقسیم کے خلاف زبانی احتجاج میں کیں اور خاموش ہو گئے۔ مختلف گروہوں کے لیڈر اور جماعتوں کے پیشوا از ہر آئے۔ یکے بعد دیگرے تقریریں کیں، سامعین ان کے مشتعل جذبات کی آتش بیانی سنتے رہے اور بس۔

شیخ حسن البنا ممبر پر آئے۔ آپ نے بھی تقریر کی۔ لیکن ایسی فیصلہ کن کہ آپ کے بولنے کے بعد کسی میں جرأت نہ ہو سکی شیخ حسن البنا کے حلق سے جو آواز نکل رہی تھی وہ عوام کے غم و غصہ کی جھوٹی تسلی کے لئے نہیں تھی۔ گرج میں عمل کی پکار تھی اس للکار میں خون کی پیش کش تھی

شیخ حسن البنا جب ممبر پر تشریف لائے تو سامعین نے تالیوں اور نعروں سے آسمان کو سر پر اٹھا لیا۔ شیخ نے اپنی بارعب اور پُر وقار آواز میں تقریر شروع کی۔ فرمایا یہ یہودی خبیث اور ذلیل قوم جو ہماری چھاتیوں کا ناسور ہے ہمارے ہی ملک میں ہماری زندگی تلخ کئے ہوئے ہے۔ ہمارے ایمان و معتقدات میں خلل انداز ہو رہی ہے۔ اُن کو یہ جرأت اس لئے ہو رہی ہے کہ یہ بڑی طاقتیں جو اللہ کا انکار کرتی ہیں اور عدل و انصاف سے گریز کرتی ہیں۔ ان کی پشت پناہی کر رہی ہیں۔ شیخ نے اپنی آواز اونچی کر کے فرمایا

اے بندگانِ مصر! کل ہی کی بات تو ہے کہ ہیضہ کی وبا میں مصر کے چالیس ہزار افراد نے دست و قے میں غرق ہو کر جان دیدی اور تم نے اسے برداشت کر لیا۔ کیا تم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ ہمارے چالیس ہزار آدمی ہمارے محبوب فلسطین کی آزادی کی خاطر خاک و خون میں لوٹ کر رتبہ شہادت حاصل کریں۔

اختتام تقریر پر شیخ نے فرمایا کہ جہاد کے لئے اخوانی نوجوانوں کی جماعت بالکل پا بہ رکاب ہے۔ مصری حکومت اگر چاہے تو وہ بھی اپنے لشکر و سپاہ کو اخوانی مجاہدین کے ساتھ بھیج دے تاکہ سب مل کر یلغار کر سکیں۔

اسی روز ازہر سے ایک شاندار جلوس مظاہرہ کرتے ہوئے نکلا۔ شاید قاہرہ نے ایسا مظاہرہ پہلی بار دیکھا ہوگا۔ اخوانی جوانوں کی ایک کثیر جماعت منظم طریقے پر پوری فوجی تنظیم کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے نکلی اور فلک شگاف نعرے لگاتی جا رہی تھی "لبیک یا فلسطین" (اے فلسطین ہم حاضر ہیں) اخوانی جلوس کا تزک و احتشام اور جاہ و جلال حکومت مصر کو ناگوار گزرا۔ پولیس مظاہرین کے درپے ہوئی۔ اور انھیں منتشر کرنے کے لئے لاٹھی چارج اور ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ شیخ کے ہاتھ میں چوٹ آگئی پھر بھی شیخ نے فیصلہ کن انداز میں اعلان کر دیا کہ جلوس "قصر عابدین" تک پہنچنے کے بعد ہی خاموش ہوگا۔ چنانچہ قصر عابدین کے آگے پہنچ کر ختم ہو گیا۔ یہ جلوس شاہ فاروق کو حق و صداقت، غلبہ و قوت اور استقلال و آزادی کی آواز سنا چکا تھا۔ اخوانی مجاہدین کا لشکر فلسطین پہنچا

(رسالہ مارچ ۱۹۴۸ء)

انمردی ثابت قدمی کے ساتھ یہودیوں کے خلاف جہاد جاری رکھا۔ فلسطین کی مقدس سرزمین شہیدوں کے خون سے لالہ زار ہو گیا
۔ حسن البنا نے ازھر میں جو وعدہ کیا تھا۔ وہ وعدہ وفا ہو رہا تھا۔ شیخ کا مقصد نہ عوام کو خوش کرنا تھا اور نہ کسی کی داد و تحسین
حاصل کرنا بلکہ آپ نے جو کچھ کیا وہ رضائے الٰہی کی خاطر تھا۔ اخوان کے اس اقدام کا یہ نتیجہ ہوا کہ اخوانیوں کی قوت و طاقت
قوت اور عزم و استقلال کا اندازہ کر کے مصری حکومت خوفزدہ ہو گئی اور خود اسے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ حکومت مصر
، اخوان دشمنی میں یہودیوں، انگریزوں فرانسیسیوں اور امریکیوں کی ہمنوا بن گئی۔ اور برطانوی کارندوں کے اشارہ پر
اخوانی جماعت کو غیر قانونی قرار دے کر گرفتاری کا عام حکم صادر کر دیا گیا۔ مصری پولیس پوری طرح حرکت میں آگئی۔ دھڑا دھڑ
اخوانیوں کو گرفتار کرنے لگی۔ فلسطین کے میدان جہاد سے اخوانی مجاہدین واپس لائے گئے اور مصری قید خانے کی تنگ و تاریک
کوٹھریوں میں نظربند کر دیئے گئے۔ حکومت مصر نے اس دوران عوام کی آزادی سلب کر لی۔ لوح و قلم کی متاع چھین لی اور ان کو
پہرے لگا دیئے۔ رعایا کو دہشت و خوف میں مبتلا کر دیا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ اس وقت شیخ حسن البنا بالکل آزاد تھے۔ مجھے یاد ہے کہ شیخ کی شہادت سے چند دن قبل ہم لوگ دفتر اخوان میں بیٹھے تھے۔ شیخ نے فرمایا کہ پتہ نہیں حکومت میرے خلاف سازش کا کیا اور کیسا جال پھیلا رہی ہے کہ اب تک مجھے گرفتار بھی نہیں کیا گیا۔ اور چند دن قبل تک میری نقل و حرکت پر جاسوسوں کی جو نگرانی تھی وہ بھی اٹھالی گئی۔ معلوم نہیں ان کارروائیوں کا مقصد کیا ہے۔ پھر ایک سرد آہ بھر کر خود ہی فرمایا۔ چھوڑئے ان سب باتوں کو اللہ کا فیصلہ غالب ہو کر رہے گا۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ایک مصری وزیر مصطفےٰ مرعی داخل ہوا (بزعم خویش خود شیخ اور حکومت کے درمیان قاصد کے فرائض انجام دے رہا تھا) اور کہا جناب آپ سے ہمارا صرف ایک ہی مطالبہ ہے اور وہ یہ کہ آپ خفیہ ریڈیو اسٹیشن ہمارے حوالے کر دیں اس کے بعد اخوان کو آزادی دیدی جائے گی اور پھر وہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں گے
شیخ نے ہنس کر فرمایا " ریڈیو اسٹیشن؟ یہ کیسی بات کرتے ہو۔ جب حکومت اور اس کے سارے جاسوس اس اسٹیشن کا پتہ لگانے سے عاجز رہ گئے ہیں تو میں کیسے تمہیں اس کا پتہ بتا سکتا ہوں۔ اسٹیشن کا ذکر تو میں نے پہلی بار تمہاری زبان سے سنا ہے۔ وزیر آتش پا ہو کر دھمکی آمیز گفتگو کرنے لگا تو شیخ کو جلال آگیا۔ غضبناک لہجہ میں وزیر کے منہ پر فرمایا۔ ابھی سن لو اگر اس کا بادشاہ اور اس کی حکومت ازہر کے ہوا خواہ علماء اور شیخ الاسلام یہ سب کے سب اخوان دشمنی پر اتر آئیں اور اخوان سے لڑائی کے لئے کمربستہ ہو جائیں تو میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس لاکھوں کا لشکر، بے انتہا فوج و سپاہ اور جنگی ساز و سامان ہے۔ دعویٰ کے ساتھ کہتا ہوں کہ میرے پاس پچاس ہزار نفوس ایسے ہیں جن کا ایک ایک فرد ان میں سے پچاس پچاس بتوں کو سرنگوں کرنے سے پہلے خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔ یہ سننے کے بعد وزیر الٹے پاؤں لوٹ گیا اور ہم لوگ بھی واپس چلے آئے۔

۱۳ فروری ۱۹۴۹ء کی صبح تھی۔ میں سو رہا تھا۔ ہاکر کی آواز نے مجھے جگا دیا۔ ہاکر " حادثہ حادثہ " کہہ کر آواز لگا رہا تھا اور اس روزمرہ کی آواز کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اخبار خرید کر میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اطمینان سے اخبار اٹھایا پہلے ہی صفحے پر جلی سرخیوں میں لکھا تھا • شیخ حسن البنا کی وفات • اخبار میرے ہاتھ سے گر پڑا۔

(عصمر عوجة الخطیب ۔ سابق وزیر خوراک شام کے عربی مقالہ سے ترجمہ)



پپیتہ

ایک نفع بخش تجارت

دیہات میں پپیتے کے درخت اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں جن میں پھل نہیں ہوتے۔ کسان عام طور پر سمجھ لیتے ہیں کہ یہ "بانجھ" پپیتے ہیں اس لئے پھل نہیں دے رہے ہیں۔ مگر یہ بات صحیح نہیں۔ اصل یہ ہے کہ پپیتے کے درختوں میں اکثر وہ ہوتے ہیں جن کو علم نباتات کی اصطلاح میں یک زوجیا DIOECIOUS کہا جاتا ہے یعنی ان کے نر اور مادہ پھول الگ الگ درختوں میں ہوتے ہیں۔ (ایک ہی درخت میں دونوں قسم کے پھول نہیں ہوتے) دوسری بات یہ کہ پپیتے کے پھلوں سے جو بیج نکلتے ہیں ان میں بڑی تعداد نر بیجوں کی ہوتی ہے۔ اگر خود رو طور پر پپیتے

[illegible] ۱۹۷۷

کے درختوں کو اُگنے دیا جائے تو وہ نر درختوں کا باغ بن جائے گا اور کوئی پھل نہیں دے گا کیونکہ پھل ہمیشہ مادہ درختوں میں لگتا ہے۔

پپیتہ کی باغبانی کے لیے منصوبہ بندی ضروری ہے یعنی ہر سال پودے لگائے جائیں اور ضروری تناسب برقرار رکھنے کے لئے نر درختوں کو مسلسل کاٹا جاتا رہے اور ان کی جگہ پر مادہ درختوں کو لگایا جاتا رہے۔ ایک باغ میں عام طور پر چند نر درخت کافی ہو جاتے ہیں۔

پھول آنے سے قبل نر اور مادہ درختوں میں تمیز نہیں ہوتی۔ تاہم چھ ماہ کی عمر کو پہنچ کر بآسانی تمیز ہو جاتی ہے جب کہ پپیتہ میں پھول آنے لگتے ہیں۔ مادہ کے مقابلہ میں، نر درخت تقریباً ایک ماہ پہلے پھول دے دیتا ہے۔ نر پودے کے پھول لمبی لمبی ڈنڈیوں میں لگے ہوتے ہیں۔ مادہ اور دو زوجیا کے پھول ڈنڈی دار نہیں ہوتے اور بالعموم تین گچھوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ اس طرح پہچان کر نر پودے نکال دیئے جاتے ہیں اور ان کی جگہ مادہ پودے لگا دیئے جاتے ہیں۔ نر اور مادہ کی قطعی پہچان پھول ہی سے ہوتی ہے۔

برصغیر ہند میں پپیتہ کو پرتگالی تقریباً تین سو سال پہلے وسطی امریکہ سے لائے تھے۔ چونکہ گرم اور مرطوب آب و ہوا اس کے لئے موزوں ہے، اس لئے ہندستان میں اس کی کاشت بہت کامیاب رہی۔ پپیتہ سخت سردی برداشت نہیں کر سکتا۔ جزیرہ ہوائی میں اس کی کاشت دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہوتی ہے۔

پپیتہ کی تقریباً دو درجن قسمیں ہیں۔ افزائش نسل زیادہ تر تخم کے ذریعہ ہوتی ہے۔ پھل گول اور لمبا ہوتا ہے۔ عام طور پر ایک پونڈ سے دس پونڈ تک کے پھل ہوتے ہیں۔

۲۵ پونڈ کے پھل بھی پائے گئے ہیں۔ اس کا درخت ایک سال کے اندر ۱۰ فٹ تک بڑھ جاتا ہے اور پہلے ہی سال پھل دینے لگتا ہے۔ ایک درخت ایک موسم میں ۱۰۰ پونڈ تک پھل دیتا ہے۔ عمر زیادہ سے زیادہ پانچ سال تک ہوتی ہے۔

پپیتہ کا پودا لگانے کے لئے جنوری، فروری کا مہینہ سب سے اچھا ہے۔ اگر بارش کے زمانہ میں پودا لگایا جائے تو پانی کی کثرت کی وجہ سے اس کے گل جانے کا ڈر رہتا ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ جنوری یا فروری میں لگا دیا جائے تاکہ بارش کے موسم تک درخت بڑا ہو جائے۔ پپیتہ نمی زیادہ چاہتا ہے، اگر جڑوں میں پانی کھڑا ہونے سے اس کا اسفنجی تنہ گلنے لگتا ہے۔ نیز اس کی جڑیں زمین میں زیادہ نیچی نہیں جاتیں۔ سطح کے قریب قریب رہتی ہیں۔ لہذا تیز و تند ہوا کے جھونکوں سے اس کو بچانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

پپیتہ کا بیج بویا جاتا ہے۔ قلم بھی لگتے ہیں۔ مگر وہ بہت مشکل طریقہ ہے۔ بڑے قد کا میٹھا پھل لے کر اس کا بیج نکال لیا جائے اور آہستہ آہستہ صاف کرکے دو تین دن دھوپ میں خشک کر لیا جائے پھر ڈبوں میں محفوظ کر لیا جائے۔ احتیاط سے رکھا جائے تو بیج تین سال تک کام دیتا ہے۔ پپیتہ کے ۸ اونس بیج سے تقریباً ۴۰۰ پودے تیار ہوتے ہیں جن سے ایک ایکڑ زمین بھری جا سکتی ہے بیج بونے کے لئے جون سے نومبر تک کا وقت بہترین ہے۔

پپیتہ بہت کم جگہ گھیرتا ہے۔ دو درختوں کے درمیان دس فٹ کا فاصلہ بھی کافی ہے۔ پودا لگانے سے پہلے گڑھا کھود کر اس میں تقریباً ۵۰ پونڈ گلی سڑی ہوئی کھاد اور تقریباً پانچ پونڈ ہڈی کا چورا ملا کر گڑھے کو بھر دیا جائے پھر اس پر مقررہ وقت پر پودا لگایا جائے۔ اس کے بعد ہر سال بارش سے پہلے دو ٹوکرے کھاد اور تقریباً تین پونڈ ہڈی کا چورا اور تھوڑی سی راکھ تنے کے اطراف میں مٹی کھود کر ڈالی جاتی رہے۔ اس ترکیب سے پھل زیادہ آتے ہیں۔ کبھی کبھی نمک کا محلول بھی جڑوں کے قریب ڈالنا چاہئے۔

پپیتہ بہت مفید پھل ہے۔ ہر ایک منڈی میں نہایت آسانی سے اچھی قیمتوں پر فروخت کیا جا سکتا ہے۔ پپیتہ کی واحد کمزوری یہ ہے کہ وہ دور کے مارکٹ میں بھیجا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ اس کا پھل اندر سے خول ہوتا ہے، دوسرے پھلوں کی طرح بھرا ہوا نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پکنے کے بعد پھل نرم ہو جاتا ہے اور معمولی دباؤ پڑنے سے خراب ہو جاتا ہے۔

تاہم پپیتہ کی بنیاد پر اور بہت سی تجارتیں وجود میں آتی ہیں جو زیادہ دیرپا اور مفید ہیں۔

پپیتہ میں ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ وہ گوشت کو نرم کرکے جلد پکا دیتا ہے۔ چنانچہ اس کا سفوف یا عرق بنا کر اس مقصد کے لئے فروخت کیا جاتا ہے۔ مغربی ملکوں میں MEAT TENDERIZER کے نام سے گوشت کو جلد پکانے کی جو دوائیں بکتی ہیں، وہ پپیتہ ہی سے تیار کی جاتی ہیں۔ پپیتہ کی یہ خصوصیت اس کو ہاضم بھی بناتی ہے۔ چنانچہ اس سے ہاضمہ کی گولیاں بھی بنائی جاتی ہیں۔

گوشت کو گلانے یا ہاضمہ کی گولیاں کچے پپیتہ سے تیار کی جاتی ہیں۔ ہرے پھلوں میں ایک مادہ ہوتا ہے جس کو PAPAIN کہتے ہیں۔ یہ مادہ پھلوں کے علاوہ اس کی پتیوں اور ڈنٹھلوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس مادہ کو نکال کر سکھا لیتے ہیں اور اس کو سفوف کی شکل میں تیار

...یقے میں۔ پپیتہ میں یہ خصوصیت اتنی زیادہ
...ت کو اگر کچھ دیر اس کے پتہ میں لپیٹ دیا جائے
...شت نرم ہو جائے گا اور پکاتے وقت آسانی سے
...جائے گا۔

پپیتہ کی ہر چیز کار آمد ہے حتیٰ کہ اس کی چھال سے رسیاں بنی جاتی ہیں اور اچھے دام پر فروخت ہوتی ہیں۔ تاہم موجودہ زمانہ میں پپیتہ کا سب سے نفع بخش جزو اس کا دودھ ہے۔ پپیتہ کا دودھ مذکورہ فائدہ کے علاوہ بھی کئی کام آتا ہے اور بہت مفید ہے۔ ملک میں اور ملک کے باہر دونوں کی مارکٹ میں اس کی بہت مانگ ہے۔

دودھ نکالنے کا طریقہ یہ ہے کہ پھل جب بڑے ہو جائیں تو ان پر ہلکی خراشیں لگائی جائیں۔ اس کے بعد فوراً دودھ نکلنے لگے گا۔ اس کو شیشہ یا چینی کے برتن میں سنبھال لیا جائے۔ یک وقت زیادہ خراشیں نہ لگائی جائیں۔ ایک دن میں صرف تین چار خراشیں لگائی جائیں۔ اس سے دودھ زیادہ مقدار میں حاصل ہوگا۔ اس عمل سے پھل خراب نہیں ہوتا۔ زخم چند دن میں بھر جاتا ہے اور پھل زیادہ میٹھا ہو جاتا ہے۔

خراشیں صبح کو ۱۰ بجے سے پہلے پہلے لگانا چاہئیں تاکہ سکھانے کے لئے پورا دن مل جائے۔ سویرے کے وقت دودھ بھی زیادہ نکلتا ہے۔ دودھ کو قاعدہ کے مطابق سکھا کر ہوا بند ڈبوں میں پیک کیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے مخصوص آلات استعمال ہوتے ہیں۔ احتیاط نہ کرنے سے دودھ خراب ہو جاتا ہے۔

پپیتہ کا دودھ نہایت نفع بخش تجارت ہے۔ حکومت کے ادارے اس کو فوراً خرید لیتے ہیں۔ اس کو برآمد کر کے قیمتی زر مبادلہ حاصل ہوتا ہے۔ اس کی اہمیت کی وجہ سے حکومت پپیتہ کی باغبانی کے لئے خصوصی امداد کرتی ہے۔

تمدن سے دور، زندگی سے قریب

Where Life Begins at 100



قراقرم (مقبوضہ کشمیر) اور کاکیشیا (روس) کے پہاڑوں میں زندگی نہایت سادہ اور تمدنی سہولتوں سے دور ہے۔ مگر یہاں کے لوگ اعلیٰ انسانی اوصاف کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ سو برس اور ڈیڑھ سو برس تک نہایت تندرست حالت میں زندہ رہتے ہیں۔ امریکہ میں ایک لاکھ کی آبادی میں سو سالہ عمر والوں کی تعداد صرف تین فی صد ہے۔ جب کہ ۱۹۷۰ کی مردم شماری کے مطابق جارجیا اور آذربائی جان کے علاقہ میں سو سالہ عمر رکھنے والوں کی تعداد تقریباً پانچ ہزار تھی۔ (جارجیا میں ۳۹ فی صد، آذربائی جان میں ۶۳ فی صد)

کبھی شکست بھی فتح ثابت ہوتی ہے

زندگی کے حقائق اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں کہ وہ فتح و شکست کی اصطلاحوں میں سما سکیں۔

اسلام کی قدیم تاریخ میں اغیار کی طرف سے اس کو دو بڑے فوجی مقابلے پیش آئے ہیں۔ ایک تاتاریوں سے، دوسرا مسیحیوں سے۔ تاتاریوں سے مقابلہ بارھویں صدی کے آخر میں پیش آیا۔ مسلم قوموں کو اس مقابلہ میں مکمل شکست ہوئی۔ مگر اس شکست کے اندر سے حیرت انگیز طور پر ایک نیا امکان برآمد ہوگیا۔ فتح نے تاتاریوں کے انتقامی جذبہ کو ختم کر دیا۔ اب وہ نفسیاتی طور پر اس پوزیشن میں تھے کہ مفتوح کے مذہب و عقائد پر ہمدردانہ رائے قائم کر سکیں۔ انھیں نظر آیا کہ اسلام ایک سچا دین ہے اور اس میں خود ان کی اپنی بھلائی چھپی ہوئی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی شکست پر ایک صدی بھی نہیں گزری تھی کہ تاتاری حکمران مسلمان ہوگئے اور سارا مسئلہ ایک نئی بہتر شکل میں ختم ہوگیا —— فوجی میدان کے فاتح فطرت اور نفسیات کے میدان میں اپنے مفتوحوں سے شکست کھا گئے۔

مسیحی یورپ اور مسلمانوں کے درمیان مقابلہ اس کے برعکس مثال پیش کرتا ہے۔ مسیحی یورپ سے دو سو سالہ صلیبی لڑائی کے بعد مسلمانوں کو شاندار فتح حاصل ہوئی اور مسیحی اقوام کو بدترین شکست کے بعد واپس لوٹنا پڑا۔

مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ سارے یورپ میں اپنے "ب حریف کے خلاف انتقام کی ایک نہ ختم ہونے والی آگ بھڑک اٹھی۔ اپنے تمام وسائل کو انھوں نے ایک نئے مقابلہ کی تیاری کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔ ان کی یہ مخالفانہ کوششیں پانچ صدیوں تک جاری رہیں۔ یہاں تک کہ ان کی کامیابی اس انتہا کو پہنچی کہ انھوں نے قوت و فتح کے نئے میدان دریافت کر لئے۔ انھوں نے مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبے میں شکست دے کر ساری دنیا پر اپنی سیادت کا جھنڈا گاڑ دیا —— انھوں نے قدیم طرز کی ملاحی جہاز رانی کو ترقی دے کر دخانی جہاز رانی کے مقام پر پہنچایا اور اس کے زور پر تمام سمندروں پر قابض ہو گئے۔ انھوں نے دور مار ہتھیار تیار کر کے مسلم تلواروں کو کند کر دیا۔ انھوں نے مشینی صنعت ایجاد کر کے مسلم دستکاری کا خاتمہ کر دیا۔ انھوں نے سائنسی علوم وضع کر کے مسلمانوں کے روایتی علوم کو بے قیمت کر دیا۔ انھوں نے محکومی کی ایک نئی قسم (اقتصادی اور فنی محکومی) دریافت کی جس میں لا کر تمام مسلم دنیا کو مجبور کیا کہ سیاسی طور پر آزاد ہونے کے بعد بھی وہ انھیں کی غلام اور محکوم بنی رہے۔

پچھلی آٹھ سو سالہ تاریخ کا یہ تجربہ بتاتا ہے کہ وہ لوگ سخت غلطی پر ہیں جو صرف فتح و شکست کی اصطلاحوں میں سوچتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے حقائق اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں کہ فتح و شکست کی اصطلاحوں میں سما سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ فتح کبھی شکست ثابت ہوتی ہے اور شکست بھی کسی وقت فتح بن جاتی ہے۔

وہ برطانی سامراج کا ملازم تھا، مگر اس کی ملازمت اس کے لئے اپنے سامراجی آقا کے اوپر اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بن گئی۔

یہ انیسویں صدی کے آخر کا واقعہ ہے۔ خلیج عدن کے جنوبی ساحل پر زائلہ (صومالی) میں برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت ہو گئی۔ اس بغاوت کو کچلنے کے لئے عدن کانسٹبلری کا دستہ بھیجا گیا تھا۔ اس دستہ کے انگریز کانسٹبلوں میں ایک ولیم ریچرڈ ولیم سن تھا۔ بغاوت ایک مہینہ کے اندر کچل دی گئی۔ تاہم ولیم سن کا مسلمانوں سے میل جول اس کی زندگی میں ایک نئے انقلاب کا سامان بن گیا۔ وہ یہاں برطانوی استعمار کا ایک کارندہ بن کر آیا تھا، مگر جب وہ واپس ہوا تو وہ مسلمان ہو چکا تھا۔

ولیم سن ایک شریر اور ضدی لڑکا تھا۔ اپنے باپ سے خفا ہو کر ۱۸۰۰ء میں وہ برسٹل (انگلستان) سے نکل بھاگا۔ اس نے سمندری جہازوں پر ملازمت کی۔ آسٹریلیا، جزیرہ پونیپ، فلپائن، ہانگ کانگ، بمبئی وغیرہ مقامات پر سات سال تک گھومتا رہا۔ اس مدت میں اُسے شدید تلخیاں اور مصیبتیں اٹھانی پڑیں جس کی تفصیل جہازی ایورنڈی کی داستان (THE TALE OF EVIRENDY) نامی کتاب میں مسٹر جیکب نے بیان کی ہے۔

اس اذیت ناک سفر کے آخری مرحلے پر جب وہ ایس۔ ایس۔ سیام" نامی جہاز کے ذریعہ بمبئی سے عدن جا رہا تھا اُسے جہاز کی مختصر لائبریری میں ایک انگریزی کتاب ملی۔ یہ کتاب اسلام کے موضوع پر تھی اور اس کا مصنف لیورپول کا ایک وکیل کولیم تھا۔ کولیم مسلمان ہو گیا تھا اور اس کا اسلامی نام عبداللہ تھا۔ اس کتاب میں اس نے اپنے مسلمان ہونے کی داستان اور اسلامی تعلیمات کی حقانیت بیان کی تھی۔ کتاب کے مطالعہ سے ولیم سن کو یوں محسوس ہوا کہ وہ جس آبحیات کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا اس کی نشاندہی اس کتاب نے کر دی ہے۔ یہ کتاب اس نے بار بار پڑھی اور ہر بار اس کا ذہن نئی ایمانی کیفیت سے لذت یاب ہوا۔

عدن کی بندرگاہ پر اسسٹنٹ ریذیڈنٹ کرنل اسٹیسی کی طرف سے ایک پیغامبر اس کا منتظر کھڑا تھا۔ کرنل اسٹیسی نے اُسے بُلایا تھا۔ ولیم سن اس بلاوے پر سخت حیران ہوا، کیونکہ وہ کرنل سے بالکل ناواقف تھا۔ جہاز کے کپتان سے اجازت لے کر وہ برٹش ریذیڈنسی پہنچا۔ کرنل اس سے بڑی گرمجوشی سے ملا۔

"نوجوان تمھارا باپ میرا دوست ہے۔ مجھے اس کا خط کل ہی ملا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ تمھارا

خیال انڈین پولیس میں شامل ہونے کا ہے۔"

ولیم سن نے خالہ کے کہنے پر اپنے والد کے ساتھ خط وکتابت کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ آخری خط اس نے مینلا کے عذاب خانے سے نجات پانے کے بعد بمبئی پہنچ کر لکھا، اسی میں اس نے انڈین پولیس میں شامل ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

"جی ہاں، خیال تو ہے۔" ولیم سن نے کہا۔

"خوب، عدن کانسٹبلری انڈین پولیس ہی کا ایک حصّہ ہے، یہاں ایک جگہ خالی ہے نوکری کرو گے؟"

ولیم سن کے لئے یہ ایک زرّیں موقعہ تھا، قدرت نے خود اس کے لئے عربوں کے درمیان رہنے کا انتظام کر دیا تھا۔ وہ فوراً آمادہ ہو گیا اور چند روز بعد "سیام" سے مستعفی ہو کر پولیس میں کانسٹبل بھرتی ہو گیا۔

پولیس کی نوکری ولیم سن کے لئے نئے فرائض اور نئے مشاغل لے کر آئی۔ ولیم سن کی تنخواہ پچاس روپے ماہانہ تھی اور وردی اور رہائش مفت۔ اس نے چند ماہ کے اندر اندر خاصی رقم پس انداز کر لی۔ اور جلد ہی ایک عربی گھوڑا خرید لیا۔ پولیس کی نوکری ولیم سن کے لئے کچھ ایسی کٹھن نہ تھی۔ اپنی جسمانی ساخت کی بدولت وہ شدید ترین گرمی برداشت کر سکتا تھا۔ تفریح اور مطالعہ کے لئے اسے کافی وقت مل جاتا۔ اسی زمانے میں صومالی ساحل پر زائلہ میں برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت ہوئی جسے کچلنے کے لئے پولیس کا دستہ بھیجا گیا۔

ولیم سن اس دستے میں شامل تھا۔ بغاوت جلد ہی فرو ہو گئی۔ پولیس پارٹی دو تین مہینے وہیں رہی۔ اس مہم میں ولیم سن کو جو ترجمان دیا گیا اس کا نام حسن علی تھا۔ وہ صومالی تھا اور بڑا ہی پُرجوش مسلمان، حسن علی برطانوی استعمار کا ملازم تھا، مگر یہ ملازمت اس کے لئے ولیم سن کے اوپر اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بن گئی۔ وہ آسٹریلیا کا سفر کر چکا تھا اور خاصی اچھی انگریزی بول لیتا تھا۔ عربی میں تو وہ بڑی روانی سے باتیں کرتا، اسے جب پتہ چلا کہ ولیم سن کو اسلام سے گہری دلچسپی ہے تو وہ اکثر اسلام کے موضوعات پر گفتگو کرنے لگا۔ یہ شناسائی بعد میں گہری دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ حسن علی نے اسے عدن کے ممتاز اور ذی اثر عربوں سے متعارف کرایا۔

ولیم سن جلد ہی اُن میں گھُل مل گیا اور اسلام کی طرف اس کا رجحان کھُل کر سامنے آ گیا۔ ہندوستان کی طرح عدن میں بھی حکمراں طبقہ مقامی باشندوں سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ کسی سفید فام کا عربوں کیساتھ اس طرح گھل مل کر رہنا ولیم سن کے افسروں کو سخت ناگوار گزرا۔ بات کرنل اسٹیسی تک پہنچی جس کی سفارش پر اُسے پولیس میں رکھا گیا تھا۔ کرنل نے اسے بُلا بھیجا اور خاصی دیر تک فہمائش کرتا رہا۔

" رنگدار لوگوں سے میل جول سفید فاموں کے لئے زیبا نہیں، آخر حاکمانہ رکھ رکھاؤ بھی تو کوئی چیز ہے۔"

ولیم سن خاموش نہ رہ سکا "عرب رنگداروں کے زمرے میں نہیں آتے۔" اس نے کہا۔

"ممکن ہے ایسا ہی ہو۔" کرنل نے جواب دیا "مگر میں تمھارے بھلے کی بات کہتا ہوں، تمھیں دوست منتخب کرنے میں زیادہ احتیاط برتنی چاہیے، اور یہاں یہ بھی سنا ہے کہ تم مسلمان ہونا چاہتے ہو؟"

"میں سوچ تو رہا ہوں مگر ایک شیخ نے مشورہ دیا ہے کہ میں عجلت میں کوئی فیصلہ نہ کروں۔" ولیم سن نے بڑی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"یہ ایک معقول مشورہ ہے۔" کرنل نے کہا "تم عیسائی گھرانے میں پیدا ہوئے اور پرورش پائی، تمھارے باپ کو پتہ چلا، تو اُسے کتنا صدمہ ہوگا۔ تمھیں مذہب سے اگر مَس ہے، تو کسی پادری کے پاس جاؤ۔ یہ عجیب وغریب خیالات دماغ سے نکال دو۔"

اس نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا اور اس کی تعلیمات میں روح وقلب کے اطمینان کا سامان موجود پایا۔ کرنل کی نصیحت اس کے نزدیک ایک ایسے بزرگ کی نصیحت تھی جسے نوجوان نسل کے مسائل سے زیادہ صرف اپنے نقطۂ نظر سے سروکار ہوتا ہے۔

پولیس میں ولیم سن نے اپنا کیریئر بنا لیا۔ صومالیہ کی مہم اور اس کے بعد تین جرمن جاسوسوں کے گرفتار کرانے میں اس نے اپنی ذہانت اور عمدہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ اس کے افسروں کی نگاہیں اس پر پڑنے لگیں۔ وہ ان تمام باتوں سے بے نیاز ہو کر سال بھر تک اسلامی کتب کا مطالعہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ تمام شکوک وشبہات دُور ہو گئے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہو وہ اب اسلام ضرور قبول کرے گا۔

اس فیصلے کے بعد اُس نے نو مسلموں کے سے جوش وجذبے کے ساتھ دوسروں کو بھی اس روحانی فیض میں حصہ دار بننے کی دعوت دی۔ اس نے برسٹل میں اپنے والد کو ایک طویل خط لکھا۔ ایک اور خط اس نے کیلیفورنیا میں اپنی خالہ کو بھیجا۔ ان دونوں کو جب یہ خطوط ملے تو انھیں سخت صدمہ پہنچا۔ ایک تیسرا خط اس نے منیلا میں امریکی قونصل مسٹر رسل ویب کے نام تحریر کیا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ صرف ولیم سن کا خط مؤثر ثابت ہوا۔ بہرحال مسٹر ویب نے آگے چل کر منیلا چھوڑ دیا اور مسلمان ہو گئے۔ حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کی اور پھر امریکہ جا کر اسلام کی دعوت و تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔ انھوں نے اسلام پر کئی کتابیں بھی لکھیں۔

ولیم سن چھٹی لے کر لیج کے سلطان فاضل ابن علی کے پاس چلا گیا۔ وہاں کئی دن مہمان رہا۔ مقررہ دن ایک شاندار تقریب منعقد ہوئی جس میں اس نے لیج کے قاضی کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ سلطان نے اس کا اسلامی نام عبداللہ فاضل رکھا اور اُسے اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا۔ اس نے اپنے اخلاص کا ثبوت دینے کے لیے ختنہ بھی کروایا۔

اب اس کی نظر میں پولیس کی نوکری کی کوئی اہمیت نہ تھی، حج کا موسم قریب تھا اور لیج سے ایک قافلہ جانے والا تھا۔ عبداللہ فاضل کے دل میں مقدس شہروں کی زیارت کا شوق تیز تر ہو گیا، لیکن اس کا روپیہ پیسہ اور کپڑے عدن میں تھے، بڑے تذبذب کے بعد وہ عدن چلا آیا۔

عدن کی فضا افسردہ سی تھی، اس کے ساتھی اور افسر بڑی رکھائی سے پیش آئے۔ اس کی ایک ایک سرگرمی اور ارادے سے برطانوی خفیہ پولیس پوری طرح واقف تھی۔ عدن کے فوجی گورنر جنرل ہوگ، کرنل اسٹیسی اور اعلیٰ پولیس افسر سب پیچ وتاب کھا رہے تھے۔ عبداللہ فاضل کو نہ صرف حج پر جانے سے منع کر دیا گیا، بلکہ لیج کے سلطان کو بھی دھمکی دی گئی کہ

نوجوان قافلہ حجاج میں شامل ہوا، تو اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ ولیم سن نے درخواست دی کہ اُسے فوری طور پر ملازمت سے سبکدوش کر دیا جائے۔ مگر اس کی درخواست رد کر دی گئی، جواب ملا کہ تم ہندوستان جاکر ہی سبکدوش ہوسکتے ہو۔ عبداللہ ولیم سن ہندوستان جانے پر مجبور ہو گیا۔ سلطان لحج کو پتہ چلا تو اس نے ہدیۃً تین سو روپے بھیج دئے۔

عبداللہ ولیم سن ہندوستان جارہا تھا۔ مگر اس کا دل عرب میں تھا۔ جہاز کا فاصلہ عدن سے جتنا بڑھتا جاتا، عرب واپس پہنچنے کی آتش شوق اتنی ہی بھڑکتی جاتی تھی۔

ہندوستان پہنچ کر عبداللہ فاضل ولیمن ایک عجیب پریشانی میں گھر گیا۔ اسے ملازمت سے تو فوراً سبکدوش کر دیا گیا، لیکن بمبئی کے برطانوی حکام بدستور اس کے معاملات میں دلچسپی لیتے رہے۔ وہ اسے واپس انگلستان بھیجنا چاہتے تھے۔ مگر قانوناً ایسا نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ انھوں نے طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے کام لینے کی کوشش کی۔

پہلے اُسے انگلستان مفت لے جانے کی پیش کش ہوئی، پھر کہا گیا کہ یہاں کی آب و ہوا تمھارے مزاج کے موافق نہیں تم آسٹریلیا یا امریکہ چلے جاؤ، تمھارے سفر کا انتظام کر دیا جائے گا، مگر ولیم سن نے صاف انکار کر دیا۔ جب اس نے عرب جانے والے جہاز میں سیٹ مخصوص کرانا چاہی تو جواب ملا "کوئی جگہ نہیں"۔ اس نے مختلف جہازوں میں ملاح، فائرمین بلکہ خلاصی تک کے لئے درخواستیں دیں مگر جہاز کے کپتان کو کوئی ضرورت نہ تھی۔ جہاز کے مالکوں کو حکومت نے ہدایات جاری کر دیں کہ انگلستان، امریکہ یا آسٹریلیا کے سوا اسے کسی حالت میں بھی سفر کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اس نے عرب میں برطانوی خفیہ پولیس کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ مگر اس پیش کش کا کوئی جواب نہ ملا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر اس نے دوسرے ذرائع سوچنے شروع کر دئے۔ عبداللہ ولیم سن صرف عرب جانے والے جہاز پر سوار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی اور کسی بات پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ اس نے بندرگاہ پر کلرکی کر لی اور نہایت مطمئن زندگی بسر کرنے لگا۔

بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ وہ بمبئی ہی میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ حکومت کو اس کی قیامگاہ کا تو علم تھا، مگر شہر میں اس کے گھومنے پھرنے پر نہ تو کوئی پابندی تھی اور نہ اس کی نگرانی کی جاتی تھی۔ ان دنوں موصل، بغداد، بصرہ اور کویت سے گھوڑوں کے تاجر بمبئی آتے جاتے رہتے تھے اس نے ان سے رابطہ پیدا کر لیا۔ ان میں ایک دو تھوڑی بہت انگریزی بول لیتے تھے۔ اسے بھی ٹوٹی پھوٹی عربی آگئی تھی۔ اس نے انھیں اپنا سارا قصہ کہہ سنایا، اور مشورہ طلب کیا۔

بات چیت سے پتہ چلا کہ برٹش انڈیا کمپنی نے اپنے جہازوں میں گھوڑوں کے تاجروں کو خصوصی مراعات دے رکھی ہیں۔ عراق، عرب سے لائے جانے والے ہر تین گھوڑوں پر کمپنی تاجر کو آمد و رفت کا ایک فرسٹ کلاس ٹکٹ مفت دیتی ہے۔ ہر دو گھوڑوں کے ساتھ ایک سائیس کو ڈیک میں مفت سفر کرنے کی اجازت ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا

کہ کسی عرب تاجر کو ہندوستان میں کچھ عرصے رہنا ہوتا تو وہ اپنا آدھا واپسی ٹکٹ کسی کے ہاتھ بیچ دیتا تھا۔

عبداللہ نے سوچا جہاز راں کمپنیوں کو جُل دیا جا سکتا ہے۔ اس نے بصرے کے ایک عرب سائیس سے تیس روپے میں بصرے کا ٹکٹ خرید لیا۔ ٹکٹ عبداللہ علی کے نام کا تھا۔ چونکہ ان دنوں پاسپورٹ وغیرہ کا سلسلہ نہ تھا۔ اس لئے عبداللہ فاضل کسی خاص زحمت کے بغیر سفر کر سکتا تھا۔ اسے جہاز پر سوار ہوتے وقت کچھ بھی دقت پیش نہ آئی۔ اس نے عربی لباس پہن رکھا تھا جو اس نے عدن میں خریدا تھا۔ دھوپ میں سنولائے ہوئے چہرے اور ذرا سی ٹیڑھی ناک سے وہ ہو بہو عرب معلوم ہوتا تھا۔

بندرگاہ کے حکام، پولیس اور جہاز کے افسروں کسی کو گمان تک نہ ہوا کہ کوئی سفید فام "بنکورا" پر سوار ہوا ہے۔ بنکورا بصرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ عبداللہ فاضل نے کھلے سمندر میں پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا لیکن برطانوی راج کے عفریت نے دُور دُور تک اپنے چنگل گاڑ رکھے تھے۔

"بنکورا" خلیج فارس کی بندرگاہ بوشہر سے دور گہرے سمندر میں لنگر ڈالے کھڑا تھا۔ جہاز کا کپتان لانچ میں بیٹھ کر کمپنی کے دفتر گیا، خاصی دیر کے بعد واپس آیا اور جہاز کی تلاشی شروع ہو گئی۔ پتہ چلا کہ بمبئی سے ایک "گورا عرب" سوار ہوا ہے، اس کی تلاشی ہو رہی ہے۔ آخر گورا عرب پکڑا گیا۔ جہاز کے کپتان نے چبھتی ہوئی نظروں سے جائزہ لیا:

"کیا تمھارا نام ولیم سن ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں!"

"تو پھر تمھارا سارا منصوبہ تلپٹ ہو گیا ہے۔ بوشہر میں پولیٹکل افسر نے مجھے بُلایا تھا۔ اسے ہندستان سے تمھارے متعلق اطلاع ملی ہے، مجھے حکم ہوا ہے کہ تمھیں بصرے میں اترنے نہ دوں۔"

ولیم سن اندر ہی اندر کھولنے لگا: "میں نے کوئی جرم نہیں کیا، مجھے روکنے والا کون ہوتا ہے؟ کسی کو میری آزادی پر قدغن لگانے کا کوئی حق نہیں۔"

"میں کچھ نہیں جانتا، میرا کام تمھیں بمبئی واپس لے جا کر چھوڑ دینے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔"

عبداللہ ولیم سن نے دوران سفر میں بہت سے عرب تاجروں سے واقفیت پیدا کر لی تھی۔ انہی میں موتیوں کے ایک تاجر یوسف ابراہیم تھے۔ ان کا شمار کویت کے مشہور شیوخ میں ہوتا تھا۔ ولیم سن نے ان سے اس نئی افتاد کا ذکر کیا۔ وہ دیر تک خاموش رہے، پھر کہنے لگے:

"کیا یہ ضروری ہے کہ تم بصرے ہی جاؤ، ہمارے ساتھ کویت کیوں نہیں چلتے؟ تم ہمارے دینی بھائی ہو ہمارے ساتھ آؤ اور ہمارے مہمان بن کر رہو، کوئی تمھیں زک نہ پہنچا سکے گا۔"

"لیکن کیسے؟"

یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ کویت میں جہاز ساحل سے دور کھڑا ہوتا ہے۔ ہمیں لینے کے لئے ہماری اپنی کشتی آئے گی۔ تم بھیس بدل کر بآسانی ساحل پر پہنچ سکتے ہو۔"

آخر کویت آ گیا۔ عبداللہ ولیم سن نے اپنا عربی لباس اُتار کر ایک کویتی کا لباس پہن لیا۔ عبا کالے رنگ کی تھی اور عقال بھی مختلف تھا۔ اس کے عرب دوستوں

نے اس کا صندوق اور دوسرا سامان اُٹھا لیا۔ اگرچہ جہاز کے دو تین افسر کھڑے مسافروں کو کشتیوں میں سوار ہوتا دیکھ رہے تھے مگر عبداللہ ولیم سن پر کسی کو شبہ نہ ہوا۔ شیخ یوسف ابراہیم کی کشتی ساحل کی طرف روانہ ہوگئی اور بنکورا سامان اتارنے کے بعد اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔

کویت میں نوجوان عبداللہ نے اپنی عرب زندگی کا آغاز کیا۔ سات برس کی جہاں گردی کے بعد اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مشفق اور مہربان مادرِ وطن کی آغوش میں آگیا ہے۔ اب وہ مطمئن تھا۔ برطانوی راج کی دسترس سے دُور۔ اب وہ عرب رسم و رواج، عربی زبان اور اسلامی تعلیمات پوری آزادی سے سیکھ سکتا تھا۔ چند روز ہی میں وہ وضع قطع، ڈھنگ اور شب و روز کے مشاغل کے اعتبار سے ایک پیدائشی عرب بن گیا۔ چند ہفتوں کے بعد اس نے شیخ یوسف سے بصرہ جانے کی اجازت چاہی۔ شیخ یوسف اس کے اصرار پر رضامند ہوگئے۔ بصرے کے بُسّام گھرانے کے ساتھ شیخ کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ اس نے ان کے نام ایک تعارفی خط لکھ دیا۔ انہی دنوں شیخ کا ایک چھوٹا جہاز سامان تجارت لے کر فاؤ جا رہا تھا جو شط العرب کے دہانے پر واقع ہے۔ عبداللہ ولیم سن اس جہاز میں سوار ہوگیا۔ کویت کے دوستوں نے اسے بڑی افسردہ دلی اور نیک تمناؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

بصرے میں بُسّام کے گھرانے سے ہر شخص واقف تھا۔ انھوں نے عبداللہ ولیم سن کو بصد شوق و مسرت "اہلاً و سہلاً" کہا اور مہمان خانے میں جگہ دی۔ شام کے وقت وہ اپنے میزبانوں کے ہاں بیٹھا تھا اور قہوے کا دور چل رہا تھا۔ دیر تک اس کے مستقبل پر غور ہوتا رہا۔ آخر خاندان کے بڑے بوڑھے نے کہا:

"عبداللہ، میرا گھر حاضر ہے۔ ہم تمھیں اپنے گھرانے کا ایک فرد سمجھیں گے۔ علم دین کی تحصیل ایک نیک مقصد ہے۔ ہمارے ہاں سال، دو سال جب تک چاہو رہو اور پورے اطمینان قلب کے ساتھ دین کی تعلیم حاصل کرو۔"

بصرہ ان دنوں ایک چھوٹا سا عرب قصبہ تھا۔ عراق پر ترک حکمرانی کرتے تھے۔ مغربی اثرات کے بہت کم نقوش دیکھنے میں آتے تھے۔ قصبے کی سڑکیں کچی تھیں اور بصرے سے باہر جانے والے راستے محض پگڈنڈیاں۔ بصرے کی زندگی ولیم سن کے لئے نہایت خوش آئند تھی۔ بسا اوقات

موجودہ زمانے میں غیر مسلموں تک اسلام کی آواز پہنچانے کے لئے سب سے عمدہ کتابیں وہ ہیں جو غیر مسلم ہمدردانِ اسلام یا نومسلموں نے لکھی ہیں۔ ان کتابوں میں جو سادگی اور تاثیر ہوتی ہے وہ مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتابوں میں نہیں ملتی۔ انھیں میں سے ایک کتاب کا واقعاتی خلاصہ یہاں پیش کیا گیا ہے۔ اس قسم کی کتابیں اور مضامین سیکڑوں کی تعداد میں چھپ چکے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کو جمع کیا جائے اور ان کی اصل اور ترجمہ اہتمام کے ساتھ چھاپ کر شائع کئے جائیں۔

کا مہمان ہونے کی وجہ سے اس کی شناسائی بصرے کے تمام اہم خاندانوں سے ہوگئی۔ وہ کبھی کبھار صحرا میں بدوؤں کے خیموں پر جاتا اور کئی کئی دن ان کے ساتھ رہتا۔ اب وہ عربی روانی سے بولنے لگا تھا اور بدوؤں کے عادات و خصائل اور رسوم و رواج سے خاصا واقف ہو چکا تھا۔ اونٹ کی سواری بھی اس نے سیکھ لی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ بات عام ہوگئی کہ بصرے میں عربوں کے ساتھ ایک گورا "سکونت پذیر ہے۔

ایک دن سہ پہر کے وقت برطانوی قونصل خانے سے ایک ترجمان آیا، خط میں برطانوی قونصل نے لکھا تھا: "میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ برطانوی رعایا ہونے کی حیثیت سے برطانوی قونصل خانے میں آکر اپنی آمد کی اطلاع دو۔"

عبداللہ ولیم سن نے اس کا جواب ہی نہ دیا۔ ترجمان سے زبانی صرف اتنا کہا: "اپنے آقا سے کہہ دو، میں نہیں آؤں گا۔" برطانوی قونصل خانے میں قدم رکھنے کے معنی برطانوی علاقہ میں داخل ہونے کے تھے۔

عبداللہ ولیم سن کا خیال تھا کہ معاملہ رفع دفع ہو چکا ہے اور وہ عربوں کے درمیان بالکل محفوظ ہے۔ لیکن برطانوی قونصل کے پاس ایک حربہ اور تھا۔ اگلے روز بصرہ کے ترک والی (گورنر) حمدی پاشا سے ملا۔ گورنر برطانیہ کے ساتھ جھگڑا مول لینے سے ہمیشہ احتراز کرتا تھا۔ [illegible] گورنر نے حکم دیا کہ خیریت چاہتے ہو تو اس گورے کو برطانوی قونصل کے حوالے کر دو۔ اس پر عرب بھی گرم ہو گئے۔ انھوں نے اپنا مہمان گورنر یا برطانوی قونصل کے حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا: "وہ ہمارا مہمان ہے، ہم

> سچائی کی یافت اس کے لئے
> زندگی کے تمام سوالات کا
> جواب بن گئی۔

اس کی حفاظت کریں گے، خواہ ہمیں قربان ہونا پڑے۔" یہ ان کا دو ٹوک جواب تھا۔ عبداللہ ولیم سن اپنے محسن میزبانوں کو کسی مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بصرے سے چلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ بصریوں نے اسے بڑے تاسف اور ملال کے ساتھ رخصت کیا۔ عبداللہ ایک عرب دوست کے پاس زبیر چلا گیا۔ وہاں سے اس نے شیخ یوسف ابراہیم کو ایک خط لکھا۔ شیخ نے اسے اپنے پاس کویت بلا لیا۔ عبداللہ بصرہ، زبیر اور کویت میں کوئی دو سال رہا۔ اس عرصے میں اس نے اپنا اکثر وقت عربی اور اسلامی تعلیمات سیکھنے میں گزارا۔ شیخ سردی اور بہار کا موسم صحرا میں گزارتا تھا۔ عبداللہ ولیم سن بھی اس کے ساتھ رہتا اور سیر و شکار میں حصہ لیتا۔ اس دوران میں صحرائی بدوؤں سے ملنے جلنے کے مواقع میسر آئے۔ ہر نیا دن اپنے دامن میں نئی دلچسپیوں اور معلومات کا سامان لے کر آتا۔ یہیں اس نے گھوڑے اور اونٹ پالنا اور شکروں سے شکار کرنا سیکھا۔ اب وہ ایک پختہ کار بدو بن چکا تھا۔

پو پھٹ رہی تھی۔ دور سے موذن کی آواز سنائی دی۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ نمازی [illegible] سے بیدار ہو گئے۔ عبداللہ ولیم سن نے حسب معمول نماز با جماعت ادا کی۔ اب صبح کی روشنی پھیلنے لگی۔ دور مسجد نبوی کے بلند مینار

نظر آرہے تھے۔ مدینۃ النبی اب چند فرلانگ دُور رہ گیا تھا۔ رات جب قافلے نے پڑاؤ ڈالا تھا، عبداللہ بن حسن پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ وہ قافلے کے ساتھ آٹھ سو میل کا سفر طے کرکے آیا تھا۔ دوسروں کی طرح وہ بھی اس طویل سفر سے، جس میں کئی مرتبہ انھیں لٹیرے بدوؤں سے جنگ کرنی پڑی تھی، سخت تھک چکا تھا مگر اس کا جی چاہتا تھا کہ قافلہ اپنا سفر جاری رکھے اور وہ اس مقدس شہر میں جلد سے جلد پہنچ جائے جو اسلام کا مرکز ہے اور جہاں اللہ کے آخری نبی استراحت فرما ہیں۔ وہ نبیِ آخر جن کی تعلیمات نے اس کے دل اور دماغ کی دنیا بدل ڈالی تھی، ان سے اسے رُوحانی اطمینان اور کردار کی پاکیزگی اور بلندی ملی تھی۔ مسلمان ہونے کے فوراً بعد وہ اس عظیم و مقدس اور تاریخ ساز شہر کی زیارت کرنا چاہتا تھا لیکن اسے کئی بار زبردستی روک دیا گیا تھا، پھر اس کے رستے میں نئی نئی رکاوٹیں کھڑی کی گئیں مگر وہ ان سب رکاوٹوں کو دور کرنے کے بعد اب اپنے مقدس شہر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کو پورا یقین تھا کہ وہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہے اور اب اس کی دنیا بھی سنور چکی ہے اور عاقبت بھی۔

وہ جب مدینۃ النبی میں داخل ہوا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ آج اس کے دل کی سب سے بڑی تمنا پوری ہو چکی تھی۔

(ماخوذ)

حروف پر نقطے کب لگائے گئے

کہا جاتا ہے کہ ایک بڑھیا فرزدق شاعر کے پاس آئی اور کہا: "میں تمھارے باپ کی قبر کی پناہ مانگتی ہوں" فرزدق نے پوچھا، تم کیا چاہتی ہو۔ اس نے بتایا کہ تمیم بن زید میرے بیٹے کو پکڑ لے گئے ہیں، اور اس کے سوا میری کوئی اولاد نہیں جو میرے لئے کمائی کرسکے۔ اس نے پوچھا تمھارے بیٹے کا نام کیا ہے۔ بڑھیا نے کہا "خنیس"۔ اس کے بعد فرزدق نے چند اشعار لکھ کر تمیم بن زید کے پاس بھیج دئے۔ آخری شعر یہ تھا:

وھب لی خنیسا واحتسب فیہ منۃ
لعبرۃ ام لا یسوغ شرابہا

اور خنیس کو مجھے دے دو اور اس کے معاملہ میں احسان کرکے اس کی ماں کے آنسو بند کرو جس کے لئے کھانا پینا بے مزہ ہو چکا ہے۔

اس زمانہ کے رواج کے مطابق الفاظ پر نقطے نہیں تھے۔ تمیم بن زید کو اشعار پہنچے تو اس نے بڑھیا کے بیٹے کو واپس کرنا چاہا مگر بے نقط "حنس" کے نام میں اس کو شک ہوگیا۔ اس نے اپنے قبیلہ کے تمام آدمیوں کے ناموں کو دیکھا تو ان میں خنیس، خنیش، جیش وغیرہ قسم کے چھ ملتے جلتے نام تھے۔ اس نے ان تمام لوگوں کو فرزدق کے پاس بھیج دیا۔

اس طرح کے واقعات نے لوگوں کو متوجہ کیا کہ وہ حروف کی شناخت کے لئے ان پر نقطے لگائیں۔ اس سلسلہ میں ابتدائی کام ابوالاسود دؤلی نے کیا۔ اس کے بعد حجاج کے حکم پر ابوالاسود کے دو شاگردوں نصر بن عاصم اور یحییٰ بن یعمر نے اس کو تکمیل تک پہنچایا۔

الرسالہ مارچ ۱۹۷۷ء

بائبل کی زبان سے

بائبل کی ۲۳ویں کتاب یسعیاہ بن آموس کے رویا اور نصیحتوں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے یہودیوں کو خدا کی گرفت سے ڈرایا تھا۔ "جنوب کے جانوروں کی بابت بار نبوت" کے تحت جو کچھ درج ہے اس کا ایک حصہ یہ ہے:

"یہ باغی لوگ اور جھوٹے فرزند ہیں جو خداوند کی شریعت کو سننے سے انکار کرتے ہیں۔ جو غیب بینوں سے کہتے ہیں غیب بینی نہ کرو اور نبیوں سے کہ ہم پر سچی نبوتیں ظاہر نہ کرو۔ ہم کو خوشگوار باتیں سناؤ اور ہم سے جھوٹی نبوت کرو۔ راہ سے باہر جاؤ۔ راستہ سے برگشتہ ہو اور اسرائیل کے قدوس کو ہمارے درمیان سے موقوف کرو"

۳۰: ۹-۱۱

اس کی ایک صورت خوشامد ہے جو چھوٹے لوگ بڑے لوگوں کو خوش کرنے کے لئے کیا کرتے ہیں۔ شاہ اسرائیل نے ارادہ کیا کہ وہ ناحق ارام کے اوپر حملہ کرے اور ان کے باغ اور زمینیں ان سے چھین لے۔ اس وقت اس کے دربار میں چار سو کی تعداد میں "جھوٹے نبی" موجود تھے۔ شاہ اسرائیل نے ان سے پوچھا: "میں رامات جلعاد سے لڑنے جاؤں یا باز رہوں" سب نے کہا: جا، کیوں کہ خداوند اسے بادشاہ کے قبضہ میں کر دے گا۔

اس وقت یہودیوں کا بادشاہ یہوسفط شاہ اسرائیل کے پاس تھا۔ اس نے یہوسفط سے کہا: کیا ان کو چھوڑ کر یہاں خداوند کا کوئی نبی نہیں ہے تاکہ ہم اس سے پوچھیں۔ شاہ اسرائیل نے یہوسفط سے کہا کہ ایک شخص املہ کا بیٹا میکایاہ ہے۔ جس کے ذریعہ ہم خداوند سے پوچھ سکتے ہیں، لیکن مجھے اس سے نفرت ہے۔ کیونکہ وہ میرے حق میں نیکی کی نہیں بلکہ بدی کی پیشین گوئی کرتا ہے۔ یہوسفط کے اصرار پر شاہ اسرائیل نے میکایاہ کو بلوایا۔ اس قاصد نے جو میکایاہ کو بلانے گیا تھا، اس سے کہا: دیکھ، سب نبی ایک زبان ہو کر بادشاہ کو خوش خبری دے رہے ہیں۔ سو ذرا تیری بات بھی ان کی بات کی طرح ہو اور تو خوش خبری ہی دینا۔ میکایاہ نے کہا، خداوند کی حیات کی قسم، جو کچھ خداوند مجھ سے فرمائے، میں وہی کہوں گا۔

میکایاہ جب شاہ اسرائیل کے پاس آیا اور اس نے پوچھا کہ ہم رامات جلعاد سے لڑنے جائیں یا رہنے دیں۔ میکایاہ نے نہ لڑنے کا مشورہ دیا اور لڑائی کی صورت میں شاہ اسرائیل کی شکست کی پیشین گوئی کی۔ اس نے مزید کہا کہ جن "نبیوں" نے تجھ کو فتح کی خوش خبری دی ہے، وہ جھوٹے ہیں ان کے منھ میں جھوٹ بولنے والی روح داخل ہو گئی ہے۔" تب شاہ اسرائیل نے یہوسفط سے کہا: کیا میں نے تجھ کو بتایا نہیں تھا کہ یہ میرے حق میں نیکی کی نہیں بلکہ بدی کی پیشین گوئی کرے گا۔

شاہ اسرائیل کے دربار میں میکایاہ کے گال پر مارا گیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ "اس شخص کو قید خانہ میں ڈال دو۔ اور اس کو مصیبت کی روٹی کھلانا اور مصیبت کا پانی پلانا جب تک میں سلامت نہ آؤں"۔ اس کے بعد شاہ اسرائیل نے شاہ یہوداہ یہوسفط کے ساتھ مل کر رامات جلعاد پر چڑھائی کی۔ مگر ان کو بدترین شکست ہوئی۔ شاہ اسرائیل زخمی ہو کر اپنے رتھ میں گر پڑا۔ خون اس کے زخم سے بہہ کر رتھ کے پائدان میں بھر گیا۔ بادشاہ مر گیا، کتوں نے اس کے خون کو چاٹا۔ (۱۔ سلاطین ۲۲: ۱-۳۸)



Dr Jonas Salk, the discoverer of polio vaccine, who gets the Nehru Award for the promotion of international understanding

آج کا انسان ایک نئی دنیا کا خواب دیکھ رہا ہے، ایک بہتر مستقبل جہاں اس کو وہ چیزیں مل سکیں جو مشینی تمدن میں اسے نہیں ملیں۔ اگرچہ اسے نہیں معلوم کہ یہ مستقبل دوسری دنیا میں سامنے آنے والا ہے نہ کہ موجودہ دنیا میں۔

امریکی عالم حیاتیات ڈاکٹر جونس سالک (JONAS SALK) ایک نہایت کامیاب ڈاکٹر تھے۔ ان کی پریکٹس خوب چل رہی تھی۔ اسی کے ساتھ وہ طبی تجربات بھی جاری کئے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے یہ بات آئی کہ اگر یکسو ہو کر کوشش کی جائے تو پولیو کا علاج دریافت کیا جا سکتا ہے۔

انھوں نے اپنی کامیاب پریکٹس چھوڑ کر تحقیق و تجربہ شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ پولیو ویکسین کے موجد بن گئے۔ ابتدائی قربانی ان کے لئے زیادہ بڑی کامیابی لے کر آئی ہے۔ اب انھوں نے امریکہ میں "سالک انسٹی ٹیوٹ آف بیالوجی" کے نام سے ایک ادارہ قائم کر لیا ہے۔ ان کا شمار ان ممتاز لوگوں میں ہونے لگا ہے جن کو عالمی مجالس میں اپنی بات کہنے کا موقع دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر سالک جنوری ۱۹۷۷ کے دوسرے ہفتہ میں ہندستان آئے تھے، یہاں ان کو آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس کی اعزازی فیلوشپ دی گئی۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۵ کا نہرو ایوارڈ (بین اقوامی مفاہمت) بھی دیا گیا۔ جو ایک بڑا اعزاز ہے۔

انھوں نے اپنے لکچر میں انسانیت کے سفر کی ایک پر امید تصویر پیش کی۔ انھوں نے کہا ہماری دنیا دور الف (EPOCH A) سے نکل کر دور ب (EPOCH B) میں داخل ہو رہی ہے۔ اب وہ زمانہ آنے والا ہے جب کہ انسان موت، بیماری اور نفرت سے آزاد ہوگا۔ وہ ایک نئی بہتر دنیا میں زندگی گزارے گا۔

یوگوسلاویہ میں اسلام

یورپ کا وہ ملک جس کو آج یوگوسلاویہ کہا جاتا ہے، ۱۹۲۹ء سے پہلے اس علاقہ کا نام بلقان تھا اور ترکی کی سلطنت عثمانی کا ایک حصہ تھا۔ یہاں اسلام آٹھویں صدی ہجری میں تاجروں کے ذریعہ پہنچا۔ ایک ترک سیاح اولیا چلبی جس نے گیارہویں صدی ہجری میں اس علاقہ کا سفر کیا تھا، اپنی کتاب (سیاحتنامہ) میں لکھتا ہے کہ جب وہ بلقان پہنچا تو وہاں کے شہر بلغراد میں ۲۱۷ مسجدیں، آٹھ درس گاہیں، نو دار الحدیث اور ۲۷ مدرسے عربی زبان سکھانے کے لئے قائم تھے۔ یوگوسلاویہ کا ایک شہر جس کا موجودہ نام سرایے فو (SARAJEVO) ہے۔ عثمانی سلطنت کے زمانہ میں اس کا نام سرائے بوسنہ تھا۔ صرف اس ایک شہر سے اتنے علماء و شعراء پیدا ہوئے کہ ان کے تذکرہ پر ایک مستقل کتاب لکھی گئی ہے، جس کا نام ہے:

"الجوہر الاسنیٰ فی تراجم علماء و شعراء بوسنہ"

نفح الطیب کے مصنف نے لکھا ہے کہ فاطمیین کے عہد میں یوگوسلاویہ کے بہت سے لوگ خلفاء کی خدمت میں رہتے تھے۔ مثال کے طور پر جعفر بن محمد المصحفی الصقالبی۔ جوہر الصقلی جو المعز لدین اللہ فاطمی کے یہاں بڑے عہدہ پر فائز تھا، کہا جاتا ہے کہ اسی نے شہر قاہرہ اور الازہر کی بنیاد رکھی تھی۔ مسعودی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ المستعین باللہ عباسی کی ماں جس کا نام مخارق تھا، ایک صقلبی (یوگوسلاوی) خاتون تھی۔ ایک یوگوسلاوی عالم حسن کافی الاقحصاری (۱۰۲۵ - ۱۹۵۱ء) کی تالیفات کی تعداد ۲۰ تک پہنچتی ہے۔ انھوں نے فقہ و اصول، عقائد و وعظ، بیان و بدیع، نحو و صرف، سیاست و اجتماع، تاریخ و منطق پر کتابیں لکھیں۔ ان کی ایک کتاب (اصول الحکم فی نظام العالم) جو اصلاً عربی میں ہے، اس کے ترجمے ترکی، فرانسیسی، جرمن اور انگریزی زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ آج بھی یوگوسلاویہ میں مسلمانوں کی معقول تعداد ہے اور ان کے متعدد رسالے یوگوسلاوی زبان میں شائع ہوتے ہیں، مثلاً

جلاسینک	ماہوار رسالہ
بریلوزی	سالانہ
الامل	ششماہی

ڈاکٹر کامل البہی (مراقب الشئون الدینیہ باذاعۃ قاہرہ) یوگوسلاویہ کے بارہ میں لکھتے ہیں:

ومن اشهرهو لاء مفتى الهرسك مصطفى يوسف المرستارى (١١٩١ — ١٢٦١هـ) وقد عين استاذا للعلوم العربية والدراسات الاسلامية بالقسطنطينية وقد عثرنا على سبعة وعشرين مخطوطا من مولفاته، ولكن اكثر مولفاته كانت فى ادب البحث والمناظرة - ولا يزال ضريحه يزار حتى الآن، ولا يزال العلماء اليوغسلاف يكتبون عنه ويترجمون له - ولا تزال الاساطير الشعبية تروى عن كراماته، حتى ان الكثيرين يعتقدون

ان الطفل الغبی اذا انہ ارضر یحیہ اربعین یوما بعد صلوٰۃ الصبح یصیر ذکیا و یزول غباوتہ

الوعی الاسلامی دکویت جمادی الآخر ۱۳۹۸ھ

ان میں سب سے مشہور ہرسک کے مفتی مصطفیٰ یوسف الموستاری (۱۱۱۹-۱۰۶۱ھ) تھے وہ قسطنطنیہ میں عربی اور اسلامی علوم کے استاذ مقرر ہوئے۔ ان کی تالیفات میں ۲۷ مخطوطات علم میں آچکی ہیں۔ ان میں سے اکثر کتابیں بحث و مناظرہ پر ہیں وہاں کی قبر اب تک زیارت گاہ بنی ہوئی ہے اور یوگوسلاویہ کے علما اب بھی اُن کے بارہ میں لکھتے ہیں اور اُن کے ترجمے شائع کرتے ہیں۔ اس علاقہ میں اُن کی کرامت کی بہت سی باتیں مشہور ہیں یہاں تک کہ بہت سے لوگ اعتقاد رکھتے ہیں کہ کند ذہن لڑکا اگر چالیس دن تک نماز فجر کے بعد ان کی قبر پر جائے تو وہ ذہین ہو جائے گا۔

الإسـلامية [illegible]دى

للكاتب الهندى وحيد الدين خان

بقلم : احمد بهجت

ان الرقي والاحترام . والسخاء وعظمة الاخلاق والقيم والمشاعر السامية . وكل ما يمكن اعتباره لمحات الهية . لا يمكن الحصول عليها عن طريق الالحاد . الالحاد . نوع من الانانية .. حيث يجلس الانسان على كرسى الله .

سوف تنتحر هذه الحضارة بدون العقيدة والدين
سوف يتحول النظام الى فوضى .
سوف ينعدم التوازن ، وضبط النفس ، والتمسك
سوف يتفشى الشر في كل مكان .
ان الحاجة ملحة لان نقوى من صلتنا وعلاقتنا بالله .

بهذه النبوءة التى كتبها رئيس اكاديمية نيويورك ، يختتم الكاتب الهندى وحيد الدين خان كتابه ((الاسلام يتحدى)) ، ولقد صدر الكتاب اول ما صدر باللغة الاردية ، ثم ترجم الى الانجليزية والعربية ، ترجمه الى العربية ظفر الاسلام خان ، وطبعت منه طبعتان خارج مصر فى الكويت ، ثم قدم المختار الاسلامى طبعته الثالثة للقراء المصريين .. ولقد قرأت الكتاب فى طبعته الاولى وتحركت لاختيار فصول منه ثم ردني الى الصمت احساس بأن هذا الكتاب ليس من نوع يحتمل فيه أن تقرأ عنه ، او تقرأ حوله ، سواء كان عرضا او نقدا او تلخيصا ،

ينتمى الكتاب الى نوع الكتب الجيدة التى يزيد ثراء المرء لو قرأها .. ويضيع عليه الكثير لو اكتفى بالقراءة عنها دون قراءتها .

مؤلف الكتاب هو ثالث ثلاثة من كتاب الهند وباكستان .. يحملون اليوم عبء الدعوة الاسلامية وينطلقون وسط تحديات العصر وتيارات الالحاد بأعلامهم وضمائرهم محاولين وقف زحف التيار الاسود واشعال شمعة لتبديد الظلام الفاجع .

الكتاب الثلاثة هم ابو الاعلى المودودى ، وابو الحسن الندوى ، ووحيد الدين خان .

نحن نعرف ان الاسلام يقوم على جناحين هما **العقل والوجدان ، او العلم والحلم ، او المعرفة والحب .** واذا كانت المؤلفات التى تدعو الى الله بايقاظ الوجدان واثارة الحب قليلة ، ومن امثلتها مؤلفات د. **عبد الحليم محمود** ، فان المؤلفات التى تدعو الى الله بالعلم اقل من القليلة .. ومن هذا النوع الثانى ينتمى كتاب وحيد الدين خان .. وليس هناك حصر لعدد المشكلات التى يواجهها الاسلام فى هذا العصر .. ومن هذه المشكلات ما هو علمى بالدرجة الاولى .

ومن المعروف ان العلم نسبى ، ومتغير ، ومتطور .. والله تعالى مطلق لا يدركه تغير ولا يحدث جلاله تطور ، فكيف ندعو بما هو نسبى الى ما هو مطلق .

ولقد كثير من الكتب فى هذا الفخ ، وكره كثير من رجال الاسلام والداعين منه ان يكون العلم هو آية الدلالة على الله .. ولنجح كتاب ((الاسلام يتحدى)) أن يتجاوز هذا الفخ ، انه لا يهتم بالعلم الذى يكتمل كل يوم ، جلال الكمال الالهى ذاته ..

ابدا .. انه لا يفعل شيئا من هذا ..

كل ما فى الامر انه يقر بالعلم اقرارا يجعل من العسير على الانسان يحترم عقله ان يؤمن ان الخلق قد جاء صدفة ، او ان الكون يمضى بغير تدبير من احد ..

وعندما كان علم الكلام هو كل جهد السابقين للبرهنة على وجود الله واثبات الرسالة .. وكان علم الكلام يستخدم الاقيسة المنطقية ، وهى اقيسة بليت لطول ما لاكتها الالسن ، واصبح التحدث بها داعية الى الملل منها فضلا عن صعوبة لغتها لشباب الاسلام ، الذى يعيش ظروفا تختلف عن ظروف الزمان القديم .. وتطالعه مقالات جدلية ماهرة ، ومناهج علمية تجريبية ، لم يعد العقل يقنع بدونها .. لقد تقدم الشك واستولى على كل الجبهات الامامية فى عقول الناس ، وسقطت كل القضايا القائمة على المسلمات المنطقية ، ولم يعد العقل الحديث يقبل التسليم منطقيا بأمر الا بعد مناقشته .. وصار علم الكلام غير قادر على اقناع ملحد حديث بخطئه ، وصارت الحاجة ماسة الى اسلوب جديد فى الفكر والاقناع يتفق مع عصرنا الذى ساده العلم ، **وساده فى نفس الوقت احساس الشرق بالهزيمة امام الغرب .**

لهذا السبب يقودك الكتاب فى رحلة خارج النفس وداخلها ...رحلة مع الذرات المادية ، ومع الافلاك والنجوم والسحب العلوية .. رحلة مع قوانين الرياضة والكيمياء .. رحلة يصعب بعدها عليك ان تصدق ان هذا الاحكام والاعجاز يمضى هكذا كيفما اتفق .. او يمضى طبقا لقوانين الصدفة ..

يقول الكتاب فى بابه ((صدفة ام عمليات حكيمة)) استطعنا معرفة عمر الكون بعد كشف العناصر المشعة ..

ولقد ثبت الاشعة انه قد مر الف واربعمائة مليون سنة على تجمد اقدم جبال فى الارض .. ويذهب البروفيسور سوليفان الى أن المعدل المعقول لعمر الارض هو ٢٠٠٠ مليون سنة = نتأمل الآن ، كيف تستطيع هذه المدة ان تنتج لنا ما نراه على الارض من حيوان او نبات ان المادة العادية - التى تخلو من الروح - تحتاج الى بلايين البلايين من السنين حتى يتسنى مجرد امكان لحدوث ((جزئى بروتينى)) فيها بالصدفة ، فكيف جاءت خلال الالفى مليون سنة وهى عمر الارض المقدر ، كيف جاءت مليون نوع من النبات ، وكيف انتشرت هذه الكمية الهائلة على سطح الارض ، وكيف جاء من خلال هذه الانواع كلها المخلوق الاعلى الذى نسميه الانسان .

تقوم نظرية النشوء والارتقاء على اساس تغيرات صدفية محضة . ولقد حسب الرياضى ((باتو)) هذه التغيرات وكانت نتيجة بحثه ان اكتمال تغير جديد فى جنس .. قد يستغرق مليونا من الاجيال . فلنفكر فى امر الكلب الذى يزعمون أنه جد الحصان الاعلى .. كم من المدة ، على قول الرياضى باتو ، سوف يستغرقها الكلب حتى يصبح حصانا .. يقول عالم الأحياء الامريكى ماولين بيو كريفو :

((ان الامكان الرياضى فى توفر العلل اللازمة للخلق ، عن طريق الصدفة ، فى نسبتها الصحيحة هو ما يقرب من لا شىء ..))

وبلغها الكا[illegible]
منهج لم يحد[illegible]
امام الفكر ا[illegible]
به الملحدون [illegible]
كأنه يسلم[illegible]
يحاولون ال[illegible]
تطالعهم لو [illegible]
والكتـــاب
حقيقة الذى [illegible]
له فى الاقناع
العقول والاف[illegible]
ونشهد أن الك[illegible]
وعلى بعث
[illegible]

عرب دنیا کے سب سے بڑے اخبار الاہرام نے کتاب الاسلام یتحدی پر مفصل تبصرہ شائع کیا ہے جس کا جز یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔ یہ تبصرہ مشہور مصری ادیب احمد بہجت کے قلم سے ہے۔

تبصرہ نگار لکھتے ہیں کہ "اسلام دو بازوؤں پر قائم ہوتا ہے۔ ایک عقل، دوسرے وجدان۔ وہ کتابیں جو کامیابی کے ساتھ وجدان کو بیدار کر کے خدا کی طرف لاتی ہوں، بہت کم ہیں۔ اس سے بھی کم وہ کتابیں ہیں جو اللہ کی طرف دعوت کو علمی اعتبار سے پیش کرنے میں کامیاب ہوئی ہوں ———— ہندی مصنف وحید الدین خاں کی کتاب (الاسلام یتحدی) دوسری قسم کی انھیں چند کتابوں سے تعلق رکھتی ہے۔

علم ایک اضافی چیز ہے، جب کہ خدا ایک مطلق ہستی ہے، پھر مطلق حقیقت کو اضافی زبان میں کس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ اس جال میں پھنس گئے اور بہت سی اسلامی شخصیتوں نے اسی نزاکت کی وجہ سے اس کو پسند نہیں کیا کہ خدا پر علمی استدلال قائم کیا جائے۔ مگر زیر تبصرہ کتاب اس جال میں پھنسے بغیر اس میدان میں کامیاب ہوئی ہے۔

مصنف کتاب نے اسلام کے مطالعہ کا ایک ایسا علمی انداز اختیار کیا ہے جو بالکل نیا اور انوکھا ہے۔ جدید مادی فکر کے مقابلہ میں دین کو وہ اسی طرز استدلال سے ثابت کرتے ہیں جس سے منکرین مذہب اپنے نظریات کو ثابت کرتے ہیں۔ گویا کہ وہ لوگوں کی عقل اور زبان کو ان سے مستعار لے رہے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ سے انھیں دکھا سکیں کہ اگر وہ اپنی عقل اور زبان کو صحیح طور پر استعمال کرتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ اصل نتیجہ اس کے برعکس نکل رہا ہے جو وہ اس سے نکالنا چاہتے ہیں۔

اسلام کے ظہور سے لے کر اب تک چودہ سو سالوں میں اسلام پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اگر تاریخ کو چھانا جائے اور اللہ کی طرف بلانے والی عمدہ کتابوں کو چھلنی سے چھان کر نکالا جائے تو کتاب الاسلام یتحدی بلاشک و شبہ ان میں سے ایک ہوگی۔ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مصنف کتاب کے عمل کو قبول فرمائے، ان کے دل کو نور سے، ان کی عقل کو معرفت سے اور ان کی روح کو رضا سے بھر دے اور ان کے قلم کو ایسی روشنائی عطا کرے جو لکھنے سے کبھی ختم نہ ہو۔"

الاہرام کے تبصرہ نگار نے لکھا ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ انگریزی زبان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ بدقسمتی سے یہ واقعہ کے مطابق نہیں۔ کتاب اپنے انگریزی ایڈیشن کے لیے ابھی کسی آنے والے دن کا انتظار کر رہی ہے!



علم کلام ● — ایک جائزہ

قرآن میں کہا گیا ہے کہ اللہ تدبیر امر کر رہا ہے اور تفصیل آیات بھی (رعد — ۲)۔ تدبیر امر سے مراد کائناتی انتظام ہے جس کے خارجی پہلوؤں کے علم کا نام سائنس ہے۔ تفصیل آیات سے مراد وحی ہے جس کا آخری اور مکمل متن قرآن کی صورت میں ہمارے پاس محفوظ ہے۔ علم کلام اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، یہ ہے کہ الہامی علم اور کائناتی علم کی وحدت کو سمجھا جائے، تا معلوم کائنات کو معلوم کائنات کی مدد سے قابل فہم بنایا جائے۔

اس حیثیت سے دیکھئے تو اسلامی علم کلام کا کوئی قدیم و جدید نہیں۔ یہ متکلمین اسلام کی ایک غلطی تھی جس نے علم کلام میں قدیم و جدید کی تقسیم پیدا کی۔ علم کلام حقیقۃً قرآنی عقلیات کو مرتب کرنے کا نام تھا۔ مگر عباسی دور کے متکلمین نے اس کو انسان کی وضع کردہ فلسفیانہ عقلیات پر ڈھالنے کے ہم معنی سمجھ لیا۔ یہی وہ غلطی ہے جس نے علم کلام میں قدیم و جدید کے تصورات پیدا کئے۔ کیونکہ فلسفیانہ عقلیات قیاسی ہونے کی وجہ سے تغیر پذیر تھیں، جب کہ قرآنی یا کائناتی عقلیات میں تغیر و تبدل کا کوئی سوال نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن کا طریق استدلال تمام تر کائناتی ہے۔ وہ محسوس واقعات کے ذریعہ غیر محسوس حقائق پر استدلال کرتا ہے۔ قرآنی علم کلام کی بنیاد زمین و آسمان کے ان قوانین پر ہے جو اٹل ہیں، جن میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس لئے قرآنی علم کلام بھی اٹل ہے، اس میں تبدیلی کا کوئی سوال نہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ قرآنی علم کلام بھی، قرآنی اعتقادیات کی طرح، غیر تغیر پذیر ہے۔ مگر جب علم کلام کو انسان کے پیدا کردہ علوم کی بنیاد پر مرتب کیا گیا تو فی الفور علم کلام میں قدیم و جدید کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ کیونکہ یہ علوم تمام تر قیاس کی بنیاد پر تھے، وہ کبھی یکساں نہیں رہ سکتے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں، اگر کلی طور پر نہیں تو ایک خاص حد تک، ہم اس پوزیشن میں ہو گئے ہیں کہ علم کلام کو اس کی قرآنی اور آفاقی شکل میں مرتب کر سکیں۔ قدیم زمانہ میں عالم افلاک اور علم افلاک دونوں الگ الگ چیزیں تھیں۔ عالم افلاک حقائق پر مبنی تھا اور علم افلاک قیاسات پر۔ آج یہ دونوں چیزیں ایک ہوتی جا رہی ہیں۔ یہی معاملہ قرآن کا ہے۔ قدیم زمانہ میں قرآن اور علم کلام دونوں الگ الگ تھے۔ قرآن آیات محکمات پر مبنی تھا اور علم کلام فلاسفہ کے قیاسات پر۔ آج علم انسانی کے ارتقا نے اس کو ممکن بنا دیا ہے کہ قرآن اور علم کلام دونوں کو ایک کیا جا سکے۔ اگر کوئی چیز ہے جس کو "علم کلام جدید" کہا جائے تو وہ یہی علم کلام ہے جس کو مرتب کیا جانا چاہئے، اگرچہ وہ ابھی تک مرتب نہیں کیا گیا ہے۔

یہاں میں مختصر طور پر چند کاموں کا ذکر کروں گا جو علم کلام کی جدید ترتیب و تدوین کے سلسلے میں ہم کو انجام دینا ہے۔

ا۔ سب سے پہلا کام قرآن کی بنیاد پر ایک نظریۂ علم کو مرتب کرنا ہے یعنی طریق استدلال کا علم۔ قدیم زمانہ میں قیاسی مفروضات و مسلمات پر استدلال قائم کیا جاتا تھا۔ تحقیق و تجربہ کے جدید طریقوں کے ظہور میں آنے کے ابتدائی زمانہ میں مشاہداتی استدلال پر زور دیا گیا۔ مگر آئن سٹائن کے بعد علم انسانی کا جو دور شروع ہوا ہے، اس میں زیادہ سے زیادہ یہ بات واضح ہوتی جا رہی ہے کہ حقیقت اپنی آخری صورت میں انسان کے لئے ناقابل مشاہدہ ہے۔ اب یہ بات تقریباً [illegible]

انسان کی محدود صلاحیتوں کی وجہ سے مشاہداتی استدلال اس کے لئے ممکن نہیں۔ ہم صرف اس پوزیشن میں ہیں کہ استنباطی استدلال قائم کرسکیں۔ ہم حقائق کو دیکھ نہیں سکتے، ہم صرف یہ کرسکتے ہیں کہ ظاہراشیاء پر غور کرکے یہ مستنبط کریں کہ یہاں فلاں چیز پائی جانی چاہئے۔

اب موجودہ زمانہ میں ایک نیا نظریۂ علم وجود میں آیا ہے جو حیرت انگیز طور پر قرآنی نظریۂ علم کے عین مطابق ہے۔ قرآن میں کہا گیا تھا کہ انسان کو علم قلیل (بنی اسرائیل ـ ۸۵) دیا گیا ہے۔ اس لئے اس کو بالواسطہ علم پر قناعت کرنی چاہئے نہ کہ وہ براہ راست علم کے لئے اصرار کرنے لگے۔ اس طرح وحی اور علم انسانی دونوں ایک نقطہ پر پہنچ گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید نظریہ علم نے قرآنی طرز استدلال کو، جدید اصطلاح میں، عین سائنٹفک استدلال کا درجہ دے دیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں علم کلام کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اس اہم ترین دریافت کو مدوّن کرے۔

۲۔ دوسرا کام قرآنی علم الآثار کی تدوین ہے۔ قرآن میں پچھلے انبیاء اور گزری ہوئی تہذیبوں کا ذکر ہے۔ یہ قرآن کا وہ حصہ ہے جس کو ایام اللہ (ابراہیم ـ ۵) کہا گیا ہے۔ تاریخ انسانی کے یہ واقعات قرآن کے نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہیں۔ وہ ثابت کرتے ہیں کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ وہ ہر دور میں اپنے نمائندے بھیجتا ہے اور اپنے اٹل قوانین کی بنیاد پر قوموں کی قسمت کا فیصلہ کرتا ہے۔

یہ اگرچہ تاریخ کا مضمون ہے۔ مگر قرآن میں اس کا ذکر معروف تاریخی انداز میں نہیں ہے، بلکہ دعوتی اور اجمالی انداز میں ہے۔ ان واقعات کے بارے میں قرآن سے باہر جو ریکارڈ ہے، وہ قدیم زمانے میں بڑی حد تک لامعلوم تھا۔ اس لئے قدیم زمانے میں قرآن کے ان اجزاء کی تدوین، خالص تاریخی انداز میں، ممکن نہ تھی۔ اب ان واقعات سے متعلق بے شمار دبے ہوئے ریکارڈ دریافت ہو گئے ہیں۔ اس طرح اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ایام اللہ کے بارے میں قرآنی حوالوں کو منضبط کیا جائے، قرآن کی دعوت کو تاریخ کی زبان میں مدوّن کر دیا جائے۔

۳۔ تیسرا کام آیات آفاق (حٰم سجدہ ـ ۵۳) کو جدید دریافتوں کی مدد سے ترتیب دینا ہے۔ قرآن کے مطابق کائنات میں بے شمار نشانیاں ہیں جو اپنے خالق کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اور اس حکمت کو بتاتی ہیں جس کے تحت یہ کارخانہ بنایا گیا ہے۔ قرآن میں بار بار ان نشانیوں کے حوالے دیئے گئے ہیں اور ان سے قرآن کی دعوت کو مدلل کیا گیا ہے۔ تاہم یہ حوالے اشاراتی زبان میں ہیں۔ قدیم زمانہ میں ایسی معلومات حاصل نہ تھیں جن سے ان اشارات کو تفصیلی انداز میں سمجھا جا سکے۔ اب سائنس کے ارتقاء نے یہ مواد، بڑی حد تک، جمع کر دیا ہے۔ شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہو کہ سائنس موجودہ زمانہ میں اسلام کی تھیالوجی بن چکی ہے۔ تاہم اس کو مدوّن کرنے کا کام ابھی باقی ہے۔ ضرورت ہے کہ خدا کی یہ نشانیاں جو طبیعی دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں، جدید دریافتوں کی مدد سے ان کو مفصل شکل میں مرتب کیا جائے۔

۴۔ قرآن کے استدلالی حصہ کا ایک پہلو وہ ہے جس کو آیات انفس (حٰم سجدہ ـ ۵۳) کہا گیا ہے یعنی نفس انسانی کے اندر خدا کی نشانیاں۔ یہ حصہ بھی قدیم زمانہ میں بڑی حد تک مخفی تھا۔ صوفیاء نے اس پہلو سے بہت کچھ لکھا ہے مگر وہ علمی حقائق سے زیادہ قیاسات پر مبنی ہے اس لئے اس کا بڑا حصہ موجودہ زمانے میں بے قیمت ہو چکا ہے۔ تاہم علم النفس کی [illegible]

نے موجودہ زمانے میں بہت سی ایسی معلومات فراہم کر دی ہیں، جن کی روشنی میں قرآن کے اشارات کو، اگر پوری طرح نہیں تو بڑی حد تک، مفصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام اگر علمی سطح پر ہو جائے تو وہ قرآنی نظریات کے حق میں ایک عظیم نفسیاتی تصدیق ثابت ہوگا۔

۵۔ ایک اور میدان سماجی علوم کا ہے یعنی قانون، سیاست، اقتصادیات، وغیرہ۔ ان موضوعات پر موجودہ زمانہ میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ یہ ذخیرہ بعض پہلوؤں سے مفید بھی ہے۔ مگر اصولاً میں اس کے حق میں نہیں ہوں کہ سماجی موضوعات کو علم کلام میں داخل کیا جائے۔ اس کی وجہ سماجی علوم کی نوعیت ہے۔ سماجی علوم تمام کے تمام قیاسی علوم ہیں اور اغلباً وہ ہمیشہ قیاسی رہیں گے۔ اگر ہم علم کلام میں ان کو استعمال کریں تو دوبارہ نئی شکل میں ہم وہی غلطی کریں گے جو عباسی دور کے متکلمین نے کی تھی۔ انھوں نے فلسفیانہ قیاسات پر علم کلام کی بنیاد رکھ دی۔ ہم سماجی قیاسات پر علم کلام کو مرتب کر ڈالیں گے۔ اس لئے ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ سماجی علوم کو فقہ کا موضوع رہنا چاہئے نہ کہ علم کلام کا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ سماجیات کو فقہی نظام کی حیثیت سے مرتب کیا جائے نہ یہ کہ ان پر عقلیات اسلام کی بنیاد رکھی جائے۔

۶۔ آخر میں میں ایک ایسے علمی کام کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو رواجاً علم کلام میں شمار نہیں کیا جاتا۔ حالاں کہ مقاصد کے اعتبار سے اس کو علم کلام کا سب سے بڑا جزو ہونا چاہئے۔ یہ ہے سائنٹفک انداز میں اسلام پر تعارفی لٹریچر تیار کرنا۔ موجودہ زمانہ میں اسلام پہ بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر تقریباً تمام کتابوں پر کسی نہ کسی طرح، کلامی انداز غالب رہا ہے۔ تفسیر، سیرت، عام اسلامی لٹریچر کا جو ذخیرہ موجودہ زمانہ میں تیار ہوا ہے، تقریباً سب کا سب، علم کلام کے خانہ میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ ان کتابوں کی علمی قدر و قیمت کیا ہے، خود یہ بات عصری تقاضے کے خلاف ہے کہ تفسیر اور سیرت کو علم کلام بنا دیا جائے۔

موجودہ زمانہ آزادیٔ فکر کا زمانہ ہے۔ آج کا انسان یہ چاہتا ہے کہ اصل بات، کسی تعبیری یا کلامی اضافہ کے بغیر، اس کے سامنے رکھ دی جائے۔ اور جانچنے پرکھنے کا معاملہ خود قاری کے اوپر چھوڑ دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ کتابوں کے ہجوم کے باوجود ساری دنیا میں نئی اسلامی کتابوں کی مانگ ہے۔ آج کا انسان اسلام کو سمجھنا چاہتا ہے۔ مگر ایسی کتابوں کے ذریعہ جن میں اسلام کو اس اسلوب میں پیش کیا گیا ہو جس کو موجودہ زمانہ میں سائنٹفک اسلوب کہا جاتا ہے۔ آج کا انسان عقلیاتی اسلوب سے زیادہ سائنٹفک اسلوب کا دلدادہ ہے۔ مگر بدقسمتی سے کسی بھی اسلامی زبان میں اب تک سائنٹفک اسلوب رواج نہ پا سکا۔ سائنٹفک اسلوب سے مراد معروف کلامی اسلوب نہیں ہے، بلکہ ایسا سادہ اور مثبت اسلوب ہے جس میں زبان و بیان دونوں اعتبار سے حقیقت نگاری کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔

موجودہ زمانہ میں ہمارے لکھنے والوں نے بے شمار کتابیں اسلام پر لکھی ہیں۔ مگر میرے علم کی حد تک کسی بھی زبان میں کوئی ایسا تعارفی سٹ تیار نہیں ہوا ہے جس میں سادہ، مثبت اور حقیقت پسندانہ انداز میں اسلام کی تعلیمات اور پیغمبر اسلام کی سیرت کو مرتب کیا گیا ہو، حالاں کہ آج سب سے زیادہ ضرورت اسی قسم کی کتابوں کی ہے۔ میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ اگر ہم کچھ اور نہ کریں، صرف اتنا کریں کہ تعلیمات قرآن، سیرت، حدیث، حالات صحابہ اور تاریخ اسلام (نہ کہ تاریخ فتوحات)

پر خالص علمی اسلوب اور حقیقت نگاری کی زبان میں کتابوں کا ایک سٹ تیار کر دیں اور اس کو تمام زبانوں میں چھاپ دیں تو ہم علم کلام کے مقصد کو، کم از کم آج کی دنیا میں، زیادہ بہتر طور پر حاصل کر سکیں گے ✱

نوٹ: دسمبر ۱۹۷۶ کے آخری ہفتہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے زیر اہتمام ایک سمینار ہوا ——— عنوان تھا: "فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ"۔ اس موقع پر ۲۷ دسمبر کی نشست میں یہ مقالہ پڑھا گیا۔

قدیم علم کلام کی ایک غلطی یہ تھی کہ وہ انسانی عقل کی اس حد بندی کو سمجھ نہ سکا کہ وہ اشیاء پر صرف ظاہری اور اجمالی دلیل قائم کر سکتی ہے، وہ اس کی حقیقی ماہیت کو متعین نہیں کر سکتی۔ مثال کے طور پر قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ سمیع و بصیر ہے۔ صحابہ نے اس کے اجمالی مفہوم کے ساتھ اس پر یقین کر لیا۔ مگر متکلمین نے یہ بحث شروع کر دی کہ خدا کی یہ صفتیں عین ذات ہیں یا خارج از ذات۔ اسی طرح قرآن میں یداللہ کے الفاظ آئے ہیں۔ اب یہ بحث چھیڑ دی گئی کہ جس ید کو اللہ نے اپنی طرف مضاف کیا ہے اس کا استعمال قرآن میں مجازی معنوں میں ہے یا حقیقی معنوں میں۔

قرآن و حدیث میں اس قسم کے خوض سے صراحۃً منع کر دیا گیا تھا۔ مگر یہ لوگ عقلی تلاش کے جوش میں اس حد بندی کو بھول گئے اور بالکل غیر ضروری طور پر ایسے مسائل کو علم کلام کا موضوع بنا دیا جن کا علم کلام سے کوئی تعلق نہ تھا۔

وقت کے علوم کے ماہر ہونے کی وجہ سے چونکہ یہ لوگ حکومتوں میں دخیل تھے، انھوں نے مزید یہ کیا کہ اپنے مخالفین کی دارو گیر شروع کر دی۔ خلق قرآن کا مسئلہ اسی کی ایک مثال ہے۔ قرآن میں ہے کہ خدا نے نبیوں سے کلام کیا اور انسان پر اپنا حکم اتارا۔ اب متکلمین نے یہ بحث چھیڑ دی کہ خدا کا کلام حادث ہے یا قدیم (یعنی فنا ہو جانے والا ہے یا غیر فنا پذیر) انھوں نے کہا۔ اگر کلام اللہ کو قدیم (غیر فنا پذیر) مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ صرف خدا ہی قدیم (غیر فنا پذیر) نہیں ہے بلکہ ایک اور چیز (قرآن) بھی قدیم ہے۔ اس طرح دو قدیم لازم آجائیں گے۔ اس طرح کی بحثوں سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ خدا کا کلام مخلوق اور حادث (فنا پذیر) ہے۔ وہ پہلے نہیں تھا، پھر خدا اس کو وجود میں لایا اور اپنے نبیوں پر وقتاً فوقتاً نازل کیا۔

اس بے معنی موشگافی کو انھوں نے کفر و اسلام کا مسئلہ بنا دیا اور اس کو یہ حیثیت دے دی گویا کہ وہ "قابل دست اندازی پولیس" جرم ہے۔ معتزلہ کے برپا کیے ہوئے اس فتنہ نے سارے عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ خلفاء (مامون، واثق اور معتصم) کے دور تک بے شمار مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ خلیفہ متوکل نے اپنے زمانہ میں اس کو ختم کیا۔

سبعہ معلقہ

حماد الراویہ (۱۵۵ھ - ۹۰ھ) نے سبعہ معلقہ کے نام سے جو کتاب ترتیب دی ہے، اس میں سات عربی قصائد ہیں مگر معلقات کی تعداد کے بارے میں علما کا اختلاف ہے۔ بعض لوگوں نے دس تک تعداد شمار کی ہے۔ ان کے مصنفین کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ امرؤ القیس	قبیلہ کندہ (قحطان)
۲۔ زہیر بن ابی سلمیٰ	قیس
۳۔ لبید بن ربیعہ	"
۴۔ عنترہ بن شداد	"
۵۔ عمرو بن کلثوم	بنو ربیعہ
۶۔ طرفہ بن العبد	"
۷۔ حارث بن حلزہ	"

معلقات کے بارہ میں مشہور ہے کہ یہ کتان کے کپڑے پر سونے کے پانی سے لکھے گئے اور کعبہ پر لٹکائے گئے تھے۔ اسی لئے ان کو "مذہبات" بھی کہتے ہیں۔ یہ عربوں کے انتہائی منتخب اور پسندیدہ اشعار تھے اور ان کی مقبولیت کی علامت کے طور پر ان کو لٹکایا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں سے بعض فتح مکہ کے دن تک وہاں لٹکے ہوئے تھے اور کچھ اس آگ میں جل گئے جو اسلام سے پہلے خانۂ کعبہ میں لگی تھی۔

کچھ دوسرے محققین کی رائے اس سے مختلف ہے۔ علامہ انباری نے لکھا ہے: "سبعہ معلقہ کی بابت جو یہ مشہور ہے کہ یہ اشعار کعبہ کے پردہ پر لٹکائے گئے تھے، اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔" ابوجعفر نحاس (م ۳۳۸ھ) نے معلقات کی شرح میں لکھا ہے: "یہ کہنا کہ یہ قصائد کعبہ میں آویزاں کئے گئے تھے، روایتہً کوئی سند نہیں رکھتا۔" پروفیسر نولدیکی نے اس موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی ہے جس میں اس خیال کو ترجیح دی ہے کہ معلقات کے معنی منتخبات یعنی پسندیدہ اور چنے ہوئے قصائد کے ہیں (علق جمع اعلاق: کسی چیز کا نفیس، یعنی اعلاق الشعر یا نفائس الشعر) نولدیکی کے نزدیک یہ نام ان قصائد کو گلے میں لٹکے ہوئے ہاروں سے تشبیہ دیتے ہوئے رکھا گیا ہے۔ مزید تقویت کے لئے اس نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ ان قصائد کو "سموط" بھی کہتے ہیں جس کے معنی بھی ہاروں کے ہیں۔ فرانسیسی مستشرق پروفیسر کلے مین ہیار جس نے تاریخ ادب عربی پر فرانسیسی زبان میں کتاب لکھی ہے وہ نولدیکی کی رائے سے متفق ہے۔

ایک اور محقق لکھتے ہیں، تعلق کے معنی آتے ہیں دل کا مائل ہونا۔ اغلب یہ ہے کہ معلقات کو اسی لغوی مفہوم میں معلقات کہا گیا۔ اس لفظ سے وہ اس لئے موسوم کئے گئے کہ انھوں نے لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف مائل کر لیا تھا۔ لانہا علقت بالقلوب اکثر من غیرھا:

نقل جاء الاسلام (و) المعلقات مشہورۃ محفوظۃ مرویۃ ولکن لم ینقل لنا احد ممن یوثق بہ خبرًا انہ راٰہا معلقۃ علی استار الکعبۃ

اسلام آیا تو معلقات مشہور اور محفوظ تھے اور

لوگ ان کو پڑھتے تھے مگر کسی قابل اعتماد شخص نے یہ نہیں کہا کہ اس نے کسی معلقہ کو کعبہ کے پردوں پر لٹکا ہوا دیکھا تھا۔ (الا وحدۃ، قطر، ذو القعدہ ۱۳۹۵ھ)

عرب جاہلیت کا جو کلام ہم تک پہنچا ہے ان میں سب سے زیادہ قابل اعتماد یہی معلقات سبعہ ہیں۔ تاہم موجودہ زمانہ میں کچھ محققین نے کلام جاہلیت کے پورے ذخیرہ کی تاریخی حیثیت پر شک کا اظہار کیا ہے حتیٰ کہ معلقات پر بھی۔ ڈاکٹر طہٰ حسین مصری لکھتے ہیں:

عرب قوم آپس میں کینہ رکھنے والی اور ایک دوسرے سے دور رہنے والی قوم تھی۔ ان میں باہمی ربط کے ایسے ذرائع نہیں پائے جاتے جن سے لہجوں کے ایک ہو جانے کا امکان پیدا ہو جاتا۔ یقینی طور پر معقول بات یہی ہے کہ ان عدنانی قبیلوں میں سے ہر قبیلہ کی اپنی زبان اپنا لہجہ ہو۔ مگر ایسی کوئی بات جاہلی اشعار میں نظر نہیں آتی۔ آپ ساتوں معلقات پڑھ سکتے ہیں، اس طرح کہ آپ کو محسوس بھی نہ ہوگا کہ ان کے درمیان زبان کا کوئی اختلاف ہے۔

ساتوں معلقات کی بحر، قافیہ سب ایک جیسے ہیں۔ الفاظ کا استعمال انھیں معنوں میں ہے جن معنوں میں دور اسلام کے بعد مسلمان شعراء کے یہاں پایا جاتا ہے۔

اب ہم دو نظریوں کے درمیان ہیں۔ یا تو ہم اس بات کو مان لیں کہ عدنان اور قحطان کے عربی قبائل کے درمیان زبان لہجہ اور طرز کلام میں کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا۔ یا پھر ہم کو اعتراف کرنا چاہئے کہ یہ اشعار ان قبیلوں سے ایام جاہلیت میں نہیں نکلے ہیں بلکہ عہد اسلام کے بعد ان قبیلوں کے شعراء کی طرف منسوب کر دئے گئے ہیں۔ پہلے کی نسبت ہم دوسرے نظریہ کی طرف زیادہ رجحان رکھتے ہیں کیونکہ عدنان اور قحطان کے درمیان زبان اور لہجہ کا اختلاف خود قدماء تک نے تسلیم کیا ہے۔ جدید تحقیق سے بھی ثابت ہوا ہے کہ لغت حمیر (عرب عاربہ) اور لغت عدنان (عرب مستعربہ) کی زبانوں کے درمیان سخت اختلاف تھا۔ ابو عمرو بن العلاء سے منقول ہے کہ وہ کہا کرتا تھا:

حمیر کی زبان ہماری زبان نہیں ہے اور ان کا لہجہ ہمارا لہجہ نہیں ہے۔ (الادب الجاہلی)

تاہم یہ نقطۂ نظر ابھی تک انفرادی ہے۔ کیونکہ عربی ادب کے مورخین کی اکثریت نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے۔

خاموش آوازوں کو سنئے

بعض روایات میں آتا ہے:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طویل الصمت متواصل الاحزان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت دیر تک خاموش رہتے اور مسلسل غم کی حالت میں نظر آتے تھے۔

امام عبداللہ شعرانی کا مقولہ ہے: من لم ینفعہ سکوتنا لم ینفعہ کلامنا (جس شخص کو ہماری خاموشی سے فائدہ نہیں ہوگا اس کو ہماری باتوں سے بھی فائدہ نہیں ہوگا) مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کے ایک مرید بیان کرتے ہیں کہ ایک دن مولانا موصوف مجلس میں آئے مگر بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ دیر تک اسی حال میں رہے پھر حاضرین مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: آپ لوگ یہ سمجھیں کہ میں خود کچھ بیان کروں گا یہاں تک کہ آپ لوگ اٹھ کر چلے جائیں تو گویا آپ نے بغیر کچھ سنے منفعت لے لی کچھ نہ ملا [illegible]

عورت کا مرتبہ اسلام میں

"جو لوگ سونا چاندی جمع کرکے رکھتے ہیں اور ان کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انھیں سخت عذاب کی خوش خبری دے دو۔" (توبہ ۳۴) قرآن کی یہ آیت اتری تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تبا للذھب تبا للفضة (برا ہو سونے کا اور برا ہو چاندی کا) یہ بات جب آپ کے اصحاب کو معلوم ہوئی تو وہ تشویش میں پڑ گئے۔ انھوں نے آپس میں کہا: فای مال نتخذ (اب ہم کون سا مال جمع کریں) حضرت عمر اس وقت وہاں موجود تھے۔ انھوں نے کہا، اگر تم لوگ پسند کرو تو میں اس کی بابت رسول اللہؐ سے سوال کروں۔ لوگوں نے کہا ہاں۔ چنانچہ وہ آپؐ کے پاس گئے اور کہا کہ آپ کے اصحاب کہہ رہے ہیں کہ کاش ہم جانتے کہ کونسا مال بہتر ہے تو ہم اسی کو جمع کرتے۔ آپ نے فرمایا: لیتخذ احدکم لسانا ذاکرا وقلبا شاکرا وزوجة مومنة تعین احدکم علی ایمانہ (تفسیر ابن کثیر، جلد ۲، صفحہ ۳۵۱) تم میں سے ہر ایک یہ کرے کہ یاد کرنے والی زبان اور شکر کرنے والا دل اپنائے اور ایسی بیوی اختیار کرے جو اس کے ایمان پر اس کی مدد کرے۔

ایک اور روایت میں ایمان کے بجائے آخرت کا لفظ ہے۔ یہاں ہم چند مثالیں نقل کریں گے جس سے مسلم معاشرہ میں عورت کے کردار کا اندازہ ہوگا۔

۱۔ حضرت ام سلمہ ایک بار کسی عورت سے اپنے بال گندھوا رہی تھیں۔ اتنے میں مسجد سے خطبہ کی آواز آئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: ایہا الناس (اے لوگو) یہ سنتے ہی فرمایا۔ بس جیسے ہیں ویسے ہی باندھ دو، عورت نے کہا اتنی جلدی کیا ہے، ابھی تو آپ نے ایہا الناس کہا ہے۔ انھوں نے کہا 'خوب' کیا ہمارا شمار آدمیوں میں نہیں؟ یہ کہہ کر خود ہی بال باندھ کر کھڑی ہو گئیں اور قریب ہو کر خطبہ سننے لگیں۔ (طبقات ابن سعد) حضرت ام سلمہؓ کی مرویات کی تعداد ۳۷۸ ہے۔ وہ فتویٰ بھی دیا کرتی تھیں۔ ابن قیم نے لکھا ہے کہ اگر ان کے فتوے جمع کئے جائیں تو ایک رسالہ تیار ہو جائے گا۔

رسول اللہ کی ازواج میں حضرت عائشہؓ سب سے زیادہ ذہین تھیں۔ ان کی مرویات کی تعداد ۲۲۱۰ تک شمار کی گئی ہے۔ ان سے تقریباً ایک سو صحابہ و تابعین نے روایت کیا ہے۔ عروہ بن زبیر، سعید بن مسیب، عبد اللہ بن عامر، مسروق بن اجدع، عکرمہ اور علقمہ جیسے لوگ آپ کے شاگردوں میں شامل ہیں۔ حضرت عائشہ ایک اعلیٰ درجہ کی فقیہ خاتون تھیں۔ جب کوئی حدیث بیان کرتیں تو اس کی علت و حکمت بھی بیان کر دیتیں۔ حضرت ابو سعید اور حضرت عبد اللہ بن عمر سے جمعہ کے غسل کے بارے میں صرف اس قدر مروی ہے کہ جمعہ کے دن غسل کرنا چاہئے۔ مگر اسی حدیث کو حضرت عائشہ نے بیان کیا تو یہ بھی فرمایا کہ لوگ دور دور کی آبادیوں سے نماز جمعہ کے لئے مدینہ آتے تھے۔ وہ گرد و غبار سے اٹے ہوتے اور پسینہ سے تر ہوتے، اس لئے

آپ نے فرمایا کہ تم لوگ نہالیا کرو۔

۲۔ بنی غفار کی ایک عورت کہتی ہیں کہ میں اپنے قبیلہ کی کچھ عورتوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی۔ آپ خیبر کے جہاد کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ ہم نے عرض کیا: اے خدا کے رسول! ہم چاہتے ہیں کہ ہم بھی اس سفر میں آپ کے ساتھ چلیں، تاکہ زخمیوں کی مرہم پٹی کریں اور جہاں تک ہو سکے مسلمانوں کی مدد کریں۔ آپ نے فرمایا: علیٰ برکۃ اللہ (اللہ برکت دے، چلو) انصاری خاتون ام عطیہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سات غزووں میں شرکت کی ہے۔ میں مجاہدین کے کجاووں کی دیکھ بھال کے لئے پیچھے رہتی، ان کے لئے کھانا پکاتی، زخمیوں کا علاج کرتی، اور مصیبت زدوں کی نگرانی کرتی۔ اسماء بنت یزید بن سکن حضرت معاذ بن جبل کے چچا کی بیٹی تھیں۔ ان کی بابت حضرت مہاجر بتلاتے ہیں کہ انھوں نے جنگ یرموک میں خیمہ کی لکڑی سے نو رومیوں کو قتل کیا۔

۳۔ مدینہ کے یہودیوں سے جنگ کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ عورتوں اور بچوں کو ایک قلعہ کی چھت پر جمع کر کے حسان بن ثابتؓ کو ان کی دیکھ بھال کے لئے وہاں رکھا گیا تھا۔ صفیہ بنت عبد المطلب بھی اسی قلعہ کی چھت پر تھیں۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ ہمارے قریب سے ایک یہودی گزرا اور ہمارے قلعے کے چکر لگانے لگا۔ اس وقت بنی قریظہ نے جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ اس وجہ سے ہمارے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان راستہ کٹ گیا تھا اور وہاں کوئی نہیں تھا جو یہود کے مقابلہ میں ہماری مدافعت کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمان دشمن کے مقابلہ پر تھے، وہ ان کو چھوڑ کر ہماری طرف نہیں آسکتے تھے۔ اتنے میں کہ وہ یہودی سامنے سے گزرا۔ میں نے کہا اے حسان! دیکھو یہ یہودی ہمارے قلعہ کا چکر لگا رہا ہے اور میں خدا کی قسم اس سے مامون نہیں۔ کہیں وہ ہماری اس غیر محفوظ حالت کو یہودیوں سے جا کر کہہ نہ دے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب جنگ میں مشغول ہیں۔ پس اترو اور اس کو جا کر قتل کر دو۔ حسان بن ثابت نے کہا: واللہ لقد عرفت ما انا بصاحب ھٰذا (خدا کی قسم تم کو معلوم ہے کہ میں اس کام کا نہیں) وہ کہتی ہیں کہ جب انھوں نے مجھ کو یہ جواب دیا اور میں نے اُن کے پاس مارنے کی کوئی چیز بھی نہ دیکھی تو میں نے کمر سے کپڑا کسا اور ایک لکڑی ہاتھ میں لی۔ پھر قلعہ سے اُتر کر اس کے پاس پہنچی اور اس لکڑی سے اس کو مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ میں نے اس کو ہلاک کر دیا۔ پھر جب میں اس سے فارغ ہو گئی تو میں قلعہ میں واپس آئی اور حسان بن ثابت سے کہا کہ قلعہ سے اُتر کر جاؤ اور اس کا سامان لاؤ۔ میں صرف اس لئے اس کا سامان اتارنے سے رک گئی کہ وہ مرد تھا، حسان بن ثابتؓ نے کہا: اے عبد المطلب کی بیٹی! مجھے اس کے سامان کی ضرورت نہیں۔ (البدایہ والنہایہ، جلد ۴ صفحہ ۱۰۸)

بولنا ضروری نہیں

عربی کا ایک مقولہ ہے: رب کلمۃ تقول لصاحبہا دعنی (بعض باتیں اپنے بولنے والے سے کہتی ہیں کہ مجھے چھوڑ دو) یعنی بعض اوقات آدمی ایسی باتیں کہنے لگتا ہے جو کہنے کی نہیں ہوتیں۔ جو اس قدر بے معنی ہوتی ہیں کہ گویا خود ہی چیخ رہی ہوتی ہیں کہ ایسی بات بولنے سے بہتر یہ کہ تو چپ رہے۔

فخر الدین علی احمد
صدر جمہوریہ

اس کام کے لئے اس ملک کو بہترین تجربہ گاہ جانئے

دسمبر ۱۹۷۶ء کے آخری ہفتہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ایک سیمینار ہوا جس کا عنوان تھا: فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ" اس سیمینار کا افتتاح صدر جمہوریہ ہند شری فخر الدین علی احمد نے کیا۔ موصوف کے افتتاحی خطبہ کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"قرآن ایک باضابطہ قانون کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی تعلیم مکمل ہے ہر ملک کے لئے، ہر قوم کے لئے، ہر فرد کے لئے اور ہر زمانے کے لئے، دراصل ہماری تعلیم نامکمل ہے، اگر ہم کسی شک وشبہ میں پڑ جاتے ہیں تو وہ ہمارے ذہن کی کمزوری ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اب ہم آزاد ملک کے شہری ہیں۔ اضطراب اور مایوسی کا دور گزر چکا ہے۔ آج ملک بھر میں نئی تعمیر کا جو ولولہ پایا جاتا ہے وہ مسلمانوں کے دلوں کو بھی گرما رہا ہے۔ انھیں اس عظیم ملک کے برابر کے شہری ہونے کی حیثیت سے اس اہمیت کا احساس ہے جو ترقی پذیر ممالک کے درمیان اسے حاصل ہے۔ لازم ہے کہ یہ احساس نئی امنگوں کو جنم دے اور وہ بھی جرأت و حوصلہ کے ساتھ ملک اور انسانیت کی تعمیر نو میں حصہ لینے پر کمربستہ ہو جائیں اس کے لئے انھیں فکر اسلامی سے حیات تازہ حاصل کرنی ہوگی۔ انھیں انفرادی، خاندانی اور ملکی ترقی کا دھیان رکھنا ہوگا اور جذبات کی رو میں بہہ کر کسی مسئلہ پر سطحی طور پر غور نہ کرتے ہوئے اس کے دور رس نتائج پر نگاہ رکھنی ہوگی۔

وقت کا تقاضا ہے کہ بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگی پیدا کرتے ہوئے ہم آگے بڑھیں اپنے خیالات کو غور و فکر کی نئی روشنی میں ڈھالیں اور ترقی کی دوڑ میں دوسری قوموں کے شانہ بشانہ چلیں۔ اس کے لئے وسیع النظر اور وسیع القلب ہونے کی ضرورت ہے۔ ہماری تاریخ کا شاید ہی کوئی ایسا دور گذرا ہوگا جب اصحاب فکر و نظر نے اس بات پر غور نہ کیا ہو کہ اسلام کے دائرہ میں رہتے ہوئے زمانے کے تقاضوں کو کس طرح پورا کیا جا سکتا ہے۔ ماضی اور حال میں تال میل پیدا کرنے کی جدوجہد کوئی نئی بات نہیں، گذشتہ صدیوں میں اسلامی علوم کی اشاعت اور اسلامی فکر کی تشکیل میں ہمارے ملک کا جو حصہ رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ جو کام آپ نے شروع کیا ہے، اس کے لئے اس ملک کو بہترین تجربہ گاہ جانئے۔ اس بھروسہ کے ساتھ قدم آگے بڑھائیے کہ پورا ملک ایک ایسی کوشش کو خوش آمدید کہتا ہے جس کے ساتھ مسلمانوں کی تخلیقی صلاحیتوں کی بیداری اور ان کے تعمیری حوصلوں میں اضافہ کی امیدیں وابستہ ہیں جو لوگ قوم کی فلاح و بہبود کا کام ہاتھ میں لیتے ہیں، خدا انھیں ضرور کامیاب کرتا ہے بشرطیکہ جہد مسلسل اور طلب صادق ہو۔

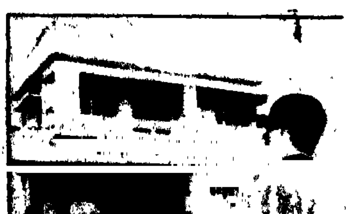
جو لوگ تقریر و خطابت کے کمالات دکھا رہے ہیں وہ صرف یہ ثابت کر رہے ہیں کہ انھیں زمانہ کی تبدیلیوں کی خبر نہیں

سحبان وائل (م ۵۴ھ) خوش بیانی میں ضرب المثل ہے۔ امیر معاویہ کے دربار میں شامل ہو کر اس نے بڑی عزت پائی۔ ایک بار خراسان سے ایک وفد امیر معاویہ کے یہاں آیا۔ انھوں نے سحبان کو بلوایا اور اس سے تقریر کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے کہا "میرے لئے عصا لاؤ۔" لوگوں نے کہا "امیر المومنین کے دربار میں تم عصا سے کیا کروگے"۔ اس نے جواب دیا "وہی جو موسیٰ اپنے رب سے باتیں کرتے وقت اپنے عصا سے کرتے تھے۔" اس کے بعد تقریر شروع کی تو ظہر سے لے کر عصر تک اس طرح مسلسل بولتا رہا کہ درمیان میں ایک بار بھی کہیں نہیں اٹکا۔ تمام حاضرین ششدر ہو کر رہ گئے۔ امیر معاویہ نے کہا "واقعی تم عرب کے سب سے بڑے خطیب ہو"۔ سحبان نے برجستہ کہا: "نہ صرف عرب کا بلکہ سارے عجم کا اور جن و انس کا بھی"۔

زیاد ابن ابیہ (م ۵۳ھ) نے ایک بار حضرت عمر کی موجودگی میں مہاجرین و انصار کے سامنے تقریر کی۔ تقریر اتنی کامیاب تھی کہ اس کو سن کر عمرو بن العاص بول اٹھے: "سبحان اللہ! اس نوجوان کا باپ اگر قریشی ہوتا تو یہ اپنے عصا سے عربوں کی قیادت کرتا"۔ حجاج بن یوسف ثقفی (۴۱-۹۵ھ) کو زبان و بیان کی حیرت انگیز صلاحیت حاصل تھی۔ مالک بن دینار کہتے ہیں: میں نے حجاج سے زیادہ اثر انگیز اور خوش بیان مقرر نہیں دیکھا۔ جب وہ ممبر پر کھڑا ہو کر عراقیوں کے سامنے اپنے احسانات اور عفو کا ذکر کرتا اور اس کے مقابلہ میں عراقیوں کی زیادتیاں اور بدسلوکیاں بیان کرتا تو میں اس کو سچا اور عراقیوں کو جھوٹا سمجھنے لگتا۔ حالانکہ اس نے ان میں سے ایک لاکھ ۲۰ ہزار کو قید میں ڈال کر مار ڈالا تھا، اور جب اس کا انتقال ہوا تو

اس وقت آدمی کو کتنی خوشی ہوتی ہے جب وہ اپنے بنائے ہوئے نئے مکان کو دیکھتا ہے۔ کاش انسان جانتا کہ اس وقت اسے اور زیادہ خوشی ہوگی جب وہ آخرت میں اپنے تعمیر کئے ہوئے مکان کو دیکھے گا۔

خوابوں کا مکان



اس کے قید خانوں میں ۵۰ ہزار مرد اور ۳۰ ہزار عورتیں بند پڑی ہوئی تھیں۔

شہادت عثمان کے بعد جب مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہوا اور نتیجہ میں بہت سی ایک دوسرے کی حریف جماعتیں پیدا ہو گئیں تو خطابت نے بہت ترقی کی۔ کیونکہ ہر فرقہ اپنے نظریہ کی تبلیغ واشاعت کے لئے سب سے زیادہ جس چیز پر اعتماد کرتا تھا، وہ خطابت اور تقریر ہی تھی۔ حدیث کی پیش گوئی کے مطابق مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہونے کے بعد پھر ختم نہ ہو سکا اس لئے خطابت اور تقریر کو خوب غذا ملتی رہی اور اتنے زیادہ مقررین پیدا ہوئے جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔

تاہم دور سائنس کے ظہور سے پہلے تقریر و خطابت اپنی بعض مضرتوں کے ساتھ بہت سے پہلوؤں سے مفید بھی ثابت ہوتی رہی۔ خاص طور پر مقابلہ کے مواقع پر جوش جہاد ابھارنے کے لئے۔ مگر دور سائنس میں اس قسم کی خطابت بالکل بے معنی ہو گئی ہے۔ آج علم و عمل کے سارے انداز بدل چکے ہیں۔ اب علم میں تحقیق اور تجزیہ نے اہمیت حاصل کر لی ہے اور عمل میں منصوبہ بندی نے۔ ظاہر ہے کہ تقریر و خطابت کا ان دونوں چیزوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے آج تقریر کا مقام وہی ہو چکا ہے جو مشاعرہ میں شاعری کا ہوا کرتا ہے، اس سے زیادہ اونچا نہیں

ان حالات میں جو لوگ اب بھی تقریر و خطابت کے کمالات دکھا رہے ہیں وہ صرف یہ ثابت کر رہے ہیں کہ انھیں زمانہ کی تبدیلیوں کی خبر نہیں۔ ان کی سرگرمیاں ممکن ہے کسی میوزیم میں جگہ پا سکیں مگر ان کو حال یا مستقبل کی تعمیر کا عنوان نہیں دیا جا سکتا

الرسالہ کے شائقین سے گزارش ہے کہ وہ پرچہ بذریعہ وی، پی طلب نہ فرمائیں۔ بلکہ اپنا زرتعاون منی آرڈر کے ذریعہ بھیج دیں' یہ طرفین کے لئے سہولت کا باعث ہے۔

جو لوگ سالانہ یا ششش ماہی زرتعاون بیک وقت ادا نہ کرسکیں، وہ ہر مہینہ دو روپے کا ٹکٹ لفافہ میں رکھ کر بھیج دیں۔ پرچہ انھیں روانہ کردیا جائے گا۔

خریدار حضرات براہ کرم اپنے خطوط میں خریداری نمبر کا حوالہ ضرور تحریر فرمائیں

خط وکتابت کے وقت یا زرتعاون بھیجتے ہوئے اپنا پتہ صاف اور حتی الامکان انگریزی میں تحریر فرمائیں۔

الرسالہ نہ صرف ملک کے مختلف حصوں میں پڑھا جاتا ہے بلکہ ملک کے باہر بھی عرب دنیا اور دوسرے علاقوں میں جاتا ہے۔ تاجر حضرات الرسالہ میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیں۔

زندگی کے ابدی مسائل کے لئے اٹھئے نہ کہ وقتی مسائل کے لئے

گھر کے اندر کوئی سانپ دکھائی دے جائے تو اچانک تمام چھوٹے بڑے اس کے خلاف ڈنڈے لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں، جبکہ خاموش تعمیری کام کے لئے یہی ہلچل ان میں پیدا نہیں ہوتی۔ ایسا ہی کچھ حال موجودہ زمانہ میں اسلامی تحریکوں کا رہا ہے۔ یہ تحریکیں کسی مثبت اسلامی فکر کی بنیاد پر نہیں اٹھیں بلکہ محض خارجی حالات کے اثر سے پیدا ہوتی رہیں —— مغربی قوموں کی یلغار، اسرائیل کی جارحیت، فرقہ وارانہ فسادات، اقتصادی اور سیاسی نقصانات وغیرہ، بس اسی قسم کی چیزیں تھیں جن کو دیکھ کر لوگ ان کے خلاف ٹوٹ پڑے اور اس کا نام انھوں نے اسلامی تحریک رکھ دیا۔

اگرچہ ان تحریکوں میں بہت سے اختلافات بھی نظر آتے ہیں۔ کوئی متشددانہ روپ میں دکھائی دے رہی ہے کوئی فلسفیانہ روپ میں۔ کوئی قرآن اور اسلام کا نعرہ بلند کر رہی ہے، کوئی قوم اور ملک کا، کوئی اقدام پر زور دے رہی ہے کوئی تحفظ پر۔ مگر ایک چیز سب میں مشترک ہے: ان کے اندر جس چیز نے حرکت و حرارت پیدا کی، وہ بیرونی دنیا کے اتفاقی حالات تھے نہ کہ اسلام کا ابدی پیغام۔

اسلام کی نظر میں انسان کا ابدی مسئلہ صرف ایک ہے اور مسلمان ہمیشہ اسی کے لئے اٹھتا ہے۔ وہ ہے آخرت کا مسئلہ۔ انسان کو اس کے خالق نے درختوں اور جانوروں کی مانند نہیں بنایا، بلکہ ایک ذمہ دار مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔ دنیا کی زندگی ایک امتحان ہے، آدمی جب مرتا ہے تو وہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اپنے کارنامہ زندگی کا حساب دینے کے لئے مالک کائنات کے یہاں پہنچا دیا جاتا ہے، اس کے بعد اس کی ابدی زندگی شروع ہوتی ہے جو یا تو جنت ہے یا جہنم۔

اسلامی تحریک اسی سنگین مسئلہ سے انسانوں کو آگاہ کرنے کے لئے اٹھتی ہے۔ مسلمان اپنا فکر دنیوی ہنگاموں کے اثر سے نہیں بناتا بلکہ زندگی کی ابدی حقیقتوں کی روشنی میں بناتا ہے۔ مسلمان دنیاوی مصائب پر صبر کرتا ہے تاکہ اصل مشن سے اس کی توجہ ہٹنے نہ پائے، وہ ہر حال میں اسی ایک کام پر اپنی طاقتوں کو خرچ کرتا ہے۔ کیونکہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ ہر دوسرا دروازہ اسی ایک عمل سے اس کے لئے کھلے گا۔ وہ زندگی کے ابدی مسائل کے لئے عمل کرتا ہے نہ کہ وقتی مسائل کے لئے۔ جب ابدی زندگی کے سنگین تر مسائل سامنے کھڑے ہوں تو وقتی مسائل میں اپنی قوتوں کو صرف کرنا کسی نادان ہی کا کام ہو سکتا ہے۔

امت مسلمہ کا مشن یہ ہے کہ لوگوں کو آخرت سے باخبر کرے۔ اگر وہ ان سے دنیوی مسائل کے لئے لڑائی چھیڑ دے تو وہ فضا ہی ختم ہو جاتی ہے جس میں انھیں اخروی مسائل کی طرف متوجہ کیا جا سکے۔ سیاسی اور معاشی جھگڑوں کے ساتھ جو دعوتی کام کیا جائے وہ مسخ ہے نہ کہ دعوت۔

پیغمبر خارجی دنیا کے حالات کو نظر انداز کر کے اپنے کام کا آغاز کرتا ہے

قدیم عرب کا تصور کیجئے، جب یمن بحر عرب اور مشرق و مغرب میں خلیج فارس اور بحر احمر کے درمیان بننے والا یہ جزیرہ نما زبردست سیاسی مسائل سے دوچار تھا۔ عرب کے مشرق میں ایران تھا جہاں طاقتور ساسانی سلطنت قائم تھی۔ شمال میں رومی یا بازنطینی سلطنت تھی جو دور قدیم کی سب سے بڑی شہنشاہیت مانی جاتی ہے۔ ان دونوں سلطنتوں نے عرب جغرافیہ کو اپنی سیاست کا اکھاڑہ بنا رکھا تھا۔ عرب کے بہترین زرخیز علاقے براہ راست ان کے قبضے میں تھے۔ عراق پر ایرانیوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ شام اور اردن اور فلسطین اور لبنان رومی سلطنت کا حصہ بنے ہوئے تھے۔ عرب کے مشرق و مغرب میں اگرچہ خلیج فارس اور بحر احمر کی قدرتی آبی دیواریں تھیں مگر یہ حصے بھی پڑوسی کی طاقت ور شہنشاہیتوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ نہ تھے۔ مشرق سے ایران کے بحری بیڑے خلیج عمان کو عبور کر کے نہایت آسانی سے عرب کے علاقے میں گھس آتے تھے۔ مغرب میں بحر احمر کے اس پار کے دونوں ممالک — مصر اور حبشہ رومی شہنشاہیت کے ماتحت تھے۔ اور وہ ان کے ذریعے سے ہر وقت عرب کے بظاہر اس محفوظ حصہ میں دخل اندازی کر سکتا تھا۔

عرب کے اندرونی علاقہ میں قبائلی سرداروں کی ریاستیں قائم تھیں۔ مگر رومیوں اور ایرانیوں کے عمومی تسلط کی وجہ سے ان کے لئے بھی زندگی کی صورت یہی تھی کہ ان بیرونی شہنشاہیتوں کی ماتحتی قبول کر کے اپنا سیاسی جزیرہ بنائیں۔ شمال میں شام کی سرحدوں سے ملی ہوئی امارت غساسنہ عربیہ تھی جو رومی سلطنت کے تابع تھی اور بعثت نبوی کے زمانہ میں اس کا امیر حارث بن ابی شمر غسانی تھا۔ اسی طرح امارت بصریٰ تھی، وہ بھی رومی شہنشاہیت کے زیر اثر تھی۔ یہاں رومی تمدن چھایا ہوا تھا اور ان کے اثر سے یہاں کے باشندوں کی بڑی تعداد مسیحی ہو گئی تھی۔

عراق کی سرحد پر امارت حیرہ عربیہ تھی جو ایران کے تابع تھی۔ خلیج فارس کے کنارے کنارے متعدد عرب ریاستیں تھیں۔ وہ سب ایران کے زیر اثر تھیں، مثلاً امارت بحرین، جس کا امیر منذر بن ساوی تھا۔ یہاں کے باشندوں کی بڑی تعداد ایرانی تہذیب کے اثر سے مجوسی ہو چکی تھی۔ امارت عمان، جس کے امیر جلندی کے دو لڑکے جیفر اور عبد تھے۔ امارت یمامہ، جس کا امیر ہوذہ بن علی الحنفی تھا۔ رومیوں اور ایرانیوں میں سیاسی رقابت کی وجہ سے اکثر جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان میں رومیوں کی ماتحت عرب ریاستیں (مثلاً غساسنہ) روم کا ساتھ دیتی تھیں اور ایران کی ماتحت عرب ریاستیں (مثلاً حیرہ) ایران کا۔ اس طرح ایران و روم کی باہمی لڑائیوں میں عرب خون بھی خوب بہتا تھا۔

قدیم یمن، موجودہ یمن سے بہت زیادہ وسیع تھا۔ اس میں مختلف قبائل کی حکومتیں قائم تھیں۔ سب سے بڑا

یمنی علاقہ وہ تھا جس کا دارالسلطنت صنعاء تھا۔ نجران اسی کے اندر واقع تھا۔ یمن میں بیرونی نفوذ کا آغاز غالباً ۳۴۲ء سے ہوتا ہے جب کہ سلطنت روم نے یہاں اپنے عیسائی مبلغین بھیجنے شروع کئے۔ ان عیسائی مبلغین کو نجران میں کامیابی ہوئی اور وہاں کے بیشتر لوگ عیسائی ہو گئے۔

اس مذہبی واقعہ میں روم کے حریف ایران کو سیاست کی بو محسوس ہوئی۔ انھوں نے سمجھا کہ اس طرح رومی شہنشاہ عرب کے جنوبی علاقہ میں نفوذ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ایرانیوں نے اس کے توڑ کے لئے یمن کے یہودی قبائل کو ملایا جن کو رومی سلطنت نے ۷۰ء میں شام سے نکال دیا تھا اور وہ وہاں سے جلاوطن ہو کر یمن میں آبسے تھے۔ عیسائیوں اور یہودیوں کی ضد میں یہودی بہت جلد ایرانیوں کے ساتھ ہو گئے۔ یوسف ذونواس جو ایک عرب تھا اور پھر یہودی ہو گیا تھا ایرانیوں کی مدد سے اس نے صنعاء پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہ ایک نیم آزاد عرب حکومت تھی جو ایرانیوں کے ماتحت قائم ہوئی تھی۔ یوسف ذونواس نے یمن کی بادشاہت حاصل کرنے کے بعد عیسائیوں کو یمن سے ختم کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ حتیٰ کہ ۵۲۳ء میں نجران کے بہت سے عیسائیوں کو زندہ جلا دیا۔

اب رومیوں کی باری تھی۔ قیصر روم نے یمن میں عیسائیت کے تحفظ کے نام پر اور حقیقۃً اپنے نفوذ کو بحال کرنے کے لئے ایک تدبیر کی۔ اس نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کو اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے استعمال کیا۔ نجاشی مذہباً عیسائی تھا اور رومی حکومت کے ماتحت تھا۔ اس نے نجاشی کو ابھارا کہ یوسف ذونواس سے بدلہ لے۔ نجاشی نے ایک حبشی سردار ایاط کو فوج دے کر روانہ کیا۔ اس نے مختصر جنگ کے بعد صنعاء پر قبضہ کر لیا۔ ذونواس نے سمندر میں ڈوب کر خودکشی کر لی۔ کچھ دنوں بعد ایاط کی فوج کے ایک سردار ابرہہ نے بغاوت کر کے ایاط کو قتل کر ڈالا۔ اور نجاشی کو راضی کر کے صنعاء کی حکومت کا فرمان حاصل کر لیا۔ یہی ابرہہ ہے جس نے ۵۷۰ء میں کعبہ پر حملہ کیا۔ ابرہہ کے بعد اس کا بیٹا یکسوم اور اس کے بعد دوسرا بیٹا مسروق حکمراں ہوا۔

سابق ملوک یمن کی اولاد میں ایک شخص سیف بن ذی یزن تھا۔ اس کو خیال ہوا کہ اپنے ملک کو غیر عربوں کے نفوذ سے پاک کرے اور اپنی آبائی سلطنت کو دوبارہ حاصل کرے۔ اس نے یمن میں آزادی کی تحریک (حرکۃ تحریریۃ) چلائی، صرف مقامی تعاون مقصد کے حصول کے لئے ناکافی تھا۔ چنانچہ وہ ایرانی بادشاہ نوشیرواں کے پاس پہنچا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اپنی فوج سے یمن کی تحریک آزادی کی مدد کرے۔ ایرانی شہنشاہ کے لئے یہ سنہرا موقع تھا۔ اس نے ایک ایرانی سپہ سالار وھرز کی سرکردگی میں ایک لشکر یمن بھیجنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اس درمیان میں سیف بن ذی یزن مر گیا۔ تاہم اس کا لڑکا معدی کرب ایرانی فوج کو یمن لانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ لوگ خلیج عمان کو عبور کر کے حضرموت کے ساحل پر اترے۔ وہاں سے صنعاء پہنچے۔ معدی کرب نے ایرانی لشکر کی مدد سے حبشہ کی فوج کو شکست دے دی اور حبشیوں کو یمن سے نکال دیا۔ اب معدی کرب صنعاء کا بادشاہ تھا تاہم ایرانی فوج بھی یہاں مقیم رہی۔ معدی کرب کے مرنے کے بعد ایرانی فوج نے صنعاء پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح صنعاء ایرانی سلطنت کا ایک سمندر پار صوبہ بن گیا۔ جب اسلام یمن میں پہنچا ہے تو صنعاء کے ایرانی گورنر باذان تھے جو بعد کو

مسلمان ہو گئے۔

مذکورہ تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام کی بعثت ہوئی تو عرب کا علاقہ کس طرح ایرانی اور رومی استعمار کی شکار گاہ بنا ہوا تھا۔ ان حالات میں ایک مصلح کے لئے بیک وقت دو راستے کھلے ہوئے تھے۔ ایک یہ کہ وقت کے حالات سے متاثر ہو کر "سامراجی طاقتوں" کے خلاف سیاسی لڑائی شروع کر دے۔ دوسرے یہ کہ خود اپنے اپنے آپ کو اندر اندر اتنا مضبوط بنایا جائے کہ سامراج کی عمارت معمولی کوشش سے گر پڑے۔ آپ نے اپنی مہم کے لئے پہلے طریقہ کے بجائے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۵ (فیل) اور سورہ نمبر ۱۰۶ (قریش) میں ابرہہ (حاکم یمن) کے مکہ کے خلاف جارحانہ منصوبہ کا ذکر ہے۔ مگر اس کے جواب میں جس عمل کی تلقین کی گئی ہے، وہ رب کعبہ کی عبادت (قریش ۔ ۳) ہے۔ گویا اسلامی مزاج یہ ہے کہ سیاسی چیلنج درپیش ہو تو اس کا جواب بھی عبادتی عمل کی سطح پر تلاش کیا جائے۔

آپ بیتی

ہر شخص کی زندگی میں بعض ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو اپنے غیر معمولی پن کی وجہ سے یاد رہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ الرسالہ میں اس قسم کا کوئی واقعہ ہر ماہ شائع کریں۔ پہلی قسط کے طور پر یہاں ایک واقعہ درج کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں جو لوگ تعاون کریں، وہ براہ کرم واقعہ کو سادہ تاریخی انداز میں لکھیں اور اپنے نام و پتہ کے ساتھ اپنا سال پیدائش بھی ضرور تحریر فرمائیں۔ (ادارہ)

۱۹۴۱ کے شروع کا واقعہ ہے۔ میں فوجی دفتر کی ایک شاخ (اے جی برانچ) کے سیکشن (اے جی نمبر ۱) واقع نئی دہلی میں ملازم تھا۔ میرے ایک ساتھی عالم چند سنگھ تھے۔ انھوں نے ایک موقع پر دفتر کی ایک فائل اس وقت کے ہمارے سیکشن کے انچارج افسر کے پاس کاغذات پر دستخط کرنے کے لئے بھیجی۔ یہ ایک انگریز کرنل تھا جس کا نام اب مجھے یاد نہیں۔ اس افسر نے فائل دیکھی تو اس کو ایک کاغذ نظر نہیں آیا جس کی اسے خاص ضرورت تھی۔ اس نے نہایت ناراضگی کے لہجہ میں یہ نوٹ لکھ کر فائل کو اپنے ماتحت مسٹر عالم چند سنگھ کے پاس بھیجا کہ فلاں کاغذ اس میں کیوں نہیں ہے۔

عالم چند سنگھ نے فائل کو غور سے دیکھا تو اس میں مطلوبہ کاغذ موجود تھا۔ چنانچہ انھوں نے فائل کو دوبارہ اپنے انگریز افسر کے پاس بھیجا اور لکھا کہ جناب فائل کے فلاں صفحہ کو ملاحظہ فرمائیں جس میں مطلوبہ کاغذ موجود ہے۔

افسر نے دوبارہ فائل کا جائزہ لیا تو کاغذ اس کے اندر موجود تھا۔ اس کو اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ اس نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے فائل پر موٹی سرخ پنسل سے اپنے سابقہ نوٹ کے ساتھ لکھ دیا:

I WAS BLIND THEN

میں اس وقت اندھا تھا۔

حاجی اختر محمد خاں (پیدائش ۱۹۱۵)
محلہ کوٹ، بگراسی، ضلع بلند شہر

ہونے کا مطلب کیا ہے

جاڑے کے موسم میں سانپ ٹھٹھرا پڑا رہتا ہے لیکن ذرا سا بھی دُم چھو دیجئے تو وہ فوراً پھن نکال کر کھڑا ہو جائے گا۔ یہی حال انسانوں کا ہے۔ ایک شخص بظاہر نہایت شریف اور معقول نظر آئے گا۔ لیکن اگر اس کی اَنا کو ضرب لگائیے۔ اس سے کسی معاملے میں اختلاف کر دیجئے تو اچانک وہ ایسا نامعقول بن جاتا ہے کہ یقین نہیں آتا کہ یہ وہی شخص ہے جس سے اب تک آپ واقف تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان اپنے اندر خدا بننے کی ایک تمنا چھپائے ہوئے ہے۔ جب آپ اس سے عقیدت مندی کے ساتھ ملتے ہیں۔ جب اس سے اس کی پسندیدہ باتیں کرتے ہیں تو اس کی خاموش تمنا کو تسکین ملتی رہتی ہے۔ اس کا لاشعور آپ کو قدردانی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک گویا آپ اس کے خدائی کے دعوے کو تسلیم کر رہے ہیں۔ مگر جب آپ ناقد کی حیثیت سے اس کے سامنے آئیں تو اس کا ردّ عمل بالکل برعکس ہوتا ہے۔ اب وہ محسوس کرتا ہے کہ آپ اس کے دعوے کو چیلنج کر رہے ہیں، وہ غصہ سے بپھر اٹھتا ہے اور چاہتا ہے کہ آپ کو مٹا ڈالے جس طرح نمرود اور فرعون نے اپنے خدائی کے دعوے کا انکار کرنے والوں کو مٹا دینا چاہا تھا۔

بہت سے لوگ ہیں جو اپنی کسی تحریر میں اپنے نام کے ساتھ "خاکسار"۔ "ہیچدان"۔ "احقر العباد" جیسے الفاظ کو لکھنا اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جتنا تحریر کے آغاز میں بسم اللہ کو۔ لیکن اگر ان کی "انا" پر ضرب لگائیے تو ایسا معلوم ہوگا گویا انھوں نے "برعکس نہند نام زنگی کافور" کے اصول پر اپنے لئے یہ القاب تجویز کئے تھے۔ اپنے خلاف تنقید کو سن کر وہ جس ردّ عمل کا اظہار کرتے ہیں اس سے ہرگز یہ معلوم نہیں ہوتا کہ فی الواقع وہ اپنے کو حقیر یا خاکسار یا کچھ نہ جاننے والا سمجھتے ہیں۔

اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ یہ کبر ہے اور خدا کے یہاں کبر کی معافی نہیں۔

لا يدخل الجنة من كان في قلبه مثقال حبة خردل من كبر، قيل وما الكبر قال: بطر الحق وغمط الناس۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت میں وہ شخص نہیں جائے گا جس کے اندر رائی کے دانہ کے برابر بھی کبر ہو، پوچھا گیا کبر کیا ہے۔ فرمایا: حق کو نظرانداز کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے آزمائش کی خاطر پیدا کیا ہے۔ اس لئے اس کے اندر نفس بھی رکھ دیا ہے جو اس کو برائیوں پر اکساتا ہے۔ تاہم اسی کے ساتھ تمیز کی قوت بھی انسان کے اندر موجود ہے جو اس کو حق و ناحق بتاتی رہتی ہے۔ ایسا ہونا بالکل فطری ہے کہ کبھی کوئی ناموافق بات سن کر آدمی پر جھنجھلاہٹ اور غصہ طاری ہو جائے اور اس کی

زبان سے نامناسب الفاظ نکل جائیں۔ مگر مومن کی
شان یہ ہے کہ ایسے واقعہ کے تھوڑی دیر بعد ہی اس
کو اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے کئے پر
شرمندہ ہوتا ہے۔ اپنے رویے کی اصلاح کا عزم کرتا
ہے۔ اس کی ذات سے کسی کو نقصان پہنچ گیا ہے تو
اس کی تلافی کرتا ہے، جس کے ساتھ نامناسب رویہ
اختیار کیا تھا اس سے معافی مانگتا ہے۔ جب وہ ایسا
کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں نہ صرف اس کا جرم
بخش دیا جاتا ہے بلکہ خود جرم کو بھی نیکی کے خانہ میں لکھ
دیا جاتا ہے کیونکہ وہ اس کیلئے ایک زیادہ بڑی نیکی کے کرنے کا
سبب بنا۔ مگر جو لوگ اختلاف کو عناد اور کینہ کے مقام
تک پہنچا دیں۔ جو اپنی "خدائی" تسلیم نہ کرنے والے شخص سے
ہمیشہ کے لئے بدگمان ہو جائیں اور جنھیں یہ توفیق نہ ملے کہ اس سے
معافی مانگ کر اس کی طرف سے اپنے دل کو صاف کر لیں،
وہ بدترین مجرم ہیں، وہ کسی حال میں خدا کی پکڑ سے بچ نہیں
سکتے خواہ دنیا میں اپنے اتفاقی حالات کی وجہ سے وہ اپنے
دل کی گندگی کو چھپانے میں کامیاب ہو جائیں۔

خدا پرست ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے
آپ کو خدا کے آگے جھکا دے، اس کے مقابلہ میں اپنی
بڑائی کے تمام احساسات کو بالکل ختم کر دے۔ یہ احساس
اگرچہ خدا کے مقابلہ میں مطلوب ہے مگر اس کا امتحان
بندوں کے معاملات ہی میں ہوتا ہے۔ انسانوں کے ساتھ
تعلقات میں جو شخص یہ ثابت کرے کہ اس کے دل میں جھکاؤ
ہے وہی دراصل خدا کے آگے جھکا ہوا ہے۔ اس کے برعکس
انسانوں سے تعلق پہنچنے کے وقت جو شخص ظالم اور متکبر
بن جائے، وہ خدا کے مقابلہ میں بھی ایسا ہی ہے خواہ وہ
بظاہر نفل و نوافل میں کتنا ہی تواضع کا اظہار کرتا ہو۔

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

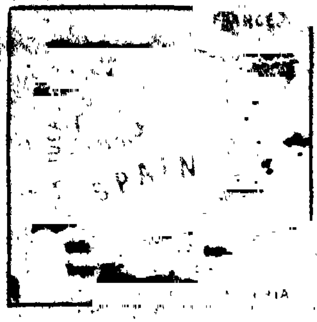
ماہنامہ "الرسالہ"، ۱۰۳۶ کشن گنج، دہلی - ۶

۱۔ مقام اشاعت	۱۰۳۶ کشن گنج، دہلی - ۶
۲۔ وقفہ اشاعت	ماہانہ
۳۔ نام پرنٹر (طابع)	محمد احمد
قومیت	ہندستانی
پتہ:	۱۰۳۶۔ کشن گنج، دہلی - ۶
۴۔ نام پبلشر (ناشر)	محمد احمد
قومیت	ہندستانی
پتہ	۱۰۳۶ کشن گنج، دہلی - ۶
۵۔ نام ایڈیٹر (مدیر مسئول)	محمد احمد
قومیت	ہندستانی
پتہ	۱۰۳۶۔ کشن گنج، دہلی - ۶
۶۔ نام اور پتہ مالک رسالہ	محمد احمد
	۱۰۳۶، کشن گنج، دہلی - ۶

میں محمد احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو تفصیلات اوپر دی گئی ہیں میرے علم و یقین کے مطابق صحیح ہیں۔

محمد احمد

یکم مارچ ۱۹۷۷ء



تاریخ انسانی عمل کا ریکارڈ ہے۔ لیکن تاریخ کو اگر افسانہ بنا دیا جائے تو وہ ایک ایسا ذہنی کارخانہ بن جاتی ہے جس میں صرف خوش فہمی کی مہلک گولیاں تیار ہوتی ہوں ——

یہ ایک سوچا سمجھا ہوا منصوبہ تھا نہ کہ محض پرجوش اقدام

طارق بن زیاد رمضان ۹۱ھ میں اسپین کے ساحل پر اترے تو ان کے ساتھ سات ہزار کا لشکر تھا۔ ساحل افریقہ اور اسپین کے درمیان دس میل کی آبنائے کو ان کے لشکر نے چار کشتیوں کے ذریعہ پار کیا تھا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ زمانہ کے ایک "مورخ اسلام" لکھتے ہیں:

"اس سے اس زمانہ کے جہازوں کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ کتنے بڑے تھے"

موصوف نے قیاس کیا کہ پورا لشکر ایک ہی بار چار کشتیوں پر لد کر دوسری طرف پہنچ گیا ہوگا۔ [illegible] نہیں۔ اس زمانہ میں ایسی کشتیاں وجود میں نہیں آئی تھیں جن پر دو ہزار فوجی اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ بیک وقت بیٹھ سکیں۔ اصل یہ ہے کہ ان لشکریوں نے کئی پھیروں میں آبنائے طارق کو پار کیا تھا۔

ساتویں صدی عیسوی کے آخر تک مسلمانوں نے افریقہ کو بحر روم کے آخری ساحل تک فتح کر لیا تھا۔ بازنطینی سلطنت ایشیا اور افریقہ سے ختم ہو چکی تھی۔ تاہم مراکش کے ساحل پر سبطہ اور اس کے مضافات کے علاقے اب بھی اسپینی گورنر یلیان (کاؤنٹ جولین) کے قبضہ میں تھے۔ یہاں رومیوں نے زبردست قلعہ بنایا تھا۔ موسیٰ بن نصیر نے اس کو فتح کرنے کی کوشش کی۔ مگر ان کی طاقت دیکھ کر بالآخر انھوں نے مصلحت یہ سمجھی کہ جولین سے صلح کر لیں اور اس ساحلی قلعہ کو اس کے قبضہ میں چھوڑ دیں۔ افریقہ سے بازنطینی سلطنت کے خاتمہ کے بعد جولین نے اپنے سیاسی تعلقات اسپین کی عیسائی حکومت سے قائم کر لئے۔ سبطہ اس وقت اندلس کا ایک سمندر پار صوبہ سمجھا جاتا تھا۔ اندلس سے برابر کشتیوں کے ذریعہ اس کو مدد پہنچتی رہتی تھی۔

یہاں یہ سوال ہے کہ جو مسلمان اسپین کے ایک ماتحت گورنر سے خود اپنے مفتوحہ براعظم میں مصالحت کرنے پر مجبور ہوئے تھے، انھوں نے سمندر پار کر کے خود اسپین پر حملہ کرنے کی جرأت کس طرح کی۔ اس کا جواب زیر بحث مسئلہ کے تاریخی مطالعہ سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔

الرسالہ مارچ ۱۹۷۷

۵۰۷ء میں قوطوں (گاتھ) قبائل اسپین میں گھس آئے اور پانچ سو سال رومی سلطنت کو ختم کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ بعد کو ان لوگوں نے ٹھیک اسی طرح مسیحی مذہب کو اختیار کر لیا جس طرح تاتاریوں کے ایک گروہ (مغلوں) نے مسلم دنیا پر قابض ہونے کے بعد اسلام قبول کر لیا۔ گاتھ کا مقصد اس تبدیلی مذہب سے یہ تھا کہ عیسائیوں کو مطمئن کر کے اسپین میں اپنے سیاسی اقتدار کو مستحکم کریں۔ جس زمانہ میں مسلمانوں نے بازنطینی اقتدار کو شام و مصر و فلسطین سے ختم کیا طلیطلہ (ٹالیڈو) پر گاتھ کا آخری بادشاہ وٹیکا (ویطشہ) حکمراں تھا۔ وٹیکا کی بعض کمزوریوں سے اس کے ایک فوجی افسر رذریق ([illegible]) کو موقع ملا کہ وہ اس کی حکومت کا تختہ الٹ دے اور خود اسپین کا حکمراں بن جائے۔

سبطہ کا گورنر جولین (جولیان) وٹیکا کا رشتہ دار تھا۔ تاہم اس نے مصلحت کے تحت اپنی وفاداریاں رذریق سے وابستہ کر دیں۔ مگر بعد کو ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے اس کو بے حد مشتعل کر دیا۔ اور اس کو اپنے بادشاہ کا مخالف کر کے مسلمانوں کے قریب کر دیا جو افریقی براعظم میں اس کے جغرافی پڑوسی تھے۔

اس زمانہ میں اسپین کا حکمراں طبقہ بدترین قسم کی عیاشیوں کا شکار تھا۔ رواج کے مطابق امراء کی لڑکیاں عرصہ تک شاہی محل میں رکھی جاتی تھیں تاکہ شاہی آداب و قواعد کو سیکھ سکیں اور بادشاہ کی خدمت کریں۔ رذریق کے عہد میں جولین کی لڑکی فلورنڈا بھی اسی رواج کے مطابق شاہی محل میں داخل ہوئی۔ لڑکی جوان ہوئی تو رذریق اس پر فریفتہ ہو گیا اور جبریہ طور پر اس کی عصمت دری کی۔ لڑکی نے کسی طرح اس واقعہ کی اطلاع اپنے باپ کو دی۔

جولین کو اس واقعہ کا انتہائی صدمہ ہوا۔ اس نے قسم کھائی کہ جب تک رذریق کی سلطنت کو دفن نہ کر دے، چین سے نہ بیٹھے گا۔ اولاً وہ طلیطلہ گیا اور لڑکی کی ماں کی بیماری کا بہانہ کر کے اس کو سبطہ واپس لایا۔ اس کے بعد وہ موسیٰ بن نصیر سے ملا اور اس کو اکسا کر تسخیر اندلس پر آمادہ کیا۔ اس نے موسیٰ کو اندلس کی اندرونی کمزوریاں بتائیں اور آمادہ کیا کہ وہ اور خود اندلس کے بہت سے لوگ اس مہم میں اسلامی فوج کا ساتھ دیں گے۔ یہ واقعہ ۹۰ھ کا ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جولین نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اپنا نام مسلم رکھا تھا۔

اس کے بعد موسیٰ بن نصیر نے خلیفہ ولید بن عبد الملک سے خط و کتابت کی۔ کئی خطوط کے بعد ولید نے لکھا:

"مسلمانوں کو خوفناک سمندر میں نہ ڈالو۔ اگر تم پر امید ہو جب بھی ابتداءً تھوڑی سی فوج بھیج کر تجربہ اندازہ کرو۔"

موسیٰ نے رمضان ۹۱ھ میں ایک شخص طریف کو، جس کی کنیت ابوزرعہ تھی پہلی مہم کے طور پر پانچ سو آدمیوں کے ساتھ اسپین روانہ کیا۔ جولین بھی ان کے ساتھ تھا۔ شمالی افریقہ کے ساحل ملک مراکش اور اسپین کے درمیان صرف دس میل کا آبی فاصلہ ہے۔ ان لوگوں نے چار کشتیوں کے ذریعہ اس کو عبور کیا اور دوسری طرف ساحل پر اتر کر ساحلی علاقوں میں رہے اور وہاں کے حالات کا اندازہ کر کے دوبارہ واپس آ گئے۔

اس کے بعد اگلے سال رمضان ۹۲ھ میں طارق بن زیاد کی سرکردگی میں سات ہزار کا لشکر تیار کیا گیا۔ اندلس کی آبنائے کو پار کر کے جب وہ لوگ اسپین کے ساحل پر اترے تو کہا جاتا ہے کہ طارق نے اپنی تمام کشتیاں جلا دیں۔ مگر کشتیاں جلانے کا واقعہ بعد کا اضافہ شدہ افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں "[illegible]

الرسالہ مارچ ۱۹۸۰

کی داستانوں میں اس قسم کے افسانے عام رہے ہیں۔ ہمارے اس خیال کے لئے ایک قرینہ یہ ہے کہ تاریخ اندلس کی بعض قدیم کتابوں، مثلاً اخبار مجموعہ فی فتح الاندلس" میں یہ واقعہ سرے سے مذکور نہیں ہے۔

بتایا گیا ہے کہ سمندر کو پار کر کے جب طارق بن زیاد اسپین کے ساحل پر اترے تو انھوں نے اپنی فوجوں کو للکارا:

ایہا الناس! العدو امامکم والبحر ورائکم ولیس لکم واللہ الا الجد والصبر

اے لوگو دشمن تمہارے سامنے ہے اور سمندر تمہارے پیچھے ہے۔ تمہارے لئے خدا کی قسم اس کے سوا کوئی راہ نہیں کہ جم کر لڑو اور جم کر مقابلہ کرو۔

سپہ سالار کے یہ جوشیلے الفاظ سن کر لشکری چیخ اٹھے:

انا ورائک یا طارق   طارق ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔

تمام تاریخوں کے متفقہ بیان کے مطابق مخالف فوجوں سے مقابلہ ساحل پر اترتے ہی فوراً پیش نہیں آیا تھا۔ قیاس یہ ہے کہ یہ تقریر بعد کو اس وقت کی گئی ہے جب کہ عملاً مقابلہ پیش آیا ہے۔ اور فتح اندلس کے بعد جب تقریر کے الفاظ "سمندر تمہارے پیچھے ہے" لوگوں میں عام ہوئے تو قصہ گویوں نے اس میں اپنی طرف سے یہ اضافہ کر دیا کہ یہ تقریر کشتیوں کو جلانے کے بعد کی گئی تھی۔ شاید ان کے نزدیک سمندر کے پیچھے ہونے کے لئے ضروری تھا کہ سمندر اور فوجوں کے درمیان سے کشتیوں کو ہٹایا جا چکا ہو!

وائرلیس کے دور سے ایک ہزار سال پہلے سمندر پار کے ملک میں اترنے والا ایک کمانڈر اس حقیقت سے بے خبر نہیں رہ سکتا تھا کہ اسپین کے ساحل پر اترنے کے بعد یہی کشتیاں وہ واحد ذریعہ ہیں جن سے وہ اپنے مرکز سے مربوط رہ سکتا ہے۔ طارق اور موسیٰ بن نصیر (گورنر افریقہ) کے درمیان پیغام رسانی کا دوسرا کوئی ذریعہ اس زمانہ میں ممکن نہ تھا۔ یہ صرف قیاس نہیں ہے بلکہ واقعات ثابت کرتے ہیں، کہ، ساحل اسپین پر اترنے اور مقابلہ پیش آنے کے درمیان تقریباً دو ماہ تک یہی کشتیاں تھیں جو دونوں کے درمیان باہمی ربط اور پیغام رسانی کا ذریعہ بنی رہیں۔

طارق جس مقام پر اترے اس کا نام قلعۃ الاسد LION'S ROCK تھا۔ بعد کو وہ جبل الطارق (جبرالٹر) کے نام سے مشہور ہوا۔ طارق اسپین کے جس ساحل پر اترے وہ اس وقت ایک غیر آباد علاقہ تھا۔ وہاں ایک دشوار گزار پہاڑی کو جائے پناہ قرار دے کر وہ لوگ اکٹھا ہو گئے، تاکہ حالات کو سمجھ کر آئندہ کا نقشہ بنا سکیں۔ اسپین کا بادشاہ رذریق ان دنوں پمپلونہ (PAMPLONA) کی ایک جنگ میں مشغول تھا، جہاں اس کے خلاف بغاوت ہو گئی تھی۔ اس کو جب طارق کے اسپین میں داخلہ کی خبر ملی تو اس نے حکم دیا کہ ایک لاکھ فوج جمع کی جائے تاکہ مداخلت کاروں کو باہر نکالا جا سکے۔ طارق کا جاسوسی نظام بھی کام کر رہا تھا۔ انھیں جب رذریق کی تیاریوں کی خبر ملی تو انھوں نے فوراً اپنا ایک قاصد موسیٰ بن نصیر (گورنر افریقہ) کے یہاں روانہ کیا اور مزید کمک کی درخواست کی۔ ادھر موسیٰ بھی خاموش نہ تھے، بلکہ مسلسل تیاریوں میں مشغول تھے۔ چنانچہ انھوں نے کشتیوں کے ذریعہ پانچ ہزار مزید سپاہی بھیج دیے۔ اس طرح طارق کے لشکر کی تعداد بارہ ہزار ہو گئی۔

الرسالہ مارچ ۱۹۸۰

طارق نے پیغام رسانی کا یہ تمام کام کشتیوں کے ذریعہ کیا۔ کوئی دوسرا ذریعہ اس زمانہ میں ممکن نہ تھا۔ وہ چھوٹی کشتیاں ہی تھیں جنھوں نے پانچ ہزار فوجیوں کی دوسری قسط کو اسپین کے ساحل پر اتارا، جس کے بعد طارق اس قابل ہو سکے کہ وہ اسپین پر حملہ کر سکیں۔ طارق اگر اسپین کے ساحل پر اتر کر اپنی کشتیوں کو جلا دیتے تو یہ پیغام رسانی ممکن نہ ہوتی۔ اور نہ مقابلہ کے وقت مزید کمک پہنچ سکتی۔

اس معرکہ میں جولین بھی پوری طرح طارق کے ساتھ تھا۔ اس نے شاہ رذریق کے خلاف مقامی باشندوں کی ناراضگی سے فائدہ اٹھایا اور اپنے تعلقات کی بنیاد پر اسپینی شہریوں کی ایک جماعت طارق کی خدمت میں حاضر کر دی۔ ان لوگوں نے دشمن کی خبریں فراہم کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا اور فوجی اعتبار سے کمزور مقامات کی اطلاع مسلمانوں کو دی اور مسلمانوں کی رہبری کرتے رہے۔ یہ واقعہ بھی مسلمانوں کے لئے ایک نعمت ثابت ہوا کہ تین سال (۸۸-۹۰ھ) تک اندلس میں سخت قحط پڑا تھا، اس کی وجہ سے اتنے لوگ مرے کہ کہا جاتا ہے کہ اندلس کی آبادی آدھی رہ گئی۔

مزید یہ کہ رذریق کی ایک لاکھ فوج میں ایک عنصر ایسا بھی تھا جو سابق شاہ اسپین سے عقیدت رکھنے کی وجہ سے باغی رذریق کا اندر اندر مخالف تھا۔ ان کے فوجی سرداروں میں شسرت اور ابتہ بھی تھے جو سابق شاہ کے بیٹے تھے۔ انھوں نے اپنی خفیہ میٹنگ کی اور کہا:

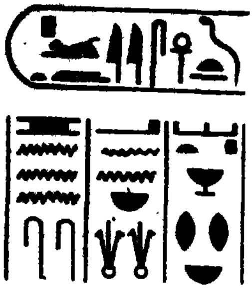
"رذریق خبیث ہمارے ملک پر خواہ مخواہ مسلط ہو گیا ہے، حالاں کہ شاہی خاندان سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو ہمارے یہاں کے کمینوں میں سے ہے۔ رہے مسلمان، وہ تو صرف وقتی لوٹ مار کے لئے آئے ہیں۔ اس کے بعد اپنے وطن کو واپس چلے جائیں گے۔ اس لئے مقابلہ کے وقت اس خبیث کو زک دینے کے لئے ہم کو خود شکست کھا جانا چاہئے۔"

رذریق کی فوج کے ایک حصہ نے نہایت سخت جنگ کی۔ مگر غیر مطمئن فوجیوں نے جنگ میں زور نہیں دکھایا۔ بالآخر شکست ہوئی اور رذریق میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد وہ نہ زندہ مل سکا نہ مردہ۔ کہا جاتا ہے کہ بھاگنے کے دوران وہ ایک دلدل میں پھنس کر مر گیا۔

اسپین کے بعض علاقوں کو طارق نے فتح کیا۔ بعض کو مغیث رومی نے، بعض کو موسیٰ بن نصیر نے، جو بعد کو ۱۸ ہزار فوج کے ساتھ اندلس میں داخل ہوئے تھے۔ رعایا کی اپنے بادشاہ اور سرداروں سے بیزاری کی وجہ سے ان کو خود اسپینیوں میں مددگار اور جاسوس ملتے چلے گئے۔ تمام مورخین لکھتے ہیں کہ غیر مسلم جاسوسوں نے اسپین کی ابتدائی فتوحات میں بہت مدد کی تھی۔

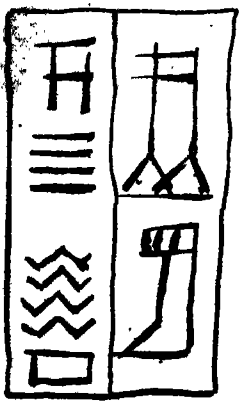
قدیم زمانہ میں انسان کس طرح لکھتا تھا

ہیروغلیفی
HIEROGLYPHICS



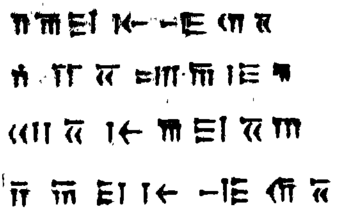
(دنیا کی سب سے قدیم اور پہلی حروف تہجی)
یہ تصویری خط اوپر سے نیچے کی طرف اور کبھی اس کے برعکس لکھا جاتا تھا۔ اس خط کے کاتب مندروں کے پجاری تھے اور یہ خط صرف مقتدایانِ مذہب کے لئے مخصوص تھا۔ دیوتاؤں کے منتر، دیوبانیاں اور جملہ مذہبی دعائیں اور احکامات، پتھروں، مٹی کی دیواروں اور لکڑی کے تابوتوں پر کندہ کئے جاتے تھے۔ یہ خط لکھنے میں بہت مشکل تھا۔ اہرام مصر اور شہر ایڈفو (EDFU) میں دیوتا ہورس کے معبد اور خصوصاً دیوتا آمون کے مندر TEMPLE (OF AMUN) میں اس خط میں بکثرت عبارتیں موجود ہیں۔

خط مسماری



مورخ بروسوس کاہن کلدانی (چار سو برس قبل مسیح) کی تاریخ سے ثابت ہے کہ چار ہزار برس قبل مسیح بابل میں سمیرین قوم کی حکومت تھی۔ سمیرین تہذیب قدیم مصر کی ہمعصر تہذیب تھی۔ یہ قوم دجلہ اور فرات کے درمیانی علاقہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ یونانیوں نے اس سرزمین کا نام میسوپوٹامیہ (دوآبہ) رکھا تھا۔ بابل کے عین جنوب میں واقع قدیم شہر نیپور (NIPOOR) کی کھدائی کے دوران پختہ اینٹوں پر اس دور کے کتبات حاصل ہوئے ہیں جن پر تصویروں کے ساتھ ساتھ خط مسماری میں عبارتیں لکھی ہوئی ہیں۔

اقتباس زیر طبع کتاب "عربی خط" (تاریخ، طرز نگارش، عہد بعہد ترقیاں)
تالیف سید احمد آرٹسٹ رام پوری۔
الرسالہ اپریل ۱۹۷۷ء



خطِ میخی - پیکانی

CUNEIFORM

۲۰۶۷ ق م۔ بابل میں حمورابی نامی بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کا عدل مشہور ہے۔ اس بادشاہ نے قانون سلطنت مرتب کیا جو دنیا کا سب سے پہلا آئین سمجھا جاتا ہے، تعلیم کے لئے مدارس کا اجرا کیا۔ اپنے دور حکومت میں سمیرین خط سے مشابہ ایک جدید خط نکلا جس کا نام عرب و عجم میں میخی اور پیکانی مشہور رہوا۔ انگلش میں کنی فارم کہتے ہیں۔ اس کے بہت سے خطوط جو مٹی کی پختہ اینٹوں پر تھے کھدائی کے دوران حاصل ہوئے ہیں۔ یہ خطوط یورپ کے بڑے بڑے میوزیموں میں رکھے ہوئے ہیں۔

وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا

محمد فاروق ایم اے

وہ نابینا تھا۔ بڑے ہال سے نکل کر باہر جانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ اس کے لئے کوئی آسان بات نہ تھی۔ ہال تو اچھا خاصہ وسیع تھا لیکن باہر نکلنے کے لئے دروازہ ایک ہی تھا۔ کسی کو موقعہ نہ تھا جو اس کی رہنمائی کرتا اور اسے دروازہ تک لے جاتا۔

ایک شخص نے جیسے شاید اس نابینا پر رحم آگیا تھا۔ اس سے کہا: تم پریشان نہ ہو۔ دیوار پر ہاتھ لگائے ہوئے چلتے جاؤ۔ جہاں دروازہ ہوگا اُسے تم خود پا لوگے۔ نابینا کی سمجھ میں یہ بات آگئی، وہ چل پڑا۔ اس کا ہاتھ دیوار سے لگا ہوا تھا۔ وہ اطمینان سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اتفاق سے جب وہ دروازہ کے قریب پہنچا تو اس کی پیٹھ میں کچھ کھجلاہٹ محسوس ہوئی۔ وہ پیٹھ کھجلانے لگا۔ اس نے ہاتھ دیوار سے ہٹا لیا، لیکن اس کے قدم رکے نہیں وہ آگے بڑھ گیا، اور پھر اپنا ہاتھ دیوار سے لگا کر چلنے لگا۔ اس کے چہرے سے اب بھی اطمینان ظاہر ہو رہا تھا۔ لیکن اس وقت وہ دروازے کی جگہ سے بہت آگے جا چکا تھا اور دروازہ اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ وہ دیوار سے ہاتھ لگائے اپنے کو تھکاتا رہا، لیکن دروازہ اُسے کیسے ملتا، وہ تو چوک گیا تھا۔

ٹھیک یہی حالت بالعموم دنیا میں لوگوں کی ہوتی ہے جب کامیابی کے مواقع سامنے ہوتے ہیں تو وہ کسی کھجلاہٹ میں ہوتے ہیں جب کھجلاہٹ دور ہوتی ہے تو بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ موقع ہاتھ سے نکل گیا ہوتا ہے۔

وقت نے کب کسی کا انتظار کیا ہے۔ یہ ہماری اپنی ذمہ داری ہے کہ وقت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

عقود فاسدہ کا مسئلہ
مولانا سید محمد میاں صاحبؒ

مسلمان پر لازم ہے کہ وہ احکام اسلام پر عمل کرتے ہوئے خیر امت کا مظاہرہ کرے

عقود فاسدہ کے جواز کا مطلب کیا ہے۔ "کیا دارالامن میں دارالحرب جیسے معاملات جائز ہیں۔" اس سوال کا جواب اثبات میں دیا جا سکتا ہے۔ مگر بنیادی طور پر فقہاء کا یہ مسلمہ اصول یاد رکھنا ضروری ہے۔ المسلم ملتزم بحکم الاسلام حیث مایکون (شرح کبیر جلد ۴) (مسلمان احکام اسلام کا پابند ہے جہاں کہیں بھی وہ ہو۔

چنانچہ خیانت، دھوکہ، رشوت، احتکار (ذخیرہ اندوزی)، استحصال بالجبر، ٹیکس کی چوری وغیرہ جس طرح دارالاسلام میں حرام ہیں دارالحرب میں بھی حرام ہیں۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ ان سب برائیوں سے باز رہے۔ اور خصوصًا ایسے موقعہ پر کہ یہ امراض وبا کی طرح پھیل رہے ہوں۔ مسلمان پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ احکام اسلام پر عمل کرتے ہوئے خیر امت ہونے کا مظاہرہ کرے۔ یہی موقعہ ہے کہ عملاً اسلام کی برتری ثابت کی جا سکتی ہے۔ اور دوسروں کو متأثر کیا جا سکتا ہے۔

باقی بہت سے معاملات ایسے ہیں جو دارالاسلام میں اسلامی قانون کے مطابق ناجائز ہوتے ہیں اگر ان کے سلسلہ میں کوئی مقدمہ اسلامی عدالت میں پیش ہو تو عدالت اس کے ناجائز ہونے کا فیصلہ کرے گی اور اس خرید و فروخت کو ناجائز قرار دے گی لیکن یہی معاملات اگر دارالحرب میں کئے جائیں۔ تو وہاں کے قانون کے مطابق وہ غلط نہیں ہوتے بلکہ ان کو جائز قرار دیا جاتا ہے مثلاً ایک من گیہوں کے معاوضہ میں ڈیڑھ من یا دو من گیہوں خریدنا "ربوا" کہلاتا ہے جو اسلامی قانون کے مطابق جائز نہیں ہے۔ اس طرح کی بیع اگر دارالاسلام میں ہو اور مقدمہ عدالت میں پہونچے تو اس بیع کو ناجائز قرار دیا جائے گا۔ لیکن اگر یہ دارالحرب میں ہو اور وہاں کا قانون اجازت دیدے تو اسے مسلمان کی ملک تصور کیا جائے گا۔

اب اگر کوئی فریق دارالاسلام میں اس مقدمہ کو چلانا چاہے تو قاضی اسلام اس کو خارج کر دیگا کیونکہ یہ معاملہ دارالاسلام کا نہیں ہے۔

اسی طرح کے احکام ہیں۔ جن کے متعلق مشہور ہو گیا ہے۔ کہ دارالحرب میں بیوع فاسدہ جائز ہوتی ہیں۔ بشرطیکہ فریقین راضی ہوں اور معاملہ خوش دلی سے ہو۔ سیر کبیر میں ہے۔ اذا دخل المسلم دار الحرب بامان فلا باس بان یاخذ منھم اموالھم بطیب انفسھم بای وجہ کان لانہ انما اخذ المباح علے وجہ عری عن الغدر فیکون ذلک طیبا لہ والاسیر والمستامن سواء حتی لو باعھم درھما بدرھمین او باعھم میتۃ بدراھم او اخذ مالا منھم بطریق القمار فذلک کلہ طیب لھم (سیر کبیر بحوالہ کشف الاستار)

(کوئی مسلمان دارالحرب میں پروانہ امن (ویزا) لے کر جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہاں دارالحرب والوں کا مال کسی بھی صورت سے حاصل کرے جو طیب خاطر اور خوشدلی سے ہو۔ کیونکہ یہ ایسا مال لے رہا ہے جو مباح ہے ایسی صورت سے لے رہا ہے جو دھوکہ اور فریب سے پاک ہے۔ پس یہ مال اس کے لئے حلال و طیب ہوگا۔ کوئی مسلمان دارالحرب میں اسیر کی حیثیت سے ہو یا پروانۂ امن حاصل کرکے (ویزا لیکر) گیا ہو۔ دونوں کے لئے یہی حکم ہے۔ چنانچہ اگر وہاں ایک درہم دو درہم میں فروخت کر دے یا مردار جانور کو درہموں کے بدلے فروخت کر دے (بقیت فروخت کر دے) یا قمار کی صورت میں مال حاصل

کرے تو یہ سب صورتیں اس لئے جائز ہوں گی۔ (سیر کبیر حوالہ کشف الاستار)

سیر کبیر کی مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ دار الحرب میں جو معاملہ اہل حرب سے ہو اس کے حلال وطیب ہونے کے لئے طیب نفس یعنی خوش دلی اور رضامندی کافی ہے۔ وہ رضامندی شرعاً معتبر ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ سود اور قمار میں جو رضامندی ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ شرعاً معتبر نہیں ہے۔ لیکن دار الحرب میں یہ غیر معتبر بھی معتبر ہوگی۔ اور اس رضامندی سے حاصل شدہ مال طیب قرار دیا جائے گا۔

تو سوال یہ ہے کہ شریعت نے جس کو خبیث فرمایا ہے کیا اس کی خباثت صرف دار الاسلام تک ہے۔ یا وہ خباثت اس معاملہ کی فطرت ہے۔ جہاں بھی اس معاملہ کا وجود ہوگا۔ خباثت موجود رہے گی۔

مثلاً قمار بقول حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اس لئے حرام ہے کہ کسب واستحصال کے جو ضابطے شریعت نے مقرر کئے ہیں یہ اُن کے برعکس اور ان کے مناقض ومخالف ہے۔ مثلاً یہ کہ اُن میں ایسی محنت نہیں ہوتی جس سے قوم اور ملک کو فائدہ پہونچے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ محنت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

چور، ڈاکو، گرہ کٹ اور بھیک مانگنے والے سب ہی محنت کرتے ہیں۔ مگر اُن کی محنت سے نہ ملک کی دولت میں اضافہ ہوتا ہے، نہ اس کی صنعت وحرفت میں، نہ تمدن ترقی کرتا ہے نہ تعمیر ملک میں فروغ ہے۔ بلکہ یہ جرائم ان مقاصد کے لئے تباہ کن ہوتے ہیں۔ اسی طرح قمار باز اور سود خوار محنت ضرور کرتے ہیں۔ مگر اُن کی محنت سے ملک کی دولت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اُن کی محنت ایک طرح کا ہیر پھیر ہوتی ہے۔ جس سے دوسرے کی رقم جھپٹ لی جاتی ہے۔ اور اس کی تہہ میں طمع وحرص کارفرما ہوتی ہے۔ جو قانون کی حد سے آگے بڑھ کر اخلاق اور روحانیت کے نقطۂ نظر سے نہایت خطرناک مرض ہیں۔ سود کی اصل علت بھی حرص وطمع ہوتی ہے۔ جس میں جارحیت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ سود خوار کمزور کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور اس کی کمزوری میں اور اضافہ کر دیتا ہے۔ کیونکہ ضرورت مند ہی قرض لینے پر مجبور ہے۔ ظاہر ہے اس میں ادائے قرض کی وسعت مشکل ہی سے پیدا ہوگی۔ لیکن سود خوار اس مشکل کی بنا پر رحم کرنے کے بجائے اس کی مشکل میں اضافہ کر دیتا ہے کہ سود کے مطالبہ کو دوچند اور سہ چند کر دیتا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ۔ باب البیوع المنہی عنہا۔

ان افعال کی یہ قباحتیں جس طرح دار الاسلام میں ہوتی ہیں۔ دار الحرب میں بھی قائم رہتی ہیں۔ تو جن معاملات کی تہ میں یہ قباحتیں موجود ہوں ان کی آمدنی کو حلال وطیب کیسے کہا جا سکتا ہے قانونی نقطۂ نظر سے اگر جواز پیدا ہوتا ہے۔ تو اس کو اسی حد تک محدود رہنا چاہئے اسکو حلال وطیب نہیں کہنا چاہئے۔ قمار سے حاصل کردہ رقم دار الحرب میں جائز ہوگی کیونکہ اس کو اسلامی قانون کا تحفظ حاصل نہیں تھا اور ملکی قانون اس کو جائز قرار دیتا تھا۔ لیکن اس جائز کو طیب نہیں کہا جا سکتا۔ کیوں کہ اخلاقی قباحتیں اس کی شکلوں میں بدستور پیوست ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ حسن وقبح کا مدار شریعت کے فیصلہ پر ہے۔ شریعت جس کو جائز قرار دے وہ حسن ہے اور جس کو ناجائز قرار دے وہ قبیح ہے۔

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے غلبہ روم کی قرآنی پیشین گوئی کے سلسلہ میں بازی لگا دینے پر جو مال حاصل کیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے اس کو جائز قرار دیا۔ اس جائز کو حسن اور اس ملک کو طیب ہی کہا جائے گا۔ لیکن بحر العلوم میں حضرت مولانا محمد صاحب رحمۃ اللہ نے اس جواز کے متعلق جو تفصیل بیان کی ہے وہ بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"بہرحال ایسے ملک سے لیا جائے جہاں صلح و عہد ہے اگر بقہر و حیلہ لیا ہے تو غیر مملوک و حرام ہے۔ اور اگر ایسی رضا سے لیا جائے جو شرعاً ممنوع ہے۔ جیسے خمر کی بیع یا سود یا قمار وغیرہ تو ملک آجائے گی برعایت صورت رضا اور حلت نہ آئے گی بوجہ مخالفت شرعی اور اگر وہ رضا شرعاً معتبر یا مسکوت ہو تو ملک بھی آجائے گی اور حلت بھی۔ (عطر ہدایہ صفحہ ۱۸۰)۔

پردہ

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی

پردہ سے متعلق دو قسم کی آیات پائی جاتی ہیں ایک میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیوں اور امت کی تمام عورتوں کو یکساں طور پر خطاب کیا ہے اور دوسری بعض آیات میں صرف ازواج مطہرات ہی کو خطاب کیا گیا ہے مگر قرآن کے مفسرین نے ان آیات کے مفہوم اور مقصود کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کے احکام بھی تمام عورتوں کے لئے عام ہیں البتہ رسولؐ کی پاک بیبیوں کی عظمت اور اُن کے اقتدار کی اہمیت کی وجہ سے اُن کو خاص طور پر مخاطب بنایا ہے کہ وہ امت کی مائیں ہیں ان کا تمام امت مسلمہ کے ساتھ بہت نازک رشتہ ہے اس لئے ضروری ہے کہ ادنیٰ سی بے حجابی بھی اس رشتہ میں رخنہ کا باعث نہ بننے پائے۔

دراصل حجاب اور پردہ سے متعلق آیات کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ صاف اور واضح نظر آتا ہے کہ ان آیات میں دو جدا جدا فیصلے دیئے گئے ہیں ایک یہ کہ عورت کی زندگی کا خصوصی امتیاز یہ ہے کہ وہ گھر کی زینت ثابت ہو اور وقتی ضرورت یا عام اسلامی مصلحت کو مستثنیٰ کرتے ہوئے عورت کا باہر گھومنا پھرنا معیوب اور ناپسندیدہ ہے۔ چناں چہ ارشاد ہے۔

"اے پیغمبر کی بیبیو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم کو خدا کا خوف ہے تو (مردوں سے) ایسے نرم انداز میں گفتگو نہ کیا کرو جس سے ایسے شخص کے دل میں لالچ پیدا ہو جس کے دل میں چور ہے اور جب بات کہو تو بھلی بات کہو اور اپنے گھروں میں ہی قرار پکڑو اور جاہلیت کے زمانہ کی طرح باہر نہ پھرا کرو۔ (احزاب)

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے۔

مسلمانو! جب تم پیغمبر کی بیبیوں سے کوئی کام کی چیز مانگنے جاؤ تو پردہ کے باہر سے مانگو اس طرز عمل میں تمہارے اور اُن کے دونوں کے دلوں کی خوب ستھرائی اور پاکی ہے۔"

اور دوسری آیات میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اگر ذاتی ضرورت یا اسلامی مصلحت کی خاطر باہر نکلنا ناگزیر ہو تو پھر شرم اور حجابات کا تقاضا ہے کہ ان باتوں کا خیال رکھو۔ چناں چہ ارشاد ہے

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! مسلمان عورتوں سے فرما دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور بجز (چہرے اور ہاتھ پیروں) کے کہ جس قدر وہ خود بہ خود کھلے رہتے ہیں اپنی زینت کے کسی مقام کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں اور ان کو

الرسالہ مارچ ۱۹۷۷

چاہئے کہ اپنے دوپٹوں سے اپنے گریبانوں کو پوشیدہ رکھیں" (احزاب)

اور اسی طرح یہ ارشاد ہے۔

"اے نبی! اپنی بیبیوں، اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیجئے کہ باہر نکلتے وقت، اپنی چادروں کو اپنے جسم پر نیچے تک لٹکالیں۔ یعنی چادروں سے اپنے پورے جسم کو لپیٹ لیں کہ غیر کی نظر نہ پڑے۔

اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ قرآن عزیز میں ازواج مطہرات ہی کو سختی کے ساتھ پردہ میں رہنے کا حکم دیا گیا ہے مگر عام عورتوں کے لئے یہ سختی نہیں ہے اور ان کو باہر نکلنے کے آداب اور طریقے بتلا کر روزمرہ کی ضرورت کے لئے نکلنے کی اجازت دی گئی ہے تب بھی یہ تو ماننا پڑتا ہے کہ اسلام کی ترغیبات اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات یہی ہیں کہ عام عورتوں کو بھی سخت ضرورت کے علاوہ باہر نکلنا معیوب ہے اور زمانۂ جاہلیت کی طرح زیب و زینت کے ساتھ حسن کی نمائش کرتے ہوئے نکلنے کی تو اسلام میں گنجائش ہی نہیں جیسا کہ آیت حجاب میں واضح ہے۔

ابوداؤد کی صحیح حدیث میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! عورت کی نماز اُس کے کمرہ میں صحن کے مقابلہ میں افضل ہے۔ صَلوٰۃُ المرأۃِ فِی بَیتِھَا افضلُ مِن صَلاتِھا فِی حُجرتِھا وصَلاتُھا فِی مخدعِھا افضلُ مِن صَلوٰتِھا فِی بیتِھا۔

اور ترمذی کی حدیث میں اس سے بھی زیادہ واضح ارشاد ہے المرأۃ عورۃ فاذا خرجت استشرفھا الشیطان عورت ناموس ہے جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اُس کی تانک جھانک میں لگا رہتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ عصمت و عفت کا تحفظ اسلام کے اہم مقاصد میں سے ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں معمولی سی لغزش بھی مرد کے مقابلہ میں عورت کی زندگی کے لئے ناقابل بیان ہلاکت و تباہی کا باعث بن جاتی ہے۔ اس لئے ازبس ضروری ہے کہ ایسے تمام وسائل و اسباب کا انسداد کیا جائے جو عام طور پر اس قسم کی لغزش یا گناہ کا سبب بن سکیں اور اس لئے پردہ اور حجاب اس مقصد نیک کے لئے بہتر سے بہتر طریق کار ہے (نورالبشر فی سیرۃ خیرالبشر)

کائنات اپنی لامحدود وسعتوں اور امکانات کے ساتھ ہر شخص کو موقع دے رہی ہے کہ وہ جتنا چاہے آگے بڑھتا چلا جائے۔ مگر کوئی شخص اپنا مقصد غلط طریقے سے حاصل کرنا چاہے تو ساری کائنات اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتی ہے۔ غلط کام کو یہ دنیا اسی طرح اگل دیتی ہے جیسے ایک نفیس ذوق کا آدمی غلط خوراک کو۔

تعارف وتبصرہ

پرلوک کی چھایا میں (ہندی)

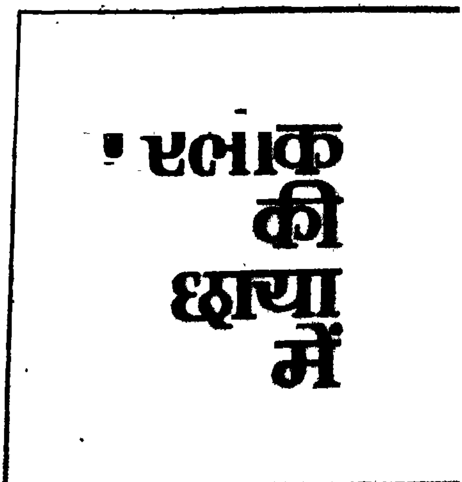
از محمد فاروق خاں۔ ایم۔ اے

صفحات ۲۰۰

قیمت چھ روپے

پتہ: مکتبہ اسلامی، اردو بازار دہلی ـ ۶

آخرت کا علم انسان کی سب سے اہم بنیادی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر انسان کبھی بھی تاریکی سے نکل نہیں سکتا۔ اس کا ایک قدم بھی صحیح رخ پر نہیں اٹھ سکتا۔ تصور آخرت سے عدم واقفیت کی صورت میں ناکامی کے سوا انسان کے حصہ میں کوئی دوسری چیز نہیں آسکتی۔ دنیا میں انبیاء علیہم السلام کے بھیجے جانے کی اصل غرض وغایت ہی یہ تھی کہ وہ آنے والے اس دن سے لوگوں کو آگاہ کریں جو یا تو آدمی کے لیے خوشخبری لے کر آئیگا یا پھر وہ اس کے لیے رنج وغم اور تباہی کا دن ثابت



ہوگا۔ دنیوی حیات کو انسان اہمیت دیتا ہے اسی کی فکر میں جیتا اور مرتا ہے، حالانکہ یہ دنیا کی زندگی گزر جانے والی ہے۔ جب کہ وہ آنے والا دن اگر کبھی واپس نہ ہوگا، اس سے بچنے کی کوئی راہ نہیں!

زیر تبصرہ کتاب میں نظریۂ آخرت پر مختلف پہلو سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے امکان کے دلائل تفصیل سے پیش کیے گئے ہیں، یہ دلائل عقلی بھی ہیں، نفسیاتی اور سائنٹیفک بھی۔ آج سائنس جس مقام پر پہنچ چکی ہے، وہاں عالم آخرت سائنس کی ایک بنیادی ضرورت بن چکا ہے، وہ اب محض مذہب کی ضرورت نہیں رہا۔

اس کتاب میں تفصیل سے دکھایا گیا ہے کہ آخرت کو مانے بغیر موجودہ زندگی بے معنی ہوکر رہ جاتی ہے۔ اس کی ساری معنویت اور خوبصورتی جاتی رہتی ہے۔ انسانی شخصیت کی تعمیر کے لیے کوئی ٹھوس بنیاد باقی نہیں رہتی۔ انسان اگر صرف موت کے سائے میں جی رہا ہو کسی دائمی زندگی کی اسے توقع نہ ہو تو اس کی زندگی کو ایک المیہ کے سوا کسی دوسری چیز سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی سے موت فائق و برتر نہیں ہوسکتی۔ یہ ممکن نہیں کہ زندگی پر موت کو فتح حاصل ہوسکے۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو زندگی کبھی نمودار نہ ہوتی۔ موت زندگی کا خاتمہ نہیں کرسکتی۔ پھر یہ موت کیا ہے؟ اس کا کیا مقصد ہے؟ انسان مرکر کہاں جاتا ہے؟ ان سبھی پہلوؤں پر اس کتاب میں گفتگو کی گئی ہے۔

خواہ وہ ملحدین کا نظریہ ہو یا عقیدۂ تناسخ ہو یا اور کوئی نظریہ ——— آخرت کے مخالف جو نظریات پائے جاتے ہیں، اس کتاب میں ان پر علمی اور سنجیدہ گفتگو [illegible] ہے

انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی پر آخرت کے ماننے یا نہ ماننے کے کیا اثرات پڑتے ہیں اس پر بھی اس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب نو ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب اپنی جگہ پر اہم ہے۔ اس کتاب میں چونکا دینے والی اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ نظریہ آخرت ہی بھارت کا اصل نظریہ رہا ہے، دوسرے نظریات بعد میں ابھرے ہیں۔

"پرلوک کی چھایا میں" کے مطالعہ کے بعد ہر شخص یہ محسوس کر سکتا ہے کہ خود انسانی زندگی کا مطالعہ اسے کس طرح کرنا چاہئے۔ زندگی کو دیکھنے کا صحیح اور سائنٹیفک طریقہ کیا ہے۔ قرآن ہمیں کون سی نگاہ دیتا ہے جس سے ہم دنیا کو دیکھیں۔ اگر ہم موجودہ زندگی کو صحیح ڈھنگ سے دیکھ سکیں تو آخرت کبھی بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتی۔ موجودہ زندگی خود اپنے اندر آخرت کو اس طرح لیے ہوئے ہے جس طرح ایک چھوٹے سے بیج میں ایک تناور درخت آرام کر رہا ہوتا ہے۔

"الرسالہ" کے بہت سے قارئین اس سے واقف ہوں گے کہ محمد فاروق خاں صاحب ایم اے قرآن مجید کو ہندی زبان میں منتقل کرنے کی اہم خدمت انجام دے چکے ہیں اور ان کے ہندی ترجمہ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے مقبولیت بھی عطا کی ہے۔ موصوف کی یہ تازہ تصنیف ہندی داں عوام کے سامنے اسلام کو پیش کرنے کے سلسلے کی اہم کڑی بھی جا سکتی ہے۔ یوں تو یہ کتاب ہر شخص کے لیے قابل مطالعہ ہے لیکن غیر مسلم بھائیوں کو خاص طور سے اس کتاب کو پڑھنے پڑھانے کی ضرورت ہے۔ بہتر ہوگا کہ صاحب خیر اس کتاب کے کچھ نسخے خرید کر اپنے ملنے جلنے والے غیر مسلم بھائیوں تک پہنچائیں۔ یہ ان کے روپے کا صحیح مصرف بھی ہوگا اور اس طرح پیغام رسانی کے اہم ترین فریضہ کی ادائیگی میں ان کا اشتراک عمل بھی ہوگا۔ اصحاب خیر کو حسب توفیق اس کتاب کو منگانا چاہیے یا رقم ارسال کرنے کے ساتھ ناشر کو اس کی اجازت دے دینا چاہیے کہ ان کی طرف سے کتاب مستحق اور شوق رکھنے والے حضرات تک پہنچا دی جائے۔ کم از کم اپنے ذاتی مطالعے کے لیے تو ہر صاحب ذوق کو یہ کتاب منگانی ہی چاہیے۔ (انتظار نعیم۔ ایم اے)

الرسالہ مارچ ۱۹۷۷

یہ ممکن نہیں کہ
زندگی پر
موت کو فتح حاصل ہو،

موت
زندگی کے اوپر
فوقیت نہیں لے جا سکتی

ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ
زندگی کا خاتمہ
موت کی صورت میں ظاہر ہو

بلاشبہ یہ سب سے بڑی حقیقت ہے
مگر بہت کم لوگ ہیں جو
اس حقیقت کو جانتے ہوں۔

Single Copy Rs. 2.00

Regd. No. D (D) 536
REGD. R.N. No. 28822/76
MARCH 1977

AL-RISALA MONTHLY

1036 KISHANGANJ, DELHI-110006 (INDIA)

محمد احمد پرنٹر پبلشر مسئول نے جے۔ کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ ۱۰۳۶ کشن گنج ___ سے شائع کیا

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

آپ کے کمرہ کی دیوار پر جو کیلنڈر ہے، اس پر ۱۹۷۷ کا سنہ لکھا ہوا ہے۔ اگر آپ چاہیں کہ کیلنڈر کے اوپر ۲۰۷۷ کا سنہ لکھا ہوا نظر آئے تو اس کے لئے آپ کو پوری ایک صدی تک انتظار کرنا پڑے گا۔ ایک خود ساختہ کیلنڈر پر آپ جو ہندسہ چاہیں اپنے ہاتھ سے لکھ لیں۔ مگر وہ کیلنڈر جو دنیا کے نزدیک بھی کیلنڈر ہو، اس پر ۲۰۷۷ کا ہندسہ دیکھنے کے لئے سو سالہ انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

اس دنیا میں کیلنڈر کے لئے جو قانون ہے، وہی ملی تعمیر کا بھی قانون ہے، نعروں اور جوشیلی تقریروں میں ملت کا مستقبل دیکھنا ہو تو کسی بھی صبح و شام لفظوں کا سیلاب بہا کر اس قسم کا ایک خیالی محل کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ مگر حقیقی مستقبل کی تعمیر طویل جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں۔

شمارہ ۶	زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے۔ فی پرچہ دو روپیہ	اپریل ۱۹۷۷

خصوصی تعاون سالانہ کم سے کم ایک سو ایک روپیہ

فہرست

قرآن	رائے قائم کرنے سے پہلے تحقیق کیجئے	۴
	قارون کے بارہ میں	۵۰
حدیث	جب زندگی کا رخ آخرت کی طرف ہو جائے	۶
سیرت	وہ اپنا حصہ ادا کرنا جانتے تھے	۴۶
تاریخ	یہ تھا مشرکین عرب کا کردار	۱۳
	ناموافق حالات نے ایک موافق امکان پیدا کر دیا	۲۳
اشاعت اسلام	ایک امریکی نومسلم سے ملاقات	۱۹
تعمیر ملت	وہ سیاست میں الجھ گئے	۲۵
	ایک غلطی سارے امکان کو برباد کر دیتی ہے۔	۲۹
اسلام اور عصر حاضر	موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکیں	۳۶
تعلیمات	جانا ہے بہت دور	۱۲
	علماء کی فقہی اور کلامی بحثیں	۴۴
دیگر مذاہب	یہ میدان ابھی تک خالی ہے	۷
	کبھی عوامی بھیڑ میں سچائی دب جاتی ہے	۵۲
اقتصادیات	اور اس نے جدوجہد شروع کر دی۔	۱۸
	درخواست کے بغیر	۲۷
جدید تحقیقات	آئس برگ سے پانی حاصل کرنے کا منصوبہ	۱۰
معلومات	جنگلات کی اہمیت	۱۷
	روداد سفر	۵۶
دعوت و تعارف	یہ عذر صحیح نہیں	۲۰
	یہ خزانہ دعوتی کام کے لئے دیا گیا ہے	۳۳
نفسیات	انکار کرنے والوں کی نفسیات کیا ہوتی ہے	۲۶
	ان کے پاس ہر بات کی دلیل موجود تھی	۴۸
اسلامی دنیا	ترکی کی جدید تاریخ کا ایک صفحہ	۲۸
سوال و جواب		۳۴
تہذیب حاضر	مشینی اصلاح کی ناکامی	۴۱
صحافت	اس کا اخبار کہاں کہاں پہنچ رہا تھا	۴۳
ادب	لطیفہ	۴۹
آپ بیتی		۵۴
عربی پریس	الرسالہ کا ذکر عربی اخبارات میں	۳

صحفي هندي يكتب:
ملاحظات من ليبيا والعقيد القذافي

نشرت مجلة الرسالة الشهرية الهندية بقلم المفكر الهندي وحيد الدين خان مقالا عن انطباعاته عن زيارته لليبيا التي زارها في شهر فبراير لحضور ندوة الحوار الإسلامي المسيحي .

وبعد ذكر انطباعاته بتفصيل عن ندوة الحوار كتب يقول :

في مساء ٢ فبراير ١٩٧٦ كان نحو خمسمائة مسلم ومسيحي مجتمعين في مسرح التحرير بطرابلس حينما توقفت الحركة فجأة وهرع بعض الناس نحو الباب واخذ المصورون بآلاتهم الثقيلة يتطلعون المصور عرفنا ان الرئيس الليبي العقيد معمر القذافي قد حضر الندوة فجأة .. وحاول بعض الناس ان يأخذوه الى المنصة ، ولكنه جلس

البقية ص ٧

صحفي هندي ـ بقية

على مقعد عادي مع الناس واستمع بنفسه الكلمات التي تلقى في الندوة . كان ذلك رجلا نحيلا ونشيطا بدون لحية على رأسه [illegible] وكان يلبس بدلة عادية بدون ربطة عنق وكان خاليا من اية علامة تدل عليه وكان يجلس بصمت على كرسيه كأي شخص آخر .

واستمرت الكلمات تلقى في الندوة .. وبعد انتهاء فترة من الندوة ، ذهب القذافي الى المنصة بسبب اصرار الناس ، ولم يجلس هناك على كرسي الرئيس بل جلس على كرسي عادي .. وخلال وجوده ذلك المساء تحدث ثلاث مرات عندما طلب الناس ، وكلماته الثلاثة كانت بسيطة وبدون بدون تمهيد وانتهت ايضا كذلك .

وفي ٦ فبراير التقيت بمعمر القذافي ، فقال لي عن ثورة :

قد قرأت كتابك ... الإسلام يتحدى .

وقال له ـ كتاب عظيم ـ وهنا في احد مراجعه يقول : هو مفكر ومؤلف كبير ونحن نقدره ..

ان العقيد القذافي شخص يحتمي البساطة ، ولا يبدو انه يعرف انه يحكم دولة كاملة .

ويقول .. هنا هي الثورة التي اوصلت هذا الشخص البسيط الى مقامه هذا ؟ واجبت بنفسي .. انها ميزة الليل المظلم ــ في ليلة الفاتح من سبتمبر ١٩٦٩ حين خرج هذا البسيط مع زملائه من معسكر قار يونس الى بنغازي ، كانت كل لحظة تمثل لهم خطر الموت .. وان كان الملك السابق ادريس في تركيا في ذلك الوقت ، الا ان قوات امنه ، المزودة بالطائرات ، كانت قادرة على القيام باي اجراء ، ولكن الشباب قبل الفجر استولوا على محطة الاذاعة ليعلن للشعب الليبي : لقد قامت قواتك المسلحة بالاطاحة بالنظام الرجعي المتخلف المتعفن ، وهكذا من الآن تعتبر ليبيا جمهورية حرة ذات سيادة تحت اسم الجمهورية العربية الليبية .

وانتهى المقال بتفاصيل اخرى عن ندوة الحوار الاسلامي المسيحي .

الرسالہ کا ذکر عربی اخبارات میں

امریکی ماہنامہ ریڈرز ڈائجسٹ ۱۳ زبانوں میں چھپتا ہے اور دنیا بھر میں اس کی ۲۹ ملین سے زیادہ کاپیاں فروخت ہوتی ہیں آج ایک دینی اور اصلاحی پرچے کے لئے اس سے بھی زیادہ شاندار امکانات ہیں۔ بشرطیکہ جاننے والے اس کو جانیں اور کرنے والے اس کو کریں۔

لیبیا کے روزنامہ الجہاد (طرابلس) نے اپنی اشاعت ۷ رجنوری ۱۹۷۷ میں الرسالہ کا ذکر کیا ہے وہ لکھتا ہے "ہندستان کے ماہنامہ الرسالہ نے ہندی مفکر وحید الدین خاں کا ایک مقالہ شائع کیا ہے جس میں انھوں نے اپنے لیبیا کے سفر کے تاثرات بیان کئے ہیں۔ وہ پچھلی فروری میں مسلم۔کرسچین ڈائیلاگ میں شرکت کے لئے یہاں آئے تھے۔

"کانفرنس کے بارہ میں اپنے مفصل تاثرات تحریر کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں"۔ اس کے بعد الرسالہ ماہ اکتوبر ۱۹۷۶ء کے صفحہ ۵۵ کالم ۲، اور صفحہ ۵۷ کالم ۱۔۲ کا مضمون نقل کیا ہے جس کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

(ظفر الاسلام خاں)

رائے قائم کرنے سے پہلے تحقیق کیجئے.....

قرآن میں اجتماعی زندگی کے بارے میں جو احکام دیئے گئے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

یا ایہا الذین آمنوا اذا جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا ان تصیبوا قوما بجہالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین (حجرات-۶)

اے ایمان لانے والو، اگر تمھارے پاس کوئی فاسق خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کرلو۔ ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کے اوپر نادانی سے جا پڑو، پھر اپنے کئے پر تم کو پچھتانا ہو

یہ ایک نہایت اہم ہدایت ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خبر لانے والا ناقص خبر لاتا ہے۔ سننے والا اگر اتنی ہی سے رائے قائم کرلے تو وہ ضرور غلط فہمی میں پڑ جائے گا اور اس کی بنیاد پر کوئی اقدام کرے تو شدید امکان ہے کہ وہ ایک شخص کو بے قصور سزا دینے کا مجرم بن جائے۔ اس لئے جو دل خدا سے ڈرتا ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ سنی ہوئی باتوں کی تحقیق کرے۔ خاص طور پر وہ بات جو کسی کے خلاف ہو، اس کو تو بلا تحقیق مان لینا شدید ترین قسم کا اجتماعی گناہ ہے۔ ایسی حرکت وہی کرسکتا ہے جس کا دل خدا کے خوف سے خالی ہو۔ یا اس کے اندر شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی بڑائی کا جھوٹا احساس پیدا ہوگیا ہو، وہ سمجھنے لگا ہو کہ اگر میں نے کسی کے خلاف بے قصور کارروائی کرلی تو وہ میرا کیا بگاڑ لے گا۔

یہاں چند واقعات درج کئے جاتے ہیں جس سے

اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ایک خبر بظاہر صحیح، مگر حقیقۃً بالکل غلط ہوسکتی ہے۔

۱۔ صحیح بخاری میں عبادہ بن الصامت سے روایت ہے۔ انھوں نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد سے نکلے کہ ہم کو لیلۃ القدر کے بارے میں بتادیں کہ وہ کب ہوتی ہے۔ اس اثنا میں دو مسلمان لڑ پڑے۔ پس اس کا علم اٹھا لیا گیا (فرفعت) اس سے شیعہ حضرات نے یہ استدلال کیا ہے کہ لیلۃ القدر صرف ایک بار ہوئی تھی۔ اب وہ ہمیشہ کے لئے اٹھالی گئی ہے۔ بظاہر حدیث کے لفظ "فرفعت" کو دیکھتے ہوئے ان کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کے آگے کے الفاظ اس خیال کی تردید کردیتے ہیں کیونکہ آگے ارشاد ہوا ہے:

وعسی ان یکون خیرا لکم فالتمسوها فی التاسعة والسابعة والخامسة

ممکن ہے اس میں تمھارے لئے بہتری ہو۔ اس لئے اس کو رمضان کی نویں شب، ساتویں شب اور پانچویں شب میں تلاش کرو

یہ فقرہ بتاتا ہے کہ "رفعت" سے مراد یہ ہے کہ اس کی تعیین کا علم اٹھالیا گیا نہ کہ خود لیلۃ القدر کا وجود ختم کردیا گیا۔

۲۔ امام ابوحنیفہؒ ایک باغ سے گزر رہے وہاں کچھ عورتیں گانا گا رہی تھیں۔ ابوحنیفہؒ کو دیکھ کر وہ چپ ہوگئیں۔ انھوں نے فرمایا قد احسنتن (تم نے اچھا کیا) کچھ لوگوں نے جو ساتھ تھے آپ کو ملامت کی کہ آپ گنہگار کی تحسین کررہے ہیں۔ یہ تو معصیت الٰہی کے کام کی حوصلہ افزائی ہے۔

بظاہر یہ اعتراض صحیح معلوم ہوتا ہے مگر جواب

دیکھئے تو بات بالکل بدلی ہوئی نظر آئے گی۔ امام ابوحنیفہؒ نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا جب وہ گا رہی تھیں تب میں نے احسنت کہا یا جب وہ خاموش ہوگئیں تب۔ کہا۔ لوگوں نے جواب دیا جب وہ خاموش ہو چکی تھیں تب کہا۔ آپ نے فرمایا:

اللہ اکبر، اردت احسنت فی السکوت لا فی الغناء۔

میں نے ان کے سکوت کی تحسین کی نہ کہ ان کے غنا کی۔

۳۔ ماہنامہ الوعی الاسلامی (کویت) کے ایک مضمون پر اعتراض کرتے ہوئے اس کے ایک قاری نے لکھا:

لقد ذکرتم فی جوابکم علی خطاب احد القراء فی مجلۃ الوعی الاسلامی العدد الصادر فی اول جمادی الاولی ۱۳۸۶ ان الخلافۃ (الاسلامیۃ) موضوع تاریخی لا یمکن ان یکون لہ صلۃ بحاضرنا

اپنے رسالہ کے ایک قاری کے خط کا جواب دیتے ہوئے آپ نے لکھا ہے کہ خلافت (اسلامی) ایک تاریخی موضوع ہے۔ ہمارے موجودہ حالات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اس کے بعد مکتوب نگار نے ایڈیٹر کو لکھا کہ یہ آپ کا جہل ہو سکتا ہے یا تجاہل۔ ورنہ یہ ایک حقیقت ہے کہ خلافت ایک حکم شرعی ہے مسلمانوں میں اس پر تو اختلاف رائے ہے کہ خلیفہ بنانے کا مستحق کون ہے۔ مگر اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ خلیفہ کا نصب واجب ہے۔

بظاہر یہ اعتراض بہت صحیح معلوم ہوتا ہے، مگر جواب پڑھئے تو وہ بالکل بے بنیاد نظر آئے گا۔ رسالہ کے ایڈیٹر نے جواب میں لکھا کہ ہم نے جس خط کے جواب میں یہ بات لکھی تھی اس میں خلافت کا اصولی مسئلہ زیر بحث نہ تھا۔ بلکہ صرف یہ سوال تھا کہ دور اول میں خلافت حضرت ابوبکر کا حق تھا یا حضرت علی کا۔

الرسالہ اپریل ۱۹۷۷

فالکلام اذن صریح فی انہ کان عن موضوع: من احق بالخلافۃ، ابوبکر ام علی لا عن موضوع الخلافۃ نفسہا

پس واضح ہے کہ یہ گفتگو اس موضوع پر تھی کہ آنحضورؐ کی وفات کے بعد خلافت کے عہدہ کے مستحق ابوبکر تھے یا علی۔ نفس خلافت کا مسئلہ اس میں زیر بحث ہی نہ تھا۔

ایڈیٹر نے لکھا کہ اس مسئلہ پر آج بحث کرنا بے فائدہ ہے۔ جو ہونا تھا، ہو چکا۔ اب ہم کیوں اس بحث میں پڑیں۔ اب تو آج کی خلافت پر گفتگو ہونی چاہئے نہ کہ ماضی کی خلافت پر۔ (الوعی الاسلامی، کویت، اکتوبر ۱۹۶۶)

کوئی شخص جتنی بلندی پر اپنے آپ کو کھڑا کرے اتنا ہی دور تک کا منظر اسے دکھائی دے گا، اسی طرح فہم قرآن کے بھی درجے ہیں۔ کسی شخص کے اوپر کتاب الٰہی کے وہی معانی کھلتے ہیں جن کے لئے اس نے اپنے آپ کو اہل بنایا ہو۔ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أُنزل القرآن علی سبعۃ احرف، لکل آیۃ منہا ظہر وبطن ولکل حد مُطّلع

(مشکوٰۃ، کتاب العلم)

قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا ہے۔ اس کی ہر آیت کا ایک اوپر ہے اور ایک اندر ہے اور ہر حد تک دیکھنے کی ایک جگہ ہے۔

زندگی کا رخ

آخرت کی طرف تصویر

AKHIRAT ORIENTED LIFE

غزوۂ ذات السلاسل کا واقعہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن العاصؓ کو لشکر کا سردار مقرر کیا۔ مگر پورا لشکر بیک وقت تیار نہ تھا۔ آپ نے عمرو بن العاصؓ کو ایک دستہ کے ساتھ پہلے روانہ کر دیا۔ اس کے بعد دو سو مہاجرین و انصار کے ساتھ دوسرا دستہ تیار ہوا اور ابو عبیدہؓ بن الجراح کی سرداری میں روانہ ہوا۔ ان کو جھنڈا دیتے ہوئے آپ نے ان کو جو نصیحتیں کیں، ان میں سے ایک یہ تھی: جب تم اپنے ساتھی (عمرو بن العاصؓ) سے ملو تو تم دونوں مل کر کام کرنا، اختلاف مت کرنا (اذا قدمت علی صاحبك فتطاوعا ولا تختلفا)

ابو عبیدہؓ کا دستہ جب مدینہ سے چل کر عمرو بن العاصؓ کے پاس پہنچا تو نماز کا وقت آگیا تھا۔ صفیں کھڑی ہوئیں، ابو عبیدہؓ نے چاہا کہ امامت کریں۔ عمرو بن العاصؓ نے اس سے اختلاف کیا۔ انھوں نے کہا آپ میری مدد کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ یہ صحیح نہیں کہ آپ میری امامت کریں جب کہ اصل امیر میں ہوں۔ ابو عبیدہؓ کے دستہ کے لوگ، جن میں ابو بکرؓ و عمرؓ بھی تھے، نے کہا کہ عمرو بن العاصؓ اپنے دستہ کے امیر ہیں اور ابو عبیدہؓ اپنے دستہ کے۔ عمرو بن العاصؓ نے اس تقسیم سے اتفاق نہیں کیا، اور کہا: تم لوگ میری مدد کے لئے بھیجے گئے ہو، پس میں ہی قائد ہوں (انما انتم امددت بکم فانا القائد)

اس کے بعد ابو عبیدہؓ بن الجراح نے اپنا حق واپس لے لیا، اور کہا: رسول اللہؐ نے مجھے نصیحت کی تھی کہ تم عمرو بن العاصؓ سے ملو تو جھگڑا مت کرنا، اتفاق کے ساتھ کام کرنا: واللہ ان عصیتنی لاطیعنك خدا کی قسم اگر تم میری بات نہ مانو تب بھی میں تمھاری اطاعت کروں گا۔

یہ میدان ابھی تک خالی ہے

مغربی دنیا میں طبیعی دنیا کی طرف سے مایوسی نے کثیر تعداد میں ایسے لوگ پیدا کر دیئے ہیں جو سائنسی ہو پر ماورائی قوتوں کی تلاش کر رہے ہیں۔ کیلی فورنیا یونیورسٹی میں انسٹی ٹیوٹ آف برین ریسرچ اس کی ایک مثال ہے۔ حتی کہ تخلیقی ذہانت (CREATIVE INTELLIGENCE) موجودہ زمانہ میں ایک مستقل سائنس بن گئی ہے۔ یہی وہ ذہنی زمین ہے جس نے ہندستانی یوگیوں کو موقع دیا ہے کہ وہ مغرب میں اپنے بہت سے شاگرد پا سکیں۔ تاہم اس کے علاوہ اس سے بھی زیادہ بڑے پیمانہ پر ایک اور تلاش جاری ہے۔ یہ ہے دور سائنس کے لئے ایک مذہب کی تلاش۔ آخری حقیقت کیا ہے، مرنے کے بعد انسان کہاں جاتا ہے، مادی دنیا کے ماورا اگر کوئی دنیا ہے تو وہ کیا ہے اور کہاں ہے۔ ان سوالات کا جواب دینے کا میدان ساری دنیا میں ابھی تک خالی ہے۔ دین حق کے حاملین کو موقع ہے کہ اس اہم رول کو ادا کرکے یہاں اپنی جگہ بنا سکیں۔

"محسوس مادہ ہی سب کچھ ہے" یہ نظریہ دو سو برس تک علمی دنیا کو مسحور رکھنے کے بعد انیسویں صدی کے آخر میں ختم ہو گیا۔ اس کے بعد مسلسل ایسے شواہد سامنے آئے جنھوں نے انسان کو مجبور کیا کہ وہ غیر مادی حقائق کو بھی تسلیم کرے۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی جدید ذہنی نظریات ہیں جنھوں نے اقرار کیا ہے کہ دماغ پراسرار طاقتوں کا خزانہ ہے اور دماغی لہروں کے ذریعہ خارجی چیزوں پر اسی طرح اثر انداز ہونا ممکن ہے جس طرح مادی چیزوں کے ذریعہ اس کو یقینی سمجھا جاتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس سلسلے میں امریکہ، انگلستان اور ندرلینڈ وغیرہ میں کثیر تحقیقات ہوئی ہیں اور اب بھی بہت بڑے پیمانہ پر جاری ہیں۔

ان حالات نے ہندستان کے یوگیوں کو موافق زمین فراہم کی ہے کہ وہ مغربی دنیا میں داخل ہوں اور اپنے قدیم فن کو نئے عنوانات کے ساتھ لوگوں میں مقبول بنائیں۔ ان کی کوششوں سے مغربی دنیا، خاص طور پر امریکہ میں ایک نئی "سائنس" وجود میں آگئی ہے جس کو ماورائی مراقبہ (TRANSCENDENTAL MEDITATION) یا مختصر طور پر ٹی ایم (TM) کہتے ہیں۔ اس سائنس کو مغربی دنیا میں پھیلانے کے لئے ہندستان کے یوگی بہت بڑی تعداد میں یورپ اور امریکہ میں کام کر رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک سو سے زیادہ ہندو جماعتیں صرف امریکہ میں متحرک ہیں۔ ایک جائزہ کے مطابق ۱۹۵۸ سے لے کر ۱۹۷۴ تک ساڑھے سات لاکھ لوگوں نے ٹی ایم کی تربیت حاصل کی۔ امریکہ میں ان کی تعداد میں ہر ماہ تقریباً ۲۰ ہزار مردوں اور عورتوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ ہندو سوامیوں کے امریکہ میں اتنے بڑے بڑے ادارے ہیں جن کے اپنے ہوائی اور سمندری جہاز ہیں۔ مہارشی انٹرنیشنل یونیورسٹی کے نام سے آئیووا (امریکہ) میں ایک باقاعدہ جامعہ قائم ہو گئی ہے۔ سویڈن میں ٹی ایم کے طلبہ کو سرکاری فنڈ سے امداد دی جاتی ہے۔ مستند سائنسی جرنل مثلاً سائنٹفک امریکن، امریکن جرنل آف [illegible]

وغیرہ نے پچھلے چار برسوں میں تقریباً ڈیڑھ سو مقالات شائع کئے ہیں جن میں ٹی ایم کے اثرات کا اقرار انسانی عضویات (HUMAN PHYSIOLOGY) پر کیا گیا ہے۔

اکتوبر ۱۹۷۶ کے آخری ہفتہ میں ۲۶ ویں انٹرنیشنل کانگرس آف فزیالوجیکل سائنسز کا اجلاس نئی دہلی میں ہوا تھا۔ اس موقع پر دنیا بھر کے سائنس دانوں کی بڑی تعداد جمع ہوئی۔ یہ اجتماع اتنے بڑے پیمانہ پر کیا گیا تھا کہ اشوکا ہوٹل میں اس کی کارروائیوں کے لئے گیارہ کانفرنس روم مخصوص کرنے پڑے۔ آنے والوں میں متعدد وہ لوگ بھی تھے جو اس ہندستانی سائنس سے متاثر ہیں۔ مثلاً مہارشی انٹرنیشنل یونیورسٹی کے صدر ڈاکٹر آر۔ کے۔ ویلیس (R.K. WALLACE) اور ڈاکٹر لارنس ڈومیش (LAWRENCE DOMASH) وغیرہ۔

کہا جاتا ہے کہ انسانی دماغ میں بے پناہ ایسے مزید امکانات چھپے ہوئے ہیں جن کا عام انسان کو تجربہ نہیں ہوتا۔ ٹی ایم ان امکانات میں داخلہ کا دروازہ ہے۔

عام طور پر انسان اپنے دماغ کو صرف پانچ فی صد تک استعمال کر پاتا ہے۔ مگر ٹی ایم کے ذریعہ یہ ممکن ہے کہ اس کو صد فی صد استعمال کیا جا سکے۔ اپنی دماغی قوت کو کام میں لا کر ایک شخص اپنے سر درد کو دور کر سکتا ہے۔ اور بلڈ پریشر کو تبدیل کر سکتا ہے۔ دماغ اور کمپیوٹر کے درمیان ریڈیائی مواصلات قائم کئے جا سکتے ہیں۔ ٹی ایم کے ذریعہ دوران خون کے نظام، تنفس کے نظام، جسمانی ٹمپریچر کے نظام، تحلیل غذا کے نظام کو متاثر کیا جا سکتا ہے۔ تجربات سے معلوم ہوا ہے کہ تربیت یافتہ یوگی اپنے جسم کے ایک حصہ کا ٹمپریچر اس طرح بدل سکتا ہے کہ دوسرے حصہ کا ٹمپریچر تبدیل نہ ہوا ہو۔ وہ پانی کی غیر معمولی مقدار جسم میں داخل کرکے اس کو ہضم کر سکتا ہے یا قے کے ذریعہ خارج کر سکتا ہے، بعض لوگوں کو ایئر ٹائٹ کمرے میں لمبی مدت کے لئے بند کر دیا گیا اور دیکھا گیا کہ وہ عام انسان کے مقابلہ میں ۵۰ فی صد کم آکسیجن پر زندہ رہ سکتے ہیں۔ نوبل انعام یافتہ برائن جوزف سن (BRIAN JOSEPHSON) نے کہا ہے کہ ٹی ایم کے ذریعہ دماغی توازن پر کنٹرول کیا جا سکتا ہے اور اس طرح غم اور تناؤ سے بچا جا سکتا ہے۔ ٹی ایم کی طرف سائنس دانوں کی توجہ کی خاص وجہ جیسا کہ ڈاکٹر ڈومیش نے کہا ہے، یہ ہے کہ اس کی تعلیم یکساں طور پر ساری دنیا میں دی جا سکتی ہے اور تحقیقات کے جدید سائنسی طریقوں کے ذریعہ اس کا تجربہ کیا جا سکتا ہے۔

ٹی ایم کی اس مقبولیت کو دیکھ کر اس کے بعض پرجوش داعی یہ کہنے لگے ہیں کہ مستقبل کے انسان کا مذہب ہندوازم یا ویدانت ہوگا تاہم ابھی وہ یہ نہیں بتا سکے ہیں کہ ٹی ایم اپنی موجودہ یا آئندہ کی متوقع کامیابیوں کے باوجود کس طرح اس سوال کا جواب ہے جس کے لئے انسان قدیم ترین زمانہ سے ایک مذہب کی تلاش کرتا رہا ہے۔

۱۔ ٹی ایم اپنی نوعیت کے اعتبار سے کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ وہی چیز ہے جس کو مسلم صوفیاء اور دیگر مذاہب کے درویش ذہنی ریاضتوں کے ذریعہ مختلف زمانوں میں حاصل کرتے رہے ہیں۔ ہندوستانی یوگیوں اور سادھوؤں نے بلاشبہ اس فن میں خصوصی کارنامے دکھائے ہیں۔ مگر اس طریقہ کے آخری ممکن استعمال کے بعد بھی انسان کو جو چیز ملتی ہے وہ صرف انسان کی مادی قوتوں میں بعض ذہنی قوتوں کا اضافہ ہے — یہ زیادہ سے زیادہ بس مادی سائنسوں کی ایک توسیع ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ انسان جو اب تک صرف مادی تدابیر کے ذریعہ اپنے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا، وہ اپنی دماغی لہروں یا اپنی ارادی قوت سے بھی خارجی اشیاء پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرنے لگے

الرسالہ اپریل ۱۹۷۷

مگر انسانی قوت کی یہ توسیع اس سوال کا جواب نہیں ہے جس کے لئے انسان ایک مذہب یا اخلاقی نظام کی تلاش کر رہا ہے۔ یہ مسئلہ انسان کی مادی قوت کی توسیع کے بارے میں نہیں بلکہ اس کو کنٹرول کرنے کے بارہ میں ہے مذہبی نقطۂ نظر سے اصل سوال یہ ہے کہ وہ انسانی ارادہ جو کبھی مادی بٹن اور کبھی اپنی دماغی لہروں کو استعمال کرکے خارجی دنیا پر اثر انداز ہوتا ہے خود اس ارادہ کو کس طرح نظم وضبط کے دائرہ میں لایا جائے۔ ایٹمی ملکوں کے فضا رجنگ اگر اپنی دماغی لہروں یا اپنی قوت ارادی کے ذریعے اپنے راکٹوں اور بمبار جہازوں کو متحرک کرنے لگیں تو اس سے اس سوال کا جواب نہیں ملتا کہ دنیا کو ایسے وزنا رجنگ سے کس طرح بچایا جائے جو یہ طاقت رکھتے ہیں کہ چند گھنٹوں کے اندر ساری آباد دنیا کو خاکستر بنا دیں۔

۲۔ مذہبی یا فلسفیانہ اعتبار سے دوسرا مسئلہ جو انسانیت کے سامنے درپیش ہے، وہ یہ کہ اگر اس کائنات میں کوئی ایسی آخری حقیقت ہے جو انسان سے ماورا ہے، تو انسان سے اس کا کیا تعلق ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک علمی دنیا میں یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ انسان سے بالاتر اس کائنات میں کوئی حقیقت نہیں۔ مگر موجودہ صدی میں ایسے کثیر شواہد سامنے آئے ہیں جو انسان یا کائنات کو آخری حقیقت تسلیم کرنے میں مانع ہیں اور اگر براہ راست نہیں تو بالواسطہ طور پر یہ قرینہ پیدا کرتے ہیں کہ اس عالم میں انسان سے بلند تر بھی کوئی حقیقت ہے۔ اس قرینہ کی وجہ سے یہ سوال شدت کے ساتھ انسان کے سامنے آگیا ہے کہ وہ اپنے اور اس آخری حقیقت کے درمیان تعلق کو دریافت کرے۔ یہی وہ سوال ہے جس نے جدید انسان کو دوبارہ مذہب کے مطالعہ کی طرف مائل کر دیا ہے۔

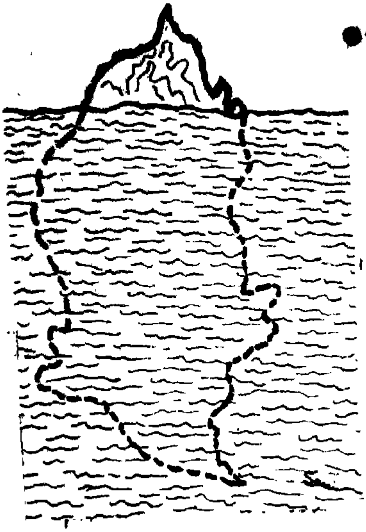
ظاہر ہے کہ ٹی ایم کا اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ انسان اور انسان کے درمیان ایک مخفی رشتہ کی دریافت ہے۔ انسان اور خدا کے درمیان رشتہ کو دریافت کرنا اس کے حدود عمل سے باہر ہے۔ نہ وہ اس کا مدعی ہے نہ اب تک ایسا کوئی قرینہ سامنے آیا ہے کہ اس سے یہ امید کی جا سکے کہ وہ انسان اور خدا کے درمیان رشتہ کو دریافت کرکے مذہب کو غیر ضروری چیز ثابت کر دے گا۔

جنوب مغربی سمت سے ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھائی کرنا اب تک بہت مشکل سمجھا جاتا تھا۔ اگست ۱۹۷۵ میں پہلی بار اس کو ایک برطانوی ٹیم نے سر کیا جس کے قائد کریس بوننگٹن تھے۔ کہا جاتا ہے کہ برطانوی ٹیم کی اس کامیابی کا اہم سبب ایک برطانوی فرم کی ایک ایجاد تھی۔ اس نے بہت ہلکے وزن کے آکسیجن سلنڈر بنائے۔ ان سلنڈروں کے ذریعہ یہ ممکن ہو گیا کہ ایک سو لیٹر آکسیجن ایک ایسے سلنڈر میں رکھا جا سکے جس کا وزن صرف ۴ء۳ کیلو گرام ہو۔ یعنی تقریباً نہیں کے برابر۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قومی زندگی میں کس طرح ایک شعبہ میں کچھ لوگوں کے آگے بڑھنے کے لئے ضروری ہے کہ دوسرے شعبوں میں کچھ دوسرے لوگ آگے بڑھے ہوئے ہوں۔ جس قوم میں سارے لوگ صرف تقریر و تحریر کا کمال دکھانے لگیں، وہ کبھی ترقی کے مقام پر نہیں پہنچ سکتی۔

سعودی عرب

قطب جنوبی سے برف کے کوہ پیکر تودے لاکر اپنی پانی کی ضرورت پوری کرے گا



سعودی عرب اپنے تیل کے ذخیروں سے صنعتی دنیا کی کبھی نہ ختم ہونے والی تیل کی پیاس بجھاتا ہے۔ مگر دو طرف سمندروں سے گھرے ہوئے اس ملک کو میٹھے پانی کے لئے بیرونی دنیا کی ضرورت ہے۔ پانی کی کمی پوری کرنے کے لئے سعودی عرب اس سے پہلے سمندری پانی کو صاف کرنے کا کارخانہ لگا چکا ہے جو کھاری پانی کو صاف کرکے روزانہ ۰ ملین گیلن سے زیادہ میٹھا پانی تیار کرتا ہے۔ اب تازہ ترین خبر یہ ہے کہ برف کے پہاڑ (آئس برگ) جو قطب جنوبی کے سمندروں میں تیر رہے ہیں، ان کو کھینچ کر عرب کے ریگستان میں لایا جائے گا اور ان کو پگھلا کر تازہ پانی حاصل کیا جائے گا۔ یہ منصوبہ کثیر دولت کا متقاضی ہونے کے علاوہ کافی پیچیدہ ہے۔ اس کو رو بعمل لانے کے لئے بیک وقت کئی علوم کی مہارتیں درکار ہیں تاہم سمندر کے کھاری پانی کو میٹھا بنانے کے مقابلہ میں وہ سستا ہوگا۔

یہ منصوبہ سعودی شہزادہ محمد الفیصل اور فرانسیسی ماہر ڈاکٹر وکٹر (PAUL EMIL VICTOR) کے درمیان گفت وشنید کے بعد طے پایا ہے۔ اس منصوبے کے تحت دس کروڑ ٹن کا ایک برف کا تودہ (آئس برگ) ۸۰۰۰ کیلو میٹر کا فاصلہ طے کرکے قطب جنوبی سے سعودی عرب کے ساحل پہنچایا جائے گا۔ اس اندیشہ کے پیش نظر کہ راستہ میں سورج کی گرمی سے وہ پگھل نہ جائے، اس کو پلاسٹک سے ڈھک دیا جائے گا۔ اس برفانی پہاڑ کو کھینچنے کے لئے پانچ قسم کے جہاز استعمال ہوں گے جو نہایت مضبوط ڈوریوں سے تودہ سے بندھے ہوئے ہوں گے۔ برفانی تودہ قطب جنوبی سے چل کر بحر ہند میں داخل ہوگا۔ باب المندب کے پاس کو تودہ کو ٹکڑے کیا جائے گا تاکہ اس تنگ گزرگاہ سے نکل کر وہ بحر احمر میں داخل ہو سکے۔ اس پورے سفر میں تقریباً چھ مہینے لگیں گے جب کہ راستہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور برفانی تودہ حسب نقشہ، فی گھنٹہ ایک سمندری میل کی رفتار سے سفر کرتا رہے۔

اس منصوبہ پر عمل شروع کرنے سے پہلے کئی ابتدائی تیاریاں کرنی ہوں گی۔ سب سے پہلے خلائی مشاہدات کے

ذریعہ برفانی تودہ کی جائے وقوع معلوم کی جائے گی۔ یہ بھی اسی سے حل [illegible] گا کہ اس علاقہ کے سمندروں کی لہریں کدھر سے کدھر جاتی ہیں۔ اس کے بعد ہوائی جہاز ان کے اوپر اڑان کرکے اندازہ کریں گے کہ ان کی لمبائی، چوڑائی اور اونچائی ٹھیک کتنی ہے اور ان کی صورت کیا ہے۔ پھر جب ان کو خاص طرح کے تاروں سے باندھ کر سمندری جہازوں سے کھینچا جائے گا تو اس سلسلے میں توازن کو ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہوگا تاکہ برفانی تودہ ٹوٹ نہ جائے۔ باب المندب پر اس کو کاٹنے کے لئے تھرمل ڈرلنگ کا طریقہ استعمال کیا جائے گا۔ یہ ایسا ہی ہوگا جیسے مکھن کی بڑی ٹکیہ کو باریک تار سے کاٹا جائے۔ ڈاکٹر وکٹر نے بتایا کہ اس منصوبہ پر وہ پچھلے پندرہ سال سے مطالعہ و تحقیق کرتے رہے ہیں اور اب یہ منصوبہ آخری مرحلہ پر پہنچ چکا ہے۔

ساحل عرب پر پہنچنے کے بعد برفانی تودے کے ٹکڑوں کو مختلف مقامات پر منتقل کیا جائے گا۔ سعودی عرب جیسے گرم ملک میں ان برفانی تودوں کو پگھلانے کے لئے کسی مشینی عمل کی ضرورت نہیں۔ وہ سورج کی گرمی سے پگھلتا رہے گا۔ اندازہ ہے کہ ۱۲۰ گز چوڑے تودے کو سورج کی گرمی سے پگھلنے میں ۱۶ سے ۱۸ ماہ تک لگیں گے۔ منصوبہ کامیاب رہا تو ایک برفانی تودہ ایک سال سے زیادہ مدت کے لئے کافی ہوگا۔

یہ منصوبہ صرف پینے کا پانی مہیا کرنے ہی کے لئے کارآمد نہیں ہوگا بلکہ زراعت اور باغبانی اور صنعت میں بھی اس سے کام لیا جا سکے گا۔ ریگستانی علاقوں یا خشک سالی کے زمانوں کے لئے یہ منصوبہ ایک عظیم تحفہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

الرسالہ جولائی ۱۹۷۷

ایک شخص اپنے بچوں کے ساتھ باغ میں داخل ہوا۔ وہاں کیڑے مکوڑے تھے۔ چوہے اور چیونٹیاں تھیں۔ پھر سب کے بیچ میں ایک بھیانک بھیڑیا کھڑا ہوا تھا۔ اس منظر کو دیکھنے کے بعد اس کے منھ سے کیا چیخ نکلے گی۔ وہ بے ساختہ پکار اٹھے گا:

بچو! بھیڑیا۔ بچاؤ اپنے کو بھیڑیے سے۔ بھیڑیے کے بھیانک چہرے کو دیکھنے کے بعد وہ دوسری تمام چیزوں کو بھول جائے گا۔ اس کو ایسا نظر آئے گا گویا سارا باغ بھیڑیا بن گیا ہے۔ اس کے سامنے اس کے سوا کوئی مسئلہ نہ ہوگا کہ بھیڑیے سے بچنے کی تدبیر کرے۔

ہم جس دنیا میں ہیں، اس میں بھی بہت سے مسائل ہیں۔ ویسے ہی جیسے باغ میں کیڑے اور چیونٹیاں۔ مگر انھیں کے بیچ میں ایک سب سے بڑا مسئلہ کھڑا ہوا ہے۔ یہ آخرت کا مسئلہ ہے۔ اگر ہم اس کو جان لیں تو ہم کو پوری کائنات میں آخرت کے سوا کوئی دوسری چیز دکھائی نہ دے۔ اس کے بعد ہم آخرت کے لئے پکاریں گے، نہ کہ "کیڑوں اور چیونٹیوں" کے لئے۔

جانا ہے بہت دور

ایک بزرگ نے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا۔ شروع شروع میں اس تعلیم گاہ کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اساتذہ کو وقت پر تنخواہیں نہ ملتیں۔ طلبا کے لیے بعض اوقات کھانے کا انتظام ناممکن ہو جاتا۔ چھپر کے سایہ کے نیچے تعلیم دی جاتی اس طرح کی بے شمار دشواریوں کے درمیان اس درس گاہ کو سفر کرنا پڑا۔

مگر دشواریاں جس طرح آدمی سے کچھ چیزیں چھینتی ہیں، اسی طرح وہ اسے کچھ چیزیں دیتی بھی ہیں۔ ظاہری اسباب کی کمی عزم وہمت کو بڑھانے کا سبب بنتی ہے۔ ایسے جذبات اس کے اندر پیدا ہوتے ہیں جو فراوانی کے اندر کبھی پیدا نہیں ہوتے۔

اس تعلیمی ادارے کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے۔ ایک روز سارے ادارے میں اداسی چھائی ہوئی تھی۔ حالات بے حد نامساعد نظر آرہے تھے۔ درس گاہ کے ناظم نے طلبا واساتذہ کا ایک اجتماع کیا جب وہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو بے اختیار ان کی زبان سے نکلا۔

"موجودہ حالات میں ممکن ہے آپ کا جی ملامت کرتا ہو کہ آپ کہاں آکر پھنس گئے۔ کسی بنی بنائی درس گاہ میں گئے ہوتے تو آرام سے رہ سکتے تھے۔ مگر یہ گھبرانے کی بات نہیں۔ کیونکہ دوسرے اگر حال کے وارث ہیں تو یہاں آپ ایک نئے مستقبل کی تعمیر کر رہے ہیں لوگ تاریخ خواں ہوتے ہیں مگر آپ کو قدرت نے ایک ایسے مقام پر کھڑا کیا ہے کہ آپ تاریخ ساز بن سکتے ہیں۔"

یہ الفاظ جن حالات میں کہے گئے تھے اس کے اعتبار سے وہاں اس نے بجلی کا کام کیا۔ طلبہ اور اساتذہ میں ایک نیا جوش پیدا ہو گیا۔ وہ زندگی کی ایک اعلیٰ ترین اخلاقی قدر سے آشنا ہوئے۔ یہ کہ مستقبل کی تعمیر کے لیے حال میں جدوجہد کی جائے۔ یہ قدر، نفسیاتی طور پر، اس وقت ان کے لیے لامعلوم رہتی جب کہ وہ ایسے حالات میں نہ ہوتے۔ اسی طرح ناظم درس گاہ کی زبان سے بھی ہرگز یہ الفاظ نہ نکلتے اگر وہ آسودگی اور فارغ البالی میں ہوتے۔ ناظم اسی لیے یہ الفاظ بول سکے اور سننے والے اسی لیے ان کو سمجھ سکے کہ وہ دشوار حالات میں تھے۔ آسانیوں کی فضا میں انھیں یہ سبق نہیں مل سکتا تھا۔

جو لوگ اپنے آپ کو مشکل حالات میں پائیں وہ اسے اپنی بدقسمتی تصور کرتے ہیں حالانکہ یہ صرف سمجھنے کی غلطی ہے اگر صحیح ذہن ہو اور عزم بیدار ہو تو مشکل حالات اس سے زیادہ بڑی چیزیں دیتے ہیں۔ جو آسانیوں اور راحتوں میں کسی کو ملتی ہے۔ دشواریاں آپ کو اعلیٰ ترین انسانی قدروں سے آشنا کرتی ہیں۔ آپ کے اندر سوز و درد پیدا کر کے آپ کے کلام کو بے پناہ بنا دیتی ہیں۔ مشکلات کو عبور کرنے کا نیا ولولہ پیدا کرتی ہیں اور بالآخر آپ کو ان بلند ترین انسانوں میں شامل کرتی ہیں جن کو تاریخ خواں کے مقابلے میں تاریخ ساز کہا جاتا ہے۔

اوپر جس واقعہ کا حوالہ دیا گیا، وہ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا واقعہ ہے، اور جس نے مذکورہ تقریر کی، وہ مولانا مجیب اللہ ندوی تھے۔ اب خدا کے فضل سے یہ ادارہ "چھپر" کے دور سے نکل کر "بلڈنگ" کے دور میں داخل ہو گیا ہے اور تعلیم کے میدان میں ملت کو ایک نئی راہ دینے کے لیے کوشاں ہے۔ ہر بار جب کوئی شخص نیا کام شروع کرتا ہے تو اس میں تذبذب کا مرحلہ لازماً آتا ہے، لیکن اگر وہ جاری رہے تو استحکام کے مرحلہ پر پہنچنے سے بھی کوئی اسے روک نہیں سکتا۔

یہ تھا مشرکین عرب کا کردار

۱۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت (۶۱۰) ہوئی تو ایران کی ساسانی سلطنت اور روم کی بازنطینی سلطنت کے درمیان تصادم جاری تھا۔ اس دوطرفہ جنگ میں تقریباً بیس سال گزر گئے۔ ابتداءً ایرانیوں کو غلبہ حاصل ہوا۔ ۶۱۵ تک رومی سلطنت کے تقریباً تمام شمالی مقبوضات اردن، شام، فلسطین، عراق، مصر، سب ایرانیوں کے قبضہ میں چلے گئے

یہ ٹھیک وہی وقت تھا جب کہ مکہ میں اسلام اور غیر اسلام کے درمیان کشمکش جاری تھی۔ یہ کشمکش اتنی شدید ہو چکی تھی کہ ۶۱۵ میں مکہ کے مسلمانوں کی بڑی تعداد کو اپنا وطن چھوڑ کر پڑوسی ملک حبش چلا جانا پڑا۔ ایسے حالات میں اہل کتاب رومیوں کے مقابلہ میں بت پرست ایرانیوں کی فتح مکہ والوں کے لئے گفتگو کا خصوصی موضوع بن گئی مشرکین نے مسلمانوں سے کہا کہ جس طرح پڑوس کے ملکوں میں بت پرست لوگ آسمانی کتاب کے حاملین پر غالب آئے ہیں، اسی طرح ہم بھی تمھارے اوپر غالب آجائیں گے۔ عین اس وقت قرآن کی سورہ نمبر ۳۰ اتری اور اعلان کیا گیا کہ چند سالوں کے بعد دوبارہ انقلاب آئے گا اور رومی سلطنت ایرانیوں کے اوپر غالب آجائے گی۔

سورہ روم کی یہ آیتیں مکہ والوں کے لئے مذاق کا نیا موضوع بن گئیں۔ ابی بن خلف نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کہا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر تم کو یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا تو آؤ مجھ سے شرط کر لو۔ اس نے اپنی طرف سے یہ شرط رکھی کہ رومی اگر تین سال کے اندر غالب آگئے تو میں دس اونٹ تمھیں دوں گا۔ اور اگر اس کے خلاف ہوا تو تم دس اونٹ مجھے دینا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ قرآن میں بضع سنین کا لفظ ہے اور عربی میں بضع کا اطلاق دس سے کم پر ہوتا ہے۔ اس لئے دس کے اندر کی شرط کرو اور اونٹوں کی تعداد بڑھا کر ایک سو کر دو۔ حضرت ابوبکر نے دوبارہ آکر ابی بن خلف سے یہ بات کہی۔ وہ راضی ہو گیا کہ دس سال کے اندر دونوں میں سے جس کی بات غلط ثابت ہوگی وہ دوسرے فریق کو سو اونٹ دے گا۔

قرآن کی پیشین گوئی لفظ بلفظ پوری ہوئی۔ نو سال بعد قیصر روم نے ۶۲۴ میں ایرانیوں کو نینوی (عراق) کے مقام پر فیصلہ کن شکست دی اور اپنے تمام چھینے ہوئے علاقے ایرانیوں سے واپس لے لئے۔

اس مدت میں مکہ کی کشمکش اس نوبت کو پہنچ چکی تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے تمام ساتھی مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے گئے۔ دونوں فریقوں کے درمیان کشمکش اس شدید نوبت کو پہنچی کہ ۶۲۴ میں جنگ بدر واقع ہوئی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح ہوئی، اور مشرکین مکہ کے اکثر بڑے بڑے سردار مارے گئے۔

اس سخت ترین ہیجانی فضا میں رومیوں کے غلبہ کی خبر آتی ہے۔ بدر کی شکست نے مکہ والوں کی دشمنی کو جنون کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ مگر حضرت ابوبکرؓ نے جب ابی بن خلف کے پاس پیغام بھیجا کہ ہماری بات پوری ہوگئی اس لئے تم شرط کے مطابق مجھے ایک سو اونٹ

ملکر وہ تو مکہ میں کسی نے مخالفت نہ کی، اور ابی بن خلف نے کسی قسم کی تکرار کے بغیر پورے ایک سو اونٹ ابوبکر صدیق کے پاس بھیج دیئے۔ جب یہ اونٹ مدینہ پہنچے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو حکم دیا کہ ان کو صدقہ کر دو۔

سخت ترین دشمنی کے باوجود مشرکین عرب اس بات سے ناواقف تھے کہ شرط کے مطابق اپنے حریف کو ایک سو اونٹ نہ دینے کے فرضی بہانے تلاش کریں۔ یا ان کی تعداد میں کمی کرنے کی کوشش کریں۔ وہ ایک ہی بات جانتے تھے: جو بات طے ہو گئی ہے اس کو پورا کرنا ہے۔ خواہ وہ اپنے دوست کے ساتھ ہو یا دشمن کے ساتھ۔

۲۔ صلح حدیبیہ کے بعد ذی الحجہ ۶ھ میں آپ نے ارادہ فرمایا کہ امراء اور سلاطین کے نام دعوتی خطوط بھیجے جائیں۔ اس سلسلے میں تقریباً ایک ماہ ضروری تیاری میں صرف ہوا۔ اور محرم ۷ھ ہجری میں آپ نے ۸ بادشاہوں کے نام اپنے سفیروں کے ذریعہ خطوط روانہ کئے۔

انھیں میں سے ایک خط ہرقل قیصر روم کے نام تھا جس کی سلطنت اس وقت شام سے لے کر قسطنطنیہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے پاس دحیہ کلبی خط لے کر گئے۔ ہرقل کو اس زمانہ میں ایران کے مقابلہ میں فتح حاصل ہوئی تھی اور اپنی نذر کے مطابق پیدل چل کر فلسطین آیا ہوا تھا۔ ہرقل کی خدمت میں آپ کا خط پیش کیا گیا تو اس نے حکم دیا کہ اس علاقہ میں عرب کا کوئی شخص آیا ہو تو اس کو میرے سامنے پیش کرو۔ اتفاق سے ابوسفیان (جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے اور ابوجہل کے بعد مشرکین مکہ کے سب سے بڑے لیڈر تھے) اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ بغرض تجارت شام آئے ہوئے تھے۔ ان کو ڈھونڈ کر لایا گیا۔ قیصر نے کہا، تمہارے یہاں جس آدمی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، میں اس کی بابت تم سے سوال کروں گا تم اپنے علم کے مطابق اس کا جواب دو۔

اس موقع پر ہرقل اور ابوسفیان کے درمیان جو گفتگو ہوئی، وہ سیرت کی تمام کتابوں میں موجود ہے۔ اس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ابوسفیان کے نزدیک ان کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ وہ آپ کو مکمل طور پر ختم کرنے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔ مگر ساری گفتگو میں ابوسفیان نے ایک بھی غلط بات نہیں کی: چند سوال و جواب یہ تھے:

ہرقل: محمد کا نسب کیسا ہے

ابوسفیان: شریف و عظیم

ہرقل: کیا اس شخص پر کبھی جھوٹ بولنے کی تہمت لگائی گئی۔

ابوسفیان: کبھی نہیں۔

ہرقل: ان کے ماننے والوں کی تعداد گھٹ رہی ہے یا بڑھ رہی ہے۔

ابوسفیان: بڑھ رہی ہے۔

ہرقل: وہ کس بات کی تعلیم دیتے ہیں۔

ابوسفیان: وہ توحید اور حسن اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں۔

ہرقل: کیا وہ عہد کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں

ابوسفیان: نہیں

ابوسفیان کہتے ہیں کہ میں نے کسی سوال کے جواب میں غلط بیانی نہیں کی اور نہ طعن کیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میرے

ساتھی مجھے جھوٹا کہیں گے۔ صرف آخری سوال کے جواب میں وہ اتنا اضافہ کرسکے: "اس سال ہمارے ان کے درمیان ایک معاہدہ (حدیبیہ) ہوا ہے، دیکھئے اس میں وہ کیا کرتے ہیں"۔

اس سوال و جواب کے وقت ابوسفیان اور ان کے ساتھی مشرک تھے اور سب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سخت ترین دشمنی تھی۔ مگر ان کو یہ گوارا نہ تھا کہ آپ کے بارہ میں کوئی غلط بیان دیں یا آپ کو مطعون کرنے کی کوشش کریں۔

۳۔ نبوت کے دسویں سال آپ کے چچا ابوطالب کا انتقال ہوگیا۔ اب خاندانی رسم کے مطابق عبدالعزیٰ (ابولہب) بنی ہاشم کا سردار منتخب ہوا جو اس وقت خاندان کا سب سے بزرگ آدمی تھا۔ ابولہب آپ کے خاندان میں آپ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ شعب ابی طالب کے مقاطعہ کے زمانہ میں سارے خاندان بنی ہاشم نے آپ کا ساتھ دیا تھا۔ صرف ایک ابولہب تھا جو آپ سے الگ رہا۔ اب جب کہ ابولہب کو خاندان کے سردار کا مقام بھی مل گیا، اس نے آپ کو خاندان سے خارج کردیا۔ خاندان سے خارج کیا جانا قدیم عرب میں بدترین سزا تھی۔ اس کے بعد آدمی بالکل تنہا ہو جاتا تھا جبکہ قبائلی نظام میں خاندانی پناہ کے سوا کوئی پناہ نہ تھی جس کے تحت آدمی محفوظ طور پر اپنی زندگی گزار سکے۔ چنانچہ اس کے بعد مکہ میں لوگوں کی مخالفتیں بہت بڑھ گئیں۔ اس سے پہلے زیادہ تر زبانی طنز و تشنیع کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ اب جارحانہ قسم کی سختیاں شروع ہوگئیں۔ یہ حالات دیکھ کر آپ نے ارادہ کیا کہ عرب کے دوسرے بڑے شہر طائف جائیں اور وہاں کے لوگوں سے پناہ کی درخواست کریں۔

آپ مکہ سے پیدل چل کر طائف پہنچے جو مکہ کے جنوب مشرق میں ۶۵ میل پر واقع تھا۔ امید کے خلاف وہاں کے لوگوں نے بہت برا برتاؤ کیا۔ نہ صرف یہ کہ آپ کو پناہ دینے پر تیار نہ ہوئے بلکہ آپ کو پتھر مار مار کر بستی سے نکل جانے پر مجبور کردیا۔ حتیٰ کہ آپ کو وہاں کے لوگوں سے کہنا پڑا کہ دیکھو یہ خبریں مکہ نہ پہنچنے پائیں۔ ایک طرف اپنے وطن مکہ میں زمین کا تنگ ہوجانا، دوسرے طائف والوں کا وحشیانہ سلوک، ان واقعات نے آپ پر شدت سے اثر کیا۔ طائف سے واپسی پر آپ نے اپنے رب سے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے:

اللھم الیک اشکو ضعف قوتی وقلۃ حیلتی و

عرب کے مشرکین نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کی شدید مخالفت کی لڑائیاں لڑیں۔ آپ کو اپنے وطن سے نکالا۔ مگر انھوں نے کبھی آپ کے خلاف کوئی ذلیل حرکت نہیں کی۔ آپ کو اپنے مخالفین کی طرف سے ذلیل اور رکیک حرکتوں کا تجربہ صرف ہجرت کے بعد ہوا جب کہ آپ کا سابقہ یہود کے ساتھ پیش آیا جو کتاب الٰہی کے حامل تھے، جو اپنے کو نبیوں کا وارث کہتے تھے، جو گویا اس وقت کے مسلمان تھے!

وھوانی علی الناس یا ارحم الراحمین

خدایا میں تجھی سے اپنی قوت کی کمی اور اپنی بےسروسامانی اور لوگوں کی نظر میں حقیر ہونے کی شکایت کرتا ہوں۔

طائف سے واپسی کے بعد کوئی دوسری جگہ نہ تھی جہاں آپ جائیں۔ کیونکہ مکہ سے نکالے ہوئے ایک شخص کو پناہ دینے کا کام طائف جیسے بڑے شہر کا کوئی سردار ہی کر سکتا تھا۔ مجبوراً آپ نے دوبارہ مکہ کا رخ کیا اور شہر کے باہر غار حرا میں اپنے خادم زید بن حارثہ کے ساتھ مقیم ہوئے۔

اب سوال یہ تھا کہ کیا کریں۔ چند روز کے غور و فکر کے بعد آپ نے مکہ کے ایک سردار مطعم بن عدی کے پاس پیغام بھیجا کہ میں غار حرا میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ تم مجھ کو اپنی پناہ میں لے لو تاکہ مکہ میں آکر رہ سکوں۔ مطعم ایک کافر تھا اور بدر سے پہلے کفر ہی کی حالت میں اس کا انتقال ہوا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت اس کے قومی دشمن کی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر جب آپ نے اس سے حفاظت طلب کی تو اس کے لئے ناممکن ہو گیا کہ وہ آپ کو اپنی حفاظت میں لینے سے انکار کر دے۔ اس کے چھ جوان لڑکے تھے۔ اس نے تمام لڑکوں کو حکم دیا کہ تم تلوار لے کر جاؤ اور محمد کو اپنی حفاظت میں مکہ لے آؤ۔ چنانچہ اس کے یہ لڑکے غار حرا پہنچے اور ان کی تلواروں کے سایہ میں آپ دوبارہ مکہ میں داخل ہوئے۔ مکہ میں آکر آپ نے سب سے پہلے کعبہ کا طواف کیا۔ جب آپ طواف میں مشغول تھے تو مطعم بن عدی نے دروازہ پر کھڑے ہو کر اعلان کیا:

"میں نے محمدؐ کو پناہ دی ہے، خبردار کوئی انھیں تکلیف نہ پہنچائے"

مطعم بن عدی ایک کافر و مشرک تھا، نیز آپ کے دشمن گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر جب آپ نے اس سے پناہ طلب کی تو اس کے لئے ناممکن ہو گیا کہ آپ کو پناہ دینے سے انکار کر دے۔

یہ تھا کردار ان لوگوں کا جو مشرک و کافر کہے جاتے ہیں۔

طبقات ابن سعد (جلد ۱، صفحہ ۱۶۳) میں زہری سے منقول ہے کہ ایک یہودی نے کہا کہ تورات میں پیغمبر آخرالزماں کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں، وہ سب میں نے آپ کے اندر دیکھ لئے تھے۔ صرف ایک وصف باقی تھا۔ اور وہ تھا حلم و بردباری۔ چنانچہ اس کے تجربہ کے لئے میں نے آپ کو ۳۰ دینار قرض دیئے۔ اس کے بعد میں خاموش رہا۔ یہاں تک کہ جب مدت پوری ہونے میں صرف ایک دن باقی تھا، میں آپ کے یہاں پہنچا اور سختی سے تقاضا کیا۔ میں نے کہا میرا حق ادا کیجئے، اور میں جانتا ہوں کہ عبدالمطلب کا خاندان تو ہمیشہ کا ٹال مٹول کرنے والا ہے۔

اس وقت عمر فاروقؓ آپ کے ساتھ تھے۔ یہودی کی زبان سے یہ جملہ سنتے ہی غضب ناک ہو گئے اور کہا: اگر رسول اللہ کا خیال نہ ہوتا تو میں تیری گردن مار دیتا۔ یہ سن کر آپؐ نے فرمایا: غفر اللہ لک یا ابا حفص، نحن کنا الی غیر ھذا منک احوج، تامرنی بحسن القضاء وتامرہ بحسن الطلب

اے ابو حفص، خدا تمہیں معاف کرے۔ ہم تم سے ایک اور سلوک کے زیادہ محتاج تھے۔ تم مجھ سے بہتر ادائیگی کے لئے کہتے اور اس کو نصیحت کرتے کہ بہتر طریقے سے طلب کرو۔ ...

جنگلات کی اہمیت

اگر ہمالیہ کے تمام جنگلات تباہ کر دیے جائیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ہمالیہ سے نکلنے والے دریا جیسے گنگا اور جمنا دہلی اور ان تمام علاقوں کو زیر آب کر دیں گے جن میں یہ دریا گزرتے ہیں اور ہمالیائی ڈھلانوں میں بہتے ہوئے ان دھاروں سے جو ملبہ بہہ کر اکٹھا ہوگا اس سے دریاؤں کی سطح میں متواتر اضافہ ہوتا رہے گا اس طرح جنگلات ان دریاؤں میں ایسا نظم و ضبط قائم رکھتے ہیں جس سے پہاڑ اپنی صحیح پوزیشن میں قائم رہتے ہیں، دریاؤں کے آس پاس سبزہ و نباتات کو تباہ کرنے سے ہمارے بہت سے اہم باندھوں میں کٹاؤ کی رفتار تیز ہوتی ہے۔

سیلابوں سے ہماری فصلوں کو ہر سال ایک ارب روپے کا نقصان پہنچتا ہے اس کے علاوہ زمین کے کٹاؤ سے جو بالواسطہ نقصان ہوتا ہے وہ بھی بھاری نقصان ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس سے زمین کی زرخیزی کو تقریباً ۷ ارب روپے کی مالیت کا نقصان پہنچتا ہے۔ اس سے ہر سال ۶۰ ارب ٹن وزنی مٹی ادھر سے ادھر ہو جاتی ہے۔

راجستھان میں جو کچھ بچی کھچی ہریالی رہ گئی ہے اگر اسے ختم کر دیا جائے تو دہلی پر اس کا تباہ کن اثر ہوگا۔ دہلی والے اگر ریت کے تلے نہ دبیں تو ریت سے آلودہ ہو جائیں گے بابل اور میسوپوٹیمیا میں ایسا ہو چکا ہے۔

زراعت اور جنگلات ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ کیونکہ جنگلات زمین کی زرخیزی، آب پاشی اور سب سے بڑھ کر ایک قدرتی توازن کے ذریعہ اس کی زرعی پیداوار کو برقرار رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ جنگلات زراعت کو کیڑے مکوڑوں اور پودوں کی بیماریوں سے بچاتے ہیں۔ تقریباً ۳ کروڑ ۹۰ لاکھ قبائل کے لیے جنگلات گھر اور مسکن ہیں۔

ماحول کی آلودگی اور کثافت جو شہری علاقوں میں نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔ جنگلات میں درختوں کی موجودگی سے کم ہو جاتی ہے۔ دہلی کے تمام درخت اکھاڑ پھینکے جائیں تو موسم گرما میں دہلی کا کیا حال ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک گرم بھٹی سے کم نہ ہوگی۔

ملک کی ترقی کے لیے جنگلات کی مسلم اہمیت ہونے کے باوجود جنگلات پر برائے نام ہی سرمایہ کاری کی گئی ہے جس کا تناسب صرف ۰.۶ فی صد ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ محکمہ جنگلات سے صرف ۱.۲ فی صد آمدنی ہوتی ہے۔ کاغذی طور پر ہندوستان کا ۷½ کروڑ ہیکٹر زمینی رقبہ جنگلات پر مشتمل ہے جو مکمل زمینی رقبہ کا ۲۳ فی صد حصہ ہے لیکن منافع بخش جنگلاتی رقبہ اس سے آدھا ہے۔ جاپان میں جنگلات کے فی کس رقبہ کی شرح 0.24 ہیکٹر فی کس، آسٹریلیا میں 9.7 ہیکٹر فی کس اور مجموعی طور پر پوری دنیا میں 1.04 ہیکٹر فی کس ہے جب کہ ہندوستان میں اس کا تناسب صرف 0.13 ہیکٹر فی کس ہے جنگلات کی موجودہ غیر اطمینان بخش آمدنی سے یہ صورت حال اور بھی ابتر ہو جاتی ہے۔

ماہرین کا اندازہ ہے کہ جنگلات کی پیداوار موجودہ پیداوار کے مقابلہ میں دس گنا بڑھائی جا سکتی ہے۔ جنگل قدرت کی ایک عظیم نعمت ہے مگر ہم نے ابھی اس سے بہت کم فائدہ حاصل کیا ہے۔

اور اس نے مستقبل کے لئے جدوجہد شروع کر دی

رات کا وقت تھا بارش پورے عروج پر تھی ہوا کے تیز و تند جھکڑ چل رہے تھے، سردی سے جسم اکڑا جاتا تھا۔ جھونپڑے کی ٹپکتی ہوئی چھت پر سے پانی کی بوندیں اس پر پھلوں کی مانند برس رہی تھیں۔ لیکن وہ ہر چیز سے بے خبر زمین پر پڑا اپنے ماضی کی یاد میں کھویا ہوا تھا۔ پچھلے تمام نقوش اس کی آنکھ کے سامنے گزرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا جسے نمونیا جیسے ہولناک مرض نے اپنے دامن میں سلا لیا تھا۔ وہ اپنی ماں کو دیکھ رہا تھا جس نے اسی جھونپڑے میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ دیا تھا وہ اپنی بہن کو دیکھ رہا تھا جو اسی جھونپڑے میں سردی سے اکڑ کر مر گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑا مگر ان آنسوؤں کی کوئی قیمت نہ تھی۔

اچانک اس کے ذہن نے کروٹ لی اور وہ ماضی کو بھول کر مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا اس کا بھی یہی حشر ہوگا جو اس کے بدقسمت ماں باپ کا ہوا ہے۔ ؟ کیا یہ ظالم موت اسے بھی اپنی آغوش میں سلا لے گی ؟ نہیں نہیں، میں موت سے پنجہ کشی کروں گا اور اس سے اپنے ماں باپ اور بہن کا انتقام لوں گا۔"

اس کے ذہن نے پھر ایک غوطہ لگایا اور تعلیم کے سمندر میں جا پہنچا اب اس نے اپنے آپ سے سوال کیا "جعفر تم کب تک جاہل رہ کر زندگی کے بقیہ دن کاٹو گے اس سے بہتر ہے کہ تم اسکول میں داخل ہو جاؤ ؛ لیکن میں تو غریب لڑکا ہوں میں کیسے اسکول میں داخل ہو سکتا ہوں"؟ اس کے دل نے سرگوشی کی۔ اس کے ذہن نے فوراً جواب دیا "تم اپنے رکھے ہوئے پیسوں سے خوانچہ

کیوں نہیں لگا لیتے۔ تاکہ نفع کما کر تم اپنی تعلیم کو جاری رکھ سکو اور آئندہ ڈاکٹر بن کر خلق کی خدمت کر و تاکہ کوئی بھی تمہارے ماں باپ اور بہن کی طرح اس ظالم موت کا شکار نہ ہونے پائے"

اب اس نے مستقبل کی جدوجہد شروع کر دی ایک ایسی جدوجہد جو ایک دو تین چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ نو، دس گیارہ، بارہ، تیرہ، چودہ، پندرہ ــــ پورے پندرہ برس میں مکمل ہونے والی تھی۔ یہ ایک پندرہ سالہ منصوبہ تھا۔ پندرہ سالوں کے بعد وہ دن آنے والا تھا جب وہ باقاعدہ ڈاکٹر بن کر مخلوق کی خدمت کرے اور دنیا سے اپنے لیے زندگی کا حق وصول کر سکے۔

وہ شام سے رات گئے تک خوانچہ فروشی کرتا اور دن کو اسکول میں پڑھتا۔ اس طرح اس نے میٹرک کیا۔ وہ میٹرک میں فرسٹ آیا۔ سارے اسکول میں اس کی فرسٹ پوزیشن تھی۔ اب اس کو اسکالرشپ ملنے لگا۔ اس نے خوانچہ فروشی چھوڑ دی اور اپنے وقت کو اور زیادہ تعلیم میں صرف کرنے لگا وہ اپنی محنت کی بدولت ہر سال اوّل آتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے ڈاکٹری کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کر لیا۔

اب وہ ایک ڈاکٹر تھا۔ شہر کا سب سے زیادہ کامیاب ڈاکٹر۔ "مجھے ڈاکٹر کس چیز نے بنایا" کبھی کبھی وہ اپنے دل میں سوچتا۔ "صرف ایک چیز نے ـــ میرے مشکل حالات نے مجھے ڈاکٹر بنایا ہے۔ مجھ پر حالات کا جو سخت دباؤ پڑا اگر وہ نہ ہوتا تو شاید میرے اندر وہ زبردست محرک اور قوت عمل پیدا نہ ہوتی جس نے مجھ کو اتنی محنت اور لگن پر لگائے رکھا اور بالآخر ڈاکٹر بنا کر چھوڑا۔" اس نے اپنے دروازہ پر تختی لگا دی جس پر لکھا ہوا تھا۔ مشکلات سے نہ گھبرایئے۔ مشکلات آپ کے لئے ترقی کا زینہ ہیں۔"

لقاء مع مسیحی دخل الاسلام



طرابلس (لیبیا) کی مسلم مسیحی کانفرنس (فروری ۱۹۷۶) میں جو لوگ شریک ہوئے، ان میں ایک یوسف مظفر الدین بھی تھے۔ یہ شمالی امریکہ کے باشندے ہیں۔ وہ ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوئے، اور ۱۹۶۲ میں اسلام قبول کر لیا۔

انھوں نے ایک ملاقات میں بتایا کہ میرے جیسے تقریباً ایک ملین امریکی ہیں جو عیسائیت سے نکل کر اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔ آج امریکہ کو، اپنی ساری ترقیوں کے باوجود بے شمار قسم کے سماجی اور خاندانی مسائل درپیش ہیں۔ ہر امریکی ان کے بارے میں سوچتا ہے۔ مگر اپنے آبائی مذہب میں اس کو ان مسائل کا حل نظر نہیں آتا۔ اس لئے وہ یا تو غیر مطمئن رہتا ہے یا عیسائیت کو چھوڑ کر دوسرے مذہب کو اختیار کر لیتا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ امریکی معاشرہ اور مسیحی چرچ دن بدن ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ امریکی معاشرہ کی بے اطمینانی اور مسیحی چرچ کا اس کا جواب پیش کرنے سے قاصر رہنا ہے۔ ان حالات نے امریکی باشندوں میں دین فطرت کی تبلیغ واشاعت کے کام کے لئے وسیع میدان کھول دیا ہے۔ مگر سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہمارے پاس اسلامی لٹریچر نہیں۔ آج کا انسان جس اسلوب اور جس نہج پر کسی چیز کے مطالعہ کا عادی ہے، اس زبان اور اسلوب میں اسلام پر کتابیں نہیں ملتیں۔

شمالی امریکہ میں ۱۹۷۱ میں ایک اسلامی تنظیم قائم ہوئی ہے اس کا خاص مقصد امریکہ میں اسلام کی تبلیغ واشاعت ہے۔ یوسف مظفر الدین اس تنظیم کے صدر ہیں۔ اس تنظیم کو اپنے کام کے سلسلے میں حکومت کی طرف سے طرح طرح کی مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ حتی کہ ان کے بیان کے مطابق، بہت سے نومسلم امریکی مختلف الزامات کے تحت جیلوں میں بند کر دئے گئے ہیں۔ اس طرح نہ صرف ان کو قبول اسلام کی سزا دی جا رہی ہے بلکہ ان کو اس امر سے بھی روک دیا گیا ہے کہ وہ ملک میں اپنی دعوتی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں۔ انھوں نے کہا ہماری کوشش یہ ہے کہ امریکہ میں اسلامی دعوت کی تحریک اتنی طاقتور ہو جائے کہ وہ اس قسم کی شکلوں سے نمٹ سکے۔ پھر بھی اگر ہم ناکام رہے تو ہم دوسرے اسلامی ملکوں سے رابطہ قائم کریں گے اور اس سلسلہ میں ان سے مدد حاصل کریں گے وہ امریکہ سے ایک اسلامی اور دعوتی ماہنامہ کی اشاعت کر رہے ہیں۔

یہ عذر صحیح نہیں

"مسلمان خود ہی اسلام کو چھوڑے ہوئے ہیں پھر وہ کس منہ سے دوسروں کو اسلام کا پیغام دے سکتے ہیں" اس اعتراض کا دین و شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ ہے آپ نے عرب میں کام شروع کیا تو ایک طرف آپ تھے، دوسری طرف شرک و کفر میں مبتلا لوگ۔ مگر دوسرے انبیاء "بگڑے ہوئے مسلمانوں" کے درمیان مبعوث ہوئے۔ اس معاملہ میں انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ ہمارے لئے اسی طرح اسوہ ہے جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اسوہ ہے کیونکہ قرآن میں صراحتہً حکم دیا گیا ہے: فبھداھم اقتدہ (ان کے طریقہ کی پیروی کر)

یہاں ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مثال پیش کریں گے۔ وہ مصر میں بنی اسرائیل کے درمیان مبعوث ہوئے تھے۔ امت محمدی کے وجود میں آنے سے پہلے بنی اسرائیل اسی طرح "مسلمان" تھے جس طرح اب اصطلاحاً آپ کی امت کو مسلمان کہا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ بنی اسرائیل اس زمانہ میں اس مقام دعوت پر تھے جس پر آپ کی بعثت کے بعد امت مسلمہ کو فائز کیا گیا ہے۔ جس خصوصیت کے لئے امت مسلمہ کو "خیر امت" کہا گیا ہے اسی خصوصیت کے لئے ان کے حق میں فضلتکم علی العالمین (بقرہ - ۴۷) کے الفاظ آتے ہیں۔ یہ ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ کی بعثت کے وقت بنی اسرائیل میں وہ ساری کمیاں پوری طرح موجود تھیں جو آج مسلمانوں میں نظر آتی ہیں، مگر اس کے باوجود غیر مسلموں پر تبلیغ حق کے کام کو موخر نہیں کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف یہ حکم دیا کہ بنی اسرائیل کی دینی و اخلاقی اصلاح کی مہم چلائی جائے۔ (یونس - ۸۷) دوسری طرف اسی کے ساتھ انھیں یہ حکم بھی دیا گیا کہ وہ مصر کی قبطی قوم کو خدا کا پیغام پہنچائیں:

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى

فرعون کے پاس جا کیونکہ وہ سرکش ہو گیا ہے

یہ نہیں کہا گیا کہ تم چونکہ خود اسلام سے دور ہو اس لئے فی الحال صرف دینی اصلاح میں مشغول رہو بلکہ اپنی داخلی اصلاح کے ساتھ بیک وقت غیر مسلم قوم کو خطاب کرنے پر بھی انھیں مامور کیا گیا۔

"پہلے مسلمانوں کو تیار کرو" کے ذہن کے تحت ہمارے یہاں بے شمار کام ہو رہے ہیں، حتیٰ کہ بعض ایسے

یسعیاہ نبی کی زبان سے بائبل میں کہا گیا ہے:

"خداوند فرماتا ہے کہ تم میرے گواہ ہو اور میرے خادم بھی جسے میں نے برگزیدہ کیا تاکہ تم جانو اور مجھ پر ایمان لاؤ۔ میرے سوا کوئی بچانے والا نہیں۔ سو تم میرے گواہ ہو" یسعیاہ ۴۳: ۱۲-۱۰

گویا اہل ایمان کی بیک وقت دو ذمہ داریاں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ خود خدا کے خادم اور فرماں بردار بنیں۔ دوسرے یہ کہ وہ قوموں کے اوپر خدا کے دین کے گواہ ہوں تاکہ، بائبل کے الفاظ میں، جب تمام قومیں فراہم کی جائیں اور سب امتیں جمع ہوں تو یہ لوگ خدا کی طرف سے سب کے اوپر گواہ بن کر کھڑے ہو سکیں۔

کام بھی ہیں جس کے بانی اول کا انتقال ۱۹۰۹ء میں ہوا تھا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ٹوٹا نہیں بلکہ ایک دن کے ناغہ کے بغیر مسلسل آج تک جاری ہے۔ اس طرح گویا مسلمانوں کو تیار کرنے کی صرف ایک جماعت وہ ہے جس کی سرگرمیوں پر پوری ایک صدی گزر چکی ہے۔ مگر آج جب کہ اس کے حامیوں کے دعوے کے مطابق یہ تحریک بین اقوامی بن چکی ہے منقسم ہندستان کا کوئی ایک گاؤں یا محلہ بھی ایسا وجود میں نہ آسکا جس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہو کہ وہ، مذکورہ معیار کے مطابق، اس قابل ہوگیا ہے کہ دوسروں کو اسلام کی دعوت دے سکے۔

ہمارے اس ملک میں روزانہ ایک لاکھ سے زیادہ آدمی مرجاتے ہیں۔ ساری دنیا کے اعتبار سے دیکھا جائے تو روزانہ مرنے والوں کی تعداد تقریباً دس لاکھ تک پہنچ جائے گی۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ہر روز دس لاکھ آدمی دین حق سے بے خبری کی حالت میں مر رہے ہوں اور ہم پوری پوری صدی صرف اس عذر میں گزار دیں کہ ابھی ہم مسلمانوں کو تیار کر رہے ہیں۔ اور یہ جواب اس نبی کے امتیوں کا ہو جس کا کہنا یہ تھا کہ لوگ پتنگوں کی طرح آگ میں گر رہے ہیں اور میں ان کو اپنی ساری طاقت سے کھینچ کر نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

کسی کے مخارج غلط ہوں یا سورتیں یاد نہ ہوں تو ہر شخص جانتا ہے کہ نماز اس سے ساقط نہیں ہوتی۔ حتی کہ اگر اس کو کوئی غلط عادت لگی ہوئی ہو تب بھی کوئی مفتی یہ فتویٰ نہیں دے گا کہ تمھاری عادت صحیح ہو جائے، اس وقت نماز پڑھنا۔ مگر شرعی ذمہ داریوں کا یہی اصول ہم اس وقت بھول جاتے ہیں جب کہ معاملہ دوسری قوموں کے سامنے دعوتی فریضہ ادا کرنے کا ہو۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ نماز کی اہمیت ہم کو معلوم ہے۔ مگر شہادت حق اور دعوت الی اللہ کی اہمیت کی ابھی تک ہم کو خبر نہیں۔ "اولیں پرسشش نماز بود" کا سبق ہم کو یاد ہے۔ مگر اس حقیقت کو ہم بھول گئے ہیں کہ خدا کے بے خبر بندوں کو خدا کے دین سے باخبر کرنا امت محمدی پر اسی طرح فرض ہے جس طرح ایک شخص کے لئے روزانہ پانچ وقت کی نماز پڑھنا۔

الفاظ جو فضا میں گم ہو گئے

مولانا محمد علی نومبر ۱۹۳۰ میں لندن کی گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔ یہاں انھوں نے جو طوفان خیز تقریر کی، اس کے چند الفاظ یہ تھے:

"آج میں جس مقصد کے لئے یہاں آیا ہوں، وہ یہ ہے کہ میں اپنے ملک کو ایسی حالت میں واپس جاؤں جب کہ آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو۔ میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا۔ اگر آپ مجھے ہندستان کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر آپ کو یہاں مجھے قبر کے لئے جگہ دینی پڑے گی ۔۔۔

ہمارے پاس ۳۲ کروڑ آدمی ہیں۔ جب وہ قحط اور پلیگ سے لاکھوں کی تعداد میں مرنا جانتے ہیں تو یقیناً وہ برطانوی گولی سے بھی جان دے سکتے ہیں" آج ان الفاظ کو تلاش کیا جائے تو وہ تاریخ کی الماری کے سوا اور کہیں نہیں ملیں گے۔

محمود پاشا بارودی (۱۳۲۲ - ۱۲۵۵ھ)

[illegible] پیدا ہوئے۔ ان کے والد دنقلہ و بربر کے حاکم تھے۔ وہ عربی، ترکی، فارسی اور انگریزی زبانیں جانتے تھے۔ انھیں دو چیزوں کا ذوق تھا سیاست اور شاعری۔ ان کا اپنا دیوان دو جلدوں میں مصر سے شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک کتاب "مختارات البارودی" ہے۔ اس کتاب کے چار حصے ہیں اور اس میں عہد عباسی کے ۳۰ شاعروں کے کلام کا انتخاب ہے۔

مصر میں وہ مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ میجر جنرل کی حیثیت سے انھیں فرانس اور انگلستان کے سفر کا بھی موقع ملا۔ مصر میں جب انگریزوں کے خلاف بغاوت ہوئی تو اس میں ان کا نام بھی تھا۔ لوگوں میں عام چرچا یہ تھا کہ بارودی اس انقلابی تحریک کے قائد ہیں۔ تاہم یہ بغاوت وادیٔ نیل پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد ختم ہو گئی۔ مگر حکومت نے باغیوں کی پکڑ دھکڑ شروع کی تو بارودی بھی اس میں گرفتار ہوئے۔ ان کو جلاوطن کر کے جزیرہ سراندیپ میں بھیج دیا گیا۔

وہاں وہ سترہ سال سے کچھ زیادہ عرصہ تک قید رہے۔ خدیو عباس ثانی کی سفارش پر ۱۳۲۷ھ میں ان کو معافی دی گئی۔ وہ مصر واپس آ گئے۔ اس کے بعد وہ صرف پانچ سال تک زندہ رہ سکے۔ آخر میں ان کی بینائی جاتی رہی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ بارودی کو عربی شاعری میں امرؤالقیس اور بشار کا درجہ حاصل تھا۔ انھوں نے موجودہ دور میں عربی شاعری کے احیار کا کام کیا۔

ان کے ناموافق حالات نے ان کے لئے ایک نیا موافق امکان پیدا کر دیا

مادہ جب "برباد" کیا جاتا ہے تو وہ انرجی بن جاتا ہے جو مادہ کی زیادہ وسیع اور طاقت ور صورت ہے۔ یہی خدا کی اس کائنات کا عام قانون ہے۔ یہاں ہر محرومی کے اندر ہمیشہ ایک نئی یافت کا امکان چھپا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ صفت خاص جس کا ظہور عالم مادی میں ہوا ہے، اس کا وعدہ زیادہ بڑے پیمانہ پر اہل ایمان کے لئے کیا گیا ہے۔ ان کے لئے ان کا رب ناموافق حالات میں بھی موافق پہلو پیدا کر دیتا ہے، بشرطیکہ وہ فی الواقع خدا کے ہو چکے ہوں۔ ان کی منصوبہ بندی خالص خدائی مشن کے لئے ہو نہ کہ اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لئے۔

مکہ میں جب مسلمانوں کے حالات سخت ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے کہا: "تم لوگ حبش چلے جاؤ۔ وہاں کا بادشاہ نجاشی عیسائی ہے اور نیک نفس ہے۔ وہ تم لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا" چنانچہ ۶۱۵ میں پندرہ آدمی جدہ پہنچے اور کشتیوں پر سوار ہو کر حبش چلے گئے۔ دوسری بار ۶۱۷ میں ایک سو مسلمان حبش گئے۔

بظاہر یہ ایک ناپسندیدہ واقعہ تھا۔ مگر اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک خیر کی صورت پیدا کر دی۔ مکی مسلمانوں کا حبش پہنچنا وہاں اسلام کو موضوع بحث بنانے کا سبب بن گیا۔ پیغمبر اسلام کی بعثت اور آپ کی دعوت کی خبریں حبش میں پھیلنے لگیں۔ قریش کا ایک مخالفانہ وفد حبش پہنچنے کے نتیجہ میں حضرت جعفر کو موقع ملا کہ دربار شاہی میں اسلام کی دعوت پر مفصل تقریر کر سکیں۔ اس طرح کے واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ حبش سے ۲۰ عیسائیوں کا ایک وفد مکہ آیا تاکہ اصل معاملہ کی تحقیق کر سکے۔

جب یہ لوگ مکہ پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں تھے۔ وہ وہاں گئے اور آپ سے مل کر مختلف سوالات کئے اور پوچھا کہ آپ کیا تعلیم لائے ہیں۔ آپ نے بتایا کہ خدا نے میرے اوپر اپنا کلام اتارا ہے اور قرآن کی کچھ آیات پڑھ کر سنائیں۔ یہ لوگ چونکہ تعصب سے خالی تھے، قرآن سن کر بہت متاثر ہوئے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ انھوں نے تصدیق کی کہ بلاشبہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اسی وقت اسلام قبول کر لیا۔

جس وقت یہ واقعہ ہو رہا تھا قریش کے بہت سے لوگ وہاں جمع تھے اور سارا ماجرا دیکھ رہے تھے۔ انھیں حیرت بھی تھی اور غصہ بھی آ رہا تھا کہ جس دین کو انھوں نے رد کر دیا ہے اس کو باہر کے لوگ آ کر اپنا رہے ہیں۔ حبش کے یہ لوگ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اٹھے تو ابوجہل اپنے کچھ ساتھیوں کو لے کر ان سے راستہ میں ملا۔ اس نے ان لوگوں کو ملامت کرتے ہوئے کہا: "ہمارا خیال ہے کہ تم سے زیادہ احمق قافلہ یہاں کبھی نہیں آیا۔ تمہارے ہم مذہب لوگوں نے تم کو اس لئے یہاں بھیجا تھا کہ تم اس شخص کے حالات کی تحقیق کرو اور واپس جا کر اپنے ساتھیوں کو بتاؤ۔ مگر ابھی تم اس سے ملے ہی تھے کہ اپنے دین کو چھوڑ بیٹھے۔"

جیسا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے یہ بنی اسرائیل کے علماء تھے (شعراء ۔ ۱۹۷) انھوں نے ابوجہل وغیرہ سے کوئی بحث نہیں کی۔ بلکہ صرف یہ جواب دیا: "سلام ہے بھائیو تم کو، ہم تمہارے ساتھ جہالت نہیں کر سکتے۔ ہمیں ہمارے طریقے پر چلنے دو اور تم اپنے طریقے پر چلتے رہو۔ ہم اپنے آپ کو جان بوجھ کر بھلائی سے محروم نہیں رکھ سکتے" (ابن ہشام)

انھیں لوگوں کے بارے میں قرآن میں آیا ہے:

"جن لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی تھی وہ قرآن پر ایمان لاتے ہیں اور جب یہ ان کو سنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لائے، یہ بلاشبہ خدا کی طرف سے ہے۔ ہم تو پہلے ہی سے اس کو ماننے والے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو دہرا اجر دیا جائے گا، ان کے صبر کے بدلے۔ وہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے انھیں دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جب انھوں نے لغویات سنی تو یہ کہہ کر اس سے الگ ہو گئے: ہمارے اعمال ہمارے ساتھ اور تمہارے اعمال تمہارے ساتھ، تم کو سلام ہے، ہم جاہلوں کا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے"
قصص ۵۵ – ۵۲

الرسالہ کے شائقین سے گزارش ہے کہ وہ پرچہ بذریعہ وی پی طلب نہ فرمائیں، بلکہ اپنا زرتعاون منی آرڈر کے ذریعہ بھیج دیں۔ یہ فریقین کے لئے سہولت کا باعث ہے۔

جو لوگ سالانہ یا ششماہی زرتعاون بیک وقت ادا نہ کر سکیں، وہ ہر مہینے دو روپے کا ٹکٹ لفافہ میں رکھ کر بھیج دیں۔ پرچہ انھیں روانہ کر دیا جائے گا۔

خریدار حضرات براہ کرم اپنے خطوط میں خریداری نمبر کا حوالہ ضرور تحریر فرمائیں۔

خط و کتابت کے وقت یا زرتعاون بھیجتے ہوئے اپنا پتہ صاف اور حتی الامکان انگریزی میں تحریر فرمائیں

پتہ پر کسی شخص کا نام نہ لکھیں۔ بلکہ ایڈیٹر الرسالہ یا منیجر الرسالہ تحریر فرمائیں

منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ ضرور تحریر فرمائیں

الرسالہ نہ صرف ملک کے مختلف حصوں میں پڑھا جاتا ہے بلکہ ملک کے باہر بھی عرب دنیا اور دوسرے علاقوں میں جاتا ہے۔ تاجر حضرات الرسالہ میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیں۔

مسلمانوں کا علمی و ذہنی انحطاط جو نویں

ویں صدی سے شروع ہوا اور سترھویں صدی میں ہم کشف الظنون کے مولف اور قدیم طرز کے عالم حاجی خلیفہ (م ۱۶۵۷ء) کو علم کلام اور علوم عقلی کے عام انحطاط پر ماتم کناں پاتے ہیں۔ اپنی کتاب میزان الحق فی اختیار الاحق میں یہ کہتے ہوئے کہ امام غزالی و امام فخر الدین رازی، قاضی بیضاوی و شیرازی و قطب الدین رازی و سید شریف جرجانی اور جلال الدین دوانی اور ان سب کے تلامذہ اپنے عہد کے جید عالم اور مانے ہوئے صاحب ذکر و نظر تھے۔ لیکن انھوں نے کسی لمحہ بھی یہ گوارہ نہیں کیا کہ وہ علم و فن کی کسی ایک ہی شاخ کے ہو کر رہ جائیں حاجی خلیفہ نے لکھا ہے۔

"لیکن بہت سے غبی لوگ اس بنیاد پر کہ یہ علوم عقلی کبھی ممنوع قرار دئے گئے تھے چٹانوں کی مانند جامد رہے اور قدماء کی اندھی تقلید کے قیدی بن گئے بغیر سوچے ہوئے کہ حقیقت حال کیا ہے انھوں نے نئے علوم کی طرف سے نہ صرف یہ کہ آنکھیں پھیر لیں بلکہ انھیں پورے طور پر رد کر دیا۔ انھوں نے اپنے آپ کو عالم سمجھا حالانکہ وہ نرے جاہل تھے۔ اس کے شوقین کہ اس چیز کا مذاق اڑائیں جسے وہ فلسفیانہ علوم تصور کرتے تھے حالانکہ انھیں اس کی خبر نہ تھی کہ زمین کیا چیز ہے اور آسمان کیا ہے۔ اولم ینظروا فی ملکوت السمٰوٰت والارض قرآن کریم کی اس ہدایت کا ان پر کوئی اثر نہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ کائنات اور اس فضائے بسیط کو دیکھنے کے معنی یہ ہیں کہ انھیں گائے کی مانند گھورا جائے۔"

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے ۱۸۵۷ء

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی

وہ سیاست میں الجھ گئے حالانکہ ضرورت یہ تھی کہ اسلام کی فطری قوتوں کو بروئے کار لانے کی جدوجہد کی جائے

سے لے کر جب صلحنامہ برلن پر دستخط ہوئے اور جس کے سبب سلطنت عثمانیہ کے انتشار و انحطاط میں تیزی پیدا ہوئی۔ خاص طور سے ۱۹۱۱ء سے جب طرابلس پر اٹلی کا حملہ ہوا۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے تعلیم یافتہ مسلم دانشور اور مدرسوں کے پڑھے ہوئے علماء سب سیاست کے جال میں ایسے الجھے کہ ملت اسلامیہ ہند کی ذہنی و روحانی ضروریات کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ اس سلسلے میں اولین اہمیت کی ضرورت یہ تھی کہ بغیر کسی انحراف و تحریف کے اور دین اسلام کے اصولوں کو مستحکم رکھتے ہوئے انھیں کی بنیاد پر روایت اور عہد جدید کے قابل قبول تقاضوں کے مابین ربط اور مطابقت پیدا کی جاتی۔ تہذیب اسلام ایک زندہ اور جاندار تہذیب ہے جس نے زمانے کے بے شمار نشیب و فراز دیکھے ہیں، نہ معلوم کتنی آزمائشوں سے یہ گزری ہے پھر بھی زندہ اور باقی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی فطری قوت متحرکہ کو بروئے کار لایا جائے۔ مسلمانوں کو اس کی شدید ضرورت ہے دنیا بھی اس کی طالب اور منتظر ہے۔ (تحقیق)

انکار کرنے والوں کی نفسیات ہمیشہ ایک رہی ہے

سچائی اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ وہ فطرت کی آواز ہے۔ علم و عقل کے سارے دلائل اس کے حق میں جاتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بے آمیز سچائی سامنے آئے اور اس کے خلاف کوئی مضبوط دلیل قائم کی جاسکے۔ اس کے باوجود ساری تاریخ میں یہ ہوتا رہا کہ جو خدا کا بندہ بھی حق کی دعوت لے کر اٹھا، لوگوں نے اس کا انکار کیا:

افسوس لوگوں پر، جب بھی ان کے پاس کوئی رسول آیا وہ اس کا استہزاء کرتے رہے۔

اس انکار حق کی وجہ کیا ہے، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ حق کا اعلان، سنت اللہ کے مطابق، ہمیشہ کسی "انسان" کی زبان سے ہوتا ہے، فرشتوں کی زبان سے یا پہاڑوں اور سمندروں کے ذریعے اس کا اعلان نہیں کرایا جاتا۔ اب چوں کہ عام لوگ کسی بات کو اس کی اندرونی قیمت کے لحاظ سے نہیں دیکھ پاتے، بلکہ اس سے متاثر ہوتے ہیں کہ بات کو کہنے والا کون ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے ہی جیسا ایک آدمی حق کا حامل کس طرح ہو سکتا ہے۔ ہمارے ہی جیسا ایک گوشت پوست کا مجموعہ خدا کی اس نعمت سے بہرہ مند کیونکر ہو سکتا ہے کہ اس کو خدا کی طرف سے سچائی کی معرفت حاصل ہو جائے اور اس

کو اس مقام پر کھڑا کیا جائے کہ وہ دوسروں کو حق سے باخبر کرے۔

قرآن میں ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو حق کی دعوت دی تو ان کو قوم کی طرف سے یہ جواب ملا:

يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ۔ ہود۔ ۵۳

اے ہود تم کوئی دلیل لے کر نہیں آئے ہو اور ہم صرف تمہارے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور نہ تمہاری بات پر یقین کرنے والے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں کو حق کا پیغام دیا تو انھوں نے یہ کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا:

ان ھذا الا قول البشر   مدثر ۲۵

یہ تو صرف آدمی کا قول ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دعوت حق کا انکار کرنے کی نفسیات ہمیشہ کیا رہی ہے: یہ تو ایک آدمی کی بات ہے جو فلاں شخص کا لڑکا ہے۔ ذاتی حوصلہ مندی نے اس کو اس قسم کے کام کے لئے ابھار دیا ہے (لتکون لکما الکبریاء فی الارض) اس کو یہ جرأت اس لئے ہوئی ہے کہ کچھ لوگ اتفاق سے اس کو مدد کرنے والے مل گئے ہیں (واعانہ علیہ قوم آخرون) وغیرہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آج آپ کے مخالفین بھی عزت و احترام کے ساتھ لیتے ہیں، کیونکہ آج آپ کے نام کے گرد چودہ سو برس کی عظمتیں قائم ہو چکی ہیں مگر آپ کی زندگی میں، جب کہ یہ تاریخ آپ کے گرد جمع نہیں ہوئی تھی، مکہ کے لوگ آپ کو "ابن ابی کبشہ" کہتے تھے جس کا مطلب ہوتا تھا: فلاں دیہاتی کا لڑکا۔

نبوت کے ابتدائی سالوں کا واقعہ ہے قریش کے سرداروں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اگر تمہارا پیغام حق ہے اور تم خدا کے رسول ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کردو اور ان میں قصی بن کلاب بھی ضرور ہوں۔ اگر قصی بن کلاب نے زندہ ہوکر کہہ دیا کہ وہی بات حق ہے جو تم کہتے ہو تو ہم ضرور مان لیں گے۔ اس مطالبہ کی نفسیات یہی تھی کہ اس وقت قریش کی روایات کے مطابق قصی بن کلاب کے حق میں تاریخی عظمتیں قائم ہوچکی تھیں جبکہ "محمد بن عبداللہ" ابھی ایک نوخیز شخص تھے۔ انھیں مکہ کے معاشرہ میں اس قسم کی عظمت کا مقام ابھی حاصل نہیں ہوا تھا۔

انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ "ظاہر" کو دیکھ کر رائے قائم کرتا ہے، کسی حقیقت کو وہ اس وقت تک تسلیم نہیں کرتا جب تک اس کے گرد ظاہری لوازم جمع نہ ہو چکے ہوں۔ حالاں کہ اصل بات یہ ہے کہ آدمی حقیقت کو اس وقت دیکھ لے جب کہ وہ معنوی شکل میں ہوتی ہے۔ جب اس کے گرد زخارف کا انبار اکٹھا ہو جائے، اس وقت کا دیکھنا معتبر نہیں۔ اس وقت تو ایک اندھا بھی ہاتھوں سے ٹٹول کر حقیقت کو پا لیتا ہے۔

درخواست کے بغیر

ڈاکٹر پی۔ ایل بھٹناگر (۱۹۷۶) نے ۱۹۲۳ء میں ایم ایس سی میں ٹاپ کیا تو گھر والوں کی بہترین تمنا یہ تھی کہ وہ آئی سی ایس کے مقابلہ میں بیٹھیں۔ اس وقت ممتاز طالب علموں کے لئے سب سے زیادہ پرکشش چیز یہی تھی۔ مگر ڈاکٹر بھٹناگر کے علمی شوق نے انھیں مجبور کیا کہ وہ آئی سی ایس افسر بننے کے بجائے ٹیچر اور اسکالر بننے کو ترجیح دیں۔

۱۹۵۶ کا واقعہ ہے پروفیسر ہمایوں کبیر وزارت تعلیم میں سکریٹری تھے۔ ان کو ایک ایسے قابل ریاضی داں کی تلاش تھی جس کو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس بنگلور میں اپلائیڈ میتھمیٹکس کے شعبہ کا صدر بنایا جا سکے۔ انٹرویو کے لئے سلکشن کمیٹی مقرر ہوئی جس کے صدر خود ہمایوں کبیر تھے۔ کمیٹی کو درخواست دہندگان میں کوئی بھی شخص عہدہ کے لائق نہ ملا۔

پروفیسر ہمایوں کبیر نے پروفیسر ڈی۔ ایس۔ کوٹھاری سے کہا جو کہ سلکشن کمیٹی کے ممبر بھی تھے: "کیا ہمارے ملک میں کوئی ایسا شخص نہیں جو اس عہدہ پر بیٹھنے کے لائق ہو"۔ کوٹھاری نے کہا: "کم از کم ایک شخص تو مجھے معلوم ہے، اور وہ ڈاکٹر بھٹناگر ہیں"۔ پروفیسر ہمایوں کبیر نے تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے فوراً ڈاکٹر بھٹناگر کے نام اپائنٹمنٹ لیٹر بھیج دیا، اگرچہ موصوف نے اس عہدہ کے لئے کوئی درخواست نہیں دی تھی۔

ڈاکٹر بھٹناگر نے ٹیچر کے مقابلہ میں صدر بننے کی پیش کش کو بمشکل قبول کیا تھا۔ تاہم وہ ان کے لئے مزید عہدوں کا زینہ بنا۔ وائس چانسلر راجستھان یونیورسٹی اور پھر یونیورسٹی ممبر یونین پبلک سروس کمیشن۔ ۱۹۷۰ میں ان کو پدم بھوشن کا خطاب دیا گیا۔ یہ تقریب ڈاکٹر ذاکر حسین کے ہاتھوں انجام پائی تھی جو اس وقت صدر جمہوریہ ہند تھے۔

ترکی مشرق و مغرب کا سنگم ہے اس لیے مغربی تہذیب سے تصادم کا مسئلہ سب سے پہلے یہیں پیش آیا۔ مگر اس کے جواب میں کیا ہوا۔ ایک طرف قدیم علماء کا گروہ تھا جو مغرب کی طرف سے آنے والی ہر چیز کا اس درجہ مخالف تھا کہ سلطان سلیم ثالث (۱۸۰۷-۱۷۸۹) اور اس کے جانشین سلطان محمود (۱۸۳۹-۱۸۰۸) کی نئی فوجی تنظیمات اور ان جدید اصلاحات تک کی مخالفت کی جو انھوں نے ترکی کو عسکری اور علمی لحاظ سے یورپ کی ابھرتی ہوئی طاقتوں کے دوش بدوش رکھنے کے لیے نافذ کی تھیں۔

دوسری طرف ترکی کی وہ نئی نسل تھی جو پیرس اور برلن اور لندن کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرکے آئی تھی، وہ ترکی کو مغرب کے رنگ میں رنگ دینا چاہتی تھی۔ ان کی انتہا پسندی کا عالم یہ تھا کہ انھوں نے مغربی تقلید کے جواز کے لیے ایک پورا فلسفہ بناڈالا۔ ضیاء گوک الپ نے کہا:

"مغربی تہذیب درحقیقت بحر روم کی تہذیب کا امتداد ہے، اس تہذیب (جس کو ہم بحیرہ روم کے منطقہ کی تہذیب کہتے ہیں) کے بانی سماری، سیتھی، فنیقی، رماۃ، ترکی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

تاریخ میں قدیم زمانوں سے پہلے ایک طورانی دور کا وجود ملتا ہے، اس لیے کہ وسط ایشیا کے قدیم باشندے ہمارے اجداد تھے۔ اس کے بعد مسلمان ترکوں نے اس تہذیب کو ترقی دی اور اس کو یورپ تک پہنچایا، پھر مغربی و مشرقی سلطنت روما کے خاتمہ کے بعد ترکوں نے یورپ کی تاریخ میں انقلاب پیدا کیا۔ اسی بنیاد پر ہم مغربی تہذیب کا جزو ہیں اور

جدید تاریخ کا ایک صفحہ

ہمارا اس میں حصہ ہے۔"

ان کا منتہائے فکر یہ تھا کہ "وہ اپنے دماغ سے کام لے کر اپنے کو مغرب کی روشن اور بلند پایہ تہذیب میں جذب کرلیں" (روفان اورگا، اتاترک، ۲۹۰) کمال اتاترک (۱۹۳۸-۱۸۸۱) جب ۱۹۲۳ میں ترک جمہوریہ کے پہلے صدر مقرر ہوئے تو ان کے نزدیک جو سب سے اہم کام تھا وہ یہ کہ ترکوں کو مغرب کا لباس پہنا دیں۔ انھوں نے پردہ کو خلاف قانون قرار دیا۔ عربی حروف کی جگہ لاطینی حروف جاری کیے۔ عربی میں اذان ممنوع ہوگئی۔ ہیٹ کا استعمال لازمی قرار دیا گیا۔ حتیٰ کہ جب ایک خوں ریز انقلاب کے بعد ہیٹ کی جنگ جیت لی گئی تو مصطفیٰ کمال نے مکہ کی موتمر اسلامی (۱۹۲۶) میں شرکت کے لیے ترک پارلیمنٹ کے ایک ممبر ادیب ثروت کو اس حال میں روانہ کیا کہ وہ اس کے واحد مندوب تھے جو اپنے سر پر مغربی ہیٹ رکھے ہوئے تھے۔ یہ گویا ترکی کی فتح عظیم کا اعلان تھا۔

یہی مثال ہر مسلم ملک میں پیش آئی ہے۔ البتہ ڈگری کا فرق تو ہو سکتا ہے مگر نوعیت کا کوئی فرق نہیں۔ ہر جگہ یہی ہوا کہ قدیم مذہبی طبقہ نے مغرب سے نفرت اور اجتناب میں زندگی کا راز بتایا اور جدید تعلیم یافتہ نے مغرب کی تقلید سے یہ امید کی کہ وہ دوبارہ بام عروج پر پہنچ جائیں گے۔ مگر یہ مثال کہیں نظر نہیں آتی کہ کچھ لوگ شدت سے اس پہلو کی طرف قوم کو متوجہ کر رہے ہوں کہ قوت و طاقت کے اس راز کو معلوم کرو جس سے مسلح ہو کر مغرب تمہارے اوپر اور دنیا کے اوپر چھا رہا ہے

ایک غلطی سارے امکان کو برباد کر دیتی ہے

ایک بار میں ایک دیہات میں گیا ہوا تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ایک شخص نے نیم کا درخت کاٹا اور اس کے بعد اس کے تنہ کا چھلکا اتارنے لگا۔

"آپ اس کا چھلکا کیوں اتار رہے ہیں" میں نے دیہات کے اس آدمی سے پوچھا۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا: "اگر چھلکا نہ اتارا جائے تو اس کے اندر کیڑے لگ جائیں گے اور لکڑی کو خراب کر دیں گے۔" یہ دس سال پہلے کی بات ہے۔ اگست ۱۹۷۵ میں دوبارہ مجھے ایک اور دیہات میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ نیم کا ایک کٹا ہوا تنہ پڑا ہے۔ ایک شخص نے اپنے گھر کے پاس نیم کا ایک درخت کاٹ دیا تھا مگر اس کا چھلکا نہیں اتارا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے دس سال پہلے والی بات یاد آئی۔ میں نے سوچا کہ تجربہ کرکے دیکھوں کہ اس کی بات صحیح تھی یا نہیں۔ میں نے اس کے گھر کے ایک آدمی سے کہا کہ کوئی اوزار لاؤ اور اس کا چھلکا اتارو۔ جب اس نے چھلکا اتارا تو میں نے دیکھا کہ چھلکے کے نیچے ایک اپنچ کے موٹے موٹے کیڑے ہیں۔ یہ کیڑے نہایت نرم تھے مگر انھوں نے تنہ کی سطح کو جگہ جگہ اس طرح کاٹ ڈالا تھا جیسے اس کے اوپر نالیاں بنائی گئی ہوں۔

یہ قدرت کا نظام ہے۔ قدرت اس طرح سبق دیتی ہے کہ اس دنیا میں تم کو نہایت محتاط رہ کر زندگی گزارنی ہے۔ کیونکہ دنیا کا نظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ یہاں ایک غلطی تمھاری ساری خوبیوں پر پانی پھیر سکتی ہے۔ ایک غفلت تمھارے سارے امکانات کو برباد کرنے کے لئے کافی ہے۔ قدرت یہ کر سکتی تھی کہ چھلکا اتارے بغیر نیم کے تنہ کو محفوظ رکھتی۔ مگر اس نے یہ قانون بنا دیا کہ اس کا مالک اس کا چھلکا اتارے۔ اس کے بعد ہی اس کا تنہ اس دنیا میں محفوظ رہ سکے گا۔

اس قانون قدرت کا انطباق اب انسانی زندگی میں دیکھئے۔

۱۹۴۴ میں جون پور (یوپی) کے دو آدمیوں نے مل کر کاروبار شروع کیا۔ ابتدائی سرمایہ ان لوگوں کے پاس چند سو سے زیادہ نہیں تھا۔ مگر ان کے مشترک کاروبار میں خدا نے برکت دی اور چھ سال میں ان کے کاروبار کی حیثیت ۳۰ ہزار تک پہنچ گئی۔ اب دونوں میں اختلاف شروع ہو گیا اور نوبت علیحدگی تک پہنچی۔ ایک ثالث کے مشورہ سے طے ہوا کہ کاروبار تقسیم نہ کیا جائے بلکہ اس کی مالیت کا اندازہ کرکے اس طرح بٹوارہ ہو کہ ایک شخص نصف کے بقدر رقم لے لے اور دوسرے کو اثاثہ سونپ دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ایک شخص کو مال و اسباب اور دوسرے کو نقد پندرہ ہزار روپے دے دئے گئے۔

۱۹۴۹ میں پندرہ ہزار روپے آج کی قیمت کے لحاظ سے ایک لاکھ سے بھی زیادہ تھے۔ جس شخص نے نقد رقم لی تھی، اس نے جون پور کے ایک بازار میں کپڑے کی دکان کھول لی۔ انھیں شروع ہی سے بڑا اچھا میدان ملا اور ایک سال میں ان کا سرمایہ دگنا ہو گیا۔ اپنے کاروبار کے دوسرے سال میں وہ اس طرح داخل ہوئے کہ ان کے سامنے ترقی اور کامیابی کا ایک نہایت وسیع دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مگر اب ایک کمزوری نہایت آہستگی سے ان کے اندر داخل ہو گئی۔ وہ خرچ کے معاملہ میں لاپروا

ہوگئے۔ اپنی ذات پر، بیوی بچوں پر اور دوستوں پر ان کا خرچ بے حساب بڑھ گیا۔ وہ بھول گئے کہ دن بھر کی بکری سے ایک ہزار روپے جو ان کے گلہ میں آگئے ہیں ان میں سے صرف ۱۰ فی صد ان کا ہے۔ باقی ۹۰ فی صد مہاجن کا ہے۔ وہ اپنے گلہ کی رقم اس طرح خرچ کرنے لگے گویا یہ سارا روپیہ ان کی آمدنی ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے وکیل کی جیب میں فیس کی جو رقم آتی ہے وہ سب اس کی آمدنی ہوتی ہے۔

دکان داری کے ساتھ اس قسم کی شاہ خرچی نہیں چل سکتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند سال میں وہ دیوالیہ ہوگئے۔ ان کے پاس پندرہ ہزار میں سے ایک روپیہ بھی باقی نہ رہا۔ اس واقعہ کے بعد وہ تقریباً پندرہ سال تک زندہ رہے۔ مگر دوبارہ کوئی کام نہ کرسکے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ تبلیغ میں "چلہ" دے دو تو تمہارا کام بن جائے گا۔ انھوں نے یہ بھی کیا۔ مگر واپسی کے بعد پہلے سے بھی زیادہ برا حال ہوگیا۔ یہاں تک کہ پریشانی کے عالم میں وہ ۱۹۷۱ میں ایک جیپ سے ٹکرا گئے اور سڑک ہی پر ان کا انتقال ہوگیا۔

یہ ایک انفرادی واقعہ ہے جس میں نظر آرہا ہے کہ زندگی میں ایک غلطی کس طرح سارے امکان کو برباد کردیتی ہے اور آدمی کو ناکامی کے آخری کنارے پہنچا دیتی ہے۔

اب ایک قومی مثال لیجئے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر کا مصری حکمراں خدیو اسماعیل پاشا (۱۸۳۰–۱۸۹۵) نہایت اعلیٰ صلاحیت کا مالک تھا۔ اس نے ایسی پالیسی اختیار کی کہ مصر عملی طور پر ترکی سے آزاد ہوگیا۔ بحر احمر اور بحر روم کو ملانے کے لئے نہر سوئز کا منصوبہ جو ۱۸۶۶ میں بنا وہ اس لئے مکمل ہوسکا کہ اس وقت کے اس مصری حکمراں نے اس تجویز کی اہمیت کو سمجھ لیا اور اس کی منظوری دے دی۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے مصر میں ۱۸۶۷ میں اسمبلی کے طریقے کو رائج کیا۔ اس کی زندگی میں اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جو اس کی اعلیٰ صلاحیت کو ثابت کرتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اسمٰعیل پاشا اس قدر ناکام ہوا کہ ۱۸۷۹ میں اس کو اپنے بیٹے توفیق پاشا کے حق میں تخت و تاج چھوڑنا پڑا۔

اس ناکامی کی واحد وجہ خدیو اسماعیل پاشا کا حد سے بڑھا ہوا اسراف تھا۔ مصر میں اپنی روزمرہ فضول خرچیوں کے علاوہ جب وہ باہر (ترکی، فرانس وغیرہ) جاتا تو وہاں بے تحاشا دولت برباد کرتا۔ بعض مورخین نے اندازہ لگایا ہے کہ اس کے قرضوں کی مقدار ۱۰۰ ملین پونڈ تک پہنچ گئی تھی۔ مزید یہ کہ ملک کے بیت المال، خیراتی اوقاف اور یتیموں اور بیواؤں کے فنڈ سے بھی اس نے قرض لے رکھا تھا جو تقریباً ۲۷،۰۰۰ ۵ پونڈ کے برابر تھا۔ ان قرضوں کی ادائیگی کے لئے اس نے مصری عوام کے اوپر ٹیکسوں کا بوجھ لاد دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے زمانے میں چالیس قسم کے ٹیکس نافذ تھے۔ عبدالرحمٰن الرافعی کی کتاب اسماعیل اور یوسف نحاس کی کتاب الفلاح میں اس کے ٹیکسوں کی جو تفصیل درج ہے وہ انتہائی ہیبت ناک ہے۔ مثلاً قدیم مصری کسان ایک لباس پہنتے تھے جس کو زعبوط کہا جاتا تھا۔ اسمٰعیل پاشا کی حکومت نے اس کپڑے پر بھی ٹیکس لگا دیا۔ ایک زعبوط پر ایک ریال ٹیکس تھا۔ ادائگی کے وقت زعبوط کی آستین پر ایک مہر لگا دی جاتی تھی۔ بدقسمتی یہ تھی کہ یہ مہر پانی لگنے سے چھوٹ جاتی تھی۔ اس لئے کسان اپنے زعبوط کو دھوتے ہوئے اس کے مہر کے حصے کو چھوڑ

دیتا کیونکہ معلوم تھا کہ ٹیکس وصول کرنے والے جو ہر وقت بازاروں میں گھومتے رہتے تھے ہر کانشان مٹتے ہی اس کے اوپر دوسرا ریال لگا دیں گے۔ ٹیکسوں کی اس کثرت کے باوجود یہ حال تھا کہ دو سال تک سرکاری ملازموں اور فوجیوں کو تنخواہیں نہ دی جاسکیں۔

مگر قرض کی ادائگی کے لئے یہ سارے ٹیکس بھی ناکافی ثابت ہوئے کیونکہ اسماعیل پاشا کا اسراف بھی اسی کے ساتھ برابر جاری تھا۔ آخر وہ اندوہناک واقعہ ہوا جس نے مصر کی تاریخ بدل ڈالی۔ اسماعیل پاشا نے قرضوں کی ادائگی کے لئے نہر سوئز میں حکومت مصر کے حصہ کو ۱۸۷۵ میں انگلستان کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ جب اس سے بھی قرضوں کا بوجھ ختم نہ ہوا تو اس نے فرانس کے قرضوں کے معاوضہ میں فرانس کو انگلستان کے ساتھ سوئز میں شریک قرار دے دیا۔ اور سوئز کے اوپر جہاں پہلے انگلستان اور مصر کا کنٹرول تھا، اب فرانس اور انگلستان کا کنٹرول قائم ہوگیا اور اسی کے ساتھ مصر میں ان کی سیاست کے داخلہ کا دروازہ بھی کھل گیا۔ جمال عبدالناصر کا ۱۹۵۶ میں سوئز کو نیشنلائز کرنا، اسماعیل پاشا کی اسی غلطی کی اصلاح تھا۔ مگر صدر ناصر نے یہ دوسری غلطی کی کہ اسراف کی اصلاح ناعاقبت اندیشانہ اقدام سے کرنی چاہی جو مصر کے حق میں پہلے سے بھی زیادہ مہنگی ثابت ہوئی۔

زندگی، خواہ افراد کی ہو یا قوموں کی، نہایت نازک امتحان ہے یہاں ہر ایک کے حوصلہ اور ہوش مندی کی جانچ ہو رہی ہے۔ ہمیں ہر وقت چوکنا رہنا ہے۔ کیونکہ کوئی ایک غلطی بھی اتنی فیصلہ کن ہو سکتی ہے کہ ہماری ساری امیدوں پر پانی پھیر دے اور ہمارے لئے بالآخر حسرت و یاس کے سوا اور کچھ نہ [illegible]

ابو عبداللہ لسان الدین معروف بہ

ابن الخطیب (۷۱۳ — ۷۷۶ھ) غرناطہ میں پیدا ہوا۔ عربی زبان و ادب، علوم دینیہ، فلسفہ و طب، ریاضی و تاریخ میں وقت کی اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کی۔ مگر حاکم غرناطہ ابو الحجاج یوسف (۷۳۴ — ۷۵۵ھ) کے دربار میں اس کو جس چیز نے پہنچایا، وہ اس کی ادب و شاعری تھی۔ سلطان نے اس کو اپنا سکریٹری بنا لیا۔ اس کے بعد اس کو وزارت کا منصب عطا ہوا۔ ابو الحجاج کے بعد اس کا بیٹا محمد خامس تخت نشین ہوا تو اس نے بھی اس کو وزارت پر بحال رکھا۔ مگر اس کی ترقی نے اس کے حاسدوں کی تعداد بہت بڑھا دی۔ انھوں نے بادشاہ کو اس کے خلاف بدگمان کر دیا۔ وہ غرناطہ سے بھاگ کر افریقہ پہنچا۔ یہاں بھی ابتداءً اس کی عزت و تکریم ہوئی۔ اس کے بعد کچھ لوگوں نے فقہا کو اس کے خلاف بھڑکایا۔ انھوں نے اس کے الحاد کا فتویٰ دے دیا۔ چنانچہ کچھ جوشیلے لوگ دیوار پھاند کر اس کے گھر میں گھس گئے اور گلا گھونٹ کر اس کو مار ڈالا۔

کہا جاتا ہے کہ جس طرح افریقہ میں علم و ادب کی امامت ابن خلدون پر ختم ہوگئی اسی طرح اندلس میں علم و ادب کی امامت ابن الخطیب پر ختم ہوئی۔ ابن الخطیب کا تاریخ میں بہت بلند مقام تھا۔ اس نے تقریباً ۶۰ تصنیفات چھوڑی ہیں۔ الاحاطہ فی تاریخ غرناطہ (تین جلدیں) غرناطہ کی شخصیتوں کے لئے تاریخی ڈکشنری کی حیثیت رکھتی ہے۔

زمین کے اندر سے تیل نکالنے کا کام، جدید پیمانے پر ۱۸۵۹ میں شروع ہوا جب کہ امریکہ کے ڈریک نے پنسلوانیا میں ۷۰ فٹ کی گہرائی سے تیل نکالنے میں کامیابی حاصل کی۔ شرق اوسط میں تیل کی دریافت پہلی بار ۱۹۰۸ میں مسجد سلیمان میں ہوئی۔ اس وقت عرب دنیا پر ترکوں کی حکومت تھی۔ مغربی کمپنیوں نے عثمانی سلطنت سے اس علاقہ میں تیل نکالنے کی خصوصی مراعات حاصل کر لیں۔

جدید صنعتی دنیا کی قوت اور ترقی کا راز یہی تیل ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے زراعت کے لئے پانی اور انسانی جسم کے لئے خون ہوتا ہے۔ حیرت انگیز بات ہے کہ اس قدرتی دولت کا بڑا حصہ اسی زمین کے نیچے دفن ہے جس کو شرق اوسط یا خلیج فارس کے ممالک کہا جاتا ہے۔ موجودہ صدی کے آغاز سے لے کر اب تک یہ دولت تمام تر مغرب کی صنعتی قوموں کے قبضہ میں رہی ہے۔ ان قوموں کی ترقی کا اصل راز وہ سستا ایندھن تھا جو انھیں نہایت آسانی سے مسلسل شرق اوسط سے مل رہا تھا۔ مسلم دنیا کے تیل سے طاقت ور ہو کر وہ مسلم دنیا کے اوپر چھائے رہے۔

اکتوبر ۱۹۷۳ کی جنگ میں تیل کے حربہ کا استعمال، وہ بھی شعوری طور پر نہیں بلکہ زیادہ تر "گربہ عاجز" کی نفسیات کے تحت، پہلا تجربہ تھا، جب کہ لوگوں کو معلوم ہوا کہ تیل ایک طاقت ہے، اتنی بڑی طاقت کہ اس کا جزئی استعمال بھی پوری صنعتی دنیا کو ہلا سکتا ہے۔

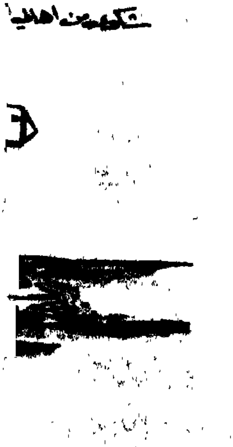
آج شرق اوسط کی زمین سے جو تیل نکالا جا رہا ہے، اس کی قیمت ۲۰ کرور ڈالر سالانہ سے بھی زیادہ ہے۔ دولت کے اس سیلاب نے خلیج فارس کے ملکوں کو اچانک اس قدر مالامال کر دیا ہے کہ تعیشات کی ہر قیاسی مد اس کے استعمال کے لئے ناکافی ہے۔ عالمی بینک کے اندازے کے مطابق ۱۹۸۵ تک تیل کے ممالک کے پاس تمام شخصی مدوں میں مسرفانہ حد تک خرچ کرنے کے بعد بھی، ایک ٹریلین ڈالر کے بقدر فاضل رقم موجود ہوگی۔

تیل کی دولت کے اس ارتکاز کو جغرافی اتفاق (ACCIDENT OF GEOGRAPHY) کہا جاتا ہے۔ مگر ماہرین ارضیات کے اس قیاس سے زیادہ یقینی بات وہ ہے جو قرآن میں بتائی گئی ہے۔ قرآن کے مطابق، اس دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ تمام تر خدائی فیصلہ کے تحت ہوتا ہے، خواہ ظاہری آنکھوں کو واقعات کے پیچھے خدائی ہاتھ کام کرتا ہوا نہ دکھائی دے۔

خدا نے یہ دولت مسلم ممالک کو کیوں دی ہے، اس پر غور کیا جائے تو سب سے پہلے یہ حدیث ہمارے سامنے آتی ہے:

یوشك ان يحسر الفرات عن كنز من ذهب

الرسالہ اپریل ۱۹۷۷



پاکستان سے تقریباً چار سو خاکروب سودی عرب بھیجے گئے ہیں۔ سودی عرب کے اخبار الریاض (۲۲ دسمبر ۱۹۷۶) کا یہ کارٹون اسی پس منظر میں ہے۔ ایک عرب پاکستانی خاکروب کو عربی آمیز اردو میں کوڑا کرکٹ کی صفائی کے لئے ہدایات دے رہا ہے۔ ✱

فمن حضرہ فلا یأخذ منہ شیئاً

قریب ہے کہ فرات سے سونے کا خزانہ نکلے، اس وقت جو موجود ہو وہ اس میں سے کچھ نہ لے۔

یہ حدیث غالباً اس سیال سونا (LIQUID GOLD) کے بارہ میں ہے جس کو تیل کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قدرتی دولت جو خلیج فارس کے علاقہ میں ظاہر ہوگی، وہ ذاتی عیش کے لئے نہ ہوگی۔ اس کے بعد جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ حرم کی توسیع اور مقامات مقدسہ کی عماراتی تزئین کے لئے ہے، ان کو قرآن کی سورہ توبہ آیت ۱۹ (أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ الخ) کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

اصل یہ ہے کہ تیل کا یہ قدرتی خزانہ مسلمانوں کی صنعتی پس ماندگی کی تلافی ہے۔ موجودہ دور میں مسلمان صنعت و تجارت میں دوسری قوموں سے پیچھے ہو گئے تھے۔ حتی کہ بعض مغربی ماہرین کو یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ یہ ممالک اب کبھی بھی، اقتصادی حیثیت سے، مغربی اقوام کے برابر نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ان کے تخمینہ کے بموجب وہ صنعتی دور (INDUSTRIAL AGE) میں پہنچیں گے تو ترقی یافتہ دنیا مافوق صنعتی دور (SUPER INDUSTRIAL AGE) میں پہنچ چکی ہوگی۔

تیل کی دولت کے ظہور نے صورت حال کو اچانک طور پر بدل دیا ہے۔ عالمی بینک کی رپورٹ نمبر ۷۰ (۱۹۸۴) کے مطابق پٹرولیم برآمد کرنے والے اوپیک ممالک کا حصہ آج تیل کی عالمی تجارت کا ۸۰ فی صد حصہ ہے۔ اس طرح انھوں نے جدید دنیا میں کلیدی اقتصادی پوزیشن (ECONOMIC LEVERAGE) کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔

مسلم ملکوں کے پاس تیل کی دولت کے ظہور نے انھیں اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ اس مشن کی انجام دہی کی بڑی سے بڑی قیمت دے سکیں جو خدا نے ان کے ذمہ کیا ہے۔ یہ مشن ہے دنیا کی قوموں کو خدا کے پیغام سے باخبر کرنا۔ لوگوں کو بتانا کہ مرنے کے بعد وہ اپنے مالک کے



پاس جیسے علاقے میں اور وہاں ان کا رب ان کے اعمال کا حساب لے گا۔

مسلمان جدید دور میں، اقتصادی حیثیت سے، اپنے مشن کو اعلیٰ معیار پر انجام دینے کے قابل نہ رہے تھے۔ خدا نے ان کو صنعتی دور کا خزانہ دے کر ان کا یہ عذر ختم کر دیا۔ یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ٹھیک ویسا ہی ایک معاملہ ہے جیسا بنی اسرائیل کے ساتھ چار ہزار برس پہلے پیش آیا تھا۔ بنی اسرائیل جب مصر کے زرخیز علاقے سے نکل کر صحرائے سینا میں پہنچے تو وہ تمام اقتصادی ذرائع سے محروم ہو چکے تھے۔ اس وقت بیابان میں من و سلویٰ بنا کر خدا نے ان کی اقتصادی محرومی کی تلافی کر دی۔

یہ نصرت الٰہی کی غیر معمولی صورتیں ہیں۔ اس کے بعد بھی جو قوم اپنی دینی ذمہ داریوں کو ادا نہ کرے وہ خدا کی نظر میں اتنی بڑی مجرم ہو جاتی ہے جس کے بعد کوئی بھی عذر سنا نہیں جاتا۔ حامل کتاب قوم کے لئے مواقع کار کی فراہمی اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے، مگر اس کے بعد کا کام تو بہر حال خود ہم کو انجام دینا پڑے گا۔ مواقع کار جتنے زیادہ ہوں، ذمہ بھی اتنی ہی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

سوال وجواب

"میں الرسالہ کو باقاعدہ خرید کر پڑھ رہا ہوں۔ مجھے آپ کی بہت سی باتوں سے مکمل اتفاق ہے۔ ان کی تفصیل میں بالکل نہیں جاؤں گا۔ میں آپ کی توجہ الرسالہ جنوری ۱۹۷۷ میں "ایک خاندانی جھگڑا جو پوری تاریخ پر چھا گیا" کے عنوان سے جو مضمون چھپا ہے اس کے چند اقتباسات کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ "حقیقت یہ ہے کہ اگر خلافت راشدہ کے آخر میں آپس کی لڑائیاں شروع نہ ہو گئی ہوتیں تو طاقت و قوت کا بے پناہ سیلاب جو عرب سے اٹھا تھا ایشیا، افریقہ اور یورپ کے تمام علاقوں کو توحید کا علاقہ بنا دیتا" بلاشبہ ان لڑائیوں سے تحریک اسلامی کو زبردست نقصان پہنچا۔ مگر اس قسم کی تحریر سے اگر کوئی بھی شخص یہ سمجھے کہ اسلام تلوار کے ذریعہ پھیلا تو کیا وہ غلط ہوگا؟

"حضرت عمرؓ اپنے بعد علیؓ بن ابی طالب کو موزوں ترین شخص سمجھتے تھے۔ مگر اسی اندیشہ کی بنا پر وہ انتخاب کو نامزد نہ کر سکے۔" اس طرح کے اندیشہ کا ٹھوس ثبوت کیا ہے؟ سوال یہ بالکل نہیں کہ خلافت کے لئے موزوں ترین شخص حضرت علیؓ تھے یا عثمانؓ۔ سوال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ جیسے محتاط اور زبردست قوت ارادی والے شخص (جس نے حضرت خالدؓ بن ولید کو سپہ سالاری سے صرف اس لئے معزول کر دیا تھا کہ مسلمان یہ نہ سمجھنے لگیں کہ فتح خالدؓ کی وجہ سے ہو رہی ہے) سے یہ توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی کہ وہ محض ایک سیاسی مصلحت کی بنا پر تحریک اسلامی کو ایک موزوں ترین شخص کی لیڈر شپ سے محروم کر دیتے۔

(مذکورہ مضمون سے اس طرح کے چند اور اقتباسات نقل کرنے کے بعد)

اچھے تاریخ داں اس طرح کے COMMENTS کو پسند نہیں کرتے۔ میں خود بھی تاریخ کا طالب علم ہوں اور جانتا ہوں کہ HISTORICAL GENERALISATIONS میں ایسی غلطیاں بہت عام ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے تاریخ کے چند HARD FACTS پر کوئی بھی نظریہ قائم کرتے وقت [illegible] TENTATIVE اسے

الرسالہ اپریل ۱۹۷۷

کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ نیز کوئی بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ مولانا وحید الدین خاں جیسے [illegible] کا خیال ۔۔۔ ہے۔ بے شک خیال کی حد تک ہر شخص آزاد ہے۔ مگر اس طرح کے GENERALISATIONS بعض زبردست غلط فہمیوں کا موجب ہوتے ہیں۔

توقیر احمد ایم اے

۳۳۴ - اے، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی - ۲۵

جواب: تاریخی جنرلائزیشن کے بارہ میں آپ کا ارشاد بجا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ تاریخ میں اس قسم کے جنرلائزیشن سے بچنا ممکن نہیں۔ تاریخ کے کسی واقعہ پر یا مجموعہ واقعات پر جب بھی آپ کوئی حکم لگائیں یا اس کو کوئی تعبیر دینے کی کوشش کریں گے تو لازماً آپ اسی مقام پر ہوں گے جہاں آپ نے الرسالہ کے مضمون نگار کو کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے نہ آپ مستثنیٰ ہو سکتے ہیں نہ کوئی دوسرا مورخ۔

مثال کے طور پر مطبوعہ مضمون کے بعض حصوں کو لے کر آپ نے جو اعتراضات کئے ہیں، وہ بھی جنرلائزیشن ہی کی صورتیں ہیں۔ آپ کا یہ کہنا کہ فلاں پیراگراف سے یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، یا فلاں عبارت سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ عمر فاروقؓ سیاسی مصلحت کا شکار ہو گئے تھے، یہ سب بھی جنرلائزیشن ہی کی صورتیں ہیں۔ تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے آپ اس سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ تاریخ میں اس قسم کی یکسانی رائے ممکن نہیں جو فزکس اور کیمسٹری میں ہوا کرتی ہے۔ تاریخ کو ایک تعبیر دینے والا شخص جس نازک مقام پر ہوتا ہے، ٹھیک اسی مقام پر وہ دوسرا شخص بھی ہوتا ہے جو اس کی تعبیر کو چیلنج کر رہا ہے۔ اس لئے تاریخ کے بارے میں یہ کہنا بے معنی ہے کہ جنرلائزیشن مت کرو، آپ صرف یہ کر سکتے ہیں کہ اپنے دلائل و شواہد کے ساتھ کسی دوسرے جنرلائزیشن کو پیش کریں جو آپ کے نزدیک واقعات کی زیادہ صحیح تعبیر ہو۔

"تاریخ کے کچھ HARD FACTS پر کوئی نظریہ قائم کرتے وقت اس کو TENTATIVE ہی سمجھنا چاہئے" آپ کے اس ارشاد سے مجھے اتفاق ہے، صرف اس اضافہ کے ساتھ کہ تاریخ کے بارہ میں ہر نظریہ ہمیشہ TENTATIVE ہی ہوتا ہے، کوئی بھی ایسا نظریہ نہیں، نہ صرف ماضی بلکہ حال کے بارہ میں بھی نہیں، جس کو مطلق صداقت کہا جا سکے۔ اگر کوئی شخص اس قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہو تو اس کے بارہ میں یہی کہا جائے گا کہ وہ نہ انسانی علم کی حدود کو جانتا اور نہ تاریخ کے موضوع کی نزاکتوں کو۔

تاریخ میں یہ بات ایک مسلّمہ حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے آپ کو یہ اصرار نہیں کرنا چاہئے کہ کوئی شخص جب تاریخ کے بارہ میں اپنا حاصل مطالعہ پیش کرے تو آخر میں یہ جملہ بھی لکھ دے: قارئین اس کو محض TENTATIVE سمجھ کر میرے خیالات کا مطالعہ کریں۔

خدا سے ڈر کی پہچان یہ ہے کہ آدمی انسان سے ڈرنے لگے۔ اس معنی میں نہیں کہ جو زور آور ہو یا جس سے کوئی مفاد وابستہ ہو، اس سے آپ ڈریں۔ یہ تو دنیا پرستی بلکہ شرک ہے۔ انسان سے ڈرنے کا مطلب صاحب حقوق سے ڈرنا ہے یہ سمجھ کر لوگوں سے معاملہ کرنا کہ ہر آدمی کے پیچھے اس کا خدا کھڑا ہوا ہے اور وہ ہمیشہ اس کا ساتھ دیتا ہے جس کی حق تلفی کی جائے۔

موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکیں

دور جدید اور اس کے مقابلہ میں اسلام کے مسئلہ کا آغاز سولھویں صدی عیسوی میں ہوتا ہے جبکہ پرتگالیوں نے یورپ اور ہندوستان کے درمیان سمندری راستہ دریافت کرکے بحر ہند اور بحر عرب پر قبضہ کر لیا اور عربوں کی تجارت مشرقی ایشیا سے کاٹ دی۔ سترھویں صدی میں اسٹیم انجن کی دریافت اور اٹھارویں صدی میں جدید سائنس کا وجود میں آنا یورپ کے لئے طاقت کا نیا میدان کھل جانے کے ہم معنی تھا۔ اس کے بعد ۱۸۶۹ میں جب نہر سویز بنی اور اس نے بحر روم اور بحر احمر کے درمیان سیدھا راستہ کھول دیا تو عالم اسلام پر مغرب کے غلبہ کا عمل اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ جب تک یہ عمل تجارتی منڈیوں پر قبضہ اور غیر سیاسی میدانوں میں نفوذ کی صورت میں ہو رہا تھا، لوگ اس سے بے خبر رہے۔ مسلم رہنماؤں کو اس واقعہ کی خبر صرف اس وقت ہوئی جب اس نے اپنے استیلاء کو مکمل کرکے عالم اسلام کے اوپر اپنا سیاسی جھنڈا لہرا دیا۔

انیسویں صدی کے آخر میں مسلم دنیا میں مختلف قسم کی تحریکوں کا ظہور ہوتا ہے۔ مگر اس پوری مدت میں جو بے شمار تحریکیں مسلمانوں کے درمیان اٹھیں، تقریباً سب کی سب ردعمل کی نفسیات کے تحت اٹھنے والی تحریکیں نظر آتی ہیں۔ ان میں کوئی تحریک ایسی نہیں ملتی جو ایجابی فکر کے تحت پیدا ہوئی ہو۔ خارجی طاقت کی دراندازی سے مسلم معاشرہ کے لئے جو مسائل پیدا ہوئے، ان سے متاثر ہو کر کچھ لوگ بس جوابی ذہن کے تحت اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ اصلاً خارجی حالات کی پیداوار تھے نہ کہ اسلامی تعلیمات اور سیرت رسول پر مثبت غور و فکر کی پیداوار۔

ردعمل کی یہ نفسیات جن جن صورتوں میں ظاہر ہوئی، ان کو سمجھنے کے لئے ہم چار عنوانات کے تحت ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں:

۱۔ مقابلہ آرائی

۲۔ تحفظ

۳۔ احیاء

۴۔ تعمیر و استحکام

مقابلہ آرائی کے ذہن نے سیاسی آزادی کی تحریکوں کی صورت اختیار کی۔ سید جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ — ۱۸۹۷) سے لے کر ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ — ۱۹۵۸) تک بے شمار ایسے قائدین پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں سے پوری مسلم دنیا کو جوش و خروش سے بھر دیا۔ جمال الدین افغانی کا نعرہ تھا: مصر للمصریین (مصر مصریوں کے لئے)۔ لیبیا میں اٹلی کے سیاسی اقتدار (۱۹۱۱ — ۴۳) کے زمانہ میں مسلمانوں کے ایک معلم نے آواز لگائی: موتوا الیوم اعزاء قبل ان تموتوا غدا اذلاء (آج عزت کے ساتھ مر جاؤ قبل اس کے کہ کل ذلت

الرسالہ اپریل ۱۹۷۷

کے ساتھ مردیا۔ الفاظ بدل کر اس دور کے تمام سیاسی لیڈروں کا نعرہ یہی تھا۔ کروڑوں لوگوں نے اجنبی اقتدار سے رہائی حاصل کرنے کے نام پر اپنی جانیں دے دیں اور کھربوں روپے کے نقصانات کو برداشت کیا۔ آزادی کی جدوجہد اپنے مقررہ نشانہ کے مطابق تقریباً تمام ملکوں میں کامیاب ہو چکی ہے۔ مگر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جس چیز نے مغربی استعمار سے آزادی کی جدوجہد کو کامیاب بنایا وہ بڑی حد تک خود مستعمرین کی باہمی لڑائیاں تھیں، جزوی طور پر جنگ عظیم اول (۱۹۱۴-۱۸) اور زیادہ بڑے پیمانے پر جنگ عظیم ثانی (۱۹۳۹-۴۵)

تاہم آزادی کی تحریکوں کی کامیابی ان امیدوں کو پورا نہ کر سکی جن کے لئے الجزائر میں ۲۵ لاکھ اور ہندوستان میں دو لاکھ مجاہدین نے اپنے کو قربان کر دیا تھا۔ مسلم قوموں پر مغربی قوموں کا غلبہ آج بھی بدستور باقی ہے۔ مگر اس فرق کے ساتھ کہ پہلے یہ غلبہ فوجی اور سیاسی معنوں میں تھا، اب اس نے اقتصادی اور صنعتی روپ اختیار کر لیا ہے۔ یہ دوسرا غلبہ اتنا شدید ہے کہ مسلم ملکوں کی سیاسی پالیسیاں بھی حقیقی معنوں میں آزاد پالیسیاں نہیں ہیں۔ وہ عملاً انھیں مغربی قوموں کے ہاتھ میں ہیں جن سے ہتھیار خرید کر وہ اپنا دفاع کرتے ہیں، جن کی مکمل امداد سے وہ اپنے تمدنی شعبوں کو چلا رہے ہیں۔ ان کے اثرات اب بھی اتنے گہرے ہیں کہ وہ جب چاہیں احمد وبلو (۱۹۶۶) یا شاہ فیصل (۱۹۷۵) کو قتل کرا دیں۔ اردن (۱۹۷۱) اور شام (۱۹۷۶) کے ہاتھوں فلسطینی تحریک کو کچل ڈالیں۔ ایران کے عوامی انقلاب (۱۹۵۱) کو ناکام بنا دیں۔ مصر کو اپنے اس دشمن سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور کر دیں جس کے بارہ میں جمال عبدالناصر (۱۹۷۰-۱۹۱۸) نے فخریہ کہا تھا: نحن ابناء الفراعنة سنرميكم في البحر (ہم فرعونوں کی اولاد ہیں، ہم تم کو سمندر میں پھینک دیں گے) وغیرہ۔

۲۔ تحفظ کی تحریکوں نے عام طور پر تعلیم دین کا رخ اختیار کیا۔ مولانا شبلی نعمانی (۱۹۱۴-۱۸۵۷) نے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں اپنی تقریر میں کہا تھا: "دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ وہ آگے بڑھیں، آگے بڑھیں۔ ہماری تمنا یہ ہے کہ ہم پیچھے ہٹیں، پیچھے ہٹیں۔ یہاں تک کہ دور نبوت سے جا ملیں۔" اس ذہن کے تحت تمام ملکوں میں بے شمار مدارس قائم کئے گئے۔ ان مدارس کا مقصد یہ تھا کہ مسلم نسلوں کو عربی زبان اور اسلامی علوم کی تعلیم دی جائے اور ان کو، کم از کم ذہنی حیثیت سے، دور نبوت تک پہنچا دیا جائے۔ توقع یہ تھی کہ جو لوگ ان مدارس میں تربیت پا کر نکلیں گے، وہ زمانہ کے اثرات سے اپنے کو بچانے کے لائق بن سکیں گے۔

یہ تحریک ان معنوں میں پوری طرح کامیاب رہی کہ اس نے ساری مسلم دنیا میں دینی مدرسوں کا جال بچھا دیا اور کوئی بستی ایسی نہ رہی جو ان درسگاہوں میں تعلیم پائے ہوئے علماء و فضلاء سے خالی ہو۔ مگر جہاں تک اسلامی ذہن اور اسلامی طرز فکر کا سوال ہے، ان مدارس کی کامیابی حد درجہ مشکوک ہے۔ ان مدارس سے فراغت کے بعد جن خوش نصیبوں کو خود ان مدارس یا ان سے ملتے جلتے کسی ادارہ میں جگہ مل گئی، انھوں نے بلاشبہ مدرسہ کے دئے ہوئے ظاہری لبادہ کو باقی رکھا کیونکہ ان اداروں میں قیام و ترقی کے لئے یہی لبادہ ان کی قیمت تھی۔ مگر جن لوگوں کے حالات انھیں ان اداروں سے باہر لے گئے، وہ کسی بھی معنی میں غیر دینی مدارس کے فارغین سے مختلف ثابت نہ ہو سکے۔ کیریرزم ان کا بھی رہا اور ان کا بھی۔

الرسالہ اپریل ۱۹۷۷

اس کی دو بڑی وجہیں ہیں ۔ اول یہ کہ دینی تعلیم کے رہنما اس واقعہ کا پوری طرح اندازہ نہ کر سکے کہ اسلامی تعلیم کا مسئلہ موجودہ زمانہ میں، صرف اسلامی زبان یا اسلامی احکام سے واقف کرانے کا مسئلہ نہیں ہے ۔ بلکہ نظام حاضر کے فکر میں اسلام کو اس کی جگہ دلانے کا مسئلہ ہے ۔ انھوں نے اپنے اداروں میں جو نسل تیار کی " وہ اگرچہ اسلام کے روایتی علوم کی ماہر تھی ، مگر اسلام اس کے حقیقی ذہن کا جز نہیں بنا تھا ۔ کیونکہ وہ اس کو اس فکری مستوی کے مطابق دکھائی نہیں دیتا تھا جس کے اندر وہ عملاً سانس لے رہا تھا ۔ جو اسلام اسے دیا گیا وہ اس کے لئے ایک قسم کا معلوماتی ضمیمہ تھا نہ کہ فکری غذا ۔ ظاہر ہے کہ عالمی افکار کے سیلاب میں کوئی شخص اس قسم کے ذہنی ضمیمہ کو دیر تک باقی نہیں رکھ سکتا ۔ دوسرے یہ کہ جدید تبدیلیوں نے مروجہ دینی تعلیم کا رشتہ اقتصادیات سے کاٹ دیا تھا ۔ اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کوئی تعلیمی نظام جو اقتصادی بنیادوں سے محروم ہو، زندگی کے نظام میں مؤثر مقام حاصل نہیں کر سکتا ۔

۳ ۔ احیاء کی تحریکوں سے میری مراد وہ تحریکیں ہیں جو اسلامی نظام کے قیام کا مقصد لے کر اٹھیں ۔ انڈونیشیا کی ماشومی پارٹی، مصر کی الاخوان المسلمون، پاکستان کی جماعت اسلامی اس کی مثالیں ہیں ۔ ان تحریکوں کا کہنا تھا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو جتنے مسائل پیش آرہے ہیں، وہ صرف اس لئے ہیں کہ اسلامی قانون کی حکومت زمین پر قائم نہیں ہے ۔ اگر مسلم ملکوں میں اسلامی قانون کی بنیاد پر معاشرہ کی تنظیم کر دی جائے تو نہ صرف ہمارے تمام اندرونی مسائل حل ہو جائیں گے بلکہ عالمی سطح پر مسلمان دوبارہ وہی مقام حاصل کر لیں گے جو ماضی میں ایک ہزار برس تک انھیں حاصل تھا ۔

ان تحریکوں نے اسلام کی تعلیمات کو جس طرح سیاسی اصطلاحوں میں بیان کیا وہ، خاص طور پر موجودہ صدی کے نصف اول کے ماحول میں بہت سے مسلمانوں کو اسلام کے حق میں وقت کا بہترین قصیدہ معلوم ہوا ۔ وہ سیاسی مشاعرہ کے اس اسلامی پنڈال میں آسانی سے جمع ہو گئے ۔ تاہم یہ مشاعرہ دیر تک باقی نہ رہ سکا ۔ ان تحریکوں کا ذہن چونکہ اسلام کی سیاسی تشریح سے بنا تھا، قدرتی طور پر ایسا ہوا کہ وہ بہت جلد اپنے ملکوں کی "غیر اسلامی" حکومتوں سے ٹکرا گئیں ۔ یہ ٹکراؤ ہر ایک کے حق میں چھری اور خربوزے کا ٹکراؤ ثابت ہوا ۔ مصر کے انور السادات نے اقتدار پر قبضہ کے بعد (۱۹۷۱) اپنے سیاسی حریفوں کو انتباہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ جو میری مخالفت کرے گا، میں اس کو قیمہ بنا دوں گا (الاعتصام ۱۹۷۵) مسلم حکمرانوں کے یہ ارادے سب سے زیادہ جن کے حق میں صحیح ثابت ہوئے ہیں، وہ یہی اسلامی نظام کی علم بردار جماعتیں ہیں ۔ انھوں نے ہر ملک میں ان جماعتوں کو قیمہ بنا کر رکھ دیا ہے، اب کسی بھی ملک میں ان کا کوئی سیاسی مستقبل نہیں ۔

اسلامی نظام کی علم بردار جماعتوں کی یہ ناکامی محض ان کے سیاسی حریفوں کی شقاوت کا نتیجہ نہیں ہے ۔ اس میں خود ان کے بنائے ہوئے کلیا جتہادی غلط اندازہ شامل ہے کہ انھوں نے سمجھا کہ وہ مقامی مسلمانوں کے ووٹ سے اسلامی حکومت بنانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں ۔ وہ اس تاریخی حقیقت کو بھول گئے کہ حکومتیں ہمیشہ وقت کے غالب افکار

کے جلو میں نکلتی ہیں۔ موجودہ زمانہ کا فکری ڈھانچہ تمام تر سیکولر بنیادوں پر قائم ہے۔ ایسی حالت میں کسی کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے ملک میں اسلام کا سیاسی جزیرہ بنا سکے، جب تک وہ زمانی افکار کے ڈھانچہ کو توڑنے میں کامیاب نہ ہو گیا ہو۔

۴۔ تعمیر و استحکام سے میری مراد وہ فکری حلقہ ہے جس کا کہنا یہ تھا کہ اجنبی اقتدار سے براہ راست سیاسی تصادم نہ کیا جائے۔ اس کو بطور چھتری استعمال کرتے ہوئے غیر سیاسی دائروں میں اپنے کام کو جاری رکھا جائے۔

بدقسمتی سے یہی وہ ذہن ہے جو موجودہ دور کے مسلمانوں میں سب سے کم پایا گیا ہے۔ مفتی محمد عبدہ نے پیرس میں زمانہ قیام (۱۸۸۴) سے متعلق اپنے استاد جمال الدین افغانی کا ایک تاثر نقل کیا ہے۔ محمد عبدہ نے ایک گفتگو کے دوران اپنے استاد سے کہا کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں سے سیاسی تصادم کا بظاہر کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ جب کہ دوسری طرف ہمارے لئے کام کا ایک ایسا میدان کھلا ہوا ہے جس میں ہم یقینی نتائج حاصل کرسکتے ہیں۔ یہ ہے یورپ اور امریکہ میں اسلام کی تبلیغ۔ ہم کیوں نہ ایسا کریں کہ اپنے کو سیاسی نشانہ سے ہٹا دیں اور خاموشی سے تبلیغ و تعلیم کے کام میں لگ جائیں۔ جمال الدین افغانی کی انقلابی طبیعت کو یہ تجویز حقیر معلوم ہوئی۔ انھوں نے کہا: انما انت مثبط (تم پست حوصلگی کی باتیں کرتے ہو)

اس پورے دور میں تعمیر و استحکام کے مقصد کے تحت اٹھنے والی کوئی قابل لحاظ تحریک نظر نہیں آتی۔ مسلم رہنماؤں کا حال یہ رہا کہ وہ — "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز" جیسے رومانی تصورات پر فدا ہوتے رہے۔ کسی کی سمجھ میں وہ حقیقت پسندانہ طریق کار نہ آسکا جس کو بدنام طور پر حالی (۱۸۳۷—۱۹۱۴) نے ان لفظوں میں بیان کیا تھا:

— چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی۔

ہندستان میں اس سلسلہ میں دو مستثنیٰ مثالیں ملتی ہیں، وہ بھی بدنام شخصیتوں کی۔ میری مراد سر سید احمد خاں (۱۸۱۷—۱۸۹۸) اور مرزا غلام احمد قادیانی (۱۸۴۰—۱۹۰۸) سے ہے۔ اول الذکر کا کہنا تھا کہ انگریز نے اگرچہ سیاسی کام کا راستہ بند کر رکھا ہے مگر سیاست کے علاوہ دوسرے میدانوں میں تعمیر و ترقی کے دروازے کھلے ہوئے ہیں:

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں   ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں

تعلیم اور اقتصادیات، جو بقیہ چیزوں کی اساس ہے، ان میں ہم کسی رکاوٹ کے بغیر آگے بڑھ سکتے ہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے اسی امکان کو ایک اور میدان میں تلاش کیا۔ یہ دعوت و تبلیغ کا میدان تھا۔ ان کا خیال تھا کہ دعوت کی راہ سے ہم نہ صرف ملک کے طبقات میں اپنے لئے کام کے مواقع پا سکتے ہیں بلکہ حکمراں قوم کے اندر بھی ہمارے لئے جدوجہد کا میدان کھلا ہوا ہے۔ مزید یہ کہ یہ کام خود اسلام کا اہم ترین مقصود ہے اور بالآخر اس غلبہ تک بھی پہنچانے والا ہے جہاں ہم سیاسی زور آزمائی کے ذریعہ ناکام طور پر پہنچنا چاہتے ہیں۔

یہ دونوں تحریکیں، اپنی ابتدائی شکل میں، نہایت مفید اور دور رس تحریکیں تھیں۔ مگر بدقسمتی سے وہ عام مسلمانوں کو اپنے ساتھ نہ لے سکیں۔ اس کی وجہ دو طرفہ تھی۔ ایک طرف ہمارے رہنماؤں کا ذہن سیاسی اور دشمن خیالات سے اتنا زیادہ مانوس ہو چکا تھا کہ کسی اور انداز سے سوچنا ان کے لئے ممکن نہ رہا تھا۔ ہر وہ شخص جس نے سیاسی کاٹ

دکھائی دیتا تھا جو سامراج سے سیاسی مقابلہ کی بات نہ کرے۔ اس کی آخری حد یہ ہے کہ علی گڑھ کے سابق استاد پروفیسر آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام ہمارے رہنماؤں کو سامراجی اغراض کے تحت لکھی ہوئی کتاب نظر آئی۔ کیونکہ اس میں تلوار کے بجائے پرامن تبلیغ کو اسلام کی اشاعت کا ذریعہ بتایا گیا تھا!

دوسری وجہ یہ ہوئی کہ اس نظریہ کے دونوں علمبردار اس اہلیت کا ثبوت نہ دے سکے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کی صحیح وکالت کر سکتے ہیں۔ سرسید احمد خاں نے اپنے موقف کی حمایت کے لئے یہ نادانی کی کہ قرآن کو انیسویں صدی کے مغربی افکار پر ڈھالنا شروع کر دیا۔ ان کے اخلاص کے ثبوت کے لئے یہ کافی ہے کہ انھوں نے "تہذیب الاخلاق" کو اپنے ذاتی فکر کا ناشر قرار دے کر اس کو علی گڑھ کالج سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کی۔ مگر یہ تقسیم عملی طور پر ممکن نہ ہو سکی اور ایک صحیح کام کے لئے غلط استدلال نے ان کے مشن کو لوگوں کی نظر میں مشتبہ بنا دیا۔

اسی قسم کی غلطی دوسری شکل میں مرزا غلام احمد قادیانی نے کی۔ انھوں نے اپنے کام کا آغاز کیا تو یہ وہ وقت تھا جبکہ سارے مسلم رہنما انگریز کے خلاف جہاد حریت میں مصروف تھے۔ ان پُرجوش مجاہدین کو محسوس ہوا کہ قادیانی مشن مسلمانوں کو مقدس جہاد کے محاذ سے ہٹا کر پُرامن تبلیغ کے میدان میں لگا دینا چاہتا ہے۔ مرزا صاحب نے اس کے جواب میں کہا کہ جہاد (بمعنی سیاسی مقابلہ) کوئی مستقل شرعی حکم نہیں ہے۔ وہ صرف دفاعی ضرورت کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ مگر ہمارے مجاہدین حریت کے لئے یہ جواب تشفی بخش ثابت نہ ہو سکا اور انھوں نے فتویٰ دیا کہ مرزا غلام احمد قادیانی انگریز کے ایجنٹ ہیں۔ اب مرزا صاحب نے ایک اور قدم بڑھایا۔ انھوں نے اپنی بات کو مستند ثابت کرنے کے لئے کہنا شروع کیا کہ ان پر وحی آتی ہے اور وہ جو کچھ بولتے ہیں خدا کی طرف سے بولتے ہیں۔ یہ دعویٰ اپنی تمام تر غلطی کے باوجود، قدیم زمانہ میں انوکھا نہ تھا کیونکہ ہمارے بہت سے بزرگ، مثال کے طور پر شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳—۱۷۶۲) بھی: الہمنی ربی (میرے رب نے مجھ کو الہام کیا) جیسی زبان میں کلام کرتے ہیں۔ تاہم مرزا صاحب کی غلطی میں مزید شناعت اس لئے پیدا ہو گئی کہ انھوں نے صاف لفظوں میں اپنے رسول اللہ ہونے کا دعویٰ کر دیا جو، ختم نبوت کے بعد، اجماعی طور پر کفر کو مستلزم ہے۔

ان چیزوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو فریقوں کے درمیان جو گفتگو "حالات کے لحاظ سے اسلامی عمل کی منصوبہ بندی" کے عنوان پر ہونی چاہئے تھی، وہ قرآن کی تفسیر جدید اور نبوت محمدی کے بعد دوسری نبوت جیسے مسائل پر مرکوز ہو گئی۔ آغاز میں اگر سرسید احمد خاں اور مرزا غلام احمد قادیانی کے مخالفین غلطی پر تھے تو آخر میں سرسید اور مرزا قادیانی شدید تر غلطیوں کا شکار ہو گئے اور ملت کے حصہ میں کفر و فسق کے فتووں کے سوا اور کچھ نہ آیا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زیر اہتمام ۲۲ — ۲۵ جنوری ۱۹۷۷ کو ایک سیمینار ہوا۔ عنوان تھا:

"اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں" ISLAM IN A CHANGING WORLD

یہ مقالہ اس موقع پر ۲۵ جنوری کی نشست میں پڑھا گیا

الرسالہ اپریل ۱۹۷۷

اخبار نیویارک (۳ مارچ ۱۹۸۱ء) میں ایک دلچسپ رپورٹ شائع ہوئی تھی۔ اس کے ایڈیٹر نے اطلاع دی تھی کہ اس کو بذریعہ ڈاک ایک مشین وصول ہوئی جس کا نام اس کے بھیجنے نے READING EASE CALCULATOR رکھا ہے۔ اس مشین کی خاصیت یہ تھی کہ اس کو کسی بھی تحریری مواد پر استعمال کرکے اس تحریر کی کیفیت معلوم کی جا سکتی تھی۔ مشین کے موجد نے داخلی قدروقیمت کے تمام پہلو حذف کر دیئے تھے۔ گویا سارے بڑے بڑے مشاہرہ کے لٹریری ایڈیٹروں کی ضرورت کو بھی ختم سمجھ لیا گیا تھا۔ وہ سب کچھ جو اس مشین کو عمل میں لانے کے لیے کرنا تھا وہ یہ کہ مخصوص ہدایات کے مطابق ایک چھوٹے سے ڈائل کو سیٹ کیا جائے پھر ایک انڈیکیٹر کو خاص طریقے سے گھمایا جائے اور اس کے بعد مشین کے فیصلہ کو پڑھا جائے جو چار میں سے کسی ایک شکل میں سامنے آتا تھا ـــــ بہت سخت، سخت، آسان اور بہت آسان۔ ہدایات کا کتابچہ بتاتا تھا کہ اس کی بنیاد مواد کی خوبیوں پر تھی۔ یعنی سب سے آسان کا مطلب تھا سب سے عمدہ اور سب سے سخت کا مطلب سب سے خراب۔

نیویارک کے ایڈیٹر نے لکھا تھا کہ اس مشین کا سب سے پہلا استعمال اس نے اسی کتابچہ پر کیا جو مشین کے ساتھ مشین کے تعارف اور ترکیب استعمال کے لیے آیا تھا۔ مشین نے بتایا "بہت سخت" اور کم سے کم اس معاملے میں اس نے مشین کے فیصلہ کو قبول کر لیا۔

اس مثال سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کا یہ رجحان کہ ہر چیز کو مشکل بنایا جائے کس قدر بے تکی ہے۔ انسان کو مشین فرض کرنے کے نتیجے میں آج کے اہل علم کیسی کیسی نادانیاں کر رہے ہیں اس کی ایک تازہ مثال یہ ہے کہ ییل یونیورسٹی اسکول آف میڈیسن (نیو ہیون) کے ڈاکٹر جوزے ڈیلگاڈو (JOSE M.R. DELGADO) نے اعلان کیا ہے کہ انھوں نے انسان کی مشینی تطہیر (MECHANICAL PURGING) کا ایک نیا طریقہ دریافت کر لیا ہے جس کو وہ ای ایس بی یعنی دماغ کی برقیاتی تحریک (ELECTRICAL STIMULATING OF BRAIN) کا نام دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس طریقہ کو استعمال کرکے ایک زیادہ پرامن سماج بنایا جا سکتا ہے۔

ان کے اس یقین کی بنیاد ان کی وہ کامیابی ہے جو انھوں نے کمپیوٹر کے ذریعہ چمپنیزی کے دماغ سے غیر حسیاتی ربط (NON-SENSORY CONNECTION) قائم کرنے میں حاصل کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی ذی حیات کا دماغ جو اب تک صرف اس کے اپنے حواس سے مربوط سمجھا جاتا تھا اب خارج میں پیدا کردہ ریڈیائی لہروں کے ذریعہ بھی اس سے ربط قائم کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر ڈیلگاڈو نے ایک چمپنیزی کے دماغ کے جارحانہ مرکز سے ربط پیدا کیا اور اس کو اس حد تک متاثر کیا کہ اس کی جارحانہ ذہنیت جاتی رہی۔ ان کے اس طریقہ کو "غیر حسیاتی تحریک بذریعہ کمپیوٹر" کا نام دیا گیا ہے۔ بمبئی کے ایک اخبار [illegible] (۵ ستمبر ۱۹۸۱ء) نے اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ تجربہ اپنے اندر بہت غیر معمولی مضمرات رکھتا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ انسانی دماغ میں برقی تحریک پیدا کرکے بہتر انسان (BETTER MAN) اور بہتر سماج کی تخلیق کی جا سکتی ہے۔

یہاں سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر ڈیلگاڈو کی دریافت کو انسان پر استعمال کرنے کی صورت کیا ہوگی۔ کیا انسان کے "ناپسندیدہ جذبات" کو دائمی طور پر ختم کر دیا جائے گا یا ہر آدمی کے ساتھ ایک امدادی کمپیوٹر لگایا جائے گا [illegible]

کرتی [illegible] جذبہ ابھرے اور فوراً مشین کو عمل میں لاکر اس کو ختم کر دیا جائے۔ اگر ایسی صورت ہو تو وہ ناممکن ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں ہر روز بے شمار لوگ پیدا ہوتے ہوں اور بے شمار لوگ مر جاتے ہوں، آخر کس طرح اس کو ممکن بنایا جائے گا کہ ساری انسانی آبادی کی مسلسل تطہیر ہوتی رہے۔ انسانیت کے موجودہ تمام وسائل بھی اس کو مسلسل جاری رکھنے کے لیے ناکافی ہیں اور اگر صرف کچھ "ناپسندیدہ" لوگوں کو اس مشین کا عمل بننے کے لیے چنا جائے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ علم ان لوگوں کے ہاتھوں غلط استعمال کا شکار نہ ہوگا جو اس کام کے ذمہ دار بنائے جائیں گے۔ ایک مصنف اس ایجاد کے نتائج پر شک کرتے ہوئے لکھتا ہے:

KNOWLEDGE AND MORAL RESPONSIBILITY, ARE NOT NECESSARILY INTERLINKED

یعنی علم اور اخلاقی ذمہ داری لازمی طور پر ایک دوسرے سے بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ اگر علم اور اخلاقی ذمہ داری لازم و ملزوم ہوتے تو ایٹمی توانائی کی دریافت ایٹم بم کی صورت اختیار نہ کرتی۔

اگر اس دریافت کے معنی یہ ہوں کہ وقتی مواقع پر اسے استعمال کیا جائے، یعنی جب کسی انسان کے اندر کوئی ناپسندیدہ جذبہ ابھرے اس وقت مشین اس کے دماغ سے لگا دی جائے تو یہ اور بھی زیادہ ناقابل فہم ہے۔ اس مقصد کے لیے ڈاکٹر ڈیلگاڈو کو موجودہ تین ارب نسل انسانی کے لیے مزید تین ارب انسان پیدا کرنے ہوں گے کیونکہ یہ کسی ایک کا نہیں بلکہ سارے ہی انسانوں کا مسئلہ ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ ہر آدمی کے ساتھ ایک اور آدمی مشین کے انتظار میں اس کے ساتھ لگا رہے۔ تاہم اس ہتھکنڈے کو [illegible] کے بعد بھی اصل مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

الرسالہ اپریل ۱۹۷۷ء

"اصلاحی مشین" صرف ان انسانوں پر اپنا عمل دہرا سکتی ہے جو مقید چمپنزی کی طرح اس کے بس میں ہوں اپنے سیاسی آقاؤں کو پھر بھی وہ اپنا معمول نہیں بنا سکتی

کیونکہ ڈاکٹر ڈیلگاڈو کا مشینی پہرہ دار صرف ان انسانوں پر اپنا عمل دہرا سکے گا جو محبوس چمپنزی کی طرح اس کے بس میں ہوں۔ ہٹلر اور اسٹالن جیسے انسانوں کو پھر بھی وہ اپنا معمول نہیں بنا سکتا۔

آخری بات یہ ہے کہ انسان کے اندر فطرت نے جو صلاحیتیں رکھی ہیں، ان میں سے کوئی بھی بذات خود غلط نہیں ہے۔ صرف اس کا بے موقع استعمال اسے غلط کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر غصہ اور جارحیت بذات خود کوئی مستقل صفت نہیں ہیں۔ یہ دراصل اس صفت کا ایک بے جا ظہور ہے۔ جو زیادہ بہتر طور پر شجاعت اور مردانگی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اگر بالفرض انسان کی ذہنی صلاحیتوں میں تبدیلی لانا ممکن ہو جب بھی یہ فطرت کے توازن کو بدلنے کی قیمت پر ہوگا۔ آپ انسان کے اندر سے غصہ کا مادہ نکال دیں تو آپ صرف غصہ ہی کو اس کے اندر سے نہیں نکالیں گے بلکہ اسی کے ساتھ یقین، جوش، حوصلہ، عزم، اقدام، اصول پر جمنے کی خصوصیات کو بھی اس کے اندر سے کمزور کر دیں۔ اس قسم کا مصنوعی انسان کسی کارخانہ میں [illegible] گھمانے کا فرض شاید انجام دے سکے [illegible] پرشور معرکہ میں کوئی کارنامہ [illegible]

اس کا اخبار وہاں بھی پہونچ رہا تھا جہاں وہ خود نہیں پہنچ سکتا تھا

روسی کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ کا ایک چھوٹا سا واقعہ ہے مگر اس کے اندر بہت بڑی نصیحت چھپی ہوئی ہے۔

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب روس میں اکتوبر ۱۹۱۷ء کا انقلاب نہیں آیا تھا روس میں بالشویکوں (کمیونسٹوں کا قدیم نام) کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکنے کے لیے شہنشاہ روس (زار) نے بالشویک پارٹی کو خلاف قانون قرار دے دیا تھا۔ اور تمام بڑے بڑے لیڈروں کے نام گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے تھے۔

کچھ لیڈر گرفتار ہوئے، کچھ بچ کر جنگلوں اور غاروں میں روپوش ہو گئے۔ انھیں روپوش ہونیوالوں میں بالشویک پارٹی کا عظیم لیڈر لینن بھی تھا۔ لینن نے جنگلوں اور غاروں کے ایک دور افتادہ علاقہ کو اپنا مسکن بنایا اور وہاں روپوش ہوکر اخبار نکالنا شروع کر دیا۔ یہ اخبار دستی پریس میں چھاپ کر دستی طور پر روس کے شہروں میں خفیہ طور پر پہنچا دیا جاتا تھا۔

ایک روز کا واقعہ ہے۔ ایک شخص ایک روسی شہر میں پنساری کے یہاں کچھ سامان خریدنے گیا۔ جب وہ سامان خرید کر گھر لایا اور پڑیا کھولی تو اچانک اس کی نظر پڑیا والے کاغذ کے چھپے ہوئے الفاظ پر پڑی۔ یہ ایک اخبار کا پھٹا ہوا صفحہ تھا جس میں آتشیں الفاظ اور [illegible] ایک عبارت چھپی ہوئی تھی۔

ردی کے اس ٹکڑے پر چھپی ہوئی عبارت پڑھ کر اس آدمی کے اندر عجیب کیفیت پیدا ہوئی۔ وہ بار بار اس کو پڑھتا رہا اور اس سے اپنے دل کو گرماتا رہا یہاں تک کہ اسے خیال ہوا کہ معلوم کرے کہ اس عبارت کا مصنف کون ہے اور یہ کس اخبار کا ٹکڑا ہے جو پنساری کی معرفت اسے ملا ہے۔

وہ تلاش میں لگ گیا۔ جوئندہ یابندہ۔ بالآخر اسے معلوم ہوا کہ یہ ردی کا ٹکڑا لینن کے اس اخبار کا پھٹا ہوا صفحہ ہے جو وہ روپوش ہوکر نکال رہا ہے۔

اب اس کا اشتیاق اور بڑھا اور وہ تلاش کرتا ہوا اس غار میں پہنچ گیا جہاں چھپ کر لینن اخبار نکالا کرتا تھا۔ اس کے بعد سے آخر تک وہ لینن کا ساتھی بنا رہا۔ اس طرح کے کتنے لوگ ہیں جن کو لینن نے صرف اپنے اخبار سے فتح کیا۔

لینن زار کی پولیس سے بچنے کے لیے غار کے اندر روپوش تھا مگر اپنے اخبار کی بدولت وہ ہر شہر میں پہنچا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ بازار میں پنساری کی دوکان بھی اس کے حق میں پروپیگنڈے کا مرکز بنی ہوئی تھی اس کا اخبار وہاں بھی پہنچ رہا تھا جہاں وہ خود نہیں پہنچ سکتا تھا۔

یہ ہے موجودہ زمانے میں پریس کی قوت۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ پچاس برس پہلے باشعور لوگوں نے اس سے جو کام لیا تھا ابھی تک ہم وہاں بھی نہیں پہنچے ہیں اور آج کی زندہ قومیں پریس سے جو کام لے رہی ہیں اس کی تو عام مسلمانوں کو خبر بھی نہیں حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں دوسری قومیں ہم سے اتنا آگے ہیں کہ ہم ان کے پیچھے بھی نہیں۔ پیچھے ہونے کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم بھی کہیں ہیں [illegible] ان کی نسبت سے کہیں نہیں ہیں۔

الرسالہ اپریل ۱۹۸۰ء

بادشاہوں کی مجالس علماء کی فقہی اور کلامی بحثوں سے معمور رہتی تھیں، جبکہ ٹھیک اسی وقت اسلام کی دعوت و اشاعت کا میدان سونا پڑا ہوا تھا

مسلمان بادشاہوں کی بدولت ہندوستان میں علماء اور صوفیا کو قدم جمانے اور اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے کا موقع ملا۔ ہر دور میں بکثرت علماء پیدا ہوتے رہے، سلاطین دہلی کے ابتدائی دور میں علماء زیادہ تر نیشاپور، صغان، مرغینان، کاشان، بلخ، سجستان، خوارزم اور تبریز سے آئے، جیسا کہ ان کے ناموں سے ظاہر ہے، اور یہ اپنے ساتھ حنفی فقہ لائے، حجاز سے آنے والے علماء کی تعداد کم رہی، اس لیے ہندوستانی فقہ میں عراق اور خراسان کے اثرات زیادہ غالب رہے، اور یہی فقہ ہندوستان میں رائج رہی، جس کی باضابطہ تدوین فتاویٰ تاتارخانیہ اور فتاویٰ عالمگیری میں ہوئی۔

سلاطین دہلی کی حکومت میں سب سے زیادہ علماء، علاؤالدین خلجی کے دور میں تھے ان کا اتنا شاندار اجتماع ہوگیا تھا کہ ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ اس وقت کی اسلامی دنیا یعنی بخارا، سمرقند، مصر، خوارزم، دمشق، تبریز، صفاہان، رے اور روم میں یہاں کے جیسے علماء نہیں پائے جاتے تھے جملہ علوم میں کامل دستگاہ رکھنے والے علماء یہاں موجود تھے، مولانا ضیاء الدین برنی ان پر فخر کرتے ہوئے یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ بعض علماء تو امام غزالی اور امام رازی کے ٹکر کے تھے، اور فقہ کے بعض ماہرین کو امام ابویوسف اور امام محمد کا مرتبہ حاصل تھا، خود امیر خسرو کو دہلی پر فخر تھا، انھوں نے اس کو قبۃ الاسلام لکھ کر یاد کیا ہے، محمد تغلق کے زمانے میں علماء کی تعداد اور بھی بڑھ گئی تھی، قلقشندی کا بیان ہے کہ دو سو فقہا سلطان کے دسترخوان پر موجود ہوتے تھے اور وہ ان

زندگی ایک بازار ہے۔ یہاں کوئی چیز اسی وقت ایک شخص کو ملتی ہے جب کہ اس کی قیمت ادا کرنے کے لیے اس کی جیب میں پیسے موجود ہوں۔ آپ کسی سے کچھ لینا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے یہ جانئے کہ آپ اس کو کیا چیز دے سکتے ہیں۔ آپ کا دینے کی پوزیشن میں ہونا ہی آپ کے لیے پانے کا استحقاق پیدا کرتا ہے، نہ کہ شکایت اور مطالبہ۔

سے مذہبی مذاکرے کیا کرتا تھا۔ فیروز شاہ تغلق فقہاء سے اس قدر متاثر تھا کہ اس نے فتاوائے فیروز شاہی کے نام سے فقہ کی تدوین کرائی جو زیادہ مقبول نہ ہو سکی۔ سکندر لودی کی خواب گاہ میں روزانہ رات کو ستر علماء جمع ہوا کرتے تھے اور وہ ان سے فقہی مسائل دریافت کیا کرتا تھا۔

عہد مغلیہ میں بھی علماء کی تعداد زیادہ تھی، ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنے عہد کے جن ممتاز علماء کے حالات لکھے ہیں ان کی تعداد ۶۹ ہے، اسی طرح مآثر رحیمی کے مؤلف نے ایسے ۴۲ علماء کا ذکر کیا ہے جو عبدالرحیم خانخاناں کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ عہد عالمگیر میں جو علماء اس کے دربار میں مختلف خدمات پر مامور تھے ان کی تعداد ۴۲ ہے۔ عالمگیر کے زمانہ سے مولانا شاہ عبدالرحیم کے خاندان سے جو سلسلۃ الذہب چلا اس پر مسلمانوں کو آج بھی فخر ہے۔ ان علماء کے ناموں پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں بھی شیراز، کاشان، تبریز، گیلان، مشہد اور ترکستان سے کچھ علماء ضرور آتے رہے، لیکن ان کے مقابلے میں ہندوستانی علماء کی تعداد زیادہ رہی، اور حنفی فقہ کی ترویج اور اس کی باضابطہ تدوین فتاوائے عالمگیری کی شکل میں ہوئی، جس کو عالمگیر کا ایک عظیم الشان علمی و فقہی کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ حنفی فقہ سے شافعی، مالکی، حنبلی اور شیعی فقہ کا تصادم ضرور ہوا، لیکن اکثریت حنفی فقہ کے ماننے والوں ہی کی رہی، اور مغلوں کی بادشاہت کا دلچسپ پہلو ہے کہ وزارت کے عہدہ پر زیادہ تر شیعہ امراء مامور رہے۔ محض ایک عرصہ دراز تک بہت شہزادیوں کے زیر اثر رہا لیکن سلطنت پر حنفی فقہ کا غلبہ رہا۔

(ماخوذ)

[illegible] اپریل ۱۹۷۷ء

صحیح کوشش کرنے والے کے لئے

ناکامی کا سوال نہیں

جو حرکت کرنا چاہے اس کا راستہ کبھی بند نہیں ہوتا — گیس نیچے نہیں سماتی تو اوپر اٹھ کر اپنے لیے جگہ حاصل کرتی ہے۔ پانی کو اونچائی آگے بڑھنے نہیں دیتی تو وہ نشیب کی طرف بہہ کر اپنا راستہ بنا لیتا ہے۔ درخت سطح پر قائم نہیں ہو سکتا تو وہ زمین کو پھاڑ کر اس سے اپنے لئے زندگی کا حق وصول کرتا ہے۔

یہی طریقہ آپ کو بھی اختیار کرنا ہے۔ آپ کا پہلا کام یہ ہے کہ اپنے آپ کو کہیں [illegible] کو صحیح ڈھنگ سے ترتیب دیں اور پھر [illegible] کر ماحول کے اندر اس طرح گھسیں کہ [illegible] مقابلہ میں اپنی اہلیت ثابت کرنے کے لئے آپ پوری طرح مسلح ہوں۔ حالات سے اپنی اہمیت منوانے کے لئے آپ نے ضروری سامان کر لیا ہو۔

لیاقت پیدا کیجئے اور دانشمندی کے ساتھ اپنے لئے راہ نکالیے۔ اس کے بعد آپ کو کسی ماحول سے شکایت نہ ہوگی۔ زندگی کی کسی منزل پر آپ اپنے کو ناکام محسوس نہیں کریں گے۔ ناکامی اور [illegible] صرف وہیں آتی ہے جہاں زندگی کی ضروری شرطیں پوری کرنے میں کوتاہی کی گئی ہو۔

وہ جانتے تھے کہ انھیں اپنا حصہ کس طرح ادا کرنا ہے

حویطب بن عبدالعزی، فتح مکہ کے بعد بیعت کرنے کی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے اپنے قدیم ساتھی ابوذر غفاریؓ سے پوچھا آپ کو سلام کس طرح کیا جاتا ہے۔ (کیف یقال اذا سلّم علیہ)

انھوں نے کہا، جب تم آپ کے پاس حاضر ہو تو اس طرح کہو —— السلام علیک ایہا النبی ورحمۃ وبرکاتہ۔

یہ پیغمبر کا کام نہیں کہ وہ ہر ایک سے یہ بتائے کہ وہ کس طرح اس کو مخاطب کریں، یہ وہ کام ہے جو آپ کے ساتھیوں کو خود سے جاننا چاہئے۔

اہل نجران کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب ملا تو انھوں نے غور وفکر کے بعد آپ کے پاس اپنا وفد بھیجا تاکہ وہ آپ سے صلح کی دفعات طے کرے۔ وہ مدینہ پہنچے تو انھوں نے اپنا سادہ سفری لباس تبدیل کیا اور ریشمی کپڑے اور سونے کی انگوٹھیاں پہن کر آپ سے ملنے کے لئے آئے۔ انھوں نے سلام کیا تو آپ نے ان کے سلام کا جواب نہیں دیا۔ وہ دیر تک آپ کے پاس بیٹھے رہے مگر آپ نے ان سے کوئی کلام نہ کیا۔ اس کے بعد وہ حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف سے ملے جن سے ان کی پہلے سے ملاقات تھی۔ ان لوگوں نے معاملہ کو سنا تو حضرت علیؓ کو بلا کر مشورہ کیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ یہ لوگ اپنے مزین کپڑے اور سنہری انگوٹھیوں کو اتار دیں اور اپنے سفری لباس پہن کر آپ کے پاس جائیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اب آپ نے سلام کا جواب دیا اور ان سے بات چیت کی اور فرمایا:

والذی بعثنی بالحق لقد اتونی المرۃ الاولیٰ وان ابلیس معھم

اس خدا کی قسم جس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے جب یہ لوگ پہلی مرتبہ میرے پاس آئے تو ان کے ساتھ شیطان تھا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ لباس فاخرہ کے ساتھ آپ کے پاس آئے تو آپ نے محسوس کیا کہ یہ چیزیں ان کے اندر احساس برتری پیدا کریں گی۔ ان کی متکبرانہ نفسیات کسی نتیجہ خیز گفتگو میں مانع ہوگی۔ مگر یہ بات آپ خود اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتے تھے۔ حضرت علیؓ نے اس حقیقت کو جانا اور اپنا کردار ادا کیا۔

الرسالہ اپریل ۱۹۷۷

سعدؓ بن معاذ انصاری مدینہ کے ممتاز ترین شخصیت رکھنے والے آدمی تھے (وکان من اعظم الناس واطولھم)

امام احمد نے حضرت عائشہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ غزوۂ خندق میں وہ زخمی ہوئے۔ ابن العرقہ قریشی نے تیر مارا جس سے ان کی رگ اکحل کٹ گئی۔ اس وقت ان کی زبان پر یہ دعا تھی:

اللّٰھم لا تمتنی حتی تقر عینی من بنی قریظۃ

خدایا مجھے موت نہ دے جب تک بنی قریظہ سے میری آنکھیں ٹھنڈی نہ ہو جائیں۔

بنو قریظہ ایک یہودی قبیلہ تھا جو مدینہ کے اندر آباد تھا وہ مسلمانوں کے خلاف مستقل سازشوں میں مشغول رہتا تھا۔ غزوۂ خندق میں انھوں نے کھل کر قریش کا ساتھ دیا۔ یہ صریح طور پر ایک غداری کا عمل تھا۔ چنانچہ غزوۂ خندق سے فارغ ہوتے ہی آپ نے ان کے قلعہ کو گھیر لیا۔ ۲۵ دن کے محاصرہ کے بعد انھوں نے [illegible]

حملہ کر دیں ہم کو منظور ہے۔ سعد بن معاذ اسلام سے
بل ان کے حلیف تھے۔ وہ زخمی حالت میں گدھے پر سوار کر کے
لائے گئے۔ سعد بن معاذ نے تورات کے مطابق فیصلہ کیا کہ ان
کے قابل جنگ مردوں کو قتل کر دیا جائے۔ ان کی اولاد کو
گرفتار کر لیا جائے اور ان کے اموال کو ضبط کر لیا جائے۔
اس کے بعد انھوں نے دعا کی:

اللّٰھم ان کنت ابقیت علی نبیک من حرب قریش شیئا فابقنی لھا وان کنت قطعت الحرب بینہ وبینھم فاقبضنی الیک

خدایا! اپنے نبی کے ساتھ قریش کی جنگ میں اگر تو نے کوئی حصہ باقی رکھا ہو تو مجھے اس کے لئے باقی رکھ۔ اور اگر تو نے ان کے درمیان جنگ کو ختم کر دیا ہو تو مجھے اپنے پاس بلالے۔

اس دعا کا پس منظر یہ تھا کہ سعد بن معاذ اپنی شخصیت، اپنی تاریخ اور یہود سے اپنے تعلق کی بنا پر مدینہ کے واحد شخص تھے جو ان کے اوپر اس قسم کے فیصلے کے لئے موزوں ہو سکتے تھے، انھوں نے سوچا کہ میں آپ کے اس کام کو انجام دے لوں اس کے بعد اس دنیا سے جاؤں۔ میرے بعد کوئی دوسرا موزوں شخص اس کام کے لئے نہ ہوگا ——
کس قدر باشعور تھے رسول اللہؐ کے یہ اصحاب!

آدمی اسی چیز کو کھو دیتا ہے جس کو وہ پانا چاہتا ہے

ابن عبدالبر نے استیعاب میں قتادہ کی روایت نقل کی ہے۔ عمر فاروقؓ کہیں جا رہے تھے۔ راستہ میں ان کو ایک بوڑھی خاتون ملیں۔ آپ نے ان کو سلام کیا۔ سلام کا جواب دینے کے بعد وہ بولیں: "اے عمرؓ، ایک وقت تھا جب میں نے تم کو بازار عکاظ میں دیکھا تھا۔ اس وقت تم عمیر کہے جاتے تھے۔ لاٹھی ہاتھ میں لئے بکریاں چراتے پھرتے تھے۔ پھر زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ تم عمرؓ کہے جانے لگے۔ پھر ایک وقت آیا کہ تم امیر المومنین کہے جاتے ہو۔ دیکھو رعیت کے معاملہ میں اللہ سے ڈرتے رہو اور یاد رکھو کہ جو اللہ کی وعید سے ڈرتا ہے، اس کے لئے دور کا آدمی بھی قریبی رشتہ داروں کی طرح ہوتا ہے اور جو موت سے ڈرتا ہے، اس کے حق میں اندیشہ ہے کہ وہ اسی چیز کو کھو دے گا جسے وہ بچانا چاہتا ہے۔"

جارود عبدی، جو اس وقت عمر فاروقؓ کے ساتھ تھے، یہ سن کر بولے: "اے عورت تو نے امیر المومنین کے ساتھ بہت زبان درازی کی۔ عمر فاروقؓ نے فرمایا: انھیں کہنے دو، جانتے ہو یہ کون ہیں۔ ان کی بات تو سات آسمانوں کے اوپر سنی گئی تھی۔ عمر کو تو بدرجہ اولیٰ سننا چاہئے۔"

یہ خاتون خولہ بنت ثعلبہ تھیں جن کا ذکر قرآن کی سورہ مجادلہ کے شروع میں آیا ہے: "بے شک اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو آپ سے اپنے شوہر کے بارہ میں ——"

ان کے پاس اپنی ہر غیر خدا پرستانہ روش کے لیے خدا کی کتاب میں دلیل موجود تھی!

مسیح کے ظہور سے پہلے یہودی حضرت مسیح کے منتظر تھے۔ وہ دعا کرتے تھے کہ "خدایا! مسیح کو جلد بھیج" مگر جب مسیح ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے تو انھوں نے ان کو ماننے سے انکار کر دیا۔ حتی کہ اپنے خیال سے آپ کو دار پر چڑھا دیا۔ اور آپ کا نام بیل زبوب (شیطان) رکھا۔

ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجہ وہی "شک" تھا جو مصریوں کو حضرت یوسفؑ کی نبوت ماننے میں رکاوٹ بنا تھا۔ حضرت مسیح اپنے ساتھ دنیوی شان و شوکت لے کر ظاہر نہیں ہوئے عام انسانوں کی طرح وہ بھی ایک انسان تھے۔ یہودیوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ انھیں جیسا ایک انسان وہ عظیم انسان ہو سکتا ہے جس کی پیشین گوئی ان کی مقدس کتابوں میں کی گئی تھی۔

یہودیوں نے حضرت مسیح کے انکار کا ایک نہایت آسان راستہ نکالا۔ ان کی کتابوں میں بعد کے دور کے لئے دو پیغمبروں کی پیشین گوئی کی گئی تھی۔ ایک مسیح، دوسرے "وہ نبی"۔ انھوں نے یہ کیا کہ حضرت مسیح کو اس معیار سے جانچنا شروع کیا جو "وہ نبی" کے لئے تھا۔ ظاہر ہے کہ اس معیار پر حضرت مسیح پورا نہیں اتر سکتا تھا۔ انھوں نے اعلان کر دیا کہ یہ "جھوٹے مسیح" ہیں۔ اگر وہ سچے مسیح ہوتے تو ضرور ہماری آسمانی کتابوں کی پیشین گوئیاں ان پر صادق آتیں۔

انھوں نے کہا کہ مسیح کا ظہور، تورات کی نصوص کے مطابق بعض نشانیوں کے ساتھ ہوگا۔ اور جب تک یہ نشانیاں ظاہر نہ ہوں، جو کوئی بھی مسیح ہونے کا دعوے دار ہوگا، وہ جھوٹا ہوگا۔ ان نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ مسیح ایک غیر معروف مقام سے ظاہر ہوگا۔ مگر ہم سب جانتے ہیں کہ اس آدمی کا گھر ناصرہ میں ہے اور ناصرہ فلسطین کا ایک مشہور معروف شہر ہے۔ دوسری نشانی یہ ہے کہ وہ ایک لوہے کے عصا کے ساتھ حکومت کرے گا یعنی وہ تلوار سے کام لے گا۔ مگر اس مدعی مسیح کے پاس لکڑی کا ڈنڈا تک نہیں ہے۔ تیسری شرط یا نشانی یہ ہے کہ وہ داؤد کے تخت پر بیٹھ کر داؤد کی بادشاہت کو قائم کرے گا۔ جبکہ اس مسیح کا حال یہ ہے کہ اس کے پاس بیٹھنے کے لئے ایک چٹائی بھی نہیں ہے۔ اسی طرح ایک شرط یہ ہے کہ وہ تورات کی شریعت کو پھر سے قائم کرے گا۔ مگر اس شخص نے اس شریعت کو منسوخ کر دیا۔ ایک نشانی مسیح کی یہ ہے کہ اس کے عہد میں عدل و انصاف اس قدر ترقی پائے گا کہ نیکی اور ہمدردی انسان کو

مفتی محمد عبدہ اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار وہ کھانے کی ایک مجلس میں تھے۔ ان کے ساتھ اس دعوت میں اور بھی بڑے بڑے علماء تھے۔ مفتی محمد عبدہ نے چمچے کو چیز اٹھا کر منہ میں ڈالی تو ازہر کے ایک عالم نے متعجب ہو کر کہا:

احلال ھذا ام حرام (یہ حرام ہے یا حلال)

الاہرام ۲۳ اپریل ۱۹۸۵

انسانی حوالوں میں بھی پائی جائے گی۔ جب کہ مسیح کے زمانہ میں یہ حال ہے کہ ہر طرف ظلم اور نا انصافی کا دور دورہ ہے اسی طرح ایک نشانی یہ ہے کہ مسیح کے وقت خدا پرست اتنے کامیاب ہوں گے کہ تمام دنیا کی قوموں پر فتح پائیں گے۔ مگر ہم نہایت ذلت اور غلامی کی حالت میں رومیوں کے ماتحت ہیں، پھر یہ شخص وہ مسیح کیسے ہو سکتا ہے جس کی تورات میں پیشین گوئی ہے۔

یہ جتنے معیار یہودیوں نے پیش کئے، وہ سب تورات میں لکھے ہوئے ہیں مگر وہ "وہ نبی" کے ہیں نہ کہ مسیح کے۔ یہودیوں نے "وہ نبی" کے معیار کو مسیح کے انکار کے لئے استعمال کیا۔ مگر جب "وہ نبی" عرب کے ایک غیر معروف شہر میں "محمد بن عبداللہ" کی صورت میں پیدا ہوئے اور خدا نے آپ پر وہ تمام نشانیاں مکمل طور پر پوری کر دیں جو تورات میں لکھی ہوئی تھیں تو انھوں نے آپ کی نبوت کا انکار کرنے کے لئے ایک اور وجہ تلاش کر لی۔ انھوں نے کہا: "اب تک تمام انبیا اسرائیل کے خاندان میں آئے، پھر اسمٰعیل کے خاندان میں کیسے کوئی نبی پیدا ہو سکتا ہے؟"

یہود نے حضرت مسیح کے انکار کے لئے یہ کیا کہ پیغمبر آخر الزماں کی علامتوں کو آپ پر چسپاں کیا جو ظاہر ہے کہ آنجناب پر چسپاں نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس کے بعد جب پیغمبر آخر الزماں کا ظہور ہوا تو آپ کو ان علامتوں سے جانچا جو ان کی کتاب میں حضرت مسیح کے لئے بتائی گئی تھیں۔ اس طرح انھوں نے دونوں نبیوں کا انکار کر دیا۔ اور دونوں مواقع پر ان کے پاس یہ کہنے کے لئے کافی الفاظ موجود تھے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں کتاب اللہ کی روشنی میں کر رہے ہیں۔ ہم نے خدا کی کتاب سے ہٹ کر اپنے لئے کوئی موقف اختیار نہیں کیا ہے!

الرسالہ اپریل ۱۹۷۷

لطیفہ

"دیکھو ترکیب استعمال بھی نوٹ" حکیم صاحب نے مریض کو نسخہ دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں ارشاد ہو"

"اس کو گرم پانی میں اچھی طرح جوش دے کر، چھان کر سوتے وقت پی لینا۔ اللہ نے چاہا تو پہلی ہی خوراک میں آرام محسوس ہوگا۔"

"بہت اچھا حضور"

"اور دیکھو کل صبح آکر اطلاع دینا"

"بہت اچھا"

دوسری صبح مریض پھر آیا، حکیم صاحب نے نبض پر ہاتھ رکھا اور پوچھا، کہو کچھ فرق محسوس ہوا۔ مریض نے کہا "نہیں حضور کچھ فرق نہیں بلکہ آج تو تکلیف اور بڑھ گئی ہے" حکیم صاحب گہری سوچ میں پڑ گئے، ماتھے پر ہاتھ رکھا، لمبی سانس لی اور کچھ یاس آمیز لہجہ میں کہا اچھا لاؤ نسخہ دکھاؤ۔

"نسخہ؟" مریض بولا "حضور نسخہ تو آپ کے ارشاد کے مطابق میں نے جوش دے کر پی لیا"

حکیم صاحب نے گھبرا کر آنکھیں اوپر اٹھائیں "کیا کہا! نسخہ پی لیا"

"جی حضور نسخہ جوش دے کر پی لیا جیسا کہ آپ نے بتایا تھا کہ اس کو ......"

"ارے بدبخت" حکیم صاحب غصہ سے بولے "کہیں نسخہ بھی جوش دے کر پیا جاتا ہے۔ نسخہ میں جو دوا لکھی جاتی ہے وہ استعمال کی جاتی ہے نہ کہ نسخہ کا کاغذ"

قارون ایک اسرائیلی خاندان میں پیدا ہوا مگر وہ قبطی بادشاہوں کا حلقہ بگوش ہو گیا۔ کیونکہ دنیوی کامیابی کی کنجیاں اس وقت قبطی حکمرانوں ہی کے پاس تھیں۔

قارون ایک اسرائیلی مسلمان تھا۔ مگر قرآن میں اس کا ذکر فرعون اور ہامان کے ساتھ کیا گیا ہے (عنکبوت)۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بنی اسرائیل سے کٹ کر وقت کے ظالم حکمراں فرعون سے جا ملا تھا۔

قارون کو بائبل اور تالمود میں قورح کہا گیا ہے۔ بائبل کی روایت (خروج ۶: ۲۱ - ۱۸) کے مطابق وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچا زاد بھائی تھا، حضرت موسیٰ اور قارون کے والد ایک دوسرے کے سگے بھائی تھے۔ قارون بنی اسرائیل میں پیدا ہوا اور اس وقت کے لحاظ سے وہ مسلمان تھا۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی شخصیت اور زبردست صلاحیتیں عطا کی تھیں۔

اس طرح کے لوگوں میں اکثر نہایت خاموشی سے یہ کمزوری داخل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی صلاحیت کی قیمت اسی موجودہ دنیا میں وصول کر لینا چاہتے ہیں۔ قارون میں بھی یہی کمزوری گھس آئی۔ وہ دن بدن اسرائیل سے دور اور فرعون سے قریب ہونے لگا۔ کیونکہ دنیوی کامیابیوں کی کنجیاں اس وقت فرعون کے پاس تھیں۔ اس کی اس پالیسی نے اس کے لئے دولت اور عزت کے دروازے کھول دیئے، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ اقتدار پرستی اور مصلحت پسندی کی انتہا پر پہنچ گیا۔ فرعون کے وزیر اعظم ہامان کے بعد وہ قبطی شہنشاہیت کا تیسرا سب سے بڑا رکن تھا۔ وہ بطور خود اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ یہ مرتبہ مجھے اپنی خصوصی صلاحیتوں (قصص - ۷۸) کی بنا پر ملا ہے۔ حالانکہ وہ اس کی قومی غداری کی قیمت تھی۔ فرعون بنی اسرائیل کو مصر سے مٹا دینا چاہتا تھا۔ اس کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو بنی اسرائیل کا ہم قوم ہو۔ تاکہ جب وہ بنی اسرائیل کو مٹانے کے منصوبے زیر عمل لائے تو اس کے پاس یہ کہنے کا جواز ہو کہ یہ سب ہم ملک کی فلاح کے لئے کر رہے ہیں۔ اگر ہم کو بنی اسرائیل سے قومی و نسلی دشمنی ہوتی تو ہم انھیں کے ایک فرد کو اپنے دربار میں اتنا اونچا مقام کیوں دیتے۔ اس کو جو مرتبہ ملا وہ بنی اسرائیل کی بربادی کی قیمت پر تھا نہ کہ اپنی کسی صلاحیت کی بنا پر۔

قارون کے بارہ میں قرآن کا بیان حسب ذیل ہے:

"قارون، موسیٰ کی قوم میں سے تھا، پھر اس نے اپنی قوم سے بغاوت کی۔ اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں طاقت ور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اٹھا سکتی تھی۔ جب اس کی قوم (بنی اسرائیل) کے لوگوں نے اس سے کہا: اپنی اس حیثیت پر نہ اترا، اللہ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے، اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں اپنے حصہ کو بھول نہ جا اور احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے، اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر۔ اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔ تو اس نے جواب دیا: یہ سب کچھ جو مجھے ملا ہے اپنے اس علم کی بنا پر ملا ہے جو مجھے حاصل ہے"[۲۷]

کیا قارون کو یہ علم نہ تھا کہ اللہ اس سے پہلے بہت سے ایسے لوگوں کو ہلاک کر چکا ہے جو اس سے زیادہ قوت و جمعیت والے تھے۔ اور مجرموں سے ان کے گناہ نہیں پوچھے جاتے۔ ایک روز وہ اپنی قوم کے سامنے اپنے پورے ٹھاٹھ کے ساتھ نکلا۔ جو لوگ دنیوی زندگی کے طالب تھے، وہ اس کو دیکھ کر کہنے لگے: کاش ہم کو بھی وہ ساز و سامان ملا ہوتا جو قارون کو ملا ہے۔ واقعی وہ بڑا نصیب والا ہے۔ جن لوگوں کو حقیقت کا علم عطا ہوا تھا، انھوں نے کہا: تمھارا ناس ہو، خدا کے گھر کا ثواب اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ جو ایسے شخص کو ملتا ہے جو خدا پر یقین کرے اور اچھے کام کرے، اور وہ انھیں کو ملتا ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔ پھر ہم نے قارون اور اس کے محل سرا کو زمین میں دھنسا دیا۔ سو کوئی ایسی جماعت نہ ہوئی جو اس کو اللہ کی پکڑ سے بچا لیتی اور نہ وہ خود اپنے کو بچا سکا۔ اور جو لوگ اس کے جیسے ہونے کی تمنا کر رہے تھے، اس کا انجام دیکھ کر کہنے لگے، اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے زیادہ روزی دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے۔ اگر ہم پر اللہ کی مہربانی نہ ہوتی تو ہم کو بھی دھنسا دیتا۔ منکروں کو کبھی فلاح نہیں ہوتی۔"

قصص ۷۶-۸۲

ہر آدمی کے لئے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے۔

ابو تمام (۱۸۸-۲۳۱ھ) دمشق کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ وہ ایک غریب آدمی تھا اور قاہرہ کی مسجد عمرو بن عاص میں پانی بھرتا تھا۔ اپنے زمانہ کے مطابق شاعری میں طبع آزمائی کرنے لگا، یہاں تک کہ شاعر بن گیا۔ اس کے اشعار کا دیوان چھپ چکا ہے اس کے علاوہ اس کی دو تصنیف الحماسہ اور فحول الشعراء ہیں جن میں اس نے زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام کے شاعروں کے کلام کا انتخاب درج کیا ہے۔ یہ انتخاب اتنا عمدہ ہے کہ جب وہ سامنے آیا تو لوگ کہنے لگے: "اس کا انتخاب اس کی اپنی شاعری سے بہتر ہے"

الحماسہ کی شکل میں جو انتخاب ہے، وہ اس نے محض اتفاقاً کیا تھا۔ ایک شخص کے یہاں ایک بار اس کو قیام کرنا پڑا۔ وہاں مختلف شعراء کے کلام کا ذخیرہ موجود تھا۔ کوئی دوسرا مشغلہ نہ ہونے کی وجہ سے اس نے انتخاب شروع کر دیا۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک کام میں اپنی عمر صرف کر دیتا ہے حالانکہ اس کی زیادہ قیمت نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس کوئی دوسرا کام اس سے محض ضمنی طور پر ہو جاتا ہے اور وہ زیادہ قیمتی قرار پاتا ہے۔

اکثر اوقات آدمی کے لئے بہترین بات یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے طبع زاد کام کا کریڈٹ لینے کا شوق نہ کرے۔ بلکہ کسی دوسرے کے کام میں شریک و معاون بن جائے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس حقیقت پسندی پر اپنے کو راضی کر سکیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عوامی بھیڑ میں سچائی دب کر رہ جاتی ہے

حضرت مسیح کو اللہ نے بہت سے معجزے دیئے تھے۔ وہ مٹی کے پرندہ پر پھونک مارتے اور وہ سچ مچ پرندہ بن کر اڑنے لگتا۔ وہ اندھے اور کوڑھی پر ہاتھ پھیرتے اور وہ فوراً اچھے ہو جاتے اور دیکھنے لگتے، وہ مرے ہوئے انسان سے کہتے کہ اٹھ، اور وہ دوبارہ زندہ ہو کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ بتا دیتے کہ کس نے پیٹ میں کیا ہے اور کس کے گھر میں کن چیزوں کا ذخیرہ ہے (آل عمران ۴۹)

یہ چیرانی کن باتیں آپ کے فرستادہ الٰہی ہونے کا ثبوت تھیں مگر یہود نے ان کو آپ کے انکار کا بہانہ بنا لیا۔ انھوں نے کہا: "یہ کوئی معلم دین یا قانون ساز نہیں، بلکہ شعبدہ باز ہے دیہات کے سادہ مزاج باشندوں میں اس نے شہرت و مقبولیت حاصل کر لی ہے" تاہم فلسطین کے مشرک رومیوں کا تاثر دوسرا تھا۔ مشرک قوموں کا عام مزاج یہ رہا ہے کہ جس کے اندر کوئی غیر معمولی بات دیکھتی ہیں، اس کو خدا سمجھ لیتی ہیں۔ برنا باحواری کی انجیل میں بتایا گیا ہے کہ حضرت مسیح کے معجزوں کو دیکھ کر اس زمانہ کے مشرک رومی سپاہیوں نے آپ کو خدا اور بعض نے خدا کا بیٹا کہنا شروع کر دیا تھا۔

حضرت مسیح کے بعد جب سینٹ پال آپ کے مذہب میں داخل ہوا تو اس کو مسیحیت کے پھیلانے کے لیے سب سے آسان نسخہ یہ سمجھ میں آیا کہ عوامی ذہن کی رعایت سے مسیحیت کی ایک ایسی تعبیر پیش کی جائے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے قابل قبول ہو۔ حضرت مسیح کی تعلیم کے مطابق آپ کے ابتدائی پیرو موسوی شریعت پر عمل کرتے تھے۔ سینٹ پال نے اعلان کر دیا کہ ایک عیسائی، شریعت یہود کی تمام پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس زمانہ کے رومیوں اور یونانیوں کے مذہب متھرا پرستی (MITHRAISM) کے عقائد کو صرف الفاظ بدل کر مسیحیت میں داخل کر لیا اور کہا کہ مسیح خدا کے بیٹے تھے اور صلیب پر جان دے کر وہ اولاد آدم کے پیدائشی گناہ کا کفارہ ہو گئے ہیں، اب صرف ان پر ایمان لانا ہی نجات کے لیے کافی ہے۔

حضرت مسیح کے ابتدائی پیروؤں نے سینٹ پال کی اس خود ساختہ مسیحیت کی سخت مخالفت کی، مگر سینٹ پال نے اپنی گھڑی ہوئی مسیحیت میں اس وقت کے عوام کے لیے جو اعتقادی کشش اور سہولت رکھ دی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ کثرت سے مسیحی دین میں داخل ہونے لگے حتیٰ کہ جدید مسیحیوں کا ایک سیلاب امنڈ پڑا۔ اس عوامی ریلے میں سچے مسیحی جو تعداد میں بہت کم تھے، دب کر رہ گئے تاہم تیسری صدی عیسوی کے خاتمہ تک بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جو حضرت مسیح کو بندہ اور رسول مانتے تھے اور آپ کی الوہیت کے عقیدہ کو غلط قرار دیتے تھے۔ مگر چوتھی صدی کے آغاز میں جب مشرقی رومی شہنشاہ قسطنطین (۲۷۲-۳۳۷) بعض سیاسی محرکات کے تحت عیسائی بن گیا تو سینٹ پال کی ایجاد کردہ مسیحیت کو سیاسی اقتدار کی سرپرستی بھی حاصل ہو گئی۔ ۳۲۵ء میں نیقیہ (NICAEA) کی کونسل میں ۳۱۸ مسیحی نمائندے جمع کیے گئے تاکہ مسیحیت کا سرکاری عقیدہ متعین کریں۔ اس میں ۳۰۰ نمائندوں نے سرکاری تشریح کی حمایت کی بقیہ اس کے خلاف تھے

پادری اے رئیس (A. R. U. S.) اس کو تبلیغ کرنے کیلئے۔ شاہ قسطنطین نے یہ کہہ کر اس کو خاموش کر دیا کہ "اگر تم اس کو نہیں مانتے تو دوسری چیز ہمارے پاس تلوار ہے"۔

قسطنطین نے مسیحیت قبول کرنے کے بعد ساری رومی سلطنت میں مسیحی مذہب پھیل گیا۔ یہ تمام مسیحی اسی نئے مسیحی مذہب پر ایمان لائے تھے جو اولاً سینٹ پال اور اس کے بعد ترتولین (۲۲۰-۱۶۰) وغیرہ نے وضع کیا تھا۔ اس عوامی طوفان میں سچے مسیحیوں کے لیے زندہ رہنے کی کوئی شکل نہ تھی۔ اولاً خاموش اور اس کے بعد وہ دھیرے دھیرے ختم ہو گئے۔

اسلام کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ خود اللہ نے قرآن کو محفوظ رکھنے کا ذمہ لیا ہے۔ (جبکہ پچھلی آسمانی کتابوں کو محفوظ رکھنے کی ذمہ داری ان کے حاملین کے اوپر تھی) اسلام کے لیے یہ خطرہ نہیں کہ وہ کبھی بدل کر کچھ سے کچھ ہو جائے یا مٹ کر ختم ہو جائے۔ مگر حفاظت کا یہ وعدہ متن اسلام کے لیے ہے، گروہ اسلام کے لئے نہیں ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ اسلام پر بھی ایسا زمانہ آئے کہ کتابی حیثیت سے تو متن اسلام (قرآن) مکمل طور پر محفوظ ہو مگر عملاً ایسا ہو کہ آسمانی مذہب کے بجائے بزرگوں کا مذہب اس طرح رائج ہو جائے کہ عملاً وہی قرآن کی جگہ لے لے۔ جیسا کہ دوسری قوموں میں ہوا ہے۔ قرآن کی تلاوت تو خوب ہو رہی ہو مگر دین کو بزرگوں سے لیا جانے لگے حتیٰ کہ یہ بھی ممکن ہے کہ اسلام کی یہ خود ساختہ شکل عوام میں اس قدر مقبول ہو کہ اسلام کے سچے پیرو اس کے طوفان میں دب کر رہ جائیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ غلط ہے، بہت سے لوگ اس لیے اس کے ساتھ لگ جائیں کہ عوامی پھیلاؤ کی وجہ سے دنیوی فائدے اس سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ علماء اس کے خلاف بولنے سے اس لیے ڈریں کہ ان کے مدرسوں کے چندے بند ہو جائیں گے۔ قائدین اس لیے اس سے قطع تعلق نہ کریں کہ انھیں اندیشہ ہو کہ ان کے استقبال کرنے والوں کی تعداد کم ہو جائے گی۔ بہت سے کتاب اللہ کا علم رکھنے والے اس کو کتاب اللہ کے موافق نہ پائیں مگر اس لیے اس کے گروہ میں شامل رہیں کہ ملک کے اندر اور ملک کے باہر اس کے پھیلے ہوئے حلقے سے وہ بہت سے مفادات حاصل کر سکتے ہیں۔

عوامی مقبولیت کبھی سچائی کی سند نہیں رہی ہے بلکہ کسی تحریک کا زیادہ پھیلاؤ اکثر یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ اس کے اندر کوئی غلطی تو شامل نہیں، کیونکہ حق کو ماننے والے ہمیشہ کم ہوتے ہیں اور اس کو پانے والے اور بھی کم۔

الرسالہ اپریل ۱۹۷۷ء

❋

"ورقہ بن نوفل نے پیغمبر اسلام سے کہا تھا، 'کاش کہ اس زمانہ میں جب لوگ آپ کو قبیلہ سے نکال دیں گے میں زندہ رہوں'۔ یہ الفاظ ورقہ نے پیغمبر اسلام سے ۶۱۰ء میں کہے تھے۔ اس کی پیشنگوئی ۶۲۲ میں سامنے آگئی۔"

اوپر کا فقرہ کونستان وروژیل جارج کی کتاب "پیغمبر اسلام" سے ماخوذ ہے۔ [illegible] پیغمبر [illegible] پیغمبر اسلام کی [illegible] آپ کی زندگی [illegible] اور تاریخ کی زبان میں بیان کیا [illegible] آپ کی زندگی [illegible] کہ محض روایاتی کہانیوں کا مجموعہ



آپ بیتی

یہ ۳۱ جنوری ۱۹۷۶ء کا واقعہ ہے جب کہ راقم الحروف لیبیا جاتے ہوئے ۳۶ گھنٹہ کے لئے روم (اٹلی) میں ٹھہرا تھا۔ روم کی یادوں میں سے ایک یاد وہ جرمن پادری ہے جس سے وہاں میری ملاقات ہوئی:

```
----------------------------------
Dr. Hans Georg Asmussen
P r o p s t
Beselerstraße 28-2240 Heide
Telefon (0481) 3220
W. Germany.
----------------------------------
```

ایک موقع پر میں نے دیکھا کہ موصوف عربی انجیل کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس سے میں نے سمجھا کہ وہ عربی زبان جانتے ہیں۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ مجھے بائبل اور اس سے متعلق لٹریچر کے مطالعہ کا شوق ہے۔ میرے پاس انگریزی میں چھپی ہوئی چیزیں موجود ہیں۔ مگر میں بائبل کا مکمل عربی ترجمہ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

میرا مقصد صرف ناشر کا پتہ پوچھنا تھا تاکہ وہاں سے عربی بائبل منگائی جا سکے۔ مگر پادری موصوف نے ناشر کا پتہ بتانے کے بجائے خود میرا پتہ دریافت کیا اور اپنی ڈائری میں میرا پتہ نوٹ کرتے ہوئے کہا: میں آپ کو عربی بائبل بھجواؤں گا۔

اس واقعہ کو تقریباً ایک برس گزر چکا تھا۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ پادری صاحب یا تو اپنا وعدہ بھول گئے یا انھوں نے کتاب روانہ کی اور وہ کسی وجہ سے مجھ تک نہیں پہنچی۔ مگر فروری ۱۹۷۷ کی ایک تاریخ کو ڈاک میں ایک پیکٹ ملا۔ کھولا تو اس کے اندر پرانے اور نئے عہدنامہ پر مشتمل "الکتاب المقدس" کا ایک نیا نسخہ موجود تھا۔ فولڈنگ جلد کے ساتھ بائبل پیپر پر چھپا ہوا یہ خوبصورت نسخہ ۱۳۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کو دیکھنے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ روانگی میں تاخیر کا امکانی سبب کیا تھا۔ پرنٹ لائن کے مطابق بائبل کا یہ عربی نسخہ کوریا میں ابھی ۱۹۷۶ میں چھپا ہے۔ غالباً پادری موصوف کے پاس یا ان کے ادارہ میں عربی نسخے ختم ہو گئے تھے اور جب کوریا سے چھپ کر وہ انھیں پہنچے ہیں تو حسب وعدہ انھوں نے فوراً اس کی روانگی کا انتظام کیا۔

پادری موصوف کے نام جب میں نے شکریہ کا خط روانہ کیا تو خیال آیا کہ کاش ہم بھی اسی طرح شکریہ کے خطوط وصول کرنے کی پوزیشن میں ہوتے۔ آج ساری دنیا میں بے شمار لوگ ہیں جو قرآن کو اپنی زبان میں پڑھنا چاہتے ہیں۔ مگر ہم ان کو قرآن کے ترجمے ان کی زبان میں اس طرح فراہم نہیں کر سکتے جس طرح مسیحی حضرات دنیا کی تمام زبانوں میں اپنی مقدس کتاب کو

دوسرے لوگ تک پہنچا رہے ہیں۔

قرآن کے مطابق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم بنی آدم کی طرف خدا کے آخری منذر (آگاہ کرنے والے) تھے۔ آپ نے قرآن کے ذریعے انذار کی یہ ذمہ داری ادا فرمائی اور اپنے بعد کتاب اللہ کو محفوظ حالت میں چھوڑ گئے کہ وہ قیامت تک لوگوں کے لئے آگاہی کا ذریعہ بنتی رہے۔

آپ کے بعد یہ قرآن کس طرح لوگوں تک پہنچے گا، اس کا ذریعہ امت محمدی ہے۔ امت محمدی کی پہلی اور لازمی ذمہ داری ہے کہ وہ قرآن کی آواز کو تمام اقوام عالم تک پہنچائے۔ مگر افسوس کہ آج ساری دنیا میں کوئی بھی ادارہ خاص اس مقصد کے لئے قائم نہیں۔ حتیٰ کہ مسلمان اپنی اس ذمہ داری کے شعور تک سے غافل ہو چکے ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے تو یہ کہا تھا کہ میں "بنی اسرائیل کی کھوئی بھیڑوں" کے پاس بھیجا گیا ہوں، مگر آپ کے پیروؤں کے جوش تبلیغ نے مسیحیت کو ساری دنیا کے لئے قابل مطالعہ بنا دیا۔ اس کے برعکس پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح لفظوں میں اعلان فرمایا کہ میری بعثت سارے عالم کے لئے ہے مگر آپ کے پیروؤں کے اندر یہ آگ نہیں بھڑکتی کہ آپ کے پیغام کو سارے عالم تک پہنچائیں —— جرمن پادری کی طرف سے ہم نے عربی بائبل کا نسخہ وصول کیا تو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ زبان حال سے کہہ رہا ہو: "دیکھو تم اسلام کا پیغام پھیلانے میں ناکام ہو گئے اور ہم ساری دنیا میں مسیحیت کا پیغام پہنچا رہے ہیں"

وحید الدین خاں (پیدائش ۱۹۲۵)
جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی

مولانا اخلاق حسین قاسمی

ایک نصیحت

قوموں کی قسمت خود اپنے کردار سے بنتی ہے۔ کسی بھی پارٹی کے ساتھ لگ جائیے، کسی کے جھنڈے اٹھائیے، اس سے کچھ نہیں بنتا۔ ہمارے رہنما کچے پکے مکانوں پر بلڈوزر چلانے کا ماتم کر رہے ہیں، لیکن ان کو یہ نظر نہیں آرہا ہے کہ جس قوم کے اخلاق کی عمارت بوسیدہ ہو جاتی ہے، اس پر کوئی رحم نہیں کرتا۔ اس پر قدرت کا بلڈوزر چلتا ہی ہے۔

ہمارے اسلاف نے بوسیدہ مکانوں میں رہ کر دلوں پر حکمرانی کی اور آج ہم فلک بوس عمارتوں میں رہ کر بھی محکوم اور غلام ہیں۔ یہ صرف اخلاقی بلندی اور پستی کا فرق ہے۔ دل کی بھڑاس نکال لیجئے۔ لیکن اس کی قیمت بہت بڑی چکانی پڑے گی۔

جو لوگ اعصابی اور مغلوب الغضب ہوں ان کے لئے میدان سیاست کا کارزار کسی طرح موزوں نہیں۔ یہ تو وہ میدان ہے جہاں بے پناہ قوت برداشت ضرورت ہے۔

اس پارٹی کی فتح ہو یا اس پارٹی کی۔ اگر ہمارے اخلاق کا حال یہی ہے تو ہم شکست کھا گئے۔ کوئی آئے اور کوئی جائے لیکن یہ ملت ہندوستان میں ماتم ہی کرتی رہے گی:

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی



روداد سفر

دسمبر ۱۹۷۶ کے آخری ہفتہ میں میوات (ہریانہ) کے چند مقامات پر جانے کا اتفاق ہوا: بہادرس، برکی، بیچگواں، نیم کھیڑا، بلیڈ اور فیروز پور جھرکا۔ ۲۰ دسمبر کی شب نیم کھیڑا (ضلع گوڑگاؤں) میں گزری۔ یہاں گاؤں کے کنارے اونچائی پر ایک مسجد ہے، جس کے شمالی جانب کشادہ صاف ستھرا کمرہ بنا ہوا ہے۔ یہاں مسجد میں نماز عشاء کے بعد ایک تذکیری مجلس ہوئی جس میں راقم الحروف نے بعض احادیث کی روشنی میں بتایا کہ اسلامی زندگی یہ ہے کہ آدمی تقویٰ کی رسی میں بندھ جائے۔ وہ ہر معاملہ میں بس وہیں تک جائے جہاں تک حدود اللہ اس کو اجازت دیتی ہوں۔ اس کے آگے اس کا ایمان اور خوف آخرت اس کو روک لے۔

مولانا عبدالرحیم بڈیڈوی اس مسجد میں امام اور مدرس کی حیثیت سے مقیم ہیں۔ گاؤں کے بچے قرآن اور دینی تعلیم کے لئے یہاں جمع ہوجاتے ہیں۔ ان کے مل کر پڑھنے سے ایک قسم کا تعلیمی نغمہ مسجد کی فضا میں گونجتا رہتا ہے۔ گاؤں کے لوگ ملنے کے لئے کمرہ میں آتے رہے اور اس طرح گاؤں کے لوگوں سے دینی ربط جاری رہا۔ خاص طور پر جناب شمس الدین صاحب اور ان کے اہل خاندان سے جن کا مکان مسجد سے بالکل ملا ہوا ہے۔

کمرہ کا جائے وقوع ایسا ہے کہ صبح کو سورج نکلتے ہی دھوپ کمرہ کے اندر آگئی۔ سردی کے موسم میں صبح صبح چمکتا ہوا سورج جب اپنی سنہری کرنوں کے ساتھ ہماری قیام گاہ کے اندر داخل ہوا تو ایسا محسوس ہوا گویا زمین والوں کے ساتھ ہم "آسمان والوں" سے بھی مربوط ہوگئے ہیں۔ مسجد کے باہر پھیلے ہوئے ہرے بھرے کھیت، ان میں جگہ جگہ کھڑے ہوئے درخت، وہ آسمان کو چھوتی ہوئی پہاڑ [illegible]

کی دیواریں ان قدرتی مناظر کے درمیان چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں، اس ماحول میں بیٹھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے خالق اپنی مخلوقات کے پورے کارخانے کے ساتھ ہماری پشت پر آکر کھڑا ہو گیا ہے — شہری زندگی میں آدمی تمدن کی مصنوعی حدبندیوں میں گم رہتا ہے، مگر شہروں کے باہر قدرت کی جو پھیلی ہوئی دنیا ہے، وہاں اپنے کو پہنچا دیجئے تو زندگی اپنی تمام تنگیوں کے باوجود وسیع معلوم ہونے لگتی ہے۔ آدمی اپنے کو ایک آفاقی مملکت کا شہری سمجھنے لگتا ہے۔

شہر کے تمدنی بندھنوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان ایک ایسے جال میں پھنسا ہوا ہے جس سے رہائی ممکن نہیں۔ مگر دیہات کی کھلی فضا جہاں ہریالی، میدان، چڑیوں کے چہچہے، پہاڑوں کی بلندیاں انسان کا استقبال کر رہی ہوں، جہاں آسمان کی وسعتیں خدا کی قدرت کو یاد دلاتی ہوں، زندگی کے معنی بالکل بدل جاتے ہیں۔ یہاں تنگیاں وسعتوں میں تحلیل ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ انسان کے پیدا کئے ہوئے مسائل خدائی عظمتوں کے آگے حقیر ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ زندگی کی تاریکیاں کائنات کی تابناکیوں میں غائب ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آدمی، انسان کے بنائے ہوئے وحشت کدہ سے نکل کر خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں پہنچ گیا ہے۔ یہاں آکر زندگی کے معنی بالکل بدل جاتے ہیں۔

مگر کیسی عجیب بدقسمتی ہے کہ لوگوں کو ان حقائق کا شعور نہیں۔ وہ خدا کے پڑوس میں ہو کر بھی انسان کی بنائی ہوئی دنیاؤں میں گم رہتے ہیں۔ آسمان کی فضاؤں سے انھیں اپنی غذا نہیں ملتی۔ چڑیوں کے زمزمے میں انھیں کوئی پیغام سنائی نہیں دیتا۔ درختوں کی ہریالی میں انھیں زندگی کا کوئی سبق نہیں ملتا۔ پہاڑوں کی بلندی میں ان کے لئے نصیحت کا کوئی سامان نہیں ہے۔ وہ صرف انسانوں کی آواز سن سکتے ہیں۔ خدا اور فرشتوں کی آواز سننے کے لئے ان کے کان بہرے ہیں۔ خدا اپنی پوری کائنات کے ساتھ ان کے سامنے کھڑا ہوا ہے، مگر ان کی آنکھیں صرف انسانی مصنوعات کو دیکھ سکتی ہیں۔ خدائی کارخانہ کو دیکھنے کی صلاحیت ان کے اندر نہیں۔ خدا یہاں پہاڑ کی بلندیوں اور آسمان کی وسعتوں سے اعلان کر رہا ہے کہ: "میرے سایہ میں آجاؤ، میرا جوا نرم ہے اور میرا بوجھ ہلکا" مگر کوئی نہیں جو اس ربانی پیغام سے آشنا ہو۔

مسجد اور گاؤں میں کچھ لمحات گزارنے کے بعد میری سمجھ میں آیا کہ قرآن کی آیت وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ کا مطلب کیا ہے۔ یعنی حالات جب اہل ایمان کو اتنا پیچھے دھکیل دیں کہ عملاً ان کے لئے گھر اور مسجد کے سوا کوئی اور میدان کار باقی نہ رہے تو انھیں چاہئے کہ اسی ملے ہوئے دائرے کو اپنے عمل کے لئے خاص کرلیں۔ خارجی دنیا کے خلاف شکایت اور احتجاج کا بے سود طوفان مرتب کرنے میں وہ اپنا وقت ضائع نہ کریں بلکہ گھروں اور مسجدوں کو مرکز بنا کر ایک طرف اپنے رب کے ساتھ اور دوسری طرف اپنے قریبی لوگوں کے ساتھ جڑ جائیں اور جو دائرہ بھی ان کے لئے باقی رہ گیا ہے، اس کے اندر دینی بیداری کی کوشش جاری رکھیں۔

الرسالہ اپریل ۱۹۷۷

"میوات" کا لفظ باہر کے لوگوں کے لئے ایک افسانوی نام بن گیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میو قوم جس کے نام سے یہ علاقہ منسوب ہے، اس ملک کی سب سے زیادہ پچھڑی ہوئی قوم ہے۔ جگہ جگہ قدیم طرز کی درگاہوں کی بڑی بڑی عمارتیں بتاتی ہیں کہ یہ علاقہ سیکڑوں برس سے بزرگوں کی توجہات کا مرکز رہا ہے۔ ایک میو سلام کے بعد مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ آپ کی طرف بڑھائے گا تو اس کے ہاتھ میں لٹکی ہوئی تسبیح بتائے گی کہ ان اصلاحی کاموں کے اثرات بھی اس قوم نے قبول کئے ہیں۔ مگر اوراد و نوافل سے اوپر حقیقی دینی تبدیلیاں شاذ و نادر ہی کہیں نظر آتی ہیں۔

ہم گاؤں کے باہر نکلے تو حد نظر تک ہرے بھرے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ ایک کھیت میں گیہوں کی فصل نہایت عمدہ کھڑی ہوئی تھی۔ "یہ کس کا کھیت ہے" میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا: "یہ رہن کا کھیت ہے جو ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان سے لیا ہے" یہ سنتے ہی میری خوشی ختم ہوگئی۔ مجھے حدیث یاد آئی: کل لحم نبت من السحت فالنار اولی به (ہر جسم جو حرام سے پلے اس کے لئے آگ ہی بہتر ہے) تاہم اس علاقہ کے لئے یہ کوئی انوکھی مثال نہیں۔ "داڑھی اور تسبیح" والے اسلام کی کثرت کے باوجود یہاں اس قسم کی بے شمار خرابیاں عمومیت کے ساتھ جاری ہیں۔

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ دنیوی عقل، جو آدمی کے گرد و پیش کے حالات خود اپنے زور پر اس کو سکھا دیتے ہیں، اس سے بھی یہ قوم ابھی تک خالی ہے۔

میو قوم ایک انتہائی برباد قوم ہے۔ اس کی بربادی

کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کو اس مادہ کا شعور نہیں۔ یہودیوں کے درمیان ایک مثل مشہور ہے :

جاٹ کہے سن جاٹنی یاہی گاؤں میں رہنا
اونٹ بلیا لے گئی، ہاں جی ہاں جی کہنا

اس شعر میں جس مفاہمت اور حقیقت پسندی کا ذکر ہے وہ یہودیوں کے روایتی تصور میں دبی ہوئی قوموں کا طریقہ تھا۔ یہودیوں کا خیال اپنے بارہ میں یہ رہا ہے کہ ہمیں دوسروں سے مفاہمت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، ان کی لاٹھی، ان کے نزدیک، اس قسم کی "بزدلی" کا بہترین بدل تھی۔ آج زندگی کے معنی بالکل بدل گئے مگر یہود اب بھی انھیں روایتی تصورات اور معانی میں جی رہے ہیں۔ آج بھی اگر کوئی معاملہ پیش آجائے تو وہ فوراً لڑنے بھڑنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں، خواہ اس کا نتیجہ یہ کیوں نہ نکلے کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ برے حال کو پہنچا دیئے جائیں ــــ دین اپنی حقیقی شکل میں، دنیا کا بھی شعور بیدار کرتا ہے اور آخرت کا بھی۔ مگر اس قبیلہ قوم کے حصہ میں ایک ایسا دین آیا ہے جس نے اس کو نہ دنیا کا صحیح شعور دیا اور نہ آخرت کا ــــــ

آپ لکڑی کو توڑیں تو وہ دو ٹکڑے ہو کر رہ جائے گی۔ مگر ایک زندہ امیبا جب ٹوٹتا ہے تو وہ دو زندہ امیبا بن جاتا ہے ــــ

حقیقت یہ ہے کہ تقسیم اور شکست اس دنیا میں صرف مردہ چیزوں کے لئے مقدر ہیں۔ ایک چیز جو زندہ ہو، اس کو کبھی توڑا نہیں جا سکتا۔ زندہ چیز اگر ٹوٹتی ہے تو اس کا ہر حصہ ایک نئے زندہ وجود کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اور پہلے سے بھی زیادہ عظیم بن جاتا ہے ــــــ

مقاصد

۱۔ عربی، انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں میں رسائل کا اجرا جس کے ذریعہ مسلمانوں کو ان کی دعوتی ذمہ داری کی طرف متوجہ کیا جاسکے اور اسلام کو جدید اسلوب اور عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق مدلل کیا جائے۔

۲۔ قرآن کے ترجمے دنیا کی تمام زبانوں میں شائع کرنا اور ان کو رعایتی قیمت کے ساتھ لوگوں تک پہنچانا۔

۳۔ قرآنی علوم کی تدوین اور اسلامی انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت۔

۴۔ حدیث، سیرت، حالات صحابہ، تاریخ اسلام اور تاریخ فتوحات پر سادہ، واقعاتی انداز میں کتابوں کی تیاری اور ان کو مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۵۔ ایسی درسگاہ کا قیام جس میں قرآن، حدیث، سیرت، تقابلی مذہب، عربی زبان اور دوسری زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہو۔

۶۔ اسلامیات اور مختلف مذاہب کے مطالعہ کے لئے ایک مکمل لائبریری کا قیام۔

۷۔ مختلف علاقوں اور ملکوں میں تبلیغی وفود بھیجنے کا انتظام۔

۸۔ اسلام کے تاریخی آثار اور دستاویزات کا میوزیم قائم کرنا۔

۹۔ علمی طرز فکر اور حقیقت پسندانہ مزاج پیدا کرنا۔

۱۰۔ جدید طرز کے پریس کا قیام جہاں مختلف زبانوں میں اعلیٰ چھپائی ہوسکے۔

۱۱۔ ایسے ادارہ کی تشکیل جہاں تمام ضروری دینی شعبے قائم ہوں اور غیر مسلم وہاں آکر اسلام کو سمجھ سکیں۔

الرسالہ، اپریل ۱۹۷۷ء

ضرورت ہے کہ اسلام
کو دنیوی مہم کے بجائے
اخروی مہم کے طور پر
سامنے لایا جائے

دعوت اسلامی ہی
ایک ایسا کام ہے جس
پر تمام مسلمانوں
کو
متحد کیا جاسکتا ہے

تعارف

سمندر میں برف کے بہت بڑے بڑے تودے ہوتے ہیں جن کو آئس برگ کہا جاتا ہے۔ ان برفانی پہاڑوں کا دس میں سے نو حصہ پانی میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور صرف ایک حصہ پانی کے اوپر دکھائی دیتا ہے۔ ایسی ہی کچھ مثال انسانی زندگی کی ہے۔ انسان کو اس کے پیدا کرنے والے نے دائمی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔ اور پھر اس کی زندگی کے نہایت مختصر حصہ — تقریباً سو سال — کو موجودہ دنیا میں رکھ کر بقیہ تمام عمر کو آخرت کی دنیا میں ڈال دیا۔ موت وہ دروازہ ہے جس سے ہم اپنی موجودہ مدت حیات پوری کرنے کے بعد، دوسری دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں۔

یہ انسانی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ انسان کی کامیابی کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ آخرت رخی زندگی (AKHIRAT ORIENTED LIFE) کو اپنی زندگی بنائے۔ اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے وسائل اور اپنی سرگرمیوں کو اس طرح منظم کرے جو اس کی زندگی کے اگلے مرحلے کو بہتر بنانے والا ہو۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس کے تمام کارنامے اسی دنیا میں رہ جائیں گے اور موت کے بعد دوسری دنیا میں وہ اس حال میں پہنچے گا کہ آخرت کی طویل تر زندگی میں اپنی جگہ بنانے کے لیے اس کے پاس کچھ نہ ہوگا۔

یہی وہ نازک مسئلہ ہے جس سے انسان کو باخبر کرنے کے لیے خدا نے پیغمبروں کا سلسلہ جاری کیا۔ ہر دور میں خدا کے نمائندے آئے اور آسمانی کتابیں اتاری گئیں تاکہ موت کے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے انسان کو بتا دیا جائے کہ اس کو بالآخر کہاں جانا ہے۔ اور اپنی مستقل کامیابی کے لئے اسے کیا کرنا چاہیے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ تاہم جہاں تک پیغمبرانہ کام کا تعلق ہے، اس کی ضرورت بدستور باقی ہے۔ آج بھی یہ مطلوب ہے کہ خدا کے بندوں کو اس اہم ترین حقیقت سے باخبر کیا جائے تاکہ آخرت میں خدا کے اوپر کسی کی حجت باقی نہ رہے۔

خدا کے اس پیغام کو اس کے بندوں تک پہنچانے کے لیے اب کوئی پیغمبر آنے والا نہیں ہے۔ اب امت مسلمہ اس کی ذمہ دار ہے۔ خاتم النبیین کی امت کا اصل مشن دنیا میں یہی ہے کہ وہ اس پیغمبرانہ ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اٹھے۔ یہ اس کا ایسا ناگزیر فریضہ ہے جس سے غفلت کسی حال میں معاف نہیں ہو سکتی۔

اسلام کا قیام اس لئے عمل میں آیا ہے کہ امت مسلمہ کو اس کی اس ذمہ داری کی طرف متوجہ کرے اور تمام ممکن ذرائع سے حق کا پیغام لوگوں تک پہنچائے۔

پیغام رسانی کا یہ عظیم کام صرف اس وقت موثر طور پر انجام دیا جا سکتا ہے جب کہ اس کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے مکمل تیاری کی جائے اور اس کے لئے تمام ضروری تدابیر عمل میں لائی جائیں۔ اسلامی مرکز نے اس سلسلے میں اپنے سامنے جو نقشہ کار رکھا ہے، اس کو مختصراً یہاں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ اسلامی علوم کی تدوین

پہلا کام اسلام کے علوم کو عصری اسلوب میں

معلوم کرتا ہے۔ اسلام ایک دائمی حقیقت ہے۔ مگر زمانہ کی اصطلاحیں اور اسلوب کلام بدلتے رہتے ہیں۔ قرآن و حدیث کی تعلیمات اور رسول اور اصحاب رسول کی زندگیوں کے بارے میں جو لٹریچر پچھلے زمانوں میں تیار ہوا وہ انتہائی قیمتی ہے۔ اور ہمیشہ کے لیے اسلام کا علمی و فکری ماخذ ہے۔ تاہم ضرورت ہے کہ اس کو جدید سائنٹفک اسلوب میں مرتب کیا جائے تاکہ آج کے ذہن کے لیے وہ فکری غذا حاصل کرنے کا ذریعہ بن سکے۔

۲۔ شاکلہ کو بدلنا

ہر دور کا ایک شاکلہ (طرز فکر) ہوتا ہے جس کے مطابق انسان سوچتا ہے اور مختلف مسائل میں رائے قائم کرتا ہے۔ قدیم زمانہ میں شرک کا شاکلہ دنیا میں رائج تھا۔ پیغمبر اسلام اور آپ کے ساتھیوں نے طاقتور فکری سیلاب برپا کرکے اس شاکلہ کو توڑ دیا۔ یہاں تک کہ تاریخ ایک نئے رخ پر چل پڑی۔ اب دوبارہ الحاد کا شاکلہ دنیا بھر میں چھا گیا ہے۔ علم و عمل کے تمام شعبوں میں رائے قائم کرنے کے لیے غیر خدائی معیاروں کو برتری حاصل ہو گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ فکری اور عملی جدوجہد کے ذریعہ دوبارہ شاکلۂ الحاد کو توڑا جائے جس طرح ہمارے اسلاف نے شاکلۂ شرک کو توڑا تھا۔ اس کے بعد ہی وہ ذہنی زمین بن سکتی ہے جب کہ خدا پرستانہ انداز فکر دوبارہ دنیا میں اپنی جگہ پا سکے۔

۳۔ اقتصادی و تمدنی استحکام

یہ دنیا مادی دنیا ہے، یہاں کوئی کام، خواہ وہ اپنی نوعیت میں خالص غیر مادی کیوں نہ ہو، مادی ذرائع کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ضرورت ہوتی ہے کہ اہل اسلام اپنے اندر اقتصادی قوت اور تمدنی استحکام پیدا کریں تاکہ ان کے لیے اپنی ذمہ داریوں کو موثر طور پر ادا کرنا ممکن ہو سکے

۴۔ جدید ضرورتوں کے مطابق اسلامی تعلیم

اسلامی تعلیم کا مقصد مسلم نسلوں کو وہ علم اور وہ شعور دینا ہے جس سے ایک طرف وہ اپنے دین کو اس کی اصل حیثیت میں سمجھیں۔ دوسری طرف وہ اس قابل ہوں کہ اپنے زمانہ کے لوگوں کے اوپر اپنی دینی ذمہ داریوں کو ادا کر سکیں۔

ہمارے موجودہ تعلیمی ادارے دونوں ہی مقاصد کی تکمیل میں ناکام ثابت ہو رہے ہیں۔ اول الذکر مقصد کے لیے جزوی طور پر اور ثانی الذکر کے لیے کلی طور پر ان کی غیر موزونیت واضح ہے۔ ضرورت ہے کہ از سر نو اسلامی تعلیم کا نہج بنایا جائے۔ اس کے بغیر وہ "علما" پیدا نہیں ہو سکتے جو انبیاء بنی اسرائیل کی طرح امت کے نگہبان بن سکیں۔

۵۔ پریس کی طاقت کا استعمال

پریس کا مطلب ایک شخص کے تحریری کلام کو کروروں سے ضرب دینا ہے۔ اس دریافت نے تاریخ میں پہلی بار ایک نیا امکان کھول دیا ہے۔ اس نے دعوت کے عمل کو مقامی پیغام رسانی کے دور سے نکال کر عالمی پیغام رسانی کے دور میں داخل کر دیا ہے۔ اگر اس امکان کو اعلیٰ معیار کے مطابق بھرپور طریقے استعما

یا جائے تو مسلمانوں کے اندر وہ کام انجام دیا جا سکتا ہے جس کے لیے پہلے صدیاں درکار ہوتی تھیں۔

۶- افراد کی ذہنی تربیت

آج مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۸۰ کروڑ ہے۔ دنیا کے تمام انسان ایک قطار میں کھڑے کیے جائیں تو ان میں سے ہر پانچواں شخص مسلمان ہوگا۔ ان مسلمانوں کے اندر یہ شعور زندہ ہو کہ وہ دعوت حق کے امین ہیں اور وہ اس امانت کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے آواز لگائیں تو سارا عالم ان کی آواز سے گونج اٹھے۔ مگر اس کثرت کے باوجود خدا کا دین غیر اعلان شدہ پڑا ہوا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر یہ شعور نہیں کہ ان کی حیثیت داعی اور پیغامبر کی ہے۔ ضرورت ہے کہ تمام ذرائع ابلاغ کو استعمال کر کے مسلمانوں کے اندر اس شعور کو زندہ کیا جائے۔ انھیں تیار کیا جائے کہ وہ صاحب نظریہ افراد کی حیثیت سے اپنی پڑوسی قوموں کے درمیان رہ سکیں۔

۷- مسلم قوموں کے اندر مقصدی یگانگت

دنیا بھر میں تقریباً تین درجن مسلم ممالک ہیں۔ اگر ان کے درمیان مقصدی یگانگت ہو تو دعوت اسلامی کے کام کو انتہائی موثر طور پر انجام دیا جا سکتا ہے۔ مگر اسلام کے نام پر سیاسی جھگڑے ان کو باہم قریب نہیں ہونے دیتے۔ ضرورت ہے کہ ہر قسم کے مادی اور سیاسی جھگڑوں سے اسلام کو الگ کر دیا جائے۔ اسلام کو دنیوی مہم کے بجائے اخروی مہم کے طور پر سامنے لایا جائے۔ اس طرح اندرونی طور پر جماعتوں اور حکومتوں اور بیرونی طور پر مختلف مسلم قوموں کا باہمی ٹکراؤ ختم ہو جائے گا اور اسلامی خدمت کی ایسی سطح وجود میں آئے گی جہاں ہر ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد و اشتراک کر سکے۔

۸- مرکز اسلامی کی تعمیر

اسلامی دعوت کا کام موجودہ زمانے میں ایک عظیم الشان کام ہے۔ اس کو موثر طور پر انجام دینے کے لیے ضروری ہے کہ وسیع پیمانہ پر ایک مرکز بنایا جائے جس میں تمام ضروری شعبے قائم ہوں اور وہاں سے اس اہم کام کی منصوبہ بندی کی جائے۔

یہ مرکز ان تمام کاموں کی تنظیم کرے گا جن کا اوپر ذکر ہوا۔ نیز مختلف قسم کی علمی، عملی اور دعوتی سرگرمیوں کے ذریعہ وہاں جو اسلامی ماحول بنے گا، وہ اس مقصد کے حصول کا بھی مفید ذریعہ ہوگا کہ غیر مسلم افراد وہاں آکر اسلام کا مطالعہ و مشاہدہ کریں۔ اور خدا کے دین کو قریب سے دیکھ کر اس کے بارہ میں اپنے رویہ کا فیصلہ کریں۔

۹- ہماری مطبوعات

اسلامی مرکز نے اپنے منصوبہ کے پہلے مرحلہ کے طور پر مختلف زبانوں میں مطبوعات کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ مثلاً اسلامی علوم کی تدوین کے سلسلے میں تعلیمات قرآن اور پیغمبر اسلام، تبدیلی شاکلہ کے سلسلے میں حقیقت اسلام، اقتصادی شعور پیدا کرنے کے سلسلے میں مستقبل کی طرف، [illegible] تعمیر کے سلسلے میں اسلام دور جدید میں، پریس کی طاقت استعمال کرنے کے سلسلے میں ماہنامہ الرسالہ کا اجراء، [illegible] کے سلسلے میں الاسلام، مسلم اقوام کے درمیان مقصدی یگانگت پیدا کرنے کے سلسلے میں [illegible] اردو

Single Copy Rs. 2.00,

Regd. No. D (D) 533
[illegible]

AL-RISALA MONTHLY

1036 KISHANGANJ, DELHI-110006 (INDIA)

الاسلام

از: مولانا وحیدالدین خاں

صفحات ۲۴۰ — قیمت مجلد ۱۵ روپے

اسلام اور مسائل حاضرہ کا ایک جامع مطالعہ

اپنے موضوع پر اس نوعیت کی پہلی کتاب

ابواب:

- جدید مسئلہ کیا ہے
- حقیقت دین
- ارکان اربعہ (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ)
- صراط مستقیم
- اسوۂ نبوت
- تحریک اسلامی، سیرت کی روشنی میں
- موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکیں
- تعمیر ملت
- دعوت الی اللہ
- دعوت اسلامی کے جدید امکانات

رسالہ بک ڈپو ـ ۱۰۳۶ کشن گنج دہلی ۶

محمد احمد پرنٹر پبلشر مسئول نے جے۔کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ ۱۰۳۶ کشن گنج دہلی سے شائع کیا

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

بہت سے دیوار اٹھانے والے اپنی دیوار کو گرا رہے ہیں۔

بہت سے لوگ جو اپنے کو دوسروں سے بڑا سمجھ رہے ہیں، وہ دوسروں کے پیروں تلے روندے جائیں گے۔

یہ اس دن ہو گا جب خدا اپنے فرشتوں کے ساتھ ظاہر ہو گا، جب سارے انسانوں سے پوچھا جائے گا کہ انھوں نے اپنے پیچھے کیا چھوڑا اور اپنے آگے کے لئے کیا روانہ کیا۔

شمارہ ۷	زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے - فی پرچہ دو روپیہ	مئی ۱۹۷۷

خصوصی تعاون سالانہ، کم سے کم ایک سو ایک روپیہ

فہرست

قرآن	• دیکھئے کہ آپ کون سا درخت لگا رہے ہیں	۲۵
حدیث	• جب زندگی کا رخ آخرت کی طرف ہو جائے	۵
سیرت	• خدا کی مدد کی ایک شکل یہ بھی ہے	۱۴
	حقیقت پسندی	۵
دعوت وتعارف	• اسلام کیا ہے	۱۶
	نصف صدی بعد بھی	۴۹
اخلاقیات	• اسلام کی تعلیم، نفرت کے جواب میں محبت	۲۱
تعلیمات	• زید بن ثابت انصاریؓ چھ زبانیں جانتے تھے	۴
تاریخ	• یہ تھی اسلامی خلافت	۱۰
عبادات	• صلاۃ التسبیح	۲۸
ادب	• اعداد کی منطق	۳۵
	جس کی نحو کمزور تھی	۴۸
دیگر مذاہب	• آچاریہ راج نیش کے خیالات	۵۶
	جب خدا کی زمین تعصبات سے خالی تھی	۷
جدید تحقیقات	• بحر مردار سے معدنیات حاصل کرنے کا منصوبہ	۸
تعمیر ملت	• اسلامی مہم کس لئے۔	۴۰
	دانش مندی کا امتحان	۵۴
اشاعت اسلام	• پادری نے اسلام قبول کر لیا	۴۲
	مثبت کام کی ضرورت ہے	۲۰
نفسیات	• ایک نفسیاتی کمزوری	۲۶
	آدمی ہمیشہ ایک جواب تلاش کر لیتا ہے	۱۲
عصر حاضر	• جس میدان میں چیلنج درپیش ہو۔	۱۹
مسائل حاضرہ	• آٹھ سال پہلے کی تحریر	۳۲
	جب تمام آوازیں پست ہو جائیں گی	۳۸
اقتصادیات	• محنت، اتحاد، استقلال	۵۳
	یہ ریگستان	۴۶
سوال وجواب	• ایک خط	۶۰
آپ بیتی	•	۵۰
حفظان صحت	•	۵۲
تعارف وتبصرہ	•	۲۲

اپنی بات

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی خوراک جنگلی شہد اور ٹڈیاں تھیں۔ وہ اونٹ کے بالوں کا کپڑا پہنتے تھے، اور راستوں میں بلند آواز سے پکارتے ہوئے چلتے تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے پاس اپنا کوئی مکان نہ تھا۔ وہ دن کے وقت لوگوں میں چل پھر کر ان کو خدا کا پیغام پہنچاتے اور جب رات ہو جاتی تو پہاڑوں میں جا کر سو رہتے۔

یہ حق کی تبلیغ کا زبانی طریقہ ہے۔ دوسرا طریقہ قلم کا ہے جس کو پریس کی ایجاد نے موجودہ زمانہ میں بہت زیادہ ترقی دے دی ہے۔ پریس نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ حق کی پیغام رسانی کے کام کو زیادہ منظم اور زیادہ وسیع شکل میں انجام دیا جا سکے۔

ماہنامہ الرسالہ کا اجراء اس بات کا ایک آزمائشی تجربہ تھا کہ کیا اس جدید طریقہ کو حق کی آواز پہنچانے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہمارا اب تک کا تجربہ اس سلسلے میں زیادہ حوصلہ افزا نہیں۔ یہ کام زبانی طریقہ کے برعکس، بہت زیادہ مالیاتی قربانی مانگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسروں کے تعاون کے بغیر اس کو چلانا کسی طرح ممکن نہیں۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان کو یا تو افیونی مذہب سے دلچسپی رہ گئی ہے یا جذباتی سیاست سے۔ کسی حقیقی دینی کام کی راہ میں تعاون کرنا وہ نہیں جانتے۔

اس میں شک نہیں کہ لفظی تعریفوں کے سلسلے میں لوگوں نے ہمارے ساتھ بخل سے کام نہیں لیا۔ ایسے لوگوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے جو چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح مفت حاصل کر کے اس کو پڑھ لیا کریں۔ مگر جہاں تک عملی تعاون کا معاملہ ہے، بدستور "زر می طلبی سخن درین است" کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ ایسی صورت حال ہے جس میں کسی سنجیدہ پرچہ کو دیر تک باقی نہیں رکھا جا سکتا۔

الرسالہ اب تک زیادہ تر ذاتی قربانی کے بل پر نکلتا رہا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ الرسالہ کے خادموں کا یہ مجنونانہ اقدام محض کلمۃ باقیۃ (زخرف - ۲۸) اور معذرۃ الی ربکم (اعراف - ۱۶۴) بن کر رہ جائے گا، یا اس سے آگے کسی منزل تک پہنچے گا۔ خدا کے ہاتھ میں دونوں ہیں اور ہم اپنے رب سے بہر حال یہی توقع رکھتے ہیں کہ اس کے علم محیط میں ہمارے لئے جو بہتر ہوگا، وہ اس کا فیصلہ فرمائے گا۔

زید بن ثابت انصاریؓ

چھ زبانیں جانتے تھے

رمضان ۲ھ میں بدر کا معرکہ پیش آیا، جس میں مسلمانوں کی تعداد، مشہور روایت کے مطابق ۳۱۳ تھی، اور دشمنوں کی تعداد ساڑھے نو سو۔ یعنی تگنی۔ مسلمان کامیاب رہے اور بہت سے قیدی ہاتھ آئے۔ ان کے لئے رہائی کا یہ فدیہ مقرر کیا گیا کہ جو قیدی لکھنا پڑھنا جانتا ہو وہ دس دس مسلمان بچوں کو اس فن کی تعلیم دے۔ بعض محدثین نے اس واقعہ کا عنوان باندھا ہے۔ "مشرک کو استاد بنانے کا جواز"

مدینہ آنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا کام جو کیا وہ مسجد کی تعمیر تھی۔ اس عمارت کے ایک حصہ میں سائبان اور چبوترہ (صفہ) بنایا گیا۔ یہ گویا اسلام کی اولین اقامتی درس گاہ تھی۔ بعض مصنفین نے اہل صفہ کے چار سو طلبہ کا ذکر کیا ہے۔ ان لوگوں کی تعلیم کے لئے اساتذہ مقرر تھے۔ عبداللہ بن سعید بن العاص انھیں لکھنا سکھاتے تھے۔ عبادہ بن الصامت سے مروی ہے کہ "رسول اللہ نے مجھے مامور کیا تھا کہ میں صفہ میں لوگوں کو لکھنا سکھاؤں اور قرآن پڑھاؤں"۔ مدینہ میں ۳ھ میں ایک اور اقامتی درس گاہ دار القراء کا بھی پتہ چلتا ہے جو مخرمہ بن نوفل کے مکان میں قائم ہوئی تھی۔ عمرو بن حزم کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا گیا تو انھیں فرائض منصبی کے متعلق ایک تحریری ہدایت نامہ دیا گیا جس میں دیگر امور کے علاوہ تعلیم کے انتظام کا حکم بھی درج تھا۔ طبری نے ۱۰ھ کے واقعات میں لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل کو ناظم تعلیمات بنا کر یمن بھیجا جہاں وہ ایک ضلع سے دوسرے ضلع تک دورہ کرتے اور مدارس کی نگرانی کرتے تھے۔

جیسا کہ مشہور ہے، ہجرت کے سفر میں آپ نے سراقہ بن مالک کو پروانہ امن لکھ کر دیا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس ہنگامی سفر میں بھی قلم، دوات اور کاغذ آپ کے ساتھ موجود تھا۔ مورخین نے آنحضرتؐ کے کاتبوں کی فہرست کے لئے مستقل باب قائم کئے ہیں۔ بعض کاتب (سکریٹری) نئی نازل ہونے والی وحی کو لکھتے، بعض سرکاری مراسلوں کا مسودہ مرتب کر کے آپ کی خدمت میں پیش کرتے، بعض زکوٰۃ اور محاصل کے حسابات لکھتے۔ بعض مال غنیمت کے اندراج اور تقسیم کا کام انجام دیتے، بعض بیرونی حکمرانوں اور قبائل کے سرداروں کے نام خط لکھتے۔ بعض فصل کے کٹنے سے پہلے تخمینہ (خرص) نوٹ کرتے۔

زیدؓ بن ثابت نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے عبرانی خط بھی سیکھا تھا۔ کیونکہ عرب کے یہودی بولتے تو عربی زبان تھے مگر لکھتے عبرانی خط میں تھے اور آپ سے مراسلات میں اسی خط کو استعمال کرتے تھے۔ مسعودی کے مطابق زیدؓ بن ثابت عربی کے علاوہ فارسی، یونانی، قبطی، حبشی اور عبرانی زبانیں بھی جانتے تھے اور بیرونی وفود سے گفتگو میں آنحضرتؐ کے مترجم کا کام انجام دیتے تھے۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص کے متعلق آتا ہے کہ انھوں نے عربی کے علاوہ سریانی زبان سیکھی تھی۔ وہ ۴۵ھ میں ۵۶ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔

علیکم بالفقه فی الدین وحسن العبادة وتفهّموا فی العربیة۔ دین میں بصیرت حاصل کرو، بہتر عبادت کرو، عربیت میں سمجھ پیدا کرو۔ ارشاد عمر فاروق

جب زندگی کا رخ آخرت کی طرف ہو جائے

اہل ایمان کی تعریف قرآن میں یہ کی گئی ہے کہ جب ان کے سامنے خدا کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل اٹھتے ہیں (انفال-۲) اور جب ان کے سامنے خدا کا کوئی حکم بیان کیا جاتا ہے تو فوراً اس کے آگے سر جھکا دیتے ہیں خواہ وہ ان کی مرضی کے خلاف کیوں نہ ہو۔ (نساء-۶۵)

حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ کے سامنے بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کہا کہ میرے پاس کچھ غلام ہیں۔ وہ میرے ساتھ خیانت کرتے ہیں اور میری نافرمانی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے میں ان کو برا بھلا کہتا ہوں اور مارتا ہوں۔ پھر ان کے معاملہ میں میرا حال کیا ہوگا۔ آپ نے جواب دیا: جب قیامت کا دن آئے گا تو ان کی خیانت اور ان کی نافرمانی کا شمار کیا جائے گا۔ پس اگر تمھاری سزا ان کے جرم کے مطابق ہوگی تو معاملہ برابر برابر ہو جائے گا اور اگر تمھاری سزا ان کے جرم سے زیادہ ہوگی تو ان کو اجازت دی جائے گی کہ اس کے بقدر تم سے بدلہ لیں۔ یہ سن کر وہ شخص چیخ پڑا اور رونے لگا۔ اور اس کے بعد کہا:

یا رسول اللہ، ما اجد لی ولھولاء خیرا من مفارقتھم، اشھدک انھم کلھم احرار (احمد، ترمذی)

اے خدا کے رسول، میرے اور ان کے درمیان جدائی سے بہتر کوئی صورت نہیں۔ میں آپ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ وہ سب آج سے آزاد ہیں۔

حقیقت پسندی

بعثت کے تیسرے سال جب عمر بن الخطابؓ اسلام لائے تو مسلمانوں کی تعداد تقریباً چالیس تھی۔ مگر مخالفین کے ڈر سے مسلمان چھپ کر عبادت کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ چونکہ نہایت پرجوش اور بہادر آدمی تھے، انھوں نے کہا: جب ہم حق پر ہیں تو ہم چھپے کیوں رہیں۔ ہم خانۂ کعبہ میں جاکر کھلم کھلا عبادت کریں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو منع فرمایا اور کہا:

یا عمر انا قلیل (اے عمرؓ! ہم تھوڑے ہیں)

غزوۂ خندق میں جب کہ دونوں فوجیں خندق کے دونوں طرف کھڑی تھیں مشرکین کی فوج سے ان کا مشہور شہسوار عمرو بن ود گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا اور آواز دی: من یبارزنی (کون میرا مقابلہ کرے گا) علی بن ابی طالب نے فرمایا: انا یا رسول اللہ (میں یا رسول اللہ) آپ نے فرمایا:

اجلس فانہ عمرو بن ود (تم بیٹھو، کیونکہ یہ عمرو بن ود ہے)

یہ تھا پیغمبر خدا کا طریقہ۔ مگر آج آپ کے ماننے والے ہیں کہ وہ کمال سمجھتے ہیں کہ حالات کا اندازہ کیے بغیر میدان مقابلہ میں کود پڑیں، خواہ اس کے بعد بربادی کے سوا اور کوئی چیز ان کے حصہ میں نہ آئے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی چھوٹی چھوٹی چیزوں میں "شریعت" کا بہت اہتمام کرتا ہے، مگر بڑے بڑے امور میں اس کو خدا کی شریعت کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ ایسے معاملات میں "بال کی کھال نکالنے" کی حد تک مذہبی بنتا ہے جن میں اس کے ذاتی مفادات مجروح نہیں ہوتے۔ جو اس کے دنیوی عزائم میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتے، جن میں اسے یہ قیمت نہیں دینی پڑتی کہ دین کی خاطر اپنے ایک مبغوض شخص سے محبت کرے اور اپنے ایک محبوب شخص سے قطعی تعلق ختم کر دے۔ خلاصہ یہ کہ جو دین اس کی اپنی زندگی میں خلل نہ ڈالے، وہ اس کی پیروی میں بہت آگے ہوتا ہے۔ مگر وہ دین جو اس کی اپنی زندگی سے ٹکرائے، جو اس سے "یہ کرو اور وہ نہ کرو" کا مطالبہ کرے، اس سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

تغلق خاندان کے آخر زمانہ میں جب اس کی سلطنت کا زوال شروع ہوا تو فیروز تغلق کے جاگیردار دلاور خاں نے مالوہ میں ۱۴۰۱ء میں خود مختار سلطنت قائم کر لی۔ اس کا دارالسلطنت ابتداءً دھار اور اس کے بعد مانڈو تھا۔ دلاور کے بعد ہوشنگ اور اس کے بعد اس کا لڑکا غزنی خاں تخت پر بیٹھا۔ اس زمانہ میں محمود خلجی اس کا وزیر تھا۔ وزیر نے موقع پاکر غزنی خاں کو مروا ڈالا اور خود تخت پر بیٹھ گیا۔

سلطان محمود خلجی ایک بہادر سپاہی تھا اور ذاتی زندگی میں نہایت شریف اور منصف مزاج تھا۔ اس نے ساری عمر کیمپ میں گزاری۔ محمود نے ۱۴۶۹ء میں وفات پائی۔

سلطان محمد تغلق کے عہد میں ۱۳۴۷ء میں دکن میں بغاوت ہوئی اور حسن گنگو نے ایک خود مختار ریاست کی بنیاد رکھی جس کا دعویٰ تھا کہ وہ ایران کے قدیم بادشاہ بہمن کی اولاد ہے۔ اس نے گلبرگہ کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ اس خاندان کے احمد شاہ بہمنی نے شہر بیدر بسایا جو گلبرگہ کے بجائے بہمنی سلطنت کا پایہ تخت ہو گیا۔ اسی خاندان کا ایک حکمراں نظام شاہ بہمنی تھا۔ وہ ۱۴۶۲ء میں تخت پر بیٹھا۔ مگر تخت نشینی کے دو سال بعد نظام شاہ کا اچانک انتقال ہو گیا۔

مالوہ کا حاکم محمود خلجی حلال غذا کا بہت زیادہ اہتمام کرتا تھا۔ ۱۴۶۱ میں اس نے بیدر پر حملہ کیا جو نظام شاہ بہمنی کا دارالسلطنت تھا۔ دوران محاصرہ اس کے سامنے ایک مسئلہ یہ آیا کہ اپنے لئے حلال غذا کہاں سے حاصل کرے۔ حلال سبزیوں کا ذخیرہ جو اس کے پاس تھا وہ محاصرہ کے طول پکڑ جانے کی وجہ سے ختم ہو گیا۔

اس مسئلہ کا اسے پہلے سے اندازہ تھا چنانچہ اپنے معمول کے مطابق وہ اپنے ملک سے مٹی اور تختے لے کر چلا تھا۔ اس نے لکڑی کے تختوں پر مٹی ڈال کر سبزی اگائی۔ مگر وہ اس کی ضرورتوں کے لئے ناکافی ثابت ہوئی۔ بالآخر اس نے اس علاقہ کے ایک بزرگ مولانا شمس الدین کرمانی کو بلایا

دین داری یہ ہے کہ دین پوری زندگی پر چھا جائے نہ کہ وہ زندگی کا محض ایک وقتی ضمیمہ ہو

اس ان سے کہا کہ مجھے کسی ایسے شخص کا پتہ بتائیے جس کے پاس حلال روپے سے خریدی ہوئی زمین ہو اور وہ میرے ہاتھ اس کو فروخت کر دے۔ میں اس کو سے کر اس میں اپنے لئے سبزیاں اگاؤں گا۔ مولانا شمس الدین کرمانی نے جواب دیا: "تم نے ایک مسلمان ملک پر حملہ کیا ہے۔ یہاں آکر تم لوگوں کا خون بہا رہے ہو اور آباد گھروں کو اجاڑ رہے ہو۔ حرام مال سے بچنے کی تمہیں اتنی فکر ہے اور مسلمانوں کی خوں ریزی سے بچنے کی کوئی فکر نہیں" یہ سن کر سلطان رو پڑا۔ ●

جب خدا کی زمین تعصبات سے خالی تھی

ستر سال پہلے کی دنیا آج کی دنیا سے کتنی مختلف تھی، اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہاں ہم مولانا شبلی نعمانی کی ایک تحریر نقل کرتے ہیں جو انھوں نے ۱۹۰۹ میں لکھی تھی:

"یہ واقعہ حیرت سے سنا جائے گا کہ کولہاپور کی ریاست نے، جو ایک ہندو ریاست ہے، ایک مسلمان طالب علم کو اپنے صرف سے ندوۃ العلماء کے دار العلوم میں اس غرض سے بھیجا ہے کہ وہ یہاں ایک مذہبی تعلیم پائے۔ ریاست مذکور کے افسر تعلیم گنج لال صاحب دیوالی ایم۔اے کا جو خط اس کے متعلق ہمارے پاس آیا ہے اس کا اقتباس حسب ذیل ہے:

"کچھ دن ہوئے مفاخرت نامہ والا شرف صدور لایا تھا۔ موقع پاکر وہ حضور مہاراجہ صاحب دام ملکہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ حضور ممدوح اس کا مضمون سن کر بہت مسرور ہوئے اور فرمایا کہ طالب علم کو وہاں روانہ کیا جائے۔ امید کہ نوجوان جناب کے دار العلوم سے اتنا ذخیرہ علوم کا لے کر واپس آئے گا کہ کل گرد و نواح کے مسلمان اس پر فخر کریں گے۔"

موجودہ دنیا کتنی کس قدر عجیب آواز ہے لیکن درحقیقت یہاں عجیب و غریب ہے تعصب کی بنیاد کاریا

الرسالہ مئی ۱۹۷۷

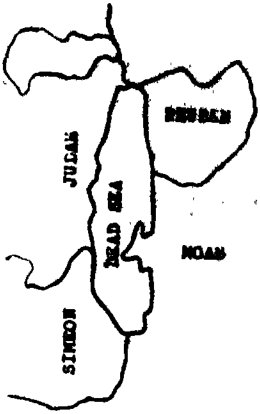
ہیں جو تیموریوں نے ہندوستان میں غیر مذہب والوں کے ساتھ برتی تھیں۔ تیموریوں نے کیا کیا۔ اس سوال کا جواب پچھلی تاریخوں نے بار بار دیا۔ لیکن مخالفین کو تسلی نہیں ہوتی۔ اس لئے ان کو زندہ مثالوں کی طرف نظر اٹھانی چاہئے۔ ان کو حیدرآباد جانا چاہئے جہاں سالانہ تین لاکھ روپے صرف شیوالوں، مندروں اور دھرم شالوں کی تعمیر و مرمت میں صرف کیا جاتا ہے۔ میں نے خود اپنے زمانہ قیام (حیدرآباد) میں دیکھا کہ ایک گاؤں کے ہندوؤں نے درخواست کی کہ ہمارے آس پاس کوئی شیوالہ نہیں ہے جس میں ہم لوگ اپنی مذہبی عبادت بجا لائیں، اس درخواست پر ریاست سے چھ ہزار روپیہ عطا ہوا۔

گیا میں جو بدھ مت کا سب سے بڑا مندر ہے، اس کے آس پاس اکثر سلاطین تیموریہ کے تیرہ فرامین موجود ہیں (میں نے خود جاکر دیکھا ہے) جس میں جاتریوں اور پجاریوں کے مصارف کے لئے زمین اور جاگیریں عطا کی گئی ہیں۔ ریاست پٹیالہ ایک سکھ ریاست ہے۔ میں نے خود وہاں جاکر معلوم کیا ہے کہ کوئی مسجد تعمیر کی جاتی ہے تو ریاست کی طرف سے ایک معین رقم اس کام کے لئے ملتی ہے۔ اور یہ قاعدہ مدت سے چلا آرہا ہے" الندوہ، ماہ جولائی ۱۹۰۹ء

بحر مردار اپنی قسم کا واحد سمندر ہے

یہ ایک عبرت ناک داستان ہے

اور ایک قدرتی عجوبہ بھی



بہت سے واقعات جن کو علمی دنیا میں محض جغرافی یا طبیعیاتی مطالعہ کا موضوع سمجھا جاتا ہے، اللہ کی نظر میں وہ خدائی آیات (ذاریات - ۲۷) ہیں۔ ان کے اندر لوگوں کے لئے عبرت ہے۔ جو لوگ آج عزت یا خوش حالی کا کوئی حصہ پاکر گھمنڈ میں پڑ گئے ہیں، انھیں ان لوگوں کے انجام سے نصیحت لینی چاہئے جن کو انھیں کی طرح عزت اور خوش حالی ملی تھی، مگر وہ گھمنڈ میں پڑ گئے، انھوں نے اپنے آپ کو مالک کائنات کی تابعداری سے آزاد سمجھ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تباہ کر دیئے گئے۔

انھیں نشانیوں میں سے ایک نشانی وہ ہے جس کو بحر مردار (DEAD SEA) کہتے ہیں۔ یہ بحیرہ شرق اردن اور فلسطین کے درمیان شمال سے جنوب تک اس طرح پھیلا ہوا ہے کہ اس کی چوڑائی کے مقابلہ میں اس کی لمبائی تقریباً پانچ گنا زیادہ ہے۔ تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ جنوب کی طرف اس بحیرہ کا ایک تہائی حصہ چار ہزار برس قبل تک اصل بحیرہ میں شامل نہ تھا۔ یہ بعد کو اس کا جزو بنا ہے۔ یہ حصہ قدیم دنیا کا ایک انتہائی سرسبز و شاداب علاقہ تھا جس کو بائبل میں "سدیم کی وادی" کہا گیا ہے۔ بائبل کا بیان ہے کہ "وہ، اس سے پیشتر کہ خداوند نے سدوم اور عمورہ کو تباہ کیا، خداوند کے باغ (عدن) اور مصر کے مانند خوب سیراب تھی (پیدائش ۱۳ : ۱۰) اسی وادی سدیم میں اس وقت کی متمدن دنیا کے بڑے بڑے شہر سدوم، عمورہ، ادمہ، ضبوئیم اور ضغر واقع تھے۔ یہاں اس وقت کی ایک طاقت ور اور ترقی یافتہ قوم، قوم لوط آباد تھی۔ ان لوگوں نے ظلم و فساد پھیلایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کے قانون نے ان کو پکڑ لیا۔ اس پورے علاقہ کو ہولناک زلزلہ نے تباہ کر دیا۔ ان کے اوپر بحر مردار کا پانی پھیل گیا اور اب وہ اپنے تمام آثار سمیت گندے پانی کے نیچے دفن پڑا ہوا ہے۔

جدید علم الآثار سے ثابت ہوا ہے کہ اس علاقہ میں حضرت ابراہیم کے زمانہ میں زبردست طوفان آیا تھا۔ پانی کے نیچے اب بھی ڈوبے ہوئے شہروں کے نشانات پائے جاتے ہیں۔

قرون وسطیٰ کے سیاحوں نے لکھا تھا کہ بحر مردار کے اوپر کوئی چڑیا نہیں اڑتی کیونکہ اس کی ہوا زہریلی ہو چکی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ گیسوں کے مسلسل اخراج کی وجہ سے یہاں کی فضا بدبودار رہتی ہے۔ مگر جیسا کہ جدید محققین نے بتایا ہے چڑیوں کے اس علاقہ میں نہ جانے کی وجہ یہ ہے کہ بحر مردار کے اندر مچھلی نہیں، نباتات کی بھی کوئی قسم وہاں برائے نام ہی پائی جاتی ہے۔

بحر مردار دنیا کا سب سے زیادہ کھاری ذخیرہ آب ہے۔ عام سمندر جتنے کھاری ہوتے ہیں اس کے مقابلہ میں بحر مردار چھ گنا زیادہ کھاری ہے۔ یہ تقریباً ۵۰ میل لمبا اور ۳ سے ۱۰ میل تک چوڑا ہے۔ مجموعی طور پر اس کا رقبہ ۴۰۵ مربع میل ہے۔ دریائے اردن اور دوسرے چشمے ہر روز بحر مردار کے اندر ۶۵ لاکھ ٹن میٹھا پانی گراتے ہیں۔ مگر بحر مردار کی شدید گرمی کی وجہ سے یہ سارا پانی بخارات بن کر اڑ جاتا ہے، اور سمندر کا کھاری پن کم نہیں ہوتا۔ اس کا پانی اتنا گاڑھا ہے کہ آدمی بآسانی اس کے اوپر سے پھسل سکتا ہے، وہ ڈوب نہیں سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بحر مردار میں ٹھوس مادہ مثلاً نمک، جپسم، پوٹاش، میگنیشیم وغیرہ ۲۵ فی صد شامل ہیں۔ جبکہ عام سمندروں میں ان کی مقدار صرف تین فی صد ہوتی ہے۔

بحر مردار کا نصف حصہ شرق اردن میں ہے اور نصف اسرائیل میں۔ شرق اردن نے منصوبہ بنایا ہے کہ وہ اپنے علاقہ میں تیل کی کمی کو بحر مردار کی معدنیات کے ذریعے پورا کرے۔ ایک عرب کمپنی کے اشتراک سے پندرہ سال مطالعہ کرنے کے بعد، بحر مردار کے جنوبی حصہ میں دو بند بنائے گئے ہیں۔ اس منصوبہ کا خاص مقصد بحر مردار سے پوٹاش الگ کرکے نکالنا ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ بحر مردار میں پوٹاش کے ذخائر کا تخمینہ اور امریکہ کے بعد، سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں پہلا پنج سالہ منصوبہ ۱۰ ملین ڈالر کے خرچ سے ۸۰-۱۹۷۶ کے لئے بنایا گیا ہے۔ پہلے یہ منصوبہ زیادہ بڑے پیمانہ پر بنایا گیا تھا۔ مگر ۱۹۶۷ کی جنگ میں جب اردن کے کچھ علاقے اسرائیل کے قبضہ میں چلے گئے تو منصوبہ کی وسعت میں کمی کرنی پڑی۔

منصوبہ کے ذمہ داروں نے بتایا ہے کہ بحر مردار کے پانی کا ۳۷،۳ ملین کیوبک میٹر بخارات میں تبدیل کرنے سے ایک ملین ٹن پوٹاش حاصل ہوگا جس کی قیمت ایک سو ملین ڈالر ہے۔ اسی طرح میگنیشیم اور برومائٹ بھی برآمد کرنے کے لئے نکالا جائے گا۔ پانی کو بخارات میں تبدیل کرنے کے عمل کے نتیجہ میں اس کے ساتھ کئی ملین ٹن نمک بھی حاصل ہوگا۔ مگر اس کو دوبارہ سمندر میں ڈالنا ہوگا۔ کیونکہ اس کا کوئی خریدار نہیں ہے۔

منصوبہ کا دوسرا مرحلہ ۱۹۸۱ میں مکمل ہوگا اور اس پر ۱۰۰ ملین ڈالر خرچ ہوں گے۔ اس سے ۲۰ کیلومیٹر کا بند بنایا جائے گا۔ اس منصوبہ کے اخراجات زیادہ تر عراق اور عالمی بنک سے حاصل کئے گئے ہیں ■

حدیث

خیر الاصحاب عند اللہ خیرھم لصاحبہ
وخیر الجیران عند اللہ خیرھم لجارہ

(ترمذی)

اللہ کے نزدیک سب سے بہتر ساتھی وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لئے سب سے بہتر ہو اور اللہ کے نزدیک سب سے بہتر پڑوسی وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لئے سب سے بہتر ہو۔

مولانا محمد تقی امینی

یہ تھی اسلامی خلافت

خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلامی خلافت کی ذمہ داریوں کو ان لفظوں میں واضح فرمایا ہے:

لو مات کلب علی شاطی الفرات جوعا لکان عمر مسئولا یوم القیمۃ

اگر کتا بھوک کی وجہ سے فرات (جیسی دور دراز جگہ پر) کے کنارے بھی مرگیا تو قیامت کے دن عمر رض سے اس کی باز پرس ہوگی

دوسری جگہ ہے۔

لو ترکت عنز جدباء الی جانب ساقیۃ لم تدھن لخشیت ان اسئال عنھا یوم القیمۃ

اگر نہر کے کنارے بھی کوئی خارش والی بکری اس حال میں رہ جائے کہ اس پر (بطور علاج) تیل کی مالش نہ ہو تو ڈر ہے کہ قیامت کے دن عمر رض سے اس کی باز پرس ہوگی۔

ملک کے تمام افراد کو حقوق اور مملکت کے قوانین میں مساوی قرار دیا۔ قومیت، ذات، پات، رنگ و زبان اور تصور حیات کی بنا پر کسی قسم کی تفریق گوارا نہ کی جیسا کہ "دستور" کی درج ذیل دفعات سے ظاہر ہے۔

(۱) مسلم اور غیر مسلم دونوں کے خون کا معاوضہ مساوی

(۲) تعزیرات میں دونوں برابر ہیں یعنی جرائم کی جو سزا مسلمانوں کو دی جائے گی وہی غیر مسلم کو دی جائے گی،

(۳) دیوانی قانون میں دونوں برابر ہیں۔

(۴) غیر مسلموں کو کسی قسم کی تکلیف پہنچانا، حتیٰ کہ پیٹھ پیچھے ان کی برائی کرنا قانوناً جرم ہے۔

(۵) غیر مسلموں کی عزت و آبرو کی اس قدر حفاظت کی جائے گی جس قدر مسلمانوں کے عزت و ناموس کی حفاظت کی جائے گی۔

عمر بن سعد رض جو حمص کے حاکم تھے اور زہد و تقدس میں تمام عہدہ داروں سے ممتاز تھے ایک مرتبہ ان کی زبان سے ایک غیر مسلم کے لئے یہ لفظ نکل گیا۔

اخزاک اللہ   اللہ تجھ کو رسوا کرے

اس پر ان کو اس قدر ندامت ہوئی کہ حضرت عمر رض کے پاس حاضر ہو کر اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور کہا کہ اس ملازمت کی بدولت مجھ سے یہ حرکت صادر ہوئی ہے

ہر قوم و ملک کے مذہب و کلچر کو خصوصیت سے برقرار رکھا اور غیر مسلموں کے معاملات ان ہی کے مذہبی طریقے اور رسم و رواج کے مطابق طے کئے۔

چنانچہ ابو عبیدہ رض کہتے ہیں:

اقر اھلھا فیھا علی مللھم وشرائعھم

مفتوحہ ممالک کے باشندوں کو ان کے اپنے مذہب اور رسم و رواج پر برقرار رکھا۔

دوسری جگہ ہے

فھم احرار فی شھاداتھم ومناکحاتھم ومواریثھم وجمیع احکامھم

یہ سب لوگ اپنی شہادتوں میں، نکاح کے معاملات اور وراثت کے قانون میں غرض اپنے تمام قواعد و قانون میں آزاد تھے۔

اس زمانہ کے ایک نسطوری پادری نے اپنے تحفظات کے بارے میں یہ تاثرات قلم بند کئے ہیں۔

"یہ طائی (عرب)، جنھیں خدا نے آج کل حکومت عطا فرمائی ہے وہ ہمارے بھی مالک بن گئے ہیں۔ لیکن وہ عیسائی مذہب سے مطلق برسرپیکار نہیں ہیں، بلکہ اس کے برخلاف وہ ہمارے دین کی حفاظت کرتے ہیں، ہمارے پادریوں اور مقدس لوگوں کا احترام کرتے ہیں اور ہمارے گرجاؤں اور کلیساؤں

کو جاگیریں عطا کرتے ہیں۔"

پروفیسر واکر قانون بین الممالک کی تاریخ میں لکھتے ہیں

"متمدن اور مہذب سلطنتوں پر وحشیوں کا دھاوا بولنا اور غالب آکر سلطنت وحکومت کا مالک بن جانا تاریخ کا ایک عادی واقعہ ہے، لیکن جرمنوں، تاتاریوں وغیرہ وحشیوں کے برخلاف عجیب بات یہ ہے کہ عرب کے بدّو جب اپنے صحرائی براعظم سے باہر کی دنیا میں امنڈ نے لگے تو ان عربی فاتحین کو عام تصور کے وحشی فاتحین میں کسی طرح نہیں شامل کیا جاسکتا، کیوں کہ ان وحشی بدوؤں میں پہلے ہی دن سے ان کے مفتوحوں سے بھی بڑھ کر تہذیب اور اخلاق حسنہ نظر آتے ہیں۔

کلیسائی تاریخ وجغرافیہ کے قاموس میں ایک رومن کیتھولک پادری نے لکھا ہے:

"مسلمان عربوں کو یعقوبی (جاکوبائٹ) عیسائیوں نے بھی اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے ہاتھوں ہاتھ لیا، مسلمانوں کی سب سے اہم جدّت جس کا یعقوبی عیسائیوں نے دلی خوشی سے استقبال کیا یہ تھی کہ انھوں نے ہر مذہب کے پیروؤں کو ایک خود مختار وحدت قرار دیا اور اس مذہب کے سرداروں کو ایک بڑی تعداد میں دینیاوی اور عدالتی اقتدارات عطا کئے"

غیر مسلموں کو ملکی انتظامات میں شریک و دخیل بنایا۔

كتب عمر بن الخطاب الى اهل الكوفة يبعثون اليه رجلا من اخيرهم واصلحهم والى اهل البصرة كذلك والى اهل الشام كذلك

حضرت عمرؓ نے اہل کوفہ وبصرہ اور اہل شام کو لکھا کہ اپنے میں سے بہتر اور صاحب صلاحیت افراد کو منتخب کرکے بھیجیں۔

اسی طرح اکثر سابق غیر مسلم افسران کو مقامی باشندوں کی مرضی سے بحال رکھا اور حکومت کا مزاج بدل جانے کے بعد ان سب نے ظلم وستم کی راہیں چھوڑ دیں۔ علامہ مقریزیؒ کہتے ہیں

فكانت جبايتهم بالتعديل ان افسروں کی وصول تحصیل عدل وانصاف کے ساتھ ہوتی تھی۔ ■

(امت مسلمہ کی رہنمائی)

حضرت عمرؓ نے فرمایا:

ان كثيرا من الخطب من شقاشق الشيطان

بہت سے خطبے (وعظ) شیطانی ہیجان سے ہیں۔

شقاشق (جمع شقشقہ) اس جھاگ کو کہتے ہیں جو مستی کے وقت اونٹ کے منہ سے باہر آتا ہے چنانچہ شاہ ولی اللہ رح کہتے ہیں۔

شیطان کے ساتھ اس شخص کو تشبیہ دی جو اپنے کلام کو وسیع کرتا اور صدق وکذب کی پروا نہیں کرتا۔

حضرت عمرؓ ذبح خانے خود تشریف لے جاتے اور جس کو دو دن گوشت خریدتے دیکھتے، درّے سے اس کو سزا دیتے تھے۔

فاذا رای رجلا اشترى لحما يومين متتابعين ضربه بالدرة

جب کسی شخص کو دیکھتے کہ وہ دو دن مسلسل گوشت خرید رہا ہے تو اس کو درّے مارتے اور یہ فرماتے تھے

الا طويت بطنك لجارك وابن عمك

تو نے اپنے پڑوسی اور چچیرے بھائی کیلئے کیوں کفایت نہیں کی۔

آدمی ہمیشہ ایک جواب تلاش کرلیتا ہے

عثمان بن عفان کی شہادت کے بعد علی بن ابی طالب کو خلیفہ بنایا گیا۔ تمام ممالک اسلامی کے لوگ آپ کے حق میں بیعت ہوگئے، صرف شام باقی رہا جہاں معاویہ بن ابی سفیان خون عثمان کا مطالبہ کر رہے تھے اور خلیفہ چہارم سے صلح کی ہر پیش کش کو رد کر رہے تھے۔

بالآخر صفین کے مقام پر علی و معاویہ کی فوجوں میں جنگ ہوئی۔ سارے قرائن و دلائل ثابت کر رہے تھے کہ اس معاملہ میں علی بن ابی طالب حق پر ہیں۔ حتی کہ قتال کے درمیان بعض ایسے واقعات پیش آئے جو نص صریح کی سطح پر آنجناب کی حقانیت کی تصدیق کر رہے تھے۔ مگر مخالف گروہ کے پاس الفاظ کی کمی نہ تھی، اس نے ہر ایسی چیز کی تردید میں ایک جواب تلاش کر لیا۔

خلیفہ چہارم کے ساتھیوں میں جو لوگ قتل ہوئے، ان میں ایک صحابی عمار بن یاسر بھی تھے۔ یہ نوے سال کے ہو چکے تھے۔ مگر اس بڑھاپے کے باوجود انتہائی بہادری کے ساتھ لڑے۔ جنگ کے وقت یہ رجزیہ اشعار ان کی زبان پر تھے:

من رائح الی الجنة	جنت کون چلتا ہے
الیوم القی الاحبة	آج میں دوستوں سے ملنے جا رہا ہوں
محمدا وحزبه	محمدؐ اور ان کی جماعت سے

عمار بن یاسر کا اس جنگ میں قتل ہونا صریح طور پر شہادت دے رہا تھا کہ اس مقابلہ میں حق کس کے ساتھ ہے، کیوں کہ مہاجرین و انصار کے درمیان یہ واقعہ مشہور تھا کہ مدینہ میں مسجد تعمیر کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم عمار کے سر پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے:

افسوس اے ابن سمیہ! تجھ کو باغیوں کی

عمارؓ یاسر اور سمیہ کے لڑکے تھے جن کو مکہ میں اسلام دشمنوں نے سخت ترین تکلیفیں پہنچائیں، یہاں تک کہ دونوں شہید ہوگئے۔ کہا جاتا ہے کہ مکہ کے ابتدائی دور میں ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم آل یاسر کی طرف سے ایسے وقت میں گزرے جب کہ ان پر تشدد کیا جا رہا تھا۔ یاسر کے منہ سے صرف اتنا نکلا:

یا رسول اللہ بس یہ ہے دنیا۔

راویان سیر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

آل یاسر صبر کرو، تم سے جنت کا وعدہ ہو چکا ہے"

یاسر اور ان کی بیوی سمیہ اسلام میں سب سے پہلے مرتبۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ ماں باپ کا روح فرسا انجام دیکھنے کے باوجود عمار کے عزم میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ مزید یقین کے ساتھ اسلام پر جم گئے۔ راویان آثار و سیر کا بیان ہے کہ عمار بن یاسر پہلے کی مسلمان ہیں جنھوں نے اپنے گھر میں مسجد بنائی۔ اسباب نزول کی روایات کے مطابق ذیل کی آیت انھیں کے بارے میں اتری تھی:

"بھلا جو شخص اپنی راتوں کو سجدہ و قیام کی حالت میں گزار رہا ہو، آخرت سے ڈرتا ہو اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہو (وہ اور غافل لوگ یکساں ہیں) کہو کیا علم والے اور بے علم والے دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ وہی لوگ نصیحت پکڑتے ہیں جو عقل والے ہیں" (زمر)

*

ایک جماعت قتل کرے گی۔

انصار کے ایک مرد صالح خزیمہ بن ثابت صفین کے وقت علی بن ابی طالب کے ساتھ تھے۔ مگر جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔ کیوں کہ ان کا دل شک سے پوری طرح خالی نہ ہوسکا تھا۔ مگر جب عمار کو انھوں نے اہل شام کی تلواروں سے قتل ہوتا ہوا دیکھ لیا تو بے اختیار پکار اٹھے: "حق ظاہر ہوگیا"۔ اس کے بعد وہ علی بن ابی طالب کے لشکر میں شامل ہوئے اور لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔

تاہم معاویہ بن ابی سفیان اور عمرو بن العاص نے ایک جواب تلاش کرلیا۔ انھوں نے کہا:

"ہم نے کب عمار کو قتل کیا ہے، ان کو تو ان لوگوں نے قتل کیا ہے جو ان کو یہاں لڑنے کے لئے لائے تھے۔"

ایسا نہ ہو کہ خدا کا قانون ہمیں پکڑ لے

گائے بھینس پالنے والوں کے سامنے ایک مسئلہ یہ رہتا ہے کہ مویشی کے دودھ کو اس کے بچہ سے کس طرح بچائیں۔ اس کا ایک طریقہ بعض علاقوں میں یہ ہے کہ بچہ کے سر پر ایک سینگ نما دو شاخہ لکڑی باندھ دیتے ہیں جس کو کٹیلا (کانٹے والا) کہتے ہیں۔ بچہ جب دودھ پینے کے لئے جانور کے تھن کے پاس اپنا منھ لے جاتا ہے تو اس کے منھ سے پہلے اس کا کٹیلا جانور کے تھن سے ٹکراتا ہے اور جانور بدک کر ہٹ جاتا ہے۔ کٹیلا باندھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ اور اس کی ماں کا تھن، دونوں ایک دوسرے سے ملنے ہی نہیں پاتے۔

ایسا ہی کچھ معاملہ اس وقت مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔ دوسری اقوام ان کے لئے مدعو (جس کو دعوت پہنچائی جائے) کی حیثیت رکھتی ہیں اور وہ ان کے اوپر حق کے داعی ہیں۔ مگر مسلمانوں نے عرصہ سے اپنی مدعو اقوام سے سیاسی اور معاشی لڑائی چھیڑ رکھی ہے۔ ہر جگہ وہ ان کے دنیوی اور مادی حریف بنے ہوئے ہیں۔ ٹکراؤ کی یہ سیاست ان کے ملی وجود کے اوپر ایک قسم کا کٹیلا بن گئی ہے۔ جب مسلمان اور دوسری قوموں کے افراد ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہیں تو قبل اس کے کہ وہ مسلمانوں کی اسلامی حیثیت کو جانیں، ان کا ٹکراؤ کردار "کٹیلا" ان سے ٹکرا جاتا ہے اور وہ ان سے متوحش ہو کر الگ ہو جاتے ہیں۔ وہ فضا بننے کی نوبت ہی نہیں آتی جس میں دوسری قومیں مسلمانوں کے دینی پیغام سے متعارف ہوں اور اس پر غیر جانب دارانہ انداز سے غور کریں۔

اگر ہم کو یقین ہے کہ آخرت آنے والی ہے اور لوگوں سے ان کے اعمال کی پوچھ ہونی ہے تو ہمارے اوپر لازم ہے کہ اس کٹیلا کو اپنے اوپر سے اتاریں۔ اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو سخت اندیشہ ہے کہ خدا کا قانون ہم کو پکڑ لے اور ہمارے اپنے جرائم کے ساتھ دوسری قوموں کا عذاب بھی ہمارے اوپر ڈال دیا جائے۔

خدا کی مدد کی ایک شکل یہ بھی ہے

> ایمان کو لازماً خدا کی مدد حاصل ہوتی ہے۔ مگر یہ مدد انھیں لوگوں کے لئے ہے جو نفسانی محرکات سے اوپر اٹھ چکے ہوں۔ جو اللہ کو سربلند کرنے کے لئے کام کریں نہ کہ اپنی ذات کو نمایاں کرنے کے لئے۔

ہجرت کے چھٹے سال حدیبیہ کے مقام پر جو دس سالہ معاہدہ کیا گیا، اس کی ایک دفعہ یہ تھی:

"قریش کا جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر بھاگ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائے گا، اس کو آپ واپس کردیں گے اور آپ کے ساتھیوں میں سے جو شخص قریش کے پاس چلا جائے گا اس کو وہ واپس نہ کریں گے"

اس معاہدہ کی تکمیل کے وقت قریش کی نمائندگی سہیل بن عمرو کر رہے تھے۔ معاہدہ ابھی لکھا ہی جا رہا تھا کہ سہیل بن عمرو کے لڑکے ابو جندل آگئے۔ وہ مسلمان ہو گئے تھے۔ مگر مکہ والوں نے ان کو قید کر رکھا تھا۔ مکہ سے حدیبیہ (موجودہ شمیسی) تک ۱۳ میل کا فاصلہ طے کرکے وہ اس طرح آپ کے کیمپ میں پہنچے کہ اب بھی ان کے پیروں میں بیڑیاں تھیں اور جسم پر مار پیٹ کے نشانات تھے۔ انھوں نے آپ سے فریاد کی کہ مجھ کو اس قید سے نجات دلائی جائے۔ صحابہ کے لئے بھی اپنے مومن بھائی کی یہ حالت دیکھ کر ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ مگر سہیل بن عمرو نے کہا کہ معاہدہ کی تحریر بھلے ہی مکمل نہ ہوئی ہو، شرائط تو ہمارے آپ کے درمیان طے ہو چکی ہیں۔ اس لئے میرے لڑکے کو میرے حوالے کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دلیل کو تسلیم کرتے ہوئے ابو جندل کو ان کے حوالے کر دیا اور وہ روتے ہوئے مکہ واپس گئے۔ اسی طرح ابو بصیر اور دوسرے مسلمان جو قریش کی قید سے بھاگ کر مدینہ آئے، ان کو حسب معاہدہ قریش کو واپس کیا جاتا رہا۔

مگر اس کے برعکس مسلمان عورتوں کے معاملہ میں اس اصول کی پابندی نہیں کی گئی۔ قرآن میں آیت اتری:

"اے ایمان والو، جب مومن عورتیں ہجرت کرکے تمھارے پاس آئیں تو ان کی جانچ کر لو، پھر جب تمھیں معلوم ہو جائے کہ وہ مومن ہیں تو ان کو کفار کی طرف واپس نہ کرو" (ممتحنہ۔۱۰)

اس سلسلہ میں، مثال کے طور پر یہ واقعہ آتا ہے کہ ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط مکہ سے نکل کر مدینہ پہنچیں۔ مکہ والوں کو معلوم ہوا تو انھوں نے معاہدہ کا حوالہ دے کر ان کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ ام کلثوم کے دو بھائی ولید بن عقبہ اور عمارہ بن عقبہ انھیں واپس لے جانے کے لئے مدینہ آئے۔ اس کے باوجود ان کو واپس نہیں کیا گیا۔

بظاہر یہ معاہدہ کی خلاف ورزی تھی۔ اور قریش کے لئے زبردست موقع تھا کہ وہ آپ کی بدعہدی کا شور مچا کر آپ کو بدنام کریں۔ مگر قریش آپ کے ساتھ انتہائی دشمنی کے باوجود، بالکل خاموش ہو گئے۔ انھوں نے اس کے خلاف احتجاج تک نہیں کیا۔ ایسا کیوں کر ہوا، سیرت اور تفسیر کی عام کتابوں میں اس کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ قاضی ابو بکر ابن عربی نے لکھا ہے کہ قریش اس لئے خاموش ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ اس معاملہ میں ان کی زبان بندی کر دی تھی۔ بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ کی مدد تھی مگر ان معنوں میں نہیں جن معنوں میں لفظ "معجزہ" عام طور

پر بولا جاتا ہے۔

معاہدہ کے الفاظ پر غور کرکے اس کی حقیقت سمجھی جا سکتی ہے۔ دوسری اکثر روایات کی طرح معاہدہ حدیبیہ کی شرائط بھی اکثر راویوں نے اپنے اپنے الفاظ میں بیان کی ہیں۔ مثال کے طور پر زیر بحث شرط کے متعلق مختلف روایتوں کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

من جاء منکم لم نردہ علیکم ومن جاءکم منا رددتموہ علینا

من اتی رسول اللہ من اصحابہ بغیر اذن ولیہ ردہ علیہ

من اتی محمدا من قریش بغیر اذن ولیہ ردہ علیہم

علی ان لا یاتیک منا رجل وان کان علی دینک الا رددتہ الینا

آخری روایت بخاری (کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد والمصالحہ) کی ہے اور با عتبار سند قوی ہونے کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ غالباً معاہدہ کی مذکورہ شرط کے اصل الفاظ یہی تھے۔ اگر یہ مان لیا جائے تو اس فقرہ میں رجل (مرد) کے لفظ نے مسلمانوں کو موقع دیا کہ وہ مکہ سے آئی ہوئی مسلم خواتین کو اس دفعہ سے مستثنیٰ قرار دے سکیں۔

معاہدہ کی یہ شرط مسلمانوں کی طرف سے نہ تھی، بلکہ مکہ والوں کی طرف سے تھی۔ ان کی جانب سے سہیل بن عمرو نے معاہدہ میں دفعہ کے یہ الفاظ لکھوائے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ دفعہ کے الفاظ لکھواتے وقت سہیل کے ذہن میں "کوئی شخص" کا مفہوم ہو جس میں عورت اور مرد دونوں شامل ہوتے ہیں۔ مگر اپنے اس ذہنی مفہوم کو لفظی شکل دیتے ہوئے اس کی زبان سے جو لفظ نکلا وہ "رجل" تھا جو عربی زبان میں صرف مرد کے لئے بولا جاتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ام کلثوم بنت عقبہ کے مدینہ پہنچنے کے بعد جب ان کے بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی بہن کی واپسی کا مطالبہ کیا، تو امام زہری کی روایت کے مطابق، آپ نے ان کو واپس دینے سے انکار کر دیا اور فرمایا:

کان الشرط فی الرجال دون النساء

شرط مردوں کے بارہ میں تھی نہ کہ عورتوں کے بارہ میں

(احکام القرآن لابن عربی، تفسیر رازی)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ سے پہلے تک خود قریش بھی غالباً اس غلط فہمی میں تھے کہ معاہدہ کی یہ دفعہ ہر طرح کے مہاجرین کے بارہ میں ہے۔ خواہ وہ مرد ہوں یا عورت۔ مگر جب آپ نے توجہ دلائی کہ معاہدہ میں رجل (مرد) کا لفظ لکھا ہوا ہے۔ تو انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا — اللہ تعالیٰ نے ایک لفظ کے ذریعہ مسلم خواتین کو ذلت کی واپسی سے بچا لیا۔

تاہم قریش کی اخلاقی بلندی کا اعتراف کرنا بھی ضروری ہے۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کے پاس صرف ایک لفظی دلیل تھی اور وہ دشمن ہوتے ہوئے اس کے آگے جھک گئے۔ حالاں کہ بحث وتاویل کا دروازہ اتنا وسیع ہے کہ نہ ماننے والے ذہن کو کسی مقام پر بھی جھکنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے زرخیز ذہن کو استعمال کرکے ہر بات کو اپنے مفید مطلب معنی پہنا سکتا ہے خواہ اس کے الفاظ کچھ بھی ہوں۔ کوئی دلیل اسی کے لئے دلیل ہے جو اس کے آگے جھکنے کے لئے تیار ہو۔ جو جھکنے کے لئے تیار نہ ہو، اس کے لئے کوئی دلیل دلیل نہیں۔

قریش اگر ہٹ دھرمی کرتے تب بھی خدا کی مدد آتی۔ ظالم کی تدبیریں مظلوموں کیلئے نصرت الٰہی کا دروازہ بند نہیں کرتیں الا یہ کہ مظلوم خود ہی اپنی بداعمالی سے نصرت کا استحقاق کھو دے۔

اسلام کیا ہے

اسلام کوئی نیا مذہب نہیں۔ یہ اسی مذہب کا زیادہ جامع اور صحیح ایڈیشن ہے جو خدا کے دوسرے رسول پچھلے زمانوں میں لے کر آتے رہے۔

انسان اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے تخلیق کا شاہکار ہے۔ مگر صلاحیتوں کے ظہور کے اعتبار سے انسان اس دنیا کی سب سے زیادہ ناکام مخلوق ہے۔ ایک درخت ہزار برس تک ہرا بھرا کھڑا رہتا ہے۔ مگر انسان سو سال سے بھی کم مدت میں مر جاتا ہے۔ خوشیوں اور لذتوں سے ہم سیر نہیں ہو پاتے کہ وہ اچانک ہمارا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ انسان جب اپنے علم، تجربہ اور پختگی کی آخری انتہا کو پہنچتا ہے تو اچانک اس کی موت آجاتی ہے۔

کیا انسانی زندگی ایک المیہ ہے۔ جواب یہ ہے کہ نہیں۔ علم الموت (THANATALOGY) اور سائیکیکل ریسرچ سے ثابت ہوا ہے کہ موت انسانی زندگی کا خاتمہ نہیں۔ مذہب اس دریافت کو مکمل کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ ہماری موجودہ زندگی، اصل منزل کی طرف محض ایک سفر ہے۔ انسانی زندگی کی مثال تودہ برف (ICE BERG) کی سی ہے۔ جس کا بہت تھوڑا حصہ اوپر نظر آتا ہے اور زیادہ حصہ سمندر کی گہرائیوں میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ موجودہ دنیا ہماری مدت حیات کا وہ مختصر حصہ ہے جس میں ہم اپنی اگلی طویل تر زندگی کے لئے تیاری کر رہے ہیں۔ ہماری زندگی کو ہمارے خالق نے دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک، پیدائش سے لے کر موت تک۔ دوسرا موت کے بعد۔ موجودہ دنیا ہماری صلاحیتوں کے ظہور کے لئے نامکمل ہے۔ وہ زوال اور فنا کے قانون سے بندھی ہوئی ہے۔ یہاں ہم اپنی امنگوں اور سرگرمیوں کو آخری حد تک پورا نہیں کر پاتے۔ اسی کے ساتھ دوسری چیز یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی ایسی کارفرما قوت نہیں جو بھلے اور برے کو اپنے اپنے دائرہ میں رکھے۔ جو اس بات کی نگرانی کرے کہ عزت اور سربلندی انھیں کو ملے جو واقعی اس کے حق دار ہیں اور وہ لوگ لازماً اس سے محروم رہیں جنھوں نے اپنے اندر اس کا واقعی استحقاق پیدا نہیں کیا ہے۔ زندگی کا اگلا مرحلہ انھیں کمیوں کی دائمی تلافی ہے۔

دنیا کی موجودہ صورت حال کی وجہ یہ ہے کہ خالق نے انسان کو یہاں آزادی اور اختیار دے رکھا ہے اور اپنے آپ کو عارضی طور پر غیب کے پردہ میں چھپا لیا ہے۔ جب تمام پیدا ہونے والے انسان پیدا ہو کر اپنے امتحان کی مدت پوری کر چکے ہوں گے تو زمین و آسمان کا قانون بدل دیا جائے گا۔ اور خدا اپنی طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہو جائے گا۔ اس کے بعد ایک ایسا عالم بنایا جائے گا جہاں موجودہ دنیا کی تمام کمیوں کو ختم کر کے اس کو ایک مکمل دنیا بنا دیا جائے گا اور انسان براہ راست خدا کے زیر حکم آجائے گا جس طرح آج بھی بقیہ دنیا براہ راست خدا کے زیر حکم ہے۔ بائبل کے الفاظ میں انسانی بادشاہت ختم ہو کر "آسمانی بادشاہت" شروع ہو گی۔ اس کے بعد انسان اپنی تمناؤں کی دنیا میں اپنی زندگی شروع کرے گا اور وہ سب کچھ مزید اضافہ کے ساتھ پالے گا جس کا آج وہ صرف خواب دیکھ سکتا ہے۔ مگر اس جنتی زندگی میں صرف انھیں لوگوں کو حصہ ملے گا جنھوں نے اپنی موجودہ زندگی میں اس کی تیاری کی ہو۔

جنھوں نے غفلت یا سرکشی میں موجودہ مواقع کو کھو دیا ہو ان کے لئے اس اگلی زندگی میں بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

انسان کے سوا جو کائنات ہے، وہ آج بھی ہر قسم کے نقص سے خالی ہے۔ انسانی بستیوں سے دور فطرت کی دنیا کتنی حسین ہے۔ صبح کے وقت جب پہاڑوں اور درختوں کے اوپر سورج اپنی سنہری کرنیں پھیلاتا ہے اور چڑیوں کے چہچہے کے ساتھ نئے دن کا آغاز ہوتا ہے تو ایسا بے پناہ منظر ہوتا ہے کہ دیکھنے والا چاہنے لگتا ہے کہ خود بھی اس آفاقی حسن کے اندر جذب ہو جائے۔ زمین کے سبزہ زاروں سے لے کر آسمان کے جگمگاتے ہوئے ستاروں تک کی یہ دنیا براہ راست خدا کے زیر حکم ہے۔ یہ کثافت (POLLUTION) اور بدعنوانی (CORRUPTION) سے پاک ہو کر اپنا عمل کر رہی ہے۔ اس کے برعکس انسانی دنیا میں عارضی طور پر انسان کو اختیار ملا ہوا ہے۔ اس اختیار اور آزادی نے انسانی دنیا کو جہنم کدہ بنا دیا ہے۔ جب اس صورت حال کو ختم کر کے انسانی دنیا میں بھی خدائی اقتدار قائم ہو جائے گا تو یہاں بھی اسی طرح ایک حسین دنیا وجود میں آجائے گی جس کا مشاہدہ ہم اپنے سے باہر کی دنیا میں کر رہے ہیں۔

جس طرح انڈے کے بظاہر سادہ خول کے اندر ایک مکمل زندگی کا امکان چھپا ہوا ہوتا ہے اور یہ امکان اتنا قوی ہوتا ہے کہ حالات کی مساعدت پاتے ہی خول توڑ کر باہر آجاتا ہے۔ اسی طرح ہماری موجودہ دنیا کے اندر ایک اور زیادہ مکمل دنیا کا امکان چھپا ہوا ہے۔ جب وقت آئے گا تو یہ امکان اپنے تمام ظاہری پردوں کو پھاڑ کر ظاہر ہو جائے گا۔

"دنیا کے اندر دوسری دنیا کا چھپا ہونا" ایک ایسی حقیقت ہے جو آج کے انسان کے لئے جانی بوجھی چیز بن چکی ہے۔ آج جب ہم ریڈیو یا ٹیلی وژن کھولتے ہیں تو اچانک ہم دریافت کرتے ہیں کہ ہمارے گرد و پیش ایک ایسی دنیا موجود تھی جس سے ہم اپنا سیٹ کھولنے سے پہلے بالکل بے خبر تھے۔ جدید سائنسی انقلاب نے ثابت کیا ہے کہ ہماری دنیا کے اندر ایک اور، زیادہ مکمل دنیا، چھپی ہوئی تھی، مگر انسان صرف سو برس پہلے تک اس امکان سے قطعاً بے خبر تھا۔ انسان اس زمین پر نامعلوم مدت سے آباد ہے اور تقریباً ۵ ہزار برس کے واقعات تو کسی نہ کسی درجہ میں تاریخی ریکارڈ میں آچکے ہیں۔ مگر اس طویل ترین تاریخ میں انسان کی واقفیت صرف ان ذرائع حیات تک محدود تھی جو ظاہری طور پر اس کو اپنی آنکھوں سے دکھائی دے رہے تھے۔ اب سے چند سو برس پہلے اگر کوئی شخص یہ کہتا کہ بیسویں صدی میں ہماری موجودہ دنیا ایک بالکل مختلف قسم کی دنیا میں تبدیل ہو جائے گی جہاں منصوبہ بند شہر ہوں گے۔ بٹن دبانے سے مکانات روشن ہو جایا کریں گے۔ انسان ہوا میں اڑے گا۔ وہ ریڈیائی لہروں کے ذریعہ خلائی راکٹوں کو کنٹرول کرے گا۔ انسان کی آواز ایک سکنڈ سے بھی کم عرصہ میں پورے کرۂ ارض کا چکر لگا لے گی۔ زمین کے کسی بھی حصہ میں رہنے والا ایک آدمی کسی بھی دوسرے حصہ کے ایک آدمی سے اس طرح بات کرے گا جیسے دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہوں۔ انسان کی ہو بہو تصویریں اتاری جائیں گی اور وہ چاند اور دوسرے سیاروں کا سفر کرے گا۔ وغیرہ وغیرہ تو اس قسم کی باتیں لوگوں کو جادو اور طلسم کی باتیں معلوم ہوتیں۔ مگر آج ہماری سابقہ دنیا کے اندر سے یہ دوسری دنیا نکل کر ہماری آنکھوں کے سامنے آچکی ہے۔

یہ ہے انسانی زندگی کی اصل حقیقت۔ اس حقیقت سے انسان کو باخبر کرنے کے لئے خالق نے پہلا انتظام

یہ کیا کہ خود انسان کے اندر پیدائشی طور پر ایک برتر زندگی کا تصور رکھ دیا تاکہ وہ اپنی اندرونی طلب کے تحت اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتا رہے۔ ساری انسانی تاریخ بتاتی ہے کہ ایک برتر زندگی کا خواب انسان کے اندرون میں اس طرح پیوست ہے کہ وہ کسی طرح اس کو نکال نہیں سکتا۔

اس برتر زندگی کو انسان کس طرح پا سکتا ہے، اس کو بتانے کے لئے خالق نے یہ انتظام کیا کہ رسالت کا سلسلہ جاری فرمایا۔ ابوالبشر آدم نہ صرف پہلے انسان تھے بلکہ خدا کے رسول بھی تھے جن کو خدا نے شعوری طور پر اپنی مرضی کا علم دیا تھا۔ اس کے بعد نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ، اور دوسرے ہزاروں پیغمبر ہر ملک میں اور ہر بستی میں آئے اور ہر زمانہ میں انسان کو زندگی کی حقیقت بتاتے رہے اور اس واقعہ سے آگاہ کرتے رہے کہ یہ کائنات کس خاص منصوبہ کے تحت بنائی گئی ہے اور بالآخر اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ مگر ان پیغمبروں کے ذریعہ جو خدائی تعلیم انسان کے پاس بھیجی گئی، اس کو انسان بار بار ضائع کرتا رہا۔ یا تو اصل آسمانی متن ہی گم ہو گیا یا اس میں انسانی کلام اس طرح مل گیا کہ یہ معلوم کرنا ممکن نہ رہا کہ کون سا حصہ خدائی کلام کا ہے اور کون سا وہ ہے جو انسان کے ہاتھوں اضافہ ہوا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آیا جب انسانیت دور تاریخ میں پہنچ گئی۔ اس وقت خدا نے پیغمبر عربی حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آخری کتاب بھیجی اور اپنی خصوصی مدد سے دوسرے تمام ادیان کو زیر کر کے اس کتاب کی بنیاد پر ایک طاقت ور سلطنت قائم کر دی جو ایک ہزار سال تک پوری شان کے ساتھ چلتی رہی اور خدا کی آخری کتاب کی حفاظت کرتی رہی۔ اس کے بعد وہ وقت آیا جب انسانی تاریخ ایک قدم اور آگے بڑھی اور پریس کے دور میں داخل ہو گئی۔ پہلے قرآن کا ہر نسخہ الگ الگ ہاتھ سے لکھا جاتا تھا۔ اب یہ ممکن ہو گیا کہ ایک صحیح نسخہ لکھ کر اس سے کروروں نسخے چھاپ لئے جائیں۔ اس طرح قرآن میں کسی قسم کی تبدیلی کا امکان ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

عرب کے پیغمبر جو دین خدا کی طرف سے لائے، اس کی حیثیت کسی نئے دین کی نہیں۔ یہ ٹھیک وہی دین ہے جس کو پچھلے نبیوں نے اپنے اپنے زمانہ میں پیش کیا تھا۔ قرآن کی حیثیت صرف یہ ہے کہ وہ پچھلی آسمانی تعلیمات کا مستند اڈیشن ہے۔ پیغمبر عربی نے خدا کے دین کو تاریخ کی حیثیت دے دی ہے، جب کہ اس سے پہلے خدا کا دین محض افسانوی روایات کے مجموعہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسی طرح پچھلے صحیفوں میں ترجمہ یا الحاق کے ذریعہ جو غلطیاں داخل ہو گئی تھیں ان کی اصلاح کی اور اس میں تکمیلی احکام کا اضافہ کر کے اس کو ایسا جامع صحیفہ بنا دیا جو قیامت تک انسان کی ضرورت پوری کرتا رہے۔ اسرائیلی انبیاء کے ذریعہ خدا نے پہلے ہی فرما دیا تھا کہ بعد کے زمانہ میں میں نیا عہد باندھوں گا جو میرا "ابدی عہد" ہو گا۔ (یوحنا - ۱۴: ۱۶) موجودہ بائبل میں انجیل کو "نیا عہد نامہ" کہا جاتا ہے۔ مگر خدا کا نیا عہد نامہ حقیقۃً قرآن ہے۔ انجیل تو صرف اس نئے عہد نامہ کی بشارت تھی نہ کہ خود نیا عہد نامہ تھی۔ ☆

> اسلام کائنات کا دین ہے، وہ ہر انسان کے دل کی آواز ہے۔ وہ خدائی تعلیمات کا مستند اڈیشن ہے

جس میدان میں چیلنج درپیش ہو اسی میدان میں باطل کو شکست دینا ہے

پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عرب میں ایک مشہور پہلوان تھا۔ اس کا نام رُکانہ تھا۔ ایک روز ایسا ہوا کہ آپ مکہ کی گھاٹی سے گزر رہے تھے۔ وہاں رُکانہ مل گیا۔ آپ لوگوں کی اصلاح وہدایت کے انتہائی حریص تھے۔ جب بھی کوئی شخص ملتا، آپ چاہتے کہ کسی نہ کسی طرح اس کے سامنے اللہ کی بات پیش کردیں۔ آپ نے بڑھ کر رکانہ سے ملاقات کی اور اس کے سامنے اللہ کا دین پیش کیا۔ اور کہا کہ اگر نجات اور کامیابی چاہتے ہو تو اس راستہ کو اختیار کرلو۔

رکانہ بولا: "محمد! اگر یہ ثابت ہو جائے کہ آپ حق پر ہیں تو میں آپ کی بات مان لوں گا" وہ پہلوان آدمی تھا۔ اس کے نزدیک سب سے بڑی دلیل جسمانی طاقت تھی۔ آپ نے اس کے اپنے ذہن کے مطابق اس کو جواب دیا: "اگر میں کشتی میں تمھیں زیر کردوں تو کیا تم میری بات مان لوگے"۔ اس نے کہا ہاں۔

دونوں میں کشتی ہوئی۔ پیغمبر اسلام نے رکانہ کو پٹک دیا۔ رکانہ کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ محمد اگر سچے بھی ہوں تو وہ زیادہ سے زیادہ روحانی آدمی ہوں گے۔ ان کو جسمانی طاقت سے کیا تعلق۔ اس نے سمجھا کہ شاید کسی اتفاقی سبب سے وہ کامیاب ہوگئے ہیں۔ اس لئے وہ دوبارہ کھڑا ہوگیا۔ اور بولا: "ایک بار اور لڑوں گا"۔ پیغمبر اسلام دوبارہ اس سے لڑے اور پھر اس کو پٹک دیا۔ اب اسے یقین ہوگیا کہ میں محمدؐ سے جیت نہیں سکتا۔ آپ نے اس کو وعدہ یاد دلایا۔ مگر وہ اپنے وعدہ سے پھر گیا اور یہ کہتا ہوا چلا گیا: "تم جادوگر ہو، بڑے جادوگر"۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ باطل کی طرف سے حق کو جو چیلنج درپیش ہو، اہل حق کو ٹھیک اسی میدان میں اہل باطل کو شکست دینی چاہئے۔ اس کے بغیر حق کی طرف سے حجت کا اتمام نہیں ہوسکتا۔ اس معاملہ میں اہل حق کی تیاری اتنی اعلیٰ معیار کی ہونی چاہئے کہ اہل باطل کسی حال میں ان پر غالب نہ آسکیں۔ حتیٰ کہ اگر تعصب اور ہٹ دھرمی کسی کے لئے قبول حق میں رکاوٹ بن جائے تب بھی یہ کہہ کر وہ حق کی برتری کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو:

"یہ تو جادو ہے جادو"۔ ☐

"سادھارن گنوں سے اسادھارن منش بنتے ہیں" یہ ہندی کی ایک سوکتی ہے عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بڑا انسان بننے کے لئے کوئی بڑا واقعہ چاہئے جو اس کو اخبار کی شاہ سرخی میں جگہ دے سکے۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اکثر معمولی باتوں میں غیر معمولی انسان بننے کا راز چھپا ہوتا ہے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس راز کو جانتے ہوں

مثبت کام کی ضرورت ہے

فرانسیسی ناول نگار وکٹر ہیوگو (۱۸۰۲-۱۸۸۵) نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ایک کتاب لکھی ہے۔ یہ کتاب نہایت مہمل ہے اور زہر سے بھری ہوئی ہے۔ ایک ناول نگار کو کیا ضرورت پیش آئی کہ وہ پیغمبر اسلام کی سیرت پر اس قسم کی کتاب لکھے۔ اس کا جواب وکٹر ہیوگو کے حالات زندگی سے ملتا ہے۔

وکٹر ہیوگو کے زمانہ میں الجزائر پر فرانس نے قبضہ کر لیا تھا اور سیاسی لیڈروں کی تقریروں کی وجہ سے وہاں کے عام لوگوں میں فرانس کے خلاف سخت نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ ایک روز ایسا ہوا کہ وکٹر ہیوگو کسی ہوٹل میں گیا۔ وہاں ایک الجزائری مسلمان بھی تھا۔ کسی بات پر دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔ وکٹر ہیوگو نے مسلمان کو مارنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ مگر الجزائری مسلمان پہلے ہی اس کے اوپر جھپٹ پڑا اور اس کی خوب پٹائی کی۔ اس موقع پر وہاں کچھ اور بھی الجزائری مسلمان موجود تھے۔ ایک فرانسیسی کے پٹ جانے پر وہ خوب خوش ہوئے اور تالیاں بجائیں۔ وکٹر ہیوگو نے کہا "اب تو میں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ مگر جلد ہی میں ایک ایسا کام کروں گا جو نہ صرف تم سے بلکہ تمہاری نسلوں تک سے اس کا انتقام لے لے"

اس جھگڑے کے پانچ ماہ بعد وہ کتاب منظر عام پر آئی جس کے ایک ایک فقرے میں پیغمبر اسلام کے خلاف زہر بھرا ہوا ہے۔

پاکستان کے سفیر برائے فرانس قدرت اللہ شہاب نے اس کتاب کی تردید میں ایک کتاب شائع کی ہے — مسلمان "معاندین اسلام" کے خلاف جوابی کتاب لکھنے کے لئے تو بہت شوق کے ساتھ تیار ہو جاتا ہے۔ مگر خود اپنے اندر وہ حالات پیدا نہیں کرتا جس کو دیکھ کر معاندین اسلام کی غلط فہمیاں دور ہوں اور خدا کے دین سے متوحش ہونے والے خدا کے دین کے قریب آنے لگیں۔

"استعمار کے خلاف پچھلی صدیوں میں جو سیاسی ہنگامے کئے گئے ہیں ان سے اسلام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، البتہ یہ بہت بڑا نقصان ہوا کہ دوسری قوموں کے لئے اسلام پر غور و فکر کا ماحول ختم ہو گیا۔ مغربی قومیں ہمارے لئے دعوت کا موضوع بننے کے بجائے نفرت کا موضوع بن گئیں۔ مغرب کے لوگوں کو ہم نے اس نظر سے نہیں دیکھا کہ خدا کے یہ بندے ہمارے لئے مدعو کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہماری ذمہ داری ہے کہ ان کو خدا کا پیغام پہنچائیں۔ اس کے برعکس ہم سمجھنے لگے کہ یہ بدترین مخلوق ہیں۔ انھیں ذلیل کرنا اور ان سے دور رہنا ہی تقدس کی بہترین نشانی ہے۔ مولانا مملوک علی کو اپنی ملازمت کی وجہ سے کبھی کبھی انگریز سے مصافحہ کرنا پڑتا تھا۔ مگر اس کے فوراً بعد وہ غسل خانہ میں جا کر ہاتھ دھوتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انگریز کو چھونے کی وجہ سے ان کا ہاتھ نجس ہو گیا ہے

دوسروں کے مقابلہ میں آپ کو کوئی بڑائی یا عزت مل جائے، تو دوسروں کو حقیر نہ سمجھئے۔ کیوں کہ بڑے اور چھوٹے دونوں بالآخر برابر ہو جانے والے ہیں۔ اس کے بعد بڑائی اسی کے لئے ہوگی جس کو خدا بڑا بنائے۔ اور چھوٹا وہ ہوگا جو خدا کے نزدیک چھوٹا قرار پائے۔

> نفرت کے جواب میں نفرت پیدا ہوتی ہے اور محبت کے جواب میں محبت۔ اسی لئے اسلام نے یہ طریقہ سکھایا ہے کہ کسی کو غلطی کرتے دیکھو تو اس کو حکمت و محبت کے ساتھ سمجھاؤ جس طرح ایک باپ اپنے بیٹے کو سمجھاتا ہے

عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ میں فجر کی جماعت میں اس لئے پیچھے رہ جاتا ہوں کہ فلاں صاحب ہماری مسجد میں نماز پڑھاتے ہیں اور وہ اس کو بہت لمبا کر دیتے ہیں۔ آپ یہ سن کر غضبناک ہوگئے۔ حتیٰ کہ اس سے زیادہ غضبناک میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر آپ نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

یا ایہا الناس ان منکم منفرین، فمن ام منکم الناس فلیتجوز، فان خلفہ الضعیف والکبیر و ذالحاجۃ (بخاری)

لوگو، تم میں کچھ ایسے ہیں جو لوگوں کو دین سے دور کر دیتے ہیں۔ تم میں سے جو شخص لوگوں کی امامت کرے، اس کو چاہئے کہ مختصر نماز پڑھائے، کیونکہ اس کے پیچھے کوئی کمزور ہے، کوئی بوڑھا، کوئی ضرورت مند۔

حضرت جابرؓ ایک روایت میں بتاتے ہیں کہ معاذ بن جبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کی مسجد میں نماز پڑھتے تھے، یہاں سے واپس ہو کر جاتے اور اپنے محلہ والوں کی امامت کرتے۔ ایک دن انھوں نے عشاء کی نماز پڑھائی اور اس میں سورۂ بقرہ پڑھی۔ ایک آدمی لمبی قرأت سے گھبرا کر نماز سے الگ ہوگیا۔ اس کے بعد حضرت معاذ اس سے کھنچے کھنچے رہنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ نے اس آدمی کو کچھ نہیں کہا۔ البتہ حضرت معاذ کی بابت فرمایا: فتان، فتان، فتان (فتنہ انگیز، فتنہ انگیز، فتنہ انگیز) بخاری

اس سلسلے کا سب سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ وہ ہے جبکہ ایک دیہاتی شخص آیا اور مسجد نبوی میں پیشاب کرنے لگا۔ لوگ اس کی طرف دوڑے تو آپ نے لوگوں کو روکا۔ جب وہ پیشاب سے فارغ ہوچکا تو آپ نے گندگی کی صفائی کرائی اور صحابہ سے فرمایا:

انما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین (بخاری)

تم آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو سختی کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے۔

قدیم زمانہ میں کعبہ کی عمارت ایک بار بارش کی زیادتی سے گرگئی تھی۔ قریش نے دوبارہ بنایا تو سامان کی کمی کی وجہ سے اصل بنائے ابراہیمی پر نہیں بنایا، بلکہ چھوٹا کرکے بنایا۔ آپ چاہتے تھے کہ اس کو دوبارہ بنائے ابراہیم کے مطابق بنوادیں مگر اس اندیشہ سے کہ کعبہ کی عمارت کے ساتھ جو تقدس شامل ہے اس کی وجہ سے لوگ شاید اس کے انہدام کا تحمل نہ کرسکیں، آپ اس سے باز رہے۔ آپ نے ایک بار حضرت عائشہ سے فرمایا:

لولا حداثۃ قومک بالکفر لنقضت البیت ثم لبنیتہ علی اساس ابراھیم

اگر تمہاری قوم نئی نئی کفر سے نہ نکلی ہوتی تو میں بیت اللہ کو توڑ کر پھر سے ابراہیم کی بنیاد کے مطابق بنا دیتا۔

جس اسلام میں انسان کی رعایت کا یہ حال تھا، اسی اسلام کے علم بردار آج انسان کو متنفر کرنے ہی کا نام اسلام سمجھتے ہیں۔

تعارف و تبصرہ

تاریخ میو چھتری۔ مجلد
از مولانا حکیم عبدالشکور مرحوم
صفحات ۴۱۶، (قیمت درج نہیں)
پتہ: چودھری یٰسین میو ہائی اسکول، نوح، ضلع گوڑگانوں

کتاب کے مصنف مولانا حکیم عبدالشکور صاحب مرحوم (۱۸۷۹ - ۱۹۶۱) نے اپنے مقدمہ میں اس کی تالیف کا مقصد پس ماندہ میو قوم کو بیدار کرنا بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"میرا یقین ہے کہ وہ قوم جو تاثرات اور انقلابات کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہو جاتی ہے، وہ ضرور ایک نہ ایک دن فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے۔ کسی قوم کا مستقبل اس وقت تک شان دار نہیں ہو سکتا جب تک اس کے شان دار ماضی کا نقشہ اس کے سامنے نہ ہو" صفحہ ۶

مصنف نے میوات اور میو قوم کے بارے میں معلومات جمع کرنے کے لئے جو غیر معمولی محنت کی ہے، وہ یقیناً ان کے اخلاص کا ثبوت ہے۔ انھوں نے "پیدائش انسان" کے مسئلہ سے اپنی تحقیق کا آغاز کیا ہے۔ پھر انھوں نے دکھایا ہے کہ "آریہ اقوام عربی الاصل اور آل ابراہیم ہیں" اور یہ کہ "حضرت ابراہیم اور برہما جی دونوں ایک ہیں" اس طرح کی باتیں نہ صرف متنازعہ فیہ ہیں بلکہ کتاب کے موضوع سے خارج بھی ہیں۔ تاہم بحیثیت مجموعی کتاب اپنے موضوع پر قابل قدر ہے۔ جغرافیہ میوات، میو سماج، میواتی زبان و ادب، میوات کے آثار قدیمہ، میووں کے گوت پال، وغیرہ پر ان کی تحقیقات ان لوگوں کے لئے کافی دلچسپی کا باعث ہیں جو میووں کے بارے میں جاننے کا شوق رکھتے ہوں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جو معلومات جمع کی ہیں، وہ بلاشبہ اس قابل ہیں کہ ان کی داد دی جائے۔

تاریخی حیثیت سے کتاب کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے مقصد تالیف کی حیثیت سے اس کی افادیت کو سمجھنا تبصرہ نگار کے لئے مشکل ہے۔ مؤلف کتاب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ میو قوم کو اس کا "شاندار ماضی" یاد دلا کر اس کے اندر مستقبل کی تعمیر کا جوش و خروش پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ میووں کا وہ شان دار ماضی کیا ہے جس کو یاد دلا کر آپ یہ مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں:

وہ شان دار ماضی یہ ہے کہ ان کے آبا و اجداد اول روز سے راجاؤں اور حکمرانوں سے جنگ کرتے رہے اور اس بے معنی تصادم کے نتیجہ میں مسلسل برباد ہوتے رہے۔ اس قسم کی تاریخی خوراک اس کے سوا اور کیا کر سکتی ہے کہ قوم کے اندر جنگ جوئی کا ذہن باقی رکھے اور دوبارہ جب اس کے سامنے کوئی ناخوش گوار صورت آئے تو پھر وہ یہی کرے کہ حقیقت پسندانہ انداز سے نمٹنے کے بجائے لڑنے بھڑنے کے لئے تیار ہو جائے۔

مؤلف کتاب نے صفحہ ۱۳۷ پر "میو قوم کی معرکہ آرائیوں" کا عنوان قائم کیا ہے اور ان معرکہ آرائیوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے جو پچھلے تقریباً ایک ہزار برس سے یہ پس ماندہ قوم جاری رکھے ہوئے ہے۔

میو قوم پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں مسلمان ہوئی۔ اس سے پہلے بھی یہ قوم لڑائی بھڑائی اور لوٹ مار کے لئے مشہور تھی۔ اس کا یہ کردار اسلام کے بعد بھی قائم رہا۔ شہاب الدین غوری، پرتھوی راج چوہان، قطب الدین ایبک، ناصرالدین محمود، غیاث الدین بلبن، بابر، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، ہر ایک سے اس کا ٹکراؤ جاری رہا۔ بھرت پور اور الور کے راجاؤں سے وہ مڈبھیڑ کرتی رہی۔ اس کے بعد انگریزوں کا دور آیا تو اس زمانہ میں بھی میووں

کی بغاوت اور سرکشی کی وجہ سے انگریزوں سے ان کی لڑائیاں جاری رہیں۔ آخر میں میوؤں کے چودھری محمد حسین خاں (۱۸۹۶ - ۱۹۷۰) کے اس کارنامہ کو بھی مؤلف کتاب نے اہتمام کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ان کی "تحریک الور" نے مہاراجہ سوائی جے سنگھ آف الور کو ریاست کے اقتدار سے محروم کر دیا تھا!

مگر سوال یہ ہے کہ لڑائی بھڑائی کے ان ہزار سالہ شاندار کارناموں سے میو قوم کو کیا ملا ——— جہالت، بدنظمی، معاشی تباہی، ویران بستیاں، حقیقت پسندانہ فکر سے محرومی، اس قسم کے منفی نتائج کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے جو اس کی لمبی فہرست میں شامل کی جاسکتی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ میو قوم کو آج ایسی تاریخ میوات کی ضرورت ہے جو ان کے ماضی کا تنقیدی جائزہ لے، نہ کہ انھیں "شاندار قومی کارنامہ" قرار دے کر دوبارہ ان کے اندر وہی مزاج پیدا کر دے جس نے ماضی میں ان کو کچھ نہیں دیا اور نہ آئندہ انھیں اس طرح کچھ مل سکتا ہے۔

وہ شہر کی ایک پُر رونق سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ لوگ پیدل اور سواریوں پر ادھر سے اُدھر جاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

"یہ نازک چہرے، یہ خوب صورت جسم، یہ ہنستی ہوئی مورتیں مرنے کے بعد بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈال دی جائیں گی۔" یہ سوچ کر بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اور پھر ایک آہ کے ساتھ اس کی زبان سے وہ الفاظ نکلے جن کو انسانوں کے سوا پوری کائنات نے سنا: "کیا اس سے بڑی کوئی بات ہے جس کے لئے آدمی تڑپے، کیا اس سے بڑی کوئی خبر ہے جس کو بتانے والے دوسروں کو بتائیں۔"

کیسی عجیب بات ہے۔ آدمی اُسی بات سے بے خبر ہے جس کو اسے سب سے زیادہ جاننا چاہئے۔ اُسی خبر کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے کوئی نہیں اٹھتا جس کو سب سے زیادہ دوسروں تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔

اپنے معاملہ میں ہوشیار

دوسرے کے معاملہ میں بیوقوف

یوگنڈا کے صدر عیدی امین نے وزیر اعظم مرار جی ڈیسائی کو مبارک باد کا خط بھیجا ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی کے نام بھی ایک خط روانہ کیا ہے جس میں اس بات کا شکریہ ادا کیا ہے کہ ان کی حکومت نے ہندوستان اور یوگنڈا کے درمیان اچھے تعلقات قائم رکھے۔

صدر عیدی امین نے اندرا گاندھی کے نام اپنے خط میں لکھا ہے:

I personally support those who have described you as a very intelligent leader, because soon after accepting defeat you and your government lifted at the right time the 21 month state of emergency imposed by yourself and which brought imprisonment without trial. This timely decision by yourself and your government to lift the emergency relieved our minds because it would have been possible for the same emergency regulations to be used against those who have now lost power.

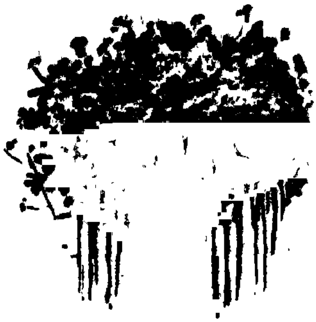
Hindustan Times, March 30, 77

"میں ذاتی طور پر ان لوگوں سے اتفاق کرتا ہوں جن کی رائے یہ ہے کہ آپ نہایت ذہین لیڈر ہیں۔ کیونکہ اپنی شکست تسلیم کرنے کے فوراً بعد آپ نے اور آپ کی حکومت نے نہایت صحیح وقت پر اکیس ماہ کی ایمرجنسی کو ختم کر دیا جس کو آپ نے نافذ کیا تھا اور جس کے تحت لوگوں کو بغیر عدالتی کارروائی کے قید کیا جا سکتا تھا۔ ایمرجنسی کو ختم کرنے کے بارے میں آپ اور آپ کی حکومت کے اس بروقت اقدام کے بعد ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ کیونکہ یہ ممکن تھا کہ اسی ایمرجنسی کے قوانین کو نئی حکومت ان لوگوں کے اوپر استعمال کرے جنھوں نے اب اقتدار کھو دیا ہے۔"

اندرا حکومت سے الیکشن کا نتیجہ سامنے آنے سے پہلے ایمرجنسی ہٹانے کے لئے کہا جاتا تھا تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایمرجنسی کے جاری رہنے سے کسی کا کیا نقصان ہے۔ مگر ۲۰ مارچ کی شب کو جب الیکشن کے نتائج کا اعلان ہوا تو اس حکومت کو ایمرجنسی کی حقیقت سمجھنے میں ایک منٹ کی دیر نہیں لگی۔ اس نے راتوں رات میٹنگ کر کے ایمرجنسی کے مکمل خاتمہ کا اعلان کر دیا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے معاملہ میں آدمی کتنا ہوشیار ہوتا ہے اور دوسرے کے معاملہ میں کتنا بے وقوف۔ آج کی دنیا میں جس شخص کا بھی تجربہ کیجئے، تقریباً بلا استثناء آپ پائیں گے کہ وہ اپنے موافق پہلو کو سمجھنے کے لئے انتہائی ذہین ہے۔ اس کے برعکس جب معاملہ دوسرے کے موافق پہلو کو سمجھنے کا ہو تو وہ ایسا بے وقوف بن جاتا ہے، جیسے اس کو کچھ آتا ہی نہیں۔ جیسے کہ وہ اینٹ پتھر ہے نہ کہ انسان۔

ہوشیاری کی یہ قسم آدمی کے اوپر بہت بڑا وبال ہے۔ ایسا کر کے دراصل وہ حاکم حقیقی کے آگے اپنے خلاف خود حجت قائم کر رہا ہے۔ اگر آدمی اپنی باتوں میں بھی بے وقوفی ظاہر کرتا تو شاید وہ خدا کی پکڑ سے بچ جاتا۔ مگر اپنی باتوں میں ہوشیاری اور دوسرے کی باتوں میں بے وقوفی اس کو خدا کی پکڑ سے بچا نہ سکے گی۔ کیونکہ اپنی باتوں میں ہوشیاری دکھا کر وہ ثابت کر چکا ہے کہ دوسرے کی باتوں میں بھی وہ اتنا ہی ذہین اور ہوشیار ہو سکتا تھا۔



دیکھئے کہ
آپ کون سا درخت
اگا رہے ہیں

دنیا کا نظام اللہ تعالیٰ نے محکم قوانین کے تحت بنایا ہے اور اس کا فیصلہ ہے کہ وہ ان قوانین میں کسی قسم کی تبدیلی قبول نہیں کرے گا۔ (فاطر-۴۳)

انھیں قوانین الٰہی میں سے ایک قانون یہ ہے کہ اس نے مقرر کر دیا ہے کہ جو لوگ سطحی نعروں اور جذباتی تقریروں پر اپنی قوم کو اٹھائیں گے، ان کی قومی زندگی برساتی جھاڑ جھنکاڑ کی طرح ہوگی۔ وقتی طور پر تو وہ بہت نمایاں دکھائی دیں گے۔ مگر ان کے اندر کوئی پائداری نہیں ہوگی۔ فاتحانہ نعروں پر اٹھنے والے لوگوں کے حصہ میں بالآخر صرف یہ فریاد آئے گی کہ "فلاں نے میرے درخت کو اکھاڑ دیا ہے"۔

اس کے برعکس جو لوگ گہری جڑوں اور دور رس منصوبوں پر اپنی قومی تعمیر کریں گے، ان کو مضبوط درختوں کی سی پائداری حاصل ہوگی، جس کو کوئی اکھاڑ نہیں سکتا اور جو صدیوں تک انسانیت کو اپنا سایہ اور پھل دیتے رہتے ہیں۔

(ابراہیم ؛ ۲۴-۲۷)

اگر آپ دنیا میں کوئی حقیقی مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے حقیقی بنیادوں پر اپنی تعمیر کی منصوبہ بندی کیجئے۔ اس صحیح مقام کو دریافت کیجئے جہاں سے صحیح اور پائدار جدوجہد کا آغاز ہوتا ہے۔ اگر آپ نے اپنے آغاز کو پالیا تو آپ اپنے اختتام کو بھی پالیں گے، کیونکہ صحیح آغاز ہی کا دوسرا نام صحیح اختتام ہے۔

فضائی جاسوسی میں جو ہوائی جہاز استعمال ہوتے ہیں ان میں بہت نازک قسم کے کیمرے لگے رہتے ہیں۔ انتہائی بلندی پر اڑان کرنے کے باوجود ان کی تصویریں اتنی مکمل ہوتی ہیں کہ آدمی کے چہرے پر جذبات کا اتار چڑھاؤ تک دیکھا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ آواز سے تیز رفتار ہوائی جہاز عموماً دشمن کا نشانہ بننے سے بچ جاتے ہیں۔ اپنی آواز سے آگے پرواز کرنے کی وجہ سے ان کا پتہ زمین پر کھڑے ہوئے لوگوں کو اس وقت ملتا ہے جبکہ ہوائی جہاز ان کے اوپر سے گزر کر بہت دور پہنچ گیا ہو —— گویا زندگی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ اپنا سفر اس طرح طے کریں کہ آپ کا حریف آپ کی کارگزاریوں سے صرف اس وقت واقف ہو جب کہ آپ اپنا کام پورا کر چکے ہوں۔

ایک نفسیاتی کمزوری جو شک اور انکار میں مبتلا کر دیتی ہے

قرآن میں یہود کا کردار بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ نبی آخر الزماں کے ظہور سے پہلے وہ آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ حق کے مخالفین کا غلبہ دیکھ کر کہتے تھے کہ افسوس اہل حق کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں۔ دعا کرتے تھے کہ خدایا، دورِ آخر میں جو مصلح اعظم آنے والا ہے، اس کو بھیج دے تاکہ اس کے ذریعہ سے اہل حق کو طاقت ملے اور دنیا میں دوبارہ تیرے سچے دین کا بول بالا ہو۔ مگر جب نبی عربی کی شکل میں وہ مصلح اعظم آیا تو انھوں نے آپ کا انکار کر دیا۔ حتیٰ کہ آپ کے مخالف ہو کر آپ کے دشمنوں سے جا ملے۔ (بقرہ ـ ۸۹)

ابن اسحاق نے ابن عباس کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ غزوۂ احزاب سے پہلے قریش، غطفان، بنو قریظہ، بنو نضیر نے آپ کے خلاف محاذ قائم کر لیا تھا۔ اس سلسلے میں قریش کو ابھارنے کے لئے یہود مدینہ کے سرداروں کا ایک وفد مکہ پہنچا۔ اس میں حیی بن اخطب، سلام بن ابی حقیق، ابو رافع، ربیع بن ابی حقیق، ابو عمارہ، ہودہ بن قیس شامل تھے۔ یہ سب لوگ بنو نضیر سے تعلق رکھتے تھے۔ جب وہ مکہ پہنچے تو قریش نے کہا: ھؤلاء احبار الیھود و اھل العلم بالکتاب الاولیٰ فاسئلوھم ادیننا خیر ام دین محمد (یہ یہود کے علماء ہیں اور قدیم آسمانی کتابوں کے جاننے والے ہیں ان سے پوچھو کہ ہمارا دین بہتر ہے یا محمد کا دین)۔ علماء یہود نے اس سوال کے جواب میں کہا: دینکم خیر من دینہ وانتم اھدیٰ منہ وممن تبعہ

تمہارا دین ان کے دین سے بہتر ہے اور تم ان سے اور ان کے پیروؤں سے زیادہ ہدایت یاب ہو (نساء ـ ۵۱)

بغوی نے لکھا ہے کہ جب ابوسفیان نے کعب سے اس کی بابت پوچھا۔ تو کعب نے کہا کہ مجھ سے اپنا دین بیان کرو۔ ابوسفیان نے کہا:

نحن ننحر للحجیج الکوماء ونسقیھم الماء ونقری الضیف ونفک العانی ونصل الرحم ونعمر بیت ربنا ونطوف بہ ونحن اھل الحرم ومحمد فارق دین آبائہ و قطع الرحم وفارق الحرم ودیننا القدیم و دین محمد الحدیث

ہم حاجیوں کے لئے بہترین جانور ذبح کرتے ہیں۔ ان کو پانی پلاتے ہیں، مہمانوں کی عزت کرتے ہیں۔ قیدیوں کو چھڑاتے ہیں، رشتہ داروں کے حقوق ادا کرتے ہیں، بیت اللہ کی تعمیر کرتے ہیں، اس کا طواف کرتے ہیں۔ ہم اہل حرم ہیں اور محمد نے باپ دادا کے دین کو ترک کر دیا اور قطع رحمی کی اور حرم کو چھوڑ دیا۔ ہمارا دین قدیم ہے، محمد کا دین نیا ہے۔

یہ سن کر کعب نے کہا:

واللہ انتم اھدیٰ سبیلا مما علیہ محمد:
خدا کی قسم محمد جس راستہ پر ہیں، اس سے تمہارا راستہ بہتر ہے

یہود کے جس کردار کا ذکر قرآن میں ہے، وہ محض ایک تاریخی واقعہ نہیں، بلکہ ہر دور میں ایسا ہو سکتا ہے۔ ہر زمانہ میں ایسے لوگ پائے جا سکتے ہیں جو اس قسم کی نفسیاتی کمزوری کا ثبوت دیں جو یہود سے ظاہر ہوئی تھی۔ مزید یہ کہ ایسے لوگ جب خود اپنی دعاؤں اور تمناؤں کے خلاف ایک دعوت حق کا انکار کر رہے ہوں گے تو ان کے پاس اپنے رویہ کے درست ہونے کی بہت معقول توجیہہ موجود ہوگی ـــــ ہم اسلاف کے پیرو ہیں، ہم دینی اداروں کے محافظ ہیں۔ ہم

الرسالہ مئی ۱۹۷۷

خدمت خلق کر رہے ہیں، ہم اتحاد ملت کے علم بردار ہیں وغیرہ

اسی کمزوری کی ایک صورت وہ ہے جس کا ذکر قرآن کی سورہ نمبر ۴۰ میں کیا گیا ہے۔

فرعون اور موسیٰؑ کی کش مکش جب آخری مرحلہ میں پہنچ گئی تو فرعون نے ارادہ کیا کہ آنجناب کو قتل کر دے۔ اس وقت فرعون کے دربار کا ایک شخص کھڑا ہو گیا۔ حضرت موسیٰؑ کی دعوت کو حق پا کر وہ اندر سے ایمان لا چکا تھا مگر ابھی تک اپنے ایمان کو ظاہر نہیں کیا تھا۔ اب حضرت موسیٰؑ کے قتل کی بات ہونے لگی تو وہ کھل کر سامنے آ گیا اور آپ کی حمایت میں ایک مفصل تقریر کی۔ اس موقع پر اس رجل مومن نے جو کچھ کہا، اس میں سے ایک یہ بھی تھا کہ —— موسیٰؑ سے پہلے تمہارے ملک مصر میں یوسفؑ بھیجے گئے۔ انھوں نے کھلی کھلی نشانیاں دکھا کر ثابت کیا کہ وہ بلاشبہ خدا کے رسول ہیں۔ بادشاہ کے خواب کی صحیح تعبیر دے کر تم کو سات سالہ قحط سے بچایا، ایسی برکت اور انصاف والی حکومت قائم کی جو تم نے کبھی اپنے ملک میں نہیں دیکھی تھی، ان کا علم، ان کا اخلاق، ان کی شخصیت تمہارے یہاں ضرب المثل بن گئی۔ تاہم ان کی زندگی میں تم ان پر ایمان نہ لائے۔ یہاں تک کہ جب خدا نے ان کو اٹھا لیا تو تم کہنے لگے کہ "اب ان کے بعد خدا ایسا کوئی رسول ہرگز نہ بھیجے گا" اسی طرح اللہ ان سب کو گمراہی میں ڈال دیتا ہے جو حد سے نکل جانے والے اور شبہات میں گرفتار رہنے والے ہیں۔ وہ جو اللہ کی باتوں میں جھگڑتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی سند ہو، یہ اللہ اور اہل ایمان کے نزدیک سخت ناپسندیدہ ہے۔ اس طرح اللہ ہر متکبر اور سرکش کے دل پر مہر کر دیتا ہے"

قرآن کا یہ ٹکڑا ایک اعتبار سے حضرت موسیٰ کی دعوتی تاریخ کا ایک صفحہ ہے اور دوسرے اعتبار سے وہ انسان کی ایک کمزوری کو بتاتا ہے جو اکثر انسانوں کے لئے دعوت حق کو قبول کرنے میں مانع بن جاتی ہے۔ یہ ہے معاصرت کا فتنہ۔

وہ لوگ جو عزت، دولت، آرام، سب چیز بس اسی دنیا میں حاصل کر لینا چاہتے ہیں، ان کے اندر دھیرے دھیرے ایک نفسیاتی پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر چاہنے لگتے ہیں کہ عزت اور اقتدار سب کا سب انھیں کو مل جائے۔ اس کا فطری نتیجہ ہوتا ہے کہ ان چیزوں میں کسی کو اپنے سے بڑھا ہوا دیکھنا انھیں گوارا نہیں ہوتا۔ انھیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی دوسرے کے لئے اگر انھوں نے مان لیا کہ وہ حق پر ہے یا اس کو فکری و عملی برتری حاصل ہے تو ان کی اپنی حیثیت گھٹ جائے گی۔ یہ چیزیں انھیں اپنے معاصرین کے لئے کوئی کمال تسلیم کرنے میں مانع رہتی ہے۔ وہ گزرے ہوئے لوگوں کی بڑائی کے آسانی سے معترف ہو جاتے ہیں مگر زندہ لوگوں کی بڑائی ماننے میں انھیں اپنی بڑائی کا مینار گرتا ہوا دکھائی دینے لگتا ہے۔ اپنے ہم زمانہ لوگوں کو چھوٹا دکھانے کے لئے کبھی کہتے ہیں "اب بھلا ویسے لوگ کہاں پیدا ہوں گے" اگر کوئی کھلی ہوئی نشانی سامنے آ جاتی ہے تو لایعنی قسم کی بحثیں چھیڑ کر اس کو غلط یا حقیر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی نفسیاتی کمزوری انھیں ایک دائمی شبہ میں مبتلا رکھتی ہے، وہ اس گمان کے سہارے اپنا عزت کا محل قائم رکھتے ہیں کہ پچھلے بزرگوں کو تو ہم مانتے ہیں۔ یہ زندہ شخص ایسا ہے ہی نہیں، ورنہ ہم اس کو بھی مان لیتے" ان کا متکبرانہ مزاج اور ان کی سرکش طبیعت ان کے لئے ایک قسم کی مہر بن جاتی ہے جو کسی معقول بات کو ان کے دل و دماغ میں داخل ہی نہیں ہونے دیتی۔ کھلی کھلی علامتوں کو دیکھ کر بھی وہ اندھے بنے رہتے ہیں یہاں تک کہ اسی حال میں مر جاتے ہیں۔ ●

صلاۃ التسبیح

کیفیت سے بھری ہوئی عبادت کا نام ہے نہ کہ کسی لفظ کو تین سو بار دہرانے کا

عبداللہ بن مبارک کے استاد عبدالعزیز ابن ابی رواد کا قول ہے:

"جو شخص جنت کا ارادہ کرے اس کو ضروری ہے کہ صلاۃ التسبیح کو مضبوط پکڑے۔ تبع تابعین کے دور سے لے کر اب تک کثرت سے لوگ اس پر عمل کرتے رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی شخص زندگی میں ایک بار بھی اگر صلاۃ التسبیح پڑھ لے تو اس کی نجات ہو جائے گی۔

یہ عقیدہ بعض روایتوں سے بنا ہے، مثلاً ابوداؤد، ابن ماجہ، بیہقی وغیرہ نے یہ روایت نقل کی ہے:

عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال للعباس بن عبد المطلب، یا عباس یا عماہ الا اعطیک الا امنحک الا اخبرک الا افعل بک عشر خصال اذا انت فعلت ذلک غفر اللہ لک ذنبک اولہ وآخرہ قدیمہ وحدیثہ خطأہ وعمدہ صغیرہ وکبیرہ سرہ وعلانیتہ، ان تصلی اربع رکعات ۔۔۔

حضرت عباس رض سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عباس بن مطلب سے کہا، اے عباس رض، اے میرے چچا، کیا میں تمھیں ایک عطیہ دوں، ایک بخشش کروں، ایک بات کی خبر دوں، کیا میں تمھیں دس خصلتوں کا مالک بناؤں۔ جب تم اس کو کروگے تو خدا تمھارے گناہوں کو معاف کردے گا، پہلے اور پچھلے، نئے اور پرانے، غلطی سے کئے ہوئے اور جان کر کئے ہوئے، چھوٹے اور بڑے، پوشیدہ اور علانیہ، وہ کام یہ ہے کہ تم چار رکعت نماز (صلاۃ التسبیح) پڑھو۔

اس کے بعد روایت میں اس مخصوص نماز کی ترکیب بتائی گئی ہے۔ وہ یہ کہ الحمد اور سورہ پڑھنے کے بعد پندرہ مرتبہ چاروں کلمے سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الہ الا اللہ، اللہ اکبر پڑھے۔ پھر رکوع میں سبحان ربی العظیم کے بعد انھیں کلمات کو دس مرتبہ پڑھے۔ پھر رکوع سے کھڑے ہو کر سمع اللہ لمن حمدہ ربنا ولک الحمد کے بعد ان کو دس مرتبہ پڑھے۔ پھر دونوں سجدوں میں سبحان ربی الاعلیٰ کے بعد ان کو دس دس مرتبہ پڑھے۔ پھر دونوں سجدوں کے درمیان جب بیٹھے تو ان کو دس مرتبہ پڑھے۔ پھر جب دوسرے سجدہ سے اللہ اکبر کہتا ہوا اٹھے تو کھڑا ہونے کے بجائے بیٹھ جائے اور اس حالت میں دس مرتبہ ان کلمات کو پڑھ کر اللہ اکبر کہے بغیر کھڑا ہو جائے۔ دو رکعت کے بعد، اسی طرح چوتھی رکعت کے بعد ان کلموں کو دس دس مرتبہ پڑھے، پھر التحیات پڑھے۔ اس طرح تسبیح الٰہی کے یہ کلمات ان چار رکعتوں میں تین سو بار ادا کئے جاتے ہیں۔

اسی طرح کسی قدر فرق کے ساتھ ایک اور طریقہ بھی بتایا گیا ہے

۱۔ صلاۃ التسبیح کے سلسلے میں سب سے پہلی قابل لحاظ بات یہ ہے کہ بخاری اور مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا ہے جو حدیث کی سب سے زیادہ مستند کتابیں سمجھی

جاتی ہیں۔ اگر صحابہ کے زمانہ میں اس کا رواج ہوتا تو ضرور اس کو صحیحین کے اندر جگہ پانا چاہئے تھا۔ اس وجہ سے بعض علماء کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ صلاۃ التسبیح ان نئے طریقوں میں سے ہے جو تبع تابعین کے دور میں رائج ہوئے۔ حتیٰ کہ ذہبی اور ابن جوزی نے صلاۃ التسبیح کی روایتوں کو موضوع قرار دیا ہے۔ اس کے رواۃ میں احمد بن داؤد کا نام ہے جس پر کذب کا الزام ہے۔ اسی طرح ابن سمعان کا نام ہے جس کو محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔

۲۔ علماء کی ایک تعداد نے صلاۃ التسبیح کی حدیث کا اس بنا پر انکار کیا ہے کہ اتنا زیادہ ثواب صرف چار رکعت پر ناقابل فہم ہے

۳۔ اس حدیث کے جو الفاظ نقل کئے گئے ہیں، ان میں کلام نبوت کی شان نظر نہیں آتی۔ کوئی بھی شخص جس کی نظر احادیث رسول پر ہو، اس کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ آپ کا کلام عام طور پر اس انداز کا نہیں ہوتا جیسا کہ صلاۃ التسبیح کی روایتوں میں دکھائی دیتا ہے۔

راقم الحروف کی تحقیق اس سلسلے میں یہ ہے کہ صلاۃ التسبیح بذات خود بے اصل نہیں۔ کیونکہ خود قرآن میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر ملتا ہے۔ البتہ اس کی وہ شکل یقینی طور پر بے اصل ہے جس کو نجات کا طلسماتی ذریعہ سمجھ کر عوام اختیار کئے ہوئے ہیں۔ قرآن کی صراحت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو متعدد بار حکم دیا گیا کہ نماز کی تسبیح کرو (ق۔۴۰) مگر کسی بھی صحیح روایت سے یہ ثابت

ایک عرب کے پاس جب کوئی مہمان آتا ہے اور وہ اس کے سامنے کھانے پینے کی کچھ چیزیں رکھتا ہے تو "کُلُوْا" نہیں کہتا بلکہ "تَفَضَّلُوْا" کہہ کر کھانا شروع کرنے کی درخواست کرتا ہے۔ اسی طرح ہندستان میں مہمان کے سامنے کھانا رکھنے کے بعد "کھائیے" نہیں کہتے بلکہ "برکت دیجئے" "اور بخشش کیجئے" کے الفاظ بولتے ہیں۔ اس کا مقصد صرف مہمان کی عزت و تکریم ہے۔ ایسا نہیں کہ جب "کھائیے" کہا جائے تو آدمی عام طریقے سے بیٹھ کر کھائے اور جب "تَفَضَّلُوْا" یا "برکت دیجئے" کہا جائے تو پہلے وہ تین سو بار لفظ "طعام" کا ورد کرے، اس کے بعد کسی خاص انوکھی ہیئت سے بیٹھ کر ایک خاص ڈھنگ سے کھانا شروع کرے اور خاص ڈھنگ سے اس کو ختم کرے۔

کلام کا یہ انداز جو تمام زبانوں میں رائج ہے، اسی پر صلاۃ التسبیح کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ قرآن میں کہیں کہا گیا ہے اَقِمِ الصَّلٰوۃَ اور کہیں کہا گیا ہے سَبِّحْ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْکَارِ۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اقامت صلوٰۃ سے کوئی اور نماز مراد ہے اور تسبیح صلوٰۃ سے کوئی دوسری نماز۔ دونوں لفظوں سے وہی عام نماز مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے مطلوب ہے اور جو ساری عمر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب پڑھتے رہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کبھی حکم کے پہلو کو ملحوظ رکھتے ہوئے "نماز ادا کرو" کہا جاتا ہے اور کبھی اس کی حقیقت و معنویت کے پہلو پر زور دینے کے لئے "نماز کی تسبیح کرو" کہہ دیا جاتا ہے۔ یعنی وہ نماز پڑھو جس میں روح صلوٰۃ پوری طرح اتر آئی ہو۔ جو پورے معنوں میں خدا کی تسبیح ہو گئی ہو جو کہ نماز کا اصل مقصود ہے۔

نہیں کہ آپ نے کبھی اس قسم کی "چار رکعت" نماز پڑھی ہو جو عام طور پر صلاۃ التسبیح کے نام سے مشہور ہے۔

یہی واقعہ یہ سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ صلوٰۃ تسبیح سے مراد کوئی علیحدہ طریقہ سے ادا کی ہوئی نماز نہیں بلکہ وہی عام نماز ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ پڑھا کرتے تھے۔ یہ ناممکن ہے کہ نبی کو خدا کی طرف سے ایک حکم دیا جائے اور وہ اس کی تعمیل نہ کرے۔ جب آپ کی زندگی میں "صلاۃ تسبیح" کے نام سے کسی علیحدہ نماز کا ثبوت نہیں ملتا تو لازماً ماننا پڑے گا کہ آپ کی وہی نماز آپ کی صلاۃ تسبیح تھی جو روزانہ آپ مسجد میں اور گھر کے اندر ادا فرماتے تھے اور ساری عمر ادا فرماتے رہے۔

تسبیح کی نماز (صلاۃ التسبیح) کوئی پُر اسرار اور انوکھی چیز نہیں۔ ہر نماز صلاۃ التسبیح ہے بشرطیکہ وہ حقیقی کیفیات کے ساتھ ادا کی گئی ہو۔ یہ اسی قسم کا ایک معاملہ ہے جس کا ذکر دوسرے اعمال شریعت کے سلسلہ میں کیا گیا ہے۔ شریعت کے جو اعمال ہیں ان میں سے ہر ایک کی ایک ظاہری شکل ہے۔ مگر یہ اعمال اصلاً اپنے ظاہر کے اعتبار سے مطلوب نہیں ہیں بلکہ اپنی باطنی کیفیات کے اعتبار سے مطلوب ہیں۔ کوئی عمل اگر صرف ظاہری ڈھانچہ کی تکمیل کی حیثیت سے ادا کیا جائے تو اس کی کوئی قیمت خدا کی نظر میں نہیں ہوتی۔ مگر اسی عمل کے اندر جب خوف خدا اور فکر آخرت کی روح بھر جائے تو وہ بالکل دوسری چیز بن جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی پسندیدہ ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً ہر عمل کے لئے اس قسم کے الفاظ آئے ہیں، مثلاً حج مبرور اور صوم احتساب وغیرہ۔ حج مبرور یا صوم احتساب کسی پُر اسرار طریقہ پر کئے ہوئے حج یا روزہ کا نام نہیں ہے۔ ہر وہ حج جو صحیح ہو حج مبرور ہے۔ اسی طرح ہر وہ روزہ جو حقیقی ہو صوم احتساب ہے۔

حقیقت اور کیفیت سے بھری ہوئی نماز کے لئے صرف صلاۃ التسبیح کا لفظ ہی نہیں آیا ہے بلکہ اس کے لئے قرآن میں اور بھی کئی الفاظ آئے ہیں:

صلاۃ وسطیٰ (بقرہ — ۲۳۸)

صلاۃ خشوع (مومنون — ۲)

صلاۃ انابت (روم — ۳۱)

صلاۃ ذکر (طٰہٰ — ۱۴)

صلاۃ تسبیح (نور — ۳۶)

تسبیح کے معنی عربی زبان میں پاکی بیان کرنے کے ہیں۔ خدا کے سامنے اس کی بڑائی اور اس کی نعمتوں کے اظہار کو بتانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کو "کرنا"، یا "پڑھنا" جیسے الفاظ میں ذکر کیا جائے، دوسرے یہ کہ اس کو تسبیح کے لفظ سے تعبیر کیا جائے۔ اردو میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ "خدا کا نام لو" کے بجائے "خدا کے نام کی پاکی بیان کرو" کے الفاظ میں ظاہر کرنا۔ اسی دوسرے طریقے کا نام تسبیح ہے۔

اگر صلاۃ وسطیٰ کا یہ مطلب نہیں کہ جب نماز پڑھو تو فلاں ترکیب سے مختلف رکعتوں میں اتنے سو بار "وسطیٰ وسطیٰ" کہو یا صلاۃ خشوع اور صلاۃ انابت سے یہ مراد نہیں کہ وقت خاص میں ایک ایسی نماز پڑھو جس میں خشوع اور انابت کے الفاظ کی اتنے سو بار تکرار کی گئی ہو تو صلاۃ تسبیح کا مطلب یہ کیسے ہو جائے گا کہ ایسی نماز پڑھو جس میں تسبیح کے کلمات مقررہ ترکیب کے تحت تین سو بار دہرائے گئے ہوں۔

نماز اپنی حقیقت کے اعتبار سے تمام تر تسبیح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں "صلّوا" (نماز پڑھو) بہت کم کہا گیا ہے۔ اس کے بجائے زیادہ تر اَقِمِ الصَّلٰوۃَ (نماز قائم

رسالہ مئی ۱۹۷۷

کرو) یا سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ (اللہ کے نام کی پاکی بیان کرو) جیسے لفظوں میں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ گویا صلاۃ تسبیح کسی علیحدہ نماز کا نام نہیں ہے۔ بلکہ ہر اس نماز کا نام ہے جس میں نماز کی حقیقت پوری طرح مجسّم ہو گئی ہو۔ جب کسی نمازی کو یہ توفیق ملے کہ اس کا وجود سراپا اللہ کی عظمت و کبریائی کے تصور میں ڈھل جائے۔ جب اس کی نماز قرآن کے لفظوں میں صلوٰۃ سہو (ماعون) یا صلاۃ کسل (نساء) نہ ہو بلکہ ہمہ تن ذکر اور انابت کی نماز بن جائے۔ تو اسی کا نام صلاۃ التسبیح ہے۔

صلاۃ تسبیح کی مروجہ شکل دراصل ایک کیفی حقیقت کو کمیاتی اصطلاحوں میں بیان کرنے کی کوشش ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عوام کے لئے قابل فہم بنانے کی یہ آسان تدبیر ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ کیفیت کو کمیاتی زبان میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً دینی کیفیات کو کمیاتی الفاظ میں مقید کرنے کی کوشش تو بدعت بھی ہے جو خدا اور رسول کے نزدیک قطعاً مقبول نہیں۔

صلاۃ تسبیح جس کیفی نماز کا نام ہے، اس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اشاراتی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ نماز ہے جب کہ بندے کے اوپر خدا کی عظمت و ہیبت کا شدید غلبہ ہوتا ہے۔ نماز میں قرآن کی تلاوت اور تسبیح و دعا کے کلمات اس کے لئے محض کلمات نہیں رہتے بلکہ براہ راست خدا سے عرض و معروض بن جاتے ہیں۔ بنیادی ڈھانچہ کے اعتبار سے اگرچہ اس وقت بھی آدمی مقررہ نماز ہی پڑھ رہا ہوتا ہے، مگر خدا سے حضوری کا غلبہ اور کیفیات کا امنڈتا ہوا سیلاب ساری رسمیات کو توڑ دیتا ہے۔ اس وقت ایک طرف خدا اپنے تمام جلال و جبروت کے ساتھ اس کے سامنے آجاتا ہے، اور دوسری طرف بندہ اپنے عجز کا سارا سرمایہ لئے ہوئے اپنے آپ کو اس طرح اس کے آگے ڈال دیتا ہے جہاں زمان و مکان کی تمام قیود ختم ہو جاتی ہیں۔ الفاظ اور ڈھانچے کی تمام پابندیاں اضافی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ انسان موجودہ دنیا میں رہتے ہوئے ایک اور دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ وہ بندہ رہتے ہوئے رب العالمین سے جا ملتا ہے۔ وہ اس وقت تسبیح خواں نہیں ہوتا بلکہ خود سراپا تسبیح بن جاتا ہے۔ اس کا قیام و قعود اور اس کا رکوع و سجدہ محض جسمانی عمل نہیں رہتا۔ بلکہ اپنے سارے وجود کو خدا کی ہستی میں گم کر دینے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جب کہ بندگی اور خدائی کی سرحدیں اتنی قریب آجاتی ہیں گویا قیامت سے پہلے قیامت آگئی ہو۔ گویا آخرت سے پہلے بندے نے خدا کو دیکھ لیا ہو۔

صلاۃ التسبیح پوری زندگی کا نذرانہ ہے، نہ کہ چار رکعت نماز کا ایک وقتی کرشمہ۔ یہ نماز اس طرح نہیں پڑھی جاتی کہ آدمی کسی وقت "میں نیت کرتا ہوں چار رکعت صلاۃ التسبیح کی" کے الفاظ بول کر قبلہ رخ کھڑا ہو جائے۔ یہ نماز کسی بندۂ خدا کے اندر سے اس وقت ابلتی ہے جب اس کا وجود ہمہ تن خدا کے خوف اور فکر آخرت میں ڈھل گیا ہو، جب اس نے اپنے آپ کو اپنے رب کی رضا کے لئے ملیامیٹ کر ڈالا ہو۔ صلاۃ التسبیح کو ادا کرنے کے لئے خاک و خون کے دریا سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ نہ صرف نماز کی تصغیر ہوگی بلکہ نعوذ باللہ خدائے ذوالجلال کی عظمتوں کا بھی کمتر اندازہ ہوگا اگر اس کو مقررہ کلمات کی چند سو بار تکرار کے ہم معنی سمجھ لیا جائے ـــــ عبادت بارگاہ الٰہی میں بندے کا ہدیہ ہے۔ اس کی وہی تعبیر صحیح ہو سکتی ہے جو اللہ العالمین کی عظمت و کمال کے شایان شان ہو۔

آٹھ سال پہلے کی ایک تحریر

الرسالہ کے زیر نظر شمارہ میں صفحہ اول پر جو مضمون درج ہے، وہ پچھلے نومبر ۱۹۷۶ میں لکھا گیا تھا۔ مگر جب وہ ہمارے پرنٹر پبلشر کے سامنے آیا تو انھوں نے اس کو چھاپنے کی رائے نہ دی۔ انھوں نے کہا: "سنسرشپ کے ذمہ دار اس کو اندرا گاندھی کے خلاف سمجھیں گے اور ہماری شامت آجائے گی" مگر اس تحریر میں جو بات چھ ماہ پہلے لکھی گئی تھی، وہ آج واقعہ بن چکی ہے۔

سنسرشپ اور ایمرجنسی کے نفاذ سے بھی تقریباً ایک سال پہلے کی بات ہے۔ راقم الحروف نے اپنے دوست شری داس جیون ایم۔ اے (دہلی) کے سامنے سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی کی سیاست پر کچھ تنقید کی۔ وہ فوراً بولے:

"ارے صاحب، اندرا جی کو کچھ نہ کہئے، ہم
ان کو درگا دیوی کے روپ میں دیکھتے ہیں"

ابھی تھوڑے دنوں پہلے تک یہ حال تھا کہ لوگوں کو یہ بات ناممکن سی نظر آتی تھی کہ اس ملک سے اندرا گاندھی کا اقتدار ختم ہو جائے گا۔ مگر خدا کا قانون جب ظاہر ہوتا ہے تو وہ کسی کے ساتھ امتیاز نہیں کرتا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد ہے:

لن یفلح قوم ولوا امرأۃ

وہ قوم فلاح نہیں پا سکتی جو عورت کو اپنا حکمراں بنائے

اس حدیث کو نقل کرتے ہوئے راقم الحروف نے ۸ سال پہلے ہفت روزہ الجمعیۃ (۸ اگست ۱۹۶۹) میں ایک مضمون شائع کیا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا:

"جب بھی عورتوں کو مطلق اختیار دیا گیا، انھوں نے ریاست اور قوم کے اندر تباہی برپا کی ہے۔ تاریخ میں بہت سے واقعات ہیں جو (لارڈ ایکٹن کے) اس مقولہ کی تصدیق کرتے ہیں کہ "اقتدار بگاڑتا ہے اور کامل اقتدار بالکل بگاڑ دیتا ہے"۔ یہ کامل اقتدار اگر عورتوں کو مل جائے تو

جب ـــــ خیمے

شریمتی اندرا گاندھی کی انتخابی شکست میں لوگوں کو صرف سیاست کا منظر نظر آ رہا ہے۔ لیکن اگر دیکھنے والی آنکھیں ہوں تو اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ سے لوگوں کو قیامت کا منظر دکھا دیا ہے۔

الہ آباد ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس جے۔ ایم۔ ایل سنہا نے ۱۲ جون ۱۹۷۵ کو ایک فیصلہ دیا جس میں سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی کے الکشن (۱۹۷۱) کو ناجائز قرار دیا گیا تھا۔ مگر اندرا گاندھی کی اولوالعزم طبیعت نے ہار نہیں مانی۔ انھوں نے اپنے عہدہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۲۵ جون ۱۹۷۵ء کی رات کو ایمرجنسی لاگو کر دی۔

اب سارے ملک میں ایک نیا عمل شروع کر دیا گیا۔ تمام ناپسندیدہ افراد جیلوں میں بند کر دیئے گئے۔ مخالف جماعتوں کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ پریس پر سنسر قائم کر دیا گیا۔ ہر قسم کے اشاعتی ذرائع کو مکمل طور پر سرکاری پروپیگنڈے کے لئے وقف کر دیا گیا۔ عدالت کو ایک آزاد ادارہ کی حیثیت سے ختم کر دیا گیا۔ دستور میں ترمیمیں کر کے اس کو مکمل طور پر اپنے موافق بنا لیا گیا۔ ایسے قوانین جاری

اکھاڑ دیئے جائیں گے

کیے گئے جن کے تحت حکومت کسی بھی شخص کو جرم بتائے بغیر گرفتار کر سکتی تھی اور نامعلوم مدت تک کے لئے اس کو جیل میں محبوس رکھ سکتی تھی۔ اپنی پوزیشن کو یہاں تک محفوظ کیا گیا کہ دستور میں چالیسویں ترمیم کے ذریعے طے کر دیا گیا کہ وزیر اعظم اپنے کسی بھی عمل کے لئے کسی بھی ملکی عدالت میں جواب دہ نہیں ہیں۔ حتیٰ کہ حکومتی عہدہ سے الگ ہونے کے بعد بھی نہیں۔ اس طرح کی بے شمار تدبیروں کے ذریعہ سابق وزیر اعظم نے ملک میں اپنی پوزیشن کو اتنا زیادہ مضبوط کر لیا جتنا شاید پوری تاریخ میں کبھی کسی حکمراں نے نہیں کیا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کو یہ اعلان کرنے کی جرأت ہوئی کہ "ایمرجنسی سے پہلے والے حالات اب کبھی واپس نہیں آئیں گے" ان کو یقین تھا کہ نہ صرف وہ آخر تک ملک کے اقتدار پر قابض رہیں گی بلکہ ان کے بعد ان کا خاندان اس کا وارث بنا رہے گا۔

مگر چھٹے عام الیکشن نے ثابت کیا کہ تمام پیش بندیوں کے باوجود آخری عدالت کا فیصلہ ابھی باقی تھا۔ یہ ملک کے عوام کی عدالت تھی۔ مارچ ۱۹۷۷ میں سابق وزیر اعظم کا مقدمہ دیس کی جنتا کے سامنے آیا۔ اور اس کے ایک فیصلہ نے اچانک سارے استحکامات کو اس طرح ڈھا دیا جیسے کہ وہ ریت کی دیوار سے بھی زیادہ بے حقیقت تھے۔ نہرو خاندان کی پچاس سالہ عظمت کا وارث صرف ایک دن میں بے یار و مددگار ہو کر رہ گیا۔

یہ واقعہ آخرت میں ہونے والی عدالت کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔ دنیا میں آدمی اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کے لئے دلائل کے پہاڑ کھڑے کرتا ہے۔ وہ دولت و عزت اور جاہ و منصب کے قلعے تعمیر کرتا ہے۔ اقتصادی ذرائع پر قبضہ کر کے اپنے مستقبل کو محفوظ کرتا ہے۔ اپنے گرد بڑی بڑی عمارتیں بنا کر سمجھتا ہے کہ اس نے اپنے بچاؤ کا آخری انتظام کر لیا ہے۔ مگر جب قیامت آئے گی تو سارے مضبوط خیمے اکھڑ جائیں گے۔ انسان اچانک پائے گا کہ وہ سب سے بڑی عدالت کے سامنے بالکل بے بس کھڑا ہوا ہے۔

زندگی کی سب سے زیادہ سنگین حقیقت یہ ہے کہ سارے انسان خدا کے بندے ہیں۔ ہر ایک کو بہر حال ایک دن خدا کی عدالت میں پیش ہونا ہے۔ عقل مند وہ ہے جو اس آنے والے دن کی تیاری میں اپنے آپ کو لگا دے۔

اکثر اوقات وہ پوری قوم کے بگاڑ کا سبب بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں بھی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی عورت کو ایک ملک کا اعلیٰ ترین عہدہ سونپا جائے۔

امریکہ میں جہاں سمجھا جاتا ہے کہ عورتوں کو بہت زیادہ برتری حاصل ہے، کسی عورت کو کبھی سکریٹری آف اسٹیٹ نہیں بنایا گیا۔ یہ غالباً امریکہ کے مردوں اور عورتوں کے لئے توہین کی بات ہوگی کہ ایک عورت کو امریکہ کا پریسیڈنٹ بنایا جائے۔ فرانس میں جہاں عورتوں کا کافی اثر رہا ہے کوئی عورت کبھی وزیر اعظم نہیں بنائی گئی۔ ڈیگال کیبنٹ میں صرف ایک عورت تھی جو سماجی امور کے محکمہ میں منسٹر آف اسٹیٹ تھی۔ برطانی کیبنٹ میں مسز باربرا کیسل کو ایک اہم عہدہ دیا گیا۔ مگر یورپ اور امریکہ میں عورتوں کو عہدہ دینے

کی یہ آخری حد تھی۔

مشرقی یورپ کے کمیونسٹ ممالک میں اناپوکر کی صفائی کے بعد جو کسی زمانہ میں رومانیہ کی وزیر خارجہ تھی، کوئی دوسری عورت ایسے عہدہ پر نہیں بٹھائی گئی جو اختیار کا عہدہ ہو۔ سوویت روس میں صرف مٹھی بھر عورتیں اوپر کی سطح پر ماتحت عہدوں پر فائز ہیں۔ ممی کلوشی کے ریٹائر ہونے کے بعد سوویت حکومت نے کوئی دوسری خاتون سفیر مقرر نہیں کی۔

یہ بے حد حیرت انگیز بات ہے کہ ہندستان میں خاص طور پر آزادی کے بعد کے ہندستان میں، عورتیں بڑے بڑے ریاستی عہدوں پر فائز رہی ہیں۔ اور اب تو وزارت عظمیٰ پر بھی ایک خاتون کا قبضہ ہے۔ کوئی شخص کوین الزبتھ اوّل کے بعض شاندار معاملات پر حیران ہو سکتا ہے تاہم اپنے زمانہ میں وہ انگلینڈ کی ایک تباہ کن ملکہ سمجھی جاتی تھی۔ روس کی ملکہ کیتھرائن کی زندگی اتنی بدنام تھی اور وہ اتنی خود مختار ہو گئی تھی کہ کئی بار اس کو قتل کرنے کی سازشیں کی گئیں۔ اسی طرح یورپ میں جب بھی عورت کو اقتدار سونپا گیا وہ ریاست کے لئے تباہ کن ثابت ہوئی ہے۔

فرائڈ کے نقطۂ نظر سے جب ان عورتوں کے کیس کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو خاص نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ آج ہم جانتے ہیں کہ کیوں عورتیں مردوں سے مختلف عمل کرتی ہیں جب کہ دونوں ایک ہی پوزیشن میں ہوں۔ مثال کے طور پر فرائڈ کا تجربہ ۵۰ سال کی عمر یا بیوہ کے بارے میں بتاتا ہے جب وہ مایوس کن زندگی سے دوچار ہوں، تو ان کے اندر انتقام یا اقتدار سے چپٹے رہنے کا جذبہ بعض حیاتیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے، جو ان میں کچھ دنوں بعد پیدا ہوتی ہیں۔ یہ حیاتیاتی تبدیلیاں ان کے طرز فکر اور ان کے جذبات میں تبدیلیاں لاتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سے نفسیات داں ان عورتوں کو ریٹائرڈ زندگی گزارنے کا مشورہ دیتے ہیں جن میں یہ تبدیلیاں وقوع پذیر ہو چکی ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ بیوہ عورتیں اپنے فرائض کو صحیح طور پر ادا نہیں کر پاتیں۔ اس کلیہ میں ملکہ وکٹوریہ کا ایک استثنا رہے۔ مگر ملکہ وکٹوریہ کو جب ایک بیوہ کی حیثیت سے حکومت کرنے کا وقت آیا تو برطانیہ ایک دستوری بادشاہت میں تبدیل ہو چکا تھا، وہ آئینی حکمراں رہی مگر حکومت نہ کر سکی۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ ایک غصہ ور ضعیف خاتون کی غلط حکمرانی کے نتائج سے محفوظ رہا۔

مزید یہ کہ تمام عورتوں کی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے دل سے سوچتی ہیں۔ نپولین نے کہا تھا ——— "ایک مرد حکمراں کا دل اس کے دماغ میں ہوتا ہے" مگر ایک عورت کا دماغ عام طور پر اس کے دل میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اور ہر ملک میں دانش مند لوگوں نے کبھی بڑی ذمہ داریوں کا بوجھ عورتوں پر نہیں رکھا۔ بیشتر عورتیں اپنی ذات اپنے خاندان یا اپنے قریبی ماحول کے دائرہ میں سوچتی ہیں۔ وہ اکثر مسائل کو وسیع ہو کر سوچنے کی اہل نہیں ہوتیں، اور اگر وہ ایسا کرنے کی کوشش کرتی ہیں تو ان سے زبردست غلطیاں ہوتی ہیں۔

ہندستان کے سیاست دانوں نے سائنٹفک علم نہ ہونے کی وجہ سے، نیز اپنے بھولا پن، اور اس شوق میں کہ وہ ترقی پسند کہلائیں عورتوں کو بڑے بڑے عہدوں پر بٹھا دیا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ موقع، کہ ہندستان اقتصادی طور پر آزاد، سیاسی طور پر طاقت ور، تہذیبی طور پر ترقی یافتہ ملک بنے، اب تک حاصل نہ ہو سکا۔ (آرگنائزر)

اعداد کی منطق

مولانا الطاف حسین حالی نے اپنے استاذ غالب کی وفات پر جو مرثیہ لکھا تھا اس کا ایک مصرعہ تھا:

رحلت فخر روزگار ہے آہ

...دو کے ایک پروفیسر نے "الکشاف" کہا ہے کہ "اس مصرعہ ...سید احتشام حسین (۱۹۷۲ — ۱۹۱۲) کی تاریخ وفات ...د ہوتی ہے اور یہ مصرعہ مرحوم کے لئے حرف بہ حرف ...ا اترتا ہے"

اعداد اور ردیف وقافیہ کی منطق بھی کیسی عجیب ...۔ اس سے ہر وہ بات ثابت کی جا سکتی ہے جو ٹھوس ...ائق سے ثابت کرنا ممکن نہ ہو۔

ایک شاعر تھے جو محمد علی جناح کے سخت مخالف تھے۔ ...ب مسٹر جناح کا انتقال ہوا تو انھوں نے اس فقرہ سے ...صوف کی تاریخ وفات نکالی:

مرگیا مردود فاتحہ نہ درود

...سری طرف ان کی ایک عزیزہ کا انتقال ہوا تو ان کی تاریخ ...ات کے لئے یہ شعر موزوں ہوگیا:

پوچھا جو میں نے غیب سے ہاتف نے دی صدا
آرام گاہ عابدہ خلد بریں میں ہو

اس قسم کے اعدادی لطیفے کتاب الٰہی سے بھی برآمد ...جاتے رہے ہیں۔ قاضی بیضاوی نے اپنی تفسیر میں ...ف مقطعات کی تقریباً ایک درجن توجیہیں نقل کی ہیں ...ں سے ایک یہ بھی ہے کہ حساب جمل کے اعتبار سے قوموں ...رج اور ان کی موت اس سے نکلتی ہے۔ چنانچہ یہود ...حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ نے سورہ آلمّ (البقرہ) پڑھ کر سنائی تو انھوں نے آلمّ کے اعداد کو گن کر کہا کہ ہم لوگ ایسے دین میں کیسے داخل ہو جائیں اور آپ پر کیسے ایمان لائیں جبکہ آلمّ کے اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے دین کی عمر صرف اکہتر سال ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی یہ بات سن کر مسکرائے۔ تو یہود نے کہا کہ کیا یہ درست نہیں ہے۔ آپ نے قرآن مجید کے دوسرے حروف مقطعات المرا، المص وغیرہ پڑھ کر سنائے کہ اب کیا خیال ہے تو یہود شرمندہ ہوئے اور انھوں نے کہا کہ اب تو آپ نے خلط ملط کر دیا۔ خلطت علینا فلا ندری بایہا ناخذ)

اکبر کے دور میں جو ایک ہزار سال پر اسلام کے ختم ہو جانے کی پیشین گوئی کی گئی تھی وہ بھی اسی بنیاد پر تھی جس کو شیعہ علماء نے قرآن مجید کی تمام صورتوں کے مقطعات کے اعداد جمع کر کے ۹۹۹ سال نکالا تھا اور درباری علماء نے اس کی تائید کی تھی۔ اس طرح اکبر کو باور کرایا گیا کہ قرآنی شریعت کا دور ختم ہو گیا۔ اب دوسری شریعت کی ضرورت ہے ■

حقیقی اسلام یہ ہے کہ آدمی خدا ہی کو سب سے بڑا سمجھے، اسی سے ہر قسم کی امیدیں وابستہ کرے۔ مگر جب دین کی روح کمزور پڑ جاتی ہے تو عملیات زندہ ہوتے ہیں۔ خدا پر بھروسہ باقی نہیں رہتا۔ مخصوص قسم کے اعمال میں پُراسرار خواص کا یقین بڑھ جاتا ہے۔ وہ خدا کو مانتے ہوئے خدا کو چھوڑ دیتے ہیں۔ دین اور عملیات میں وہی فرق ہے جو قرآن اور جادو میں۔

Regd. No. D. ...

Published from New Delhi, Bombay and Ahmedabad.

THE TIM[E]

NEW DELHI: MONDAY, MARCH 21, 1977

MRS. INDIRA GA



Recount plea rejected: Sanjay too loses

By Our Special Correspondent

NEW DELHI, March 21

THE Prime Minister, Mrs. Indira Gandhi, was defeated by over 55,000 votes in Rae Bareli at the hands of Mr. Raj Narain as the Janata Party mauled the Congress in northern states to register a tally of 101 out of 207 Lok Sabha seats the results of which have been declared so far.



Mrs. Gandhi polled 1,22,517 votes as against 1,77,729 votes secured by Mr. Raj Narain (Janata).

The returning officer of the Rae Bareli parliamentary constituency, Mr. Vinod Malhotra, announced the result of Mrs. Gandhi after rejecting a plea by Mr M. L. Fotedar, election agent of Mrs. Gandhi, seeking time to file petition for recounting.

Before announcing the result, Mr Malhotra also turned down a plea by Mr. Fotedar asking for repoll on several grounds, including alleged tampering of official seals on one of the ballot boxes.

In the neighbouring constituency of Amethi, Mr Sanjay Gandhi has lost to Mr Ravindra Pratap Singh (Janata) by 75,844 votes.

Among the ministers who have tumbled at the hustings are Mr

(Continued on page 7, column 1)

Party position

Total seats	542
Seats declared	539
Janata	270
CFD	28
CPI(M)	22
Congress	153
CPI	7
AIADMK	19
DMK	[illegible]
Akali Dal	[illegible]
Others	23
Independents	8

Janata ... throu[gh]

By A ...

CHANDIGARH, March

ٹائمس آف انڈیا کے صفحۂ اول کی یہ کٹنگ ایک عبرتناک مرقع پیش کر رہی ہے۔ ۲۰ مارچ ۱۹۷۷ء تک اس ملک میں جس شخص کا اقتدار اس طرح چھایا ہوا تھا کہ عدالت عالیہ بھی اس کے خلاف فیصلہ دینے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔ جب زوال آیا تو اسی کا یہ حال ہوا کہ ایک معمولی ریٹرننگ افسر نے اس کے الیکشن ایجنٹ کی یہ درخواست مسترد کر دی کہ انتخابی نتیجہ کا اعلان ابھی نہ کیا جائے کیونکہ ۔۔۔ ووٹوں کو دوبارہ شمار کرنے کے لیے پٹیشن داخل کرنا ہے

ہر آدمی ایک فیصلہ کن انجام کی طرف بڑھ رہا ہے۔

ہندستان کی آزادی سے بارہ سال پہلے ۱۹۳۵ میں جب آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو نے انگریزی جیل میں اپنی آپ بیتی مکمل کی تو اس کے آخر میں انھوں نے لکھا:

"میں محسوس کرتا ہوں کہ میری زندگی کا ایک باب ختم ہو گیا اور اب اس کا دوسرا باب شروع ہوگا۔ اس میں کیا ہوگا، اس کے متعلق میں کوئی قیاس نہیں کر سکتا۔ کتابِ زندگی کے اگلے ورق سربمہر ہیں۔"

آٹو بیاگرافی (لندن ۱۹۵۳) صفحہ ۵۹۷

نہرو کی زندگی کے اگلے اوراق کھلے تو معلوم ہوا کہ وہ دنیا کے تیسرے سب سے بڑے ملک کے وزیر اعظم ہیں۔ انسانی آبادی کے چھٹے حصہ پر انھوں نے اپنی ساری عمر بلاشرکت حکومت کی۔ ان کا اقتدار اتنا مکمل تھا کہ اپنی وزارتی کابینہ کے طاقت ور ترین شخص سردار پٹیل سے جب ان کے اختلافات ہوئے تو ہندستان کے اس مرد آہن نے بالآخر نہرو کے آگے ہتھیار ڈال دئے اور لکھ کر دے دیا کہ اختلافی معاملات میں عملاً میں اسی رائے کا پابند رہوں گا جو آپ کی رائے ہوگی۔

اس قسم کے کامل اقتدار کے باوجود پنڈت نہرو اپنی آخری عمر میں یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ شاید حقیقت کی کچھ اور منزلیں ہیں جہاں تک ان کی رسائی نہ ہو سکی۔ جنوری ۱۹۶۴ میں مستشرقین کی بین اقوامی کانگرس نئی دہلی میں ہوئی تھی۔ اس میں ہندستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے بارہ سو ڈیلی گیٹ شریک ہوئے۔ پنڈت نہرو نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

"میں ایک سیاست داں ہوں اور مجھے سوچنے کے لئے وقت کم ملتا ہے۔ پھر بھی بعض اوقات میں یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہوں کہ آخر یہ دنیا کیا ہے۔ کس لئے ہے۔ ہم کیا ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ یہ میرا یقین ہے کہ کچھ طاقتیں ہیں جو ہماری تقدیر بناتی ہیں۔"

(نیشنل ہیرلڈ ۷، جنوری ۱۹۶۴)

پنڈت نہرو کے انتقال کے بعد، ایک مختصر وقفہ کو چھوڑ کر، ہندستان کا اقتدار دوبارہ ان کی صاحبزادی مسز اندرا گاندھی کے ہاتھ میں آیا اور گیارہ سال دو مہینے تک اتنی شان کے ساتھ انھوں نے حکومت کی کہ لوگ کہنے لگے کہ بیٹی باپ پر بھی بازی لے گئی ہے۔ مگر بالآخر قدرت نے ان کی سیاسی کتاب کو بھی اس طرح سربمہر کر دیا کہ وہ بھی دوبارہ اسی سوال سے دوچار ہیں جس سے ان کا باپ چالیس سال پہلے دوچار تھا ——

"زندگی کیا ہے اور بالآخر آدمی کا انجام کیا ہونے والا ہے"

تاریخ کے اندر بے شمار سبق ہیں۔ ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ ہر آدمی ایک ایسی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے جہاں آدمی کی خوش فہمیاں اس کا ساتھ چھوڑ دیں گی۔ کوئی اقتدار کسی کے کام نہ آئے گا۔ وہاں فیصلہ کا سارا اختیار دوسری طاقت کے ہاتھ میں ہوگا۔ دنیا میں انسان کا انجام آخرت کے اسی انجام کا ابتدائی نمونہ ہے۔

ہر شخص جس کو زندگی کے اسٹیج پر اپنا کردار ادا کرنے کا موقع ملتا ہے، وہ انتہائی نادانی کے ساتھ اسی عمل کو دہراتا ہے جو پچھلے تجربہ میں مکمل طور پر ناکام ہو چکا ہے۔

سورہ طٰہٰ میں ارشاد ہے کہ پچھلے لوگوں کے حالات میں تمھارے لئے سبق ہے اور قرآن کی صورت میں ایک مکمل نصیحت نامہ تمھارے لئے بھیج دیا گیا ہے۔ کھلا کھلا حق آجانے کے بعد بھی جو اس سے اعراض کرے قیامت کے دن اس کو بہت برا بوجھ اٹھانا پڑے گا۔

اس دن جب کہ صور پھونکا جائے گا اور خدا تمام مجرموں کو اس طرح گھیر لائے گا کہ ان کی آنکھیں خوف دہشت سے پتھرائی ہوئی ہوں گی۔ اس وقت دنیا کی زندگی ان کو اتنی حقیر اور مختصر معلوم ہوگی کہ آپس میں چپکے چپکے کہیں گے: "دنیا میں مشکل سے ہم نے دس دن گزارے ہوں گے"۔ پھر کوئی بولے گا: "نہیں، تمھاری دنیا کی زندگی تو بس ایک دن کی زندگی تھی"۔

جب قیامت آئے گی تو پہاڑوں کو خدا دھول بنا کر اڑا دے گا اور ساری زمین کو ایسا چٹیل میدان بنا دے گا کہ اس میں کہیں کوئی اونچ نیچ دکھائی نہ دے گی۔ اس دن تمام انسان پکارنے والے کی پکار پر سیدھے چلے آئیں گے۔ کوئی کسی قسم کی اکڑ نہ دکھا سکے گا۔ تمام آوازیں خدا کے آگے پست ہو جائیں گی۔ سارے لوگ خاموش ہوں گے۔ چلنے کی ہلکی پھسپھساہٹ کے سوا تم کوئی آواز نہ سنو گے۔ اس روز کوئی سفارش کسی کے لئے کارگر نہ ہوگی۔ تمام لوگوں کے سر اس حی و قیوم کے آگے جھک جائیں گے۔

اس دن وہ شخص ناکام و نامراد ہوگا جو کسی ظلم کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ اور جو خدا پر ایمان رکھنے والا ہو اور نیک عمل کرے، اس کے لئے کسی قسم کا کوئی خطرہ اس دن نہ ہوگا۔

جب تمام آوازیں پست ہو جائیں گی

وزیر داخلہ چرن سنگھ نے ۲۱ مارچ کو لوک سبھا میں یہ سنسنی خیز انکشاف کیا کہ انٹرنل ایمرجنسی کے نفاذ پر صدر جمہوریہ کے دستخط ۲۵ جون ۱۹۷۵ کو ہوئے تھے اور مرکزی کابینہ کے سامنے منظوری کے لئے اس کو اگلے دن ۲۶ جون کو پیش کیا گیا۔ یہ دستور کی دفعہ ۷۴ (۱) کے صریح خلاف تھا۔ کیوں کہ اس کے مطابق ایمرجنسی کے نفاذ کا فیصلہ اولاً وزرا کی کونسل میں ہونا چاہیے۔

وزیر داخلہ کے اس بیان کے بعد جنتا پارٹی کے ممبروں کی طرف سے "شرم شرم" کے نعرے بلند ہوئے۔ مگر کانگرس کی بنچوں پر مکمل خاموشی طاری رہی۔ کانگرس پارٹی کے ممبران اپنی نشستوں پر اس طرح چپ بیٹھے تھے جیسے ان کے پاس الفاظ ہی نہ ہوں۔ حالاں کہ یہ وہی لوگ ہیں جو ۲۰ مارچ سے پہلے اس طرح بولتے تھے جیسے ڈکشنری کے سارے الفاظ صرف انھیں کے لئے بنائے گئے ہیں۔ کہ انھوں نے اپنے آپ کو ۶۰ کروڑ باشندوں کے اس ملک کا مالک ثابت کرنے کے لئے یہ الفاظ بھی تلاش کر لئے تھے: "اندرا از انڈیا، انڈیا از اندرا"

یہ خبر پڑھ کر راقم الحروف کو قرآن کی وہ آیت یاد

جس میں کہا گیا ہے کہ جب دنیا کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور تمام لوگ خداوند عالم کے سامنے کھڑے کر دئے جائیں گے تو ہر ایک دم بخود ہوگا۔ وہ لوگ جن کے پاس دنیا میں ہر بات کا جواب دینے کے لئے الفاظ کا ذخیرہ ہوا کرتا تھا، وہاں اس طرح خاموش ہوں گے جیسے ان کے منھ میں زبان ہی نہیں۔

آج لوگوں کا یہ حال صرف اتنی سی بات پر ہو رہا ہے کہ اقتدار کی کرسی سے ان کو ہٹا دیا گیا ہے۔ جب کہ سیاسی اقتدار کے علاوہ زندگی کی تمام سہولتیں اب بھی ان کو پوری طرح حاصل ہیں۔ مگر قیامت کا دن تو وہ دن ہوگا جب کہ لوگوں سے صرف اختیارات ہی نہیں چھینے جائیں گے بلکہ ضرورت اور عیش کے تمام سامان بھی ان سے واپس لے لئے جائیں گے۔ اس وقت آدمی کے پاس اپنے جسم کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ کیسا سخت ہوگا وہ دن۔ مگر آدمی اتنا بڑا ظالم ہے کہ ایک لمحہ پہلے بھی ہوش میں آنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

تاریخ کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ انسان کو اس زمین پر مطلق اقتدار حاصل نہیں۔ اس دنیا کا نظام ہم سے ماورا ایک طاقت ور قانون کے تحت چل رہا ہے۔ ہم اگر یہاں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو اس کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ ہم اس بالاتر قانون کے ڈھانچہ میں اپنی زندگی کا نقشہ بنائیں۔ اگر ہم نے اس کو نظرانداز کرکے چلنا چاہا تو ہمارا وہی انجام ہوگا جو ایک انجنیر کا اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ ایک چلتی ہوئی لوہے کی مشین کے اندر اپنا ہاتھ ڈال دے۔ لوہے کی مشین کے مقابلہ میں حقیقت پسندی کا انداز اختیار کرنا کوئی نہیں بھولتا۔ مگر یہی بات عظیم تر مسئلہ کے بارہ میں ہر شخص بھول جاتا ہے۔

یہ انسان

مسلم اسپین کی تاریخ پر جو کتابیں لکھی گئیں، ان میں سے ایک کتاب کا نام ہے:

اخبار مجموعہ فی فتح الاندلس وذکر امرائہا
رحمہم اللہ والحروب الواقعۃ بہا بینہم

یہ کتاب غالباً گیارھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی اور ۱۸۶۷ میں پہلی بار مجریط (میڈرڈ) سے شائع ہوئی۔

اموی دور حکومت میں افریقہ کے بربری قبائل کی بار بار بغاوت کا ذکر کرتے ہوئے اس کا مصنف لکھتا ہے:

"بربری اپنے عمال کی حرکتوں سے تنگ آکر اکثر بغاوت کر بیٹھتے تھے۔ اس زمانہ میں یہ دستور تھا کہ خلیفہ اور اس کے بیٹوں کو جب ضرورت ہوتی، وہ عمال طنجہ سے ایسی کھالیں طلب کرتے تھے جو حاملہ بکریوں کا پیٹ چاک کرکے ان کے بچوں سے حاصل کی جاتی تھیں۔ اسی کے ساتھ یہ شرط بھی لگا دیتے تھے کہ چمڑا شہد کے رنگ کا ہونا چاہئے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا کہ سو سو بکریاں ذبح کی جاتیں اور ان میں ایک چمڑا بھی شرائط کے مطابق نہ ملتا یہ بات بربریوں کی تکلیف اور ان کی برہمی کا باعث بنتی تھی۔ (۶۶)

انسان کو جب اقتدار ملتا ہے تو اپنی بڑائی کے زعم میں وہ کیسی کیسی حرکتیں کرتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اس کے اوپر بھی ایک صاحب اقتدار ہے اور عنقریب اس حال میں اس کے یہاں حاضر کیا جائے گا کہ وہ اس کے سامنے بکری سے بھی زیادہ بے زور ہوگا اور ایک مرے ہوئے بچہ سے بھی زیادہ بے حقیقت۔ تاریخ کا سب سے عجیب المیہ یہ ہے کہ انسان نے تاریخ سے سبق نہیں سیکھا۔

اسلام یہ ہے کہ لوگوں کو جہنم سے آگاہ کرنے کی مہم چلائی جائے نہ کہ سیاسی اور سماجی مسائل کو حل کرنے کے لئے

لوگ خوش ہو رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کوئی بہت بڑا قلعہ فتح کر لیا ہے۔ گویا فتح مبین" دوبارہ نئی شکل میں واپس لوٹ آئی ہے۔ مگر میرا دل غم سے پھٹا جا رہا ہے۔ شاید میرے جیسے آدمی کے لئے اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ وہ جنگل میں چلا جائے۔ جنگل کے درخت کسی خدا کے بندے کے لئے زیادہ بہتر ہم نشیں ہیں۔ چڑیوں کے نغموں میں انسانوں کے قہقہوں اور تقریروں سے زیادہ بامعنی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ایک انتہائی ہولناک قسم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہر اس شخص کا انتظار کر رہی ہے جس کی موت اس حال میں آجائے کہ اس کا خدا اس سے راضی نہ ہو۔ یہی سارے انسانوں کا اصل مسئلہ ہے اور اسی سے تمام قوموں کو آگاہ کرنے کے لئے مسلمان، اس زمین پر خدا کے گواہ بنائے گئے ہیں۔ مسلمان کی فتح یہ ہے کہ وہ صحیح معنوں میں اس حقیقت کا گواہ بن کر لوگوں کے سامنے کھڑا ہو سکے۔ اس کی شکست یہ ہے کہ وہ اپنی اس ذمہ داری کو ادا کرنے میں ناکام رہے۔

مسلمان کے کسی عمل کی قیمت صرف اس وقت ہے جب کہ اس کے رب کے نزدیک اس کا کوئی تعلق گواہی کے نازک کام سے ثابت ہو سکے۔ اس حیثیت سے دیکھئے تو یہ سارے ہنگامے نہ صرف غیر متعلق ہیں بلکہ وہ ہمارے لئے جرم کا درجہ رکھتے ہیں۔ مسلمان کو اس دنیا میں اس لئے کھڑا کیا گیا تھا کہ وہ لوگوں کو آخرت کے عذاب و ثواب کی خبر دیں۔ مگر اپنی

الرسالہ مئی ۱۹۷۷

"انقلابی" تحریکوں سے وہ لوگوں کو صرف دنیا کے عذاب ثواب کی خبر دے رہے ہیں۔ کتاب آسمانی کے حامل گروہ کے لئے اس قسم کی سرگرمیاں بلاشبہ جرم کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ لوگوں کو مسائل آخرت کی طرف متوجہ کرنے کے بجائے مسائل دنیا کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ یہ الٹی گواہی ہے جو قیامت کے دن ہمارے لئے بہت بڑا وبال بننے والی ہے۔ اس کی سنگینی ممکن ہے دنیا کی زندگی میں سمجھ میں نہ آئے۔ مگر اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ مرنے کے بعد وہ اس تلخ حقیقت کو اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اگرچہ اس وقت کا دیکھنا ان کے کچھ کام نہ آئے گا۔

پھر دنیوی نتائج کے اعتبار سے بھی اس قسم کے ہنگاموں کی کوئی قیمت نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی سیاسی انقلاب خواہ وہ کتنا ہی کامیاب ہو، وہ صرف اسی کے حق میں مفید بنتا ہے جس نے انقلاب سے پہلے اس کے لئے تیاری کی ہو۔ یہ درس ہم کو دو سو برس پہلے مل چکا تھا۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ لوگ آج بھی اس سے اتنا ہی بے خبر ہیں جتنا کہ وہ کبھی پہلے تھے۔ آج بھی وہ صرف "انقلاب زندہ باد" جیسے نعروں کے لئے جوش و خروش دکھاتے ہیں۔ خود اپنی تعمیر و استحکام کے لئے ان کے اندر کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی جو کہ قوموں کے لئے کرنے کا اصل کام ہے۔

اٹھارویں صدی کے وسط (۹۶-۱۷۴۳) میں شاہ ولی اللہ دہلوی نے احمد شاہ ابدالی کے ذریعہ ملک کے

سکھوں اور مرہٹوں پر حملے کرائے۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور ان کے ساتھیوں نے ۱۸۳۱ء میں سکھ راجہ سے مقابلہ کرتے ہوئے جان دے دی۔ ان کوششوں سے سکھوں اور مرہٹوں کا زور تو کسی درجہ میں ٹوٹ گیا مگر اس کے بعد ۱۸۵۷ کے انقلاب نے جو چیز برآمد کی وہ، ہماری امیدوں کے برعکس، انگریز تھے نہ کہ دہلی کی مغل سلطنت۔ اس وقت انگریز زیادہ تیار اور زیادہ منظم تھا۔ اس لئے وہی نئے حالات کا ماسٹر بن سکتا تھا۔

اب انگریزوں کو ختم کرنے کے لئے سو سالہ جد وجہد شروع ہوئی جس میں لاکھوں لوگ قربان ہو گئے۔ مگر ۱۹۴۷ میں جب تاریخ نے اپنا فیصلہ دیا تو معلوم ہوا کہ نئے انقلاب کے اندر سے نیشنل کانگریس کا راج برآمد ہو گیا ہے، نہ کہ ان لوگوں کا جن کو ہم نے بطور خود شیخ الہند، امام الہند اور مفتی اعظم کے خطابات دے رکھے تھے۔

اس کے بعد تیسرا دور آیا جب کہ نئے حکمرانوں کے تلخ تجربات نے "نان کانگریس ازم" کی تحریک پیدا کی ہمارے بھائی دوسروں کے ساتھ، اس میں بھی پیش پیش تھے، ۱۹۶۹ میں اس تحریک کو جزوی طور پر اور ۱۹۷۷ میں کلی طور پر کامیابی حاصل ہوئی۔ مگر اس کے بعد جو چیز برآمد ہوئی وہ جنتا کی جمہوریت تھی نہ کہ لوگوں کی خوش گمانی کے مطابق "خیر امت" کے لئے اس کا کھویا ہوا مقام۔

اس قسم کی منفی سیاست اتنی بار دہرائی گئی ہے اور اتنی بار ناکام ہوئی ہے کہ اب اس کو سیاست کہنا ہی، کم از کم میرے جیسے آدمی کے لئے، مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر اسی کا نام سیاست ہو تو مجھے نہیں معلوم کہ حماقت پھر کس چیز کا نام ہوگا۔

وحید الدین خاں

۵ مارچ ۱۹۷۷

مارچ ۱۹۷۷ کے الیکشن کے بعد ملک کی سیاست میں جو انقلاب آیا ہے اس طرح کے انقلابات کی دو ظاہری وجہیں قرآن میں بتائی گئی ہیں۔ ایک، انعام۔ دوسرے، امتحان۔

کبھی اللہ تعالیٰ اپنے کچھ بندوں کے بارہ میں ارادہ فرماتا ہے کہ نہ صرف آخرت میں بلکہ دنیا میں بھی ان کو غلبہ عطا کیا جائے۔ اس وقت وہ غالب گروہ کو اقتدار کے مقام سے ہٹا دیتا ہے اور اس کی جگہ اپنے پسندیدہ گروہ کو بٹھا دیتا ہے جو اب تک زمین میں کمزور سمجھے جا رہے تھے۔ ملک کے موجودہ حالات میں ایسی کوئی علامت نظر نہیں آتی کہ موجودہ انقلاب کو نصرت الٰہی کے اس قانون کے ذیل میں شمار کیا جائے۔

دوسری وجہ، اس طرح کے انقلابات کی امتحان ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی امتحان کی حالت میں ہے۔ قومیں اور جماعتیں بھی اپنے اپنے مقام پر اپنا امتحان دے رہی ہیں۔ فرد جب اپنا امتحان دے چکتا ہے تو موت کے فرشتے اس کو دار العمل سے اٹھا کر دار الجزا میں پہنچا دیتے ہیں۔ اسی طرح کوئی قوم یا جماعت جب علم الٰہی کے مطابق اپنے امتحان کی مدت پوری کر لیتی ہے تو اس کو میدان عمل سے ہٹا دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرے فریق کو کام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔

وہی سنت جو اس سے پہلے مغلوں اور انگریزوں کے حق میں ظاہر ہوئی تھی اب نہرو خاندان کے حق میں ظاہر ہوئی ہے۔ یہ امتحان کا معاملہ ہے نہ کہ انعام کا۔



ظفر الاسلام خاں

عیسائی پادری کا قبول اسلام

مصر کے ابراہیم خلیل فلپس اسلام لانے سے پہلے ایک اہم پادری شمار کئے جاتے تھے۔ انھوں نے مصری عیسائی اداروں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۲ میں پرنسٹن یونیورسٹی (امریکہ) سے مسیحی علوم میں ایم۔ اے حاصل کیا۔ امریکہ سے واپسی پر وہ اسیوط کے کلیۃ اللاہوت میں پروفیسر ہوگئے۔ ان کا کام اسلام کے بارے میں اپنے طلبہ کو تیار کرنا تھا جو کہ کالج سے فارغ ہو کر پادری کی حیثیت سے مشرقی کنیسہ (مصر و حبشہ) کے لئے کام کرتے تھے۔ تدریس کے دوران ان کو یہ خیال ہوا کہ کیوں نہ مستشرقوں پر اعتماد کرنے کے بجائے وہ خود اسلام کا مطالعہ کریں تاکہ اس پر طعن و تشنیع بہتر طریقے سے کر سکیں۔ لیکن نتیجہ کیا ہوا؟ خود ان کے الفاظ میں: "نتیجہ الٹا نکلا کیونکہ میرا ایمان متزلزل ہونے لگا اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا گویا میرے دل و دماغ میں کش مکش پیدا ہو گئی ہے۔ مجھے پتہ چلا کہ جو کچھ میں نے پہلے پڑھا اور پڑھایا تھا وہ سب محض تحریف اور جھوٹ تھا"

۱۹۵۴ میں ابراہیم خلیل کو جرمن سوِیس مشن کا مصر میں سکریٹری جنرل بنا کر اسوان بھیج دیا گیا جہاں ان کا اصل کام اس علاقے کے مسلمانوں کو عیسائی بنانا تھا۔ اسوان ہی میں اگلے سال (۱۹۵۵) کی ایک شام کو ریڈیو سنتے ہوئے ابراہیم خلیل نے سورہ جن کی ابتدائی آیتیں سنیں، جن کا ترجمہ یہ ہے: کہو میرے پاس وحی آئی ہے کہ جنات میں سے ایک گروہ نے قرآن کو سنا۔ پھر اپنی قوم سے جاکر کہا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو راہ راست بتاتا ہے۔ سو ہم اس پر ایمان لے آئے۔ اور ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گے۔

ان آیتوں نے ان کے دل و دماغ میں ایک آگ لگا دی اور انھوں نے اسی وقت قرآن شریف پڑھنا شروع کیا اور اگلی صبح تک پڑھتے ہی رہے۔ یہاں تک کہ وہ اس آیت شریفہ تک پہنچے: اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىِٕثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۠ ○

(وہ لوگ جو رسول نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جن کو وہ اپنے پاس توریت و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ ان کو نیک باتوں کا حکم دیتا ہے اور بری باتوں سے منع کرتا ہے اور

وہ مصر کے ایک بڑے عیسائی پادری تھے۔ اسلام کا مطالعہ انھوں نے مستشرقین کی کتابوں کے ذریعہ کیا تھا۔ پھر ان کو خیال ہوا کہ اسلام کو براہ راست سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ جب انھوں نے اسلام کو قرآن و حدیث سے سمجھنے کی کوشش کی تو وہ اس کی باتوں سے اتنا متاثر ہوئے کہ اسلام قبول کر لیا۔

پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال بتاتا ہے اور گندی چیزوں کو ان پر حرام کرتا ہے اور ان کے اوپر جو بوجھ اور طوق تھے، ان کو ان سے دور کرتا ہے۔ سو جو لوگ اس رسول پر ایمان لائے ہیں اور اس کی حمایت کرتے ہیں اور اس کی مدد کرتے ہیں۔ اور اس نور کا اتباع کرتے ہیں جو اس کے ساتھ بھیجا گیا ہے، ایسے لوگ ہی کامیاب ہونے والے ہیں

(۷ : ۱۵۷)

اس آیت کو پڑھ کر انھوں نے اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ کر لیا۔ صبح کو انھوں نے اپنی بیوی کو بتایا کہ انھوں نے طے کر لیا ہے کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ وہ بھاگی بھاگی اسوان میں مسیحی مشن کے صدر کے پاس گئی جو کہ شاڈنر نامی ایک سوئس آدمی تھا۔ اس نے گھبرا کر ان سے سوال کیا کہ کیا آپ کی بیوی کا کہنا درست ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ بالکل ٹھیک ہے۔ شاڈنر نے ان کو بہلانے کی بہت کوشش کی لیکن جب کامیاب نہ ہو سکا تو یہ کہتے ہوئے چلا گیا کہ آج سے اپنے آپ کو کام سے برخاست سمجھو۔ اسی کے ساتھ ساتھ شاڈنر نے سارے اسوان میں یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ ابراہیم خلیل پاگل ہو گئے ہیں۔ ابراہیم خلیل کو وہاں کے عیسائیوں نے اس قدر پریشان کیا کہ وہ اسوان چھوڑ کر قاہرہ آگئے۔ یہاں وہ اسٹینڈرڈ اسٹیشنری کمپنی میں ڈپٹی ڈائرکٹر (سیلز) ہو گئے اور ۱۹۵۹ تک کام کرتے رہے اور آخر کار ۲۵ دسمبر ۱۹۵۹ کو انھوں نے علانیہ اپنے مسلم ہونے کا اعلان قاہرہ کے امریکی مشن کے نام ایک تار میں کیا۔ اور قاہرہ گورنمنٹ کو درخواست دے دی کہ ان کے اسلام لانے کے سلسلے میں ضروری اجراءات پوری کی جائیں۔ اس عرصہ میں ان کے پاس کنیسہ کے بہت سے ذمہ دار بہکانے اور لبھانے آئے، مگر وہ اپنے موقف سے ہٹے اور مصری قانون کے مطابق گورنمنٹ کی ایک کمیٹی کے سامنے پیش ہو کر اپنے یقین و ارادہ کا اظہار کیا اور آخر کار ۲۱ مئی ۱۹۶۰ کو باقاعدہ طور پر ابراہیم خلیل فلپس سے ابراہیم خلیل احمد ہو گئے۔

اسلام لانے کے بعد جذبۂ ایمانی سے سرشار ابراہیم خلیل نے مصری مسجدوں اور رسالوں میں تقریریں کرنا اور کتابیں لکھنا شروع کر دیں جن میں وہ اسلام کے محاسن بیان کرتے اور لوگوں کو استشراقی و مسیحی خیالات سے آگاہ کرتے۔ ان کی کوششوں سے بہت سے عیسائی نوجوانوں کو نور ہدایت ملا۔ ان کی سرگرمیوں سے پریشان ہو کر مصری کنیسہ نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ ان کو روکا جائے۔ اس مرحلہ پر بات آجانے سے مصری وزارت داخلہ نے انھیں بلا کر تنبیہ کی اور انھیں وطنی اتحاد کے قانون (قانون الوحدۃ الوطنیۃ) کی زد میں آنے کی دھمکی دے کر خاموش کرنے کی کوشش کی۔ اس وجہ سے وہ سعودی عرب ہجرت کر گئے جہاں وہ کلیۃ الدعوۃ واصول الدین میں تدریس کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

ابراہیم خلیل احمد کی مؤلفات

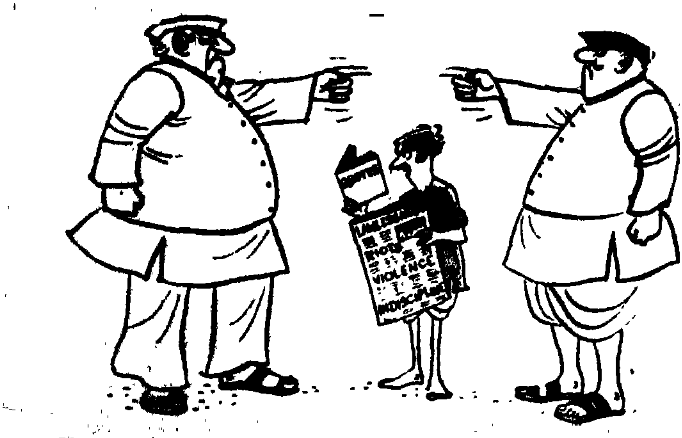
۱۔ محمد فی التوراۃ والانجیل والقرآن۔
۲۔ المستشرقون والمبشرون فی العالم العربی والاسلامی
۳۔ اسرائیل والتلمود
۴۔ الاستشراق والتبشیر وصلتہما بالاستعمار العالمی
۵۔ تاریخ بنی اسرائیل (تین اجزاء میں)
۶۔ الاسلام فی الکتب السماویۃ
۷۔ المسیح انسان لا الہ
۸۔ المخطط التبشیری والاستعماری
۹۔ اعرف عدوک : اسرائیل عقیدۃ وسیاسۃ

جائز حدود میں وسعت ناجائز حدود میں جانے کا راستہ بند کردیتی ہے

۱آبادی سے متعلق اقوام متحدہ کی رپورٹ (شائع شدہ ۱۹۷۶ء) میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۷۵ء کے اختتام تک دنیا کی آبادی تین ارب ۸۹ کروڑ ۸۰ لاکھ تھی۔ اس میں عورتیں ۵۲ فی صد اور مرد ۴۸ فی صد ہیں۔ گویا تقریباً چار ارب کی آبادی میں مردوں کی نسبت ۴۴ کروڑ عورتیں زیادہ ہیں۔

یہ کوئی اتفاقی بات نہیں۔ جنگ اور مختلف حادثات کی وجہ سے ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ آبادی میں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلہ میں زیادہ ہو جاتی ہے۔ ۱۸۹۰ء اور ۱۹۰۱ء کے درمیان برطانیہ، فرانس، جرمنی، سویڈن، اسپین، آسٹریلیا وغیرہ مغربی ملکوں میں جو مردم شماری ہوئی، اس میں مجموعی طور پر تقریباً ۴۰ لاکھ عورتیں زیادہ تھیں۔ یک زوجگی کے اصول کے مطابق دیکھا جائے تو ان ۴۰ لاکھ یا مذکورہ بالا ۴۴ کروڑ عورتوں کے شوہر مہیا نہیں ہو سکتے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ان "فاضل" عورتوں سے کہہ دیا جائے کہ تم اپنے دلوں سے مرد کی خواہش ہمیشہ کے لئے نکال دو۔ ظاہر ہے کہ ایسا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی معاشرہ کو، جہاں یک زوجگی کا اصول نافذ ہے، اس کا حل صنفی انارکی کی صورت میں تلاش کرنا پڑا۔

اسلام اس کا بالکل سادہ اور فطری حل یہ پیش کرتا ہے کہ: تم عدل کی شرط کے ساتھ حسب ضرورت ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرلو (نساء-۳) اسلام نے اپنے اس چھوٹے سے قانون کے ذریعہ کروڑوں عورتوں کو اپنے دوسرے ہم جنسوں کے برابر حقوق دے کر مساوات کی صف میں کھڑا کردیا۔ انسان کی خصوصیت یہ ہے کہ کسی کام کے جائز راستے بند ہو جائیں تو وہ ناجائز ذرائع سے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ خدائی قانون نے جائز حدود میں وسعت پیدا کرکے ناجائز راستوں میں جانے کا راستہ بند کردیا۔



"When you point your finger accusingly at some one, three of your fingers are pointing back at you." "

چین کا سفر

کے ۔ کے ۔ سود

مضمون نگار آل انڈیا ریڈیو کے نامہ نگار ہیں۔ وہ نومبر ۱۹۷۱ میں ٹیبل ٹینس کے ہندستانی کھلاڑیوں کی ایک ٹیم کے ساتھ چین گئے تھے۔

شہر پیکنگ کو پہلی بار دیکھنے والا آدمی دھوکے میں پڑجاتا ہے۔ چین کی یہ راجدھانی چین میں کسی ٹکنکل اور صنعتی ترقی کا پتہ نہیں دیتی۔ یہاں اسکائی اسکریپر (کثیر منزلہ عمارتیں) نہیں۔ سڑکوں پر زیادہ تر سائکلیں نظر آتی ہیں یا پیدل چلنے والے۔ کہا جاتا ہے کہ چار ملین آبادی کے اس شہر میں ایک ملین سائکلیں ہیں۔

دنیا کی دوسری راجدھانیوں کی طرح یہاں سڑکوں پر کاروں کا منظر دکھائی نہیں دیتا۔ یہاں بہت ہی کم کاریں ہیں۔ وہ بھی یا تو غیر ملکیوں کی ہیں یا حکومت کی۔ چین کے ترقیاتی منصوبہ کی فہرست میں "کار" کا مقام بہت پیچھے ہے۔ اسی طرح چین میں اسکوٹر اور موٹر سائکلیں بھی نہیں۔ البتہ عام شہریوں کے لئے چین میں منظم بس سروس کا انتظام کیا گیا ہے۔ یہاں سڑکیں عموماً اچھی اور چوڑی ہیں۔

اوپر سے پیکنگ قدیم طرز کا ایک شہر معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کے نیچے انتہائی جدید قسم کا زمین دوز ریلوے کا نظام ہے۔ اس کی لمبائی تقریباً ۲۳ کیلومیٹر ہے۔ اس کی تعمیر ۱۹۶۹ میں ہوئی تھی۔ چینیوں کا کہنا ہے کہ یہ تمام تر چینی انجینیروں نے بنایا تھا۔

یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ چین نے بڑی حد تک غریبی کو ختم کر دیا ہے۔ اگرچہ جاپان جیسے کسی ملک سے چین کا عام معیار

الرسالہ مئی ۱۹۷۷

الرسالہ مئی ۱۹۷۷

ایک پچھڑا ہوا ملک صرف ۲۵ سال میں اپنے مسائل حل کر سکتا ہے، بشرطیکہ وہ ذاتی وسائل پر انحصار، محنت اور ایمانداری کا طریقہ اختیار کرے

ایسا نہ ہو تو سو سال کی مدت بھی کسی ملک کے سنبھلنے کے لئے کافی نہیں۔

زندگی کمتر نظر آتا ہے مگر وہاں بھوک کے مارے انسان کہیں دکھائی نہیں دیتے، وہ سادہ غذائیں کھاتے ہیں، جسمانی تربیت بہت عام ہے۔ سڑکوں پر ہزاروں لڑکے ورزش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی وجہ سے چین نے اپنے شہریوں کی جسمانی صحت کا معیار بہت بہتر بنالیا ہے۔

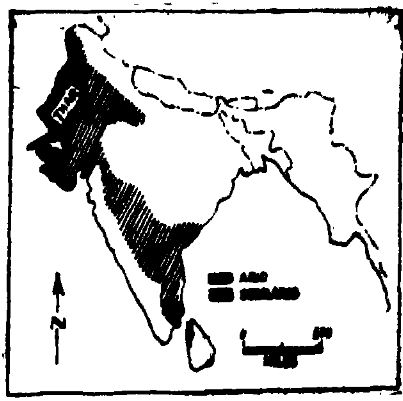
چینی حکومت نے رہائش کے معیار کو بہتر بنانے کے لئے شہروں میں کئی منزلہ کوارٹر بنائے ہیں۔ مگر عام طور پر لوگ ان میں جانا پسند نہیں کرتے۔ وہ اپنے قدیم طرز کے مکانوں میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں جہاں وہ اپنے مختصر صحن میں کچھ سبزیاں بھی اگا سکیں۔

چین میں تقریباً نصف درجن نو آبادیاتی طاقتیں پچھلی صدیوں میں استحصال کرتی رہی ہیں۔ مگر آزادی کے بعد صرف ۲۵ برسوں میں چین نے خود کفیل معیشت تعمیر کرلی ہے اور اپنے عوام کا معیار زندگی بھی بلند کرلیا ہے۔ چین میں ہر آدمی کام میں مصروف نظر آتا ہے خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ مرد ہو یا عورتیں۔

یہ ریگستان!

ہماری زمین کا ۲۰ ملین مربع کیلو میٹر رقبہ یا تو ریگستان ہے یا ناقابل زراعت۔ یہ مقدار زمین کے زیر کاشت رقبہ کے مقابلہ میں پانچ ملین مربع کیلو میٹر زیادہ ہے۔ مختلف قدرتی اور انسانی اسباب سے اس ریگستانی رقبہ میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شمالی افریقہ کا صحرا ہر سال تقریباً ایک لاکھ ہیکٹیر زمین کو ریگستان بنا رہا ہے۔ ہندستان میں راجستھان کے ریتیلے میدانوں کے بارے میں اندازہ ہے کہ وہ ہر سال ایک کیلو میٹر کی رفتار سے بڑھ رہے ہیں۔ پچھلے پچاس برس سے مسلسل یہ صورت حال جاری ہے۔ اکونومک اینڈ سائنٹفک ریسرچ فاؤنڈیشن کی تحقیق کے مطابق ہندستان اپنی قابل کاشت زمین کا ایک فی صد حصہ ہر سال کھو رہا ہے۔ کیونکہ وہ مسلسل ریگ زار کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

پانی کا نہ ہونا کسی علاقہ کے ریگستان ہو جانے کا بنیادی سبب ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان علاقوں کے



لئے پانی کہاں سے لایا جائے۔ اس کا سب سے بڑا ذریعہ زمین کے نیچے کا پانی ہے بشرطیکہ ریگستان کے نچلے طبقات میں پانی موجود ہو۔ دوسرا ذریعہ نہریں ہیں جو ایک مقام سے دوسرے مقام کو پانی کے ذخائر منتقل کرتی ہیں۔ ریگستان کے کنارے کے علاقوں میں درخت لگانا بھی اس کا ایک جزوی حل ہے۔

اسرائیل نے اپنے ریگستانوں کو کارآمد بنانے کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ دریائے اردن سے نہریں نکال کر اس کا فاضل پانی ریگستانوں میں لے جایا جاتا ہے۔ وہ پانی جو بالآخر بہہ کر بحر مردار میں گر جاتا، اس کو ریگستانی علاقوں کو سرسبز کرنے میں استعمال کیا جا رہا ہے۔

ہندستان میں تین لاکھ ۲۰ ہزار مربع کیلو میٹر زمین ریگستان ہے، جس کا بڑا حصہ راجستھان میں ہے۔ (۶۲ فی صد) اگر اس کو قابل کاشت بنایا جا سکے تو نہ صرف ہمارا غذا کا مسئلہ حل ہو جائے بلکہ ہم غذائی اشیاء کو برآمد کرنے کے قابل ہو جائیں۔

گنگا اور جمنا کے سیلابی پانی کے رخ کو مصنوعی طور پر موڑ کر راجستھان اور گجرات کے ریگستانوں میں پہنچایا جا سکتا ہے۔ سیلاب کے پانی میں زرخیز مٹی بڑی مقدار میں ملی ہوئی ہوتی ہے، اس لئے اگر یہ عمل جاری رکھا جا سکے تو دس سال میں ریگستان کی مٹی کو بدلا جا سکتا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ان ریگستانوں کے نیچے "خاموش دریا" پائے جاتے ہیں اور ان کے پانی کو اوپر لا کر بھی ان علاقوں کو سیراب کیا جا سکتا ہے۔

عرب ملکوں اور دوسرے ریگستانی علاقوں میں اس مسئلہ کی تحقیق پر کثیر رقم خرچ کی جا رہی ہے۔ ▬

کے کھاری پانی کو آب پاشی کے لئے استعمال کرنے کے طریقے دریافت کئے جارہے ہیں۔ مصنوعی بارش اور مصنوعی شبنم پیدا کرنے کے تجربے ہورہے ہیں۔ امریکہ کی نیشنل سائنس فاؤنڈیشن نے اپنے سہ ماہی جرنل کا خصوصی نمبر اس کے بارے میں شائع کیا ہے جو اس موضوع پر اب تک کی تحقیقات و نتائج کا نہایت قیمتی مجموعہ ہے۔

قدرت نے زمین کو عجیب ڈھنگ سے بنایا ہے۔ یہاں کہیں زرخیز مٹی ہے، کہیں ریگستان، کہیں پہاڑ ہے کہیں سمندر، کہیں جنگل ہے کہیں بیابان۔ ان میں سے ہر ایک کا ایک مصرف ہے۔ انسان کو عقل اسی لئے دی گئی ہے کہ وہ ان میں سے ہر ایک کے امکانات کو جانے اور ان کو انسانی مفاد کے لئے استعمال کرے۔ مگر یہی تاریخ کا عجیب المیہ ہے کہ انسان نے ہمیشہ اپنی عقل کو تعمیر سے زیادہ تخریب کے کاموں میں استعمال کیا ہے۔ ◀

آخرت کا تصور نہ ہو تو انسانی زندگی جنگل کی زندگی بن جاتی ہے

واشنگٹن میں ولسن اسکول فار ٹیچرس کے نام سے معلمین کی تربیت کے لئے ایک ادارہ قائم ہے۔ اس ادارہ میں غیر ملکیوں کو انگلش سکھانے والے شعبہ کی ایک خاتون استاد، لاطینی امریکہ کے طلبہ کو امریکی معاشرہ کی روایات کے بارہ میں لکچر دے رہی تھیں۔ لکچر کے خاتمہ پر گوئٹے مالا کی ایک خاتون طالب علم نے کہا: میں نے دیکھا ہے کہ یہاں چودہ سال کی لڑکیاں اور پندرہ سال کے لڑکے مکمل جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں۔ اور یہ اس قسم کے تعلقات کے لئے بہت زیادہ قبل از وقت ہے۔"

امریکی خاتون استاد نے نہایت جوش سے جواب دیا:

"زمین پر ہماری زندگیاں انتہائی مختصر ہیں۔ یہاں اتنا موقع نہیں کہ ہم چودہ سال سے زیادہ اپنا وقت ضائع کریں" (امریکا التی رأیت، از سید قطب)

یہ حقیقت ہے کہ اگر آخرت کے تصور کو نکال دیا جائے تو ہر قسم کی اخلاقی پابندیاں اور انسانی احتیاط بالکل بے معنی ہو جاتی ہیں۔ اگر زندگی یہی دنیا کی زندگی ہو اور اس کے بعد آدمی ہمیشہ کے لئے مٹ جانے والا ہو تو کیوں وہ دنیا کی لذتوں اور آسائشوں کے بارہ میں کسی قسم کی پابندی قبول کرے۔ اس کے برعکس اگر انسان کے ذہن میں یہ بات بٹھادی جائے کہ موت کے بعد بھی زندگی کا تسلسل جاری رہتا ہے۔ موت کے بعد لذت اور الم ہے تو موجودہ مختصر دنیا اس کے لئے بے حقیقت ہو جائے گی اور وہ اگلی طویل زندگی کو بہتر بنانے کے لئے ہر قسم کی اخلاقی بندشوں کو خوشی سے قبول کرے گا۔ ولوڈ ریڈی نے لکھا ہے:

"کیا اس دنیا کے علاوہ کوئی اور دنیا ہے جہاں ہمارے عمل کے مطابق ہم کو بدلہ دیا جائے گا۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس سے ہمارا مفاد بہت زیادہ وابستہ ہے۔ موجودہ زندگی بہت مختصر ہے اور اس کی خوشیاں بے حد معمولی ہیں۔ جب ہم وہ کچھ حاصل کر لیتے ہیں جو ہم چاہتے ہیں تو موت کا وقت قریب آچکا ہوتا ہے، اگر یہ واضح ہو سکے کہ ایک خاص طریقہ پر زندگی گزارنے سے دائمی خوشی حاصل ہو سکتی ہے تو بیوقوف یا پاگل کے علاوہ کوئی بھی شخص اس طرح زندگی گزارنے سے انکار نہیں کرے گا"

مارشائرڈم آف مین ۱۹۴۱

جس کی نحو کمزور تھی وہ تاریخ کا سب سے بڑا نحوی بن گیا

وقتی مقبولیت یا نامقبولیت تاریخ کے فیصلہ کو متاثر نہیں کرتی

مشہور نحوی سیبویہ (م ۱۷۷ھ) ایران میں پیدا ہوا اور بصرہ میں پرورش پائی۔ اس کی نوجوانی کا واقعہ ہے جب کہ وہ حدیث وفقہ کا طالب علم تھا۔ ایک دن وہ حماد بن سلمہ کی مجلس میں تھا۔ وہ حدیث کی املا کرا رہے تھے۔ ایک حدیث آئی:

لیس من اصحابی احد الا لو شئت لاخذت علیہ لیس ابا الدرداء

سیبویہ یہ سن کر بول اٹھا: لیس ابو الدرداء۔ اس پر حماد نے چلا کر کہا: سیبویہ تم غلطی پر ہو۔ یہ استثناء ہے (اس لئے ابو کے بجائے ابا ہے)۔ سیبویہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے جی میں کہا کہ میری نحو کمزور ہے اور مجھے اس میں مہارت پیدا کرنی چاہئے۔ اب اس نے نحو سیکھنا شروع کر دیا۔ وہ بصرہ وکوفہ کے نحوی علماء، خلیل، یونس اور عیسیٰ بن عمر کی مجلسوں میں جانے لگا۔ اس نے اس فن میں اتنی محنت کی کہ بالآخر وہ اس کا امام بن گیا۔ نحو وادب کے شاذ مسائل میں اس کا کوئی ثانی نہ رہا۔ اس کے بعد اس نے نحو پر ایک ایسی کتاب لکھی جو اپنی اہمیت اور بلندی کی وجہ سے "الکتاب" کے نام سے مشہور ہے۔ اس فن کے علماء کا کہنا ہے کہ فن نحو پر اس کے برابر کی کوئی کتاب آج تک لکھی نہ جا سکی۔ کسائی کے متعلق بھی اسی قسم کا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔

آخری دور میں سیبویہ بغداد چلا گیا۔ یہاں مشہور نحوی عالم کسائی (م ۱۸۹ھ) تھا۔ وہ ہارون رشید کے لڑکے امین کا اتالیق تھا۔ ایک بار یحییٰ بن خالد برمکی وزیر کے زیر اہتمام دونوں کے درمیان مناظرہ ہوا۔ اس مجلس میں کسائی نے سیبویہ کے سامنے عربی کا یہ جملہ دہرایا:

کنت اظن ان العقرب اشد لسعۃ من الزنبور فاذا ھو ایاھا

کسائی نے پوچھا: اس جملہ میں صحیح زبان کا طریقہ کیا ہے۔ سیبویہ نے جواب دیا کہ جملہ کے آخر میں "ایاھا" کی منصوب ضمیر لانا جائز نہیں ہے۔ صحیح جملہ یوں ہوگا: فاذا ھو ھی۔

کسائی نے کہا نہیں۔ عرب اس کو دونوں طریقے سے بولتے ہیں۔ بحث بڑھی تو دونوں نے مسئلہ کا فیصلہ کرانے کے لئے ایک فصیح اللہجہ دیہاتی عرب کو حکم بنایا۔ اس سے جب پوچھا گیا تو اس نے سیبویہ کو صحیح بتایا۔

مگر کسائی شہزادہ امین کا اتالیق تھا۔ مزید یہ کہ وہ کوفی تھا اور سیبویہ ایرانی۔ اور جیسا کہ معلوم ہے، خلفاء عباسیہ کوفہ والوں کی طرف داری کرتے تھے۔ امین نے اپنے کوفی استاد کی حمایت میں تعصب سے کام لیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر دیہاتی بھی ڈر گیا اور اس نے بعد کو کسائی کی موافقت کر دی۔ اب معاملہ سنگین ہو گیا حتی کہ سیبویہ کو اندیشہ ہوا کہ اس کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ وہ بغداد کو چھوڑ کر ایران بھاگ گیا۔ وہاں شیراز کے قریب ایک گاؤں بیضاء میں اپنی زندگی کے بقیہ دن گزار دیئے۔ یہاں چالیس سال سے کچھ زیادہ کی عمر پا کر اس کا انتقال ہو گیا۔

نصف صدی بعد بھی

ندوۃ العلماء لکھنؤ کے انیسویں اجلاس (مارچ ۱۹۲۵) میں نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے خطبہ صدارت پڑھا تھا۔ پچاس برس پہلے ہمارے دینی مدارس کا جو حال تھا، اس کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"ہمارے مدارس کی بے سروسامانی اس سے ظاہر ہے کہ حال میں جو فتنہ ارتداد پھیلا تو ہر طرف سے یہ صدائیں بلند ہیں کہ تعلیم تبلیغ کے واسطے جماعتیں قائم کی جائیں۔ یعنی قدیم تعلیم اور جماعتیں اس ضرورت کے لئے بھی ناکافی ہیں۔ اور واقعہ بھی یہی ہے۔ تقریر اور تحریر دونوں کی وہ قوت نہیں جو سننے اور پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر سکہ جما دے۔ معلومات، کتابوں کے ضمائر اور اشارات تک، شروح و حواشی قدیمہ کی عبارات تک محدود۔ کام چلے تو کیونکر۔ شدید ضرورت داعی ہوئی جدید جماعتوں کے قیام کی۔"

ان سطروں کو لکھے ہوئے پچاس برس گزر گئے مگر ہمارے اداروں کا یہ خلا بدستور باقی ہے۔

غیر مسلموں میں اسلام کا پیغام پہنچانے کے لئے آج پہلے سے بھی زیادہ بڑی تعداد میں مبلغین کی ضرورت ہے۔ یورپ میں مذہب کو از سر نو جاننے کا زبردست رجحان پیدا ہو گیا ہے اور دوسرے مذاہب کے لوگ تیزی سے ان کے درمیان گھس رہے ہیں۔ مگر ہمارے مدارس کے پاس ایسے لوگ نہیں جو اہل یورپ کو اسلام کا پیغام دے سکیں۔ افریقہ کی مقامی زبانوں میں اسلامی لٹریچر کی بے حد مانگ ہے، مگر ہمارے یہاں ایسے لوگ مفقود ہیں جو ان زبانوں میں اسلامی کتابوں کا عمدہ ترجمہ کر سکیں۔ جدید اسلوب اور جدید استدلال کے ساتھ اسلامی کتابیں تیار کرنے کی ضرورت کا ہر طرف سے تقاضا ہو رہا ہے۔ مگر ہمارے رہنما جذباتی تقریروں کے سوا اور کوئی چیز آج کے انسان کو نہیں دے سکتے۔

ہندستان میں خود غیر مسلم جماعتیں اپنے اہتمام سے ایسے اجتماعات کرتی ہیں جن میں مختلف مذاہب کے لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ وہاں آکر اپنے مذہب کا تعارف کرائیں مگر اس ذمہ داری کو ادا کرنے والے آدمی بھی ہمارے پاس نہیں۔

الرسالہ مئی ۱۹۷۷

پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴) کے زمانہ میں جب عرب دنیا ترکی کی عثمانی خلافت کے "جوئے" سے رہائی کو اپنے لئے عظیم نجات تصور کئے ہوئے تھی، ان کے درمیان ایسے لوگ بھی تھے جو اس کے دور رس عواقب کو سمجھتے تھے اور اپنے عرب بھائیوں کو اس سے آگاہ کر رہے تھے۔

مثال کے طور پر امیر شکیب ارسلان (۱۹۴۶-۱۸۶۹) نے اسلامی اتحاد کی اہمیت کو محسوس کیا اور عربوں کو ترکوں کے خلاف بغاوت سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اگرچہ اس کے صلے میں انھیں یہ تحفہ ملا کہ ان کو خوشامدی اور غدار کہا گیا۔ اس کا جواب انھوں نے اپنے ایک شعر میں اس طرح دیا تھا:

سیعلم قومی اننی لا اغشهم
ومهما استطال اللیل فالصبح واصل

(جلد ہی میری قوم جان لے گی کہ میں اس کو دھوکا نہیں دے رہا ہوں۔ رات خواہ کتنی ہی طویل ہو جائے، صبح بہرحال آنے والی ہے)

آپ بیتی

میں جب بنما شہ (از ستمبر ۱۹۶۲ تا جون ۱۹۶۳) میں میکگل یونیورسٹی (کناڈا) کے اسلامک ریسرچ اینڈ ایجوکیشن انسٹی ٹیوٹ سے بحیثیت معلم کے وابستہ تھا اس زمانہ میں ایک واقعہ پیش آیا کہ مئی ۱۹۶۳ کے پہلے ہفتہ میں انسٹی ٹیوٹ کی گورننگ باڈی کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں میں بھی شریک تھا اور پروفیسر ولفریڈ کینٹول اسمتھ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے اس میں صدر نشین تھے۔ ایجنڈے پر بہت سے تعلیمی مسائل کے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ انسٹی ٹیوٹ کے ایک طالب علم مسٹر مشیر الحق (حالیہ پروفیسر اسلامیات جامعہ ملیہ) ایم۔ اے کا امتحان دے چکے تھے اور اب وہ پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ چاہتے تھے۔ میٹنگ میں جب یہ مسئلہ زیر غور آیا تو پروفیسر اسمتھ نے کہا کہ مشیر ایم۔ اے کے امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہو جائیں گے اور اس بنا پر پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ اور ان کے اسکالرشپ کے مستحق ہوں گے ہی لیکن اس سلسلہ میں انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ہمیں اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ مشیر شادی شدہ ہیں اور ان کے بچے بھی ہیں اور مشیر کو ان سے جدا ہوئے دو برس ہو چکے ہیں۔ اب اگر یہ پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ لیتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اب مزید تین برس اور یہ اپنی بیوی بچوں سے جدا رہیں گے اور یہ ایک جوان میاں بیوی کے لئے نامناسب بات ہے، اس بنا پر میں دو تجویزیں پیش کرتا ہوں۔ ایک یہ کہ مشیر کے لئے ہندوستان آنے جانے کا انتظام کیا جائے تاکہ وہ موسم گرما کی تعطیل کے تین مہینے اپنے بچوں میں گزار لیں اور دوسری تجویز یہ ہے کہ ان کی بیوی اور بچوں کو یہاں بلا دیا جائے اور ان کے اسکالرشپ کی رقم میں اتنا اضافہ کر دیا جائے کہ سب لوگ آسانی سے گزر کر سکیں۔ کچھ دیر بحث و گفتگو کے بعد اسمتھ صاحب کی دونوں تجویزوں کو علی سبیل التبادل نہیں بلکہ علی سبیل الاجتماع منظور کر لیا گیا۔ چنانچہ مشیر صاحب ہندوستان آئے، تین مہینے کے قریب یہاں رہے اور پھر اپنی بیوی بچوں کو لے کر کناڈا واپس لوٹ گئے۔

(مولانا) سعید احمد اکبرآبادی (پیدائش ۱۹۰۸)
ہمدرد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، تغلق آباد، نئی دہلی

آدمی اسی چیز کو کھو رہا ہے جس کو وہ سب سے زیادہ پانا چاہتا ہے

لوگوں کی دوڑ دھوپ آج کس چیز کے لئے ہے۔ کھانا، کپڑا، مکان، عزت، خوش حالی اور پُر مسرت زندگی۔ ہر شخص اپنی ساری زندگی کو انھیں چیزوں کے حصول اور ترقی میں لگائے ہوئے ہے۔

مگر موت کا واقعہ بتاتا ہے کہ آدمی موجودہ دنیا میں اپنے اس مطلوب کو انتہائی عارضی مدت کے لئے حاصل کرتا ہے۔ ان چیزوں کو پانے کی اصل جگہ وہ دنیا ہے جہاں آدمی کو ہمیشہ رہنا ہے۔ لوگ اپنی ساری طاقت دنیوی مستقبل کی تعمیر میں لگائے ہوئے ہیں، اُخروی مستقبل کی تعمیر کی کسی کو فکر نہیں۔ زندگی کے اگلے طویل تر مرحلہ میں وہ اسی چیز کو کھو رہے ہیں جس کو وہ موجودہ عارضی دنیا میں سب سے زیادہ پانا چاہتے ہیں ——— کیسی عجیب ہے یہ محرومی۔ مگر کوئی نہیں جو اس پر سوچنے کے لئے تیار ہو۔

سعودی عرب کے نائب وزیر اعظم شہزادہ فہد ۲۱ اکتوبر ۱۹۷۵ کو لندن پہنچے تو ان کا استقبال "اس روایتی شان کے ساتھ کیا گیا جو الف لیلہ کے دور میں کسی اسلامی خلیفہ کا ہو سکتا تھا" اخبار (ہندستان ٹائمس ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۵) کے الفاظ میں "زمین کے اس سب سے اہم آدمی" نے ایک اقتصادی معاہدہ پر دستخط کئے جس کے مطابق برطانیہ کو ۷۰ ملین ڈالر کے پانچ سالہ منصوبہ میں سعودی عرب کی غیر معمولی امداد حاصل ہوگی۔ اخبار نے اس خبر کی سرخی قائم کی:

BRITAIN BOWS BEFORE OIL CALIPH

مشرق وسطیٰ کے تیل نے دنیا کی سیاست کا نقشہ جس طرح بدلا ہے، اس میں ایک سبق یہ بھی ہے کہ اس نے اس مفروضہ کو بے بنیاد ثابت کر دیا کہ "اسلام کا زمانہ ختم ہو چکا۔" اسلام کی مغلوبیت حقیقۃً کسی نظریاتی کمزوری کی وجہ سے پیدا نہیں ہوئی تھی بلکہ صرف اس عملی واقعہ کا نتیجہ تھی کہ مغربی قومیں اقتصادی قوتوں پر چھا گئیں اور مسلم قومیں اس دوڑ میں پیچھے رہ گئیں۔ اب جیسے ہی شرق اوسط کے تیل نے مسلم قوموں کی اقتصادی پس ماندگی کی تلافی کی، صورت حال بدلنے لگی۔ اور "اسلام" کا لفظ ماضی کے بجائے حال کا نشان بن گیا۔

سودی اقتصادیات کے خلاف

اکیسویں کامن ویلتھ پارلیمنٹری کانفرنس اکتوبر ۱۹۷۵ کے آخری ہفتہ میں نئی دہلی میں ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں ۲۷ اکتوبر کو ایک سیمینار ہوا جس کا عنوان تھا:

PROBLEM OF DEBT REPAYMENT FOR DEVELOPING COUNTRIES

"زیر ترقی ممالک کے لئے قرضوں کی ادائیگی کا مسئلہ" اس موقع پر ممبران کی طرف سے مطالبہ کیا گیا کہ ترقی یافتہ ممالک زیر ترقی ممالک کو بلا سود (انٹرسٹ فری) قرضے دیں۔ تاکہ یہ قرضے مقروض ملکوں کے لئے زیادہ بامعنی بن سکیں۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ شکل میں یہ قرضے عملاً بے معنی ثابت ہو رہے ہیں۔ کیونکہ سود کے ساتھ قرضوں کی ادائگی کی وجہ سے زیر ترقی ممالک کے وسائل دوبارہ ترقی یافتہ ملکوں کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ جب کہ معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہئے تھا۔

ہندستان کے پارلیمنٹری نمائندہ مسٹر پی راجو نے بتایا کہ ہندستان کے اوپر جو بیرونی قرضے ہیں، ان کی مقدار موجودہ مالی سال کے خاتمہ تک سات ہزار کروڑ ہو جائے گی۔ یہ قرضے بالاقساط ادا کئے جاتے ہیں۔ مگر جہاں تک سود کا تعلق ہے، وہ پوری رقم پر ہر سال دینا ہوتا ہے۔ اور یہ ادائگی بھی ظاہر ہے کہ بیرونی سکہ میں ہوتی ہے۔ چنانچہ ہندستان کی برآمدی کمائی کا ۲۵ فی صد بیرونی قرضوں کی ادائگی میں چلا جاتا ہے۔ مسٹر راجو نے کہا کہ بیرونی تجارت کا توازن اس وقت ایک ہزار کروڑ روپیہ کے بقدر ہندوستان کے خلاف ہے۔ ایسی حالت میں وہ کس طرح اپنے اقتصادی وجود کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وقت آگیا ہے کہ سودی قرضوں کو، کم از کم غذا، ایندھن اور کھاد میں بالکل ختم کر دیا جائے۔

(ہندستان ٹائمس یکم نومبر ۱۹۷۵)

اندھاپن

انڈین کونسل آف میڈیکل ریسرچ کے ایک سروے کے مطابق ہندستان کی ۶۰۰ ملین آبادی میں آٹھ ملین سے زیادہ لوگ اندھے ہیں۔ بتایا گیا ہے کہ اندھے پن کی شرح، مسلمانوں کے مقابلہ میں، ہندوؤں میں زیادہ پائی جاتی ہے۔

(ہندستان ٹائمس ۵ نومبر ۱۹۷۵)

حفظان صحت

حکیم عبدالکریم، بکریمی دواخانہ
بچگاؤں، ضلع گونڈہ گاؤں

"معدہ بیماریوں کا گھر ہے" اور "پرہیز کل دواؤں کا سر ہے"۔ یہ مقولے آج بھی اتنے ہی صحیح ہیں جتنے کبھی پہلے تھے۔ صحت و تندرستی کے لیے ابتدائی شرط یہ ہے کہ آدمی کھانا اسی قدر کھائے جتنا اس کا معدہ آسانی سے ہضم کرسکتا ہو۔ سادہ غذا جو غلیظ ہو، اسکے عادی کو بیماری کم پیدا ہوگی اور عمر بھی دراز ہوگی۔ لطیف غذا اور شربت اگرچہ زود ہضم ہوتے ہیں۔ مگر معدہ کو ضعیف کرتے ہیں۔ لطیف کھانوں سے اگرچہ اچھی خلطیں حاصل ہوتی لیکن وہ جلد اثر قبول کرنیوالی ہوتی ہیں، اسلئے جب مرض کا حملہ ہوتا ہے تو طبیعت اس کے دفاع میں عموماً ناکام رہتی ہے۔

جو لوگ قدرت سے قریب تر کثیف غذائیں استعمال کرنے کے عادی ہوتے ہیں، وہ اکثر زیادہ تندرست دیکھے گئے ہیں، ایسے لوگ اکثر عمر بھی لمبی پاتے ہیں، انکے اعضا مضبوط ہوتے ہیں، جیسا کہ دیہات کے لوگوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ شہری لوگ جو لطیف غذاؤں کے عادی اور شربت نوش ہوتے ہیں، اکثر ضعیف الاعضاء اور کم عمر پائے گئے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ کثیف قدرتی غذا دیر ہضم ہوتی ہے اور بدہضمی پیدا کرتی ہے۔ مگر یہ بات غیر معتاد کیلئے ہے جب عادت ہوجائے تو کثیف غذا زود ہضم ہوجاتی ہے اور خلطیں اچھی پیدا کرتی ہے۔ اور صحت قائم رکھنے میں عادت کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔

آنکھ: ایک قدرتی تحفہ

آنکھ ہمارے دماغ کی کھڑکی ہے۔ باہر کی دنیا سے جو معلومات ہم حاصل کرتے ہیں، ان میں سے ۸۰ فیصد ہم کو آنکھ کی معرفت پہنچتی ہیں۔

انڈین کونسل آف میڈیکل ریسرچ کے حالیہ اندازے کے مطابق ہندوستان میں اندھوں کی تعداد ۹۰ لاکھ ہے اس سے کئی گنا زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جن کی آنکھ کمزور ہے یا صحیح طور پر کام نہیں کرتی۔ ہندوستانی شہریوں کو ان اندھوں کی پرورش و پرداخت پر جو خرچ کرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ ۱۳ ہزار کروڑ سالانہ کیا گیا ہے اندھوں کی بڑی تعداد صحیح علاج سے درست ہوسکتی تھی، مگر غیر تربیت یافتہ معالجین کے غلط علاج اور سرمے اور کاجل نے انھیں مستقل طور پر اندھا بنادیا۔

آنکھ کی کمزوری کا ایک بڑا سبب ناقص خوراک ہے عالمی ادارہ صحت کے ایک جائزہ کے مطابق ۱۵ ہزار بچے ہر سال اپنی آنکھ کی روشنی سے اسلیے محروم ہوجاتے ہیں کہ انکو وٹامن اے نہیں ملتا۔ اسی طرح خوراک میں پروٹین اور وٹامن بی کامپلکس کی کمی بھی اندھاپن پیدا کرتی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان میں غلط پکوان کی وجہ سے ہر سال ایک ہزار کروڑ روپے کے وٹامن ضائع ہوجاتے ہیں۔

تاہم ہندوستان میں اندھے پن کا واحد بڑا سبب آنکھ میں سفید پانی آجانا ہے، چھ ملین افراد اس قسم کی صورتحال میں مبتلا پائے گئے ہیں۔ سفید پانی (موتیا بند) کا کامیاب علاج صرف آپریشن ہے۔ غیر ترقی یافتہ ملکوں میں زیادہ تر بچپن میں آنکھ ضائع ہوجاتی ہے جبکہ ترقی یافتہ ملکوں میں بڑی عمر میں اسکی نوبت آتی ہے۔ بچے کی آنکھ میں کوئی نقص یا کوئی غیر معمولی بات نظر آئے تو فوراً کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیئے

محنت اتحاد اور استقلال نے انھیں کامیاب بنایا



The Research and Development Plant of Ashok Organic Industries Limited.

راستہ پر لگ جائیے ، حالات آپ کے موافق ہوتے چلے جائیں گے

مسٹر منی لال کرڈاکیا ممبئی میں کپڑے کی دلالی کرتے تھے۔ اس کے بعد ان کا تجارتی تجربہ ان کے کام آیا اور وہ ایک ایسی فرم میں ورکنگ پارٹنر ہوگئے جو کپڑے کی برآمد کا کام کرتی تھی۔

چند کامیاب سالوں کے بعد ان کے اقتصادی حوصلہ نے انھیں سجھایا کہ وہ اپنا کوئی مستقل کاروبار شروع کریں۔ انھوں نے ۱۹۶۳ میں منی لال کرڈاکیا اینڈ کمپنی کے نام سے ایک فرم قائم کرلیا۔ اتفاق سے انھیں دنوں کپاس کے کاروبار میں بحران کا دور آگیا۔ ابتدائی چند سال مسٹر کرڈاکیا کے بہت سخت گزرے۔ تاہم انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔

اب ایک خوش قسمتی نے مسٹر کرڈاکیا کا ساتھ دیا۔ ان کا بڑا لڑکا مسٹر اشوک کرڈاکیا تعلیم یافتہ ہو کر باپ کی مدد کے قابل ہوگیا۔ اب دونوں نے مل کر ازسرنو نئی قوت کے ساتھ کوشش شروع کردی۔

اس کے بعد ان کے حالات نے انھیں ایک اور زینہ فراہم کیا۔ ان کے دوسرے لڑکے ڈاکٹر انیل کرڈاکیا نے میڈیسن میں ڈگری حاصل کی، اور اپنی سائنسی صلاحیت کو اپنے والد اور بھائی کے قائم کردہ کارخانہ میں لگادیا۔ تیسرے بھائی مسٹر پنکاج کرڈاکیا، جنھوں نے کیمیکل انجینرنگ میں ڈگری لی تھی، انھوں نے مینجمنٹ اور تعمیرات کی ذمہ داری سنبھال لی۔

۱۹۷۳ میں اس خاندان کا اشوک آرگینک انڈسٹریز لمیٹڈ کے نام سے ایک کارخانہ قائم ہوچکا تھا۔ ضلع بڑودہ میں نندیسری کے مقام پر گجرات سرکار نے ان کو ۲۵ ہزار مربع میٹر کا پلاٹ نیز مالی امداد دی۔ دینا بینک نے ضروری سرمایہ فراہم کرنے میں تعاون کیا۔ اب یہ خاندان کامیابی کے ساتھ کیمیکل ٹریڈ کے میدان میں ترقی کے مراحل طے کر رہا ہے۔

(فری پریس جرنل، ممبئی - ۱۴ جولائی ۱۹۷۶)

الرسالہ مئی ۱۹۷۷

دانش مندی کے امتحان میں ہاری ہوئی بازی کو نہ پرجوش تقریروں کے ذریعہ جیتا جاسکتا ہے اور نہ خوشامدی سیاست سے۔

ہندستان کی چھٹی لوک سبھا کے لئے الیکشن کے انعقاد کا اعلان ۱۰ر جنوری ۱۹۷۷ کو ہوا ہے اور سابق صدر جمہوریہ فخرالدین علی احمد کا انتقال ۱۱ر فروری کو۔ جب الیکشن کا اعلان ہوا تو راقم الحروف نے اپنے کچھ ساتھیوں سے کہا تھا ——— "فخرالدین علی احمد اگر اس وقت صدارت سے استعفا دے دیں اور اندرا گاندھی کے مقابلہ میں سیاست کے میدان میں آجائیں تو وہ سارے ملک کے سیاسی ہیرو بن جائیں گے"۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۰ر جنوری اور ۱۶ر مارچ کے درمیان دو ماہ کا وقت ہندستان کی سیاست میں ایک تاریخ ساز لمحہ تھا۔ مگر نہ فخرالدین علی احمد اس راز کو سمجھ سکے اور نہ دوسرا کوئی مسلم لیڈر۔ ذاتی طور پر مجھے سیاست سے کوئی دل چسپی نہیں۔ مگر مجھے حیرت ہے کہ جو لوگ سیاست ہی کو اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہیں، وہ سیاست سے اتنے بے خبر کیوں رہتے ہیں کہ ایک دن پہلے تک بھی انھیں حالات کی اطلاع نہیں ہوتی۔

آزادی کے بعد بننے والے ہندستان میں جن مسلمانوں کو موقع ملا کہ وہ کانگریسی حکومتوں میں صدر، گورنر، وزیر اور سفیر بنیں وہ دراصل ان کے اس سیاسی کردار کی قیمت تھی جو ۱۹۴۷ سے پہلے آزادی کی تحریک میں انھوں نے برادران وطن کے ساتھ مل کر ادا کیا تھا۔ بعد کو جو لوگ

کانگریس پارٹی میں شامل ہوئے، وہ قدرتی طور پر یہ درجہ حاصل نہ کرسکے۔

انگریزوں کے خلاف لڑائی میں لوگوں کا سیاسی کردار پچاس سال میں بنا تھا۔ کانگریسی راج کے مقابلہ میں جدوجہد کا یہ لمحہ، مخصوص اسباب سے، سمٹ کر دو مہینے میں سمٹ آیا تھا۔ مگر مسلم قیادت، تقریباً سب کی سب کانگریس سے چمٹی رہی۔ وہ اس تاریخ ساز عمل میں شریک ہونے کی دانش مندی نہ دکھا سکی۔ نہرو خاندان کی حکومت کے تحت ان کو جو مفادات ملے ہوئے تھے، ان کو ان آخری لمحات میں بھی خطرہ میں ڈالنا انھیں گوارا نہیں ہوا جب کہ زمانہ اس حکومت کے خاتمہ کا آخری فیصلہ کر چکا تھا۔

اب بہت سے لوگ اپنی سیاسی وفاداریاں تبدیل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مگر اب اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ ۱۶ر مارچ ۱۹۷۷ سے پہلے سیاسی پلیٹ فارم بدلنے سے آدمی کا سیاسی کردار بنتا تھا، جب کہ آج اس قسم کی تبدیلی صرف سیاسی ابن الوقتی ہے جس کی کوئی قیمت کسی کے نزدیک نہیں۔

مسلم قیادت کی یہ غلطی ایک عظیم سیاسی نقصان کی صورت میں سامنے آئی ہے۔ اس الکشن میں مسلمانوں نے عام طور پر جنتا پارٹی کو ووٹ دیا۔ نئے گروہ کی کامیابی میں بلاشبہ مسلم ووٹروں کا بھی ایک حصہ ہے۔ مگر نئی بننے والی حکومت میں اسی نسبت سے ان کو مقام نہ مل سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی سیاسی نظام میں ایک گروہ کا مقام محض ووٹروں سے نہیں بلکہ لیڈروں سے بنتا ہے۔ جو قوم صرف ووٹ دینے کے لئے جوش و خروش دکھانا جانتی ہو، اس کی ساری دھوم دھام پولنگ کے دن ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد حکومت کے نظام میں اس کا کوئی

دخل نہ ہوگا۔ خواہ وہ حکومت کے ایوان کے باہر کتنی ہی تقریریں کرتی رہے۔

مسلم قیادت کی یہ غلطی اب ناقابلِ تلافی ہے کہ اس نے زمانہ کے رخ کو نہیں پہچانا اور نئی سیاسی قوتوں کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ جانے والی طاقت کے ساتھ لپٹے رہے، جب کہ سیاسی بصیرت کا تقاضا تھا کہ وہ آنے والی سیاسی طاقت کے حق میں اپنا وزن ڈال دیتے۔

مسلمانوں کو سب سے زیادہ دلچسپی سیاست سے ہے۔ مگر اپنی سیاسی بے شعوری کی وجہ سے ہر انقلاب کے موقع پر وہی سب سے زیادہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔ اور جدید انقلاب کے بعد انھیں جو سیاسی نقصان پہنچا ہے، وہ تو پچھلے تمام نقصانات سے بھی زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ فرضی امیدوں کے جوش اور جذباتی تقریروں کے ہجوم میں ابھی ان کو یہ نقصان دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ مگر بہت جلد وہ وقت آئے گا کہ حقائق خود کھلے طور پر انھیں یہ سب کچھ بتا دیں گے۔ اگرچہ یہ امید نہیں کہ اس وقت بھی وہ کوئی صحیح رد عمل دکھا سکیں۔

ذاتی طور پر راقم الحروف کا خیال تو یہ ہے کہ مسلمان سیاست کو بالکل چھوڑ دیں اور اپنی ساری قوت اصلاح و تعمیر اور دعوت و تبلیغ میں لگا دیں۔ مگر جو لوگ سیاسی مشغلہ ہی کو اپنا مشن بنائے ہوئے ہیں، وہ کیوں اپنے میدانِ عمل کے مسائل سے اتنا بے خبر رہتے ہیں، اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

(دہلی — ۲۸ مارچ ۱۹۷۷)

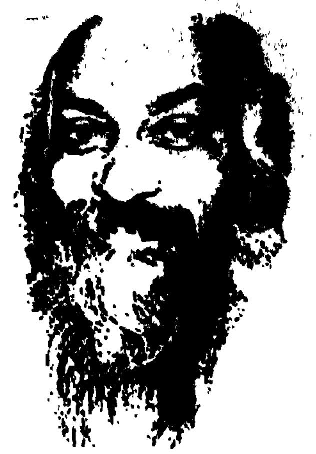
آدمی دوسروں کے ساتھ عبرتناک واقعات ہوتے دیکھتا ہے مگر اپنے آپ کو اس طرح الگ کر لیتا ہے گویا اس کے ساتھ ایسا ہونے والا نہیں

ہفت روزہ الجمعیۃ ۱۳ دسمبر ۱۹۶۸ کا صفحہ ۱۰ آپ کھولیں تو اس میں "تاریخ مظلوم کا ساتھ دیتی ہے" کے زیر عنوان یہ عبارت چھپی ہوئی ملے گی:

"وہ اقتدار سب سے زیادہ نادان اقتدار ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ ظلم و ستم کے ذریعہ کسی کے اوپر حکومت کی جا سکتی ہے۔ انسان کی مثال پتھر کی سی نہیں ہے کہ اس کو ہتھوڑے سے توڑ دیا جائے تو وہ ٹوٹی ہوئی حالت پر قانع ہو کر پڑا رہے۔ بلکہ وہ احساس اور شعور رکھنے والا ایک وجود ہے جس کو اگر مٹایا جائے تو اس کے اندر انتقام کی بے پناہ آگ بھڑک اٹھتی ہے اور یہ آگ ایسی خوفناک ہوتی ہے جو بڑے سے بڑے ظالم کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔

تاریخ میں ہمیشہ ظلم کا یہی انجام ہوا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ بعد کے ظالم اپنے پچھلے ظالموں سے سبق نہیں لیتے اور دوبارہ اسی حماقت کو دہراتے ہیں جو ان کے پیشرو دہرا چکے ہیں۔"

قرآن — ایک انوکھی کتاب ہے
محمدؐ — کا تیاگ سب سے بڑھا ہوا ہے
نماز — خدا سے شکتی لینے کا نام ہے



Shree Rajneesh Ashram,
17, Koregaon Park, Poona 411 001.

آچاریہ رجنیش ۱۹۳۱ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۷ میں ساگر یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم اے کیا۔ ۹ سال تک کالج میں استاد رہے۔ ۱۹۶۶ میں ملازمت چھوڑ کر مذہبی کام کرنا شروع کیا۔

آچاریہ جی نمائشی مذہبیت سے بیزار ہیں اور گہرائی میں اتر کر حقیقت کو پانے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے: "باہر کی یاترا کم کرو، اس سے انتر یاترا میں بادھا پڑتی ہے"۔ ان کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی ہے کہ ان کا بولا ہوا ایک ایک لفظ شائع ہوتا ہے۔ ان کی تمام تقریروں کے ٹیپ تیار ہوتے ہیں اور وہ ملک کے مختلف حصوں میں قائم شدہ مراکز میں لفظ بلفظ سنائے جاتے ہیں۔

ایک بار انھوں نے اپنی تقریر میں کہا:

"ابھی یہ جو میرے قریب آگئے ہیں، جو میں بولتا ہوں اس سے ان کا بہت پریوجن (غرض) نہیں ہے، میرے دو شبدوں کے بیچ جو خالی جگہ ہے، اس سے ہی

ان کا زیادہ پریوجن (غرض) ہے۔ اب وہ لکیروں کے بیچ پڑھنے لگے ہیں اور شبدوں کے بیچ سننے لگے ہیں۔ اور شبد تو صرف بہانا ہیں۔"

ان کا خیال ہے کہ بیشتر لوگ بس ویسے ہی بن جاتے ہیں جیسا ماحول ان کو بنا دے۔ حالاں کہ آدمی کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ خود شعوری کا مقام حاصل کرے اور آپ اپنی تعمیر کرے۔ انھوں نے ایک بار کہا: بچے تو سبھی پیدا کرتے ہیں۔ سب سے کٹھن کام اپنے آپ کو جنم دینا ہے۔

یہاں آچاریہ رجنیش کے چند اقوال نقل کئے جاتے ہیں جو قرآن، نماز اور پیغمبر اسلام کے بارے میں انھوں نے کہے ہیں:

پیغمبر اسلام

"مہاتما بدھ نے راج پاٹ چھوڑا، مہابیر نے محل تیاگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ ان دونوں کا بڑا تیاگ تھا لیکن محمدؐ کا تیاگ سب سے بڑھا ہوا ہے۔ انھوں نے ایسا

جیون اپنایا جس میں روزانہ تیاگ کرنا پڑتا تھا۔ یہ تیاگ ایک دن کا تیاگ نہ تھا بلکہ روز روز کا تیاگ تھا۔ ہر دن پہلا ہوا مال آتا تھا۔ وہ فوراً لوگوں میں اسے بانٹ دیتے اور پھر خالی کے خالی ہاتھ ہو جاتے تھے۔

● قرآن

"تم اخبار پڑھتے ہو، تم نے کبھی اس پر خیال کیا کہ یہی روز روز پڑھتے ہو! کچھ نیا گھٹتا ہے کبھی؟ نیا تو قرآن میں گھٹا ہے۔"

(گھٹنا: واقع ہونا)

● نماز

"مہورت وقت کا کوئی ناپ جوکھ نہیں ہے۔ وقت کے باہر کی جھلک ہے بشبہ مہورت میں سارے کام شروع ہوں۔ اس لئے سارے دھرموں نے کہا ہے کہ صبح اٹھتے ہی پرارتھنا پہلا کام ہو، تاکہ مہورت سدھ جائے۔ پھر تم چلو یاترا پر۔ پھر کوئی حرج نہیں۔ پھر دھرموں نے یہ بھی کہا ہے کہ دن میں کئی بار پھر پڑاؤ بنا لو! جیسے اسلام نے کہا ہے پانچ بار، بار بار مہورت کو پکڑ پکڑ لو۔ تو ایسے اگر کوئی دن میں پانچ بار نماز پڑھے، ٹھیک میں ہی پڑھے، ایسا دہرانا نہ ہو صرف ایک خانہ پُری کو۔ تو وہ پائے گا کہ اس کا جیون ہو کے سنسار میں رہتے ہوئے بھی سنسار میں نہیں ہے۔ کیونکہ بار بار اس کے پیچھے کے سنسار کی دھول جمے، وہ پھر نہائے گا۔ اس کے پیچھے کہ سنسار کا اپدرو (فتنہ و فساد) اسے گھیرے، وہ پھر دور کر جائے، وہ پھر تازہ ہو جائے گا۔ پھر وہ پرماتما سے شکتی لے گا، پھر اپنے بستر پر چھپ کے ایک ڈبکی لگائے گا، پھر پربھاوِت (متوجہ) ہو کر، آنند مگن ہو کے (طرح سے بھر کر) واپس سنسار میں آ جائے گا۔

رات سوتے وقت بھی پھر دھیان کے لوری میں سونا ہے۔ پھر لوٹ کر دعا کا پکڑ لو، دن میں کئی بار کھو گیا ہو گا۔"

"آچاریہ رجنیش کے کمرہ میں جو کتابیں رکھی ہوئی ہیں، ان میں مذہب سے لے کر مارکسزم اور سیاسیات تک شامل ہیں۔ سیمن، کرشنا مورتی، جیسے مارتر، گورڈ گیف، ہیڈگر اور شنکر سبھی کی تصنیفات ان کی لائبریری میں موجود ہیں۔ ان کے ایک شاگرد کا کہنا ہے کہ آچاریہ رجنیش کی معلومات کو وقت کے مطابق رکھنے کے لئے ہم چار ہزار روپیہ مہینہ خرچ کرتے ہیں۔ ہمارے لئے وہ ایک قسم کے کمپیوٹر ہیں۔ ہم انھیں کتابیں دے دیتے ہیں اور وہ اس حکمت کا خلاصہ ہمیں بتا دیتے ہیں جو ان کتابوں کے اندر ہوتا ہے۔ کتاب کو پڑھنا، اس کا تجزیہ، اس کو ہضم کرنا، اس کی تعبیر کرنا، یہ سب ہمیں نہیں کرنا پڑتا۔ آچاریہ رجنیش کی انگریزی بھی اتنی ہی اچھی ہے جتنی کہ ہندی جو کہ ان کی مادری زبان ہے۔ وہ دونوں زبانوں پر غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔"

غیر ملکی اے۔ ایس۔ رس، جنھوں نے آچاریہ جی کے کیمپ میں چند دن گزارے تھے، مذکورہ باتیں لکھتے ہوئے کہا ہے کہ وہ انسان کو باطنی سفر INNER JOURNEY کا پیغام دیتے ہیں۔

(سنڈے اسٹینڈرڈ ۲۸ فروری ۱۹۷۱ء)

غلط استدلال

سورہ انفال (آیت ۴۱) میں یہ حکم ہے کہ اموال غنیمت کا خمس ریاست کا حصہ ہے اور بقیہ فوجیوں کا۔ ابتدائی دور میں اسی کے مطابق عمل ہوتا رہا۔ مائن، جلولار، حمص، حلب وغیرہ فتح ہوئے تو ان کے اموال غنیمت کو پانچ حصوں میں تقسیم کرکے ایک حصہ ریاست کو بھیج دیا گیا اور بقیہ چار حصے فوجیوں میں تقسیم کر دئے گئے۔ واضح ہو کہ اس زمانہ میں فوجی با تنخواہ نہیں ہوتے تھے، بلکہ رضا کارانہ طور پر لڑنے کے لئے جایا کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں سواد عراق کی زمینیں فتح ہوئیں تو فاتح فوجیوں نے چاہا کہ ان زمینوں کو بھی اسی طرح تقسیم کیا جائے، جس طرح اس سے پہلے اموال تقسیم ہوتے رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اس سے اختلاف کیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ یہ زمینیں تم لوگوں کو دے دوں تو دوسرے مسلمانوں کے لئے کیا رہے گا۔ اور حکومت کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔ (فمبانا تسدّ بہ الثغور وما یکون للذریۃ وللارامل) اس مسئلہ پر کئی روز تک بحث ہوتی رہی۔ فوجیوں کا کہنا تھا کہ یہ ہماری ملکیت ہے۔ اس لئے ہم کو ملنا چاہئے (اتقسم ما افاء اللّٰہ علینا باسیافنا علی قوم لم یحضروا) بالآخر فیصلہ حضرت عمرؓ کی رائے پر ہوا۔

جو لوگ اجتماعی ملکیت کے نظریہ پر یقین رکھتے ہیں، وہ اس واقعہ سے دلیل لاتے ہیں کہ انفرادی ملکیت کو منسوخ کرکے اجتماعی ملکیت قائم کرنا اسلام میں جائز ہے مگر اس واقعہ سے یہ بات قطعاً ثابت نہیں ہوتی۔ حضرت عمرؓ اور ان کے ہم خیال (عثمانؓ، علیؓ، طلحہؓ وغیرہ) کی جو گفتگوئیں اور تقریریں منقول ہوئی ہیں، ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ان زمینوں کو فی الواقع فوجیوں کی ملکیت سمجھتے تھے اور اس کے باوجود ان کو چھین کر ریاستی ملکیت بنانا انھوں نے جائز سمجھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ زمینیں تو ابھی نئی نئی فتح ہوئی تھیں اور ان پر ملکیت کے تحقق کا سوال تھا نہ کہ فردی ملکیت سے نکال کر اجتماعی ملکیت میں دینے کا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنی تقریر میں واضح لفظوں میں کہا کہ یہ زمینیں تمھاری ملکیت نہیں ہیں۔ اگر وہ تمھاری ملکیت ہوتیں تو میں ان کو چھیننا اپنے لئے جائز نہ سمجھتا:

قد سمعتم کلام ھٰؤلاء القوم الذین زعموا انی اظلمھم حقوقھم وانی اعوذ باللّٰہ ان ارکب ظلما۔ لئن کنت ظلمتھم شیئا ھو لھم واعطیتہ غیرھم لقد شقیت

الفاروق عمرؓ از محمد حسنین ہیکل

الجزء الثانی صفحہ ۲۹۶

تم لوگوں نے ان فوجیوں کی گفتگو سنی جن کا خیال ہے کہ میں ان کے حقوق غصب کر رہا ہوں۔ میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ کسی کا حق غصب کروں۔ اگر میں ایسا کروں کہ ایک چیز جو ان کی ہو، اس کو لے کر کسی دوسرے کو دے دوں تو میں شقی ہوں گا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ اجتماعی ملکیت کے نظریہ کی تردید ہے۔ کیونکہ اس میں خلیفہ دوم صاف لفظوں میں فرما رہے ہیں کہ مجھ کو (بالفاظ دیگر حکومت کو) شخصی ملکیت کو منسوخ کرنے کا حق نہیں۔ اگر میں ایسا کروں تو میں شقاوت کا مرتکب ہوں گا۔ یہ واقعہ اس کے برعکس ثابت کر رہا ہے جس کے لئے اسے پیش کیا جاتا ہے

الرسالہ مئی ۱۹۷۶

سوچ کر زندگی گزاریئے

حافظ حامد حسن علوی (۱۸۶۷-۱۹۵۹ء) علی گڑھ کے ایک بزرگ تھے۔ نہایت ذہین اور معاملہ فہم۔ ان کے عزیزوں میں ایک شخص اکثر گھر کے اندر عورتوں اور بچوں میں بیٹھا کرتے تھے۔ حافظ صاحب مرحوم نے جب کئی بار ان کو اس طرح دیکھا تو ایک روز بگڑ کر فرمایا: "عورتوں میں مت بیٹھو، اس سے عقل کم ہو جاتی ہے۔"

یہ قول حال میں مجھے اس وقت یاد آیا جب میں نے ایک نوجوان کو دیکھا۔ وہ اس سے پہلے ایک معمولی ملازمت میں تھے۔ پچھلے دو برس سے انھوں نے ملازمت چھوڑ کر ایک کاروبار کر لیا ہے۔ جب میں ان سے ملا تو مجھے محسوس ہوا کہ ان کے کل اور آج میں بہت بڑا فرق ہو چکا ہے۔ ملازمت کے زمانے میں وہ دبے اور سہمے ہوئے شخص دکھائی دیتے تھے۔ بہت کم کوئی سمجھ داری کا جملہ ان سے سننے میں آتا تھا۔ مگر اب جو میں نے دیکھا تو ان کے اندر ایک اعتماد ابل رہا تھا اور بات بات میں سمجھ داری کی باتیں ان کی زبان سے نکل رہی تھیں۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ آدمی جیسی زندگی گزارتا ہے، اسی کے لحاظ سے اس کی عقل کی تربیت بھی ہوتی ہے۔ جو شخص عورتوں اور بچوں میں اپنا وقت گزارے ظاہر ہے کہ اس کی گفتگو کے موضوعات بالکل معمولی ہوں گے۔ گھر کے قصے، فیشن، ہنسی مذاق، کھانا کپڑا وغیرہ۔ اس قسم کی باتوں میں مشغول رہنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا ذہن اونچے اور گہرے مسائل میں غور و فکر کی تربیت نہیں پا سکے گا۔

اسی طرح ملازم کی زندگی ایک لگی بندھی زندگی ہوتی ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح مہینہ پورا کرے تو اس کو مقررہ تنخواہ بہر حال مل جائے گی۔ اس زندگی کی وجہ سے اس کے اندر ایک قسم کا ذہنی ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس تجارت ایک ایسا کام ہے جس میں ہر وقت آدمی کی محنت اور صلاحیت کا امتحان ہوتا رہتا ہے۔ ہر دن اس کو نئے نئے حالات سے نمٹنا پڑتا ہے۔ یہ چیز حالات سے لڑنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ اس کی عقل کو جلا دیتی ہے۔ اس کو بار بار زندگی کی خوراک دیتی رہتی ہے۔

آدمی کو چاہیے کہ اپنی زندگی کا مشغلہ طے کرتے وقت یہ ضرور سوچے کہ وہ اس کی زندگی کی تربیت کس طرح کرے گا۔ وہی مشغلہ ایک انسان کے لیے صحیح مشغلہ ہے جس میں اس کی چھپی ہوئی صلاحیتیں ابھریں۔ اس کے ذہن کا افق وسیع ہو۔ اس کے اندر خود اعتمادی کی پرورش ہو سکے۔ وہ دنیا میں وہ تمام "رزق" پا سکے جو خدا نے یہاں اس کے لیے مہیا کر رکھا ہے۔

انسانی ذہن حیران کن حد تک بے پناہ صلاحیتیں رکھتا ہے۔ اگر ہم درست مشغلہ اختیار کریں تو ہمارے ذہن کی ترقی ہماری زندگی کی آخری سانس تک جاری رہے گی، اس کے امکانات کبھی ختم نہ ہوں گے۔ اس کے برعکس اگر ہم اس کو کسی محدود یا ناقص مشغلہ میں بند کر دیں تو وہ ٹھٹھر کر رہ جائے گا۔ پانی ایک گڑھے میں ہو تو وہ گھٹ کر رہ جاتا ہے، مگر وہی پانی جب دریا میں رواں ہوتا ہے تو سیلاب بن جاتا ہے۔

محمد رفیق خاں ایم اے

ایک خط

میں اپنے ایک رفیق کے والد کے انتقال پر تعزیتی خط لکھنے بیٹھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے میں خود اپنے آپ سے کچھ کہنے چلا ہوں۔ جب ہم کسی سے کچھ کہتے ہیں تو اس شخص سے کہیں زیادہ اس کا مخاطب خود ہم ہوتے ہیں۔ مکتوب الیہ کے والد کا انتقال ۲۳ اور ۲۴ دسمبر ۱۹۷۶ کی درمیانی شب میں ہوا۔

آپ کے والد محترم کے انتقال کی خبر ملی۔ والد کا انتقال زندگی کا ایک خاص تجربہ ہوتا ہے۔ اس تجربہ سے آپ کو گزرنا تھا گزرے۔ خدا مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ دنیا سے ان کی واپسی درحقیقت زندگی کے مزید امکانات کی خبر ہے۔ پھر زندگی میں اگر یہ واپسی نہ ہو تو زندگی اجیرن ہو جائے، دشوار ہو جائے۔ جیون میں رس تو اسی واپسی کی وجہ سے ہے یہ واپسی محض واپسی نہیں ایک بڑے امکان کی طرف پیش قدمی ہے۔ موت زوال نہیں کمال کی خبر ہے۔ اس کمال کی خبر جس کی متحمل موجودہ دنیا نہیں ہو سکتی۔ موجودہ دنیا تو صرف اس کی طرف ہمارا ذہن موڑ سکتی ہے۔ بشرطیکہ ہم اس کے لیے تیار ہوں۔ بیدار ہوں۔ بصورت دیگر ہم اس کے اشاروں کو سمجھنے سے قاصر ہی رہیں گے۔ موت زندگی کی شام نہیں۔ زندگی کی صبح ہے۔ صبح ہونے سے ہم غمزدہ کیوں ہوں۔ ہمارا دل تو اتنا وسیع ہونا چاہیے جس میں دنیا اور مابعد دنیا دونوں ہی سما جائیں۔ جو دنیا کے بعد ہے اسے ہم اپنی ذات سے الگ نہ دیکھیں۔ ساری کلفتوں اور غموں کا سبب یہ ہے کہ ہم اپنے دل کو اتنا تنگ و تاریک رکھتے ہیں کہ اس میں ہمیں دنیا تو دکھائی دیتی ہے۔ اس کے آگے جو ہے، نظر نہیں آتا۔ وہ اس سے چھوٹ جاتا ہے۔ باہر رہ جاتا ہے۔ دیار غیر معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ اپنا دیار ہے۔ اس دنیا سے کہیں زیادہ اپنا ہے۔ اس دنیا میں تو ہم بہت تھوڑا ظاہر ہو پاتے ہیں۔ کامل اظہار تو وہاں ہی ممکن ہے۔ دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ لینے کی غلطی سے سب سے بڑا نقصان یہ نہیں ہوتا کہ آدمی عام معنی میں دنیا پرست ہو جاتا ہے بلکہ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ آدمی کا فکر اور اس کا نظریہ غلط ہو جاتا ہے۔

مومن ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ آدمی کو معلوم ہو جائے کہ وہ اس دنیا میں غیب کی مخلوق ہے۔ بظاہر وہ دنیا میں دکھائی دے لیکن دنیا میں رہتے ہوئے بھی وہ حقیقت میں عالم غیب میں رہنے لگے۔ نماز اسی بڑی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے۔ نماز وہ خوشبو ہے جو اس عالم کی نہیں ہے۔ یہ ایسی روشنی ہے جس کا تعلق کسی دوسرے عالم سے ہے۔ جس کو ہم عالم غیب سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کا کوئی اور نام بھی تجویز کیا جا سکتا ہے۔ نماز کے ذریعہ سے ہم دنیا میں اس عالم کو اتار لاتے ہیں۔ یہ نماز کا عمل بار بار دہرانے کا منشا صرف یہی نہیں ہے کہ اس عالم میں رہنے کی مشق ہو بلکہ دنیا میں رہتے ہوئے اس عالم میں رہنا ہمیں آ جائے۔ امید ہے ان باتوں پر غور فرمائیں گے آپ جیسے ذہین آدمی اگر اس طرف توجہ نہ دیں تو زندگی اپنا ٹھکانہ کہاں ڈھونڈے گا۔ (دہلی ۳۰ دسمبر ۱۹۷۶)

الرسالہ کے شائقین سے گزارش ہے
کہ وہ پرچہ بذریعہ وی پی طلب نہ فرمائیں، بلکہ
اپنا زرتعاون منی آرڈر کے ذریعہ بھیج دیں۔ یہ
طرفین کے لئے سہولت کا باعث ہے۔

جو لوگ سالانہ یا ششماہی زرتعاون بیک وقت
ادا نہ کر سکیں، وہ ہر مہینے دو روپے کا ٹکٹ
لفافہ میں رکھ کر بھیج دیں۔ پرچہ انھیں روانہ
کر دیا جائے گا۔

خریدار حضرات براہ کرم اپنے خطوط میں
خریداری نمبر کا حوالہ ضرور تحریر فرمائیں۔

خط و کتابت کے وقت یا زرتعاون بھیجتے ہوئے
اپنا پتہ صاف اور حتی الامکان انگریزی میں
تحریر فرمائیں

پتہ پر کسی شخص کا نام نہ لکھیں۔ بلکہ ایڈیٹر
الرسالہ یا منیجر الرسالہ تحریر فرمائیں

منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ ضرور
تحریر فرمائیں

الرسالہ نہ صرف ملک کے مختلف حصوں میں
پڑھا جاتا ہے بلکہ ملک کے باہر بھی عرب دنیا اور
دوسرے علاقوں میں جاتا ہے۔ تاجر حضرات
الرسالہ میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیں۔

امت مسلمہ کی رہنمائی حضرت عمر رضہ کی تعلیمات میں

از مولانا محمد تقی امینی

صفحات ۱۰۴، قیمت دو روپے

پتہ: ادارۂ احتساب، امینی منزل، دودھپور روڈ، علی گڑھ

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کتاب میں خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کی تعلیمات کی روشنی میں امت مسلمہ کو رہنمائی دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اصحاب رسول ؐ کی زندگیاں، اگر کسی تعبیری اضافہ کے بغیر، امت کے سامنے لائی جائیں تو اس میں شک نہیں کہ اصلاح افکار اور تعمیر حیات کے لئے اس سے بڑا خزانہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

حضرت عمر رضہ سے ایک شخص نے مصر کے حاکم اعلیٰ (گورنر) عیاض بن غنم کی ان الفاظ میں شکایت کی:

"اے عمر رضہ کیا حاکموں سے صرف حلف لے لینے سے آپ کو اللہ کی بازپرس سے نجات مل جائے گی کیا آپ کو معلوم نہیں کہ عیاض بن غنم رضہ باریک کپڑا پہنتے ہیں اور دروازے پر دربان رکھا ہے۔"

یہ سنتے ہی حضرت عمر رضہ نے محمد بن مسلمہ رضہ (سفیر) کو حکم دیا کہ "عیاض بن غنم" جس حالت میں ہوں مہلت دیئے بغیر میرے پاس حاضر کرو، محمد بن مسلمہ جب مصر پہنچے تو واقعی عیاض بن غنم رضہ باریک کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ حسب الحکم مہلت دیئے بغیر اسی حالت میں لے آئے گئے۔ حضرت عمر رضہ نے دیکھنے کے بعد فرمایا:

انزع قميصك ودعا بمدرعة صوف وبربيضة من غنم وعصا فقال البس هذه المدرعة وخذ هذه العصا وارع هذه الغنم واشرب واسق من مر بك

اپنی قمیص اتار دو اور پھر کمبل کا جبہ اور بکریوں کا گلہ منگوا کر کہا کہ کمبل کا جبہ پہن لو، اور بکریوں کا گلہ اور عصا لے کر جنگل کی طرف جاؤ وہاں جا کر بکریاں چراؤ اور راستہ سے جو گزرے اس کو پانی پلاؤ۔

اسی طرح حضرت سعد رضہ بن وقاص کے خلاف لوگوں نے شکایت کی کہ "وہ گھر کے اندر عدالت کرتے ہیں باہر نہیں کرتے"، یہ سن کر حضرت عمر رضہ نے محمد بن مسلمہ رضہ کو بلا کر کہا:

اذهب الى سعد بالكوفة وحرق عليه قصره ولا تحدثن حدثا حتى تاتيني

سعد رضہ کے پاس کوفہ جاؤ اور ان کے محل کو جلا دو، وہاں اور کوئی نئی بات نہ کرنا یہاں تک کہ میرے پاس آ جاؤ۔

محمد بن مسلمہ رضہ حکم کی تعمیل میں کوفہ گئے، جہاں ایک بنئے سے لکڑی کا گٹھا خریدا اور محل کو آگ لگادی، سعد رضہ نے نکل کر پوچھا

ماهذا — یہ کیا حرکت ہے؟

ابن مسلمہ نے جواب دیا

عزمة امير المومنين — امیرالمومنین رضہ کا حکم ہے،

یہ سن کر وہ خاموش ہو گئے اور محل جل گیا، سعد رضہ نے ابن مسلمہ رضہ کو واپسی کے وقت سفر خرچ دینا چاہا لیکن انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ واپس آنے کے بعد حضرت عمر رضہ نے سفر خرچ کے بارے میں پوچھا،

هلا قبلت نفقته — تم نے خرچ کیوں نہیں قبول کیا

جواب دیا

انك قلت لا تحدثن حدثا حتى تاتينى،

آپ نے کہا تھا کہ کوئی نئی بات نہ کرنا یہاں تک کہ میرے پاس آجاؤ

کتاب میں اس قسم کے اقوال اور واقعات کثرت سے درج ہیں جن کو آنسوؤں سے تر ہوئے بغیر آدمی ختم نہیں کر سکتا۔

الرسالہ مئی ۱۹۷۷

Single Copy Rs. 2.00

Regd. No. D (D) 630

AL-RISALA MONTHLY

1036 KISHANGANJ, DELHI-110006 (INDIA)

الاسلام

از: مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۲۴۰ ——— قیمت مجلد ۱۵ روپے

اسلام اور مسائل حاضرہ کا ایک جامع مطالعہ

اپنے موضوع پر اس نوعیت کی پہلی کتاب

ابواب:

جدید مسئلہ کیا ہے
حقیقت دین
ارکان اربعہ (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ)
صراط مستقیم
اسوۂ نبوت
تحریک اسلامی، سیرت کی روشنی میں
موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکیں
تعمیر ملت
دعوت الی اللہ
دعوت اسلامی کے جدید امکانات

رسالہ بک ڈپو ـ ۱۰۳۶ کشن گنج دہلی ۶

محمد احمد پرنٹر پبلشر مسئول نے جے۔ کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ ۱۰۳۶ کشن گنج دہلی سے شائع کیا

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

تارکول کی چکنی سڑک پر نئی کار تیزی سے پھسل رہی تھی۔ دوسری طرف سڑک کے کنارے ایک کسان ٹریکٹر کی پیٹھ پر ہچکولے کھا رہا تھا۔ وہ ٹیلوں اور کھائیوں کو ہموار کر رہا تھا تاکہ اس کو فصل اگانے کے قابل بنائے۔ کار کے لئے کوئی ٹھہراؤ نہیں تھا جب کہ ٹریکٹر کو جگہ جگہ ٹھوکر لگ رہی تھی۔ اس کو بار بار رکنا پڑتا تھا۔

کار کے مقابلہ میں ٹریکٹر کی یہ حالت کسی بھی درجہ میں اس کی اہمیت کو نہیں گھٹاتی — کار بنے بنائے راستہ پر دوڑ رہی ہے، جب کہ ٹریکٹر خود اپنا راستہ بنا رہا ہے — ایک ماضی میں سفر کر رہا ہے، دوسرا مستقبل کی طرف مارچ کر رہا ہے۔ ایک تاریخ کے اندر گم ہے، دوسرا اپنی جدوجہد سے خود ایک تاریخ بنا رہا ہے۔

ٹریکٹر کی سست رفتاری میں جو عظمتیں چھپی ہوئی ہیں، اس کے مقابلہ میں کار کی تیز رفتاری کی کوئی حقیقت نہیں۔

شمارہ ۸	زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے۔ فی پرچہ دو روپیہ	جولائی ۱۹۷۷

خصوصی تعاون سالانہ: کم سے کم ایک سو ایک روپیہ

فہرست

قرآن	● ایک مسئلہ	[illegible]
حدیث	● چند متصل لوگوں کے ساتھ [illegible]	۳
سیرت	● وہ خدا کے سایہ میں پہنچ گئے ہیں	۳۰
فقہ	● کچھ نئے مسائل	۳۱
تہذیب جدید	● جدید انسان کی تلاش	۴۱
اسلام اور عصر حاضر	● یہ کوئی مسئلہ نہیں	[illegible]
	دعوت اسلامی کے جدید امکانات	۶
	مشینی ترقی انسان کو مطمئن نہ کرسکی	۴۰
تعمیرات	● انھیں کام کے بہتر مواقع ملے تھے	۴۹
	طاقت کا خزانہ آپ کے اندر ہے	۵۵
معلومات	● چڑیوں کی دنیا	۵۹
	زلزلہ	۵۰
	فطرت میں توازن کا اصول	۳۳
تحقیقات جدیدہ	● مریخ پر زندگی کی تلاش	۳۴
نفسیات	● تعریف و تنقید	۲۱
اشاعت اسلام	● ایک امریکی کا قبول اسلام	۲۸
ادب	● زبان کا مسئلہ	۲۹
دیگر مذاہب	● ایک مسیحی تصنیف پر تبصرہ	۵۶
آپ بیتی		۶۲
تاریخ	● شام میں قدیم تہذیب کی دریافت	۴۲
اقتصادیات	● کناڈا میں بے کاری نہیں	۵۴
محاسن اسلام		۱۸

الرسالہ کا دفتر تبدیل ہوگیا ہے۔ براہ کرم تمام خطوط
اور رقوم وغیرہ درج ذیل پتہ پر روانہ کریں۔

ماہنامہ الرسالہ، جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

اداریہ

الرسالہ جون کے مہینے میں شائع نہ ہو سکا۔ ممکن ہے کہ آئندہ بھی ایسا ہو۔ اس لئے اعلان کیا جاتا ہے کہ قارئین الرسالہ اپنی خریداری کی مدت کو مہینوں کے اعتبار سے شمار نہ فرمائیں بلکہ الرسالہ کی موصولہ تعداد کے اعتبار سے شمار کریں۔ ایک خریدار جس نے سالانہ زر تعاون جمع کیا ہے، اس کی مدت خریداری رسالہ کے بارہ شمارے پر ختم ہوگی۔ خواہ وہ بارہ مہینوں میں پوری ہو یا اس سے زیادہ مہینوں میں۔

الرسالہ کی اشاعت میں وقفہ بلاشبہ ایک حادثہ ہے مگر بعض حادثات اپنے اندر بھلائی کا پہلو لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ راقم الحروف کے لئے یہ حادثہ اسی قسم کی ایک بھلائی کا سبب بن گیا۔ الرسالہ کا پہلا شمارہ اکتوبر ۱۹۷۶ میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد مسلسل سات شمارے نکلنے کے بعد اچانک بلا اعلان جون ۱۹۷۷ کا شمارہ نہ پہنچنا قارئین کے لئے پریشانی کا باعث تھا۔ فطری طور پر دفتر کو استفسار کے خطوط ملنے شروع ہوئے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ صرف ایک خط کو چھوڑ کر کسی نے بھی ہم کو سخت خط نہیں لکھا۔ بلکہ بعض لوگوں نے ہمیں تسکین دلائی کہ اگر ایک دو مہینے کسی وجہ سے پرچہ نہ نکلے تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اس قسم کے مقصدی پرچوں میں ایسا بھی ہوتا ہے۔

ایک صاحب نے جب دیکھا کہ رسالہ نہیں ملا تو ہم کو خفگی کا خط لکھنے کے بجائے انھوں نے خود اپنے آپ کو متحرک کر دیا۔ وہ اپنی مصروفیات کے باوجود سفر پر نکل پڑے تاکہ اپنے دوستوں اور جاننے والوں سے الرسالہ کے لئے تعاون جمع کریں۔ انھوں نے ہم کو صرف اس وقت خط لکھا جب کہ وہ الرسالہ کے لئے اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر چکے تھے۔

یہ واقعات ہمارے قارئین کی شعوری پختگی کا ثبوت ہیں۔ اجتماعی زندگی کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف شکایت کے بجائے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ دوسرے کو ذمہ دار ٹھہرانے کے بجائے دوسرے کے سلسلے میں اپنا حصہ ادا کرنے میں لگ جائیں۔

اگر یہ مزاج ہو تو کسی کے لئے یہ سمجھنا بالکل مشکل نہیں کہ الرسالہ جیسے جریدہ کی اشاعت میں بے قاعدگی عین باقاعدگی ہے۔ حالات سے موافقت کی بنیاد پر نکلنے والے پرچوں کے لئے جو چیز "کارنامہ" شمار ہوتی ہے وہ حالات کے خلاف جاری ہونے والے پرچوں کے یہاں کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ ایک کا پانا دوسرے کے لئے کھونا ہے۔ اول الذکر کے یہاں جو چیز محرومی ہے، ثانی الذکر کے لئے وہ یافت کے خانہ میں لکھی جاتی ہے۔

اگر ہم کو ایسے قارئین مل گئے ہیں جو الرسالہ کی صحافتی مہم میں "بے قاعدگیوں" کو دیکھنے کے بعد یہ کہہ سکیں کہ یہ تو وہی ہے جس کے لئے ہم پہلے سے اپنے کو تیار کئے ہوئے تھے (ھذا ما وعدنا......، احزاب ـ ۲۲) تو شاید ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ الرسالہ نے آدھی کامیابی حاصل کر لی۔

رحمت خداوندی کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کی کمزوریوں میں ہمت کی شان پیدا کر دیتا ہے۔ وہ ان کی ناکامیوں کو کامیابی کے زینے بنا دیتا ہے۔ یہ سلوک ان خاص بندوں کے لئے ہے جو اپنی ذات کے حلقے سے نکل گئے اور صرف اس کے لئے گم ہو گئے۔ (وحید الدین)

اللہ نے ہم کو بھیجا ہے تاکہ ہم لوگوں کو اس کی طرف بلائیں

اسلامی غلبہ سے پہلے عراق قدیم ساسانی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ ۱۴ھ میں سعد بن ابی وقاص کی سرکردگی میں لشکر اسلام عراق کی طرف بڑھا۔ دوسری طرف ساسانی فوج کا سردار رستم تھا۔ جنگ سے پہلے مختلف اسلامی سفرا رستم کے دربار میں بات چیت کے لئے گئے۔ انھیں میں سے ایک ربعی بن عامر بھی تھے۔ رستم نے ربعی بن عامر سے پوچھا: تم کو کیا چیز یہاں لے آئی ہے۔ انھوں نے جواب میں جو تقریر کی، اس کا ایک فقرہ یہ تھا:

اللہ ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادۃ العباد الی عبادۃ اللہ ومن ضیق الدنیا الی سعتہا ومن جور الادیان الی عدل الاسلام فارسلنا بدینہ الی خلقہ لندعوہم الیہ (ابن کثیر۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۷، صفحہ ۳۸)

اللہ نے ہم کو بھیجا ہے کہ جس کو وہ چاہے، بندوں کی عبادت سے نکال کر خدا کی عبادت کی طرف لے آئیں۔ دنیا کی تنگی سے اس کی فراخی کی طرف اور مذاہب کے ظلم سے اسلام کے عدل کی طرف لے آئیں۔ پس اس نے ہم کو اپنے دین کے ساتھ اپنی مخلوق کی طرف بھیجا ہے تاکہ ہم لوگوں کو اس کی طرف بلائیں۔

ہم کس بات کی گواہی دے رہے ہیں

مغلوں کے مقابلہ میں جب مرہٹے اور سکھ ابھرے تو مسلمان ان کے خلاف بھڑک اٹھے۔ بدیس سے انگریز آکر ملک کے اوپر قابض ہو گئے تو ان کو ہٹانے کے لئے انھوں نے ساری دنیا میں ہنگامہ مچا دیا۔ کانگریس حکومت کے تحت ان کے ساتھ جبر و امتیاز کا سلوک ہوا تو اس کو انتخابی شکست دینے کے لئے ان کے درمیان زبردست طوفان اٹھ کھڑا ہوا ——— یہ ہے مسلمانانِ ہند کی دو سو سالہ سیاست کا خلاصہ۔ اس پوری مدت میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خوف خدا اور فکر آخرت کو دعوتی مشن بنانے پر ان کے درمیان آگ بھڑکی ہو، آنے والے یوم الحساب کے مسئلہ سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے وہ بے تابانہ اٹھ کھڑے ہوئے ہوں۔ سیاسی مسائل اور اقتصادی مفادات کا معاملہ ہو تو فوراً ان کے اندر عمل کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ آخرت کے مفادات اور جنت اور جہنم کے مسائل اس سے کہیں زیادہ بڑے ہیں۔ مگر ان کی خاطر سرگرم ہونا وہ نہیں جانتے۔

مسلمان کا معاملہ عام قوموں سے مختلف ہے۔ وہ "شہداء اللہ فی الارض" ہیں۔ ان کو آخرت کے مسائل کی گواہی دینے پر مامور کیا گیا تھا۔ مگر وہ لوگوں کے سامنے دنیا کے مسائل کی گواہی دینے میں سارا زور دکھا رہے ہیں۔ یہ الٹی گواہی نبی آخر الزماں کی امت کے لئے جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر مسلمان اپنی اس روش سے باز نہ آئے تو اندیشہ ہے کہ وہ دنیا میں بھی رسوا ہوں گے اور آخرت میں بھی۔ اس قسم کی سرگرمیاں خدا کے غضب کو بھڑکانے والی ہیں نہ کہ اس کی رحمت و نصرت کو کھینچنے والی۔

مولانا مفتی محمد شفیع صا

ہم نے ایک ایسی چیز کے پیچھے اپنی عمر ضائع کر دی جس کا نہ دنیا میں کوئی فائدہ ہے، نہ آخرت میں اس کے بارے میں سوال ہونے والا ہے

قادیان میں ہر سال ہمارا جلسہ ہوا کرتا تھا۔ اور سیدی حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ ایک سال اسی جلسہ پر تشریف لائے۔ میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ ایک صبح نماز فجر کے وقت اندھیرے میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت سر پکڑے ہوئے بہت مغموم بیٹھے ہیں۔ میں نے پوچھا حضرت کیسا مزاج ہے؟ کہا ہاں! ٹھیک ہی ہے میاں۔ مزاج کیا پوچھتے ہو، عمر ضائع کر دی!

میں نے عرض کیا، حضرت! آپ کی ساری عمر علم کی خدمت میں، دین کی اشاعت میں گزری ہے، ہزاروں آپ کے شاگرد علماء ہیں، مشاہیر ہیں، جو آپ سے مستفید ہوئے اور خدمت دین میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ کی عمر اگر ضائع ہوئی تو پھر کس کی عمر کام میں لگی!

فرمایا: میں تم سے صحیح کہتا ہوں عمر ضائع کر دی!

میں نے عرض کیا: حضرت بات کیا ہے؟

فرمایا: ہماری عمر کا، ہماری تقریروں کا، ہماری ساری کد و کاوش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کر دیں امام ابو حنیفہؒ کے مسائل کے دلائل قائم کریں اور دوسرے ائمہ کے مسائل پر آپ کے مسلک کی ترجیح ثابت کریں یہ رہا ہے محور ہماری کوششوں کا، تقریروں کا اور علمی زندگی کا۔

اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی؟ ابو حنیفہ رح ہماری ترجیح کے محتاج ہیں کہ ہم ان پر کوئی احسان کریں، ان کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام دیا ہے وہ مقام لوگوں سے خود اپنا لوہا منوائے گا، وہ تو ہمارے محتاج نہیں۔

اور امام شافعی رح، مالک اور احمد بن حنبل رح اور دوسرے مسالک کے فقہا جن کے مقابلے میں ہم یہ ترجیح قائم کرتے آئے ہیں کیا حاصل ہے اس کا؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو "صواب محتمل الخطاء" (درست مسلک جس میں خطاء کا احتمال موجود ہے) ثابت کر دیں اور دوسرے کے مسلک کو "خطاء محتمل الصواب" (غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں، ان تمام بحثوں، تدقیقات اور تحقیقات کا جن میں ہم مصروف ہیں۔

پھر فرمایا:

ارے میاں! اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کون سا مسلک صواب تھا اور کون سا خطاء، اجتہادی مسائل صرف یہی نہیں ہیں کہ دنیا میں ان کا فیصلہ نہیں ہو سکتا، دنیا میں بھی ہم تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی صحیح ہے اور وہ بھی صحیح، یا یہ کہ یہ صحیح ہے، لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطا ہو۔ اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ

صواب ہے۔ دنیا میں آپ بھی یہ خبر نہیں پا سکیں گے نہیں پا سکیں گے کہ رفع یدین حق تھا یا ترک رفع یدین حق تھا۔ آمین بالجہر حق تھی یا بالسر حق تھی۔ برزخ میں بھی اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا اور قبر میں بھی یہ سوال نہیں ہوگا۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ یہ تھے:

اللہ تعالیٰ نہ شافعی کو رسوا کرے گا نہ ابوحنیفہ کو، نہ مالک کو نہ احمد بن حنبل کو، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے علم کا انعام دیا ہے جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے بڑے حصے کو لگا دیا ہے، جنھوں نے نور ہدایت چار سو پھیلایا ہے۔ جن کی زندگیاں سنت کا نور پھیلانے میں گزریں۔ اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو رسوا نہیں کرے گا کہ وہاں میدان حشر میں کھڑا کرکے یہ معلوم کرے کہ ابوحنیفہ نے صحیح کہا تھا یا شافعی نے غلط کہا تھا یا اس کے برعکس، یہ نہیں ہوگا۔

تو جس چیز کو نہ دنیا میں کہیں نکھرنا ہے، نہ برزخ میں نہ محشر میں، اسی کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کر دی۔ اپنی قوت صرف کر دی اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی، مجمع علیہ اور سب کے مابین جو مسائل متفقہ تھے اور دین کی جو ضروریات سب کے نزدیک اہم تھیں، جن کی دعوت انبیاء کرام لے کر آئے تھے، جن کی دعوت کو عام کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا اور وہ منکرات جن کو مٹانے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی تھی، آج یہ دعوت تو نہیں دی جارہی۔ یہ ضروریات دین تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی ہیں اور اپنے و اغیار ان کے چہرے کو مسخ کر رہے ہیں اور وہ منکرات جن کو مٹانے میں ہمیں لگے وہ پھیل رہے ہیں، گمراہی پھیل رہی ہے، الحاد پھیل رہا ہے، شرک و بدعت پھیل رہی ہے، حرام و حلال کا امتیاز اٹھ رہا ہے۔ لیکن ہم لگے ہوئے ہیں ان فروعی بحثوں میں۔

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ ہائے میں یہاں بیٹھا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ عمر ضائع کر دی۔

تمام انسان بنیادی طور پر ایک ہی قسم کا جسمانی ڈھانچہ رکھتے ہیں۔ تاہم کوئی بھی دو انسان بالکل ایک دوسرے کے مشابہ نہیں۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ شخصی انفرادیت صرف آج کے لوگوں میں نہیں ہے۔ ہر وہ انسان جو کبھی اس زمین پر پیدا ہوا، مکمل طور پر ایک منفرد شخصیت کا مالک تھا۔ ہر آدمی بے مثال اور ناقابل اعادہ ہے۔ یہی صورت حال مستقبل میں بھی باقی رہے گی۔

بے شمار شہادتوں سے ثابت ہوا ہے کہ انسان کے جسم اور ذہن میں پچھلے ایک لاکھ سال کے اندر کوئی قابل لحاظ تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ پتھر کے زمانہ میں انسانی جسم جس طرح قدرتی حالات کے تحت عمل کرتا تھا، آج بھی وہ ویسا ہی کرتا ہے۔ اس پر مثال کے طور پر، چاند کی گردش کا اثر پڑتا ہے۔ جیسے جہاز جب تیزی سے سفر کر کے ہم کو دن کے وقت رات کے حصے میں داخل کر دیتا ہے تو انسانی جسم میں عضویاتی کشمکش شروع ہو جاتی ہے ــــــ اس طرح کے واقعات ارتقا پسند علماء کے تمام قیاسات کو باطل ثابت کرتے ہیں۔

دعوت اسلامی کے جدید امکانات

خدائی پیغام رسانی کا کام، انسانیت کے آغاز سے لے کر ساتویں صدی عیسوی تک پیغمبروں کے ذریعہ ہوا ہے۔ نبوت کی سطح پر اس کام کی انجام دہی کا یہ فائدہ تھا کہ اس کو معجزاتی تائید کی قوت حاصل رہتی تھی۔ نبی جب اپنی مدعو قوم کے سامنے اپنی دعوت پیش کرتا تو اس کے ساتھ وہ ایسے معجزات پیش کرنے پر قادر ہوتا تھا جو اس کی دعوت کی صداقت پر غیر معمولی برہان بن سکیں۔

ختم نبوت کے بعد یہ صورت حال ہو گئی کہ دعوت کی ذمہ داری تو بدستور اپنی پوری شدت کے ساتھ باقی ہے۔ مگر دعوت کے حق میں معجزاتی تائید کا وعدہ باقی نہیں رہا۔ ایک حکومت جب کسی کو فارسٹ افسر مقرر کرتی ہے تو اسی کے ساتھ وہ اس کو ضروری ہتھیار بھی دیتی ہے تاکہ جنگل میں درندوں کے متوقع حملہ کے وقت وہ اپنا دفاع کر سکے۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن تھا کہ وہ ہستی جو ساری رحمتوں کا خزانہ ہے وہ اس پہلو کو بھول جائے، وہ ہم کو ذمہ داری سونپ دے مگر ہماری ضرورتوں کا انتظام نہ کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ بعد کو آنے والے داعیوں کے لئے اللہ نے ایسا انتظام کیا جو پچھلے تمام انتظامات سے بھی زیادہ بڑا تھا۔ اللہ نے اس مقصد کے لئے خود انسانی تاریخ کے رخ کو موڑ دیا تاکہ دعوتی مشن کے حق میں وہ تائید معمول کے حالات میں مل جائے جس کو پچھلے لوگ صرف غیر معمولی حالات میں پانے کی توقع کر سکتے تھے۔ اگرچہ موجودہ دور میں اہل اسلام اس کو سمجھ نہ سکے اور اس سے فائدہ اٹھانے میں ناکام رہے۔

قرآن میں شرک کو ظلم عظیم (۳۱:۱۳) کہا گیا ہے۔ اس کے بالمقابل توحید کی بابت ارشاد ہوا ہے کہ وہی حق صداقت ہے (۱۰:۳۲)۔ قدیم ترین زمانے سے انسانی زندگی کا انتظام شرک کی بنیاد پر قائم چلا آرہا تھا۔ تمام پیغمبر جو خدا کی طرف سے آئے وہ اسی لئے آئے کہ انسان کو شرک کی برائیوں سے آگاہ کریں اور توحید کی بنیاد پر زندگی کا نظام قائم کریں تاکہ انسان کے لئے دنیا اور آخرت کی کامیابیوں کا دروازہ کھل سکے۔ مگر قوموں نے پیغمبروں کی بات چلنے نہ دی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پہلے پیغمبر ہیں جن کو خدا کی خصوصی نصرت کے تحت یہ کامیابی حاصل ہوئی کہ انھوں نے شرک کو مکمل طور پر ختم کیا اور توحید کی بنیاد پر ایک کامل انقلاب پیدا کر دیا (وقاتلوہم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ)۔ یہ انقلاب جو ساتویں صدی عیسوی میں ظاہر ہوا، اس کے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ تھا کہ اس نے تاریخ انسانی میں پہلی بار مظاہر کائنات کے تقدس کو ختم کر دیا اور انسانیت کے لئے مادی تحقیق کے ظہور کی راہ ہموار کی جس کو جدید سائنس کہا جاتا ہے۔

تہذیب جدید کے مورخین کے سامنے ایک سوال پیدا ہوا ہے کہ فطرت کے خزانے اول دن سے زمین کے اوپر موجود تھے۔ انسان کے اندر ضروری ذہنی صلاحیت بھی قدیم ترین زمانہ سے پائی جاتی رہی ہے۔ پھر اس خزانہ کو انسانی تمدن کے لئے استعمال کرنے میں اتنی دیر کیوں لگی۔ انسان لاکھوں برس سے زمین کے اوپر آباد ہے۔ مگر زمین کے قدرتی خزانوں کو موجودہ شکل میں استعمال کرنے کی تاریخ صرف چند سو برس پیچھے تک جاتی ہے۔ مورخ آرنلڈ ٹائن بی (۱۸۸۹-۱۹۷۵) نے بجا طور پر اس کا جواب یہ دیا ہے کہ قدیم زمانہ کا انسان زمین کو دیوتا سمجھتا تھا۔ یہاں کی ہر چیز اس کے لئے خدا کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ ان کو دیکھتا تو ان کے بارے میں اس کے اندر تقدس اور پرستش کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ اس نفسیاتی فضا میں زمینی ذخائر کو انسانی خدمت کے لئے استعمال کرنے کا جذبہ نہیں ابھر سکتا تھا۔ ٹائن بی کے الفاظ میں یہ توحید (MONOTHEISM) کا عقیدہ ہے جس نے کائنات کے تقدس کو ختم کیا اور ہر چیز کو ایک خدا کی مخلوق بتایا۔ اس طرح وہ نفسیاتی فضا پیدا ہوئی جس میں انسان اپنے سیارہ کو دیوتا سمجھنے کے بجائے اپنا خادم سمجھے اور اس پر تصرف کا عمل کر سکے۔ (ریڈرز ڈائجسٹ مارچ ۱۹۷۴)

کائنات کو تسخیر و تدبر کا موضوع سمجھنے کا ذہن اولاً اسلام کے اثر سے عربوں میں پیدا ہوا۔ اس فکری انقلاب کا ایک دھارا وہ تھا جس کا مرکز سسلی اور اسپین بنا۔ ان ملکوں میں غلبۂ توحید کے بالواسطہ نتیجہ کے طور پر، سائنسی کھوج اور زمینی خزانوں کو استعمال کرنے کا ذہن ابھرا اور بالآخر ایک عظیم الشان تہذیب وجود میں آ گئی۔ یہی عرب تہذیب تیرھویں صدی سے اٹلی کے راستہ یورپ پہنچنا شروع ہوئی اور بڑھتے بڑھتے بالآخر سترھویں اور اٹھارویں صدی کے انقلاب کا سبب بنی۔ جدید مورخین نے عام طور پر تسلیم کیا ہے کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا سبب اول (FIRST CAUSE) نبی عربی کے پیروؤں کے وہ کارنامے تھے جو انھوں نے اسپین کی حکومت (۷۱۱-۱۴۹۲) کے زمانہ میں دکھائے۔

بریفالٹ (BRIFFAULT) نے لکھا ہے "اگرچہ یورپ کی ترقی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر اسلامی تہذیب کے فیصلہ کن اثرات موجود نہ ہوں۔ لیکن یہ اثر کہیں بھی اتنا واضح اور اہم نہیں جتنا اس طاقت کے ظہور میں ہے جو دنیائے جدید کی مخصوص اور مستقل قوت اور اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ یعنی سائنس اور سائنسی طرز فکر" اس کے بعد اس کے الفاظ یہ ہیں:

IT IS HIGHLY PROBABLE THAT BUT FOR THE ARABS, MODERN INDUSTRIAL CIVILISATION WOULD NEVER HAVE ARISEN AT ALL

Making of Humanity, P. 202

انتہائی اغلب ہے کہ عربوں کے بغیر جدید صنعتی تہذیب سرے سے وجود ہی میں نہ آتی۔

کائناتی تقدس ختم ہونے کا یہی نتیجہ نہیں ہوا کہ عالم طبیعی کے بارے میں انسان کا نقطۂ نظر بدل گیا۔ انسانی تعلقات کے تمام شعبے بھی اس سے انتہائی گہرائی کے ساتھ متاثر ہوئے۔ مشرکانہ نظام کے تحت جس طرح یہ ہوا تھا کہ طبیعی دنیا کی جو چیز زیادہ روشن اور نمایاں نظر آئی اس کو خدا سمجھ لیا گیا، اسی طرح انسانی عظمتوں کے بارے میں بھی [illegible] قائم ہو گئے۔ بادشاہ دیوتاؤں کی اولاد قرار پائے۔ مذہبی پیشواؤں کے ساتھ خدا کا خصوصی رشتہ فرض کر لیا گیا۔ جس

انسان کے اندر کوئی نرالی خصوصیت نظر آئی اس کے متعلق یقین کر لیا گیا کہ اس کو کوئی خاص آسمانی حیثیت حاصل ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں۔

اسلامی انقلاب کے بعد جب شرک کا نظام ٹوٹا اور توحید کو غلبہ حاصل ہوا تو انسانی عظمتوں کو فوق الفطری معتقدات سے وابستہ کرنے کا ذہن بھی ختم ہو گیا۔ اب سارے انسان ایک خدا کے برتر کی یکساں مخلوق قرار پائے۔ ایک انسان اور دوسرے انسان میں فرق کرنے کی وہ بنیاد باقی نہ رہی جس کی وجہ سے تاریخ کے نامعلوم زمانوں سے انسانیت اونچ نیچ میں مبتلا چلی آرہی تھی۔ انسان اپنے حقیقی شرف سے محروم تھا۔ پیغمبر اسلام نے توحید کی بنیاد پر جو انقلاب برپا کیا، اس نے خدا کی برتری اور اس کے مقابلہ میں سارے انسانوں کی یکسانیت اس طرح ثابت کی کہ قدیم روایتی نظام بالکل ٹوٹ کر رہ گیا۔ انسانیت ایک نئے راستہ پر چل پڑی۔ لوگوں کے عقائد بدل گئے۔ پیشوائی اور سرداری کا سابقہ نظام درہم برہم ہو گیا۔ وہ شہنشاہتیں زمیں بوس ہو گئیں جو فوق الفطری عظمتوں کا یقین دلا کر لوگوں کے اوپر حکومت کر رہی تھیں۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار اس تبدیلی کا آغاز ہوا جو ساری دنیا میں ایک نئے انسانی دور کا آغاز بنا۔

روسو (۱۷۱۲ — ۱۷۷۸) نے اپنی کتاب اس مشہور فقرہ سے شروع کی ہے:

"انسان آزاد پیدا ہوا تھا، مگر میں اس کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھتا ہوں"

یہ فقرہ درحقیقت خلیفہ ثانی عمر فاروق (۵۸۱ — ۶۴۴) کے اس فقرہ کی بازگشت ہے جو انھوں نے روسو سے گیارہ سو برس پہلے محض ایک خیالی نظریہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ریاست کے حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے اپنے ماتحت افسر سے کہا تھا:

متی استعبدتم الناس وقد ولدتهم امهاتهم احرارا — تم نے کب سے لوگوں کو اپنا غلام بنا لیا، حالاں کہ ان کی ماؤں نے انھیں آزاد جنا تھا۔

تاریخ انسانی کو پیغمبر اسلام کی اس دین کا اعتراف غیر مسلم محققین نے عام طور پر کیا ہے۔ ڈاکٹر ہیرا لال چوپڑا (کلکتہ یونیورسٹی) اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

MODERN HISTORY ATTRIBUTES LIBERTY, EQUALITY AND FRATERNITY TO BE THE OUTCOME OF THE FRENCH REVOLUTION, BUT THE FIRST PERSON TO PROCLAIM IT WAS THE FOUNDER OF ISLAM FOURTEEN CENTURIES AGO.

Illustrated Weekly of India, April 15, 1973

جدید تاریخ آزادی، مساوات اور اخوت کو فرانسیسی انقلاب کا نتیجہ قرار دیتی ہے۔ مگر پہلا شخص جس نے اس کا اعلان کیا وہ اسلام کے بانی تھے جو چودہ سو سال پہلے پیدا ہوئے۔

یہ واقعات جو عالم طبیعی اور عالم انسانی میں پیش آئے، یہ درحقیقت توحید کے پیدا کردہ انقلاب کے دنیوی نتائج تھے۔ امریکہ سے ایک انسائیکلوپیڈیا چھپی ہے جس کا نام ہے: "مین اینڈ ہز گاڈس"۔ اس میں مختلف مذاہب پر مقالے ہیں۔ اسلام پر جو مقالہ ہے اس کے عیسائی مقالہ نگار نے اسلامی انقلاب کے ان نتائج کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے:

ITS ADVENT CHANGED THE COURSE OF HUMAN HISTORY (P.389)

اسلام کے ظہور نے انسانی تاریخ کے رخ کو موڑ دیا

پیغمبر آخر الزماں اور آپ کے ساتھیوں کے ذریعہ جو انقلاب برپا کیا گیا، وہ اگرچہ اصلاً توحید اور آخرت پر مبنی ایک انقلاب تھا۔ مگر اس نے بہت سے دور رس دنیوی نتائج بھی پیدا کئے۔ آپ کے لائے ہوئے انقلاب کے دنیوی نتائج میں سب سے اہم وہ نتائج ہیں جنھوں نے قدیم زمانہ کے سماجی اور اجتماعی نظام کو اس طرح بدل دیا کہ وہ حالات ہی ختم ہو گئے جن میں دعوت حق کا کام ایک انتہائی مشکل کام بن گیا تھا۔ اب دعوت حق کا وہ کام ایک سادہ اور آسان کام بن چکا ہے جس کے لئے اٹھنے والوں کو قدیم زمانہ میں فرعون کے اس چیلنج کا سامنا کرنا پڑا تھا:

میں تمھارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹ دوں گا اور تم سب کو سولی پر چڑھاؤں گا (الشعراء ۴۹)

اسی طرح اس انقلاب نے قدیم زمانہ کے اس فکری ڈھانچہ کو بدل دیا جس نے قیاسات اور توہمات کو علم کا درجہ دے رکھا تھا۔ کائنات میں چھپی ہوئی خدا کی تصدیقی نشانیاں لوگوں کے سامنے آگئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دعوت حق کا وہ کام جس کے لئے اس سے پہلے معجزاتی استدلال کی ضرورت ہوتی تھی، اب ممکن ہو گیا ہے کہ خود علم انسانی کے ذریعہ اس کو ثابت اور مدلل کیا جا سکے۔

تاریخ کا رخ موڑنے کا یہ عمل جو ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوا تھا، موجودہ زمانہ میں وہ اپنی آخری انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ خدا کے دین کی خاطر کام کرنے والوں کے لئے اب خود انسانی اسلحہ خانہ میں ہر قسم کے تائیدی ذرائع موجود ہیں۔ قانونی اور سماجی انقلابات نے اب اس کا موقع دے دیا ہے کہ دعوت اسلام کا کام اس طرح کھلے میدان میں کیا جائے جہاں کوئی فرعون اور کوئی نمرود راستہ روکنے کے لئے موجود نہ ہو۔ حقائق کی دنیا جو اب انسان کے علم میں آئی ہے وہ نہ صرف تمام دوسرے ادیان کو بے اعتبار ثابت کر رہی ہے بلکہ مثبت طور پر اس نے دین حق کی صداقت پر تمام دلائل جمع کر دیئے ہیں۔

یہ ایک نہایت وسیع مضمون ہے تاہم اس خاص پہلو سے یہاں ہم اس انقلاب کے بعض نتائج کا ذکر کریں گے

۱۔ سیاسی ادارہ کو فوق الفطری معتقدات سے جدا کرنا

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چار ہزار برس پہلے قدیم عراق کے دارالسلطنت (اُر) کے لوگوں کو پکارا کہ صرف ایک خدا ہے جو نفع و ضرر کا مالک ہے۔ ان باتوں میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اس لئے تم اسی سے حاجتیں مانگو اور اسی کی پرستش کرو۔ اس دعوت توحید کے خلاف اس وقت کے مشرک بادشاہ نمرود کلدانی نے اتنا شدید ردعمل ظاہر کیا کہ آپ کو آگ کے الاؤ میں ڈال دیا۔ آج بھی ہندستان میں شرک کا عقیدہ بڑے پیمانہ پر پایا جاتا ہے۔ لیکن آج آپ یہاں دعوت ابراہیمی کو لے کر اٹھیں تو نئی دہلی کے حکمراں آپ کے ساتھ اس قسم کا سلوک نہیں کریں گے۔

اس کی وجہ زمانی تبدیلی ہے۔ نمرود کے زمانہ میں شرک ایک سیاسی عقیدہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب کہ آج وہ صرف ایک محدود مذہبی عقیدہ ہے۔ نمرود، قدیم زمانہ کے دوسرے بادشاہوں کی طرح، لوگوں میں یہ عقیدہ پھیلا کر ان کے اوپر حکومت کر رہا تھا کہ وہ سورج دیوتا کا مظہر ہے، اس لئے اس کو حکمرانی کا فوق الفطری حق حاصل ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں۔ اس کے برعکس ہندستان کے موجودہ حکمرانوں کے نزدیک اس قسم کے کسی عقیدہ کا کوئی تعلق سیاست سے نہیں۔ انھوں

نے عوامی ووٹوں کی بنیاد پر حکمرانی کا حق حاصل کیا ہے نہ کہ کسی فوق الفطری عقیدہ کی بنیاد پر۔ یہی وجہ ہے کہ توحید کی دعوت میں ان کو اپنے سنگھاسن کے لئے کوئی راست نظریاتی خطرہ نظر نہیں آتا، جبکہ نمرود کو اس قسم کے کسی عقیدہ کے پھیلنے میں اپنی سیاسی جڑ کٹتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

قدیم زمانہ میں جب کوئی نبی اٹھتا تو اکثر ایسا ہوتا کہ پہلے ہی مرحلہ میں اقتدار وقت سے اس کا ٹکراؤ شروع ہو جاتا اور غیر ضروری قسم کی مشکلات اس کی راہ میں حائل ہو جاتیں۔ اس کی وجہ سیاسی اداروں کے ساتھ فوق الطبیعی عقائد کی یہی وابستگی تھی۔ قدیم زمانہ کے بادشاہ عوام کو یہ یقین دلا کر ان کے اوپر حکومت کرتے تھے کہ وہ دیوتاؤں کی اولاد ہیں، خدا ان کے اندر حلول کر آیا ہے۔ ایسے ماحول میں جب توحید خالص کی آواز بلند ہوتی تو ان کو نظر آتا کہ وہ ان کے سیاسی استحقاق کو بے اعتبار بنا رہی ہے۔ یہ اعتقادی پیچیدگی ان کو داعی حق سے متصادم کر دیتی تھی۔

اسلام نے ثابت کیا کہ ہر قسم کا فوق الفطری اقتدار صرف خدا کے لئے ہے اور یہ اعلان کیا کہ تمام انسان برابر ہیں ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ اس طرح اسلام نے سیاسی ادارہ کو اعتقادیات سے جدا کر دیا۔ اب سیاسی حکمرانی صرف سیاسی حکمرانی تھی، وہ مسئلہ توحید سے کوئی براہ راست تعلق نہ رکھتی تھی۔

اسلام کی اس فکر کی بنیاد پر عرب میں جو انقلاب آیا، وہ ایشیا اور افریقہ ہوتا ہوا بالآخر یورپ پہنچا۔ اٹھارویں صدی میں فرانس اور امریکہ کے جمہوری انقلابات اسی کی بازگشت تھے۔ اس کے بعد تبدیلی کا یہ عمل آخری طور پر مکمل ہو گیا۔ اب وہ وقت اپنی کامل صورت میں آ گیا کہ ایک داعی توحید کی دعوت لے کر اٹھے اور سیاسی اعتقادیات کی پیچیدگی میں الجھے بغیر بندگان خدا کو حق سے آگاہ کرتا رہے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص عوام میں یہ بات مشہور کر کے اپنا طبی کاروبار چلا رہا ہو کہ وہ ایک جن ڈاکٹر کا شاگرد ہے جو روزانہ رات کو آ کر اس کو فن طب کے رموز بتا جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں اگر کوئی شخص یہ آواز بلند کرے کہ علم طب میڈیکل کالج میں سیکھا جاتا ہے نہ کہ جناتوں کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے تو مذکورہ طبیب ایسی تحریک کا سخت مخالف ہو جائے گا۔ جب کہ اسی بستی میں ایم بی بی ایس ڈاکٹر کو اس تحریک سے کوئی عداوت نہ ہوگی۔

۴۔ اظہار رائے کی آزادی

دنیوی عظمتوں کو فوق الطبیعی سمجھنے ہی کا یہ نتیجہ بھی تھا کہ قدیم زمانہ میں عام افراد کو رائے کی آزادی حاصل نہ تھی۔ ایک شخص کی زبان قانون سمجھی جاتی تھی۔ اسلام نے جب غیر اللہ کے لئے فوق الطبیعی عظمتوں کے تصور کو منہدم کیا تو ساری دنیا میں ایک نیا عمل شروع ہو گیا۔ اگرچہ انتہائی خلاف زمانہ تصور ہونے کی وجہ سے اس عمل کی تکمیل میں ایک ہزار برس لگ گئے۔ تاہم وہ چیز جو قدیم زمانہ میں ایک مسلمہ حقیقت سمجھی جاتی تھی آج وہ اتنی بے دلیل ہو چکی ہے کہ ساری دنیا میں کوئی اس کی وکالت کرنے والا نہیں۔

جاپان کی تاریخ اس سلسلے میں بڑی سبق آموز مثال پیش کرتی ہے۔

سولھویں صدی کے نصف آخر میں عیسائی مذہب پرتگیزیوں کے ذریعہ جاپان میں داخل ہوا اور ملک

تھا۔ [illegible] یہ بادشاہت کا زمانہ تھا۔ ۱۶۱۲ میں ایک شاہی فرمان جاری ہوا جس کے مطابق عیسائیت اور اس کی تبلیغ کو جاپان میں خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ دو سو برس تک اس فرمان پر انتہائی بے رحمی کے ساتھ عمل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ عیسائیت کو جاپان سے بالکل ختم کر دیا گیا۔

مگر اسی مدت میں ایک اور عمل جاری تھا۔ اسلام نے تاریخ انسانی کو جو دھکا دیا تھا، وہ یورپ میں داخل ہو کر اٹھارویں صدی میں اپنی آخری سیاسی انتہا کو پہنچ گیا۔ فردی آزادی اور اظہار رائے مسلّمہ انسانی حق قرار پائے۔ یہ افکار جاو لاً فرانس میں مرتب ہوئے انھوں نے ساری دنیا پر اپنے اثرات ڈالنے شروع کئے۔ یہاں تک کہ جاپان کو ۱۸۷۳ میں خلاف مسیحیت قانون کو منسوخ کرنا پڑا اور ہر ایک کے لئے اظہار رائے کی مکمل آزادی تسلیم کر لی گئی۔

اس زمانی تبدیلی نے دین کی دعوت و تبلیغ کے تمام راستے کھول دیئے ہیں۔ اب ساری دنیا میں دین خداوندی کا اعلان کیا جاسکتا ہے اور کہیں بھی داعی کی زبان و قلم پر کوئی پابندی لگانے والا نہیں ہوگا۔ تاہم اس امکان کے دروازے اب بھی کھلے ہوئے ہیں کہ ہم خود اپنی نادانی کی وجہ سے دوبارہ کسی نئے عنوان سے دین کی اسلام کی راہ میں کھڑے کر دیں جن کو خدا نے اسلام کی راہ سے ہٹا دیا تھا۔ کوئی بھی انتظام، خواہ کتنا ہی اعلیٰ پیمانہ کا ہو، کسی کے لئے اس قسم کی نادانی کے امکان کو بند نہیں کرتا۔

■ ۳۔ مظاہر فطرت کو تسخیر و تدبر کا موضوع بنانا

کائناتی مظاہر پچھلے تمام معلوم زمانوں سے پرستش کا موضوع بنے ہوئے تھے۔ اسلام نے پہلی بار ان کو تسخیر و تدبر کا موضوع بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ جب تک آدمی ان کو خدا سمجھتا تھا وہ ان کے آگے جھکتا رہا۔ جب اس نے جانا کہ یہ سب مجبور اور مخلوق ہیں تو اس نے ان کو سمجھنے کے لئے تحقیق شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علوم فطرت آدمی کے سامنے کھلنے لگے۔ خدا نے اپنی تخلیقات میں جو تصدیقی نشانیاں رکھ دی تھیں وہ ایک ایک کر کے ظاہر ہونا شروع ہو گئیں۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی میں پہنچ کر اب وہ وقت آگیا ہے جس کی پیشگی اطلاع قرآن میں ان لفظوں میں دی گئی تھی: ہم ان کو آفاق و انفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے گا کہ یہ حق ہے۔ یہ پیشین گوئی اتنے بڑے پیمانہ پر واقعہ بن چکی ہے کہ جو باتیں ماضی کے انسان کے لئے ایمان بالغیب کی حیثیت رکھتی تھیں، آج وہ اس کے لئے ایمان بالشہود کے درجہ پر پہنچ چکی ہیں۔

قدیم زمانہ کا انسان فطرت کو سادہ واقعات کا مجموعہ سمجھتا تھا۔ آج معلوم ہوا کہ وہ بے حد پیچیدہ اور انتہائی حکیمانہ اصولوں پر مبنی ہے۔ اس کا نظام اتنی محکم بنیادوں پر چل رہا ہے کہ ایک عظیم کارساز کو مانے بغیر اس کی کوئی توجیہہ ممکن نہیں۔ قدیم فلاسفہ یہ کہتے تھے کہ خدا جیسے ایک ازلی وجود کو ماننے کے بجائے ہم کیوں نہ اسی کائنات کو ازلی مان لیں۔ مگر جدید تحقیقات (مثال کے طور پر بگ بینگ نظریہ) نے اس نقطۂ نظر کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔ جدید سائنس نے دریافت کیا ہے کہ دنیا ایک وقت خاص میں پیدا کی گئی۔ گویا اب ایک ازلی و ابدی خالق کو مانے بغیر چارہ نہیں۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ کائنات کے اندر جو مختلف طبیعی، کیمیاوی اور حیاتیاتی مظاہر ہیں، ان کو بہت سی الگ الگ

فطری طاقتیں کنٹرول کر رہی ہیں۔ نیوٹن کے بعد ان طاقتوں کی گنتی تین تک آگئی: تجاذب، مقناطیسیت اور نیوکلیر فورس۔ مگر حال میں ایٹم کے اندر جو چارجڈ ذرہ (CHARGED PARTICLE) دریافت ہوا ہے، اس کے بعد تعدد کا نظریہ ختم ہو گیا۔ اب یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ ایک ہی متحدہ طاقت ہے جو فطرت کے تمام عملوں کی ذمہ دار ہے۔ گویا شرک کے حق میں علمی بنیاد ختم ہو گئی اور اب توحید کے سوا کوئی راستہ انسان کے لئے باقی نہیں رہا۔ زندگی بعد موت جس کو پہلے ناقابل ثبوت سمجھا جاتا تھا، اب اس کا سائنسی ثبوت فراہم ہونے لگا ہے۔ حتیٰ کہ غیر مذہبی علماء آج ایسی کتابیں لکھ رہے ہیں جن کا نام ہوتا ہے: زندگی کے بعد زندگی (LIFE AFTER LIFE)

۴۔ غیر علمی طرز فکر کا خاتمہ

پچھلے تمام زمانوں میں غیر علمی یا توہماتی طرز فکر دنیا کے اوپر چھایا ہوا تھا۔ اس طرز فکر کا خاصہ ہے کہ وہ کسی بات کی کھری جانچ کئے بغیر اس کو مان لیتا ہے۔ قدیم زمانہ میں اس غیر علمی طرز فکر نے لوگوں کو یہ موقع دے رکھا تھا کہ وہ آسانی سے اپنے لئے کوئی نہ کوئی ذہنی پناہ گاہ تلاش کریں جہاں وہ دین حق سے بھاگ کر چھپ سکیں۔ فتح مکہ کے بعد جب کعبہ سے بتوں کو نکال کر توڑا جانے لگا تو اسلام کا یہ غلبہ دیکھ کر مکہ کے بت پرستوں کو فوراً توبہ کر لینی چاہئے تھی، مگر انھوں نے یہ کیا کہ وہ بستی چھوڑ کر پہاڑوں میں بھاگ گئے۔ ان کا یقین تھا کہ اب ضرور مکہ پر کوئی آفت آئے گی اور مسلمانوں کے استیصال کا جو کام وہ خود نہ کر سکے وہ ان کے بت انجام دے دیں گے۔ انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ اگر بتوں کے اندر طاقت ہوتی تو وہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہی کیوں ہونے دیتے۔

سائنسی انقلاب دراصل توہماتی طرز فکر کے بجائے واقعاتی غور و فکر کا نام تھا۔ کائنات کا نظام چونکہ انتہائی اٹل بنیادوں پر چل رہا ہے۔ اس لئے فطری طور پر کائناتی علم کی ترقی نے تجزیاتی استدلال اور حقیقت پسندانہ تحقیق کا مزاج پیدا کیا۔ قدیم زمانہ میں لوگوں کو اپنی توہم پرستی اور غیر علمی انداز فکر کی وجہ سے ایک غیر واقعی بات کو مان لینے میں کوئی مشکل نہیں پیش آتی تھی۔ وہ نہایت آسانی کے ساتھ ایک بے بنیاد عقیدہ کو اس طرح اپنے ذہن میں جگہ دے سکتے تھے گویا وہ کوئی ثابت شدہ حقیقت ہے۔ مگر آج کا انسان حقیقت واقعہ سے کم تر سطح پر کسی چیز کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اس ذہنی فضا نے تاریخ میں پہلی بار تمام دروازے صرف دین حق کے لئے کھول دیئے ہیں کیونکہ اس کے سوا کوئی دین نہیں جو واقعاتی تجزیہ اور حقیقت پسندانہ جانچ کے معیار پر پورا اتر سکے۔

یہ نئی زمین جو اسلام کے حق میں تیار ہوئی ہے، مسلمان خود تو ابھی بہت کم اس سے فائدہ اٹھا سکے ہیں۔ البتہ اس سے پیدا شدہ ثمرات ان کو ملنا شروع ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر یہی چیز ہے جس نے اسلام کے مطالعہ کے لئے قدیم طرز کے استشراق کا خاتمہ کر دیا۔ صلیبی لڑائیوں کے بعد یورپ نے اسلام کی تاریخ اور اس کی تعلیمات کو بالقصد بگاڑنا شروع کیا۔ صدیوں تک یہ کام جاری رہا۔ یہاں تک کہ سارا مغربی لٹریچر اس سے بھر گیا۔ سائنس کے ظہور سے پہلے لوگوں کو اس میں کوئی قابل اعتراض بات نظر نہ آتی تھی۔ مگر سائنس کے ذریعہ جو حقیقت پسندانہ طرز فکر پیدا ہوا اس نے اس طرح مطالعہ کو بے معنی بنا دیا۔ قدیم استشراق کے خاتمہ کا پہلا نشان تھامس کارلائل (۱۷۹۵ - ۱۸۸۱) کے زمانہ

میں شروع ہوا اور اب بیسویں صدی کے نصف آخر میں وہ بالکل ختم ہو چکا ہے۔

۵۔ افسانوی طرز فکر کے بجائے تاریخی طرز فکر

قدیم زمانہ میں روایت اور تاریخ میں فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ لوگ ایک بے اصل افسانہ کو بھی اسی طرح مانتے تھے جس طرح ایک ثابت شدہ تاریخی واقعہ کو ماننا چاہئے۔ سائنسی اور علمی نقطہ نظر نے جب حقیقت پسندی کا ذہن پیدا کیا تو اس کے ساتھ فطری طور پر یہ ذہن بھی پیدا ہوا کہ انسانی واقعات کو مورخانہ انداز سے سمجھا جائے۔

تاریخی تحقیق کی یہ مہم مذہب تک بھی پہنچی اور وہ فن پیدا ہوا جس کو تنقید عالیہ (HIGHER CRITICISM) کہا جاتا ہے۔ اس شعبہ تاریخ کے تحت جب مختلف مذاہب کی چھان بین کی گئی تو معلوم ہوا کہ دور قدیم کے سارے مذاہب تاریخی حیثیت سے غیر معتبر ہیں۔ اسلام کے بعد، تمام مذاہب میں، عیسائیت سب سے قریبی زمانہ سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر اس کا حال بھی یہ ہے کہ حضرت مسیح کے وجود کا کوئی تاریخی ریکارڈ آپ کی معاصر تاریخ میں نہیں پایا جاتا۔ آنجناب کے بارے میں معلومات کا واحد ذریعہ وہ مختصر انجیلیں ہیں جن کا تاریخی استناد خود انتہائی طور پر مشتبہ ہے — مذاہب کی فہرست میں صرف اسلام کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ پروفیسر ہٹی کے الفاظ میں وہ تاریخ کی پوری روشنی میں WITHIN THE FULL LIGHT OF HISTORY پیدا ہوا۔ اس کی تمام چیزیں تاریخ کے معیار پر مکمل طور پر پوری اترتی ہیں۔ اسلام، پورے معنوں میں، ایک تاریخی واقعہ ہے نہ کہ غیر ثابت شدہ روایات کا مجموعہ۔

قدیم زمانہ میں تاریخی ثبوت کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی تھی۔ مگر آج کا انسان اس چیز کو قابل غور بھی نہیں سمجھتا جو مورخانہ معیار پر پوری نہ اترتی ہو۔ اس صورت حال نے اسلام کو لوگوں کے لئے پرکشش بنانے کا اتنا بڑا میدان کھول دیا ہے جو اس سے پہلے کبھی حاصل نہ تھا۔

۶۔ آسمانی توجیہہ کی تلاش

خدا کو نہ ماننے والوں کی یہ کوشش رہی ہے کہ زمینی واقعات کی توجیہہ خود زمین کے حالات میں تلاش کریں۔ مثلاً زندگی کو زمینی عناصر کے تعامل کا نتیجہ قرار دینا۔ مگر جدید شواہد نے اس قسم کی باتوں کو بالکل بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔ اب سائنس داں مجبور ہو رہے ہیں کہ وہ زمینی واقعات کے لئے آسمانی توجیہہ تلاش کریں۔ مثلاً قدیم نظریہ ارتقاء کے بجائے اب پینس پرمیا (PANSPERMIA) کا نام لیا جانے لگا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی زمین پر خود بخود پیدا نہیں ہوگئی بلکہ بالائی خلا سے ہمارے اس کرہ پر بالقصد بھیجی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بالائی خلا میں کسی مقام پر غالباً ہم سے زیادہ ترقی یافتہ "تہذیب" موجود ہے جس نے زمین پر زندگی کے جراثیم بھیجے ہیں۔

مزید یہ کہ فلکیات کے وسیع تر مطالعہ سے معلوم ہوا کہ "عالم بالا" ہم سے غیر متعلق اور بے عقل و بے شعور عالم نہیں ہے۔ ایسے قرائن معلوم ہوئے ہیں جو بتاتے ہیں کہ خلا کے کسی مقام پر ہم سے زیادہ ذہین ہستیاں موجود ہیں۔ وہ اپنے اعلیٰ مواصلاتی ذرائع سے مسلسل ہماری زمین سے ربط رکھے ہوئے ہیں۔ حال میں ایک نیا شعبہ مطالعہ وجود میں آیا ہے جس کو ریڈیائی فلکیات (RADIO ASTRONOMY) کہا جاتا ہے۔ علم الافلاک کی اس نئی شاخ کا مقصد یہ ہی

خلا میں سگنل بھیجنا اور اوپر سے آنے والی ریڈیائی لہروں کا مطالعہ کرنا ہے۔ سائنسی حیثیت سے ترقی یافتہ ممالک میں ایسے بہت سے ادارے وجود میں آئے ہیں جو مختلف تدابیر کے ذریعے اس کوشش میں مصروف ہیں کہ زمین کے علاوہ کسی دوسرے کائناتی مقام پر جو اعلیٰ تر ذہنی ہستیاں پائی جاتی ہیں، ان سے ربط قائم کیا جائے ـــ ان کوششوں کا انجام خواہ جو بھی ہو، تاہم اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جدید انسان کے لئے خدائی الہام کا تصور اب ایسی مستبعد چیز نہیں رہا جس پر سوچنے کے لئے وہ تیار ہی نہ ہوسکتا ہو۔

فطرت کی دریافت اور کائنات کی تسخیر نے موجودہ زمانہ میں عیش وعشرت کے بے شمار نئے دروازے کھول دیئے۔ انسان نے ایسا شاندار تمدن بنایا جو معلوم تاریخ کے مطابق اس زمین پر کبھی نہیں بنا تھا اور آرام وراحت کے ایسے سامان فراہم کئے جو پہلے انسان نے خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔

مگر ترقیوں کی انتہا پر پہنچ کر بالآخر انسان کو معلوم ہوا کہ موجودہ دنیا میں وہ زندگی نہیں بن سکتی جو خوف وحزن اور لغو اور تاثیم سے خالی ہو ـــ ترقیات نے فطرت کے حسین توازن کو توڑ دیا۔ بڑھاپا، بیماری اور موت پر قابو پانا ممکن نہ ہوسکا۔ حکومتی نظام اور قانونی ضوابط انسان کو نظم وضبط کے دائرہ میں رکھنے کے لئے ناکافی ثابت ہوئے۔ مشینی تہذیب کی کثافتوں نے خشکی وتری کو فساد سے بھر دیا۔ مادی ساز وسامان آدمی کو خوشی اور سکون نہ دے سکے۔ وغیرہ

اس تجربہ کے بعد ساری دنیا میں ایک نئی حرکت شروع ہوئی ہے۔ انسان مادیات سے اکتا کر غیر مادیات میں اپنی تسکین ڈھونڈ رہا ہے۔ خارجی دنیا سے واپس ہوکر وہ اپنی اندرونی دنیا میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے اس کوشش نے مذہب اور نفسیات کے علم کو بالکل نئی اہمیت دے دی ہے۔ آج کا انسان دوبارہ اس مقام پر واپس آگیا ہے جہاں اس کو خدا اور مذہب کی باتیں بتائی جائیں اور وہ ان کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ غور کرے۔ قدیم زمانہ میں تھوڑے سے حنیف "تھے جو سچائی کی تلاش کر رہے تھے۔ آج دنیا کی دنیا سچائی کی تلاش میں سرگرداں ہے

یہ ذہنی زمین، بالواسطہ طور پر، اسلام ہی کی پیدا کردہ ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے معاملہ میں اسلام کے پیرو ہی سب سے پیچھے دکھائی دیتے ہیں۔

اس طرح کی بے شمار چیزیں ہیں جنھوں نے موجودہ زمانہ میں دین حق کی تبلیغ واشاعت کا بالکل نیا میدان کھول دیا ہے۔ آج سیاسی جبر اور ذہنی رکاوٹ دونوں سے آزاد ہو کر خداوندی پیغام کا اعلان کیا جا سکتا ہے۔ الا یہ کہ ہم خود اپنی نادانی کی وجہ سے دوبارہ کسی نئے عنوان سے وقت کے حکمرانوں سے وہی ٹکراؤ شروع کر دیں جس سے خدا نے دعوت اسلامی کی تحریک کو محفوظ کر دیا تھا۔

۳ ۱ ـــ سائنٹفک اسلوب بیان

اس سلسلے میں ایک بات دعوت حق کے اسلوب سے متعلق ہے۔ قرآن میں دعوت حق کو جس زبان میں پیش کیا گیا ہے، وہ فطرت کی سادہ زبان ہے۔ "افی اللہ شک فاطر السماوات والارض" کی زبان سے قدیم زمانہ کا تعلیم یافتہ انسان زیادہ مانوس نہ تھا۔ وہ یا تو جادو اور طلسمات سے متاثر ہوتا یا خیالی فلسفوں سے

یہی وجہ ہے کہ ہمارے قدیم صوفیاء کو یوگ اور اشراق سے اس ذوق کے لئے تسکین فراہم کرنی پڑی اور متکلمین کو یونانی فلسفہ سے۔ قصّاص کے گروہ نے اسی مقصد کے لئے بے شمار تعداد میں عجائب وغرائب قصّے گھڑے اور ان کے ذریعہ اسلام کی ایک الف لیلیٰ تیار کر دی۔

مگر اب صورت حال مکمل طور پر بدل گئی ہے۔ اب سائنس کے انقلاب کے بعد، وہی زبان اور اسلوب وقت کا معیاری اسلوب قرار پا گیا ہے جو چودہ سو برس پہلے قرآن میں اختیار کیا گیا تھا۔ یہ ہمارے حق میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی مدد ہے۔ اب ہمیں نہ تو بے معنی قسم کی روحانی ورزشوں میں وقت ضائع کرنے کی ضرورت ہے اور نہ قصہ گوئی اور فلسفہ طرازی کا کمال دکھانے کی۔ اب قرآن کی دعوت کو اس کے سادہ فطری اسلوب ہی میں لوگوں کے سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ قرآن و حدیث کے سادہ ترجمے، سیرت رسول اور حالات صحابہ پر واقعاتی اسلوب میں لکھی ہوئی کتابیں اگر مختلف زبانوں میں مرتب کر کے دنیا بھر میں پھیلا دی جائیں تو یہی اقوام عالم پر حجت قائم کرنے کے لئے کافی ہے۔

۹۔ وسائل کا خداداد خزانہ

آخری بات یہ کہ موجودہ زمانہ میں علم کی ترقی اور پریس کی ایجاد نے دعوتی کام کی انجام دہی کے لئے لامتناہی امکانات کھول دیئے ہیں۔ حضرت مسیح کی آواز، آنجناب کے زمانہ میں فلسطین کے ایک قصبہ سے باہر نہ جا سکی۔ مگر آج آپ کے پیرو بیک وقت دو ہزار سے بھی زیادہ زبانوں میں مسیحی مذہب کو منتقل کر رہے ہیں اور سارے عالم میں مسلسل اس کی آواز پہنچا رہے ہیں۔ کل اور آج کا یہ فرق دراصل زمانہ کا فرق ہے۔ آج ایسے وسیع الاثر مواقع کھل گئے ہیں کہ زمین کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر ساری دنیا میں دعوت کے کام کو منظم کیا جا سکتا ہے۔ جدید ذرائع ابلاغ کی دریافت نے دعوت کے عمل کو مقامی پیغام رسانی کے دور سے نکال کر عالمی پیغام رسانی کے دور میں پہنچا دیا ہے۔

جدید صنعتی دور میں مسلمان اپنی اقتصادی پس ماندگی کی وجہ سے اس قابل نہ رہے تھے کہ دعوت حق کی اشاعت کے لئے جدید امکانات کو اعلیٰ سطح پر استعمال کر سکیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے مسلم ملکوں میں پٹرول کے خزانے برآمد کر کے ان کی اقتصادی پس ماندگی کی تلافی کر دی اور انھیں اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے اس فریضہ کی ادائگی کی بڑی سے بڑی قیمت دے سکو بھی اس کو انتہائی کامل شکل میں جاری رکھ سکیں۔

ہمارے رب نے ہمارے لئے سیاسی اور فکری رکاوٹیں بھی دور کر دی ہیں اور اقتصادی رکاوٹیں بھی۔ اس سہ طرفہ نصرت کے بعد بھی مسلمان اگر دعوتی کام کے لئے نہ اٹھیں تو انھیں اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ وہ خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے، خواہ دعوت کی ذمہ داری کو چھوڑ کر وہ کوئی دوسرا کام کتنی ہی بڑی مقدار میں کیوں نہ انجام دے رہے ہوں۔

خاتمۂ کلام

قدیم زمانہ میں شرک (غیر اللہ کی فوق الفطری کبریائی) کا عقیدہ غالب عقیدہ کی حیثیت رکھتا تھا جس طرح آج، مثال کے طور پر، انسانی آزادی کے تصور نے ساری دنیا میں غالب عقیدہ کی حیثیت حاصل کر لی

ہے۔اس صورت حال نے قدیم زمانہ میں بے شمار مصنوعی مسائل پیدا کر رکھے تھے جن میں سے ایک مسئلہ یہ تھا کہ توحید کے داعیوں کو آگ اور خون کے طوفان سے گزر کر حق کا پیغام دینا پڑتا تھا۔

پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو انقلاب آیا، اس نے شرک کو غالب عقیدہ کے مقام سے ہٹا دیا اس کے بعد ایک نیا تاریخی عمل شروع ہوا۔ آغاز اسلام کے تقریباً ہزار ویں سال اس انقلاب کے دو حصے ہو گئے۔ اس کا مذہبی پہلو اسلامی دنیا میں محفوظ رہا۔ اور اس کا دنیوی پہلو اس سے الگ ہو کر مغربی دنیا کی طرف منتقل ہو گیا۔ وہاں اس نے مزید ترقی شروع کی۔ یہاں تک کہ ۱۹ ویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول کے زمانے میں وہ اپنے آخری کمال تک پہنچ گیا۔ موجودہ زمانہ میں جمہوریت، آزادی رائے، سائنسی نقطۂ نظر، سب اسی کی مثالیں ہیں جو در حقیقت اسلامی انقلاب کے دنیوی پہلو یا اس کے سیکولر نتائج ہیں۔

اسلام کے زیر اثر پیدا شدہ اس انقلاب نے جدید دنیا میں اسلام کی توسیع و اشاعت کے نئے دروازے کھول دیئے تھے۔ ایک طرف یہ ممکن ہو گیا تھا کہ توحید کی پیغام رسانی کے کام کو نہایت قوت کے ساتھ بالکل آزادانہ ماحول میں شروع کیا جا سکے۔ دوسری طرف پریس اور جدید ذرائع ابلاغ نے تاریخ میں پہلی بار یہ امکان پیدا کیا تھا کہ اسلامی دعوت کی مہم کو عالمی سطح پر منظم کیا جا سکے۔ مگر عین اس وقت ایک حادثہ پیش آیا۔ موجودہ زمانہ میں اسلام کے نام پر اٹھنے والی تحریکوں نے دعوت کے بجائے سیاست کا رُخ اختیار کر لیا۔ وقت کے حکمرانوں سے ٹکرا کر انھوں نے اپنے لئے نئے عنوان سے وہی مشکلات پیدا کر لیں جن کو اسلام کے ہزار سالہ عمل نے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا تھا۔

اسلام کی تاریخ میں کوئی واقعہ اتنا الم ناک نہیں جتنا الم ناک یہ واقعہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں اٹھنے والی تقریباً تمام اسلامی تحریکوں نے سیاسی مقابلہ آرائی کو کام سمجھا اور غیر ضروری طور پر اسلام کو اقتدار کے مدمقابل کھڑا کر دیا۔ کسی تحریک نے شروع ہی سے میدان سیاست میں چھلانگ لگا دی۔ کوئی بعد کو اس "مقدس جہاد" کی طرف مڑ گئی ـــــــ ٹھیک اس وقت جب کہ تاریخ کا عمل اپنی آخری انتہا کو پہنچ کر ہمارے لئے دعوتی کام کا عالی شان میدان کھول رہا تھا، ہم انتہائی نادانی کے ساتھ ایک ایسی سیاسی لڑائی میں مشغول ہو گئے جس کا کوئی نتیجہ مسلمانوں کو ملنے والا نہیں تھا، نہ دینی نہ دنیوی۔ اب اس غلطی کی واحد تلافی یہ ہے کہ سیاست بازی کو مکمل طور پر ترک کر کے قرآن و سنت کے پیغام کو اہل عالم تک پہنچانے کا کام فوراً شروع کر دیا جائے۔

اپریل ۱۹۷۷ میں جامعہ دار السلام عمر آباد کی گولڈن جوبلی منائی گئی۔ اس موقع پر علما ہریلی کی نشست میں یہ مقالہ بشکل تقریر پیش کیا گیا۔

"جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور ان کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انھیں سخت عذاب کی خوش خبری دے دو" (توبہ۔ ۳۴) قرآن کی یہ آیت اتری تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تبا للذھب تبا للفضۃ (برا ہو سونے کا اور برا ہو چاندی کا)۔ یہ بات جب آپ کے اصحاب کو معلوم ہوئی تو وہ تشویش میں پڑ گئے۔ انھوں نے آپس میں کہا: فای مال نتخذ (اب ہم کون سا مال جمع کریں)۔ حضرت عمرؓ اس وقت وہاں موجود تھے۔ انھوں نے کہا "اگر تم لوگ پسند کرو تو میں اس کی بابت رسول اللہؐ سے سوال کروں۔ لوگوں نے کہا" ہاں۔ چنانچہ وہ آپ کے پاس گئے اور کہا کہ آپ کے اصحاب کہہ رہے ہیں کہ کاش ہم جانتے کہ کون سا مال بہتر ہے تو ہم اس کو جمع کرتے۔ آپ نے فرمایا:

لیتخذ احدکم لسانا ذاکرا وقلبا شاکرا وزوجۃ مومنۃ تعین احدکم علی ایمانہ	تم میں سے ہر ایک یہ کرے کہ یاد کرنے والی زبان اور شکر کرنے والا دل اپنائے اور ایسی بیوی اختیار کرے جو اس کے ایمان میں اس کی مدد کرے۔

تفسیر ابن کثیر، جلد ۲، صفحہ ۳۵۱

خواتین اسلام

حضرت ام سلمہ ایک بار کسی عورت سے اپنے بال گندھوا رہی تھیں۔ اتنے میں مسجد سے خطبہ کی آواز آئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: ایہا الناس (اے لوگو) یہ سنتے ہی فرمایا، بس جیسے ہیں ویسے ہی باندھ دو۔ عورت نے کہا اتنی جلدی کیا ہے۔ ابھی تو آپ نے ایہا الناس کہا ہے۔ انھوں نے کہا "خوب! کیا ہمارا شمار آدمیوں میں نہیں" یہ کہہ کر خود ہی بال باندھ کر کھڑی ہو گئیں اور قریب ہو کر خطبہ سننے لگیں۔ (طبقات ابن سعد) حضرت ام سلمہ کی مرویات کی تعداد ۳۷۸ ہے۔ وہ فتوی بھی دیا کرتی تھیں۔ ابن قیم نے لکھا ہے کہ اگر ان کے فتوے جمع کئے جائیں تو ایک رسالہ تیار ہو جائے گا۔

رسول اللہؐ کی ازواج میں حضرت عائشہؓ سب سے زیادہ ذہین تھیں۔ ان کی مرویات کی تعداد ۲۲۱۰ تک شمار کی گئی ہیں۔ ان سے تقریباً ایک سو صحابہ و تابعین نے روایت کیا ہے۔ عروہ بن زبیر، سعید بن مسیب، عبداللہ بن عامر، مسروق بن اجدع، عکرمہ اور علقمہ جیسے لوگ آپ کے شاگردوں میں شامل ہیں۔ حضرت عائشہ ایک اعلیٰ درجہ کی فقیہ خاتون تھیں۔ جب کوئی حدیث بیان کرتیں تو اس کی علت و حکمت بھی بیان کر دیتیں۔ حضرت ابو سعید اور حضرت عبد اللہ بن عمر سے جمعہ کے غسل کے بارے میں صرف اس قدر مروی ہے کہ جمعہ کے دن غسل کرنا چاہیے۔ مگر اسی حدیث کو حضرت عائشہ نے بیان کیا تو یہ بھی فرمایا کہ لوگ دور دور کی آبادیوں سے نماز جمعہ کے لئے مدینہ آتے تھے۔ وہ گرد و غبار سے اٹے ہوتے اور پسینہ سے تر ہوتے۔ اس لئے آپ نے فرمایا کہ تم لوگ نہا لیا کرو۔

بنی غفار کی ایک عورت کہتی ہیں کہ میں اپنے قبیلہ کی کچھ عورتوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی۔ آپ خیبر کے جہاد کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ ہم نے

عرض کیا: اے خدا کے رسول! ہم چاہتے ہیں کہ ہم بھی اس سفر میں آپ کے ساتھ چلیں۔ تاکہ ہم زخمیوں کی مرہم پٹی کریں۔ اور جہاں تک ہو سکے مسلمانوں کی مدد کریں۔ آپؐ نے فرمایا: علی برکۃ اللہ (اللہ برکت دے، چلو)۔ انصاری خاتون ام عطیہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سات غزووں میں شرکت کی ہے۔ میں مجاہدوں کے کجاووں کی دیکھ بھال کے لئے پیچھے رہتی، ان کے لئے کھانا پکاتی، زخمیوں کا علاج کرتی اور مصیبت زدوں کی نگرانی کرتی۔ اسماء بنت یزید بن سکن حضرت معاذ بن جبل کے چچا کی بیٹی تھیں۔ ان کی بابت حضرت مہاجر بتاتے ہیں کہ انھوں نے جنگ یرموک میں خیمہ کی لکڑی سے نو رومیوں کو قتل کیا۔

مدینہ کے یہودیوں سے جنگ کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ عورتوں اور بچوں کو ایک قلعہ کی چھت پر جمع کر کے حسان بن ثابت رضؓ کو ان کی دیکھ بھال کے لئے وہاں رکھا گیا تھا۔ صفیہ بنت عبد المطلب بھی اسی قلعہ کی چھت پر تھیں۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ ہمارے قریب سے ایک یہودی گزرا۔ اور ہمارے قلعہ کا چکر لگانے لگا۔ اس وقت بنی قریظہ نے جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ اس وجہ سے ہمارے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان راستہ کٹ گیا تھا۔ اور وہاں کوئی نہیں تھا جو یہود کے مقابلہ میں ہماری مدافعت کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمان دشمن کے مقابلہ میں تھے، وہ ان کو چھوڑ کر ہماری طرف نہیں آسکتے تھے۔ اتنے میں آنے والا یہودی سامنے سے گزرا۔ میں نے کہا اے حسان! دیکھو یہ یہودی ہمارے قلعہ کا چکر لگا رہا ہے اور میں خدا کی قسم اس سے مامون نہیں۔ کہیں وہ ہماری اس غیر محفوظ حالت کو یہودیوں سے جاکر کہہ نہ دے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب جنگ میں مشغول ہیں۔ پس اترو اور اس کو جاکر قتل کر دو۔ حسان بن ثابت نے کہا: واللہ لقد عرفت ما انا بصاحب ھذا (خدا کی قسم تم کو معلوم ہے کہ میں اس کام کا نہیں) وہ کہتی ہیں کہ جب انھوں نے مجھ کو یہ جواب دیا اور میں نے ان کے پاس مارنے کی کوئی چیز بھی نہ دیکھی، تو میں نے کمر سے کپڑا کسا اور ایک لکڑی ہاتھ میں لی۔ پھر قلعہ سے اتر کر اس کے پاس پہنچی اور اس لکڑی سے اس کو مارنا شروع کیا، یہاں تک کہ میں نے اس کو ہلاک کر دیا۔ پھر جب میں اس سے فارغ ہو گئی تو میں قلعہ میں واپس آئی اور حسان بن ثابت سے کہا کہ قلعہ سے اتر کر جاؤ اور اس کا سامان لاؤ۔ میں صرف اس لئے اس کا سامان اتارنے سے رک گئی کہ وہ مرد تھا، حسان بن ثابتؓ نے کہا: اے عبد المطلب کی بیٹی! مجھے اس کے سامان کی ضرورت نہیں۔ (البدایہ والنہایہ، جلد ۴، صفحہ ۱۰۸)

زندگی کیا ہے، موت کی طرف ایک سفر۔ موت اس لئے آتی ہے تاکہ دوسری دنیا میں آدمی کی وہ مستقل زندگی شروع ہو جو دنیا کے عمل کے مطابق اچھی یا بری اسے گزارنی ہے۔ ہر شخص دوسروں کو اپنے سامنے اس انجام کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا ہے مگر خود اس طرح زندگی گزارتا ہے، گویا اس کو کبھی اس انجام سے دوچار ہونا نہیں پڑے گا۔ آہ وہ انسان جو اسی بات کو نہیں جانتا جس کو اسے سب سے زیادہ جاننا چاہئے۔

وہ خدا کے سایہ میں چلنے لگتے ہیں

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حریفوں پر جو حیرت انگیز سیاسی کامیابی حاصل کی اور جس طرح اپنے لائے ہوئے دین کو ایک پورے جغرافیہ پر غالب کر دیا، وہ ساری انسانی تاریخ میں اپنی قسم کا پہلا واقعہ ہے۔ ہمارے قدیم مورخین اور سیرت نگار جب آپ کے ان عظیم کارناموں پر پہنچتے ہیں تو یہ کہہ کر بات ختم کر دیتے ہیں کہ "آپ پر وحی نازل ہوتی تھی اور آپ خدا کی ہدایت کے مطابق سارے اقدامات کرتے رہتے تھے"۔ یہ انداز تعبیر اتنا عام ہے کہ روایت پرست مورخین تو درکنار ابوالحسن ماوردی، ابویعلی الفراء، ابن تیمیہ، ابن قیم اور ابن قتیبہ جیسے لوگ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

سیرت کے اس انداز کو بظاہر آپ کی عظمت و تقدس کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ مگر درحقیقت یہ پیغمبر اسلام کی تصغیر ہے۔ یہ آپ کو گائیڈیڈ مزائل کی سطح پر پہنچا دینا ہے۔ بلاشبہ آپ اللہ کے نبی تھے اور اللہ کی طرف سے آپ کو ہدایات پہنچتی رہتی تھیں۔ مگر اسی کے ساتھ آپ ایک اعلیٰ ترین انسان اور اعلیٰ ترین مومن بھی تھے۔ آپ عام انسانوں کے لیے ایک معیاری نمونہ تھے کہ کس طرح ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص جب اپنے آپ کو دین حق کے لیے وقف کرتا ہے اور خدا کی یاد اور اس کی محبت میں مشغول ہو جاتا ہے تو خدا سے اس کا لازوال تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ وہ حسن و کمال کے سرچشمہ سے اس طرح مربوط ہو جاتا ہے کہ وہ اس کو دیکھنے لگتا ہے۔ اس سے اس کی سرگوشیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ دائمی طور پر اس کے سایہ میں چلنے لگتا ہے۔

پیغمبر اسلام کا تعلق اپنے رب سے صرف جبریل کے ذریعے ہی نہ تھا۔ بلکہ براہ راست بھی تھا۔ اور یہ وہی تعلق تھا جو ہر ایک کے لیے اس کے حوصلہ کے بقدر کھلا ہوا ہے۔ یہ تعلق قائم ہوتا ہے ـــــ قرآن میں تدبر سے، نماز میں مشغول ہونے سے، کائنات میں غور و فکر سے، ہر آن اپنے رب کو یاد کرنے سے، صبر و شکر اور قناعت کی زندگی اختیار کرنے سے، دعا و استغفار میں اپنے آپ کو لگائے رہنے سے۔ اللہ کی یاد میں کھو جانے سے۔ بندۂ مومن جب اس طرح اپنے آپ کو خدا سے جوڑ لیتا ہے تو اس کو حیرت انگیز طور پر ایک بے پناہ بصیرت حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ اشیاء کو ان کی اصل حقیقت کے اعتبار سے دیکھنے لگتا ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ "خدا کی نظر سے دیکھے، خدا کے پاؤں سے چلے اور خدا کے ہاتھ سے پکڑے"

پیغمبر اسلام نے اپنے حریفوں سے جو سیاسی معاملات کیے، وہ اگر پیشگی طور پر موصول شدہ ہدایات کے تحت تھے تو ایسا کیوں ہے کہ قرآن میں متعدد مقامات پر آپ کے کسی اقدام یا فیصلہ پر گرفت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ کو ایسا نہ کرکے ایسا کرنا چاہئے تھا ـــــ یہ خود قرآن میں ایک واضح مثال ہے جس سے اصل معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔

> عرب دنیا میں مغرب کا سیاسی کنٹرول تقریباً ۷۰ سال رہا۔ اس کا آغاز ۱۸۸۲ میں مصر پر برطانیہ کے قبضہ سے ہوا، اور ۱۹۵۰ میں اردن اور عراق سے برطانی قبضہ کے خاتمہ کے ساتھ ختم ہوا۔

تعریف سے خوش ہونا
اور تنقید سے بپھرنا،
پستی کی علامتیں ہیں۔

فانی بدایونی (۱۹۴۱-۱۸۷۹) نے کہا ہے کہ دنیا کی رنگینیاں انتہائی بے حقیقت ہونے کے باوجود اپنے ظاہر میں اتنی پرکشش ہیں کہ انسان ان کو حقیقت سمجھ بیٹھتا ہے۔ بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص دھوکا دینے والے ان مناظر سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے:

فریب جلوہ اور کتنا مکمل! اے معاذ اللہ
بڑی مشکل سے دل کو بزم عالم سے اٹھایا پایا

اس میں شک نہیں کہ دنیا کی رنگینیوں سے اپنے کو اوپر اٹھالینا سخت مشکل کام ہے۔ تاہم کم تعداد میں سہی، ایسے لوگ پھر بھی کچھ نہ کچھ مل جاتے ہیں۔ مگر اس کے بعد "اوپر اٹھنے" کی ایک اور سطح ہے اور اس کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو کامیاب افراد کی تعداد کم یابی سے گزر کر نایابی تک پہنچ جائے گی۔ یہ ہے اپنے آپ کو مقید فکر (CONDITIONED THINKING) سے باہر نکالنا۔ ہر آدمی جن حالات میں پیدا ہوتا ہے اور بڑھتا ہے، اس کے لحاظ سے ماحول اور روایات کا ایک ہالہ اس کے گرد قائم ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک فکری مدار بن جاتا ہے جس میں وہ گھومتا رہتا ہے۔
اس غیر محسوس مدار سے باہر آکر سوچنا اور مکمل طور پر آزادانہ رائے قائم کرنا اس قدر دشوار ہے کہ وہ لوگ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں جو آزادانہ فکر کے علم بردار بنے ہوئے نظر آتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ خلائی راکٹ جب اپنی گردش کے دوران زمین کے مدار سے نکل کر دوسرے سیارہ کے مدار میں داخل ہوتا ہے تو خول کے نقطہ پر دھماکہ کے ساتھ زبردست آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہی قانون شاید انسانی زندگی کے لئے بھی ہے۔ کوئی شخص اپنے مدار سے نکل کر آزاد شعوری مدار میں اس وقت داخل ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے اس فکری خول کو توڑنے کے لئے پوری طرح تیار ہو جائے جو روایات اور ماحول کے اثر سے محض اتفاقی طور پر اس کے گرد بن گیا ہے۔

کوئی شخص کب اس قابل ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو روایتی مدار سے نکال کر آزاد مدار کی طرف لے جانے کا عمل شروع کر سکے، اس کا ایک ہی جواب ہے: جب وہ اپنے آپ کو ایسا بنانے میں کامیاب ہو جائے کہ نہ ذاتی تعریف سے اسے خوشی حاصل ہو اور نہ ذاتی تنقید اسے بری لگے۔ کوئی آدمی کس مقام پر ہے، اس کو جاننے کی یہ واحد یقینی پہچان ہے۔

اگر آدمی اپنی ذات کے مدار میں گھوم رہا ہے تو وہ اپنے آپ کو اس سے نہیں بچا سکتا کہ ذاتی تعریف اس کو اچھی لگے اور ذاتی تنقید پر وہ بھڑک اٹھے۔ مگر جو شخص اپنے ذاتی مدار سے بلند ہو جائے وہ کبھی اس بیماری میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ اس کو تعریف اور تنقید دونوں ہی بے معنی معلوم ہوں گی۔ کیوں کہ وہ حقائق کو ایسی بلند سطح سے دیکھ رہا ہوگا جہاں روایات اور ماحول کے اثرات اس کے لئے ایک خارجی چیز بن جاتے ہیں۔ بعض اعتبار سے ان میں ملوث ہونے کے باوجود وہ ان کو اس طرح دیکھ سکتا ہے جیسے کوئی شخص اپنے سے باہر کی ایک چیز کا دور سے مشاہدہ کر رہا ہو۔

مولانا سید سلیمان ندوی

عرب اور ہندوستان کے درمیان تعلقات کی تاریخ ہزاروں برس پہلے تک جاتی ہے

ہندوستان اور عرب، دنیا کے وہ ملک ہیں جو ایک حیثیت سے پڑوسی کہے جا سکتے ہیں۔ ان دونوں کے بیچ صرف سمندر حائل ہے۔ یہ سمندر گویا ایک وسیع قدرتی سڑک ہے جو دونوں ملکوں کو باہم ملاتی ہے۔

دریا کے کنارے بسنے والے ملک فطرتاً تجارتی ہوتے ہیں۔ یہی پہلا رشتہ ہے جس نے ان دونوں قوموں کو باہم آشنا کیا۔ عرب تاجر ہزاروں برس سے ہندوستان کے ساحل تک آتے تھے اور یہاں کی پیداوار کو مصر اور شام کے ذریعہ یورپ تک پہنچاتے تھے اور وہاں کے سامان کو ہندوستان، جزائر ہند، چین اور جاپان تک لے جاتے تھے۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ ہندوستان کی تمام تحریریں بلکہ تمام آرین تحریریں بائیں طرف سے لکھی جاتی ہیں۔ لیکن حیرت انگیز بات ہے کہ آریہ ورت کی ابتدائی تحریریں دائیں سے شروع ہوتی ہیں جو سامی تحریروں کی خصوصیت ہے۔ اس کے علاوہ گنتی لکھنے کا طریقہ بھی شاید ابتدائی ہندوستانیوں نے عرب تاجروں سے سیکھا تھا۔ (۸)

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں سنسکرت کے مقالے کے تحت یہ تحقیق پیش کی ہے کہ:

"ہندوستانی تحریر کے قدیم ترین نمونے وہ کتبات ہیں جو چٹانوں پر کندہ ہیں۔ یہ وہی کتبے ۲۵۳ ق م میں شہنشاہ اشوک نے کندہ کرائے تھے۔ یہ کتبات دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو داہنی جانب سے بائیں جانب پڑھے جاتے ہیں ان کو "آرین پالی" کہا جاتا ہے۔ دوسرے وہ جو بائیں جانب سے داہنی جانب پڑھے جاتے ہیں، ان کو ہندی پالی کہا جاتا ہے۔

پروفیسر بولر (BUHLER) نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ شاید عراق کے تاجروں نے آٹھویں صدی ق م میں ان حروف کو یہاں روشناس کرایا ہو۔"

ستیارتھ پرکاش کے مصنف سوامی دیانند جی کے بیان کو صحیح مانا جائے تو مہا بھارت کے زمانے میں ہندوستان میں ایسے لوگ تھے جو عربی زبان سے واقف تھے۔ انہوں نے لکھا ہے:

"مہا بھارت میں جب کوروؤں نے لاکھ کا گھر بنا کر پانڈوؤں کو اس کے اندر جلا کر پھونک دینا چاہا تو ودر جی نے یدھشٹر کو عربی زبان میں بتایا اور یدھشٹر جی نے اسی عربی زبان میں ان کو جواب دیا۔"

ایک روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مجھے ہندوستان کی طرف سے ربانی خوشبو آتی ہے۔" چنانچہ شروع زمانہ ہی سے عرب کثرت سے ہندوستان آنا شروع ہو گئے تھے اور محمود کی آمد سے سینکڑوں برس پہلے جگہ جگہ ان کی نوآبادیاں قائم تھیں۔

عربوں کو اپنے تجارتی جہازوں کی حفاظت کے لیے ہندوستان کے کسی ساحلی بندرگاہ کی تلاش تھی۔ چنانچہ اسلام کے ظہور کے بعد ہندوستان پر عربوں کی سب سے پہلی فوج کشی ۱۵ھ (۶۳۶ء) میں تھانہ (بمبئی) کی بندرگاہ پر ہوئی۔ عربوں کا یہ داخلہ تجربے کے

گورنر کے حکم پر ہوا تھا۔

۸۶ھ (۷۰۵ء) میں دمشق کے تخت پر ولید اموی بیٹھا۔ اس کی طرف سے حجاج عراق و ایران و کران و بلوچستان یعنی حکومت کے مشرقی مقبوضات کا نائب مقرر ہوا تو ہندستان اور ہندستانی جزیروں کی طرف توجہ کی۔ اس وقت ہندستان کے اکثر ساحلوں سے بحری قزاق عرب تاجروں کے جہازوں پر ڈاکہ ڈالا کرتے تھے۔ بلاذری (م ۲۲۴ھ) تک سومنات اور کچھ بحری ڈاکوؤں کی سب سے بڑی جائے پناہ تھی۔

حجاج کے زمانہ میں ایک بار سندھ کی بندرگاہ دیبل کے قریب ڈاکوؤں نے عربوں کے ایک جہاز پر چھاپہ مارا جس میں عورتیں بھی سوار تھیں۔ ان لوگوں نے حجاج سے فریاد کی۔ حجاج نے سندھ کے راجہ داہر کو لکھا تو اس نے معذرت کی کہ یہ دریائی ڈاکو ہمارے قبضہ میں نہیں۔ اسی دوران یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ مکران سے کچھ عرب مجرم اور باغی بھاگ کر سندھ میں پناہ گزین ہوئے اور انھوں نے راجہ داہر کی ماتحتی میں اپنا ایک جتھا بنا لیا۔

اسکے بعد حجاج نے اپنے نوجوان بھتیجے محمد بن قاسم کی سرکردگی میں شیراز سے چھ ہزار فوج سندھ روانہ کی اور کچھ فوج مع سامان کے دریائی راستے سے سندھ کی طرف بھیجی اور اس کی کمک کے لیے ایران کے پرانے راستہ سے خشکی کی طرف سے بھی فوجیں بھیجیں۔

سن ۹۳ھ میں محمد بن قاسم سندھ پہنچا اور تین برس کے عرصہ میں ملتان سے لے کر کچھ تک اور مالوہ کی سرحد تک پر قبضہ کر لیا اور پورے سندھ میں انصاف اور امن کی سلطنت قائم کر دی۔

۹۶ھ میں ولید نے وفات پائی اور اس کی جگہ تخت پر سلیمان بیٹھا۔ اس کو حجاج اور اس کے خاندان سے ذاتی عداوت تھی۔ اس نے اسی سال حجاج کے دوسرے آدمیوں کے ساتھ محمد بن قاسم کو بھی سندھ سے واپس بلا لیا۔ اور بالآخر ذاتی انتقام کے نشے میں اس کو قتل کرا دیا۔

اموی خلیفہ کے ہاتھوں یہ بیدردانہ قتل اس شخص کا تھا جس کے متعلق تاریخ بتاتی ہے کہ "جب محمد بن قاسم سندھ سے واپس جانے لگا تو سندھ کی رعایا نے اپنے نیک دل اور انصاف پسند فاتح کی جدائی میں آنسو بہائے اور اس کی یادگار میں اس کا بت بنا کر کھڑا کیا۔" (تاریخ فتوح البلدان بلاذری، باب فتح سندھ)

اس کے بعد خلافت دمشق سے مختلف گورنر یہاں مقرر ہو کر آتے رہے اور انھوں نے کچھ کارگزاریاں بھی دکھائیں۔ ۱۳۲ھ (۷۵۰ء) میں عربی حکومت کے دفتر کا ورق الٹ گیا۔ امویوں کی جگہ عباسی آئے اور حکومت کا مرکز دمشق سے ہٹ کر بغداد چلا گیا۔ بغداد کی سلطنت معتصم باللہ عباسی (م ۲۲۷ھ) تک مضبوط رہی۔ اس کے بعد وہ روز بروز ایسی کمزور ہوتی گئی کہ اس کا تعلق سندھ اور ہندستان سے ٹوٹ گیا۔ کچھ دن تک عرب امرا یہاں خود مختار بنے رہے۔ بالآخر ہندو راجاؤں نے پھر قبضہ کر لیا۔ اور بعد کو صرف دو مشہور عرب ریاستیں یہاں قائم رہ گئیں جن میں ایک ملتان میں تھی اور دوسری سندھ کے عربی شہر منصورہ میں۔

ہندستان میں جو ترک و افغانی مغل فاتح آئے وہ مسلمان تھے، اس لیے ان کی تمام کارروائیوں کا ذمہ دار اسلام سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ اس حقیقت سے ہم سب کو

واقف ہونا چاہیئے تھا کہ ترک فاتح جو ہندستان آئے۔ خاص خاص السروں یا عہدیداروں کو چھوڑ کر قوم کی مجموعی حیثیت سے وہ اسلام کے نمائندے نہ تھے۔ اور نہ ان کے اصول سلطنت کو اسلام کی طرز حکومت اور اصول فرمانروائی سے کوئی مناسبت تھی۔ ان کے ترک افسر زیادہ تر نومسلم غلام تھے جن کو اسلام کے صلح و جنگ کے قوانین سے شاید واقفیت بھی نہ تھی۔

غزنویہ سلطنت جس ملک میں آکر قائم ہوئی، وہ اسلامی حدود سلطنت کا سب سے آخری گوشہ تھا۔ وہاں اسلام نے ابھی پورا قدم بھی نہیں جمایا تھا۔ سلطان محمود کی فوج میں جو سپاہی بھرتی ہو کر آئے، وہ غزنی، خلجی، ترکوں اور افغانوں کے مختلف قبائل تھے۔ ہندو بھی اس کی فوج میں داخل تھے۔ ترک قبائل کا یہ حال تھا کہ وہ بیشتر مسلمان نہ تھے۔ وہ غلاموں کی حیثیت سے ہزارہا کی تعداد میں فروخت ہوتے تھے اور سلاطین و امراء ان کو خرید کر اور مسلمان بنا کر فوج میں بھرتی کرتے تھے، یا وہ خود لوٹ مار کے شوق میں وسط ایشیا سے نکل کر اسلامی ممالک میں آتے تھے اور مسلمان ہو کر مختلف بادشاہوں اور امیروں کی فوج میں بھرتی ہوتے تھے اور آگے چل کر بڑے افسر ہو جاتے تھے، یہاں تک کہ بادشاہ بن جاتے تھے — الپتگین اور سبکتگین جو غزنوی سلطنت کے بانی تھے اسی قسم کے ترک غلام تھے۔ سلطان غوری کے جانشین التمش وغیرہ بھی ایسے ہی تھے۔ سلجوقی ترک جو چند برس کے بعد عظیم الشان سلجوقی سلطنت کے بانی ہوئے، اسی زمانے میں اسلامی سرحد میں آکر مسلمان ہوئے۔ یہی حال سلطان محمود کی فوج کا بھی تھا۔ ترکستان اور ماوراءالنہر کے ترک قبائل اس کی فوج میں داخل ہو گئے تھے جو زیادہ تر اسی

زمانے میں مسلمان ہوئے تھے۔ ۱۸۸

مغل ابھی تک مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے۔ وہ ساتویں صدی ہجری تک کافر سمجھے جاتے تھے۔ علاؤالدین خلجی (م ۷۱۶ھ) تک فوج میں مغل مسلمان کر کے نوکر رکھے جاتے تھے۔

افغانوں کے بڑے بڑے شہروں میں گو اسلام تھا مگر خود افغان اب تک مسلمان نہ تھے۔ کافر ہی سمجھے جاتے تھے۔ گو خاص کابل کے بادشاہ نے تیسری صدی کے شروع میں، یعنی غزنویوں سے سو برس پہلے اسلام کا اظہار کیا تھا، لیکن افغانوں کے اکثر قبائل محمود غزنوی ہی کے زمانے میں مسلمان ہونے شروع ہوئے تھے۔

ان کے علاوہ غوری قبائل چوتھی صدی کے وسط تک یعنی غزنویوں کی پیدائش کے بعد تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ پھر سلطان محمود سے پہلے اس وقت تک ان اطراف میں نہ اسلامی درسگاہیں تھیں نہ اسلامی تعلیمات کا رواج ہوا تھا اور نہ مسلمان علماء پھیلے تھے۔ ان اسباب سے ان قوموں کے اس وقت کے طور طریق، اصول جنگ اور طرز عمل کو اسلام نہیں کہا جا سکتا۔ ۱۹۰

برخلاف اس کے عرب فاتح جو ایک صدی کے اندر ایک طرف شام کی سرحد عبور کر کے مصر اور شمالی افریقہ کے راستے سے اسپین تک پہنچ چکے تھے اور دوسری طرف عراق کے راستے سے خراسان تک اور ایران و ترکستان کو طے کر کے ایک سمت میں کاشغر اور دوسری سمت میں سندھ تک فتح کر چکے تھے۔ وہ لوگ تھے جن میں اسلام کی تعلیمات زندہ تھیں، اسلام کا قانون جنگ عمل میں تھا۔ کہیں کہیں افسروں میں بعض ایسے بزرگوار بھی تھے جنھوں نے پیغمبر اسلام کی صحبت اٹھائی تھی۔ اور ایسے تو

بکثرت تھے جنھوں نے صحابہ کا فیض پایا تھا۔ اس لئے ان کے طور طریق، اصول حکومت اور طرز سلطنت خیبر سے آنے والی قوموں سے بالکل مختلف تھے۔ ۱۰

پہلی صدی ہجری (ساتویں صدی عیسوی) کے خاتمہ پر سندھ کی فتح کے چند سال بعد جب بنوامیہ کے دیندار اور برگزیدہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے سندھ کے لوگوں کو اسلام کا دعوت نامہ بھیجا تو بہت سے راجاؤں نے اسلام قبول کرلیا۔ (فتوح البلدان بلاذری فتح سندھ) ۴۴۰

مختلف تجارتی، معاشرتی اور سیاسی تعلقات کا یہ نتیجہ ہوا کہ سندھ، گجرات، کارومنڈل، ملبار، مالدیپ، سرندیپ اور جاوا میں اسلام نے اپنے قدم آہستہ آہستہ بڑھانے شروع کئے۔ ان جزیروں میں ایک طرف ہندوؤں اور دوسری طرف چینیوں کے اثر سے بدھ مت پھیلا ہوا تھا، مگر صدی بعدی کے جغرافیوں اور سفرناموں کی کتابوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی بھڑائی کے بغیر بوچے امن چین کے ساتھ اسلام کے اثرات یہاں بڑھتے چلے گئے۔

سندھ کا علاقہ خلیفہ المامون (۲۱۸ھ) تک بغداد کے مرکز سے وابستہ رہا، بلکہ اسی کے آخر زمانہ میں عرب امراء خودمختاری کے خواب دیکھنے لگے۔ چنانچہ بنی سامہ کے غلام فضل بن ماہان نے سندان نام کے ایک شہر کو فتح کرکے براہ راست خلیفہ المامون سے اپنی امارت کی سند حاصل کرلی اور وہاں ایک جامع مسجد بنوائی جس میں نماز جمعہ ادا ہوتی تھی اور خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔

اس کے بعد اس کا بھائی محمد بن فضل بن ماہان حاکم ہوا اور یہ زمانہ معتصم باللہ (۲۲۷ھ) کا تھا۔ اس نے ستر جہازوں کے بیڑے کے ساتھ میدابن پر حملہ کیا۔ اس کی غیر حاضری میں اس کے بھائی ماہان نے ریاست پر قبضہ کرلیا اور غالباً اسی خانہ جنگی میں ریاست مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی۔ (بلاذری صفحہ ۴۴۶)

معتصم باللہ کے زمانہ میں قندابیل میں محمد بن خلیل نے خودمختاری کا اعلان کردیا تھا۔ مگر معتصم کے عہدہ دار عمران برمکی والئ سندھ نے وہاں کے سرداروں کو گرفتار کرکے قصدار (قزدار) بھیج دیا۔

عمران برمکی ہی کے زمانہ میں عربوں کے دو مشہور قبیلوں یمنی (قحطانی) اور حجازی (نزاری) میں بعینہ وہی خانہ جنگی شروع ہوئی جس خانہ جنگی نے بنوامیہ کا خاتمہ کردیا تھا۔ عمران نے یمنیوں کی طرف داری کی۔ اس وقت حجازیوں کا ایک سرگروہ ایک قریشی سردار عمر بن عبدالعزیز ہباری تھا۔ اس نے موقع پاکر عمران کو قتل کردیا (بلاذری، ۴۴۶)

عمر بن عبدالعزیز ہباری کی امارت کے بعد بھی عباسی تعلق قائم رہا۔ چنانچہ معتمد کے زمانہ (۲۵۶-۲۷۹ھ) میں بغداد کے انتظامات ملکی میں سندھ کا نام بھی نظر آتا ہے۔ اس کے بعد سندھ کا یہ برائے نام رشتہ بھی بغداد سے کٹ گیا۔ بلاذری جو ۲۷۹ھ میں مرا ہے، وہ لکھتا ہے کہ "بنوکندہ کا آزاد کردہ غلام ابوالصمہ جو تیسری صدی کے شروع کے ایک عباسی والی عمر بن حفص بن ہزار مرد کے ساتھ سندھ گیا تھا۔ اس کا بیٹا اصمد آج کل سندھ میں زبردستی خودمختار بن بیٹھا ہے۔" (بلاذری، ۴۴۵)

تاہم مسعودی ۳۰۳ھ میں ہندستان آیا تو اس نے دیکھا کہ یہاں عرب امراء حکمراں ہیں جو اب بھی خلیفہ بغداد کا خطبہ پڑھتے ہیں۔ ابن حوقل ۳۶۷ھ میں اور مقدسی ۳۷۵ھ میں یہاں آیا تو انھوں نے بھی یہی پایا کہ خطبہ خلیفہ کے نام کا پڑھا جاتا ہے۔ ■

زبان کا مسئلہ

ایک ہندوستانی عالم ایک عرب ملک گئے۔ وہاں ایک عرب نوجوان ان سے ملنے کے لئے آیا۔ گفتگو کے دوران اس نے پوچھا: متی القدوم (کب تشریف لائے) ہندستانی عالم نے جواب دینا چاہا تو ان کی زبان سے نکل گیا: غداً۔ عربی میں آئندہ کل کے لئے "غد" اور پچھلے کل کے لئے "امس" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مذکورہ بزرگ عربی کے اچھے عالم ہیں۔ مگر عربی بولنے کی مشق نہ ہونے کی وجہ سے وہ غداً (اگلے دن) کہہ گئے۔ حالاں کہ موقع کے اعتبار سے انھیں بالامس (پچھلے دن) کہنا چاہئے تھا۔

اسی طرح ایک اور ہندستانی عالم نے ایک مضمون لکھا جس کا عنوان انھوں نے قائم کیا: الاقدار الاسلامیۃ۔ یہاں اقدار کو انھوں نے انگریزی لفظ "ویلوز" کے معنی میں استعمال کیا تھا۔ حالانکہ یہ اس لفظ کا اردو استعمال ہے۔ عربی میں ویلوز کے لئے قیمۃ (جمع قیم) بولا جاتا ہے۔

یہ اتفاقی غلطی کی مثال ہے جس سے کوشش کرکے آدمی بچ سکتا ہے۔ تاہم ایک غیر اہل زبان لغت اور نحو کی خواہ کتنی ہی مہارت حاصل کرلے، وہ اہل زبان کی سی زبان لکھنے اور بولنے پر قادر نہیں ہوسکتا۔ الا ماشاء اللہ۔ مولانا شبلی نعمانی عربی زبان کے ادیب تھے۔ وہ مصر و شام کے سفر پر گئے۔ وہاں ایک بار وہ اپنے ساربان سے عربی میں گفتگو کر رہے تھے۔ درمیان میں اس نے کہا: یا شبلی انت نحوی (اے شبلی آپ تو قواعد داں ہیں)۔ مولانا شبلی سمجھے کہ ساربان ان کی عربی دانی کی تعریف کر رہا ہے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ طنز تھا۔ مولانا شبلی نحو و صرف کے قواعد کی انتہائی پابندی کرتے ہوئے بول رہے تھے۔ مگر عرب ساربان کو ان کی یہ زبان مصنوعی معلوم ہو رہی تھی۔

ہر زبان کے کچھ اپنے لطیف آداب ہوتے ہیں۔ اہل زبان چونکہ بچپن سے اسی کے ماحول میں پرورش پاتے ہیں، اس لئے وہ ذوقی طور پر اس سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ ان کے لکھنے اور بولنے میں خود بخود ان آداب کی رعایت شامل ہوتی رہتی ہے۔ مگر غیر اہل زبان عام طور پر اس کی رعایت نہیں کرپاتے۔ مخزومی پاشا سید جمال الدین افغانی کے ایک رفیق ہیں۔ انھوں نے موصوف کے بارہ میں عربی میں ایک کتاب لکھی اور اس کا نام رکھا: جمال الدین افغانی فی البلاط السلطانی (جمال الدین افغانی شاہی مجلس میں) سید جمال الدین افغانی نے سنا تو کہا:

ان ھذا العنوان لیس لھذا المقال بطبیق، قل خاطرات ولا تزد

یہ نام اس کتاب کے موافق نہیں۔ اس کا نام صرف "خاطرات" رکھو اور اس پر کچھ اضافہ مت کرو۔

مخزومی پاشا لکھتے ہیں کہ بعد کو میں نے ایک عرب ادیب سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا، اگر کتاب کا یہ نام رکھا گیا تو اہل لغت اس پر تنقید کریں گے۔ کیوں کہ آپ "خاطرات جمال الدین" کا لفظ "افکار جمال الدین" کے معنی میں لے رہے ہیں۔ مگر اہل زبان اس مفہوم کے لئے "خواطر" کا لفظ بولتے ہیں۔ لغت کے اعتبار سے اگرچہ دونوں الفاظ ہم معنی ہیں، مگر استعمال کے اعتبار سے خاطرات میں وساوس کا مفہوم آجاتا ہے۔ جمال الدین افغانی نے اپنی آزاد طبعی کی بنا پر اس کو تسلیم نہیں کیا اور مخزومی پاشا سے کہا قل خاطرات ولا تبال بمن فسد لسانھم (تم کتاب کا نام خاطرات ہی رکھو اور ان کی پروا

مت کرد جنھوں نے اپنی زبان کو بگاڑ رکھا ہے۔

اہل زبان اور غیر اہل زبان کا یہ فرق اتنا ہی ہے کہ تاریخ میں بمشکل ہی کچھ مثالیں اس کے خلاف تلاش کی جاسکتی ہیں۔ مرزا غالب (۱۸۶۹ - ۱۷۹۷) کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا۔ انھوں نے اپنے فارسی دیوان کے بارے میں کہا:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

مگر غالب کو شاعری کی دنیا میں جو مقام ملا وہ ان کے اردو کلام کی بنا پر ملا، فارسی کے کلام کی بنا پر نہیں ملا۔ مولانا شبلی نعمانی (۱۹۱۴ - ۱۸۵۷) نے جب پہلی بار اردو میں سیرۃ النعمان لکھی تو اس کے آغاز میں ایک فارسی معذرت شامل کی، جس میں انھوں نے کہا:

گرچہ مرا شیوۂ فن ایں نبود
حرف بہ اردو زدن آئیں نبود

مگر شبلی کو ان کی جن کتابوں نے شبلی بنایا وہ اردو کتابیں ہی تھیں نہ کہ فارسی اور عربی کتابیں۔ اسی طرح مولانا حمید الدین فراہی (۱۹۳۰ - ۱۸۶۳) نے تفسیر قرآن کو اپنا موضوع بنایا اور اس پر بہت سی قیمتی تحریریں لکھیں یہ تمام تحریریں عربی زبان میں تھیں۔ مگر ان کی عربی تحریریں نہ ہندستان میں مقبول ہو سکیں اور نہ عالم عرب میں۔ جب ان کا ترجمہ اردو میں شائع کیا گیا، اس وقت لوگوں کو ان کی اہمیت کا احساس ہوا۔

یہ بات اردو یا عربی زبان کے ساتھ مخصوص نہیں، ہر زبان کا یہی حال ہے۔ ہندستان میں انگریزی کے رواج کے بعد بے شمار لوگوں نے انگریزی کو اپنی قلمی زبان بنایا۔ مگر بمشکل ہی کچھ ایسے لوگوں کا نام لیا جاسکتا ہے جنھوں نے انگریزی ادب کی تاریخ میں کوئی مقام حاصل کیا ہو۔ جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی وغیرہ کی انگریزی تحریریں بلاشبہ یورپ اور امریکہ میں کافی پڑھی گئیں۔ مگر ان کو جو کچھ بھی مقبولیت حاصل ہوئی، ان کی تاریخی اہمیت کی بنا پر ہوئی، کیونکہ ہندستان کی جدید سیاسی تاریخ جاننے کے لیے یہ کتابیں ماخذ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ سی۔ نراد چودھری جو انگریزی اور بنگالی دونوں کے اچھے ادیب ہیں، انھوں نے ٹیگور کے بارے میں لکھا ہے کہ ۱۹۱۳ میں نوبل انعام ملنا ان کے لئے ایک حادثہ تھا۔ کیوں کہ اس کے بعد ٹیگور نے سمجھ لیا کہ ایشیا سے زیادہ یورپ ان کے فن کا قدر داں ہے۔ انھوں نے انگریزی میں لکھنا شروع کر دیا۔ مگر انگریزی ان کے لئے بہر حال ایک غیر ملکی زبان تھی۔ اس میں وہ ویسی گہرائی اور کشش پیدا نہ کر سکے جو اپنی مادری زبان بنگالی میں لکھنے کی صورت میں ہو سکتی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ اربندو گھوش نے بعد کی عمر میں بنگلہ زبان سیکھی تو اس کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ گیتان جلی کو اصل بنگالی زبان میں پڑھ سکیں۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ کوئی ادیب یا مصنف خواہ کتنی ہی زبانیں جانتا ہو مگر اپنی مادری زبان میں وہ جس لطافت اور حسن کے ساتھ اپنے خیالات کو پیش کر سکتا ہے، کسی دوسری زبان میں اس کی امید نہیں کی جاسکتی۔ بعض شاذ مثالیں ہو سکتی ہیں۔ مگر الشاذ کالمعدوم۔

ناکامی کی وجہ

شریف کمال ایک اخوانی رہنما ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اخوان المسلمین کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ سیاست میں قبل از وقت داخل ہو گئی: تدخلنا في السياسة قبل وقتها

رکوع وسجود کا منظر اتنا پرکشش ہوتا ہے کہ کوئی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا

عیسائیت کو میں نے چھوڑا ہے اور اسلام کو اختیار کیا ہے۔ مجھے یہ بات تسلیم ہے کہ مسیحیت میں بھی حق وصداقت اور مفید اصول موجود ہیں اور اگر اس مذہب سے وہ تمام بدعتیں دور کردی جائیں جو پادریوں نے پیدا کردی ہیں تو یہ مذہب بھی انسان کے لیے ایک مفید مذہب بن سکتا ہے۔ لیکن ان بدعتوں نے اس کی اصل صورت کو بگاڑ دیا ہے اور بالکل بے جان کر ڈالا ہے۔ اس کے برخلاف اسلام اسی ابتدائی شکل میں ہے جس میں وہ جلوہ گر ہوا تھا اور چونکہ میں ایک ایسے مذہب کا متلاشی تھا جو آمیزش سے پاک ہو اس لیے میں نے اسلام قبول کرلیا ہے۔ کسی عیسائی کلیسا میں چلے جائیے وہاں نقش ونگار اور مورتیوں کے سوا آپ کو کچھ نہیں ملے گا اس کے علاوہ پادریوں کے زرق برق لباس پر نظر ڈالیے اور پھر ان کے طریقوں راہبوں اور ننوں کے ہجوم کو دیکھیے تو ان کا روحانیت سے دور کا بھی تعلق دکھائی نہیں دیتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی عبادت گاہ میں نہیں ہیں بلکہ ایسے بتخانہ میں ہیں جو صرف بتوں کی پوجا کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس کے بعد مسجد پر نظر ڈالیے وہاں آپ کو نہ کوئی مورت دکھائی دے گی اور نہ تصویر۔ پھر نمازیوں کی صفوں پر نظر ڈالیے ہزاروں چھوٹے بڑے انسان شانہ ملائے کھڑے نظر آئیں گے۔ امام کو دیکھیے تو اس کا لباس بھی نہایت سادہ ہوگا سچ تو یہ ہے کہ نماز میں رکوع وسجود کا منظر اس قدر جاذب قلب ہوتا ہے کہ کوئی انسان بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مسجد کی پوری فضا اور اس کی تمام چیزیں روحانیت کی جانب انسان کی رہنمائی کرتی ہیں نہ یہاں تصنع ہے نہ بناوٹ کی قسم کی کوئی چیز۔ اس کے برخلاف کلیسا کی تمام چیزوں میں مادی دنیا کا مظاہرہ بہت زیادہ ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ کہیں کہ پروٹسٹنٹ مذہب تو ان عیوب سے پاک ہے اس نے تو ان گرجوں سے بت اور تصویریں نکال پھینکی ہیں تم نے اسلام کے بجائے اسے قبول کیوں نہیں کیا۔ بلاشبہ پروٹسٹنٹ مذہب حقیقی مسیحیت سے قریب ضرور ہے۔ باوجود اس اعتراف کے کہ مسیح علیہ السلام جلیل القدر پیغمبر تھے، میں ہرگز ان کی الوہیت کا قائل نہیں جو میری ہی طرح گوشت پوست رکھتے تھے میرا یہ عقیدہ کوئی نیا نہیں بلکہ ابتدا ہی سے میں اسکا اظہار کرتا رہا ہوں۔ اسلام نہ صرف حضرت مسیح علیہ السلام ہی کا پورا احترام سکھاتا ہے بلکہ دنیا کے تمام مذہب اور بانیان مذاہب کے احترام کی دعوت دیتا ہے۔ میں عرصہ دراز سے اسلام کی طرف رجوع تھا لیکن میرا ایمان اتنا قوی نہیں تھا کہ میں بے دھڑک اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرسکتا۔

یہ تذبذب کسی انسان یا سوسائٹی کے خوف کی بنا پر نہیں تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں پوری طرح اسلام کی خوبیوں اور خصوصیتوں سے واقف نہیں تھا۔ میں اسلام کے بارے میں علمائے اسلام کی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا اور میری آنکھیں کھلتی گئیں اور مجھے صاف طور پر اس دین متین کی خوبیاں اور اس کے پیغمبر محمدؐ کا بنی نوع انسان پر احسان معلوم ہوگیا اور آخر میں نے اس

دین فطرت کو اپنا مذہب بنالیا۔ اسلام میں توحید پرستی جیسی میں نے پائی ہے وہ کسی دوسرے مذہب میں موجود نہیں ہے اور اسلام کی اسی توحید پرستی نے مجھے سب سے پہلے اس مذہب کی جانب مائل کیا۔ اسلام میں جو سب سے بڑی خوبی میں نے پائی ہے وہ یہ ہے کہ وہ صرف روحانی ترقی ہی کا حامل نہیں ہے بلکہ وہ دنیاوی ترقی میں بھی بہت بڑا ممد و معاون ہے وہ انسان کو گوشہ نشینی اور راہبانہ زندگی گزارنے کی تعلیم نہیں دیتا۔ بلکہ وہ کارگہ حیات میں آگے بڑھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ دینی معاملات میں ہی انسان کی رہنمائی نہیں کرتا بلکہ دنیا کے ہر معاملہ میں انسان کو راستہ بتاتا ہے اور قدم قدم پر بنی نوع انسان کو روشنی دکھاتا ہے اسلام نے دنیا کو عاقبت کی کھیتی قرار دیا ہے اور اسے حق دیا ہے کہ وہ دینی فرائض سے بھی غافل نہ ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ موجودہ سائنسی دور میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو ترقی یافتہ دنیا کا ساتھ دے سکتا ہو۔

اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تنگ نظری اور تعصب کا شدید مخالف ہے۔ وہ صرف اپنے ہم مذہبوں ہی کے ساتھ مروت یا محبت کی ہدایت نہیں کرتا بلکہ وہ کل بنی نوع انسان کے ساتھ خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے کیوں نہ تعلق رکھتے ہیں ہمدردی و مساوات کا حکم دیتا ہے وہ تفریق کا نہیں اتحاد انسانی کا قائل ہے سچ تو یہ ہے کہ اس مذہب نے پہلی مرتبہ انسان کو انسانیت کا سبق پڑھایا۔

میں گزشتہ پانچ سال سے مذہب اسلام کا پیرو ہوں جس چیز نے میرے ایمان کو تقویت دی وہ اسلام کے بلند اور پاک اصول ہیں اس کی عالمگیر

امریکی نومسلم پروفیسر اے۔ ایچ۔ بی۔ رہٹ نے قبول اسلام کے بعد اپنے جو تاثرات شائع کئے ہیں، ان کو یہاں نقل کیا جارہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام کے مطالعہ کے بعد میں نے اس دین کو اپنے دل کی آواز پایا اور اس دین فطرت کو قبول کرلیا۔ یہی واقعہ دوسرے بیشمار لوگوں کے ساتھ ہوسکتا ہے، بشرطیکہ ان کو اسلام کے پیغام سے واقف کرایا جائے۔

اخوت ہے۔ اس کی بے نظیر مساوات ہے اور اس کا علم و عرفان ہے جس نے میرے دل و دماغ میں ایک نئی روشنی پیدا کردی ہے۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو سراپا علم و عمل ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ اسلام ایک ایجابی دین ہے کوئی اگر صحیح معنوں میں عیسائی بننا چاہے تو اسے دنیا سے کنارہ کش ہوکر گوشہ نشینی اختیار کرنی ہوگی لیکن اسلام میں رہ کر دنیا کی تمام مسرتوں اور نعمتوں سے مستفیض ہوسکتے ہیں۔ نہ ہمیں عبادت کا گوشہ تلاش کرنا ہوگا اور نہ ہی ویرانوں میں زندگی بسر کرنے کی مجبوری ہوگی۔ اگر انسان کو دنیا میں اسی لیے بھیجا گیا ہے کہ وہ گوشہ نشینی میں اپنی زندگی برباد کرلے تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ یہ صرف اسلام نے بتایا ہے کہ انسان اس کارگاہ حیات میں رہ کر قدرت کی ہر چیز سے فائدہ اٹھائے مگر ساتھ ہی اپنے پروردگار اور اس کی مخلوق کو نہ بھولے۔ میں نے جب سے اسلام قبول کیا ہے میں انتہائی قلبی سکون محسوس کررہا ہوں۔ میری دنیا بھی درست ہوگئی ہے اور عاقبت بھی۔

تہذیب کا ارتقائی عمل انسانی شعور کو ایک اعلیٰ مرحلہ کی طرف لے جا رہا ہے

مشینی ترقیاں ان کو مطمئن نہ کرسکیں

۱۸۴۰ء میں ہر امریکی کی جیب میں مستقبل کا ایک خوب صورت خاکہ موجود ہوتا تھا بالکل ویسے ہی جیسے ہر جیب میں رومال موجود ہوتا ہے۔ مگر آج امریکیوں کی جیبیں اس قسم کی کسی پرشوق چیز سے خالی ہیں۔ لوگ سماجی حالات سے سخت مایوس ہیں۔ اعلیٰ سماج بنانے کے تصورات ختم ہو گئے ہیں۔ زمین پر بہشت بنانے کا خیال اب اپنی ذات کے اندر بہشت ڈھونڈنے کی طرف مائل ہے۔ آج کی برباد دنیا میں مفکرین کی ایک بڑی تعداد نے آئیڈیلزم کی آخری پناہ گاہ کے طور پر اپنی امیدوں اور اپنے عقیدہ کو روح لے اوپر مرکوز کر دیا ہے۔ مادیات کے بجائے روحانیات کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے بعض لوگوں کا یہاں تک کہنا ہے کہ ارتقائی عمل تہذیب کو شعور کے ایک اعلیٰ مرحلہ کی طرف لے جا رہا ہے جو

جب قدرتی توازن ٹوٹ جائے

طبیعیات اور حیاتیات کی دنیا میں جو قوانین کام کر رہے ہیں۔ ان کا ایک خاص عمل یہ ہے کہ یہ قوانین مختلف اشیاء کے درمیان ایک فطری توازن (NATURAL BALANCE) کو برقرار رکھتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو انسانی زندگی تباہ ہو جائے۔ جدید دریافتوں سے معلوم ہوا ہے کہ فطرت کا یہ توازن انتہائی صحیح اندازوں کے مطابق کیا گیا ہے۔ اسکے اندر انسان کی کوئی مداخلت شدید خطرہ پیدا کرنے کا باعث ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر جدید تمدن کا وہ خطرناک مسئلہ جس کو صنعتی کثافت (INDUSTRIAL POLLUTION) کہتے ہیں وہ کیا چیز ہے۔ وہ قدرت کے نظام میں انسانی مداخلت سے پیدا شدہ ایک صورتحال ہے۔ کاربن گیس اور دوسری کثافتیں جو عام حالات میں پیدا ہوتی ہیں، قدرت ان کے علاوہ دوری (RECYCLE) کے ذریعہ اپنے توازن کو برقرار رکھتی ہے مگر صنعتی دور نے اپنی پیدا کردہ کثافتوں سے اس نظام میں جو مداخلت کی ہے اس نے فطرت کے توازن کو بگاڑ دیا۔

توازن فطرت کے ٹوٹنے کا یہی معاملہ سماجی قوانین میں بھی کام کرتا ہے۔ خدا نے جس طرح طبیعی اور حیاتیاتی دنیا میں توازن کا قانون جاری کر رکھا ہے، اسی طرح اس نے سماجی زندگی میں توازن کو برقرار رکھنے کیلئے بھی قوانین مقرر کئے ہیں۔ انھیں قوانین کا نام اسلامی شریعت ہے۔ انسان کی بہتری یہ ہے کہ وہ اس قانون کو استعمال کرکے سماجی زندگی کے توازن کو برقرار رکھے۔ اگر اس کو نظرانداز کرکے بطور خود قانون وضع کریگا تو وہ سماجی زندگی کے مطلوبہ توازن کو توڑ دے گا اور زندگی تباہ ہو جائے گی۔

بالآخر انسان کو بلند ترین حقیقت سے ملا دے گا یعنی خدا سے۔

صنعتی دور کی ترقی کے بعد امریکیوں نے سمجھا تھا کہ وہ ٹکنالوجی میں نجات حاصل کر لیں گے۔ مصنفین نے بڑے شاندار قسم کے خاکے پیش کئے۔ مگر ٹکنالوجی انسانی مسرت کے حصول میں ناکام ثابت ہوئی۔ اس کے ذرائع نہایت آسانی سے انسانی ترقی کے بجائے انسانی بربادی میں استعمال ہونے لگے۔

ٹائم (نیویارک) ۱۸ جنوری ۱۹۷۱ء

اوپر جو عبارت نقل کی گئی، وہ امریکی میگزین کے ایک خصوصی مضمون کا ترجمہ ہے جس کا عنوان ہے:

A VOYAGE TO UTOPIA

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مادی ترقیوں کی حقیقت کیا ہے۔ آج کی دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک مادی ترقی کی تمام قسموں کا مالک بننے کے بعد بالآخر جس احساس سے دوچار ہے وہ یہ کہ مادی ترقی انسانی ترقی کا اصل زینہ نہیں۔ حقیقی انسانی ترقی کے لئے کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔

امریکہ اس دوسری چیز کو نفسیات اور روحانیات کی دنیا میں تلاش کر رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس دنیا میں جس کی نشاندہی مذہب نے کی تھی مگر مادیات کے ابتدائی جنون میں لوگوں نے اس کو نظر انداز کر دیا تھا۔

یہ بہترین وقت ہے کہ حاملین اسلام اٹھیں اور جدید دنیا کے سامنے خدا کے دین کی دعوت پہنچائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زمانہ نے صدیوں کے انقلابات کے بعد دین خدا کی حامل قوموں کے لئے میدان خالی کر دیا ہے۔ وہ آج کی دنیا کی ذہنی قیادت حاصل کر سکتی ہیں۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ اس سنہرے امکان کے عین کنارے وہ اس طرح غافل پڑی ہوئی ہیں۔ جیسے انھیں اس کی خبر بھی نہیں۔

کیسے کیسے مسائل!

مسجد میں کسی کو چھینک آجائے تو دوسرا شخص جو حالت نماز میں ہے، اگر اس کی زبان سے یرحمك الله (خدا تجھ پر رحم کرے) نکل جائے تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی۔ البتہ اگر وہ یرحمه الله (خدا اس پر رحم کرے) کہے تو نماز باطل نہ ہوگی۔ یہ شافعیہ کا مسلک ہے۔

حنفیہ کے نزدیک مسئلہ یہ ہے کہ مسجد میں کسی کو چھینک آئے تو مصلی خواہ یرحمك الله کہے یا یرحمه الله، ہر حال میں اس کی نماز باطل ہو جائے گی البتہ اگر خود مصلی کو چھینک آئے اور وہ اپنے کو مخاطب کرتے ہوئے یرحمنی الله (مجھ پر اللہ رحم کرے) یا یرحمك الله کہے تو نماز باطل نہ ہوگی۔

الفقہ علی المذاهب الاربعہ
از عبدالرحمٰن الجزیری،
حصہ اول، صفحہ ۳۰۴

"فرانسیسی مفکر اینڈری مالرو نے کہا ہے کہ یورپ کا عروج ۱۴۵۰ء تک شروع ہوا۔ یہ دور پانچ سو برس تک رہا۔ ۱۹۴۹ء میں ماؤ کا برسراقتدار آنا اس دور کے خاتمہ کا اعلان تھا۔ مغربی تہذیب جس طرح سدی تہذیب کے خاتمہ کے بعد پیدا ہوئی تھی، اسی طرح اب وہ کسی آنے والی تہذیب کے لئے جگہ خالی کر رہی ہے۔ (ٹائم، ۸ر اپریل ۱۹۷۴)

مستقبل قریب میں مغربی تہذیب کا انہدام یقینی ہے۔ اس کے بعد ساری دنیا ایک فکری خلاسے دوچار ہوگی جس کو پُر کرنے کے لئے اس وقت کوئی قوم موجود نہیں ہے۔ چین اور روس بظاہر دورِ جدید کے طاقتور دیو بن کر ابھرے ہیں۔ مگر وہ اس خلا کو پُر نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ ان کا اندرونی تضاد ہے۔ اشتراکی ڈکٹیٹرشپ جس نے ان ملکوں کو موقع دیا ہے کہ وہ اپنے وسائل کو مخصوص میدانوں میں مرتکز کر کے طاقتور قوم بن جائیں، وہی اس میں مانع ہے کہ ان ملکوں میں کوئی فکری ارتقار وجود میں آسکے۔ کلیت پسندانہ نظام کے تحت ٹکنکل علوم ترقی کر سکتے ہیں، مگر فکری علوم، جو قوموں کو امامت کا مقام دیتے ہیں، ان کی ترقی کے لئے آزاد فضا ناگزیر طور پر ضروری ہے جو اشتراکی نظام میں موجود نہیں ہوتی۔

اس کے بعد جاپان ہے۔ بلاشبہ جاپان نے صنعتی ترقی کے میدان میں معجزنما کارنامے دکھائے ہیں۔ مگر جاپان بنیادی طور پر ایک ٹکنکل معاشرہ ہے اور مستقبل بعید تک یہ امید نہیں کہ وہ فکری حیثیت سے کوئی مقام حاصل کر سکے۔

مغربی قوموں کا انہدام، صنعتی تہذیب کے نتائج سے مایوسی اور عمومی فکری خلا نے دینِ حق کے حاملین کو آج اس مقام پر کھڑا کر دیا ہے کہ اگر وہ بیدار ہو جائیں تو اسلام کو دوبارہ نوعِ انسان کی امامت کے مقام پر پہنچا سکتے ہیں

اس اعلیٰ مقصد کے لئے جدوجہد میں جو واحد چیز رکاوٹ بن سکتی تھی، وہ جدید صنعتی دور میں وسائل کے اعتبار سے ان کا پیچھے ہونا ہے۔ تاہم قدرت نے تیل کے ذخائر کا تین چوتھائی حصہ ان کی زمین کے نیچے رکھ کر حیرت انگیز طور پر ان کی پس ماندگی کی تلافی کر دی ہے۔ آج مسلم دنیا ہر وہ اقتصادی قیمت ادا کر سکتی ہے جو دورِ جدید میں اسلام کے احیار کی مؤثر جدوجہد کے لئے درکار ہے۔ خدا نے اپنے حصہ کا کام کر دیا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کے بندے اپنے حصہ کا کام کرتے ہیں یا نہیں" (ماخوذ از "الاسلام" صفحہ ۲۳۷ - ۲۳۵)



The picture shows Viking's earlier landing site, Chryse, which has now been abandoned as it has nearby a bigger crater than previously known. Another site north-west of the original one is being considered and the landing has been delayed. Viking photographed the crater named Yuty from a 1165-mile altitude. The crater was formed by a collision with a meteorite and is 11 miles in diameter with layers of broken rocks thrown out of the crater by the shock following impact. — (AP)



A ROCK LIKE A HUMAN HEAD

The picture above, which was shot on July 25 from a height of 1,873 kilometers, is one of many photographs taken in the northern latitudes of Mars by the Viking I orbiter, when it was searching for a landing site for Viking II. Eroded, mesa-like landforms are visible. What seems to be a human head in the center of the picture is really a huge rock formation in which the play of shadows gives the illusion of eyes, nose and mouth. This rock is about 1.5 kilometers across.

اوپر کی تصویر میں صاف طور پر ایک انسان کا چہرہ دکھائی دے رہا ہے۔ وائکنگ اول نے ۲۵ جولائی ۱۹۷۶ کو مریخ سے یہ تصویر بھیجی تو زمین پر انتظار کرنے والے سائنس دانوں میں زبردست جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ تصویر مریخ پر انسان جیسی مخلوق کی موجودگی کا قطعی ثبوت ہے مگر بعد کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ صرف نظر کا دھوکا تھا۔ مریخ پر انسان کی تصویر ایک چٹان کے سایہ کا کرشمہ ثابت ہوئی۔

کائنات بے شمار ستاروں سے بھری ہوئی ہے۔ یہ ستارے ہماری زمین سے کروڑوں اربوں گنا بڑے آگ کے شعلے ہیں۔ سورج اسی قسم کا نسبتاً ایک چھوٹا ستارہ ہے۔ سورج کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہم سے قریب ہے اور اس کے گرد زمین اور دوسرے غیر روشن سیارے گھوم رہے ہیں جن کی مجموعی تعداد ۹ ہے، پھر ان سیاروں کے گرد مزید چھوٹے سیارے گردش کر رہے ہیں۔ جن کو چاند کہا جاتا ہے۔ نظام شمسی میں اس قسم کے ۲۹ سیارچے پائے جاتے ہیں۔ ان میں بعض سیارچے مریخ کے حجم کے برابر ہیں۔ سائنس دانوں کا قیاس ہے کہ اس قسم کے سیاراتی نظام ہماری کائنات میں تقریباً ایک سو ملین کی تعداد میں ہیں۔ تاہم ابھی تک کسی دوسرے سیاراتی نظام کا کوئی سائنسی ثبوت نہیں ملا ہے۔

مریخ جس کو ہندی میں منگل اور انگریزی میں مارس

مریخ پر زندگی کی تلاش

"بے شمار دنیاؤں کی اس وسیع کائنات میں زمین ایک انوکھا استثنا ہے"۔ خلائی مہموں کی اس دریافت نے حیرت انگیز طور پر خصوصی تخلیق کے نظریہ کو صحیح ثابت کر دیا ہے جس کو ارتقا پسندوں نے سو سال پہلے رد کر دیا تھا

کہتے ہیں، نظام شمسی کا ایک سیارہ ہے۔ مریخ کا فاصلہ زمین سے ۱۴ کروڑ ۰۵ لاکھ میل ہے اور اس کا قطر زمین کے مقابلہ میں تقریباً نصف ہے۔ یہ "سرخ ستارہ" قدیم ترین زمانہ سے انسان کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ قدیم علم نجوم میں اس کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ موجودہ زمانہ میں مریخ سے دلچسپی کی خاص وجہ یہ ہوئی کہ سائنس دانوں کا خیال تھا کہ مریخ کے طبیعی حالات ہماری زمین سے بہت زیادہ مشابہ ہیں اور وہاں زندگی کی کچھ اقسام ضرور پائی جانی چاہئیں۔ ابتدائی مشاہدہ میں مریخ پر کچھ ایسی چیزیں نظر آئیں جن کو برف کا تودہ سمجھا گیا۔ چنانچہ کہا گیا کہ برفانی تودوں کا مطلب ہے پانی اور فضا، فضا کا مطلب ہے آکسیجن اور دونوں کا مطلب ہے زندگی۔

اس نظریہ کی بنیاد کسی حقیقی دریافت سے زیادہ قیاس پر تھی۔ جدید علما زندگی کو ایک ارتقائی واقعہ فرض کرتے ہیں۔ یعنی مادی اشیاء کے باہمی تعامل سے مخصوص حالات میں زندگی کا ایک ابتدائی شرارہ نکلا اور پھر مختلف مادی حالات کے تحت ارتقا کرتا ہوا موجودہ انواع حیات تک پہنچا۔ اسی کے ساتھ ان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ساری کائنات کا مادہ ایک ہے۔ جو ایٹم ہمارے اندر ہے، ذرے سے لے کر ستاروں تک تمام کائنات اسی سے بنی ہوئی ہے۔ اسی لئے امریکی فلکیات داں ڈاکٹر ساگان (Dr. CARL SAGAN) نے انسان کو کوکبی مخلوق (STARFOLK) کہا ہے۔ اب اگر زندگی ارتقا کے طبیعی قانون کے تحت بنی ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ محض ایک زمینی استثنا رہو۔ اس توجیہ کا لازمی تقاضا ہے کہ زندگی ایک کائناتی مظہر ہو۔ وہ کائنات کے تمام حصوں میں، اپنے اپنے حالات کے لحاظ سے، ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی نظر آئے۔ اتنی بڑی کائنات میں صرف ایک چھوٹے سیارہ پر زندگی ہو تو وہ ایک شعوری اور ارادی تخلیق معلوم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس زندگی اگر ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہو، تو جدید ذہن کے نزدیک، وہ ارتقاء کی تصدیق کرتی ہوئی نظر آئے گی —— مریخ پر زندگی کی تلاش کا کم از کم فلسفیانہ محرک یہی ہے۔

۱۸۷۷ میں اٹلی کے ایک فلکیات داں شیاپریلی (GIOVANNI SCHIAPARELLI) نے دوربین سے مریخ کا مشاہدہ کیا۔ اس کے مشاہدہ میں بعض ایسی چیزیں آئیں جن کو اس نے اپنی زبان میں کینالی CANALI سے تعبیر کیا۔ اس اطالوی لفظ کا انگریزی مترادف چینل (CHANNELS) ہے۔ مگر انگریزی میں جب یہ خبر چھپی تو اس کا ترجمہ چینل کے بجائے کینال (CANALS) کر دیا گیا۔ چینل قدرتی گزرگاہ کو کہتے ہیں۔ جب کہ کینال کا لفظ انسان کی بنائی ہوئی نہر کے لئے بولا جاتا ہے۔ ترجمہ کی یہ غلطی اتنی عام ہوئی کہ لوگوں نے سمجھ لیا کہ مریخ پر واقعی انسان جیسی

مخلوق پائی جاتی ہے۔

۱۸۹۴ میں ایک امریکی فلکیات داں پرسیول لاویل (PERCIVAL LOWELL) نے زیادہ گہرائی سے مریخ کا مشاہدہ کیا۔ اس نے بتایا کہ میں نے اپنے مشاہدہ میں مریخ پر ۵۰۰ نہریں شمار کی ہیں۔ اس کے بعد اس نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا: مریخ زندگی کا مسکن:

MARS AS THE ABODE OF LIFE

۱۸۹۸ میں خیالات کا یہ قافلہ اور آگے بڑھا جبکہ برطانیہ کے سائنسی کہانیاں لکھنے والے ایچ۔ جی۔ ویلز نے ایک کتاب شائع کی۔ اس کا نام تھا "دنیاؤں کی جنگ"

THE WAR OF THE WORLDS

اس کتاب میں برطانی مصنف نے دکھایا کہ مریخ کے باشندوں نے ہماری دنیا پر حملہ کر دیا ہے۔ یہ کہانی اتنی مقبول ہوئی کہ امریکی ریڈیو نے ۱۹۳۸ میں اس کو نشر کیا اور اس کے فوراً بعد ہالی وڈ نے ایک فلم بنائی جس میں مریخ کے باشندوں کو عجیب و غریب قسم کے بڑے بڑے جانوروں کے روپ میں دکھایا گیا تھا۔ ۱۹۱۱ میں امریکہ میں ایک ناول چھپا جس کا نام تھا UNDER THE MOONS OF MARS یہ کتاب کروڑوں کی تعداد میں فروخت ہو گئی۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ مریخ پر سرخ انسان، زرد انسان، ہرا انسان وغیرہ مخلوقات پائی جاتی ہیں۔

موجودہ زمانہ میں خلائی سائنس کی ترقی نے جب اس کو ممکن بنا دیا کہ مریخ کے حالات کی تحقیق کے لئے زیادہ دور رس تحقیقات کی جا سکیں تو نئے نئے منصوبے شروع ہوئے۔ اس کی تین خاص صورتیں یہ تھیں:

۱۔ بیرونی خلا میں سگنل بھیجنا اور ان کا ردعمل معلوم کرنا۔ قیاس یہ تھا کہ زمین سے ایک ہزار سال نور کے اندر جو ستارے واقع ہیں، ان میں کم از کم دس سیارے ایسے ہو سکتے ہیں جن میں ترقی یافتہ تہذیبیں موجود ہوں۔ اور وہ ہمارے سگنل کا جواب دیں۔ پہلی بار پروفیسر ڈریک (DRAKE) نے ۱۹۶۰ میں ستاروں سے مواصلات قائم کرنے کی کوشش کی۔ کائنات میں مفروضہ زندگیوں سے ربط قائم کرنے کے لئے ریڈیو اینٹینا کا رخ قریبی ستاروں کی طرف کر دیا گیا۔ میری لینڈ یونیورسٹی اور شکاگو یونیورسٹی نے ۱۹۷۲ سے ایک مشترکہ پروگرام شروع کر رکھا ہے جس کے ذریعہ گرین بینک کی رصدگاہ (مغربی ورجینیا) سے سات سو قریبی ستاروں تک مسلسل سگنل بھیج کر ان کا جواب سننے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وغیرہ

۲۔ بیرونی خلا سے آنے والے شہابیے (METEORS) حاصل کرنا اور احتیاط کے ساتھ ان کا مطالعہ کرنا کہ شاید ان پر دوسری دنیاؤں کے جراثیم لپٹے ہوئے مل جائیں۔ چاند سے لائے ہوئے ذرات اور ٹکڑوں کو بھی اسی طرح خصوصی آلات کی مدد سے دیکھا گیا ہے۔ اس مقصد کے لئے دوسرے سیاروں پر راکٹ بھیج کر واپس لائے جاتے ہیں اور غور ان کا مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ شاید ان کے اوپر کوئی کائناتی جرثومہ لپٹ کر آ گیا ہو۔

۳۔ تیسری صورت مریخ پر ضروری ساز و سامان سے لیس خلائی جہاز بھیجنا ہے جو وہاں کے قریبی فوٹو بھیجے اور وہاں کی مٹی کا جائزہ لے کر اپنی رپورٹ دے۔ وائکنگ اول اور وائکنگ دوم اسی سلسلے کے مشن تھے جنھوں نے پچھلے سال بہت زیادہ شہرت پائی۔

مریخ پر زندگی کی تلاش کا جدید سلسلہ ۱۹۶۵ میں شروع ہوا جبکہ میرینر (MARINER) نام کی خلائی مشینیں اس کی طرف بھیجی گئیں۔ ان مہموں کا خاص مقصد قریب سے

مریخ کا فوٹو لینا تھا۔ اس کے بعد سے مسلسل امریکی اور سوویت اسپوتنک مریخ کے گرد چکر لگاتے رہے ہیں۔ تاہم وائکنگ اول پہلی انسانی مشین تھی جو جولائی ۱۹۷۶ میں مریخ کی سطح پر اتری۔ اس کے بعد وائکنگ دوم کو ستمبر ۱۹۷۶ میں اس پر اتارا گیا۔

وائکنگ کے لفظی معنی "بحری قزاق" کے ہوتے ہیں۔

۷۰۰ ملین کیلومیٹر کا سفر طے کرکے یہ پیچیدہ مشین گیارہ مہینے میں مریخ پر پہنچی۔ ۹۰ دن تک کام کرنے والی اس مشین کا وزن چار ٹن تھا۔ اس میں تین آٹومیٹک لیبوریٹریاں تھیں اور مجموعی طور پر اس کے اندر کل ۹۲۵۰۰۰ پرزے لگے ہوئے تھے۔ زمین پر کسی لیبوریٹری میں جتنے آلات ہوتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ آلات وائکنگ کی لیبوریٹری میں تھے۔ اس کے باوجود وہ اتنی چھوٹی تھی کہ کوئی شخص اس پوری لیبوریٹری کو بغل میں دبا کرلے جا سکتا تھا۔ وائکنگ کی تیاری پر ایک سو ملین ڈالر خرچ ہوئے تھے۔ اس کے بجٹ میں اتنی رقم نہ رہی کہ اس میں فلیش لائٹ نصب کی جاسکے، کیونکہ وہ بہت قیمتی تھی۔ چنانچہ وائکنگ کو فلیش لائٹ کے بغیر بھیجا گیا۔ امریکی سائنس دانوں نے اس پر قناعت کی کہ وہ صرف دن کے وقت مریخ کی تصویریں حاصل کریں، رات کو اس کا سلسلہ بند رکھیں۔ وائکنگ کے دو قیمتی کیمرے اتنے طاقت ور تھے کہ وہ مریخ پر ایک چیونٹی سے لے کر زرافہ تک کے اجسام کے مکمل فوٹو لے سکتے تھے۔

وائکنگ کی ہر چیز بے حد پیچیدہ حساب سے تعلق رکھتی تھی۔ مثال کے طور پر اس کو مریخ پر اتارنے کے لئے جو حسابی اندازہ کیا تھا، اگر اس میں چند میٹر کی بھی غلطی ہوجائے، تو وہ مریخ تک پہنچ کر ہزار کیلومیٹر کی غلطی کی شکل اختیار کرلیتی۔ وائکنگ کو زمین سے ریڈیائی لہروں کے ذریعے کنٹرول کیا جارہا تھا۔ یہ نظام اتنا زبردست تھا کہ ۲۵ جولائی کو جب کہ مریخ پر اترنے کے بعد وائکنگ اول کا ۱۰ فٹ لمبا بازو جام ہوگیا، جس کا کام یہ تھا کہ مریخ کی مٹی اٹھا کر اس کو اپنی لیبوریٹری میں ڈالے تو پساڈینا کے زمینی مرکز سے ریڈیائی لہروں کے ذریعہ اس کی مشینی غلطی درست کردی گئی، اور بازو دوبارہ کھل کر اپنا کام کرنے لگا۔ اسی طرح وائکنگ کے اترنے کے لئے ابتداءً جو جگہ طے کی گئی تھی، جب اس کی بھیجی ہوئی تصویروں سے معلوم ہوا کہ وہاں گیارہ میل قطر کا ایک گہرا غار ہے، تو وائکنگ کو مقررہ وقت پر اترنے سے روک دیا گیا۔ مزید مطالعہ کے بعد جب دوسری مناسب جگہ متعین ہوگئی تو اس کو اترنے کا "حکم" دیا گیا۔

وائکنگ کو مریخ پر زندگی کی تلاش کے سلسلے میں بہت سے کام انجام دینا تھے۔ اس میں ایسے آلات لگے ہوئے تھے جو مریخ کی سطح پر ایکسرے کی بمباری کرسکیں۔ اس کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ مریخ کی سطح کا مادہ کن چیزوں کا مرکب ہے۔ ایک اور آلہ وہاں کے موسمیاتی اعداد و شمار جمع کرنے کے لئے رکھا گیا تھا۔ اس کی کیمسٹری لیبوریٹری کا مقصد یہ تھا کہ وہ کاربن مالیکیول کی تلاش کرے اور یہ پتہ کرے کہ مریخ پر کیا آرگینک مالیکیول کسی شکل میں موجود ہیں۔ یہ آلہ اتنا حساس تھا کہ آرگینک مٹیریل اگر ایک ملین میں ایک کی نسبت سے ہو، تب بھی وہ اس کو پکڑ سکتا تھا۔ وائکنگ میں لگے ہوئے کیمرے تین ابعادی تصویریں کھینچ سکتے تھے۔ کوئی جاندار چھوٹا یا بڑا ان کے سامنے سے گزرے تو وہ ان کی گرفت سے بچ نہیں سکتا تھا۔



Rilles or channels that might have been formed as fissures split by the uplifting plateau under tension from heat processes below the Martian crust.



The letter "B" or perhaps the figure "8" appears to have been etched into the Mars rock at the left [illegible] of this picture taken on July 24 by the Viking 1 Lander. It is believed to be an illusion caused by weathering processes and the angle of the sun as it illuminated the rocks for the [illegible] camera.

[illegible]

وائکنگ نے مریخ سے تصویریں بھیجنی شروع کیں تو پساڈینا (امریکہ) میں بیٹھے ہوئے سائنس دانوں کا جوش و خروش بہت بڑھ گیا۔ ان ابتدائی تصویروں میں انھیں کچھ ایسی چیزیں ملیں جو مریخ پر زندہ اشیاء کی موجودگی کا ثبوت دے رہی تھیں۔ ۱۲ اگست ۱۹۷۶ کو کچھ تصویریں موصول ہوئیں جن میں بظاہر ایسا منظر تھا جو جوتے ہوئے کھیت کے ہوائی فوٹو میں ہوتا ہے۔ دھاریاں اتنی سیدھی تھیں کہ سائنس دانوں کے لئے یہ یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ یہ محض فطری اسباب سے بن سکتی ہیں۔ مگر بعد کو معلوم ہوا کہ ان کا کوئی تعلق ذی شعور مخلوق سے نہیں ہے۔ یہ ویسی ہی ہیں جیسے صحرا میں ہواؤں کے ذریعہ ریت کے اندر سیدھی دھاریاں بن جاتی ہیں۔

اسی طرح وائکنگ نے کچھ ایسی تصویریں بھیجیں جن میں انسانی حروف اور گنتیاں نظر آ رہی تھیں مثلاً B G 8 وغیرہ۔ اس سے سمجھ لیا گیا کہ مریخ پر انسان جیسی کوئی مخلوق ہے اور اس نے وہاں کی چٹانوں پر یہ حروف اور گنتیاں لکھ رکھی ہیں، مگر بعد کو معلوم ہوا کہ یہ محض نظر کا دھوکا تھا۔ اس قسم کے تمام نقوش صرف سایہ کا کرشمہ ثابت ہوئے۔ اس سلسلے میں ایک تصویر ایسی بھی موصول ہوئی جس میں صاف طور پر انسانی چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس میں آنکھ، ناک سب انسان جیسے تھے۔ مگر بعد کی تحقیق میں وہ بھی محض سایہ ثابت ہوا۔

مریخ پر زندگی کی تلاش کے سلسلے میں وائکنگ کا ایک خاص کام یہ تھا کہ وہ اپنے اندر سے دس فٹ کا بازو نکال کر مریخ کی مٹی کھودے اور اس کو اپنی لیبورٹری میں رکھ کر جلائے۔ اس کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ مریخ کی سطح پر کاربن پر مبنی آرگینک کمپاؤنڈ ہے یا نہیں۔ زمین پر مٹی کے ہر ٹکڑے میں بے شمار تعداد میں خوردبینی کیڑے موجود رہتے ہیں۔ اگر مٹی کے کسی ٹکڑے کو آگ پر پکایا جائے تو یہ کیڑے جل کر کاربن ڈائی آکسائڈ خارج کریں گے جو اس بات کا ثبوت ہوگا کہ اس کے اندر زندہ جسم یا بالفاظ دیگر آرگینک میٹر موجود تھا۔

وائکنگ کی لیبورٹری کے ذریعہ اسی زمینی تجربہ کو مریخ پر دہرایا گیا۔ مریخ کی مٹی کو اولاً ۵۰ ڈگری سنٹی گریڈ اور اس کے بعد ۲۰۰ ڈگری سنٹی گریڈ تک گرم کیا گیا۔ مگر اس کے اندر کسی زندہ چیز کا ثبوت نہیں ملا۔ مریخ کی مٹی میں چھوٹے سے چھوٹا خوردبینی کیڑا یا کائی کے مانند بھی کوئی ہریالی ہوتی تو اس عمل سے اس کا پتہ چل جاتا۔

شروع میں جب مریخ کی مٹی لیبورٹری کی بھٹی میں ڈالی گئی جو سورج کی حرارت سے گرمی لے کر اس کو پکاتی تھی تو کسی قدر آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائڈ کے اخراج کا نشان ملا۔ مگر بعد کو معلوم ہوا کہ وہ بعض کیمیکل ری ایکشن کی وجہ سے تھا نہ کہ کسی قسم کی زندگی کی وجہ سے۔ وائکنگ کی لیبورٹری میں زندگی کی جانچ کے تین مختلف سائنسی طریقے اختیار کئے گئے، مگر آرگینک کمپاؤنڈ جو زندگی کا بلڈنگ بلاک ہے، مریخ پر دستیاب نہ ہو سکا۔

اسی کے ساتھ وائکنگ میں دوسرے ایسے آلات تھے جو حیاتیاتی اجسام کی صفتیں مثلاً نشو و نما، نظام ہضم، نظام تنفس کا انتہائی باریکی کے ساتھ پتہ لگا سکتے تھے، مگر ان آلات نے بھی آٹھ ہفتے کی تلاش کے باوجود ایسی کوئی اطلاع نہ دی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ مریخ پر ان خصوصیات کو رکھنے والی کوئی چھوٹی بڑی مخلوق پائی جاتی ہے۔

مریخ کی تحقیق یہ پتہ چلانے کے لئے تھی کہ کیا زمین

سے باہر کی دنیاؤں میں زندگی موجود ہے۔ مگر ان تحقیقات نے مریخ پر زندگی کے بارے میں جدید انسان کی رجائیت کو سخت دھکا پہنچایا ہے کیونکہ اس سے صرف یہ ثابت ہوا ہے کہ مریخ پر زندگی کم از کم اس وقت ناممکن ہے۔ اس کی فضا میں پانی کے بخارات کی بہت کم مقدار، اور اس کی سطح پر سیال پانی کا فقدان ایسی باتیں ہیں جو زندہ نظام جسمانی کے لئے اس کو نا اہل بنا دیتی ہیں۔ شروع میں جب مریخ پر آکسیجن کا انکشاف ہوا تو فوراً مریخ پر زندگی کے بارے میں پُر امید قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ مگر بالآخر ثابت ہوا کہ آکسیجن کی بہت تھوڑی مقدار جو بظاہر مریخ پر پائی جاتی ہے وہ اپنے ماخذ کے اعتبار سے غیر حیاتیاتی ہے۔

"اس قسم کے بیانات کہ مریخ کی فضا میں نائٹروجن کی موجودگی سیارہ پر زندگی کے موجود ہونے کی توثیق کر سکتی ہے" ایک روسی سائنس داں لیعت موخن لکھتا ہے "مجھے حد سے زیادہ عاجلانہ دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ قمری چٹانوں کے گیس کے حامل اجزا کا مطالعہ کرنے پر بھی اسی طرح نائٹروجن دریافت ہوئی تھی" یہ بالکل ممکن ہے کہ وہاں زندگی کا کوئی وجود نہ ہو اور مریخ کی مٹی اور اس کی فضا کے بارے میں جو کچھ معلوم کیا گیا ہے وہ سب ایک غیر معمولی رد عمل کا نتیجہ ہو۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مریخ کی سطح پر سخت قسم کی شمسی الٹرا وائلٹ شعاع افشانی نے مریخ کی مٹی کی جذب کرنے والی صلاحیتوں کو بدل دیا ہو اور جو کچھ آج ہمارے سامنے ہے وہ بخارات بننے کے سلسلہ ہائے عمل کا نتیجہ ہو۔

فلکی طبیعیات کے مشہور روسی عالم پروفیسر جوزف شکلووسکی (JOSSIF SHKLOVSKY) چند سال پہلے تک اس نظریہ کے زبردست حامی تھے کہ زمین کے علاوہ کائنات کے دوسرے مقامات پر بھی ذہین زندگی (ذہین مخلوق) موجود ہے۔ مگر اکتوبر ۱۹۷۷ء کے آخر میں سوویت اکیڈمی آف سائنس کے مجلہ میں مضمون لکھتے ہوئے انھوں نے اپنے اس خیال سے رجوع کر لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ذہین زندگی کا وجود صرف زمین پر ہے۔ اس کے علاوہ کائنات کے کسی دوسرے مقام پر ہمارے جیسی ذہین زندگی نہیں پائی جاتی۔ "ذہین زندگی اگر ہماری کہکشاں میں یا ستاروں کے کسی اور نظام میں موجود ہوتی تو خلائی سائنس کے ماہرین اب تک اس کا کوئی متعین ثبوت دریافت کر چکے ہوتے۔" انھوں نے مزید کہا کہ اس سلسلے میں خلائی مخلوق یا اڑن طشتریوں وغیرہ کے مفروضات کے حق میں کوئی بھی بنیاد موجود نہیں ہے۔

اگر انسان نہیں تو اس کی روبوٹ مشین بہر حال مریخ پر پہنچ چکی ہے۔ مگر اس نے پچھلی تمام امیدوں کے خلاف یہ بتایا کہ مریخ پر خشک چٹانوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ بظاہر سائنس فکشن لکھنے والوں کے تمام قیاسات غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ تاہم انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ کیمپل مین (KAMPELMAN) نے لکھا کہ مریخ کے جس حصہ پر وائکنگ اترا، وہ اس وقت مریخ کا گرم علاقہ تھا، ظاہر ہے کہ مریخ کے باشندے ان دنوں نسبتاً سرد علاقوں میں منتقل ہو چکے ہوں گے جہاں ان کے لئے پارک اور آرام گاہیں ہیں۔" ایک اطالوی ادیب باسکولو (BENUCCIO BOSCOLO) نے کہا: وائکنگ نے مریخ کی ایک قدیم تہذیب کے کھنڈرات کی تصویر بھیجی تھی مگر "ناسا" کے افسروں نے اس کو چھپا دیا۔ رے بریڈ بری (RAY BRADBURY) نے کہا: مریخ کے باشندے وائکنگ کی گرفت میں کیسے آسکتے تھے کیونکہ وہ تو ناقابل مشاہدہ (INVISIBLE) مخلوق ہیں وغیرہ

بچوں کا گھروندا جتنی دیر میں بنتا ہے اس سے بھی کم مدت میں زمیں بوس ہوجاتا ہے

ایک طالب علم کے سرپرست کالج کے پرنسپل سے ملے ۔۔۔ "آپ لوگوں نے جو تعلیمی نصاب بنایا ہے وہ بڑا طویل ہے۔ طالب علم کی عمر کا بڑا حصہ صرف پڑھنے میں گزر جاتا ہے؟" انھوں نے کہا۔

"اس کا حل تو بہت آسان ہے" پرنسپل نے جواب دیا۔ "آپ مختصر نصاب بھی بنا سکتے ہیں۔ اصل میں مدت کا تعلق اس بات سے ہے کہ آپ طالب علم کے اندر کس درجہ کی لیاقت دیکھنا چاہتے ہیں۔ قدرت کو شاہ بلوط (OAK) کا درخت تیار کرنے میں سو برس لگ جاتے ہیں مگر جب وہ ککڑی اگانا چاہتی ہے تو اس کے لیے صرف چند مہینے درکار ہوتے ہیں۔ اگر آپ معمولی قسم کا علمی معیار چاہتے ہوں تو چند سال کی تعلیم بھی کافی ہو سکتی ہے مگر اعلیٰ تعلیم یافتہ بنانے کے لیے تو بہرحال زیادہ وقت دینا پڑے گا۔"

یہی حال قومی تعمیر کا بھی ہے۔ اگر آپ ٹھوس اور دیرپا تعمیر چاہتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو صبر آزما انتظار کے مرحلے سے گزرنا ہوگا اور لمبے عرصہ تک مسلسل محنت کرنی پڑے گی۔ لیکن اگر آپ بچوں کا گھروندا بنانا چاہتے ہوں تو پھر صبح شام میں ایسا گھروندا بن کر کھڑا ہو سکتا ہے۔ البتہ ایسی حالت میں آپ کو اس حادثہ کا سامنا کرنے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے کہ جتنی دیر میں آپ کا گھروندا بن کر کھڑا ہوا ہے اس سے بھی کم مدت میں وہ دوبارہ زمیں بوس ہو جائے۔

ہوائیں چلتی ہیں تو گرد وغبار اڑ کر فضا میں اڑنے لگتے ہیں۔ مگر گرد وغبار کی پرواز کیلئے آخری طور پر جو انجام مقدر ہے وہ یہ کہ دوبارہ وہ زمین پر گریں اور قدموں کے نیچے پامال ہونے کے لیے باقی رہ جائیں۔

مگر یہی ہوائیں پانی کے قطروں کو بھی پرواز پر آمادہ کرتی ہیں۔ مگر یہاں معاملہ بالکل مختلف ہوتا ہے قطرے فضا میں جاکر بادل بنتے ہیں، پھر وہ بارش کی شکل میں زمین پر برستے ہیں۔ اس کے بعد نالوں اور ندیوں سے ہوتے ہوئے سمندر میں پہنچتے ہیں اور بالآخر اس عظیم آبی چادر کا حصہ بن جاتے ہیں جو دائمی طور پر پورے کرۂ ارض کو لپیٹے ہوئے ہے۔

ایسا ہی کچھ معاملہ ہماری سرگرمیوں کا بھی ہے۔ سطحی اور غیر دانش مندانہ سرگرمیاں انسانوں کو صرف گڑھے میں گرانے کا باعث ہوتی ہیں اور جن سرگرمیوں کی بنیاد گہری بصیرت پر ہوتی ہے وہ آدمی کو ترقی کے آسمان پر پہنچا دیتی ہیں۔ پچھلے ڈیڑھ سو برس کے درمیان ہم نے اس ملک میں قومی تعمیر کے نام سے زبردست ہنگامہ آرائی کی ہے مگر یہ کوششیں اس انجام پر ختم ہوئی ہیں کہ آج ہم صرف گرد راہ بن کر انسانی قافلوں کے قدموں کے نیچے پامال ہونے کے لیے پڑے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ہم کو جدوجہد کا جو طویل موقع ملا اور اسمیں جو سنہری امکانات ہمارے لیے چھپے ہوئے تھے اگر ہم نے دانش مندی کے ساتھ انھیں استعمال کیا ہوتا تو آج ہم زمین پر چھائے ہوئے ہوتے۔ فریاد و ماتم کے بجائے ہم فیصلہ کرنے والے کی پوزیشن میں ہوتے۔ ہمارے لیے آسمانی پرواز بھی مقدر تھی، مگر ہماری نادانی کی وجہ سے صرف زمین کی پامالی کا انجام ہمارے حصہ میں آیا ہے۔

شام میں قدیم تہذیب کی دریافت

روم اگر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو اور اچانک اپنی پوری تاریخ کے ساتھ ظاہر ہو جائے تو مورخین کے لئے بلاشبہ یہ انتہائی حیرت انگیز واقعہ ہوگا۔ ڈاکٹر ڈیوڈ نوئل فریڈمین DAVID NOEL FREEDMAN کے نزدیک ایسا ہی معاملہ اس قدیم تہذیب کا ہے جس کے آثار شام میں کھدائی سے برآمد ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر فریڈمین مشی گان یونیورسٹی میں ببلیکل آرکیالوجی کے استاد ہیں اور انھوں نے روم یونیورسٹی کے ماہرین علم الآثار کی اس ٹیم کے ساتھ کام کیا تھا جس نے شام کے تل مردیخ میں کھدائی کرکے اس چھپی ہوئی تاریخ کو برآمد کیا ہے۔

یہ واقعہ ستمبر ۱۹۷۵ء میں دنیا کے علم میں آیا۔ اس کھدائی میں سطح زمین سے چار میٹر نیچے ایک قدیم شاہی محل کے کھنڈرات برآمد ہوتے ہیں جس میں ۱۵ ہزار مٹی کی تختیاں ملی ہیں۔ ان تختیوں کا حجم ہاتھ کی ہتھیلی یا اس سے کچھ بڑا ہے۔ ان تختیوں پر قدیم خط میں کتبات لکھے ہوئے ہیں جن کو گیووانی پیٹی ناٹو GIOVANNI PETTINATO نے پڑھا ہے جو قدیم زبانوں کے ماہر ہیں۔ یہ تختیاں ۵۰ سال کی مدت سے تعلق رکھتی ہیں جو ۲۴۰۰ ق م سے ۲۲۵۰ ق م تک پھیلا ہوا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم شامی شہر ابلہ ایک عظیم ترقی یافتہ سلطنت کا مرکز تھا جس کا علاقہ شمال میں بحر احمر سے لے کر موجودہ ترکی تک پھیلا ہوا تھا۔ مشرق میں اس کی سرحدیں میسوپوٹامیہ (عراق) سے ملتی تھیں۔

سمیری جو کہ ایک غیر سامی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، ۳۰۰۰ ق م میسوپوٹامیا کے جنوب میں آباد تھے۔ قدیم خط اسماریہی کو ترقی دے کر انھوں نے وہ خط بنایا جس کو خط میخی (CUNEI FORM) کہا جاتا ہے۔ ابلہ کی تختیاں اسی سے ملتے جلتے خط میں لکھی ہوئی پائی گئی ہیں۔

تختیوں کی ۸۰ فی صد تعداد مالی معاہدات سے تعلق رکھتی ہے۔ ان لوگوں کی تجارت آس پاس کے ملکوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ بعض تختیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ قبرص میں تانبا برآمد کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی معاہدے، فوجی سودا دیں، مذہبی تحریریں، تخلیق کی کہانی اور "عظیم طوفان" کی باتیں تختیوں میں درج ہیں۔ ان میں بار بار پیغمبروں کے نام بھی آتے ہیں، مثلاً ابراہیم، اسماعیل، اسرائیل، داؤد وغیرہ۔

میسوپوٹامیا والوں نے ۲۲۵۰ ق م میں ابلہ سلطنت پر حملہ کیا اور اس کے شاہی محل میں آگ لگا دی۔ اس کے نتیجہ میں محل تباہ ہو گیا۔ تاہم مٹی کی پکائی ہوئی تختیاں آگ سے محفوظ رہیں۔ اگرچہ ان میں سے کچھ ترخ کر ٹوٹ گئیں۔ اس کے بعد موسمی ہوائیں، گرد کی تہیں ان کھنڈرات پر چڑھاتی رہیں چند صدیوں کے بعد یہاں ریت اور مٹی کا اونچا ٹیلہ بن گیا۔ تختیاں اس کے نیچے محفوظ رہیں۔ ان تختیوں کی مالیت کا اندازہ پندرہ ملین ڈالر ہے۔

تختیوں کے ذریعہ جو ملکی قوانین معلوم ہوئے ہیں

ان سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے یہاں زنا کی سزا موت تھی۔
مورخین کا خیال اب تک یہ تھا کہ اس علاقہ
میں سب سے قدیم سلطنتیں مصر اور میسوپوٹامیا (عراق) والوں
کی تھیں۔ مگر ان تحقیقوں سے انکشاف ہوتا ہے کہ ابلہ (شام)
والوں نے بھی تیسری عظیم سلطنت اس علاقہ میں قائم کرنے
میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اس تیسری سلطنت کی
عظمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ میسوپوٹامیہ والوں کی
فتح کا ذکر کرتے ہوئے ایک تختی کہتی ہے:
"یہ وہ شہر ہے جو انسان کی پیدائش سے لے کر اب
تک کبھی مفتوح نہیں ہوا تھا۔" (اسٹیٹسمین، ۱۸ اگست ۱۹۷۰)

دین نہ سیاسی مقابلہ آرائی کا نام ہے نہ فراری عملیات کا

انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اوّل کے درمیان پورے سو سال تک مسلمانوں کے اوپر سیاست کا جنون سوار رہا۔ نہ صرف دنیادار لیڈر بلکہ مقدس بزرگ بھی سیاست کے میدان میں اس طرح ٹوٹ پڑے گویا اس سے بڑا کوئی کام ہی نہیں جس کے لئے وہ متحرک ہوں حتی کہ کچھ پُرجوش داعیوں نے اسلام کی ایسی تشریح کر ڈالی جیسے اسلام نام ہی ہے اسلامی سیاست کا۔

یہ بے معنی سیاست جب اس بے معنی انجام کو پہنچ گئی جہاں اُسے پہنچنا تھا تو اب مسلمانوں کا پنڈولم دوسری انتہا کی طرف جا رہا ہے۔ یہ ہے ٹونے ٹوٹکے کا مذہب۔ "مجربوں والے اعمال" میں ایسے پُر اسرار اوصاف تلاش کر لئے گئے ہیں کہ چھت کے سایہ میں بیٹھ کر اس کے بیج پر الفاظ شماری کرو اور مقابلہ کا میدان خود بخود سر ہوتا چلا جائے گا۔

مگر ان دونوں میں سے کوئی بھی وہ دین نہیں ہے جس کو پیغمبر آخر الزماں خدا کی طرف سے لائے تھے اور جو قرآن کی صورت میں اب بھی پوری طرح محفوظ ہے۔ دین نہ سیاسی مقابلہ آرائی کا نام ہے اور نہ فراری عملیات کا۔ دین نام ہے دنیا میں رہ کر آخرت کے لئے عمل کرنے کا۔ دین ایک ایسی زندگی ہے جس کو آج کی زبان میں AKHIRAT ORIENTED LIFE کہا جا سکتا ہے یعنی آخرت پسندانہ زندگی۔ ایک ایسی زندگی جس میں تمام سرگرمیوں کا رُخ آخرت کی طرف ہو۔

ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم آخرت کے مسافر ہیں۔ ہماری موجودہ زندگی، ہماری اصل زندگی کا بہت ہی چھوٹا حصہ ہے۔ ہم بہت جلد اپنی دائمی زندگی کے مرحلہ میں داخل ہونے والے ہیں۔ اس حقیقت واقعہ کو یاد رکھنا اور دنیا کے نفع نقصان کے بجائے آخرت کے نفع نقصان کو سامنے رکھ کر زندگی گذارنا اسی کا نام دین یا اسلامی زندگی ہے۔

مسلمان کا کام یہ ہے کہ خود اسی راہ کو اپنائے اور دوسروں کو اسی راستہ کی طرف دعوت دے۔

سب سے بڑا اعتماد خدا پر اعتماد ہے

جس بہادری کا انحصار مادّی سہارے پر ہو، وہ اس وقت بزدلی میں تبدیل ہو جائی ہے جب مادّی سہارا چھن جائے

دوسری جنگ عظیم میں جب اتحادی طاقتوں نے بالآخر جرمنی کو شکست دیدی تو تمام نازی لیڈروں کو اسی برلن میں پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا گیا جہاں وہ ساری دنیا کے قتل کا منصوبہ بنایا کرتے تھے۔

یہ واقعہ اکتوبر ۱۹۴۶ء کا ہے۔ ہٹلر اور گورنگ نے تو پہلے ہی خودکشی کر لی تھی اس کے بعد رین ٹراپ، کیٹل، کیلٹن برنر، الفریڈ روزنبرگ، ہنس فرینک، ولہم فرک جولیس سٹاکل، جوڈل، سس انکوارٹ اور دوسرے نازی لیڈر جو زندہ بچے تھے، ایک ایک کر کے ختم کر دیئے گئے۔

یہ وہ لیڈر تھے جنھوں نے چالیس لاکھ یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور ان کی املاک پر قبضہ کر لیا تھا۔ انھوں نے ایک ایسی خونی جنگ چھیڑی تھی جس میں ان کے مفروضہ دشمنوں کے علاوہ خود جرمن قوم کے ۷۰ لاکھ سپاہی کام آئے۔ انھوں نے لاکھوں انسانوں کو بیگار کیمپوں (CONCENTRATION CAMP) میں جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ ان کی درندگی کا یہ عالم تھا کہ اپنے ملک کے بڈھے، معذور اور بیمار لوگوں کو "جرمنی کے لیے بے فائدہ" قرار دے کر گولی سے اڑا دیتے۔ مقتول بچوں، لاشوں سے اٹے ہوئے گڑھوں اور بیواؤں اور یتیموں کے غول دیکھ کر بھی ان کا پتھر جیسا دل پسیجنا نہیں جانتا تھا۔

مگر شکست کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ جب وہ پھانسی کے تختے کے سامنے لائے گئے تو ان کے چہرے زرد تھے، ان کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں، وہ کچھ بولنا چاہتے تو معلوم ہوتا کہ زبان ان کا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ شعلہ بیان لیڈر گویائی کی طاقت کھو بیٹھے تھے۔ جو دوسروں کی زندگیوں سے کھیلتے تھے، وہ اپنے انجام کو دیکھ کر پاگل ہو گئے تھے۔

جس بہادری کا انحصار صرف مادی سہارے پر ہو، وہ اس وقت بزدلی میں تبدیل ہو جاتی ہے جب مادی سہارا اس سے چھن جائے۔ البتہ جس کا اعتماد خدائے لازوال پر ہو، وہ ہر حال میں شجاعت و عزیمت کی چٹان بنا رہتا ہے، خواہ مادّی سہارے اس کا ساتھ دے رہے ہوں یا انھوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔

مسلمان اس نبی کی امت ہیں جس نے غار ثور میں بیٹھ کر اس وقت لا تحزن ان اللہ معنا کا سبق دیا جبکہ سارے مادی سہارے اس سے چھن چکے تھے اور طاقتور دشمن قتل کی مکمل تیاری کے ساتھ عین غار کے دہانے پر کھڑا ہوا تھا۔ اگر خدا کی مدد کا یہ یقین دلوں میں زندہ ہو جائے تو کبھی آپ مایوسی کا شکار نہیں ہو سکتے۔ قاتلوں اور غارت گروں کے ہجوم سے بھی آپ اس طرح زندہ سلامت نکل آ سکتے ہیں۔ جیسے وہاں کسی کا وجود ہی نہیں تھا۔

یہ علوم کیسے بنے

اسلام جب جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر اطراف کے علاقوں میں پھیلا تو اس کے ساتھ نئے نئے مسائل بھی پیدا ہوئے۔ عجمیت ہر طرف سے اسلام پر "حملہ آور" ہو گئی۔ اس وقت انھوں نے قرآن کی زبان کو محفوظ رکھنے کے لئے نحو، اس کے حل مشکلات کے لئے تفسیر، اس سے استنباط احکام کے لئے فقہ مرتب کی۔ حدیث کے تلف ہونے اور اس میں وضعی احادیث کے مل جانے کے خطرہ کی وجہ سے انھوں نے احادیث کو مدون کیا اور اس سے متعلق فنون وضع کئے۔

اسلام کے پھیلاؤ کے ساتھ عربی زبان بھی پھیل رہی تھی۔ اب وہ حجاز و نجد کے قصبات سے نکل کر بصرہ، کوفہ، دمشق، بغداد، قرطبہ اور مصر جیسے متمدن علاقوں کی زبان بن گئی۔ ظاہر ہے کہ دوسری قوموں کو عربی پر وہ قدرت حاصل نہ تھی جو عربوں کو ہو سکتی تھی۔ اختلاط کے نتیجہ میں ایک نئی زبان بننے لگی جو خامیوں اور غلطیوں سے بھری ہوئی تھی۔ چوتھی صدی ہجری کے آخر تک اگرچہ عرب دیہات کی زبان اپنی خالص حالت پر موجود رہی مگر شہروں کی زبانیں بدل چکی تھیں۔ بعد کو یہ بگاڑ عام ہو گیا۔ مسلمانوں کو خطرہ ہوا کہ کہیں قرآن کی زبان بھی اس سے متاثر نہ ہو جائے۔ انھوں نے اس کی حفاظت کے لئے نحو و صرف کے قواعد بنائے۔ اس کی عبارتوں پر اعراب اور نقطے لگائے۔ اس سے یہ فائدہ تو ہوا کہ کتابی زبان محفوظ رہ گئی۔ مگر بول چال کی زبان کی اصلاح نہ ہو سکی۔ بالآخر عربی زبان کے دو حصے ہو گئے۔ ایک تحریر کی ادبی زبان، دوسری بول چال کی عوامی زبان۔ یہ تقسیم آج تک بلاد عرب میں جاری ہے۔

عربی نحو کے قواعد مرتب کرنے والا سب سے پہلا شخص ابو الاسود دؤلی (م ۶۹ھ) ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابتداءً جب اس نے کوفہ و بصرہ کے گورنر زیاد سے اس فن کو مرتب کرنے کی اجازت مانگی تو اس نے اجازت نہ دی۔ اس کے بعد یہ واقعہ ہوا کہ ایک شخص زیاد کے پاس آیا اور گفتگو کے دوران کہا: توفی ابانا و ترک بنون (صحیح جملہ یوں ہوگا: توفی ابونا و ترک بنین) اب زیاد کو احساس ہوا اور اس نے ابو الاسود کو صرف و نحو کے قواعد مرتب کرنے کی اجازت دے دی۔ ابو الاسود دؤلی سریانی زبان جانتا تھا اور اس زبان کی نحو عربی سے قبل مرتب ہو چکی تھی۔ اس کی پیروی کرتے ہوئے اس نے بھی عربی نحو کو سریانی نحو کے قواعد پر مرتب کیا۔

قید رحمت ثابت ہوئی

ابوریحان ابن احمد البیرونی (

خوارزم (موجودہ خیوا) میں پیدا ہوا۔ وہ نوابوں کے دربار سے وابستہ تھا۔ ۱۰۱۷ء میں جب محمود غزنوی نے خوارزم میں حکمراں نسل کو ختم کیا تو البیرونی کو بھی اس نے حراست میں لے لیا اور اس کو غزنہ میں رہنے پر مجبور کر دیا۔ یہ حراست البیرونی کے لئے نہایت مفید ثابت ہوئی۔ غزنہ میں اس وقت سنسکرت کے علماء موجود تھے۔ اس نے ان سے سنسکرت زبان سیکھنا شروع کی اور سنسکرت کی کلاسیکل کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اس کی یہی کوششیں بعد کو اس کی مشہور کتاب "تحقیق الہند" کی شکل میں ظاہر ہوئیں۔

اس میں آپ کے لئے سبق ہے

ابتدائی اسلامی دور کے شعراء میں تین سب سے زیادہ مشہور ہیں: جریر، فرزدق اور اخطل۔ جریر (م ۱۱۰ھ) اور فرزدق (۱۱۰ھ) دونوں ایک دوسرے کی ہجو کیا کرتے تھے۔ مثلاً فرزدق نے کہا:

احلامنا تزن الجبال رزانة
وتخالنا جنا اذا ما نجهل

ہماری عقلیں پہاڑوں کے برابر وزنی ہیں اور جب ہم بگاڑ پر مائل ہو جائیں تو تم ہم کو جن خیال کرو گے۔

جریر نے جواب دیا:

ابلغ بنی وقبان ان حلومهم
خفت فلا يزنون حبة خردل

بنی وقبان کو بتا دو کہ ان کی عقلیں ہلکی ہو گئیں اور وہ رائی کے برابر بھی وزنی نہیں۔

یہ ایک سادہ سی مثال ہے۔ ورنہ ان کی ہجویات خاص طور پر فرزدق کی، اتنی زیادہ عریاں ہیں کہ ان کو نقل بھی نہیں کیا جا سکتا۔

جریر کے سلسلہ میں یہ قصہ مشہور ہے کہ اس کی ماں نے ایام حمل میں خواب دیکھا کہ اس کے اندر سے ایک رسی نکلی اور لوگوں کے اوپر کودنے لگی اور ایک ایک کا گلا گھونٹنے لگی۔ جب اس نے اپنے خواب کی تعبیر معلوم کی تو بتانے والوں نے بتایا کہ تجھ سے ایک لڑکا پیدا ہوگا جو لوگوں کی ہجو کیا کرے گا اور ان کے لئے ایک آفت کا باعث ہوگا۔ اس لئے لڑکے کا نام جریر رکھا گیا جس کے معنی عربی زبان میں رسی کے ہوتے ہیں۔

دو معاصر شعراء کے درمیان ہجو گوئی کیسے شروع ہوئی۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ جریر جو علیمہ میں پیدا ہوا، طبیعت کے رجحان اور ماحول کے اثر سے شعر و شاعری شروع کر دی۔ اس کو معلوم ہوا کہ بصرہ میں شاعروں کی بڑی قدر ہے۔ وہ وہاں پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ فرزدق اپنی شاعری کی بدولت بہت بلند مقام حاصل کئے ہوئے ہے۔ فرزدق کی خوش حالی اور اس کی قدر و منزلت نے اس کو حیرت میں ڈال دیا۔ اگرچہ وہ علیمی تھے۔ تاہم جریر دل ہی دل میں اس سے حسد کرنے لگا۔ مربد کا بازار جریر اور فرزدق کے فخریہ قصائد اور ہجویہ نظموں کا اکھاڑا بن گیا۔ دونوں ایک دوسرے کی ہجو میں قصائد لکھتے جو "نقائض" کے نام سے مشہور ہوئے۔ تاہم جب عمر کا بالکل آخری حصہ آیا تو دونوں مقابلہ آرائی کو چھوڑ کر عبادت میں مشغول ہو گئے۔

آدمی جب کسی مشغلہ کو اختیار کرتا ہے تو خواہ اس کا محرک جو بھی ہو دھیرے دھیرے وہ اس کی طبیعت بن جاتی ہے اور اس کے اقوال و افعال اسی کے سانچہ میں ڈھل جاتے ہیں۔ جریر اس کی ایک مثال ہے۔

جریر ایک مرتبہ خلیفہ ولید بن عبد الملک کے دربار میں پہنچا۔ وہاں عدی بن رقاع عاملی بیٹھے ہوئے تھے۔ خلیفہ نے جریر سے پوچھا: "ان کو پہچانتے ہو"۔ جریر نے کہا "اے امیر المومنین نہیں"۔ خلیفہ نے بتایا کہ یہ عاملہ خاندان کے فرد ہیں۔ یہ سن کر برجستہ جریر کی زبان سے نکلا "وہی عاملہ جس کے بارہ میں اللہ فرماتا ہے: عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ تَصْلَىٰ نَارًا حَامِيَةً (بہت سے چہرے اس روز خستہ حال ہوں گے، بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے، غاشیہ۔ ۳، ۴)۔ اس کے بعد ایک شعر پڑھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جریر اور عدی کے درمیان دشمنی شروع ہو گئی اور دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف ہجویہ نظمیں لکھیں۔

حقائق غالب آئے

پاکستان کے لیڈروں کا خیال تھا کہ برصغیر کے مغرب میں جب وہ مسلم حکومت قائم کریں گے تو پورا مغربی ایشیا اور خلیج فارس اور بحر احمر کے گرد واقع تمام ممالک جو انھیں کی طرح مذہباً مسلمان ہیں، ان کے ساتھ ہوں گے اور وہ بقیہ بھارت کے مقابلہ میں چھوٹے ہونے کے باوجود اپنے "بھائیوں" سے مل کر بہت بڑی حیثیت حاصل کرلیں گے۔

صدر ایوب کے زمانہ اقتدار (۱۹۶۹—۱۹۵۸) میں یہ امید کسی درجہ میں پوری بھی ہوئی۔ مگر بہت جلد زندگی کے حقائق غالب آگئے۔ مغربی ایشیا کے مسلم ممالک کے یہاں پٹرول کا خزانہ برآمد ہوا۔ اب انھیں ضرورت ہوئی کہ اس دولت کے ذریعہ اپنے ملکوں میں ترقیاتی اسکیمیں چلائیں۔ ان کے پاس روپیہ با فراط تھا، مگر فنی واقفیت (TECHNICAL KNOW HOW) کی اسی قدر کمی تھی۔ یہ دوسری چیز انھیں پاکستان نہیں دے سکتا تھا۔ دوسری طرف ہندستان پچھلے سو برس کی کوششوں کے نتیجہ میں اپنے کو اس قابل بنا چکا تھا کہ وہ مسلم ملکوں کی اس ضرورت کو پورا کرسکے۔ چنانچہ ہندستان کے ماہرین کو آج مسلم ممالک میں زبردست استقبال مل رہا ہے اور پاکستان پس پشت چلا گیا ہے۔

اخباری شہنشاہ

یونسکو نے ۲۰۰ قوموں کے ماس میڈیا کے بارہ میں ایک سروے شائع کیا ہے۔ سروے کے مطابق اگرچہ موجودہ زمانہ میں نشر و اشاعت کے ذرائع ترقی کرکے سٹلائٹ کمیونی کیشن کے دور میں پہنچ گئے ہیں۔ مگر عملاً جو صورت حال ہے وہ یہ کہ عملی اعتبار سے چند ترقی یافتہ قومیں ہی دوسری تمام قوموں کے لئے خبر حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ سروے میں بتایا گیا ہے کہ اگرچہ ۹۰ ملکوں میں قومی نیوز ایجنسیاں ہیں مگر یہ ممالک بھی اپنی ملکی خبروں کو دوسری اقوام تک پہنچانے کے لئے پانچ عالمی نیوز ایجنسیوں کے محتاج ہیں۔ یہ چار عالمی نیوز ایجنسیاں کسی ملک کی جن خبروں کو دوسری اقوام تک پہنچاتی ہیں، وہ عام طور پر اس قوم کے برے پہلو اور ان کی غیر نمائندہ خصوصیات ہی ہوتی ہیں —— گویا پانچ نیوز ایجنسیاں تمام اخباری دنیا کی شہنشاہ ہیں۔

انسان اور کچھوا

ہندستان میں سب سے پہلا چڑیا گھر ۱۸۷۵ میں قائم ہوا۔ یہ کلکتہ کے قریب علی پور میں ہے۔ اس کو لوئی شیویڈلر نے قائم کیا تھا۔ ۱۸۷۵ میں یہاں ایک کچھوا تھا جس کی عمر اس وقت ۵۰ سال تھی۔ یہ کچھوا آج بھی علی پور زو میں موجود ہے اور اب اس کی عمر ۱۵۰ سال ہوچکی ہے۔ ایک اخباری تصویر (ایوننگ نیوز ۲۹ ستمبر ۱۹۷۵) میں ایک لڑکے کو کچھوے کے اوپر بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے۔ انسان کچھوے کی طرح ۱۵۰ سال تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ مگر انسان کا ایک بچہ کچھوے کی پیٹھ پر سوار ہوسکتا ہے۔

آسٹریلیا

آسٹریلیا کے سیاہ فام قدیم باشندے تقریباً ۲۵ ہزار سال پہلے اس براعظم میں آئے تھے۔ علم الانسان کے ماہرین کا خیال ہے کہ یہ لوگ پیدل چل کر یہاں پہنچے تھے جب کہ آسٹریلیا، نیوگنی اور ایشیا سے ملا ہوا تھا۔ اس کے بعد آسٹریلیا کٹ کر دور چلا گیا۔ یہ قدیم باشندے اب بھی ۱۴۰۰۰۰ کی تعداد میں موجود ہیں۔ یعنی کل آبادی (۱۳۲۶۸۶۰۰) کا ایک فی صد حصہ۔

آسٹریلیا کا رقبہ ہندستان کے مقابلہ میں دگنا سے بھی زیادہ ہے۔ مگر اس کی آبادی بمبئی اور کلکتہ کی مجموعی آبادی سے بھی کم ہے۔ ۱۸۰۰ میں جب برطانیہ کے کچھ مجرموں کو بطور سزا اس مقام پر لاکر ڈالا گیا جہاں آج سڈنی ہے، تو اس وقت یہاں کھانے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ مایوسی اور جھنجلاہٹ میں یہ لوگ آپس میں لڑ لڑ کر مرنے لگے۔ مگر آج آسٹریلیا ایک مکمل طور پر خود کفیل براعظم ہے۔ وہ ۴۰۰ کروڑ روپے کا گیہوں ہر سال برآمد کرتا ہے اور دنیا کی اون کی کل پیداوار کا چوتھائی سے بھی زیادہ حصہ یہاں پیدا ہوتا ہے۔ قدرتی مناظر سے بھرپور اس ملک کے باشندوں کا معیار زندگی دنیا کے انتہائی چند ترقی یافتہ ملکوں میں سے ایک ہے۔

ایک انسانی کمزوری

لارڈ ریتھ (۱۹۷۱-۱۸۹۰) بی بی سی لندن کے "فادر" کہے جاتے ہیں۔ وہ حیرت انگیز شخصیت کے مالک تھے۔ اور انھوں نے برطانی عوام کے اندر غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔

۵۲۵ صفحات پر مشتمل ان کی ذاتی ڈائری THE REITH DIARIES شائع ہوئی ہے۔ ڈائری میں حیرت انگیز طور پر وہ ہٹلر (۱۹۴۵-۱۸۸۹) کے لئے شاندار کارکردگی (MAGNIFICIENT EFFICIENCY) کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس کے برعکس خود اپنے ملک کے لارڈ ونسٹن چرچل (۱۸۷۴-) کے لئے ان کے پاس مکار (IMPOSTER) اور خبطی (LUNATIC) کے الفاظ ہیں۔

اس فرق کی وجہ ہم کو خود ان کے اعتراف میں مل جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں ایک انتہائی قسم کا خود پسند (SELF-CENTERED) آدمی ہوں۔ بہت کم ایسا ہوسکتا ہے کہ میں کسی دوسرے کے اندر خوبی کا اعتراف کروں:

I WII RARELY ADMIT
GREATNESS IN OTHERS

لارڈ چرچل نے برطانیہ کی وزارت عظمیٰ کا مقام حاصل کر لیا۔ یہ وہ عہدہ ہے جس کے لئے لارڈ ریتھ اپنے آپ کو سب سے زیادہ موزوں سمجھتے تھے۔ چرچل کا تصور آتے ہی ان کے اندر حریفانہ نفسیات کام کرنے لگتی تھی جبکہ ہٹلر ان کے لئے ایک غیر متعلق شخص تھا، ہٹلر کا نام ان کے اندر معاصرانہ نفسیات پیدا نہیں کرتا تھا ـــــ یہ تھی سادہ سی وجہ مذکورہ بالا فرق کی۔

میں سوچ رہا ہوں

راجہ راؤ ایک میسوری برہمن ہیں اور ہندستان کے مشہور فلسفی ہیں۔ ہندستان میں اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد ۱۹۲۹ میں وہ مزید مطالعہ کے لئے پیرس گئے۔ اور ۱۹۵۰ میں پہلی بار امریکہ کا سفر کیا۔ ۱۹۷۳ میں امریکہ کی ٹیکسس یونیورسٹی میں ان کو فلسفہ کے مہمان پروفیسر کی حیثیت سے بلایا گیا۔ اس قیام کے دوران ایک امریکی مصنفہ الزبتھ ووڈ نے ان سے مفصل انٹرویو لیا۔ الزبتھ ووڈ دوبار ہندستان آچکی ہیں۔ انٹرویو کا ایک فقرہ یہ ہے:

راؤ اپنی ذہنی زندگی کی حفاظت کرنے میں بڑے مستعد ہیں۔ وہ بغیر کسی احساس ندامت کے محض اس بنا پر کسی ملاقاتی سے ملنے سے انکار کرسکتے ہیں کہ وہ "سوچ" رہے ہیں۔

اس میں ہم صرف اتنا اضافہ کریں گے کہ یہ کہنے کے لئے بھی امریکہ کی سرزمین چاہئے۔ ہندستان میں اگر کوئی ایسا کہے تو اس کو پاگل کا خطاب ملے گا یا مغرور کا۔

کامیابی کا راز یہ ہے کہ آدمی اپنی ناکامی سے سبق لے

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے

مسلم عہد کا علمی و تصنیفی کام

مسلم عہد کے علماء زیادہ تر بیرونی علماء کی تفسیروں سے خوشہ چینی کرتے رہے اور ان کے ہم پایہ تفسیریں نہ لکھ سکے اور جو لکھیں وہ عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے خواص تک محدود رہیں۔ یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ اگرچہ مسلمانوں کی زبان فارسی رہی، مگر اس زبان میں کلام پاک کا ترجمہ مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے کے تقریباً ساڑھے پانچ سو برس بعد شاہ ولی اللہ نے پہلی دفعہ کیا، اور جب انھوں نے اس دولت کو عام کیا تو کم سواد علماء نے اس کے خلاف شورشیں برپا کیں۔

ہندستان کے علماء کا سب سے محبوب موضوع فقہ رہا ہے، اور جو علماء باہر سے یہاں آئے وہ مفسر اور محدث ہونے کے بجائے زیادہ تر فقیہ رہے، ان کو سلاطین اور امراء کا تقرب آسانی سے حاصل ہو جاتا تھا، کیونکہ وہ مسائل میں انہی کی طرف رجوع کرتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستان میں اسلام زیادہ تر فقہا کے ذریعہ سمجھا گیا جو عموماً اپنی سختی اور درشتی کے لیے مشہور ہیں۔ اسی لیے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ہندستان میں اسلام مفسرین اور محدثین کے ذریعہ سمجھا جاتا تو زیادہ موثر ہوتا، فقہ کی اس مقبولیت کے باوجود اہل قلم فقہا زیادہ تر فقہ کی بیرونی کتابوں کے حواشی لکھتے رہے۔ فتاویٰ تاتارخانی اور فتاوائے عالمگیری ہندستان کے بڑے اہم فقہی کارنامے ہیں، ان دونوں کی تدوین ایک امیر اور ایک بادشاہ کے ذریعہ ہی سے ہوئی۔

انھیں کام کے بہترین مواقع حاصل تھے، مگر

ہندستان میں ہر قسم کی علم پرستی کے باوجود کوئی امام غزالی، یا ابن تیمیہ، یا ابن مسکویہ، یا ابن خلدون پیدا نہ ہو سکا، حالانکہ جہاں تک بادشاہوں کا تعلق ہے، ان میں بہت سے ایسے گزرے ہیں جو دنیا کے بڑے سے بڑے حکمرانوں کی صف میں رکھے جا سکتے ہیں۔ مغل بادشاہوں کی حکومت اپنے عروج کے زمانے میں دنیا کی طاقتور ترین اور متمدن ترین حکومت سمجھی جاتی تھی۔ اگر ہندستان کے علماء بھی اسی درجہ کے اور اسلامی ممالک کے علماء کے ہم پایہ ہوتے تو ہندستان کے مسلمانوں کی دینی، ذہنی، نظری اور فکری نشوونما اور نہج پر ہوتی۔ جب یورپ میں محققین ہر قسم کے علوم و فنون پر کتابیں لکھ کر نئے نظام حیات اور نئے مقصد زندگی کے لیے اپنی اپنی قوموں کو تیار کر رہے تھے۔ اس وقت ہندستان کے علماء صرف ایسی کتابیں لکھتے رہے جن سے عام مسلمان زیادہ مستفیض نہیں ہو سکے، اور پھر یہ عجیب بات رہی کہ مذہبی زبان عربی تھی، سلاطین اور امراء کی زبان ترکی یا فارسی تھی اور عوام خصوصاً ہندی الاصل مسلمان یہاں کے باشندوں کے میل جول سے ایک نئی زبان بولنے کے عادی ہو رہے تھے۔ علماء یا تو عربی یا فارسی زبان میں تصنیف و تالیف کرتے جس کی زبان اتنی مشکل ہوتی کہ وہ جو کچھ لکھتے خواص ہی تک محدود رہ جاتا، اور پھر ان میں بھی جو چیز ہوتی وہ صرف تقلید جامد،

زلزلہ

۱۹۶۷ء میں کوئنا کے مقام پر جو زلزلہ آیا تھا اس کے نتیجہ میں وہاں کے بجلی گھر کو اس قدر نقصان پہنچا کہ پانچ ماہ تک بجلی نہ رہی اور تقریباً ایک کروڑ روپے کی صنعتی پیداوار کا نقصان ہوا۔ دیگر نقصانات اس کے علاوہ تھے۔

یہ نسبتاً ایک معمولی زلزلے کا نقصان تھا اس سے کہیں زیادہ بڑے زلزلے دنیا کے مختلف مقامات پر آتے رہتے ہیں اور انسانی تمدن کو اس طرح تہس نہس کر دیتے ہیں گویا قدرت کی نظر میں ان کی کوئی قیمت نہیں

زلزلے کو روکنا انسان کے بس سے باہر ہے۔ تاہم سائنس داں اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اس کا وقت اور مقام پہلے سے معلوم کر لیں تاکہ جان و مال کے نقصان سے بچنے کی تدبیر کی جا سکے۔ اس مقصد کے لئے زلزلہ کی ایک انجینئرنگ وجود میں آ چکی ہے۔ مگر ابھی تک اس میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہو سکی۔ زیادہ سے زیادہ جو ہو سکا ہے، وہ یہ کہ سائنس دانوں نے مستقبل میں آنے والے زلزلوں کے امکانی مراکز کسی حد تک معلوم کر لئے ہیں۔ اس طرح یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ان مقامات پر جو عمارتیں وغیرہ بنیں، ان کو اس انداز سے بنایا جائے کہ زلزلے کے معمولی جھٹکوں سے انہیں نقصان نہ پہنچے

زلزلے کی مدت عام طور پر پانچ دس سیکنڈ ہوتی ہے اور اس تھوڑی سی مدت میں اگر لوگ نہ بچ نکلیں تو ٹھیک ہے نہیں تو لاکھوں افراد ہلاک اور بے گھر ہو جاتے ہیں روس اور امریکہ و جاپان میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ زلزلے کا وقت اور مقام پہلے سے معلوم کر لیا جائے۔ اس سلسلے میں زلزلے کی علامتوں کا مطالعہ کیا گیا ہے مگر کوئی ایک علامت ایسی نہیں جس کی مدد سے ہر بار زلزلے کی پیشین گوئی کی جا سکے۔ زلزلہ قدرت کا ایک ناقابل پیشین گوئی حادثہ ہے، آج بھی اور پہلے بھی۔ ▶

موت کے خوف نے ان سے زندگی کی راحتیں چھین لیں



۲۸ جولائی ۱۹۷۶ء کو شمال مشرقی چین میں زلزلہ آیا۔ چین کا تیسرا سب سے بڑا صنعتی شہر تنگشان جس کی آبادی دس لاکھ تھی، کھنڈر میں تبدیل ہو گیا۔ زلزلہ اتنا شدید تھا کہ اس کے جھٹکے جاپان اور کوریا تک محسوس کئے گئے۔

چین کی راجدھانی پیکنگ زلزلہ زدہ شہر سے تقریباً ۲۰۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ تاہم لوگوں کے خوف و ہراس کا عالم یہ تھا کہ پیکنگ کی ۶۰ لاکھ آبادی نے ممکنہ موت کے ڈر سے اپنے مکانات چھوڑ دیئے اور کئی راتیں سڑکوں اور پارکوں میں گزاریں جبکہ ان کے سروں پر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔

ایک مسئلہ

ابن ماجہ اور ترمذی کی روایت ہے — لا نکاح الا بولی (ولی کے بغیر کوئی نکاح نہیں) اس حدیث سے بعض فقہا نے استدلال کیا ہے کہ عورت کے نکاح کے لئے ولی کی اجازت لازماً ضروری ہے۔ اس کی تائید میں قرآن کی ایک آیت بھی پیش کی جاتی ہے:

فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ

عورتوں کو اپنے شوہروں سے نکاح کرنے سے ہرگز نہ روکو، اگر وہ آپس میں نیکی کے ساتھ راضی ہو چکے ہیں

کہا جاتا ہے کہ اس آیت کا سبب نزول یہ ہے کہ معقل بن یسار رض صحابی کی بہن کو ان کے شوہر نے طلاق رجعی دی تھی۔ مگر عدت کے زمانہ میں شوہر دوبارہ ان کو اپنی زوجیت میں لانا چاہتا تھا۔ وہ خاتون بھی یہی چاہتی تھیں۔ مگر ان کے بھائی دوبارہ ان کو نکاح کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اولیاء کو عورت کی مرضی کے خلاف نہ کرنا چاہئے۔

امام شافعی اس آیت کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر ولی کو روکنے کا حق نہ ہوتا تو معقل بن یسار کیوں انہیں روکتے اور کیونکر روک سکتے تھے۔ معلوم ہوا کہ ولی کو روکنے کا حق حاصل ہے۔

مفتی محمد عبدہ اس استدلال پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اس آیت سے تو اس کے برعکس یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت کی مرضی کے خلاف مرد کو روکنے کا حق نہیں ہے۔ اس واقعہ کی اصلیت یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں مردوں کو عورتوں پر جو ظالمانہ حقوق حاصل تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ جن میں سے چاہتے تھے ان کا نکاح کر دیتے تھے اور جس سے چاہتے تھے نہیں کرتے تھے۔ حضرت معقل بن یسار نے اسی رواج کے مطابق اپنی بہن کی شادی کو روکنا چاہا۔ مگر قرآن نے اس آیت کے ذریعہ اس رواج کو توڑ کر عورتوں کو یہ اختیار دیا کہ اپنی مرضی کے مطابق شادی کریں۔

جہاں تک حدیث کا تعلق ہے، وہ اگرچہ سنداً زیادہ قوی نہیں۔ تاہم اس سے قطع نظر اس سے ایک معنی یہ مراد لیا جا سکتا ہے کہ "نہیں ہے کوئی نکاح مگر بذریعہ ولی کے" یعنی عورتوں کا نکاح باعتبار مقررہ طریق عمل، ولی کے ذریعہ منعقد ہونا چاہئے۔ اس سے لازماً یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ولی کی رضامندی یا اجازت بذات خود ضروری ہے۔ ولی، نکاح کے عمل میں، وکیل یا ایجنٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور وکیل یا ایجنٹ کی ضرورت اس لئے ہے کہ عورتیں مجمع عام میں مردوں کے سامنے اپنی زبان سے رضامندی کے کلمات ادا کرتے ہوئے عموماً شرم محسوس کرتی ہیں۔ اس لئے یہ مناسب معلوم ہوا کہ ان کی طرف سے کوئی رشتہ دار یا خاندان کا بزرگ ان کی ترجمانی کرے۔ تاہم اگر کوئی لڑکی ولی کی وساطت اور اجازت کے بغیر خود اپنا نکاح کرے اور خود رضامندی کے کلمات کہہ دے تو شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں۔

[illegible]

سیاست کے لئے جوش وخروش
دعوت کے لئے سرد مہری

ضیاء الدین احمد برنی، مولانا محمد علی جوہر کے رفیق خاص تھے۔ وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

" جنگ طرابلس اور جنگ بلقان نے مولانا محمد علی جوہر کو بہت پریشان رکھا۔ وہ ترکوں کی پے در پے ہزیمتوں سے بے حد مغموم تھے۔ انھوں نے ان کے مصائب کو ہلکا کرنے کی غرض سے ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں طبی مشن روانہ کیا۔ پہلی جنگ بلقان (۱۹۱۸) کے بعد جب فاتحین میں تقسیم غنیمت پر جھگڑا ہوا، اور دوسری جنگ بلقان برپا ہوئی تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ترکوں نے ایڈریانوپل پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس وقت عالم اسلام میں غیر معمولی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ خبر جب رائٹر کے ذریعہ دہلی پہنچی تو اس وقت رات بہت زیادہ گزر چکی تھی مگر مولانا کی ترک دوستی کا اندازہ کیجئے کہ انھوں نے اس کا انتظار نہیں کیا کہ یہ خبر دوسری صبح کو اخبارات کے ذریعے لوگوں تک پہنچے۔ چند رفقاء کار کو لے کر سیدھے جامع مسجد پہنچے اور راستے بھر چلا چلا کر مسلمانوں کو یہ روح افزا خبر پہنچاتے رہے۔ سنا وقت ہونے کے باوجود جامع مسجد میں ہزارہا آدمیوں کا اجتماع ہو گیا۔ مولانا نے وہاں ولولہ انگیز تقریر کر کے اس خبر کی اہمیت کو واضح کیا۔ وہ رات بھی کیسی ہیجان انگیز تھی۔"

مولانا محمد علی (۱۹۶۲) مرتبہ سید نظر برنی صفحہ ۹۵

ہماری جدید تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے جو بتاتے ہیں کہ سیاسی اور جذباتی امور کے لیے مسلمانوں میں کس قدر جوش وخروش پیدا ہو گیا تھا۔ مگر خدا کے دین کو خدا کے بندوں تک پہنچانے کے لیے ان میں کوئی تڑپ پیدا نہیں ہوئی۔ "رائٹر" کی سیاسی خبریں انھیں بے چین کر دیتی تھیں۔ مگر قرآن کی اخروی خبروں نے انھیں بے قرار نہیں کیا کہ اس کے لیے وہ اپنے گھروں سے نکل پڑتے اور ساری قوموں کو بتاتے کہ اے لوگو تم مرنے والے ہو اور مرنے کے بعد تم کو خدا کے یہاں اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔

موجودہ زمانے میں بے شمار قربانیوں کے باوجود مسلمانوں کی بربادی کی واحد وجہ یہی ہے کہ انھوں نے پیغام بری کا وہ کام نہ کیا جو خدا نے ان کے اوپر فرض کیا تھا اور ظاہر ہے کہ جو خادم اپنی اصل ڈیوٹی سے ہٹ جائے وہ خواہ کسی اور کام میں کتنی ہی بہادری دکھائے، بہرحال وہ سزا کا مستحق ہوگا نہ کہ انعام کا۔

رسول اللہ نے فرمایا

انکم ستختلفون من بعدی۔ فما جاءکم عنی فاعرضوہ علی کتاب اللہ، فما وافقہ فمنی وما خالفہ فلیس منی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے بعد تم لوگ اختلافات میں پڑ جاؤ گے۔ پس میری جو بات تمہیں پہنچے اس کو خدا کی کتاب کی روشنی میں دیکھنا جو اس کے مطابق ہو وہ میری طرف سے ہے جو اس کے خلاف ہو وہ میری طرف سے نہیں

یہ کوئی مسئلہ نہیں

کہا جاتا ہے کہ جدید تہذیب نے مذہب کو
سودہ اور غیر ضروری ثابت کر دیا ہے۔

وہ کیا چیز ہے جو مغربی تہذیب نے انسانیت کو دی
ہے۔ وہ ہیں جدید طرز کی سواریاں، نئے طرز کے مکانات،
نئے قسم کے ذرائع مواصلات، نئے قسم کے لباس، مختصر
یہ کہ دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے نئے ساز و سامان
جو پچھلے سامانوں کے مقابلے میں زیادہ آرام دہ، زیادہ
خوشنما اور زیادہ سریع العمل ہیں۔ سوال یہ ہے
کہ ان سامانوں اور اسباب و ذرائع کا خدا اور مذہب
پر عقیدہ رکھنے یا نہ رکھنے کے مسئلہ سے کیا تعلق۔

کیا کسی کے پاس جدید طرز کی رہائش گاہ اور
موٹر کار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے لئے خدا کا
وجود بے معنی ہو گیا۔ کیا تار اور ٹیلی فون کے ذریعہ
خبر رسانی سے وحی و الہام کے عقیدے کی تردید ہو جاتی
ہے۔ کیا ہوائی جہاز اور راکٹ کے ذریعہ فضا میں اڑنے
کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کا اس کائنات میں کہیں وجود
نہیں ہے۔ کیا لذیذ کھانے، خوشنما لباس اور راحت
کے وجود میں آنے کے بعد جنت و دوزخ کو ماننے
کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ کیا جدید عورتوں کے اندر
صلاحیت کہ وہ ٹائپ رائٹر کی بورڈ پر اپنی انگلیاں
چلا سکتی ہیں، یہ ثابت کرتا ہے کہ اَلرِّجَالُ
قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ کی آیت منسوخ ہو گئی۔ کیا اسمبلی
اور پارلیمنٹ کی شاندار عمارتوں میں بیٹھ کر کچھ لوگوں کا
قانون سازی کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ شریعت کا قانون
موجودہ زمانے میں بے معنی ہو گیا ہے۔

نئے ساز و سامان اور نئے ذرائع و وسائل کی اہمیت و
افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ
ان کا مذہب کی صداقتوں کی تائید یا تردید سے کیا تعلق ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جدید تہذیب کے لوازم کا مذہب
سے ٹکراؤ باعتبار حقیقت نہیں ہے بلکہ انسان کی سطحیت
نے اس کو پیدا کیا ہے۔ انسان کی سب سے بڑی کمزوری سطحی
چیزوں سے لگاؤ اور ظاہری اشیاء کو اصل اہمیت کی چیز
سمجھ لینا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب فطرت کے چھپے ہوئے
راز سامنے آئے، اور عیش و عشرت اور زیبائش و آرائش
کے سامان حاصل ہونے لگے تو انسان ان میں اتنا محو ہوا کہ
سمجھنے لگا کہ بس اب اس کے آگے کوئی حقیقت نہیں ہے۔
دنیوی ساز و سامان کے سوا ہر چیز اس کی نظر میں غیر اہم
ہو گئی۔

ایک اقتباس

شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۰۳-۱۷۶۲) نے
حجۃ اللہ البالغہ (باب الخلق) میں لکھا ہے:

فیری الانسان اظرف ما یکون واعقلہ و
لیس فی قلبہ مثقال ذرۃ من الامانۃ لا
بالنسبۃ الی دین اللہ ولا بالنسبۃ الی معاملات
الناس (آدمی بعض اوقات بڑا عالی ظرف اور عقلمند
دکھائی دیتا ہے۔ مگر اس کے دل میں امانت
کا ایک ادنیٰ جزو بھی نہیں ہوتا۔ نہ تو دین الٰہی
کے اعتبار سے اور نہ لوگوں کے باہمی معاملات
کے اعتبار سے۔

کوڑا بھی بیکار نہیں

ہر شہر میں صبح کو یہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ میونسپلٹی کے ملازمین شہر کا تمام کوڑا اکٹھا کرتے ہیں اور گاڑیوں میں لاد کر اس کو باہر پھینک آتے ہیں۔ گھریلو گندگی، صنعتی ٹوٹ پھوٹ، استعمال شدہ چیزیں، کاغذ، دھات اور پلاسٹک وغیرہ کے ٹکڑے ہماری زبان میں صرف کوڑا ہیں۔ عام تصور کے مطابق ان کا واحد مصرف یہ ہے کہ انھیں جمع کر کے کسی گڈھے میں دفن کر دیا جائے۔

مگر مغربی دانشوروں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اس کوڑے کرکٹ کے اندر ایک عظیم طاقت چھپی ہوئی ہے اور وہ ان کی وہ حرارت ہے جس کی مجموعی مقدار ۲۱ سے ۳۰، ۸۰ برٹش تھرمل یونٹ (B.T.U) فی گھنٹہ ہوتی ہے۔

اس دریافت نے یکایک کوڑے کرکٹ کو وہ مقام دے دیا جو کوئلہ اور پٹرول کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد یورپ میں ایک نئی ٹیکنک وجود میں آئی جس کو گاربیج بوائلر (GARBAGE BOILER) کہتے ہیں۔ یورپ کے بہت سے شہروں میں اس اسکیم کے تحت خاص طرح کے بوائلر اور بھٹیاں تیار کی گئی ہیں شہر کا تمام گھریلو اور صنعتی کوڑا حتی کہ ٹوٹے ہوئے فرنیچر اور سائیکل تک وہاں لاکر ڈال دیئے جاتے ہیں۔ یہ گندگی اور سڑی ہوئی چیزیں بوائلر کی بھٹی میں جلائی جاتی ہیں اس سے حرارت پیدا ہوتی ہے جو اسٹیم بناتی ہے اور اسٹیم سے الکٹرک جنریٹر کو حرکت دے کر بجلی پیدا کی جاتی ہے اس طرح کوڑے کرکٹ کو بالآخر بجلی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے جو دورِ جدید کی سب سے بڑی قوت ہے، جو موجودہ زمانے میں پورے انسانی تمدن کو متحرک کئے ہوئے ہے۔

کوڑا عام حالات میں صرف کوڑا ہے مگر جب اس پر دانش مندی اور محنت کا اضافہ کیا جائے تو وہ بجلی کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس سے زیادہ طاقت ور کوئی چیز اس دنیا میں نہیں۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اتنے بے پناہ امکانات رکھے ہیں کہ یہاں کوڑا بھی بیکار نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اگر کوئی قوم اتنی پستی میں پہنچا دی جائے کہ لوگ اسے "انسانی کوڑا" سمجھنے لگیں جب بھی خدا کی اس کائنات میں اس کے لئے مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔ وہ کوڑے خانے سے نکل کر انتہائی بلند مقام پر پہنچ سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے اندرونی امکانات کو بروئے کار لانے کے لئے محنت اور دانش مندی کا وہ عمل کرے جو گاربیج بوائلر کی شکل میں نظر آتا ہے

قرآن کے بارے میں

"میں نے قرآن کا مطالعہ کیا مجھے اس کی سب سے بڑی خوبی یہ نظر آئی کہ یہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔" (گاندھی)

"وہ وقت دور نہیں جب کہ قرآن اپنی ناقابلِ انکار صداقت اور روحانیت کے ذریعہ سب مذاہب کو اپنے اندر جذب کر لے گا" (...)

"میں نے توریت، انجیل اور وید سب پڑھے مگر قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جو سب سے زیادہ اعلیٰ و ارفع ثابت ہوئی۔" (گوسٹاؤلی ...)

طاقت کا خزانہ آپکے اندر ہے

نیپولین کا نام فوجی تاریخ میں عظمت کا نشان ہے۔ مگر وہ ایک پست قد آدمی تھا اگرچہ فربہ اندام تھا۔ ایک دن وہ پہنڈ گرا کنشش معمولی لباس میں کھڑا تھا اتنے میں اس کا ایک فوجی پیچھے سے آیا اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ کوئی معمولی سپاہی ہے، نیپولین کے اوپر سے پھلانگ کر گیا۔ اس کے بعد وہ فخریہ انداز میں پلٹا اور کھڑے والے شخص کے سامنے سے اس کے چہرہ پر نظر ڈالی تو وہ نیپولین تھا جو سنجیدگی کے ساتھ اپنے فوجی کی طرف دیکھ رہا تھا فوجی نے جب اچانک اپنے عظیم کمانڈر نیپولین کو دیکھا تو وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور فوراً مر گیا۔

معلوم ہوا کہ طاقت کا اصل سرچشمہ خود آدمی کا اپنا احساس ہے۔ وہی نیپولین ہے اور وہی فوجی۔ مگر ایک بار وہ نیپولین کے سر سے فخریہ انداز میں پھاند جاتا ہے اور دوسری بار اس کو دیکھتے ہی بدحواس ہوتا ہے کہ فوراً مر جاتا ہے۔

یہ دونوں احساس کے کرشمے ہیں اگر آپ کا دل بے خوف ہے تو آپ شیر سے لڑ سکتے ہیں اور دریاؤں کو پھلانگ سکتے ہیں۔ لیکن اگر دل میں شبہ اور دہشت پڑا ہوا تو گیدڑ کا غول بھی آپ کو بوکھلا دے گا اور معمولی نہریں بھی آپ کو ڈبانے کے لیے کافی ہوں گی۔

اوپر ہم نے نیپولین کے فوجی کی جو مثال پیش کی ہے، وہ اس صورت حال سے متعلق تھی کہ ایک طاقتور شخص کس طرح دل کی گھبراہٹ کی وجہ سے اپنی موجودہ طاقت بھی کھو بیٹھتا ہے۔ اب ایک ایسی مثال لیجیے جبکہ ایک کمزور اور شکست خوردہ آدمی محض دل کی کیفیت بدل جانے کی وجہ سے دوبارہ فتح و کامیابی کا مالک بن جاتا ہے۔

اسکاٹ لینڈ کے رابرٹ بروس (ROBERT BRUCE) نے انگلینڈ کے بادشاہ کنگ ایڈورڈ اوّل کے خلاف بغاوت کر دی تھی جو کہ اسکاٹ لینڈ کے اوپر اقتدار اعلیٰ کا دعویدار تھا اس کو ۱۳۰۶ء میں کنگ آف اسکاٹ لینڈ کا تاج پہنایا گیا۔

اس مقابلہ میں رابرٹ بروس کو بری طرح شکست ہوئی اور اس کو جنگلوں اور بیابانوں میں پناہ لینا پڑی۔ مگر ۱۳۱۴ء میں اس نے دوبارہ انگلینڈ کے بادشاہ ایڈورڈ دوم سے بناک برن میں جنگ کی اور اس کو شکست دی۔ اور اسکاٹ لینڈ کو انگریزوں سے آزاد کرا لیا۔ اس کے بعد رابرٹ اوّل کے نام سے اس نے ۱۳۲۹ء تک اسکاٹ لینڈ پر حکومت کی۔

رابرٹ بروس کو شکست کے بعد فتح کس طرح حاصل ہوئی اس کے سلسلے میں ایک دلچسپ قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ وہ ایک جنگل کے اندر کسی غار میں پڑا ہوا تھا۔ "مجھے اب انگلینڈ کے بادشاہ سے مقابلہ کا خیال چھوڑ دینا چاہیے" اس نے سوچا۔ اس کو اپنی کامیابی کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ کئی بار کے مقابلہ کے بعد بالآخر وہ مایوس ہو چکا تھا۔

اتنے میں غار کے اندر ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا۔ ایک مکڑی اپنے جالے کے باریک تار سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔ رابرٹ بروس کی نظریں اس کے اوپر جم گئیں۔ اس نے دیکھا کہ مکڑی نے اپنا ایک منٹ ضائع نہیں کیا۔ اور لٹکتے ہوئے تار کے ذریعے دوبارہ اوپر چڑھنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ مگر چھت کے قریب پہنچتے ہی وہ دوبارہ پھسل کر گر پڑی۔ اب وہ پھر پہلے کی طرح زمین پر پڑی ہوئی تھی اس طرح وہ بار بار چڑھتی اور بار بار گرتی رہی۔ مگر وہ

ہمت نہیں ہاری اور پھر بار دوبارہ اسی کام میں مشغول ہوجاتی جس میں وہ اس سے پہلے ناکام ہو چکی تھی۔

رابرٹ بروس اس کے ناکام تجربات کو گنتا رہا۔ یہاں تک کہ جب وہ نویں بار زمین پر گری تو اس کو ہنسی آگئی۔ "اب یہ کیڑا مزید کوشش کی حماقت نہیں کرے گا" اس نے کہا۔ مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ مکڑی نے ایک لمحہ ٹھہرے بغیر دسویں بار پھر اپنی جدوجہد شروع کردی۔

اس بار رابرٹ بروس کے سامنے دوسرا منظر تھا اس نے دیکھا کہ مکڑی منزل سے بہت قریب پہنچ گئی ہے وہ دھیرے دھیرے چڑھتی رہی یہاں تک کہ جب فاصلہ بہت قریب آگیا تو اس نے آخری چھلانگ لگائی اب وہ اپنے جالدار مکان کے اندر تھی۔

"خوب" رابرٹ بروس چلایا "وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو ہمت نہ ہاریں اور مسلسل اپنی جدوجہد جاری رکھیں" وہ ایک لمحہ کے لیے رکا اور پھر بولا "ایک معمولی کیڑے نے مسلسل کوشش سے اپنی بازی جیت لی۔ پھر میں کیوں ایسا نہیں کرسکتا۔"

رابرٹ بروس غار سے نکل کر باہر آیا۔ اس نے آخری فیصلہ کن مقابلہ کے لیے تیاری شروع کردی۔ وہ نئے عزم کے ساتھ شاہ انگلینڈ سے لڑا اور اس بار اس نے فتح حاصل کرلی۔

حقیقت یہ ہے کہ "میں ایسا نہیں کرسکتا" محض ایک بزدلانہ فقرہ ہے ہر شخص ہر کام کرسکتا ہے اور شکست دوبارہ نئی فتح میں تبدیل ہوسکتی ہے۔ بشرطیکہ مسلسل جدوجہد کرنے کا حوصلہ پیدا ہوجائے۔ ❋

سیب کا عرق

ایک ٹن سیب سے کتنا عرق نکالا جاسکتا ہے۔ کوئی بھی پھلوں کا ماہر آپ کو بتائے گا کہ ۶۰۰ سے ۷۵۰ کلوگرام تک۔ مگر سیب میں حقیقتاً اس سے بہت زیادہ عرق ہوتا ہے۔ محققین نے دریافت کیا ہے کہ موجودہ ذرائع کے تحت جب ہم سیب کو مکمل طور پر نچوڑ چکے ہوتے ہیں، اس کے بعد بھی اس کے اندر ایک ٹن میں ۱۰۰ سے ۱۲۰ کلوگرام تک عرق باقی رہتا ہے۔

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے کولھو اچھے نہیں ہیں۔ نہیں۔ اگر ہم سب سے طاقتور برقی کولھو استعمال کریں جب بھی عرق کی مقدار میں بس برائے نام ہی فرق آئے گا۔ سیب کے اندر بچا ہوا عرق پھر بھی نہیں حاصل نہ ہوسکے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیب کے خلیوں کا چھلکا بے انتہا دباؤ کے تحت بھی ویسے کا ویسا ہی رہتا ہے۔ اور کولھو میں پس جانے کے باوجود اس کا عرق خلیوں کے اندر محفوظ رہتا ہے موجودہ حالت میں دباؤ اور طاقت کا اضافہ اس مسئلہ کو حل نہیں کرتا۔

یہ سیب کا قصہ ہے مگر اسی کے اندر آپ قوموں کی تصویر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ایک قوم وہ ہوتی ہے کہ اگر وہ کسی دباؤ کی زد میں آجائے تو آخری حد تک نچڑ کر رہ جاتی ہے۔ مگر زندہ قوموں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اگر وہ ظلم وستم کے کولھو میں پیل دی جائیں جب بھی۔ سیب کی طرح، ان کے اندر زندگی کی رمق باقی رہتی ہے اور موقع پاتے ہی وہ دوبارہ اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔

زیر نظر کتاب (لیٹ گاڈ بی ٹرو) عیسائیوں کی ایک عالمی تنظیم کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔ اس کا نام "خدا سچا ٹھہرے" نئے عہدنامہ کے باب "رومیوں کے نام خط" (۳:۴) سے لیا گیا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۶ میں ایک کروڑ تین ہزار کی تعداد میں چھاپا گیا۔ ہمارے پیش نظر دوسرا ایڈیشن ہے جو ۱۹۵۲ میں ۲۵ لاکھ کی تعداد میں چھپا تھا۔

"مقدس تثلیث" عیسائی مذہب کا مرکزی اور بنیادی عقیدہ ہے۔ کروروں لوگ اس کو سب سے بڑی صداقت سمجھتے ہیں۔ اس عقیدہ کا مطلب یہ ہے کہ باپ، بیٹا، روح القدس تینوں یکساں طور پر خدائی صفات کے مالک ہیں۔ تینوں الگ الگ ہو کر بھی ایک ہیں اور ایک ہو کر بھی تین ہیں۔ ظاہر ہے اس قسم کا ایک عقیدہ انسانی عقل کی گرفت سے باہر ہے۔ کتاب کے مصنف کا کہنا ہے کہ اس قسم کا پراگندہ اصول خدا کا دیا ہوا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خدا پراگندگی کا خالق نہیں ہے (کرنتھیوں کے نام ۱۴: ۳۳)

تثلیث کا عقیدہ قدیم بابلیوں اور مصریوں میں اور دوسرے مذہبی حلقوں میں پایا جاتا تھا۔ مسیح کے بعد عیسائیوں نے انھیں سے اس کو لے لیا۔ (۱) دوسری صدی عیسوی کے ترتولین نے، جو قرطاجنہ میں رہتا تھا، لاطینی لفظ (TRINITAS) کو رائج کیا۔ یہی لفظ انگریزی میں (TRINITY) کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اس سے پہلے یہ لفظ کسی مقدس کتاب میں نہیں آیا تھا۔ (۲) اس کے بعد تھیوفیلس نے اس کو یونانی میں رائج کیا۔ اس کا زمانہ بھی دوسری صدی عیسوی کا ہے۔ چوتھی صدی میں ۳۲۵ء میں عیسائیوں کی ایک کونسل شاہ قسطنطین کے تحت نیقیا (ایشیائے کوچک) میں ہوئی۔ اور اس نے تثلیث کو عیسائیت کا سرکاری عقیدہ قرار دے دیا۔

حیرت کی بات ہے کہ تثلیث کا عقیدہ، اس قدر اہم ہونے کے باوجود انجیل میں موجود نہیں۔ انجیل کے چار مقدس ترین ابواب (متی، مرقس، لوقا، یوحنا) اس کے بیان سے خالی ہیں۔ چند حوالے جو دیے جاتے ہیں وہ بالکل ناکافی ہیں:

میں اور باپ ایک ہیں (یوحنا ۱۰: ۳۰)

وہ جو جسم میں ظاہر ہوا (تیمیس ۳: ۱۶)

ظاہر ہے کہ اس قسم کے مبہم الفاظ سے اتنا بڑا عقیدہ اخذ نہیں کیا جا سکتا جس کو تثلیث کہتے ہیں۔ ساری انجیل میں صرف ایک آیت اس مفہوم کی ہے۔ مگر کتاب کے مصنف نے ثابت کیا ہے کہ وہ الحاقی ہے۔

یہ آیت یوحنا کے عام خط میں ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:
"اور گواہی دینے والے تین ہیں۔ باپ، کلمہ، روح القدس اور یہ تینوں ایک ہیں۔ (۵: ۷)

اگرچہ یہ آیت بھی "خدائی" کی سہ گانہ تقسیم کو ثابت کرنے کے لیے پوری طرح کافی نہیں، مگر حیرت انگیز بات ہے کہ وہ بھی انجیل کے قدیم نسخوں میں موجود نہیں۔ اس سے ثابت ہے کہ یہ الحاقی ہے اور بعد کو اس کے متن میں ملائی گئی ہے۔

مصنف نے اس کو تحریف کے کام میں اضافہ کرنے کی ایک نمایاں مثال (صفحہ ۱۰۳) کہا ہے۔ اس نے انیسویں صدی کے عیسائی عالم [illegible] کا قول نقل کیا ہے جو لکھتے ہیں: "یہ آیت انجیل کے قدیم نسخوں میں سے کسی میں بھی موجود نہیں ہے۔ یہ نسخے پندرھویں صدی سے پہلے لکھے گئے تھے

---

1 LET GOD BE TRUE
WATCHTOWER BIBLE AND TRACT SOCIETY
BROOKLYN, NEW YORK, 1952, pp. 320

سوائے بائبل کے یہاں مصنف نے اس آیت کا ذکر نہیں کیا ہے۔ قدیم ترین نسخے [illegible] تحریر میں بھی اس سے خالی ہیں۔ اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ یہ فقرہ الحاقی ہے۔" (۱۰۳)

بائبل کی تاریخی حیثیت کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں کہ اس کی ۶۶ کتابیں سولہ صدیوں میں تیس مختلف افراد کے ہاتھ سے لکھی گئیں۔ موسیٰ نے اس کی پہلی تحریر ۱۴۰۰ ق م میں لکھی۔ اور سب سے آخر میں یوحنا کے خطوط ۹۰ء میں لکھے گئے۔ بائبل کے آخری حصہ کی تحریر کے ۱۵۰۰ برس بعد ہم کیسے مان [illegible] اور واقعتاً صحیح ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ [illegible] ابتدائی ترتیب کو خدا کی طرف سے الہام ہوا تھا تب بھی اس کا کیا ثبوت کہ آج بھی وہ محفوظ شکل میں ہے کیونکہ بائبل کی کوئی بھی اصل موجود نہیں ہے۔"

مصنف کا مقصد [illegible] بتانا نہیں بلکہ اس کے قریب لانا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بائبل [illegible] موجودہ شکل میں آنا کے اضافوں [illegible] کے نزدیک وہ خدائی کتاب ہے۔ [illegible] جس طرح خدائی ہے۔ مگر انسانی آمیزش نے [illegible] کی نظروں سے اعتبار ہٹا دیا ہے۔ اس لئے [illegible] کو دوبارہ بائبل سے قریب لانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اضافی اجزاء کو اس سے الگ کر دیا جائے۔

مصنف کی یہ بات بجائے خود ٹھیک ہے۔ مگر یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ بائبل کے [illegible] اجزاء کو جانچنے کے لئے معیار کیا ہوگا۔ کیا انسانی عقل۔ ظاہر ہے کہ خدائی کلام کو انسانی معیار سے جانچا نہیں جا سکتا۔ خدائی کلام میں اگر آمیزش ہو جائے تو اس کو دوسرے خدائی کلام ہی کے ذریعہ جانچا جا سکتا ہے نہ کہ انسانی عقل کے ذریعہ۔

اسلام کے ابتدائی زمانہ میں دفاتر کا نظام

حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں دفاتر کا نظام رائج کیا۔ ابتداءً خلفاء نے عرب کے شہروں کے علاوہ دیہاتیوں اور عجمیوں سے مدد لی۔ اس وقت ہر صوبہ میں محصول کا حساب کتاب وہاں کی مقامی زبان میں ہوتا تھا۔ عراق و ایران میں فارسی، شام میں یونانی اور مصر میں قبطی۔ بعد کو جب عربوں نے اس فن کو سیکھ لیا تو وہ اس خدمت کو انجام دینے لگے۔ عبدالملک بن مروان اور اس کے بیٹے ولید کے زمانہ تک تمام محصولات کا حساب [illegible] ہوتا تھا۔ عراق میں صالح بن عبدالرحمٰن نے حجاج کے گورنری کے زمانہ میں وہاں کے دفتر محصولات کو عربی زبان میں منتقل کیا۔ شام میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں ابو ثابت سلیمان بن سعد نے یہ خدمت انجام دی۔ مصر میں بھی ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں [illegible] عربی زبان میں ہونے لگے۔ تاہم یہ صرف محصولات کے دفاتر کا معاملہ تھا۔ جہاں تک فوجی دفاتر [illegible] کا تعلق ہے وہ ابتدا ہی سے عربی زبان میں ہوا کرتے تھے۔

چڑیوں کی دنیا



[illegible]

[illegible] direction [illegible] phenomenon. [illegible] migratory birds [illegible] winter [illegible] they travel.

بعض چڑیاں درمیان میں رکے بغیر تین ہزار میل تک اڑتی چلی جاتی ہیں۔ وہ اتنی بلندی پر پرواز کرتی ہیں جہاں کوئی انسان مزید آکسیجن کا اہتمام کئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

بیشتر چڑیاں اپنے انڈے بچے گرمیوں کے موسم کو خط استوا کے شمالی حصے میں گزارتی ہیں اور [illegible] کے جنوبی حصے میں [illegible] کوئی ایک خاص [illegible] ایسی معلوم نہیں [illegible] کے خلاف عمل کرتی ہو تاہم [illegible] چڑیوں میں بعض مثالیں اس کے خلاف پائی جاتی ہیں۔

ان چڑیوں نے نہ تو کسی درسگاہ میں جغرافیہ کا علم حاصل کیا ہے اور نہ مسافت کے فن سے وہ کوئی واقفیت رکھتی ہیں، اس کے باوجود پہاڑوں اور سمندروں کو طے کر کے ہزاروں میل دور منزل تک ان کا پہنچنا انتہائی حیرت انگیز ہے۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ چڑیاں [illegible] مقام پر جا کر انڈے بچے کرتی ہیں اور ان کو وہاں چھوڑ کر چلی آتی ہیں۔ یہ بچے بڑے ہو کر ٹھیک اسی راستے سے سفر کرتے ہیں جس سے ان کے والدین نے [illegible] بغیر کسی رہبر کے وہ اپنے اصل مسکن میں پہنچ جاتے ہیں۔ [illegible] حیرت انگیز سفر [illegible] کتاب نے تجربہ کیا ہے۔

ہندستان میں۔ وہ موسم کی چڑیاں [illegible] تقریباً [illegible] قسمیں مہاجر (MIGRATORY) [illegible] سائبیریا [illegible] ہزاروں میل [illegible] پرندوں کے [illegible] ہمارے ملک میں [illegible] تجربے [illegible] ہندستان کو پاکستان [illegible] اپریل میں گرمیاں شروع ہوتے ہی یہ پرندے [illegible] روانہ ہو جاتے ہیں۔ [illegible] ان کا پسندیدہ مقام ہے۔

چڑیوں کی [illegible] ایک ہی جگہ [illegible] اس طرح [illegible] فضا کی [illegible]

[illegible] ہجرت [illegible] وقت پر ہوتی [illegible] جاتے تھے۔

بات کہ بعض چڑیاں اپنے سابقہ مقام پر واپس چلی جاتی کی مخصوص صلاحیت رکھتی ہیں، قدیم انسان کو بھی معلوم تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ٹیلی گراف کی ایجاد سے پہلے کبوتروں کو دور دراز مقام پر پیغامات بھیجنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

ہر سال ستمبر کے مہینہ میں کروڑوں مہاجر چڑیاں ہمالیہ کے اس پار سے ہندوستان آتی ہیں تاکہ یہاں جاڑے کا موسم گزاریں۔ ان میں سے اکثر وہ ہیں جو وسط ایشیا، مغربی ایشیا، ایران، افغانستان، تبت، روس، سائبیریا، یورپ سے آتی ہیں تاکہ یہاں رہنے کے لئے غذا اور مسکن حاصل کریں۔ سفر کے دوران انہیں ٹھیک ٹھیک علم رہتا ہے کہ وہ کہاں جا رہی ہیں۔ وہ عام طور پر رات میں اڑتی ہیں۔ وہ ساڑھے پندرہ ہزار سے لے کر ۲۰ ہزار فٹ کی بلندی تک اڑتی ہیں۔ ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے وہ ہزاروں میل کا فاصلہ طے کرتی ہیں۔ اکثر چڑیاں چھ یا آٹھ گھنٹے کے بعد "بریک جرنی" کرتی ہیں۔ بعض چڑیاں (مثلاً ایسٹرن گولڈن پلوور) جو مغربی الاسکا اور شمالی سائبیریا میں انڈے بچے کرتی ہے، ہندوستان تک ۲۵۰۰ میل کا مسلسل سفر کرکے پہنچتی ہے اور راستے میں کہیں نہیں ٹھہرتی۔ سانپ کی ایک قسم جو جاپان میں پائی جاتی ہے کہ رات بھر اڑتی ہے اور جاڑے کا موسم جنوبی [illegible] میں گزارتی ہے۔ سب سے بڑی "[illegible]" [illegible] ہے۔ وہ سیارے کے [illegible] قطب شمالی سے قطب جنوبی تک اڑ چلی جاتی ہے۔

یہ چڑیاں اکثر اتنی بلندی پر اڑتی ہیں کہ کوئی انسان مزید آکسیجن کا اہتمام کئے بغیر وہاں زندہ نہیں رہ سکتا۔ مثلاً واربلر (چھوٹی چڑیاں) کا ہندوستان سے سفر ریکارڈ کیا جاتا ہے۔ دوربینی کیمروں سے فوٹو لیا گیا تو وہ ہمالیہ کے اوپر ۲۰۰۰۰ فٹ کی بلندی سے اڑتی ہوئی پائی گئیں۔

یہ چڑیاں رات کو اور خراب موسم میں سفر کرتے ہوئے کس طرح اپنے صحیح راستہ کو پا لیتی ہیں جبکہ انسان کو اس قسم کے سفروں کے لئے راڈار کی ضرورت ہے، یہ ایسا سوال ہے جس کا جواب ابھی تک ہم پورے طور سے معلوم نہ کر سکے — ایک نظریہ یہ ہے کہ چڑیاں اپنے سر میں ایک قسم کا "بردولو جیکل یا بیالوجیکل کمپاس" رکھتی ہیں۔ اور یہ ان کے لئے راڈار کی طرح کام کرتا ہے اور زمین کے مقناطیسی پول سے متحرک رہتا ہے۔ کچھ اور لوگوں کا خیال ہے کہ ان کے کان کے اندرونی نالی پر دباؤ ان کو زمین کی گردشی قوت سے باخبر رکھتا ہے۔ مگر یہ سب قیاسات ہیں، جن کے حق میں کوئی سائنسی دلیل موجود نہیں۔ چڑیوں کے ماہرین نے مختلف مقامات پر شاہراہی مراکز بنائے ہیں۔ ان کے ذریعہ چڑیوں کی ہجرت کے راستے اور ان کی عمر کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

مہاجر چڑیاں انسان کی بنائی ہوئی سرحدوں کو نہیں جانتیں۔ انہیں سفر کے قواعد و ضوابط کی پابندی کی ضرورت نہیں۔ واحد قانون جس کی وہ پابندی کرتی ہیں، وہ فطرت کا قانون ہے مگر ابھی تک انسان کو نہیں معلوم کہ یہ فطرت کا قانون ہے کیا۔





جدید انسان کی تلاش

زیان فرانسس ایویل کی کتاب "مارکس یا مسیح کے بغیر" WITHOUT MARX OR JESUS ۱۹۷۰ میں فرانس میں شائع ہوئی۔ کتاب میں مصنف نے بوڈ بلیئر کا قول نقل کیا ہے جس نے تجویز کیا تھا کہ انسانی حقوق کے اعلان میں دو مزید حقوق شامل کئے جائیں۔ ایک، آپ اپنی تردید کرنے کا حق۔ دوسرے کنارہ کشی کا حق۔ امریکی نوجوان آج اسی انقلاب کی طرف جا رہا ہے۔ ایک طرف وہ ایک ایسے سماج کو رد کر رہا ہے جس کا محرک صرف منافع ہو اور جس پر صرف اقتصادی امور کا غلبہ ہو۔ دوسری طرف اسے روایتی مذاہب پر بھی اطمینان نہیں۔ کیوں کہ اس کے نزدیک بہترین مذہب وہ ہے جسے آدمی خود دریافت کرے۔ امریکی نوجوان کے جدید رجحانات کے چند خاص پہلو یہ ہیں: اخلاقی قدروں کی طرف رجوع کرنے کا ذہن۔ خالص اقتصادی اور تکنیکی سماجی مقاصد سے انکار، قدرتی ماحول کو تجارتی منفعت سے زیادہ اہم سمجھنا۔ مصنف کے الفاظ میں۔ "آج امریکہ میں ایک نیا انقلاب سر اٹھا رہا ہے۔ یہ بنی نوع انسان کے لئے واحد راہ فرار پیش کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ ٹکنالوجیکل تہذیب کو بطور ایک وسیلے کے قبول کیا جائے نہ کہ بطور ایک مقصد کے۔ اور چونکہ ہمیں نہ اس تہذیب کی تباہی بچا سکتی ہے اور نہ اس کا استمرار، اس لئے اس قابلیت کو بھی بڑھایا جائے کہ ہم اس تہذیب کو فنا کئے بغیر اسے ایک نئی شکل دے سکیں"

یہ ذہن جس کی نمائندگی اس کتاب میں کی گئی ہے، ایک ایسے آدمی کی بے چینی کی طرح ہے جسے خود اپنی بے چینی کا سبب معلوم نہ ہو۔ امریکی نوجوان مادی تہذیب سے، جس کی آخری نمائندگی مارکس نے کی، بکلی طور پر غیر مطمئن ہو چکا ہے۔ وہ دوبارہ اس "ماضی" کو دیکھنے لگا ہے جس کو اس کے باپ دادا نے چھوڑ دیا تھا۔ مگر یہاں "ماضی" کی نمائندگی کرنے والی جو چیز ملتی ہے وہ عیسائیت ہے۔ عیسائیت اپنے موجودہ ڈھانچے کے ساتھ خالص علمی و عقلی ذہن کو اپیل نہیں کرتی۔ اس لئے وہ "مارکس" کے ساتھ "مسیح" کا بھی باغی ہو جاتا ہے۔ تاہم جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بغاوت کے بعد وہ جس چیز کا طالب ہے، وہ اس کے اپنے الفاظ میں وہی چیز ہے جس کا جواب صرف مذہب کے اندر ہے تو ہم یہ ماننے پر مجبور ہوتے ہیں کہ وہ اپنے مجہول احساس کے ساتھ اسی چیز کی تلاش میں ہے جس کو مذہب کہتے ہیں۔ مصنف نے اپنی کتاب کا نام "نہ مارکس نہ مسیح" رکھا ہے۔ مگر باعتبار حقیقت اس کا نام ہونا چاہئے تھا "نہ مارکس نہ مروجہ عیسائیت"

انسان مذہب کی طرف لوٹنا چاہتا ہے۔ مگر مذہب کی غلط نمائندگی اس کو دوبارہ مذہب سے دور لے جا رہی ہے۔ یہ ہے دور جدید کا سب سے بڑا المیہ

> میڈلین ایم۔ او ہیئر، امریکہ کی مشہور ترین ملحد خاتون ہیں۔ وہ کھلم کھلا اپنے الحاد کی تبلیغ کرتی ہیں۔ پکے خدا پرست والدین کی یہ بیٹی اپنے بچپن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہے:
>
> "مجھے ان کے اعتقادات کا علم تھا اور احترام بھی کرتی تھی۔ مگر ۱۳ سال کی عمر میں اتوار کا پورا دن انجیل پڑھتے رہنے کے بعد میں اس کی یکسر خلاف عقل باتوں سے متنفر ہو گئی" ۔

آپ بیتی

نومبر کا مہینہ تھا اور رات کے تقریباً ۱۲ بجے کا وقت۔ طالب علم اپنے کمرہ میں سو رہا تھا۔ اس کی چارپائی کے پاس شلف میں مجلد کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ طالب علم نے نیند کی حالت میں کروٹ لی اور اس کا ہاتھ شلف پر چلا گیا۔ اچانک وہ ایک چیخ کے ساتھ اٹھ بیٹھا۔ دیکھا تو ہاتھ کی انگلی میں دانت دھنسنے کا نشان تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ "مجھے سانپ نے کاٹ لیا" وہ چلایا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کی آواز سن کر قریب کے کمروں کے لڑکے بھی جمع ہو گئے۔ اس وقت طالب علم کا جسم پسینہ سے تر تھا اور وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ دہشت کا یہ عالم تھا کہ ایک شخص نے ٹسٹ کی غرض سے نیم کی پتیاں لا کر دیں تو وہ بے تکلف ان پتیوں کو کھا گیا اور اسے کڑوے پن کا احساس تک نہیں ہوا۔

وہاں ایک اور طالب علم تھا جس کا پورا خاندان طبیب کا تھا۔ اس نے آکر مارگزیدہ طالب علم کا ہاتھ دیکھا۔ اس کے زخم پر نظر ڈالی "دانت تو ضرور دھنسے ہیں مگر یہ دانت....." اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے ایک ڈنڈا لیا اور کمرے میں روشنی کر کے اس کو اندر سے بند کر لیا۔ جو لوگ کمرے کے باہر کھڑے تھے انہوں نے اندر سے ڈنڈا چلنے کی آواز سنی تو انہوں نے سمجھا کہ وہ سانپ کو مار رہا ہے۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد جب وہ طالب علم کمرے سے باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں سانپ کے بجائے ایک مرا ہوا چوہا تھا جس کو وہ دم سے پکڑ کر لٹکائے ہوئے تھا۔ "دیکھو یہ تھا وہ چوہا جس نے تمہیں کاٹا ہے" اس نے کہا۔ "میں زخم دیکھتے ہی [illegible] شبہ ہو گیا تھا کہ یہ سانپ کا کاٹا ہوا نہیں ہے کیونکہ چوہے کے دانت اور سانپ کے دانت میں فرق ہوتا ہے لیکن اگر میں یوں ہی کہتا تو تمہیں یقین نہ آتا۔ اس لیے میں نے چاہا کہ پہلے چوہے کو پکڑ لوں اور اس کے بعد تمہیں بتاؤں کہ حقیقت کیا ہے۔"

یہ باتیں سن کر اور چوہا دیکھ کر وہ طالب علم اٹھ بیٹھا۔ اب وہ بالکل اچھا تھا۔ "مجھے یاد آیا" اس نے کہا "کل ہی میرے یہاں نئی نئی کتابیں جلد ہو کر آئی ہیں۔ نئی جلدوں میں لئی کی بو پا کر اکثر چوہے آ جاتے ہیں اور وہی قصہ یہاں بھی پیش آیا۔"

وہی طالب علم جس پر چند منٹ پہلے موت کی بدحواسی طاری تھی اب بالکل ہشاش بشاش ہو کر باتیں کر رہا تھا۔ حالانکہ اس کا کوئی علاج نہیں کیا گیا تھا۔ اس کو صرف یہ یقین دلا دیا گیا تھا کہ اس کو جس چیز نے ڈسا ہے وہ سانپ نہیں بلکہ چوہا ہے۔

یہی حال ہماری قوم کا ہے۔ ہماری قوم اس وقت اپنے مسائل سے اس قدر پریشان ہے کہ زندگی کا حوصلہ تک اس سے رخصت ہو رہا ہے۔ مگر یہ پریشانی حقیقی سے زیادہ نفسیاتی ہے۔ اگر قوم کے دل میں یہ بات اتار دی جائے کہ تمہارا مسئلہ چوہے کا مسئلہ ہے نہ کہ سانپ کا مسئلہ تو قوم کی حالت بالکل بدل جائے گی۔ [illegible] حوصلہ اور اعتماد کی ان تمام قوتوں کو [illegible] جو موجودہ حالات میں کھو چکی ہے۔

محمد خالد اعظمی (ریسرچ [illegible] ۱۹۹۰)
اردو لیکچرر [illegible]
[illegible]

اپنی رائے دیجئے

الرسالہ اب تک خاص نہج کے انداز میں نکلتا رہا ہے۔ اقتباسات اور عام معلومات سے لے کر دینی اور علمی موضوعات تک مختلف عنوانات کے تحت چھوٹے چھوٹے مضامین شامل کئے جاتے ہیں جن کا تعلق زندگی سے ہے۔

تاہم شروع سے کچھ دوستوں کی رائے یہ ہے کہ اس طرح کا انداز ختم کر دیا جائے اور الرسالہ کو سنجیدہ دینی موضوعات کے لئے خاص رکھا جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس قسم کے معلوماتی مضامین تو لوگوں کو دوسرے رسائل میں بھی بہت مل جاتے ہیں۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ اسلام کی صداقت پر لوگوں کے ذہنوں کو مطمئن کیا جائے اور اسلام کی گہری معرفت پیدا کرنے والے مضامین شائع کئے جائیں۔

الرسالہ اب تک جس طرح نکلتا رہا ہے اس کی افادیت یہ ہے کہ ہر ذوق کا آدمی اس میں اپنی دلچسپی کی کچھ چیزیں پا لیتا ہے۔ موجودہ ترتیب میں چونکہ عام موضوعات میں بھی کوئی نہ کوئی دینی اور اصلاحی لمس (TOUCH) دینے کی کوشش کی جاتی ہے اس لئے ان مضامین کا مطالعہ کرتے ہوئے بھی آدمی کو ذہنی فکری غذا پہنچتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ خالص دینی و علمی مضامین بھی الرسالہ میں شامل رہتے ہیں اس لئے اپنی پسند کے مضامین پڑھنے کے بعد وہ دوسرے مضامین کو بھی پڑھ لیتا ہے جو زیادہ واضح اور براہ راست انداز میں دینی فکر کی حامل ہوں۔

مذکورہ تجویز کے مطابق الرسالہ کو ترتیب دیا جائے تو وہ "رسالہ" کم اور "کتاب" زیادہ ہو جائے گا۔ اس تبدیلی سے ممکن ہے کہ اس کی مقبولیت پر کچھ اثر پڑے۔ کیونکہ اسلام کو [illegible] [illegible] افادیت بڑھ جائے گی۔

موجودہ وقت میں ایک اہم کام یہ ہے کہ اسلام کو وقت کے لسانی اسلوب میں مرتب کیا جائے اور موجودہ عصر کے فکری سطح پر اس کو مدلل کیا جائے۔ اسی کے ساتھ وقت کے اندر وہ جذبہ اور تڑپ پیدا کرنا اور دین کا گہرا شعور جگانا وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ یہ دوسرا کام اگرچہ موجودہ الرسالہ میں بھی مسلسل انجام دیا جا رہا ہے لیکن اگر تفریحی حصہ کو ختم کر دیا جائے تو اس پہلو سے رسالہ کی افادیت یقیناً بڑھ جائے گی اور زیادہ وسیع طور پر اس کا موقع ملے گا کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کی علمی و فکری ضرورت کو پورا کیا جائے۔

ایک قابل عمل صورت یہ ہے کہ الرسالہ کو ماہنامہ کے بجائے سہ ماہی کر دیا جائے۔ ہر تیسرے مہینہ کسی خاص اسلامی موضوع پر ۱۲۸ صفحات کا ایک مجموعہ تیار کیا جائے اور اس کو خریدار حضرات کے پاس بھیجا جائے۔ گویا اس کی حیثیت ایک قسم کی سہ ماہی کتاب کی ہو۔ ظاہر ہے کہ ماہانہ رسالہ کے متفرق مضامین کے مجموعہ کے مقابلہ میں سنجیدہ طبقہ کے لئے ایک مرتب کتاب میں زیادہ علمی کشش ہوگی، اور فکری تعمیر و تہذیب کے لئے وہ زیادہ کارآمد ثابت ہوگی۔

تجویز یہ ہے کہ یہ سہ ماہی الرسالہ چھوٹی ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہو۔ البتہ اس کے اوپر پہلے کاغذ کے ٹائٹل کا اضافہ کیا جائے اور سالانہ قیمت چار شماروں کے لئے دس روپیہ رکھی جائے۔ کیونکہ سہ ماہی بنانے کے بعد ہر پرچہ کا ٹکٹ دو پیسہ کے بجائے ۱۰ پیسے کا لگا کرے گا۔ نیز ٹائٹل کی وجہ سے بھی لاگت بڑھ جائے گی۔

الرسالہ کے قارئین کے سامنے یہ تجویز اس لئے پیش کی جا رہی ہے تاکہ وہ اپنی رائے سے مطلع فرمائیں تاکہ اس سلسلہ میں کوئی آخری فیصلہ کیا جائے گا۔

Single Copy Rs. 2.00

Regd. No. D (D) [illegible]
R.N.I. No. [illegible]
JULY — 1977

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING. QASIMJAN STREET, DELHI 6 (India)

محمد احمد پرنٹر پبلشر مسئول نے جے۔کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ 1502 قاسم جان اسٹریٹ

الرسالہ

سرپرست

مولانا وحید الدین خاں

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY
JAMIA NAGAR

کوئی شکاری اگر جانور کے سایہ کو جانور سمجھ کر بندوق چلادے تو اس کی گولی اپنا نشانہ کھو دے گی، کارتوس خالی کرنے کے بعد بھی وہ اپنی مطلوبہ چیز سے محروم رہے گا۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو زندگی کا نصب العین مقرر کرنے میں غلطی کر جائیں۔ اگر آپ نے نصب العین کا تعین صحیح نہیں کیا ہے تو آپ کی ساری کوششیں اور قربانیاں اسی طرح رائگاں چلی جائیں گی جس طرح کوئی شکاری غلط نشانہ پر بندوق چلادے اور بالآخر اس کے حصہ میں خالی کارتوس کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

شمارہ ۹
اگست ۱۹۷۷

زرتعاون سالانہ ۲۴ روپے
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی

قیمت فی پرچہ
دو روپے

ذاتی معاملہ میں ہر آدمی حقیقت پسند ہوتا ہے۔ مگر ملی معاملہ ہو تو ہر آدمی جذباتی ہو جاتا ہے۔ میں نے ایک شخص سے کہا "ذاتی معاملہ میں ہوشیار اور ملی معاملہ میں بیوقوف، اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔"

جس شخص سے میں نے یہ بات کہی، وہ ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی تھا۔ مگر اس نے جو جواب دیا، وہ اس قابل ہے کہ اس کو نقل کیا جائے۔ اس نے کہا:

"وجہ بالکل سادہ ہے۔ ذاتی معاملہ میں نتیجہ مقصود ہوتا ہے اور ملی معاملہ میں لیڈری۔ بس اس کے سوا اس فرق کی اور کوئی وجہ نہیں۔"

یہ ایک واقعہ ہے کہ جب بھی یہ ذہن ہوگا کہ اپنی کوشش کو ایک حقیقی نتیجہ تک پہنچانا ہے تو آدمی معاملہ کو گہرائی کے ساتھ سمجھے گا، وہ سنجیدگی کے ساتھ اپنے عمل کا نقشہ بنائے گا۔ وہ شور کی سیاست کے بجائے چپ کی سیاست اختیار کرے گا۔ اس کے برعکس لیڈری کا مزاج ہو تو ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ کیونکہ لیڈری تو ایک نعرہ، ایک پرجوش تقریر، اخبار کی ایک سرخی سے حاصل ہو جاتی ہے۔ حتی کہ اگر کوئی شخص ایسا اقدام کرے جو قوم کو بربادی کے آخری کنارے پر پہنچا دے، جب بھی اس کی لیڈری مسلّم رہے گی۔ لیڈر بننے کے لئے تعمیری نتیجہ نہ صرف غیر ضروری بلکہ غیر مفید بھی ہے۔ کیوں کہ اکثر حالات میں تخریبی اقدام آدمی کو اس سے زیادہ نمایاں کر دیتا ہے جتنا تعمیری اقدام۔ صرف اس اتفاقی خوش قسمتی کے ساتھ کہ آدمی اپنے تخریبی اقدام کو انقلابی اقدام کا نام دینے میں کامیاب ہو گیا ہو۔ (ظفر الاسلام خاں)

فہرست

غلط نشانہ ۱
عجیب و غریب تضاد ۲
اداریہ ۳
آہ کس قلم سے لکھا جائے ۴
قرآن: ایک معجزہ ۵
نظریاتی طاقت ۱۶
شرعی قانون کی حکمتیں ۱۷
ایک عیسائی خاندان ۱۸
پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ۱۹
سیرت پر ایک کتاب کی ضرورت ۲۹
مومن اور غیر مومن کا فرق ۳۰
شہد: ایک عجیب نعمت ۵۸
زندگی اور موت ۳۰
اسلامی تاریخ: ایک مطالعہ ۳۵
صرف کریڈٹ ۴۰
جنت والے ۴۰
جب تاریخ کا رخ موڑ دیا گیا ۴۱
ہندی میں پہلا ترجمہ قرآن ۴۳
الاسلام: ایک تعارف ۴۴
چھوٹی صنعتیں عظیم امکانات ۴۴
اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ ۴۵
مذہب انسانی تخلیق نہیں ۴۸
یہ کرشمہ قرآن کا تھا ۵۱
برتر سطح سے کام کیجئے ۵۳
جنوبی ہند کا سفر ۵۴
اسلامی مرکز: مقصد، پروگرام ۳۶

اداریہ

الرسالہ کے متعلق ماہ جولائی کے شمارہ میں صفحہ ۴۹ پر جو سوال درج کیا گیا تھا اس سلسلے میں ایک تجویز سامنے آئی ہے کہ الرسالہ حسب معمول اپنی موجودہ ماہانہ صورت میں نکلتا رہے۔ البتہ اسی کے ساتھ اس کی مزید افادیت کے لئے ایسا کیا جائے کہ اس کے متفرق طور پر چھپے ہوئے مضامین کا ایک موضوعاتی انتخاب ہر چند مہینے کے بعد شائع ہو۔ یعنی کسی خاص موضوع پر شائع شدہ مضامین جو مختلف شماروں میں بکھرے ہوئے ہیں، ان کو ایک عنوان کے تحت یکجا کرکے شائع کیا جائے۔ یہ مجموعہ ایک اعتبار سے ماہنامہ الرسالہ کا ایک نمبر ہوگا۔ دوسرے اعتبار سے وہ ۶۴ صفحات کا ایک کتابچہ ہوگا جو مستقل افادیت کا حامل ہوگا۔

ہمارے علم میں یہ بات آئی ہے کہ بعض لوگ ہماری اجازت کے بغیر بطور خود الرسالہ کا چندہ جمع کر رہے ہیں۔ جبکہ ان کے پاس نہ ہماری رسید ہے اور نہ ہمارا اجازت نامہ۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اب تک کتنے لوگ اس قسم کی کارروائیوں کا شکار ہو چکے ہیں۔ تاہم ہم نہایت افسوس کے ساتھ معذرت خواہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اب تک کسی کو اس حیثیت سے اپنا نمائندہ مقرر نہیں کیا کہ وہ ہماری طرف سے لوگوں سے رقمیں وصول کرے۔ اگر اس کام کے لئے کسی کا تقرر ہوا تو الرسالہ میں اس کا اعلان کر دیا جائے گا۔ فی الحال گزارش ہے کہ جو لوگ الرسالہ کے ساتھ تعاون کرنا چاہیں یا اس کا سالانہ چندہ اشتراک ادا کرنا چاہیں، وہ براہ راست دفتر الرسالہ (جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ، دہلی-۶) کو روانہ کریں۔ شخصی طور پر کسی کو کوئی رقم نہ دیں۔ جن لوگوں نے کسی کو رقمیں دی ہوں اور اس کی رسید ان کو اب تک نہ ملی ہو، وہ براہ کرم اپنے نام و پتہ اور مقدار رقم سے مطلع فرمائیں۔ نیز یہ کہ یہ رقم انھوں نے کس کو دی تھی۔

کتاب "الاسلام" کی افادیت کی بنا پر یہ تجویز سامنے آئی تھی کہ اس کی قیمت تخفیف کی جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے اس سے استفادہ کرنا ممکن ہو سکے۔ اس تجویز کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے طالب علموں، اداروں نیز کم آمدنی والوں کے لئے الاسلام کی قیمت میں خصوصی رعایت کر دی گئی ہے۔ اس رعایت کے بعد ان شاء اللہ کسی بھی طبقہ کے افراد کے لئے اس کو حاصل کرنا مشکل نہ رہے گا۔ اس سلسلے میں ضروری امور خط و کتابت کے ذریعہ معلوم کئے جا سکتے ہیں۔

بعض استفسارات کے جواب میں اعلان کیا جاتا ہے کہ الرسالہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں۔ نہ کسی کے شخصی ذوق کی تسکین کے لئے اس کو جاری کیا گیا ہے۔ یہ ایک تعمیری اور دعوتی مہم کا نقیب ہے، جو لوگ اس کے ساتھ تعاون کریں گے وہ کسی شخص کے ساتھ تعاون نہیں کریں گے بلکہ ایک مقصد کے لئے تعاون کریں گے جو ان کا اور الرسالہ کا مشترک مقصد ہے۔

منی آرڈر اور ہر قسم کی ڈاک کے لئے ہمارا اپنا پتہ نوٹ فرمائیں

ماہنامہ الرسالہ، جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی

آہ! کس قلم سے لکھا جائے

چار سال پہلے کی بات ہے۔ دار السلطنت میں ایک "بین اقوامی اسلامی اجتماع" ہوا۔ اس میں شرکت کے لئے جنوب کے ایک شہر سے آنے والوں نے پوری ایک ٹرین رزرو کی۔ آمد و رفت اور ہالٹنگ چارج ملا کر اس کا بل تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے تھا۔ یہ اس "عظیم" اجتماع کے کثیر اخراجات کا صرف ایک چھوٹا سا جزو تھا۔ راقم الحروف نے ایک ذمہ دار سے کہا: اس ڈیڑھ لاکھ روپے کا زیادہ بہتر مصرف ہوتا اگر اس سے کتاب اللہ کا ملکی زبان میں ترجمہ چھاپ کر برادران وطن تک پہنچا دیا جاتا۔

"آپ جانتے نہیں" انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اپنا سفر رزرو ٹرین سے طے کرنے کے محرک نے یہ ڈیڑھ لاکھ روپے ان کی جیب سے نکالے ہیں۔ ترجمۂ قرآن کے نام پر ہم یہ پیسے ان سے وصول نہیں کر سکتے"

یہی قوم کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔ اس کو صرف بے فائدہ نعروں پر متحرک کیا جا سکتا ہے۔ حتی کہ جو نعرہ جتنا زیادہ بے معنی ہو، اتنا ہی زیادہ وہ اس کے لئے جوش و خروش دکھاتی ہے۔ حال میں پڑوسی ملک میں حکومت کے خلاف "اسلامی محاذ" قائم کیا گیا۔ اس کے لئے مسلمانوں نے کروڑوں روپے نذر کر دیے۔ اگرچہ اس محاذ کا معلوم یقینی انجام صرف یہ ہونا تھا کہ وہ قوم کا مزید اربوں روپیہ برباد کر کے ہمیشہ کے لئے دفن ہو جائے ——— پچھلے تقریباً دو سو برس سے پوری قوم مسلسل اسی قسم کی "قربانیاں" دینے میں مصروف ہے۔ کوئی صحیح آواز اس کو اپیل نہیں کرتی۔

آہ وہ قوم جس کا حال اس آیت قرآنی کا مصداق ہو جائے:

"اگر وہ ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا طریقہ نہ بنائیں۔ اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا طریقہ بنا لیں" اعراف ـ ۱۴۶

وحید الدین ، ۷ ، جولائی ۱۹۷۷

قرآن: ایک لسانی معجزہ

جتنی بھی قدیم کتابیں آج دنیا میں پائی جاتی ہیں، ان میں قرآن ایک حیرت انگیز استثناء ہے۔ تمام مقدس کتابوں کی اصل زبانیں تاریخ کی الماری میں بند ہو چکی ہیں۔ مگر قرآن کی زبان (عربی) آج بھی بدستور زندہ ہے۔ آج بھی کروڑوں انسان اس زبان کو لکھتے اور بولتے ہیں جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار برس پہلے قرآن اتارا گیا تھا ——— یہ واقعہ قرآن کے معجزاتی کتاب ہونے کا یقینی ثبوت ہے۔ کیونکہ قرآن کے سوا ساری انسانی تاریخ میں کوئی دوسری کتاب نہیں جس نے اپنی اصل زبان کو اس طرح بعد کے زمانوں میں باقی رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہو۔

مثال کے طور پر انجیل کو لیجئے جو قرآن کے بعد سب سے زیادہ قریب العہد مقدس کتاب ہے۔ اس کا حال یہ ہے کہ ابھی تک قطعیت کے ساتھ یہ بھی نہیں معلوم کہ حضرت مسیح کون سی زبان بولتے تھے۔ قیاساً یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی زبان غالباً آرامی تھی۔ تاہم انجیل کی شکل میں آپ کی تعلیمات کا جو بالواسطہ ریکارڈ آج ہمارے پاس ہے اس کا قدیم ترین نسخہ یونانی زبان میں پایا جاتا ہے۔ گویا حضرت مسیح کے خیالات صرف ترجمہ شدہ حالت میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ پھر یہ یونانی زبان بھی قدیم و جدید یونانی سے بالکل مختلف ہے حتیٰ کہ انیسویں صدی کے آخر تک نئے عہد نامہ میں کم ازکم ۵۵۰ الفاظ (کل متن کا ۱۲ فی صد) ایسے تھے جن کے معانی معلوم نہ تھے۔ انیسویں صدی میں ایک جرمن عالم اڈولف ڈیزمن (ADOLF DEISSMANN) نے مصر میں بعض قدیم تحریریں پائیں۔ ان کے مطالعہ کے بعد اس نے قیاس کیا کہ "ببلیکل گریک" دراصل قدیم یونانی زبان کی غیر علمی بولی تھی جو پہلی صدی عیسوی میں فلسطین کے عوام میں رائج تھی۔ اس نے مذکورہ نامعلوم الفاظ کے کچھ معانی متعین کئے۔ تاہم اب بھی یونانی انجیل میں ۵۰ الفاظ (کل متن کا ایک فی صد) ایسے ہیں جن کے معانی ابھی تک نامعلوم ہیں۔ (صفحہ ۸۰ - ۷۹)

XAVIER LEON-DUFOUR S.J.,
THE GOSPELS AND THE JESUS OF HISTORY
DESCLEE CO. INC.,
NEW YORK 1970, pp.312

ارنسٹ رینان (۱۸۹۲ - ۱۸۲۳) نے عربی زبان کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنی کتاب اللغات السامیہ میں لکھا ہے:

"انسانی تاریخ کا سب سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ عربی زبان ہے۔ یہ زبان قدیم تاریخ میں ایک غیر معروف زبان تھی۔ پھر اچانک وہ ایک کامل زبان کی حیثیت سے ظاہر ہوئی۔ اس کے بعد سے اس میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہ ہو سکی حتیٰ کہ اس کا نہ کوئی بچپن ہے اور نہ بڑھاپا۔ وہ اپنے ظہور کے اول دن جیسی تھی ویسی ہی آج بھی ہے۔"

قرآن کی زبان کے بارے میں فرانسیسی مستشرق کا یہ اعتراف دراصل اعجاز قرآن کا اعتراف ہے۔ کیونکہ حقیقۃً یہ قرآن کا معجزاتی اسلوب ہے جس نے عربی زبان کو تبدیلی کے اس عام تاریخی قانون سے مستثنیٰ رکھا جس سے دوسری تمام زبانیں متاثر

جرجی زیدان (۱۸۶۱ - ۱۹۱۴ء) نے اپنی کتاب آداب اللغة العربیہ میں اس کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے:

وبالجملة فان للقرآن تاثیرا فی آداب اللغة العربیة لیس لکتاب دینی مثلہ فی اللغات الاخری

مختصر یہ کہ عربی زبان کے ادب پر قرآن نے ایسا غیر معمولی اثر ڈالا ہے جس کی مثال کسی اور دینی کتاب کی دوسری زبانوں میں نہیں ملتی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی تمام زبانیں تبدیلی کا شکار رہی ہیں۔ حتیٰ کہ کسی زبان کا آج کا ایک عالم اس زبان کی چند سو برس پہلے کی کتاب کو لغت اور شرح کی مدد کے بغیر سمجھ نہیں سکتا۔ اس تبدیلی کے اسباب عام طور پر دو قسم کے رہے ہیں۔ ایک، اجتماعی انقلاب، دوسرے، ادبی ارتقار۔ عربی زبان کے ساتھ پچھلی صدیوں میں یہ دونوں واقعات اسی شدت کے ساتھ پیش آئے جس طرح کسی دوسری زبان کے ساتھ پیش آسکتے ہیں۔ مگر وہ اس زبان کے لسانی ڈھانچہ میں کوئی تبدیلی نہ کرسکے۔ عربی زبان اب بھی وہی زبان ہے جو چودہ سو برس پہلے نزول قرآن کے وقت مکہ میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ ہومر (م ۸۵۰ ق م) کی ایلیڈ، تلسی داس (م ۱۶۲۳ء) کی رامائن، اور شیکسپیر (۱۵۶۴ - ۱۶۱۶) کے ڈرامے انسانی ادب کا شاہکار سمجھے جاتے ہیں اور زمانۂ تالیف سے لے کر اب تک مسلسل پڑھے جاتے رہے ہیں۔ مگر وہ ان زبانوں کو اپنی ابتدائی شکل میں محفوظ نہ رکھ سکے جن میں وہ لکھے گئے تھے۔ ان کی زبانیں اب کلاسیکس کی زبانیں ہیں نہ کہ زندہ زبانیں۔ زبانوں کی تاریخ میں قرآن واحد مثال ہے جو مختلف قسم کے علمی اور سیاسی انقلابات کے باوجود اپنی زبان کو مسلسل اسی حالت پر باقی رکھے ہوئے ہے جس حالت پر وہ نزول قرآن کے وقت تھی۔ انسانی سماج کی کوئی بھی تبدیلی اُس میں تبدیلی کا باعث نہ بن سکی۔ یہ واقعہ قرآن کے ایک برتر کلام ہونے کا یقینی ثبوت ہے۔ پچھلے ڈیڑھ ہزار برس کی تاریخ نے قطعی طور پر ثابت کردیا ہے کہ قرآن ایک معجزہ ہے، اس کے بعد اعجاز قرآن کے لئے مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔

اجتماعی انقلابات

اجتماعی انقلابات کس طرح زبانوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، اس کو سمجھنے کے لئے لاطینی کی مثال لیجئے۔ لاطینی کا مرکز بعد کے دور میں اگرچہ اٹلی بنا، مگر اصلاً یہ زبان اٹلی کی پیداوار نہ تھی۔ تقریباً ۱۲ سو قبل مسیح، لوہے کا زمانہ آنے کے بعد، جب وسط یورپ کے قبائل اطراف کے علاقوں میں پھیلے تو ان کی ایک تعداد، خاص طور پر کوہ الپس کے قبائل اٹلی میں داخل ہوئے اور روم اور اس کے آس پاس آباد ہوئے۔ ان کی بولی اور مقامی بولی کے ملنے سے جو زبان بنی وہی ابتدائی لاطینی زبان تھی۔ تیسری صدی قبل مسیح میں لیوبس اینڈرونیکس نے یونانی زبان کے کچھ ڈراموں اور کہانیوں کا ترجمہ لاطینی میں کیا۔ اس طرح لاطینی زبان ادبی زبان کے دور میں داخل ہوئی۔ پہلی صدی قبل مسیح میں رومی سلطنت قائم ہوئی تو اس نے لاطینی کو اپنی سرکاری زبان بنایا۔ مسیحیت کے پھیلاؤ سے بھی اس کو تقویت ملی۔ اس طرح مذہب اور سیاست نیز سماجی اور اقتصادی زور پر اس کی ترقی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ قدیم یورپ کے تقریباً پورے علاقہ میں

پھیل گئی۔ سینٹ آگسٹین (۳۵۴ - ۴۳۰) کے زمانے میں لاطینی اپنے عروج پر تھی۔ قرون وسطیٰ میں لاطینی زبان دنیا کی سب سے بڑی بین الاقوامی زبان سمجھی جاتی تھی۔

آٹھویں صدی میں مسلم قومیں ابھریں اور انھوں نے رومی سلطنت کو توڑ کر اس کو قسطنطنیہ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ ۱۴۵۳ میں ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کر کے وہاں سے بھی اس کا خاتمہ کر دیا۔

ہزار برس قبل جب رومی شہنشاہیت ٹوٹی تو مختلف علاقائی بولیوں کو ابھرنے کا موقع مل گیا۔ یہی بولیاں لاطینی کی آمیزش کے ساتھ بعد کو وہ زبانیں بنیں جن کو آج ہم فرانسیسی، اطالوی، اسپینی، پرتگالی، رومانوی زبانیں کہتے ہیں۔ اب لاطینی زبان صرف رومن کلیسا کی عبادتی زبان ہے اور سائنس اور قانون کی اصطلاحات میں استعمال ہوتی ہے۔ اب وہ کوئی زندہ زبان نہیں ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت تاریخی ہے۔ مثال کے طور پر نیوٹن (۱۶۴۲ - ۱۷۲۷) کی پرنسپیا کوئی اصل زبان میں پڑھنا چاہے تو اس کو قدیم لاطینی زبان سیکھنی پڑے گی۔

یہی معاملہ تمام قدیم زبانوں کے ساتھ ہوا ہے۔ ہر زبان مختلف سماجی حالات کے تحت بدلتی رہی۔ یہاں تک کہ ابتدائی زبان ختم ہو گئی اور اس کی جگہ دوسری بدلی ہوئی زبان نے لے لی۔ قومی اختلاط، تہذیبی تصادم، سیاسی انقلاب، زمانی تبدیلی جب بھی کسی زبان کے ساتھ پیش آئے ہیں تو وہ بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ یہی تمام حالات پچھلے ڈیڑھ ہزار برس میں عربی زبان کے ساتھ بھی پیش آئے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ عربی زبان میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ اس تغیر پذیر لسانی دنیا میں عربی کا غیر تغیر پذیر رہنا تمام تر قرآن کا معجزہ ہے۔

۷۰ء میں یہودی قبائل شام سے نکل کر یثرب (مدینہ) آئے۔ یہاں اس وقت عمالقہ آباد تھے جن کی زبان عربی تھی۔ عمالقہ کے ساتھ اختلاط کے بعد یہودی نسلوں کی زبان عربی ہو گئی۔ تاہم ان کی عربی عام عربوں کی زبان سے مختلف تھی۔ وہ عبری اور عربی کا ایک مرکب تھی۔ یہی واقعہ اسلام کے بعد عربوں کے ساتھ زیادہ بڑے پیمانہ پر پیش آیا جب کہ وہ اپنے وطن عرب سے نکلے اور ایشیا اور افریقہ کے ان ملکوں میں داخل ہوئے جہاں کی زبانیں دوسری تھیں۔ مگر اس اختلاط کا کوئی اثر ان کی زبان پر نہیں پڑا۔ عربی بدستور اپنی اصل حالت پر محفوظ رہی۔

نزول قرآن کے بعد عربی زبان کے لئے اس قسم کا پہلا موقع خود صدر اول میں پیش آیا۔ اسلام عرب کے مختلف قبائل میں پھیلا۔ وہ لوگ اسلامی شہروں میں یک جا ہونے لگے۔ مختلف قبائل کی زبانیں تلفظ، لب و لہجہ وغیرہ کے اعتبار سے کافی مختلف تھیں۔ ابو عمرو بن العلاء کو کہنا پڑا تھا: مالسان حمیر بلساننا ولا لغتہم بلغتنا (قبیلہ حمیر کی زبان ہماری زبان نہیں ہے) حضرت عمر نے ایک بار ایک اعرابی کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا تو اس کو پکڑ کر آنحضورؐ کے پاس لائے۔ کیونکہ وہ الفاظ قرآن کو اتنے مختلف ڈھنگ سے ادا کر رہا تھا کہ حضرت عمرؓ یہ نہ سمجھ سکے کہ وہ قرآن کا کون سا حصہ پڑھ رہا ہے۔ اسی طرح آنحضورؐ نے ایک بار ایک عرب قبیلہ کے وفد سے اس کی اپنی بولی میں گفتگو کی تو حضرت علیؓ کو ایسا محسوس ہوا جیسے آپ کوئی اجنبی زبان بول رہے ہیں۔

اس کی بڑی وجہ لہجوں کا اختلاف تھا مثلاً بنو تمیم جو مشرقی نجد میں رہتے تھے۔ وہ جیم کا تلفظ یا سے کرتے تھے، وہ

سے ہر سبب [illegible] سرت کہتے تھے۔ اسی طرح جو تمیم ق کو جیم بولتے تھے۔ مثلاً طریق کو طریج، صدیق کو صدیج، قصد کو جصد اور قاسم [illegible] تھے۔ اس طرح مختلف قبائل کے ملنے سے لسانی تاریخ کے عام قانون کے مطابق ایک نیا عمل شروع ہونا چاہیے [illegible] یک نئی زبان کی تشکیل پر منتج ہوتا۔ مگر قرآن کے برتر ادب نے عربی زبان کو اس طرح اپنے قبضہ میں لے رکھا تھا [illegible] کے اندر اس قسم کا عمل جاری نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس وہ واقعہ پیش آیا جس کو ڈاکٹر احمد حسین زیات نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

ماكانت لغة مضر بعد الاسلام لغة امة وحدة وانما كانت لغة لجميع الشعوب التي دخلت في دين الله

اسلام کے بعد عربی زبان ایک قوم کی زبان نہیں رہی۔ بلکہ ان تمام قبائل کی زبان بن گئی جو خدا کے دین میں داخل ہوئے تھے۔

پھر یہ عرب مسلمان اپنے ملک سے باہر نکلے۔ انھوں نے ایک طرف جبل الطارق تک اور دوسری طرف کاشغر تک فتح کر ڈالا۔ ان علاقوں میں مختلف زبانیں رائج تھیں۔ وہ فارسی، قبطی، بربری، عبرانی، سریانی، یونانی، لاطینی، آرامی زبانیں بولتے اور لکھتے تھے۔ ان میں ایسی قومیں بھی تھیں جو اپنے سیاسی نظام اور اپنے تمدن میں عربوں سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھیں۔ وہ عراق میں داخل ہوئے جو ایک قدیم تمدن کا حامل تھا اور بڑی بڑی قوموں کا مرکز رہ چکا تھا۔ ان کا ایران سے اختلاط ہوا جو اس وقت کی دو عظیم ترین شہنشاہیتوں میں سے ایک تھا۔ ان کا تصادم رومی تہذیب اور عیسائی مذہب سے ہوا جو زبردست ترقی کے مقام پر پہنچ چکے تھے۔ ان کا سابقہ شام سے پیش آیا جہاں فینیقی، کنعانی، مصری، یونانی، غسانی قوموں نے اپنے آداب و اطوار کے نمایاں اثرات چھوڑے تھے۔ ان کا مقابلہ مصر سے ہوا جہاں مشرق و مغرب کے فلسفے آکر ملے تھے۔ یہ اسباب بالکل کافی تھے کہ عربی میں ایک نیا عمل شروع ہو اور ابتدائی زبان کے ساتھ ان نئے عوامل کے اثر سے ایک اور زبان وجود میں آجائے جیسا کہ دوسری زبانوں کے ساتھ ہوا، مگر اتنے بڑے لسانی بھونچال کے باوجود قرآن اس زبان کے لئے ایک ایسا برتر معیار بنا رہا جس نے تمام دوسرے عوامل کو اس کے لئے بے حقیقت بنا دیا۔

اسلام کی فتوحات کے بعد عربی زبان صرف ایک ملک کی زبان نہ رہی بلکہ کئی درجن ملکوں اور قوموں کی زبان بن گئی۔ ایشیا اور افریقہ کی عجمی اقوام نے جب اسلام قبول کیا تو ان کی زبان بھی دھیرے دھیرے عربی بن گئی۔ فطری طور پر ان غیر ملکی اقوام میں عربی زبان بولنے کی وہ قدرت نہ تھی جو خود عربوں میں تھی۔ ان کی زبان میں اپنی غیر عربی زبانوں کے اثر سے بہت سی خامیاں پیدا ہو گئیں۔ پھر یہی نہیں بلکہ خود عربوں میں جو لوگ زیادہ باشعور نہ تھے، دھیرے دھیرے وہ ان قوموں سے اثر لینے لگے۔ یہاں تک کہ خود ان کی زبان بدلنا شروع ہو گئی۔ بڑے بڑے شہروں میں یہ غلطیاں سب سے زیادہ تھیں کیونکہ یہاں مختلف قوموں کے لوگ جمع تھے۔ بڑھتے بڑھتے یہ خرابی خواص تک پہنچ گئی۔ ولید بن عبد الملک اموی کے دربار میں ایک بار ایک شخص آیا اور بولا: توفی ابانا وترك بنون (ہمارا باپ مرگیا اور اولاد چھوڑ گیا) اس جملہ میں اباناکی جگہ ابونا ہونا چاہیے تھا اور بنون کی جگہ بنین۔ اس طرح کے بے شمار فروق پیدا ہو گئے [illegible]

کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہی عربی زبان کے ساتھ بھی واقع ہوتا۔ مگر یہاں بھی قرآن کی ادبی عظمت عربی کے لئے ڈھال بن گئی اور عربی زبان کی صورت بگڑی نہیں وہی باقی رہی جو قرآن نے اس کے لئے مقرر کر دی تھی۔

اس طرح کے واقعات جو عربی زبان کی پچھلی ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ میں بار بار پیش آئے ہیں قرآن کے معجزہ ہونے کا کھلا ہوا ثبوت ہیں کیونکہ یہ تمام تر قرآن کی عظمت ہی کا نتیجہ تھا جس نے عربی کو کسی تغیری عمل کا معمول بننے نہ دیا۔

دوسری صدی ہجری میں اموی سلطنت کا خاتمہ اور عباسی سلطنت کا قیام عربی زبان کے لئے زبردست فتنہ تھا۔ بنی امیہ کی حکومت خالص عربی حکومت تھی۔ اموی حکمراں عرب قومیت اور عربی زبان وادب کی حمایت میں جانب داری اور تعصب کی حد تک سخت تھے۔ انھوں نے اپنا پایہ تخت دمشق کو بنایا تھا جو عرب دیہات کی سرحد پر واقع تھا۔ ان کی فوج، دفتر، عملہ اور افسران سب عرب ہوا کرتے تھے۔ مگر عباسی حکومت میں ایرانیوں کا غلبہ ہو گیا۔ عباسیوں نے ایرانیوں ہی کی مدد سے بنی امیہ کا خاتمہ کیا تھا، اس لئے ان کے نظم ونسق میں ایرانی اعاجم کا عمل دخل ہو جانا لازمی تھا، حتیٰ کہ عباسیوں نے دار الخلافہ بغداد کو قرار دیا جو ایران سے بہت قریب تھا۔ انھوں نے ایرانیوں کو اتنی چھوٹ دی کہ وہ حکومت کے سارے معاملات میں آزادانہ کار روائیاں کرنے لگے۔ انھوں نے عرب اور عرب تہذیب کو حقارت کی نظر سے دیکھا اور اس کو بالقصد کمزور کرنے کی تدبیریں کرنے لگے۔ عربی عصبیت کے کمزور ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانی، ترکی، سریانی، رومی اور بربری عناصر حکومت اور سماج کے تمام معاملات پر چھا گئے۔ عربوں اور غیر عربوں میں رشتہ داریاں قائم ہو گئیں۔ آریائی تہذیب اور سامی تہذیب کے ملنے سے زبان اور تہذیب میں نیا انقلاب آگیا۔ اکاسرہ کے پوتے اور قدیم جاگیرداروں کے بیٹے پھر سے ابھر آئے۔ انھوں نے اپنے آبا واجداد کی تہذیب کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

ان واقعات کا عربی زبان پر بہت گہرا اثر پڑا۔ متنبی (۹۶۵ - ۹۱۵ء) کے زمانہ میں عربی کی جو حالت ہو چکی تھی، اس کا اندازہ اس کے چند اشعار سے ہوتا ہے:

مغانی الشعب طیبا فی المغانی — بمنزلۃ الربیع من الزمان
ولکن الفتی العربی فیہا — غریب الوجہ والید واللسان
ملاعب جنۃ لو سار فیہا — سلیمان لسار بترجمان

شرح دیوان المتنبی (بیروت ۱۹۳۸) صفحہ ۳۴۴

شعب بوان (ایران) کے مکانات میں گویا تمام مکانات سے اسی طرح اچھے ہوتے ہیں جس طرح زمانہ کی تمام فصلوں میں بہار کی فصل۔ مگر ان مکانات میں ایک عرب جوان (متنبی) اپنے چہرہ، ہاتھ اور زبان کے لحاظ سے اجنبی ہے۔ یہ مکانات کے تمام جنات کے رہنے کی جگہ ہیں [illegible] اگر اس علاقہ میں آئیں تو انہیں اپنے ساتھ ترجمان رکھنا پڑے گا ——— [illegible] اس سلسلہ میں ایرانیوں کی کوشش یہ تھی کہ [illegible] عظمت عربی زبان کے [illegible] اس قسم کی کوششوں سے [illegible] اور عربی زبان میں کوئی مستقل تبدیلی پیدا نہ کر سکی۔

خلیفہ متوکل (۲۳۲ — ۲۴۷ھ) کے بعد عجمی اقوام، ایرانی اور ترک، عرب علاقہ میں بہت زیادہ دخیل ہو گئے۔ ۶۵۶ھ میں ہلاکو خاں نے بغداد کی سلطنت کو برباد کر دیا۔ ۸۹۸ھ میں اندلس کی عرب حکومت کو یورپی اقوام نے ختم کر دیا۔ ۹۲۳ھ میں مصر و شام سے فاطمیوں کا خاتمہ ہو گیا اور ان عرب علاقوں کی حکومت عثمانی ترکوں کے قبضہ میں چلی گئی۔ اسلامی حکومت کا دار السلطنت قاہرہ کے بجائے قسطنطنیہ ہو گیا۔ سرکاری زبان عربی کے بجائے ترکی قرار پائی۔ عربی زبان میں غیر زبان کے الفاظ اور اسالیب کثرت سے آنے لگے۔

عالم عرب پر ساڑھے پانچ سو سال ایسے گزرے ہیں جب کہ تمام عرب دنیا عجمی بادشاہوں کے جھنڈے کے نیچے رہی۔ حتیٰ کہ مغل، ترک اور ایرانی حکمراں عرب آثار تک کو مٹانے پر تلے رہے۔ عربی کے کتب خانے جلائے گئے، مدرسے اجاڑے گئے، علماء کو ذلیل کیا گیا۔ عثمانی سلطنت نے اپنی ساری طاقت کے ساتھ عربوں کو ترک بنانے کی وہ مہم چلائی جس کو جمال الدین افغانی نے بجا طور پر "تتریک العرب" کہا ہے۔ مگر ان میں سے کوئی واقعہ بھی عربی زبان میں کوئی مستقل تبدیلی پیدا نہ کر سکا۔ بغداد و بخارا میں تاتاریوں نے، شام میں صلیبیوں نے اور اندلس میں یورپی قوموں نے عربی زبان و ادب اور عرب تہذیب کو جو نقصانات پہنچائے وہ عربی زبان کا نام و نشان مٹانے کے لئے بالکل کافی تھے۔ اس کے بعد دوسری زبانوں کی تاریخ کے مطابق، یہ ہونا چاہئے تھا کہ عربی زبان اپنی دیگر سامی زبانوں سے مل جاتی۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ترکوں کی جہالت اور ایرانیوں کا تعصب اگر حائل نہ ہوا ہوتا تو عربی زبان آج تمام دنیا کے مسلمانوں کی واحد زبان ہوتی۔ تاہم جہاں تک عرب علاقہ کا تعلق ہے، وہاں اس کا بدستور اپنی سابقہ شان میں باقی رہ جانا تمام تر قرآن ہی کا معجزہ تھا۔ قرآن کی عظمت نے اس مدت میں لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ عربی زبان سے اپنا تعلق حکومت و اقتدار کے علی الرغم باقی رکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں بھی بے شمار ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے عربی زبان و ادب کی خدمت کی۔ مثال کے طور پر ابن منظور (۶۳۰ — ۷۱۱ھ) ابن خلدون (۷۳۲ — ۸۰۸ھ) وغیرہ۔

نپولین کے قاہرہ میں داخلہ ۱۷۹۸ کے بعد جب مصر میں پریس آیا اور تعلیم کا دور دورہ ہوا تو عربی زبان کو نئی زندگی ملی تاہم پچھلے سیکڑوں برس کے حالات نے یہ صورت حال پیدا کر دی تھی کہ مصر و شام کے دفاتر کی زبان ترکی و عربی کا ایک مرکب تھا۔

۱۸۸۲ میں مصر پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد پھر صورت حال بدلی۔ انھوں نے عربی کے خلاف اپنی ساری طاقت لگا دی۔ تمام تعلیم انگریزی کے ذریعہ لازمی کر دی گئی۔ مختلف زبانیں سکھانے کے ادارے ختم کر دیئے گئے۔ اسی طرح جن عرب علاقوں پر فرانسیسیوں کا غلبہ ہوا، وہاں انھوں نے فرانسیسی کو رواج دیا۔ مگر تقریباً سو سال تک انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے غلبہ کے باوجود عربی زبان بدستور اپنی اصل حالت پر باقی رہی۔ اس میں الفاظ کی وسعت ضرور پیدا ہوئی۔ مثال کے طور پر ٹینک کے لئے دبابہ کا لفظ رائج ہوا جو پہلے معروف منجنیق کے لئے بولا جاتا تھا۔ اسی طرح طرز بیان میں وسعت پیدا ہوئی۔ مثلاً مسلموں کے حالات پر آج ایک کتاب شائع ہو تو اس کا نام رکھا جاتا ہے لماذا اسلمنا۔ جب کہ اس سے پہلے مسجع و مقفیٰ ناموں کا رواج تھا۔ اسی طرح بہت سے الفاظ معرب ہو کر رائج ہوئے مثلاً دکتور، ڈاکٹر۔ مگر اس سے

اصل زبان میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اصل زبان بدستور وہی آج بھی ہے جو قرآن کے نزول کے وقت مکہ میں رائج تھی۔

ادبی ارتقاء

زبانوں میں تبدیلی کا دوسرا سبب ادیبوں اور مصنفوں کے کارنامے ہیں۔ جب بھی کوئی غیر معمولی ادیب یا مصنف پیدا ہوتا ہے، وہ زبان کو کھینچ کر نئے لسانی اسلوب کی طرف لے جاتا ہے۔ اس طرح زبان تبدیلی اور ارتقاء کے مراحل طے کرتی رہتی ہے، اور بدلتے بدلتے کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ عربی زبان میں اس کے برعکس، ایسا ہوا کہ قرآن نے اول روز ہی ایسا برتر معیار سامنے رکھ دیا کہ کسی انسانی ادیب کے لئے ممکن نہ ہو سکا کہ وہ اس سے اوپر جا سکے۔ اس لیے عربی زبان اسی اسلوب پر باقی رہی جو قرآن نے اس کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں، عربی زبان میں قرآن کے بعد کوئی دوسرا "قرآن" نہ لکھا جا سکا۔ اس لئے زبان بھی قرآنی زبان کے سوا کوئی اور زبان نہ بن سکی۔

انگریزی زبان کی مثال لیجئے۔ ساتویں صدی عیسوی میں وہ ایک معمولی مقامی بولی کی حیثیت رکھتی تھی جس میں کسی علمی خیال کو ظاہر کرنا ممکن نہ تھا۔ پانچ سو برس سے بھی زیادہ عرصہ تک یہی حال رہا۔ انگریزی زبان کا معمار اول جافرے چاسر (۱۳۴۰ - ۱۴۰۰) پیدا ہوا تو انگلستان کی درباری زبان فرانسیسی تھی۔ چاسر جو لاطینی، فرانسیسی اور اطالوی زبانیں جانتا تھا، اس نے انگریزی میں اشعار کہے اور نظمیں لکھیں۔ اپنی غیر معمولی ذہانت اور دیگر زبانوں سے واقفیت کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب ہو سکا کہ انگریزی بولی کو آگے لے جائے اور اس کو ایک علمی زبان کا روپ دے۔ ہاسر (ERNEST HAUSER) کے الفاظ میں اس نے اپنی کامیاب نظموں کے ذریعہ انگریزی کو ایک مضبوط بڑھاوا (FIRM BOOST) دیا۔ اس نے ایک بولی کو ایسی طاقت ور زبان بنا دیا جس میں ترقی کے نئے امکانات چھپے ہوئے تھے۔ (ریڈرز ڈائجسٹ۔ جون ۱۹۷۵)

دو سو برس تک چاسر انگریزی شاعروں اور ادیبوں کا رہنما بنا رہا۔ یہاں تک کہ ولیم شکسپیر (۱۹۲۵ - ۱۵۵۸) کا ظہور ہوا جس نے چاسر سے زیادہ برتر ادب کا نمونہ پیش کیا۔ اپنے اشعار اور ڈراموں کے ذریعہ اس نے انگریزی کو دوبارہ ایک نیا معیار عطا کیا۔ اب انگریزی زبان ایک قدم اور آگے بڑھی اور ترقی کی نئی شاہراہ پر سفر کرنے لگی۔ یہ دور تقریباً ایک سو برس تک رہا، یہاں تک کہ سائنس کے ظہور نے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب میں بھی، دوبارہ نئے معیار قائم کرنے شروع کئے۔ اب شعر کے بجائے نثر، اور افسانہ نویسی کے بجائے واقعہ نگاری کو اہمیت ملنے لگی۔ اس کے اثر سے انگریزی میں سائنٹفک اسلوب وجود میں آیا۔ سوئفٹ (۱۶۶۷ - ۱۷۴۵) سے لے کر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (۱۸۸۸ - ...) تک درجنوں ادیب پیدا ہوئے جنھوں نے زبان کو وہ نیا معیار عطا کیا جس سے اب ہم گزر رہے ہیں۔

یہی عمل تمام زبانوں میں ہوا ہے۔ ایک کے بعد دوسرا زیادہ ... نے والا ادیب ... زبان کا گرد ... اٹھتا ہے اور وہ کو نیا اسلوب دے کر نئے مرحلے کی طرف لے جاتا ہے۔ اس طرح زبان بدلتی رہتی ہے یہاں تک کہ چند صدیاں گزرنے کے بعد اتنا فرق ہو جاتا ہے کہ اگلے لوگ پچھلی زبان کو لغات اور شرح کے بغیر سمجھ بھی نہ سکیں۔

اس کلیہ سے صرف ایک زبان مستثنیٰ ہے اور وہ عربی زبان ہے۔ یہی واقعہ قرآن کے اس دعوے کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ کوئی شخص قرآن جیسی کتاب وضع نہیں کر سکتا۔ بلاشبہ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ پچھلی صدیوں میں

[illegible] قرآن کے جواب میں معارضۂ قرآن لکھنے کی کوشش کی، کوشش کرنے والوں میں [illegible]
مسیلمہ بن حبیب، طلیحہ بن خویلد، نضر بن الحارث، ابن الراوندی، ابو العلاء المعری، ابن المقفع، متنبی وغیرہ۔ اس سلسلے میں ان کی [illegible] ملتی ہیں، وہ اتنی کمزور ہیں کہ قرآن کے مقابلہ میں ان کو رکھنا بھی مشکل [illegible] معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً مسیلمہ کے "قرآن" کا ایک حصہ یہ تھا:

یا ضفدع نقی ما تنقین، لا الماء تکدرین ولا الشارب تمنعین

اے مینڈک! جتنا ٹرا سکے ٹرا لے، تو نہ پانی کو گدلا کرے گی نہ پینے والوں کو روکے گی۔

اسی طرح مسیلمہ کا ایک اور "الہام" یہ تھا:

لقد انعم اللہ علی الحبلی، اخرج منها نسمة تسعی، من بین صفاق وحشا

تہذیب سیرۃ ابن ہشام، جلد دوم، صفحہ ۱۲۱

اللہ نے حاملہ عورت پر بڑا انعام کیا ہے، اس کے اندر سے دوڑتی ہوئی جان نکالی، جھلی اور پیٹ کے اندر سے

تاہم اس سے بھی زیادہ بڑا ثبوت وہ مسلسل واقعہ ہے جس کو ارنسٹ رینان نے ایک لسانی معجزہ قرار دیا ہے۔ جس طرح دوسری زبانوں میں زباندان اور ادیب پیدا ہوئے، اسی طرح عربی میں بھی شعراء اور ادباء اور مصنفین پیدا ہوئے اور پیدا ہو رہے ہیں۔ مگر اس پوری مدت میں کوئی ایسا زباں داں نہ اٹھا جو قرآن سے بہتر ادب پیش کرکے عربی میں نیا لسانی معیار قائم کرتا اور زبان کو نئے مرحلہ کی طرف لے جاتا۔ اس لئے زبان اسی مرحلۂ ترقی پر قائم رہی جو قرآن نے اس کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ اگر دوسری زبانوں کی طرح عربی زبان میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوتے جو قرآن کے مقابلہ میں اعلیٰ ادب کا نمونہ پیش کرتے تو ناممکن تھا کہ زبان ایک مقام پر رکی رہے۔

قرآن کی مثال عربی زبان میں ایسی ہی ہے جیسے کسی زبان میں آخری اعلیٰ ترین ادیب اول روز ہی پیدا ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد کوئی ایسا ادیب نہیں ابھر سکتا جو زبان میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکے۔ قرآن کے نزول کے زمانہ میں جو زبان عرب میں رائج تھی، اس کو ترقی دے کر قرآن نے اعلیٰ ترین ادب کی شکل میں ڈھال دیا۔ اس کے بعد اس میں تبدیلی کا کوئی سوال نہ تھا۔

قرآن نے عربی کے روایتی اسالیب پر اضافے کرکے اس میں وسعت کا دروازہ کھولا۔ مثال کے طور پر [illegible] میں "اللہ احد" کا استعمال۔ عربی زبان میں اس سے پہلے یہ لفظ مضاف مضاف الیہ کے طور [illegible] استعمال ہوتا تھا جیسے یوم الاحد (اتوار کا دن) یا نفی عام کے لئے جیسے ما جاءنی احد (میرے پاس کوئی نہیں آیا) [illegible] مگر قرآن نے یہاں اللہ احد کہہ کر [illegible] کے لئے وصف کے طور پر استعمال کیا جو عربی زبان میں [illegible]۔

عربی میں دوسری زبانوں کے الفاظ شامل کئے۔ مثلاً استبرق، سرادق (فارسی)، صراط [illegible] اسی طرح قسطاس، سجیل، مشکاۃ، [illegible] سندس، انجیل وغیرہ۔ کرکے [illegible] (فرقان ۔۔) تو اس کا لسانی پہلو یہ تھا کہ [illegible]

کہ غیرعربی الفاظ کو معنی کہتے تھے۔ قرآن نے ان الفاظ کی تعریب کرکے ان کو اللہ کے لئے استعمال کیا تاکہ وہ ان کو اجنبی محسوس ہوا۔ انھوں نے کہا اور رد نہیں کیا۔ قرآن میں غیرعربی الاصل الفاظ ایک سو سے زیادہ شمار کئے گئے ہیں جو فارسی رومی، نبطی، حبشی، عبرانی، سریانی قبطی زبانوں سے لئے گئے ہیں۔

قرآن اگرچہ قریش کی زبان میں اترا مگر دوسرے قبائل عرب کی زبان بھی اس میں شامل کی گئی۔ مثلاً قرآن میں فاطر کا لفظ آیا ہے، عبد اللہ بن عباس جو ایک قریشی مسلمان تھے کہتے ہیں:

ماكنت ادرى ما معنى فاطر السماوات والارض حتى سمعت اعرابيا يقول لبئر ابتدا حفرها: انا فطرتها

میں فاطر السماوات والارض کے معنی نہیں سمجھتا تھا یہاں تک کہ ایک اعرابی جس نے ایک کنواں کھودنا شروع کیا تھا، کہا: انا فطرتها۔ تب میں اس کو سمجھا۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

ماسمعت بسكين الا في قوله تعالى (یوسف۔ ۳۱) ماكنا نقول الا المدية

میں نے سکین (چھری) کا لفظ پہلی بار قرآن کی آیت سے جانا۔ اس سے پہلے ہم اس کو مدیہ کہا کرتے تھے۔

بہت سے الفاظ ایسے تھے جن کے مختلف لہجے عرب قبائل میں رائج تھے۔ قرآن نے ان میں سے فصیح تر لفظ کا انتخاب کرکے اس کو اپنے ادب میں استعمال کیا۔ مثلاً قریش کے یہاں جس مفہوم کے لئے اعلیٰ کا لفظ تھا اس کے لئے تمیم کے یہاں اُعلیٰ بولا جاتا تھا۔ قرآن نے اُعلیٰ کو چھوڑ کر اعلیٰ کا انتخاب کیا۔ اسی طرح شناتر کی جگہ اصابع کتع کی جگہ ذنب وغیرہ۔ قرآن اصلاً قریش کی زبان میں اترا ہے۔ مگر بعض مقامات پر قریش کی زبان کو چھوڑ کر کسی دوسرے قبیلے کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر لا يلتكم من اعمالكم بنی عبس کی زبان ہے۔ (الاتقان)

اس طرح قرآن نے الفاظ اور اسالیب کو نئی وسعتیں اور نیا حسن دے کر ایک اعلیٰ عربی ادب کا نمونہ قائم کر دیا۔ یہ نمونہ اتنا بلند تھا کہ اس کے بعد کوئی ادیب اس سے برتر معیار پیش نہ کر سکا۔ اس لئے عربی زبان ہمیشہ کے لئے قرآن کی زبان ہو کر رہ گئی۔

عربوں میں جو امثال اور تعبیرات قدیم زمانے سے رائج تھیں، ان کو قرآن نے زیادہ بہتر پیرایہ میں ادا کیا۔ مثلاً زندگی کی بے ثباتی کو قدیم عربی شاعر نے ان الفاظ میں ظاہر کیا تھا

کل ابن انثى وان طالت سلامته يوما على آلة حدباء محمول

ہر آدمی خواہ وہ کتنے ہی عرصے تک صحیح و سالم رہے، ایک دن بہرحال وہ تابوت کے اوپر اٹھایا جائے گا۔
قرآن نے اس تصور کو ان لفظوں میں ادا کیا: كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (آل عمران — ۱۸۵)

قدیم عرب میں قتل و غارت گری سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ اس صورت حال نے چند فقرے پیدا کئے تھے جو اس زمانہ میں فصاحت کا کمال سمجھے جاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ قتل کا علاج قتل ہے۔ اس تصور کو انھوں نے حسب ذیل مختلف الفاظ میں موزوں کیا تھا:

قَتْلُ الْبَعْضِ إِحْيَاءٌ لِلْجَمِيعِ	بعض لوگوں کا قتل سب کی زندگی ہے
أَكْثِرُوا الْقَتْلَ لِيَقِلَّ الْقَتْلُ	قتل کی زیادتی کرو تا کہ قتل کم ہو جائے۔
اَلْقَتْلُ أَنْفَى لِلْقَتْلِ	قتل کو سب سے زیادہ روکنے والی چیز قتل ہے

قرآن نے اس تصور کو ان لفظوں میں ادا کیا: وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ (بقرہ - ۱۷۹)

قرآن سے پہلے عربی میں اور دنیا کی تمام زبانوں میں شعر کو بلند مقام حاصل تھا۔ لوگ شعر کے اسلوب میں اپنے خیالات کو ظاہر کرنا کمال سمجھتے تھے۔ قرآن نے اس عام روش کو چھوڑ کر نثر کا اسلوب اختیار کیا۔ یہ واقعہ بجائے خود قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت ہے۔ کیوں کہ ساتویں صدی کی دنیا میں صرف خدائے لم یزل ہی اس بات کو جان سکتا تھا کہ انسانیت کے نام ابدی کتاب بھیجنے کے لئے اسے نثر کا اسلوب اختیار کرنا چاہئے نہ کہ شعر کا، جو مستقبل میں غیر اہم ہو جانے والا ہے۔ اسی طرح پہلے کسی بات کو مبالغہ کے ساتھ کہنا ادب کا کمال سمجھا جاتا تھا۔ قرآن نے تاریخ ادب میں پہلی بار واقعہ نگاری کو رواج دیا۔ پہلے جنگ اور عاشقی سب سے زیادہ مقبول مضامین تھے۔ قرآن نے اخلاق، قانون، سائنس، نفسیات، اقتصادیات، سیاسیات، تاریخ وغیرہ مضامین کو اپنے اندر شامل کیا۔ پہلے قصہ کہانی میں بات کہی جاتی تھی۔ قرآن نے براہ راست اسلوب کو اختیار کیا۔ پہلے قیاسی منطق کو ثبوت کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا، قرآن نے علمی استدلال کی حقیقت سے دنیا کو باخبر کیا۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ ساری چیزیں قرآن میں اتنے بلند اسلوب کلام میں بیان ہوئیں کہ اس کے مثل کوئی کلام پیش کرنا انسان کے امکان سے باہر ہے۔

قدیم عرب میں یہ مقولہ تھا کہ ان اعذب الشعر اکذبہ (سب سے زیادہ میٹھا شعر وہ ہے جس میں سب سے زیادہ جھوٹ ہو) مگر قرآن نے ایک نیا طرز بیان (رحمٰن - ۴) پیدا کیا جس میں فرضی مبالغوں کے بجائے واقعیت تھی، اس نے حقیقت پسند ادب کا نمونہ پیش کیا۔ قرآن عربی زبان و ادب کا حاکم بن گیا۔ ادب جاہلی کا جو سرمایہ آج محفوظ ہے، وہ سب قرآن کی زبان کو محفوظ رکھنے اور اس کو سمجھنے کے لئے جمع کیا گیا۔ اسی طرح صرف و نحو، معانی بیان، لغت و تفسیر، حدیث و فقہ، علم کلام، سب قرآن کے معانی و مطالب کو حل کرنے اور اس کے اوامر و نواہی کی شرح کرنے کے لئے وجود میں آئے۔ حتیٰ کہ عربوں نے جب تاریخ و جغرافیہ اور دیگر علوم کو اپنایا تو وہ بھی قرآن کے احکام و ہدایت کو سمجھنے اور ان پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کی ایک کوشش تھی —— قرآن کے سوا تاریخ میں کوئی دوسری مثال نہیں کہ کسی ایک کتاب نے کسی قوم کو اتنا زیادہ متاثر کیا ہو۔

قرآن نے عربی زبان میں ... کر کے جو اعلیٰ تر ادب تیار کیا، وہ اتنا ممتاز اور بدیہی ہے کہ کوئی بھی عربی جاننے والا شخص کسی بھی دوسری عربی کتاب کی زبان سے قرآن کی زبان کا تقابل کر کے ہر وقت اسے دیکھ سکتا ہے۔ قرآن کا ادب عام انسانی ادب سے اتنا نمایاں طور پر فائق ہے کہ کوئی عربی داں اس کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہاں ہم ... کے لئے ایک ... کرتے ہیں جس سے اس فرق کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔ طنطاوی جوہری لکھتے ہیں:

۳ جون ۱۹۳۳ کو میری ملاقات مصری ادیب استاذ کامل ... سے ہوئی۔ انھوں نے ایک عجیب واقعہ

بیان کیا۔ انھوں نے کہا: میں امریکی مستشرق فنکل کے ساتھ تھا۔ میرے اور ان کے درمیان ادبی رشتہ سے گہرے تعلقات تھے۔ ایک دن انھوں نے میرے کان میں چپکے سے کہا "کیا تم بھی انھیں لوگوں میں ہو جو قرآن کو ایک معجزہ مانتے ہیں" یہ کہہ کر وہ ایک معنی خیز ہنسی ہنسے جس کا مطلب یہ تھا کہ اس عقیدہ کی کوئی حقیقت نہیں، محض تقلیداً مسلمان اس کو مانتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ انھوں نے ایسا تیر مارا ہے جس کا کوئی روک نہیں۔ ان کا یہ حال دیکھ کر مجھے بھی ہنسی آگئی۔ میں نے کہا: قرآن کی بلاغت کے بارے میں کوئی حکم لگانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم تجربہ کرکے دیکھ لیں کہ کیا ہم اس جیسا کلام مرتب کرسکتے ہیں۔ تجربہ کرکے خود بخود اندازہ ہوجائے گا کہ ہم ویسا کلام تیار کرنے پر قادر ہیں یا نہیں۔

اس کے بعد میں نے استاد فنکل سے کہا کہ آیئے ہم ایک قرآنی تصور کو عربی الفاظ میں مرتب کریں۔ وہ تصور یہ کہ "جہنم بہت وسیع ہے"۔ انھوں نے اس رائے سے اتفاق کیا اور ہم دونوں قلم کاغذ لے کر بیٹھ گئے۔ ہم دونوں نے مل کر "تقریباً بیس جملے عربی کے بنائے جس میں مذکورہ بالا مفہوم کو مختلف الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ جملے یہ تھے:

ان جهنم واسعة جدا

ان جهنم لاوسع مما تظنون

ان سعة جهنم لا يتصورها عقل الانسان

ان جهنم لتسع الدنيا كلها

ان الجن والانس اذا دخلوا جهنم لتسعهم ولا تضيق بهم

كل وصف في سعة جهنم لا يصل الى تقريب شئ من حقيقتها

ان سعة جهنم لتصغر امامها سعة السماوات والارض

كل ما خطر ببالك في سعة جهنم فانها لارحب منه واوسع

سترون من سعة جهنم ما لم تكونوا لتحلموا به او تتصوروه

مهما حاولت ان تتخيل سعة جهنم فانت مقصر ولن تصل الى شئ من حقيقتها

ان البلاغة المعجزة لتقصر وتعجز اشد العجز عن وصف سعة جهنم

ان سعة جهنم قد تخطت احلام الحالمين وتصور المتصورين

متى امسكت بالقلم وتصديت لوصف سعة جهنم احسست بقصورك وعجزك

ان سعة جهنم لا يصفها وصف ولا يتخيلها وهم ولا تدور بحسبان

كل وصف لسعة جهنم انما هو فضول وهذيان

ہم دونوں جب اپنی کوشش مکمل کر چکے اور ہمارے پاس مزید عبارت کے لئے الفاظ نہ رہے تو میں نے

پروفیسر [illegible] طاقتور لفظوں سے دیکھا۔ اب آپ پر قرآن کی بلاغت کھل جائے گی۔ میں نے کہا، جب کہ ہم اپنی ساری کوشش صرف کر کے اس مفہوم کے لئے اپنی عبارتیں تیار کر چکے ہیں۔ پروفیسر فنکل نے کہا، کیا قرآن نے اس مفہوم کو ہم سے زیادہ بلیغ اسلوب میں ادا کیا ہے۔ میں نے کہا، ہم قرآن کے مقابلے میں بچے ثابت ہوئے ہیں۔ انھوں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا، قرآن میں کیا ہے۔ میں نے سورہ ق کی یہ آیت پڑھی: یَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ۔ یہ سن کر ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ اس بلاغت کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انھوں نے کہا:

صدقت نعم صدقت وانا اقر بذلك مغتبطا من كل قلبي۔

آپ نے سچ کہا بالکل سچ۔ میں کھلے دل سے اس کا اقرار کرتا ہوں۔

میں نے کہا، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ آپ نے حق کا اعتراف کر لیا۔ کیوں کہ آپ ادیب ہیں اور اسالیب کی اہمیت کا آپ کو پورا اندازہ ہے۔ یہ مستشرق انگریزی، جرمن، عبرانی اور عربی زبانوں سے بخوبی واقف تھا۔ لٹریچر کے مطالعہ میں اس نے اپنی عمر صرف کر دی تھی۔

الشیخ طنطاوی جوہری، الجواہر فی تفسیر القرآن الکریم، مصر ۱۳۵۰ھ، جزء ۲۳، صفحات ۱۲-۱۱

نظریاتی طاقت

انجیل میں پیغمبر اسلام کے بارے میں جو پیشین گوئیاں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

ومن فمه يخرج سيف ماض لكي يضرب به الامم

۱۔ قوموں کو مارنے کے لئے اس کے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے

یوحنا عارف کا مکاشفہ ۱۹ : ۱۵

اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر آخر الزماں کو جو دین دیا جائے گا اس کی طاقت لوہے کی تلوار نہیں ہوگی بلکہ الفاظ کی تلوار ہوگی۔ وہ نظریاتی طاقت سے قوموں کو زیر کرے گا۔ وہ اس قوت کے ذریعہ کام کرے گا جو زبان سے نکلتی ہے نہ کہ وہ قوت جو کانوں سے اور زمین کی تہوں سے برآمد ہوتی ہے۔

یہ ایک عظیم الشان پیشین گوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آخری رسول کے ذریعہ جو دین دیا گیا ہے، اس کے حاملین کے لئے کبھی ہتھیار بے وسیلہ ہونے کا سوال نہیں۔ وہ اس وقت بھی امکانی طور پر اعلیٰ ترین طاقت سے مسلح ہوں گے جبکہ ہر قسم کی ظاہری طاقتیں ان سے چھن چکی ہوں گی۔ کیونکہ ان کی طاقت کا راز ان کے دین کی نظریاتی صداقت میں ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کو ان سے کوئی چھین نہیں سکتا۔

یہ پیشین گوئی پیغمبر اسلام کی زندگی میں اپنی مکمل شکل میں پوری ہو چکی ہے۔ آپ کی زبان پر اللہ نے اپنا جو کلام جاری کیا، اس نے قدیم آباد دنیا کے تقریباً پورے علاقہ کو زیر و زبر کر ڈالا۔ کلام الٰہی کی یہ طاقت آج بھی اپنا کرشمہ دکھا سکتی ہے، بشرطیکہ پیغمبر اسلام کے امتی اس کو لے کر اسی طرح اٹھیں جس طرح ان کے پیش رو اس کو لے کر اٹھے تھے۔

یہی حقیقت حدیث میں ان لفظوں میں بیان ہوئی ہے:

ان الله يرفع بهذا القرآن اقواما ويضع به آخرين

اللہ اس کتاب کے ذریعہ کچھ لوگوں کو بلند کرے گا اور کچھ لوگوں کو اس کے ذریعہ سے پست کرے گا۔

شرعی قانون کی حکمتیں

اسلامی قانون میں چور کے لئے یہ سزا رکھی گئی ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے تاکہ آئندہ لوگ اس کے شر سے محفوظ ہو جائیں اور اس کے انجام کو دیکھ کر دوسرے کو سبق حاصل ہو۔ (مائدہ ۔ ۳۸) اس کے بارہ میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ایک بے رحمانہ قانون ہے۔ کسی معاشرہ میں اس پر عمل کیا جائے تو وہاں بے شمار لوگ بے ہاتھ ہو جائیں گے اور پورا معاشرہ بے کار معاشرہ بن کر رہ جائے گا۔ مگر یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی کہے کہ میڈیکل سائنس کا یہ نظریہ غلط ہے کہ کسی عضو میں سپٹک ہو جائے تو اس کو فوراً کاٹ دینا چاہئے۔ میڈیکل سائنس کے اس نظریہ کے عملی رواج کے باوجود اگر تمام لوگ بغیر ہاتھ پاؤں کے نہیں ہو گئے ہیں تو چوری کے بارہ میں اسلامی قانون کی وجہ سے لوگ بے ہاتھ کیوں ہو جائیں گے۔

یہ کوئی فرضی بات نہیں ہے۔ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں جب کہ اس قانون کو نافذ کیا گیا، دور نبوت سے لے کر خلافت راشدہ کے خاتمہ تک صرف چھ آدمیوں کے ہاتھ کاٹے گئے اور ساری مسلم سلطنت میں امن قائم ہو گیا۔ موجودہ زمانہ میں سعودی عرب میں یہ قانون نافذ ہے۔ مگر برسوں گزر جاتے ہیں اور ایک ہاتھ کاٹنے کی نوبت بھی نہیں آتی۔ وجہ یہ ہے کہ یہ قانون اپنے اندر چوری کو روکنے کی خاصیت (DETERRENT VALUE) رکھتا ہے۔ قطع ید کے حکم کا مطلب ہاتھ کاٹنے سے زیادہ یہ ہے کہ لوگوں میں دہشت پیدا ہو جائے اور کوئی شخص چوری کرنے کی جسارت نہ کرے۔ یہ فائدہ اسلام کے قانونی نظام میں پہلے بھی حاصل ہوا اور آج بھی حاصل ہو رہا ہے۔

معاشرہ کو بے کار کرنے کا الزام زیادہ صحیح طور پر موجودہ قوانین پر عائد ہوتا ہے۔ ان قوانین میں چوری کی ہلکی سزا ہونے کی وجہ سے مجرموں کی حوصلہ شکنی نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ چوری کی وارداتیں بے حد بڑھ جاتی ہیں اور بے شمار لوگ چوری کے جرم میں پکڑ کر قید میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح ہزاروں لوگوں کو عمل کے میدان سے ہٹا کر ان کو قوم کے اوپر بوجھ بنا دیا جاتا ہے۔ جب کہ شریعت کے مطابق چند آدمیوں کا ہاتھ کاٹ کر ہمیشہ کے لئے امن کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ لوگ اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگتے ہیں۔ نتیجۃً سماج کے عمل میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ چند لوگوں کو سخت سزا دے کر سارے معاشرہ کو مستقل طور پر تحفظ کا احساس دے دیا جائے، یہ اس سے بہتر ہے کہ چند لوگوں کی خاطر مستقل طور پر معاشرہ سے تحفظ کا احساس ختم کر دیا جائے۔

یورپ اور امریکہ کے حالات نے اس نظریہ کو غلط ثابت کیا ہے کہ مادی فراوانی سے چوری خود بخود ختم ہو جائے گی۔ ترقی یافتہ ملکوں میں چوری کے واقعات غیر ترقی یافتہ ملکوں سے کم نہیں ہیں۔ البتہ شکلیں مختلف ہیں۔ پس ماندہ ملک کا ایک شخص دیہاتی چودھری کے مکان میں نقب لگاتا ہے اور امریکہ میں وہ بینک کے اوپر ڈاکہ ڈالتا ہے۔

قطع ید کی سزا نہ صرف سماج کو امن کی ضمانت دیتی ہے بلکہ ایک چور کا ہاتھ کاٹنا بہت سے لوگوں کو اس انجام سے بچاتا ہے کہ ان کے ہاتھ پاؤں انتہائی بے رحمی کے ساتھ کاٹ ڈالے جائیں۔ چور اور ڈاکو جب کسی کا مال لوٹنے آتے ہیں تو وہ صرف مال ہی نہیں لوٹتے، بلکہ صاحب مال پر بھی حملہ کرتے ہیں اور کبھی ان کو ہلاک کر ڈالتے ہیں۔ کبھی ناکارہ بنا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر چور کے ہاتھ

[illegible] کے ہاتھ [illegible] ہیں گے [illegible] کی تعداد [illegible] [illegible] ہونے کے برے ثابت ہوتا ہے۔

تطبیق کے حکم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس "چوری" کی علامات ہوئی اور فوراً آدمی کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ انسانی زندگی میں کوئی واقعہ بے شمار عوامل کے تحت ہوتا ہے اس لیے کسی متعین واقعہ پر حکم لگانے کے لئے سارے پہلوؤں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ حتی کہ شریعت کا منشا یہ ہے کہ ایک قاضی کا معاف کرنے میں غلطی کر جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں غلطی کر جائے۔

چوری کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو مجرمانہ ذہنیت کے تحت کی جاتی ہے دوسری وہ جو ضرورتاً کسی سے کبھی صادر ہو جاتی ہے۔ دوسری قسم کی چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ مثلاً بھوک سے چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اسی طرح باپ کا بیٹے کے مال سے یا بیٹے کا باپ کے مال سے لینے پر بھی نہیں۔ نابالغ اور [illegible] کا ہاتھ بھی نہیں کاٹا جائے گا۔ اسی طرح اور بہت سی صورتیں ہیں جن میں چوری کا واقعہ ہونے کے باوجود ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

اسلام میں انسان کا اور اس کے "ہاتھ" کا جتنا احترام ہے کسی بھی دوسرے نظام میں اس سے زیادہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر کوئی شخص غلطاً کسی کا ہاتھ کاٹ دے تو اس کو ایک انسان کے قتل کی دیت کا نصف (پچاس اونٹ) مقطوع الید کو دینا پڑتا ہے۔ پیغمبر اسلام کے پاس ایک بار ایک دیہاتی آیا۔ سلام کے بعد آپ نے اس سے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اس نے معذرت کی اور کہا کہ میرا ہاتھ موٹا کام کرنے کی وجہ سے سخت و درشت ہو گیا ہے۔ آپ نے بڑھ کر اس کے ہاتھ کو چوم لیا اور فرمایا: جو ہاتھ محنت کی کمائی سے سخت ہو جائے، اس ہاتھ کو اللہ اور رسول بہت پسند کرتے ہیں۔

بطرس بن بولس بستانی مارونی (۱۸۸۳ - ۱۸۱۹) بستان کا ایک عیسائی عالم تھا۔ وہ عربی، سریانی، لاطینی، اطالوی، انگریزی، عبرانی، یونانی زبانیں جانتا تھا۔ فلسفہ، علم الٰہیات، قانون، تاریخ، جغرافیہ اور حساب کی تعلیم حاصل کی۔ اس نے امریکی عیسائیوں کی ایک ٹیم کے ساتھ مل کر تورات کا ترجمہ کیا۔ المدرسۃ الوطنیہ کے نام سے ایک اسکول قائم کیا۔ یہ مدرسہ اتنا مقبول ہوا کہ شام، مصر، آستانہ، یونان اور عراق تک کے طلبہ اس میں تحصیل علم کے لئے آتے تھے۔ اس نے قاموس المحیط کے نام سے جدید طرز کا عربی لغت لکھا۔ قطر المحیط کے نام سے ایک انسائیکلو پیڈیا لکھنی شروع کی۔ چھ جلدیں شائع کر سکا تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے لڑکے سلیم نے ساتویں اور آٹھویں جلدیں شائع کیں۔ نویں جلد کو ترتیب دیتے ہوئے اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد دوسرے بیٹوں نے نویں جلد مکمل کی۔ اس کے بعد بطرس بستانی کے بھائی سلیمان بستانی نے دسواں اور گیارھواں حصہ لکھا۔

ایک کام کو پشت در پشت آگے بڑھانے کا یہ طریقہ اس کی کامیابی کی سب سے زیادہ یقینی ضمانت ہے۔

پیغمبر اسلام

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو ہم دو بڑے دوروں میں بانٹ سکتے ہیں۔ ایک نبوت سے پہلے، دوسرا نبوت ملنے کے بعد۔ آپ اپنی زندگی کے دونوں دوروں میں خدا کے کامل بندے اور اس کی طرف پوری طرح رجوع کرنے والے نظر آتے ہیں۔ نبوت سے پہلے آپ کی عبدیت بھی تلاش حق کی صورت میں ظاہر ہوئی اور نبوت کے بعد بھی اتباع حق کی صورت میں۔

پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ۲۲ اپریل ۵۷۱ء کو عرب میں پیدا ہوئے اور ۸ جون ۶۳۲ء کو آپ کی وفات ہوئی۔ آپ نہایت تندرست اور طاقت ور تھے۔ بچپن سے یہ حال تھا کہ جو دیکھتا، کہہ اٹھتا: ان لهذا الغلام لشأنا۔ بڑے ہوئے تو آپ کی شخصیت اور زیادہ نمایاں ہو گئی۔ آپ کو دیکھنے والے آپ سے مرعوب ہو جاتے۔ اسی کے ساتھ اتنے نرم اور شیریں زبان تھے کہ تھوڑی دیر بھی جو شخص آپ کے قریب رہتا، آپ سے محبت کرنے لگتا۔ برداشت، سچائی، معاملہ فہمی، حسن سلوک آپ کے اندر کامل درجہ میں پایا جاتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ آپ اس انسانی بلندی کی اعلیٰ ترین مثال تھے جس کو نفسیات کی اصطلاح میں متوازن شخصیت (BALANCED PERSONALITY) کہا جاتا ہے۔ داؤد بن حصین کا بیان ہے کہ عرب کے لوگ عام طور پر یہ کہتے سنے جاتے تھے کہ محمد بن عبداللہ اس شان سے جوان ہوئے کہ آپ اپنی قوم میں سب سے زیادہ با اخلاق، پڑوسیوں کی خبر گیری کرنے والے، حلیم و بردبار، صادق و امین جھگڑے سے دور رہنے والے، فحش گوئی و دشنام طرازی سے پرہیز کرنے والے تھے۔ اسی وجہ سے آپ کی قوم نے آپ کا نام "الامین" رکھا تھا (خصائص کبریٰ، جلد ۱، صفحہ ۹۱)

۲۵ سال کی عمر میں جب آپ نے شادی کی تو اس موقع پر آپ کے چچا ابو طالب نے نکاح کا خطبہ پڑھتے ہوئے کہا تھا:

ان ابن اخي محمدا بن عبد الله لا يوزن به رجل الا رجح به شرفا ونبلا وفضلا وعقلا، وهو والله بعد هذا له نبأ عظيم وخطر جليل

میرے بھتیجے محمد بن عبداللہ کا مقابلہ جس شخص سے بھی کیا جائے، وہ شرافت، نجابت، بزرگی اور عقل میں اس سے بڑھ جائے گا۔ خدا کی قسم اس کا مستقبل عظیم ہوگا، اور اس کا رتبہ بلند ہوگا۔

ابو طالب نے یہ الفاظ ان معنوں میں نہیں کہے تھے جن معنوں میں بعد کو تاریخ نے اسے سچا ثابت کیا۔ انھوں نے یہ بات تمام تر دنیوی معنوں میں کہی تھی۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ جو شخص فطرت سے وہ پرکشش شخصیت لے کر پیدا ہوا ہو، جو محمد بن عبداللہ میں نظر آتی ہے، وہ بہرحال قوم کے اندر معزز مقام حاصل کرتا ہے اور دنیا کے بازار میں اس کی شخصیت بہت اونچی قیمت مل کر رہتی ہے۔ ایسے شخص کی اعلیٰ صلاحیتیں اس کی ترقی اور کامیابی کی یقینی ضمانت ہیں۔

پیغمبر اسلام کے لئے یہ امکانات، بلاشبہ، پوری طرح موجود تھے۔ آپ اپنی صلاحیتوں کی بڑی سے بڑی دنیوی قیمت وصول کر سکتے تھے۔ آپ مکہ کے ایک اونچے خاندان میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ آپ کو [illegible]

اونٹنی اور ایک خادمہ ملی تھی۔ مگر آپ کی شاندار پیدائشی خصوصیات نے مکہ کی سب سے امیر خاتون کو متاثر کیا۔ ۲۵ سال کی عمر میں ان سے آپ کا نکاح ہو گیا۔ یہ ایک تاجر خاندان کی بیوہ تھیں۔ ان سے آپ کو نہ صرف مال اور جائداد بلکہ عرب میں اور عرب کے باہر تجارت کا زبردست میدان بھی ہاتھ آیا۔ اب آپ کے لئے ایک پرسکون اور کامیاب زندگی بنانے کے سارے مواقع فراہم ہو چکے تھے۔ مگر آپ نے ان کو چھوڑ کر ایک اور ہی چیز کا انتخاب کیا۔ آپ نے جانتے بوجھتے اپنے کو ایک ایسی راہ پر ڈال دیا جو صرف دنیا کی بربادی کی طرف لے جاتی تھی۔ خدیجہ سے نکاح سے پہلے آپ اپنی گزر اوقات کے لئے کچھ معاشی کام کر لیتے تھے۔ اب وہ بھی چھوٹ گیا، اب آپ ہمہ تن اس تلاش میں لگ گئے جس کی جستجو آپ کو بچپن سے تھی۔ یہ کہ سچائی کیا ہے۔ آپ گھنٹوں بیٹھے ہوئے زمین و آسمان پر غور کرتے رہتے۔ مکہ کے شہر میں اپنے تعلقات بڑھانے اور وہاں کی مجلسوں میں اپنی جگہ پیدا کرنے کے بجائے آپ نے یہ کیا کہ صحراؤں اور پہاڑوں کو اپنا ہم نشین بنا لیا۔ مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑی سلسلہ ہے جس میں ایک کھوہ ہے جس کا نام حرا ہے۔ آپ ستو اور پانی لے کر وہاں چلے جاتے۔ پہاڑ کے سنسان ماحول میں زندگی کی حقیقت پر غور کرتے۔ زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے سے دعائیں مانگتے کہ میرے رب! تو اپنے آپ کو میرے اوپر ظاہر کر دے۔ سچائی کیا ہے، مجھ کو بتا دے۔ جب پانی کی مشک خالی ہو جاتی اور ستو ختم ہو جاتے پھر واپس آتے تاکہ دوبارہ اسی طرح کھانے پینے کا سامان لے کر قدرت کے اس ماحول میں لوٹ جائیں جہاں صحرا اور درخت اور پہاڑ اور آسمان کی پرسکون فضائیں تھیں۔ آپ کی بے چین طبیعت انسانی ہنگاموں میں اپنے سوال کا جواب نہ پا سکی تھی۔ اب آپ نے قدرت کی خاموش دنیا کو اپنا ہم نشین بنایا تھا کہ شاید وہ اس کا کچھ جواب دے سکے۔

جوانی کی طاقتوں سے بھرپور ایک شخص کے لئے اس قسم کی زندگی کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ خوشی کے راستہ کو چھوڑ کر غم کے راستہ کو اپنانا تھا۔ بیوی بچوں کے ساتھ آرام کی زندگی گزارنا، تجارت کو ترقی دینا اور سوسائٹی میں اپنی جگہ بنانا، یہ تمام امکانات آپ کے لئے پوری طرح کھلے ہوئے تھے۔ مگر آپ کی بے تاب اور متلاشی طبیعت ان چیزوں پر راضی ہونے کے لئے تیار نہ تھی۔ تمام چیزیں اس وقت تک آپ کو ہیچ معلوم ہوتی تھیں جب تک آپ زندگی کا راز معلوم نہ کر لیں۔ آپ جاننا چاہتے تھے کہ ان ظاہری چیزوں سے اوپر اگر کوئی حقیقت ہے تو وہ کیا ہے۔ نفع نقصان اور آرام و تکلیف کی اصطلاحوں میں سوچنے کے بجائے آپ اس سوال کو حل کرنے میں منہمک رہتے کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔

پیغمبر اسلام کی زندگی کا یہی وہ پہلو ہے جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے: وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ (والضحیٰ) ضال کے معنی ہیں راہ بھولا ہوا، سرگرداں۔ (ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم ضل فی شعاب مکۃ وھو صغیر۔ شمہ رحیم) یہ لفظ اس مسافر کے لئے بولا جاتا ہے جو راستہ سے بھٹک گیا ہو اور حیران و پریشان مختلف راستوں کو دیکھ رہا ہو، اس کی سمجھ میں نہ آتا ہو کہ کدھر جائے۔ اسی لئے اس درخت کو ضالہ کہتے ہیں جو صحرا میں اکیلا کھڑا ہو اور اس کے آس پاس کوئی دوسرا درخت نہ ہو۔ اسی سے کہا جاتا ہے ضل الماء فی اللبن (پانی دودھ میں کھو گیا) آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ جاہلیت کے بیابان میں اکیلے درخت کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ صحراؤں اور پہاڑوں میں یہ غم لئے ہوئے کہ سچائی کیا ہے جس کو میں اپناؤں۔ دنیا کے مروجہ نقشوں میں اپنی جگہ بنانے کے بجائے حیران و متفکر ہو کر ایک ...

ہوئے تھے سچائی سے آخر کون سی چیز آپ کی روح کے بے تسکین کا ذریعہ نہیں بن سکتی تھی حتی کہ آپ کی تلاش حق کی سرگرمیاں یہ
ت کو پہنچ گئی تھی کہ زندگی آپ کے لئے ایک ایسا بوجھ بن گئی جو آپ کی کمر توڑے دے رہی تھی ۔ (الم نشرح)

اس وقت اللہ کی رحمت آپ کی طرف متوجہ ہوئی ۔ آپ کے لئے ہدایت اور روشنی کے دروازے کھول دیئے گئے۔ اار فروری ۶۱۰ کو جب کہ آپ حرا میں تنہا بیٹھے ہوئے تھے ، خدا کا فرشتہ انسان کی صورت میں آپ کے سامنے ظاہر ہوا اور خدا کی طرف سے آپ کو وہ کلمات سکھائے جو قرآن کی سورہ نمبر ۹۶ کی ابتدا میں درج ہیں ۔ آپ کی تلاش نے بالآخر اپنا جواب پالیا۔

پیغمبر اسلام کی بے چین روح کا ربط رب العالمین سے قائم ہوگیا ۔ خدا نے آپ کو نہ صرف ہدایت دی بلکہ اپنے نمائندہ کی حیثیت سے چن لیا ۔ آپ کے اوپر خدا کا کلام اترنے لگا ۔ آپ کی نبوت کی یہ مدت ۲۳ سال تک پھیلی ہوئی ہے ۔ اس مدت میں خدا کی کتاب (قرآن) مکمل طور پر آپ کے اوپر اتاری گئی۔

پیغمبر اسلام نے اپنی مشکل زندگی کے چالیسویں سال میں سچائی دریافت کرلی ۔ مگر یہ سچائی آپ کے لئے کوئی آسان دریافت نہ تھی ۔ اس سچائی کا مطلب یہ تھا کہ آدمی ایک عظیم تر خدا کی زد میں ہے ۔ یہ اپنے عجز کے مقابلہ میں خدا کی کبریائی کی دریافت تھی، خدا کے اثبات کے مقابلہ میں اپنی نفی کا پتہ لگانا تھا ۔ یہ اس راز کو معلوم کرنا تھا کہ اس دنیا میں بندۂ مومن کی صرف ذمہ داریاں ہیں، ذمہ داریاں ہیں، یہاں اس کا کوئی حق نہیں ہے ۔

سچائی کی دریافت کے بعد پیغمبر اسلام کے لئے، زندگی کے معنی کیا تھے ۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہاں پر صرف ایک حدیث نقل کی جاتی ہے ۔ آپ نے ایک بار فرمایا:

امرنی ربی بتسع	میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے
خشیۃ اللہ فی السر والعلانیۃ	کھلے اور چھپے ہر حال میں خدا سے ڈرتا رہوں
وکلمۃ العدل فی الغضب والرضا	غصہ میں ہوں یا خوشی میں، ہمیشہ انصاف کی بات کروں
والقصد فی الفقر والغنا	محتاجی اور امیری دونوں حالتوں میں اعتدال پر قائم رہوں
وان اصل من قطعنی	جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں
واعطی من حرمنی	جو مجھے محروم کرے میں اسے دوں
واعفو من ظلمنی	جو مجھ پر ظلم کرے، میں اس کو معاف کردوں
وان یکون صمتی فکرا	اور میری خاموشی غور و فکر کی خاموشی ہو
ونطقی ذکرا	میرا بولنا یاد الٰہی کا بولنا ہو۔
ونظری عبرۃ (رواہ رزین)	میرا دیکھنا عبرت کا دیکھنا ہو

یہ محض تقریر یا گفتگو کے الفاظ نہ تھے ۔ یہ خود آپ کی زندگی تھی جو لفظوں کی صورت میں ڈھل رہی تھی ۔ یہ حیرت انگیز نادر کلمات احساس اور حقیقت کی ہوئی باتیں ایک عام انسان کی زبان سے نکل ہی نہیں سکتیں ۔ یہ الفاظ تو خود بولنے والے

کا مقام پا رہے ہیں۔ وہ کہنے والے کے اندرون کو نازل رہے ہیں۔ وہ بہت واضح طور پر الفاظ کے آئینے میں بےنقاب کر رہے ہیں۔

آپ کی زندگی اگرچہ نبوت ملنے سے پہلے بھی اسی قسم کی تھی۔ مگر وہ تمام تر فطرت کے زور پر تھی۔ اب حقائق کی دریافت نے اس کو شعور کا درجہ دے دیا۔ جو کردار اب تک طبعی تقاضے کے تحت ظاہر ہوتا تھا، اب وہ ایک سوچے سمجھے ذہن کا ارادی رجحان ہو گیا۔ یہی بندۂ خدا کا وہ مقام ہے جہاں دنیوی تقاضے انتہائی حد تک گھٹ کر صرف بقدر حاجت رہ جاتے ہیں۔ آدمی کی جینے کی سطح عام انسانوں سے مختلف ہو جاتی ہے۔ اس کا جسم اسی ظاہری دنیا میں ہوتا ہے مگر نفسیاتی اعتبار سے وہ ایک اور دنیا میں زندگی گزارنے لگتا ہے۔

ایک روایت کے مطابق پیغمبر اسلام نے فرمایا:

وعلی العاقل ما لم یکن مغلوباً علی عقله ان یکون له ساعات	عقلمند شخص کے لئے لازم ہے کہ اس پر کچھ گھڑیاں گزریں
ساعة یناجی فیها ربه	ایسی گھڑی جب کہ وہ اپنے رب سے باتیں کرے،
وساعة یحاسب فیها نفسه	ایسی گھڑی جب کہ وہ اپنی ذات کا محاسبہ کرے،
وساعة یتفکر فیها فی صنع الله	ایسی گھڑی جب کہ وہ خدا کی تخلیق میں غور کر رہا ہو۔
وساعة یخلو فیها لحاجته من المطعم والمشرب	اور ایسی گھڑی جب کہ وہ کھانے پینے کی ضرورتوں کے لئے وقت نکالے۔

(رواہ ابن حبان فی صحیحه والحاکم وقال صحیح الاسناد عن ابی ذر الغفاری)

گویا خدا کا وفادار بندہ وہ ہے جس کے روز و شب کے لمحات اس طرح گزریں کہ کبھی اس کی بے قراریاں اس کو خدا سے اتنا قریب کر دیں کہ وہ اپنے رب سے سرگوشیاں کرنے لگے۔ کبھی یوم الحساب میں کھڑے ہونے کا خوف اس پر اس طرح طاری ہو کہ وہ دنیا ہی میں اپنا حساب کرنے لگے۔ کبھی کائنات میں خدا کی کاریگری کو دیکھ کر وہ اس میں اتنا محو ہو کہ اس کے اندر اس کو خالق کے جلوے نظر آنے لگیں۔ اس طرح گویا خدا سے ملاقات، اپنے آپ سے ملاقات اور کائنات سے ملاقات میں اس کے لمحات گزر رہے ہوں۔ اور بدرجہ حاجت وہ کسی وقت کھانے پینے کے لئے بھی اپنے کو فارغ کر لیا کرے۔

یہ الفاظ محض کسی انسان کا تعارف نہیں ہیں۔ اس میں خود پیغمبر اسلام کی اپنی شخصیت بول رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ظاہری جسم کے اندر جو موجزن روح تھی اس میں ہر وقت کس قسم کے طوفان اٹھتے رہتے تھے۔ آپ کی زندگی کس قسم کی "ساعات" کے درمیان گزر رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص خود ان گھڑیوں کا تجربہ نہ کر رہا ہو وہ کبھی اتنے اعلیٰ الفاظ میں اس بات کو بیان ہی نہیں کر سکتا۔ یہ ایک ایسی روح سے نکلے ہوئے کلمات ہیں جس نے ان کیفیات کو خود کمال درجہ میں پایا تھا جس کو وہ لفظوں کے ذریعہ دوسروں پر کھول رہا تھا۔

پیغمبر اسلام کو وحی خداوندی ملنے سے پہلے موجودہ دنیا اپنی نکیوں اور محدودیتوں کے ساتھ بے معنی معلوم ہوتی تھی۔ مگر جب آپ پر خدا نے اس حقیقت کو کھولا کہ اس دنیا کے سوا ایک اور دنیا ہے جو کامل اور ابدی ہے اور جو

[illegible] یہ وہ لمحہ تھا جب زندگی اور کائنات کے راز آپ کے سامنے کھلے۔ اب آپ نے زندگی کی وہ سمت
پالیا جہاں آپ پہنچ سکتے تھے جس میں آپ اپنا اصل مقام پا سکتے تھے۔ اب آپ کو ایک ایسا مستقل ضابطہ مل گیا جس سے وابستہ ہو کر
اور منافقوں کو اس سے وابستہ کر سکیں جس کے پیش نظر اپنی زندگی کی منصوبہ بندی کریں۔

یہ مطلب ہے الدنیا مزرعۃ الآخرۃ (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) کا۔ اس احساس کے تحت جو زندگی بنتی ہے، اس کو آج کل کی اصطلاح میں آخرت رخی زندگی (AKHIRAT ORIENTED LIFE) کہا جا سکتا ہے۔ ایسا آدمی اپنے تصور حیات کے لازمی نتیجہ کے طور پر آخرت کو اپنا اصل مسئلہ سمجھنے لگتا ہے۔ وہ اس سے باخبر ہو جاتا ہے کہ دنیا ہماری منزل نہیں۔ وہ صرف راستہ ہے۔ وہ آخرت کے مستقبل کی تیاری کا ایک ابتدائی مرحلہ ہے۔ جس طرح ایک دنیا پرست آدمی کی تمام سرگرمیاں دنیوی مصالح کے گرد گھومتی ہیں، اسی طرح ایک بندۂ خدا کی پوری زندگی کا رخ آخرت کی طرف ہو جاتا ہے۔ ہر معاملہ میں اس کا رویہ اس فکر کے تحت بنتا ہے کہ آخرت میں اس کا انجام کیا ہوگا۔ خوشی ہو یا غم، کامیابی ہو یا ناکامی، تندرستی کی حالت ہو یا بیماری کی، تعریف کی جا رہی ہو یا تنقید، غصہ کا موقع ہو یا محبت کا، ہر حال میں آخرت کا خیال اس کا رہنما بنا رہتا ہے۔ حتی کہ وہ وقت آتا ہے جب کہ آخرت کا فکر اس کے لاشعور کا جزء بن جاتا ہے۔ اگرچہ اب بھی وہ بشریت سے خالی نہیں ہوتا۔ مگر اس کا ذہن انھیں امور میں چلتا ہے جو آخرت سے تعلق رکھنے والے ہوں۔ جن باتوں میں آخرت کا کوئی پہلو نہ ہو ان سے اس کی دلچسپیاں اتنی کم ہو جاتی ہیں کہ بعض اوقات اس کو کہنا پڑتا ہے: انتم اعلم بامور دنیاکم (تم اپنے دنیا کے معاملات کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو)

اس حقیقت کی حیثیت محض ایک علمی دریافت کی نہیں۔ اس کو پانے کے بعد آدمی کی جینے کی سطح بدل جاتی ہے۔ وہ کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ اس کی بہتر مثال خود پیغمبر اسلام کی ذات ہے۔ آپ کی زندگی کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ جب تک جینے کی سطح نہ بدلے، عمل کی سطح نہیں بدل سکتی۔

پیغمبر اسلام نے جب یہ حقیقت پائی تو وہ ان کی پوری زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا۔ جس جنت کی خبر آپ دوسروں کو دے رہے تھے، اس کے آپ خود سب سے زیادہ حریص بن گئے اور جس جہنم سے دوسروں کو ڈرا رہے تھے، اس سے آپ خود سب سے زیادہ ڈرنے لگے۔ آپ کا یہ اندرونی طوفان بار بار دعا اور استغفار کی صورت میں آپ کی زبان سے ظاہر ہوتا رہتا تھا۔ آپ کی جینے کی سطح عام انسانوں سے کس طرح مختلف تھی اس کا اندازہ [illegible] سے ہوگا۔

عن ام سلمۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان فی بیتہا فدعا وصیفۃ لہ او لہا فابطأت فاستبان الغضب فی وجہہ فقامت ام سلمۃ الی الحجاب فوجدت الوصیفۃ تلعب ومعہ سواک فقال لولا خشیۃ القود یوم القیامۃ لاوجعتک بہذا السواک
(الادب المفرد، باب قصاص العبد، صفحہ ۲۹)

ام سلمہ بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر میں تھے۔ آپ نے خادمہ کو بلایا۔ اس نے آنے میں دیر کی۔ آپ کے چہرہ پر غصہ ظاہر ہو گیا۔ ام سلمہ نے پردہ کے پاس جا کر دیکھا تو خادمہ کو کھیلتے ہوئے پایا۔ اس وقت آپ کے ہاتھ میں ایک مسواک تھی۔ آپ نے خادمہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اگر قیامت کے دن مجھے بدلہ کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں تم کو اس مسواک سے مارتا۔

جنگ بدر (رمضان ۲ھ) کے بعد جو لوگ قیدی ہو کر آئے، وہ آپ کے بدترین دشمن تھے۔ مگر آپ نے ان کے ساتھ بہترین سلوک کیا۔ ان قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمرو تھا جو آتش بیان خطیب تھا اور مقام مجمع میں آپ کے خلاف بیہودہ تقریریں کیا کرتا تھا۔ عمر فاروقؓ نے رائے دی کہ اس کے نیچے کے دو دانت اکھڑوا دیے جائیں تاکہ آئندہ کے لئے اس کا تقریر کا جوش ختم ہو جائے۔ آپؐ نے یہ سن کر فرمایا:

"خدا میرا چہرہ قیامت میں بگاڑ دے گا اگرچہ میں خدا کا رسول ہوں"

پیغمبر اسلام عام انسانوں کی طرح ایک انسان تھے۔ خوشی کی بات سے آپ کو خوشی ہوتی تھی اور غم کی بات سے آپ غمگین ہوتے تھے۔ مگر آپ کی عبدیت آپ کو خدا کے مقرر کئے ہوئے دائرہ سے باہر نہیں جانے دیتی تھی۔

پیغمبرؐ اسلام کی آخر عمر میں ماریہ قبطیہ سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ لڑکا خوبصورت اور تندرست تھا۔ اس کا نام آپ نے اپنے بزرگ ترین جد امجد کے نام پر ابراہیم رکھا۔ ابو رافع نے جب ابراہیم کی پیدائش کی خبر دی تو آپ اتنا خوش ہوئے کہ ابو رافع کو ایک غلام انعام میں دے دیا۔ آپ ابراہیم کو گود میں لے کر کھلاتے اور پیار کرتے۔ عرب قاعدہ کے مطابق ابراہیم کو ایک دایہ ام بردہ بنت المنذر بن زید انصاری کے حوالے کیا گیا تاکہ وہ دودھ پلائیں۔ یہ دایہ ایک لوہار کی بیوی تھیں۔ ان کے چھوٹے سے گھر میں اکثر بھٹی کا دھواں ہوتا رہتا۔ آپ لڑکے کو دیکھنے کے لئے اکثر لوہار کے گھر جاتے اور وہاں دھواں آپ کی آنکھ اور ناک میں گھستا رہتا اور آپ انتہائی نازک طبع ہونے کے باوجود اس کو برداشت کرتے۔ ابراہیم ابھی ڈیڑھ سال کے ہوئے تھے کہ ہجرت کے دسویں سال (جنوری ۶۳۲ء) ان کا انتقال ہو گیا آپؐ بیٹے کی موت کو دیکھ کر رونے لگے۔

ان واقعات میں پیغمبر اسلام ایک عام انسان کی طرح نظر آتے ہیں۔ ان کے جذبات، ان کی حسرتیں ویسی ہی ہیں جیسی ایک عام باپ کی ہوتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود خدا کا دامن آپ کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ آپ غم زدہ ہیں مگر زبان سے نکل رہا ہے:

واللہ یا ابراھیم انا بفراقک لمحزونون،	خدا کی قسم اے ابراہیم ہم تمہاری موت سے غمگین ہیں
تبکی العین ویحزن القلب ولا نقول	آنکھ رو رہی ہے، دل دکھی ہے، مگر ہم کوئی ایسی بات
ما یسخط الرب	نہ کہیں گے جو رب کو ناپسند ہو۔

جس دن ابراہیم کا انتقال ہوا۔ اتفاق سے اسی دن سورج گرہن پڑا۔ قدیم زمانہ میں اعتقاد تھا کہ سورج گرہن اور چاند گرہن کسی بڑے آدمی کی موت سے ہوا کرتے ہیں۔ اس کے اثر سے مدینہ کے مسلمان کہنے لگے کہ یہ سورج گرہن پیغمبر کے بیٹے کی موت کی وجہ سے ہوا ہے۔ آپ کو یہ بات بہت ناپسند ہوئی۔ کیوں کہ یہ انسان کی عاجزانہ حیثیت کے خلاف تھی۔ آپ نے لوگوں کو جمع کر کے تقریر کی، آپ نے فرمایا:

ان الشمس والقمر لا ینخسفان لموت احد من الناس	سورج چاند میں کسی انسان کی موت سے گہن نہیں لگتا۔ وہ اللہ
ولکنھما آیتان من آیات اللہ، فاذا رأیتموھا فصلوا	کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں۔ جب تم ایسا دیکھو تو نماز پڑھو

مدینہ میں باقاعدہ اسلامی حکومت قائم ہو چکی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ذمہ دار اعلیٰ ہیں۔ اس زمانہ میں آپ کو ایک بار ایک یہودی سے قرض لینے کی ضرورت پیش آئی جس کا نام زید بن سعنہ تھا۔ قرض کی ادائگی کے لئے جو مدت طے ہوئی تھی، ابھی اس میں چند دن باقی تھے کہ یہودی تقاضا کرنے کے لئے آگیا۔ اس نے آپ کے کندھے کی چادر اتارلی اور کرتا پکڑ کر سختی سے بولا: "میرا قرض ادا کرو۔" پھر کہنے لگا "عبدالمطلب کی اولاد بڑی نادہندہے۔"

حضرت عمر فاروق رض اس وقت آپ کے ساتھ تھے۔ یہودی کی بدتمیزی پر ان کو سخت غصہ آگیا۔ انھوں نے اس کو ڈانٹا۔ قریب تھا کہ اس کو مارنا شروع کر دیتے مگر پیغمبر اسلام صرف مسکراتے رہے۔ یہودی سے صرف اتنا کہا: ابھی تو وعدہ میں تین دن باقی ہیں (لقد بقی من اجلہ ثلاث) پھر عمر فاروق رض سے فرمایا:

انا وھو کنا الی غیر ھذا امنک احوج یا عمر، تامرنی بحسن القضاء وتامرہ بحسن التقاضی

(رواہ البیہقی مفصلاً)

عمر! میں اور یہ یہودی تم سے ایک اور برتاؤ کے زیادہ ضرورت مند تھے، مجھ سے تم بہتر ادائگی کے لئے کہتے اور اس سے بہتر تقاضے کے لئے۔

پھر عمر فاروق رض سے فرمایا کہ جاؤ فلاں شخص سے کھجوریں لے کر اس کا قرض ادا کر دو۔ اور بیس صاع (تقریباً ۴۰ کیلو) زیادہ دینا، کیونکہ تم نے اسے جھڑکا تھا۔

پیغمبر اسلام کو اپنی زندگی میں اتنی کامیابی حاصل ہوئی کہ آپ عرب سے لے کر فلسطین تک کے علاقہ کے حکمراں بن گئے۔ رسول اللہ ہونے کی وجہ سے آپ کی زبان قانون کا درجہ رکھتی تھی۔ آپ ایسے لوگوں کے درمیان تھے جو آپ کی عقیدت و تعظیم اتنی زیادہ کرتے تھے جو کبھی کسی انسان کی نہیں کی گئی۔ حدیبیہ کی بات چیت کے موقع پر عروہ بن مسعود قریش کے سفیر کی حیثیت سے آئے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جب آپ وضو کرتے ہیں تو لوگ دوڑ پڑتے ہیں کہ آپ کا غسالہ زمین پر گرنے سے پہلے ہاتھ پہ لے لیں اور اس کو تبرک کے طور پر جسم پر ملیں۔ انس رض کہتے ہیں کہ انتہائی محبت کے باوجود ہم لوگ آنکھ بھر کر آپ کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مغیرہ کہتے ہیں کہ کسی صحابی کو آپ کی رہائش گاہ پر دستک دینے کی ضرورت ہوتی تو وہ ناخن سے دروازہ کھٹکھٹاتا تھا۔ جابر بن سمرہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سرخ چادر اوڑھ کر چاندنی رات میں سو رہے تھے۔ میں کبھی چاند کو دیکھتا، کبھی آپ کو۔ بالآخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ آپ چاند سے زیادہ خوش نما ہیں (فاذا ھو احسن عندی من القمر) حنین میں جب جنگ کے شروع میں مسلم فوج کو شکست ہوئی اور مخالف فوج نے آپ کے اوپر تیروں کی بارش شروع کر دی تو آپ کے ساتھیوں نے آپ کو گھیرے میں لے لیا، وہ سارے تیر اپنے ہاتھ اور جسم پر اس طرح روکتے رہے جیسے وہ انسان نہیں، لکڑی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض ساتھیوں کا یہ حال ہوا کہ ان کے جسم پر ساہی کے کانٹے کی طرح تیر لٹکنے لگے تھے۔

اس قسم کا مرتبہ اور عقیدت آدمی کے مزاج کو بگاڑ دیتا ہے۔ وہ اپنے کو دوسروں سے بڑا سمجھنے لگتا ہے۔ مگر آپ لوگوں کے درمیان بالکل عام انسان کی طرح رہتے۔ کوئی تلخ تنقید یا اشتعال انگیز رویہ آپ کو آپے سے باہر کرنے والا ثابت نہ ہوتا۔ صحیحین میں حضرت انس رض سے منقول ہے کہ ایک دیہاتی آیا۔ اس نے آپ کی چادر کو زور سے کھینچا جس

کندھے پر اس کی چادر کے نشان پڑ گیا۔ پھر بولا: "محمد! یہ جو دو اونٹ ہیں۔ ان کو لاد کر سامان مجھے دو کیونکہ جو مال تمہارے پاس ہے وہ نہ تیرا ہے، نہ تیرے باپ کا ہے۔" آپ نے فرمایا مال تو اللہ کا ہے اور میں اس کا عبد ہوں۔ پھر آپ نے پوچھا جو برتاؤ تم نے مجھ سے کیا، "اس پر تم ڈرتے نہیں؟" وہ بولا نہیں۔ آپ نے پوچھا کیوں۔ اس نے کہا: مجھے معلوم ہے کہ تم برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے۔ آپ یہ سن کر ہنس پڑے اور حکم دیا کہ دیہاتی کو ایک اونٹ کا بوجھ جو اور ایک کی کھجوریں دی جائیں۔

آپ پر خدا کی ہیبت اتنی طاری رہتی کہ آپ بالکل عجز اور بندگی کی تصویر بنے رہتے تھے۔ بہت کم بولتے، چلتے تو جھک کر چلتے۔ تشہد سے کبھی خاموش نہ ہوتے۔ کپڑا پہنتے تو فرماتے کہ میں خدا کا بندہ ہوں اور بندوں کی طرح لباس پہنتا ہوں (انما انا عبد البس کما یلبس العبد) کھانا کھاتے تو ادب کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے اور فرماتے کہ میں بندوں کی طرح کھانا کھاتا ہوں (انا اکل کما یاکل العبد)

اس معاملہ میں آپ کے نزاکت احساس کا عالم یہ تھا کہ آپ کے ایک ساتھی نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے ایک بار کہا: ماشاء اللہ وما شئت (جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں) یہ سنتے ہی آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، آپ نے درشتی کے ساتھ فرمایا: اجعلتنی للہ ندا (کیا تم نے مجھے اللہ کے برابر کر دیا) تم کو اس طرح کہنا چاہئے: ماشاء اللہ وحدہ (وہ ہوگا جو اللہ چاہے) اسی طرح ایک صحابی نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

من یطع اللہ ورسولہ فقد رشد ومن یعصہما فقد غوی	جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے وہ راہ راست پر ہے اور جو ان دونوں کی نافرمانی کرے وہ گمراہ ہے۔

آپ نے یہ سن کر فرمایا: بئس خطیب القوم انت (تو قوم کا برا خطیب ہے) آپ نے پسند نہیں فرمایا کہ اللہ اور رسول کو تثنیہ کی ایک ہی ضمیر میں جمع کر دیا جائے۔

پیغمبر اسلام کے یہاں تین لڑکے پیدا ہوئے جو بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔ چار صاحبزادیاں بڑی عمر کو پہنچیں۔ چاروں حضرت خدیجہ کے بطن سے تھیں۔ حضرت فاطمہ آپ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ آپ حضرت فاطمہؓ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ کسی سفر سے واپس لوٹتے تو مسجد میں دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ کے گھر جاتے۔ ان کے ہاتھ اور پیشانی کو چومتے۔ حضرت عائشہؓ سے جمیع بن عمیر صحابی نے پوچھا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب کون تھا۔ انھوں نے جواب دیا "فاطمہؓ"

مگر پیغمبر اسلام کی پوری زندگی آخرت میں ڈھل گئی تھی۔ اس لئے اولاد سے محبت کا مفہوم بھی آپ کے یہاں دوسرا تھا۔ ایک روایت جو نسائی کے سوا دوسری تمام کتب صحاح میں نقل ہوئی ہے، یہ ہے کہ علی مرتضیٰؓ نے ایک بار ابن عبدالواحد سے فرمایا۔ میں تجھ کو فاطمہ بنت رسولؐ کی ایک بات سناؤں جو سارے کنبہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب تھیں۔ ابن عبدالواحد نے کہا، ہاں۔

حضرت علیؓ نے کہا۔ فاطمہ کا یہ حال تھا کہ چکی پیستیں تو ہاتھ میں چھالے پڑ جاتے۔ پانی کی مشک اٹھانے کی وجہ

سے گردن میں نشان پڑ گیا تھا۔ جھاڑو دیتیں تو کپڑے میلے ہو جاتے۔ انھیں دنوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ خادم آئے۔ میں نے فاطمہ سے کہا تم اپنے والد کے پاس جاؤ اور اپنے لئے ایک خادم مانگو۔ فاطمہ گئیں۔ مگر وہاں بول نہ سکیں۔ اگلے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر آئے اور پوچھا کیا ضرورت تھی۔ فاطمہ چپ ہو گئیں۔ میں نے قصہ بتایا اور یہ بھی کہا کہ میں نے ان کو کہلا کر بھیجا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سننے کے بعد فرمایا:

اتقی اللہ یا فاطمۃ وادّی فریضۃ ربک واعمل عمل اھلک، واذا اخذت مضجعک فسبحی ثلاثا وثلاثین واحمدی ثلاثا وثلاثین وکبّری اربعا وثلاثین، فذلک مائۃ، ھی خیرلک من خادم

اے فاطمہ خدا سے ڈرو۔ اپنے رب کے فرائض ادا کرو۔ اپنے گھر والوں کا کام کرو۔ جب بستر پر جاؤ تو ۳۳ بار خدا کی تسبیح کرو، ۳۳ بار خدا کی حمد کرو۔ ۳۴ بار خدا کی تکبیر کرو۔ یہ پورا سو ہو گیا۔ یہ تمھارے لئے خادم سے بہتر ہے۔

حضرت فاطمہؓ نے یہ سن کر کہا رضیت من اللہ ومن رسولہ (میں خدا اور رسول سے اس پر خوش ہوں) حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بس یہ جواب دیا اور فاطمہ کو خادم نہیں دیا۔ (ولم یخدمھا)

پیغمبر اسلام پر جو حقیقت کھولی گئی، وہ یہ تھی کہ یہ عالم بے خدا نہیں ہے۔ اس کا ایک خدا ہے اور وہی اس کا خالق اور مالک ہے۔ سارے انسان اس کے بندے ہیں اور اسی کے سامنے بالآخر جواب دہ ہیں۔ مرنے کے بعد آدمی ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ دوسری دنیا میں اپنی مستقل زندگی شروع کرنے کے لئے داخل ہو جاتا ہے۔ وہاں نیک آدمیوں کے لئے جنت کا آرام ہے اور برے لوگوں کے لئے جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ۔

خدا نے جب آپ کو اس حقیقت کا علم دیا تو یہ بھی حکم دیا کہ سارے انسانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر دو۔ مکہ کے کنارے صفا نام کی ایک چٹان تھی جو اس زمانہ میں عوامی اجتماعات کے لئے قدرتی اسٹیج کا کام دیتی تھی۔ آپ نے صفا پر چڑھ کر لوگوں کو پکارا۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے تقریر کی۔ آپ نے خدا کی عظمت و کبریائی بیان کرنے کے بعد کہا:

واللہ لتموتن کما تنامون ولتبعثن کما تستیقظون وانھا لجنۃ ابدا او لنار ابدا

خدا کی قسم تم یقیناً مرو گے جس طرح تم سوتے ہو اور دوبارہ زندہ ہو گے جس طرح تم جاگتے ہو۔ اس کے بعد یا تو ہمیشہ کے لئے جنت ہے یا ہمیشہ کے لئے آگ۔

زمانہ کے خلاف کسی طریقہ کو آدمی صرف ذاتی طور پر اختیار کرے، اس وقت بھی اگرچہ قدم قدم پر مشکلیں پیش آتی ہیں، تاہم یہ مشکلیں جارحانہ نوعیت کی نہیں ہوتیں۔ یہ مشکلیں آدمی کے جذبات کو ٹھیس پہنچاتی ہیں۔ مگر وہ آدمی کے جسم کو زخمی نہیں کرتیں۔ یہ زیادہ سے زیادہ آدمی کے خاموش صبر کا امتحان ہوتی ہیں۔ مگر اس وقت صورت حال بالکل بدل جاتی ہے جب آدمی زمانہ کے خلاف ایک آواز کا داعی بن کر کھڑا ہو جائے، جب وہ دوسروں سے کہنے لگے کہ یہ کرو اور وہ نہ کرو۔ پیغمبر اسلام صرف ایک بندۂ مومن نہ تھے بلکہ پیغام الٰہی کو دوسروں تک پہنچانے کا مشن بھی آپ کے سپرد کیا گیا۔

تھا۔ آپ کی اس دوسری حیثیت نے آپ کو پوری عرب قوم سے ٹکرا دیا۔ فاقہ سے لے کر جنگ تک سخت ترین حالات پیش آئے۔ مگر ۲۳ سال کی پوری زندگی میں آپ مکمل طور پر انصاف اور تقویٰ پر قائم رہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ آپ کے اندر انسانی جذبات نہیں تھے، اصل یہ ہے کہ خدا کے خوف نے آپ کو پابند بنا رکھا تھا۔

ہجرت کے تیسرے سال مکہ کے مخالفین نے مدینہ پر چڑھائی کی اور وہ معرکہ پیش آیا جس کو غزوۂ احد کہا جاتا ہے اس جنگ میں ابتداءً مسلمانوں نے فتح پائی۔ مگر اس کے بعد آپ کے بعض ساتھیوں کی غلطی سے دشمنوں کو موقع مل گیا اور انھوں نے پیچھے سے حملہ کرکے جنگ کا نقشہ بدل دیا۔ یہ بڑا بھیانک منظر تھا۔ آپ کے اکثر ساتھی میدان جنگ سے بھاگنے لگے۔ یہاں تک کہ آپ مسلح دشمنوں کے نرغہ میں تنہا ہو گئے۔ مخالف ہجوم بھوکے بھیڑیئے کی طرح آپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کو پکارنا شروع کیا الی عباد اللہ (خدا کے بندو میری طرف آؤ) من رجل یشری لنا نفسہ (کون ہے جو ہمارے لئے اپنی جان قربان کرے) کون ہے جو ان ظالموں کو مجھ سے ہٹائے، وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا (مسلم)

وہ کیسا ہولناک سماں ہوگا۔ جب خدا کے رسول کی زبان سے اس قسم کے الفاظ نکل رہے تھے۔ اگرچہ آپ کے ساتھیوں میں سے ایک تعداد نے آپ کی پکار پر لبیک کہی۔ مگر اس وقت اتنا انتشار کا عالم تھا کہ آپ کے جاں نثار بھی آپ کو پوری طرح بچانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ عتبہ ابن ابی وقاص نے آپ کے اوپر ایک پتھر پھینکا۔ یہ پتھر آپ کو اتنے زور سے لگا کہ ہونٹ چھل گئے اور نیچے کے دانت ٹوٹ گئے۔ عبد اللہ ابن قمیہ قریش کا مشہور پہلوان تھا۔ اس نے آپ پر شدید حملہ کیا جس کے نتیجہ میں لوہے کی خود کی دو کڑیاں آپ کے رخسار میں گھس گئیں۔ یہ کڑیاں اتنی گہرائی تک گھسی تھیں کہ ابو عبیدہ بن الجراح نے جب ان کو نکالنے کے لئے اپنے دانتوں سے پکڑ کر کھینچا تو ابو عبیدہ رضی کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ایک اور شخص عبد اللہ بن شہاب زہری نے آپ کو پتھر مارا جس سے آپ کی پیشانی زخمی ہو گئی۔ مسلسل خون بہنے سے آپ بے حد کمزور ہو گئے۔ حتیٰ کہ آپ ایک گڑھے میں گر پڑے۔ میدان میں جب آپ دیر تک نظر نہیں آئے تو مشہور ہو گیا کہ آپ شہید ہو گئے۔ اس دوران میں آپ کے ایک صحابی کی نظر گڑھے کی طرف گئی وہ آپ کو دیکھ کر خوشی میں بول پڑے: "رسول اللہ یہاں ہیں" آپ نے انگلی کے اشارے سے ان کو منع کیا کہ چپ رہو۔ دشمنوں کو میری یہاں موجودگی کا علم نہ ہونے دو۔ (فاشار الیہ الرسول ان اصمت، نور الیقین فی سیرۃ سید المرسلین۔ محمد الخضری، صفحہ ۱۳۰)

ایسے خوفناک حالات میں آپ کی زبان سے قریش کے بعض سرداروں (صفوان، سہیل، حارث) کے لئے بددعا کے الفاظ نکل گئے۔ آپ نے کہا: کیف یفلح القوم شجوا نبیھم (وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جو اپنے نبی کو زخمی کرے) آپ کی زبان سے اتنی بات بھی اللہ کو پسند نہیں آئی۔ اور جبریل خدا کی طرف سے یہ وحی لے کر آ گئے:

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ (آل عمران)

تم کو معاملہ کا کوئی اختیار نہیں۔ خدا یا ان کو توبہ کی توفیق دے گا یا ان کو عذاب دے گا۔ کیوں کہ وہ ظالم ہیں۔

خدا کی طرف سے اتنی تنبیہ کافی تھی۔ فوراً آپ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ آپ زخموں سے نڈھال تھے۔ مگر ظالموں

کے حق میں ہدایت کی دعا فرما رہے ہیں۔ آپ کے ایک ساتھی عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ "اس وقت بھی گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے سامنے ہیں۔ آپ اپنی پیشانی سے خون پونچھتے جاتے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں:

رب اغفر لی قومی فانہم لا یعلمون — خدایا میری قوم کو معاف کر دے۔ کیونکہ وہ نہیں جانتے

مسلم، غزوہ احد، جلد ۲، صفحہ ۱۰۸)

اوپر جو واقعات نقل کیے گئے، وہ اس قسم کے ان بے شمار واقعات میں سے صرف چند ہیں جو حدیث اور سیرت کی کتابوں میں بھرے ہوئے ہیں۔ یہ واقعات بتاتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کی زندگی کس طرح انسانی کردار کا معیاری نمونہ تھی۔ یہ واقعات عمل کی زبان میں یہ سبق دیتے ہیں کہ انسان خدا کا بندہ ہے اور اس کو ہر حال میں خدا کا بندہ بن کر رہنا چاہئے خدا اور بندے کے درمیان تعلق کا تقاضا ہے کہ بندے کے دل میں ہر وقت خدا کا اور اس کی آخرت کا طوفان برپا رہے ساری کائنات اس کے لئے یاد الٰہی کا دسترخوان ہو جائے۔ وہ ہر واقعہ کو خدا کی نظر سے دیکھے اور ہر چیز میں خدا کا نشان پائے۔ دنیا میں کوئی معاملہ کرتے وقت وہ کبھی یہ نہ بھولے کہ بالآخر سارا معاملہ خدا کے ہاتھ میں جانے والا ہے۔ جہنم کا خوف اس کو انسانوں سے تواضع اختیار کرنے پر مجبور کرے اور جنت کا شوق دنیا کو اس کی نظر میں بے حقیقت بنا دے۔ خدا کی بڑائی کا خیال اس کے ذہن پر اس قدر چھا جائے کہ اپنی بڑائی کا کوئی بھی مظاہرہ اس کو مضحکہ خیز دکھائی دینے لگے۔ کوئی تنقید اس کو مشتعل نہ کرے اور کوئی تعریف اس کے ذہن کو بگاڑنے والی ثابت نہ ہو —— یہ ہے انسانی کردار کا وہ نمونہ جو خدا کے رسول نے اپنے عمل سے ہمیں بتایا ہے۔

نوٹ: ۸ مئی ۱۹۷۷ کو چندی گڑھ میں ایک سیرت کانفرنس ہوئی جس میں مقامی غیر مسلم بھی بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر یہ مقالہ بشکل تقریر پیش کیا گیا۔

پیغمبر اسلام کی زندگی دنیا میں سب سے زیادہ حیرت انگیز اور سب سے زیادہ مکمل زندگی ہے۔ مگر سیرت کی بے شمار کتابوں کے باوجود آپ کی اصل سیرت لکھنے کا کام ابھی تک باقی ہے۔ سیرت کی قدیم کتابوں میں اشعار، بے اصل قصے اور غزوات کا پہلو اتنا غالب ہے کہ اس نے رسول کی اصل سیرت کو ڈھک لیا ہے۔ بعد کے دور میں سیرت کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئیں، ان میں فقہی مسائل، کلامی بحثیں، تعبیری اضافے اصل سیرت کو چھپائے ہوئے ہیں۔ کوئی سیرت کو عنوان بنا کر اسلام کا دائرۃ المعارف مرتب کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

ضرورت ہے کہ سیرت پر ایک ایسی جامع کتاب تیار کی جائے جو صرف "سیرت" ہو۔ وہ آپ کی زندگی کا واقعاتی مرقع ہو۔ وہ نہ "مغازی" کی داستان ہو اور نہ دوسری، سیرت سے غیر متعلق بحثوں سے اس کو بوجھل بنایا گیا ہو۔ یہ ایک ایسا کام ہے جو کافی محنت اور وسیع ذرائع چاہتا ہے۔ تاہم اگر ایسی ایک کتاب وجود میں آجائے تو وہ موجودہ زمانہ میں لکھی جانے والی لاکھوں کتابوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگی۔

جنت والے

امام نسائی نے انس بن مالک سے نقل کیا ہے۔ ایک بار تین دن تک مسلسل یہ ہوتا رہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مجلس میں یہ فرماتے کہ اب تمھارے سامنے ایک ایسا شخص آنے والا ہے جو اہل جنت میں سے ہے۔ ہر بار یہ آنے والے انصار میں سے ایک شخص ہوتے۔ یہ دیکھ کر عبد اللہ بن عمرو بن عاص کو جستجو ہوئی کہ آخر وہ کون سا عمل کرتے ہیں جس کی بنا پر آپ نے ان کے بارے میں بار بار یہ بشارت سنائی ہے۔ چنانچہ وہ ایک بہانہ کر کے گئے اور تین روز تک مسلسل ان کے یہاں رات گزارتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ شاید کوئی خاص عبادت کرتے ہوں گے جس کی وجہ سے ان کو یہ مقام ملا۔ مگر ان کی عبادت اور شب گزاری میں کوئی غیر معمولی چیز ان کو دکھائی نہ دی۔ آخر انھوں نے خود ہی ان سے پوچھا کہ بھائی، آپ کون سا ایسا عمل کرتے ہیں جس کی بنا پر ہم نے رسول اللہ کی زبان سے آپ کے بارے میں یہ عظیم بشارت سنی ہے۔ انھوں نے کہا، میری عبادت کا حال تو وہی ہے جو آپ نے دیکھا البتہ ایک بات شاید اس کا سبب بنی ہو، اور وہ یہ کہ:

لا اجد فی نفسی غلا لاحد من المسلمین

ولا احسد کا علی خیر اعطاہ اللہ تعالی

میں اپنے دل میں کسی مسلمان کے خلاف کوئی کینہ نہیں رکھتا۔ اور نہ کسی ایسی بھلائی پر جو اللہ نے اسے دی ہو، اس سے حسد کرتا ہوں۔

زندگی کیا ہے، موت کی طرف ایک سفر۔ ہر شخص دوسروں کو اپنے سامنے مرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ مگر خود اس طرح زندگی گزارتا ہے گویا اس کو کبھی موت نہیں آئے گی۔

کوئی رصدگاہ اگر کسی دن یہ دریافت کرے کہ زمین کی جذب وکشش کی قوت ختم ہو گئی ہے تو اگلے دن یہی دریافت تمام اخباروں کی شاہ سرخی ہوگی۔ کیوں کہ اس قسم کی خبر زمین کے لئے موت کے سفر کے ہم معنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین کا کرہ چھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کی طرف کھنچنا شروع ہو جائے اور چند ہفتوں کے اندر اپنے سے بارہ لاکھ گنا بڑے سورج کے الاؤ میں اس طرح جا گرے جیسے دنیا کے سب سے بڑے آتش فشاں کے اندر کوئی ایک تنکا۔

زمین کے لئے موت کے سفر کی خبر کسی دن اخبار میں چھپ جائے تو ساری دنیا میں کہرام مچ جائے گا۔ ہم میں سے ہر شخص اس قسم کے ہولناک تر سفر میں ہے۔ مگر کوئی نہیں جو اس سے چوکنا ہو اور اپنی زندگی کے آئندہ مراحل میں بربادی سے بچنے کی فکر کرے — سب سے بڑا مسئلہ موت کا مسئلہ ہے مگر لوگ زندگی کے مسائل میں اتنا الجھے ہوئے ہیں کہ کسی کو موت کے مسئلہ پر دھیان دینے کی فرصت نہیں۔

المركز الاسلامی

AL-MARKAZ-UL-ISLAMI (Regd.)

ISLAMIC CENTRE

JAMIAT BUILDING - QASIMJAN STREET - DELHI 110006 (India)

اسلام کا مطلب ہے اپنے آپ کو خدا کے آگے سپرد (SURRENDER) کر دینا۔ مسلمان وہ ہے جو اس بات پر یقین رکھتا ہو کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ وہ مرنے کے بعد ہر ایک سے اس کے کارنامہ زندگی کا حساب لے گا۔ اس کے بعد اپنے وفادار بندوں کے لئے دائمی جنت کا فیصلہ کرے گا، اور غیر وفادار بندوں کو دائمی جہنم میں ڈال دے گا۔ اس احساس کے تحت جو زندگی بنتی ہے، اس کو ایک لفظ میں آخرت رخی زندگی (AKHIRAT ORIENTED LIFE) کہہ سکتے ہیں۔

یہ احساس جب کسی دل میں پیدا ہو جائے تو اس کی پوری زندگی بدل جاتی ہے۔ وہ ہر وقت خدا سے ڈرنے لگتا ہے۔ کیوں کہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ خدا اس کو کھلے اور چھپے ہر حال میں دیکھ رہا ہے، بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے وہ ہمیشہ انصاف اور خیر خواہی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ ہر انسان کے پیچھے اس کا خدا کھڑا ہوا ہے۔ وہ کبھی اس بات کو نہیں بھولتا کہ بالآخر وہی چیز صحیح قرار پائے گی جس کو خدا صحیح کہے اور وہ سب کچھ غلط ٹھہرے گا جس کو خدا غلط ٹھہرائے۔

اسی کے ساتھ مسلمان کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کی اس حقیقت کو دوسری تمام قوموں تک پہنچائے۔ اس سنگین واقعہ سے لوگوں کو باخبر کرنے کے لئے پہلے انبیاء آتے تھے۔ ختم نبوت کے بعد یہ ذمہ داری نبی آخر الزماں کی امت پر ڈال دی گئی ہے، مسلمان پر جس طرح خود عمل کرنے کی ذمہ داری ہے، اسی طرح دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری ہے۔ ان میں سے کوئی ایک کام، دوسرے کام کے لئے خدا کے یہاں عذر نہیں بن سکتا۔

اسلامی مرکز کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کو دنیوی مہم کے بجائے اُخروی مہم کے طور پر سامنے لایا جائے۔ اس کا منصوبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر ان احساسات کو جگائے، اور دوسری قوموں تک حق کا پیغام پہنچانے کی تدبیریں اختیار کرے۔

اسلامی مرکز کے سامنے پہلا کام یہ ہے کہ اسلام کو وقت کے اسلوب اور زمانہ حاضر کی زبان میں لوگوں کے سامنے لایا جائے۔ تاکہ جس اسلام کو وہ تقلیدی طور پر مانتے ہیں، وہ ان کے ذہن کی غذا بن سکے، وہ ان کے اندر عمل کی حرارت پیدا کرنے لگے۔ وہ ان کی زندگی کا محض ایک ضمیمہ نہ ہو، بلکہ وہی ان کی کل زندگی بن جائے۔ ہر عہد کا ایک فکری معیار ہوتا ہے، اور کسی انسان کی زندگی میں کوئی فکر اسی وقت غالب فکر بن کر داخل ہوتا ہے جب کہ وہ اس کو اس فکری معیار پر ملے جس کے اندر وہ سانس لے رہا ہے۔

اسلامی مرکز کے سامنے دوسرا کام، مسلمانوں کو داعی گروہ کی حیثیت سے اٹھانا ہے۔ دعوت ہی واحد کام ہے جو مسلمانوں میں عمل کا حوصلہ ابھار سکتا ہے، ان کے اندر اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا کرتا ہے، ان کو خدا کی اجتماعی نصرتوں کا مستحق بناتا ہے۔ ان کو آخرت میں خدا کے گواہ کا درجہ عطا کرتا ہے جس سے بڑا کوئی درجہ انسان کے لئے نہیں۔

اسلامی مرکز انھیں دونوں مقاصد کے تحت قائم کیا گیا ہے۔ کسی قسم کی سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ مسلمانوں کو اور تمام انسانوں کو آنے والے یوم الحساب سے ہوشیار کرنے کی ایک مہم ہے۔ زندگی میں آدمی کو بے شمار مسائل نظر آتے ہیں۔ مگر موت کے بعد ایک ہی مسئلہ اس کے سامنے ہوگا۔ ہم چاہتے ہیں کہ موت سے پہلے آدمی اس مسئلہ سے آگاہ ہو جائے، موت سے پہلے وہ اس کی تیاری میں اپنے کو لگا دے۔

ہمارا پروگرام

عربی، انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں میں رسائل کا اجراء جس کے ذریعہ مسلمانوں کو ان کی دعوتی ذمہ داری کی طرف متوجہ کیا جا سکے اور اسلام کو جدید اسلوب اور عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق مدلل کیا جائے۔

۲ قرآن کے ترجمے دنیا کی تمام زبانوں میں شائع کرنا اور ان کو رعایتی قیمت کے ساتھ لوگوں تک پہنچانا۔

۳ قرآنی علوم کی تدوین اور اسلامی انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت۔

۴ حدیث، سیرت، حالاتِ صحابہؓ، تاریخ اسلام (نہ کہ تاریخ فتوحات) پر سادہ، واقعاتی انداز میں کتابوں کی تیاری اور ان کو مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۵ ایسی درس گاہ کا قیام جس میں قرآن، حدیث، سیرت، تقابلی مذہب، عربی زبان اور دوسری زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہو۔

۶ اسلامیات اور مختلف مذاہب کے مطالعہ کے لئے ایک مکمل لائبریری کا قیام۔

۷ مختلف علاقوں اور ملکوں میں تبلیغی وفود بھیجنے کا انتظام۔

۸ اسلام کے تاریخی آثار اور دستاویزات کا میوزیم قائم کرنا۔

۹ علمی طرز فکر اور حقیقت پسندانہ مزاج پیدا کرنا۔

۱۰ جدید طرز کے پریس کا قیام جہاں مختلف زبانوں میں اعلیٰ چھپائی ہو سکے۔

۱۱ ایسے ادارہ کی تشکیل جہاں تمام ضروری دینی شعبے قائم ہوں اور غیر مسلم وہاں آکر اسلام کو سمجھ سکیں۔

اسلامی مرکز کے سلسلہ میں تمام امور کے لئے براہ راست صدر سے رجوع کیا جائے

خطوط وغیرہ بر حسب ذیل پتہ تحریر کیا جائے:

مولانا وحیدالدین خاں، صدر اسلامی مرکز، جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

MAULANA WAHIDUDDIN KHAN
PRESIDENT, ISLAMI MARKAZ
JAMIAT BUILDING
QASIMJAN STREET, DELHI 6

اسلامی تاریخ: ایک مطالعہ

نبیوں کی دعوت ایک تھی۔ مگر ان کی تاریخیں مختلف ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دعوت کیا ہو، اس کا تعلق صرف داعی سے ہے۔ جب کہ تاریخ کا تعلق داعی اور مدعوّدونوں سے ہوجاتا ہے۔ تمام انبیاء کو خدا کی طرف سے ایک ہی دین ملا اور وہ ایک ہی دعوت کو لے کر ہمیشہ اپنی مخاطب قوموں کے سامنے کھڑے ہوتے رہے۔ مگر مدعو اقوام کا ردعمل مختلف رہا، اس لئے ان کے تعلق سے جو تاریخ بنی، وہ یکساں نہیں ہو سکتی تھی۔

حضرت ابراہیمؑ کو اپنے وطن عراق میں ساتھی نہ ملے تو آنجناب اپنے بھتیجے اور اپنی اہلیہ کو لے کر غیر آباد جگہ چلے گئے کہ وہاں توحید کا ایک عبادت خانہ بنائیں۔ حضرت یوسفؑ کی شخصیت اور تعبیر رویا سے مصر کا بادشاہ متاثر ہوگیا۔ اس طرح آپ کو موقع ملا کہ اس کے اقتدار اعلیٰ کے تحت انتظام ملکی کا عہدہ سنبھال سکیں۔ حضرت موسیٰؑ کو مصر سے نکلنے کے بعد ایک پوری قوم (بنی اسرائیل) کی سیادت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ آپ نے صحرائے سینا کی آزاد فضا میں قوانین الٰہی کی بنیاد پر ایک معاشرہ قائم کیا۔ حضرت مسیحؑ نے دعوتی مرحلہ میں فلسطین کے رومی اقتدار سے کشمکش پیدا کرنا مصلحت کے خلاف سمجھا، اس لئے اپنے شاگردوں کو تلقین کی کہ —— "جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو، جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو"

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت بھی اسی دین کی طرف تھی جو دوسرے انبیاء لے کر آئے۔ مگر آپ کی قوم نے جہاں آپ کی شدید مخالفت کی، قوم کے اندر سے ہزاروں کی تعداد میں آپ کو اعلیٰ درجہ کے ساتھی بھی مل گئے آپ نے قوم کی جارحانہ کارروائیوں کے خلاف اپنے ساتھیوں کو منظم کیا۔ مقابلہ میں اللہ کی مدد سے آپ کو فتح حاصل ہوئی اور اسلام کا اقتدار قائم ہوگیا۔

اسلامی غزوات میں دشمنان خدا کا قتل کیا جانا اسی طرح اسلامی تاریخ کا ایک اضافی جزو تھا جس طرح اس سے پہلے حضرت یحییٰؑ اور اصحاب الاخدود کا قتل ہوجانا۔ مگر بعد کے دور میں جب اسلام کی تاریخیں لکھی گئیں تو جنگ و مقابلہ کا پہلو اس کے اوپر چھا گیا۔ کیونکہ قدیم ذوق کے مطابق اسلامی تحریک کے غیر سیاسی پہلو بہت کم قلم بند ہو سکے۔ البتہ قتال اور سیاسی معرکہ آرائیوں کے واقعات کو خوب نمایاں کرکے بیان کیا گیا۔ اس طرح اسلام کی مدون تاریخ عملاً مغازی اور فتوحات کی داستان ہو کر رہ گئی۔

اگر ایسا ہوتا کہ عرب کے سردار، حضرت یوسفؑ کے ہم عصر مصری حکمراں کی طرح، آغاز ہی میں اسلام سے متاثر ہوجاتے یا ملکہ سبا کی طرح رومی حکمراں اسلام قبول کر لیتے تو اسلام کی تاریخ بالکل دوسری ہوتی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تاریخ سے عقیدہ اخذ کرنا کیوں صحیح نہیں ہے۔ اس قسم کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حضرت یوسفؑ کو ماننے والے کہیں گے کہ پیغمبرانہ طریق کار یہ ہے کہ وقت کے حکمراں سے صاف لفظوں میں مطالبہ کیا جائے کہ اجعلنی علی خزائن الارض

نذیین کے خزانے میرے حوالے کر دو ۔ حضرت مسیح کو ماننے والے کہیں گے کہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ حکومت وقت سے تعرض نہ کرتے ہوئے خدا کے حقوق ادا کئے جاتے رہیں ۔ حضرت ابراہیم سے اسوہ لینے والوں کو اصل کام یہ نظر آئے گا کہ جب لوگ دعوت حق کو نہ مانیں تو داعی کو چاہئے کہ وہ بستی کو چھوڑ کر دور کسی صحرا میں چلا جائے اور وہاں خدا کا گھر بنا کر عبادت کرے ۔ نبی آخر الزماں کو ماننے والے کہیں گے کہ بدر و احد اور حنین و احزاب کے معرکے گرم کرنے کا نام اسلام ہے ۔ قرآن میں ہے کہ تمام پیغمبروں کو اللہ نے ہدایت دی (انعام ۔ ۸۴) تو تم انھیں کے راستہ پر چلو (انعام ۔ ۹۰) اب اگر تاریخ سے عقیدہ اخذ کیا جائے تو وہ کون سا واحد راستہ ہوگا جس پر چلنا تمام نبیوں کے راستہ پر چلنے کے ہم معنی ہو ۔

خدا کا دین ، عقیدہ بھی ہے اور تاریخ بھی ۔ مگر ہم عقیدہ کو عقیدہ سے سمجھ سکتے ہیں اس کو تاریخ سے اخذ نہیں کر سکتے ۔

قرآن کی مکی سورتوں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی دس سالہ زندگی سے ثابت ہے کہ مکہ میں اسلام کی دعوت بالکل غیر سیاسی انداز میں شروع ہوئی تھی ۔ توحید ، آخرت اور مواسات بنی آدم کی طرف آپ لوگوں کو متوجہ کرتے اور ایک خدا کی عبادت کی طرف بلاتے ۔ آپ نے یا آپ کے ساتھیوں نے کبھی کسی کے خلاف تشدد کا مظاہرہ نہیں کیا ۔ نہ کسی قسم کی سیاسی منازعت کی ۔ اس کے باوجود مکہ کے سردار بالکل یک طرفہ طور پر آپ کے خلاف ہو گئے ۔ انھوں نے آپ پر اور مسلمانوں پر ہر قسم کے ظلم ڈھانا شروع کئے ۔ سب وشتم سے لے کر سماجی اور معاشی بائیکاٹ تک ہر چیز کو آپ یک طرفہ طور پر برداشت کرتے رہے یہاں تک کہ انھوں نے طے کیا کہ سب مل کر آپ کو قتل کر ڈالیں ۔ اس وقت آپ مکہ سے ہجرت کرکے عرب کے دوسرے شہر یثرب چلے گئے ۔

سرداران عرب نے اب بھی آپ کو نہ چھوڑا ۔ وہ فوج لے کر آئے تاکہ اسلام کے مرکز کو تباہ کر ڈالیں ۔ اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو لے کر نکلے ۔ یہ جنگ آپ کی طرف سے تمام تر دفاعی تھی (بقرہ ۔ ۱۹۰) بدر کے مقام پر دونوں گروہوں میں مقابلہ ہوا ۔ خدا کی مدد آپ کے شامل حال رہی اور سرداران عرب کو زبردست شکست ہوئی ۔ اس شکست نے ان کو اور زیادہ مشتعل کر دیا ۔ اب محاذ جنگ اور وسیع ہو گیا ۔ مکہ کے قریش اور مدینہ اور خیبر کے یہود اسلام کو مٹانے کے لئے متحد ہو گئے ۔ اس کے نتیجہ میں احد (۳ھ) سے لے کر حنین (۸ھ) تک مسلسل جھڑپوں اور لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا ۔ بالآخر مسلمانوں کو فتح ہوئی اور مشرکین اور یہود دونوں کا زور ٹوٹ گیا ۔

عرب کے مشرکین اور یہود نے مل کر اسلام کو فنا کرنے کے لئے جو جارحانہ اقدام کیا تھا ، اس میں انھیں مکمل ناکامی ہوئی ۔ تاہم ان کے بچے کچھے افراد نے اب ایک اور منصوبہ بنایا ۔ انھوں نے یہ کوشش شروع کی کہ بیرونی حکومتوں (ایران و روم) کو اسلام کے خلاف ابھارا جائے اور ان کے ذریعہ اس کو کچلنے کی کوشش کی جائے ۔ یہ حکومتیں پہلے ہی سے عرب میں ایک نئی طاقت کے ابھرنے کو تشویش کی نظر سے دیکھ رہی تھیں ۔ اب خود عربوں ہی کے ایک طبقہ کی حمایت ملی تو وہ اور زیادہ جری ہو گئیں ۔ تاہم یہ واقعہ اسلام کے حق میں ایک عظیم تائید غیبی ثابت ہوا ، کیونکہ اس وقت کی آباد دنیا پر عملاً انھیں دونوں سلطنتوں کا غلبہ قائم تھا ۔ ان کی طرف سے قتال کے آغاز نے مسلمانوں کو موقع دے دیا کہ وہ اقدامات

سے لے کر اسپین تک فتح کرتے چلے جائیں بغیر اس کے کہ ان پر جارحیت کا الزام عائد ہوتا ہو۔

عرب کے پڑوس میں اس زمانہ کی دو سب سے بڑی سلطنتیں قائم تھیں۔ پورب میں خلیج فارس کے دوسری طرف ساسانی سلطنت تھی جس کے قبضہ میں موجودہ ایران کے علاوہ اطراف کے ملکوں (پاکستان، افغانستان، ترکی، عراق) کے حصے بھی شامل تھے۔ پچھم کی طرف بحر احمر کے دوسری جانب رومی سلطنت تھی جو شام و فلسطین سے شروع ہو کر بحر روم کے کنارے کنارے افریقہ کے تمام شمالی ملکوں پر قابض تھی۔ اس کے آگے اس کی سرحدیں یورپ میں بہت دور تک چلی گئی تھیں۔

ان دو شہنشاہیتوں نے قلب عرب کے خشک بیابان کو چھوڑ کر اس کے سرحدی علاقوں میں چاروں طرف اپنی ماتحت عرب ریاستیں قائم کر رکھی تھیں۔ اپنے زیر اثر علاقوں میں انھوں نے اپنے مذہب کو بھی پھیلا رکھا تھا۔ عرب کو اپنی سلطنت کا براہ راست حصہ نہ بنا کر بھی وہ اس کو اپنا ماتحت سمجھتے تھے۔ ابو طالب کی وفات کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے موسمی بازاروں میں گئے اور مختلف قبائل کے سامنے اپنے کو پیش کیا کہ مجھ کو اپنی حمایت میں لے لو تاکہ میں خدا کا پیغام پہنچانے کا کام کر سکوں۔ اس سلسلہ میں ایک سرحدی قبیلہ بنو شیبان کے سرداروں سے آپ کی گفتگو تاریخ میں نقل ہوئی ہے۔ گفتگو کا ایک حصہ یہ تھا:

قال المثنیٰ بن حارثہ: انما نزلنا بین صیرین، احدھما الیمامۃ والاخریٰ السمامۃ، فقال لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وما ھذان الصیرانؒ فقال لہ: اما احدھما فطفوف البر وارض العرب، واما الآخر فارض فارس وانہار کسریٰ، وانما نزلنا علی عھد اخذ علینا کسریٰ ان لا نحدث حدثا، ولا نؤوی محدثا۔ ولعل ھذا الامر الذی تدعوا الیہ تکرھہ الملوک۔ فاما ما کان یلی بلاد العرب فذنب صاحبہ مغفور وعذرہ مقبول۔ واما ما کان ممایلی بلاد فارس فذنب صاحبہ غیر مغفور، وعذرہ غیر مقبول۔ فان اردت ان ننصر ممایلی العرب فعلنا۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما اسأتم الرد اذا فصحتم بالصدق

(البدایہ والنہایہ)

مثنیٰ بن حارثہ نے کہا، ہمارا قیام دو سرحدوں کے درمیان ہے۔ ایک یمامہ دوسرے سمامہ۔ آپؐ نے پوچھا یہ دو سرحدیں کیا ہیں۔ سردار قبیلہ نے کہا، ایک طرف عرب کی زمین اور اس کی پہاڑیاں ہیں۔ دوسری طرف ایران کی زمین اور اس کی ندیاں ہیں اور ہم وہاں ایک معاہدہ کے تحت مقیم ہیں جو کسریٰ نے ہم سے لیا ہے۔ وہ یہ کہ ہم کوئی نئی بات نہ کریں گے اور نہ کسی نئی بات کرنے والے کو پناہ دیں گے۔ اور یہ بات جس کی طرف آپ بلاتے ہیں، شاید بادشاہوں کو ناگوار ہو۔ بلاد عرب کا معاملہ تو یہ ہے کہ وہ خطاکار کو معاف کر دیتے ہیں اور عذر کو قبول کر لیتے ہیں۔ مگر بلاد فارس میں خطاکار کی معافی نہیں ہوتی اور اس کا عذر قبول نہیں کیا جاتا۔ پس اگر آپ عرب علاقہ میں ہماری امداد چاہیں تو ہم اس کے لیے تیار ہیں۔ آپؐ نے فرمایا، تم نے جواب دینے میں کوئی برائی نہیں کی اگر تم سچے ہو۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہودی سلطنتوں نے کس طرح عرب کو اپنے سیاسی مفادات کے تابع بنا رکھا تھا۔

نبوت کے پانچویں سال جب اہل مکہ کے مظالم سے تنگ آ کر کچھ مسلمان حبش چلے گئے تو قریش کا ایک وفد وہاں پہنچا تھا اور حبش کے بادشاہ اصحمہ نجاشی کو مسلمانوں کے خلاف ابھارنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس میں وہ ناکام رہے۔

اب انھوں نے ایران اور روم کی شہنشاہیتوں کا رخ کیا۔ یہود اور مشرکین کے وفود رومی حکمرانوں اور ایرانی بادشاہوں سے ملے اور ان کو اسلام کے سیاسی خطرات سے آگاہ کیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ ایک طرف باہر سے کوئی حکومت اسلام کے مرکز (مدینہ) پر حملہ کرے، دوسری طرف عرب قبائل میں اندر سے بغاوت پیدا کر دی جائے۔ اس طرح مسلمانوں کو کچل کر رکھ دیا جائے۔ ایران و روم قدیم زمانہ کی سب سے بڑی سلطنتیں تھیں۔ ان کو قدیم آباد دنیا کے تقریباً تمام حصے پر سیادت حاصل تھی۔ اس لئے انھیں اپنی طاقت کا گھمنڈ تھا۔ وہ آسانی سے عرب کی اس نئی ابھرتی ہوئی قوت کو کچلنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف کے بادشاہوں کے نام دعوتی خطوط روانہ کئے۔ ان خطوط کا اصل مقصد اسلام کی دعوت کو وقت کے حکمرانوں تک پہنچانا تھا۔ تاہم اس کا ایک متوقع فائدہ یہ بھی تھا کہ یہ حکمراں اسلام کو اس کی اصل حیثیت میں سمجھ سکیں اور غلط پروپگنڈہ کی وجہ سے کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ نیز یہ بھی توقع تھی کہ اگر حکمرانوں میں سے کچھ لوگ اسلام کی دعوتِ فطرت سے متاثر ہو گئے تو یہودیوں اور مشرکوں کی سازشیں خود بخود کمزور پڑ جائیں گی۔ مکتوبات کی روانگی کے بعد یہ توقع جزوی طور پر پوری بھی ہوئی۔ بعض حکمرانوں (مثلاً عمان کے جلندی برادران) مسلمان ہو گئے۔ بعض (مثلاً مقوقس حاکم مصر) اسلام کے ہمدرد بن گئے۔

مگر دونوں بڑی سلطنتوں (ایران و روم) نے اس سے مختلف معاملہ کیا۔ اس کا پہلا شدید مظاہرہ اس وقت ہوا جب کہ عبداللہ بن حذافہ سہمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب لے کر ساسانی حکمراں خسرو پرویز کے دربار میں پہنچے۔ یہ خط بالکل سادہ مضمون پر مشتمل تھا۔ اس میں کوئی سیاسی بات نہ تھی۔ پورا خط صرف یہ تھا۔

"محمد رسول اللہ کی طرف سے کسریٰ شاہ فارس کے نام۔ سلام اس شخص پر جو ہدایت قبول کرے اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ میں تجھ کو اللہ کی عبادت کی طرف بلاتا ہوں۔ میں تمام انسانوں کی طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں تاکہ اللہ کے عذاب سے ڈراؤں۔ اور جو لوگ انکار کریں، ان کے لئے عذر باقی نہ رہے۔ اسلام قبول کرو، تمہارے لئے سلامتی ہوگی۔ اور اگر انکار کرو گے تو اپنی قوم مجوس کے انکار کا وبال بھی تمہارے اوپر ہوگا"

اس خط کو کسریٰ نے اپنی شان کے خلاف سمجھا اور غصہ میں بولا: میرا غلام ہو کر مجھ کو خطاب کرتا ہے (یکتب الی وھو عبدی)۔ اس نے آپ کے مکتوب کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ یہی نہیں۔ بلکہ بین اقوامی روایات کے تمام اصولوں کو توڑتے ہوئے آپ کے قتل کا فیصلہ کر ڈالا۔ یمن اس وقت اس کے ماتحت تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے یمنی گورنر باذان کو لکھا کہ محمدؐ کے پاس دو آدمی بھیجو جو ان کو گرفتار کر کے لائیں اور میرے دربار میں حاضر کریں۔ اس حکم کی تعمیل میں باذان نے اپنے دو سپاہی مدینہ روانہ کئے جو ناکام واپس گئے۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایرانی حکمراں کتنے متکبر تھے اور عربوں اور مسلمانوں کو کتنا حقیر

سمجھتے تھے۔

مدینہ کے یہود جن کو ان کی سازشوں اور بدعہدیوں کی وجہ سے تورات کے قانون کے مطابق، مدینہ سے جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ انھوں نے اپنے چالاک اور زبان آور ایلچیوں کو ایرانی دارالسلطنت مدائن بھیجا۔ انھوں نے ایرانیوں کو مدینہ پر چڑھائی کرنے کے لئے خوب ابھارا۔ چنانچہ ایرانی حکومت نے جدید عربی طاقت کو ختم کرنے کا مکمل ارادہ کر لیا۔ خلیفہ اول کے زمانے میں باقاعدہ ٹکراؤ شروع ہوا۔ مگر نتیجہ ان کے خلاف نکلا اور خلیفہ ثانی کے زمانے میں تقریباً پوری ساسانی سلطنت اسلام کے جھنڈے کے نیچے آ گئی۔ تاہم ساسانی سلطنت کا آخری وارث یزدگرد ابھی زندہ تھا۔ اس کے ساتھ کئی ہزار ایرانیوں کی جمعیت تھی۔ ان کی مدد سے وہ ایک قسم کی گوریلا وار حکومت اسلامی کے خلاف جاری کئے ہوئے تھا۔ بالآخر خلیفہ سوم کے زمانہ میں ایک پن چکی والے نے اس کو قتل کر دیا۔ یہ واقعہ مرو کے پاس مرغاب میں ۲۳ اگست ۶۵۱ء کو پیش آیا۔ اس کے بعد ایرانی سلطنت کا کوئی دعوے دار باقی نہ رہا۔

رومی شہنشاہ ہرقل کو بھی آپ نے اسی قسم کا خط بھیجا، جیسا کسریٰ کو بھیجا تھا۔ اس نے اگرچہ آپ کے مکتوب کے ساتھ کوئی گستاخی نہیں کی۔ تاہم شام میں ہرقل کی ماتحت جو غسانی ریاست قائم تھی، اس کے پاس جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد حارث بن عمیر ازدی آپ کا مکتوب لے کر گئے تو بصریٰ کے حاکم شرحبیل بن عمرو غسانی نے شام کی سرحد پر قاصد نبوی کو قتل کرا دیا۔ یہ صریح طور پر ایک حکومت کی دوسری حکومت پر جارحیت تھی۔ چنانچہ آپ نے اس کے جواب میں تین ہزار کی ایک جمعیت کو سرحد شام کی طرف روانہ کیا۔ ہرقل نے اپنے غسانی حاکم کو تنبیہ کرنے کے بجائے اس مقابلہ میں اس کا پورا ساتھ دیا اور اس کی مختصر فوج کے ساتھ اپنی ایک لاکھ رومی فوج میدان میں اتار دی۔ عربوں اور رومیوں کے درمیان وہ پہلی جنگ پیش آئی جو تاریخ اسلام میں غزوہ موتہ (جمادی الاولیٰ ۸ھ) کے نام سے مشہور ہے۔

پھر بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ قیصر روم براہ راست میدان میں آ گیا۔ عرب کی اس نئی ابھرتی ہوئی طاقت کو ابتدا ہی میں ختم کرنے کے لیے اس نے باقاعدہ تیاری شروع کر دی۔ سرحد شام کے سردار اور شاہ غسان، جو قیصر کے باج گذار تھے، ان کے تعاون سے اس نے بہت بڑا لشکر تیار کیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ مدینہ پر حملہ کر کے عرب کی اس ابھرتی ہوئی طاقت کو شروع ہی میں کچل دیا جائے۔ یہ رومی لشکر اسلامی دارالسلطنت کی طرف بڑھنا شروع ہوا اور بلقاء تک پہنچ گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبریں ملیں تو انتہائی ناموافق حالات کے باوجود آپ نے مسلمانوں کو تیار ہونے کا حکم دے دیا اور رجب ۹ھ میں ۳۰ ہزار کا لشکر لے کر رومی علاقہ کی طرف روانہ ہوئے۔ شام کی سرحد کو عبور کر کے آپ تبوک تک پہنچے تھے کہ معلوم ہوا کہ شاہ روم نے اس وقت مقابلہ کا ارادہ ترک کر کے اپنی فوجوں کو واپسی کا حکم دے دیا ہے۔

خلیفہ اول کے زمانے میں رومیوں سے باقاعدہ جنگ کا آغاز ٹھیک اسی مقام (موتہ) پر ہوا جہاں اس سے پہلے رومیوں نے مسلمانوں کی دو ہزار فوج کا خاتمہ کر دیا تھا۔ بعد کے مقابلوں میں مسلمانوں کی کامیابی نے رومیوں کے مخالفانہ جذبات کو اور بڑھا دیا اور وہ پوری طاقت سے مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ مگر اللہ کی مدد سے فیصلہ مسلمانوں کے موافق ہوتا چلا گیا۔ شام و فلسطین سے گزر کر یہ جنگ شمالی افریقہ کے رومی مقبوضات تک پہنچی اور مسلمان ایک کے بعد

ایک رومی ملکوں کو فتح کرتے ہوئے مراکش تک پہنچ گئے۔ اور بالآخر رمضان ۹۱ھ میں آبنائے جبرالٹر کو پار کرکے اسپین میں داخل ہو گئے۔ یہ سارا علاقہ جو مسلمانوں کے قبضہ میں آیا، وہ قدیم رومی سلطنت کا حصہ تھا۔ رومی حکمرانوں کی جارحیت خود ان کے خلاف پڑی اور آخرکار رومی حکمراں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ اپنے تمام مشرقی مقبوضات کو مسلمانوں کے لئے چھوڑ کر اپنے مغربی دارالسلطنت (قسطنطنیہ) میں پناہ گزیں ہو جائے۔

صدر اول میں مسلمانوں کی جتنی جنگیں ہوئیں، وہ سب دیگر قوموں کے جارحانہ اقدامات کے جواب میں ہوئیں۔ عرب کے اندر قریش اور یہود سے، اور عرب کے باہر ایران و روم سے۔ یہ خدا کا خصوصی فضل تھا کہ جارحیت خود ان قوموں کے خلاف پڑی اور مسلمان ہر جگہ ان کو مغلوب کرتے چلے گئے۔

عرب کے پڑوس میں حبش کی نسبتاً کمزور سلطنت تھی۔ مگر اس نے مسلمانوں کے خلاف کوئی جارحانہ اقدام نہیں کیا۔ اس لئے مسلمانوں نے بھی اس کے خلاف کوئی فوجی کارروائی نہیں کی۔ اگرچہ اس کی یہ قیمت دینی پڑی کہ حبش (ایتھوپیا) آج شمالی افریقہ کا واحد ملک ہے جہاں مسلم آبادی سب سے کم ہے اور اس کی وجہ سے مسلم دنیا کے خلاف اس کا رویہ ہمیشہ معاندانہ رہتا ہے۔

ایرانیوں اور رومیوں کی طرف سے جارحانہ اقدام کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے ایک ایسا قیمتی موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ ایشیا اور افریقہ سے گزر کر یورپ کو اس کی آخری سرحدوں تک فتح کر سکتے تھے۔ کیونکہ یہ سب انھیں جارح شہنشاہیتوں کے علاقے تھے اور ان کی جارحیت نے مسلمانوں کو ان کے اندر داخل ہونے کا پورا جواز فراہم کر دیا تھا۔ مگر مسلمانوں کے باہمی اختلافات، خاص طور پر صفین و جمل کی خانہ جنگیوں میں ۸۰ ہزار بہادر مسلمانوں کا کٹ جانا، وہ واحد حادثہ ہے جس نے اس امکان کو اپنی پوری شکل میں واقعہ بننے نہیں دیا۔

انسان صرف اچھا یا برا کریڈٹ لے رہا ہے

ایک سب سے بڑی بات جس کو انسان سب سے زیادہ بھولا رہتا ہے، یہ کہ اس دنیا میں کسی انسان کو کوئی ذاتی طاقت حاصل نہیں۔ کوئی شخص نہ کسی کو کچھ دیتا، نہ کوئی شخص کسی سے کچھ چھینتا۔ ہر واقعہ جو اس زمین پر ہوتا ہے وہ خدائی اجازت سے ہوتا ہے۔ انسان کی ساری حیثیت یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں امتحان کے لئے ہے۔ ارادہ کے سوا انسان کے بس میں اور کچھ نہیں۔ واقعات اس لئے اس کے سامنے لائے جاتے ہیں کہ اس کی جانچ ہو تاکہ اس کا خدا یہ دیکھے کہ اس کا بندہ مختلف رویوں میں سے کس رویہ کا اپنے لئے انتخاب کر رہا ہے۔ واقعات کا اہتمام مالک کائنات کی طرف سے ہوتا ہے۔ انسان تو صرف اچھا یا برا کریڈٹ لے رہا ہے۔

جب تاریخ کا رخ موڑ دیا گیا

قدیم عرب کے شمال اور جنوب کے زرخیز حصے اس زمانہ کی دو بڑی شہنشاہیتوں ساسانی سلطنت اور بازنطینی سلطنت کے قبضہ میں تھے۔ شمال میں امارت غسانہ اور امارت بُصری تھی۔ یہ دونوں بازنطینی سلطنت (رومیوں) کے ماتحت تھیں اور یہاں ان کی طرف سے عرب سردار حکومت کرتے تھے۔ رومی اثرات کے تحت یہاں کی اکثر آبادی مسیحی مذہب اختیار کر چکی تھی۔ عرب کے جنوب میں امارت بحرین، امارت عمان، امارت یمامہ تھی۔ یہ ریاستیں ساسانی سلطنت (ایرانیوں) کے ماتحت تھیں اور ان کے اثر سے یہاں کے باشندوں میں مجوسیت پھیلی ہوئی تھی۔

۶ھ میں جب حدیبیہ میں قریش سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ ہوا اور حالات پرامن ہو گئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے اطراف میں واقع سلطنتوں کو دعوتی مراسلے بھیجنے شروع کئے۔ اس سلسلے میں ایک مراسلہ حارث بن ابی شمر غسانی کے نام تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر شجاع بن دھب آپ کا مراسلہ لے کر اس کے پاس گئے۔ اس مراسلہ میں یہ بھی تھا کہ اللہ پر ایمان لاؤ تمہاری حکومت باقی رہے گی (یبقیٰ لک ملکک) اس نے مکتوب نبوی میں یہ جملہ پڑھا تو اس کو غصہ آگیا۔ اس نے خط کو زمین پر پھینک دیا اور کہا: میری حکومت مجھ سے کون چھین سکتا ہے (من ینزع ملکی منی) حاکم بُصری شرجیل بن عمرو غسانی نے اس سے بھی زیادہ بیہودہ سلوک کیا۔ اس رومی گورنر کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر حارث بن عمیر ازدی آپ کا خط لے کر گئے تھے، وہ سرحد شام پر قصبہ موتہ میں داخل ہوئے تھے کہ حاکم بصری کے اشارہ پر ایک اعرابی نے آپ کے سفیر کو قتل کر دیا۔

بین اقوامی روایات کے مطابق یہ واقعہ ایک ملک پر دوسرے ملک کی جارحیت کے ہم معنی تھا۔ مختلف قرائن یہ بھی ظاہر کر رہے تھے کہ شام کی فوجیں پیش قدمی کر کے مدینہ میں داخل ہو جانا چاہتی ہیں۔ رومی شہنشاہیت اس کو برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ عرب میں کوئی آزاد حکومت قائم ہو اور ترقی کرے۔

حارث بن عمیر کے قتل کی خبر مدینہ پہنچی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فوجی جواب دینا ضروری سمجھا۔ آپ نے حکم دیا کہ مسلمان اپنے اپنے ہتھیار لے کر موضع حرق میں جمع ہو جائیں۔ چنانچہ تین ہزار کی تعداد میں اسلامی لشکر اکٹھا ہو گیا۔ آپ نے اس لشکر پر زید بن حارثہ کو سردار مقرر کیا اور ضروری نصیحتیں کرنے کے بعد ان کو شام کی طرف روانہ کیا۔

اسلامی لشکر نے معان (شام) پہنچ کر قیام کیا۔ دوسری طرف حاکم بصری بھی جنگ کے لئے تیار ہو گیا۔ اس کی حوصلہ افزائی اس واقعہ سے بھی ہوئی کہ اتفاق سے ہرقل انھیں دنوں مآب (بلقاء) میں آیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک لاکھ مسلح فوج تھی۔ نیز اس علاقے کے عیسائی قبائل لخم، جذام، قین، بھراء، بلی بھی مسیحی حمیت کے جوش میں اٹھ کھڑے ہوئے اور بنی بلی کے سردار مالک بن زافل کی قیادت میں لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس طرح شامی محاذ پر ایک لاکھ سے بھی زیادہ کا لشکر جمع ہو گیا جبکہ مسلمانوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی۔

یہ جنگ جو جمادی الاولیٰ ۸ھ میں ہوئی، اس میں زید بن حارثہ دشمنوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ ان کے بعد

جعفر بن ابی طالب اور عبداللہ بن رواحہ کی قیادت کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ مسلمانوں کا جھنڈا گرجانے سے انتشار کی کیفیت پیدا ہو گئی، اس وقت لشکر اسلام کے ایک سپاہی ثابت بن اقرم نے بڑھ کر جھنڈا اٹھالیا اور بلند آواز سے کہا، مسلمانو! کسی ایک شخص کو امیر بنانے پر اتفاق کر لو۔

مسلمان فوجیوں کی طرف سے آواز آئی: رضینا بک (ہم تمہاری سرداری پر راضی ہیں) ثابت ابن اقرم نے جواب دیا: ما انا بفاعل فاتفقوا علی خالد بن الولید (میں یہ کام نہ کرسکوں گا تم لوگ خالد بن ولید کو اپنا سردار بنالو) بہ آواز بلند ہوئی: ہم کو خالد بن ولید کی سرداری منظور ہے۔ یہ سنتے ہی خالد بن ولید نے آگے بڑھ کر جھنڈا اپنے ہاتھ میں لے لیا اور رومی لشکر پر حملہ کر کے اس کو پیچھے دھکیل دیا۔ اس جنگ میں بارہ مسلمان شہید ہوئے۔

تاہم یہ جنگ فیصلہ کن طور پر ختم نہیں ہوئی تھی۔ ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ رومیوں کی مدد سے غسان مدینہ پر چڑھ آئیں اور اس نو مولود ریاست کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔ ذی الحجہ ۵ ھ میں بنو قریظہ کے خاتمہ کے بعد جب مدینہ میں بعض معاشی مسائل پیدا ہوئے اور ازواج رسول نے اضافہ نفقہ کا مطالبہ کیا تو آپ کو بہت رنج ہوا اور آپ نے ایک مہینہ تک گھر کے اندر نہ آنے کی قسم کھالی۔ اس سلسلے میں تاریخ میں آتا ہے کہ جب ایک صحابی عمر فاروق سے ملے اور ان سے کہا، "کچھ سنا آپ نے" تو عمر فاروق کی زبان سے فوراً نکلا، "کیا غسانہ آگئے" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں غسانیوں کی طرف سے مدینے کے لیے کتنا خطرہ لاحق تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مسئلہ کا شدید احساس تھا۔ چنانچہ اپنی عمر کے آخری ایام میں جن امور کے لیے آپ نے شدت سے اہتمام کیا، ان میں غسانیہ یا بالفاظ دیگر رومیوں سے مقابلہ کے لیے فوج کی تیاری بھی تھی۔ آپ نے اس مقصد کے لیے ایک فوج ترتیب دی۔ اس فوج میں اگرچہ ابوبکر وعمر جیسے بڑے بڑے اصحاب تھے مگر آپ نے انتہائی دانش مندی سے کام لیتے ہوئے اس لشکر کا سردار اسامہ بن زید کو مقرر کیا۔ اسامہ نہ صرف ایک بہادر نوجوان تھے بلکہ ان کے دل میں رومیوں سے انتقام کا شدید جذبہ بھی موجزن تھا۔ کیونکہ موتہ کی جنگ میں رومیوں نے ان کے والد زید بن حارثہ کو قتل کیا تھا۔

تاہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں یہ لشکر روانہ نہ ہو سکا۔ کیونکہ عین وقت پر آپ کے اوپر مرض الموت کا غلبہ ہو گیا۔ آپ کی وفات کے بعد صدیق اکبر نے خلیفہ اول کی حیثیت سے اس لشکر کو شام کی طرف روانہ کیا۔

یہ روانگی بھی اسلامی تاریخ کا حیرت انگیز واقعہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہر طرف سے ارتداد کی خبریں آنے لگیں۔ لوگوں نے خلیفہ اول کو مشورہ دیا کہ اب جبکہ مرکز اسلام خطرہ میں پڑ گیا ہے اور مدینہ پر حملہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں اس لشکر کی روانگی کو ملتوی کر دیا جائے مگر صدیق اکبر کا یہ جواب لوگوں کو خاموش کرنے کے لیے کافی تھا، "اگر مجھ کو یقین ہو کہ لشکر کی روانگی کے بعد مجھ کو مدینہ میں کوئی درندہ تنہا پاکر پھاڑ ڈالے گا، تب بھی میں اس لشکر کی روانگی کو ملتوی نہیں کر سکتا جس کو خود رسول اللہ نے ترتیب دیا ہو" صدیق اکبر کی یہ ایمانی جرأت کام آئی۔ اسامہ کا لشکر نہ صرف رومیوں کے مقابلہ میں کامیاب ہوا بلکہ رومی شہنشاہیت کے مقابلہ میں مسلمانوں کی فتح نے مرتدین کی بھی حوصلہ شکنی کی۔

نیز آسانی کے ساتھ وہ مغلوب کر لیے گئے۔

اس واقعہ میں ایک اور بہت بڑی حکمت شامل تھی۔ عرب قبائل ہمیشہ سے آپس میں لڑتے چلے آرہے تھے شدید اندیشہ تھا کہ اپنی توقف کے خاتمہ کا دوسرا مرحلہ ان پر آئے تو دوبارہ آپس میں لڑنے لگیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے ساتھ عرب طاقت کو وقت کی شہنشاہیت سے متصادم کر کے اس کا جواب فراہم کر دیا۔ اب عربوں کی جنگجو فطرت کے لیے ایک بہترین میدان مل چکا تھا۔ چنانچہ تاریخ نے دیکھا کہ وہ لوگ جو اپنے ہم وطنوں کی قتل و غارتگری کے سوا کچھ نہ جانتے تھے انھوں نے ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں ایک پوری دنیا کو فتح کر ڈالا۔

جان بیگٹ گلب پاشا نے اپنی کتاب دی لائف اینڈ ٹائمز آف محمد میں اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

عرب نامعلوم زمانے سے ایک دوسرے کے ساتھ جنگ و جدل میں زندگی بسر کرنے کے عادی رہے تھے۔ یہ جنگ و جدل کسی خاص سبب کا نتیجہ نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ ان کی طرز زندگی میں داخل تھی۔ اب جبکہ وہ بحیثیت مسلمان ایک دوسرے سے لڑنے بھڑنے سے روک دیئے گئے تھے یہ کیسے ممکن تھا کہ فوجی ذہنیت کے قبائلی آدمیوں کو ہمیشہ کے لیے پرامن زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا جائے؟ پیغمبر اسلام نے خود اس مہم کو روانہ کر کے جس نے موتہ میں شکست کھائی تھی اس سوال کا حل پیش کر دیا تھا۔

۶۳۴ء کے موسم بہار میں تین عرب کالموں نے فلسطین اور شام پر حملہ کر دیا اسی اثناء میں مشرقی عرب کے قبیلوں نے جو حیرہ کی لخمی ریاست کی شکست کے بعد سے ایران کے دشمن بنے ہوئے تھے، فرات کی طرف پیش قدمی کر کے حیرہ پر قبضہ کر لیا۔ ۲۰ اگست ۶۳۶ء کو بازنطینی (رومی) قوت نے یرموک کے میدان میں مکمل شکست کھائی اور شام کا تمام علاقہ طبریہ تک عربوں کے قبضہ میں آگیا۔ فروری ۶۳۷ء میں ایرانی فوج قادسیہ کے مقام پر جو حیرہ سے چند میل کے فاصلہ پر تھا مکمل طور پر تباہ کر دی گئی اور قدیم عراق بشمول ایرانی دارالسلطنت مدائن جو دجلہ کے جنوب میں موجودہ بغداد کے قریب واقع تھا، عربوں کے زیر تسلط آگیا۔ ۶۴۰ء میں مصر پر حملہ ہوا اور ایک بار پھر بازنطینی حکومت شکست یاب ہوئی اور ستمبر ۶۴۲ء تک پورے مصر پر عرب قبضہ مکمل ہو گیا۔ اسی سال بچی کھچی ایرانی فوج نہاوند کے مقام پر تباہ کر دی گئی اور ایرانی سلطنت کا مستقل طور پر خاتمہ ہو گیا۔

★

دوسری صدی ہجری کے آخر میں ایک ہندستانی راجہ کی طلب پر ہارون الرشید نے بغداد سے ایک معلم ہندستان بھیجا تھا۔ قرآن کا سب سے پہلا ہندی ترجمہ ایک ہندو راجہ کے حکم سے کیا گیا تھا۔ ۲۷۰ھ میں سندھ کے راجہ مہروگ نے منصورہ کے حاکم عبداللہ بن عمر کو لکھا کہ کسی ایسے شخص کو میرے پاس بھیجے جو ہندی میں ہم کو اسلام کا مذہب سمجھائے۔ منصورہ میں اس وقت ایک عراقی مسلمان تھا جو ہندستان میں پلا تھا اور یہاں کی زبانیں جانتا تھا۔ چنانچہ امیر نے اسے راجہ کی خدمت میں بھیج دیا۔ وہ راجہ کے دربار میں تین برس رہا اور اس کی خواہش پر اس نے ہندی زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا جس کو راجہ روزانہ پڑھوا کر سنتا تھا۔

چھوٹی صنعتیں
عظیم امکانات

ہندوستان ایک عظیم ملک ہے۔ یہاں قدرتی طور پر چھوٹی چھوٹی صنعتوں کے بے حد امکانات ہیں اگرچہ انھیں ابھی تک بہت کم استعمال کیا گیا ہے۔

ہندوستان کے رقبہ کا تقریباً ۲۵ فی صد حصہ جنگلات پر مشتمل ہے۔ ان جنگلات میں بے شمار قسم کی چھوٹی چھوٹی صنعتیں قائم کی جا سکتی ہیں۔

مثلاً شہد کی مکھی پالنے کی صنعت کو لیجیے۔ جنوبی کنڑا کے شری گوڑا نے اس کام کے امکانی فائدے بتائے ہیں۔ انھوں نے مقامی طور پر میسر ہونے والی لکڑی اور بانسوں سے شہد کی مکھیوں کے چھتے بنائے اور پھر انھوں نے ایک سیزن کے پانچ ماہ میں ان چھتوں سے ۳۰۰ کلوگرام شہد نکالا جس کی مجموعی مالیت دو ہزار چار سو روپے تھی۔ ملک کے اندر اور ملک سے باہر شہد کی بڑی مانگ ہے اور دیہاتی علاقوں میں اس کام کی ترقی کے وسیع مواقع موجود ہیں۔ بانس کی کھپچیوں سے بورئیے اور ٹوکریاں بنانے کی صنعت بھی ایسے ہی دھندوں میں سے ایک ہے۔ جسے ترقی دینے کے لیے اس کی ایک مارکیٹنگ تنظیم قائم ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اس کا اظہار بانس کے بورئیے بنانے والے ایک کارخانے کو دیکھنے سے ہوتا ہے۔ جو کیرل کے کھادی اینڈ ولیج انڈسٹری بورڈ کے ماتحت ضلع کنانور کے ارباد گاؤں میں واقع ہے اور کوآپریٹیو سوسائٹی کے زیر انتظام ہے۔

اس کارخانے نے ریڈ بانس کی ایک چیز تیار کی ہے جو بانس کی تلی کو کیمیائی عمل کے ذریعہ پلائیوڈ کا مستند نعم البدل بناتا ہے۔ بانس ایک ایسا خام مادہ ہے جو گھر کے پچھواڑے میں بھی بڑی آسانی سے اگایا جا سکتا ہے۔ درختوں کے گوند اور ان سے نکلنے والی رال کے ذریعہ ۱۹۷۴-۷۵ء کے دوران ملک کو ۲۴ کروڑ روپے کی بدیشی کرنسی حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ یہ دونوں چیزیں سماج کے پسماندہ طبقوں کے بہت سے بیروزگار اور نیم بیروزگار افراد کے لیے کام کا ذریعہ ثابت ہوئیں۔

سال کے بیج جنگلات کی ایک ایسی شے ہیں جن سے دیہاتی معیشت کو فروغ دینے کے زبردست امکانات پائے جاتے ہیں۔ سال بڑی تیزی سے پھلتا پھولتا ہے اور یہ مجموعی طور پر ۹۷ لاکھ ہیکٹر رقبہ زمین پر موجود ہے جس میں سے بیشتر مدھیہ پردیش، بہار اور اڑیسہ کے قبائلی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ سال درخت کے گودے میں ۱۴ فی صد سخت قسم کی چکنائی ہوتی جو صابن بنانے میں کام آتی ہے۔ اسے صاف کر لیا جائے تو اس سے ایک قسم کا مکھن تیار ہو جاتا ہے۔ اس گودے کا تیل نکال لیا جائے تو اس کے پھوک میں ۴۰ فیصد نشاستہ اور ۱۰ فی صد پروٹین ہوتا ہے۔ ہر سال لاکھوں ٹن سال کے بیج پیدا ہوتے ہیں۔ اس وقت مشکل سے ایک فیصد بیج کی فصل اٹھائی جاتی ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ ایک ٹن سال کے بیج کو اکٹھا کرنے اور اسے مطلوبہ مقامات پر پہنچانے کے لیے ۶ کام کے دن چاہئیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سال کے بیج سے کتنا بڑا معاشی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ — ٹینڈو کے پتوں کی پیداوار اور تجارت سے قبائلی معیشت کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ [illegible] عام طور سے بیڑی

پکایا جاتا ہے۔ ان پتوں کو چھانٹنا، توڑنا اور ان کی ڈھیری بنانا بڑی محنت کا کام ہے۔ اس دھندے سے صرف مدھیہ پردیش میں ڈھائی لاکھ افراد مستقل آمدنی حاصل کرتے ہیں اور ۱۹۷۵ء میں صرف مدھیہ پردیش کے دیہاتی علاقوں میں اس کام کے مزدوروں کو چار کروڑ روپیہ تقسیم کیا گیا۔ اس دھندے کو مزید وسعت دینے کی کافی گنجائش موجود ہے۔

ٹمنڈو کے پتے ان کے بیج بوکر بڑی آسانی سے پیدا کئے جاسکتے ہیں اور پھر انھیں جانور مشکل سے چگ سکتے ہیں۔ ان میں آگ لگنے کا خطرہ بھی کم ہوتا ہے ان کے پودوں کی دیکھ بھال اور انھیں پروان چڑھانے میں بھی زیادہ دشواری نہیں ہوتی۔ اس طرح دیہات کے آس پاس افتادہ زمین میں تمنڈو کے پتوں کا ذخیرہ کیا جاسکتا ہے دیہاتی معیشت پر اس کا کتنا خوش گوار اثر ہوگا اس کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

حالیہ برسوں میں یہ بات مشاہدہ میں آئی کہ ترقی پذیر ممالک بھاری بنیادی صنعتوں کی نسبت چھوٹی صنعتوں میں زیادہ خوش حال اور کامیاب ہوسکتے ہیں۔ ہمارے جیسے ملک میں ان چھوٹی صنعتوں سے کئی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً ان سے ضرورت مندوں کو مناسب وقت اور مقام پر مناسب روزگار ملتا ہے اور اس کے لیے زیادہ سرمایہ بھی نہیں لگانا پڑتا۔

اس کے علاوہ جنگلات سے کئی چھوٹی بڑی صنعتوں کو خام مواد ملتا ہے جیسے کاغذ بنانے کے لیے گودا، بانس، گھاس وغیرہ۔ ریشے والی کر جنگلات میں پیدا ہونے والی لکڑی سے کام لیتے ہیں اور نرم لکڑی ... جو ہلکی ... کے لیے ... میں کام آتی ہے۔ ... سے

ہی وہ پیکنگ سامان حاصل ہوتا ہے جو پھلوں اور دوسری گھریلو اشیا کی پیکنگ میں کام آتا ہے۔ خوشبو سازی کی صنعت۔ وارنش کی صنعت، کپڑے کی صنعت، اور کئی دوسری چھوٹی اور بڑی صنعتیں ان اشیاء سے فائدہ اٹھاتی ہیں جو جنگلات میں پیدا ہوتی ہیں۔

اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ کیجئے آپ کو دوسروں سے کوئی شکایت نہ ہوگی

پتھر ہر ایک کے لیے سخت ہے۔ البتہ وہ اس کے لئے نرم ہوجاتا ہے جس نے اس کو توڑنے کا اوزار فراہم کرلیا ہو ـــــ یہی صورت ہر معاملہ میں پیش آتی ہے۔ اگر آپ لیاقت اور اہلیت کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوں تو ہر جگہ آپ اپنا حق وصول کرکے رہیں گے۔ اور اگر لیاقت اور اہلیت کے بغیر آپ نے زندگی کے میدان میں قدم رکھا ہے تو آپ کے لئے اس دنیا میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اپنی مفروضہ حق تلفی کے خلاف فریاد وفغاں کرتے رہیں۔

ماحول سے کوئی امید نہ رکھئے، بلکہ اپنی محنت اور لیاقت پر بھروسہ کیجئے۔ آپ کو ماحول سے کبھی شکایت نہ ہوگی۔ ماحول کی شکایت دراصل ماحول سے زیادہ خود اپنی نالائقی کا اظہار ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے وہ تیاری نہیں کی تھی جو ماحول سے اپنا حق وصول کرنے کے لیے ضروری ہے۔

نجات

قرآن جس زمانہ میں آیا، ساری دنیا میں کوئی نہ کوئی مذہب رائج تھا۔ کوئی قوم ایسی نہ تھی جو مذہب کی قائل نہ ہو۔ مگر ہر ایک نے خود ساختہ طور پر کچھ چیزوں کو مذہب اور خدا پرستی کا درجہ دے رکھا تھا۔ کچھ لوگوں کے نزدیک ایک مقدس جگہ پر جمع ہو کر تالیاں اور سیٹیاں بجانے کا نام عبادت تھا (انفال۔ ۳۵) کچھ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ عبادت خانوں کی عمارتیں بنا کر اور لوگوں کو کھانا کھلا کر اپنے خدا کو خوش کر لیں گے (توبہ ۔ ۱۹) کچھ لوگ خدا پرستی کا مطلب یہ سمجھتے تھے کہ انسانی ہنگاموں سے الگ ہو کر اپنے لئے تنہائی کا ایک گوشہ بنا لیا جائے اور وہاں بیٹھ کر خدا کے نام کی جپ کی جاتی رہے (حدید ۔ ۲۷) کچھ اور لوگ تھے جو خدا پرستی کا کمال یہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں جن افکار و نظریات کا رواج ہو جائے، اسی کے رنگ میں رنگ کر مذہب کو بھی پیش کر دیا جائے (توبہ۔ ۳۰)

قرآن نے اعلان کیا کہ ان میں سے کوئی بھی چیز وہ نہیں جو اللہ کو اپنے بندوں سے مطلوب ہو اور جس کے کرنے والے کو وہ آخرت کے انعامات سے سرفراز کرے۔ اللہ کو اصلاً جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ اس کے بندے اپنے خالق کو "کبیر" مان کر اس کے آگے اپنے آپ کو "صغیر" بنا لیں۔

یہ اصلاً ایک قلبی کیفیت ہے۔ اسی لئے اللہ تعالی سب سے پہلے اپنے بندوں کے دل کو دیکھتا ہے۔ دل کا جھکاؤ، دل کا خوف، دل کی فروتنی ہی وہ چیز ہے جو اصلاً خدا کو اپنے بندوں سے مطلوب ہے۔ مگر انسان ایک ایسی مخلوق ہے کہ اس کے دل میں جو کیفیت ہو، وہ ضرور اس کے جسم اور اس کی [illegible] ہے۔ اگر ہم کو اپنے بیٹے سے پیار [illegible] کا اظہار ہوگا۔ اگر ہم سانپ سے ڈرتے ہیں تو ہماری حرکات بھی [illegible] اسی طرح خدا کے آگے اپنے آپ کو "صغیر" بنانا اگرچہ بااعتبار حقیقت ایک قلبی کیفیت ہے، مگر جب وہ کسی دل کے اندر حقیقی معنوں میں پیدا ہو جائے تو اس کے اعضاء و جوارح اور اس کے حرکات و اعمال سے بھی [illegible] اس کا اظہار ہوتا ہے۔ اس طرح پوری زندگی اس کے دائرہ میں آ جاتی ہے۔

حقیقی خدا پرستی، جو آدمی کے لئے آخرت کی نجات کا ذریعہ ہوگی، یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالی کو پورے معنوں میں خالق، مالک، رب اور محاسب و مجازی تسلیم کرے۔ اس کے ساتھ کسی معاملے میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔ پھر دل و دماغ میں اسی کی بڑائی کے احساس کو جگہ دے۔ اس کا اندرونی وجود [illegible] سرشار ہو اور [illegible] کی زبان، اور اس کے سارے اعضاء و جوارح اسی دائرہ کے اندر اپنے وظائف ادا کریں جو خدا نے اپنی شریعت میں ان کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ پھر دوسرے انسانوں سے تعلقات اور دنیا کے مختلف معاملات میں وہ اسی رویہ کو اپنائے جو خدا نے بتایا ہے۔ [illegible] دنیا میں وہی شخص کامیاب [illegible] زندگی [illegible] ہوگا جس [illegible]

مذہب کو انسانی تخلیق ثابت کرنے کے تمام نظریات غلط ثابت ہو گئے

یونانی مصنف ایومیرس (EUHEMERUS) نے کہا تھا کہ دیوتا ابتداءً زمین کے بڑے بڑے بادشاہ تھے پھر دھیرے دھیرے وہ خدا بن گئے اور ان کی پرستش کی جانے لگی۔ بعد کو اس عقیدہ کو بتانے کے لئے ایک اصطلاح اس کے نام پر وضع ہوئی جس کو ایومیرزم (EUHEMERISM) کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دیوتا کسی زمانہ میں انسانی ہیرو تھے۔ یونانی مصنف کا یہ نظریہ محض قیاس پر مبنی تھا۔ اس نے اس واقعہ پر زیادہ دھیان نہیں دیا کہ چین اور افریقہ اور دوسرے بعض مقامات پر جہاں آبا و اجداد کی پرستش کی مثالیں ملتی ہیں وہاں ان کی پرستش خدا کی پرستش سے الگ دوسرے طریقے سے کی جاتی ہے۔

قدیم زمانہ میں اس قسم کی باتیں محض تفنن پسند لوگ کیا کرتے تھے۔ تاہم ایک سو سال پہلے بہت بڑے پیمانہ پر اس سوال کے جواب کی تلاش شروع ہوئی کہ مذہب کی ابتدائی شکل کیا تھی۔ مگر تحقیق و تلاش کے لمبے سفر کے بعد آدمی دوبارہ وہیں پہنچ گیا جہاں وہ پہلے تھا۔ اب یہ ثابت ہوا کہ مذہبی معتقدات اتنے ہی پرانے ہیں جتنی کہ انسانی تاریخ پرانی ہے۔ ایک لاکھ برس پہلے نینڈرتھل انسان (NEANDERTHAL MAN) کو جب مرنے کے بعد دفن کیا گیا تو اس کے ساتھ قبر میں کھانا بھی رکھ دیا گیا تاکہ دوسری دنیا کے سفر میں اس کے لئے زاد راہ کا کام دے سکے۔ اس سے ثابت ہوا کہ انتہائی

بدھزم اور جین ازم کو کئی محققین نے مذہب میں شمار نہیں کیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ فلسفہ کے اسکول تھے نہ کہ حقیقۃً مذاہب۔ قدیم زمانہ میں چونکہ علم کلام (تھیالوجی) اور فلسفہ الگ الگ نہ تھے، اس لئے بہت آسانی سے فلسفہ، علم کلام اور علم کلام، فلسفہ بن جاتا تھا۔ جین مت اور بدھ مت دراصل فلسفہ کی حیثیت سے پیدا ہوئے۔ مگر زمانے کے اثر سے بعد کو مذہب کی حیثیت اختیار کر گئے ــــ کئی ہندستانی مصنفین مثلاً ڈی۔ ڈی کوسمبی اور رومیلا تھاپر نے بدھزم کو ایک سوشل فلاسفی قرار دیا ہے، نہ کہ عام معنوں میں مذہب۔ (۲۲۸)

"ابتدائی انسان" بھی مرنے کے بعد زندگی کے تسلسل کا عقیدہ رکھتا تھا۔

"مذہب کیسے شروع ہوا" یہ سوال باقاعدہ طور پر صرف ایک سو سال پہلے وجود میں آیا۔ اس سے پہلے بائبل کی کتاب پیدائش اور قرآن کے زیر اثر عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ پہلا انسان (آدم) جب پیدا کیا گیا تو اسی وقت خدا کا الہام بھی اس کو مل گیا جس میں اس کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ سچا مذہب خدا کے نزدیک کیا ہے۔

مذاہب کے علماء عام طور پر یقین کرتے تھے کہ اس ابتدائی مذہب میں بعد کی نسلوں نے پہلی بار بگاڑ پیدا کیا اور اس طرح مذہب کی مختلف شکلیں بنتی چلی گئیں۔ ۱۹ویں صدی میں خاص طور پر نظریۂ ارتقاء نے، تعلیم یافتہ طبقہ کے اندر یہ ذہن پیدا کیا کہ مذہب کا ارتقائی مطالعہ کرے اور اس کی ابتدائی شکلیں دریافت کرے۔ یہ فرض کر لیا گیا کہ

ابتدائی [illegible] ہر معاملہ میں اسی طرح جاری ہے جیسا کہ [illegible] تیات میں دکھایا ہے

ابتدائی مذہب (PRIMITIVE RELIGION) اور ترقی یافتہ مذہب (HIGHER RELIGION) کی اصطلاحیں پیدا ہوئیں۔ اس تلاش نے بہت جلد انسان کو اس دریافت تک پہنچا دیا کہ مذہب کی ابتدا محض کچھ وہمی خیالات (ILLUSIONS) سے شروع ہوئی۔ دھیرے دھیرے اصلاح ہوتے ہوتے وہ مذہب کی موجودہ ترقی یافتہ شکلوں تک پہنچی۔ اس طرح گویا علمی تجزیہ نے ثابت کر دیا کہ مذہب اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک نفسیاتی یا سماجی وہم کے سوا اور کچھ نہیں۔ مگر مذہب کے محققین کا یہ یقین دیر تک باقی نہ رہ سکا۔ تحقیق کے بعد کے نتائج نے اس کے ابتدائی نتائج کی تردید کر دی۔

ایڈورڈ بی۔ ٹیلر نے ۱۸۷۱ میں مذہب کے بارہ میں اپنے نظریہ کی وضاحت کے لئے روحیت مظاہر (ANIMISM) کی اصطلاح وضع کی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ابتدائی انسان نے خواب، ہذیان اور موت کے واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کے اندر کوئی غیر فانی روح ہے۔ جب کوئی مرا ہوا شخص خواب میں نظر آیا تو سمجھ لیا گیا کہ انسان کی روح مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے، انھیں میں سے کچھ روحیں دھیرے دھیرے دیوتا بھی بن گئیں۔ اسی زمانہ میں ہربرٹ اسپنسر نے یہ خیال پیش کیا کہ مرے ہوئے لوگ جو بھوتوں کی شکل میں دکھائی دیتے تھے، ان کو دیوتا سمجھ لیا گیا اور ان کی پوجا ہونے لگی۔ مگر ٹیلر اور اسپنسر وغیرہ کے نظریات کا جب بعد کے محققین نے تجزیہ کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ لوگ یہ ثابت کرنے میں ناکام رہے ہیں کہ دور تاریخ سے قبل کا انسان اسی ڈھنگ پر سوچتا تھا اور روحوں اور بھوتوں سے خدا تک پہنچا محض قیاس پر مبنی تھا۔ اس نظریہ کے حامی اس سوال کا جواب بھی نہ دے سکے کہ اگر مردہ انسانوں کی روح سے خدا کا تصور نکلا تو یہ عالمی کیسے بن گیا جب کہ قدیم زمانہ میں کرۂ ارض پر پھیلے ہوئے مختلف قبائل کے درمیان قطعاً کوئی مواصلاتی سلسلہ موجود نہ تھا۔ چنانچہ روحیت مظاہر (انیمزم) کا یہ نظریہ مذہب کی علمی توجیہ کی حیثیت سے آج عملاً رد کر دیا گیا ہے۔

روحیت مظاہر کا ایک [illegible] آر۔ آر میرٹ نے ۱۸۹۹ میں پیش کیا۔ اس نے کہا کہ انسان اولاً شخصی روح (PERSONAL SOUL) کو نہیں مانتا تھا بلکہ غیر شخصی طاقت (IMPERSONAL FORCE) کا عقیدہ رکھتا تھا جس نے دنیا کو زندگی عطا کی ہے۔ اس نے اپنے اس نظریہ کو اینیمیٹزم (ANIMATISM) کا نام دیا۔ مگر بعد کی تحقیق نے معلوم ہوا کہ محض ایک لفظی مغالطہ سے اس نے یہ نظریہ قائم کر لیا تھا۔ بحرالکاہل کے کنارے رہنے والے بعض قبائل جن کو میلانیسین (MELANESIAN) کہا جاتا ہے، ان کی زبان میں ایک لفظ منا (MANA) ہے۔ میرٹ نے سمجھا کہ قبیلہ کے لوگ اس کو روحانی طاقت کے معنی میں بولتے ہیں اور غیر شخصی طاقت کا یہی عقیدہ مذہب کی بنیاد ہے۔ اس نے مزید کہا کہ قدیم انسانی تفکر نہ تھا بلکہ ایکشن تھا۔ اس طرح اس کا مذہب جادو سے بہت کم مختلف تھا۔ مگر بعد کی تحقیقات نے بتایا کہ یہ قبائل "منا" کا لفظ غیر شخصی طاقت کے معنی میں نہیں بولتے تھے جس نے کائنات کو زندگی عطا کی ہو۔ جیسا کہ میرٹ اور دوسرے لوگوں نے سمجھ لیا تھا۔ بلکہ امتیازی روحانی صفت کے معنی میں بولتے تھے۔

۱۸۹۰ میں جیمز فریزر نے کتابوں کا ایک سلسلہ

شائع کتا شروع کیا جس میں سب سے زیادہ خاص سنہری شاخ (THE GOLDEN BOUGH) تھی۔ اس نے اپنی کتاب کا آغاز ایک "مقدس درخت" کی کہانی سے کیا جو قدیم اٹلی کے ایک مقام ار یسیا پر ایک شخص نے لگا رکھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس درخت میں کوئی روحانی طاقت ہے اور اس کی مدد سے جادو کے کرشمے دکھائے جا سکتے ہیں۔ اس طرح کے واقعات کو لے کر فریزر نے ایک نظریہ وضع کیا، یہ تھا — جادو پھر مذہب پھر سائنس:

(MAGIC to RELIGION to SCIENCE)

اس نے کہا کہ جادو کے طریقے میں جب پہلی بار ناکامی ہوئی تو انسان نے سمجھا کہ کوئی مافوق ہستی ہے جو اس کی مدد کر کے کامیابی کو یقینی بنا سکتی ہے۔ اس طرح جادو نے مذہب کی صورت اختیار کر لی۔ پھر انسان منطقی اور تجرباتی طریقہ تک پہنچا جس کو سائنس کہا جاتا ہے۔ اپنی ارتقائی کشش کی وجہ سے یہ نظریہ شروع میں بہت مقبول ہوا۔ مگر بہت جلد معلوم ہوا کہ اس مفروضہ کے لئے کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے کہ جادو پہلے تھا اور مذہب اس کے بعد وجود میں آیا۔ کلچر کے ہر مرحلہ میں، تاریخی دستاویزوں کے مطابق، مذہب اور جادو دونوں ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ اس لئے یہ نظریہ کہ "جادو پھر مذہب پھر سائنس" غیر تاریخی (UNHISTORICAL) ہے۔

۱۹۲۲ میں لوسین لیوی برو ہل نے ابتدائی ذہن (PRIMITIVE MENTALITY) کا نظریہ پیش کیا۔ اس نے کہا کہ دور قدیم کے وحشی انسان ایک ابتدائی منطقی فکر (PRE-LOGICAL THINKING) استعمال کرتے تھے جو کہ ہمارے موجودہ فکر سے مختلف تھا۔ اس نے اس نظریہ پر تنقید کی کہ تمام انسان یکساں صلاحیت کے تھے۔ اس نے مثال دی کہ تمام "غیر ترقی یافتہ" قومیں موت کی توجیہہ فطری اسباب کے سوا دوسرے اسباب سے کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک آدمی سادہ طور پر محض بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے نہیں مرتا بلکہ کوئی پُراسرار طاقت ہے جو اس کو مارتی ہے۔ مگر پچھلے سو برس کے دوسرے شارحین مذہب کی طرح لیوی برو ہل بھی محض کرسی نشین مفکر تھا جس کو موجودہ زمانہ کے "ابتدائی انسان" کی خبر نہ تھی۔ حتیٰ کہ وہ اس بات سے بھی بے خبر تھا کہ قدیم انسان کس طرح سوچتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی دور کا انسان بخوبی جانتا تھا کہ موت کس طرح طبیعی اسباب کے تحت ہوتی ہے، اگرچہ اس کے ساتھ وہ ایک روحانی توجیہہ کو بھی اس میں شامل کرتا تھا۔

ایک اور فرانسیسی مصنف امائیل درکھیم نے ۱۹۱۲ میں مذہب پر اپنی کتاب شائع کی۔ اس نے زور دیا کہ مذہب ایک سماجی واقعہ (SOCIAL FACT) ہے نہ کہ انسان کی نفسیات کی پیداوار۔ مذہب وہم نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ہر دور میں ہر جگہ پایا گیا ہے۔ اس نے اخلاق اور قانون کے بڑے بڑے نظام قائم کئے ہیں۔ تاہم درکھیم کے نزدیک مذہب خود سماج کی پرستش کا نام تھا، اگرچہ وہ پُراسرار علامتوں کے بھیس میں ظاہر ہوتا ہے۔ درکھیم نے اپنا تصور آسٹریلیا کے بعض قدیم قبائل سے لیا۔ مگر اس واقعہ میں درکھیم کی غلطی چھپی ہوئی تھی، کیونکہ وہ کبھی آسٹریلیا نہیں گیا۔ اس نے دوسروں کی فراہم کردہ ناقص معلومات پر اپنے نظریہ کی بنیاد رکھ دی اور پھر اس سے مستنبط کر لیا کہ تمام دنیا کے لوگ آسٹریلیا کے انھیں قدیم قبائل کے مطابق عمل کرتے تھے۔ یہ قدیم قبائل بعض پودوں اور جانوروں کو مقدس مانتے تھے اور ان کو کھانا حرام سمجھتے تھے۔ بعض مشابہتوں کی وجہ

سے ڈرخیم نے اس کو شمالی امریکہ کے انڈین قبائل کے ٹوٹم (TOTEM) کے مماثل سمجھا اور کہا کہ پودے اور جانور قبیلہ کے سماجی آدرشوں کا نشان تھے جو بالآخر مذہب کی صورت اختیار کر گئے۔ مگر نہ صرف ٹوٹم کا یہ تصور عمومی طور پر ثابت نہیں ہوا، یہ بھی تاریخی طور پر ثابت نہ ہو سکا کہ ٹوٹم کا عقیدہ مذہب کے عقیدہ سے پہلے پایا جاتا تھا۔

اس سے بھی زیادہ کمزور توجیہہ وہ تھی جو آسٹریا کے نفسیات داں سگمنڈ فرائڈ نے ۱۹۱۳ میں پیش کی۔ اس نے اپنی کتاب TOTEM and TABOO میں بحرالکاہل کے علاقہ کے بعض قبائل کی کہانی لکھی کہ قدیم زمانہ میں ایک طاقتور باپ خاندان کی تمام عورتوں کو اپنی ذات کے لئے مخصوص لئے ہوئے تھا۔ بعد کو جب لڑکے جوان اور طاقتور ہوئے اور باپ بوڑھا ہو گیا تو "ایک دن" انھوں نے مل کر باپ کو قتل کر ڈالا اور عورتوں کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ مزید یہ کہ یہ قاتلین اپنے مقتول (باپ) کو کھا گئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ باپ کی روح ان کے اندر آ گئی، جس سے وہ ڈرتے تھے، جس کو برتر سمجھتے تھے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے کچھ جانور مقرر کئے جو باپ کی طاقت کا نشان تھے۔ اس کے بعد انھوں نے جشن منانے شروع کئے جس میں وہ طرح طرح سے اپنے ان عقائد کا اظہار کرتے۔ یہی چیز دھیرے دھیرے مذہب ہو گئی۔

مگر اس عجیب و غریب نظریہ کے لئے بعد کے محققین کو کوئی تاریخی ثبوت نہ مل سکا۔ "باپ" کو مذکورہ بالا شکل میں کھا جانے کی مثال امکانی طور پر ساری تاریخ میں صرف آسٹریلیا میں اور وہ بھی ایک بار ملتی ہے اور وہاں بھی شہادتیں بہت غیر واضح ہیں۔ اس کی کوئی تاریخی، اشریاتی یا اور کوئی شہادت نہیں ہے کہ مذہب اسی طرح بیٹوں کی طرف سے باپ کو قتل کرنے کے واقعات سے شروع ہوا۔ یا یہ کہ مذہب ساری دنیا میں ایک ہی جگہ سے پھیلا ہے یا ہر ملک میں اسی خاص ڈھنگ سے شروع ہوا۔

مذہب کے آغاز کے نفسیاتی یا سماجی نظریات کے بالکل برعکس کچھ مصنفین نے دعویٰ کیا ہے کہ قدیم ترین مذہبی عقیدہ ایک برتر ہستی کا عقیدہ تھا۔ اینڈریو لینگ (ANDREW LANG) نے ۱۸۹۸ میں مذہب کی تشکیل (THE MAKING OF RELIGION) اور ولہلم اشمٹ (WILHELM SCHMIDT) نے خدا کے تصور کی ابتدا (THE ORIGIN of the IDEA of GOD) شائع کی جس میں شدت سے یہ نظریہ پیش کیا گیا۔ لینگ نے طویل سفر کئے اور برس ہا برس تک تمام دنیا سے شہادتیں جمع کرتا رہا۔ اور بتایا کہ ایک خدا کا عقیدہ انتہائی ابتدائی انسانوں میں پایا جاتا رہا ہے اور اس کو پہلی مذہبی صورت کہا جا سکتا ہے۔ بعد کے مصنفین نے یہ اعتراف کرتے ہوئے کہ بہت سے ابتدائی قبائل میں ایک خدا کا تصور پایا جاتا ہے، یہ کہا کہ تاہم اسی کے ساتھ دوسرے دیوتاؤں کا تصور بھی ہے۔ اس طرح "ایک خدا" کا تصور گویا کئی خداؤں کو ملنے ہی کا ایک جزو ہے۔

مذہب کے آغاز کے بارے میں پچھلے مفروضوں کے غلط ثابت ہونے کی وجہ سے اب اس میدان میں کام کرنے والے علماء بہت زیادہ محتاط ہو گئے ہیں۔ اگر مذہب اتنا ہی پرانا ہے جتنا انسانی غور و فکر کی تاریخ پرانی ہے تو وہ اتنے بعید ماضی سے تعلق رکھتا ہے کہ بظاہر ناممکن ہے کہ اس کے آغاز کی بابت کوئی مسلّم شہادت مل سکے۔ رومانوی محقق (MIRCEA ELIADA) کے الفاظ میں "موجودہ زمانہ کے مورخین مذہب جانتے ہیں کہ یہ ناممکن

ہے کہ مذہب کی ابتدائی شکل کو معلوم کیا جا سکے۔

ماضی میں مذہب کے محققین کا یہ گمان تھا کہ اگر یہ ثابت کیا جا سکے کہ مذہب کا آغاز کچھ وہمی تصورات سے ہوا تو بعد کی ترقی یافتہ مذہبی شکلوں کو بھی بے بنیاد ثابت کیا جا سکتا ہے۔ مگر اب عملی طور پر اس کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ مذہب کو نفسیاتی فریب PSYCHOLOGICAL ILLUSION یا سماجی فریب (SOCIOLOGICAL ILLUSION) ثابت کرنے کا خواب بے تعبیر ہو چکا ہے۔ اب یہ ذہن پیدا ہو رہا ہے کہ مذہب جیسا کچھ آج ہے اس کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے نہ کہ اس کی ابتدائی صورتوں کو دریافت کرنے کی لاحاصل کوشش میں وقت ضائع کیا جائے۔

مذہبی ارتقار کی ابتدائی شکل دریافت کرنے کا ذہن ڈارونزم کے بعد پیدا ہوا تھا۔ یہ فرض کر لیا گیا کہ وحشی قبائل جو آج بھی جنگلوں میں پائے جاتے ہیں، وہ "ابتدائی دور" کے انسان کی باقیات ہیں۔ اور مہذب سماج میں بسنے والے لوگ ترقی یافتہ دور کے انسان۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وحشی قبائل میں مذہب کا جو تصور پایا جائے وہ ابتدائی مذہب کو بتاتا ہے۔ اور مہذب سماج میں جو مذہب ہے وہ مذہب کی ترقی یافتہ شکل کو بتاتا ہے۔ مگر یہ مفروضہ بہت جلدی میں قائم کر لیا گیا جب کہ حقائق اس کی تردید کر رہے تھے۔ مثال کے طور پر ایسے ابتدائی قبائل ہیں جن میں ایک برتر خدا کا عقیدہ موجود ہے، جب کہ بدھزم کو ماننے والے بہت سے ترقی یافتہ لوگ خدا کو نہیں مانتے۔

Geoffrey Parrinder
Essay in 'Man and his Gods'
(Encyclopedia of the
World's Religions)
London 1974

یہ کرشمہ قرآن کا تھا

اسلام سے پہلے عرب میں تعلیم بہت کم تھی۔ بستہ میں جواثا (بحرین، الحسار) جیسے بڑے مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تبلیغی خط بھیجا۔ راوی کہتے ہیں کہ سارے علاقے اور قبیلہ میں ایک شخص بھی نہ تھا جو خط کو پڑھ سکے۔ لوگ تلاش کرتے رہے یہاں تک کہ ایک نوجوان ملا جس نے خط کو پڑھ کر سنایا۔ تقریباً اسی زمانہ کا واقعہ ہے، النمر بن تولب مسلمان ہوئے۔ وہ ایک بڑے قبیلہ کے سردار تھے اور اتنے بڑے شاعر کہ ان کے اشعار کا ایک دیوان تیار ہوا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ان کے قبیلہ عکل (یمن) کا سردار مقرر کر کے ایک تحریری پروانہ عطا کیا۔ مگر وہ اس کو پڑھ نہیں سکتے تھے۔ بازار میں آکر پوچھنے لگے "کیا آپ لوگوں میں کسی کو پڑھنا آتا ہے جو یہ خط پڑھ کر مجھے سنا دے"۔ کہا جاتا ہے کہ بعثت نبوی کے وقت شہر مکہ میں مشکل سے ڈیڑھ درجن آدمی ایسے مل سکتے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے ہوں۔ مدینہ میں اس سے بھی کم عرب یہ فن جانتے تھے۔ لیکن دوسری صدی ہجری ہی میں عربی زبان علمی نقطۂ نظر سے دنیا کی متمول ترین زبان بن گئی۔ عربوں میں لسانی ترقی کا زمانہ اتنا مختصر ہے کہ دنیا کی پرانی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ حیرت انگیز واقعہ براہ راست قرآن کا کرشمہ تھا۔

عمرآباد ریاست تامل ناڈو کی ایک چھوٹی سی بستی ہے جولارپیٹ سے تقریباً ۲۲ کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں جامعہ دارالسلام کے نام سے ایک دینی اور عربی مدرسہ ہے جو ۱۹۲۴ میں قائم ہوا تھا۔ ۲۴، ۲۵، ۲۶ اپریل ۱۹۷۷ کو اس کا گولڈن جوبلی "بین الاقوامی سطح پر" منائی گئی۔ جامعہ کی خصوصی دعوت پر راقم الحروف کو اس میں شرکت کا اتفاق ہوا۔

پہاڑوں اور درختوں کے درمیان مدرسہ کی بستی ایسا منظر پیش کرتی ہے جیسے وہ قدرت کی گود میں واقع ہو۔ ابتداءً اس مدرسہ کا قیام ایک فرد کے شخصی حوصلہ سے ہوا۔ کاکا حاجی محمد عمر (م ۱۹۲۷) اس علاقہ کے ایک غریب آدمی تھے۔ مگر نہایت دیانت دار اور باصلاحیت تھے۔ انھوں نے چمڑے کا کاروبار شروع کیا اور نیت کی کہ اللہ ان کے کاروبار کو ترقی دے تو وہ ایک مدرسہ قائم کریں گے۔ حالات نے مساعدت کی اور ان کی "مدرسہ کمپنی" نے اتنی ترقی کی کہ وہ چمڑے کی تجارت کے "بادشاہ" کہے جانے لگے۔ سارے ملک میں ان کی تقریباً ۵۰ شاخیں قائم ہوگئیں اور چمڑے کی برآمد سے انھوں نے بہت پیسہ کمایا۔

اب انھوں نے اپنی نیت پوری کی اور ۱۹۲۴ میں اپنے گاؤں کے قریب ایک زمین خرید کر موجودہ مدرسہ تعمیر کیا۔ ابتداءً کاکا خاندان ہی بڑی حد تک اس کا کفیل رہا۔ پھر اطراف کے لوگوں نے زمینیں، باغات اور مکانات اس پر وقف کئے۔ کاکا حاجی محمد عمر صاحب کے بعد ان کے لڑکے کاکا محمد اسمٰعیل (م ۱۹۵۹) اس کی سرپرستی کرتے رہے۔ اب بانی جامعہ کے پوتے کاکا محمد عمر اور کاکا سعید احمد بحیثیت سکریٹری اور جوائنٹ سکریٹری اس کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ۱۹۵۵ سے یہ مدرسہ ایک رجسٹرڈ کمیٹی کے تحت ہے۔ اور اس کا مالی انتظام مقامی مسلمانوں کے تعاون اور حکومت کی گرانٹ کے ذریعہ اس کا خرچ پورا کیا جاتا ہے۔

جامعہ دارالسلام عمرآباد جس تعلیمی نقشہ کے تحت کام کرنا چاہتی ہے اس کو جامعہ کے ناظم صاحب نے اپنے مختصر مقالہ میں ان الفاظ میں بیان کیا:

۱۔ عصری درسگاہوں اور قدیم طرز کے عربی مدارس کے طلبہ کو ایک دوسرے سے قریب کیا جائے کیونکہ اس تفریق سے بڑی نفرتیں اور دوری پیدا ہوتی جا رہی ہے صرف طلبہ ہی کے درمیان نہیں اساتذہ کے درمیان بھی کوئی کسی کو سمجھنے یا قریب ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔ ایک دوسرے کو عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں جس میں اجنبیت کے ساتھ تحقیر بھی ہوتی ہے۔

۲۔ نصاب تعلیم میں ایسی تبدیلیاں پیدا کرنا کہ طالب علم کا ذہن علمی اور تحقیقی ہو جائے کیونکہ ایک عرصہ مدت گزار کر بھی دینی مدرسے کے طالب علم اپنے علم و عمل اور افکار و نظریات میں ہم آہنگی نہیں پیدا کر پاتا۔

۳۔ ایسے فارغین پیدا کئے جائیں جن کے پاس اجتہادی صلاحیتیں ہوں اور وہ تہذیب و تمدن اور ترقی یافتہ دنیا کو بتا دیں کہ اسلامی نظام ہر دور، ہر ملک اور ہر حالات کے لئے موزوں اور سازگار ہے۔

۴۔ ایسے داعی اور مبلغ نکالیں جو اسلام کا پیغام مشرق سے مغرب تک بڑی حکمت اور دانائی سے عام کر سکیں، اور دنیا کے آگے یہ ثابت کر سکیں کہ دنیا کا آج کا ذکی انسان اسلامی تعلیمات کا جتنا محتاج آج ہے شاید ہی پہلے رہا ہو۔ دنیا کا کھویا ہوا سکون اور اطمینان صرف اسلام کے ذریعہ نصیب ہو سکتا ہے [illegible]

کہ مذہب اسلام کی دعوت کس طرح دی جاسکتی ہے۔

۵۔ ایک نیا نصاب تعلیم جس کی بدولت طالب علم دنیا کے تمام مذاہب، تحریکوں، فکری کوششوں اور نظریات سے مکمل واقفیت حاصل کرسکے۔ مزید برآں یہ نصاب طالب علم کے 2 باعزت اور خوشحال زندگی کی ضمانت دے۔ اگر وہ سیکولر اسٹیٹ میں بھی دعوت دین کا کام کرنا چاہے۔"

گولڈن جوبلی (الاحتفال الذہبی) میں چند قسم کے پروگرام رکھے گئے تھے:

(۱) تعلیمی کانفرنس جس میں تعلیم کی اہمیت اور مسائل پر تقریریں ہوئیں (۲) مرکز تحقیقات اسلامی و تخصص فی الدعوۃ کا افتتاح۔ اس سلسلہ میں تقریریں ہوئیں اور مرکز کی مجوزہ عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ (۳) اسلامی نمائش جس میں اسلامی تاریخ اور تعلیمات کو چارٹوں کے ذریعہ نمایاں کیا گیا تھا۔ ایک سیٹھ صاحب کو یہ نمائش اتنی پسند آئی کہ اس کو دیکھنے کے بعد انھوں نے اعلان کیا: نمائش کے تمام اخراجات میں تنہا اپنی جیب سے ادا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ (۴) جلسہ تقسیم اسناد۔

جامعہ دارالسلام عمرآباد کا قدیم منصوبہ ہے کہ وہ یہاں ایک تصنیف و تالیف کا ادارہ قائم کرے، جہاں اسلام کا تحقیقی کام ہو۔ [illegible]

۱۔ جدید اسلوب میں اسلامی لٹریچر تیار کرنا۔

۲۔ جدید اسلامی موضوعات پر [illegible]

۳۔ جدید و قدیم تعلیم یافتہ نوجوانوں کو تصنیف و تالیف کی تربیت دینا۔

پروگراموں میں شریک ہونے والوں کا ابتدائی اندازہ تین چار ہزار کا تھا۔ مگر آنے والوں کی تعداد تقریباً دس ہزار ہوگئی۔ ہندوستان کے علاوہ جن ملکوں کے وفود اس موقع پر شریک ہوئے، ان کے نام یہ ہیں: سعودی عرب، مصر، قطر، کویت، لیبیا، اردن، بحرین، یمن، امارات عربیہ متحدہ، زنجبار، سری لنکا، نیز مختلف عرب سفارت خانوں کے نمائندے۔ مجموعی طور پر بیرونی مہمانوں کی تعداد ۵۲ تھی۔

ارباب جامعہ کی کوششوں سے پچھلے دنوں مدراس یونیورسٹی سے اس کا الحاق کرایا گیا تھا تاکہ "اس کے فارغین معاشی اعتبار سے قوم پر بوجھ نہ بنیں بلکہ خود کفیل رہ کر دین کی خدمت کریں"۔ اب مدینہ کی جامعہ اسلامیہ سے بھی اس کا الحاق ہوگیا ہے۔ سعودی عرب اور قطر سے آئے ہوئے تعلیمی ذمہ داروں نے جشن طلائی کے موقع پر اعلان کیا کہ وہ جامعہ کے فارغین کو اپنے یہاں کی درسگاہوں میں اعلیٰ تعلیم کے لئے خوشی کے ساتھ قبول کریں گے۔ جامعہ میں اس وقت طلبہ کی تعداد تقریباً ۵۰۰ ہے جن میں کچھ طلبہ سیلون، ملیشیا، مالدیپ اور نیپال کے بھی ہیں۔

جنوبی ہند وہ مقام ہے جہاں [illegible]

ان کی زبردست کوشش رہتی ہے کہ اپنے اجتماعات کو عرب مہمانوں کے ذریعہ پُررونق بنا سکیں۔ یہ نہ صرف اپنی قرآنی زبان اور عربوں کی وجہ سے مسلم حاضرین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں بلکہ تالیوں کی گونج میں اپنے ملکوں کی طرف سے کثیر قدر مالی عطیات کا اعلان بھی کرتے ہیں۔ اگرچہ دینی اداروں کے ان عطیات سے کہیں زیادہ مقدار ان کی ان فیاضیوں کی ہے جو وہ ساری دنیا میں سیکولر مقاصد کے تحت کام کرنے والے اداروں کو دے رہے ہیں۔

آج کل یہ صورت حال ہے کہ ہر مسلم ادارہ اپنے "ڈائس" پر عرب شخصیتوں کو بٹھانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ اور اگر کسی ادارہ کی دعوت پر کوئی عرب شخصیت ملک میں آگئی تو دوسرے تمام ادارے دوڑ دھوپ شروع کر دیتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اس کو اڑا کر اپنے ادارہ میں لے جائیں اور وہاں اس کو شاندار استقبالیہ دے سکیں ——

"عرب پٹرول" نے نہ صرف دنیا کے اقتصادی نظریات کو متاثر کیا ہے بلکہ شاید خود ہماری دینی قدروں کو بھی بدل ڈالا ہے!

گولڈن جوبلی کے سہ روزہ پروگرام میں ملکی شخصیتوں کے علاوہ عرب مہمان بھی مسلسل شریک رہے جو مختلف عرب ممالک سے آئے تھے۔ ان کی رعایت سے تمام کارروائی عربی زبان میں ہوئی۔ عربی تقریروں کے اردو ترجمے ہوتے تھے اور اردو تقریریں عربی میں ترجمہ کی جاتی تھیں۔ یہ رجحان ادھر حال میں ہمارے مسلم اداروں میں پیدا ہوا ہے۔ ہندستان میں ہونے والی کسی کانفرنس میں عربی زبان کے غلبہ کا محرک اگرچہ زیادہ تر وہی ہوتا ہے جس کے تحت اس سے پہلے مغل دور میں فارسی اور برطانوی دور میں انگریزی کا رواج تھا۔ تاہم اس میں ایک خوشی کا پہلو بھی ہے۔ کیوں کہ اس سے قرآن کی زبان کو فروغ ملتا ہے اور ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی ہے جو خدا کی کتاب کو اس کی اصل زبان میں سمجھ سکیں۔ قرآن اپنی اصل زبان میں ایک حیرت ناک قسم کا طوفانی کلام ہے جو آدمی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے جب کہ ترجمہ کی زبان میں اس کا زور باقی نہیں رہتا۔

اس موقع پر جو تقریریں ہوئیں وہ عام طور پر رسمی اور سرسری قسم کی تھیں۔ کسی تقریر میں اگر کوئی قیمتی نکتہ آیا تو وہ بھی اکثر برجستہ ترجمہ میں چھوٹ گیا۔ مثال کے طور پر ایک عرب مقرر نے اپنی تقریر میں یہ آیت پڑھی: قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ــ مقرر موصوف نے اس سے استنباط کیا کہ دعوت الی اللہ کی فرضیت جس طرح پیغمبر پر ہے اسی طرح آپ کے متبعین پر بھی ہے۔ مگر یہ قیمتی نکتہ اردو ترجمہ میں نہ آسکا۔

ایک عرب مقرر نے کہا کہ اسلام سے قبل یمن کے حبشی گورنر ابرہہ نے مکہ پر حملہ کیا۔ اس وقت وہاں کے مقامی عرب مکہ چھوڑ کر پہاڑوں میں بھاگ گئے۔ مگر یہی عرب صرف ۷۰ سال بعد روم اور فارس کی شہنشاہیتوں سے لڑ گئے، جو اس زمانہ میں ویسی ہی تھیں، جیسی آج کل امریکہ اور روس۔ آج کوئی بھی چھوٹی قوم، جیسے کہ اس زمانہ میں عرب تھے، روس اور امریکہ سے متصادم ہونے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ پھر عربوں کو کس چیز نے یہ حوصلہ اور یقین عطا کیا۔ مقرر نے کہا کہ یہ ایمان اور اعتماد علی اللہ تھا جس نے ۷۰ سال سے کم مدت میں ایک قوم کی کایا پلٹ دی۔

ایک عرب مقرر نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کو مشورہ دیا:

عليهم ان يهتموا بالحقائق لا بالشكليات

ان کو چاہئے کہ حقیقت اور معنویت میں اپنے کو لگائیں نہ کہ

اشکال اور مظاہر میں۔ مگر مہرجان کا رنگارنگ ماحول اور رسمیات کا اہتمام زبان حال سے کہہ رہا تھا کہ پرجوش مقرر شبلی ہی اس نکتۂ خطابت کے لئے حاضرین سے کوئی داد پانے کی امید کر سکتے ہیں۔

جشن سیمین کی تقریبات کی ایک نشست میں مرکزی وزیر پیٹرولیم مسٹر ہیم وتی نندن بہوگنا بھی شریک ہوئے۔ وہاں کا یہ طریقہ ہے کہ وہ اپنی تقریر کا آغاز السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ سے کرتے ہیں۔ مسٹر بہوگنا کی موجودگی میں اس قسم کی متعدد تقریریں ہوئیں۔ بعد کو جب وہ اسٹیج پر آئے تو انھوں نے بھی اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے کہا "السلام علیکم"۔ شری بہوگنا کی زبان سے السلام علیکم سن کر سارا مجمع جھوم اٹھا اور دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ پھر انھوں نے کہا کہ "بھارت اور عربوں کے درمیان کوئی مال دولت کا رشتہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کا رشتہ ہے۔ مال دولت کے رشتے ٹوٹ سکتے ہیں۔ مگر ایمان کا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹتا"۔ اس پر بھی خوب تالیاں بجیں۔ اگر تالیوں کی کثرت کو دیکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مسٹر بہوگنا کی تقریر سب سے زیادہ عوام پسند ثابت ہوئی۔ کئی عرب ملکوں کے نمائندوں نے اپنی تقریر کے بعد جامعہ دار السلام کے لئے ڈالر اور پونڈ کے عطیات کا اعلان کیا تھا۔ مسٹر بہوگنا نے کہا کہ ہندستان ایک غریب ملک ہے۔ اس لئے میں آپ کی جامعہ کے لئے اس قسم کے کسی عطیہ کا اعلان نہیں کر سکتا۔ البتہ ہم اپنی نیک خواہشات آپ کے لئے پیش کرتے ہیں۔

راقم الحروف نے اس موقع کے لئے ایک مقالہ تیار کیا تھا جس کا عنوان تھا:

دعوت اسلامی کے جدید امکانات

اس مقالہ کو تقریری شکل میں مختصراً دوپہر کی شام کی نشست میں پیش کیا گیا۔ الرسالہ کی پچھلی اشاعت میں یہ پورا مقالہ شائع ہو چکا ہے۔

کئی درجن عرب مہمان جو مختلف ملکوں سے اس موقع پر یہاں آئے تھے، ان میں سے شاید کوئی مجھ کو شکل سے نہیں پہچانتا تھا۔ مگر غائبانہ طور پر تقریباً سبھی مجھ کو نہ صرف جانتے تھے بلکہ میری عربی کتابیں پڑھے ہوئے تھے۔

ایک دن شام کو ڈائنس پر میری کرسی ایک یمنی عرب (شیخ احمد عبدہ ناشر) کے قریب ہو گئی۔ میں نے ان سے کہا:

هل سمعت من الكاتب الهندي وحيد الدين خان

اس نے جواب دیا "کیا الاسلام یتحدی کے مؤلف"۔ میں نے کہا ہاں۔ پھر اس نے کہا، کیا آپ ہی وہ ہیں۔ میں نے مسکرا کر کہا شاید۔ یہ سنتے ہی وہ بے قرار ہو گیا۔ اس نے کہا، میں نے آپ کی کتاب پڑھی ہے۔ بڑی عظیم کتاب ہے۔ پھر وہ عرب انداز میں مجھ سے اظہار محبت کرنے لگا۔ اس نے اپنے یہاں کے ایک ممتاز عالم کا پتہ دیا اور کہا کہ وہ آپ سے بہت متاثر ہیں، ان سے خط و کتابت کیجئے:

الشیخ عبد المجید الزندانی
رئیس مکتب التوجیه والارشاد العام
ص ب ۲۴۹
صنعاء الجمهورية العربية اليمنية

اس کے بعد میں نے قریب کے دوسرے عربوں سے کہا "هذا هو الكاتب وحيد الدين خان"۔ اب لوگ مجھ کو عجیب حیرت کے ساتھ مجھ سے ملنے لگے۔

[illegible] جو کھیل گنگ [illegible] ہم پہچانتے ہیں

مبارک ہو۔ مگر یہ تحریری کام نہ آسکا۔ چند منٹ انھوں نے پھر اس تمام کو بیان کر لیا۔ اسی کے بعد اسم کی آرام گاہ پر رہ گئے۔ جنوبی ہند کا علاقہ ہر اعتبار سے شمالی ہند سے اتنا مختلف ہے کہ بالکل دوسرا ملک معلوم ہوتا ہے۔ تاہم اہل علم کی کثیر تعداد میری جاننے والی تھی۔ خصوصاً اہل علم تو تقریباً سبھی جانتے تھے۔

کسی اجتماع میں یہ صورت حال کبھی میرے لئے پسندیدہ نہیں ہوتی۔ میری گوشہ گیر اور خلوت پسند طبیعت کو گمنامی سب سے زیادہ محبوب ہے۔ مگر علم بھی شاید ایک فتنہ ہے جو آدمی کو "تنہا" نہیں ہونے دیتا۔ حالاں کہ تنہائی سے زیادہ قیمتی کوئی چیز انسان کیلئے نہیں۔

عمرآباد میں میں نے ایک شخص سے کہا: میرا جی چاہتا ہے کہ میں "قلم" کا مشغلہ ترک کر دوں اور کسی مسجد میں معتکف ہو کر قرآن اور نماز میں مشغول ہو جاؤں۔ انھوں نے کہا: کیا آپ اس بات کو لکھ کر شائع کر سکتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کیوں نہیں — جو بات میرے دل میں ہے اس کو چھاپنے میں مجھ کو کیا عذر ہو سکتا ہے۔

اگرچہ قرآن میں عَلَّمَ بِالْقَلَمِ اور نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ جیسی آیتیں شامل ہیں۔ مگر ۲۵ برس تک قلم کا تحریر کرنے کے بعد اب میری آخری تمنا ہے کہ کسی سنسان مسجد میں روپوش ہو جاؤں۔ وہاں گمنامی کی زندگی گزاروں۔ نماز پڑھوں اور قرآن و حدیث میں مشغول رہوں اور اسی حال میں دنیا سے چلا جاؤں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری یہ تمنا پوری ہوگی یا نہیں۔ کیوں کہ دو چیزیں ہر وقت آدمی کا پیچھا کر رہی ہیں۔ ایک، ذمہ داری کا احساس، دوسرے موت۔

شمالی ہند کے ایک مسافر کے لئے جنوبی ہند کی جو خصوصیت سب سے زیادہ محسوس ہوتی ہے وہ یہاں کی بے تعصبی ہے۔ یہاں مختلف فرقوں کے درمیان کسی قسم کی کوئی کشمکش نہیں۔ مذہب کے نام پر جھگڑے کا یہاں کوئی وجود نہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی معاشرت، شمالی ہند کے برعکس یہاں تقریباً ایک ہی قسم کی ہے۔ اس کی وجہ سے یہاں دونوں فرقوں کے درمیان معاشرتی تعلقات ہیں۔ کوئی اِس مذہب کو مانتا ہے یا اُس مذہب کو، یہاں اس قسم کے سوالات پر کوئی اپنا دماغ نہیں خراب کرتا۔

ان حالات نے جنوبی ہند کو دعوت حق کے کام کے لئے ایک آئیڈیل خطہ بنا دیا ہے۔ یہاں نہایت عمدہ طور پر وہ کام ہو سکتا ہے جس کے لئے دوسرے مقامات پر طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ مواقع کی اس فراوانی نے مسلمانوں کو کوئی سبق نہیں دیا۔ سارے جنوبی ہند میں، شمالی ہند ہی کی طرح، کوئی ایک بھی قابل ذکر جماعت نہیں جو دین کو پھیلانے اور دوسری اقوام میں اس کو متعارف کرانے کا کام کر رہی ہو۔ جس خطے نے ہزار برس پہلے عرب تاجروں کا استقبال دین حق کے مبلغ کی حیثیت سے کیا تھا، آج وہ انھیں عربوں کا استقبال اس حیثیت سے کرنے میں مسابقت دکھا رہا ہے کہ وہ اپنے "پیٹرو ڈالر" کے خزانے کا کوئی حصہ اس کی طرف بھی پھینک دیں۔ آج ہندستان کے تمام دینی ادارے عربوں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کوئی کلمات مقدسہ کی تلاوت کرتے ہوئے اس مقدس طواف میں مشغول ہے اور کوئی اخلاق کو برطرف کر کے سیدھے سیدھے اس مادی عمل میں داخل ہو جانا چاہتا ہے۔

جامعہ دارالسلام کے معتمد عمومی نے اپنے خطبۂ
استقبالیہ میں یاد دلایا کہ جنوبی ہند کا خطہ وہ مقام ہے
جہاں عرب تاجر سب سے پہلے آئے اور اسلام کو پھیلایا:

"آج ہماری چشم تمنا دعا کے ہاتھ پھیلائے منتظر ہے کہ عرب کی ارض مقدس سے پھر کوئی قافلۂ تجارت رواں دواں ہو جس کے کچھ انوار و آثار بھی دکھائی دے رہے ہیں جو اپنے ہمراہ قدرت کے عطا کردہ دنیوی مال تجارت کے ساتھ اخروی تجارت کا سرمایۂ نجات بھی رکھتا ہو اور اس طرح اور ایک بار دنیا انسانیت اسلام کی روحانی و اخلاقی فتوحات کا نظارہ کر سکے اور پوری دنیا اسلام کے نور سے جگمگا اٹھے۔ آمین"

۱۶ اپریل کو جب کہ میں ٹامل ناڈو سپر فاسٹ ایکسپریس سے واپس آ رہا تھا، چیر کار میں میری نظر سامنے کی پلیٹ پر پڑی۔ لکھا ہوا تھا:

PLEASE DO NOT PLAY RADIO
EXCEPT WITH AN EARPHONE

یعنی ریڈیو مت بجائیے۔ اگر بجانا چاہیں تو بالکل آہستہ بجا کر کان کے آلہ کے ذریعہ خود سن لیجئے۔

تاہم یہ ضابطہ صرف مسافروں کے لئے تھا۔ خود ریلوے کو گویا یہ لائسنس ملا ہوا تھا کہ وہ اپنے اہتمام میں پرشور طور پر ٹیلی وژن چلائے اور اپنے نظام کے تحت بجائے ہوئے ریڈیو کے گانے سننے پر لوگوں کو مجبور کرے۔ ایر کنڈیشنڈ بوگی ہمارے اور باہر کے شور کے درمیان حائل تھی۔ مسافروں کے ہنگامۂ شور سے بھی ہم بچے ہوئے تھے۔ مگر ریلوے کے اوپر کون قدغن لگا سکتا تھا جو "نوائز پلیوشن" کا لا محدود حق اپنے لئے محفوظ کئے ہوئے تھی ــــ اگر لوگ اپنے لئے بھی وہی پسند کرنے لگیں جس کی تلقین وہ دوسروں کو کرتے ہیں تو دنیا کے کم از کم آدھے مسئلے یک لخت حل ہو جائیں۔

جب ٹیلی وژن چلتا تو ساری نگاہیں اس کے شیشہ پر لگ جاتیں۔ ایک سردار جی نے گلاس میں شراب کے ساتھ برف اور کوکاکولا ملایا اور لطف لے کر پینے لگے۔ کچھ لوگ اپنے بیوی بچوں میں مشغول تھے اور کچھ کھانے پینے میں۔ کچھ تاش کے ذریعہ وقت گزاری کر رہے تھے۔ کوئی ناول اور افسانہ کا مطالعہ کر رہا تھا۔

ایک طرف بند ڈبہ کے اندر یہ مشاغل جاری تھے۔ دوسری طرف ڈبہ کے باہر قدرت کی دنیا اپنی ساری رعنائیوں کے ساتھ موجود تھی۔ سپر فاسٹ ایکسپریس ہندستان کے سرسبز میدانوں اور پہاڑیوں سے گزرتے ہوئے گویا فطرت کی لامتناہی ریل ہمارے سامنے کھول رہی تھی۔ ہرے بھرے درختوں کے سلسلے، پھیلا ہوا آسمان، بادلوں کے آفاقی مناظر، سورج کی ضیا پاشیاں، یہ ساری چیزیں ایک عظیم کائناتی شو کی طرح مسلسل آنکھوں کے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ زندگی، عظمت، حسن اور معنویت لی جو اتھاہ کہانی اس خاموش کائناتی ٹیلی وژن سے نشر ہو رہی تھی اس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مگر مسافروں کو ڈبے کے اندر کے کھلونوں سے فرصت نہیں تھی کہ وہ باہر کی عالمی رونقوں کو دیکھ سکیں۔ ہر ایک نے اپنے قریب ایک مشغلہ تلاش کر لیا تھا اور اسی میں وہ مشغول تھا۔ میں نے سوچا: لوگ کہتے ہیں کہ خدا ہے تو وہ ہم کو نظر کیوں نہیں آتا۔ وہ لوگ جو سامنے کی کثیف کائنات کو دیکھنے کی نگاہ بھی نہ رکھتے ہوں، وہ اس کے پیچھے لطیف خدا کی ہستی کا مشاہدہ کس طرح کر سکتے ہیں۔ خالق کو دیکھنے کے لئے مخلوق کو دیکھنے کی نظر پیدا کرنی پڑتی ہے۔ جو مخلوق کو نہ دیکھ سکے، وہ خدا کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔ خالق نے اپنی صنعت کا شاہکار ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ جو لوگ اس کی بے قدری کریں وہ کیسے توقع کرتے ہیں کہ خدا اپنی تجلیات کو ان کے اوپر ظاہر کرے گا۔

[illegible]ل عریاں شکل میں صرف آخرت میں ظاہر ہوگا۔ یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے یہاں کے لیے اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ یہاں وہ حق کو مشتبہ اور ملتبس شکل میں سامنے لے آتا ہے۔ (انعام۔ ۹) وہ حق کے علم بردار کو فرشتہ کی صورت میں کھڑا نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے اوپر بشریت کا لباس اڑھاتا ہے۔ تاکہ لوگوں کو وہ اپنے ہی جیسا ایک انسان دکھائی دے:

"نبیؑ نے جب اپنی قوم کو حق کا پیغام دیا تو انکار کرنے والوں نے کہا، ہم تو دیکھ رہے ہیں کہ تم ہمارے ہی جیسے ایک آدمی ہو اور ہم دیکھتے ہیں کہ تمھارا ساتھ صرف ان تھوڑے سے لوگوں نے دیا ہے جو ہم میں پست ہیں اور جن کی سمجھ بھی کم ہے۔ اور تمھارے اندر ہم کو اپنے مقابلہ میں کوئی بڑائی بھی دکھائی نہیں دیتی۔ ہمارا تو خیال ہے کہ تم خدا کے نمائندے نہیں ہو، تم صرف جھوٹا دعویٰ کر رہے ہو۔ (ہود۔ ۲۷)

مومن اور غیر مومن کی تعریف اگر حقیقت کی زبان میں کی جائے تو وہ یہ ہوگی:

مومن وہ ہے جو دلیل اور معقولیت کے الفاظ میں بات کو سمجھ لے۔ غیر مومن وہ ہے جو بات کو صرف اس وقت سنے گا جب کہ خدا کی چنگھاڑ بلند ہو، اگرچہ اس وقت کا سننا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

شہد: ایک عجیب نعمت

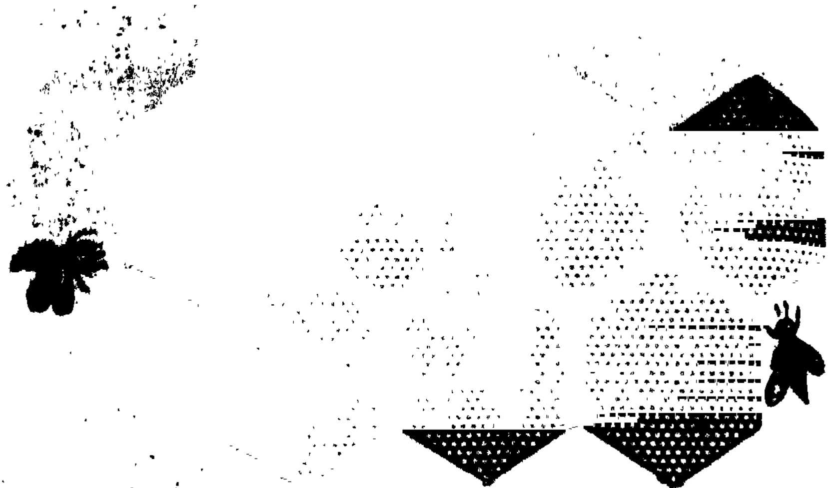
قرآن کی سورہ نمبر ۱۶ میں ارشاد ہوا ہے:

"تیرے رب نے شہد کی مکھی کے جی میں یہ بات ڈالی کہ تو پہاڑوں میں گھر بنائے اور درختوں میں بھی اور لوگ جو عمارتیں بناتے ہیں ان میں۔ پھر ہر قسم کے پھلوں سے رس چوس۔ پھر اپنے رب کے راستوں میں چل جو آسان ہیں۔ اس کے پیٹ میں سے پینے کی ایک چیز نکلتی ہے جس کی رنگتیں مختلف ہیں۔ اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی دلیل ہے جو سوچتے ہیں:" (نحل۔ ۶۹)

شہد نہ صرف ایک لذیذ قدرتی غذا ہے۔ بلکہ وہ قدیم ترین زمانہ سے علاج کے کام میں بھی آتا رہا ہے۔ شہد کی تیاری کے لئے خدا نے جو حیران کن انتظام کیا ہے اس پر موجودہ زمانہ میں کافی معلومات جمع کی گئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا ایک ایک جزو حیرت انگیز حد تک عجیب ہے۔ تاہم یہ تحقیقات ابھی تک تکمیل کو نہیں پہنچی ہیں خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کے کتنے پہلو ابھی انسان کے علم میں آنے باقی ہیں۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ شہد میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔ حال میں اس سلسلے میں ایک حیرت انگیز دریافت ہوئی ہے جس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

علم طب کے مطابق جراثیم بیماریاں پیدا کرتے ہیں جدید تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ شہد ان جراثیم کو مارنے کے لئے نہایت موثر ہے۔ اگرچہ یہ بات انسانیت کو بہت قدیم زمانہ سے معلوم تھی کہ شہد بیماریوں سے بچانے کے لئے بہت کامیاب ہے مگر سائنسی طور پر اس کا مظاہرہ



ی صرف بیسویں صدی میں کیا جا سکا ہے۔
ڈاکٹر ڈبلیو۔جی۔ساکٹ (Dr W.G. Sackett)
اس سے پہلے فورٹ کولنس کے کولوریڈو
یگریکلچرل کالج سے متعلق تھے، وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش
ہے تھے کہ شہد بیماریوں کو پھیلاتا ہے اور اس میں جراثیم
طرح پلتے ہیں جس طرح دودھ میں۔ مگر ان کو بے حد تعجب
جب اس کے برعکس انھوں نے دیکھا کہ وہ تمام بیماری
جراثیم جو انھوں نے خالص شہد میں ڈالے، بہت جلد
گئے۔ وہ جراثیم جو ٹائیفائڈ کا بخار پیدا کرتے ہیں،
الص شہد کے اندر ۴۸ گھنٹے میں مکمل طور پر ختم
گئے۔ وہ جراثیم جو آنتوں کا ورم پیدا کرتے ہیں، وہ
ص شہد میں صرف ۱۰ گھنٹہ تک زندہ رہ سکے۔ گلے
یماریاں پیدا کرنے والے بعض جراثیم کافی سخت جان
ت ہوئے۔ تاہم وہ بھی شہد کے اندر چار دن سے
یادہ زندہ نہ رہ سکے۔ جراثیم کی ایک قسم جو چھوت کی
طرناک بیماریاں پیدا کرتی ہے، وہ تجربہ کے پانچویں
مردہ پائی گئی۔
شہد کی اس جراثیم مار خصوصیت کی وجہ ڈاکٹر

بوڈوگ بیک (Dr Bodog Beck) کے نزدیک
یہ ہے کہ شہد کے اندر رطوبت کو جذب کرنے کی صلاحیت
(Hygroscopic Ability) ہے۔ شہد سادہ
طور پر صرف یہ کرتا ہے کہ وہ جراثیم کے اندر کی رطوبت کی
تمام مقدار مکمل طور پر کھینچ لیتا ہے۔ جراثیم، دوسری تمام
ذی حیات اشیاء کی طرح، پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے
اس لئے شہد جب ان کی ساری رطوبت کھینچ لیتا ہے تو
وہ فوراً مر جاتے ہیں۔
شہد کی رطوبت کو جذب کرنے کی صلاحیت تقریباً
لامحدود ہے۔ اس کی یہ قوت اتنی زبردست ہے کہ وہ
دھات، شیشہ اور پتھر تک کی رطوبت کو کھینچ لیتا ہے۔

Rosicrucian Digest
California 95191 U.S.A.
September 1975, P. 11

خدا فضا سے انسان کے لئے پانی برساتا ہے، مویشی کے پیٹ
سے لذیذ دودھ نکالتا ہے۔ درختوں سے طرح طرح کے میٹھے پھل
پیدا کرتا ہے۔ مکھیوں کو اس نے شہد جیسی قیمتی چیز تیار کرنے کا
کارخانہ بنا دیا ہے۔ پھر بھی انسان خدا کی کاریگری پر غور نہیں
کرتا۔ پھر بھی انسان خدا کا شکر ادا نہیں کرتا۔

مؤلف
مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۳۴۰ قیمت مجلد مع پلاسٹک کور پندرہ روپے
قیمت مجلد بغیر پلاسٹک کور تیرہ روپے

دین کی حقیقت، تعلیمات قرآن کی حکمتیں، سیرت رسول کا انقلابی سبق
موجودہ زمانہ میں اسلام کے مسائل، دین کا تجدید و احیاء
امت مسلمہ کی تعمیر، دعوت اسلامی کے جدید امکانات ـــ

ان موضوعات کے گہرے مطالعہ کے لئے "الاسلام" پڑھئے۔
جدید سائنٹفک اسلوب میں، نہایت دلچسپ اور معلومات سے بھرپور۔

اداروں، طالب علموں، نیز کم آمدنی والوں کے لئے غیر معمولی رعایت
تاجروں اور ایجنٹوں کے لئے خصوصی کمیشن

قیمت ـــ بذریعہ منی آرڈر بھیج کر طلب فرمائیں
کتاب کی روانگی کا ڈاک خرچ ادارہ کے ذمہ ہوگا۔
بیرونی ممالک کے لئے تیس روپے یا اس کے مساوی رقم

الدار العلمیہ، جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۔ ۶

AL-DARUL ILMIYYA, JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI 6 (India)

نبوت کے چھٹے سال جب عمر فاروق رضؓ اسلام لائے تو انھوں نے مسجد حرام میں جاکر اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ قریش کے لوگ ان سے لپٹ گئے۔ دیر تک مقابلہ ہوتا رہا۔ بالآخر حضرت عمر رضؓ نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"جو تمھارے جی میں آئے کر دو۔ خدا کی قسم اگر ہم تین سو آدمی ہو جائیں تو پھر یا ہم اس سرزمین کو تمھارے لئے چھوڑ دیں گے یا تم اس کو ہمارے چھوڑ دو گے۔"

نبوت کے چودھویں سال بدر کے واقعہ نے ثابت کر دیا کہ آپ کا یہ ارشاد کس قدر صحیح تھا۔

حضرت عمر فاروق رضؓ کی خلافت کے زمانہ میں عمرو بن العاص رضؓ مصر کے محاذ پر تھے انھوں نے لکھا کہ فتح میں تاخیر ہو رہی ہے۔ خلیفہ دوم نے جواب میں لکھا:

"تم کو جاننا چاہئے کہ تمھارے ساتھ بارہ ہزار آدمی ہیں اور بارہ ہزار کبھی قلت کی وجہ سے شکست نہیں کھاتے۔"

فاروق اعظم کے اس ارشاد سے ثابت ہوتا ہے کہ تین سو آدمی انقلاب لانے کے لئے بالکل کافی ہیں۔ اور اگر یہ تعداد بارہ ہزار تک پہنچ جائے تو پھر فریق ثانی کی کسی بھی تعداد کے مقابلہ میں محض عددی کمی کی بنا پر شکست نہیں ہو سکتی۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں ہماری ایک ایک جماعت بلکہ ایک ایک قائد کو لاکھوں کی تعداد میں کارکن ملے۔ مگر وہ اسلام کی تاریخ میں ناکامی کی مثالوں کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ کر سکے۔" (الاسلام، صفحہ ۱۶۳)

اس موضوع کی تفصیل کے لئے

الاسلام کا مطالعہ کیجئے

الاسلام

صفحات ۲۴۰

قیمت مجلد مع پلاسٹک کور ۱۵ روپے۔ مجلد بغیر کور ۱۴ روپے

اسلام اور مسائل حاضرہ کا ایک جامع مطالعہ
اپنے موضوع پر اس نوعیت کی پہلی کتاب

ابواب :

جدید مسئلہ کیا ہے
حقیقت دین
ارکان اربعہ
صراط مستقیم
اسوۂ نبوت
تحریک اسلامی، سیرت کی روشنی میں
موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکیں
تعمیر ملت
دعوت الی اللہ
دعوت اسلامی کے جدید امکانات
آخری بات

الدار العلمیہ، جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

Single Copy Rs. 2.00

Regd. No. D (D) 532
REGD. R.N. No. 28822/76
AUGUST — 1977

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI 6 (India)

محمد عبد الرحیم پرنٹر پبلشر مسعود احمد نے جے کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ" جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا



سرپرست

مولانا وحید الدین خاں

الرسالہ

قبر دوسری زندگی کا دروازہ ہے۔ ہم میں سے ہر ایک نے کسی نہ کسی شخص کے لئے اس دروازہ کو کھلتے ہوئے اور پھر اس کے اوپر اس کو بند ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ مگر ہم میں سے بہت کم لوگ ہیں جو یہ جانتے ہوں کہ خود ان کے لئے بھی یہ دروازہ ایک روز کھولا جائے گا، اور پھر اسی طرح بند ہوگا جس طرح وہ دوسروں کے اوپر ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے۔

آدمی کی یہ نفسیات بھی کتنی عجیب ہے کہ دوسروں کو وہ ہر روز مرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ مگر خود اس طرح زندگی گزارتا ہے گویا اس کو ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا ہے — وہ دیکھتا ہے کہ لوگ ایک ایک کرکے روزانہ خدا کے یہاں پیشی کے لئے بلائے جا رہے ہیں۔ مگر خود اپنے کو اس طرح الگ کر لیتا ہے گویا عدالت الٰہی میں حاضری کا یہ دن اس کے اپنے لئے کبھی نہیں آئے گا۔

شمارہ ۱۰ — ستمبر ۱۹۷۷

زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے

خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے

بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی

قیمت فی پرچہ دو روپے

روزہ

اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، روزہ یہ ہے کہ آدمی علائق دنیا سے اپنے آپ کو کاٹ لے۔ اس قسم کی روزہ داری سے کیا فائدہ حاصل کرنا مقصود ہے۔ ایک لفظ میں یہ کہ انسانی وجود کا مادی پہلو کمزور ہو اور اس کی روحانیت بڑھے تاکہ عالم قدس سے اس کا اتصال ممکن ہو سکے۔ جسم کی مادی غذا کے مقابلہ میں روزہ کا مقصد روح کو معنوی غذا پہنچاتا ہے۔

آدمی جب اپنے آپ کو مادی دنیا سے اٹھاتا ہے اور روحانی دنیا سے مربوط ہوتا ہے تو حیرت انگیز طور پر وہ محسوس کرتا ہے کہ علم حقیقت کا ایک نیا دروازہ اس کے سامنے کھل گیا ہے۔ وہ سارے واقعات جو مادی غلاف میں لپٹے ہونے کی وجہ سے اس کو دکھائی نہیں دیتے تھے، اب اسے نظر آنے لگتے ہیں۔ وہ اس بلندی پر پہنچ جاتا ہے جو انسان کی آخری معراج ہے۔

اسی راہ سلوک کا ایک مقام وہ ہے جب آدمی مادی غلاف سے اتنا زیادہ گزر جاتا ہے کہ عالم حقائق اس کو بالکل بے نقاب شکل میں دکھائی دینے لگتا ہے۔ روزہ کی یہی حکمت ہے جس کی بنا پر قرآن میں، حکم روزہ کے درمیان، یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ بندوں کے قریب ہے اور پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہے۔ (الاسلام ۴۳-۴۴)

فہرست

۱	قبر کا دروازہ	۱
۲	روزہ	۲
۳	عمل کی مصنوعی سطح	۳
۴	نبوت محمدی: ایک عظیم احسان	۴
۵	خارجی ہدایت کی ضرورت	۹
۶	فطرت میں توازن	۱۲
۷	علوم اسلامی کی تدوین	۱۴
۸	المرکز الاسلامی	۲۱
۹	ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا	۲۴
۱۰	کام کی برتر سطح	۲۷
۱۱	ستاروں کی دنیا	۲۹
۱۲	حبش کی ہجرت	۳۴
۱۳	تاریخ کا مطالعہ	۳۵
۱۴	الاسلام: ایک رائے	۴۰
۱۵	ایجنسی الرسالہ کی شرائط	۴۲
۱۶	مراسلات	۴۳
۱۷	بلند فکری	۴۴
۱۸	خلیج کے کنارے	۴۵
۱۹	کائنات کی خاموش زبان	۴۵
۲۰	تعارف وتبصرہ	۴۶
۲۱	ڈاکٹر کی ضرورت نہیں	۴۷

ماہنامہ الرسالہ

جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی-۶

عمل کی حقیقی سطح پر آدمی ناکام رہتا ہے، اور مصنوعی سطح پر کامیابی کے جھنڈے لہرا رہا ہے

امریکہ میں انسانی حقوق کے عنوان پر ایک بین اقوامی سمینار ہو، اس کے لئے آپ کے پاس دعوت نامہ آئے، آپ ہوائی جہاز سے اڑ کر امریکہ پہنچیں اور وہاں شاندار اسٹیج پر ایک تقریری ریکارڈ دہرادیں۔ تو یہ خبر فوراً اخبارات میں چھپ جائے گی۔ اس کے برعکس اگر آپ کو آخرت کا ڈر ہے۔ اور جہنم کے اندیشے کے تحت آپ لوگوں کے حقوق ادا کرتے ہیں تو یہ واقعہ کبھی اخبار کی سرخی نہیں بنے گا۔

آخرالذکر، عمل کی حقیقی سطح ہے ۔ اول الذکر، عمل کی مصنوعی سطح۔ آج صورت حال یہ ہے کہ ہر شخص، خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی، عمل کی مصنوعی سطح پر زندگی گزار رہا ہے۔ وہ ان امور میں تو خوب کارنامے دکھاتا ہے جن میں "نیوز ویلو" ہو، جن سے اس کی امیج بنتی ہو، جن میں عزت و جاہ کے استقبالئے وصول ہوتے ہوں، جن میں حق کی علم برداری کا عالمی کریڈٹ ملتا ہو، جو اس کو اخبار کی سرخیوں میں جگہ دینے والے ہوں —— مصنوعی سطح کی چمک دمک نے لوگوں کو اتنا زیادہ اپنی طرف کھینچ رکھا ہے کہ عمل کی حقیقی سطح کی طرف توجہ دینے کی کسی کو فرصت نہیں۔

دوسری طرف لوگوں کا حال یہ ہے کہ اگر ان سے کوئی معاملہ پڑ جائے تو وہ کچے ثابت ہوں، کسی سے اختلاف پیدا ہو تو انصاف پر قائم نہ رہ سکیں، ان کی غلطیاں روز روشن کی طرح واضح ہو جائیں جب بھی وہ اعتراف نہ کریں۔ ایک مظلوم ان سے بے لاگ فیصلہ کی امید نہ کر سکے۔ خدا کی کھلی کھلی نشانیاں ظاہر ہوں مگر وہ عبرت نہ پکڑیں۔ وہ اپنے دل کو حسد، بغض، کینہ، نفرت، عصبیت سے پاک نہ کریں۔ وہ طاقت کے آگے جھک جائیں، مگر دلیل کے آگے جھکنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ خدا کی آیتیں سن کر ان کے دل نہ دہلیں اور آخرت کی جواب دہی کے خوف سے ان کے جسم کے رونگٹے کھڑے نہ ہوں۔

لوگ عمل کی مصنوعی سطح پر کامیابی کے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ اور عمل کی جو حقیقی سطح ہے وہاں ناکامی کے گڑھے میں پڑے ہوئے ہیں —— جلسوں اور کنونشنوں کی دھوم ہے، جہاد اور انقلاب کے نعرے لگ رہے ہیں۔ دوسری طرف خاموش تعمیری کام کا سارا میدان خالی پڑا ہوا ہے اور اس کے لئے کوئی نہیں اٹھتا۔

نبوت محمدی: انسانیت پر ایک عظیم احسان

بعثت کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے۔ کسی عرب قبیلہ کا ایک شخص کعبہ کی زیارت کے لئے مکہ آیا۔ وہ جب واپس گیا تو اس کے قبیلہ والوں نے پوچھا، مکہ کی کوئی خبر بتاؤ۔ اس نے جواب دیا:

محمد تنبأ و تبعه ابن ابی قحافة

محمدؐ نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور ابوقحافہ کا لڑکا ان کا ساتھ دے رہا ہے

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۶۱۰ء میں جب آپ نے نبوت کا اعلان فرمایا اس وقت لوگوں کے ذہن میں آپ کی تصویر کیا تھی۔ آپ کے مخالفین اس زمانہ میں آپ کو ابن ابی کبشہ کہتے تھے، جس کا مطلب ہوتا تھا: فلاں دیہاتی کا لڑکا۔ کوئی زیادہ شریف زبان بولنا چاہتا تو کہتا: فتی من قریش، یعنی قبیلہ قریش کا ایک جوان۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال اپنے زمانہ میں تھا۔ مگر صدیاں گزرنے کے بعد اب صورت حال بالکل مختلف ہے۔ کیوں کہ اب آپ کی نبوت کوئی نزاعی مسئلہ نہیں۔ اب وہ ایک تسلیم شدہ واقعہ (ESTABLISHED FACT) کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ آج جب ایک شخص کہتا ہے "محمد رسول اللہ" تو اس کے ذہن میں ایک ایسے پیغمبر کا تصور ہوتا ہے جس کے گرد ایک عظیم الشان تاریخ بن چکی ہے، جس کی پشت پر ڈیڑھ ہزار برس کی تصدیقی عظمتیں قائم ہیں۔ اگر ایسا ہو کہ یہ تاریخ مکمل طور پر آپ سے الگ کر دی جائے اور نبی عربی دوبارہ "ابن ابی کبشہ" کی صورت میں ظاہر ہوں تو اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ آپ پر ایمان لانے والوں کی تعداد جو آج کروروں میں گنی جاتی ہے، صرف درجنوں تک محدود ہو کر رہ جائے گی — "ابن ابی کبشہ" کے حلیہ میں رسول خدا کو پہچان لینا انتہائی مشکل کام ہے۔ جب کہ یہی کام اس وقت انتہائی آسان ہو جاتا ہے جب رسول ایک مسلّمہ تاریخی حیثیت یا قرآن کے لفظوں میں مقامِ محمود (اسراء ـ ۷۹) کا درجہ حاصل کر چکا ہو۔

پچھلے ادوار میں نبیوں کے ہم زمانہ لوگوں کے لئے نبی کا انکار کرنے کی سب سے بڑی نفسیاتی وجہ یہی تھی — "یہ تو وہی معمولی شخص ہے جس کو اب تک ہم فلاں بن فلاں کے نام سے جانتے تھے، وہ اچانک خدا کا پیغمبر کیسے ہو گیا" جب بھی کوئی نبی اٹھتا، یہ خیال ایک قسم کا شک اور تردد بن کر ان کے اوپر چھا جاتا، اور نبی کی پیغمبرانہ حیثیت کو پہچاننے کے معاملہ کو اس کے معاصرین کے لئے مشکل بنا دیتا۔

یہ صورت حال، خاتم النبین کے ظہور سے پہلے، انسانیت کو مسلسل ایک کڑی آزمائش میں مبتلا کئے ہوئے تھی۔ ہر بار ان کے اندر سے ایک نیا شخص خدا کے رسول کی حیثیت سے اٹھتا۔ مخاطب قوم کی اکثریت، مذکورہ نفسیاتی رکاوٹ کی وجہ سے، اپنے ہم عصر نبی کے بارے میں شک اور تردد میں پڑ کر انکار کر دیتی اور بالآخر سنت اللہ کے مطابق ہلاک کر دی جاتی۔

اب اللہ تعالٰی نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک ایسا نبی بھیجے جو ساری دنیا کے لئے رحمت کا دروازہ کھول دے۔ اس کی ذات پچھلے پیغمبروں کی طرح لوگوں کو اس آزمائش میں نہ ڈالے کہ "معلوم نہیں یہ واقعی پیغمبر ہے یا شخصی حوصلہ مندی

نے اس کو اس قسم کے دعوے پر آمادہ کر دیا ہے۔" اس کی نبوت ہر دور کے لوگوں کے لئے ایک مسلّمہ واقعہ کی حیثیت رکھتی ہو۔ لوگ کسی نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا ہوئے بغیر اس کی "محمودیت" کی وجہ سے اس کو پہچان لیں اور اس پر ایمان لا کر خدا کی رحمتوں میں حصہ دار بنیں۔

متعدد روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے افراد تمام دوسرے انبیاء کی امتوں سے زیادہ ہوں گے۔ اس کا تعلق بھی اسی مسئلہ سے ہے۔ آپ کے بعد چونکہ کوئی نبی آنے والا نہیں۔ اس لئے آپ کی امت میں آپ کے بعد دوبارہ کفر و اسلام کا مسئلہ کھڑا ہونے والا نہیں ہے۔ آپ کی امت بدستور بڑھتی رہے گی، یہاں تک کہ قیامت آ جائے گی۔

اس معاملہ کو بنی اسرائیل کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ حضرت مسیح کے زمانہ میں جو یہود تھے، وہ سب خدا کی شریعت پر ایمان رکھتے تھے وہ حضرت موسیٰ کے امتی تھے۔ مگر ابن مریم کی صورت میں جب ان کے اندر ایک نیا نبی اٹھا تو اس کو ماننا یہود کے لئے ممکن نہ ہو سکا۔ حضرت موسیٰ کو وہ اب بھی مانتے تھے۔ مگر اپنے ہم عصر نبی کا انکار کر رہے تھے۔ اس کی وجہ سے، ایک درجن مومنین مسیح کو چھوڑ کر، سارے کے سارے یہودی کافر قرار پا گئے۔ حضرت مسیح کے چھ سو برس بعد جب نبی عربی کی بعثت ہوئی تو مسلمانوں کی اس نئی جماعت (عیسائیوں) کی تعداد بہت بڑھ چکی تھی۔ مگر دوبارہ وہی ہوا کہ نئے "اسماعیلی نبی" کو ماننے کے لئے وہ اپنے کو آمادہ نہ کر سکے۔ وہ تاریخی نبی (حضرت مسیح) پر بدستور ایمان رکھتے تھے۔ مگر اپنے ہم عصر نبی (حضرت محمدؐ) کے منکر تھے۔ اس کی وجہ سے دوبارہ ایسا ہوا کہ نبوت محمدی پر ایمان لانے والے چند عیسائیوں کو چھوڑ کر پوری عیسائی قوم کو کافر قرار دے دیا گیا۔

ختم نبوت کی وجہ سے امت محمدی میں اس قسم کی چھٹنی، کم از کم موجودہ دنیا میں، دوبارہ ہونے والی نہیں۔ اس لئے آپ کے امتیوں کی تعداد بھی دوسرے انبیاء کے پیرووں سے زیادہ رہے گی —— یہ بھی ایک پہلو ہے آپ کے رحمۃ للعالمین ہونے کا جو اس لئے حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مقام محمود پر کھڑا کیا۔ مقام محمود دنیوی اعتبار سے یہ ہے کہ آپ کی نبوت کو ساری دنیا کے لئے ایک تاریخی مسلّمہ بنا دیا گیا۔ یہی تعریفی حیثیت قیامت کے دن خصوصی خداوندی اعزاز کی صورت میں ظاہر ہوگی جو اولین و آخرین میں آپ کے سوا کسی کو حاصل نہ ہوگی۔

مگر کسی نبی کو مقام محمود پر کھڑا کرنا سادہ طور پر محض نامزدگی کا معاملہ نہ تھا۔ یہ ایک نئی تاریخ کو ظہور میں لانے کا معاملہ تھا۔ اس کے لئے ایک طرف ایسی معیاری شخصیت درکار تھی جیسی کوئی دوسری شخصیت بنی آدم میں پیدا نہ ہوئی ہو دوسری طرف ایسی قربانی اور حوالگی درکار تھی جیسی قربانی و حوالگی کا ثبوت کسی دوسرے انسان نے نہ دیا ہو۔ یہی وہ نازک لمحہ تھا جب کہ خدا نے اپنے ایک بندے کو پکار کر کہا: يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنذِرْ ۔۔۔ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ، اور کمل میں لپٹی ہوئی اس عظیم روح نے لبیک کہہ کر اپنے آپ کو ہمہ تن خدائی منصوبہ کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد طویل عمل کے نتیجہ میں بالآخر وہ نبوت ظہور میں آئی جو سارے عالم کے لئے رحمت بن گئی۔ جس نے انسانی تاریخ میں بار بار نئے نبیوں کی آمد کے آزمائشی سلسلہ کو ختم کیا اور ایک مسلّمہ نبوت کے دور کا آغاز کر کے لوگوں کے لئے خدا کی رحمتوں میں بلا روک ٹوک داخلہ کی راہ کھول دی

داخل ہونے کا دروازہ کھول دیا۔

نبوت کو تاریخی مسلمہ بنانے کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ آئندہ کے لئے نبیوں کی آمد کا سلسلہ بند ہو جائے۔ مگر یہ بھی محض اعلان کا معاملہ نہ تھا۔ ختم نبوت سے پہلے ضروری تھا کہ چند شرائط لازمی طور پر پوری ہو چکی ہوں:

۱۔ زندگی کے تمام معاملات کے لئے احکام خداوندی کا نزول (اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ)

۲۔ انسانی کردار کے لئے ایک کامل نمونہ سامنے آجانا (لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ)

۳۔ وحی الٰہی کی دائمی حفاظت کا انتظام (نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ)

اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک فیصلہ کے ذریعہ ان تینوں شرائط کی تکمیل کا انتظام فرما دیا۔

پچھلے نبیوں کے لئے اللہ کی سنت یہ رہی ہے کہ ہر نبی کو کچھ آیات (معجزے) دیئے جاتے تھے۔ نبی اپنی مخاطب قوم میں تبلیغ و دعوت کا فریضہ آخری حد تک ادا کرتا۔ وہ غیر معمولی نشانیوں کے ذریعہ اپنے نمائندہ الٰہی ہونے کا ثبوت پیش کرتا۔ اس کے باوجود جب لوگ ایمان نہ لاتے تو نبی کا کام ختم ہو جاتا۔ اب اللہ تعالیٰ کے فرشتے متحرک ہوتے اور زمینی یا آسمانی عذاب کے ذریعہ اس قوم کو ہلاک کر دیتے۔

نبی آخر الزماں کے لئے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہوا کہ آپ کی مخاطب قوم کے لئے اس قسم کا عذاب نہیں آئے گا، بلکہ خود نبی اور آپ کے اصحاب کو ان سے ٹکرا کر انھیں مجبور کیا جائے گا کہ وہ دین خداوندی کو قبول کریں (تقاتلونھم او یسلمون) اس کے باوجود ان میں سے جو لوگ اطاعت نہ کریں وہ اہل ایمان کی تلواروں سے قتل کر دیئے جائیں (قَاتِلُوْھُمْ یُعَذِّبْھُمُ اللّٰہُ بِاَیْدِیْکُمْ) دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس سے پہلے جو کام فرشتے کرتے تھے، اس کو انسانوں کے ذریعہ انجام دیا جائے۔

اسی فیصلۂ الٰہی کا نتیجہ تھا کہ ہجرت اور اتمام حجت کے بعد، دیگر انبیاء کی قوموں کے برعکس، اہل عرب پر کوئی جوالا مکھی پہاڑ نہیں پھٹا اور نہ آسمان سے آگ برسی۔ بلکہ رسول اور اصحاب رسول کو ان کے ساتھ ٹکرا دیا گیا۔ اس فوجی تصادم میں اللہ کی خصوصی نصرت کے ذریعہ رسول اور آپ کے اصحاب کو فتح حاصل ہوئی۔ خدا کا دین ایک باقاعدہ اسٹیٹ کی شکل میں جزیرہ نمائے عرب پر قائم ہو گیا۔

اس واقعہ کے مختلف نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ تھا کہ دعوت نبوت کو، انفرادی تقاضوں سے لے کر اجتماعی معاملات تک، زندگی کے تمام مراحل سے گزرنا پڑا اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کے لئے مسلسل احکام اترتے رہے۔ اگر یہ واقعات پیش نہ آتے تو اسلامی شریعت میں ہر قسم کے احکام نہیں اتر سکتے تھے۔ کیونکہ اللہ کی یہ سنت ہے کہ وہ حالات کے لحاظ سے اپنے احکام بھیجتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ کتابی مجموعہ کی شکل میں یک وقت سارے احکام لکھ کر نبی کو دے دیئے جائیں۔ فرشتوں کے ذریعے منکرین عرب کا استیصال کرنے کے بجائے اہل ایمان کی تلوار کے ذریعہ ان کو زیر کرنے کے فیصلے نے دین کی تکمیل کے اسباب پیدا کر دیئے۔

پھر اسی کی وجہ سے یہ امکان پیدا ہوا کہ پیغمبر کا سابقہ زندگی کی تمام صورتوں سے پیش آئے۔ اور ہر قسم کی

سرگرمیوں میں وہ اسلامی کردار کا عملی نمونہ دکھا سکے۔ اس کے بعد خود حالات کے ارتقاء کے تحت ایسا ہوا کہ نبی کو مسجد اور مکان سے لے کر میدان جنگ اور تخت حکومت تک ہر جگہ کھڑا ہونا پڑا اور ہر جگہ اس نے معیاری انسانی کردار کا مظاہرہ کرکے قیامت تک کے لوگوں کے لئے نمونہ قائم کر دیا۔

پھر اسی واقعہ نے قرآن کی حفاظت کی صورتیں بھی پیدا کیں۔ پچھلی آسمانی کتابیں جو محفوظ نہ رہ سکیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ نبی کے بعد ان کتابوں کی پشت پر کوئی ایسی طاقت نہ رہی جو بزور ان کو ضائع ہونے سے بچاتی۔ پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب نے اپنی ہم عصر قوموں سے مقابلہ کرکے اولاً عرب اور اس کے بعد قدیم دنیا کے بڑے حصہ پر اسلام کا غلبہ قائم کر دیا۔ اس طرح کتاب الٰہی کو حکومتی اقتدار کا سایہ حاصل ہو گیا جو خدا کی کتاب کو محفوظ رکھنے کی یقینی ضمانت تھا۔ یہ انتظام اتنا طاقتور تھا کہ ایک ہزار برس تک اس میں کوئی فرق نہ آ سکا۔ اسلامی اقتدار کے زیر سایہ قرآن ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتا رہا۔ یہاں تک کہ صنعتی انقلاب ہوا اور پریس کا دور آ گیا جس کے بعد قرآن کے ضائع ہونے کا کوئی سوال نہیں۔

یہ سب جو ہوا، اس طرح ٹھنڈے ٹھنڈے نہیں ہو گیا جیسے آج ہم اس کو سیرت و تاریخ کی کتابوں میں پڑھ لیتے ہیں۔ اس کے لئے نبی اور آپ کے ساتھیوں کو ناقابل برداشت طوفان سے گزرنا پڑا۔ کفار کے مطالبہ اور نبی کی خواہش کے باوجود ان کو فوق الفطری معجزے نہیں دیئے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں اپنے اخلاق و کردار کو معجزاتی واقعات کا بدل بنانا پڑا۔ ان کے مکذّبین کے لئے کوئی ارضی وسماوی عذاب نہیں آیا۔ اس طرح انھیں وہ کام کرنا پڑا جس کے لئے پہلے بھونچال آتے تھے اور آتش فشاں پھٹتے تھے۔ ختم نبوت کے فیصلہ کے باوجود کتاب الٰہی کو یکبارگی ان کے حوالے نہیں کیا گیا۔ اس لئے ان کے واسطے ضروری ہو گیا کہ وہ زندگی کے وسیع سمندروں میں کود دیں اور ہر قسم کی چٹانوں سے ٹکرائیں تاکہ تمام معاملات زندگی کے بارے میں ان پر احکام الٰہی کا نزول ہو سکے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس پورے عمل کے دوران نبیؐ اور آپ کے اصحاب امتحان کے اس انتہائی کڑے معیار پر تھے جس کو قرآن میں زلزالِ شدید (احزاب۔ ۱۱) کہا گیا ہے۔ نبیؐ کو سخت ترین حکم تھا کہ ظالموں کی طرف ادنیٰ جھکاؤ بھی مت دکھاؤ (اسراء۔ ۷۵) ورنہ تم کو دگنی سزا دی جائے گی۔ حالات خواہ کتنے ہی شدید ہوں، آپ کے ساتھیوں کے لئے کسی بھی حال میں تخلف (توبہ۔ ۱۱۹) کی اجازت نہ تھی۔ آپ کی ازواج اگر دو وقت کی روٹی کا بھی مطالبہ کریں تو ان کے لئے یہ صاف جواب تھا کہ پیغمبر کی صحبت اور دنیا میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کر لو (احزاب۔ ۲۸)

حقیقت یہ ہے کہ نبوت محمدی کو بروئے کار لانا انسانی تاریخ کا مشکل ترین منصوبہ تھا۔ اور یہ سب کچھ اتنی قیامت خیز سطح پر ہوا کہ خود رسول کی زبان سے نکلا کہ "اس راہ میں مجھ کو اتنا ستایا گیا جتنا کسی دوسرے نبی کو نہیں ستایا گیا"۔ آپ کی رفیقۂ حیات نے شہادت دی کہ لوگوں نے آپ کو روند ڈالا تھا (حطمہ الناس) خاتم النبیین اور آپ کے ساتھیوں نے دنیا کا آرام تو درکنار زندگی کی ناگزیر ضرورتوں سے بھی اپنے کو محروم کر لیا، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکا کہ تاریخ میں اس نبوت کا دور شروع ہو جس کو رحمۃ للعالمین کہا گیا ہے۔

نبی عربی کا آپ کے بعد آنے والی نسلوں پر یہی وہ احسان عظیم ہے جس کی وجہ سے دائمی طور پر آپ پر صلوٰۃ و سلام بھیجنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تاریخ کے اس مشکل ترین مشن میں چونکہ آپ کے اہل خاندان نے آپ کے ساتھ مکمل تعاون کیا اور آپ کے اصحاب اس صبر آزما جدوجہد میں پوری طرح صادق القول اور صابر العمل ثابت ہوئے، اس لئے رسولؐ کے ساتھ آپ کے آل اور آپ کے اصحاب کے لئے بھی رحمت اور سلام بھیجنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جب کوئی شخص کسی کے اوپر احسان کرے تو انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس پر شکر کا اظہار کیا جائے۔ درود و سلام اسی قسم کے ایک عظیم ترین احسان کا دعائی شکل میں اعتراف ہے۔ حدیث میں ہے: البخیلُ مَن ذُکرتُ عندَہ فلم یُصلِّ علیَّ (نسائی، ترمذی)

اللّٰھُمَّ صَلِّ علیٰ سَیِّدِنا مُحَمَّدٍ وَّ علیٰ آلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَسَلَّم

سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا ہے ـــ "خدا تم کو مقام محمود پر کھڑا کرے گا"۔ پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں یہ خداوندی اطلاع مکی دور کے آخری سال نازل ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ آپؐ کی مظلومیت اور بے سروسامانی اپنی آخری انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ حتیٰ کہ آپ کے مخالفین آپ کے قتل کی تدبیریں کرنے لگے تھے۔ آپ کو محمدؐ (تعریف کیا ہوا) کے بجائے مذمم (مذمت کیا ہوا) کہتے تھے۔

اس وقت خبر دی گئی کہ مخالفین اسلام اپنے وقتی اقتدار سے خوش نہ ہوں۔ محمدؐ بن عبداللہ کا معاملہ کوئی انسانی معاملہ نہیں۔ یہ تمام تر خدائی معاملہ ہے۔ خدا بہرحال اپنے منصوبہ کو پورا کرکے رہے گا، خواہ منکرین اس کے خلاف کتنی ہی کوششیں کر ڈالیں۔ نبی عربی کے ساتھ یہ نہیں ہونا ہے کہ وہ گمنامی کے ساتھ اس دنیا سے چلے جائیں، جیسا کہ اکثر نبیوں کے ساتھ ہوا۔ خدا اپنے نبیؐ کو مکہ سے نکال کر یثرب لے جائے گا اور وہاں اس کے لئے مرکز فراہم کرے گا۔ اس کو اقتدار عطا فرمائے گا جس کے ذریعہ سے وہ باطل کو شکست دے گا۔ مخصوص خدائی مصالح کے تحت ان کو اس حد تک کامیاب بنانا ہے کہ وہ محمود خلائق ہو جائیں۔ ان کو مذمم کہنے والے بہت جلد اپنی زندگی ہی میں ان کو حقیقی معنوں میں محمد اور محمود بنتے ہوئے دیکھیں گے ـــ نبی عربیؐ کے بارے میں خدا کا یہ منصوبہ مکمل طور پر پورا ہوا۔ حتیٰ کہ وہ اس قابل ہو سکے کہ دین خداوندی کی بنیاد پر ایک نئی تاریخ وجود میں لا سکیں۔

خدا کے رسولؐ جس طرح دنیا میں لوگوں کے درمیان محمود و ممدوح قرار پائے، اسی طرح میدان حشر میں بھی وہ لوگوں کے درمیان مقام محمود پر فائز ہوں گے۔ محمودیت کے اس آخری اور کامل اظہار کا نام مقام شفاعت ہے۔ دنیا میں آپ کے ذریعہ انسانیت کو ایک عظیم امتحان سے نجات ملی۔ آخرت میں بھی اللہ آپ کے وسیلہ سے لوگوں کو حشر کی ہولناک آزمائش سے نکالے گا اور بلاشبہ یہ ایک ایسا اعزاز ہوگا جو اولین و آخرین میں کسی کو حاصل نہیں۔

خارجی ہدایت کی ضرورت

انسان آزاد پیدا ہوا ہے۔ مگر اس کو نہیں معلوم کہ وہ اپنی آزادی کو کس طرح استعمال کرے۔ کائنات کی غیر ذی روح اشیاء قانون فطرت کے تحت اپنا عمل کر رہی ہیں اور ذی روح اشیاء جبلت کے تحت۔ ساری معلوم دنیا میں یہ صرف انسان ہے جس کو اپنی زندگی کا نقشہ خود بنانا ہوتا ہے۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ انسان، اپنی ساری اعلیٰ صلاحیتوں کے باوجود یہ نہیں جانتا کہ اپنی زندگی کا نقشہ کس طرح بنائے۔ ایک انتہائی مکمل کائنات کے اندر انسان ایک نامکمل وجود ہے۔

کائنات میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ایسی نہیں جو بقیہ کائنات سے الگ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی کا نظام بنانے کے لیے پوری کائنات کا علم درکار ہے۔ انسان اس عظیم کائنات کا محض ایک جزوی حصہ ہے مگر اس جزو کو سمجھنا بھی اسی وقت ممکن ہے جب کہ کل کے بارہ میں ہم کو پورا علم حاصل ہو چکا ہو۔ تاریخ بتاتی ہے کہ انسان کسی بھی زمانہ میں اس قابل نہ ہو سکا کہ وہ حقائق عالم کا احاطہ کر لے۔ اور اب تو سائنس نے ایک قدم آگے بڑھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اپنی محدود صلاحیتوں کی بنا پر انسان کے لیے اس قسم کا احاطہ ممکن ہی نہیں۔

پانی کا راستہ زمین کے نشیب و فراز سے بن جاتا ہے۔ جانوروں کو ان کی جبلت ایک متعین راہ پر چلاتی رہتی ہے۔ بالفرض ایسا نہ ہو، جب بھی ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ کیونکہ پانی یا جانور فطری طور پر صحیح اور غلط کے احساس سے خالی ہیں۔ ان کی دنیا میں وہی ٹھیک ہے جو بالفعل وقوع میں آجائے۔ اس کے برعکس انسان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ صحیح و غلط، بالفاظ دیگر اخلاقی احساس اس کی فطرت میں اس طرح پیوست ہے کہ وہ کسی بھی طرح اپنے آپ کو اس سے جدا نہیں کر سکتا۔ مگر آدمی جب اپنے اخلاقی احساس کو خارجی طور پر متعین کرنا چاہتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ انسان اپنے موجودہ حواس کے تحت کسی ایسی ہی چیز کو قطعیت کے ساتھ جان سکتا ہے جو ہماری نسبت سے اپنا کوئی معروضی مقام (OBJECTIVE STATUS) رکھتی ہو۔ عجب کہ تجربہ بتاتا ہے کہ انسان ایک ایسی دنیا میں ہے جہاں معروضی اقدار (OBJECTIVE VALUES) کا کوئی وجود نہیں۔

انسان اپنی زندگی کی تشکیل کے لیے جو بھی قدم اٹھاتا ہے، فوراً دو سوال اس کے سامنے

آکر کھڑے ہوجاتے ہیں ـــــ اس کے عمل کا نقطۂ آغاز (STARTING POINT) کیا ہو۔ اور یہ کہ اس کے عمل کی حدود (LIMITATIONS) کیا ہیں۔ ان دونوں سوالات کے جواب پر ہی اس کے عمل کی صحت موقوف ہے۔ مگر انسان کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں جس سے وہ ان دونوں سوالات کا ٹھیک ٹھیک جواب معلوم کر سکے۔

مثال کے طور پر عورت مرد کے باہمی تعلق کے مسئلہ کو لیجیے۔ دور جدید کے انسان نے اس معاملہ کا نقطۂ آغاز دونوں جنسوں کے درمیان کلی مساوات کو سمجھا۔ مگر طویل تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ یہاں ایسی حیاتیاتی اور نفسیاتی رکاوٹیں ہیں کہ موجودہ نظام تخلیق کے باقی رہتے ہوئے دونوں کے درمیان کلی مساوات ممکن ہی نہیں۔ اس طرح غلط نقطۂ آغاز سے چلنے کی وجہ سے نہ صرف بےشمار انسانی وسائل ضائع ہو گئے بلکہ ایسے نئے نئے سماجی اور خاندانی مسئلے پیدا ہو گئے جن کا کوئی حل اب انسان کی سمجھ میں نہیں آتا۔

اسی طرح اٹھارویں صدی میں مشینی طاقت کی دریافت کے بعد جب جدید صنعتی نظام وجود میں آیا تو لوگوں نے دیکھا کہ کارخانہ کی ملکیت اب سادہ معنوں میں صرف ملکیت نہیں رہی بلکہ اقتصادی استحصال کے ہم معنی ہو گئی ہے۔ اس سے روایتی افکار کے خلاف بغاوت پیدا ہوئی جو بالآخر یہاں تک پہنچی کہ خود انفرادی ملکیت ہی کو سرے سے منسوخ کر دیا گیا۔ تاہم آباد دنیا کے تقریباً نصف حصہ پر آدھی صدی تک تجربہ کرنے کے بعد آخری بات جو انسان کو معلوم ہوئی وہ یہ کہ تنسیخ ملکیت محض ردعمل کے جذبات کے تحت ایک انتہا پسندانہ کارروائی تھی جس نے دوسرا شدید تر استحصالی نظام وجود میں لانے کے سوا اور کوئی نتیجہ پیدا نہیں کیا۔ اب تمام دنیا کے اہل فکر یہ سوچنے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ شاید زیادہ صحیح بات یہ تھی کہ ملکیتوں کی تنسیخ کے بجائے استحصال کی تنسیخ کی جاتی۔

ایک اور مسئلہ ہے جو مذکورہ بالا دونوں مسئلوں سے بھی زیادہ اہم ہے۔ تمام دوسرے حیوانات کے مقابلہ میں انسان کے اندر ایک حیرت انگیز داعیہ یہ ہے کہ وہ کل (TOMORROW) کا تصور رکھتا ہے وہ صرف "آج" پر قانع نہیں۔ اسی کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری موجودہ زندگی انتہائی مختصر ہے اور اس کی خوشیاں اور کامیابیاں بے حد معمولی ہیں۔ جب ہم وہ سب کچھ حاصل کر لیتے ہیں جو ہم چاہتے ہیں تو موت کا وقت قریب آجاتا ہے ـــ حالیہ دور میں تکنیکی انقلاب کے بعد جب انسان نے دیکھا کہ اس کے اوپر عیش و راحت کے ایسے دروازے کھل گئے ہیں جو پچھلے انسان نے خواب میں بھی نہ دیکھے تھے تو سمجھ لیا گیا کہ بس یہی موجودہ زندگی ہی سب کچھ ہے

اور یہاں عزت اور خوشی حاصل کرلینا ہی انسان کی اصل کامیابی ہے۔ مگر انسان ایک صدی بھی اس نئے امکان سے محظوظ نہ ہوسکا تھا کہ نئے نئے مسائل مثلاً صنعت کی پیدا کردہ کثافت (INDUSTRIAL POLLUTION) نے اس کی زندگی کو بالکل تلخ کر دیا۔ ایک طرف اینٹی سائنس تحریک مختلف شکلوں میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوسری طرف نفسیاتی تحقیقات نے یہ ثابت کرنا شروع کیا کہ زندگی ایک ایسا مظہر ہے جو جسمانی موت کے بعد بھی کسی نہ کسی شکل میں باقی رہتا ہے حتی کہ علم الموت (THANATALOGY) کے نام سے سائنس کی ایک نئی شاخ وجود میں آگئی ہے جو اس امکان کی تحقیق میں سرگرم ہے کہ کیا موت اور زندگی دونوں ایک دوسرے کے حصے (PART) ہیں۔ ان واقعات نے دوبارہ انسان کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے لیے کسی صحیح تر فلسفہ حیات کی تلاش کرے۔

اوپر جن پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا، اس کی صرف دو توجیہیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ انسان ایک مکمل کائنات کے اندر ایک نامکمل وجود کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ایسے کائناتی تضاد کی علامت ہے جس کا کوئی حل معلوم دنیا کے اندر ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس تضاد کا بھی حل ہے یا کم از ہو سکتا ہے۔ تجرباتی علوم کے پاس دونوں توجیہات میں سے کسی کے حق میں کوئی قطعی ثبوت موجود نہیں۔ تاہم عقلی قیاس یہ کہتا ہے کہ دوسری توجیہ کو صحیح ہونا چاہیے کیونکہ یہ عظیم کائنات جس طرح قانون فطرت اور جبلت کے تحت انتہائی منظم طور پر چل رہی ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ بات ناقابل قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اس سے کمتر درجہ کے ایک سوال کا جواب اس کے پاس نہ ہو۔ جو تخلیقی قوت عالم افلاک کے مہیب نظام کو گردش دے رہی ہے اور ذی روح اشیا کی انتہائی پیچیدہ زندگی کو پوری کامیابی کے ساتھ بروئے کار لانے میں مصروف ہے، وہ اس کے مقابلہ میں ایک بہت چھوٹے مسئلہ کا حل اپنے پاس نہ رکھتی ہو، یہ کسی طرح قابل فہم نظر نہیں آتا۔ انسان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ بطور خود اپنا فلسفہ حیات دریافت کر سکے مگر خارجی قرائن کہتے ہیں کہ کائنات میں اس انسانی طلب کا انتظام ہونا چاہیے، جس طرح دوسری بے شمار ضرورتوں کا مکمل انتظام اس کے اندر موجود ہے۔

یہ واقعہ انسان کے لیے خارجی ہدایت کی ضرورت ثابت کرتا ہے اور خارجی ہدایت ہی کا دوسرا نام وحی والہام ہے۔

فطرت میں توازن کا اصول

زمین کی رنگا رنگی اور متنوع شکل بڑی حد تک ان حشرات الارض، نباتات اور حیوانات کی پیدا کردہ ہے جو اس کی بے جان چٹانوں اور گیسوں کو لاتعداد قسم کے پیچیدہ مرکبات میں لگاتار تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ یہ صرف انسان ہے جو فطرت کے کام میں خلل اندازی کرکے اکثر تباہ کن حالات پیدا کر دیتا ہے۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری ہوئی ہے کہ کس طرح زراعت اور صنعت کی بدانتظامی سے توازنِ فطرت میں بگاڑ رونما ہوا ہے۔ جون ۱۹۷۲ میں اسٹاک ہوم میں انسانی ماحول سے متعلق اقوام متحدہ کی ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ایسے عالمی طریق کار وضع کئے جائیں جن سے انسان کی ارضی بدانتظامی سے پیدا ہونے والے ماحولی نقائص کا انسداد ممکن ہو سکے۔

ڈاکٹر بیری کامنر نے توازن فطرت سے متعلق اپنے چوتھے قانون کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے: "فطرت کی دانش افضل ترین ہے"۔ جب ماحول کو جوں کا توں چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنے آپ ایک متوازن حالت پر آنے لگتے ہیں۔

ایسے متوازن حالات میں قدرت کے تمام فضلات پھر نئے سرے سے فطرت کی گردش میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر درختوں کے سوکھے پتے اور ٹہنیاں حشرات الارض کے کام آتی ہیں جو ان کے عناصر ترکیبی کو معدنی و مرکباتی غذاؤں کی شکل میں زمین کو واپس کرتے ہیں اور ان مرکبات کے سہارے اس جنگل میں مزید نباتات اگتی جاتی ہیں۔ اس طرح وہاں توازن فطرت کا نظام برقرار رہتا ہے۔ کچھ جانوروں جیسے لیمنگ، چھچھوندر اور خرگوش کی تعداد میں بار بار جو اچانک بھاری کمی ہوتی ہے، اس کا سبب بھی یہی قدرتی عمل ہے جس کے ذریعہ کھلی فطرت میں جانداروں کی تعداد پر کنٹرول کیا جاتا ہے۔ یہ متعلقہ جانوروں کی آبادی اور مقامی وسائل کے درمیان پھر سے توازن قائم کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ انسان جب تیل، کوئلہ وغیرہ کو نکال کر جلاتا ہے تو وہ بھی گویا اس گردش کو مکمل کرنے میں مدد دیتا ہے۔ کیونکہ اس طرح وہ ان ایندھنوں کے کاربن اور دیگر معدنیات کو پودوں کی نشوونما کے لئے پھر سے مہیا کرتا ہے۔

قدیم زمانہ میں انسان اپنی مختلف سرگرمیوں کے دوران جو فضلات پیدا کرتا تھا، قدرت ان کو ری سائیکل کرکے دوبارہ ان کو مفید شکل میں تبدیل کر دیتی تھی۔ مشینی صنعت کے دور میں پہلی بار یہ مسئلہ پیدا ہوا ہے کہ انسان ایسے کیمیاوی مرکبات وجود میں لا رہا ہے جن کو ری سائیکل کرنے کا انتظام قدرت کے ڈھانچہ میں نہیں۔ چنانچہ دور جدید کے ماہرین یہ کہہ رہے ہیں کہ انسان کو اگر اس زمین پر صحت و عافیت کے ساتھ رہنا ہے تو اس کو اپنی عادتوں میں تبدیلی کرنی پڑے گی۔

یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ انسان اس زمین پر آزاد اور خود مختار نہیں ہے۔ وہ خدا کا بندہ ہے۔ اس کو اسی طرح زندگی گزارنی ہے جس طرح اس کا خدا چاہتا ہے۔ اگر وہ خدائی نقشہ کے خلاف چلے گا تو بربادی کے سوا کہیں اور نہیں پہنچ سکتا۔

بے شمار بھڑکتے ہوئے ستاروں کی اس وسیع کائنات میں زمین ایک حیرت انگیز استثناء ہے۔ اس کا احساس آدمی کو اس وقت ہوگا جب اس ہرے بھرے کرہ کو اس سے چھین لیا جائے گا۔ اس وقت آدمی دیکھے گا کہ زمین کے باہر اس کے استقبال کے لئے آگ کے ہولناک شعلوں کے سوا اور کچھ نہیں۔

تاہم گردش نو کی اس انسانی شکل میں یہ خرابی ہے کہ ان ایندھنوں کی باقیات کو ہوا، پانی اور زمین کے ذریعہ پھر سے فطری گردش میں ڈالنے کا عمل اتنی زیادہ تیزی سے ہوتا ہے کہ وہ آج کے توازن فطرت پر ایک بوجھ بن جاتے ہیں۔

گوانو (GUANO) نام کے مادہ کا جمع ہونا بھی فطرت کا ایک عجیب کارنامہ ہے۔ یہ مادہ جو اب کھاد کے طور پر استعمال ہوتا ہے، بیٹ پر مشتمل ہے جو پرندوں نے لاکھوں سال تک بعض جزیروں اور پہاڑی چوٹیوں پر ڈالی ہے۔ مثال کے طور پر کروڑوں سمندری پرندے پیرو کے ساحل سمندر کے قریب واقع جزائر چنچا کو اپنے بسیرے اور انڈے دینے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ یہاں ان کی بیٹ جو صدیوں سے جمع ہوتی رہی ہے۔ گوانو کی تہوں میں بدل گئی ہے جو ۱۸ سے ۳۰ میٹر تک اونچی ہیں۔ یہ گوانو (بیٹ) چونکہ نائٹروجن، فاسفیٹ اور پوٹاش سے بھرپور ہے، اس لئے یہ نہایت اعلیٰ قسم کی کھاد ہے۔ اور اس کا جمع ہونا مقامی باشندوں کے لئے ایک عجیب و غریب نعمت ہے جو اس کو جمع کر کے کھیتوں میں ڈالتے ہیں۔ اس طرح یہ پودوں کی خوراک بن کر پھر سے حیاتیاتی گردش میں شامل ہو جاتی ہے

ٹھوس فضلات کا مسئلہ اب بے حد سنگین ہو گیا ہے۔ کیونکہ ہم ماضی کی نسبت اب کہیں زیادہ فضلہ پھینکتے ہیں اور وہ عام طور سے ایسے کیمیاوی مرکبات پر مشتمل ہوتا ہے جو قدرتی نظاموں میں نہیں پائے جاتے۔ اب فطرت نہیں جانتی کہ اس نئی صورت حال سے جس کی ماضی میں کوئی نظیر نہیں ہے، کیسے نپٹا جائے۔ ان ٹھوس فضلات کے مسئلہ کا حل فطرت کے اپنے طریقوں میں نہیں نکل سکتا اس کے لئے نئے ٹکنالوجیکل طریقے اور انسان کی جبلی طرز عمل میں تبدیلیاں ضروری ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ کئی قدیم تہذیبوں نے اپنے ماحول کو تباہ کیا ہے اور یہ کہ پھر ایسا ہی عمل اب انتہائی صنعتی ترقی والے علاقوں میں ہو رہا ہے۔ بنی نوع انسان کو مستقبل کی خاطر، اس زمین کے نگہبان کے طور پر عمل کرنا ہے۔

انسان نے اپنی محنت سے ارضی مناظر میں اضافہ کی کوشش کی ہے۔ کھیت، باغ، پارک، مصنوعی جھیلیں اس کی شکل ہیں۔ تاہم انسان کی دست اندازی سے پہلے زمین پر لامتناہی سبز چادر کا جو منظر پھیلا ہوا تھا۔ کوئی انسانی پارک اس کا بدل نہیں ہو سکتا۔ فطرت کے جنگلوں کی عجیب روشنیاں حیرت و استعجاب کی ایسی کیفیت پیدا کرتی ہیں جو کسی پھلوں کے باغیچے یا گلستاں میں محسوس نہیں کی جا سکتی۔ سمندر کی وسعت اور اس کی لہروں کے لامتناہی مد و جزر میں ایک پُراسرار خوبی نظر آتی ہے جو انسان کے بنائے ہوئے ماحول میں ممکن نہیں۔ قدرت کا حسن آفاقی حسن ہے، جب کہ انسان کا بنایا ہوا حسن محدود حسن ہوتا ہے۔ اور محدود حسن کبھی آفاقی حسن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ صبح کی سنہری شعاعوں یا شام کی رنگین شفق کے پس منظر میں چڑیوں کے جھنڈ کے جھنڈ اڑنے سے جو اتھاہ حسن پیدا ہوتا ہے کون ہے جو اس کو دہرا بھی سکے، اس سے بہتر حسن کو وجود میں لانے کا تو سوال ہی کیا۔

ہمارے پاس اسلامی کتابوں کا ایک ایسا سٹ ہونا چاہئے جو اسلام کے مکمل مطالعہ کے لئے کسی کو دیا جا سکے۔ اس سلسلہ میں علوم اسلامی کی تدوین کی ایک تجویز یہ ہوسکتی ہے :

قرآن

۱ غیر عربی دانوں کے لئے ترجمہ (بغیر تفسیر) شائع کرنا، مختلف زبانوں میں ۔
۲ قرآن میں مذکور انبیاء اور قوموں کے حالات تاریخی انداز سے مرتب کرنا، قدیم معلومات اور جدید اثریات کی مدد سے ۔
۳ قرآن میں مظاہر کائنات کے جو حوالے ہیں، ان کی تفصیلات جدید علوم کی مدد سے ۔
۴ قرآن کی تعلیمات کتابی ابواب کی صورت میں ۔

حدیث

ضعیف اور موضوع روایتوں کو الگ کر کے تمام قوی الاسناد روایات کو چند الگ الگ مجموعوں میں اکٹھا کر دیا جائے ، مثلاً :

۵ تفسیری روایات
۶ واقعاتی روایات
۷ احکامی روایات
۸ تذکیری روایات

سیرت

۹ پیغمبر اسلام، صرف غزوات نہیں بلکہ مکمل سیرت، سادہ تاریخی اور واقعاتی انداز میں ۔
۱۰ حالات صحابہ، مکمل حالات، صرف غزوات کے نہیں بلکہ پوری زندگی کے بارہ میں ۔
۱۱ تاریخ اسلام (صرف فتوحات اسلام نہیں بلکہ مکمل تاریخ)

معاون کتابیں

۱۲ صحف سماوی (تاریخ اور تعارف)
۱۳ اعلام الاسلام (اسلامی شخصیتوں کی ڈکشنری)
۱۴ قاموس الاسلام (مختصر اسلامی انسائیکلوپیڈیا)
۱۵ معجم الحدیث (حدیث کے مندرجہ بالا مجموعوں کا مکمل انڈکس)
۱۶ تاریخ دعوت اسلام (آرنلڈ کی پریچنگ آف اسلام کے انداز پر زیادہ جامع کتاب)

علوم اسلامی کی تدوین

عقبہ بن نافع تابعی (۶۲ھ) یزید بن معاویہ کی خلافت کے زمانہ میں افریقہ میں اسلامی فوجوں کے سپہ سالار تھے۔ وہ مغربی افریقہ کے ملکوں کو فتح کرتے ہوئے اٹلانٹک کے ساحل تک پہنچ گئے۔ یہ شہر اسفی ان کی آخری منزل تھی۔ وہاں انھوں نے اپنا گھوڑا سمندر میں ڈال دیا اور اس کے پانی میں کھڑے ہو کر کہا:

اللّٰهم انی لو اعلم وراء هذا البحر بلداً لخضته اليه حتی لا يعبد احد دونك

خدایا، اگر میں جانتا کہ اس سمندر کے اُس پار بھی کوئی ملک ہے تو میں سمندر میں گھس کر وہاں جاتا یہاں تک کہ تیرے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے۔

وہ لوگ جو دور اول میں قرآن پر ایمان لائے، اور جنھوں نے براہ راست پیغمبر خدا سے تربیت حاصل کی تھی، ان کے اندر سب سے زیادہ ابھرا ہوا جذبہ یہی تھا کہ وہ خدا کے پیغام کو خدا کے تمام بندوں تک پہنچا دیں۔ ان کا یہ جذبہ اس وقت تک تھمتا ہوا نظر نہ آتا تھا جب تک سارے جہان کے لوگوں کو اللہ کا بندہ نہ بنالیں۔ بعد کی صدیوں میں اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا انتہائی حیرت کے ساتھ دیکھتا ہے کہ یہ جذبہ دھیرے دھیرے ختم ہو گیا۔ قریبی صدیوں میں جب اسلام کو زوال ہوا تو اس کو از سر نو زندہ کرنے کے لئے کتنی ہی عالی شان تحریکیں اٹھیں۔ مگر کوئی بھی قابل ذکر تحریک دعوت الی اللہ کے مقصد کو لے کر اٹھنے والی نہیں ملتی۔

جو قرآن صحابہ و تابعین نے پڑھا تھا، وہی قرآن بعد کے لوگوں نے بھی پڑھا، پھر کیا وجہ ہے کہ جس قرآن نے اپنے اولین مخاطبین کے اندر دعوت اسلام کی آگ لگا دی تھی وہی قرآن بعد کے لوگوں کو دعوت کے عنوان پر کھڑا کرنے کا باعث نہ بن سکا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ صدر اول میں قرآن براہ راست طور پر لوگوں کے لئے علم دین کا ماخذ تھا۔ جب کہ بعد کے دور میں وہ انسانوں کے پیدا کردہ علوم کے ہالہ میں چھپ گیا۔

قرآن ایک اساسی کتاب ہے جس میں دین کے تمام بنیادی مسائل بتائے گئے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ ان اساسات کی بنیاد پر اس کی مزید تبئین (نحل۔ ۴۴) کر کے اس کو لوگوں کے لئے تیسیر الفہم بنا دیا جائے۔ اس تبئین کا واضح نمونہ سنت رسول اللہ میں موجود تھا۔ مگر بعد کے دور میں قرآن کی تبئین و تفصیل نے سنت کے سادہ طریقے کے بجائے فنی طریقہ اختیار کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیدھے سادے دین محمدی کے بجائے ایک پیچیدہ قسم کا متوازی دین وجود میں آگیا جس کا تانا بانا فقہی اصطلاحات، متکلمانہ موشگافیوں اور متصوفانہ اسرار و رموز سے تیار ہوا تھا۔ تابعین، جنھوں نے اصحاب رسول سے دین کو پایا تھا، انھوں نے دین کو اس طرح فن بنانے پر سخت احتجاج کیا۔ ان کے نزدیک یہ یہود و نصاریٰ کی نقل تھی نہ کہ سنت محمدی کی پیروی۔ مگر عوام اور حکمراں چونکہ کیفیات دین سے خالی ہو چکے تھے، اس لئے تشکیل دین کے زیادہ حسب حال تھا، ان کی تائید کے زور پر وہ بڑھتا رہا۔ تاریخ کا تجربہ ہے کہ جب طویل مدت گزر جائے تو ماضی

کی ہر چیز مقدس ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وقت گزرنے کے ساتھ اس متوازی دین میں تقدس کا عنصر بھی شامل ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ اب کوئی شخص یہ سوچ نہیں سکتا کہ فقہ کی کتابوں میں کوئی مسئلہ ایسا بھی ہو سکتا ہے جو قرآن و سنت کی منشا کے مطابق نہ ہو۔ صوفیا کے ملفوظات اور قصوں میں کسی غلطی کا بھی امکان ہے۔ یا مروجہ معقولات میں بھی کوئی چیز ایسی ہو سکتی ہے جس کو غیر معقول کہا جائے ——— اس کے بعد قرآن کو جہاں جگہ مل سکتی تھی، وہ صرف برکت کا خانہ تھا۔ وہ برکت کی حیثیت سے کتاب تلاوت بن کر رہ گیا۔ حتیٰ کہ جن لوگوں نے قرآن کی تفسیریں لکھیں، ان کے سامنے بھی یا تو "ثواب" حاصل کرنا تھا یا یہ تھا کہ فقہ، تصوف یا معقولات میں اپنے مخصوص نقطۂ نظر کو خدا کی کتاب سے ثابت کر دکھائیں الا ماشاء اللہ۔

یہ کہنا صحیح ہوگا کہ فقہ اور تصوف اور علم کلام کی شکل میں جو اضافے اسلام میں ہوئے، ان کا سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ قرآن کا سرا امت کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ان اضافوں نے دین کو ایک قسم کا فن بنا دیا۔ کتاب الٰہی میں جو چیز سادہ اور فطری انداز میں بتائی گئی تھی، اس میں اپنی طرف سے موشگافیاں کر کے نئے نئے مسئلے پیدا کئے اور بطور خود بے شمار اصطلاحات وضع کیں تاکہ ان کو فنی انداز میں بیان کیا جا سکے۔ اس طرح دین خداوندی ایسے احکام و مسائل کا مجموعہ بن گیا جو صرف فنی کتابوں کے مطالعہ سے جانا جا سکتا ہو۔ کتاب الٰہی کے ذریعہ اس کو معلوم کرنا ممکن نہ ہو۔

آج کسی کو نماز کے "مسائل" جاننا ہوں تو اس کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ وہ اس مقصد کے لئے قرآن کا مطالعہ کرے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ نماز کے مسائل تو فقہ کی کتابوں میں ملیں گے۔ کسی کو روحانی ترقی مطلوب ہو تو اس کو کبھی یہ خیال نہیں آئے گا کہ خدا کی کتاب لے کر بیٹھے اور اس میں روحانی سلوک کے طریقے تلاش کرے۔ وہ صرف یہ کرتا ہے کہ کسی "بزرگ" کے پاس پہنچ جاتا ہے، کیونکہ اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ فن روحانیت کے آداب تو فن روحانیت کے کسی ماہر ہی سے معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح کسی کو یہ شوق ہو کہ وہ اسلام کی دعوت کو عقلی طور پر مدلل کرے تو وہ قرآن میں اس کے نکتے نہیں ڈھونڈے گا بلکہ معقولات میں غرق ہو جائے گا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس فن کی باریکیاں صرف معقولات کی کتابوں سے حاصل کی جا سکتی ہیں ——— قرآن اس لئے اتارا گیا تھا کہ لوگ اس میں تدبر (ص۔ ۲۹) کر کے اپنے لئے رہنمائی حاصل کریں۔ مگر قرآنی تعلیمات کو فن بنانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن، کتاب تدبر نہ رہا، کتاب تلاوت بن گیا جس کا آخری استعمال یہ تھا کہ اس کو ہر روز یا ہر ہفتہ بس "ختم" کر لیا جایا کرے۔ لوگ اپنے دین کو اپنے احبار و رہبان سے اخذ کرنے لگے اور قرآن کو برکت کی چیز کی حیثیت سے جزدان میں لپیٹ کر رکھ دیا۔ ایسا ہونا بالکل فطری تھا۔ کیوں کہ جن نکتوں اور موشگافیوں کو انھوں نے دین سمجھ رکھا تھا، وہ قرآن کے اندر موجود ہی نہ تھے۔

خدا کی کتاب سے محرومی کا یہ معاملہ اسی حد پر نہ رکا بلکہ وہ ہماری پوری زندگی پر چھا گیا۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے تمام ضروری امور کی تفصیل بیان کر دی ہے (اسراء۔ ۱۲) وہ ہر معاملہ میں مومن کی ذہنی غذا ہے۔ مگر مذکورہ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ذہن ہی ختم ہو گیا کہ اسلام اور ملت اسلام کے تمام مسائل کو ہم قرآن میں تلاش کریں، قرآن کو خالی الذہن ہو کر دیکھئے تو بلا اشتباہ نظر آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اس بات کو جانے کہ مرنے کے بعد اسے

اپنے رب کے سامنے حساب کے لئے کھڑا ہونا ہے۔ اس آنے والے دن سے تمام قوموں کو باخبر کرنا ہی امت محمدی کا اصل مشن ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں اٹھنے والی بے شمار تحریکوں میں سے کوئی بھی قابل ذکر تحریک ایسی نہیں جو اس خاص مقصد کو لے کر اٹھی ہو۔

موجودہ زمانہ میں جو لوگ احیائے اسلام کے لئے اٹھے، وہ اگرچہ عالم تھے اور قرآن کو پڑھتے تھے مگر ان کا شاکلہ فقہ اور تصوف اور علم کلام نے بنایا تھا۔ یہی چیز ہے جس نے قرآن کی صراط مستقیم سے لوگوں کو ہٹا دیا۔ ان میں سے جن کے اوپر کلامیات کا غلبہ تھا، اس کے ذہن میں خدمت دین کے شوق نے مناظرہ کی صورت اختیار کر لی، جو لوگ متصوفانہ ذہن رکھتے تھے، وہ خانقاہی طرز کی تعلیم و تربیت میں ملت کا مستقبل تلاش کرنے لگے۔ اسی طرح جن کا ذہن فقہ کے سانچے میں بنا تھا، وہ اسلام کو بطور ایک "نظام" کے دیکھنے لگے، جس کو بروئے کار لانے کی واحد شکل یہ تھی کہ حکومت الٰہیہ قائم کرکے اسلام کے دیوانی اور فوجداری قوانین کو نافذ کیا جائے۔ یہ نقطۂ نظر عوام تک میں اس طرح سرایت کر گیا کہ اسلام کے اصل کام کے لئے ان کے اندر کوئی اپیل نہیں رہی۔ ان کی فہرست میں صرف دو کام ثواب کے کام کی حیثیت سے باقی رہ گئے — مسجدوں اور مدرسوں کی تعمیر کے لئے چندے دینا، یا "بزرگوں" کی خدمت میں نذرانے پیش کرنا۔ ان کے سوا کوئی اور کام انھیں دینی کام نظر نہیں آتا، اس لئے اس میں ان سے تعاون کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔

ایک خالی الذہن شخص ہمارے اسلامی کتب خانہ کو دیکھے تو وہ حیرت انگیز طور پر ایک اختلاف کا مشاہدہ کرے گا۔ یہ دین منزّل اور دین مدوّن کا اختلاف ہے جو بہت بڑے پیمانہ پر اسلام کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ خدا کا دین قرآن و حدیث میں ایک سادہ اور فطری چیز نظر آتا ہے۔ وہ دلوں کو گرماتا ہے اور عقل میں جلا پیدا کرتا ہے۔ مگر یہی الٰہی علوم جب انسانی کتابوں میں مدون ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں تو اچانک وہ ایک ایسی شکل اختیار کر لیتے ہیں جس میں خشک بحثوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ ان میں نہ دلوں کے لئے گرمی ہے اور نہ عقل کے لئے روشنی۔ قرآن میں بھی فقہ ہے مگر وہ کنز الدقائق (ابوالبرکات نسفی) کی فقہ سے مختلف ہے۔ قرآن میں بھی تصوف ہے مگر ضیاء القلوب (حاجی امداد اللہ مہاجر کی) کے تصوف سے اس کو کوئی مشابہت نہیں۔ اسی طرح قرآن میں بھی معقولات ہیں مگر شمس بازغہ (ملا جیون جونپوری) کی معقولات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ علوم اسلامی کی تدوین بذات خود کوئی غیر مطلوب چیز تھی۔ وہ بلاشبہ مطلوب تھی۔ مگر اس نے بعد کی صدیوں میں جو رخ اختیار کر لیا وہ صحیح نہ تھا۔ اسلامی علوم کی تدوین تذکیری طرز پر مطلوب تھی نہ کہ فنی طرز پر، جیسا کہ عملاً وقوع میں آیا۔ دین کو ذکر و نصیحت کی خاطر آسان (قمر — ۱۷) بنایا گیا تھا۔ مگر ہم نے اپنی پیچیدہ بحثوں سے اس کو مشکل بنا دیا۔

قرآن کو ذکر یعنی نصیحت (یٰسٓ — ۶۹) کہا گیا ہے۔ قرآن میں غور و فکر (ص — ۲۹) اور علمی اضافہ (زمر — ۳۹) وہی مطلوب ہے جس سے ذکر اور نصیحت حاصل ہو۔ مزید یہ کہ علوم قرآنی کی تفصیل و تبیین کس طرح کی جائے، اس کا بھی واضح نمونہ سنت رسول میں موجود تھا کیونکہ آپ اس کے لئے خدا کی طرف سے مامور تھے (نحل — ۴۴) اور آپ نے اس کو

انتہائی عملی شکل میں انجام دیا۔ یہ تمام چیزیں ثابت کرتی ہیں کہ علوم اسلامی کی تدوین کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس میں فنی اضافہ کیا جائے یا اللہ اور رسول نے جو احکام دئے ہیں، ان میں مزید استخراج کرکے نئے نئے مسائل وضع کئے جائیں اور قرآن، جس میں امام غزالی کے نزدیک صرف پانچ سو احکام ہیں، اس کو پانچ سو ہزار احکام کا مجموعہ بنا دیا جائے۔ علوم اسلامی کی تدوین کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس میں بطور تبیین وتفصیل وہ چیزیں شامل کی جائیں جن میں ذکر اور نصیحت کا سامان ہو۔ قرآن میں ہم کو جو باتیں بتائی گئی ہیں، ان کے بارے میں جہاں یہ ہے کہ ان کو مضبوطی سے پکڑو، اسی کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن کے بیانات پر غور اور تدبر کرو (ص - ۲۹) قرآن میں تفصیلات اور معانی کی تلاش بجائے خود ایک پسندیدہ چیز ہے۔ مگر یہ تلاش تذکیر ونصیحت کے اجزاء تلاش کرنے کے لئے ہونا چاہئے نہ کہ فنی تعینات اور قانونی فروعات ڈھونڈنے کے لئے۔

آج اگر کسی بستی کے لوگ دار الافتاء کو یہ مسئلہ لکھ کر بھیجیں کہ ہماری مسجد کا مسقف حصہ نمازیوں کی بڑھی ہوئی تعداد کے لیے تنگ ہو رہا تھا اور مسجد کے موجودہ رقبہ میں اضافہ کی صورت نہ تھی۔ اس لئے ہم نے مسجد کے پورے صحن پر چھت ڈال دی۔ اب مشکل یہ پیش آگئی کہ مسجد میں صحن باقی نہ رہا۔ ایسی حالت میں کیا موسمی ضرورتوں کے تحت مسجد کی کھلی چھت کو نماز کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے، تو ہمارا مفتی فوراً ایک شرعی مسئلہ کی حیثیت سے اس کا جواب دینے بیٹھ جائے گا اور لکھے گا کہ فلاں فلاں شرطوں کے ساتھ مسجد کی چھت کو نماز کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ حالاں کہ ہر چیز کو "شرعی مسئلہ" بنانا قطعاً اسلام کے خلاف ہے۔ یہ تو وہ یہودیت ہے جس کو مٹانے کے لئے نبی آخر الزماں کو مبعوث کیا گیا تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے زمانے میں یہ حال تھا کہ جب اس قسم کا کوئی سوال کیا جاتا تو سائل کو کوئی متعین جواب نہ دیا جاتا بلکہ یہ کہا جاتا کہ یہ کوئی شرعی مسئلہ نہیں ہے۔ اپنے حالات کے لحاظ سے جیسا مناسب سمجھو ویسا کرلو۔ احادیث وسیر کی کتابوں میں کثرت سے اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں کہ کسی سوال کے جواب میں "مسئلہ" بتانے کے بجائے خود سوال کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ مگر آج کے فقیہ اور مفتی کے یہاں اس قسم کا کوئی خانہ نہیں۔ اس کے یہاں ہر چیز ایک شرعی مسئلہ ہے اور ہر بات کے جواب میں وہ اپنی فقہ کی کتابوں سے کوئی نہ کوئی جزئیہ دریافت کرلیتا ہے جس کی روشنی میں وہ سائل کو مسئلہ کی شرعی صورت بتا سکے۔

نزول قرآن کے وقت یہود سے کہا گیا تھا:

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ اعراف ــــ ۱۵۷	یہ نبی ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔

مطلب یہ کہ یہودی فقیہوں نے اپنی قانونی موشگافیوں سے اور ان کے روحانی مقتداؤں نے اپنے تورع کے مبالغوں سے ان کی زندگی کو جن بوجھوں کے نیچے دبا رکھا ہے اور جن خود ساختہ بندشوں میں انھیں جکڑ رکھا ہے، یہ پیغمبر ان سے انھیں آزاد کرتا ہے اور دین خداوندی کو اس کی بے آمیز شکل میں ان کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ آج پیغمبر آخر الزماں کی امت خود انھیں "اصر و اغلال" کے نیچے دب چکی ہے۔ ان کے فقہاء ومشائخ نے اسلام میں وہ سارے اضافے کر ڈالے ہیں

جو یہودی فقیہوں اور فریسیوں نے شریعت موسوی میں کئے تھے۔ آج اسلام کی تجدید کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اسلام کو ان تمام اضافوں سے پاک کر دیا جائے۔ جب تک یہ کام نہ ہو اسلام کو زندہ کرنے کی طرف کوئی اگلا قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔

خدا کے دین کو فنی بنانا بظاہر ایک حسین یا کم از کم بے ضرر چیز معلوم ہوتا ہے۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے وہ نہایت سنگین ہے۔ یہ دلوں کے اندر قساوت پیدا کرتا ہے اور لطیف احساسات کو آدمی سے چھین لیتا ہے۔ قرآن و حدیث میں خدا کا دین جس زبان میں ہے، وہ انذار و تبشیر کی زبان ہے، وہ تذکیر و نصیحت کی زبان ہے۔ یہ دونوں انداز ایک دوسرے سے مکمل طور پر مختلف ہیں اور بالکل مختلف قسم کے نتائج پیدا کرتے ہیں۔ قرآن و حدیث کا انداز آدمی کو حقائق و معانی کی طرف متوجہ کرتا ہے، جبکہ ہمارے فنی علوم اس کو جزئیات میں مشغول کر دیتے ہیں۔ قرآن و حدیث کے انداز سے آدمی کے اندر تفکر و تدبر پیدا ہوتا ہے جبکہ فنی علوم بحث و جدال کے لامتناہی دروازے کھول دیتے ہیں۔ قرآن و حدیث کا انداز آدمی کے احساسات کو اس طرح جگاتا ہے کہ یوم الحساب کا مسئلہ اس کو سب سے بڑا مسئلہ نظر آنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس فنی علوم آدمی کو لایعنی قسم کی منطقی موشگافیوں میں الجھا کر اس کو زندگی کے اصل سوالات سے دور کر دیتے ہیں۔ اس طرح یہ فنی علوم، بظاہر جائز علوم ہونے کے باوجود، باعتبار نتائج اس مقصد کے لئے قاتل بن گئے ہیں جس کے لئے اللہ نے قرآن اتارا اور اپنا رسول بھیجا تھا۔

اس صورت حال کی اصلاح کی کوئی عملی شکل اس کے سوا نہیں ہے کہ قرآن و حدیث کو حقیقی معنوں میں لوگوں کے لئے دین اخذ کرنے کا ذریعہ بنا دیا جائے، جس طرح اب وہ فنون کی کتابوں سے اپنا دین اخذ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر نماز کے بارے میں تمام بنیادی باتیں قرآن میں موجود ہیں۔ اس کے بعد اس کے ضروری مسائل حدیث اور آثار صحابہ میں مل جاتے ہیں۔ اب مسائل نماز پر ہماری جو کتاب لکھی جائے، وہ بس انھیں تینوں چیزوں (قرآن، سنت، آثار صحابہ) پر مشتمل ہو۔ اس کے سوا کسی بھی چیز کو نماز کے مسائل میں شمار نہ کیا جائے۔ حتی کہ ترجیح اور تفضیل کو بھی نہیں۔ کیونکہ صحابہ کے درمیان کسی مسئلہ میں اختلاف ہونا اس مسئلہ میں دینی توسع کو بتاتا ہے۔ نہ یہ کہ ایک صحیح ہے اور دوسرا غلط، ایک افضل ہے، دوسرا غیر افضل۔

ہمارے عربی کتب خانہ کی "اہہات کتب" کا بیشتر حصہ وہ ہے جو اسی فنی زبان میں مرتب کیا گیا ہے۔ فنی فقہ، فنی معقولات اور فنی تصوف، بعد کو پیدا ہونے والے اسلامی لٹریچر پر اسی طرح چھائے ہوئے ہیں جس طرح ہالہ چاند کو گھیرے ہوئے ہوتا ہے۔ نتیجۃً اگرچہ متن اسلام نہیں مگر عملی اور روایتی اسلام ٹھیک اسی طرح انسانی آمیزش کا شکار ہو گیا جس طرح دوسرے مذاہب اس کا شکار ہوئے تھے۔ جب تک یہ کتابیں علم دین کا ماخذ ہیں، کبھی یہ ممکن نہیں کہ صحیح تصور دین لوگوں کے دماغوں میں جگہ پا سکے۔ صحیح دینی فکر پیدا کرنے کے لئے ناگزیر طور پر ضروری ہے کہ قرآن و حدیث اور آثار صحابہ کو علم دین کا ماخذ بنایا جائے نہ کہ ان کتابوں کو جو ہمارے دارالعلوموں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ اسلام کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے پہلا ناگزیر قدم یہ ہے کہ علوم قرآن، علوم حدیث اور آثار صحابہ کو از سر نو سادہ علمی انداز میں مرتب

کیا جائے اور فقہی اور معقولاتی اور متصوفانہ انداز کو ہمیشہ کے لئے ایک تاریخی چیز بنا دیا جائے۔ خدائی دین کو جب تک انسانی آمیزشوں سے پاک نہ کیا جائے، اسلام کا احیاء نہیں ہو سکتا۔

اسلام کی تدوین کا کام ایک دو شخص کے کرنے کا نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی مجلس ہی کے ذریعہ انجام پا سکتا ہے جس میں معقول تعداد میں ایسے اہل علم جمع کئے جائیں جو نہ صرف قرآن و حدیث کو بخوبی جانتے ہوں بلکہ خالص علمی انداز سے مسائل کی تحقیق کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس طرح کی ایک ٹیم ایک ادارہ میں اکھٹا ہو کر مسلسل کام کرے اور اُس کو اِس مقصد کی تکمیل کے لئے ہر قسم کے وسائل بافراط حاصل ہوں تو انشاء اللہ دس برس میں وہ ذخیرہ کتب تیار ہو سکتا ہے جو اسلام کو از سرِ نو زندہ کرنے کی ایک حقیقی جد وجہد کے لئے فکری بنیاد کا کام دے۔ یہ امت اگر چاہتی ہے کہ قیامت میں اس کو امت محمدی کی حیثیت سے شمار کیا جائے تو اس کا پہلا لازمی فریضہ ہے کہ "ہدیٰ محمدی" کو انسانی آمیزشوں سے پاک کر کے اس کی خالص شکل میں لوگوں کے سامنے رکھ دے۔ موجودہ حالت میں اگر ارادۃً نہیں تو علاوہ کتمان حق کی مجرم بن رہی ہے اور اس بات کو اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ کسی حامل کتاب گروہ کے لئے کتمان حق کے ساتھ کوئی بھی عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول نہیں ہوتا۔

حکمت کا تقاضا ہے کہ اس کام کو اجتماعی اہتمام کے ساتھ انجام دیا جائے۔ وہ علوم جو اجتماعی اہمیت کے حامل ہوں ان کی تدوین اجتماعی سطح پر ہی ہونا چاہئے تاکہ پوری ملت کے اندر ان کو مستند مقام حاصل ہو اور سارے لوگ ان کو قبول کر سکیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے زمانہ میں جب ریاست کے تحت قرآن کی جمع و ترتیب کا کام انجام دیا گیا اور اس کے بعد جو نسخے بچے ان کو جلا دیا گیا، تو اس کے اندر یہی حکمت تھی۔ جمع قرآن کا کام اگر انفرادی شخصیتوں کے ذریعہ انجام پاتا تو سخت اختلاف ہو جاتا اور پھر قیامت تک ختم نہ ہوتا۔

حدیث کی جمع و تدوین کے لئے بھی حضرت عمر بن عبد العزیز نے غالباً یہی منصوبہ بنایا تھا۔ انھوں نے مدینہ کے گورنر محمد بن عمرو بن حزم اور دوسرے گورنروں کو لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیث اور سنت ملے ان کو جمع کر کے ضبط تحریر میں لائیں۔ مگر ان کی جلد موت کی وجہ سے خلافت کی ماتحتی میں یہ کام انجام نہ پا سکا۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ لوگ "ثواب" کے جذبہ کے تحت انفرادی طور پر اس کو کرنے میں لگ گئے۔ بہتر طریقہ یہ تھا کہ محدثین، خلفاء کے ذریعہ، جو ان کے بے حد عقیدت مند تھے، سرکاری انتظام کے تحت ایک ادارہ قائم کراتے جس میں محدثین کی منتخب جماعت اکھٹا ہو کر حدیث کی جمع و ترتیب کے سلسلے میں وہی کرتی جو قرآن کے سلسلے میں زید بن ثابت انصاری اور ان کے ساتھیوں نے کیا تھا۔ اگر آغاز ہی میں معتبر احادیث کا ایک مجموعہ تیار کر کے باقی تمام "احادیث" کو نذر آتش کر دیا جاتا، تو امت بے شمار فتنوں سے بچ جاتی۔ فقہ کی تدوین کے سلسلے میں بھی صحیح طریقہ اسی اسوۂ صدیقی پر عمل کرنا تھا، بجائے اس کے کہ مختلف فقہاء الگ الگ اپنا مدرسہ فکر لے کر بیٹھ جائیں اور ایک خداوندی مذہب کو دس الگ الگ مذاہب میں تبدیل کر ڈالیں۔ اسی طرح علوم اسلامی کی تدوین کا جو کام ہمارے ذمہ ہے اس کو انجام دینے کا بھی صحیح طریقہ یہ ہے کہ اہل علم کی ایک ٹیم مقرر کی جائے اور وہ اپنی اجتماعی جد وجہد سے کتابوں کا ایک سٹ مرتب کرے۔ انفرادی طور پر اگر یہ کام کیا گیا تو اصل مدعا حاصل نہ ہوگا۔

المركز الاسلامی

AL-MARKAZ-UL-ISLAMI (Regd.)

ISLAMIC CENTRE

JAMIAT BUILDING - QASIMJAN STREET - DELHI 110006 (India)

تعارف

سمندر میں برف کے بہت بڑے بڑے تودے ہوتے ہیں جن کو آئس برگ کہا جاتا ہے۔ ان برفانی پہاڑوں کا دس میں سے نو حصہ پانی میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور صرف ایک حصہ پانی کے اوپر دکھائی دیتا ہے۔ ایسی ہی کچھ مثال انسانی زندگی کی ہے۔ انسان کو اس کے پیدا کرنے والے نے دائمی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔ اور پھر اس کی زندگی کے نہایت مختصر حصہ — تقریباً سو سال — کو موجودہ دنیا میں رکھ کر بقیہ تمام عمر کو آخرت کی دنیا میں ڈال دیا۔ موت وہ دروازہ ہے جس سے ہم اپنی موجودہ مدتِ حیات پوری کرنے کے بعد دوسری دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں۔

یہ انسانی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ انسان کی کامیابی کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ آخرت رخی زندگی (AKHIRAT ORIENTED LIFE) کو اپنی زندگی بنائے۔ اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے وسائل اور اپنی سرگرمیوں کو اس طرح منظم کرے جو اس کی زندگی کے اگلے مرحلے کو بہتر بنانے والا ہو۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس کے تمام کارنامے اسی دنیا میں رہ جائیں گے اور موت کے بعد دوسری دنیا میں وہ اس حال میں پہنچے گا کہ آخرت کی طویل تر زندگی میں اپنی جگہ بنانے کے لیے اس کے پاس کچھ نہ ہوگا۔

یہی وہ نازک مسئلہ ہے جس سے انسان کو باخبر کرنے کے لیے خدا نے پیغمبروں کا سلسلہ جاری کیا۔ ہر دور میں خدا کے نمائندے آئے اور آسمانی کتابیں اتاری گئیں تاکہ موت کے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے انسان کو بتا دیا جائے کہ اس کو بالآخر کہاں جانا ہے۔ اور اپنی مستقل کامیابی کے لئے اسے کیا کرنا چاہئے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ تاہم جہاں تک پیغمبرانہ کام کا تعلق ہے اس کی ضرورت بدستور باقی ہے۔ آج بھی یہ مطلوب ہے کہ خدا کے بندوں کو اس اہم ترین حقیقت سے باخبر کیا جائے تاکہ آخرت میں خدا کے اوپر کسی کی حجت باقی نہ رہے۔

خدا کے اس پیغام کو اس کے بندوں تک پہنچانے کے لیے اب کوئی پیغمبر آنے والا نہیں ہے۔ اب امت مسلمہ اس کی ذمہ دار ہے۔ خاتم النبیین کی امت کا اصل مشن دنیا میں یہی ہے کہ وہ اس پیغمبرانہ ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اٹھے۔ یہ اس کا ایسا ناگزیر فریضہ ہے جس سے غفلت کسی حال میں معاف نہیں ہو سکتی۔

اسلامی مرکز کا قیام اس لئے عمل میں آیا ہے کہ امت مسلمہ کو اس کی اس ذمہ داری کی طرف متوجہ کرے اور تمام ممکن ذرائع سے حق کا پیغام لوگوں تک پہنچائے۔

یہ ایک باقاعدہ طور پر رجسٹرڈ ادارہ ہے اور ماہنامہ الرسالہ اسی کے آرگن کے طور پر جاری کیا گیا ہے۔

پیغام رسانی کا یہ عظیم کام صرف اس وقت موثر طور پر انجام دیا جا سکتا ہے جب کہ اس کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے مکمل تیاری کی جائے اور اس کے لئے تمام ضروری تدابیر عمل میں لائی جائیں۔ اسلامی مرکز نے اس سلسلے میں اپنے سامنے جو نقشہ کار رکھا ہے، اس کو مختصراً یہاں درج کیا جاتا ہے۔

مقاصد

۱۔ عربی، انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں میں رسائل کا اجراء جس کے ذریعہ مسلمانوں کو ان کی دعوتی ذمہ داری کی طرف متوجہ کیا جاسکے اور اسلام کو جدید اسلوب اور عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق مدلل کیا جائے۔

۲۔ قرآن کے ترجمے دنیا کی تمام زبانوں میں شائع کرنا اور ان کو رعایتی قیمت کے ساتھ لوگوں تک پہنچانا۔

۳۔ قرآنی علوم کی تدوین اور اسلامی انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت۔

۴۔ حدیث، سیرت، حالات صحابہ، تاریخ اسلام (بہ شمول تاریخ فتوحات) پر سادہ، واقعاتی انداز میں کتابوں کی تیاری اور ان کو مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۵۔ ایسی درس گاہ کا قیام جس میں قرآن، حدیث، سیرت تقابلی مذہب، عربی زبان اور دوسری زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہو۔

۶۔ اسلامیات اور مختلف مذاہب کے مطالعہ کے لئے ایک مکمل لائبریری کا قیام۔

۷۔ مختلف علاقوں اور ملکوں میں تبلیغی وفود بھیجنے کا انتظام۔

۸۔ اسلام کے تاریخی آثار اور دستاویزات کا میوزیم قائم کرنا۔

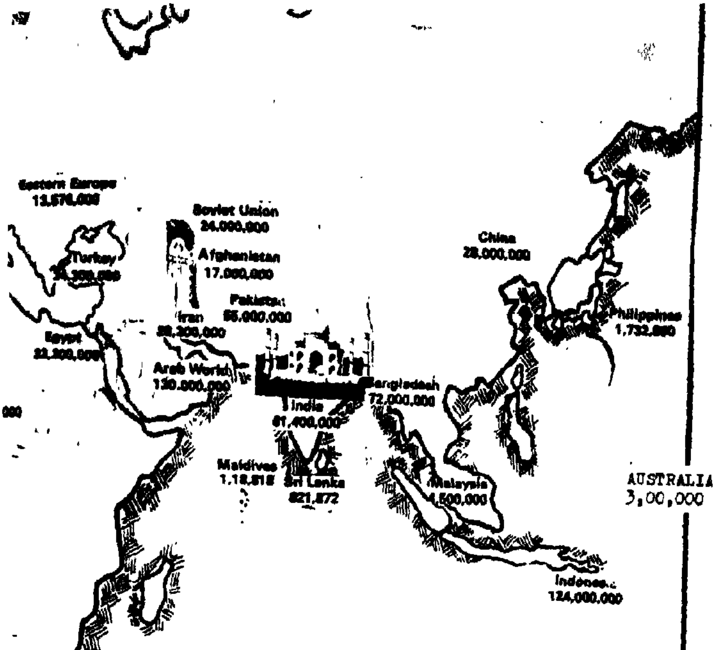
۹۔ علمی طرز فکر اور حقیقت پسندانہ مزاج پیدا کرنا۔

۱۰۔ جدید طرز کے پریس کا قیام جہاں مختلف زبانوں میں اعلیٰ چھپائی ہو سکے۔

۱۱۔ ایسے ادارہ کی تشکیل جہاں تمام ضروری دینی شعبے قائم ہوں اور غیر مسلم وہاں آکر اسلام کو سمجھ سکیں۔

ضرورت ہے کہ اسلام
کو دنیوی مہم کے بجائے
اخروی مہم کے طور پر
سامنے لایا جائے

دعوت اسلامی ہی
ایک ایسا کام ہے جس
پر تمام مسلمانوں
کو
متحد کیا جا سکتا ہے

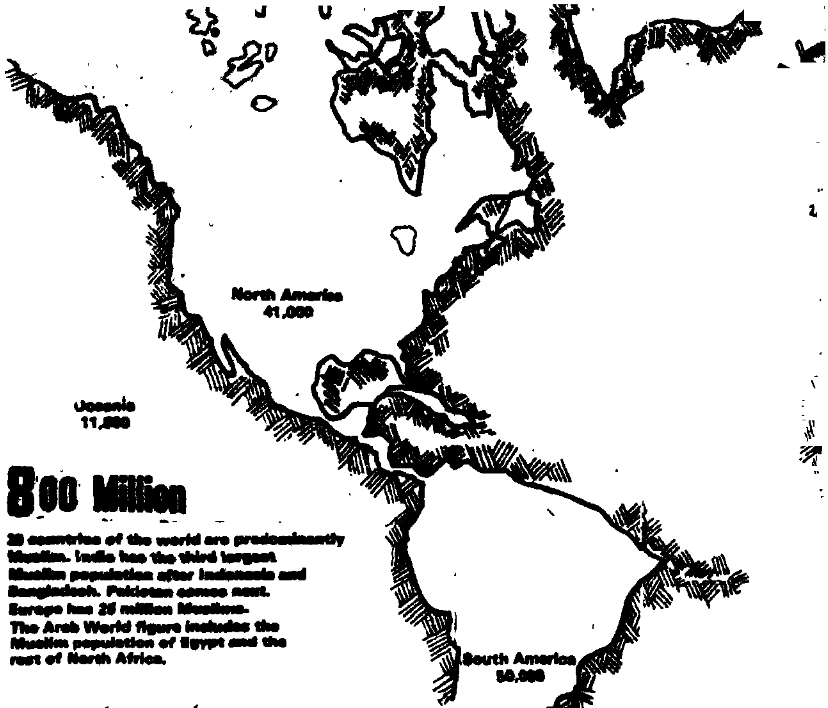


تقریباً ۳۰ سال پہلے کی بات ہے۔ راقم الحروف نے کسی مسلم اخبار میں ایک تصویر دیکھی۔ یہ تصویر بیت المقدس کی تھی۔ اس تصویر کے نیچے جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا:

"ارضِ مقدس جس پر چالیس کروڑ مسلمانوں کی جانیں قربان ہیں"

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں نے، پچھلے برسوں میں، بے شمار تعداد میں ارضِ مقدس پر اپنی جانیں قربان کر دی ہیں۔ مگر عملاً نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔ ۳۰ سال پہلے ارضِ قدس کی جتنی زمین یہودیوں کے قبضہ میں تھی، آج اس کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ رقبہ پر وہ اپنا اقتدار قائم کر چکے ہیں۔ مزید حیرت یہ ہے کہ اس تیس سالہ مدت میں مسلمانوں کی تعداد ساری دنیا میں ۴۰ کروڑ سے بڑھ کر ۸۰ کروڑ ہو چکی ہے۔ مگر اپنے "دشمنوں" کے مقابلہ میں وہ کہیں بھی کوئی حقیقی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

تعداد کی کثرت اور تحریکوں کے ہجوم کے باوجود مسلمان کیوں ناکام ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے، وہ یہ کہ وہ اپنے اصل فریضۂ منصبی کو ادا نہیں کر رہے۔ مسلمان کے ساتھ خدا کے تمام اجتماعی وعدے اس شرط پر ہیں کہ وہ دنیا میں اس اجتماعی کام کو انجام دیں جس کے لئے انھیں چنا گیا ہے۔ اگر وہ اس کام کے لئے نہ اٹھیں تو خدا کی نظر میں مجرم ہیں۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ یہ کام کیا ہے۔ یہ کہ وہ تمام انسانوں کو اللہ کا پیغام پہنچائیں۔ پیغام رسانی کا یہ کام کوئی قومی کام نہیں ہے، نہ اس کا سیاسی اور اقتصادی مفادات سے کوئی براہ راست تعلق ہے۔ یہ ایک خالص خدائی اخروی کام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو امتحان کے لئے پیدا کیا ہے۔ دنیا میں ایک وقت تک زندگی کا موقع دینے کے بعد وہ تمام انسانوں کو آخرت میں



کرے گا اور وہاں ان کے عمل کے مطابق ان کے لئے دائمی جنت یا دائمی جہنم کا فیصلہ کرے گا۔

خدا اگرچہ اپنے بندوں کے اعمال سے خوب واقف ہے مگر اس نے اپنی اس عدالت کے لئے جو طریقہ مقرر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ہر زمانہ میں خود انسانوں میں ایسے لوگ اٹھیں جو خدا کی طرف سے لوگوں کو آنے والے یوم الحساب سے باخبر کریں، یہ لوگ جو دنیا میں قوموں کو خدا کا پیغام پہنچائیں گے، یہی آخرت میں ان کے اوپر خدا کے گواہ بنیں گے۔ وہ آخرت کی عدالت میں کھڑے ہو کر کہیں گے کہ کس نے پیغام خداوندی کو مانا اور کس نے اس کا انکار کیا۔ ان کی گواہی کے مطابق خدا ہر ایک کے اوپر اپنا فیصلہ صادر کرے گا۔

مسلمانوں کا اصل جرم یہ ہے کہ وہ اپنی اس حیثیت کو بھول گئے ہیں۔ وہ قوموں کے اوپر خدا کے گواہ بن کر نہیں کھڑے ہو رہے ہیں۔ خدا کو اپنی سنت کے مطابق اپنی عدالت کے لئے گواہ مطلوب ہیں (وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ آل عمران ۔ ۱۴۰) مگر سارا عالم اسلام اس ذمہ داری کو بھولا ہوا ہے۔ وہ اس خدائی منصوبہ میں اپنے کو شامل نہیں کر رہا ہے۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کو مجرم کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا ہے، بجائے کہ وہ خدا کی نصرتوں کے مستحق قرار پائیں۔

پچھلے برسوں میں پٹرول کی قدرتی طاقت نے بلاشبہ مسلم دنیا کو کافی سہارا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خداداد خزانہ اگر ظاہر نہ ہوا ہوتا تو مسلمان، حالیہ صدیوں میں اپنی بے حساب نادانیوں کی وجہ سے، آج بین اقوامی اچھوت کی سطح پر پہنچ چکے ہوتے۔ ہماری نام نہاد انقلابی تحریکیں کسی بھی درجہ میں ہم کو بچانے والی ثابت نہیں ہو سکتی تھیں۔

پٹرول کی طاقت نے مسلمانوں کو نہ صرف اقتصادی اور سیاسی سہارا دیا ہے بلکہ وہ اعلان حق اور دعوت دین کے کام میں بھی مددگار ہو رہا ہے۔ دو بلین پٹرو ڈالر (۱۸۰۰ کروڑ روپے) کے خرچ سے ۱۹۷۶ میں لندن میں جو ورلڈ آف اسلام فیسٹیول (مہرجان العالمی الاسلامی) ہوا، اس کو دیکھ کر سیکڑوں یورپی باشندے مسلمان ہو گئے۔ ایک برطانوی اخبار نے اس مہرجان کی رپورٹ دیتے ہوئے اس کو یورپ کے اوپر اسلام کا حملہ قرار دیا تھا۔ (السٹریٹڈ ویکلی ۱۸ جولائی ۱۹۷۶):

THE ISLAMIC INVASION IS UPON US

پٹرول کی اقتصادی قوت نے آج مسلم قوموں کو نئی اہمیت دے دی ہے۔ ساری دنیا میں عربی زبان کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں جگہ جگہ اسلامی مراکز کھل رہے ہیں۔ اسلامی لٹریچر کی اشاعت کا کام بہت بڑھ گیا ہے۔ دنیا بھر میں اسلامی شخصیتوں اور اسلامی اداروں کو پٹرول کے جادو نے نئی زندگی عطا کر دی ہے۔ بین اقوامی اسلامی اجتماعات اتنی زیادہ تعداد میں ہو رہے ہیں جن کا چند سال پہلے تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ افریقہ میں نہ صرف عوام میں اسلام پھیل رہا ہے بلکہ حالیہ برسوں میں دو عیسائی حکمراں اسلام قبول کر چکے ہیں

———— یہ اور اس طرح کے دوسرے اسلامی اہمیت کے واقعات جو آج ساری دنیا میں ہو رہے ہیں وہ تمام تر اس دولت کے کرشمے ہیں جو خداداد پٹرول کے ذریعہ اچانک خلیج فارس کے مسلم ملکوں کو حاصل ہو گئی ہے۔ حتی کہ حالیہ برسوں میں مسلم قوموں کو اپنے مغربی آقاؤں کے مقابلہ میں جو جرأت اختلاف پیدا ہوئی ہے، وہ بھی تمام تر پٹرول کی خداداد طاقت کا کرشمہ ہے، مثلاً ترکی، سعودی عرب اور پاکستان کا امریکہ کے مقابلہ میں، اور مصر کا روس کے مقابلہ میں۔

مگر ان باتوں میں ہمارے لئے بہت زیادہ خوشی کا پہلو نہیں ہے۔ کیوں کہ "انسان" کا کام "پٹرول" انجام دینے لگے تو یہ خدا کی طرف سے انسان کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار ہے۔ جب خدائی آواز بلند کرنے کے لئے انسانوں کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں، اس وقت دابہ (نمل ـ ۸۲) زمین سے نکل کر امر حق کا اعلان کرتا ہے۔ مگر جب دابۃ ارضی کی زبان سے خدا اپنا اعلان کرانے لگے تو یہ خوشی کا نہیں غم کا وقت ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد زمین و آسمان کی بساط لپیٹ دی جاتی ہے۔ انسانوں سے زمین کا سرسبز کرہ چھین لیا جاتا ہے اور اس کو دھوئیں اور آگ کی دنیا کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے جہاں وہ ابدی طور پر "روتا اور دانت پیستا" رہے۔

مسیح سے یروشلم کے یہودی علماء نے کہا کہ اپنے شاگردوں کو منع کر دو کہ وہ ہمارے اوپر تبلیغ نہ کیا کریں۔ مسیح نے جواب دیا:

اقول لکم انہ ان سکت ھولاء فالحجارۃ تصرخ

میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر یہ چپ ہو جائیں تو پتھر چلا اٹھیں گے

(لوقا: ۱۹: ۴۰)

مطلب یہ ہے کہ خدا کے پیغام کو بہر حال بلند ہونا ہے۔ اگر وہ انسانوں کی زبان سے بلند نہیں ہوگا تو درخت اور پتھر چلا کر اسے لوگوں کو سنائیں گے۔ مگر جب درخت اور پتھر چلانے لگیں تو یہ انسانوں کے لئے موت کا وقت ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد عمل کی مہلت ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد وہی چیزیں باقی رہتی ہیں یا جنت یا جہنم۔ یہ امتحان کی کاپی چھین لینے کا وقت ہوتا ہے نہ کہ پرچہ حل کرنے کا۔

برتر سطح سے کام کرنے کا ذہن پیدا کیجئے

کسی شہر میں کپڑے کی دوکان نہ ہو تو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ ایک سنہری موقع ہے جس کو استعمال کرکے کوئی شخص شہر میں ایک کامیاب دوکان کا مالک بن سکتا ہے. مگر حقیقت یہ ہے کہ یہاں ایک اس سے بھی زیادہ بڑا خلا ہے جس کو ابھی تک کسی نے استعمال نہیں کیا۔ ہمارے ملک کے بھرے ہوئے دفاتر اور ہمارے پر رونق بازار جہاں ہر وقت خرید و فروخت کے ہنگامے جاری رہتے ہیں اپنی ساری ہماہمی کے باوجود ابھی تک خالی ہیں۔

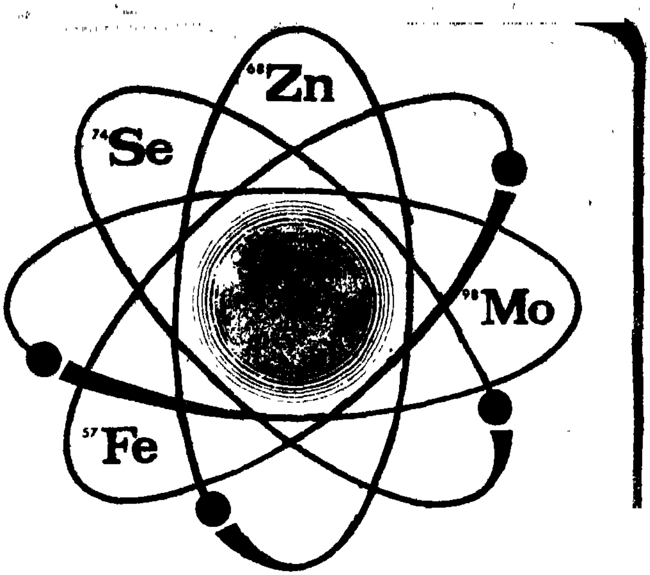
آپ بازار سے کوئی ملک کی بنی ہوئی چیز خریدیں، چند ہی روز کے تجربے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کو اپنی پسند کی چیز نہیں ملی. آپ اپنے کام کے لیے ملازم رکھئے، بہت جلد آپ محسوس کریں گے کہ آپ جیسا کارکن چاہتے ہیں، آپ کا ملازم ان اوصاف میں پورا نہیں اترتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بازار اگرچہ سامانوں سے پٹے ہوئے ہیں مگر وہ ان چیزوں سے خالی ہیں جو حقیقتاً گاہک کو مطمئن کرنے والی ہوں۔ اسی طرح وہ جگہیں جہاں آدمی کو کام ملتا ہے اگرچہ بظاہر بھری ہوئی ہیں. مگر انھیں اب بھی ایسے کارکنوں کا انتظار ہے جو ان کی مرضی کے مطابق ان کا کام پورا کر سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آج سارا ملک ایک عظیم خلا سے دوچار ہے۔ اور یہ خلا اعلیٰ مصنوعات اور بہتر کارکردگی کا خلا ہے۔ اگر کوئی گروہ ہو جو محنت اور عملی دیانتداری میں اعلیٰ معیار دکھا سکے، جو مثال کے طور پر جرمنی اور جاپان میں نظر آتا ہے تو وہ آناً فاناً ملک کی اقتصادیات پر چھا جائے گا اور جو گروہ اقتصادیات پر قابض ہو جائے وہ لازمی نتیجہ کے طور پر دوسرے شعبوں پر بھی قابض ہو کر رہتا ہے۔

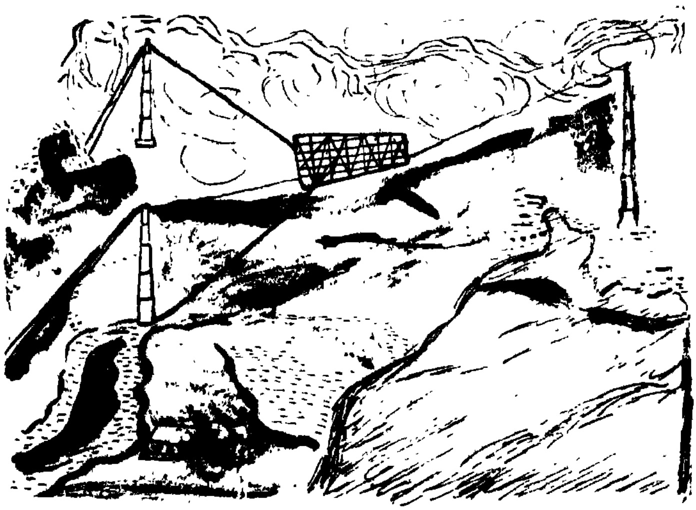
کارکردگی کا خلا پر کرکے آپ اپنے لئے جگہ حاصل کرسکتے ہیں۔

دنیا میں اپنی جگہ بنانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ——— جس آسامی کے لیے بی اے کی قابلیت کی شرط ہو اور بی اے والوں نے درخواستیں دے رکھی ہوں۔ وہاں آپ بھی اپنی بی اے کی ڈگری لے کر پہنچ جائیں اور جب آپ کو نہ لیا جائے تو بحث کریں کہ کیوں آپ کے مقابلے میں دوسرے امیدوار کو ترجیح دی گئی جبکہ دونوں یکساں طور پر گریجویٹ تھے دوسری شکل یہ ہے کہ جہاں لوگ بی اے کی سندیں پیش کر رہے ہوں وہاں آپ ماسٹر ڈگری لے کر پہنچیں جہاں لوگ مطابقِ شرائط قابلیت کی بنیاد پر اپنا حق مانگ رہے ہوں وہاں آپ برتر از شرائط قابلیت دکھا کر اپنا حق تسلیم کرائیں۔

یہی دوسرا طریقہ زندگی کا اصل طریقہ ہے. تمام بڑی بڑی ترقیاں اور کامیابیاں انھیں کے لیے مقدر ہیں جو اس دوسرے طریقے کے مطابق کام کرنے کے لیے تیار ہوں ———



ATOM - AS CONCIEVED BY SCIENTISTS



THE WORLD'S LARGEST RADIO TELESCOPE AT THE ARECIBO OBSERVATORY IN PUERTO RICO IS USED BY CORNELL UNIVERSITY ASTRONOMERS TO FIND AND IDENTIFY "QUASARS". (AMERICAN REVIEW, SUMMER 1974)

ستاروں کی دنیا

قدیم زمانہ میں ستاروں کی بابت انسان کا علم محض قیاسات و مفروضات پر مبنی تھا جن کو علم نجوم (ASTRALOGY) کی صورت میں بیان کیا جاتا ہے۔ سترھویں صدی میں دوربین کی ایجاد اور پھر نئے نئے آلات کے استعمال کے بعد انسان کی معلومات میں اضافہ ہوا اور فلکیات (ASTRONOMY) وجود میں آئی۔ موجودہ زمانے میں فلکیات کا علم مزید آگے بڑھا ہے اور کائنات کے آغاز، اس کی تاریخ اور اس کے انجام کی بابت تحقیق کی جا رہی ہے اس نئے علم کو کاسمولوجی ([illegible]) کہا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ متعدد ذیلی علوم بھی پیدا ہوئے ہیں مثلاً ریڈیائی فلکیات (RADIO AS[illegible]) وغیرہ۔

کائنات کے فاصلے

کائنات کے فاصلے اتنے زیادہ ہیں کہ ان کو ان عام پیمانوں سے ناپا نہیں جا سکتا جن کو ہم زمینی فاصلوں کو بتانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ فلکیات والوں نے اس کے لیے ایک خاص پیمانہ وضع کیا ہے جس کو نوری سال (LIGHT YEAR) کہتے ہیں۔ روشنی ایک سکنڈ میں ۰۰[illegible]۱ میل کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ یعنی ایک سال میں ۶۰ کھرب میل۔ اسی فاصلہ کو فلکیات میں سال نور کہا جاتا ہے اور کائناتی فاصلوں کو ناپنے کے لیے اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔

سورج ہماری زمین سے روشنی کے نو منٹ کے فاصلہ پر ہے۔ یعنی اس کی روشنی مذکورہ رفتار سے سفر کر کے ہم تک نو منٹ میں پہنچتی ہے۔ زمین سے سورج کا فاصلہ ۹۳ ملین میل ہے۔ سورج کے بعد دوسرا ستارہ جو زمین سے سب سے زیادہ قریب ہے وہ الفا سنٹوری (ALPHA CENTAURI) ہے، وہ ۴٫۳ نوری سال دور ہے۔ یعنی ۲۵۸ کھرب میل۔

ہماری کہکشاں جس میں تقریباً ۱۰۰ ہزار ملین ستارے ہیں، ایک عظیم پلیٹ کی مانند ہے۔ جس کی موٹائی دس ہزار نوری سال ہے اس کا قطر (DIA[illegible]) تقریباً ایک لاکھ سال نور ہے۔ سورج ہماری کہکشاں کے مرکز سے ۳۲۰۰۰ نوری سال دور ہے۔ اس قسم کی کہکشائیں بے شمار تعداد میں ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں۔ فلکیات والوں کا خیال ہے کہ کائنات کا دائرہ (RADIUS) کم از کم ۱۰ ہزار ملین سال نور ہے۔ اس وسیع کائنات میں فلکیات داں اپنی دوربینوں کے ذریعہ آٹھ ہزار ملین سال نور تک دیکھ چکے ہیں۔

جدید فلکیات

زمینی دوربینوں کی تصویری پلیٹ، ریڈیو ٹیلی اسکوپ کے ذریعہ وصول شدہ الیکٹرانکس سگنل، راکٹ اور مصنوعی سیاروں میں لگے ہوئے آلات وغیرہ کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ خلاء میں ایسے اجسام بھی ہیں جن کی خصوصیات ان عام ستاروں سے بہت زیادہ مختلف ہیں جن کو اب تک انسان جانتا تھا۔

مثلاً وہ اجسام جن کو پلسار (PULSAR) کا نام دیا گیا ہے۔ قیاس ہے کہ یہ وہ ستارے ہیں جو جل کر بجھ چکے ہیں، یہ اتنی زیادہ کثیف (DENSE) حالت میں ہیں کہ ان کے ایک مربع انچ مادہ کا وزن ایک ہزار ملین ٹن کے برابر ہے۔ وہ ناقابل قیاس رفتار سے خلا میں گردش کر رہے ہیں۔

اسی طرح ایسے اجسام ہیں جن کو بلیک ہول (BLACK HOLE) کہا جاتا ہے۔ یہ پلسار سے بھی زیادہ کثیف حالت میں ہیں۔ بلیک ہول انسان کے لیے ناقابل مشاہدہ ہیں کیونکہ ان کی کثافت کی وجہ سے ان کی قوت کشش اتنی طاقت ور ہوگئی ہے کہ روشنی بھی ان سے باہر نکلنے نہیں پاتی۔

اسی طرح کوئیسار (QUASAR) ہیں۔ یہ ستاروں کی مانند ہیں۔ وہ کائنات میں سب سے زیادہ دور فاصلوں پر واقع ہیں۔ ان میں سے ہر ایک، ہزار ملین سورج سے زیادہ روشن ہے۔ ان سے بے پناہ قوت حرارت نکل رہی ہے، وہ علماء کے لیے حیرت و استعجاب کا موضوع بنی ہوئی ہے۔ کوئیسار اتنے دور فاصلوں پر ہیں کہ علماء کا خیال ہے کہ ان کے مطالعہ سے شاید وہ کائنات کے حدود کو دریافت کر سکیں۔ اس طرح کی اور چیزیں ہیں مثلاً فلاٹسام (FLOTSAM) جس کے متعلق اندازہ ہے کہ وہ گیس اور گرد کے بادل ہیں، وغیرہ۔

ابھی حال تک سائنس داں آسمانی مشاہدوں کے لیے اسی قسم کی تکنیک پر بھروسہ کرتے تھے جو گلیلیو نے سترہویں صدی میں استعمال کی تھی یعنی ستاروں سے آنے والی روشنیوں کو دوربینوں کے ذریعے دیکھنا۔ مگر تجربات کے دوران معلوم ہوا کہ قابل مشاہدہ روشنی اصل کائنات کا بہت تھوڑا حصہ ہے۔ الیکٹرانکس اور راکٹ سائنس کی ترقی نے فلکیات والوں کو ایسے آلات دیئے جو آسمان میں ان کی واقفیت کو زیادہ دور تک لے جاسکتے تھے۔

۱۹۳۱ء میں بیل لیبوریٹری کے ایک انجنیئر جانسکی (CARL JANSKY) نے پایا کہ اس کا ریڈیو انٹینا ایسے سگنل پکڑ رہا ہے جن کا کوئی ماخذ زمین میں نہیں ہے۔ جانسکی نے معلوم کیا کہ یہ سگنل آسمان سے آرہے ہیں اس طرح ریڈیائی فلکیات (RADIO ASTRONOMY)

وجود میں آئی جس کا مقصد تھا آسمانی اجسام سے آنے والی ریڈیائی لہروں کا مطالعہ کرنا۔ آج زمین پر متعدد ایسی رصدگاہیں وجود میں آچکی ہیں جہاں پلیٹ کی وضع کے بہت بڑے بڑے انٹینا لگے ہوئے ہیں۔ یہاں عالم بالا سے آنے والی ریڈیائی لہروں کو وصول کیا جاتا ہے اور ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔

مزید مطالعہ کے بعد معلوم ہوا کہ ریڈی ایشن کی اور بھی قسمیں ہیں۔ ایکس ریز، الٹرا وائلٹ ریز، انفرا ریڈ ریز وغیرہ۔ یہ لہریں جو اوپر سے آتی ہیں، زمینی فضا میں جذب ہو جاتی ہیں۔ تاہم خلائی دور سے پہلے انسان کو اس کا علم نہ تھا۔ آج مصنوعی سیارے مختلف قسم کے آلات سے لیس ہو کر زمین کے گرد گھوم رہے ہیں اور اس قسم کی لہروں کو اخذ کر کے انسان کو ان سے باخبر کر رہے ہیں۔ اس طرح نئے نئے ذیلی علوم وجود میں آرہے ہیں مثلاً ایکس رے اسٹرانومی، الٹرا وائلٹ رے اسٹرانومی،

موجودہ صدی کی تیسری دہائی میں امریکی فلکیات داں ہبل (EDWIN P. HUBBLE نے ماؤنٹ ولسن (کیلی فورنیا) کی ایک سو انچ قطر کی دوربین کو استعمال کر کے دریافت کیا کہ کائنات پھیل رہی ہے جیسے کسی غبارے میں ہوا بھری جائے اور وہ پھیلتا چلا جائے فلکیاتی اصطلاح میں اس کو ریڈ شفٹ (RED SHIFT) کہا جاتا ہے۔

مگر اس پھیلنے کی وجہ کیا ہے۔ بلجیم کے سائنس داں لیمائٹر (ABBE GEORGES - LEMAITRE) نے ۱۹۲۷ء میں اس کا ایک جواب دیا۔ اس نے کہا کہ بہت پہلے کائنات کی ابتداء میں پوری کائنات کا مادہ ایک نہایت منجمد ٹکڑے کی صورت میں تھا اس کو اس نے سپر ایٹم (SUPERATOM) کا نام دیا۔ اس کے بعد یہ سپر ایٹم پھٹا۔ اس کا مادہ چاروں طرف پھیلنا شروع ہوا۔ لمبے زمانوں کے بعد مادہ کا یہ طوفان کہکشاؤں، ستاروں اور سیاروں کی شکل میں جمع ہو گیا اس انفجار کو اب بگ بینگ (BIG BANG) کہا جاتا ہے۔

کائنات کا آخری انجام کیا ہے فلکیات داں قیاس کر رہے ہیں کہ کائنات کا پھیلاؤ دھیرے دھیرے کم ہوگا۔ اس کے بعد رک جائے گا اور اس کے بعد سکڑنا شروع ہوگا اس مفروضہ کے مطابق کائنات کا آخری انجام یہ ہوگا کہ وہ دوبارہ سمٹ کر ایک سپر ایٹم کی صورت اختیار کرے گی۔ اگرچہ ان دونوں عملوں میں بیسیوں بلین سال لگ جائیں گے۔

پرنسٹن یونیورسٹی کے پروفیسر وھیلر (JOHN WHEELER) نے حساب لگایا ہے کہ کائنات بالآخر سکڑ کر بلیک ہول کی صورت

میں منجمد ہو جائے گی اور پھر پھٹ جائے گی.
اور دوبارہ پھیلنے کا وہی عمل شروع ہوگا جو
آغاز میں اس کے ساتھ ہو چکا ہے.

۱۹۴۸ء میں برطانی فلکیات دانوں نے اپنے مطالعہ کے دوران پایا کہ بالائی خلاء میں انرجی کا انشقاق (BURSTS) ہو رہا ہے. یہ انشقاق اتنا زیادہ معین وقت پر ہوتا تھا کہ انھوں نے قیاس کیا کہ یہ کسی دوسری تہذیب (CIVILIZATION) کے ارادی عمل کا نتیجہ ہے جو خلا میں کسی مقام پر انسان کے علاوہ پائی جاتی ہے. ان سے جو ریڈیائی لہریں آرہی تھیں ان میں اتنی زیادہ صحت تھی کہ ۱/۱۰۰ ملین کے بقدر ان سے گھڑی کو صحیح کیا جا سکتا تھا بعد کو علماء فلکیات نے یہ رائے قائم کی کہ یہ ریڈیائی لہریں ایک نئے قسم کے ستاروں سے آرہی تھیں جن کو نیوٹران اسٹار کا نام دیا گیا. انھیں ستاروں کا دوسرا نام پلسار ہے.

رابرٹ ایم ہیلنگ کا خیال ہے کہ بلیک ہول دراصل وہائٹ ہول ہیں جو ہماری ایک نزدیکی کائنات (NEIGHBORING UNIVERSE) میں واقع ہیں. اس کا خیال ہے کہ کائنات کے آخری انشقاق کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام اجرام مل کر ایک کائناتی بلیک ہول کی صورت اختیار کرلیں گے اور پھیلاؤ اور انجماد اور انشقاق کا ایک نیا عمل شروع ہوگا.

کوئیسار (QUASARS) کا معاملہ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے تجربات سے معلوم ہوا ہے کہ یہ اجرام تمام دوسرے ستاروں سے بہت زیادہ بعید فاصلے پر واقع ہیں اس کے باوجود وہ دکھائی دیتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بہت بڑی تعداد میں روشنی خارج کر رہے ہیں. تقریباً ملین ملین سورج کے برابر. اب تک ۲۰۰ کوئیسار دریافت ہو چکے ہیں. ممکن ہے کہ زمین سے ان کا فاصلہ ۱۲ ہزار ملین سال نور ہو. اس سے مراد وہ فاصلہ ہے جو روشنی بارہ ہزار ملین سال میں طے کرے جب کہ وہ ۱۸۶۲۰۰ میل فی سکنڈ کی رفتار سے سفر کر رہی ہو. بعض علماء کا خیال ہے کہ کوئیسار شاید کائنات کا آخری کنارا ہو اور شاید وہ سب سے قدیم آسمانی اجسام ہوں. ہمارے معلوم طبیعی قوانین کے تحت ان ناقابل قیاس اجرام کی توجیہہ نہیں ہوتی. وہ کہتے ہیں کہ وقت آگیا ہے کہ طبیعیات کے نئے قوانین دریافت کیے جائیں جو نئے دریافت شدہ حالات پر چسپاں ہو سکیں.

کائناتی شواہد کی توجیہہ کے لیے نئے طبیعی قوانین کی ضرورت کا اظہار کر کے جدید سائنس داں دراصل اسی بات کو دہرا رہے ہیں جو اس سے پہلے نیوٹن نے کہی تھی:

"سیاروں کی گردش کی توجیہہ کے لیے صرف معلوم فلکیاتی قوانین کا حوالہ کافی نہیں

اس کے لیے ایک "خارجی بازو" کو ماننا بھی ضروری ہے۔"

آخر میں ایک امریکی میگزین کا اقتباس ملاحظہ ہو:

IS THE FATE OF A BLACK HOLE THE ULTIMATE FATE OF THE UNIVERSE ? WHEELER BELIEVES SO. IN SOME BILLIONS OF YEARS, THE GALAXIES WILL RUSH TOGETHER, FORMING ONE MASSIVE BLACK HOLE WHERE THE LAWS OF THE UNIVERSE THAT EXIST TODAY WILL BE 'NOT BROKEN, BUT TRANSCENDED', WHEELER SAYS. IN SUCH SPECULATION, COSMOLOGY BEGINS TO APPROACH METAPHYSICS.

The American Review,
Summer 1974

کیا بلیک ہول کا انجام ہی کائنات کا آخری انجام ہے۔ وہیلر کا خیال یہی ہے۔ کچھ بلین سال میں ایسا ہوگا کہ کہکشائیں کھنچ کر ایک دوسرے میں مل جائیں گی۔ ان کے ملنے سے ایک بڑا بلیک ہول تیار ہوگا جہاں موجودہ کائناتی قانون "ٹوٹ نہیں جائے گا بلکہ برتر صورت اختیار کرلے گا"۔ یہ وہیلر کا کہنا ہے۔ اس قسم کے نظریات کے بعد کائناتی سائنس مابعد الطبیعات سے قریب ہو جاتی ہے۔

قرآن میں ہے کہ زمین وآسمان باہم ملے ہوئے تھے (گویا سپر ایٹم کی حالت میں تھے) پھر اللہ نے ان کو پھاڑ دیا (بگ بینگ کا انفجار ہوا) پھر جس طرح تخلیق کا آغاز ہوا اسی طرح اس کو دوبارہ لوٹا دیا جائے گا (کائنات دوبارہ سپر ایٹم کی صورت اختیار کرلے گی) اس کے بعد نئے زمین وآسمان کی تخلیق ہوگی (کائناتی قانون بہتر صورت اختیار کرلے گا) قرآن میں جو کچھ کہا گیا تھا سائنس کس قدر صحت کے ساتھ اس کی تصدیق کر رہی ہے!

سائنس مابعد الطبیعات سے قریب

موجودہ زمانہ میں ایک نئی اصطلاح وجود میں آئی ہے جس کو (ETC) کہتے ہیں۔ یہ ایک انگریزی لفظ کا مخفف ہے:

EXTRA-TERRESTRIAL CIVILISATION

بالائی تہذیب۔ موجودہ زمانہ کے سائنسی مطالعہ سے انسان کے علم میں ایسے واقعات آرہے ہیں جو اس کو یہ یقین کرنے پر مجبور کر رہے ہیں کہ زمین کے علاوہ بھی خلا میں کہیں ذہین ہستیاں ہیں۔ مثلاً بالائی خلا سے نہایت صحت کے ساتھ سگنل موصول ہوتے ہیں جن کے مطالعہ کے لیے ایک مستقل فن (ریڈیو اسٹرونومی) وجود میں آئی ہے۔ جدید مشاہدات سے ثابت ہوا ہے کہ نظریۂ ارتقا زمینی زندگیوں کی توجیہہ کے لیے بالکل ناکافی ہے۔ چنانچہ اب یہ قیاس کیا جا رہا ہے کہ زمین پر زندگی کسی بالائی کرہ سے آئی ہے جہاں ہم سے زیادہ ترقی یافتہ تہذیب موجود ہے۔ اس نظریہ کو پینس پرمیا کا نام دیا گیا ہے۔

آج کل کثرت سے ایسے مضامین اور کتابیں چھپ رہی ہیں جن کا موضوع یہ ہوتا

کیا کائنات میں کسی دوسرے مقام پر بھی زندگی موجود ہے۔ ایک اخبار نے ایک مضمون چھاپا جس کا عنوان تھا

HELLO! HELLO! ANYONE OUT THERE

(کیا اوپر کوئی ہے) ایک ڈچ ریاضی داں (H. FREUDENTHAL) نے ۱۹۶۰ء میں ایک کائناتی زبان تجویز کی تھی جو خلائی باشندوں سے گفتگو میں کام آسکے۔ اگرچہ ۱۷-۱۹ ویں صدی میں ہر سیارہ حتی کہ سورج بھی زندگی کا مسکن سمجھا جاتا تھا۔ مگر اب کائنات کے دوسرے مقامات پر جس زندگی کا یقین کیا جا رہا ہے، وہ پہلے سے بہت مختلف اور معنی خیز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے علوم اس کو دوبارہ خدا کے عقیدہ کی طرف لے جا رہے ہیں۔ البتہ وہ "خدا" کا نام نہ لے کر "ترقی یافتہ تہذیب" کا نام لے رہا ہے۔ شاید تاریخ اپنے آپ کو دہرانے والی ہے۔

حبش کی ہجرت

نبوت کے پانچویں سال مکہ میں مسلمانوں کے حالات بہت سخت ہو گئے۔ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھ کر قریش نے ان کی حوصلہ شکنی کے لیے ایک نئی تحریک شروع کی۔ انھوں نے لوگوں سے کہنا شروع کیا کہ کوئی شخص مسلمانوں سے کوئی چیز نہ خریدے، نہ ان کے ہاتھ بیچے۔ نہ ان کی لڑکی سے نکاح کرے، نہ اپنی لڑکی ان کے نکاح میں دے۔

قدیم مکہ میں اس قسم کا معاشی اور سماجی بائیکاٹ زندگی کو مفلوج کر دینے کے ہم معنی تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو مشورہ دیا کہ حبش میں ایک انصاف پسند بادشاہ کی حکومت ہے تم لوگ وہاں چلے جاؤ۔ مسلمان چھوٹی جماعتیں بنا کر حبشہ جانا شروع ہوئے۔ کیونکہ اجتماعی شکل میں گھر سے نکلنے میں یہ اندیشہ تھا کہ قریش رکاوٹ ڈالیں گے۔

جدہ کے ساحل سے کرایہ کی کشتیوں میں سوار ہو کر ان لوگوں نے بحر قلزم پار کیا اور حبش میں اتر گئے۔ وہاں تجارت اور مزدوری کر کے گزر اوقات کرنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ مجموعی طور پر تقریباً ایک سو آدمی مکہ سے نکل کر حبش گئے تھے۔

قریش کو جب معلوم ہوا کہ مسلمان مکہ چھوڑ کر حبش چلے گئے ہیں تو انھوں نے اپنے دو آدمی عمرو بن العاص اور عمارہ بن ولید کو مقرر کیا کہ وہ حبش جائیں اور بادشاہ کو آمادہ کریں کہ وہ مسلمانوں کو قریش کے حوالے کر دے۔

قریش کا یہ وفد تحفہ تحائف لے کر حبش پہنچا اور شاہ نجاشی کے سامنے اپنی درخواست پیش کی۔ بادشاہ نے مسلمانوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ تمہارا اس مسئلہ میں کیا جواب ہے۔ جعفر بن ابی طالب مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے بولے۔ "اے بادشاہ مکہ یا عرب کے کسی دوسرے مقام پر ہم نے چوری نہیں کی ہے، نہ کسی کو قتل کیا ہے اور نہ کوئی دوسرا ظلم کیا ہے۔" شاہ حبش نے قریش کے وفد سے پوچھا۔ انھوں نے جواب دیا: ان کا کہنا صحیح ہے۔ انھوں نے چوری اور قتل جیسا کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ ہمارا الزام صرف یہ ہے کہ انھوں نے باپ دادا کے دین کو بدل ڈالا ہے۔

سلیمان بن عبد الملک (م ۹۹ھ) کی منقبت کے لیے یہ کافی ہے کہ اس نے خلافت راشدہ کی زریں فہرست میں پانچویں خلیفہ راشد (عمر بن عبد العزیز) کا اضافہ کیا۔ مگر عجیب بات ہے کہ اسی اموی حکمراں کے خانہ میں تاریخ ان واقعات کو بھی لکھتی ہے جن کا آخری نتیجہ ان دو عظیم ترین المیوں کی شکل میں برآمد ہوا جن میں سے ایک کا نام اسپین اور دوسرے کا نام ہندوستان ہے۔ اگر سلیمان بن عبد الملک نے اسپین میں طارق کو اور ہندوستان میں محمد بن قاسم کو معتوب کر کے واپس نہ بلایا ہوتا تو شاید ان دونوں ملکوں کی تاریخ اس سے مختلف ہوتی جو بعد کے دور میں ہمیں نظر آتی ہے۔

اسپین میں کیا ہوا

سلیمان بن عبد الملک نے تخت خلافت پر بیٹھنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ محض ایک ذاتی شکایت کی بنا پر موسیٰ بن نصیر گورنر افریقہ اور اس کے سپہ سالار طارق بن زیاد (فاتح اسپین) کو ان کے عہدوں سے معزول کر کے واپس بلالیا۔ اور اول الذکر کو قید اور دوسرے کو نظر بند کر دیا۔ اس کے قدرتی نتیجہ کے طور پر اسپین کی مسلم حکومت اور مرکز خلافت کے درمیان آغاز ہی میں حریفانہ جذبات پیدا ہو گئے۔ ۱۳۲ھ میں جب ایک خونی آشام انقلاب کے بعد دمشق کی اموی سلطنت ختم ہوئی اور نئے دار الخلافہ بغداد میں عباسی خلافت قائم ہوئی تو اموی خاندان کا ایک لٹا ہوا شہزادہ عبد الرحمٰن الداخل اسپین پہنچا اور وہاں کے حالات سے فائدہ اٹھا کر اسپین میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ بنو امیہ کے ایک فرد کی یہ کامیابی عباسیوں کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس طرح اسپین اور مرکز خلافت کے درمیان رقابت کی ایک اور وجہ پیدا ہو گئی اور نتیجۃً باہمی آویزشوں کا وہ لامتناہی سلسلہ چلا جو صرف اس وقت ختم ہوا جب اسپین میں خود مسلم سلطنت ختم ہو گئی۔

مرکز خلافت اور اسپین کی یہ رقابت یہاں تک بڑھی کہ جس خلافت نے طارق بن زیاد کو بھاری کمک دے کر اسپین کی مہم پر بھیجا تھا اسی خلافت نے فرانس کے بادشاہ شارلیمین کو اکسایا کہ وہ اسپین پر حملہ کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسپین میں ایک عام خانہ جنگی اور بغاوت کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ہر علاقہ کا گورنر خود مختاری کے خواب دیکھنے لگا۔ امیر قرطبہ کے رشتہ داروں نے اس نازک وقت کو اسپین کے تاج و تخت کے لیے سازش کرنے کا سنہری موقع سمجھا۔ مقامی عیسائیوں کو شہ ملی کہ وہ باغی مسلمانوں کو ساتھ لے کر ہر جگہ شورش پیدا کرتے رہیں۔ اسپین کی اموی خلافت کے بعد اسپین کا ملک چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستوں میں تقسیم ہو گیا جنھوں نے قرطبہ، اشبیلیہ، غرناطہ، بلنسیہ، طلیطلہ، مالقہ وغیرہ شہروں کو اپنا اپنا دار الحکومت بنالیا۔

طارق بن زیاد ۹۲ھ (۷۱۱ء) میں اسپین میں داخل ہوا تھا اور ۸۹۷ھ (۱۴۹۲ء) میں اسپین سے مسلم

اقتدار کا خاتمہ ہوا۔ آٹھ سو برس کی اس طویل مدت کا کوئی دن ایسا نہیں گزرا جو بغاوتوں اور شورشوں سے خالی ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ اسپین کو اکثر بہت لائق مسلم حکمراں ملے۔ عدل و انصاف کے اعتبار سے بھی اور تمدن و سیاست کے اعتبار سے بھی۔ اور بلا شبہ انھوں نے مشکل حالات کے باوجود تمدن اور سیاست دانی کے اعتبار سے اسپین میں ایک عظیم تاریخ بنائی۔ مگر اندرونی حالات اور مرکز خلافت کی شہ کی بنا پر ملک کی عیسائی رعایا مسلسل بغاوتوں پر مائل رہتی تھی جس کی وجہ سے وہ ماحول نہ بن سکا جس میں اس اہم ترین کام کی بنیاد پڑتی جس کے لیے اسلام نے کشورکشائی اور جہاں بانی کے میدان میں قدم رکھا تھا۔ یعنی اشاعت دین کا کام۔ عرب اور اطراف عرب کے اکثر ممالک جتنی مدت میں مکمل طور پر اسلامی آبادی کے ملک بن گئے اس سے بہت زیادہ مدت پانے کے باوجود اسپین اسلامی آبادی کا ملک نہ بن سکا۔

اسپین میں مسلم حکومت کی مثال تقریباً ویسی ہی ہے جیسے آزادی سے قبل ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کی مثال۔ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے سو سالہ دور حکومت میں ملک کو زبردست تمدنی ترقیات سے مالا مال کیا۔ اگرچہ انھوں نے وہ غلطی نہیں کی جو اسپین کے مسلمانوں نے کی تھی۔ انھوں نے سارے ملک میں عیسائی مشنریوں کا جال بچھا دیا اوران کو بے پناہ سہولتیں عطا کیں مگر مسیحی مذہب میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ اس ملک کی آبادی کو اپنا ہم عقیدہ بنالیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہندوستان سے انگریزوں کی ہوا اکھڑی تو عالی شان عمارتیں اور بڑے بڑے پل ان کے کام نہ آسکے اور انھیں ہندوستان چھوڑ کر وطن واپس جانا پڑا۔

طارق بن زیاد نے جس اسلامی جذبے کے تحت اسپین کی سرزمین پر قدم رکھا تھا اگر وہ جذبہ جاری رہتا اور وہاں مستحکم حکومت کی روایت قائم ہوسکتی تو اسپین میں مسلمانوں کے سوا کسی کا وجود نہ ہوتا۔ دریا پار کرنے کے بعد اپنی طویل دعا میں اس نے رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا کی آیت بطور بددعا نہیں دہرائی تھی۔ بلکہ یہ اپنے اس عزم کا اظہار تھا کہ وہ اس ملک کو کفر و شرک سے خالی کر کے اسلام کا گہوارہ بنا دینا چاہتا ہے۔ مسلم اسپین کی ابتدائی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی کثرت سے اسلام قبول کر رہے ہیں۔ مگر چند ہی برس بعد وہاں کی سیاست کا رخ اس طرح بدلا کہ تبلیغ دین کا کام پس پشت پڑ گیا۔ ۱۳۲ھ میں جب مرکز خلافت میں تبدیلی ہوئی اور بنو امیہ کی جگہ بنو عباس کی سلطنت قائم ہوئی تو اس ذہن کو مزید تقویت ملی۔ کیونکہ عباسیوں کو جتنی دلچسپی تمدن اور علوم و فنون کی ترقی سے تھی اتنی دین کی اشاعت سے نہیں تھی۔ اس طرح بغداد کے اثر سے قرطبہ تمدن اور علوم و فنون کا مرکز تو بن گیا مگر وہ اشاعت دین کا مرکز نہ بن سکا۔

چنانچہ اسپین میں جب حالات بدلے تو وہاں کی مسلم اقلیت پر عیسائی اکثریت آناً فاناً غالب آگئی اور الحمرا کا بے مثال محل مسلمانوں کے کچھ کام نہ آسکا۔ چونکہ عام آبادی میں عیسائیوں کو غلبہ حاصل تھا اس لیے ۹۰۲ھ میں قرطبہ کو زیر کرنے کے بعد جب مسلمانوں کے خلاف داروگیر شروع ہوئی تو ان کے لیے وہاں چھپنے کی

ہی کوئی جگہ نہیں تھی۔ عیسائیوں نے غالب آتے ہی تمام ملک میں اپنی مذہبی عدالتیں قائم کردیں جن میں ہر روز ہزاروں مسلمان گرفتار کرکے لائے جاتے اور طرح طرح کے جھوٹے الزامات لگا کر آگ میں جلا دیے جاتے۔ ۱۶۰۴ء میں ایک عام حکم جاری کیا گیا کہ ہر وہ شخص جو مسلمان ہے وہ دین مسیحی قبول کرلے ورنہ جہاں اس کو پایا جائے گا قتل کردیا جائے گا۔ کچھ مسلمان جہازوں پر سوار ہوکر افریقہ کے لیے روانہ ہوئے مگر ان کو ساحل افریقہ تک پہنچنے سے پہلے ہی سمندر میں غرق کردیا گیا۔ آخر کار کوئی ایک بھی توحید پرست سرزمین اسپین میں باقی نہ رہا۔ عیسائیوں نے سب کو یا تو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ یا سمندر میں ڈبو دیا۔ یا آگ میں جلا ڈالا۔

(۲)

خلفائے اربعہ کے بعد اسلامی حکومت بنی امیہ کے ہاتھ میں چلی گئی جس کے بانی امیر معاویہ (وفات ۶۰ھ) تھے اس سلسلۂ حکومت کا پانچواں فرماں روا عبدالملک بن مروان تھا۔ ۸۶ھ میں عبدالملک کا انتقال ہوا۔ انتقال سے پہلے اس نے اپنے دونوں بیٹوں ولید اور سلیمان کو ولی عہد مقرر کردیا۔ اس نے تمام صوبوں کے گورنروں اور عاملوں کے نام فرامین جاری کیے کہ عید الفطر کے اجتماع میں یکم شوال ۸۶ھ کو ولید و سلیمان کی ولی عہدی کے لیے بیعت لی جائے۔ چنانچہ تمام ممالک اسلامی میں تاریخ مقررہ پر ان دونوں کی ولی عہدی کے لیے بیعت لی گئی۔ یہی موقع ہے جب کہ مدینہ کے مشہور محدث سعید بن مسیب کو بیعت سے انکار کرنے پر درے لگائے گئے۔

عبدالملک بن مروان (۸۶-۲۳ھ) کے انتقال کے بعد جب اس کا بڑا لڑکا ولید تخت پر بیٹھا تو اس نے یہ کوشش شروع کی کہ اپنے بعد تخت کی وراثت اپنے بھائی (سلیمان) کے بجائے اپنے بیٹے (عبدالعزیز) کی طرف منتقل کردے۔ ولید بن عبدالملک نے پہلے اپنے بھائی سلیمان کو لکھا کہ وہ از خود ولی عہدی سے دست بردار ہوجائے۔ جب سلیمان اس کے لیے تیار نہ ہوا تو اس نے دوسری تدبیر کی۔ اس نے تمام والیان ملک اور ممتاز افراد کو اپنے حق میں ہموار کیا اور طے کیا کہ ایک روز کسی خاص اجتماع کے موقع پر تمام ممالک اسلامی میں سلیمان بن عبدالملک کی ولیعہدی کی منسوخی کا اعلان کردیا جائے اور اس کے بجائے عبدالعزیز بن ولید کی ولیعہدی پر لوگوں سے بیعت لے لی جائے۔

مگر اس منصوبہ کی تکمیل سے پہلے ۱۵ جمادی الثانی ۹۶ھ (فروری ۷۱۵ء) میں اس کا انتقال ہوگیا۔ ولید بن عبدالملک کے انتقال کے بعد سلیمان بن عبدالملک تخت نشین ہوا تو قدرتی طور پر وہ ان سرداروں کا دشمن ہوگیا جنھوں نے اس کو تخت سے محروم کرنے کی سازش میں اس کے بھائی ولید کا ساتھ دیا تھا۔ انھیں میں سے ایک حجاج بن یوسف تھا جو مشرق کے اسلامی ممالک کا وائسرائے تھا اور مغربی ممالک کا وائسرائے موسیٰ بن نصیر۔ حجاج کا صدر مقام عراق تھا اور موسیٰ بن نصیر کا قیروان۔ ان دونوں نے ولید کے منصوبہ کی حمایت کی تھی اس لیے دونوں سلیمان کی نظر میں وہ بدترین دشمن تھے جن سے سب سے پہلے نمٹنا نئے حکمراں کے لیے ضروری تھا۔ حجاج، سلیمان بن عبدالملک کی تخت نشینی سے آٹھ ماہ پہلے شوال ۹۵ھ میں انتقال کرگیا تھا۔ اس لیے

سلیمان اب حجاج بن یوسف کو نہیں پا سکتا تھا. تاہم حجاج کے رشتے دار اس کے انتقامی جذبات کی تسکین کے لیے موجود تھے جن میں سرفہرست حجاج کے ابن عم اور داماد محمد بن قاسم کا نام تھا جس نے سندھ (موجودہ پاکستان) میں غیر معمولی فاتحانہ کارنامے دکھا کر حجاج کی شہرت میں اضافہ کیا تھا.

محمد بن قاسم نہایت اعلیٰ درجہ کی قابلیت رکھنے والا سپہ سالار تھا. ایک مورخ کے الفاظ میں "اس نے سندھ و ہند کی فتوحات میں ایک طرف اپنے آپ کو رستم و اسکندر سے زیادہ بڑا بہادر ثابت کیا تو دوسری طرف نوشیروان عادل سے بڑھ کر عادل و رعایا پرور ظاہر ہوا" یہ نوجوان فتح مند سردار سندھ و پنجاب میں اتنی تیزی سے گھس رہا تھا اور بستیوں کی بستیاں اس کے اثر سے اس طرح دائرہ اسلام میں داخل ہوتی چلی جارہی تھیں کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عنقریب سارا علاقہ ایک اسلامی علاقہ بن جائے گا.

ہندوستان کی مہم پر محمد بن قاسم کو حجاج ہی نے روانہ کیا تھا اس کے لیے حجاج نے کتنا اہتمام کیا تھا اس کا اندازہ چند مثالوں سے ہوگا.

۱- حجاج نے دیگر تمام ساز و سامان کے علاوہ ۳۰ ہزار دینار خصوصی طور پر محمد بن قاسم کے ہمراہ کیے تھے تاکہ ناگہانی ضرورت کے وقت کام آسکیں (زبیر معصوم) کہا جاتا ہے کہ فوج کشی کی اس مہم پر کل ۶ کروڑ درہم صرف ہوئے تھے.

۲- فراہمی سامان کا حجاج کو اس قدر خیال تھا کہ اس نے سوچا کہ محمد بن قاسم کو عربوں کی عادت کی بنا پر کھانے میں سرکہ کی ضرورت ہوگی. چنانچہ اس نے بہت سی روئی سرکہ میں تر کر کے خشک کرایا اور اس کو محمد بن قاسم کے پاس روانہ کیا اور لکھا کہ جب سرکہ کھانے کا جی چاہے تو اس کو پانی میں بھگو کر نچوڑ لیا کرنا

۳- بڑی منجنیقیں جو بھاری ہونے کی وجہ سے خشکی کے راستے سے روانہ نہ ہو سکتی تھیں، ایک بڑے جہاز پر لدوا کر ساحل سندھ کی طرف روانہ کیں. یہ منجنیقیں اتنی بڑی تھیں کہ ان میں سے ہر ایک کو چلانے کے پانچسو آدمیوں کی ضرورت ہوتی تھی

۴- اس پوری مہم کے دوران حجاج اور محمد بن قاسم کے درمیان ڈاک کا سلسلہ جاری رہا. حجاج بصرہ میں تھا اور محمد بن قاسم سندھ میں. مگر انتظام یہ تھا کہ ہر تیسرے روز ایک خط حجاج لکھتا تھا اور اسی طرح محمد بن قاسم بھی ساری مصروفیتوں کے باوجود ہر تیسرے روز حجاج کے نام مفصل حالات تحریر کرتا. ڈاک کی روانگی کے لیے ایسے خاص انتظامات کیے گئے تھے کہ اگرچہ دیبل (سندھ) اور بصرہ میں ہزاروں کوس کا فاصلہ تھا. مگر برابر ساتویں روز بصرہ سے دیبل اور دیبل سے بصرہ دونوں کے خطوط پہنچ جاتے تھے.

محمد بن قاسم نے ۹۶ھ میں ملتان فتح کیا. اب پورا سندھ اس کے قبضہ میں تھا - بحر عرب سے لے کر حدود کشمیر تک تمام راجاؤں اور سرداروں نے اسلام کی عظمت کو تسلیم کر لیا تھا. اب اس نے پورے برصغیر میں اسلام کی اشاعت کا مقصد بنایا اور قنوج کی طرف کوچ کرنا شروع کیا. اس کا خیال تھا کہ قنوج پر قبضہ کرنے کے بعد

بقیہ علاقوں کی فتوحات کا دروازہ کھل جائے گا۔ مگر ۹۶ھ میں سلیمان بن عبدالملک تخت نشین ہوا۔ اس کو حجاج کے متعلقین سے حجاج کا بدلہ لینا تھا۔ اس نے ایک طرف حجاج کے بعد یزید بن مہلب کو عراق کا والی مقرر کیا اور ایک خارجی المذہب صالح بن عبدالرحمٰن کو خراج وصول کرنے کی خدمت سپرد کی۔ یہ دونوں حجاج کے بدترین دشمن تھے۔ چنانچہ سلیمان کے حکم کے مطابق ان دونوں نے نسل عقیل (خاندان حجاج) کے لوگوں کو طرح طرح سے ماخوذ کرکے قتل کرنا شروع کیا۔

دوسری طرف سلیمان نے محمد بن قاسم کو ولایت سندھ سے معزول کرنے کا حکم جاری کر دیا جس کا قصور اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ حجاج بن یوسف کا ابن عم اور داماد تھا اور حجاج کا نامور عزیز ہونے کی بنا پر اس کو ہلاک کرکے سلیمان اپنے انتقامی جوش کو ٹھنڈا کر سکتا تھا۔ سلیمان نے محمد بن قاسم کی جگہ یزید بن ابی کبشہ کو سندھ کا حاکم مقرر کیا۔ نیا حاکم دربار خلافت کا حکم لے کر سندھ پہنچا۔ اس نے محمد بن قاسم کو گرفتار کیا اور مجرموں کی طرح اس کو ٹاٹ کے کپڑے پہنائے۔ ہاتھ پاؤں میں زنجیریں ڈالیں اور معاویہ بن مہلب کی حراست میں عراق روانہ کیا۔ یہ بھی محمد بن قاسم کی سعادت مندی تھی۔ ورنہ سندھ میں وہ اتنا مقبول تھا کہ وہ خلیفہ کے حکم سے بغاوت کرکے خود یزید اور مہلب کو گرفتار کر سکتا تھا۔

فتوح البلدان کے بیان کے مطابق عربی کا مشہور شعر اسی وقت محمد بن قاسم کی زبان پر جاری ہوا تھا،

اضاعونی وای فتی اضاعوا ۔۔۔ لیوم کریھۃ وسداد ثغر

(لوگوں نے مجھے ضائع کر دیا اور کیسے جوان کو ضائع کیا۔ وہ جو مصیبت کے دن کام آئے اور سرحدوں کو محفوظ رکھے)

اس کے بعد محمد بن قاسم کو دمشق لے جایا گیا۔ وہاں سلیمان کے حکم سے وہ واسط کے جیل خانہ میں قید کر دیا گیا۔ اس پر داروغہ جیل کی حیثیت سے صالح بن عبدالرحمٰن مسلط تھا جس نے اس کو جیل میں طرح طرح کی تکلیفیں دے کر مار ڈالا

ایک مورخ ان واقعات کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے،

"اگر ولید بن عبدالملک کی زندگی کچھ روز اور وفا کرتی۔ یا سلیمان ہی عقل و ہوش سے کام لے کر محمد بن قاسم کو چھوڑ دیتا تو شاید ایشیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔"

یہی مورخ مزید لکھتا ہے "محمد بن قاسم کے زمانہ میں خلقت خدا کثرت سے اسلام قبول کرتی جا رہی تھی۔ تبلیغ دین کی جو سچی اور صحیح کوشش اس نے چند روز میں کرکے دکھا دی۔ بعد کی بڑی بڑی سلطنتیں صدیوں میں بھی نہ کر سکیں۔ اس نو عمر سپہ سالار نے چند روز کی حکمرانی میں جو گہرا اثر ڈال دیا تھا۔ ویسا اثر پٹھانوں اور مغلوں کی سلطنتیں پانچ سو برس میں بھی ملک پر نہیں ڈال سکیں۔ سندھ کے علاوہ بقیہ ملک میں آج مسلمان تھوڑے ہیں اور ملک پر کوئی اثر نہیں رکھتے۔ بخلاف اس کے سندھ میں سب سے بڑا غلبہ مسلمانوں کو حاصل ہے اور یہ صرف عربوں اور خاصتہً محمد بن قاسم کی دین ہے۔"

الاسلام

مؤلف:
مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۱۴۴ — قیمت مجلد مع پلاسٹک کور پندرہ روپے

قیمت مجلد بغیر پلاسٹک کور تیرہ روپے

دین کی حقیقت، تعلیمات قرآن کی حکمتیں، سیرت رسول کا انقلابی سبق
موجودہ زمانہ میں اسلام کے مسائل، دین کا تجدید و احیاء
امت مسلمہ کی تعمیر، دعوت اسلامی کے جدید امکانات —

ان موضوعات کے گہرے مطالعہ کے لئے "الاسلام" پڑھئے۔
جدید سائنٹفک اسلوب میں، نہایت دلچسپ اور معلومات سے بھرپور۔

اداروں، طالب علموں، نیز کم آمدنی والوں کے لئے خصوصی رعایت
تاجروں اور ایجنٹوں کے لئے خصوصی کمیشن

قیمت — بذریعہ منی آرڈر بھیج کر طلب فرمائیں
کتاب کی روانگی کا ڈاک خرچ ادارہ کے ذمہ ہوگا۔
بیرونی ممالک کے لئے تیس روپے یا اس کے مساوی رقم

الدار العلمیہ، جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

AL-DARUL ILMIYYA, JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI 6 (India)

"الاسلام، اسلوب تحریر اور مواد استدلال دونوں کے اعتبار سے آج کی کامیاب ترین کتاب ہے۔ میں علماء سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس کا گہرا مطالعہ کریں، اور ایک درسی کتاب کی طرح اس سے فائدہ اٹھائیں"

حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی تحریر فرماتے ہیں:

مکرمی مولانا صاحب، سلام مسنون

شدید انتظار کے بعد آپ کی بہترین کتاب "الاسلام" میرے پاس پہنچ گئی، اس کتاب کے مسودہ پر میں نے سرسری طور پر نظر ڈالی تھی، اس وقت سے مجھے اس کتاب کا انتظار تھا۔ مصروفیت کے باوجود اس دور کی یہ اہم علمی، تبلیغی اور اصلاحی کتاب سفر و حضر میں ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہے اور میں اسے بہت غور و فکر کے ساتھ آہستہ آہستہ سمجھ سمجھ کر پڑھ رہا ہوں۔ صفحہ ۱۲ پر آپ نے لکھا ہے:

"پہلے جو ہر کے سلسلہ میں اہم ترین کام یہ ہے کہ اسلام کے عقائد و احکام کو جدید استدلالی انداز میں مرتب کیا جائے تاکہ وہ لوگوں کو "آج کی چیز" معلوم ہونے لگیں، نہ یہ کہ پڑھنے والا یہ سمجھے کہ وہ اس دور کی چیز ہیں جب کہ انسان قبائلی دور میں سانس لیتا تھا"

میں "الاسلام" کے فاضل مصنف کو مبارکباد اور ساتھ ہی دعائیں دیتا ہوں کہ اس نے الاسلام کو اسلوب تحریر اور استدلالی مواد دونوں کے لحاظ سے "آج کی کامیاب ترین چیز" بنا دیا ہے۔ دین برحق کے ایک ایک عنوان کے تحت مسائل شریعت کو الاسلام کے فاضل مصنف نے اس موثر انداز سے سمجھایا ہے کہ وہ دل و دماغ میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ یہ اہم کتاب عام مسلمانوں سے زیادہ علماء اسلام کے لئے ایک اہم تربیتی اور تعلیمی کتاب ہے۔ دین کی تعلیم اور تبلیغ کا کام کرنے والے حضرات اس کتاب کو سمجھ کر پڑھیں، ہر قسم کا تکلف دور کر کے اس کی ایک ایک سطر کا مطالعہ کریں اور مولانا وحید الدین خاں صاحب نے جس جدید اسلوب سے قرآن و حدیث کی باتیں پیش کی ہیں اس انداز کو اپنی تقریروں اور تحریروں میں سمونے کی کوشش کریں۔

میں نے مولویانہ تعلّی سے علیٰحدہ ہو کر اس کتاب کو اپنے سرہانے رکھ چھوڑا ہے اور اس کے ایک ایک دو دو صفحے ایک طالب علم کی طرح سمجھ سمجھ کر روزانہ پڑھتا ہوں۔ میں اپنے طبقہ کے ساتھیوں اور خاص طور پر نوجوان علماء سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ الاسلام کا گہرا مطالعہ کریں اور اسے ایک درسی کتاب سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اخلاق حسین قاسمی دہلوی۔ ۳ اگست ۱۹۷۷ء

الرسالہ کے سلسلے میں قارئین کے تعریفی خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں ہم ایک قاری کا خط نقل کر رہے ہیں جو اس سے پہلے ہم سے سخت قسم کا فکری اختلاف رکھتے تھے۔ الرسالہ کے مسلسل مطالعہ کے بعد انھوں نے اپنے احساسات مندرجہ ذیل الفاظ میں تحریر فرمائے ہیں۔

خدا آپ کے سکون واطمینان کو بحال رکھنے کے لیے آپ کو ہر پریشانی سے محفوظ رکھے تاکہ اللہ کی منشا کی بات آپ بہتر سے بہتر طور پر بندگانِ خدا کے سامنے رکھ سکیں۔ خدا آپ کی خوب سے خوب تر مدد کرے۔ آمین۔ واقعی آپ نے میرا دل جیت لیا ہے اب میں آپ سے بہت خوش ہوں۔ کل آپ سے ناراضی کی بنیاد سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھی جس کی بنیاد پر اب خوش ہوں۔ خدا اپنا کرم کرے۔ مجھے آپ کی باتیں (مضامین کی شکل میں) ایسی لگ رہی ہیں جیسے حقیقت کا خزانہ یہی ہیں۔ اللہ آپ کی مدد کرے اور ہر (برائی کے) اندیشے سے محفوظ رکھے۔ "آپ نے دل جیت لیا" کا مطلب ان معنوں میں نہیں ہے کہ کسی مخالف کے ساتھ اچھا برتاؤ کر کے اپنا بنا لیں۔ بلکہ یہ واقعہ ہے کہ میں آپ کی باتوں کا بغور مطالعہ کر کے اس میں حقیقت کی روشنی پا رہا ہوں اور میرا یہ یقین بن چکا ہے کہ اسی طریقہ کو اپنا کر اسلام کو صحیح معنوں میں غالب کیا جا سکتا ہے۔ مگر بہت کم لوگ اس شکل رائے کو اپنا سکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ مجھ سے اکثر ناراض رہے ہیں اور اب تو اور بھی اس میں شدت پیدا ہو گئی ہے۔ جہاں معقولیت نام ہو جذباتیت اور خود پسندی کا وہاں معقولیت کی امید عبث ہے۔ اللہ آپ کی مدد کرے، میرے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی رہتی ہے۔ اللہ تعالے نے آپ کو بہت اچھی سمجھ دی ہے۔ پس اللہ تعالے کی مدد سے اس کو سنبھال رکھیے۔ ورنہ بہت سے شیطان پسندی کا شکار ہو گئے ہیں۔ اسی لیے اپنی پسند سے آگے جانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اللہ تعالے ایسے لوگوں سے اپنے دین کو بچائے۔ اللہ تعالے الرسالہ کو دن دُگنی رات چوگنی ترقی عطا کرے کاش کہ لوگ سمجھیں — !

الرسالہ میری نظر میں ایمان واسلام کا خزانہ لیے ہوئے ہوتا ہے بلکہ خدا پسندی کا لافانی سامان لیے ہوتا ہے۔ میں جب بھی پڑھتا ہوں تو میرا دل بے ساختہ آپ کو دعائیں دئے بغیر نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر تازہ شمارہ کا انتظار قریبی تاریخوں سے شروع ہو جاتا ہے۔ اللہ آپ کو اس کا خوب بدلہ عطا کرے۔ اور اس کو ہر بندۂ خدا تک پہنچنے کا سامان اور مخالفین کو سوچنے کی توفیق عطا کرے۔ "سب سے بڑا اعتماد خدا پر اعتماد ہے" یہ مضمون پڑھنے کے بعد مجھے اپنی لکھی بات مناسب نہیں معلوم ہوئی کہ ایسے آدمی سے نصیحت کی بات کروں جو خود ایسی گُر کی باتیں جانتے ہیں۔

آج آپ کا یہ مضمون پڑھ کر دل نے بہت دعائیں دیں: "دعوت اسلامی کے جدید امکانات" ایک ایک سطر کئی بار پڑھا۔ اور بڑی خوشی ہوئی مضمون بہت اچھا لگا۔ اللہ آپ کی مدد کرے —

"الاسلام" واقعی آپ کا ایک غیر معمولی کارنامہ ہے اور خدائے تعالیٰ اس کو قبولیت کا درجہ عطا فرمائے (اپنی بارگاہ میں) میں اس کی باتوں سے متفق ہی نہیں اس کے عام ہونے کا خواہشمند ہوں۔ انشاء اللہ آج نہیں تو کل یہ مقبول عام ہوکر رہے گی۔ اور اسلام کو سربلندی اسی طریقے سے مل سکتی ہے۔ اگر یہ کتاب میں پہلے دیکھتا تو آپ کا میرا اختلاف کبھی نہیں ہوتا۔ میں آپ کا پہلے سے بھی شخصی طور پر بہت قدرداں ہوں۔ لیکن میرے ذہن میں آپ کی طرف سے یہ بات بہت کھٹکتی تھی کہ "خدا پسند حکومت کے قیام کی ضرورت نہیں" جبکہ میرے خیال میں خدا ہی اس زمین کا خالق اور مالک ہے تو پھر اس زمین پر دوسروں کی مرضی کیسے ؟ پھر ایک اچھی حکومت کے بغیر انسانی حقوق کا تحفظ بھی ممکن نہیں ... . مگر اب یہ بات سمجھ میں آگئی ہے کہ آپ خدا پسند حکومت کے مخالف نہیں بلکہ اس طریقہ کے مخالف ہیں جس سے وہ کبھی قائم نہیں ہوسکتی۔ اور موجودہ واقعات بھی آپ ہی کی بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ مجھے آپ کی بات پوری طرح پٹ گئی ہے۔ یعنی میں نے اس کو پوری طرح تسلیم کرلیا ہے۔ کتاب الاسلام کے بارے میں میرا خیال ہے کہ دین پہنچانے کی ذمہ داری کے تحت الاسلام ہی کو پیش کردینا کافی ہے۔ "حرف آخر" بھی بہت معقول لگا۔ اب تو واقعی الرسالہ کے بعد کوئی پرچہ اچھا نہیں لگتا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ آج ہماری سب سے اہم ضرورت یہی ہے کہ ہم مسلمان بنیں اور مسلمانی کو عام کریں۔

بلند فکری

جب تیز ہواؤں کا طوفان آتا ہے تو چھوٹی چڑیاں اس کے اندر گھر کر رہ جاتی ہیں۔ مگر جو بڑی چڑیاں ہوتی ہیں، وہ اپنے قوی بازوؤں کے ساتھ اڑکر اوپر چلی جاتی ہیں۔ اور اس طرح طوفان کے دائرے سے باہر نکل جاتی ہیں۔ اس واقعہ کی روشنی میں یہ امریکی مثل ہے : بگ برڈ آف دی اسٹارم (طوفان کی بڑی چڑیا)

اسی طرح سوچنے کی بھی دو سطحیں ہیں۔ کچھ لوگوں کی سوچ ان کے قریبی حالات کے دائرہ میں بنتی ہے۔ ان کا فکر ان کے آس پاس کے واقعات کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ وہ جن حالات میں گھرے ہوئے ہیں ان سے اٹھ کر سوچ نہیں پاتے۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جو "طوفان کی بڑی چڑیا" کی طرح اپنے قریبی حالات سے اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ وہ حالات سے متاثر ہوکر نہیں سوچتے بلکہ حالات سے بلند ہوکر اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔

اس دوسرے طرز فکر کو کوئی نام دینا ہو تو شاید یہ کہنا صحیح ہوگا کہ بڑی چڑیا کے انداز پر سوچنا (BIG BIRD THINKING)

خلیج کے کنارے

متحدہ عرب امارات سمندر کے اس حصّہ کے شمال مشرقی سرے پر واقع ہیں جس کو عرب خلیج عرب کہتے ہیں اور ایرانی خلیج فارس۔ سات ریاستوں پر مشتمل اس وفاق کا یہ نام ۱۹۷۱ء سے لیا جانے لگا۔ اس سے پہلے اس وفاق کا ہر حصّہ اپنی الگ الگ امارت کے نام سے موسوم تھا۔ انہی سات ریاستوں میں سے ایک ابوظہبی ہے جس کے امیر شیخ زاید بن سلطان النہیان متحدہ عرب امارات کے صدر ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں وہ ابوظہبی کے حکمران مقرر ہوئے تھے۔

ایران اور عمان کی طرح متحدہ عرب امارات کے غوطہ خور قدیم زمانہ میں سمندر سے موتی نکالنے کا کام کرتے تھے۔ آج بھی اس علاقہ میں آپ کو کوئی نہ کوئی ایسا شخص ملے گا جو فخر کے ساتھ آپ کو بتائے گا کہ اس کا کس سنہ کا نکالا ہوا کون سا موتی کس تاج دار یا تاجر کی کلاہ کی زینت بن چکا ہے۔ مگر آج موتی نکالنے کا یہ قیمتی پیشہ ختم ہو چکا ہے۔ جاپان میں پالش شدہ مصنوعی موتیوں کی صنعت نے جنم لیا اور ۱۹۲۹ء سے اس نے دنیا کی موتی کی منڈیوں کو پاٹنا شروع کر دیا۔ جاپان کے ان مصنوعی موتیوں نے خلیج کے موتیوں کی صنعت کو بالکل ختم کر دیا۔ کچھ عرصہ تک یہ علاقہ سخت بیروزگاری کا شکار رہا کیونکہ یہاں موتی اور ماہی گیری کے سوا کسی قسم کی کوئی صنعت یا تجارت نہ تھی۔ مگر اس کے بعد اس علاقہ میں تیل کی دولت نکل آئی جس نے اس علاقہ کو پہلے سے ہزاروں گنا زیادہ مالا مال کر دیا۔ آج عرب امارات میں تعلیم اور علاج مکمل طور پر مفت ہے۔ بیروزگاروں اور معذوروں کو مستقل وظیفے دیے جاتے ہیں اور بے شمار طریقوں سے حکومت اپنے شہریوں کی مدد کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ ماہی گیری، زراعت، جہاز رانی کو جدید ڈھنگ سے ترقی دی جا رہی ہے۔ وہ علاقہ جو پہلے ہر قسم کی زرعی پیداوار کے لیے مکمل طور پر درآمدات کا محتاج تھا۔ آج کئی قسم کی سبزیاں اور پھل برآمد کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ بستیاں، بندرگاہیں، کارخانے، اسپتال، جدید طرز کے شہر ہر روز اس چٹیل میدان سے ابھر رہے ہیں۔

لوگوں کے پاس سننے والے کان ہوں تو سچائی کو بتانے کے لیے کسی اعلان کی ضرورت نہیں۔ کائنات کی خاموش زبان ہر آن سچائی کو اس سے زیادہ بہتر طور پر نشر کر رہی ہے جو کوئی انسان اپنا تحریر وتقریر کے ذریعہ کر سکتا ہے۔

تعارف وتبصرہ

عمدۃ اللبیب شرح شیم الحبیب

تالیف : مولانا نیاز محمد صاحب
صفحات ۲۱۰، قیمت آٹھ روپے

شمائل نبوت کا موضوع بہت ایمان افروز موضوع ہے متقدمین نے اس پر کثرت سے کتابیں لکھی ہیں جن میں امام ابوعیسیٰ ترمذی (م ۲۷۰ھ) کی کتاب سب سے زیادہ کامیاب سمجھی جاتی ہے۔ مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (۱۱۶۲-۱۲۴۵ھ) کی شمائل نبوی پر ایک مختصر کتاب ہے جس کا نام ہے شیم الحبیب۔ زیر نظر تالیف اسی عربی کتاب کی عربی شرح ہے۔ یہ کتاب، مختصر ہونے کے باوجود اپنے موضوع پر کافی جامع ہے اور فاضل شارح کی مفصل تعلیقات نے اس کو مکمل بنا دیا ہے۔ مولانا کی محنت اور تحقیق کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ موصوف نے شمائل نبوت پر بعض ایسی حدیثیں بھی تلاش کر کے نقل کی ہیں جو عام شرحوں میں نہیں پائی جاتیں۔

مولانا نیاز محمد صاحب (پیدائش ۱۹۱۹ء) علاقہ میوات کے مشہور علماء میں سے ہیں۔ نوح (ضلع گوڑگاؤں) میں ایک عربی مدرسہ کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ زیر نظر شرح کے علاوہ آپ نے اور بھی متعدد کتابیں تالیف کی ہیں جو سب، کی سب شرح اور حواشی پر مشتمل ہیں۔

زیر نظر کتاب اپنی مفصل تعلیقات کے ساتھ محض شیم الحبیب کی شرح نہیں ہے بلکہ اس میں جگہ جگہ مختلف علوم سے متعلق قیمتی نکتے بیان ہوتے چلے گئے ہیں۔ مثلاً صفحہ ۴۰-۴۸ پر حضرت حسنؓ کے بارے میں مفید تاریخی معلومات درج ہیں۔ اسی طرح مثلاً حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ہشاش بشاش رہتے تھے (دائم البشر) دوسری طرف حدیث یہ بتاتی ہے کہ آپ مسلسل غمگین رہتے تھے۔ کوئی چیز آپ کی راحت کا باعث نہیں ہوتی تھی (کان متواصل الاحزان لیس له راحة)

اس کی تشریح صاحب کتاب نے نہایت فطری انداز میں کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔ اصل یہ ہے کہ جب آپ ملاقاتیں کرتے اور لوگوں کے درمیان ہوتے تو آپ ہشاش بشاش چہرہ کے ساتھ ان سے ملتے۔ جب آپ تنہا ہوتے تو اس وقت آپ پر ذمہ داری کا احساس غالب رہتا اور آپ غم میں ڈوب جاتے (صفحہ ۱۴۷)

حجازی نغمے

از مولانا حکیم عبدالشکور شاکر گیاوی
صفحات ۶۴، قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے
پتہ شاکر گیاوی مہاری شاپ بٹو پور بازار، جمشید پور ۱
یہ حمد ونعت اور ملی نظموں کا مجموعہ ہے پوری کتاب میں اصلاحی اور اسلامی نظمیں شامل ہیں۔

احکام الجمعہ
از مولانا عبدالرحیم بڈیڈوی
صفحات ۵۶، قیمت ایک روپیہ
پتہ: مدرسہ احیاء العلوم، بڈیڈ، ضلع گوڑگاؤں (براستہ پونا ہانا)

اس کتاب میں جمعہ اور نماز جمعہ کے مسائل پر مفصل بحث کی گئی ہے اور حضرات مفتیان عظام کے فتاوی شامل کر دیے ہیں۔ آغاز کتاب میں مولانا محمد میاں صاحب مرحوم کی رائے حسب ذیل الفاظ میں درج ہے:

"احقر محمد میاں نے یہ رسالہ پڑھا۔ مولانا عبدالرحیم صاحب (بڈیڈوی) نے جس جذبہ سے یہ رسالہ لکھا ہے وہ قابل قدر ہے جو باتیں اس میں لکھی گئی ہیں ان کے حوالے درج ہیں جو صحیح ہیں اللہ تعالیٰ مولانا کی محنت اور لگن کو قبول فرمائے اور اس کے بہتر نتائج ظاہر ہوں۔"

الاستغفارات المنقذة من النار
باہتمام مولانا محمد سراج الدین گنگوری
صفحات ۴۹، قیمت ۲/۵۰ روپے
پتہ: مدرسہ رحیمیہ اسلامیہ عربیہ، درگاہ صاحب خان پیر، قصبہ پہاڑی، ضلع بھرت پور، راجستھان

اس کتاب میں توبہ، استغفار کے فضائل اور ہفتہ کی سات منزلیں درج ہیں۔ یہ کتاب مدت سے نایاب تھی، مولف نے کوشش کر کے اس کو حاصل کیا اور اس کو عمدہ کتابت اور آفسیٹ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر مسلمہ خانم

آپ کو ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہوگی

ایک شخص نے ایک دیہاتی آدمی کو دیکھا ساٹھ سال سے زیادہ عمر ہونے کے باوجود وہ خوب تندرست اور سرگرم دکھائی دیتا تھا "آپ کی صحت کا راز کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔ دیہاتی کا جواب یہ تھا:

"میرے من میں جب بھی ایسا ہوتا ہے کہ کھاؤں یا نہ کھاؤں تو میں ہمیشہ نہ کھاؤں کو ترجیح دیتا ہوں۔"

یہ بات جو ایک دیہاتی ان پڑھ نے بتائی، یہی بات سقراط نے ان لفظوں میں کہی تھی "اس وقت تک نہ کھاؤ جب تک تم بھوک سے بے تاب نہ ہو جاؤ۔"

غذا ہی میں انسان کی طاقت ہے مگر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ غذا ہی آدمی کی ساری بیماریوں کی جڑ ہے۔ غلط خوراک یا ناقص خوراک جتنی مضر ہے اتنی ہی مضر یہ بات بھی ہے کہ آدمی بھوک کے بغیر کھائے یا ضرورت سے زیادہ اپنے پیٹ کو بھرے۔ صحت کا راز ایک لفظ میں صرف یہ ہے:

"صحیح خوراک معتدل مقدار میں"

اگر آدمی صرف اس ایک اصول کو پوری طرح پکڑ لے تو اس کو زندگی بھر ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہوگی۔

Single Copy Rs. 2.00

Regd. No. D(D) 687
[illegible]

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI 6 (India)

محمد احمد پرنٹر پبلشر مسئول نے جے۔ کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ "جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی" سے شائع کیا

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحیدالدین خاں

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI 6

اسلام کی دعوت کیا ہے، آخرت کی چیتاونی۔ یہ قبر کے اُس پار کے معاملات سے قبر کے اِس پار والوں کو باخبر کرنا ہے۔ اسلام کا داعی موت اور زندگی کے درمیان کھڑا ہوتا ہے، اس کو موت سے پہلے مرجانا پڑتا ہے۔ تاکہ وہ دوسری طرف کی دنیا کو دیکھے اور مُردوں کے احوال سے زندوں کو مطلع کرسکے۔

شمارہ ۱۱
اکتوبر ۱۹۷۷

زرتعاون سالانہ ۲۴ روپے
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی

قیمت فی پرچہ
دو روپے

دعا یا کرتب

ایک شخص حکومت کے کسی شعبہ میں جگہ حاصل کرنے کے لئے ملازمت کا فارم بھرے تو اس کا نام درخواست ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ ایسا کرے کہ اپنے گھر میں سر نیچے اور پاؤں اوپر کر کے کھڑا ہو جائے اور یہ یقین کرے کہ اسی حال میں سات دن رہوں گا تو مجھ کو ملازمت مل جائے گی، تو یہ کرتب ہے۔ درخواست دینا ایک بالکل معقول بات ہے۔ مگر کرتب اتنی ہی بے معنی چیز ہے۔

اسی طرح خدا سے مانگنے میں بھی ایک دعا کا طریقہ ہے اور دوسرا کرتب کا طریقہ۔ دعا یہ ہے کہ آدمی اپنے حاجات و مسائل میں خدا کی طرف رجوع کرے، اس سے روئے گڑگڑائے، اس سے حاجت روائی کی درخواست کرے۔ یہ عین مطلوب ہے۔ حدیث میں ہے کہ جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو اس کو بھی خدا سے مانگو۔

مگر کچھ لوگوں نے اسی کے ساتھ کرتب کے کچھ طریقے نکال رکھے ہیں —— فلاں لفظ اتنی بار دہرا دو تو بلا ٹل جائے گی، فلاں وقت میں فلاں عمل کرلو تو حاجات پوری ہو جائیں گی۔ فلاں نقش کاغذ پر لکھ کر اتنے دن تک باندھے رہو تو دشمن ختم ہو جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کرتب ہیں۔ دعا (اللہ کو پکارنا) جتنا بامعنی ہے، کرتب (عملیات) کے طریقے اتنے ہی بے معنی ہیں۔ پہلا عین اسلامی ہے اور دوسرا قطعاً غیر اسلامی۔

فہرست

دعا یا کرتب ۲
منفی تدبیروں سے مثبت نتیجہ نہیں نکلتا ۴
جب مادی حالات کے اندر روحانی دعائیں نکلنے لگیں ۶
حق بے آمیز شکل میں ۷
شریعت کے نفاذ کا نیا رجحان ۸
موجودہ مسیحی مذہب ۱۰
معلومات نہیں، ذہنی رجحان ۱۱
کیسا ہیبت ناک دن ۱۲
خدا انسانی فطرت کی آواز ۱۳
ناموافق حالات ترقی کا زینہ ۱۶
قرآن کا مطلوب انسان ۱۷
صنعتی نظام کا تضاد ۲۸
نادانی کی چھلانگ ۲۹
تاریخ کو انتظار ہے ۳۰
نصرت الٰہی کا اصول (الاسلام) ۳۳
آدم سے مسیح تک ۳۵
نبوت محمدی کا ظہور ۳۸
بائبل کی پیشین گوئیاں ۴۱
ڈاکٹر تارا چند ۴۹
خاتون اسلام ۵۰
کام میں انہماک ۵۱
آپ بیتی ۵۲
جب ذہن الٹی طرف کام کرنے لگیں ۵۳
حال کے اندر مستقبل کو دیکھئے ۵۴
روداد سفر ۵۵
تعارف و تبصرہ ۵۸

اداریہ

دورِ جدید کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مسلمانوں نے جو نقصان اٹھایا ہے، ان میں سے ایک نقصان اردو زبان کا ابھی تک بے ٹائپ ہونا ہے۔ دنیا کی تمام قابلِ ذکر زبانوں کے ٹائپ بن چکے ہیں۔ حتیٰ کہ خود ایران، جس سے ہم نے "فارسی رسم الخط" کو لیا ہے، اس نے بھی اپنے خط کو ٹائپ کی صورت میں ڈھال لیا۔ مگر برصغیر ہند کے مسلمان اپنی آفاقی فتوحات میں اتنے مشغول رہے کہ ان کو زمین پر کوئی تعمیری کام کرنے کی فرصت ہی نہ ملی۔

ٹائپ صنعتی دور کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ ٹائپ کا مطلب ایک آرٹسٹ کے عمل کو کروڑوں سے ضرب دینا ہے۔ مگر مسلمان دستکاری دور سے اوپر اٹھ کر سوچ نہ سکے۔ قدیم ترین زمانہ سے کتابت ایک شخصی فن کی حیثیت سے معروف چلا آرہا تھا۔ کتابت یا خوش نویسی کا مطلب یہ تھا کہ ایک آدمی برسہا برس کی محنت سے لکھنے کی مہارت حاصل کرے اور اس مہارت کو اپنی انگلیوں کے ذریعہ کاغذ پر منتقل کرے۔

مگر صنعتی علم نے بتایا کہ فن کار کے دستی عمل کو دھات کے ٹائپ کی شکل میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ اس طرح ایک فن کار کے عمل کے کروروں نقش تیار ہو جائیں گے اور جو قلم ایک وقت میں صرف ایک حرف لکھ سکتا تھا، وہ مشینی ضرب پاکر کروروں حروف بنا ڈالے گا۔

مگر مسلمان، دوسرے نئے امور کی طرح فن کتابت میں بھی، بدستور "دستکاری" ذہن سے سوچتے رہے اس سے باہر آکر جدید حقائق کا اندازہ نہ کرسکے۔ وہ جدید زمانہ میں قدیم دور کے کمالات دکھاتے رہے جس وقت ہم اپنے خوش نویسوں کو "آفتاب رقم" اور "اعجاز خطاطی" کے خطابات دے رہے تھے، ٹھیک اسی وقت بقیہ دنیا اپنے خوش نویسوں سے حروف کے نمونے لکھوا کر ان کو ٹائپ کی صورت میں ڈھال رہی تھی۔ اس طرح انھوں نے نہ صرف خوش نویسی کے عمل کو دائمی طور پر محفوظ کرلیا بلکہ اپنے کو اس قابل بنالیا کہ ایک خوش نویس کا قلم بیک وقت بے شمار کتابوں کی "کتابت" انجام دے سکے۔ ہم خوش نویسوں کی وصلیوں کی نمائش میں لگے رہے، جب کہ دوسری قوموں نے اپنے خوش نویسوں کے فن کو مستقل حیثیت سے محفوظ کرلیا۔

ہماری تمنا ہے کہ اگر حالات موافقت کریں تو ہم اردو زبان میں عربی ٹائپ کا رواج شروع کردیں جس طرح ایران نے عربی ٹائپ کو اپنے لئے اختیار کرلیا ہے۔ اس کے لئے اپنا مکمل پریس قائم کرنا ضروری ہوگا کیونکہ بازار میں ایسے عربی پریس موجود نہیں ہیں جن سے کام کرایا جاسکے۔ خدا جلد وہ دن لائے جب کہ الرسالہ ٹائپ میں چھپنا شروع ہو جائے اور اسی کے ساتھ اس کا عربی ایڈیشن بھی۔

عربی ٹائپ کو اردو میں اختیار کرنے کی بات ہوتی ہے تو اکثر لوگ فوراً یہ کہہ دیتے ہیں کہ ٹائپ کے ذریعہ چھپائی مہنگی پڑے گی۔ موجودہ حالت میں یہ بات صحیح ہے۔ مگر اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس وقت اردو میں ٹائپ کی عمومی سہولتیں حاصل نہیں ہیں۔ اگر کثرت سے اردو کے ٹائپ پریس قائم ہو جائیں تو ٹائپ کی چھپائی یقینی طور پر سستی اور آسان ہو جائے گی۔

رواجِ عام کے بعد وہی چیز بالکل معمولی ہو جاتی ہے جو ابتدا میں نہایت مشکل دکھائی دیتی تھی۔

شیشم کے بیج سے شیشم کا تناور درخت تیار ہوتا ہے،
اگرچہ سو سال بعد۔ اس کے برعکس ککڑی کے بیج سے وقتی بیل ہی اُگے گی،
خواہ ہزار برس تک اس کا بیج زمین میں بکھیرا جاتا رہے،

منفی تدبیروں سے کبھی مثبت نتیجہ نہیں نکل سکتا

۱۹۴۵ کی ایک شام تھی۔ میں شہر میں اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں سڑک پر مسلمانوں کا ایک جلوس ظاہر ہوا۔ مقرر لاؤڈ اسپیکر پر بولتا: "پاکستان کا مطلب کیا"۔ مجمع متحدہ آواز سے جواب دیتا: "لا الٰہ الا اللہ"۔ یہ سیاست اپنے تمام خوش نما نعروں کے ساتھ ۳۰ برس پہلے ختم ہوگئی۔ مگر عجیب بات ہے کہ ہمارے رہنما آج بھی اسی فکری سطح پر ہیں جہاں ان کے پیش رو نصف صدی قبل تھے۔ آج بھی وہ ایک مفروضہ دشمن کے ختم کرنے کو اسلام کے احیاء کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ آج بھی بدلے ہوئے الفاظ کے ساتھ وہی نعرہ لگ رہا ہے: پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ۔

۱۹۴۷ سے پہلے برصغیر ہند کے مسلمان سیاسی آتش فشاں بنے ہوئے تھے۔ مذہبی رہنماؤں سے لے کر سیکولر لیڈروں تک ہر ایک یہ یقین کئے ہوئے تھا کہ سارا مسئلہ اکثریتی فرقہ کے سیاسی غلبہ سے نجات حاصل کرنے کا ہے۔ جغرافی تقسیم اس مسئلہ کو حل کر دے گی۔ اور اس کے بعد اسلام اپنی ماضی کی تمام عظمتوں کے ساتھ زندہ ہو جائے گا۔

مگر اسلام کو دوبارہ زندہ کرنا ایک نئی تاریخ کو وجود میں لانا تھا۔ اور اس طرح کے جذباتی ہنگاموں اور سطحی خوش فہمیوں سے کبھی تاریخیں نہیں بنتیں۔ منفی کوششوں سے مثبت نتائج برآمد نہیں ہو سکتے تھے۔ بے حساب قربانیوں کے ذریعہ وجود میں آنے والا پاکستان اس امید کو پورا نہ کر سکا۔

اب ہمارے رہنماؤں نے ایک اور نام تلاش کر لیا جس کو مملکت خداداد میں اسلامی سپنوں کے پورا نہ ہونے کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکے۔ یہ مسلم لیگ تھی جس کو پاکستان بننے کے بعد وہاں کا اقتدار مل گیا تھا۔ اسلام کی راہ میں اس دوسری رکاوٹ کو دور کرنے کی جدوجہد شروع ہوگئی۔ پہلے اکثریتی فرقہ کو اقتدار کے مقام سے ہٹانا لا الٰہ الا اللہ کو ظہور میں لانے کے ہم معنی تھا۔ اب مسلم لیگی اقتدار کا خاتمہ اور اسلام کا احیاء دونوں ہم معنی قرار پا گئے۔ لمبی اکھیڑ پچھاڑ کے بعد یہ نشانہ بھی پورا ہوا۔ اور ۱۹۵۸ میں مسلم لیگی اقتدار ہمیشہ کے لئے پاکستان سے ختم ہوگیا۔ مگر اس کے بعد کرسی پر جس کو جگہ ملی وہ فیلڈ مارشل ایوب خاں تھے۔

اسلام کے احیاء کا خواب اب بھی بے تعبیر تھا۔ تاہم اسلام اور مایوسی دونوں یک جا نہیں ہو سکتے تھے۔ بہت جلد دریافت کر لیا گیا کہ اسلام کے قیام کی راہ میں

اصل رکاوٹ فیلڈ مارشل ایوب خاں کا اقتدار ہے۔ اس کو اگر کسی طرح ہٹا دیا جائے تو اس کے بعد جو چیز برآمد ہوگی، وہ یقینی طور پر اسلام ہوگا۔ اب اسلامی جہاد کا تیسرا دور شروع ہوا۔ اگرچہ اس مقدس جہاد میں خود ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ تاہم نشانہ پورا ہوا، اور ایوب خاں کو کرسی چھوڑنی پڑی۔ مگر اب بھی نفی سے اثبات برآمد نہیں ہوا۔ ۱۹۷۱ میں اس مقدس جہاد کا آخری سیاسی نتیجہ نکلا تو لوگوں نے حیرت انگیز طور پر دیکھا کہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو تخت سلطنت پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

تاہم مجاہدین اسلام ہمت ہارنے والے نہ تھے۔ انھوں نے آواز لگائی: ایک کوشش اور کرو اور بھٹو کو اقتدار سے ہٹا دو۔ اس کے بعد اسلام کے سوا کسی کے لئے اس ملک میں جگہ نہ ہوگی۔ اب چوتھا اسلامی جہاد شروع ہوگیا۔ مگر ۷ مارچ ۱۹۷۷ کے الکشن سے جو فیصلہ برآمد ہوا، اس نے دوبارہ مسٹر بھٹو کے سر پر سیاسی تاج کو برقرار رکھا۔

اب معاملہ ناقابل برداشت تھا۔ مجاہدین اسلام کے لئے ممکن نہ رہا کہ وہ اگلے انتخاب کی رسمی مدت کا انتظار کریں۔ انھوں نے فوراً ہی براہ راست نعرہ لگا دیا: "بھٹو تخت چھوڑ دو"، سارے ملک میں آگ لگا دی گئی۔ اربوں روپے کے نقصانات کی قیمت ادا کرنے کے بعد بالآخر ۵ جولائی ۱۹۷۷ کے سورج نے یہ خبر دی کہ اسلام دشمن بھٹو کو تخت سلطنت سے معزول کر دیا گیا ہے تاہم اصل مسئلہ اب بھی بدستور قائم تھا "مولانا اسلام" کی جگہ "مسٹر جنرل" نے پاکستان کے اقتدار کی کرسی پر قبضہ کر لیا تھا۔

اب تازہ ترین صورت حال یہ ہے کہ پاکستان کے مجاہدین اسلام خوشیاں منا رہے ہیں۔ ان کے نزدیک پاکستان کا اسلامی قافلہ، اپنی پانچویں چھلانگ کے بعد، بالآخر منزل کے کنارے پہنچ چکا ہے۔ "۱۸ اکتوبر" کا طلسماتی لفظ اب ان کی امیدوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اس تاریخ کو جس انتخاب کے انعقاد کا اعلان جنرل ضیاء الحق کی طرف سے کیا گیا ہے، وہ ان کے نزدیک پاکستان میں اسلام کی تاج پوشی کی محض ایک رسمی کارروائی ہوگی۔ اس قسم کے سیاسی معجزہ سے کون مسلمان خوش نہیں ہوگا۔ مگر راقم الحروف کو اعتراف ہے کہ اس مسرت میں شریک ہونے کے لئے خوش فہمیوں کی جو بھاری مقدار مطلوب ہے، بدقسمتی سے وہ مجھ کو حاصل نہیں۔

وحید الدین — ۸ ستمبر ۱۹۷۷

جب مادی حالات کے اندر بھی روحانی دعائیں نکلنے لگیں

حضرت موسیٰؑ پر قتل کا الزام عائد کر کے جب مصری سرداروں نے مشورہ کیا کہ انھیں ہلاک کر دیں، تو آنجناب مصر سے مدین چلے گئے۔ مدین اس زمانہ میں، خلیج عقبہ کے مشرقی اور مغربی کناروں پر واقع علاقہ کو کہا جاتا تھا جہاں بنی مدیان آباد تھے۔ یہ مقام فرعونِ مصر کی سلطنت سے باہر تھا۔ اس لئے حضرت موسیٰؑ نے مصر سے نکل کر مدین کا رخ کیا۔

قرآن پاک میں ہے کہ جب آپ خوف اور اندیشہ کی حالت میں سفر کر رہے تھے تو اللہ کو یاد کرتے ہوئے آپ کی زبان سے یہ کلمہ نکلا:

عَسٰی رَبِّیْٓ اَنْ یَّھْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ (قصص۔۲۲) امید ہے کہ میرا رب مجھے ٹھیک راستہ کی طرف رہنمائی کرے گا۔

بعض مفسرین قرآن نے اس کو محض راستہ کی تلاش کے معنی میں لیا ہے۔ ایک مفسر اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یعنی ایسے راستہ پر جس سے میں بخیریت مدین پہنچ جاؤں"

یہ الفاظ اس کیفیت کی ترجمانی کے لئے بہت ناقص ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے دل میں پیدا ہوئی تھی، یہ ایک مومنانہ کلمہ ہے نہ کہ عام معنوں میں محض ایک راستہ کے مسافر کی دعا۔ حضرت موسیٰؑ کو اگرچہ مادی حالات نے مصر سے نکال کر مدین کے راستہ پر ڈالا تھا، مگر بندہ مومن کا یہ حال ہوتا ہے کہ مادی واقعات کے اندر بھی اس کی زبان سے روحانی دعائیں نکلتی ہیں۔ بظاہر وہ اسی زمین میں راستہ تلاش کر رہا ہوتا ہے مگر زمین میں راستہ کی تلاش اس کے لئے دوسری دنیا کی یاد دہانی بن جاتی ہے، وہ اس کے ذہن کو آخرت کی وادیوں میں پہنچا دیتی ہے۔ اس کے قدم دنیوی منزل کی طرف چل رہے ہوتے ہیں، مگر اس کے اندر کا طوفان پکار رہا ہوتا ہے —— "خدایا! مجھے وہاں پہنچا دے جہاں میں تجھ کو پا سکوں۔ کیوں کہ انسان کی حقیقی منزل وہی ہے"

حضرت موسیٰؑ کا یہ کلمہ ایک نازک ایمانی کیفیت کا کلمہ ہے۔ اس کو سفر اور جغرافیہ کے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

جو لوگ حقیقی معنوں میں اپنے رب کو پا لیں، ان کے جینے کی سطح بالکل دوسری ہو جاتی ہے۔ وہ موجودہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی آخرت کی فضاؤں میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہ آج کی لذتوں اور تلخیوں کو دیکھتے ہوئے کل کے جنت اور جہنم کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ مومن حقیقت میں وہی ہے جو دنیا میں آخرت کے عالم کو دیکھ لے۔ جو حالتِ غیب میں رہتے ہوئے حالتِ شہود میں پہنچ جائے۔ غیر مومن پر بھی وہ دن آئے گا جب کہ وہ عالمِ آخرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ مگر یہ اس وقت ہوگا جب کہ غیب و شہود کا فرق مٹ چکا ہوگا۔ جب قیامت کی چنگھاڑ سارے پردوں کو پھاڑ دے گی۔ مگر اس وقت کا دیکھنا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔ کیونکہ وہ بدلہ پانے کا وقت ہوگا نہ کہ ایمان و یقین کا ثبوت دینے کا۔

پیغمبر اسلام نے جب حق کو بے آمیز شکل میں پیش کیا تو آپ کے معاصرین کو محسوس ہوا کہ آپ ان کے بزرگوں کی تحقیر کر رہے ہیں۔ ان کے لئے یہ یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ قبیلۂ قریش کا ایک معمولی آدمی ایسی سچائی کا جاننے والا ہو سکتا ہے جو ان شخصیتوں کو حاصل نہیں ہوئی جن کو اپنے روایتی اعتقاد کے مطابق وہ اونچا مذہبی مقام دیئے ہوئے تھے۔

عمرو بن مرۃ الجہنی رضی اللہ عنہ نے مدنی دور میں اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد وہ اپنے قبیلہ جہینہ میں واپس آئے اور ان کو اسلام کی طرف دعوت دی۔ ابن عساکر کی روایت کے مطابق اس کے بعد قبیلہ کا ایک شخص اٹھا اور اس نے کہا:

یا عمرو بن مرۃ! امر اللہ عیشک، اتامرنا برفض آلھتنا وان نفرق جمعنا وان نخالف دین آبائنا الشیم العلی۔ الی مایدعونا الیہ ھذا القرشی من اھل تہامۃ؟ لاحبا ولا کرامۃ، ثم انشأ:

ان ابن مرۃ قد اتی بمقالۃ   لیست مقالۃ من یرید صلاحا

انی لاحسب قولہ وفعالہ   یوما وان طال الزمان ذباحا

لیسفہ الاشیاخ ممن قد مضی   من رام ذلک لا اصاب فلاحا

اے عمرو بن مرۃ! خدا تیری زندگی تلخ کر دے، کیا تو ہم کو ہمارے معبودوں کو چھوڑنے کا حکم دے رہا ہے۔ اور یہ کہ ہم اپنی جمعیت کو منتشر کر دیں اور اپنے باپ دادا کے دین کی مخالفت کریں جو اعلیٰ اخلاق پر تھے۔ یہ تہامہ کا رہنے والا قریشی ہمیں کس چیز کی طرف بلاتا ہے، اس میں نہ کوئی شرافت ہے نہ کرامت ——

پھر اس نے یہ اشعار پڑھے:۔

عمرو بن مرۃ ایک ایسی بات لے کر آیا ہے جو صلاح پسند لوگوں جیسی بات نہیں۔ میرا یقین ہے کہ اس کا قول و فعل ایک دن مہلک ثابت ہوگا خواہ اس میں کچھ دیر لگ جائے۔ وہ ہمارے گزرے ہوئے اسلاف کو احمق ثابت کرنا چاہتا ہے اور جس کا ایسا ارادہ ہو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

شریعت کے نفاذ کا نیا رجحان

Islamic World Enforces Shariat To Fight Crime & Uphold Morality

الجزائر کے مشہور عالم اور مفکر مالک بن نبی (۱۹۷۳ – ۱۹۰۵) کی تمام تصنیفات فرانسیسی زبان میں ہیں کیوں کہ وہ اپنی مادری زبان (عربی) میں عمدہ اظہار خیال پر قادر نہ تھے۔ یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پچھلی صدیوں میں مسلم ممالک پر مغربی قوموں کے غلبہ نے کس طرح حالات کو بدل ڈالا تھا۔ سترھویں صدی میں پرتگالی عالم اسلام کے ساحلی علاقوں پر قابض ہو گئے۔ ہالینڈ نے جزائر شرق الہند پر غلبہ حاصل کر لیا۔ انیسویں صدی تک تقریباً تمام اسلامی دنیا مغربی قوموں کے قبضہ میں جا چکی تھی۔ ۲۰ ویں صدی کے آغاز میں عثمانی خلافت کے سقوط کے بعد یہ عمل اپنی آخری انتہا کو پہنچ گیا۔

عالم اسلام پر مغرب کا یہ غلبہ ایک ہمہ گیر غلبہ تھا جس نے زبان، تہذیب، طرز معیشت ہر چیز کو بدلنا شروع کر دیا۔ اس کی زد قانون پر بھی پڑی۔ ہندستان میں ۱۷۹۱ تک چور کا ہاتھ کاٹا جاتا تھا۔ مگر انگریزوں نے اولاً متوازی عدالتیں قائم کیں اور بالآخر انیسویں صدی کے وسط تک تمام سابق قوانین کو بدل دیا گیا۔ صرف نکاح و طلاق جیسے معاملات شخصی قانون کی حیثیت سے باقی رہ گئے۔ اسی طرح مصر میں ابتداءً "المحاکم المختلطہ" قائم کی گئیں۔ ۱۸۸۲ء میں جب انگریز مصر کے اوپر قابض ہوئے تو بہت جلد انھوں نے شخصی احوال کو چھوڑ کر تمام امور میں مغربی قانون کو رائج کر دیا۔ یہی صورت کم و بیش دوسرے مسلم ممالک میں پیش آئی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد مغرب کا سیاسی اقتدار ختم ہو گیا۔ تاہم صورت حال میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوا۔ کیونکہ مغرب کا اقتصادی غلبہ شدید تر شکل میں مسلم ملکوں کے اوپر موجود تھا، جو اگر براہ راست نہیں تو بالواسطہ طور پر، اسلامی شریعت کے احیاء میں مانع تھا۔

پچھلے دس برسوں میں صورت حال میں غیر معمولی تبدیلی آئی ہے۔ پٹرول کی قدرتی دولت نے اکثر مسلم ملکوں کو اس حد تک مالا مال کر دیا ہے کہ اب انھیں کسی کے چشم و ابرو کی طرف دیکھنے ضرورت باقی نہیں۔ بلکہ خود مغربی دنیا اپنی ادائگیوں کے توازن کو برقرار رکھنے کے لئے مسلم ملکوں کی محتاج ہو گئی ہے۔ اس صورت حال نے مسلم اقوام میں خود اعتمادی کا نیا رجحان پیدا کر دیا ہے۔ وہ دباؤ اور مرعوبیت کے دور سے نکل کر نئے بھروسہ کے ساتھ اپنے مذہب اور تہذیب کی طرف دیکھنے لگے ہیں۔ اس نئی صورت حال کے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت کے حامیوں میں نیا حوصلہ پیدا ہو گیا ہے۔ اکثر ملکوں میں اسلامی قانون کو دوبارہ زندہ کرنے کے چرچے ہو رہے ہیں۔ اسلامی قانون کے نفاذ کی خبریں عالمی اخبارات کی سرخیوں میں جگہ پانے لگی ہیں۔ ایک امریکی میگزین (ٹائم) نے سعودی عرب کی ایک تصویر چھاپی ہے جس میں چوری کے جرم میں ایک شخص کا ہاتھ کاٹا جا رہا ہے۔ قطع ید کے قرآنی حکم کو

نقل کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

THIS STERN INJUNCTION WAS ENUNCIATED BY THE PROPHET MOHAMMAD SOME 1,300 YEARS AGO TO HIS FOLLOWERS IN A PRIMITIVE DESERT SOCIETY. NOW AFTER CENTURIES OF BEING SUPERCEDED BY WESTERN LAW THE EXACTING CODE OF THE KORAN IS ONCE MORE GAINING STRENGTH AND SUPPORT IN A NUMBER OF COUNTRIES.

Time, July 25, 1977

یہ سخت حکم پیغمبر اسلام نے ۱۳ سو سال پہلے اپنے پیرووں کے سامنے ایک ابتدائی صحرائی سماج میں پیش کیا تھا۔ اب، صدیوں تک مغربی قانون سے دبے رہنے کے بعد، قرآن کا قانون دوبارہ مختلف اسلامی ملکوں میں زور پکڑ رہا ہے۔

اسی طرح رائٹر نے ایک خبر نشر کرتے ہوئے کہا ہے:

A TREND IS GROWING IN THE ISLAMIC WORLD TOWARDS TIGHTENING MORALITY AND DISCOURAGING CRIME BY THE REINFORCEMENT OF THE SHARIAT FORMULATED 1,400 YEARS AGO.

Times of India, August 15, 1977

اسلامی ملکوں میں یہ رجحان بڑھ رہا ہے کہ ۱۴ سو سالہ شریعت کے قانون کو نافذ کرکے جرائم کا خاتمہ کیا جائے اور اخلاقی فضا پیدا کی جائے۔

شرق اوسط کی پانچ عرب ریاستوں۔ سعودی عرب، قطر، عُمان، لیبیا، شمالی یمن ۔ کے قانون کی بنیاد قرآن پر ہے۔ مصر، جہاں مغربی تہذیب کا غلبہ ہے، وہاں بھی ایک پارلیمنٹری کمیشن اس مقصد کے لئے مقرر کیا گیا ہے کہ اسلام کی بنیاد پر ایک نیا قانون مرتب کرے۔ اس کے مطابق، دوسرے جرائم کے ساتھ، ارتداد کی سزا قتل ہوگی۔ الاہرام نے خبر دی ہے کہ عنقریب مصر میں قطع ید کی سزا نافذ ہو جائے گی۔ پاکستان کی فوجی حکومت نے بھی اپنے ملک میں متعدد شرعی قوانین نافذ کئے ہیں جن میں ہاتھ کاٹنا اور سرعام کوڑے مارنا کی سزائیں شامل ہیں۔ جنرل ضیاء الحق نے کہا ہے کہ ہاتھ کاٹنے کے لئے سن کرنے والی دوائیں استعمال ہوں گی۔ ٹائم لکھتا ہے:

THE THREAT WAS APPARENTLY SUFFICIENT TO CAUSE A SHARP DROP IN CRIME

اس قسم کی سزاؤں کا اندیشہ بظاہر جرائم میں زبردست کمی کرنے کے لئے بالکل کافی ہے۔

پاکستان کی طرح کویت اور عرب امارات متحدہ میں بھی قانون اسلامی کا نفاذ کیا جا رہا ہے۔ کویت نے سور کے گوشت کی تجارت بالکل بند کر دی ہے۔ یہ مطالبہ زور پکڑ رہا ہے کہ کویت یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا جائے۔ سعودی عرب میں نماز کے وقت دکان دار اپنی دکانیں کھلی چھوڑ کر مسجد میں نماز ادا کرنے کے لئے چلے جاتے ہیں۔ مگر کوئی شخص دکان کی کوئی چیز اٹھانے کی ہمت نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کی قیمت بہت مہنگی ہے ۔ اپنے ہاتھ سے ہمیشہ کے لئے محرومی۔ سعودی عرب میں جرائم کی شرح سب سے کم ہے۔

کتے کی خصلت	کتا جب کسی کو نہتا دیکھتا ہے تو بھونکتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں لاٹھی ہے تو دم دبا کر بھاگ جاتا ہے ۔

موجودہ مسیحی مذہب —

اکثر مذاہب میں یہ غلطی ہوئی ہے کہ بعد کے دور میں وہ ان علوم کے ہم معنی ہو کر رہ گئے جو ان کے بعد کے بزرگوں نے وضع کئے تھے۔ مثال کے طور پر موجودہ یہودیت اپنی بعد کی پیداشدہ فقہ کا نام ہے اور مسیحیت بعد کے پیداشدہ علم کلام کا۔

نئے عہدنامہ میں چار انجیلیں ہیں جن میں حضرت مسیح کے اقوال و احوال درج ہیں۔ اگرچہ تاریخی اعتبار سے ان کی صحت مشکوک ہے۔ تاہم موجودہ مسیحیت ان انجیلوں سے زیادہ سینٹ پال کے وضع کردہ نظریات پر مبنی ہے۔ ایک محقق نے لکھا ہے:

IN THE EFFECTIVE SENSE PAUL, RATHER JESUS, WAS THE FOUNDER OF CHRISTIANITY

Rationalist Encyclopedia, Page 437

زیادہ صحیح معنی میں، سینٹ پال نہ کہ حضرت عیسیٰ، مسیحی مذہب کے بانی ہیں

اسپنوزا نے کہا تھا: "اس دنیا میں صرف ایک مسیحی تھا اور وہ صلیب پر چڑھا دیا گیا۔" جب ایک خالی الذہن آدمی نیا عہدنامہ پڑھتا ہے تو وہ حیرت انگیز طور پر اس کے اندر اس بیان کی تصدیق پاتا ہے نئے عہدنامہ کے ابتدائی چار ابواب جو حضرت مسیح کے حالات و اقوال کا ریکارڈ ہیں، ان میں کہیں بھی ان عقاید کا کوئی ذکر نہیں جن کے مجموعہ کا نام نیقیا کونسل (۳۲۵) کے اعلان کے مطابق مسیحیت ہے۔ کفارہ کا عقیدہ جو گویا کل مسیحیت ہے اس کو پہلی بار سینٹ پال نے وضع کیا جس نے حضرت مسیح کو دیکھا بھی نہ تھا۔ تثلیث خود سینٹ پال کے یہاں بھی نہیں وہ ترتولین (۲۳۰—۱۵۰) کی ایجاد ہے۔ اسی طرح دوسرے عقائد۔ اس کے بعد صرف حضرت مسیح کے بارہ ساتھی یا شاگرد رہ جاتے ہیں جن کو سچا مسیحی کہا جا سکے۔ مگر خود کتاب مقدس کے مطابق جب رومی سپاہیوں نے حضرت مسیح کو پکڑا تو "سب شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گئے"۔ (مرقس، ۱۴: ۵۰)

انجیل یا نیا عہدنامہ باعتبار ترتیب ۲۷ کتابوں پر مشتمل ہے۔ مگر "انجیل مقدس" کا لفظ حقیقتہً صرف ابتدائی چار کتابوں پر صادق آتا ہے جو متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی مرتب کی ہوئی ہیں اور جن میں حضرت مسیح کے حالات و اقوال درج ہیں۔ دوسری ۲۳ کتابیں بعد کے مسیحی بزرگوں کے خطوط یا ان کے مکاشفات و احوال پر مبنی ہیں۔

کتاب مقدس کا ایک طالب علم سب سے پہلے یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ مجلد کتاب جو "انجیل مقدس" کے نام سے آج اس کے ہاتھوں میں ہے وہ کب اور کس زبان میں لکھی گئی۔ مگر اس کی کوئی تاریخ قطعیت کے ساتھ بتائی نہیں جا سکتی۔

قدرت کا سبق

گیس نیچے نہیں سماتی تو اوپر اٹھ کر اپنے لئے جگہ حاصل کر لیتی ہے۔ پانی کو اونچائی آگے بڑھنے نہیں دیتی تو وہ نشیب کی طرف بہہ کر اپنا راستہ بنا لیتا ہے۔ درخت سطح کے اوپر قائم نہیں ہو سکتا تو وہ زمین پھاڑ کر اس سے اپنے لئے زندگی کا حق وصول کرتا ہے۔

معلومات نہیں، ذہنی رجحان

نوبل پرائز کا حصول، سائنس کی دنیا میں، اعلیٰ ترین کارکردگی کا ایک مسلمہ معیار سمجھا جاتا ہے۔ یہ انعام کیسے کسی کو حاصل ہوتا ہے۔ کیمسٹری کے نوبل انعام یافتہ ایچ۔ اے۔ کریبز (H.A. KREBS) نے اس کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اعلیٰ سائنس داں بننے کے لئے اعلیٰ سازوسامان والی لیبارٹریوں اور جدید ترین لٹریچر پر مشتمل لائبریریوں سے بھی کہیں زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ کچھ مدت کے لئے کسی بڑی سائنسی شخصیت کی صحبت و رفاقت میسر آجائے۔ "اگر مجھے اپنی جوانی کے ابتدائی چار سال" وہ لکھتا ہے "آٹو واربرگ (OTTO WARBURG) جیسے سائنس داں کی رفاقت میسر نہ آتی تو میرے اندر سائنس کا صحیح ذوق پیدا ہونا محال تھا"

کریبز مختلف بڑے بڑے سائنس دانوں کے اقوال پیش کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ اعلیٰ سائنس دانوں کی صحبت جو بڑی چیز کسی کو دیتی ہے وہ سائنسی حقائق اور سائنسی طریقوں کے بارے میں معلومات کا انبار نہیں ہے۔ یہ دونوں چیزیں تو ہر جگہ سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ جو بات حقیقی فرق پیدا کرتی ہے، وہ دراصل فیضانِ نظر ہے جسے استاد اپنے شاگرد میں منتقل کرتا ہے۔ یہی فیضانِ نظر، جس کو وہ عمومی سائنسی روح (GENERAL SCIENTIFIC SPIRIT) کا نام دیتا ہے، کسی شخص کو سچا سکالر بناتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ایک عظیم استاد یا سائنس داں اپنے شاگرد کے ذہن میں حقائق کے بارے میں معلومات سے کہیں زیادہ ایک ذہنی رویہ (ATTITUDE) منتقل کرتا ہے۔ ۔ ۔ اس ذہنی رویہ میں دو باتیں بالخصوص بہت اہم ہیں۔ ایک، عجز (HUMILITY) دوسرا شوق (ENTHUSIASM) (ایگریکلچرل سائنس ریویو)

نمک خواہ ایک ٹن ہو، کوئی چیونٹی اس کے پاس نہیں آئے گی۔ لیکن شکر ایک گرام بھی ہو تو چیونٹیوں کی فوج اس کے گرد جمع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح قوموں کا بھی مزاج ہوتا ہے۔ کوئی قوم "شکر" پسند ہو تو آپ اس کو "نمک" کے گرد اکٹھا نہیں کرسکتے۔

مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ "قوالی" پسند ہو کر رہ گئے ہیں۔ کوئی ایسی ہی چیز انھیں اپنی طرف کھینچتی ہے جس کے ساتھ قوالی کی چاشنی لگی ہوئی ہو ـــــ مذہبی قوالی، سیاسی قوالی یا اور کوئی قوالی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے گلے باز لوگوں کے گرد بہت تیزی سے جمع ہو جاتے ہیں جو خطابت کے دریا بہاتے ہوں، جو اشعار اور قصے سنائیں، جو فضائل اور کرامت کی داستانیں بیان کریں۔ کسی سنجیدہ آواز اور کسی تعمیری دعوت کے گرد وہ کبھی اکٹھا نہیں ہوتے۔

گراوٹ کے اسی مرحلہ کے بارے میں قرآن میں کہا گیا ہے: ان کا حال یہ ہے کہ سیدھا راستہ ان کے سامنے آئے تو اس کو اختیار نہ کریں اور ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اس پر چل پڑیں۔ (اعراف ـ ۱۴۶)

اگر لوگوں کو معلوم ہو کہ کیسا ہیبت ناک دن ان کی طرف دوڑا چلا آ رہا ہے تو ان کے چلتے ہوئے قدم رک جائیں اور ان کے پاس بولنے کے لئے الفاظ نہ رہیں

اس آئینہ میں آپ اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں

خدا کے وفادار بندوں کے مشیر فرشتے ہوتے ہیں اور خدا کے باغیوں کے مشیر شیطان۔ جو آدمی اختلاف کے وقت تواضع اختیار کرے، وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کو یہ توفیق ملی ہے کہ خدا کے فرشتے اس کے مشیر بنیں۔ کیونکہ فرشتوں کی صفت یہ ہے کہ وہ استکبار نہیں کرتے۔

اس کے برعکس جو لوگ اختلاف کے وقت ظلم اور ناانصافی پر اتر آئیں اور متکبرانہ روش اختیار کریں، وہ یہ ثابت کر رہے ہیں کہ انھوں نے شیطان کو اپنا مشیر بنا رکھا ہے۔ کیونکہ قرآن میں گھمنڈ اور سرکشی کو صرف شیطان کی صفت بتلایا گیا ہے

خدا — انسانی فطرت کی آواز ہے

فرانس کی ایک فلم ایکٹرس گائنا لولو برجیڈا (GINA LOLLOBRIGIDA) جنوری ۱۹۷۵ میں ہندستان آئی تھی۔ ایک پریس کانفرنس میں ایک اخباری رپورٹر سے اس کا سوال و جواب یہ تھا:

> TO A QUESTION WHETHER SHE BELIEVED IN GOD, GINA SAID: I BELIEVE IN GOD. I BELIEVE IN GOD, MORE WHEN I AM ON AN AEROPLANE.
>
> Times of India, 3.1.1975

ایک سوال کے جواب میں کہ کیا وہ خدا کو مانتی ہے، گائنا نے کہا: میں خدا کو مانتی ہوں، میں خدا کو مانتی ہوں، اس وقت اور بھی زیادہ جب میں ہوائی جہاز میں ہوتی ہوں۔

آدمی جب ہوائی جہاز میں اڑ رہا ہو تو اس وقت وہ مکمل طور پر ایسے خارجی اسباب کے رحم و کرم پر ہوتا ہے جن کے توازن میں معمولی فرق بھی اس کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے۔ انسان کی یہی بے چارگی سمندری سفروں میں بھی ہوتی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

"کیا تم دیکھتے نہیں کہ کشتی سمندر میں اللہ کے فضل سے چلتی ہے، تاکہ وہ تمہیں اپنی قدرتیں دکھائے۔ درحقیقت اس میں نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لئے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو۔ اور جب سمندر میں ان لوگوں کو موجیں بدلیوں کی طرح گھیر لیتی ہیں تو یہ اللہ کو پکارتے ہیں، اپنے دین کو اسی کے لئے خالص کرکے۔ پھر جب وہ بچا کر انھیں خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کوئی اعتدال پر رہتا ہے۔ اور ہماری نشانیوں کا انکار وہی کرتا ہے جو بدعہد اور ناشکرا ہے۔ (لقمان ۳۱-۳۲)

کوئی شخص خواہ کتنا ہی سرکش اور منکر کیوں نہ ہو، جب مشکل حالات پڑتے ہیں تو وہ بے اختیار خدا کو پکار اٹھتا ہے۔ یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا انسانی فطرت کی آواز ہے۔

۲۔ روسی ڈکٹیٹر مارشل اسٹالن (۱۸۷۹-۱۹۵۳) خدا کا منکر تھا۔ مگر اس کی زندگی میں ایسے واقعات ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ مشکل اوقات میں وہ بے اختیار خدا کو یاد کرنے لگتا تھا۔ ونسٹن چرچل (۱۸۷۴-۱۹۶۵) نے دوسری جنگ عظیم کے موقع پر اگست ۱۹۴۲ میں ماسکو کا سفر کیا تاکہ ہٹلر کے خلاف دوسرا محاذ (سکنڈ فرنٹ) قائم کرنے کے لئے روسی لیڈروں سے گفتگو کرے۔ چرچل نے اس سلسلہ میں اتحادیوں کا فوجی منصوبہ اسٹالن کے سامنے رکھا جس کا خفیہ نام ٹارچ (TORCH) رکھا گیا تھا۔ اسٹالن چونکہ خود بھی ہٹلر کی بڑھتی ہوئی یلغار سے خائف تھا، اس نے اس فوجی منصوبہ میں گہری دلچسپی لی۔ چرچل کا بیان ہے کہ منصوبہ کی تشریح کے ایک خاص مرحلہ پر جب کہ اسٹالن کی دلچسپیاں اس سے بہت بڑھ چکی تھیں اس کی زبان سے نکلا:

MAY GOD PROSPER THIS UNDERTAKING

خدا اس منصوبہ کو کامیاب کرے۔

Winston S. Churchill,
The Second World War (Abridgement)
Cassell & Company
London, 1965, P. 603

۳۔ سابق صدر امریکہ مسٹر رچرڈ نکسن کے افراد خاندان جب آخری فوٹوگراف کے لئے وائٹ ہاؤس میں جمع ہوئے تو سرکاری فوٹوگرافر کو ان کا فوٹو لینے میں کافی دیر لگی کیونکہ صدر نکسن سمیت سب لوگ رو رہے

تھے اور فوٹو گرافر اس انتظار میں تھا کہ بغیر آنسو وں کا کوئی لمحہ ہے تو شاٹ لے سکے۔

واٹر گیٹ سکینڈل کے متعلق ٹیپ ریکارڈنگ جس نے نکسن کی صدارت کو ختم کیا، اگر نکسن چاہتے تو اس کو ضائع کر سکتے تھے۔ ایسی صورت میں ان کی صدارت خطرہ میں نہ پڑتی۔ مگر صدر نکسن کو یہ لالچ تھا کہ صدارت کے بعد اس ٹیپ کو فروخت کر کے وہ معقول رقم حاصل کر سکتے ہیں، مگر ان کی یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ ٹیپ ریکارڈنگ لوگوں کے علم میں آ گئی اور نکسن کی صدارت ایسے بھونچال کا شکار ہوئی کہ علیحدگی کے سوا ان کے لئے کوئی چارہ نہ رہا۔

واٹر گیٹ اسکینڈل کے انکشاف سے پہلے رچرڈ نکسن اتنا زیادہ پریشان تھے کہ نیم پاگل ہو گئے تھے۔ وہ وائٹ ہاؤس میں روتے رہتے۔ انھوں نے خودکشی کا ارادہ کر لیا تھا۔ اگرچہ سخت نگرانی کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

آخری ایام THE FINAL DAYS نامی کتاب میں انکشاف کیا گیا ہے کہ:

AS THE END NEARED, NIXON ASKED SECRETARY OF STATE HENRY KISSINGER TO KNEEL AND PRAY WITH HIM, SAYING:
"YOU ARE NOT A VERY ORTHODOX JEW AND I AM NOT AN ORTHODOX QUACKER, BUT WE NEED TO PRAY."

Daily American (Rome) 27.3.1976

جب صدارت کا خاتمہ قریب آ گیا، نکسن نے سابق سکریٹری آف اسٹیٹ ہنری کسنجر سے کہا کہ وہ ان کے ساتھ خدا کے آگے جھکیں اور دونوں مل کر دعا کریں۔ "نہ تم زیادہ پکے یہودی ہو نہ میں زیادہ پکا عیسائی۔ مگر اس وقت ہم کو ضرورت ہے کہ ہم دعا کریں"۔ نکسن نے کہا اور عیسائی طریق عبادت کے مطابق جھک کر دعا کرنے لگے۔

۴۔ روس میں اشتراکی انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ میں آیا۔ اس طرح اس انقلاب پر اب پورے ساٹھ سال گزر چکے ہیں۔ تازہ اعداد و شمار کے مطابق ۲۵ کرور سوویت شہریوں میں ۲۱ کرور ایسے لوگ ہیں جو اکتوبر انقلاب کے بعد پیدا ہوئے ہیں، دوسرے لفظوں میں ایسے سماج میں جس میں، حکومت روس کے دعوے کے مطابق، قدیم مذہبی نظام مکمل طور پر ختم کر دیا گیا ہے۔

اشتراکی نظریہ کے مطابق مذہب، سرمایہ داری نظام کا ضمیمہ تھا۔ سرمایہ داری نظام کے خاتمہ کے بعد قدرتی طور پر اس کے ضمیمہ کو بھی ختم ہو جانا چاہئے۔ روسی حکومت کا دعویٰ ہے کہ اس نے سرمایہ داری نظام کو روس سے ختم کر دیا ہے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ مذہب اب بھی وہاں زندہ ہے۔ حتیٰ کہ روس کی جدید نسل میں دوبارہ مذہب پروان چڑھ رہا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک دل چسپ واقعہ وہ ہے جو ۱۹۷۳ میں ہندستان میں پیش آیا۔ ایک روسی جہاز (ILYUSHIN JET) ہندستان میں مغربی بنگال کی فضا پر اڑ رہا تھا کہ اس کا انجن خراب ہو گیا ہوا بازی کی ساری کوششیں ناکام ہو گئیں اور جہاز زمین پر گر پڑا — ہوا باز سمیت سارے مسافر جل کر ختم ہو گئے۔

چونکہ یہ حادثہ ہندستان کی سرزمین پر ہوا تھا اس لئے بین الاقوامی قانون کے مطابق ہندستان کو اس کی تفتیش کرنی تھی۔ ہوائی جہازوں کا قاعدہ ہے کہ اس میں آواز ریکارڈ کرنے والی ایک خودکار مشین رکھی جاتی ہے جس کو عام طور پر (BLACK BOX) کہتے ہیں۔

بلیک باکس ہواباز اور کنٹرول ٹاور کے درمیان گفتگو کو ریکارڈ کرتا رہتا ہے۔ اس کو ہوائی جہاز کی دُم میں رکھا جاتا ہے تاکہ ہوائی جہاز کے جلنے کے بعد بھی وہ بچ سکے۔

ہندستانی افسروں نے ہوائی جہاز کے ملبہ سے اس بلیک باکس کو حاصل کیا۔ جب اس بکس کا ٹیپ بجایا گیا تاکہ اس سے تفتیش میں مدد لی جاسکے تو معلوم ہوا کہ بالکل آخری لمحات میں روسی ہواباز کی زبان سے جو لفظ نکلا وہ یہ تھا:

PETER SAVE US

(سینٹ پیٹر ہم کو بچا) واضح ہو کہ پیٹر یا پطرس حضرت عیسیٰؑ کے بارہ حواریوں میں سے ایک تھے اور عیسائیوں کے یہاں بڑے بزرگ مانے جاتے ہیں۔

۵. کون جانتا تھا کہ سٹالن کی اپنی لڑکی سویتلانہ SVETLANA ALLILUYEVA اس کے بعد عیسائی مذہب قبول کرے گی۔ سویتلانہ اشتراکی دنیا سے مایوس ہو کر ہندستان آئی تھی ۔ ہوسکتا تھا کہ وہ کسی ہندستانی مذہب میں پناہ لے۔ مگر ہمارے حکمرانوں کے لئے اس کا یہاں رہنا ہند۔ روس دوستی کے خلاف معلوم ہوا۔ چنانچہ مجبور ہو کر وہ یورپ چلی گئی، اور وہاں عیسائیت کا اختیار کرلیا۔

سویتلانہ اپنی کتاب ONLY ONE YEAR (صرف ایک سال) میں لکھتی ہے کہ میں ماسکو ہی میں غیر مطمئن تھی اور اپنے قلب کی تسکین کے لئے کوئی چیز ڈھونڈ رہی تھی — وہ چیز مجھے بائبل کے ان جملوں میں مل گئی:

خداوند میری روشنی اور میری نجات ہے مجھے کس کی دہشت۔
خداوند میری زندگی کا پشتہ ہے، مجھے کس کی ہیبت۔
خواہ میرے خلاف لشکر خیمہ زن ہو۔
میرا دل نہیں ڈرے گا۔
خواہ میرے مقابلہ پر جنگ برپا ہو۔
تو بھی میں خاطر جمع رہوں گا۔

زبور: ۲۷

۶. آج کے روس میں اس کیفیت کے ابھرنے کے شواہد کثرت سے مل رہے ہیں۔ سولزے نتسین اور سخاروف اسی روحانی کش مکش کی ایک علامت ہیں۔ سولزے نتسین کو اگر نوبل انعام حاصل کرنے کی اجازت مل ہوتی تو وہ اس رقم کو روسی عوام کے لئے ایک گرجا تعمیر کرنے میں صرف کرتا۔ سولزے نتسین کے ایک قریبی دوست دیلتری پینی سے پوچھا گیا کہ روسی سلطنت کا سب سے کمزور پہلو کیا ہے۔ اس نے بلا تردد جواب دیا:

THE HUNGER OF ORDINARY PEOPLE FOR MORAL AND SPIRITUAL TRUTH

"عام انسان کی یہ بھوک کہ وہ اخلاقی اور روحانی سچائی کو پا سکے"

جو شخص گھمنڈ اور عصبیت جیسی نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا ہو وہ کبھی سچائی کو دیکھ نہیں سکتا، خواہ وہ کتنی ہی کھلی شکل میں اس کے سامنے رکھ دی گئی ہو۔ سچائی کو پانے کے لئے سچائی کا طالب ہونا ضروری ہے۔

ناموافق حالات زندہ قوموں کیلئے
ترقی کا زینہ بن جاتے ہیں

آرنلڈ ٹائن بی (۱۹۷۵-۱۸۸۹) چند خوش قسمت مصنفین میں سے ہے جس نے اپنی زندگی ہی میں عالمی مقام حاصل کرلیا۔ اس انگریز مورخ کو سب سے زیادہ شہرت اپنی ۱۲ جلدوں پر مشتمل "اسٹڈی آف ہسٹری" کی وجہ سے ملی جس میں اس نے ۲۱ تہذیبوں کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ وہ قوتیں جو تاریخ بناتی ہیں، وہ بنیادی طور پر داخلی قوتیں ہیں نہ کہ خارجی اسباب۔ اس نے قدیم زمانہ سے لے کر اب تک تمام بڑی تہذیبوں کا مطالعہ کرکے دکھایا ہے کہ ان تہذیبوں کو جن قوموں نے پیدا کیا، وہ تخلیقی صلاحیت رکھنے والی اقلیتیں تھیں جنھوں نے وقت کے چیلنج کا کامیابی کے ساتھ جواب دیا۔

اقلیتوں کے ساتھ ہمیشہ یہ ہوا ہے کہ وہ اکثریت کی طرف سے مسلسل دباؤ میں رہتی ہیں۔ یہ دباؤ عملی زندگی میں بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کی وجہ سے کسی قوم کی وہ اندرونی تخلیقی صلاحیت ابھرتی ہے جو اُس کو اِس قابل بناتی ہے کہ وہ پیش آنے والے چیلنج کے مقابلہ میں قائدانہ رول ادا کرسکے۔ اس کے برعکس جن قوموں کی لغت میں "دباؤ" کے معنی صرف "مظلومیت" کے ہوتے ہیں، ان کے حصہ میں فریاد واحتجاج کے سوا کچھ نہیں آتا۔ وہ اپنی محرومیوں کا رجسٹر بنانے میں مشغول رہتی ہیں یا جلسوں اور تقریروں کا کمال دکھا کر سمجھتی ہیں کہ انھوں نے اپنی سربلندی کا راز پالیا ہے۔ یہاں تک کہ جب وقت کا قافلہ آگے بڑھ جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لئے اس دنیا میں قبرستان کے سوا اور کچھ نہیں۔

قرآن کا مطلوب انسان

ایک حدیث ہے کہ ــــ اَلْمُؤْمِنُ مِرْاٰةُ الْمُؤْمِنِ ــــ یعنی مومن دوسرے مومن کے لیے آئینہ ہوتا ہے۔ آج کی صحبت میں آپ کے لیے میں یہی بننا چاہتا ہوں۔ اس موقع پر بہترین خدمت جو میری سمجھ میں آئی ہے وہ یہ کہ میں نہایت سادہ اور مختصر طور پر چند ایسی باتیں آپ کے سامنے رکھوں جس میں آپ خود کو بالکل برہنہ دیکھ سکیں۔ اللہ میری اور آپ کی مدد فرمائے۔

ایمان کی علامت کیا ہے۔ اس کی اگر مختصر ترین فہرست بنائی جائے تو شاید وہ دو چیزوں پر مشتمل ہوگی۔ قرآن اور نماز ــــ یہ دو الفاظ دراصل پورے دین کا عنوان ہیں۔ ایک نظری حیثیت سے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور دوسرا عملی پہلو سے۔ اسی نے دراصل خدا کو پایا ہے جس نے قرآن اور نماز کو پایا ہے۔ یہ دونوں چیزیں اگر آپ کی زندگی میں شامل ہو گئی ہوں تو سمجھیے کہ ایمان اور اسلام آپ کی زندگی میں شامل ہو گیا ہے اور اگر آپ کی زندگی ان سے خالی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ ابھی تک ایمان اور اسلام سے محروم ہیں۔

ان دونوں چیزوں کی بنیادی اہمیت خود قرآن سے ثابت ہے، جیسا کہ فرمایا:

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ۝ (اعراف - ۱۷۰)

جو لوگ خدا کی کتاب کو مضبوط پکڑ لیتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، ہم ایسے مصلحین کا اجر ضائع نہیں کریں گے۔

گویا مصلح صرف وہ ہے جو قرآن اور نماز کو اپنی زندگی میں شامل کر چکا ہو۔ ایسے ہی لوگوں کی کوششیں خدا کی نظر میں "اصلاح" کی حیثیت رکھتی ہیں اور انھیں کے عمل کو اللہ تعالیٰ دنیا میں برومند کرے گا اور آخرت میں اپنے انعام سے سرفراز فرمائے گا۔ دوسرے مقام پر یہی چیز حکم کے انداز میں کہی گئی ہے:

اُتْلُ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ (عنکبوت - ۴۵)

کتاب الٰہی کا جو حصہ تمہارے پاس بھیجا گیا ہے اس کو پڑھو اور نماز قائم کرو۔

مگر قرآن اور نماز کو پانے کا مطلب کسی لفظی مجموعے یا کسی ظاہری ڈھانچے کو پا لینا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ایک عظیم حقیقت کو پانا ہے جو آدمی کے وجود پر چھا جاتی ہے، جو اس کی پوری زندگی بن جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر چیز جو آپ کی زندگی میں نظر آ رہی ہو اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو آپ نے حقیقی طور پر اختیار کیا ہو ــ دوسرے یہ کہ وہ آپ کی زندگی کا حقیقی جزء نہ ہو بلکہ کچھ دوسرے اسباب کے تحت وہ آپ کے اثاث البیت میں شامل ہو گئی ہو۔ یہ عین ممکن ہے کہ آدمی الفاظ کے ذریعے اپنے بارے میں جو دعوے کرے اس کا "لحن القول" اس کے خلاف گواہی دے رہا ہو (محمد - ۳۰) اس کی زبان و قلم سے نہایت اعلیٰ درجے کی باتیں نکل رہی ہوں مگر اس کا یہ تمام عمل يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ (آل عمران - ۱۶۷) کا مصداق ہو۔ کیا کی زندگی کا مرکز و محور اس کے معاشی مفادات، اس کی بیوی بچے اور اس کی دنیوی تمنائیں ہوں مگر گفتگو اور تعلقات

میں وہ اپنے آپ کو اس طرح ظاہر کرے گویا اس نے خدا اور اس کے دین کو اپنی زندگی کا مرکز و محور بنا رکھا ہے۔

مثال کے طور پر ایک شخص امت کی حالت زار پر تقریریں اور بیانات شائع کر رہا ہو مگر اس کی زندگی میں ایک رات بھی ایسی نہ گزری ہو جب کہ امت کے درد میں اس کی نیند اڑ جائے اور بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اس کی زبان سے نکلے کہ "خدایا تو انھیں ہدایت دے، خدایا مجھے طاقت دے کہ میں ان کو تیرے راستے کی طرف بلا سکوں"۔ تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ امت کے درد سے زیادہ اس کو خود اپنا درد ستا رہا ہے، کیونکہ اس عنوان کو اختیار کیے بغیر وہ پریس اور اسٹیج سے اپنے آپ کو نمایاں نہیں کر سکتا۔ میز کے گرد بات چیت میں اگر کوئی شخص مظلوم انسانوں کی حمایت پر گرما گرم حصہ لے رہا ہو مگر اس کی روزمرہ کی زندگی مظلوم انسانوں کی ہمدردی سے خالی ہو تو یہ ہمدردی کا نہیں بلکہ ریاکاری کا ثبوت ہے۔ رسمی قسم کے بحث و مباحثہ میں اگر کوئی شخص اصول اور ضابطے کا بہت حوالہ دیتا ہو، مگر اس گفتگو کے باہر جو زندگی وہ گزارتا ہے وہ بے اصولی کا نمونہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ حقیقتاً اس کے اندر موجود نہیں ہے اس کو وہ الفاظ کے ذریعہ اپنے اندر ثابت کرنا چاہتا ہے وہ اپنے کو ایک ایسی حیثیت میں ظاہر کر رہا ہے جو کہ دراصل اس کی حیثیت نہیں ہے۔ اگر آپ کسی کو دیکھیں کہ دوسروں پر تنقید کرنے میں اس کی زبان بہت تیز ہے مگر خود اس کو عمل کے جو مواقع حاصل ہیں ان میں وہ خود بھی اسی قسم کی کمزوریاں ظاہر کر رہا ہے جس میں دوسرے لوگ اپنے دائرے کے اندر مبتلا ہیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کو فی الواقع اصلاح حال سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس کو صرف تنقید عزیز ہے اور اسی کو وہ انجام دے رہا ہے۔

کئی سال پہلے کی بات ہے۔ میں ایک مرتبہ ٹرادنکور کے علاقے میں ٹرین سے سفر کر رہا تھا۔ میرے سامنے کی سیٹ پر کچھ عیسائی بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے کہا: مسلمانوں کے اندر مذہبی اسپرٹ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ان کا ہر بچہ جب تعلیم شروع کرتا ہے تو سب سے پہلے اس کو قرآن پڑھایا جاتا ہے۔ بےشک یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے۔ بلکہ مسلمانوں میں تو یہ روایت رہی ہے کہ وہ روزانہ صبح کی نماز کے بعد سب سے پہلے کتاب الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں۔ اگرچہ موجودہ زمانے کی سطحیت پسندی نے اس ذوق کو بڑا نقصان پہنچایا ہے اور خاص طور پر پڑھے لکھے لوگوں کی صبح تو اب تلاوتِ قرآن کے بجائے تلاوتِ اخبار میں بسر ہونے لگی ہے۔ تاہم اب بھی ہمارے یہاں ایسے مردوں اور عورتوں کی کافی تعداد ہے جو کسی نہ کسی حد تک اس روایت کو باقی رکھے ہوئے ہیں۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ اس قسم کی تلاوت بھی ایک دینی کام ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو جو چیز مطلوب ہے وہ محض الفاظِ قرآنی کی تلاوت نہیں بلکہ "تلاوتِ حق" ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے :-

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ (البقرہ - ۱۲۱)	جو لوگ کتاب الٰہی کے حامل ہیں وہ اس کو اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ اس کے پڑھنے کا حق ہے۔ یہی اس کے حقیقی مومن ہیں۔

یہ تلاوت حق جس کو حاصل ہوگئی ہو وہی دراصل قرآن کا قاری ہے اور وہی اس پر صحیح معنوں میں ایمان لانے والا ہے۔ تلاوت حق کی پہچان کیا ہے۔ اس پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمارے سامنے سب سے پہلے یہ آیت آتی ہے۔

وَاِذَا مَا اُنْزِلَتْ سُوْرَۃٌ فَمِنْهُمْ مَنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ○ (توبہ-۱۲۴)

اور جب کوئی سورہ اترتی ہے تو بعض (منافقین) کہتے ہیں کہ اس سورہ نے تم میں سے کس کا ایمان بڑھا دیا ہے۔ ہاں اس نے ان لوگوں کا ایمان بڑھا دیا ہے جو واقعی مومن ہیں اور وہ اس کو پاکر خوش ہیں۔

اس آیت سے قرآن پر ایمان رکھنے والوں کی پہچان یہ معلوم ہوئی کہ وہ جب قرآن کو پڑھیں تو اس سے ان کے ایمان میں اضافہ ہو، وہ اپنے بہترین احساسات کو اس کے اندر بولتا ہوا پائیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کو دوسرے مقام پر عرفان حق کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا:۔

وَاِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ۔ (مائدہ-۸۳)

اور جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو خدا کے رسول پر اترا ہے تو تم دیکھوگے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑتے ہیں عرفان حق کے سبب سے۔

اضافۂ ایمان اور عرفان حق دونوں ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔ جو لوگ قرآن کے واقعی مومن ہیں وہ جب قرآن کو پڑھتے ہیں تو یہ کتاب انھیں سراپا حقیقت نظر آتی ہے، وہ حقیقت جس کے متعلق علم انسانی نے تسلیم کیا ہے کہ وہ کبھی اسے معلوم نہیں کرسکتا۔ وہ حقیقت جس کو فلسفہ ہزاروں سال سے تلاش کر رہا ہے مگر وہ اس تک پہنچ نہ سکا، اہل ایمان اس کو خدا کی کتاب میں پا لیتے ہیں۔ قرآن کی شکل میں وہ حقیقت کو دیکھنے لگتے ہیں۔ یہ علم ان کے یقین کو بڑھاتا ہے، قرآن کے مضامین اپنے پڑھنے والے سے جس قسم کی جوابی کیفیات کا تقاضا کرتے ہیں ان کا دل ہر مقام پر بالکل اس کے مطابق ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ جب زمین و آسمان کی نشانیاں پیش کرکے اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کہ ان کا خالق کون ہے تو بے اختیار ان کی زبان سے نکل پڑتا ہے "بل انت یا رب" جب خدا کے احکام بیان ہوتے ہیں اور انسان سے اس کی حیثیت کے مطابق صحیح رویے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو وہ پکار اٹھتے ہیں رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ۔ قرآن کو پڑھتے ہوئے دل کے اندر یہ یقین ابھرنا چاہیے کہ یہ خدا کا کلام ہے، جس مطالعہ سے یہ کیفیت حاصل نہ ہو وہ اندھے بہرے کا مطالعہ ہے۔ (فرقان) مومن جب قرآن کو پڑھتا ہے تو اس کو اس طرح پڑھتا ہے گویا وہ رب العالمین کی آواز سن رہا ہے، گویا وہ خدا سے ہم کلام ہے، گویا قرآن خود اس کے اوپر نازل ہو رہا ہے۔ قرآن اس کی سب سے محبوب کتاب بن جاتی ہے جس میں وہ اپنے جذبات کی تسکین پاتا ہے، جس سے وہ اپنے دل کی دنیا کو آباد کرتا ہے، جس سے اس کو ایک نئی روشنی حاصل ہوتی ہے جو اس کے تمام عقلی اور روحانی تقاضوں کا جواب بن جاتی ہے۔

قرآن کا یہ پانا محض ایک علمی دریافت کی قسم کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ بندے کا اپنے رب کو پانا بلکہ اس تک

پہنچ جاتا ہے۔ تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں کہ بعض لوگوں کے علمی ذوق نے انھیں کتابوں کا عاشق بنا دیا۔ یہی کی بھی بہت سی مثالیں ملیں گی کہ کسی فلسفی یا مفکر کی تصنیفات نے لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ وہ بالکل اس کے مومن ہو گئے۔ مگر خدا کی کتاب کا معاملہ اس قسم کے واقعات سے بالکل مختلف ہے۔ یہ کائنات کے خالق و مالک کی کتاب ہے اور ہم اس کے حقیر بندے ہیں۔ اس نسبت کا قدرتی تقاضا ہے کہ قرآن سے ہمارا تعلق محض علمی تعلق نہ ہو بلکہ وہ بندے اور خدا کا تعلق بن جائے۔ ہم جب قرآن کو پڑھیں تو ہمارے اوپر وہ ہیبت طاری ہو جو کائنات کے فرمانروا کا حکم سن کر اس کے ایک عاجز غلام پر طاری ہونی چاہیے۔ اس کو پڑھتے ہوئے ہمارا دل پگھل جائے، ہماری آواز پست ہو جائے، ہمارا پورا وجود سراپا عجز و نیاز بن کر اس کے آگے جھک جائے، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ (زمر۔ ۲۳)

وہ اللہ ہے جس نے یہ بہترین کتاب اتاری ہے جس کی باتیں آپس میں ملتی ہوئی دہرائی ہوئی ہیں، اس کو سن کر ان لوگوں کے بدن کانپ اٹھتے ہیں جو خدا سے ڈرنے والے ہیں، پھر ان کے دل اور ان کے جسم خدا کی یاد کی طرف جھک جاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن خدا سے ڈرنے والوں کے لیے کپکپی پیدا کر دینے والی کتاب ہے، اس کو سن کر ان کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، وہ انھیں خدا کی طرف مائل کرتی ہے، وہ انھیں ذکر الٰہی میں غرق کر دیتی ہے۔ وہ جب اسے سنتے ہیں تو ان کے قلوب پگھل کر آنکھوں کے راستے سے بہنے لگتے ہیں۔ قرآن کو سنتے یا پڑھتے کے وقت دل کے اندر خدا کی یاد اور خشوع پیدا ہونا چاہیے، ایسا نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی "قساوتِ قلب" کی بیماری میں مبتلا ہو چکا ہے۔ (حدید۔ ۱۶)

یاد رکھیے قرآن سے ناآشنا صرف وہ لوگ نہیں ہیں جن کے لیے یہ کتاب "کتابِ مہجور" بن گئی ہے، جنھوں نے قرآن کو اس طرح پس پشت ڈال دیا ہے گویا کہ وہ اسے جانتے ہی نہیں، گویا ان کی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ وہ شخص بھی قرآن سے محروم ہے جس کے لیے یہ کتاب صرف خوش الحانی کے لیے موزوں الفاظ مہیا کرتی ہو، جس کے لیے وہ محض علمی غور و بحث کا موضوع ہو، جس کے لیے وہ حوالے کی کتاب ہو جس کو وہ تحریر و تقریر کے وقت الٹ پلٹ کر دیکھ لیتا ہو۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک شخص نے ہزاروں انسانوں کے درمیان صرف قرآن کی بنیاد پر اپنی شخصیت کا سکہ بٹھا رکھا ہو، مگر وہ قرآن کی نعمت سے محروم ہو۔ اسی طرح اگر آدمی زبان و قلم کے ذریعے قرآن کے اسرار و معارف بیان کر رہا ہو مگر اس کی اپنی زندگی ان حقیقتوں سے خالی ہو تو یہ بھی خدا کی کتاب سے محرومی کی ایک قسم ہے۔ دوسروں کو کتاب الٰہی کا درس دینا اور خود "نسیان" میں مبتلا رہنا، قرآن سے تعلق نہیں بلکہ بے تعلقی کا ثبوت ہے (بقرہ۔ ۴۴) اگر کسی نے لغت اور نحو کی مدد سے الفاظ قرآن کو حل کر لیا ہو تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ قرآن کو بھی پا گیا ہے۔ قرآن کو پانے والا صرف وہ شخص ہے جس نے

اپنے سینے کی دھڑکنوں میں اس کو بولتے ہوئے سنا ہے، جس نے ان حقیقتوں کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے جن کا قرآن میں ذکر ہے، جس نے اس کو اس طرح پڑھا ہے گویا وہ خود اپنے اندر چھپے ہوئے صحیفے کو زبان سے دہرا رہا ہے۔ یاد رکھیے حقیقت کو پانے والا صرف وہ ہے جس نے اپنے دل کی کتاب پر اس کو لکھا ہوا پایا ہے۔ جس نے صرف لفظی تشریحات کے ذریعہ اسے جانا ہے، اس نے حقیقت کو ابھی تک پایا ہی نہیں:

بَلْ هُوَ اٰيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ۔ (عنکبوت۔ ۴۹)

قرآن کیا ہے وہ کھلی ہوئی آیتیں ہیں، جو ان لوگوں کے سینوں میں ہیں، جو معرفت رکھتے ہیں۔

قرآن کی جو صفتیں بیان کی گئی ہیں، وہ اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ صفتیں بتاتی ہیں کہ قرآن کے وہ کیا کیا پہلو ہیں جن کا ہماری زندگیوں میں شامل ہو جانا ہمارا خدا کی کتاب کو پالینا ہے۔ قرآن کو پانے والا وہ ہے جس کی مردہ روح کو قرآن سے زندگی ملی ہو، جس کے لیے وہ دل کے زنگ کو دور کرنے والی کتاب ہو، جس کے لیے وہ نور بن گیا ہو جس کی روشنی میں وہ چلتا ہو۔ قرآن کو ان لوگوں نے پایا ہے جن کا حال یہ ہے کہ جب وہ اسے پڑھتے ہیں تو ان کے دل دہل اٹھتے ہیں اور وہ اپنے آنسوؤں سے اس کا استقبال کرتے ہیں۔ ان کی شخصیت صاحب قرآن کے آگے سجدہ ریز ہو جاتی ہے۔ یہی وہ علامات ہیں جو بتاتی ہیں کہ آدمی کو قرآن کی تلاوت حق نصیب ہوئی ہے یا نہیں اور اس نے فی الواقع خدا کی کتاب کو پالیا ہے یا وہ ابھی تک اس سے محروم ہے:

إِذَا تُتْلَى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَّ بُكِيًّا۔ (مریم۔ ۵۸)

جب اللہ کی آیتیں انھیں سنائی جاتی ہیں تو وہ روتے ہوئے سجدے میں گر پڑتے ہیں۔

یہاں ایک بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے۔ یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تمام چیزوں کو اس ڈھنگ پر بنایا گیا ہے کہ ایک ہی چیز سے آدمی نصیحت بھی حاصل کر سکتا ہے اور وہی بیک وقت اس کے لیے فتنے میں پڑنے کا بھی ذریعہ ہے۔ ٹھیک یہی حال خدا کی کتاب کا بھی ہے، جیسا کہ فرمایا:

كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ۔ (مدثر۔ ۳۱)

اسی طرح اللہ (قرآن کی آیتوں سے) کسی کو گمراہ کرتا ہے اور کسی کو ہدایت دیتا ہے۔

بلاشبہ قرآن کتاب ہدایت ہے۔ مگر آدمی کا اپنا چہرہ جتنا صاف ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ آئینہ کے اندر صاف دکھائی دے گا۔ چنانچہ قرآن سے بھی آدمی کو وہی کچھ ملتا ہے جو وہ اس سے حاصل کرنا چاہتا ہو۔

قرآن کے ذریعہ بے راہ ہونے کی ایک صورت تو وہ ہے جب کہ آدمی اس میں سے ایسی باتیں ڈھونڈ لے جو اس کے لیے قرآن پر ایمان نہ لانے کا بہانہ بن جائیں۔ مگر جو لوگ قرآن کو مانتے ہیں وہ بھی اس خطرہ سے محفوظ نہیں ہیں۔ اس قسم کی ممکن صورتوں میں سے ایک وہ ہے جس کا عنوان تحریف ہے۔ یعنی سب کچھ جاننے کے باوجود محض اپنی غلطی کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کلام الٰہی کے الفاظ یا اس کے معانی کو بدل دینا (بقرہ۔ ۷۵)۔

دوسری چیز اقتسام ہے (حجر۔ ۹۰) اقتسام کے معنی ہیں بانٹنا، تقسیم کرنا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ خدائی تعلیمات کو پوری کی پوری شکل میں قبول نہ کیا جائے بلکہ اپنی خواہش کے مطابق ٹکڑے کرکے اس کے بعض حصوں کو لیا جائے اور بعض کو چھوڑ دیا جائے۔ تیسری چیز وہ ہے جس کو قرآن میں مضاہاۃ کہا گیا ہے (توبہ۔ ۳۰) مضاہاۃ کے معنی عربی زبان میں مشاکلۃ الشیٔ بالشیٔ کے آتے ہیں (لسان العرب) یعنی کسی چیز کو دوسری چیز کے ہم شکل قرار دینا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل باطل کے خیالات سے متاثر ہوکر یا دنیوی مصالح کی بنا پر ان کی بات کو اپنا لیا جائے اور اس کو اس طرح پیش کیا جائے گویا وہ خدائی تعلیم کے عین مطابق یا اس کے مشابہ ہے۔

جہاں تک پہلی صورت (تحریف) کا تعلق ہے اس کی بنیاد مکمل طور پر بدنیتی کے اوپر قائم ہے۔ اور ہم سب لوگ اس کی برائی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ مگر دوسری اور تیسری صورت کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ یہ فتنہ کبھی کبھی اچھے خاصے نیک نیت لوگوں میں بھی اس طرح چپکے سے داخل ہوجاتا ہے کہ انھیں خبر نہیں ہوتی اور وہ اپنا کام تمام کرکے بالآخر انھیں کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔

ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ انسان اکثر حالات میں متاثر ذہن کے ساتھ واقعات کا مطالعہ کرتا ہے۔ وقت کی سوسائٹی میں جن خیالات کی اہمیت تسلیم کی جاچکی ہوتی ہے۔ قدرتی طور پر وہ ان کا اثر قبول کرتا ہے۔ اسی طرح حقیقی دنیا کی بہت سی مصلحتیں معصوم شکل میں آکر اس کے ذہن کی سطح سے بار بار ٹکراتی رہتی ہیں۔ یہ چیزیں مل کر کبھی شعوری اور زیادہ تر غیر شعوری طور پر اس کا ایک فکر بنا دیتی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان ہمیشہ چیزوں کو صرف اس حیثیت سے نہیں دیکھتا جیسی کہ وہ فی الواقع ہیں۔ اکثر حالات میں وہ مجبور ہوتا ہے کہ چیزوں کو اس حیثیت سے دیکھے جیسا کہ اس کا ذہن انھیں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس طرح جب کوئی شخص ایک خاص ذہن لے کر قرآن کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ بلا ارادہ اقتسام کی ایک صورت میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ وہ قرآن کی بعض ایسی باتوں کو تو لے لیتا ہے جو اس کے ذہن کے چوکھٹے میں بیٹھ سکتی ہوں اور باقی تمام باتوں کو چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح وہ سارا قرآن پڑھ لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نے خدا کی کتاب کو پا لیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ قرآن سے غافل بے خبر رہتا ہے۔ اس نے خدا کی کتاب کے بڑے حصہ کو چھوڑ کر اس کے بعض اجزا کو اپنے خود ساختہ مفہوم میں لے لیا ہے۔ اس نے جو چیز پائی ہے وہ وہی ہے جو اس کے ذہن میں پہلے سے موجود تھی اور جس کی تائید میں اتفاق سے قرآن کی بعض آیتیں بھی اسے ہاتھ آگئیں۔ ایسے آدمی کی مثال اس تعلیم یافتہ نوجوان کی سی ہے جو اپنی بے کاری سے پریشان ہو اور صرف "ضرورت ملازمت" کے اشتہارات دیکھنے کے لیے اخبار کا مطالعہ کرتا ہو۔ یہ نوجوان اپنے اس مطالعہ سے ممکن ہے ملازمت کی درخواست بھیجنے کے لیے کچھ پتے حاصل کرلے مگر وہ دنیا کی سیاست سے بے خبر رہے گا اور اخبار بینی کے اصل مقصد کو حاصل نہ کرسکے گا۔

اسی طرح مضاہاۃ کی خرابی بھی آدمی کے اندر خاموشی کے ساتھ داخل ہوجاتی ہے۔ اس میں ماحول کے ذاتی تاثر کے علاوہ خاص طور پر تبلیغی ضروریات کا بھی کچھ دخل ہوتا ہے۔ یہ خیال کہ ہم جن لوگوں سے کہنی ہے وہ ایسی

ہونی چاہیے جو لوگوں کے ذہن سے قریب تر ہو تاکہ وہ اس کو قبول کر سکیں۔ نیز یہ کہ بات کو ایسے الفاظ اور اصطلاحات میں پیش کیا جائے کہ وقت کا معیارِ فکر اس کی اہمیت تسلیم کرنے پر مجبور ہو، وقت کے علمی خیالات کے ساتھ وہ پہلو بہ پہلو جگہ لے سکے۔ یہ اگرچہ بذاتِ خود غلط نہیں ہے مگر بعض مرتبہ وہ آدمی کے ذہن میں خدائی تعلیمات کی ایسی تصویر بنا دیتا ہے جو اصل تعلیمات سے زیادہ وقت کے نظریات سے مطابقت رکھنے والا ہو۔ خدائی تعلیمات سے جزوی مشابہت تو ضرور اس میں موجود رہتی ہے۔ مگر درحقیقت وہ اسلامی الفاظ اور اصطلاحات میں غیر اسلامی خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے۔

اگر بے جا جسارت نہ ہو تو میں عرض کروں گا کہ تصوف جو بعض محققین کے نزدیک یونانی لفظ تھیوسوفیا (THEOSOFIA) کی تعریب ہے، وہ بھی اسی نوعیت کا ایک واقعہ ہے جو دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں محض خارجی اثرات کے تحت اسلام کے اندر داخل ہو گیا۔ ہمارے قدیم بزرگ جب اسلام کا پیغام لے کر عرب کے باہر دوسرے ملکوں میں گئے تو انھوں نے اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پایا جہاں کچھ مخصوص افکار و اشغال لوگوں کے ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے اور مذہب اور مذہبی زندگی کا تصور ان کے بغیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان افکار و اشغال کی پشت پر ایک زبردست فلسفہ بھی موجود تھا۔ ان چیزوں نے کچھ دعوتی مصلحت اور کچھ انفعالی تصور کے تحت ہمارے بزرگوں کو آمادہ کیا کہ وہ اسلام کو اس رنگ میں پیش کریں جس سے لوگ پہلے سے مانوس ہیں۔ اس طرح نبوت کے تقریباً دو سو سال بعد اسلام کی متصوفانہ تعبیر ہماری تاریخ میں داخل ہو گئی۔

اب قدیم روحانی انداز میں سوچنے کا زمانہ ختم ہو رہا ہے اور ہم ایک ایسی دنیا میں سانس لے رہے ہیں جب کہ ہر طرف معاشی اور سیاسی تحریکوں کا زور ہے۔ آج کا انسان عام طور پر اس انداز میں سوچتا ہے کہ موجودہ سماجی ڈھانچے کو بدل کر کسی اور بنیاد پر دنیا کا نظام چلایا جائے۔ یہ اسی قسم کا ایک نیا فتنہ ہے جس سے ہمارے پیش روؤں کو سابقہ پیش آیا تھا۔ وہ اگر تعبیر روحانیت کا فتنہ تھا تو یہ تعبیر مادیت کا فتنہ ہے۔ اب اگر ہم نے اس فتنے کو نہ پہچانا اور اس سے اپنے ذہن کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہ کی تو ہم بھی دین کی تعبیر میں اسی قسم کی غلطی کریں گے جو اس سے پہلے صوفیائے کرام سے ہو چکی ہے۔ اور پھر قرآن کی ایک نئی تفسیر کر کے قدیم روحانی تصوف کی طرح اسلام کو ایک جدید سیاسی تصوف بنا کر رکھ دیں گے۔ اور اس کے بعد ان تمام نتائج سے دوچار ہوں گے جو سیاسی تحریکوں کے لیے مقدر ہیں۔

ؔ یہ یونانی زبان کے دو لفظوں کا مرکب ہے THEOS بمعنی خدا اور SOFIA بمعنی حکمت۔ انگریزی میں معمولی تغیر کے بعد یہ لفظ THEOSOPHY کی شکل میں استعمال ہوتا ہے "تھیوسوفی" اس عقیدے یا اصول کے لیے اصطلاحی لفظ کے طور پر استعمال ہوتا ہے کہ ہر شخص بلاواسطہ خدا کی معرفت روحانی وجدان سے حاصل کر سکتا ہے۔

نماز

صرف نماز کو لیجیے۔ نماز دین کا بنیادی ستون ہے۔ اس کے بغیر کسی کا ایمان ہی معتبر نہیں۔ وہ آدمی کے لیے نجات کا ذریعہ ہے۔ (حدیث) مگر یہ فائدہ صرف اس نماز سے حاصل ہوتا ہے جو صلوٰۃ خشوع ہو، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ (مومنون - ۲)

کامیاب ہوئے ایمان لانے والے، وہ جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔

میں یہاں چند چیزوں کا ذکر کروں گا جس سے معلوم ہوگا کہ صلوٰۃ خشوع کیا ہوتی ہے اور اس کی علامات کیا ہیں۔

پہلی بات یہ کہ اس سے مراد وہ نماز ہے جو اس طرح پڑھی جائے کہ آدمی اس کا نگراں اور محافظ بن گیا ہو:

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ (بقرہ - ۲۳۸)

اپنی نمازوں کی حفاظت کرو۔

یہاں حفاظت سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنی روزانہ زندگی کو ہر اس چیز سے بچائے جو اس کی نماز میں خلل ڈالنے والی ہو، جس سے وہ اپنی نمازوں کو ٹھیک ٹھیک ادا نہ کرسکے۔ اس میں وقت کا اہتمام خاص طور پر داخل ہے۔ محافظتِ صلوٰۃ، اپنے ابھرے ہوئے مفہوم کے لحاظ سے، محافظت اوقات کا دوسرا نام ہے۔ نماز اہل ایمان کے لیے "کتاب موقوت" ہے جس کو متعین لمحات میں "رکوع کرنے والوں" کے ساتھ باجماعت ادا کرنا ہے۔ اس لیے آدمی کو ہر اس عادت یا ہر اس مشغولیت سے اپنی زندگی کو بچانا اور پاک کرنا ہے جو اس کو وقت پر نماز باجماعت کی ادائیگی سے محروم کردے یا تکبیر تحریمہ کے وقت وہ مسجد کی صف میں کھڑا ہوا نظر نہ آئے۔

ٹھیک وقت پر نماز کے لیے حاضر ہونا محض فوجی ڈسپلن کی قسم کی چیز نہیں ہے بلکہ وہ دراصل بندے کی طرف سے اس بات کا مظاہرہ ہے کہ وہ آقا کی پکار پر فوراً دوڑ پڑنے کے لیے تیار رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب خدا کے گھر سے "آؤ نماز کی طرف" کی آوازیں بلند ہوتی ہیں تو خدا کا بندہ ہر دوسری مشغولیت سے اپنے آپ کو فارغ کرکے خدا کی پکار کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ یہ انتہائی آمادگی اور انتہائی تعلق کا ثبوت ہے۔ وقت آتے ہی نماز کے لیے دوڑ پڑنا اس بات کا اظہار ہے کہ آدمی نے اپنی زندگی میں اولین مقام صرف خدا کو دے رکھا ہے۔ مگر جو شخص ایسا نہیں کرتا وہ گویا اس بات کا مظاہرہ کرتا ہے کہ خدا کے سوا دوسری چیزوں کو بھی وہ اپنی عبادت میں شریک کیے ہوئے ہے۔ وہ یا تو بےحسی کا شکار ہے یا کسی دوسری مشغولیت کو اس نے اپنی زندگی میں وہ مقام دے رکھا ہے جو دراصل خدا کا ہونا چاہیے۔

مسجدوں کی صف بندی دراصل خدا کے دربار میں کھڑے ہونے کا وقت ہے۔ جو اس اہم ترین وقت پر خدا کے گھر میں نظر نہ آئے یا دیر سے پہنچے وہ گویا اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کو خدا کی پکار سے زیادہ اپنے نفس کی پکار عزیز ہے۔ عین اس وقت بھی وہ اپنے آپ کو دوسرے مشاغل میں معروف رکھتا ہے جب خدا کے بندے خدا کے حضور کھڑے ہو رہے ہوتے ہیں۔ ایسے آدمی کے متعلق یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ خدا کی یاد سے غافل ہے۔

ایک امام کا واقعہ ہے۔ ان کی مسجد کے نمازی عموماً دیر کر کے نماز کے لیے آتے تھے۔ ایک روز نماز شروع ہوئی تو حسب دستور پیچھے چند آدمی موجود تھے، اور جب امام نے سلام پھیرا تو پوری صف کھڑی ہوئی نظر آئی۔ یہ منظر دیکھ کر بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا۔ "کاش اللہ تعالیٰ مجھے متقیوں کا امام بنائے۔ ایسے لوگوں کی امامت نے تو مجھے بیزار بنا دیا ہے ان کا حال یہ ہے کہ جب نماز شروع ہو چکی ہے یا اس کا ایک حصہ گزر جاتا ہے تو وہ بھاگم بھاگ آتے ہیں اور دائیں بائیں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بخدا یہ وہ نماز نہیں ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو مطلوب ہے۔ یہ کسل کے ساتھ خدا کی عبادت کے لیے اٹھنا ہے جس کو ذکر قلیل کہا گیا ہے یا وہ صلوٰۃ سہو ہے جس پر قرآن میں سخت وعید آئی ہے۔"

خاص طور پر صبح کی نماز جو صلوٰۃ مشہود ہے٭ (بنی اسرائیل - ۷۸) اس میں جو شخص وقت پر نہیں پہنچتا یا اس سے غیر حاضر رہتا ہے وہ تو اپنے آپ کو اس خطرے میں ڈال رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کا لباس اس سے اتار لیا جائے اور شیطان کے مقابلہ میں اس کے پاس کوئی پناہ باقی نہ رہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:۔

مَنْ صَلَّى صَلٰوةَ الصُّبْحِ فَهُوَ فِيْ ذِمَّةِ اللّٰهِ فَلَا يَطْلُبَنَّكُمُ اللّٰهُ مِنْ ذِمَّتِهٖ بِشَيْءٍ فَإِنَّهٗ مَنْ يَطْلُبْهُ مِنْ ذِمَّتِهٖ بِشَيْءٍ يُدْرِكْهُ ثُمَّ يَكُبَّهٗ عَلٰى وَجْهِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ۔ (مسلم)

جس نے صبح کی نماز ادا کر لی وہ اللہ کے ذمہ میں آگیا۔ پس ایسا نہ ہو کہ اللہ تم سے اپنے ذمہ کے متعلق کسی چیز کے بارے میں پوچھے۔ کیونکہ اللہ جس سے اپنے ذمہ کے متعلق کسی چیز کے بارے میں سوال کرے گا وہ اس کو پکڑ لے گا اور اس کو منہ کے بل جہنم میں ڈال دے گا

فجر کی نماز حدیث کے الفاظ میں "اول نہار" کی نماز ہے، وہ دوسری نمازوں کا مقدمہ ہے۔ ہر روز جب صبح کی سپیدی سورج کے آنے کی خبر دیتی ہے تو دو طرح کے مواقع انسان کے لیے کھلتے ہیں۔ ایک دنیا کا کام، دوسرا آخرت کا کام۔ عین اس وقت مؤذن بلند مقام پر کھڑے ہو کر آواز دیتا ہے:۔

حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ، حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ — آؤ نماز کی طرف، آؤ کامیابی کی طرف۔

یہ پکار انسان کو دعوت دیتی ہے کہ وہ دن کی سرگرمیوں کو شروع کرنے سے پہلے خدا کے گھر میں آئے اور فجر کی نماز ادا کر کے اپنے اس ارادے کا اظہار کرے کہ وہ آنے والے لمحات کو آخرت کی کامیابی حاصل کرنے میں لگائے گا، وہ آنے والے دن کو خدا کی عبادت میں بسر کرے گا۔ عین اس وقت ایک اور پکارنے والا پکارتا ہے۔ یہ انسان کا دشمن شیطان ہے جو ایک ایک شخص کے دل میں یہ بات ڈالتا ہے کہ وہ اپنے دن کو صرف دنیا حاصل کرنے میں لگائے۔

پہلی پکار دیواروں سے ٹکرا کر واپس آجاتی ہے۔ ہزاروں کی آبادی میں صرف چند ایسے لوگ مسجد کے لیے نکلتے ہیں جو بوڑھے ہو چکے ہیں یا کسی اور کام کے قابل نہیں رہے ہیں۔ مگر دوسری پکار کو سن کر ہر شخص اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، کسان اپنے کھیتوں کی طرف چل پڑتے ہیں، تاجر کنجیوں کے بڑے بڑے گچھے لے کر اپنی دکانوں کی طرف

٭ صلوٰۃ مشہود کے لفظی معنی حضوری کی نماز، یعنی صبح کی نماز۔

روانہ ہو جاتے ہیں۔ ملازم اپنے دفتروں کی تیاری شروع کر دیتے ہیں اور بہت سے لوگ جنہیں صرف آرام عزیز ہے سہانے وقت میں اپنے نرم بستروں سے لپٹ جانے کو موزوں ترین خیال کرتے ہیں۔
کس قدر غافل ہے انسان جو اس وقت بھی محروم رہتا ہے جب کہ پانے کے امکانات سب سے زیادہ ہوں۔ ایک دروازہ جو ہر روز انسان کے لیے کھلتا ہے مگر نادان انسان ہر روز اسے اپنے اوپر بند کر لیتا ہے۔
صلوٰۃ خشوع کی دوسری پہچان یہ ہے کہ نماز میں آدمی کا جھکنا اس کی پوری زندگی میں اسی قسم کے جھکاؤ کا عنوان بن جاتا ہے۔ اس کا رکوع اور سجدہ دراصل اس بات کا ایک عملی اقرار ہے کہ اس نے پوری زندگی خدا کے آگے ڈال دی ہے، وہ مکمل طور پر خدا کے حکم کا پابند بن چکا ہے۔ اسی لیے قرآن میں کہا گیا ہے:
اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (عنکبوت۔ ۴۵) نماز بدکاریوں اور برائیوں سے روکتی ہے۔
ایک نبی نے جب لوگوں کو خدا کا عبادت گزار بننے کی دعوت دی تو ان کی قوم، جس نے اپنی زندگی کی باگ اپنے نفس کے حوالے کر دی تھی اور کسی دوسرے نظام اطاعت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھی، اس نے جواب دیا:
یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا
اے شعیب! کیا تمہاری نماز کہتی ہے کہ ہم ان چیزوں کی عبادت چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں اور ہمارے مالوں میں ہماری مرضی کا کوئی دخل نہ ہو۔
ہود۔ ۸۷
اس سے معلوم ہوا کہ نماز محض رسمی قسم کی پوجا نہیں ہے بلکہ وہ اپنے وجود اور تمام اثاثے کو خدا کے آگے ڈال دینے کا نام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ خدا کے حضور جھک کر زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ "میرے آقا تو مجھے حکم دے، میں تیرے حکم کی تعمیل کروں گا"۔ اس اقرار کے باوجود اگر آپ کسی کو دیکھیں کہ اس کی مسجد کی نماز اس کی پوری زندگی کی نماز نہیں بنی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ابھی تک صلوٰۃ خشوع سے محروم ہے۔ قرآن کی تصریح کے مطابق جس نماز کے ساتھ "اتباعِ شہوات" پایا جا رہا ہو، وہ ایسی نماز ہے جس سے روح صلوٰۃ ضائع ہو چکی ہے (مریم۔ ۵۹)
بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ان کی نمازیں بہت اچھی نہ سہی تاہم وہ نماز تو پڑھ لیتے ہیں اور یہ بھی بہرحال فرض کی ادائگی کے لیے کافی ہے۔ مگر یہ صرف شیطان کا دھوکہ ہے۔ یاد رکھیے اللہ تعالیٰ کو جو چیز مطلوب ہے وہ ذکر قلیل نہیں، بلکہ ذکر کثیر ہے۔ ذکر قلیل کو تو منافقوں کی پہچان بتایا گیا ہے۔ (نساء۔ ۱۴۲)
صلوٰۃ خشوع کی تیسری اور آخری پہچان یہ ہے کہ بندہ جب نماز میں مشغول ہو تو وہ اپنے آپ کو خدا سے بالکل قریب محسوس کرے، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:
وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (علق ۱۹) سجدہ کر اور قریب ہو جا
یہ سجدۂ قربت کیا چیز ہے، اس کو شاید لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جب آدمی اس عالم میں پہنچتا ہے تو اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ ایک ان دیکھی حقیقت کو کامل یقین کے ساتھ دیکھ رہا ہے۔ ایک بعید ترین چیز سے

انتہائی طور پر قریب ہے، کسی مخاطب کی موجودگی کے بغیر کامیاب ترین گفتگو میں معروف ہے۔ ایک سب سے زیادہ چہیتی چیز کے لیے اپنے اندر سب سے زیادہ محبت کے جذبات پا رہا ہے۔ ایک چیز جس کو بظاہر کسی بھی واسطے کے ذریعہ محسوس نہیں کیا جا سکتا، کسی واسطے کے بغیر وہ اس تک پہنچ گیا ہے۔

گویا سجدہ جو نماز کی انتہائی حالت ہے، وہ بیک وقت خدا سے قریب ہونے کی بھی انتہائی حالت ہے۔ نماز کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے یہ انتظام کیا ہے کہ ہم دنیا میں رہتے ہوئے اس کی معیت اور قربت حاصل کر سکیں۔ نماز کے ذریعہ آدمی جب اپنے آپ کو خدا کی طرف متوجہ کرتا ہے تو وہ روحانی طور پر خدا سے جڑ جاتا ہے وہ یاد الہٰی کی ایسی حالت اپنے اوپر طاری کرتا ہے جب کہ وہ مکمل طور پر ایک حیاتی وجود بن جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لیے اپنے آپ کو خدا کے اندر گم کر دیتا ہے۔ وحدت وجود کا تصور غالباً اپنی ابتدائی شکل میں محض اس کیفیت کو بتانے کے لیے تھا جو تصور الہٰی میں غرق ہونے کے وقت آدمی کے اوپر طاری ہوتی ہے۔ مگر بعد کو منطقی تعین کی کوشش نے اس کو ہمہ اوست کے ناقابل فہم فلسفے تک پہنچا دیا۔ اگر اس بدنام عقیدے کے متعلق میری تشریح کو صحیح مانا جائے اور اس کو محض حیاتی ارتباط کے مفہوم میں لیا جا سکے تو میں کہوں گا کہ سجدۂ قربت کے وقت آدمی پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کے اظہار کے لیے شاید انسانی زبان میں یہ ایک قریب ترین تعبیر ہے۔ جب سپردگی کا لمحہ آتا ہے، جب عجز اور محدودیت کا پیکر اپنے آپ کو لامحدود کمال کے حوالے کر دیتا ہے، جب پیشانی اس طرح کھنچ اٹھتی ہے گویا وہ زمین سے چپک گئی ہے۔ اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے گویا قطرہ نے اپنے آپ کو سمندر میں ڈال دیا ہے، گویا انسان خدا سے جا ملا ہے۔

خاتمہ

یہ تلاوت حق اور صلوٰۃ خشوع کی مختصر ترین تشریح ہے جو میں نے آپ کے سامنے کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کچھ نئی باتیں نہیں ہیں۔ ہر وہ شخص جس نے قرآن کو پڑھا ہے وہ ان باتوں کو بخوبی جانتا ہے۔ مگر اس کے باوجود میں نے آج آپ کے سامنے ان کو اس لیے دہرایا ہے تاکہ انھیں یاد دلا کر آپ سے یہ عہد لوں کہ آپ ان کو اپنی زندگیوں میں شامل کریں گے۔ آپ میں سے ہر شخص کو کسی دوسرے سے نہیں بلکہ خود اپنے آپ سے اس معاہدہ پر بیعت کرنا ہے کہ وہ اپنے علم کو اپنا احساس بنائے گا۔ وہ جو کچھ جانتا ہے اس کو محسوس کرنے کی کوشش کرے گا۔ اگر آپ سچ مچ یہ اقرار کریں تو یقین مانیے کہ یہ کائنات آپ کے لیے سلام و مرحبا کی آواز سے اس طرح گونج اٹھے گی کہ آپ کے کان اس کی آواز سنیں گے، اور آپ کے لیے خدا کی جنت کے دروازے اس طرح کھول دیے جائیں گے کہ آپ جیتے جی اس کی خوشبو محسوس کریں گے۔

اور اگر آپ اس عہد کے لیے تیار نہ ہوں تو وہ سب کچھ جو اجالے میں ہے اور وہ سب کچھ جو اندھیرے میں چھپا ہوا ہے، گواہ ہے کہ خدا کے یہاں اب آپ کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ یہ کہہ کر کہ آپ ان باتوں کو پہلے سے جانتے ہیں، آپ نے خود اپنے اوپر حجت تمام کر دی ہے۔ اس کے بعد بھی اگر آپ اپنے کو نہیں بدلتے تو مجھے نہیں معلوم کہ آپ کے پاس وہ کونسا سہارا ہے جس کے بل پر آپ رب العالمین کے سامنے اتنی بڑی جسارت کر رہے ہیں۔ (زندگی ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ

تقریر اجتماع جماعت اسلامی ہند، بمقام بدایوں، ۱۶/۱۷ اپریل ۱۹۶۱ء)

صنعتی نظام کا تضاد

ایرک گِل (ERIC GILL) نے لکھا ہے:

"ہمیں کارخانوں میں انسانوں کی ضرورت نہیں، مشینیں ان سے بہتر ہیں۔ ان کی ایجاد اور استعمال کا سب سے بڑا مقصد انسانی محنت کی بچت ہے، لہٰذا ہمیں مشینوں کو نہیں، انسانوں کو ختم کرنا ہے مگر وہ انسان جسے ہم دنیا سے مٹا دینا چاہتے ہیں۔ وہ وہ انسان ہے جو کارخانہ میں کام کرتا ہے نہ کہ محلّہ میں بسنے والا انسان۔ محلّوں رہنے والے انسان ہمارے ساتھی ہیں۔ وہ ہمارے دوست ہیں۔ کیونکہ وہ ہمارا مال خریدتے ہیں۔ آج کل سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح پیدائش میں انسانی محنت کے دخل کو ختم کیا جائے، اور دوسری طرف صارفین (CONSUMERS) کی تعداد اور ان کی قوت خرید کو بھی بڑھایا جائے۔ یہی ہمارا بنیادی مسئلہ ہے۔ جڑ بھی یہی ہے اور شاخ بھی یہی ہے۔"

صنعتی نظام کا وہ مسئلہ ہے جس کا کوئی حل اس کے موجودہ ڈھانچہ میں نہیں۔ قدیم زمانہ میں انسان اپنی محنت سے پیداوار تیار کرتا تھا اور انسان ہی اسے خریدتا تھا۔ اس طرح اقتصادی عمل کے اندر کوئی تضاد نہیں تھا۔ اب ٹکنالوجی کے دور میں مشین پیداوار تیار کرتی ہے۔ جب کہ اشیاء کو خریدنے والے اب بھی انسان ہی ہیں۔ اس صورت حال نے اقتصادی عمل کے درمیان تضاد پیدا کر دیا ہے۔ یعنی انسان اور پیداوار کے درمیان فاصلہ۔ جدید صنعتی نظام ایک طرف پیداوار کو پُرفخر طور پر بڑھاتا ہے، دوسری طرف خریداروں کو مسلسل گھٹا رہا ہے۔ مشین کی ترقی یہ ہے کہ وہ کام کرنے والوں کی تعداد کو انتہائی حد تک کم کر دے۔ مگر یہ بھاری مشینیں جو پیداوار نکالتی ہیں، ان کو کھپانے کے لئے دوبارہ بڑھتے ہوئے خریداروں کی ضرورت ہے۔ یہ خریدار کہاں سے آئیں جب کہ خود مشین ہی نے پورے اقتصادی عمل پر قبضہ کر کے ان کو بے روزگار کر دیا اور نتیجۃً ان کی قوت خرید کو ختم کر دیا۔

یہ ہے وہ تضاد جس سے آج کا صنعتی نظام دوچار ہے۔ اس کی جو کامیابی ہے، وہی اس کی ناکامی بن گئی ہے۔ اس کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ بھاری مشینیں ایجاد کر کے کام کرنے والوں کی تعداد گھٹا دے۔ مگر کام کرنے والوں کی تعداد کو گھٹانا عملاً خریداروں کی تعداد کو گھٹا دینا ہے۔ اس طرح مشینی عمل کے معنی بالآخر یہ ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے ٹکنکل کمالات سے جو قیمتی پیداوار تیار کرے، خود اس کے اپنے عمل کے نتیجہ میں اس کو بازار سے اٹھانے کے لئے خریدار موجود نہ ہوں۔

کارل مارکس (۱۸۸۳-۱۸۱۸) کی کتاب سرمایہ (DAS KAPITOL) کا پہلا ایڈیشن جرمن زبان میں چھپا تو اس کے فروخت ہونے میں اتنے سال لگ گئے کہ کہا جاتا ہے کہ اس کی آمدنی کارل مارکس کے سگار کا خرچ بھی پورا نہیں کر سکتی تھی۔ مگر اسی کارل مارکس کی کتابوں، اس کے ترجموں اور اس کی تشریحات پر آج اتنے بے شمار ادارے قائم ہیں جن سے لاکھوں لوگوں کو قیمتی روزگار مل رہا ہے۔

کام صرف وہ ہے جو خود اپنے مثبت فکر کے زور پر وجود میں آئے۔ خارجی حالات کے خلاف ردعمل کے طور پر جو چیز ظاہر ہو، وہ کام نہیں، جذباتی ابال ہے۔ اس قسم کا جذباتی ابال وقتی شور و شر تو ضرور پیدا کرسکتا ہے۔ مگر اس سے کسی حقیقی نتیجہ کی امید کرنا ایسا ہی ہے جیسے کتے کی بھونک سے بلبل کے نغمہ کی توقع کی جائے۔

نادانی کی چھلانگ

حکایت ہے کہ کسی زمانہ میں بہت بڑا سیلاب آیا۔ ایک بندر اور ایک مچھلی اس میں پھنس گئے۔ بندر تیز تھا۔ چھلانگ لگا کر ایک درخت پر چڑھ گیا اور ایک شاخ پر جا بیٹھا جہاں وہ سیلاب کی طوفانی موجوں سے محفوظ تھا۔ اب اس نے نیچے نظر ڈالی تو دیکھا کہ مچھلی امنڈتی ہوئی لہروں کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہے۔ اس نے سمجھا کہ مچھلی طوفان میں پھنس گئی ہے۔ وہ پوری ہمدردی اور نیک نیتی کے ساتھ نیچے آیا اور مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا۔ اس کے بعد جو نتیجہ نکلا وہ ظاہر ہے۔

نادان دوستی کی یہ تمثیل ایڈیسن کی زندگی میں واقعہ بن چکی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایڈیسن ایک کتا پالے ہوئے تھا جو اس کو بہت محبوب تھا۔ ایک روز ایڈیسن کا کتا اس کے مطالعہ کے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ میز پر اس کے ضروری کاغذات پھیلے ہوئے تھے اور کروسین کا لیمپ جل رہا تھا۔ ایک پتنگا کہیں سے کمرے میں داخل ہوگیا اور لیمپ کے گرد منڈلانے لگا۔ کتا دیر تک یہ منظر دیکھتا رہا۔ آخر اس کو گوارا نہ ہوا کہ اس کے آقا کی میز پر ایک پتنگا قابض ہو جائے۔ اس نے اس کو پکڑنے کے لئے ایک چھلانگ لگائی۔ پتنگا تو اڑ گیا، البتہ لیمپ الٹ گیا اور میز پر تیل پھیل جانے کی وجہ سے فوراً آگ لگ گئی اور کاغذات جل گئے۔ ایڈیسن نے دیکھا تو کہا:

"میرے محبوب کتے! تجھے نہیں معلوم کہ تو نے کیا کیا!"

موجودہ زمانے میں ہمارے رہنماؤں نے بھی حیرت انگیز طور پر اسی قسم کے کارنامے دکھائے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اصلاح ملت اور احیائے اسلام کا نعرہ لے کر اٹھا۔ مگر ہر ایک نے ایسی نادانی کی چھلانگیں لگائیں کہ اصل مقصد تو حاصل نہیں ہوا البتہ نئے نئے مسائل اور نئی نئی پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں جس کے نتیجہ میں مسئلہ پہلے سے بھی زیادہ گمبھیر ہوگیا۔ نادانی کے اقدام سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ کوئی اقدام ہی نہ کیا جائے۔

تاریخ کو انتظار ہے

رابطۂ عالم اسلامی (مکہ) نے دو سو صفحات پر مشتمل ایک عربی کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے: لماذا اسلمنا (ہم نے اسلام کیوں قبول کیا) اس کتاب میں موجودہ زمانہ کے ۴۴ نومسلموں نے خود اپنے قلم سے اپنے حالات لکھے ہیں۔ ان میں سے چند جاپانی ہیں۔ ان لوگوں نے نہایت شدت اور یقین کے ساتھ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ جاپان میں اسلام کی اشاعت کے غیر معمولی امکانات ہیں۔ علی محمد موری جاپانی لکھتے ہیں کہ جاپان جغرافی طور پر روس اور امریکہ کے درمیان پایا جاتا ہے اس لئے دونوں بلاک جاپانی قوم کے اندر اپنے اثرات پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر دونوں میں سے کوئی بھی کامیاب نہیں۔ کیوں کہ جاپان کے روحانی سوال کا جواب ان میں سے کسی کے پاس نہیں ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جاپانی نوجوانوں میں نئے آدرش کی تلاش کا جذبہ شدت سے ابھرا۔ اس موقع سے عیسائی مبلغین نے فائدہ اٹھایا اور جاپان کی نئی نسل میں عیسائیت پھیلنے لگی۔ مگر بہت جلد وہ اس سے متوحش ہو گئے۔ کیونکہ انھیں محسوس ہوا کہ عیسائی مشنریوں کے پیچھے برطانوی اور امریکی استعمار کے مقاصد کام کر رہے ہیں (۱۵۴)

عمر میتا جاپانی جنھوں نے جاپانی زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا ہے، لکھتے ہیں کہ جاپان میں اسلام کے لئے ایک عظیم مستقبل ہے۔ جاپانی قوم سچے دین کی پیاسی ہے وہ کسی مذہبی تعصب میں بھی گرفتار نہیں۔ اس لئے اگر اس کے سامنے دین فطرت کو پیش کیا جائے تو وہ بہت تیزی سے اس کی طرف بڑھے گی۔ انھوں نے دنیا کے مسلمانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ ایسے افراد کو جاپان بھیجیں جو اس قوم کو خدا کا سچا پیغام پہنچا سکیں۔ (۱۵۱)

محمد سلیمان تاکیوتشی جاپانی لکھتے ہیں کہ جاپان کے موجودہ حالات اسلام کی اشاعت کے لئے انتہائی موزوں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جاپان مادی ترقی کی انتہا پر پہنچ کر روحانی مایوسی سے دوچار ہے۔ کیونکہ یہ ترقیاں اس کی روح کو تسکین نہ دے سکیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جاپان میں مناسب انداز سے اسلام کی اشاعت کی جائے تو صرف دو تین نسلوں میں سارے ملک میں اسلام پھیل جائے۔ اور اگر ایسا ہو جائے تو یہ شرق اقصیٰ میں اسلام کی عظیم نصرت کے ہم معنی ہوگا اور بالآخر ساری نوع انسانی تک اس کے اثرات پہنچیں گے (۱۶۷)

ہر پیدا ہونے والا فطرت الٰہی پر پیدا ہے۔ معبود کی طلب انسان کی پیدائشی ساخت میں اس طرح شامل ہے کہ اس کو کسی طرح اس سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس فطری طلب پر موجودہ زمانہ میں مزید یہ اضافہ ہوا ہے کہ مادی تہذیب سے مایوسی نے ساری دنیا میں ایک نئی تلاش کا جذبہ ابھار دیا ہے۔ ان حالات نے آج دین حق کی اشاعت کے ایسے امکانات کھول دئے ہیں جو اس سے پہلے کبھی حاصل نہ تھے۔

اپریل ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں کانگریس کی شکست سے پہلے جو شخص وزیر اعظم کے بعد ملک کا دوسرا سب سے طاقتور آدمی سمجھا جاتا تھا، وہ یہاں ہتھکڑی میں بندھا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔

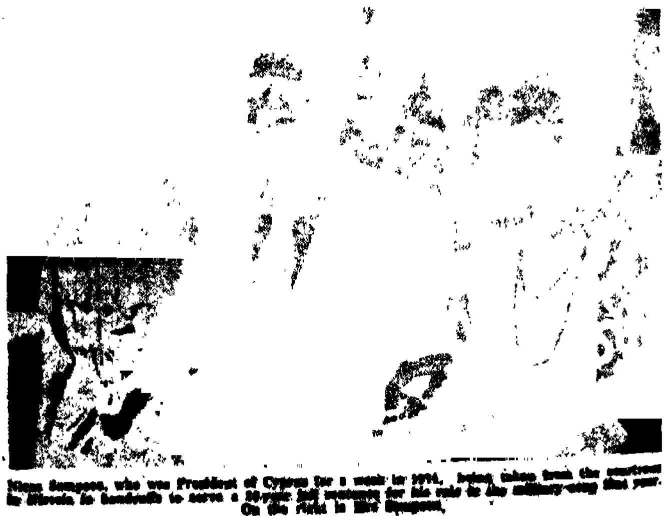
موت بھی اسی قسم کی ایک گرفتاری ہے۔ وہ تمام دوسری گرفتاریوں سے زیادہ سخت ہے کیونکہ وہ زمین و آسمان کے مالک کی طرف سے اس کے بندوں کی گرفتاری ہے۔ گرفتاری کا یہ دن ہر آدمی کی طرف دوڑا چلا آ رہا ہے۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ "بنسی لال" کی گرفتاری سے تو خوب واقف ہیں۔ مگر خود اپنی گرفتاری کی انھیں خبر نہیں۔ یہ خدائی گرفتاری کا دن اتنا ہولناک ہے کہ اگر آدمی کو اس کا واقعی احساس ہو جائے تو وہ ہر گرفتاری کو اپنی گرفتاری سمجھے۔ دوسرے کے ہاتھ میں ہتھکڑی لگتی ہوئی دیکھے تو اس کو ایسا محسوس ہو گویا خود اسی کو باندھا جا رہا ہے۔



Mr Bansi Lal, former Defence Minister, at the city police station, Bhiwani, in handcuffs before he was taken to the district court on Wednesday.

سابق وزیر اعلیٰ ہریانہ اور سابق وزیر دفاع شری بنسی لال ۲۳ اگست ۱۹۷۷ء کو ہریانہ میں گرفتار کر لیے گئے۔ ان پر الزام تھا کہ انھوں نے ہریانہ یوتھ کانگریس فنڈ کا پانچ لاکھ روپیہ خورد برد کیا ہے۔

قبرص میں ۱۹۷۴ء میں فوجی انقلاب ہوا اور نکوس سیمپسن صدر ہو گئے۔ ان کی صدارت ہو گئے۔ ان کی صدارت اس کے بعد دوبارہ انقلاب ہوا۔ نکوس سیمپسن کو صدارت کے عہدہ سے معزول کر کے گرفتار کر لیا گیا۔ عدالت نے ان کو ۲۰ سال قید کی سزا سنائی۔ تصویر میں ان کو ہتھکڑی پہنا کر جیل لے جایا جا رہا ہے۔



Nicos Sampson, who was President of Cyprus for a week in 1974, being taken from the courtroom in Nicosia in handcuffs to serve a 20-year jail sentence for his role in the military coup that year. On the right is Mrs Sampson.

الاسلام

مؤلف:
مولانا وحیدالدین خاں

صفحات ۲۴۰ — قیمت مجلد مع پلاسٹک کور پندرہ روپے

قیمت مجلد بغیر پلاسٹک کور تیرہ روپے

دین کی حقیقت، تعلیمات قرآن کی حکمتیں، سیرت رسول کا انقلابی سبق
موجودہ زمانہ میں اسلام کے مسائل، دین کا تجدید و احیاء
امت مسلمہ کی تعمیر، دعوت اسلامی کے جدید امکانات —

ان موضوعات کے گہرے مطالعہ کے لئے "الاسلام" پڑھئے۔
جدید سائنٹفک اسلوب میں، نہایت دلچسپ اور معلومات سے بھرپور۔

اداروں، طالب علموں، نیز کم آمدنی والوں کے لئے غیر معمولی رعایت
تاجروں اور ایجنٹوں کے لئے خصوصی کمیشن

قیمت — بذریعہ منی آرڈر بھیج کر طلب فرمائیں
کتاب کی روانگی کا ڈاک خرچ ادارہ کے ذمہ ہوگا۔
بیرونی ممالک کے لئے تیس روپے یا اس کے مساوی رقم

الدار العلمیہ، جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی-۶

AL-DARUL ILMIYYA, JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI 6 (India)

ایک شخص مقام اضطرار پر ہو تو صرف دعا کے کلمات ہی نصرتِ الٰہی کو کھینچنے کے لئے کافی ہیں۔ مگر جو شخص یا گروہ مقامِ اضطرار پر نہ ہو بلکہ اس کو جدوجہد کے مواقع بھی حاصل ہوں، اس کے لئے دعا کے ساتھ یہ بھی ضروری ہوگا کہ وہ اپنی دعا کے موافق عمل کرے۔ (فاطر - ۱۰)

دعا کے موافق عمل کیا ہے، یہ اس دعا سے متعین ہوتا ہے جو کسی معاملہ میں نصرت کو طلب کرنے کے لئے آدمی مانگ رہا ہو ——— اگر کوئی شخص قرآن کے اسرار و حکم جاننے کی دعا کر رہا ہو تو اس کے لئے اس دعا کے موافق عمل یہ ہوگا کہ وہ کتاب الٰہی میں تدبر کرے۔ کوئی شخص نصرتِ معاش کا طلب گار ہے تو اپنی دعا کے ساتھ اس کو معاش کی راہوں میں اپنی ممکن جدوجہد صرف کرنی ہوگی۔ اغیار کے خلاف نصرتِ رب مطلوب ہے تو اپنے درمیان اتحاد پیدا کرنا ہوگا۔ اعدائے اسلام پر نصرتِ فتح کی دعا کی جا رہی ہے تو اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ ان کے اوپر دعوت الی اللہ کا کام شروع کیا جائے اور اس کو اتمام حجت کی حد تک لے جانے کی کوشش کی جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ کسی گروہ کو پوری طرح آگاہ کرنے سے پہلے ہلاک نہیں کرتا۔

اللہ کا وعدہ ہے کہ اہلِ اسلام اگر ۲۰ ہوں تو اہلِ باطل کے ۲۰۰ پر غالب آئیں گے۔ مگر ضروری ہے کہ دونوں گروہوں کے درمیان یہ فرق باعتبار کمیت ہو نہ کہ باعتبار نوعیت۔ یعنی اہل باطل جس چیز میں "دو سو" ہوں، اہلِ حق کو اسی چیز میں "بیس" ہونا چاہئے۔ اگر ایسا ہو کہ ایک طرف دو سو بندوقیں ہوں اور دوسری طرف بیس تلواریں تو یہ وعدہ متحقق نہ ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں فرق کمیت کا نہ رہا، نوعیت کا ہو گیا۔ اسی طرح اگر اہلِ اسلام کے پاس روایتی علم ہو اور اہل باطل کے پاس سائنسی علم۔ اہل اسلام جوش سے مسلح ہوں اور اہل باطل نے ہوش کا خزانہ جمع کر رکھا ہو، اہل اسلام کے پاس زمانہ سے بے خبری ہو اور اہل باطل کے پاس زمانہ سے آگاہی، اہل اسلام کے پاس اختلاف کا سرمایہ ہو اور اہل باطل کے پاس اتحاد کا۔ اہل اسلام کے پاس بے ترتیبی ہو اور اہل باطل کے پاس منصوبہ بندی، اہل اسلام قدیم قوتوں کے مالک ہوں اور اہل باطل جدید قوتوں کے، تو اہل اسلام کو کبھی یہ توقع نہ رکھنی چاہئے کہ وہ اپنے حریف کے مقابلہ میں نصرتِ خداوندی کے مستحق قرار پا سکتے ہیں۔ کیونکہ ان تمام صورتوں میں دونوں گروہوں کے درمیان نوعی فرق ہے اور جب نوعی فرق پایا جائے تو کسی بھی تعداد پر کوئی نصرت نازل نہیں ہوتی۔ جب بھی ایسا ہو کہ دونوں گروہوں کے درمیان فرق باعتبار نوعیت ہو جائے تو اہل اسلام کا پہلا کام یہ ہوگا کہ اس کو ختم کر کے کمیت کی سطح پر لے آئیں۔ اس کے بعد ہی وہ نصرتِ الٰہی کے مستحق قرار پا سکتے ہیں۔ (الاسلام، صفحہ ۹۲-۹۰)

ایک لیڈر جب وزیر ہو جائے یا کسی بڑے سیاسی عہدہ پر پہنچ جائے تو اس کے بعد اس کے لئے اپنے محلہ میں کوئی کام نہیں رہتا، اس کا کام ہمیشہ کسی ایسے مقام پر ہوتا ہے جو اس سے ہزاروں میل دور ہو۔ اس کے قدموں کے نیچے جو زمین ہے، وہ مسائل کا انبار لئے ہوئے کراہ رہی ہوگی، مگر یہ کراہ اس کو سنائی نہ دے گی، البتہ دور کے کسی مقام پر مسائل انسانی پر ایک سیمینار ہو رہا ہو تو اس کا افتتاح کرنے کے لئے اس کے پاس کافی وقت ہوگا۔ ہمارے حکمرانوں کی اسی روش کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک عظیم ملک اتنی لمبی مدت سے ان کے زیر انتظام ہے، مگر وہ ملک کو اس کے سوا کوئی اور تحفہ نہ دے سکے کہ اس کو مہنگائی، رشوت، بدعنوانی اور بے انصافی سے بھر دیں۔

یہی روایت ہمارے ملی رہنماؤں میں بھی گھس آئی ہے۔ ہمارے رہنماؤں کی پہنچ اتنی بلند نہیں جتنی ملک کے سیاسی عہدہ داروں کی ہوسکتی ہے۔ تاہم اپنے دائرہ میں وہ بھی ٹھیک اسی عمل کو دہرا رہے ہیں جس کا نمونہ ان کے حکمرانوں نے ۳۰ سال سے قائم کر رکھا ہے۔ ہمارے ہر رہنما کا یہ حال ہے کہ اس کے قدموں کے نیچے اس کے لئے کوئی کام نہیں۔ چھوٹے رہنماؤں کی پرواز چند سو میل کے دائرہ تک محدود ہے۔ جو اس سے بڑے ہیں ان کا کام ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع ہوتا ہے اور جو اور بڑے ہیں وہ بین اقوامی دائرہ میں اپنی خدمات انجام دینے کے لئے کام پا رہے ہیں۔ غرض ہر ایک کا کام دور کے کسی علاقہ میں واقع ہے جہاں وہ چند روز کے لئے مہمان بن کر جائے اور اعزازات کے ماحول میں شاندار تقریر کر کے اس طرح لوٹے کہ دوبارہ اسی قسم کے کسی دور دراز مقام پر واقع ایک اسٹیج اس کے جلووں کا انتظار کر رہا ہو۔

بخدا یہ کام کرنے کا طریقہ نہیں۔ اگر ہمارے رہنماؤں کی یہ روش باقی رہی تو ۱۹۴۷ء کے بعد کے دور کو بھی ہم اسی طرح کھو دیں گے جس طرح اس سے پہلے کے دور کو ہم کھو چکے ہیں۔ کام کا یہ طریقہ صرف عالی شان قیادتیں وجود میں لا سکتا ہے وہ عالی شان قوم وجود میں نہیں لا سکتا۔ اس قسم کی قیادتیں قوم کو جو آخری وراثت دے سکتی ہیں، وہ صرف شاندار مقبرے ہیں۔ وہ قوم کو شاندار مستقبل تک نہیں پہنچا سکتیں۔

کیا لوگوں کو یہ ڈر نہیں کہ خدا کے یہاں ان سے پوچھا جائے گا کہ جو مواقع انھیں دیئے گئے تھے ان کو انھوں نے کہاں خرچ کیا۔ یا وہ اتنے نادان ہیں کہ انھیں خبر ہی نہیں کہ اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے انھیں کیا کرنا چاہئے۔

آدم سے مسیح تک

خدا کی طرف سے جتنے رسول آئے، سب اس لئے آئے کہ انسان کو زندگی کی حقیقت سے باخبر کر دیں، یہ حقیقت کہ موجودہ دنیا کی زندگی، انسان کی ابدی زندگی کا صرف ایک امتحانی وقفہ ہے۔ کم و بیش سو سال یہاں زندگی گزار کر ہم اپنی مستقل دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں خدا کے وفادار بندوں کے لئے جنت ہے اور اس کے نافرمان بندوں کے لئے جہنم۔

آدمؑ پہلے انسان بھی تھے اور پہلے رسول بھی۔ اس کے بعد حضرت مسیحؑ تک مسلسل خدا کے پیغمبر آتے رہے۔ ابوامامہ کی روایت میں آیا ہے کہ ابوذر غفاری نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے انبیاء کی تعداد کے بارے میں سوال کیا آپؐ نے فرمایا، ایک لاکھ ۲۴ ہزار۔ ان میں تین سو پندرہ رسول تھے۔ (رواہ احمد و ابن راہویہ فی مسندیھما و ابن حبان فی صحیحہ والحاکم فی المستدرک) خدا کے ان نمائندوں نے مختلف قوموں اور آبادیوں کو اس حقیقت سے باخبر کیا اور خدا سے ڈر کر زندگی گزارنے کی تلقین کی۔ مگر انسانوں میں بہت کم ایسے لوگ نکلے جو اپنی آزادیٔ عمل کو خدا کے حوالے کرنے کے لئے تیار ہوں۔ حضرت یحییٰ کو کوئی ساتھی نہیں ملا اور وہ قتل کر دیئے گئے۔ حضرت لوط نے اپنی قوم کو چھوڑا تو ان کے ساتھ ان کی صرف دو لڑکیاں تھیں۔ حضرت نوح کے ساتھ، ان کی کشتی کا قافلہ، توریت کے بیان کے مطابق، صرف آٹھ افراد پر مشتمل تھا۔ حضرت ابراہیم اپنے وطن عراق سے نکلے تو ان کے ساتھ ان کی بیوی سارہ تھیں اور ان کے بھتیجے لوط۔ [redacted] بعد کو اس قافلہ میں ان کے دو بیٹے اسماعیل اور اسحاق شامل ہوئے۔ حضرت مسیح کو ساری کوشش کے بعد بارہ آدمی ملے، وہ بھی آخر وقت میں آپ کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔

بیشتر انبیاء کا حال یہی رہا ہے۔ کوئی تنہا رہ گیا کسی کو چند ساتھ دینے والے ملے۔ ان چند میں بھی زیادہ تر ان کے اپنے اہل خاندان تھے جن سے رشتے کا تعلق نبی کا ساتھ دینے کے لئے ایک اضافی محرک بن گیا۔ قرآن کی یہ آیت اس پوری تاریخ پر ایک تبصرہ ہے:

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ

افسوس ہے بندوں کے حال پر جب بھی ان کے پاس کوئی رسول آیا تو انھوں نے اس کی ہنسی اڑائی۔

انسانی نسل میں خدا کے نزدیک سب سے اہم ہستیاں وہ ہیں جن کو پیغمبر کہا جاتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ ساری تاریخ میں یہی لوگ سب سے زیادہ غیر اہم رہے ہیں۔ بادشاہوں اور سپہ سالاروں کے واقعات تاریخ نے مکمل طور پر ضبط کئے۔ مگر آدم سے مسیح تک کوئی نبی ایسا نہیں جس کو باقاعدہ طور پر مدون تاریخ میں جگہ ملی ہو۔ حتیٰ کہ بیشتر رسولوں کے نام تک ہم کو معلوم نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تقریباً تمام انبیاء کے ساتھ یہ صورت پیش آئی کہ ان کی قوم نے ان کو رد کر دیا۔ ان کے گھروں کو اجاڑا گیا، ان کو معاشرہ میں بے قیمت کر کے رکھ دیا گیا، ان کو

ایسا بنا دیا گیا گویا وہ اتنے غیر اہم لوگ ہیں جن کا ذکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

نبیوں کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا گیا۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے: اپنی مخاطب قوموں کی روش پر تنقید۔ انسان کو سب سے زیادہ جو چیز محبوب ہے، وہ ہے اپنی تعریف۔ اور جو چیز سب سے زیادہ مبغوض ہے، وہ ہے اپنے خلاف تنقید۔ انبیاء چونکہ صحیح اور غلط کو بتانے کے لئے آتے ہیں، وہ اپنے ہم قوموں سے مصالحت نہیں کرتے۔ وہ ان کی اعتقادی اور عملی غلطیوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس لئے قوم ان کی مخالف بلکہ دشمن ہوجاتی ہے۔ انبیاء اگر لوگوں کی دل پسند تقریریں کرتے تو کبھی ان کو اس صورت حال سے دوچار ہونا نہ پڑتا۔

اس عمومی انجام میں صرف چند نبیوں کا استثناء ہے۔ مثلاً حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت یوسف علیہم السلام۔ مگر ان حضرات کو جو عروج و اقتدار ملا، وہ ان کے نظریات کی عوامی مقبولیت کا نتیجہ نہ تھا۔ اس کے اسباب بالکل دوسرے تھے۔

حضرت داؤد اسرائیلی بادشاہ ساؤل کی فوج میں ایک نوجوان سپاہی تھے۔ ان کے زمانہ میں اسرائیلیوں اور فلسطیوں میں جنگ ہوئی۔ فلسطی فوج میں جالوت نام کا ایک دیو ہیکل پہلوان تھا جس سے مقابلہ کرتے ہوئے تمام لوگ ڈرتے تھے۔ بادشاہ نے اعلان کیا کہ جو شخص اس کو قتل کرے گا میں اپنی لڑکی کی شادی اس سے کردوں گا۔ حضرت داؤد نے مقابلہ کیا اور اس کو مار ڈالا۔ اس طرح وہ اسرائیلی بادشاہ کے داماد بن گئے۔ اس کے بعد جب ایک جنگ میں بادشاہ اور اس کا ولی عہد دونوں ہلاک ہوگئے تو تخت حضرت داؤد کے حصہ میں آگیا۔ حضرت سلیمان آپ کے بیٹے تھے اور ان کو حکومت اپنے باپ سے وراثت میں ملی۔ حضرت یوسف کو تعبیر خواب کا علم دیا گیا۔ اس سے مصر کا مشرک بادشاہ متاثر ہوگیا، اور اپنے اقتدار اعلیٰ کے تحت حکومتی انتظامات آپ کے سپرد کردیئے۔ تاہم بادشاہ اور عام مصری باشندے بدستور اپنے مشرکانہ دین پر قائم رہے۔

اس صورت حال کا نقصان صرف یہی نہیں ہوا کہ ہر دور کی بیشتر آبادی خدا کی نعمت ہدایت سے محروم رہی۔ اس سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ کوئی پیغمبر خدا کی طرف سے جو کتاب اور پیغامات لے کر آتا تھا، اس کے بعد اس کو محفوظ رکھنے کا سامان نہ ہوسکا۔ کیونکہ پیغمبر کے بعد اس کے متبعین ہی اس کو محفوظ رکھ سکتے تھے۔ مگر وہ یا تو حاصل نہیں ہوئے یا اتنے کم تھے کہ سماج کے علی الرغم کلام الٰہی کی حفاظت نہ کرسکتے تھے۔

خدا جس کا علم ازل سے ابد تک پھیلا ہوا ہے، جو آنے والے مستقبل کو بھی اسی طرح دیکھ رہا ہے جس طرح گزرے ہوئے ماضی کو، اسے انسانیت کا یہ انجام معلوم تھا۔ اس لئے اس نے پہلے ہی یہ مقدر کردیا تھا کہ پیغمبرانہ دور کے آخری مرحلہ میں وہ اپنا ایک خاص نمائندہ بھیجے گا۔ اس پیغمبر کو دعوت دین کے ساتھ اظہار دین کی نسبت بھی حاصل ہوگی۔ اس کو یہ نصرت خاص دی جائے گی کہ وہ ہر حال میں اپنے مدعوئین پر غلبہ حاصل کرنے اور ان کو حق کے آگے جھکنے پر مجبور کرے (لن اقبضه حتى يقيم به الملة العوجاء) خدا کی فوج اس کا ساتھ دے کر اس کے مخالفوں کو زیر کرے گی، تاکہ خدا کا دین ہمیشہ کے لئے مضبوط بنیادوں پر قائم ہوجائے، اور خدا کی کتاب کی حفاظت کا مستقل انتظام ہوسکے۔ بائبل کے

کے الفاظ میں "جس طرح سمندر پانی سے بھرا ہوا ہے، اسی طرح زمین خداوند کے جلال کے عرفان سے معمور ہو (حبقوق ۲:۱۴)

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس منصوبہ کو، بائبل کی شہادت کے مطابق، ہزاروں برس پہلے سے مختلف انبیاء کے ذریعہ ظاہر کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ بتا دیا گیا تھا کہ وہ نبی عرب کے صحرائی جغرافیہ سے اٹھے گا۔ وہ بنی اسرائیل کے بقیہ گھرانے یعنی ان کے بھائیوں (بنی اسماعیل) کی اولاد سے ہوگا۔ وہ حضرت مسیح کے بعد آئے گا۔ اس کے ساتھی خدا کے خریدے ہوئے کہلائیں گے۔ جو قومیں ان سے ٹکرائیں گی پاش پاش ہو جائیں گی۔ ازلی پہاڑ (ایران و روم) جھک جائیں گے۔ اس کی سلطنت خشکی سے لے کر بحری ممالک تک پھیلی ہوئی ہوگی۔ وغیرہ

موجودہ بائبل اگرچہ ترجمہ اور الحاقات کے نتیجہ میں اصل بائبل سے بہت کچھ مختلف ہو چکی ہے۔ تاہم آج بھی کثیر تعداد میں اس کے اندر ایسے بیانات موجود ہیں جو ایک غیر جانب دار آدمی کے لئے آنے والے آخری نبی کے سوا کسی اور پر صادق نہیں آتے۔ خاص طور پر حضرت مسیح علیہ السلام کی تشریف آوری کا تو خاص مشن یہی تھا کہ وہ دنیا کو خصوصاً یہود کو آنے والے نبی سے آخری طور پر آگاہ کر دیں۔ آپ نے جس "نئے عہد نامہ" کی بشارت دی وہ حقیقۃً اسلام تھا جو یہود کی معزولی کے بعد بنی اسماعیل کے ذریعہ باندھا گیا۔ انجیل نئے عہد نامہ کی بشارت ہے نہ کہ خود نیا عہد نامہ۔

حضرت مسیح علیہ السلام، نبی آخر الزماں سے چھ سو سال قبل تشریف لائے۔ قرآن کی سورہ نمبر ۶۱ میں ارشاد ہوا ہے کہ حضرت مسیح نے فلسطین کے یہودیوں سے کہا کہ اللہ نے مجھے ایک آنے والے نبی سے پہلے اس کا مبشر بنا کر بھیجا ہے جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد ہوگا (الصف — ۶)

احمد اور محمد دونوں ہم معنی الفاظ ہیں جن کے معنی ہیں "تعریف کیا ہوا"۔ انجیل برناباس میں صاف صاف لفظ "محمد" آیا ہے۔ تاہم چونکہ مسیحی حضرات انجیل برناباس کو جعلی انجیل کہتے ہیں، اس لئے ہم اس کا حوالہ مناسب نہیں سمجھتے۔ نیز ہمیں اس میں شبہ ہے کہ حضرت مسیح نے اپنی پیشین گوئی میں لفظ احمد یا محمد کہا ہوگا۔ زیادہ قرین قیاس بات یہ ہے کہ آپ نے احمد یا محمد کے ہم معنی کوئی لفظ استعمال فرمایا۔

محمد بن اسحاق (م ۱۵۲ھ) کی ایک روایت جو ابن ہشام نے نقل کی ہے، اس کے مطابق یہ لفظ غالباً مُنْحَمَنّا تھا۔ ابن اسحاق سیرت کے موضوع پر سب سے زیادہ اہم ماخذ سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی روایت ہے کہ مجھے بتانے والوں نے بتایا کہ یحنس (یوحنا) کی انجیل میں آنے والے رسول کی جو پیشین گوئی ہے، اس میں اس کا نام منحمنا بتایا گیا ہے (تہذیب سیرۃ ابن ہشام جلد اول، صفحہ ۵۰) اغلباً یہ روایت انھیں اپنے زمانہ کے فلسطینی عیسائیوں کی معرفت پہنچی جو اس وقت اسلام کے زیر اقتدار آ چکا تھا۔ منحمنا سریانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "تعریف کیا ہوا"۔ ماضی کے اس دور میں اس وقت تک فلسطین کے باشندوں کی زبان سریانی تھی۔ اغلب ہے کہ حضرت مسیح اپنی مادری زبان میں بولا ہوا اصل لفظ (منحمنا) انجیل کی روایات میں چلا آ رہا تھا جو بعد کے ترجموں میں باقی نہ رہ سکا۔

یہاں ہم بائبل (قدیم اور جدید عہد ناموں) سے کچھ اقتباسات بغیر کسی کمی یا اضافہ کے نقل کرتے ہیں۔

نبوت محمدی کا ظہور

ایک طرف افریقہ اور دوسری طرف ایشیا اور یورپ کے وسط میں عرب کا جزیرہ نما قدیم آباد دنیا کا جغرافی قلب معلوم ہوتا ہے۔ مگر قدیم زمانہ کے سیاسی حوصلہ مندوں میں کوئی نہیں ملتا جس نے اس علاقہ کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی کوشش کی ہو۔ تمام فوجی مہمیں عرب کے سرحدی علاقوں — عراق، شام، فلسطین، لبنان اور یمن پر جاکر ٹھہر گئیں۔ اس سے آگے نجد و حجاز کے علاقہ کو اپنی قلمرو میں شامل کرنے کی ضرورت انھوں نے نہیں سمجھی۔ یوں کہ تین طرف سے سمندروں سے گھرا ہونے کے باوجود یہاں ان کے لئے خشک پہاڑ اور اڑتی ہوئی ریت کے سوا اور کچھ موجود نہ تھا۔

اسی "بے آب وگیاہ" وادی کی مرکزی بستی مکہ میں پیغمبر اسلام محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پیدا ہوئے۔ آپ کے والد عبداللہ بن عبدالمطلب آپ کی پیدائش سے چند ماہ پہلے انتقال کرگئے۔ والدہ کا انتقال بھی اس وقت ہوگیا جب کہ آپ کی عمر ابھی صرف چھ سال تھی۔ اب آپ کے سرپرست آپ کے دادا عبدالمطلب بن ہاشم تھے تاہم دو سال بعد وہ بھی اس دنیا سے چلے گئے۔ آخر عمر میں آپ کی سرپرستی آپ کے چچا ابوطالب بن عبدالمطلب کے حصہ میں آئی۔ مگر ہجرت کے تین سال پہلے، آپ کی زندگی کے مشکل ترین مرحلہ میں، ان کے لئے بھی موت کا پیغام آگیا۔

اگرچہ فطرت نے آپ نے بڑی شان دار شخصیت پائی تھی۔ بچپن میں آپ کو دیکھنے والے کہا اٹھتے: ان لهذا الغلام لشانا (اس لڑکے کا مستقبل عظیم ہے) جب بڑے ہوئے تو آپ کے شخصی رعب ووقار کا حال یہ تھا کہ حضرت علی کے الفاظ میں: من رآه بديهة هابه ومن خالطه احبه (جو آپ کو پہلی بار دیکھتا مرعوب ہوجاتا، جو ساتھ بیٹھتا وہ آپ سے محبت کرنے لگتا) مگر چالیس سال کی عمر میں جب آپ نے دعوت نبوت کا آغاز کیا تو لوگوں کو آپ کا دعویٰ اتنا حقیر معلوم ہوا کہ انھوں نے کہا: هذا ابن ابي كبشة يكلم من السماء۔ اس کا مطلب تھا: دیکھو یہ فلاں دیہاتی کا لڑکا، وہ سمجھتا ہے کہ آسمان سے اس کو وحی آتی ہے۔

آپ کی دعوتی جدوجہد کی کل مدت صرف ۲۳ سال ہے۔ مگر اس انتہائی مختصر مدت میں عرب کے قبائل میں آپ نے ایسا انقلاب برپا کردیا جس کی کوئی دوسری مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس انقلاب نے سو سال سے بھی کم عرصہ میں دنیا کی دو بڑی شہنشاہیتوں، ساسانی سلطنت اور بازنطینی سلطنت کو زیر کرلیا اور ایک طرف عراق وایران سے لے کر بخارا تک، دوسری طرف شام وفلسطین سے لے کر مصر اور پورے شمالی افریقہ تک کو فتح کرلیا۔ پھر یہ سیلاب مغربی سمت بڑھا اور ۷۱۱ء میں جبرالٹر سے گزر کر اسپین اور پرتگال میں داخل ہوگیا۔ مغربی یورپ میں قافلۂ اسلام کی پیش قدمی ۷۳۲ء میں شاہ فرانس چارلس مارٹل نے تور کے مقام پر روک دی۔ تاہم دو صدیوں تک یورپ کی صلیبی جنگوں اور اس کے بعد تاتاریوں کے بےپناہ حملوں کے باوجود پندرھویں صدی تک اس کو کوئی

حقیقی نقصان نہیں پہنچا، جب کہ انھوں نے اپنے اندرونی اختلاف کی وجہ سے اسپین کو کھو دیا۔

اس کے بعد اسلام کی اندرونی طاقت نے ترکوں اور مغلوں کو کھڑا کیا۔ ترکوں نے ۱۴۵۳ میں قسطنطنیہ کو فتح کیا اور مشرقی یورپ میں یوگوسلاویہ تک پہنچ گئے۔ وائنا کے سامنے ۱۶۸۳ تک ایک ترک فوج موجود تھی۔ سولھویں صدی میں مغلوں نے برصغیر ہند اور افغانستان کے علاقہ میں اسلام کا اقتدار قائم کیا۔ تیرہ صدیوں کے بعد اس توسیع کا نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا کے تقریباً تمام حصوں میں مسلمان موجود ہیں۔ ایشیا اور افریقہ سے لے کر یورپ تک تقریباً چار درجن ممالک کا ایک مسلم علاقہ بن چکا ہے۔ موتمر عالم اسلامی کے شائع کردہ عالمی مسلم گزیٹر (۱۹۷۵) کے مطابق آج دنیا بھر میں اہل اسلام کی تعداد ۹۰ کروڑ ہے۔

یہ سب جو ہوا، اس ۲۳ سالہ عمل کا نتیجہ تھا جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں عرب میں انجام دیا گیا تھا۔ ۲۳ سال کی مدت میں ایک ایسا انقلاب آنا جو نہ صرف تاریخ انسانی میں دائمی طور پر ثبت ہو جائے بلکہ خود اپنی ایک مستقل تاریخ پیدا کرے، کسی انسان کے بس کی چیز نہیں۔ یہ ایک خدائی معاملہ تھا اور اسی نے اس کو انجام دیا۔

بدر کی فتح کے بعد جب مسلمان واپس ہوئے تو روحاء کے مقام پر کچھ لوگ ملے جنھوں نے ان کو فتح کی مبارک باد دی۔ سلمہ بن سلامہ نے جواب دیا، تم لوگ کس چیز کی مبارک باد دے رہے ہو۔ خدا کی قسم یہ تو گویا بندھے ہوئے اونٹ تھے جن کو ہم نے ذبح کر دیا۔ (کانا بل المعقلۃ فنحرناھا) تہذیب سیرۃ ابن ہشام-۱۵۳)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خصوصی اہتمام سے پیشگی اس کے اسباب فراہم کر دیئے تھے۔ عرب کے خشک جغرافیہ میں ایک ایسی قوم جمع کر دی گئی جس میں صحرائی زندگی کے نتیجہ میں کردار کی صلابت غیر معمولی حد تک پائی جاتی تھی۔ وہ اقرار اور انکار کے درمیان کسی تیسری چیز کو نہ جانتے تھے، ان کے اندر وہ تمام فطری خصائص پوری طرح محفوظ تھے جو کسی تحریک کا مجاہد بننے کے لئے ضروری ہیں۔ پھر عرب کے جزیرہ نما کے گرد اس وقت کی دنیا کی دو سب سے بڑی سلطنتیں قائم کر دی گئی تھیں، بالکل فطری تھا کہ وہ اپنے پڑوس میں ایک نئی ابھرتی ہوئی طاقت کو برداشت نہ کریں اور اس کے خلاف جارحیت کا آغاز کر دیں۔ اس طرح ان کی جارحیت اہل اسلام کے لئے جواز فراہم کر دے کہ وہ دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک ملکوں کو فتح کرتے چلے جائیں۔ کیونکہ عملاً اس وقت کی تقریباً تمام دنیا انھیں دونوں جابر قوموں کا علاقہ تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کی لڑائیاں دوسروں کے خلاف جارحیت نہیں تھیں۔ بلکہ وہ دوسروں کی جارحیت کا جواب تھا جو ہمیشہ تمام دنیا میں جائز سمجھا گیا ہے۔

اس طرح جو واقعات ظہور میں آئے، ان کی اہمیت صرف سیاسی تھی۔ اس سے زیادہ بڑی بات یہ تھی کہ اس انقلاب کے ذریعہ انسانی تاریخ کے بند دروازے کو کھول دینا مقصود تھا۔ اس کے ذریعہ وہ انقلاب آنا تھا جو دین حق کو ایک تاریخی حقیقت بنا دے، جو اس سے پہلے تاریخی واقعہ کی حیثیت حاصل کرنے سے محروم تھا۔ وہ پریس کا دور لے آئے جس کے بعد قرآن کی دائمی حفاظت کا انتظام ہو جائے۔ آزادی [illegible] حق کی اشاعت کی راہ سے تمام [illegible]

عدالت کو [illegible] ساتی سطح پر مدلل اور مبرہن کر دیں۔

اس انقلاب کا اس سے بھی اہم پہلو یہ ہے کہ نبی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے قیامت سے پہلے قیامت کا منظر دکھا دیا۔ سچے لوگوں کو آپ کے ذریعہ غالب کر دیا گیا جو آخرت میں دائمی برتری حاصل کریں گے، اور برے لوگوں کو آپ کے ذریعہ مغلوب کر دیا گیا جو آخرت میں دائمی پستی اور مغلوبیت کا شکار رہیں گے۔

تاریخ کا یہ اندوہناک منظر ہے کہ خدا کے سچے پرستار یہاں ہمیشہ دبے اور پسے ہوئے نظر آتے ہیں، اور دولت اور اقتدار کو پوجنے والوں کو یہاں تفوق حاصل رہتا ہے۔ تمام انبیاء اور صلحا کی تاریخ یہی بتاتی ہے۔ یہ صورت حال حقیقی صورت حال کے بالکل برعکس ہے۔ کیونکہ بالآخر جو ہونے والا ہے، وہ تو یہ کہ خدا اپنے پرستاروں کو دائمی عزت اور برتری عطا فرمائے گا اور جو لوگ اپنے نفس کی اور دنیا کی پوجا میں لگے رہے، ان کو ہمیشہ کے لئے ذلت اور رسوائی میں دھکیل دے گا۔

یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں لوگوں کو موقع ہے کہ وہ جو چاہیں کریں۔ اس لئے یہاں خدا کسی کا ہاتھ نہیں پکڑتا۔ تاہم پیغمبر اسلام کے ذریعہ، کم از کم ایک بار اس زمین پر وہ منظر ابتدائی شکل میں دکھا دیا گیا ہے جو کامل اور دائمی صورت میں آخرت میں سامنے آنے والا ہے۔ آپ کے ساتھی جن کا حال یہ تھا کہ ان کے گھروں کو ڈھا دیا گیا، جن کے لئے زمین کو تنگ بنا دیا گیا، جن کی معاشیات تباہ کر دی گئیں، جن کو اس قدر خوف و ہراس میں مبتلا کیا گیا کہ ان کو ہر وقت یہ اندیشہ لگا رہتا کہ لوگ انھیں اچک لیں گے ان کو عزت اور اقتدار کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ دوسری طرف قریش اور یہود، رومی اور ایرانی، یمنی اور غسانی جو دولت اور اقتدار کے گھمنڈ میں مبتلا تھے، ان کو ذلیل کر کے پستی کے گڑھے میں ڈال دیا گیا۔

ہر نبی جو خدا کی طرف سے آتا ہے، وہ زمین پر خدا کی عدالت ہوتا ہے۔ اس کی معرفت خدا اپنے ان فیصلوں سے لوگوں کو باخبر کرتا ہے جس کو وہ آخرت میں براہ راست خود سنانے والا ہے۔ مگر پیغمبر اسلام کے ذریعہ یہ عدالت الٰہی ایسی خصوصی شکل میں ظاہر ہوئی کہ وہ خود تاریخ انسانی کا جزو بن گئی۔ جس طرح بہت سے دوسرے انسانی تجربات تاریخی حقیقت کا درجہ اختیار کر چکے ہیں، اسی طرح یہ واقعہ بھی ایک تاریخی حقیقت کی حیثیت سے انسانی معلومات میں ثبت ہو چکا ہے کہ خدا اپنے متقی بندوں کو سرفراز کرتا ہے اور جو لوگ سرکشی اختیار کریں، ان کو ذلت و بربادی کے دائمی عذاب میں دھکیل دیتا ہے۔ جنت اور جہنم اگرچہ دوسری دنیا میں قائم ہونے والی حقیقتیں ہیں۔ مگر انسان کی نصیحت کے لئے اللہ نے اس کا ایک ابتدائی منظر اسی دنیا میں لوگوں کو دکھا دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بعثت محمدی کا ظہور، خدا کی خدائی کا ظہور تھا، اسی لئے انجیل میں اس کو "خدا کی بادشاہت" سے تعبیر کیا گیا ہے آپ کے ذریعہ لائے ہوئے انقلاب کی بلاشبہ سیاسی اور عمرانی اہمیت بھی ہے اور دوسری بہت سی اہمیتیں بھی۔ مگر اس کی سب سے اہمیت یہ ہے کہ وہ انسان کو خدا کے جلال کا مشاہدہ کراتا ہے۔ وہ خدا کی عدالت کا منظر دکھا رہا ہے، اس نے ان حقیقتوں کو آخرت سے پہلے انسان کے سامنے بے نقاب کر دیا ہے جن کو انسان آخرت میں اپنی کل شکل میں دیکھے گا۔

بائبل کی پیشین گوئیاں

اور خداوند نے ابرام سے کہا کہ تو اپنے وطن اور اپنے ناتے داروں کے بیچ سے اور اپنے باپ کے گھر سے نکل کر اس ملک میں جا جو میں تجھے دکھاؤں گا۔ اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور برکت دوں گا اور تیرا نام سرفراز کروں گا۔ سو تو باعث برکت ہو۔ جو تجھے مبارک کہیں ان کو میں برکت دوں گا اور جو تجھ پر لعنت کرے اس پر میں لعنت کروں گا اور زمین کے سب قبیلے تیرے وسیلہ سے برکت پائیں گے۔ سو ابرام خداوند کے کہنے کے مطابق چل پڑا اور لوط اس کے ساتھ گیا۔ اور ابرام پچھتر برس کا تھا جب وہ حاران سے روانہ ہوا۔ اور ابرام نے اپنی بیوی ساری اور اپنے بھتیجے لوط کو اور سب مال کو جو انھوں نے جمع کیا تھا اور ان آدمیوں کو جو ان کو حاران میں مل گئے تھے، ساتھ لیا اور وہ ملک کنعان کو روانہ ہوئے۔ اور ملک کنعان میں آئے۔ اور ابرام اس ملک میں سے گزرتا ہوا مقام سکم میں مورہ کے بلوط تک پہنچا۔ اس وقت ملک میں کنعانی رہتے تھے۔ تب خداوند نے ابرام کو دکھائی دے کر کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا اور اس نے وہاں خداوند کے لئے جو اسے دکھائی دیا تھا، ایک قربان گاہ بنائی۔ (پیدائش ۱۲: ۱۔۷)

جب ابرام ننانوے برس کا ہوا تب خداوند ابرام کو نظر آیا اور اس سے کہا کہ میں خدائے قادر ہوں تو میرے حضور میں چل اور کامل ہو۔ اور میں اپنے اور تیرے درمیان عہد باندھوں گا اور تجھے بہت زیادہ بڑھاؤں گا۔ تب ابرام سرنگوں ہو گیا اور خدا نے اس سے ہم کلام ہو کر فرمایا کہ دیکھ۔ میرا عہد تیرے ساتھ ہے اور تو بہت قوموں کا باپ ہوگا اور تیرا نام پھر ابرام نہیں ہوگا بلکہ تیرا نام ابرہام ہوگا۔ کیوں کہ میں نے تجھے بہت قوموں کا باپ ٹھہرا دیا ہے۔ اور میں تجھے بہت برومند کروں گا اور قومیں تیری نسل سے ہوں گی اور بادشاہ تیری اولاد میں سے برپا ہوں گے۔ اور میں اپنے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ان کی سب پشتوں کے لیے اپنا عہد جو ابدی عہد ہوگا، باندھوں گا تاکہ میں تیرا اور تیرے بعد تیری نسل کا خدا رہوں۔ اور میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے، ایسا دوں گا کہ وہ دائمی ملکیت ہو جائے۔ اور میں ان کا خدا ہوں گا۔ (پیدائش ۱۷: ۱۔۸)

اور خداوند کے فرشتہ نے آسمان سے دوبارہ ابرہام کو پکارا اور کہا کہ خداوند فرماتا ہے، چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے۔ دریغ نہ رکھا، اس لئے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی ہے کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کنارے کی ریت کی مانند کر دوں گا۔ اور تیری اولاد اپنے دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی۔ اور تیری نسل کے وسیلے سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی۔ کیوں کہ تو نے میری بات مانی۔ (پیدائش ۲۲: ۱۵۔۱۸)

اور یعقوب نے اپنے بیٹوں کو یہ کہہ کر بلوایا کہ تم سب جمع ہو جاؤ تاکہ میں تم کو بتاؤں کہ آخری دنوں میں تم پر کیا

[illegible]۔ اے یعقوب کے بیٹو جمع ہو کر سنو اور اپنے باپ اسرائیل کی طرف کان لگاؤ (پیدائش ۴۹: ۱-۲)
یہوداہ سے سلطنت نہیں چھوٹے گی اور نہ اس کی نسل سے حکومت کا عصا موقوف ہوگا، جب تک کہ وہ نہ آیا جو بھیجا
جانے والا ہے۔ اور قومیں اس کی مطیع ہوں گی۔ وہ اپنا جوان گدھا انگور کے درخت سے باندھا کرے گا۔ (۱۰-۱۱)

(موسیٰ نے کہا اے اسرائیلیو) خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے
میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی سننا۔ یہ تیری اس درخواست کے مطابق ہوگا جو تو نے خداوند اپنے خدا سے
مجمع کے دن حورب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو
تاکہ میں مر نہ جاؤں۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لئے ان ہی کے بھائیوں
میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا، وہی وہ
ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے
لوں گا۔ (استثنا ۱۸: ۱۵-۱۹)

اور مرد خدا موسیٰ نے جو دعائے خیر دے کر اپنی وفات سے پہلے بنی اسرائیل کو برکت دی، وہ یہ ہے۔ اور اس
نے کہا۔ خداوند سینا سے آیا۔ اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا۔ وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا۔ اور دس ہزار قدسیوں
میں سے آیا۔ اس کے داہنے ہاتھ پر ان کے لئے آتشی شریعت تھی۔ (استثنا ۳۳: ۱-۲)

خدا ہم پر رحم کرے اور ہم کو برکت بخشے۔ اور اپنے چہرہ کو ہم پر جلوہ گر فرمائے۔ تاکہ تیری راہ زمین پر ظاہر ہو جائے۔
اور تیری نجات سب قوموں پر۔ اے خدا لوگ تیری تعریف کریں۔ سب لوگ تیری تعریف کریں۔ امتیں خوش ہوں اور خوشی
سے للکاریں۔ کیونکہ تو راستی سے لوگوں کی عدالت کرے گا۔ اور زمین کی امتوں پر حکومت کرے گا۔ اے خدا! لوگ
تیری تعریف کریں۔ سب لوگ تیری تعریف کریں۔ زمین نے اپنی پیداوار دے دی۔ خدا یعنی ہمارا خدا ہم کو برکت
دے گا۔ خدا ہم کو برکت دے گا۔ اور زمین کی انتہا تک سب لوگ اس کا ڈر مانیں گے۔

خدا اٹھے۔ اس کے دشمن پراگندہ ہوں۔ اس سے عداوت رکھنے والے اس کے سامنے سے بھاگ جائیں۔
جیسے دھواں اڑ جاتا ہے، ویسے ہی تو ان کو اڑا دے۔ جیسے موم آگ کے سامنے پگھل جاتا ہے، ویسے ہی شریر خدا
کے حضور فنا ہو جائیں۔ لیکن صادق خوشی منائیں۔ وہ خدا کے حضور شادماں ہوں۔ بلکہ وہ خوشی سے پھولے نہ سمائیں۔
خدا کے لئے گاؤ۔ اس کے نام کی مدح سرائی کرو۔ صحرا کے سوار کے لئے شاہراہ تیار کرو۔ (زبور ۶۷-۶۸)

اے خدا، بادشاہ کو اپنے احکام اور شہزادہ کو اپنی صداقت عطا فرما۔ وہ صداقت سے تیرے لوگوں کی اور
انصاف سے تیرے غریبوں کی عدالت کرے گا۔ ان لوگوں کے لئے پہاڑوں سے سلامتی کے اور پہاڑیوں سے صداقت
کے پھل پیدا ہوں گے۔ وہ ان لوگوں کے غریبوں کی عدالت کرے گا۔ وہ محتاجوں کی اولاد کو بچائے گا۔ اور ظالم کو ٹکڑے
ٹکڑے کر ڈالے گا۔ جب تک سورج اور چاند قائم ہیں، لوگ نسل در نسل تجھ سے ڈرتے رہیں گے۔ وہ کٹی ہوئی گھاس
پر مینہ کی مانند اور زمین کو سیراب کرنے والی بارش کی طرح نازل ہوگا۔ اس کے ایام میں صادق برومند ہوں گے۔

اور جب تک چاند قائم ہے، خوب امن رہے گا۔ اس کی سلطنت سمندر سے سمندر تک اور دریائے فرات سے زمین کی انتہا تک ہوگی۔ بیابان کے رہنے والے اس کے آگے جھکیں گے۔ اور اس کے دشمن خاک چاٹیں گے۔ ترسیس کے اور جزیروں کے بادشاہ نذریں گزرانیں گے۔ سبا اور سیبا کے بادشاہ ہدئے لائیں گے۔ بلکہ سب بادشاہ اس کے سامنے سرنگوں ہوں گے۔ کل قومیں اس کی مطیع ہوں گی۔ کیونکہ وہ محتاج کو جب وہ فریاد کرے اور غریب کو جس کا کوئی مددگار نہیں، چھڑائے گا۔ اور غریب اور محتاج پر ترس کھائے گا اور محتاجوں کی جان کو بچائے گا۔ وہ فدیہ دے کر ان کی جان کو ظلم اور جبر سے چھڑائے گا اور ان کا خون اس کی نظر میں بیش قیمت ہوگا۔ وہ جیتے رہیں گے اور سبا کا سونا اس کو دیا جائے گا۔ لوگ برابر اس کے حق میں دعا کریں گے۔ وہ دن بھر اسے دعا دیں گے۔ زمین میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر اناج کی افراط ہوگی۔ ان کا پھل لبنان کے درختوں کی طرح جھومے گا۔ اور شہر والے زمین کی گھاس کی مانند ہرے بھرے ہوں گے۔ اس کا نام ہمیشہ قائم رہے گا۔ جب تک سورج ہے، اس کا نام رہے گا۔ اور لوگ اس کے وسیلہ سے برکت پائیں گے۔ سب قومیں اسے خوش نصیب کہیں گی۔ (زبور — ۷۲)

مبارک ہیں وہ جو تیرے گھر میں رہتے ہیں۔ وہ سدا تیری تعریف کریں گے۔ مبارک ہے وہ آدمی جس کی قوت تجھ سے ہے۔ جس کے دل میں صیئون کی شاہراہیں ہیں۔ وہ وادی بکا (BACA) سے گزر کر اسے چشموں کی جگہ بنا لیتے ہیں بلکہ پہلی بارش اسے برکتوں سے معمور کر دیتی ہے۔ وہ طاقت پر طاقت پاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک صیئون میں خدا کے حضور حاضر ہوتا ہے۔ (زبور ۸۴: ۴ — ۷)

اے یاہ! تجھ سا زبردست کون ہے، میرا ہاتھ اس کے ساتھ رہے گا۔ میرا بازو اسے تقویت دے گا۔ دشمن اس پر جبر نہ کرنے پائے گا اور شرارت کا فرزند اسے نہ ستائے گا۔ میں اس کے مخالفوں کو اس کے سامنے مغلوب کروں گا۔ اور اس سے عداوت رکھنے والوں کو ماروں گا۔ پر میری وفاداری اور شفقت اس کے ساتھ رہیں گی۔ اور میرے نام سے اس کا سینگ بلند ہوگا۔ میں اس کا ہاتھ سمندر تک بڑھاؤں گا۔ اور اس کے داہنے ہاتھ کو دریاؤں تک۔ وہ مجھے پکار کر کہے گا تو میرا باپ، میرا خدا اور میری نجات کی چٹان ہے۔ میں اسی کو اپنا پہلوٹھا بناؤں گا۔ اور دنیا کا شہنشاہ۔ میں اپنی شفقت کو اس کے لئے ابد تک قائم رکھوں گا۔ اور میرا عہد اس کے ساتھ لاتبدیل رہے گا۔ میں اس کی نسل کو ہمیشہ تک قائم رکھوں گا۔ اور اس کے تخت کو جب تک آسمان ہے۔ اگر اس کے فرزند میری شریعت کو ترک کر دیں اور میرے احکام پر نہ چلیں، اگر وہ میرے آئین کو توڑیں اور میرے فرمان کو نہ مانیں تو میں ان کو چھڑی سے خطا کی اور کوڑوں سے بدکاری کی سزا دوں گا۔ لیکن میں اپنی شفقت اس پر سے ہٹا نہ لوں گا۔ اور اپنی وفاداری کو باطل ہونے نہ دوں گا۔ میں اپنے عہد کو نہ توڑوں گا۔ اور اپنے منہ کی بات کو نہ بدلوں گا۔ اس کی نسل ہمیشہ قائم رہے گی۔ اور اس کا تخت آفتاب کی مانند میرے حضور قائم رہے گا۔ وہ ہمیشہ چاند کی طرح اور آسمان کے سچے گواہ کی مانند قائم رہے گا۔ (زبور ۸۹: ۸، ۲۱—۳۷)

اے سب اہل زمین! اس کے حضور کانپتے رہو۔ قوموں میں اعلان کرو کہ خداوند سلطنت کرتا ہے۔ جہان قائم ہے

اور اسے جنبش نہیں۔ وہ راستی سے قوموں کی عدالت کرے گا۔ آسمان خوشی منائے اور زمین شادماں ہو۔ سمندر اور اس کی معموری شور مچائیں۔ میدان اور جو کچھ اس میں ہے، باغ باغ ہوں۔ تب جنگل کے سب درخت خوشی سے گانے لگیں گے۔ خداوند کے حضور، کیونکہ وہ آرہا ہے۔ وہ زمین کی عدالت کرنے کو آرہا ہے۔ وہ صداقت سے جہان کی اور اپنی سچائی سے قوموں کی عدالت کرے گا (زبور ۹۶: ۹ – ۱۳)

خداوند سلطنت کرتا ہے۔ زمین شادماں ہو۔ بے شمار جزیرے خوشی منائیں۔ بادل اور تاریکی اس کے اردگرد ہیں۔ صداقت اور عدل اس کے تخت کی بنیاد ہیں۔ آگ اس کے آگے آگے چلتی ہے۔ اور چاروں طرف اس کے مخالفوں کو بھسم کر دیتی ہے۔ اس کی بجلیوں نے جہان کو روشن کر دیا۔ زمین نے دیکھا اور کانپ گئی۔ خداوند کے حضور پہاڑ موم کی طرح پگھل گئے یعنی ساری زمین کے خداوند کے حضور۔ آسمان اس کی صداقت ظاہر کرتا ہے۔ سب قوموں نے اس کا جلال دیکھا ہے۔ کھدی ہوئی مورتوں کے سب پوجنے والے جو بتوں پر فخر کرتے ہیں، شرمندہ ہوں۔ ۔ ۔ ۔ وہ ان کو شریروں کے ہاتھ سے چھڑاتا ہے۔ صادقوں کے لئے نور بویا گیا ہے۔ (زبور ۹۷)

صداقت کے پھاٹکوں کو میرے لئے کھول دو۔ میں ان سے داخل ہو کر خداوند کا شکر کروں گا۔ خداوند کا پھاٹک یہی ہے۔ صادق اس سے داخل ہوں گے۔ میں تیرا شکر کروں گا۔ کیونکہ تو نے مجھے جواب دیا۔ اور خود میری نجات بنا ہے۔ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا، وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا۔ اور ہماری نظر میں عجیب ہے، یہ وہی دن ہے جسے خداوند نے مقرر کیا۔ ہم اس میں شادماں ہوں گے اور خوشی منائیں گے۔ (زبور ۱۱۸ : ۱۹ – ۲۴)

دیکھو میرا خادم جس کو میں سنبھالتا ہوں۔ میرا برگزیدہ جس سے میرا دل خوش ہے۔ میں نے اپنی روح اس پر ڈالی۔ وہ قوموں میں عدالت جاری کرے گا۔ وہ نہ چلائے گا اور نہ شور کرے گا اور نہ بازاروں میں اس کی آواز سنی جائے گی۔ وہ مسلے ہوئے سرکنڈے کو نہ توڑے گا اور ٹمٹماتی ہوئی بتی کو نہ بجھائے گا۔ وہ راستی سے عدالت کرے گا۔ وہ ماندہ نہ ہوگا اور نہ ہمت ہارے گا، جب تک عدالت کو زمین پر قائم نہ کرلے۔ جزیرے اس کی شریعت کا انتظار کریں گے (یسعیاہ ۴۲ : ۱ – ۴)

گزر جاؤ، پھاٹکوں میں سے گزر جاؤ۔ لوگوں کے لئے راہ درست کرو اور شاہراہ اونچی اور بلند کرو۔ پتھر چن کر صاف کر دو۔ لوگوں کے لئے جھنڈا کھڑا کرو۔ دیکھ خداوند نے انتہائے زمین تک اعلان کر دیا ہے۔ دختر صیون سے کہو، دیکھ تیرا نجات دینے والا آتا ہے۔ دیکھ اس کا اجر اس کے ساتھ اور اس کا کام اس کے سامنے ہے اور وہ مقدس لوگ اور خداوند کے خریدے ہوئے کہلائیں گے۔ اور تو مطلوبہ یعنی غیر متروک شہر کہلائے گی۔ (یسعیاہ ۶۲ : ۱۰ – ۱۲)

تیرے لوگوں اور تیرے مقدس شہر کے لئے ستر ہفتے مقرر کئے گئے کہ خطاکاری اور گناہ کا خاتمہ ہو جائے۔ بدکرداری کا کفارہ دیا جائے۔ ابدی راستبازی قائم ہو۔ رویا و نبوت پر مہر ہو اور پاک ترین مقام ممسوح کیا جائے۔ (دانی ایل ۹ : ۲۴)

صیون میں نرسنگا پھونکو۔ میرے کوہ مقدس پر سانس باندھ کر زور سے پھونکو۔ ملک کے تمام باشندے تھرتھرائیں۔ کیونکہ خداوند کا روز چلا آتا ہے، بلکہ آ پہنچا ہے۔ اندھیرے اور تاریکی کا روز۔ ابر سیاہ اور ظلمات کا روز ہے۔ ایک بڑی اور زبردست امت جس کی مانند کبھی ہوئی اور نہ سالہائے دراز تک اس کے بعد ہوگی۔ پہاڑوں پر صبح صادق کی طرح

پھیل جائے گی۔ گویا ان کے آگے آگے بھسم کرتی جاتی ہے۔ اور ان کے پیچھے پیچھے شعلہ جلاتا جاتا ہے۔ ان کے آگے زمین باغ عدن کی مانند ہے اور ان کے پیچھے ویران بیابان ہے۔ ہاں ان سے کچھ نہیں بچتا۔ ان کی نمود گھوڑوں کی سی ہے اور سواروں کی مانند دوڑتے ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر رتھوں کے کھڑکھڑانے اور بھوسے کو بھسم کرنے والے شعلۂ آتش کے شور کی مانند بلند ہوتے ہیں۔ وہ جنگ کے لئے صف بستہ زبردست قوم کی مانند ہیں۔ ان کے روبرو لوگ تھرتھراتے ہیں۔ سب چہروں کا رنگ فق ہو جاتا ہے۔ وہ پہلوانوں کی طرح دوڑتے اور جنگی مردوں کی طرح دیواروں پر چڑھ جاتے ہیں۔ سب اپنی اپنی راہ پر چلتے ہیں اور صف نہیں توڑتے۔ وہ ایک دوسرے کو نہیں دھکیلتے۔ ہر ایک اپنی راہ پر چلا جاتا ہے۔ وہ جنگی ہتھیاروں سے گزر جاتے ہیں اور بے ترتیب نہیں ہوتے۔ وہ شہر میں کود پڑتے اور دیواروں اور گھروں پر چڑھ کر کھڑکیوں سے گھس جاتے ہیں۔ ان کے سامنے زمین و آسمان کانپتے اور تھرتھراتے ہیں۔ سورج اور چاند تاریک اور ستارے بے نور ہو جاتے ہیں اور خداوند اپنے لشکر کے سامنے للکارتا ہے۔ کیونکہ اس کا لشکر بے شمار ہے اور اس کے حکم کو انجام دینے والا زبردست ہے۔ کیونکہ خداوند کا روز عظیم نہایت خوفناک ہے۔ کون اس کو برداشت کر سکتا ہے۔ (یوایل ۲: ۱-۱۱)

رب الافواج اسرائیل کا خدا فرماتا ہے مجھے اپنی حیات کی قسم، یقیناً موآب، سدوم کی مانند ہوگا اور بنی عمون عمورہ کی مانند۔ وہ پرخار و نمک زار اور ابدالآباد برباد رہیں گے۔ میرے لوگوں کا بقیہ ان کو غارت کرے گا۔ اور میری قوم کے باقی لوگ ان کے وارث ہوں گے۔ یہ سب کچھ ان کے تکبر کے سبب سے ان پر آئے گا۔ کیوں کہ انھوں نے رب الافواج کے لوگوں کی ملامت کی اور ان پر زیادتی کی۔ خداوند ان کے لئے ہیبت ناک ہوگا اور زمین کے تمام معبودوں کو لاغر کردے گا اور بحری ممالک کے سب باشندے اپنی اپنی جگہ میں اس کی پرستش کریں گے (صفنیاہ ۲: ۹-۱۱)

جس طرح سمندر پانی سے بھرا ہے، اسی طرح زمین خداوند کے جلال کے عرفان سے معمور ہوگی (۲: ۱۴)
خدا تیمان سے آیا۔ اور قدوس کوہ فاران سے۔ اس کا جلال آسمان پر چھا گیا۔ اور زمین اس کی حمد سے معمور ہو گئی۔ اس کی جگمگاہٹ نور کی مانند تھی۔ اس کے ہاتھ سے کرنیں نکلتی تھیں۔ اور اس میں اس کی قدرت نہاں تھی۔ وبا اس کے آگے آگے چلتی تھی۔ اور آتشی تیر اس کے قدموں سے نکلتے تھے۔ وہ کھڑا ہوا اور زمین تھرا گئی۔ اس نے نگاہ کی اور قومیں پراگندہ ہو گئیں۔ ازلی پہاڑ پارہ پارہ ہو گئے۔ قدیم ٹیلے جھک گئے۔ اس کی راہیں ازلی ہیں (حبقوق ۳: ۳-۶)

دیکھو، میں اپنے رسول کو بھیجوں گا۔ اور وہ میرے آگے راہ درست کرے گا اور خداوند جس کے تم طالب ہو، ناگہاں اپنی ہیکل میں آموجود ہوگا۔ ہاں عہد کا رسول جس کے تم آرزو مند ہو، آئے گا، رب الافواج فرماتا ہے۔ پر اس کے آنے کے دن کی کس میں تاب ہے۔ اور جب اس کا ظہور ہوگا تو کون کھڑا رہ سکے گا۔ کیونکہ وہ سنار کی آگ اور دھوبی کے صابون کی مانند ہے۔ اور وہ چاندی کو تانے اور پاک صاف کرنے والے کی مانند بیٹھے گا۔ اور بنی لاوی کو سونے اور چاندی کی مانند پاک صاف کرے گا تاکہ وہ راستبازی سے خداوند کے حضور ہدیے گزرانیں (ملاکی ۳: ۱-۳)

رب الافواج فرماتا ہے، اس روز وہ میرے لوگ بلکہ میری خاص ملکیت ہوں گے۔ اور میں ان پر ایسا رحیم ہوں گا جیسا باپ اپنے خدمت گزار بیٹے پر ہوتا ہے۔ تب تم رجوع لاؤ گے اور صادق اور شریر میں، اور خدا کی عبادت

کرنے والے اور نہ کرنے والے میں امتیاز کرو گے۔ کیونکہ دیکھو وہ دن آتا ہے جو بھٹی کی مانند سوزاں ہوگا۔ تب سب مغرور اور بدکردار بھوسے کی مانند ہوں گے۔ اور وہ دن ان کو ایسا جلائے گا کہ شاخ و بن کچھ نہ چھوڑے گا۔
(ملاکی ۳: ۱۷-۱۸، ۴: ۱)

نیا عہد نامہ

یسوع مسیح نے ان سے کہا، کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ "جس پتھر کو معماروں نے رد کیا، وہی کونے کے سرے کا پتھر ہوگیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا۔ اور ہماری نظر میں عجیب ہے"۔ اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو، جو اس کے پھل لائے، دے دی جائے گی۔ اور جو اس پتھر پر گرے گا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ لیکن جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔ (متی ۲۱: ۴۲-۴۴)

اور یوحنا کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے۔ تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا۔ بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں۔ انھوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے۔ کیا تو ایلیاہ ہے۔ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ کیا تو وہ نبی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ پس انھوں نے اس سے کہا پھر تو ہے کون تاکہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں تو اپنے حق میں کیا کہتا ہے۔ اس نے کہا، میں جیسا یسعیاہ نبی نے کہا ہے، بیابان میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ کو سیدھا کرو۔ یہ فریسیوں کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔ انھوں نے اس سے یہ سوال کیا کہ اگر تو نہ مسیح ہے، نہ ایلیاہ، نہ وہ نبی، تو پھر بپتسمہ کیوں دیتا ہے۔ یوحنا نے جواب میں ان سے کہا کہ میں پانی سے بپتسمہ دیتا ہوں۔ تمھارے درمیان ایک شخص کھڑا ہے جسے تم نہیں جانتے۔ یعنی میرے بعد کا آنے والا جس کی جوتی کا تسمہ میں کھولنے کے لائق نہیں۔ (یوحنا ۱: ۱۹-۲۶)

(یسوع نے کہا) اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے۔ (یوحنا ۱۴: ۱۶) میں نے یہ باتیں تمھارے ساتھ رہ کر تم سے کہیں۔ لیکن مددگار یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمھیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمھیں یاد دلائے گا (۲۵-۲۶) اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا۔ کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں (۱۴: ۳۰)۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمھارے لئے فائدہ مند ہے۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمھارے پاس نہ آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمھارے پاس بھیج دوں گا۔ اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا (۱۶: ۷-۸) مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں۔ مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی روح حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا۔ اور تمھیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ وہ میرا جلال ظاہر کرے
(۱۲-۱۴)

خداوند فرماتا ہے دیکھ، وہ دن آتے ہیں کہ میں اسرائیل کے گھرانے اور یہوداہ کے گھرانے سے ایک نیا عہد

باندھوں گا۔ یہ اس عہد کی مانند نہ ہوگا جو میں نے ان کے باپ دادا سے اس دن باندھا تھا جب ملک مصر سے نکال لانے کے لئے ان کا ہاتھ پکڑا تھا۔ اس واسطے کہ وہ میرے عہد پر قائم نہیں رہے اور خداوند فرماتا ہے کہ میں نے ان کی طرف کچھ توجہ نہ کی۔ پھر خداوند فرماتا ہے کہ جو عہد اسرائیل کے گھرانے سے ان دنوں کے بعد باندھوں گا وہ یہ ہے کہ میں اپنے قانون ان کے ذہن میں ڈالوں گا اور ان کے دلوں پر لکھوں گا۔ اور میں ان کا خدا ہوں گا اور وہ میری امت ہوں گے۔ (عبرانیوں کے نام ۸: ۸—۱۰)

پھر میں نے ایک اور فرشتہ کو آسمان کے بیچ میں اڑتے ہوئے دیکھا۔ جس کے پاس زمین کے رہنے والوں کی ہر قوم اور قبیلہ اور اہل زبان اور امت کے سنانے کے لئے ابدی خوشخبری تھی۔ اور اس نے بڑی آواز سے کہا کہ خدا سے ڈرو اور اس کی تمجید کرو۔ کیونکہ اس کی عدالت کا وقت آپہنچا ہے اور اس کی عبادت کرو جس نے آسمان اور زمین اور سمندر اور پانی کے چشمے پیدا کئے۔ پھر اس کے بعد ایک اور دوسرا فرشتہ یہ کہتا ہوا آیا کہ گر پڑا۔ وہ بڑا شہر بابل گر پڑا جس نے اپنی حرام کاری کی غضب ناک مے تمام قوموں کو پلائی ہے۔ (یوحنا کا مکاشفہ ۱۴: ۶—۸) پھر میں نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید بادل ہے اور اس بادل پر آدم زاد کی مانند کوئی بیٹھا ہے جس کے سر پر سونے کا تاج اور ہاتھ میں تیز درانتی ہے۔ پھر ایک اور فرشتہ نے مقدس سے نکل کر اس بادل پر بیٹھے ہوئے سے بڑی آواز کے ساتھ پکار کر کہا کہ اپنی درانتی چلا کر کاٹ کیونکہ کاٹنے کا وقت آگیا۔ اس لئے کہ زمین کی فصل بہت پک گئی۔ پس جو بادل پر بیٹھا تھا اس نے اپنی درانتی زمین پر ڈالی اور زمین کی فصل کٹ گئی (۱۴: ۱۴—۱۶)

پھر میں نے آسمان کو کھلا ہوا دیکھا۔ اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید گھوڑا ہے اور اس پر ایک سوار ہے۔ جو سچا اور برحق کہلاتا ہے۔ اور وہ راستی کے ساتھ انصاف اور لڑائی کرتا ہے۔ اور اس کی آنکھیں آگ کے شعلے ہیں۔ اور اس کے سر پر بہت سے تاج ہیں اور اس کا ایک نام لکھا ہوا ہے جسے اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ اور وہ خون کی چھڑکی ہوئی پوشاک پہنے ہوئے ہے اور اس کا نام کلام خدا کہلاتا ہے۔ اور آسمان کی فوجیں سفید گھوڑوں پر سوار اور سفید اور صاف مہین کتانی کپڑے پہنے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے ہیں۔ اور قوموں کے مارنے کے لئے اس کے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے۔ اور وہ لوہے کے عصا سے ان پر حکومت کرے گا اور قادر مطلق خدا کے سخت غضب کی مے کے حوض میں انگور روندے گا۔ اور اس کی پوشاک اور ران پر یہ نام لکھا ہوا ہے:
بادشاہوں کا بادشاہ اور خداوندوں کا خداوند۔ (مکاشفہ ۱۹: ۱۱—۱۶)

پھر میں نے ایک فرشتہ کو آسمان سے اترتے دیکھا۔ اس نے اژدہا یعنی پرانے سانپ کو جو ابلیس اور شیطان ہے پکڑ کر ہزار برس کے لئے باندھا اور اسے اتھاہ گڑھے میں ڈال کر بند کر دیا اور اس پر مہر کر دی تاکہ وہ ہزار برس کے پورے ہونے تک قوموں کو پھر گمراہ نہ کرے۔ اور جب ہزار برس پورے ہو چکیں گے تو شیطان قید سے چھوڑ دیا جائے گا اور ان قوموں کو جو زمین کی چاروں طرف ہوں گی یعنی جوج و ماجوج کو گمراہ کر کے لڑائی کے لئے جمع کرنے کو نکلے گا۔ وہ تمام زمین پر پھیل جائیں گی اور مقدسوں کی لشکرگاہ اور عزیز شہر کو چاروں طرف سے گھیر لیں گی اور آسمان پر سے آگ نازل ہو کر انہیں کھا جائے گی (مکاشفہ ۲۰: ۱—۹)

خلاصہ

بائبل کی ان پیشین گوئیوں کے مطابق پچھلے نبیوں کے ذریعے بتا دیا گیا تھا کہ آخری زمانہ میں کیا ہونے والا ہے۔
حضرت ابراہیمؑ کے دو صاحبزادے تھے۔ اسحاقؑ اور اسماعیلؑ۔ آپ نے اسحاقؑ کو کنعان (فلسطین) میں آباد کیا اور اسمٰعیل اور ان کی ماں (ہاجرہ) کے ساتھ اپنے وطن عراق سے نکلے اور خدا کے حکم سے ان کو لے کر مورہ (مروہ) کے علاقہ میں آئے۔ یہاں انھوں نے ایک قربان گاہ (کعبہ) کی تعمیر کی۔ اپنے فرزند اسماعیل کو یہاں بسایا۔ خدا نے کہا تیری اس اولاد کی نسل میں میری برکت (نبوت) ظاہر ہوگی۔ اس سے میں ابدی عہد باندھوں گا (دائمی شریعت عطا کروں گا) اس کے وسیلے سے سب قومیں فیض پائیں گی (وہ عالمی نبوت ہوگی)

بنی اسرائیل کے بھائیوں (بنی اسماعیل) میں جب نئے عہد والا نبی آئے گا تو اسرائیلی نسل (یہود) سے سلطنت چھین لی جائے گی۔ بنی اسرائیل کو جب احکام الٰہی دیئے گئے تو وہ براہ راست دیئے گئے جس کی وجہ سے انھیں دہشت ناک کیفیات سے گزرنا پڑا۔ بنی اسرائیل کے بقیہ (بنی اسماعیل) میں جو نبی آئے گا، خدا اس کے قلب پر اپنا حکم اتارے گا، اور وہ اپنے منھ سے دہرا کر اس کو دوسروں کو بتائے گا۔ سینا (مصر) سے موسیٰ کی نبوت ظاہر ہوئی۔ شعیر (فلسطین) سے عیسیٰ کی نبوت، اب نبی آخر الزماں کا ظہور فاران (عرب) سے ہوگا۔ وہ تعریف کیا ہوا (محمد) کہلائے گا۔ لوگ دن بھر اس کے لئے دعا (درود و سلام) کرتے رہیں گے۔

اسماعیلی نبی جو صحرائی علاقہ میں آئے گا، صرف پیغام نہیں پہنچائے گا، وہ اپنی زندگی ہی میں اپنے دشمنوں کو مغلوب کرے گا۔ وہ مظلوموں (غلاموں) کو اوپر اٹھائے گا اور ظالموں کو زیر کرے گا۔ اس کا اقتدار قیامت تک ختم نہ ہوگا۔ توحید کے پرستار اس کے عہد میں غلبہ حاصل کریں گے، بیابان کے رہنے والے (قریش) اس کے آگے جھک جائیں گے۔ اس کے دشمن (یہود) ذلیل ہوں گے۔ یمن اور اطراف عرب کے حکمراں اس کے مطیع ہوں گے۔ ازلی پہاڑ (روم و ایران) اس کے سیلاب کے آگے پارہ پارہ ہو جائیں گے۔ یہ پیغمبر ابد تک لوگوں کے ساتھ رہے گا (اس کا فیض نبوت جاری رہے گا) وہ سب باتیں (مکمل شریعت) بتائے گا۔

اس کی حکومت نہ صرف خشکی کے آخری سرے تک ہوگی بلکہ اس سے گزر کر سمندر پار کے علاقوں تک پہنچ جائے گی۔ وہ خدا کی عدالت کو زمین پر قائم کرے گا۔ اس کی نبوت نبیوں کے سلسلے پر مہر کرے گی۔ پاک ترین مقام (کعبہ) مرکز توحید قرار پائے گا۔

اس پیغمبر کے ماننے والے خدا کے خریدے ہوئے کہلائیں گے (اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ) وہ جنگ میں صف بستہ ہو کر لڑیں گے (یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا) وہ پہلوانوں کی طرح دوڑیں گے اور دیواروں (خیبر کے قلعوں پر) چڑھ جائیں گے۔ یہ پیغمبر (فتح مکہ کے دن) دس ہزار ساتھیوں کو لے کر اچانک اپنی ہیکل (خانہ کعبہ) میں آموجود ہوگا۔ اس پیغمبر کے امتی اگر خدا کے احکام کو ترک کر دیں، تب بھی وہ سابق امتوں کی طرح معزول نہ کیے جائیں گے۔ صرف تنبیہ کی سزا انھیں دی جائے گی۔

ڈاکٹر تاراچند

انھوں نے اسلامی تاریخ پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔

ڈاکٹر تاراچند (۱۹۷۳ - ۱۸۸۸) فارسی زبان بہت اچھی جانتے تھے۔ اسی لیے پنڈت نہرو نے ۱۹۵۲ء میں ان کو ایران کا سفیر مقرر کیا تھا۔ انھوں نے سرِّ اکبر (اپنشد کا فارسی ترجمہ، از دارا شکوہ) کو ایڈٹ کیا تھا جس کو حکومت ایران نے خصوصی اہتمام کے ساتھ چھپوایا۔

۱۹۱۳ میں انھوں نے میور سنٹرل کالج الہ آباد سے امتیاز کے ساتھ تاریخ میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد وہ کائستھ پاٹھ شالہ (ڈگری کالج) میں استاد ہوگئے۔ کائستھ پاٹھ شالہ ٹرسٹ کے صدر کرنل رنجیت سنگھ ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے ٹرسٹ کے اگزیکیٹو کے سامنے تجویز پیش کی کہ نوجوان استاد کو ریسرچ کے لیے یورپ بھیجا جائے۔ بیشتر ممبروں نے شدت سے اس تجویز کی مخالفت کی۔ مگر کرنل رنجیت سنگھ نے بزور اس تجویز کو منظور کرایا اور ان کے سفر کے تمام انتظامات کیے۔

اس کے بعد ڈاکٹر تاراچند آکسفرڈ گئے۔ وہاں وہ کوئنس کالج میں تین سال (۲۲ - ۱۹۱۹) رہے۔ اور ڈی۔ فل کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے مقالہ کا عنوان تھا، ہندوستانی کلچر پر اسلام کا اثر :

THE INFLUENCE OF ISLAM
ON INDIAN CULTURE

حکومت ہند کی وزارت تعلیم کے تحت انھوں نے ہندوستان کی آزادی کی تاریخ پر چار جلدوں میں ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کی تیاری میں اپنی آخری زندگی کے ۱۴ سال صرف کیے۔ اس کتاب کی پہلی جلد ۱۹۶۱ میں اور چوتھی جلد ۱۹۷۳ میں شائع ہوئی۔

مسٹر سورش رام نے بجا طور پر لکھا ہے کہ یہ کتاب ڈاکٹر تاراچند کے غیر جانب دارانہ رائے قائم کرنے DISPASSIONATE JUDGMENT کا حیرت انگیز نمونہ ہے۔ ۱۹۳۷ء میں یوپی میں کانگریس کا مسلم لیگ کو وزارت میں شریک نہ کرنا ایک انتہائی نزاعی مسئلہ ہے۔ مگر اس کے بارے میں ڈاکٹر تاراچند نے لکھا :

ADMITTING THAT THERE COULD BE TWO OPINIONS CONCERNING THE CONSTITUTIONAL PROPRIETY OF THE 'DECISION TO REFUSE THE APPOINTMENT OF THE MUSLIM LEAGUERS TO THE CONGRESS CABINET, IT IS DIFFICULT TO JUSTIFY ITS WISDOM. (Vol. IV, P. 238)

یہ مانتے ہوئے کہ کانگرس کابینہ میں مسلم لیگی نمائندوں کو شریک کرنے کی قانونی اہمیت پر دو رائیں ہو سکتی ہیں، اس کی معقولیت کو ثابت کرنا سخت مشکل ہے۔

نیشنل ہیرلڈ (لکھنؤ)، ۷ نومبر ۱۹۷۳

ڈاکٹر تاراچند کا خاتمہ بظاہر اس بات کی علامت تھا کہ غیر مسلموں میں وہ نسل اب ختم ہوگئی جو اردو، عربی، فارسی زبانیں جانتی ہو اور اسلامی تاریخ اور مسلم تہذیب کے پس منظر میں سوچنے کی علمی صلاحیت رکھتی ہو۔ مگر حالیہ برسوں میں پٹرول کی کرامت نے از سر نو عربی اور فارسی کو زندہ کر دیا ہے۔ اب مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم ان موضوعات میں داخلے لے رہے ہیں۔ یہ بھی شاید بالواسطہ طور پر اس حدیث نبوی کی تصدیق ہے کہ یہ دین ہمیشہ زندہ رہے گا۔ سیاسی اور زمانی انقلابات کبھی اس میں کامیاب نہ ہوں گے کہ خدا کے دین کو ماضی کی چیز بنا کر تاریخ کی الماری میں بند کر دیں۔

خاتونِ اسلام

زبیدہ خانم ایم اے

اسماء بنت ابوبکر ہجرت سے ۲۷ سال پہلے پیدا ہوئیں۔ مکہ میں جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو مسلمانوں کی تعداد سترہ تھی۔ حضرت ابوبکر نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کی طرف ہجرت کی تو ان کے پاس تقریباً چھ ہزار درہم تھے۔ وہ سب ساتھ لے گئے تھے۔

حضرت ابوبکر کے والد ابو قحافہ جو نابینا ہو گئے تھے۔ بعد کو پوتیوں کے پاس تسلی کے لیے آئے اور کہنے لگے: میرا خیال ہے کہ ابوبکر نے اپنے جانے کا صدمہ بھی تم کو پہنچایا اور مال بھی شاید سب لے گیا۔ اسماء کہتی ہیں کہ میں نے اپنے دادا سے کہا، وہ تو ہمارے لیے بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں۔ یہ کہہ کر میں نے چھوٹے چھوٹے پتھر جمع کیے ــ اور اس طاق میں بھر دیا جس میں میرے والد کے درہم پڑے رہتے تھے۔ اور ان کے اوپر ایک کپڑا ڈال کر دادا کا ہاتھ اس کپڑے پر رکھ دیا۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ درہم سے بھرے ہوئے ہیں۔ کہا خیر یہ ابوبکر نے اچھا کیا۔ اس سے تم لوگوں کے گزارہ کی صورت ہو جائے گی۔

اسماء کہتی ہیں کہ خدا کی قسم کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے صرف دادا کی تسلی کے لیے یہ صورت اختیار کی تھی۔

حضرت اسماء کی شادی حضرت زبیر سے ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب دونوں ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو اس وقت جو حال ہوا۔ وہ صحیح بخاری میں ان کی زبان سے اس طرح نقل ہوا ہے۔

جب میرا نکاح زبیر سے ہوا تو ان کے پاس نہ مال تھا نہ جائیداد۔ نہ کوئی خادم کام کرنے والا، نہ کوئی اور چیز۔ ایک اونٹ پانی لاد کر لانے کے لیے تھا اور ایک گھوڑا۔ میں ہی اونٹ کے لیے گھاس وغیرہ لاتی تھی اور کھجور کی گٹھلیاں کوٹ کر دانہ کے طور پر کھلاتی تھی۔ میں ہی پانی بھر کر لاتی اور پانی کا ڈول پھٹ جاتا تو اس کو آپ ہی سیتی تھی۔ مجھ ہی کو گھوڑے کی ساری خدمت کرنی ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ گھر کا سارا کام بھی انجام دینا ہوتا۔ ان سب کاموں میں گھوڑے کی خبر گیری میرے لیے زیادہ مشقت کی چیز تھی۔ روٹی البتہ مجھ کو اچھی طرح پکانا نہیں آتی تھی۔ اس لیے جب روٹی پکانا ہوتا تو میں آٹا گوندھ کر اپنے پڑوس کی انصار عورتوں کے یہاں لے جاتی۔ وہ

زمین کو انسان کی قیام گاہ بنایا گیا ہے۔ مگر وہی قیام گاہ زمین کے اوپر کھڑی ہوتی ہے جس کی تعمیر کو بنیاد سے شروع کر کے چھت تک پہنچایا گیا ہو۔ کوئی شخص چھت کی طرف سے اپنا مکان بنانا شروع کر دے تو خدا کی زمین ایسے مکان کو قبول کرنے سے انکار کر دے گی۔

یہ اس دنیا کی ایک اٹل حقیقت ہے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ جب ملت کی تعمیر کا سوال آتا ہے تو لوگ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں۔ وہ چھت کی طرف سے ملت کا محل اٹھانا شروع کر دیتے ہیں۔ خواہ ان کا محل بالآخر زمین بوس ہو کر مایوسی اور بے یقینی کے ملبہ کے سوا ان کے لیے کچھ اور نہ چھوڑے۔

بڑی مخلص عورتیں تھیں۔ میری روٹی بھی پکا دیتیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچنے پر زبیر کو ایک زمین جاگیر کے طور پر دی تھی جو مدینہ سے دو میل کے فاصلہ پر تھی۔ میں وہاں کام کے لیے جایا کرتی اور وہاں سے اپنے سر پر کھجور کی گٹھلیاں لادکر لاتی۔

ایک بار میں اس طرح آرہی تھی اور گٹھری میرے سر پر تھی۔ راستہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم مل گئے۔ وہ اونٹ پر آرہے تھے اور انصار کی ایک جماعت ساتھ تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھ کر اونٹ کو ٹھہرایا۔ اور اس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تاکہ میں اس پر بیٹھ جاؤں۔ مجھے مردوں کے ساتھ جاتے ہوئے شرم آئی اور یہ بھی خیال آیا کہ زبیر کو غیرت بہت زیادہ ہے ان کو یہ ناگوار نہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے انداز سے سمجھ گئے کہ مجھ کو اونٹ پر بیٹھتے ہوئے شرم آرہی ہے چنانچہ آپ آگے بڑھ گئے۔

میں گھر کو آئی اور زبیر کو پورا قصہ سنایا۔ میں نے کہا کہ مجھے مردوں کے ساتھ اونٹ پر بیٹھتے ہوئے شرم آئی اور تمہاری غیرت کا بھی خیال آیا۔ زبیر نے کہا، خدا کی قسم تمہارا گٹھلیاں سر پر رکھ کر لانا میرے لیے اس سے بھی زیادہ گراں ہے۔

مدینہ کی زندگی میں عورتوں کے اس طرح کثرت سے واقعات ہیں۔ اس وقت عورتیں نہ صرف گھر کا بلکہ باہر کا بھی اکثر کام کرتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مرد زیادہ تر جہاد اور تبلیغ دین وغیرہ میں مشغول رہتے تھے۔ ان کو موقع نہیں ملتا تھا کہ گھر کی ذمہ داریوں کو ادا کریں۔ چنانچہ ان کی عورتوں نے گھر کے کاروبار کو سنبھال لیا تھا۔ حتی کہ جانوروں کی دیکھ بھال اور زراعت اور باغبانی بھی وہ کرنے لگی تھیں۔

کام میں انہماک

سر جادو ناتھ سرکار (۱۸۷۰-۱۹۵۸) کو مغل تاریخ کا کولمبس کہا جاتا ہے۔ یہ مقام انھیں کس غیر معمولی انہماک کے ذریعہ ملا، اس کا ایک ہلکا سا اندازہ ان کے خطوط سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے استاد ڈاکٹر رگھوبیر سنہہ کو اپنی عمر کے آخری ۲۷ برسوں میں لکھے۔ ۸۰ برس کی عمر کو پہنچ کر بھی ان کے اندر کام کا شوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ کلکتہ میں اپنے وسیع مکان کو چھوڑ کر وہ صرف اس لئے کامشیت چلے گئے کہ کلکتہ کے ناموافق موسم کی وجہ سے وہ وہاں پوری طرح کام نہیں کر سکتے تھے۔ یہ منتخب ۳۲۹ خطوط جس زمانہ (۱۹۳۲-۱۹۵۸) سے تعلق رکھتے ہیں، اس میں ملک کے اندر اور باہر زبردست واقعات ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم، ہندستان کی آزادی، مہاتما گاندھی کا قتل، وغیرہ۔ مگر خطوط میں ان واقعات کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ تاہم دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کی شکست کی خبر انھیں متاثر کرتی ہے ۲۸ جون ۱۹۴۵ کو وہ اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں:

"اگر تم اپنے لندن کے فوٹوگرافر کو خط لکھو تو اس کو ہدایت کرو کہ وہ برٹش میوزیم کے (فلاں) مخطوطہ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی لے لے۔ یورپ میں امن قائم ہو جانے کی وجہ سے برٹش میوزیم نے اپنے مخطوطات کے ذخیرہ کو شاید دوبارہ نکال لیا ہو جو (جنگ کے زمانہ میں) تہ خانوں میں رکھ دیے گئے تھے۔"

آپ بیتی

۱۹۵۲ء میں جب کہ میں بنارس ہندو یونیورسٹی میں انجینیرنگ کا طالب علم تھا، ایک واقعہ پیش آیا جو کہ اب تک مجھے یاد ہے۔ میرے استاد ڈاکٹر پران ناتھ نے لاپلاس ٹرانسفارم کو پڑھانا شروع کیا تو انھوں نے بتایا کہ اس سلسلے میں ایک دلچسپ کہانی ہے جو ہمارے موجودہ پرنسپل سے متعلق ہے۔ یہ پروفیسر ایم. سین. گپتا تھے جو اس وقت ہندو یونیورسٹی کے انجینیرنگ کالج کے پرنسپل تھے اور اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔

پروفیسر گپتا مزید تعلیم کے لیے گلاسگو یونیورسٹی گئے تھے اور وہاں سے انھوں نے ٹاپ کیا تھا۔ گلاسگو کا پروفیسر ایک روز بلیک بورڈ پر ایک الیکٹریکل پرابلم کو حل کر رہا تھا۔ اسی درمیان میں DIFFERENTIAL EQUATION کا ایک سوال آ گیا۔ گلاسگو پروفیسر نے اس کو عام طریقے سے حل کیا جس میں کافی وقت لگا اور سارا بلیک بورڈ بھر گیا۔

پروفیسر گپتا نے اس موقع پر اپنے پروفیسر سے کہا: میرا خیال ہے کہ یہاں لاپلاس ٹرانسفارم کو اپلائی کیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ سوال بہت مختصر طریقہ سے حل ہو جائے گا۔ پروفیسر نے اس تجویز پر عمل کیا تو صرف دو لائنوں میں سوال حل ہو گیا۔ اگرچہ دونوں طریقوں کا آخری جواب ایک ہی تھا۔ مگر پروفیسر نے کہا: جب مختصر طریقہ ہمارے پاس موجود ہے تو لمبے طریقے کو اختیار کرنا ہی سرے سے غلط ہے۔ اس نے بلیک بورڈ پر اپنے حل کو مٹا دیا اور پروفیسر گپتا کے طریقہ کو لکھتے ہوئے کہا: THIS IS THE ONLY METHOD یہی واحد طریقہ ہے۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ ۱۹۶۴ء کا ہے۔ حکومت ہند کی وزارت تعلیم نے امریکی حکومت کے ایجوکیشن ڈویژن کے تعاون سے "سمر اسکول فار ٹیچرس" کا ایک پروگرام شروع کیا۔ ہندوستانی شخصیتوں کے علاوہ تین امریکی پروفیسر آئے تھے۔ اس وقت میں چندولی پالی ٹکنیک میں سینیر لکچرر تھا اور اسی حیثیت سے چنڈی گڑھ کے اسکول میں شرکت کی تھی۔ یہ پہلا کورس تھا جو ۱۵ جون سے ۲۴ جولائی ۱۹۶۴ء تک ہوا۔

امریکی پروفیسر مچل نے ایک روز کلاس میں سوال کیا: WHO ARE CREATIVES تخلیقی لوگ کون ہوتے ہیں۔ مختلف لوگوں نے مختلف نام لیے۔ ایک شخص نے کہا پوئیٹ (شاعر) پروفیسر نے کہا، کیا (WHAT) پروفیسر مچل کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بار بار "واٹ" کہتے رہے اور ہمارے ساتھی بار بار "پوئیٹ" دہراتے رہے۔ بالآخر انھوں نے اس کی اسپلنگ بتائی: پی او ای ٹی۔ اب پروفیسر مچل سمجھ گئے کہ ہمارے ساتھی کی مراد شاعر سے ہے۔ مگر ہندوستانی اور امریکی تلفظ کے فرق کی وجہ سے وہ سمجھ نہیں پاتے تھے۔ کیونکہ ہندوستانی تلفظ اس لفظ کا پوئیٹ ہے جبکہ امریکی تلفظ میں اس کو پائیٹ کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا:

YOU ARE RIGHT, I AM WRONG
BECAUSE I AM IN YOUR COUNTRY

آپ صحیح ہیں۔ میں ہی غلطی پر ہوں۔ کیونکہ میں اس وقت آپ کے ملک میں ہوں۔

عبدالمجید خاں (پیدائش ۱۹۳۷)
پرنسپل گورنمنٹ پالی ٹکنیک، فیض آباد

ایک فتنہ

قرآن کی سورہ نمبر ۲۲ میں ارشاد ہوا ہے :

ہم نے جتنے بھی رسول بھیجے، سب کے ساتھ یقیناً ضرور یہ پیش آیا کہ جب اس نے اللہ کا کلام پڑھا تو شیطان نے اس کے پڑھنے میں شبہہ ڈال دیا۔ پھر اللہ شیطان کے ڈالے ہوئے خیال کو مٹا دیتا ہے۔ اس کے بعد اللہ اپنی آیات کو اور مضبوط کر دیتا ہے۔ اور اللہ خوب جاننے والا، حکمت والا ہے۔ اس واسطے تاکہ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو اللہ ان لوگوں کے لیے آزمائش کا ذریعہ بنا دے جن کے دلوں میں روگ ہے اور جن کے دل سخت ہیں۔ اور بلاشبہ یہ ظالم مخالفت میں دور جا پڑے ہیں۔ اور ایسا اس لیے ہوتا ہے تاکہ جن لوگوں کو سمجھ ملی ہے، وہ جان لیں کہ نبی جو کچھ سنا رہا ہے، وہ یقیناً رب العالمین کی طرف سے ہے۔ پھر وہ اس پر یقین کریں اور ان کے دل اس کی طرف جھک جائیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ایمان والوں کو اللہ ہی راہ راست دکھاتا ہے۔ (حج)

اصل متن میں تمنی اور امنیہ کا لفظ ہے۔ تمنی کا لفظ یہاں بمعنی قرأت اور امنیہ بمعنی متلو استعمال ہوا ہے۔ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد ایک شاعر نے کہا تھا:

تمنی کتاب اللہ اول لیلہ ۔۔۔ واخرھا لاقی حمام المقادر

شروع رات میں آپ نے کتاب اللہ کی تلاوت کی اور آخر رات میں مقدر موت سے جا ملے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح لوگوں کی ہدایت کے لیے یہ انتظام کیا ہے کہ وہ اپنے نمائندے بھیجتا ہے جو لوگوں کو اس کے احکام سناتے ہیں۔ اسی طرح اللہ نے شیطان کو بھی پورا موقع دے رکھا ہے۔ ہر زمانہ میں ایسا ہوا کہ جب پیغمبر نے اللہ کی بات کا اعلان کیا تو شیطان نے لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کی باتیں ڈال کر انھیں شبہہ میں مبتلا کر دیا۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی آیت سنائی انکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جہنم، تو شیطان نے یہ شبہ ڈالا:

"ما تعبدون من دون اللہ میں تو مسیح اور عزیر اور ملائکہ بھی شامل ہیں، تو کیا یہ سارے جہنم کا ایندھن بنیں گے۔"

جب کوئی بھی بات پیش کی جائے تو ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کرے اور سیدھی طرح اس کو مان لے۔ یہ سچے طالبان حق کا طریقہ ہے۔ مگر جن لوگوں کے دلوں میں سچی طلب نہیں ہوتی ان کا ذہن، شعوری یا غیر شعوری طور پر، اس کوشش میں لگ جاتا ہے کہ داعی کی بات میں کوئی نہ کوئی ایسی غلطی نکالی جائے جس سے اپنے موقف کا جواز ثابت ہو جائے۔ اب ان کا ذہن الٹی طرف کام کرنے لگتا ہے وہ اصل بات میں طرح طرح کے شوشے نکالنا شروع کرتے ہیں تاکہ لوگوں کی نظر میں اس کی صداقت کو مشتبہ کر دیں۔ نیز خود بھی یہ جھوٹی تسکین حاصل کریں کہ ہم جس دعوت کے مخالف ہیں، وہ اسی قابل ہے کہ اس کی مخالفت کی جائے۔

اس کی بے آمیز صداقت کو یہ کہہ کر رد کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ اسلاف کی تحقیر ہے۔ (انت تنفہ آباءنا) اس کی تاثیر یہ کہہ کر گھٹاتے ہیں کہ یہ ادبی سحر کاری ہے (بل ھو شاعر) داعی کے یقین اور حوصلہ کو یہ کہہ کر بے قیمت ٹھہراتے ہیں کہ یہ

سادہ انداز میں یہ ہے کہ فلاں شخص سے ان کو مدد مل گئی ہے (اعانہ علیہ قوم آخرون) کبھی یہ کہہ کر معاملہ کو مشتبہ کرتے ہیں کہ یہ تو ایک آدمی کی بات ہے (ان ھذا الا قول البشر) کبھی کہتے ہیں کہ یہ تو محض کچھ غیر اہم لوگوں کا قصہ ہے (اراذلنا بادی الرای) وغیرہ۔

اس قسم کی باتوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ داعی کی حیثیت کو مشتبہ اور اپنی پوزیشن کو مضبوط کیا جائے۔ مگر داعی حق کو اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل ہوتی ہے اور نتیجہ بالکل برعکس نکلتا ہے۔

سبق آموز

قومی رہنمائی کے کام کے لیے صرف انھیں لوگوں کو اٹھنا چاہیے جو حال کے اندر مستقبل کو دیکھ سکتے ہوں۔ جن کے اندر یہ صلاحیت نہ ہو، ان کا قومی رہنما بن کر اٹھنا، قومی جرم ہے نہ کہ قومی خدمت

چودھری خلیق الزماں (۱۸۸۸ - ۱۹۷۳) پاکستان تحریک کے بانیوں میں سے تھے۔ انھیں اپنے اوپر اتنا اعتماد تھا کہ انھوں نے کہا: "نہرو سے زیادہ سیاست میرا کوچوان جانتا ہے۔" انھوں نے ایک کتاب بھی لکھی ہے جس میں دکھایا ہے کہ پاکستان کے اصل بانی وہی تھے۔ یہ انھیں کا تخیل تھا اور اس وقت تھا جب کہ مسٹر جناح بھی اس کے خلاف تھے۔

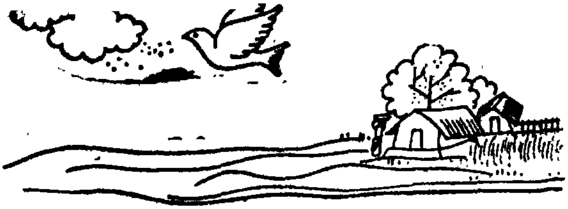
مگر آخر عمر میں چودھری صاحب کو یہ احساس ہو گیا کہ انھوں نے تقسیم ملک کی جو تحریک چلائی وہ غلط تھی۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور (۱۲ اپریل ۱۹۷۳ء) میں ان کا ایک انٹرویو چھپا تھا۔ اس سے پھر روزنامہ جنگ میں نقل ہوا۔ اس انٹرویو کا ایک حصہ یہ تھا:

"ممتاز مسلم لیگی لیڈر چودھری خلیق الزماں نے روزنامہ "جنگ" کے نمائندہ کو ایک ملاقات میں انٹرویو دیا اور برصغیر کی تقسیم کے بارے میں تفصیل سے اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ موجودہ حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے یہ تقسیم کرا کر ہندوستان کے مسلمانوں کو کمزور کر دیا اور جن عظیم مقاصد کے لیے پاکستان قائم کیا تھا وہ بھی حاصل نہ ہو سکے۔ اب ہم ایک کوزہ میں بند ہو گئے ہیں۔ ہندوستان میں اب بھی ۷۔۸ کروڑ مسلمان ہیں، جن کی ہم کوئی خدمت نہیں کر سکتے۔ اس صورت میں کون کہہ سکتا ہے کہ تقسیم ہند کرا کر ہم نے کوئی فائدہ حاصل کیا۔"

روزنامہ جنگ۔ راولپنڈی۔ ۳۰ اپریل ۱۹۷۳، صفحہ ۳

(ماخوذ از الفرقان، جنوری فروری ۱۹۷۴)

اس میں ہم صرف اتنا اضافہ کریں گے کہ موجودہ زمانے میں ہمارے تمام قائدین، خواہ وہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی، چودھری خلیق الزماں ہی کی مثال ثابت ہوئے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ بعض لوگ مرتے ہوئے چودھری صاحب کی طرح اپنا اقرار نامہ لکھ کر قوم کو دے گئے۔ اور بیشتر کا حال یہ رہا کہ آخر وقت تک وہ یہی کہتے رہے یا کہہ رہے ہیں کہ انھوں نے جو راہ اختیار کی وہی صحیح ترین راہ تھی۔ حالات کے بگاڑ میں ان کا اپنا کوئی حصہ نہیں۔



روداد سفر

گنگاپور راجستھان کا ایک شہر ہے جو دہلی سے ۳۰۰ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ۸ اگست ۱۹۷۷ کو ہم دہلی سے پتھروں کے اس شہر کے لئے روانہ ہوئے جہاں چھپر بھی پتھر کے ہوتے ہیں۔ راستہ میں مسلسل سرسبز و شاداب مناظر آنکھوں کے لئے "جنت نظارہ" بن رہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف ساری زمین سبز چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ جگہ جگہ ابھرے ہوئے درخت قدرتی گل بوٹے کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ کھلے آسمان کا منظر اور اس میں بادلوں کی حسین ٹکڑیاں آفاقی حسن کا منظر پیش کر رہی تھیں۔

"یہ شاداب حسن کس قدر لذت بخش ہے" میں نے سوچا۔ مگر وہ اپنے اندر تلخیاں بھی لئے ہوئے ہے۔ ہر سال جب بارش ہوتی ہے تو زمین پر سرسبزی اور شادابی کا ایک اتھاہ حسن اُگ آتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ کیچڑ اور سیلاب بھی لاتا ہے۔ مکانات گرتے ہیں۔ فصلیں تباہ ہوتی ہیں۔ بارش میں بھیگنے سے کتنی چیزیں خراب ہو جاتی ہیں۔ مچھر، مکھی، کیڑے مکوڑے وغیرہ طرح طرح کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔"

سرسبز درخت قدرت کی اتنی حسین نعمت ہیں کہ آخرت میں بننے والی بے پایاں نعمتوں کی دنیا کا نام ہی جنت (باغ) رکھ دیا گیا۔ انسان کی حسین ترین تمنا ہمیشہ یہ رہی ہے کہ سرسبز درختوں کے جھرمٹ میں عمدہ رہائش گاہ (مساکن طیبۃ فی جنات عدن) اسے حاصل ہو۔ زمین پر سرسبزی کا انحصار زیر زمین آبی اہتمام کے ساتھ بڑی حد تک فضائی بارش پر ہے۔ بارش کے فضائی انتظام کی وجہ سے یہ تمام مسائل پیدا ہوتے ہیں اور اس کی مصلحت یہ ہے کہ انسان ایک نعمت کو پا کر اس میں مگن نہ ہو جائے۔ بلکہ اس کی تلخیوں کو بھی بھگتے۔ تاکہ خدا کی یاد اس کے ذہن میں تازہ رہے۔ آخرت میں اس کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس لئے وہاں سرسبزی کو قائم رکھنے کے لئے غالباً فضائی بارشوں کا انتظام ختم یا محدود کر دیا جائے گا۔ اور زیر زمین آبی اہتمام کو زیادہ کامل بنا دیا جائے گا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جگہ جگہ کہا گیا ہے کہ جنت میں سرسبز باغات ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی (جنّٰت تجری من تحتها الانهار) گویا جنت میں آب رسانی کا نظام تحت زمینی ہوگا نہ کہ بالائے زمینی۔

گنگاپور میں تقریباً چھ ہزار مسلمان ہیں اور آٹھ مسجدیں ہیں۔ یہاں ایک رات گزری۔ تبلیغیوں والی مسجد میں فجر کی نماز کے بعد چند احادیث کی روشنی میں آخرت کی طرف توجہ دلائی گئی۔ انسان اپنے دنیا کے "گھر" کو بہتر بنانے میں مصروف رہتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ وہ زندگی سے زیادہ موت سے قریب ہے۔ کسی بھی وقت خدا کا فیصلہ آکر اس کے گھروندے کو منتشر کر سکتا ہے۔ اس کے بعد نہ وہ ہوگا نہ اس کی بنائی ہوئی دنیا جس کے بل پر وہ گھمنڈ کرتا تھا۔

۹ اگست کی صبح کو ہم اگلے سفر کے لئے گنگاپور اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ ساڑھے آٹھ

بجے ٹھیک وقت پر گاڑی شور مچاتی ہوئی پلیٹ فارم میں داخل ہوگئی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ موت بھی اسی قسم کی ایک سواری ہے جو اپنے مقررہ وقت پر خدا کی طرف سے آتی ہے۔ کسی کے لئے وہ "مخصوص سواری" ہوگی جس پر آرام سے بٹھا کر اعزاز و اکرام کے ساتھ اس کو رب العالمین کی مہمانی کے لئے لے جایا جائے گا۔ کسی کے لئے وہ پولیس کی "کالی گاڑی" ہوگی جس کے تنگ و تاریک خول میں اس کو دھکا دے کر ڈال دیا جائے گا، اور کشاں کشاں خدا کی عدالت میں پہنچا یا جائے گا تاکہ اس کے کبر اور سرکشی کی دردناک سزا اسے دی جائے۔

۱۰ بجے ہم ملارنا پہنچے۔ یہاں پہنچتے ہی جو پہلی خبر ملی وہ یہ کہ دو مسلم خاندان آپس میں لڑ گئے۔ راستہ بھر قدرتی مناظر سے گذرتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا یہ کتاب الٰہی کے بکھرے ہوئے اوراق ہیں جن کو پڑھتا ہوا میں ان کے درمیان سے گزر رہا ہوں۔ یہ ایک آفاقی نشرگاہ تھی جو خدائی پیغامات کو اس کی حسین ترین شکل میں نشر کر رہی تھی۔ "لوگ حقیقت سے اتنے بے خبر کیوں ہیں جب کہ زمین و آسمان سے مسلسل حقیقت کا اعلان ہو رہا ہے" میں نے سوچا "خدائی پیغام رسانی کا یہ کام اتنے حسین، اتنے ابدی اور اتنے آفاقی انداز میں ہو رہا ہے کہ کوئی کان اس کو سننے سے محروم نہ رہے۔ کوئی آنکھ اس کے مشاہدہ سے خالی نہ رہے۔ پھر بھی کیوں ایسا ہے کہ لوگ اس کے سننے کے لئے بہرے ہیں اور آنکھیں اس کو دیکھنے کے لئے اندھی ہو رہی ہیں"

درخت کہہ رہے ہیں کہ لوگوں کے لئے سایہ اور پھل کی مانند بنو۔ پھول کہہ رہے ہیں کہ ایسے بنو کہ تم کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور لوگوں کو تم سے خوشبو ملے۔ چڑیاں کہہ رہی ہیں کہ خدا کی حمد کے نغمے گاؤ۔ ہوائیں کہہ رہی ہیں کہ لوگوں کے بیچ سے اس طرح گزر جاؤ کہ تمھارا سفر بھی جاری رہے اور کسی کو تم سے تکلیف نہ پہنچے۔ پہاڑ کہہ رہے ہیں کہ لوگوں کے درمیان صبر اور تحمل کی چٹان بن کر رہو۔ آسمان کہہ رہا ہے کہ اپنے آپ کو اتنا اوپر اٹھالو کہ نفرت اور شکایت کی باتیں تم کو حقیر نظر آنے لگیں ——— اس قسم کی بے شمار آوازیں کائنات میں ہر آن ابل رہی ہیں مگر وہ کسی کو سنائی نہیں دیتیں۔

خیال کا قافلہ یوں ہی چلتا رہا۔ یہاں تک کہ مجھے ایک حدیث یاد آئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے شب قدر کا علم دیا گیا اور میں مسجد سے نکلا کہ لوگوں کو بتا دوں۔ اتنے میں دو مسلمان لڑ گئے۔ اس لئے وہ علم اٹھا لیا گیا۔ (فتلاحی الرجلان فرفعت) گویا جب لوگ باہمی لڑائی جھگڑے کی سطح پر ہوں تو علم الٰہی کی روشنی ان سے دور ہو جاتی ہے۔ خدائی کلام کو سننے کے لئے ان کے کان بہرے ہو جاتے ہیں۔ معرفت خداوندی کا فیضان اسی قلب پر اترتا ہے جس کا دل دوسروں کے خلاف بغض و حسد سے خالی ہو۔ جس کا سینہ دوسروں کے خلاف نفرت کا کوڑا خانہ بنا ہوا ہو، اس میں الہام خداوندی کو لے کر چلنے والے پاک فرشتے قدم نہیں رکھتے۔

۹ اگست کی شام کو ہم بہتیٹر (ضلع سوائی مادھوپور) پہنچے۔ یہ بستی دہلی سے تقریباً ۲۵۰ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ بہتیٹر اور ملارنا دونوں قریب قریب بستیاں ہیں جن کو صرف ایک پہاڑی راستہ جدا کرتا ہے — دونوں ایک دوسرے کا بازو معلوم ہوتی ہیں۔ دونوں بستیوں میں کئی تقریریں ہوئیں۔ ان تقریروں کا موضوع مختلف پہلوؤں سے، خوف خدا اور فکر آخرت تھا۔

یہ پورا علاقہ پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ سب سے اونچی چوٹی وہ ہے جو ہیتیڑ اور ملارنا کے درمیان واقع ہے۔ اس کے اوپر شاہ محمد اسماعیل کی کا مزار ہے۔ ہر جمعرات کے روز یہاں دیئے جلائے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ سے کئی دیواریں بالکل کالی ہو گئی ہیں۔ قبر پر دیا جلانا خود ناقابل فہم ہے۔ مگر یہ اور بھی زیادہ ناقابل فہم ہے کہ ایسا عمل کیا جائے جو "بزرگ" کی در و دیوار کو کالک لگانے کے ہم معنی بن جائے۔ تاہم ایک توہم پرست ذہن کے لئے یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ کیونکہ توہم پرستی نام ہی ہے متضاد چیزوں کو ذہن میں جمع کرنے کا۔

اس پہاڑی کے اوپر دوسرا عجیب منظر بجلی کے کھمبے ہیں۔ ہیتیڑ میں ابھی تک بجلی نہیں پہنچی۔ مگر اس غیر آباد بلند چوٹی پر، ملارنا سے، بجلی کے کھمبے پہنچا دیئے گئے ہیں یہ پچھلے الکشن (مارچ ۱۹۷۷) کی برکت ہے۔ تاہم تاروں کا بھاری بوجھ اٹھائے ہوئے یہ بجلی کے کھمبے ابھی تک قمقموں کے بوجھ سے خالی ہیں۔ ہم تقریباً دو درجن آدمیوں کے قافلے نے پہاڑ کی اس چوٹی پر عصر کی نماز ادا کی اور دو گھنٹے تک یہاں رہے۔ کھلا آسمان، تازہ ہوا، سرسبز میدان، پہاڑی سلسلے، ڈنڈ بائی ہوئی ندیاں، چڑیوں کے چہچہے، غرض قدرت کے ماحول میں گزرنے والے یہ لمحات بڑے پُرکیف تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ہم زندگی کی ایسی بلند سطح پر پہنچ گئے ہیں جہاں تمام پستیاں تحلیل ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ وہ مسائل جو زمین پر انسان کو الجھائے رہتے ہیں، یہاں بے حقیقت ہوتے ہوئے دکھائی دئے۔ آخر میں یہاں ایک نشست ہوئی جس میں دعوتی کام کی اہمیت اور موجودہ زمانہ میں اس کے امکانات پر اظہار خیال کیا گیا۔

۱۱ اگست کو ہم گنگا پور ہوتے ہوئے دوبارہ دہلی واپس آگئے۔ ہمارا یہ سفر مدرسہ نورالاسلام ہیتیڑ (ضلع سوائی مادھوپور) کی دعوت پر ہوا۔ مولانا عبدالرحیم بنڈیڈوی اور مولانا محمد حسن خاں میواتی شریک سفر رہے

قرآن کی سورہ نمبر ۴۲ میں حکم دیا گیا ہے کہ دین کو قائم رکھو۔ (شوریٰ - ۱۳) اس آیت میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اقامت دین سے اتحاد مراد لیا ہے:

(ان اقیموا الدین) امر اللہ لجملۃ الانبیاء ان اقیموا الدین ان اتفقوا فی الدین (ولا تتفرقوا فیہ) لا تختلفوا فی الدین	اللہ نے تمام پیغمبروں کو حکم دیا کہ دین کو قائم رکھو، یعنی دین میں متفق رہو اور اس میں مختلف و متفرق نہ ہو جاؤ۔

(تفسیر عبداللہ بن عباس (مطبوعہ ۱۲۸۰ھ)

اس تشریح کے مطابق اقامت دین کی آیت میں جس بات کا حکم دیا گیا ہے وہ دراصل یہ ہے کہ مسلمان اس صورت حال سے بچیں جو عام طور پر حامل کتاب گروہ کے اندر زوال کے زمانہ میں پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی دین کے نام پر اختلاف و انتشار۔ یہ داخلی دینی اتحاد کا حکم ہے نہ کہ خارجی معرکہ آرائی کا۔

تعارف وتبصرہ

[illegible] قرآن

از مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی

صفحات ۴۶۵ قیمت مجلد پندرہ روپے

پتہ: ادارہ رحمت عالم، شیخ چاند اسٹریٹ، لال کنواں، دہلی

مصنف کتاب مولانا اخلاق حسین قاسمی پچھلے ۴۰ سال سے دہلی کی مساجد میں قرآن کا درس دیتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا کے سامنے "دوسری تفاسیر کے ساتھ خاص طور پر حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ اور تشریحی فوائد پیش نظر رہے ہیں (۷)، موصوف نے دیکھا کہ ناشرین کی بے پروائی سے شاہ صاحب کے ترجمہ اور فوائد میں اغلاط داخل ہوگئی ہیں۔ انھوں نے ضروری سمجھا کہ اس قیمتی قرآنی خدمت کو اس کی اصل شکل میں محفوظ کیا جائے۔ شاہ صاحب کے ترجمہ کی تصحیح کی جائے اور مختلف قدیم نسخوں کو سامنے رکھ کر صحیح ترجمہ مرتب کیا جائے اور اس کی اشاعت ہو۔ (۸)

شاہ صاحب نے ۴۰ سال معتکف رہ کر یہ ترجمہ ۱۲۰۵ (۱۷۹۰ء) میں مکمل کیا۔ اس کی اہمیت کے بارہ میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ایک اقتباس کافی ہوگا۔ ڈپٹی صاحب نے ۱۳۱۴ھ میں قرآن کا اپنا ترجمہ کیا تھا۔ اپنے مقدمہ میں انھوں نے لکھا: "شاہ صاحب کے ترجمہ کے بعد ہر ایک کو ترجمہ کا حوصلہ ہوگیا مگر خاندان شاہ ولی اللہ کے سوا کوئی شخص مترجم ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا"

شاہ صاحب نے اپنے ترجمہ میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کافی استعمال کئے ہیں۔ "اس کا مقصد صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم طبقہ قرآن کے پیغام سے قریب ہو" (۱۴) اس طرح شاہ صاحب کے ترجمہ کو زندہ کرنے میں دو نسبتیں شامل ہوگئی ہیں۔ ایک عام مسلمانوں کو قرآن کے معانی سے واقف کرانا۔ دوسرے غیر مسلم حضرات تک قرآن کے پیغام کو پہنچانا۔

شاہ صاحب کا ترجمہ پہلی بار ۱۷۹۰ میں شائع ہوا۔ مگر یہ ابتدائی نسخہ آج غالباً کہیں موجود نہیں ہے۔ بعد کے ترجموں میں لوگوں نے بطور خود ترمیمات کرنی شروع کردیں اور تفسیری حواشی میں اضافے کر ڈالے۔ اب یہ متعین کرنا ایک مشکل کام بن گیا ہے کہ شاہ صاحب کا اصل ترجمہ اور حواشی کیا تھے۔ فاضل مصنف نے اس سلسلے میں غیر معمولی تحقیق کی ہے، اور اس سلسلے کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ فاضل مصنف نے صرف شاہ صاحب کے ترجمہ کی علمی وتاریخی تحقیق ہی نہیں کی ہے۔ بلکہ اس میں خود تفسیری مسائل پر بھی قیمتی بحثیں درج ہیں۔

فاضل مصنف نے شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ کو صحیح کر کے اس کی اشاعت کا جو منصوبہ بنایا ہے، اللہ تعالٰی اس راہ میں موصوف کی مدد کرے تاکہ یہ کام بخوبی طور پر اپنی تکمیل کو پہنچے۔

امت مسلمہ کی رہنمائی حضرت عمرؓ کی تعلیمات کی روشنی میں

از مولانا محمد تقی امینی

ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

صفحات: ۱۰۴ قیمت: دو روپے

مفت تقسیم کے لیے بڑی تعداد میں خریدنے والوں کے لیے ۴۰ فی صد کمیشن۔ ایک نسخہ کے خواہش مند دو روپے بذریعہ منی آرڈر بھیج کر طلب فرمائیں۔

ادارۂ احتساب، امینی منزل

دودھ پور روڈ، علی گڑھ

المركز الاسلامی

AL-MARKAZ-UL-ISLAMI (Regd.)

ISLAMIC CENTRE

JAMIAT BUILDING - QASIMJAN STREET - DELHI 110006 (India)

اسلام کا مطلب ہے اپنے آپ کو خدا کے آگے سپرد (SURRENDER) کردینا۔ مسلمان وہ ہے جو اس بات پر یقین رکھتا ہو کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ وہ مرنے کے بعد ہر ایک سے اس کے کارنامہ زندگی کا حساب لے گا۔ اس کے بعد اپنے وفادار بندوں کے لئے دائمی جنت کا فیصلہ کرے گا، اور غیر وفادار بندوں کو دائمی جہنم میں ڈال دے گا۔ اس احساس کے تحت جو زندگی بنتی ہے، اس کو ایک لفظ میں آخرت رخی زندگی (AKHIRAT ORIENTED LIFE) کہہ سکتے ہیں۔

یہ احساس جب کسی دل میں پیدا ہو جائے تو اس کی پوری زندگی بدل جاتی ہے۔ وہ ہر وقت خدا سے ڈرنے لگتا ہے۔ کیوں کہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ خدا اس کو کھلے اور چھپے ہر حال میں دیکھ رہا ہے۔ بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے وہ ہمیشہ انصاف اور خیرخواہی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ ہر انسان کے پیچھے اس کا خدا کھڑا ہوا ہے۔ وہ کبھی اس بات کو نہیں بھولتا کہ بالآخر وہی چیز صحیح قرار پائے گی جس کو خدا صحیح کہے اور وہ سب کچھ غلط ٹھہرے گا جس کو خدا غلط ٹھہرائے۔

اسی کے ساتھ مسلمان کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کی اس حقیقت کو دوسری تمام قوموں تک پہنچائے۔ اس سنگین واقعہ سے لوگوں کو باخبر کرنے کے لئے پہلے انبیاء آتے تھے۔ ختم نبوت کے بعد یہ ذمہ داری نبی آخر الزماں کی امت پر ڈال دی گئی ہے، مسلمان پر جس طرح خود عمل کرنے کی ذمہ داری ہے، اسی طرح دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری ہے۔ ان میں سے کوئی ایک کام، دوسرے کام کے لئے خدا کے یہاں عذر نہیں بن سکتا۔

اسلامی مرکز کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کو دنیوی ہم کے بجائے اُخروی ہم کے طور پر سامنے لایا جائے۔ اس کا منصوبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر ان احساسات کو جگائے، اور دوسری قوموں تک حق کا پیغام پہنچانے کی تدبیریں اختیار کرے۔

اسلامی مرکز کے سامنے پہلا کام یہ ہے کہ اسلام کو وقت کے اسلوب اور زمانہ حاضر کی زبان میں لوگوں کے سامنے لایا جائے۔ تاکہ جس اسلام کو وہ تقلیدی طور پر مانتے ہیں، وہ ان کے ذہن کی غذا بن سکے، وہ ان کے اندر عمل کی حرارت پیدا کرنے لگے۔ وہ ان کی زندگی کا محض ایک ضمیمہ نہ ہو، بلکہ وہی ان کی کل زندگی بن جائے۔ ہر عہد کا ایک فکری معیار ہوتا ہے، اور کسی انسان کی زندگی میں کوئی فکر اسی وقت غالب فکر بن کر داخل ہوتا ہے جب کہ وہ اس کو اس فکری معیار پر ملے جس کے اندر وہ سانس لے رہا ہے۔

اسلامی مرکز کے سامنے دوسرا کام، مسلمانوں کو داعی گروہ کی حیثیت سے اٹھانا ہے۔ دعوت ہی واحد کام ہے جو مسلمانوں میں عمل کا حوصلہ ابھار سکتا ہے، ان کے اندر اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا کرتا ہے، ان کو خدا کی اجتماعی نصرتوں کا مستحق بناتا ہے۔ ان کو آخرت میں خدا کے گواہ کا درجہ عطا کرتا ہے جس سے بڑا کوئی درجہ انسان کے لئے نہیں۔

اسلامی مرکز انھیں دونوں مقاصد کے تحت قائم کیا گیا ہے۔ کسی قسم کی سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ مسلمانوں کو اور تمام انسانوں کو آنے والے یوم الحساب سے ہوشیار کرنے کی ایک ہم ہے۔ زندگی میں آدمی کو بے شمار مسائل نظر آتے ہیں۔ مگر موت کے بعد ایک ہی مسئلہ اس کے سامنے ہوگا۔ ہم چاہتے ہیں کہ موت سے پہلے آدمی اس مسئلہ سے آگاہ ہو جائے، موت سے پہلے وہ اس کی تیاری میں اپنے کو لگا دے۔

ہمارا پروگرام

۱ عربی، انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں میں رسائل کا اجرا جس کے ذریعہ مسلمانوں کو ان کی دعوتی ذمہ داری کی طرف متوجہ کیا جا سکے اور اسلام کو جدید اسلوب اور عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق مدلل کیا جائے۔

۲ قرآن کے ترجمے دنیا کی تمام زبانوں میں شائع کرنا اور ان کو رعایتی قیمت کے ساتھ لوگوں تک پہنچانا۔

۳ قرآنی علوم کی تدوین اور اسلامی انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت۔

۴ حدیث، سیرت، حالاتِ صحابہؓ، تاریخ اسلام (نہ کہ تاریخ فتوحات) پر سادہ، واقعاتی انداز میں کتابوں کی تیاری اور ان کو مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۵ ایسی درس گاہ کا قیام جس میں قرآن، حدیث، سیرت، تقابلی مذہب، عربی زبان اور دوسری زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہو۔

۶ اسلامیات اور مختلف مذاہب کے مطالعہ کے لئے ایک مکمل لائبریری کا قیام۔

۷ مختلف علاقوں اور ملکوں میں تبلیغی وفود بھیجنے کا انتظام۔

۸ اسلام کے تاریخی آثار اور دستاویزات کا میوزیم قائم کرنا۔

۹ علمی طرز فکر اور حقیقت پسندانہ مزاج پیدا کرنا۔

۱۰ جدید طرز کے پریس کا قیام جہاں مختلف زبانوں میں اعلیٰ چھپائی ہو سکے۔

۱۱ ایسے ادارہ کی تشکیل جہاں تمام ضروری دینی شعبے قائم ہوں اور غیر مسلم وہاں آکر اسلام کو سمجھ سکیں۔

اسلامی مرکز کے سلسلہ میں تمام امور کے لئے براہ راست صدر سے رجوع کیا جائے

خطوط وغیرہ برحسب ذیل پتہ تحریر کیا جائے:

مولانا وحید الدین خاں، صدر اسلامی مرکز، جمعیۃ بلڈنگ۔ قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

MAULANA WAHIDUDDIN KHAN
PRESIDENT, ISLAMI MARKAZ
JAMIAT BUILDING
QASIMJAN STREET, DELHI 6

Single Copy Rs. 2.00

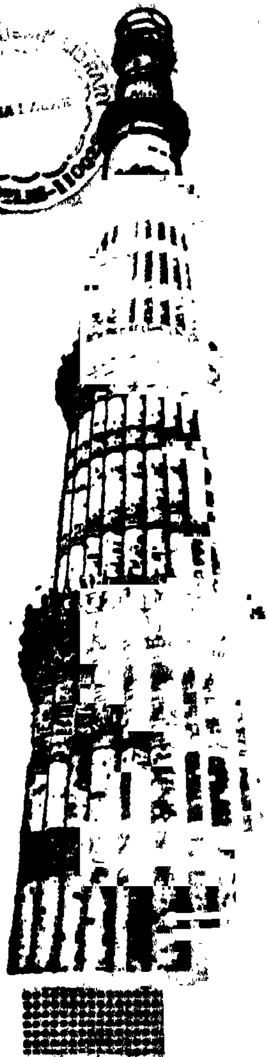
Regd. No. D (D) 532
REGD. R. N. No. 28822/76
OCTOBER 1976

AL-RISALA MONTHLY
JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI 6 (India,

وحید الدین پرنٹر پبلشر مسئول نے جے۔ کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ "جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

الرسالہ



ایک شخص نے کاروبار شروع کیا اور زبردست محنت کر کے اس میں کافی ترقی کی۔ اس کے دوست نے اس کو عید کارڈ بھیجتے ہوئے لکھا: "سلف میڈ مین کے نام جو قطب مینار کی بلندیوں کو بھی پار کر سکتا ہے"

وہ لوگ اور بھی زیادہ خوش نصیب ہیں جو ایمان و اسلام کی بلندیوں کو پار کریں۔ آخرت کے دن خدا کے فرشتے ان کو مبارکباد دیتے ہوئے کہیں گے: "پچھلی زندگی میں تم نے آج کے لئے عمل کیا تھا۔ اب اس کا بے حساب انعام لو اور خدا کی جنت میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو جاؤ۔"

۱۷	زر تعاون سالانہ	۲۴ روپے	قیمت فی پرچہ
	خصوصی تعاون سالانہ	ایک سو روپے	
دسمبر ۱۹۷۷	بیرونی ممالک سے	۱۵ ڈالر امریکی	دو روپے

عزت وذلت کا معیار

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص سامنے سے گزرا۔ اس کا عمدہ لباس اور اس کا شاندار جسم بتا رہا تھا کہ یہ بستی کا صاحب حیثیت آدمی ہے۔ آپ نے حاضرین سے کہا: اس شخص کے بارے میں تم لوگوں کی کیا رائے ہے۔ کسی نے جواب دیا، یارسول اللہ، یہ یہاں کے شریف لوگوں میں سے ہے۔ خدا کی قسم وہ اس قابل ہے کہ اگر کسی گھر میں نکاح کا پیغام دے تو قبول کیا جائے۔ کسی کی سفارش کرے تو اس کی سفارش مانی جائے۔

آپ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد ایک اور شخص سامنے سے گزرا۔ آپ نے دوبارہ حاضرین سے پوچھا، اس کے بارے میں کیا رائے ہے۔ کسی نے کہا، یارسول اللہ یہ ایک غریب مسلمان ہے۔ کہیں نکاح کا پیغام دے تو قبول نہ کیا جائے، کہیں سفارش کرے تو اس کی سفارش سنی نہ جائے۔ بات کرے تو کوئی اس کی طرف متوجہ نہ ہو۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا: "پہلی قسم کے آدمیوں سے اگر ساری زمین بھر جائے تو خدا کی نظر میں ایسا ایک شخص ان سے بہتر ہوگا"۔

فہرست

۱۔	جب برائی کو نیکی کے خانہ میں لکھ دیا جائے۔	۳
۲۔	حکمت کی باتیں۔	۷
۳۔	موت کے اس پار۔	۸
۴۔	قرآن کو سمجھنے کے لئے۔	۱۸
۵۔	ترجمہ کی غلطی۔	۱۹
۶۔	الاسلام پر اخبار بلٹز کا تبصرہ۔	۲۱
۷۔	جب لائق کا معیار خوشامد ہو جائے۔	۲۲
۸۔	فطرت کو اس کی تلاش کا جواب مل گیا۔	۲۳
۹۔	عضویاتی ارتقار کا نظریہ۔	۲۴
۱۰۔	یہ ایک خدائی منصوبہ تھا۔	۲۷
۱۱۔	اسلام ایک عظیم جدوجہد	۲۸
۱۲۔	گلاب کی سات سو قسمیں	۴۳
۱۳۔	المرکز الاسلامی: ایک تعارف	۴۴

یہاں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی خریداری کی مدت ختم ہو گئی ہے۔ امید ہے کہ الرسالہ کو آپ نے اپنے لئے مفید پایا ہوگا۔ اور آئندہ بھی اس کا مطالعہ پسند فرمائیں گے۔

براو کرم سالانہ زر تعاون بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں تاکہ الرسالہ آپ کے نام جاری رکھا جا سکے

منیجر ماہنامہ الرسالہ

جمعیتہ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

جب برائی کو نیکی کے خانہ میں لکھ دیا جائے

اللہ تعالیٰ نے اپنے وفادار بندوں کے لئے جن انعامات کا وعدہ کیا ہے، ان میں سے ایک خصوصی وعدہ وہ ہے جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:

فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ (فرقان ۔۔۔) اللہ ان کی برائیوں کو بدل دیتا ہے بھلائیوں سے

اس خدائی انعام کا تعلق اصلاً اس انفرادی یافت سے ہے جو ایک بندۂ مومن کو خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ تاہم اس کا ایک اجتماعی پہلو بھی ہے۔ یہاں ہم دونوں پہلوؤں کے بارے میں مختصراً عرض کریں گے۔

انسان کو کچھ اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ لغزشوں اور کوتاہیوں سے پاک نہیں رہ سکتا۔ حتیٰ کہ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بجائے خود مطلوب بھی ہے کہ انسان غلطی کرے۔ ایک روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر دی کہ انسان اگر گناہ نہ کرتا تو اللہ دوسری مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرے اور پھر اللہ سے معافی مانگے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ انسان سے اللہ تعالیٰ کو اصلاً جو چیز مطلوب ہے، وہ عجز ہے۔ یہ احساس کہ "میں نے غلطی کی" آدمی کے اندر عجز کا جذبہ زیادہ ابھارتا ہے بہ نسبت اس احساس کے کہ "میری زندگی گناہوں سے پاک ہے"۔ مومنانہ قلب رکھنے والے ایک آدمی سے جب کوئی لغزش ہو جاتی ہے تو وہ فوراً تڑپ اٹھتا ہے۔ یہ سوچ کر وہ بیتاب ہو جاتا ہے کہ شیطانی ترغیبات اور نفسانی محرکات کے مقابلہ میں وہ کتنا کمزور ثابت ہوا۔ بے چارگی اور شرمندگی کے جذبہ کے تحت وہ دوبارہ خدا کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ وہ اپنی اس عاجزانہ حیثیت کو پالیتا ہے کہ خدا اگر میری مدد نہ کرے تو میں اپنے کو سنبھال نہیں سکتا۔ میرے اندر کوئی ذاتی طاقت نہیں۔ انسان اگر غلطی نہ کرے تو اندیشہ ہے کہ اس کے اندر گھمنڈ کی نفسیات پیدا ہو جائے اور نتیجۃً وہی چیز (عجز) اس سے چھن جائے جو بندہ ہونے کی حیثیت سے اس کا اصل زیور ہے:

والذی نفسی بیدہ لو لم تذنبوا لخشیت علیکم ماھو اشد منہ وھو العجب (رزین)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر تم گناہ نہ کرو تو تمہارے بارے میں مجھے اس سے بھی زیادہ سخت چیز کا اندیشہ ہے، اور وہ عُجب ہے۔

اللہ کے یہاں "نیکیوں" کی گنتی اور کارناموں کے انبار کی قیمت نہیں۔ اس کو تو ٹوٹے ہوئے دل درکار ہیں (انا عند المنکسرۃ قلوبھم) وہ ایسے بندوں کو پسند کرتا ہے جن کا کلمہ یہ ہو کہ میرے رب! میں تو کچھ بھی نہ کر سکا۔ میری زندگی تو غفلتوں میں گزر گئی۔ یہ محض مصنوعی طور پر نہ ہو بلکہ یہی آدمی کا واقعی احساس بن جائے۔ حتیٰ کہ اس کا احساس عجز اتنا بڑھ جائے کہ یہ کلمہ بھی اس کی زبان سے ادا نہ ہو، وہ آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ اگر آدمی

کی لغزش اُس کے اندر، اِس احساسِ عبدیت کو ابھارنے کا سبب بن جائے تو وہ خدا کی نظر میں اتنا محبوب ہوجاتی ہے کہ وہ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ میرے بندے کی اس لغزش کو اس کے اعمال نامہ میں حسنات کے خانہ میں لکھ دو۔ کیونکہ وہ میرے بندے کو مجھ سے قریب لے آئی ہے۔ اس کے برعکس جو نیکی آدمی کے اندر فخر کا احساس پیدا کرے، اس کے متعلق اندیشہ ہے کہ وہ سیئات کے خانہ میں نہ لکھ دی جائے۔ کیونکہ وہ بندے کو خدا سے دور کرنے کا سبب بنی۔

غلطیاں ہر ایک سے سرزد ہوتی ہیں۔ مومن سے بھی اور غیر مومن سے بھی۔ مگر جس کو حقیقی معنوں میں عبدیت کا مقام حاصل ہوتا ہے، اس سے جب کوئی لغزش ہوجاتی ہے تو وہ فوراً چونک اٹھتا ہے۔ اس کا احساسِ گناہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ دگنی شدت کے ساتھ اپنے رب کی طرف دوڑے۔ اس کی غلطی اس کو نئی اعلیٰ تر قسم کی ایمانی کیفیات سے لبریز کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔ اللہ سے خوف و محبت کا نیا طوفان اس کے اندر امنڈ آتا ہے۔ اللہ کی طرف رجوع، جو تمام عبادات کی روح ہے، اس کے اندر پہلے سے بھی زیادہ بڑے پیمانہ پر پیدا ہوجاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ گناہ جو اپنے بعد خشیت اور تضرع کے آنسو لے آئے، وہ نہ صرف گناہ کی سیاہی کو دھو دیتا ہے، بلکہ خود گناہ کو نیکی کے خانہ میں ڈال دیتا ہے۔ کیونکہ نتیجۃً اس نے جو چیز پیدا کی، وہ وہی تھی جو تمام نیکیوں کا اصل مقصود ہے۔

اس کے برعکس معاملہ ان لوگوں کا ہے جن کے اندر عبدیت کا احساس بیدار نہ ہوا ہو۔ جن کا حال یہ ہو کہ گناہ کرنے کے بعد بھی شرمندگی اور گنہ گاری کا جذبہ ان کے اندر نہ ابھرے۔ ایسے لوگ غلطیوں کے اندھیرے میں گم رہتے ہیں۔ ان کی لغزشیں ان کو عجز اور انابت کی خوراک نہیں دیتیں بلکہ ان کی قساوت کو بڑھاتی رہتی ہیں۔ وہ ہر گناہ کے بعد اگلے گناہ کے لئے کچھ اور جری ہوجاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انھوں نے اپنی باگ شیطان کے ہاتھ میں دے دی ہے، اور وہ جدھر چاہتا ہے، انھیں کھینچے لئے پھرتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ ۝ وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّونَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُونَ ۝

جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں، جب شیطان کا کوئی گروہ انھیں چھوتا ہے تو وہ چونک جاتے ہیں۔ پھر ان کو سوجھ آجاتی ہے۔ اور جو شیطان کے بھائی ہیں، وہ ان کو گمراہی میں کھینچتے رہتے ہیں، پھر کمی نہیں کرتے۔

اعراف — ۲۰۲

مومن کی سیئات کو حسنات سے بدل دینے کا دوسرا پہلو وہ ہے جو اجتماعیات سے متعلق ہے۔ یہ اہلِ ایمان کے ساتھ اللہ کا وہ خاص معاملہ ہے جب کہ وہ ان کے ناموافق حالات (DISADVANTAGE) کو موافق حالات (ADVANTAGE) میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ مدد چونکہ ایک اعتبار سے دنیوی ہے، اس لئے، پہلی قسم کی مدد کے برعکس، وہ بعض اوقات غیر اہلِ ایمان کے حصہ میں بھی آجاتی ہے۔ تاہم دونوں گروہوں میں ایک فرق ہے۔ جہاں تک خدا کے مومن بندوں کا تعلق ہے، ان کے لئے اس قسم کی مدد کی یقینی ضمانت ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب یہ مدد انھیں مخالفینِ اسلام کے مقابلہ میں درکار ہو۔ جب کہ غیر اہلِ ایمان کے لئے اس طرح کی کوئی ضمانت نہیں۔

اسلام کی تاریخ اس قسم کی مدد کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔

ا۔ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں، مکہ میں مسلمانوں کے حالات اتنے سخت ہو گئے کہ ان کے لئے اس کے سوا کوئی صورت نہ رہی کہ اپنا وطن چھوڑ کر باہر چلے جائیں۔ انھوں نے حبش کا انتخاب کیا جو عرب کی سرحد پر تھا اور اس وقت وہاں ایک عیسائی بادشاہ (نجاشی) حکومت کر رہا تھا جس کی نیک نفسی مشہور تھی۔ ۶۱۵ء میں پندرہ آدمی جدہ پہنچے اور کشتیوں سے سفر کر کے حبش کے ساحل پر اتر گئے۔ دوسری بار ۶۱۷ء میں ایک سو مسلمانوں کا قافلہ حبش گیا۔

گھر بار، جائداد، اعزہ اقربا کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں جانا بظاہر ایک ناپسندیدہ واقعہ تھا۔ مگر اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے خیر کی صورت پیدا کر دی۔ مسلمانوں کا حبش پہنچنا، سمندر پار کے ایک ملک میں اسلام کو موضوع بحث بنانے کا سبب بن گیا۔ پیغمبر اسلام کی بعثت اور آپ کی دعوت کی خبریں حبش میں پھیلنے لگیں۔ قریش کے ایک مخالفانہ وفد کی آمد کی وجہ سے مسلمانوں کے سردار جعفر بن ابی طالب کو موقع ملا کہ وہ شاہی دربار میں اسلام کی دعوت پر مفصل تقریر کر سکیں۔ ان واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ حبش سے ۲۰ عیسائی علما ر کا وفد تحقیق حال کے لئے مکہ آیا۔ اور اسلام قبول کر کے اپنے ملک واپس ہوا۔ (قصص ۵۵ - ۵۲) اس طرح وہ تحریک جو ہجرت حبش سے پہلے مکہ کی ایک قصباتی تحریک کی حیثیت رکھتی تھی، ہجرت حبش کے بعد اس نے بین الاقوامی تحریک کی حیثیت حاصل کر لی۔

۲۔ اسلام جب عرب میں ظاہر ہوا، اس وقت عرب کے شمال اور جنوب میں تمام علاقے اس زمانہ کی دو بڑی شہنشاہیتوں، ساسانی سلطنت اور بازنطینی سلطنت کے ماتحت تھے۔ یہ سلطنتیں اس کو برداشت نہ کر سکتی تھیں کہ قلب عرب میں کوئی آزاد اقتدار قائم ہو۔ اور ترقی کرے۔ ان کے اس جذبہ کا اظہار مختلف شکلوں میں ہوتا رہتا تھا۔ اسی کی ایک مثال ۸ھ کا وہ واقعہ ہے جب کہ بُصری کے گورنر شرحبیل بن عمرو غسانی نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر کو شام کے سرحدی قصبہ موتہ میں قتل کر دیا۔ یہ حارث بن عمیر ازدی تھے جو آپ کی طرف سے دعوت اسلام کا مکتوب لے کر حاکم بُصریٰ کے پاس گئے تھے۔

بین اقوامی روایت کے مطابق یہ واقعہ ایک ملک پر دوسرے ملک کی جارحیت کے ہم معنی تھا۔ یہ خبریں بھی آنے لگیں کہ شام کی طرف سے رومی فوجیں پیش قدمی کر کے مدینہ میں داخل ہونا چاہتی ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ نے اس کا فوجی جواب دینا ضروری سمجھا۔ آپؐ نے تین ہزار کا ایک لشکر تیار کیا اور زید بن حارثہ کو اس کا سردار مقرر کر کے شام کی طرف روانہ کیا۔ موتہ کے مقام پر مقابلہ ہوا۔ مگر مسلمانوں کے تین ہزار فوجیوں کے مقابلہ میں رومیوں کی ایک لاکھ سے بھی زیادہ فوج اکٹھا ہو گئی۔ حضرت زیدؓ سمیت تقریباً دو ہزار مسلمان شہید ہو گئے اور بقیہ فوج اس حال میں واپس ہوئی کہ مدینہ والوں نے ان کا استقبال یا فُرّار (اے بھاگنے والو) کہہ کر کیا۔

پیغمبر اسلامؐ کی پوری ۲۳ سالہ نبوی زندگی میں یہ سب سے بڑا نقصان کا واقعہ تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے حیرت انگیز طور پر اس کے اندر سے ایک عظیم الشان خیر کا پہلو پیدا کر دیا۔ عرب کے مسلمان جن قبائل سے تعلق رکھتے تھے، وہ صدیوں

سے آپس میں لڑتے چلے آرہے تھے۔ جنگ ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ شدید اندیشہ تھا کہ اپنی قوتوں کے اظہار کا کوئی میدان نہ پاکر وہ دوبارہ آپس میں لڑنے لگیں۔ غزوۂ موتہ کے حادثہ نے اس کا بہترین حل فراہم کردیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیوں کی جارحیت کا جواب دینے کے لئے دوبارہ ایک عظیم تر فوج ترتیب دی اور اس کا سردار اسامہ بن زیدؓ کو بنایا جن کے دل میں رومیوں سے انتقام کا شدید جذبہ بھرا ہوا تھا، کیونکہ انھوں نے آپ کے والد زید بن حارثہ رضؓ کو قتل کیا تھا۔

اس طرح پیغمبر اسلامؐ کو موقع ملا کہ اپنے آخری ایام میں عربوں کو رومی شہنشاہیت سے متصادم کرکے ان کی جنگجو فطرت کے لئے عمل کا ایک میدان فراہم کردیں۔ چنانچہ تاریخ نے دیکھا کہ وہ لوگ جو اپنے ہم وطنوں کی قتل وغارتگری کے سوا اور کچھ نہ جانتے تھے، انھوں نے ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں ایک پوری دنیا میں اسلام کا اقتدار قائم کردیا۔

۳۔ اسی قسم کی ایک مثال تیرھویں صدی عیسوی میں مسلم دنیا پر مغلوں اور تاتاریوں کا حملہ بھی ہے۔ ان وحشی قبائل نے مشرق کی جانب سے عالم اسلام پر حملہ کیا اور اس کے بڑے حصہ کو تاراج کرڈالا۔ ان کے مقابلہ میں مسلمانوں کو مکمل شکست ہوئی۔ یہ سب سے بڑی سیاسی آفت تھی جو مسلمانوں کی پوری تاریخ میں ان کے اوپر نازل ہوئی۔ مگر اس کے اندر سے حیرت انگیز طور پر ایک نیا امکان پیدا ہوگیا۔ فتح نے تاتاریوں کے انتقامی جذبہ کو ختم کردیا۔ اب وہ نفسیاتی طور پر اس پوزیشن میں تھے کہ مفتوح کے مذہب وعقائد پر بے لاگ رائے قائم کرسکیں۔ مسلمانوں سے اختلاط نے ان کو ایک صحیح آسمانی مذہب سے واقف کرایا جو اب تک مذہب کے نام سے جاہلانہ اوہام پرستی کے سوا اور کچھ نہ جانتے تھے۔ انھیں نظر آیا کہ اسلام ایک سچا دین ہے اور اس میں خود ان کی اپنی بھلائی چھپی ہوئی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی شکست پر ایک صدی بھی نہیں گزری تھی کہ تمام تاتاری مسلمان ہوگئے۔

اس فتح کا یہی فائدہ نہیں ہوا کہ وہ تمام مسجدیں جن کو ہلاکو نے سمرقند سے حلب تک اپنے راستہ میں تباہ کی تھیں، اس کے پوتوں نے دوبارہ ان کی تعمیر کی اور ان کی چھتوں کے نیچے خدائے واحد کے آگے سجدہ کیا۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ عرب اور ایرانی قومیں جو اب تک اسلام کی علم برداری کررہی تھیں، عیش اور حکمرانی نے انھیں کمزور کردیا تھا۔ اب ایک تازہ دم گروہ کی ضرورت تھی جو اسلام کی پاسبان بنے۔ مغل اور تاتاری، جو دراصل وحشی قبائل تھے، ان صلاحیتوں سے بھرپور تھے۔ انھوں نے اسلام قبول کرکے اسلام کا علم اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کے بعد چھ سو برس تک اسلام کے طاقتور محافظ بنے رہے۔

اسلام کی تاریخ میں اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں جب کہ ہمارا رب ہمارے ناموافق حالات کو ہمارے لئے موافق بناتا رہا۔ یہ تاریخ آج بھی دہرائی جاسکتی ہے بشرطیکہ ہم اپنی طرف سے استحقاق کی وہ شرط پوری کرنے کے لئے تیار ہوں جس کا پورا کرنا خدا کی سنت کے مطابق ضروری ہے۔

جو اپنے کو جہنم کے دروازہ پر کھڑا ہوا پائے وہی جنت میں داخل ہوگا۔

جو چپ رہنے لگے اس کو بولنا آگیا ــــــــــــــــ

جو بے عزتی پر راضی ہوجائے اس نے اپنی عزت کو بچا لیا ــــــــــــ

جو خاموش آوازوں کو سننے لگے وہی کان والا ہے۔ ــــــــــــ

جس کو اپنی برائیاں دکھائی دینے لگیں وہی قابل تعریف ہے ــــــــــ

جو اپنے سے آغاز کرے وہی دوسروں تک پہنچے گا ــــــــــــ

جو اپنی غلطی کو مان لے وہی صحیح راستہ پر ہے ــــــــ ــــــــ

جس کی نظر میں تمام چیزیں بے لذت ہوجائیں اس نے لذت کا راز پا لیا ــــــــ

جو اپنے کو بے علم جانے وہی علم والا ہے۔ ــــــــــــ

وہی آدمی باشعور ہے جس نے اپنے لاشعور کو جان لیا ــــــــــــ

جو کمزوروں سے ڈرے وہی طاقت ور کی پکڑ سے بچ سکتا ہے ــــــــــ

جو دوسروں کو دیتا ہے اسی نے اپنے آپ پر خرچ کیا ــــــــــ

جو اپنے معاملات میں نادان ہوجائے وہی ملت کے معاملات میں ہوشیار ثابت ہوگا۔

جس کو اپنے منافق ہونے کا اندیشہ ہو وہی ایمان والا ہے ــــــــــ

جو کھونے والا ہے اسی نے دراصل پالیا ــــــــــــ

جس کو ہارنا آجائے اس کو کوئی ہرا نہیں سکتا ــــــــــــ

موت کے اس پار

ستارے اور سیارے کبھی اپنے مقررہ راستے سے نہیں بھٹکتے۔ درختوں اور پہاڑوں کے سامنے کبھی یہ مسئلہ نہیں آتا کہ وہ اپنی زندگی کے نظام کو کس طرح بہتر بنائیں کسی جانور کو کبھی یہ سوال پریشان نہیں کرتا کہ وہ اپنی غیر حاصل شدہ تمناؤں کو کیسے پورا کرے۔ انسان کے سوا جتنی چیزیں اس کائنات میں ہیں، سب ویسی ہی ہیں جیسا کہ انھیں ہونا چاہئے۔ معلوم دنیا میں صرف انسان ہے جو اس احساس سے دوچار ہے کہ وہ جو کچھ چاہتا ہے، اس کو حاصل نہیں کرسکتا اور نہ موجودہ دنیا میں کبھی اس کا حصول ممکن ہے۔

ہمارے اور موجودہ دنیا کے درمیان اس تضاد کو ہمیشہ لوگوں نے محسوس کیا ہے۔ عام انسان صرف یہ سوچتا ہے کہ وہ بیماری، حادثہ، بڑھاپا، موت سے آزاد زندگی پانا چاہتا ہے مگر وہ اسے پا نہیں سکتا۔ علماء اور مفکرین زیادہ گہرائی تک جاتے ہیں اور زیادہ دور رس قسم کے ناموافق پہلوؤں کا انکشاف کرتے ہیں جو انسان اور موجودہ دنیا کے درمیان فیصلہ کن طور پر حائل ہیں۔

انسان خلاؤں کو ناپتا ہے اور اقتدار کے خواب دیکھتا ہے۔ مگر وہ کس قدر عاجز اور حقیر ہے، اس کو ایک مثال میں دیکھئے۔ زمین پر آج جتنے انسان پائے جاتے ہیں، اگر ان میں کا ہر آدمی چھ فٹ لمبا، ڈھائی فٹ چوڑا اور ایک فٹ موٹا ہو تو پوری آبادی کو بہ آسانی ایک ایسے صندوق میں بند کیا جاسکتا ہے جو طول و عرض اور بلندی میں ایک میل ہو۔ پھر اگر اس صندوق کو کسی سمندر کے کنارے لے جاکر ایک ہلکا سا دھکا دے دیں تو وہ پانی کی گہرائی میں پہنچ کر گم ہو جائے گا۔ صدیاں گزر جائیں گی مگر نسل انسانی دوبارہ زمین پر چلتی پھرتی دکھائی نہ دے گی۔ دنیا کے ذہن سے یہ بھی محو ہو جائے گا کہ یہاں انسان کی قسم کی کوئی مخلوق آباد تھی۔ سمندر کی سطح پر اسی طرح بدستور طوفان آتے رہیں گے، سورج اسی طرح چمکتا رہے گا۔ کرۂ ارض اپنے محور پر بدستور گھومتا رہے گا۔ کائنات کی لامحدود پہنائیوں میں پھیلی ہوئی بے شمار دنیائیں اتنے بڑے حادثہ کو ایک معمولی واقعہ سے زیادہ اہمیت نہ دیں گی۔ مدتوں کے بعد ایک اونچا سا مٹی کا ڈھیر زبان حال سے بتائے گا کہ یہ نسل انسانی کی قبر ہے جہاں وہ صدیوں پہلے ایک چھوٹے سے صندوق میں دفن کی گئی تھی۔

سر جیمز جینز (۱۸۷۷ — ۱۹۴۶) کائنات کی بے پناہ وسعت کے مقابلے میں انسان اور اس کے وطن (زمین) کی معمولی حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ریت کے ذرہ کے ایک خوردبینی ٹکڑے پر کھڑے ہو کر ہم کائنات کی فطرت اور اس کے مقصد کو معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو کہ زمان و مکان کے اندر ہمارے وطن (زمین) کو گھیرے ہوئے ہے۔ ہمارا پہلا تاثر کچھ دہشت ناک قسم کا ہوتا ہے۔ ہم کائنات کو دہشتناک پاتے ہیں اس کے وسیع ناقابل فہم فاصلوں کی وجہ سے، دہشتناک اس کے لامعلوم حد تک لمبے پھیلے ہوئے وقت کی وجہ سے جس کے مقابلے میں انسانی تاریخ محض پلک جھپکنے

کے بقدر معلوم ہوتی ہے، دہشت ناک ہماری انتہا درجہ کی تنہائی کی وجہ سے، اور خلا میں ہمارے وطن کے مادی طور پر بالکل بے حقیقت ہونے کی وجہ سے ـــــ ساری دنیا کے سمندروں میں پائے جانے والے ریت کے ذروں میں سے ایک ذرہ کا دس لاکھواں حصہ۔ مگر ان سب سے بڑھ کر کائنات کو ہم اس لئے دہشت ناک پاتے ہیں کہ وہ ہماری جیسی ایک زندگی کے معاملہ میں غیر جانب دار ہے: جذبات، حوصلے، کامیابیاں، آرٹ اور مذہب، سب اس کے منصوبے میں اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ شاید ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہماری جیسی زندگی کی دشمن ہے۔ کیوں کہ خالی خلا کا بیشتر حصہ اس قدر سرد ہے کہ تمام زندگی اس کے اندر منجمد ہو جائے گی۔ خلا کے اندر مادہ کا بیشتر حصہ اس قدر گرم ہے کہ اس کے اوپر زندگی کا وجود ناممکن ہے۔ خلا خم دار ہے اور فلکیاتی اجسام پر مسلسل مختلف قسم کی ریڈیائی بمباری ہوتی رہتی ہے، جن میں سے اکثر اغلباً زندگی کے لئے مخالف یا تباہ کن ہیں۔ اس قسم کی ایک دنیا میں ہم ٹپک پڑے ہیں، اگر غلطی سے نہیں تو کم از کم اس چیز کے نتیجہ میں جس کو اتفاق کہا جا سکتا ہے۔ (۳)

سیاراتی نظام (جس میں ہماری زمین ہے) انتہائی نادر خلائی واقعہ ہے۔ سیاراتی نظام کا اس قدر نادر ہونا بے حد اہم ہے۔ کیونکہ زندگی کی جس قسم سے ہم زمین پر واقف ہیں، وہ زمین ہی جیسے کسی سیارہ پر وجود میں آسکتی ہے۔ اس کو اپنے ظہور کے لئے موافق طبیعی حالات درکار ہیں جن میں سب سے اہم وہ ٹمپریچر ہے جس میں اشیاء رقیق شکل میں باقی رہ سکیں۔ (۴)

ان وجوہ سے یہ ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے کہ کائنات ابتدائی طور پر ہماری جیسی زندگی کے لئے بنائی گئی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو یقینی طور پر ہم میکانزم کے حجم اور پیداوار کی مقدار میں زیادہ بہتر تناسب کی توقع کر سکتے تھے۔ کم از کم پہلی نظر میں زندگی انتہائی غیر اہم ضمنی پیداوار دکھائی دیتی ہے۔ ہم زندہ لوگ شارع عام سے کچھ ہٹے ہوئے ہیں۔

WE LIVING THINGS ARE SOMHOW OFF THE MAIN LINE (P.5)

سائنس نے اب تک جو معلومات دی ہیں، ان کے مطابق ہم نہایت تعجب انگیز طور پر وجود میں آئے ہیں۔ اور ہماری حیرانی میں صرف اضافہ ہوتا ہے جب ہم اپنی ابتدا کے مسئلہ سے آگے بڑھ کر اپنے وجود کی معنویت کو سمجھنا چاہتے ہیں یا یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ قسمت نے مستقبل میں ہماری نسل کے لئے کیا چیز ذخیرہ کر رکھی ہے (۱۰)

فزکس اور فلکیات دونوں ایک ہی کہانی بتاتے ہیں۔ وہ یہ کہ کائنات کا صرف ایک ہی انجام ہو سکتا ہے۔ اور وہ ہے حرارتی موت (HEAT DEATH)۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ اس آخری انجام تک پہنچنے کا راستہ کیا ہوگا۔ کائناتی موت کے سوا اس سفر کا دوسرا کوئی انجام نہیں ہو سکتا:

END OF THE JOURNEY CANNOT BE OTHER THAN UNIVERSAL DEATH (P.11)

پھر کیا ایسا ہے کہ زندگی محض اتفاق سے ایک ایسی کائنات میں بھٹک آئی ہے جو واضح طور پر زندگی کے کے لئے نہیں بنائی گئی تھی۔ اور جو تمام مظاہر کے مطابق یا تو مکمل طور پر غیر جانب دار ہے یا قطعی طور پر اس کے مخالف۔ ایک ذرے کے محض ایک ٹکڑے پر ہمیں اس وقت تک چمٹے رہنا ہے جب کہ ہم منجمد ہو جائیں، اپنے مختصر

اسٹیج پر مختصر تر لمحات کے لئے اکڑ کر چلنا یہ جانتے ہوئے کہ ہمارے تمام حوصلے بالآخر فنا ہو جانے والے ہیں، اور یہ کہ ہماری کامیابیاں ہماری نسل کے خاتمہ کے ساتھ ختم ہو جائیں گی، کائنات کے باقی رہتے ہوئے جہاں ہم موجود نہ ہوں گے (۱۲)

THE MYSTERIOUS UNIVERSE, PP. 3-12

ان احساسات کا اظہار تاریخ کے ہر دور میں مختلف سوچنے والے لوگ مختلف انداز میں کرتے رہے ہیں۔ کریسی مارسین (۱۹۴۶ - ۱۸۸۴) زندگی کا سائنسی مطالعہ کرتے ہوئے بے اختیار کہہ اٹھتا ہے:

WHENCE LIFE COME, WHERE LIFE GOES, SCIENCE ANSWERS NOT

زندگی کب اس زمین پر آئی، زندگی کہاں جا رہی ہے، سائنس ہمیں اس کا کوئی جواب نہیں دیتی۔

آئن سٹائن (۱۹۵۵ - ۱۸۷۹) اپنے سائنسی علم کی روشنی میں جب انسان پر غور کرتا ہے تو اس کے پاس اس اقرار کے سوا کوئی اور بات کہنے کے لئے نہیں ہوتی:

MAN IS OUT OF PLAN. HE HAS COME WHERE HE WAS NOT WANTED

آدمی اس دنیا میں بے جگہ معلوم ہوتا ہے، وہ ایسے مقام پر آ گیا ہے جہاں وہ مطلوب نہ تھا۔

انسان جو کچھ پانا چاہتا ہے، وہ موجودہ دنیا کے ڈھانچہ میں ممکن نہیں۔ انسان ابدی زندگی چاہتا ہے مگر اس کو ابدی دنیا نہیں دی گئی۔ وہ اپنے لئے ایک بہتر کل (BETTER TOMORROW) پیدا کرنا چاہتا ہے، مگر آنے والا کل اس کے لئے جو چیز لے کر آ رہا ہے، وہ حادثہ، بڑھاپا اور موت ہے۔ وہ ایک آزاد، برائیوں سے پاک اور خوشیوں سے بھری دنیا دیکھنا چاہتا ہے، مگر ایسی دنیا اس زمین پر کسی طرح بنتے نہیں پاتی۔

اب دو ہی متبادل قیاسات ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ زندگی، برٹرینڈ رسل (۱۹۷۰ - ۱۸۷۲) کے الفاظ میں، نظام شمسی کے وسیع قبرستان میں اپنی تمام کامیابیوں اور ناکامیوں کے ساتھ بالآخر ہمیشہ کے لئے دفن ہو جانے والی ہے۔ اس کے بعد مدفن (مادی دنیا) شاید کسی شکل میں باقی رہے مگر دفن ہونے والے (انسان) کا اس میں کہیں وجود نہ ہوگا۔ دوسرے یہ کہ موجودہ دنیا کے علاوہ یا اس کے بعد کوئی اور زیادہ مکمل دنیا ہے جہاں انسان اپنے خوابوں کی زندگی کو پا سکتا ہے۔ موت اگلی وسیع تر زندگی کی طرف سفر ہے نہ کہ اس کا خاتمہ۔ گویا ہمارے اور ہماری آرزوؤں کے درمیان وہی نسبت ہے جو بچہ اور انسان کے درمیان پائی جاتی ہے۔ بچہ اپنی ماں کے پیٹ میں یہ آرزو لئے ہوئے بند رہتا ہے کہ وہ ایک وسیع کائنات کے اندر ایک پورے قد کا انسان بن کر ظاہر ہو۔ پیٹ کے اندر کی محدود دنیا میں یہ محض ایک موہوم خواب معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب وہ ایک دن ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے تو اچانک وہ پاتا ہے کہ اس کا خواب ایک انتہائی حقیقی خواب تھا جو مکمل تعبیر کی صورت میں اس کے قریب ہی موجود تھا، اگرچہ پیٹ کے اندر رہتے ہوئے وہ اس کو براہ راست نہیں جان سکتا تھا یا کم از کم نہیں جان سکا تھا۔

پہلے قیاس کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ وہ چیز جس کو ہم انسان کہتے ہیں، وہ صرف ایک جسم کا نام ہے جسم کی موت کے بعد لازمی طور پر "انسان" کی موت بھی ہو جاتی ہے۔ مگر اس مفروضہ کے حق میں کوئی قطعی دلیل اب تک

قائم نہ ہو سکی۔ تمام دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ مگر یہ دلیل اصل دعوے کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں۔ کیونکہ موت کے دن جو "انسان" جسم سے الگ ہوتا ہے، وہ موت سے پہلے بھی ہمارے لئے قابل مشاہدہ نہیں ہوتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس نے سوچنے اور محسوس کرنے والے انسان کو دیکھا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم انسان کے صرف اس جسم کو دیکھتے ہیں جو نمکیات و معدنیات سے مل کر بنا ہے۔ ماورائے جسم انسان، جو موت کے دن خاموش ہو جاتا ہے، اس کو ہم مرنے سے پہلے بھی نہیں دیکھتے — پھر مرنے کے بعد اگر وہ دکھائی نہ دے تو اس سے اس کا عدم وجود کیسے ثابت ہو جائے گا۔ مزید یہ کہ جدید سائنس یہ ثابت کر رہی ہے کہ مادّہ جب "فنا" ہوتا ہے تو وہ فنا نہیں ہوتا۔ بلکہ زیادہ حقیقی اور ترقی یافتہ شکل اختیار کر لیتا ہے، یعنی انرجی کی شکل۔

فلاسفہ و مفکرین موت کے بعد زندگی کے عقلی و منطقی ثبوت دیتے رہے ہیں۔ بعض ثبوت ان میں بجائے خود وزنی بھی ہیں۔ مثلاً فرد ہاف شوان (FRITHJOF SCHUAN) کا یہ قول کہ روح جو دراصل ذہن یا شعور ہے اس کے غیر فانی ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اس کا اختتام اپنے سے کم درجہ پر نہیں ہو سکتا، دوسرے لفظوں میں مادّہ یا مادّہ کا ذہنی انعکاس کی صورت میں۔ کوئی برتر چیز کمتر چیز کا محض فعل نہیں ہو سکتی۔ وہ اس چیز کا صرف ذریعہ نہیں ہو سکتی جس سے وہ بڑھ جاتی ہے:

> ONE PROOF OF IMMORTALITY OF THE SOUL - WHICH IS ESSENTIALLY INTELLIGENCE OR CONSCIOUSNESS - IS THAT THE SOUL COULD NOT HAVE AN END BENEATH ITSELF, IN OTHER WORDS MATTER OR THE MENTAL REFLECTION OF MATTER. THE HIGHER CANNOT BE MERELY A FUNCTION OF THE LOWER, IT CANNOT BE ONLY A MEANS IN RELATION TO WHAT IT SURPASSES.
>
> Frithjof Schuan, Understanding Islam

تاہم، اپنی تمام تر معقولیت کے باوجود، اس قسم کے استدلات قیاسی استدلالات تھے، اس لئے جدید ذہن کے لئے ان میں زیادہ اپیل نہ تھی۔ جدید ذہن حسی استدلال کو اہمیت دیتا ہے۔ وہ اسی دلیل کو دلیل سمجھتا ہے جس کو وہ چھوئے، دیکھے اور تجربہ کرے۔ قیاسی منطق پر قائم ہونے والی دلیل اس کے نزدیک معتبر نہیں۔

مگر بیسویں صدی کے نصف آخر میں جو تحقیقات ہوئی ہیں، انھوں نے حیرت انگیز طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ قیاسی دلائل کے علاوہ خالص تجرباتی نوعیت کے شواہد بھی قدیم زمانہ سے یہاں موجود تھے۔ مگر علمی اصولوں پر ان کا منظم مطالعہ نہیں کیا گیا اور بلا تحقیق یہ فرض کیا جاتا رہا کہ موت کے بعد زندگی کے حق میں کوئی تجرباتی دلیل موجود نہیں ہے۔

قرآن کی سورہ نمبر ۳۹ میں بتایا گیا ہے: اللہ موت کے وقت جانوں کو کھینچ لیتا ہے۔ اور جن کے مرنے کا وقت نہیں آیا، ان کی نیند میں۔ پھر ان جانوں کو روک لیتا ہے جن پر مرنا ٹھیرا دیا ہے اور باقی جانوں کو ایک میعاد تک کے لئے رہا کر دیتا ہے (زمر — ۴۲) قدیم ترین زمانہ سے خواب اس قرآنی بیان کی تصدیق کر رہے تھے۔ مگر قدیم زمانہ میں خواب کے فلسفیانہ پہلوؤں پر زیادہ غور نہیں کیا گیا۔ موجودہ زمانہ میں جب ان کا علمی تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ واقعات، حیرت انگیز طور پر، یہ ثابت کر رہے ہیں کہ روح یا شعور جسم سے الگ ایک مستقل حقیقت ہے۔ وہ

جسم سے الگ ہو کر بھی پوری طرح باقی رہتا ہے۔ خواب، موت کے بعد زندگی کو تجرباتی سطح پر ثابت کر رہے ہیں۔

عام تجربہ ہے کہ خواب میں ایک شخص دور کے کسی واقعہ کو یا مستقبل میں پیش آنے والے کسی حادثہ کو دیکھ لیتا ہے۔ یہ تجربات جو تقریباً ہر شخص کو پیش آتے ہیں، ثابت کرتے ہیں کہ خواب کی حالت میں آدمی کا شعور موجودہ مادی دنیا سے اوپر اٹھ جاتا ہے اور ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں زمان و مکان کی حدبندیاں نہیں پائی جاتیں۔ نیند کے وقت سونے والے آدمی پر جو بے خبری طاری ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی روح، جزئی طور پر، اس کے جسم کو چھوڑ دیتی ہے۔ وہ انسان کی محدود دنیا سے نکل کر خدا کی ابدی دنیا میں پہنچ جاتی ہے۔

راقم الحروف کی لڑکی فریدہ خانم (پیدائش ۱۹۵۲) نے ۲۴ جنوری ۱۹۷۱ کو دہلی میں خواب دیکھا کہ اس کے بھائی ظفرالاسلام خاں (پیدائش ۱۹۴۸) نے اس کے لئے دس روپے بھیجے ہیں۔ یہ خواب انتہائی غیر معمولی تھا۔ کیونکہ خواب دیکھنے والی کے بھائی ۱۹۶۶ سے قاہرہ میں تھے۔ اور باہر سے کوئی بھائی اپنی بہن کو "دس" روپے بھیجے، یہ کسی طرح قابل قیاس نہیں ہو سکتا۔ مگر چند ہی روز بعد ظفرالاسلام کا لفافہ قاہرہ سے ملا جس کے اندر دس روپے کا ایک ہندستانی نوٹ رکھا ہوا تھا۔ ظفرالاسلام کو یہ نوٹ قاہرہ میں اپنے بکس میں پڑا ہوا ملا۔ چونکہ عرب دنیا میں یہ نوٹ ان کے لئے بے کار تھا، انھوں نے ہندستان میں اپنی بہن کو خط بھیجتے ہوئے اس کو لفافہ میں ڈال دیا۔ اس کی توجیہہ اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی کہ نیند کی حالت میں آدمی کی روح جسمانی محدودیتوں سے آزاد ہو کر ایک بلند تر آفاقی سطح حاصل کر لیتی ہے۔ اس وقت وہ اشیاء کو ایسے مقام سے دیکھنے لگتی ہے جہاں وہ اپنی جسمانی قیام گاہ کی حدبندیوں سے نہیں دیکھ سکتی۔

اسی طرح سویا ہوا آدمی خواب میں بعض اوقات کسی مرے ہوئے شخص کو دیکھتا ہے۔ یہ مردہ شخص اپنے زندہ ساتھی کو خواب میں ایسی باتیں بتاتا ہے جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ وہ شخص اب بھی پورے شعور کے ساتھ موجود ہے، اور خواب دیکھنے والے کی فی الواقع اس سے "ملاقات" ہوئی ہے۔ گویا سوئے ہوئے آدمی کے شعور کی سطح، ایک خاص حد تک، مرے ہوئے آدمیوں کے شعور کی سطح کے برابر ہو جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر، نیند کی حالت میں آدمی، محدود معنوں میں، زندگی بعد موت کا تجربہ کرتا ہے۔ نیند کی حالت، جزوی طور پر موت کی حالت کے مشابہ ہے۔

ڈاکٹر کیسل نے شمالی کیرولینا کے ایک امیر شخص کے واقعہ کی تحقیق کی ہے۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ وہ کسی بات پر تین لڑکوں سے ناراض ہو گیا اور ایک وصیت نامہ کے ذریعہ اپنے ان تین لڑکوں کو جائداد میں حصہ دار بننے کے حق سے محروم کر دیا۔ جب وہ مر گیا تو اس کے جلد ہی بعد اس کے چوتھے لڑکے نے، جس کو از روئے وصیت جائداد مل رہی تھی، اپنے باپ کو خواب میں دیکھا۔ خواب میں اس کے باپ نے اپنی پسندیدہ برساتیوں میں سے ایک برساتی اوڑھ رکھی تھی۔ وہ سراپا احتجاج دکھائی دیتا تھا اور دوران گفتگو بار بار برساتی نما کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ نیند کھلی تو لڑکے نے اپنے باپ کی اس کوٹ کو، جو اس نے خواب کے درمیان پہن

رکھا تھا۔ نکالا اور اس کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ جیب میں باپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک وصیت نامہ موجود تھا۔ اس کے تحت پچھلی وصیت کو منسوخ کرتے ہوئے بقیہ تینوں لڑکوں کو بھی حق دیا گیا تھا کہ وہ اپنے حصہ کی جائداد وصول کر سکتے ہیں۔ باپ نے موت سے تھوڑی دیر پہلے جائداد کی وراثت کے بارے میں اپنا فیصلہ بدل لیا تھا۔ اس نے دوبارہ اپنا وصیت نامہ تیار کرایا اور اس کو مکمل کرکے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا۔ پھر اس سے پہلے کہ اپنے تمام لڑکوں کو اس تبدیلی فیصلہ سے آگاہ کرے، انتقال کر گیا ——————
ظاہر ہے کہ اس واقعہ کو مردہ شخص کے سوا کوئی اور نہیں جانتا تھا۔ اس لئے یقین کرنا پڑے گا کہ وہ مرنے کے بعد بھی کسی نہ کسی شکل میں زندہ تھا اور اس نے اپنے لڑکے کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

نیند ہی سے ملتا جلتا وہ واقعہ ہے جب کہ حادثہ وغیرہ کے موقع پر ایک شخص وقتی طور پر "مرجاتا ہے" اور پھر کچھ دیر بعد جی اٹھتا ہے۔ قدیم زمانہ سے اس قسم کے واقعات ہوتے رہے ہیں کہ ایک شخص طبی اعتبار سے مکمل طور پر مرگیا۔ چند منٹ بعد پھر اس کے قلب کی حرکت جاری ہوگئی۔ وہ دوبارہ "زندہ" ہوگیا۔ اس قسم کے واقعات بظاہر اس بات کا ثبوت ہیں کہ "آدمی" نے کچھ لمحات کے لئے اپنا جسم چھوڑ دیا تھا اور پھر دوبارہ اپنے جسم میں واپس آگیا۔ قدیم زمانہ میں ان واقعات کا ذکر صرف عجوبہ کے طور پر کیا جاتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں ان کو علمی انداز سے جانچا گیا تو معلوم ہوا کہ ان سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ انسان، جسم سے ماورا اپنی ایک مستقل ہستی رکھتا ہے جو اس وقت بھی باقی رہتی ہے جب کہ وہ اپنے دنیوی جسم سے الگ ہوگیا ہو۔

بعض ایسے واقعات ریکارڈ کئے گئے ہیں کہ ایک بیمار شخص آپریشن ٹیبل پر تھا۔ آپریشن کے دوران اس کے دل کی حرکت بند ہوگئی۔ طبی طور پر وہ مرگیا۔ کچھ دیر بعد اس کو ہوش آیا۔ اس سے پوچھا گیا کہ "موت" کے دوران تم نے کیسا محسوس کیا۔ اس نے بتایا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اپنے جسم سے الگ ہو کر فضا میں تیر رہا ہوں۔ میں فضا سے اپنے جسم کو دیکھ رہا تھا جو آپریشن ٹیبل پر پڑا ہوا تھا اور اس کے گرد ڈاکٹر جھکے ہوئے تھے۔ اس نے اس دوران میں ہونے والی ڈاکٹروں کی بعض باتوں کو اس طرح بتایا جیسے کہ وہ "موت" کے وقت بھی ان کو دیکھ اور سن رہا تھا —— روح اگر محض ایک جسم کا عمل (FUNCTION) ہو تو وہ جسم سے الگ ہو کر کیسے اس طرح باقی رہ سکتی ہے۔ جسم سے الگ ہو کر بھی شعور ذات کا ختم نہ ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان ایک مستقل ہستی ہے جو جسم سے علیحدگی کے بعد بھی پوری طرح باقی رہتا ہے۔

ڈاکٹر گرفیلڈ بتاتے ہیں کہ میں ایک بوڑھی عورت کا معائنہ کر رہا تھا۔ یہ عورت ہڈی کے کینسر کی مریض تھی۔ اس کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ ہم نے مریضہ کے درد کو دور کرنے کی جتنی تدبیریں کیں سب بے سود ثابت ہوئیں۔ اچانک وہ بے ہوش سی ہوگئی۔ اس کے بعد جب ہوش میں آئی تو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کو بہت افاقہ ہوگیا ہو۔ میں نے عورت سے اس کی اچانک تبدیلی کا سبب پوچھا۔ اس نے بتایا کہ ابھی اس کی مردہ ماں اس سے ملنے آئی تھی اور اس کو بتا گئی ہے کہ بہت جلد دونوں اکٹھا ہو جائیں گی۔ اپنی ماں سے اس گفتگو کے بعد وہ بہت پرسکون ہوگئی اور تھوڑی دیر

کے بعد مر گئی ـــــــ یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ مریضہ کی ماں، اپنی موت کے بعد بھی پورے شعور کے ساتھ موجود تھی۔ ورنہ کس طرح وہ اپنی بیٹی کے پاس آتی۔ نیز ماں کی خبر کے مطابق ٹھیک وقت پر اس کا مرجانا ثابت کرتا ہے کہ مریضہ کا تجربہ حقیقی تھا نہ کہ محض خیالی۔

قرآن کی سورہ نمبر ۵۶ میں ارشاد ہوا ہے: جب مرنے والے کی جان حلق تک آجاتی ہے اور تم دیکھ رہے ہوتے ہو کہ وہ مر رہا ہے۔ اس وقت تمھاری بہ نسبت ہم مرنے والے کے زیادہ نزدیک ہوتے ہیں۔ مگر تم نہیں دیکھتے (واقعہ) اس سے معلوم ہوا کہ آدمی جب مرنے کے قریب ہوتا ہے تو جان کی جسم سے علیحدگی سے پہلے موت کے اُس پار کی بعض کھڑکیاں اس پر کھول دی جاتی ہیں۔ دوسری دنیا کا پردہ ایک خاص حد تک، اس سے ہٹا لیا جاتا ہے۔ موجودہ دنیا میں رہتے ہوئے وہ عالم آخرت کی بعض چیزوں کو دیکھنے لگتا ہے۔

ان میں سب سے عام اور کثیر الوقوع مشاہدہ اپنے مردہ عزیزوں کو دیکھنا ہے۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آتا ہے جب کہ آدمی نزع کے عالم میں پہنچ گیا ہو۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ نزع کے وقت آدمی اپنے مرے ہوئے رشتہ داروں کو پکارنے لگتا ہے۔ اپنے مرے ہوئے اعزہ اور دوستوں کو وہ اس طرح آواز دیتا ہے جیسے وہ اس کے قریب کھڑے ہوں۔ راقم الحروف کی بڑی بہن طاہرہ خانم کا انتقال تقریباً ۶۰ سال کی عمر میں اگست ۱۹۷۶ میں ہوا۔ اس وقت وہ اعظم گڑھ کے اسپتال میں تھیں۔ انتقال کے وقت میں خود بہن کے پاس موجود نہ تھا۔ تاہم میری والدہ زیب النساء خاتون نے مجھے بتایا کہ آخر وقت میں مرحومہ کی زبان سے یہ کلمات سنے گئے۔ "ابا اتنی دیر سے کھڑے ہیں کوئی ان کو بیٹھنے کے لئے نہیں دیتا" ہمارے والد کا انتقال ۱۹۲۹ میں ہو چکا ہے۔ اس لئے لوگوں کو یہ سن کر تعجب ہوا۔ مرحومہ کی لڑکی نے کہا: " ابا یہاں کہاں ہیں"۔ مرحومہ نے دوبارہ کہا: "وہ کیا سامنے کھڑے ہیں" اور پھر چند لمحہ بعد ان کا خاتمہ ہو گیا۔

ڈاکٹر الزبتھ کیوبلر روز نے بطور مہم یہ کام شروع کیا کہ وہ نزع میں گرفتار لوگوں سے ملیں اور آخر وقت میں ان کی آوازوں کا ٹیپ لیں۔ انھوں نے ایک ہزار سے زیادہ ایسے لوگوں کا قریب سے مشاہدہ اور مطالعہ کیا جو عالم نزع میں گرفتار تھے۔ اور گویا موجودہ دنیا اور اگلی دنیا کے درمیان پہنچ چکے تھے۔ ان لوگوں نے انھیں بتایا کہ نزع کی حالت میں ان کے کئی ایسے دوست اور رشتہ دار ان کے پاس آئے جو پہلے مر چکے تھے۔ "تاکہ سفر آخرت کے وقت ان کی امداد کر سکیں"۔ یہ لوگ اگر اس دنیا میں اپنے بدن کے کسی عضو سے محروم تھے تو نزع کی حالت میں انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے ان کا بدن ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ مثلاً جو شخص لنگڑا تھا اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے دونوں پاؤں صحیح وسالم موجود ہیں۔ گویا جسم میں کسی حادثہ سے کمی واقع ہو جائے تو اس کی وجہ سے اصل انسانی ہستی میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

اس قسم کے خواب اور واقعات اگرچہ ہمیشہ سے پیش آرہے تھے مگر موجودہ زمانہ میں پہلی بار ان کا منظم مطالعہ کیا گیا ہے، ضروری اعداد و شمار کے ساتھ ہزاروں واقعات جمع کئے گئے ہیں خاص طور پر امریکہ میں جدید ترین تکنیک

اور سائنسی اہتمام کے ساتھ ان کا باقاعدہ جائزہ لیا جا رہا ہے۔ ان تحقیقی نتائج پر متعدد کتابیں چھپی ہیں۔ حال میں امریکہ سے ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے زندگی کے بعد زندگی:

LIFE AFTER LIFE (U.S.A. 1976)
BY DR. RAYMOND A. MOODY JR.

یہ کتاب آج کی انتہائی کثیر الاشاعت کتابوں میں سے ہو رہی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے اخبارات و رسائل میں، جدید دور میں پہلی بار، زندگی بعد موت سے متعلق سرخیاں نظر آنے لگی ہیں۔ اس سلسلے میں تحقیقی کتابوں کے خلاصے شائع کئے جا رہے ہیں۔ مثلاً نیوز ویک ۱۲ جولائی ۱۹۷۶، السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا مارچ ۱۹۷۷، ریڈرز ڈائجسٹ اگست ۱۹۷۷۔ ایک امریکی میگزین (ٹائم، ۴ جنوری ۱۹۷۴) کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ "موت" کا موضوع اور موت کے بعد زندگی کا مسئلہ اچانک طور پر امریکہ کا بہت زیادہ مقبول عام موضوع بن گیا ہے۔ اجتماعات میں اب موت کا موضوع جنس اور سیاست جیسے سدا بہار موضوعات سے تجاوز کرنے لگا ہے۔ کتابوں کی ایک نئی قسم وجود میں آگئی ہے جس کو علم الموت (THANATALOGY) کی کتابیں کہا جاتا ہے۔

آرتھر کوسلر (ARTHUR KOESTLER) پہلے مارکسسٹ تھے، مگر اب وہ اس حد تک بدل چکے ہیں کہ انھوں نے ایک طویل محققانہ مقالہ شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے "کیا موت کے بعد بھی زندگی ہے" IS THERE LIFE AFTER DEATH

موجودہ صدی کے ربع ثانی میں آئن سٹائن، ڈی بروگلی، شروڈنگر اور ہیزن برگ نے کامیاب طور پر مادہ کا غیر مادہ ہونا ثابت کیا ہے۔ جو چیز دیکھنے میں ٹھوس جسم نظر آتی ہے، وہ انرجی (قوت) کا صرف ایک شدید اجتماع ہے۔ اس سے ثابت ہوا ہے کہ مادہ کے اجزاء — الکٹران، پروٹان، نیوٹران وغیرہ — معروف معنوں میں مادی ذرات نہیں ہیں بلکہ وہ لہروں کی مانند ہیں۔ ڈی بروگلی کا کہنا ہے کہ ایک الکٹران بیک وقت جسمیہ بھی ہے اور لہر بھی۔ ثنویت (DUALISM) جدید طبیعیات کا لازمہ ہے اور (PRINCIPLE OF COMPLEMENTARITY) یعنی تکمیلی اصول اس کا جدید سائنسی نام ہے۔ (سنڈے (کلکتہ) ۳ اکتوبر ۱۹۷۶)

ان دریافتوں کا حوالہ دیتے ہوئے آرتھر کوسلر نے لکھا ہے کہ ذرہ/لہر (PARTICLE/WAVE) کے اصول کو مان لینے کے بعد جسم/ذہن (BODY/MIND) کے اصول کو ماننا آسان ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ تکمیلی اصول کو مان لینے کے بعد دوسری جگہ اس کو نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ ہم پوچھ سکتے ہیں کہ جب مادہ اپنے آپ کو لہروں میں تبدیل کر سکتا ہے اور اس طرح ایک خالص غیر جسمانی انرجی (DISEMBODIED ENERGY) بن جاتا ہے تو کیا اب بھی یہ خالی از معنی ہوگا کہ بے جسم ذہن (DISCARNATE MENTAL ENERGY) کی موجودگی کی بات کی جائے۔ کیا ایسی گفتگو اب بھی اسی طرح بے حقیقت ہے جس طرح وہ پچاس سال پہلے معلوم ہوتی تھی جب کہ طبیعیات نے ابھی مادہ کی حیثیت کو ختم نہیں کیا تھا اور ابھی ہم کو بتایا نہیں تھا کہ ایٹم "چیز" نہیں ہیں، اور کیا اب بھی یہ معقول بات ہوگی کہ کوئی شخص ذہنی مادہ (MIND-STUFF) کی اصطلاح کو غیر سائنسی کہہ کر مذاق اڑائے جس کو ایڈنگٹن نے وضع کیا تھا۔ ڈاکٹر ائی۔ جے

گڈنے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مادہ اثیری ہے اور ذہن ٹھوس چٹان ہے :

MATTER IS AETHEREAL AND MIND IS THE SOLID ROCK

موت کے بعد زندگی کا ثبوت ہی یہ بھی ثابت کر دیتا ہے کہ موجودہ نظر آنے والی دنیا کے علاوہ ایک اور دنیا بھی ہے۔ اگر ایسی کوئی دنیا نہیں ہے تو یہ غیر مرئی انسانی ہستیاں کہاں واقع ہیں۔ لوگ اپنے جسم کو چھوڑ کر کہاں چلے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے اس طرح بندھی ہوئی ہیں کہ ایک کا ثابت ہونا اپنے آپ دوسرے کو ثابت کر دیتا ہے۔

قرآن میں کہا گیا ہے: اور ہر چیز کو ہم نے بنایا جوڑا جوڑا۔ تاکہ تم دھیان کرو (ذاریات ۔ ۴۹) اس آیت میں اس بات کا اشارہ ہے کہ دنیا کا نظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ ہر چیز جوڑے کی صورت میں ہے۔ (نر مادہ، مثبت منفی، رات دن) ایک جزو اپنے دوسرے جزو سے مل کر اپنے کو مکمل کرتا ہے۔ یہ اس لئے تاکہ لوگ سمجھیں کہ جس طرح ہر چیز کا جوڑا ہے اسی طرح اس دنیا کے لئے بھی جوڑا ہونا ضرور ہے۔ یہ جوڑا آخرت ہے۔ آخرت کے بغیر یہ دنیا، موجودہ تخلیقی نظام کے مطابق کبھی مکمل نہیں ہو سکتی۔

آج دنیا کا یہ جوڑا انسانی علم میں آ چکا ہے۔ اس جوڑے کا سائنسی نام اینٹی ورلڈ ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں ایک طرف انسان کا مطالعہ موت کے بعد انسانی ہستی کے بقا کا تجربہ کرا رہا تھا، دوسری طرف عین اسی وقت طبیعی سائنس یہ ثابت کر رہی تھی کہ ہماری موجودہ دنیا کے متوازی ایک اور دنیا ہے جو مکمل شکل میں اپنا وجود رکھتی ہے۔ ہماری موجودہ دنیا ورلڈ ہے اور وہ اینٹی ورلڈ۔

۱۹۲۸ء تک طبیعیات داں یہ سمجھتے تھے کہ تمام ایٹم صرف دو قسم کے ذرات کا مجموعہ ہوتے ہیں، مثبت برقی چارج رکھنے والے پروٹان، اور منفی برقی چارج رکھنے والے الکٹران۔ مگر اسی سال پال ڈیراک (PAUL A.M. DIRAC) نے ایک نئے قسم کے ذرہ کی موجودگی کا امکان ظاہر کیا۔ اس نے کہا "اس کا مقدار مادہ الکٹران جیسا ہے۔ مگر وہ اس کے مخالف برقی چارج رکھتا ہے۔ ہم اس ذرہ کو اینٹی الکٹران کہہ سکتے ہیں" ۱۹۳۲ میں اینڈرسن (K. ANDERSON) نے اس اینٹی الکٹران کو کاسمک شعاعوں میں دریافت کر لیا۔ اب معلوم ہوا کہ ایٹم کے ہر پارٹیکل کا ایک اینٹی پارٹیکل ہے۔ پروٹان ایک اینٹی پروٹان رکھتا ہے، نیوٹران ایک اینٹی نیوٹران رکھتا ہے۔ گویا کائنات کے تمام ذرات، جوڑ لیا (PAIR PARTICLES) کی صورت میں ہیں۔

اب سائنسی فکر آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ معلوم ہوا کہ عالم مادی میں جوڑوں کی یہ تقسیم الکٹران کے ناقابل مشاہدہ ذرات سے شروع ہو کر خود مجموعہ عالم تک پہنچ جاتی ہے۔ الکٹران کا اینٹی الکٹران ہے، ایٹم کا اینٹی ایٹم، میٹر کا اینٹی میٹر، حتیٰ کہ ورلڈ کا اینٹی ورلڈ۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ ہماری دنیا میں تمام اینٹی پارٹیکل غیر قائم (UNSTABLE) حالت میں ہیں۔ مگر اینٹی ورلڈ میں وہ سب قائم (STABLE) حالت میں ہوں گے۔ کیونکہ تمام ایٹموں کے نیوکلیس منفی برقی چارج رکھتے ہوں گے اور تمام الکٹران مثبت برقی چارج۔ اس قسم کے ایک اینٹی ورلڈ کا امکان پہلی بار ۱۹۳۳ میں ڈیراک نے اپنے لکچر میں بتایا تھا۔ اب سائنس داں عام طور پر اس کو تسلیم کرتے جا رہے ہیں۔ سوویت یونین کے ڈاکٹر

گستاف ناہن (GUSTAV NAAN) نے ریاضیات کے ذریعہ اس اینٹی ورلڈ کی ایسی ٹھوس احاطہ بندی کردی ہے کہ اب اس کے مخالفین تک اس کو انتہائی زبردست قسم کا متوازن تصور ماننے لگے ہیں۔

اپنی دنیا میں دور کی چیزوں کو ہم فوٹان کی مدد سے پہچانتے ہیں جو کہ برقی مقناطیسی شعاعوں کے ذرات ہیں۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اینٹی ورلڈ بھی اسی قسم کے فوٹان کا اخراج کرتی ہوگی جو کہ بیک وقت پارٹیکل بھی ہے اور اینٹی پارٹیکل بھی۔ اینٹی ورلڈ، وہ دور ہو یا نزدیک، اس کی روشنی فوٹان کی شکل میں ہوسکتا ہے کہ مسلسل ہم تک پہنچ رہی ہو۔ مگر ہم اس کو اپنے پازیٹو ورلڈ کی چیزوں کی روشنی سے الگ کرکے نہیں دیکھ سکتے۔ ورلڈ اور اینٹی ورلڈ کے درمیان کیا رشتہ ہے۔ کیا دونوں کے درمیان کوئی مواصلاتی سلسلہ ہے جس کے ذریعہ ہماری دنیا اینٹی ورلڈ سے تعلق قائم کرتی ہے۔ سائنس دانوں کا جواب اثبات میں ہے۔ ڈاکٹر نان کا خیال ہے کہ بلیک ہول اور وائٹ ہول کو ورلڈ اور اینٹی ورلڈ کے درمیان ایک مقامی واسطہ (LOCAL CHANNELS) سمجھنا چاہئے۔

بہت سے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اینٹی ورلڈ ہم سے الگ اور ہماری دنیا کے متوازی اپنا وجود رکھتا ہے تخلیق کے بارے میں عظیم دھماکہ (BIG BANG) کا نظریہ فرض کرتا ہے کہ ۱۰ سے ۲۰ بلین سال پہلے سارا مادہ منجمد حالت میں ابتدائی ایٹم کی صورت میں تھا اور فوٹان انرجی پر مشتمل تھا۔ قیاس ہے کہ فوٹان، ایک عظیم دھماکہ کے ساتھ میٹر اور اینٹی میٹر کی صورت میں مجتمع ہوگئے اور ورلڈ اور اینٹی ورلڈ کو بنانے کے لئے الگ الگ ہوگئے۔ اسی بنیاد پر ہینز الفوین (HANNES ALFVEN) نے ۱۹۶۲ میں تفریقی میکانزم (SEPERATION MECHANISM) کا امکان ظاہر کیا جس کے ذریعہ ایک ہی کہکشاں میں میٹر اور اینٹی میٹر دونوں موجود رہتے ہیں۔

سائنس یہاں پہنچ کر خاموش ہوجاتی ہے اور اسے خاموش ہوجانا چاہئے۔ کیونکہ اس کا دائرۂ تحقیق صرف وہ واقعات ہیں جو قانون طبیعی کے تحت ظہور میں آتے ہیں۔ ماورائے طبیعات چیزوں کے بارے میں وہ ہمیں کوئی قطعی بات نہیں بتا سکتی۔ تاہم اس نے یہ تسلیم کرکے ہمارے لئے مزید تحقیق کا دروازہ کھول دیا ہے کہ استنباط (INFERENCE) بھی ایک جائز ذریعۂ علم ہے بشرطیکہ وہ ثابت شدہ واقعات کی بنیاد پر کیا گیا ہو۔ اس اصول کی روشنی میں اگر ہم یہ استنباط کریں کہ دوسری دنیا، جہاں مرنے کے بعد انسان پہنچ رہا ہے، غالباً وہی ہے جس کو سائنس نے اینٹی ورلڈ کا نام دیا ہے تو خالص علمی اعتبار سے اس کو نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہوگی۔

موجودہ معلوم دنیا میں جو صورت حال ہے، وہ بھی یہی ہے۔ سائنس کی پہنچ دنیا کے کیاتی پہلوؤں تک ہے۔ کیفیاتی پہلو اس کی دسترس سے باہر ہیں۔ سائنس ہمیں پھول کی خبر دیتی ہے، مگر وہ خوشبو کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔ وہ ہمیں اشیاء کا پتہ دیتی ہے مگر ان کے حسن سے ہمیں مطلع نہیں کرتی۔ وہ انسان سے ہمارا تعارف کراتی ہے مگر انسانی شعور کے بارے میں اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح اگر وہ ہمیں "اینٹی ورلڈ" کی خبر دے مگر اس کی "خوشبو" اس کے "حسن"۔ اس کے "شعور" کو بتانے سے عاجز ہے تو اس پر ہمیں تعجب نہ کرنا چاہئے۔ یہ خلا ہم اپنے استنباط کے ذریعہ اسی طرح پُر کرسکتے ہیں جس طرح ہم موجودہ معلوم دنیا کے بارے میں آج بھی کر رہے ہیں۔

قرآن سمجھنے کے لئے

علامہ زمخشری نے لکھا ہے کہ ایک شخص کے سامنے قرآن کی یہ آیت پڑھی گئی :

يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ جس دن ہم بلائیں گے تمام آدمیوں کو ان کے مقتدا کے ساتھ۔

اس آدمی نے آیت کا مطلب یہ نکالا : جس دن ہم بلائیں گے سب کو ان کی ماؤں کے ساتھ۔

امام کا لفظ جو مفرد تھا، اس کو اُمّ (ماں) کی جمع سمجھ لیا گیا۔ حالاں کہ وہ شخص اگر قواعد صرف سے واقف ہوتا تو اس کو معلوم ہو جاتا کہ اُمّ کی جمع امام نہیں آتی۔ اسی طرح مثلاً لفظ "مسیح" دو مادوں سے مشتق ہو سکتا ہے۔ اور دونوں کے الگ الگ معنی ہیں۔ اس کا اشتقاق مسح سے ہو تو اس کے معنے چھو لے اور تر ہاتھ کسی چیز پر پھیرنے کے ہوں گے۔ اور اگر مساحت سے ہو تو اس کے معنی پیمائش کے ہوں گے، وغیرہ

انھیں وجوہ سے اہل فن نے قرآن کی تفسیر کے لئے پندرہ علوم پر مہارت ضروری بتائی ہے :

۱۔ لغت، جس سے قرآن کے مفرد الفاظ کے معنی معلوم ہو سکیں۔
۲۔ نحو، یعنی اعراب کا علم، کیونکہ عربی زبان میں زبر زیر کے فرق سے معنی بالکل بدل جاتے ہیں۔
۳۔ صرف، صیغوں کے اختلاف کو جاننا۔
۴۔ اشتقاق، یعنی کون کس مادہ سے بنا ہے۔
۵۔ علم معانی، جس سے کلام کی ترکیبیں معنی کے اعتبار سے معلوم ہوتی ہیں۔
۶۔ علم بیان، جس سے کلام کا ظہور و خفا، تشبیہ و کنایہ معلوم ہوتا ہے۔
۷۔ علم بدیع، جس سے کلام کی خوبیاں تعبیر کے اعتبار سے معلوم ہوتی ہیں۔
۸۔ علم قرأت، کیونکہ مختلف قرأتوں کی وجہ سے مختلف معنی معلوم ہوتے ہیں۔
۹۔ علم عقائد، تاکہ یہ معلوم ہو کہ کہاں ظاہر معنی مراد ہیں اور کہاں تاویل کی ضرورت ہے۔
۱۰۔ اصول فقہ، جس سے وجوہ استدلال و استنباط معلوم ہوتے ہیں۔
۱۱۔ اسباب نزول، کیونکہ شان نزول جاننے سے آیت کے معنی زیادہ واضح ہوتے ہیں۔
۱۲۔ علم ناسخ و منسوخ، تاکہ منسوخ شدہ احکام معمول بہا سے ممتاز ہو سکیں۔
۱۳۔ علم فقہ، کیونکہ جزئیات کے احاطہ سے کلیات پہچانے جاتے ہیں۔
۱۴۔ احادیث، یعنی وہ تفسیری روایات جو قرآن کی مجمل آیات کی تفسیر کرتی ہیں۔
۱۵۔ علم وہبی، وہ علم خاص جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللهُ عِلْمَ مَا لَمْ يَعْلَمْ

بعض لوگوں نے قرآن فہمی کے لئے اس سے کم یا اس سے زیادہ علوم بھی بیان کئے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام

غیر ضروری شرائط ہیں۔ ان کا غیر متعلق ہونا اس سے واضح ہے کہ ان میں سے اکثر علوم وہ ہیں جن سے صحابہ بالکل ناواقف تھے، وہ بعد کے دور میں بنائے گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن فہمی کے لئے صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک ایمان، دوسرے عربی زبان۔ اگر آدمی کو فی الواقع ایمانی شعور حاصل ہو اور وہ عربی زبان سے بخوبی واقف ہو تو یقیناً اللہ کی مدد سے وہ کلام الٰہی کو سمجھ لے گا اس کے بعد کسی اور علم کی اس کو ضرورت نہیں۔

ایمان محض کلمہ کے الفاظ کو دہرانا نہیں ہے۔ ایمان دراصل فطرۃ اللہ کو پالینے کا نام ہے، وہ فطرت جس پر سارے انسانوں کو پیدا کیا گیا ہے۔ ایمان، مجمل شعور کے طور پر، آدمی کو خالق اور مخلوق کے تمام رموز سے آشنا کر دیتا ہے۔ اس کے بعد اگر وہ عربی زبان جانتا ہو اور قرآن کو پڑھے تو وہ اپنے آپ کو ملہم کے مقام پر کھڑا ہوا پاتا ہے۔ اس کو محسوس ہونے لگتا ہے گویا کہ خدا براہ راست اس سے مخاطب ہو گیا ہے۔ اس مقام کو پہنچنے کے بعد انسانی ساخت کے دوسرے علوم قرآن اور بندہ کے درمیان ایک قسم کی رکاوٹ بن جاتے ہیں، کیا کہ وہ قرآن کے معانی کو آدمی کے اوپر کھولنے کا ذریعہ بنیں۔

ترجمہ کی غلطی

علامہ سخاوی کی ایک کتاب ہے "القول البدیع فی الصلاۃ علی الحبیب الشفیع"۔ اس میں انھوں نے شیخ ابوالخیر اقطع کا ایک قصہ نقل کیا ہے۔ اس کا ترجمہ ایک اردو کتاب میں ان لفظوں میں کیا گیا ہے:

"شیخ ابوالخیر کہتے ہیں کہ میں مدینہ منورہ میں آیا۔ وہاں پانچ دن قیام کیا۔ مجھ کو کچھ ذوق و لطف حاصل نہ ہوا۔ میں قبر شریف کے پاس حاضر ہوا اور حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو سلام کیا۔ اور عرض کیا۔ اے رسول اللہ، آج میں آپ کا مہمان ہوں۔ پھر وہاں سے ہٹ کر منبر کے پیچھے سو رہا۔ خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ حضرت ابوبکر آپ کے داہنی طرف اور حضرت عمر آپ کے بائیں طرف تھے۔ حضرت علیؓ آپ کے آگے تھے۔ حضرت علیؓ نے مجھ کو بلایا اور فرمایا اٹھ، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں۔ میں اٹھا اور حضرت کے دونوں آنکھوں کے درمیان چوما۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو ایک روٹی عنایت فرمائی۔ میں نے آدھی کھائی۔ اور جاگا تو آدھی میرے ہاتھ میں تھی۔

اس وقت ہمیں اس قصہ کی سند اور اس کی صداقت سے کوئی بحث نہیں۔ اس کو ہم نے صرف ایک ادبی مقصد کے تحت نقل کیا ہے۔ قصہ کا یہ جملہ "مجھ کو کچھ ذوق و لطف حاصل نہ ہوا" ترجمہ کی غلطی ہے۔ اصل کتاب کے الفاظ یہ ہیں: اَقَمْتُ خَمْسَۃَ اَیَّامٍ مَا ذُقْتُ ذَوَاقاً۔ اس فقرہ کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا: میں پانچ دن رہا۔ مجھے ان دنوں میں کوئی چیز چکھنے کو بھی نہیں ملی۔

اس قسم کی غلطیاں اردو ترجموں میں بہت عام ہیں۔

الاسلام

صفحات ۲۴۰

قیمت مجلد مع پلاسٹک کور ۱۵ روپے۔ مجلد بغیر کور ۱۳ روپیے

اسلام اور مسائل حاضرہ کا ایک جامع مطالعہ

اپنے موضوع پر اس نوعیت کی پہلی کتاب

ابواب :

- جدید مسئلہ کیا ہے
- حقیقت دین
- ارکان اربعہ
- صراط مستقیم
- اسوۂ نبوت
- تحریک اسلامی، سیرت کی روشنی میں
- موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکیں
- تعمیر ملت
- دعوت الی اللہ
- دعوت اسلامی کے جدید امکانات
- آخری بات

الدارالعلمیہ، جمعیۃ بلڈنگ۔ قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

اخبار بلٹز کا تبصرہ

بلٹز (بمبئی) نے اپنی اشاعت ۱۰ ستمبر ۱۹۷۷ء میں ایک مفصل مضمون شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے "پرانے چراغ اور الاسلام"۔ "پرانے چراغ" مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب ہے اور "الاسلام" مولانا وحید الدین خاں کی۔ مضمون کے شروع میں کہا گیا ہے کہ مسلم ممالک کو "پٹرول" کے ذریعہ جو اقتصادی قوت حاصل ہوئی ہے، "اس کا احساس تو انھیں ہو گیا۔ لیکن یہ شعور بیدار ہونا باقی ہے کہ پٹرول کی نہیں، ذہنی خوراک اور روحانی تسکین کی بھوکی دنیا کو دینے کے لئے ان کے پاس کیا ہے، اور وہ کیونکر صاف کر کے پیش کر دینا ہے، اس کے لئے کتنی زبردست مادی اور ذہنی تیاری کی ضرورت ہے۔"

اس تمہید کے بعد لکھا ہے "موضوع سخن ہے، ہندستان کے وہ علمائے اسلام اور ان کی تحریریں جو علمی دنیا میں اعتبار کا پایہ رکھتے ہیں۔ جو موجودہ دور کے مزاج شناس ہونے کے ساتھ ساتھ نسل حاضر سے محبت بھی رکھتے ہیں اور اسلام کا اصل جوہر پیش کرنے کی اہلیت بھی۔"

"پرانے چراغ" میں فاضل مصنف کے وہ اٹھارہ مضامین شامل ہیں جو انھوں نے اپنی مختلف معاصر شخصیتوں پر ان کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد لکھے۔ یہ مضامین جیسا کہ دیباچہ میں واضح کیا گیا ہے، ان شخصیتوں کے سوانح حیات کے طور پر نہیں لکھے گئے۔ یہ درحقیقت نقوش و تاثرات کا ایک مجموعہ ہے۔"

اس سلسلہ میں "پرانے چراغ" پر تبصرہ کرنے کے

اس قابل قدر تصنیف میں بے تکلف غور و فکر کی گمبھیر فضا موجود ہے

بعد بلٹز نے "الاسلام" پر مفصل اظہار خیال کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"مگر بات یہاں (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب "پرانے چراغ" پر) تمام نہیں ہوتی۔ مولانا وحید الدین خاں کی تصنیف الاسلام کا مطالعہ دوسرے پہلو سے ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ یہاں ادعائیت کی جگہ استدلال ہے اور حقیقتوں کو تسلیم کرلینے کا حوصلہ "دنیا کی امامت" کرنے کی لگن پر غالب ہے۔

مولانا وحید الدین خاں بھی درجنوں باخبر علماء مشرق کی طرح درس اور بوریئے پر درس دے کر اٹھے اور عمر عزیز کے ۲۵ برس یوں گزارنے کے بعد، اور ۲۵ سال انھوں نے انگریزی زبان کی معرفت جدید علوم، خصوصاً فلسفہ اور تاریخ سے علم و خبر لینے میں صرف کئے۔ اس کا جلوہ ان کی تصنیف "الاسلام" میں نظر آتا ہے۔ اس تصنیف کی روح بھی لفظ "دعوت" میں پوشیدہ ہے۔

اس علمی اور غور طلب مختصر تصنیف کو اول تا آخر طالب علمانہ پڑھنے بلکہ نچوڑنے کے بعد تین نکات نکلتے ہیں۔

(۱) دین کے اصل منشا کی طرف پُرامن دعوت دی جائے (۲) وقت کا شاکلہ بدل چکا ہے (یہی لفظ شاکلہ، پوری کتاب کا مرکزی لفظ ہے) دنیائے اسلام

کے بڑے علماء اور مجددین کو اس تبدیلی کا احساس ہی نہ ہوا۔ اور پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ شاکلہ سے مراد ذہنی ساخت ہے۔ جسے ہم روح عصر یا وقت کی پکار کہہ سکتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ سائنس کی ترقی نے ذہنی ساخت کا پرانا سانچا توڑ دیا ہے۔ آج حالات اسلامی تبلیغ اور تصدیق کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔ "موجودہ زمانے میں الحاد کا شاکلہ توڑنے کے لئے بھی اسی قسم کی طویل اور عمیق جدوجہد درکار ہے۔ اس کے بغیر آج کی دنیا میں اسلام کو اس کی جگہ نہیں دلائی جا سکتی" ص ۱۷۱

(۳) ہمیں اپنے زمانے کے علوم سے آگاہی اور مادی سرو سامان سے پوری تیاری کے ساتھ "ارباب اقتدار سے غیر ضروری تصادم" مول لئے بغیر جدید دنیا کا تبلیغی اور اصلاحی کام کرنا چاہئے۔

مولانا الحاد کے جس شاکلہ سے لڑنے پر زور دیتے ہیں، وہ ان کی منطق کا لازمی نتیجہ نہیں۔ اس سے درگزر کرکے اس قابل قدر تصنیف "الاسلام" میں بے شمار غور و فکر کی گمبھیر فضا موجود ہے۔ خصوصاً اس کے ساتویں باب "موجودہ زمانے کی اسلامی تحریکیں" اور دسویں باب "جدید امکانات" میں۔

جب لائق کا معیار خوشامد ہو جائے

حال میں ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے:

ALL THE PRIME MINISTER'S MEN

اس کے مصنف مسٹر جناردن ٹھاکر ہیں۔ کتاب میں بڑے دلچسپ انکشافات کئے گئے ہیں۔ مثلاً بتایا گیا ہے کہ ۲۰ مارچ ۱۹۷۷ کے الکشن سے پہلے سابق وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے تین بار سرکاری آدمیوں کے ذریعہ معلوم کرایا کہ الکشن کے سلسلہ میں عوام کا رجحان کیا ہے۔ پہلی رپورٹ ریسرچ اینڈ اینالسس ونگ نے پیش کی، جو ملک کی تمام ریاستوں کے جائزہ کے بعد تیار کی گئی تھی۔ شروع جنوری ۱۹۷۷ میں مسٹر اوم مہتا (اسٹیٹ منسٹر وزارت داخلہ) نے یہ رپورٹ سابق وزیر اعظم کے صاحبزادے مسٹر سنجے گاندھی کے سامنے رکھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ملک کی سیاسی فضا اس وقت مسز گاندھی کے حق میں ساز گار نہیں ہے۔ مسٹر سنجے گاندھی اس کو دیکھتے ہی بگڑ گئے: "یہ لوگ کچھ نہیں جانتے۔ میں سارے ہندوستان میں گیا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ سارا ملک اس وقت ہمارے ساتھ ہے" یہ کہہ کر انھوں نے رپورٹ کو رد کر دیا۔

دوسری بار کچھ اور لوگ چنے گئے اور ان کو تمام ریاستوں میں سیاسی جائزہ کے لئے بھیجا گیا۔ اس بار بھی رپورٹ ناموافق آئی اور سابق حکمراں گروہ کی طرف سے بدستور اس کو غلط قرار دے کر رد کر دیا گیا۔ اب تیسری بار زیادہ "لائق افراد" جائزہ کے لئے چنے گئے۔ انھوں نے اپنی لیاقت کا ثبوت اس طرح دیا کہ چند ہی دن کے اندر رپورٹ پیش کر دی: "الکشن کے لئے یہ بہترین موافق وقت ہے" چنانچہ فوراً الکشن کا اعلان کر دیا گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ معلوم ہے۔

تعریف کرنے والے کے مقابلہ میں وہ شخص کسی کا زیادہ بہتر ساتھی ہے جو نصیحت کرنے والا ہے۔ اگرچہ بہت کم لوگ ہیں جو اس کو جانتے ہوں۔ اور کوئی مرتبہ پانے کے بعد تو آدمی سب سے زیادہ جس حقیقت سے بے خبر ہو جاتا ہے وہ یہی ہے۔

فطرت کو اس کی تلاش کا جواب مل گیا

مسٹر الطاف گوہر پاکستان کے چوٹی کے صحافی ہیں۔ وہ پاکستان ٹائمس کے ایڈیٹر تھے۔ بھٹو حکومت (۱۹۷۱ - ۱۹۷۷) نے اپنے اقتدار کے ابتدائی زمانہ میں الطاف گوہر کو جیل خانہ میں ڈال دیا۔ جیل کا مطلب، سیاسی قیدیوں کے لئے، اپنے میدان عمل سے محرومی کے ہم معنی ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں عام طور پر سب سے بہتر مشغلہ یہ رہ جاتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں مصروف کر لے۔ الطاف گوہر نے قرآن کو ترجمہ کی مدد سے پڑھنا شروع کر دیا۔

یہ مطالعہ، حیرت انگیز طور پر، ان کے لئے ایک نیا تجربہ ثابت ہوا۔ وہ زندگی کی نئی وسعتوں سے آشنا ہوئے جس سے اب تک وہ، اپنی سیاسی مشاغل کی ہماہمی میں بے خبر رہے تھے۔ وہ شخص جس کا قلم چند دن پہلے تک عالمی سیاست کا جائزہ لیا کرتا تھا، جو اپنی خداداد ذہانت کے ساتھ قلم کا شہ سوار بنا ہوا تھا، جیل خانہ میں اس نے اپنے آپ کو اچانک بالکل بے بس پایا۔ اس کی دنیا ایک محدود کوٹھری تھی جہاں اس کی اپنی ذات کے سوا کوئی اور نہ تھا۔

تنہائی کی زندگی، ہر معاملہ میں دوسروں پر انحصار، تمام ظاہری سہاروں کا رخصت ہو جانا، ان واقعات نے جیل کے ماحول کو الطاف گوہر کے لئے ایک عظیم حقیقت کے ادراک کی تربیت گاہ بنا دیا۔ ان کی فطرت، غیر ارادی طور پر، ایک ایسی ہستی کو تلاش کرنے لگی جو ہر طاقت سے بڑھ کر طاقت ور ہو۔ جس کو آدمی ہر آن پا سکتا ہو۔ جو ہر حال میں آدمی کی چٹان بن سکے۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ حالات اس کو دھکیل کر ایسے مقام پر پہنچا دیں جہاں اس کے اپنے کمزور وجود کے سوا کوئی اس کے پاس نہ ہو، جہاں اس کے تمام سہارے اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہوں۔

اس نازک لمحہ میں جب مسٹر الطاف گوہر نے قرآن کی سورہ فاتحہ کھولی اور اس کو پڑھتے ہوئے اس فقرہ تک پہنچے: اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ، تو اچانک ان پر کھلا کہ وہ ہستی فی الواقع کائنات میں موجود ہے جس کی تلاش ان کی فطرت کا سب سے بڑا سوال بنی ہوئی تھی۔ سورہ کی آیت نمبر ۴ میں ان کو انسان کی حقیقی عظمت اور آزادی کا راز مل گیا۔ یہاں بندہ اپنے خدا کے ساتھ ایک ایسے ابدی عہد میں وابستہ نظر آیا جو مکمل طور پر اس کے عجز کا بدل بن جاتا ہے، جو اس کو ایک اتھاہ طاقت کی دائمی سرپرستی میں دے دیتا ہے۔ الطاف گوہر اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

I REMEMBER VIVIDLY THE MOMENT WHEN I FIRST REALIZED THE SIGNIFICANCE OF THIS VERSE. 'WE WORSHIP YOU ALONE, AND TO YOU ALONE WE TURN FOR HELP.' IT WAS A DRAMATIC MOMENT OF FREEDOM, A MOMENT IN WHICH FEAR DISAPPEARED, AND WITHIN ME I FELT A RESURGENCE OF CONFIDENCE AND FAITH.

مجھے وہ لمحہ خوب یاد ہے جب کہ میں نے پہلی بار اس قرآنی فقرہ کی معنویت کو سمجھا "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور ہم صرف تجھی سے مدد چاہتے ہیں"۔ یہ آزادی کا ایک ڈرامائی لمحہ تھا، ایک ایسا لمحہ جس کے بعد خوف مٹ گیا، اور میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر ایک نیا اعتماد و یقین ابھر آیا ہے۔

عضویاتی ارتقار کا نظریہ

جو سائنسی حقیقت سے زیادہ

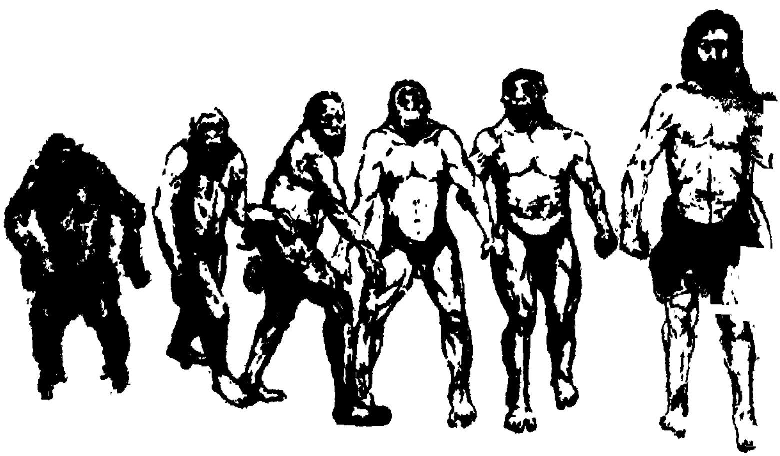
ایک سائنسی لطیفہ ہے

ذیل کی تصویر نیچرل ہسٹری میوزیم (تاریخ فطرت کے عجائب خانہ) سے لی گئی ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ موجودہ انسان سے پہلے بن مانس کی شکل کی مخلوق زمین پر پائی جاتی تھی۔ اس سے ترقی کرتے کرتے موجودہ شکل وصورت کا انسان بن گیا۔ ایک آدمی اس طرح کے کسی چارٹ کو دیکھ کر بظاہر سمجھے گا کہ ارتقار فی الواقع کوئی تاریخی واقعہ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام تصویریں محض قیاسی ہیں۔ عالم واقعہ میں ان کا وجود ثابت نہیں۔

عضویاتی ارتقار کے مطابق زندگی کی مختلف شکلیں الگ الگ پیدا نہیں ہوئیں، بلکہ سب ایک ہی ابتدائی جرثومۂ حیات کی مختلف ترقی یافتہ صورتیں ہیں جانوروں میں سے دودھ پلانے والے جانوروں کی بعض قسموں نے ترقی کرتے کرتے بالآخر بن مانس کی شکل اختیار کی۔ اس کے بعد لاکھوں برس تک مختلف انسان نما مخلوقات پیدا ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ انسان بنا جس کو ہم آج دیکھتے ہیں۔

اس نظریہ کی سب سے بڑی بنیاد متحجر ڈھانچے (FOSSILS) ہیں۔ قدیم زمانہ کی ذی حیات اشیار زلزلوں وغیرہ میں زمین کی تہوں میں دب گئیں۔ پھر مختلف کیمیاوی عمل سے ان کے پنجر پتھر کی شکل اختیار کر گئے۔ انھیں بکھرائے ہوئے اجزار کے ذریعہ قدیم زمانہ کے انسانوں کی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔

اس نظریہ کے حق میں اگرچہ ابھی تک چند منتشر ہڈیوں کے سوا اور کوئی چیز نہیں ملی ہے، مگر نظریہ



[illegible]

ارتقاء کے علماء کو اس پر اتنا یقین ہے کہ انھوں نے انھیں منتشر ہڈیوں کے ساتھ اپنے قیاس کا اضافہ کرکے انسانیت کی ایک مکمل ارتقائی تاریخ بنا ڈالی ہے۔

بعض اوقات چٹان میں دبی ہوئی ایک کھوپڑی ملتی ہے۔ پتھروں سے کاٹ کر نکالنے میں اس کے ریزے ریزے ہو جاتے ہیں۔ کئی ٹن سنگریزے اور مٹی کو چھاننے کے بعد جب "کھوپڑی" کو حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تلاش کرنے والوں کو کھوپڑی کا صرف ایک حصہ ملا ہے اور وہ بھی چار سو ٹکڑوں کی شکل میں۔

نظریۂ ارتقاء کی تاریخ دلچسپ لطیفوں سے بھری ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر برطانی سائنس داں ٹی۔ ایچ۔ ہکسلے (۱۸۹۵ - ۱۸۲۵) اور جرمن پروفیسر ارنسٹ ہیکل (۱۹۱۹ - ۱۸۳۴) نے جب پہلی بار سمندر کی تہ کی کیچڑ کا معائنہ کیا تو انھوں نے پورے یقین کے ساتھ اعلان کر دیا "یہی وہ مادہ ہے جس سے زندگی کے ابتدائی جرثومہ کا آغاز ہوا۔

اس کے بعد ۱۸۷۰ میں جغرافی سوسائٹی نے اس مسئلہ کی علمی تحقیقات کی تو اس کو اعلان کرنا پڑا کہ یہ بالکل باطل ہے اس قسم کے مفروضہ کے لئے کوئی حقیقی قرینہ نہیں ملتا۔ حتیٰ کہ علم الانسان کے ایک پروفیسر نے کہا کہ یہ خود فریبی (SELF DELUSION) کی ایک انوکھی مثال تھی۔

آسٹریلیا کے ساحل پر ماہرین کو ایک چٹان نظر آئی جہاں خالی اور ٹوٹی ہوئی سیپیوں کا ایک ڈھیر جمع تھا۔ انھوں نے سمجھا کہ وہ ایک ایسی قدیم تہذیب کی جائے وقوع پر پہنچ گئے ہیں جس کے لوگ زیادہ تر گھونگھوں پر گزارہ کرتے تھے۔ (یہ انسانی ارتقاء کے ایک اہم مرحلہ کا انکشاف تھا) مگر بعد کی تحقیقات نے بتایا کہ یہ محض ایک غلط فہمی تھی۔ اصل یہ ہے کہ سمندری بگلوں کی ایک قسم ہے جس کی چونچ اتنی مضبوط نہیں ہوتی کہ وہ سیپ کو توڑ کر اندر دبا ہوا گھونگھا کھا سکے۔ آسٹریلیا کے ساحل پر سیپ بافراط پائی جاتی ہے۔ سمندری بگلا اس مشکل کا حل قدرت کے بتائے ہوئے طریقہ پر کرتا ہے۔ وہ سیپ کو اپنی چونچ میں پکڑ کر کافی بلندی تک جا کر ساحل پر واقع چٹانوں پر گرا دیتا ہے۔ نتیجہ میں سیپ ٹوٹ جاتی ہے اور گھونگھا باہر نکل آتا ہے جسے سمندری بگلا ایک ہی نوالے میں ہڑپ کر جاتا ہے۔ برسہا برس سے جمع شدہ خالی سیپیوں کے یہ ڈھیر جب ماہرین نے دیکھے تو انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ کسی قدیم تہذیب کا نشان ہے، حالاں کہ اس کا انسانی تہذیب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

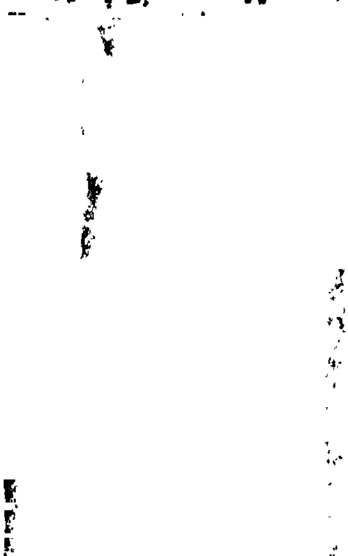
ارتقاء کے حامیوں کا خیال ہے کہ ارتقاء کی سیڑھی پر چمپینزی (بن مانس) انسان سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ جنگل میں آزاد چمپینزی تقریباً ۲۰ قسم کی آوازیں نکالتا ہے جس سے مختلف قسم کے جذبات — خطرہ، غصہ، خوشی، پسند، نفرت، وغیرہ — کی ترجمانی ہوتی ہے۔ "چمپینزی کو تربیت دی جائے تو کیا وہ انسان جیسی آوازیں بھی نکال سکتا ہے" علمائے حیاتیات کے نزدیک اس کا جواب اثبات میں تھا۔ ان کے نزدیک چمپینزی کے حلق میں اس کی صلاحیت موجود تھی کہ اس کو بولنا سکھایا جا سکے۔ اسی طرح دوسری انسانی خصوصیات بھی۔

۱۹۴۷ میں فلوریڈا کی تجربہ گاہ میں ایک چمپینزی کو رکھا گیا۔ باقاعدہ منصوبہ کے تحت اس کو ایک تربیتی کورس سے گزارا گیا۔ مگر ساری کوشش کے بعد وہ صرف

حیاتیاتی حقائق نظریۂ ارتقا کے قیاسات کو قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں

چنانچہ امریکہ میں اس قسم کی کوششیں پچھلے ۳۰ برسوں میں مسلسل کی جاتی رہی ہیں۔ مگر چمپینزی کے اندر انسانی اوصاف پیدا کرنے میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

۱۹۶۰ میں اوکلاہاما یونیورسٹی میں کثیر رقم کے خرچ سے ایک جامع منصوبہ بنایا گیا اور سات چمپینزیوں کو غیر معمولی اہتمام کے ساتھ بالکل انسانی ماحول میں رکھ کر تربیت دی گئی۔ وہ کچھ وقت لیبورٹری میں گزارتے اور اس کے بعد پروفیسروں کے گھروں میں ان کے فرد خاندان کی طرح رہتے۔ ان کو انسانی کپڑے پہنائے جاتے۔ میز کرسی پر کھانا کھلایا جاتا۔ رات کو مسہریوں پر سلایا جاتا۔



انسان کے مفروضہ جد اعلیٰ (چمپینزی) کو انسانی تعلیم کے مطابق پانی پینے کی مشق کرائی جارہی ہے۔

صفائی ستھرائی کے تمام آداب سکھائے جاتے۔ مگر تربیتی کورس کی مدت ختم ہونے کے بعد وہ بدستور "چمپینزی" تھے۔ ان کے اندر کوئی قابل لحاظ تبدیلی پیدا کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی ——— حیاتیاتی حقائق نے ارتقائی مفروضہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

پانڈیچری سے ۱۲ میل کے فاصلہ پر ایک مقام ہے تروکاری، یہاں قدیم زمانہ سے درختوں کے تنے کی شکل کے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ عوام کا خیال تھا کہ یہ بھوتوں یا راکششوں کی ہڈیاں ہیں جن کو کسی دشنو بھگوان نے ہلاک کیا تھا۔ لوگ ان کے پاس جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔

حال ہی میں ماہرین نے دریافت کیا کہ یہ دراصل فاسل ہیں۔ یعنی قدیم زمانہ کے درختوں کے پتھرائے ہوئے تنے۔ اندازہ ہے کہ یہ درخت ۲۰ ملین سال پہلے پائے جاتے تھے اس قسم کا ایک شجری فاسل نومبر ۱۹۷۰ میں نئی دہلی لایا گیا اور یہاں نیشنل میوزیم میں عام نمائش کے لیے رکھا گیا ہے۔

یہی صورت حال، بدلی ہوئی شکل میں، ارتقا پسندوں کے ساتھ پیش آئی ہے۔ انھوں نے بعض جزوی آثار پر اپنے قیاسات کا اضافہ کر کے ایک پورا حیاتیاتی نقشہ بنالیا۔ مگر موجودہ زمانہ میں جس طرح عوامی توہمات ختم ہوتے چلے جارہے ہیں اسی طرح معلومات انسانی میں اضافہ اس "سائنٹفک قیاس" کی واقعیت کو بھی دن بدن مشتبہ کرتا جارہا ہے۔

اگرچہ اب بھی نصابی کتابوں میں قدیم نظریہ ہی پڑھایا جاتا ہے، مگر وہ دن دور نہیں جب ارتقا کے نظریہ کو تاریخ کی الماری کے سوا اور کہیں جگہ نہیں ملے گی۔

یہ ایک خدائی منصوبہ تھا

تاکہ ظالموں اور متکبروں کا مجرم ہونا ثابت ہو جائے اور اللہ کے وفادار بندوں کو خدائی گواہ بننے کا اعزاز حاصل ہو

ہجرت کے تیسرے سال احد کا معرکہ پیش آیا۔ اس جنگ میں ابتداءً مسلمانوں کو کامیابی ہوئی، مگر بعد کو اہل ایمان کی ایک اتفاقی غلطی سے فائدہ اٹھا کر خدا کے دشمن ان کے اوپر ٹوٹ پڑے اور انھیں نقصان پہنچایا۔ اس واقعہ سے اہل ایمان کے درمیان طرح طرح کے سوالات پیدا ہونے لگے۔ انھوں نے کہا: ہم حق پر ہیں پھر یہ مصیبت کہاں سے آگئی (آل عمران ۔ ۱۶۵) جواب ملا کہ یہ وقتی نقصانات ہیں، ان کی پرواہ مت کرو۔ خدا کی نصرت حق پرستوں کے ساتھ ہے اور آخری کامیابی بہر حال انھیں کو حاصل ہوگی۔

"یہ اس واسطے ہوا تاکہ اللہ ایمان والوں کو جان لے اور تم کو ظالموں کے اوپر گواہ بنائے" (آل عمران ۔ ۱۴۰) ——— گویا احد کی جنگ میں مسلمانوں سے جو ایک اتفاقی غلطی ہوئی اور جس کی وجہ سے خدا کے دشمنوں کو موقع ملا کہ وہ بے گناہ مسلمانوں کے اوپر پیچھے سے چڑھ آئیں، وہ بھی خدائی منصوبہ کا ایک جزء تھا۔ اس طرح خدا ظالموں اور سرکشوں کو ننگا کرنا چاہتا تھا، ان کے ہاتھوں اہل ایمان کو زخمی کرکے ان کی درندگی اور سرکشی کا ثبوت فراہم کرنا مقصود تھا۔ اللہ چاہتا تھا کہ اس واقعہ کے ذریعہ ایک طرف ظالموں اور متکبروں کو مجرمین کے کٹہرے میں کھڑا کر دے، دوسری طرف اپنے وفادار بندوں کو ان کے مقابلہ میں عدالت الٰہی کا گواہ بننے کا اعزاز عطا کرے۔ یہ ایک خدائی معاملہ تھا نہ کہ محض ایک انسانی واقعہ (۲۰ جولائی ۱۹۷۷)

انسان صرف اچھا یا برا کریڈٹ لے رہا ہے

ایک سب سے بڑی بات جس کو انسان سب سے زیادہ بھولا رہتا ہے، یہ کہ اس دنیا میں کسی انسان کو کوئی ذاتی طاقت حاصل نہیں۔ کوئی شخص نہ کسی کو کچھ دیتا، نہ کوئی شخص کسی سے کچھ چھینتا۔ ہر واقعہ جو اس زمین پر ہوتا ہے وہ خدا کی اجازت سے ہوتا ہے۔ انسان کی ساری حیثیت یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں امتحان کے لئے ہے۔ ارادہ کے سوا انسان کے بس میں اور کچھ نہیں۔ واقعات اس لئے اس کے سامنے لائے جاتے ہیں کہ اس کی جانچ ہو تاکہ اس کا خدا یہ دیکھے کہ اس کا بندہ مختلف رویوں میں سے کس رویہ کا اپنے لئے انتخاب کر رہا ہے۔ واقعات کا اہتمام مالک کائنات کی طرف سے ہوتا ہے۔ انسان تو صرف اچھا یا برا کریڈٹ لے رہا ہے

اسلام — ایک عظیم جدوجہد

قرآن مالک کائنات کا فرمان ہے، جو اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ عزت کس کے لیے ہے اور ذلت
س کے لیے۔ کامیاب کون ہے اور نامراد کون۔ دنیوی اعتبار سے جب ہم کامیابی کا لفظ بولتے ہیں تو اس کے
معنی ہوتے ہیں کسی سوسائٹی میں ایک شہری کو ترقی کے جو مواقع دیے گئے ہیں ان کو استعمال کرکے اونچے
درجات تک پہنچنا۔ ایک شخص بڑا تاجر، اونچا عہدیدار اور اعلیٰ اعزازات کا مالک ہو تو اس کو کامیاب انسان کہا
جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ماحول کے اندر تجارت کو بڑھانے کی جو ممکن صورتیں ہیں۔ اعلیٰ عہدوں پر پہنچنے
کے لیے جو صفات مقرر کی گئی ہیں اعزازات کے حصول کے لیے جو راستے بنے ہوئے ہیں وہ شخص ان کو عبور
کر گیا ہے اور اپنی جدوجہد کے نتیجہ میں اس نے اس بلند مقام کو پالیا ہے جو قانون وقت کے تحت اس کے
لیے ممکن تھا۔ کامیابی کے معنی الہ دین کا چراغ پالینے کے نہیں ہیں، بلکہ کامیابی اس واقعہ کا نام ہے کہ ایک
شخص نے اپنی صلاحیت اور کام کے مواقع کو ان راہوں میں صرف کیا جو اس کے لیے کھلی ہوئی تھیں اور بالآخر
اپنی کوششوں کے نتیجہ میں اس منزل تک پہنچ گیا جہاں ان راستوں کا کوئی چلنے والا پہنچتا ہے۔ کامیابی کوئی
خوش قسمتی سے پیش آنے والا اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ وہ صحیح جدوجہد کا فطری نتیجہ ہے۔ اسی بات کو ایک مفکر
نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے :-

"لائق شخص اور کامیاب نہ ہو، یہ جھوٹ ہے"

یہی حال دوسری زندگی کی کامیابی کا بھی ہے جو انسان کی حقیقی منزل ہے، جہاں تمام اگلے پچھلے انسان
اپنے رب کے حضور جمع کیے جائیں گے۔ اس دن عزت اور کامیابی ان لوگوں کے لیے ہوگی جو خدا کی رضا کو
پالیں اور ذلت اور نامرادی ان کے لیے جو اس کی رضا کو حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ پہلے گروہ کے لیے
دائمی عیش ہے اور دوسرے گروہ کے لیے دائمی عذاب۔ جو شخص قرآن پر ایمان لائے اور اسلام کو اختیار کرے
وہ گویا پہلے انجام کا امیدوار ہے اور دوسرے انجام سے بچنا چاہتا ہے۔ مگر اس مقام بلند کا حاصل کرنا کوئی
آسان کام نہیں ہے۔ یہ ایک عظیم چڑھائی ہے جس کو عبور کرنے کے ایک لمبے عمل کے بعد آدمی اس کے
اوپر پہنچتا ہے۔ خدا کا انعام کسی پڑی ہوئی چیز کی طرح محض اتفاق سے کسی کو نہیں مل جاتا، بلکہ دنیوی کامیابی
کی طرح وہ ایک زبردست جدوجہد کا قدرتی نتیجہ ہے جو اللہ تعالےٰ کے قانون کے مطابق کسی شخص کو حاصل
ہوتا ہے۔ آخرت میں انسان کی کامیابی دراصل ایک لمبے امتحان سے پار اتر جانے کا دوسرا نام ہے۔ انسان کو پیدا
کرکے اللہ تعالےٰ نے ایک ایسی دنیا میں ڈال دیا ہے جہاں طرح طرح کے باطل نظریات اور فاسد رجحانات ہیں
جن سے اسے اپنے دل و دماغ کو پاک کرنا ہے۔ بہت سے غلط اور ناجائز طریقے ہیں جن سے اسے بچنا ہے۔
بہت سی شیطانی اور طاغوتی قوتیں ہیں جو انسان کو راہ حق سے پھیر دینے میں لگی ہوئی ہیں۔ ان طاقتوں سے

لڑتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ غرض دشواریوں سے بھرا ہوا ایک راستہ ہے جس کو طے کرکے اس کو اپنے رب تک پہنچنا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ وَحُجِبَتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ (متفق علیہ)	جہنم لذتوں سے ڈھکی ہوئی ہے اور جنت تکلیفوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔

اسلام کی حقیقت کو اگر ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو اس کے لیے "قربانی" سے زیادہ موزوں اور کوئی لفظ نہیں ہو سکتا۔ اسلام دراصل ایک زبردست جدوجہد ہے، وہ قربانی کا ایک مسلسل عمل ہے جو ایمان لانے کے بعد سے آدمی کی موت تک جاری رہتا ہے۔ سب سے پہلی قربانی آدمی اس وقت دیتا ہے جب وہ اپنے پسندیدہ خیالات اور قلبی رجحانات کو خیرباد کہہ کر دینِ حق کو قبول کرتا ہے۔ اس کے بعد دوسری قربانی وہ ہے جو عمل کی دنیا میں دی جاتی ہے۔ اخلاق و معاملات اور معیشت و تمدن میں وہ ان طریقوں کو چھوڑ دیتا ہے جو خدا کو ناپسند ہیں اور ان طریقوں کو اختیار کر لیتا ہے جو خدا کو محبوب ہیں۔ پھر جب وہ ان دونوں مرحلوں کو پار کر لیتا ہے تو وہ امتحان کے اس آخری میدان میں پہنچ جاتا ہے جہاں نہ صرف حرام چیزیں بلکہ زندگی کے جائز اثاثے بھی چھوڑ دینے ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی جان بھی قربان کر دینی پڑتی ہے۔ یہ جان کی قربانی اس سلسلۂ امتحان کی تکمیل ہے اور عہد بندگی کو آخری طور پر ثابت کر دکھانا ہے جو ایمان لا کر آدمی نے اپنے رب سے کیا تھا۔

یہ تین دور جن سے گزر کر آدمی اپنے رب تک پہنچتا ہے اور اس کی رضا کا مستحق بنتا ہے، ان کو قرآن میں — ایمان، ہجرت اور جہاد — کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ○ (توبہ - ۲۰)	جو لوگ ایمان لائے، جنھوں نے ہجرت کی اور اپنی جانوں اور مالوں سے خدا کی راہ میں جہاد کیا ان کے لیے خدا کے یہاں بڑا درجہ ہے اور یہی لوگ دراصل کامیاب ہونے والے ہیں۔

اس آیت میں ایمان سے مراد ان حقائق کو تسلیم کرنا ہے جو قرآن میں تلقین کیے گئے ہیں، اور ہجرت سے مراد اس اعتراف اور اس کے تقاضوں کے خلاف جو کچھ ہے اس کو چھوڑ دینا، اور جہاد اس کوشش اور جدوجہد کا نام ہے جو ایمان اور مہاجرت کی زندگی کو آخری حد تک باقی رکھنے کے لیے اس دنیا میں آدمی کرتا ہے۔ اس طرح یہ ایمان، ہجرت اور جہاد — ایک دوسرے سے الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی سلسلۂ سفر کی اگلی پچھلی منزلیں ہیں۔ یہ ایک ہی کیفیت کے مختلف ارتقائی مراحل ہیں جن کو ممیز کرنے کے لیے جدا جدا عنوان دے دیا گیا ہے۔ نیز ہجرت اور جہاد کی کوئی متعین صورتیں نہیں ہیں۔ ایمان کی حقیقت، مختلف حالات میں، مختلف صورتوں میں ظہور کرتی ہے۔ کسی کے لیے ہجرت ترک وطن کے ہم معنی ہوتی ہے، کسی کے لیے صرف یہ کہ وہ اپنے اندر کے برے رجحانات کو چھوڑ دے۔ کسی کا جہاد اس کو بیرونی قوتوں سے ٹکراؤ تک لے جاتا

ہے۔ کسی کا جہاد صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی داخلی ترغیبات کا مقابلہ کر کے اس کو زیر کرے۔

ایمان

سب سے پہلے ایمان کو لیجیے۔ یہ اس عظیم امتحانی مہم میں شریک ہونے کا فیصلہ کرنا ہے جس کی ابتدا زبان کے اقرار سے ہوتی ہے اور جس کی انتہا یہ ہے کہ اسی پر قائم رہتے ہوئے آدمی اپنی جان دے دے۔ یہ وہ عہد ہے جو بندہ اپنے خدا سے اس بات کے لیے کرتا ہے کہ وہ ساری عمر اس کا وفادار رہے گا۔ ایمان اس کیفیت کا نام ہے جو حقیقت کے صحیح اور مخلصانہ شعور سے پیدا ہوتی ہے۔ جب آدمی اس حیرت انگیز کائنات کے پیچھے ایک لامحدود قوت کا مشاہدہ کر لیتا ہے، جب وہ خدا کے رسولؐ کو تسلیم کر کے اس کے تمام فیصلوں پر راضی ہو جاتا ہے، جب اس کا دل پکار اٹھتا ہے کہ تخلیق کا یہ عظیم منصوبہ بے مقصد نہیں ہے بلکہ ایک ایسا دن آنے والا ہے جب ماضی اور مستقبل کے تمام انسانوں کو جمع کر کے ان کا حساب لیا جائے، تو اسی کیفیت کے مجموعہ کو ہم ایمان سے تعبیر کرتے ہیں۔

ایمان کی اصل روح اعتماد کرنا ہے۔ یہ اعتماد ایک ایسی ہستی کے بارے میں ہوتا ہے جس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتے۔ اس لیے اس میں یقین کا مفہوم پیدا ہوا۔ اسی طرح خدا کو اس کی تمام صفات کے ساتھ ماننے کے لازمی معنی یہ ہیں کہ اس کے غضب سے ڈرا جائے اور اس کے عذاب سے بچنے کی فکر کی جائے اس لیے اس کے ساتھ تقویٰ اور خوف کا ہونا ضروری ہے۔ اس طرح اگر قرآن کے تصور ایمان کی تشریح کے لیے تین الفاظ — یقین، اعتماد اور خوف — کو اکٹھا کر دیں تو ہم اس کی روح کے بالکل قریب پہنچ جاتے ہیں۔ ایمان اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے خدا اور اس کے رسولؐ پر اس کلی اعتماد کا نام ہے جو یقین کامل سے پیدا ہوتا ہے، اور خدا سے اس خوف کا نام ہے جو آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ کسی پولیس اور فوج کے تسلط کے بغیر خود سے اس کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم کر لے۔

یہ یقین جو ایمان کا پہلا جزو ہے، یہ خارج سے درآمد کی ہوئی کسی چیز کا نام نہیں ہے بلکہ اس حقیقت کا زندہ شعور ہے جو خود انسان کی فطرت میں چھپی ہوئی ہے۔ انسان کائنات پر غور کرتا ہے۔ رسولؐ کی تعلیمات کو دیکھتا ہے اور اپنے اندر سے اٹھنے والی آواز پر کان لگاتا ہے تو یہ تینوں چیزیں بالکل ایک معلوم ہوتی ہیں۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی ایک ہی پیغام ہے جو ایک وقت میں تین مختلف مقامات سے نشر ہو رہا ہے۔ خدا کا رسولؐ جس حقیقت کی خبر دیتا ہے، کائنات پوری کی پوری بالکل اس کی ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے اور انسان کی اندرونی آواز ہمہ تن اس کی تصدیق کرتی ہے۔ وہ کتاب الٰہی میں جو کچھ پڑھتا ہے زمین و آسمان کے اندر اسی کو دیکھتا ہے اور جو کچھ پڑھتا ہے اور دیکھتا ہے اس کی فطرت اس کو اس طرح قبول کر لیتی ہے جیسے کسی خانے میں بالکل اسی سائز کی چیز رکھ دی گئی ہو۔ مگر یقین کی یہ کیفیت کسی کو خود بخود حاصل نہیں ہوتی۔ جس طرح فطرت کی ہر صلاحیت اسی وقت روبکار آتی ہے جب اس کو نشو و نما دے کر

ابھارا جائے، کائنات کا ہر راز اسی وقت انسان کے اوپر بے نقاب ہوتا ہے جب اس کی تلاش میں وہ اپنے آپ کو گم کر چکا ہو۔ اور کسی کتاب کے مضامین اسی وقت آدمی پر کھلتے ہیں اور اسے فائدہ پہنچاتے ہیں جب اس کا گہرا مطالعہ کر کے اس کے مطالب کو اخذ کیا جائے۔ ٹھیک اسی طرح یہ یقین بھی آدمی کو اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ اپنی قوت ارادی کو اس کے لیے کام میں لائے۔ یہ اگرچہ کائنات کی واضح ترین حقیقت ہے مگر اس دنیا کے لیے اللہ تعالیٰ کا قانون یہی ہے کہ آدمی کو وہی کچھ ملے جس کے لیے اس نے جد و جہد کی ہو۔

ایمان کا دوسرا جزو اعتماد ہے۔ اپنی ذات اور کائنات کا مطالعہ جہاں آدمی کو ایک طرف یہ بتاتا ہے کہ ایک عظیم خالق اور کارساز ہے جو اس کارخانے کے تمام واقعات کا حقیقی سبب ہے۔ اسی کے ساتھ اور عین اسی وقت اس کو دو اور باتوں کا شدید احساس ہوتا ہے۔ ایک اپنی انتہائی بے چارگی کا اور دوسرے خدا کے بے پایاں احسانات کا۔ وہ دیکھتا ہے کہ وہ اپنے وجود کے لیے بے شمار چیزوں کا ضرورت مند ہے، مگر وہ کسی ایک چیز کو بھی خود سے نہیں بنا سکتا۔ وہ ایک کمزور بچہ کی شکل میں پیدا ہوتا ہے اور بڑھاپے کی ناتوانیوں کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ وہ ایک ایسی زمین کے اوپر کھڑا ہے جو فضا کے اندر معلق ہے جس کے توازن میں معمولی بگاڑ بھی آ جائے تو اس کو تباہ کر دینے کے لیے کافی ہے، وہ اپنے کو ایک ایسی عظیم کائنات کے اندر گھرا ہوا پاتا ہے جس پر اسے کوئی اختیار نہیں۔ ان حالات میں اس کو اپنا وجود بالکل بےبس اور حقیر معلوم ہونے لگتا ہے۔ دوسری طرف وہ دیکھتا ہے کہ وہ سب کچھ جس کی اسے ضرورت تھی، اس کے لیے مہیا کر دیا گیا ہے۔ اس کو ایسا جسم دیا گیا ہے جو دیکھتا ہے، جو سنتا ہے، جو بولتا ہے، جو سوچتا ہے اور اس کی قوتوں کو برقرار رکھنے کے لیے ایک خود بخود چلنے والی مشین کی طرح مسلسل کام کر رہا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ زمین و آسمان کی ساری قوتیں پوری ہم آہنگی کے ساتھ اس کی خدمت میں لگی ہوئی ہیں۔ اس کو اپنا وجود مجسم احسان نظر آنے لگتا ہے۔ اس کے اندر بے پناہ جذبۂ شکر امنڈتا ہے اور وہ احسان مندی کے جذبہ سے لبریز ہو جاتا ہے۔ یہ واقعہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ اس ہستی کو اپنا سب کچھ قرار دے جس نے یہ سارا انتظام اس کے لیے کیا ہے۔ پہلی چیز اس کو اپنی مکمل بے بسی کا یقین دلاتی ہے اس کو شدید احساس ہوتا ہے کہ کوئی بلند تر قوت ہو جو اس کی دستگیری کرے۔ اور دوسرا احساس اس کی اس طلب کا جواب بن کر سامنے آتا ہے۔ جو مطالعہ اس کو اپنے اندر خلا کا احساس دلاتا ہے وہی مطالعہ بیک وقت اس خلا کو پر بھی کر دیتا ہے۔

ایمان کا تیسرا جزو "خوف" ہے۔ یہ خوف ایمان کے ابتدائی دو اجزاء — یقین اور اعتماد سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا لازمی نتیجہ اور اس کی تکمیل ہے۔ ایک طرف وہ خدا کو دیکھتا ہے جو عدل و حکمت کا خزانہ ہے۔ دوسری طرف کائنات کو دیکھتا ہے تو اس کا دل پکار اٹھتا ہے کہ اتنا بڑا تخلیقی منصوبہ بے مقصد نہیں ہو سکتا۔ پھر جب وہ زمین پر بسنے والے انسانوں کو دیکھتا ہے جن میں ظالم بھی ہیں اور مظلوم بھی۔ اچھے

بھی ہیں اور برے بھی، تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ محاسبہ کا ایک دن آنا ضروری ہے جہاں بھلوں کو ان کی بھلائی کا اور بروں کو ان کی برائی کا بدلہ دیا جائے۔ رب العالمین پر اعتماد ہی اس کے لیے رب العالمین سے خوف کی بنیاد بن جاتا ہے۔

یہ خدا کا خوف اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جو کسی ڈراؤنی چیز کو دیکھ کر آدمی کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کو کسی بھی ایک لفظ سے صحیح طور پر تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ انتہائی امید اور انتہائی اندیشہ کی ایک ایسی ملی جلی کیفیت ہے جس میں بندہ کبھی یہ طے نہیں کر پاتا کہ دونوں میں سے کس کو فوقیت دے۔ یہ سب کچھ کرکے اپنے کو کچھ نہ سمجھنے کا وہ اعلیٰ ترین احساس ہے جس میں آدمی کو صرف اپنی ذمہ داریاں یاد رہتی ہیں اور اپنے حقوق کو وہ بالکل بھول جاتا ہے۔ یہ محبت اور خوف کا ایک ایسا مقام ہے جس میں آدمی جس سے ڈرتا ہے اسی کی طرف بھاگتا ہے، جس سے چھننے کا خطرہ محسوس کرتا ہے اسی سے پانے کی بھی امید رکھتا ہے یہ ایک ایسا اضطراب ہے جو سراپا اطمینان ہے اور ایسا اطمینان ہے جو سراپا اضطراب ہے۔

یہ ایمان کے تین نمایاں پہلو ہیں۔ ایمان دراصل اس کیفیت کا نام ہے جو خدا کے خوف، اس پر مکمل اعتماد اور اس کے بارہ میں کامل یقین سے پیدا ہوتا ہے۔ جو شخص اللہ تعالےٰ پر، اس کے رسولوں پر اور اس کے احکام پر ایمان لائے، اپنا سب کچھ اس کو سونپ دے، اس کے تمام فیصلوں پر راضی ہو جائے، وہ مومن ہے۔ ایمان عقل کے لیے ہدایت اور روشنی ہے اور دل کے لیے طہارت اور پاکیزگی۔ اس لیے یہ عقل اور ارادہ دونوں کو ایک ساتھ متاثر کرتا ہے اور خیالات و اعمال سب پر حاوی ہو جاتا ہے۔ قرآن کی زبان میں مومن وہ شخص ہے جو خدا کا خالص اور وفادار بندہ ہے اور اس کے احکام پر یقین و اعتماد کی ساری کیفیات کے ساتھ اطاعت کا معاہدہ کرتا ہے۔

ہجرت

اب ہجرت کو لیجیے — ہجرت کے معنی ہیں چھوڑنا، ترک تعلق کرنا عام طور پر ہجرت کو ترک وطن کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ یقیناً ہجرت کا لفظ مخصوص طور پر جس واقعہ کے لیے بولا جاتا ہے وہ یہی ہے، مگر کسی واقعہ کو اس کے پس منظر سے الگ کرکے سمجھا نہیں جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ترک وطن جو مومن کی زندگی میں پیش آتا ہے یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہوتا بلکہ ایک لمبی تاریخ کا اختتام ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو مومن کی زندگی میں پہلے دن سے شروع ہوتا ہے اور بالآخر ترک علائق تک پہنچ جاتا ہے۔

اللہ تعالےٰ کے فضل سے ایک شخص پر حق کا انکشاف ہوتا ہے اور وہ اٹھ کر لوگوں کو اس کی طرف بلانا شروع کر دیتا ہے، وہ وقت کے خلاف ایک نئی آواز کا علمبردار بن کر گویا یہ اعلان کرتا ہے کہ اس نے ماحول کی بندگی چھوڑ دی ہے اور زمانہ کے خلاف اپنے لیے ایک راہ بنانے کا فیصلہ کیا ہے، یہ ہجرت کا آغاز ہے جب

آدمی ناجائز زندگی کو چھوڑ کر جائز زندگی کو اپنانے کا عزم کرتا ہے۔ اس کے بعد ایک مسلسل جدوجہد شروع ہو جاتی ہے جس میں اس کو بہت سی پرانی چیزوں کو چھوڑنا اور بہت سی نئی چیزوں کو اختیار کرنا ہوتا ہے۔ کتنے ہی اپنے لوگوں سے کٹنا اور کتنے ہی غیروں سے جڑنا ہوتا ہے۔ اندر سے باہر تک بے شمار پسندیدہ چیزوں کو ترک کرنا اور اس کے بجائے دوسری ناخوش گوار چیزوں کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح ایمان لانے کے ساتھ ہی مومن کی زندگی میں ہجرت۔۔ ایک نیا طرزِ عمل اختیار کرنے کے لیے بہت سی پرانی چیزوں کو چھوڑنے کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ یہ ہجرت جو اس نے خود کی ہے دوسروں کو بھی اسی کی طرف بلانا شروع کر دیتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں کچھ لوگ اس کا ساتھ دیتے ہیں اور کچھ مخالف بن جاتے ہیں۔ اس طرح ماحول میں دو بالکل مقابل گروہ ابھرنے لگتے ہیں جن میں سے ایک گروہ اس چیز سے چمٹا ہوا رہتا ہے جس کو دوسرا گروہ چھوڑ دینا چاہتا ہے

یہ اختلاف صرف اس پہلو سے نہیں ہوتا کہ ایک گروہ دوسرے گروہ پر تنقید کرتا ہے اور اس کے رویہ کو غلط قرار دیتا ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر دونوں کے درمیان ایک عملی کش مکش شروع ہو جاتی ہے انسانی معاشرہ ایک وحدت ہے جس میں کوئی شخص دوسرے تمام لوگوں سے الگ اپنے لیے کوئی راہ نہیں بنا سکتا۔ انسان اپنی عین فطرت کے اعتبار سے سماجی واقع ہوا ہے۔ اس کی تمام ضرورتیں دوسروں سے مل جل کر انجام پاتی ہیں اور اس کو دوسروں کے پھیلائے ہوئے نظریات کے درمیان زندگی بسر کرنی ہوتی ہے۔ کوئی شخص اپنے پسند کیے ہوئے نظریہ کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ جب تک وہ سماج کے تمام اداروں میں اسی نظریہ کو رائج نہ کر لے۔ اس کے بغیر نہ تو وہ مدرسہ میں اپنی مرضی کے مطابق تعلیم حاصل کر سکتا نہ بازار میں اپنی مرضی کے مطابق خرید و فروخت کر سکتا۔ نہ عدالتوں سے اپنے اصول کے مطابق فیصلے لے سکتا۔ حتیٰ کہ وہ یہ بھی نہیں کر سکتا کہ جس چیز کو وہ حلال سمجھتا ہے اسے کھائے اور جو چیزیں اس کے نزدیک حرام ہیں ان کو اپنے حلق کے نیچے اترنے نہ دے۔ اس لیے جب کوئی شخص وقت کے خلاف کسی مسلک کو اختیار کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کا یہ فیصلہ لازمی طور پر ان لوگوں سے ٹکراؤ کا سبب بن جاتا ہے جن کے بنائے ہوئے نظام کے اندر وہ زندگی گزار رہا ہے۔ انسانی معاشرہ کی مثال ایک جال کی سی ہے جس کے تمام افراد حلقوں کی مانند ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک حلقہ کو الگ کرنے کی کوشش پورے جال کو جھنجھوڑ دیتی ہے۔ اس طرح ایک مستقل اختلاف شروع ہو جاتا ہے جو دن بہ دن نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے۔ قدم قدم پر ایک دوسرے سے مزاحمت پیش آتی ہے جس میں برسرِ اقتدار طبقہ اہلِ حق کو ستانے اور ان کو ذرائعِ حیات سے محروم کرنے کی ساری تدبیریں کرتا ہے۔ دونوں طرف سے شدت بڑھتی چلی جاتی ہے ایک طرف مظالم کی شدت۔ دوسری طرف یہ شدت کہ سب کچھ سہیں گے مگر اپنے عزم کو ترک نہیں کریں گے۔ جس چیز کو غلط سمجھ کر ایک بار چھوڑ چکے ہیں اس کی طرف دوبارہ واپس نہیں جائیں گے۔ یہ کش مکش بالآخر ایک ایسے نقطے پر پہنچ جاتی ہے جہاں معاشرہ حق پسندوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور یہ فیصلہ

کرتا ہے کہ ان کے وجود کو سرے سے ختم کر دیا جائے۔ اس وقت اہل حق یہ طے کرتے ہیں کہ اس بستی کو چھوڑ کر زمین کے کسی دوسرے ٹکڑے میں چلے جائیں۔ پہلے انھوں نے غلط خیالات اور حرام معاملات کو ترک کیا تھا۔ اب وہ اپنے مکان، اپنی جائیداد اپنے عزیزوں، غرض ساری متاع حیات کو چھوڑ دیتے ہیں یہ ہجرت کی آخری اور انتہائی شکل ہے۔

اس ہجرت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک مقام کو چھوڑ کر آدمی دوسرے مقام پر چلا گیا۔ بلکہ ناحق کو چھوڑ کر حق کی طرف بڑھنا ہے۔ یہ شیطان اور طاغوت کی بندشوں سے نکل کر خدا کی طرف بھاگنا ہے۔ چنانچہ قرآن و حدیث میں مومنین کی ہجرت کو "ہجرت الی اللہ" کہا گیا ہے۔ یعنی خدا کی طرف ہجرت۔ ایسا کیوں ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ لوگ زمین کو چھوڑ کر آسمان پر نہیں چلے جاتے بلکہ اسی دنیا میں رہتے ہیں، ایسا کہنے کی وجہ یہ ہے کہ چھوڑنے کا یہ عمل خدا پرستی کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔ خدا کی طرف ہجرت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جو کچھ مانع آئے، جو چیز بھی اس کی طرف بڑھنے میں رکاوٹ بنے اس کو چھوڑ دینا۔ یہ خدا پرستانہ زندگی کی بنیاد ہے جب تک آدمی اس ہجرت کے لیے تیار نہ ہو وہ ایمان کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔ اپنی زندگی کو اسلامی زندگی بنانے میں وہی کامیاب ہو سکتا ہے جو اس قربانی کے لیے تیار ہو۔ جب وہ دیکھے کہ اس کے اندر ایسے افکار اور رجحانات پرورش پا رہے ہیں جو خدا کی مرضی کے خلاف ہیں تو انھیں کھرچ کر نکال دے۔ اگر وہ غلط اعمال میں مبتلا ہو تو انھیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے۔ کسی کا تعلق دین کی طرف مکمل کر آنے میں رکاوٹ بن رہا ہو تو ایسے تعلق کو خیرباد کہہ دے۔ کسی معیار زندگی کو برقرار رکھنے کا مسئلہ دین کے کام میں اپنا حصہ ادا کرنے کا موقع نہ دیتا ہو تو ایسے معیار زندگی کو دفن کر دے۔ دین کے تقاضے پورے کرنے میں معاشی خوشحالی کو خطرہ لاحق ہو تو اس کو گوارا کر لے۔ اپنے آپ کو خدمت دین کے لیے وقف کرنے میں اپنا اور بچوں کا مستقبل تاریک نظر آتا ہو تو اس کی پرواہ کیے بغیر آگے بڑھ جائے۔ غرض ہر بار جب آدمی کسی ایسی حالت میں مبتلا ہو کہ ایک طرف خدا بلا رہا ہو اور دوسری طرف کوئی دوسرا تقاضا آدمی کو کھینچ رہا ہو تو دوسرے تقاضوں کو چھوڑ کر خدا کی طرف بڑھ جانا — اسی کا نام ہجرت الی اللہ ہے۔

اس ہجرت کے بہت سے مراحل اور اس کی بے شمار شکلیں ہیں مگر اس کی حقیقت سمجھنے کے لیے ہم اس کو دو بڑے عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک ناجائز اور حرام چیزوں کو چھوڑنا اور دوسرے ان چیزوں کو چھوڑنا جو فی نفسہ قابل اجتناب نہیں ہیں۔ مگر دین کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں ایسے مراحل آتے ہیں کہ مومن کو ان سے بھی دست بردار ہونا پڑتا ہے۔

ہجرت کی پہلی قسم میں خیالات اور اعمال کی وہ پوری فہرست آتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام اور قابل ترک قرار دیا ہے ہر آدمی کسی ماحول میں پیدا ہوتا ہے ماحول نام ہے تاریخ، روایات، عادات اور چال چلن کے ایک مخصوص ڈھانچہ کا۔ یہ افکار و اعمال کا ایک نظام ہے جو زندگی کے تمام گوشوں پر چھایا ہوا

رہتا ہے جس طرح زمین کے گولے کے گرد ہوا کا ایک غیر مرئی غلاف ہے جس میں ہم سب لوگ ڈوبے ہوئے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ہر پیدا ہونے والا اپنے وقت کے ماحول میں ڈوبا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ اسی کے اندر اس کی نشو ونما ہوتی ہے۔ ماحول کے افکار اور روایات اس کی رگ رگ میں پیوست ہو جاتے ہیں اور اکثر اوقات ان کے خلاف سوچنا اس کے لیے دشوار ہو جاتا ہے جب آدمی پر حق کا انکشاف ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس "دینِ آباء" کو چھوڑنے کا مرحلہ سامنے آتا ہے۔ اس کو ان تمام غلط اثرات کو کھرچ کر اپنے اندر سے نکال دینا ہوتا ہے جو ماحول کے اثر سے اس نے قبول کر رکھے تھے۔ پھر ہر آدمی کے اندر ایک نفس ہوتا ہے، یہ نفس فطرتاً لذتوں کو ڈھونڈتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی چیز کو پسند یا ناپسند کرنے کا معیار یہ نہیں ہے کہ وہ صحیح ہے یا غلط، اچھی ہے یا بری۔ بلکہ اس کے نزدیک پسندیدگی کا معیار صرف یہ ہے کہ وہ اسے اچھی لگتی ہے اور اس کے ذریعے سے اس کو فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ آدمی اپنی جاہلی زندگی میں بہت سی ایسی دلچسپیاں اور مشغولیتوں کو اپنے اندر جمع کر لیتا ہے جو اگرچہ غلط ہیں مگر اس کے نفس کو پسند آتے ہیں۔ اسی طرح وہ بہت سی ایسی ذمہ داریوں کو بھلا دیتا ہے اور انھیں ترک کر دیتا ہے جو اگرچہ اخلاقاً اس کے لیے ضروری ہیں، مگر اس کے نفس کو پسند نہیں آتیں۔ اس لیے جب کوئی شخص ایمان لاتا ہے تو اس کو اپنی زندگی میں شکست و ریخت کا ایک مستقل عمل جاری کرنا پڑتا ہے، بہت سی چیزیں جو اس کو پچھلی زندگی میں نہایت عزیز تھیں انھیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے، اور بہت سی چیزیں جن سے اسے نفرت تھی، جن سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی، ان کو اپنی زندگی میں شامل کرنا ہوتا ہے، اس طرح ایمان لانے کے بعد غلط جذبات، غلط تعلقات، اور غلط اعمال سے جدائی کی ایک مستقل مہم شروع ہو جاتی ہے زندگی کے تمام معاملات میں ناجائز طریقوں سے بچنے کا ایک پیہم عمل کرنا ہوتا ہے جو موت کی آخری گھڑی تک جاری رہتا ہے یہ ہجرت کی پہلی اور ابتدائی قسم ہے جو ماضی کے غلط عادات و اطوار سے اپنے کو پاک کرنے اور آئندہ اس طرح کی کوئی چیز قبول نہ کرنے کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس ہجرت کا ذکر قرآن میں سورۂ مدثر میں کیا گیا ہے جو نبوت کے بالکل ابتدائی زمانے کی سورہ ہے۔ فرمایا

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (مدثر۔ ۵) گندگی سے ہجرت کرو یعنی خیال اور عمل کی تمام برائیوں کو چھوڑ دو

یہی بات آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مندرجہ ذیل الفاظ میں واضح فرمائی ہے۔

اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ ۔ مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع کیا ہے۔

یہ ہجرت الی اللہ کا ایک پہلو ہے جس میں آدمی کو تمام ناجائز چیزیں چھوڑ دینی ہوتی ہیں۔ خدا کی مرضی کے مطابق بننے کے لیے ان چیزوں سے اپنے کو پاک کرنا ہوتا ہے جو خدا کی مرضی کے خلاف ہیں۔ اس کا دوسرا پہلو وہ ہے جس میں آدمی مجبور ہوتا ہے کہ اپنے جائز مفادات بھی خدا کی راہ میں قربان کر دے۔ ایسا اس لیے ہے کہ اسلام آدمی کو کرنے کا اتنا بڑا کام دے دیتا ہے کہ اس کے بعد پھر اسے کچھ اور کرنے کا موقع باقی نہیں رہتا۔ اس کی توجہات اپنی ذات سے ہٹ کر ہمہ تن اسلام کی طرف لگ جاتی ہیں۔ اسی

لیے کہا گیا ہے کہ دنیا کے اندر مومن کی صرف ذمہ داریاں ہیں۔ یہاں اس کا کوئی حق نہیں ہے اس کا جو کچھ حق ہے وہ خدا کے یہاں ہے اور وہیں وہ اسے پائے گا۔

اسلام کو قبول کرنے کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی زندگی میں اس کو اختیار کرلے۔ بلکہ عین اسی کے ساتھ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ دوسروں کو اس کی طرف بلائے اور پورے معاشرہ میں اس کو قائم کرنے کی جدوجہد کرے۔ دین کا یہ دوسرا تقاضا ہماری ذمہ داری کو صرف دگنا نہیں کرتا بلکہ اس کو انتہائی حد تک دشوار بنا دیتا ہے۔ اگرچہ انفرادی زندگی میں ممکن حد تک دین کو اختیار کرنا بھی کچھ آسان کام نہیں ہے۔ یہ فتنوں سے بھری ہوئی دنیا میں اپنے اختیار اور اپنے ارادہ کو صرف صحیح سمت میں استعمال کرنا ہے۔ یہ خود مختار ہو کر اپنی مرضی سے اپنے آپ کو پابند بنا لینا ہے اور موت کی آخری گھڑی تک پابند بنائے رکھنا ہے۔ مگر دین کا دوسرا تقاضا — یعنی دوسرے بندگان خدا تک خدا کے پیغام کو پہونچانا اور اس کے دین کو عملاً زمین کے اوپر رائج کرنے کی جدوجہد کرنا — یہ اتنا گراں بار تقاضا ہے کہ اس کا تصور بھی آدمی کو لرزا دینے کے لیے کافی ہے۔ یہ ایک ایسا عظیم اور جاں گسل کام ہے جو اس کی ساری قوت اور اس کا سب کچھ مانگتا ہے۔ دعوتِ حق اور اشاعتِ دین کے علاوہ کسی کام میں وہ جتنا وقت اور قوت بھی صرف کرے گا اس کے معنی یہ ہیں کہ اسی کے بقدر وہ اصل فریضہ کی ادائیگی میں کمی کر رہا ہے۔

آدمی جب اس حیثیت سے دین کو قبول کرتا ہے تو وہ فوراً محسوس کرتا ہے کہ اس کام میں اپنا حصہ ادا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ میں اور کچھ نہ کروں۔ وہ اپنے لیے اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں پاتا کہ اپنی ضرورتوں کو انتہائی حد تک مختصر کردے۔ دنیا کے اندر اپنی تمناؤں کو ہمیشہ کے لیے دفن کردے اور اپنی ذات کے لیے کم سے کم مصروف رہ کر حق کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دے۔ وہ مجبور ہوتا ہے کہ بالکل ناگزیر ضروریات کی فراہمی کے بعد جو وقت بھی ملے اس کو شہادتِ دین کی راہ میں لگا دے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام کو اپنی انفرادی زندگی میں اختیار کرنا ہو تو صرف حرام چیزوں کو چھوڑ کر بھی کوئی شخص "دیندار" بن سکتا ہے مگر اسلام کو اجتماعی زندگی میں قائم کرنے کی مہم شروع کیجیے تو آپ کو بہت سی حلال چیزوں سے بھی دستبردار ہونا پڑے گا۔ اس کے بغیر صحیح طور پر اس کام کی ابتدا بھی نہیں کی جا سکتی۔ اس کو انجام تک پہنچانا تو بہت دور کی بات ہے۔

پہلی صورت میں آدمی کے اوپر صرف اس کی اپنی ذمہ داری ہوتی ہے اور دوسری صورت میں وہ ساری خلق تک پیغامِ حق پہنچانے کا ذمہ دار بن جاتا ہے۔ یہ چیز آپ کی مصروفیتوں اور دقتوں میں بے پناہ اضافہ کردیتی ہے اس کا تقاضا ہے کہ آپ اسلام کے برحق ہونے اور اس کے سوا دوسرے تمام افکار و نظریات کے ناحق ہونے کا بے پناہ یقین پیدا کریں تاکہ آپ اس کے پرجوش مبلغ بن سکیں۔ آپ کو اسلام کا تفصیلی علم حاصل کرنا ہے تاکہ دوسروں کے سامنے اس کو واضح انداز میں پیش کرسکیں۔ آپ کو ان غلط افکار و نظریات کے خلاف دلائل فراہم

کرنے میں جنھوں نے انسانی ذہنوں کو متاثر کر رکھا ہے تاکہ باطل کو چھوڑ کر لوگوں کو حق کی طرف آنے پر آمادہ کیا جاسکے۔ آپ کو ایک ایک شخص تک پہنچنا ہے اور اس کی نفسیات، اس کے حالات اور اس کی قوتِ فہم کے مطابق اسے بات سمجھانی ہے۔ آپ کو اسلامی اخلاق کا نہایت اعلیٰ نمونہ بننا ہے تاکہ آپ کی زندگی آپ کے دعوے کی تردید کرنے والی نہ ہو بلکہ اس کی صداقت پر گواہ ہو۔ غرض فرائض کی ایک عظیم فہرست ہے جو آپ سے آپ کی پوری عمر اور آپ کا پورا اثاثہ مانگتی ہے۔ پھر ایسے فرض کو ادا کرنے کی ذمہ داری اوڑھنے کے بعد کسی دوسری چیز میں دلچسپی لینے کا موقع کہاں باقی رہتا ہے۔

یہ ہجرت کی دوسری قسم ہے یعنی دین کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اپنی ذات کے تقاضوں کو چھوڑ دینا جب دین کی ضروریات اور اپنی ضروریات میں ٹکراؤ ہو، جب دین کا کام آپ سے آپ کا پورا وقت اور آپ کی ساری صلاحیتیں مانگتا ہو۔ جب دین کا تقاضا یہ ہو کہ آپ اپنی خوشی اپنا آرام اور اپنے عزیز و اقارب تک کو چھوڑ کر اس کی طرف بڑھیں تو آپ اپنا سب کچھ اس کے لیے قربان کر دیں اور کوئی چیز بھی ایسی نہ ہو جس کا تعلق آپ کو دین کی طرف جانے میں روک بن جائے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو مندرجہ ذیل آیت میں بیان کی گئی ہے۔ مومن، مہاجر اور مجاہد فی سبیل اللہ کے بلند درجات کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ○

(توبہ — ۲۴)

اے نبی کہہ دو، اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں اور تمہاری برادری کے لوگ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تجارت جس کے ماند پڑنے کا تمہیں ڈر لگا رہتا ہے اور مکانات جو تم کو پسند ہیں اگر یہ تم کو خدا اور رسول سے زیادہ محبوب ہیں اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے مقابلہ میں تم کو ان چیزوں سے زیادہ شیفتگی ہے تو انتظار کرو، یہاں تک کہ خدا کا فیصلہ آجائے اور اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

اس آیت میں جن چیزوں کا ذکر ہے وہ سب کی سب جائز ہیں اور ان میں سے کوئی بھی فی نفسہ حرام نہیں ہے مگر مومنین سے کہا گیا ہے کہ ان سب کو چھوڑ کر خدا کی طرف بڑھیں اور جو لوگ ایسا نہ کریں وہ فاسق (یعنی عہد شکن) قرار دیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مطالبہ ہمارے پیش رو حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے کیا تھا جنھوں نے نبی آخر الزماں کے ذریعہ اپنے رب سے یہ عہد کیا تھا کہ وہ دین کو سربلند کرنے کی جدوجہد میں اپنی ساری قوت لگا دیں گے۔ جب صحابۂ کرام کے اس عہد پر بیس سال کی مدت گزر گئی اور انھوں نے مسلسل قربانیوں کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ وہ دین کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑنے کے لیے تیار ہیں تو غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد ۹ ھ میں اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں ان کی کوششوں کی قبولیت کا اعلان فرمایا۔

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ
بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ
حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ وَمَنْ
اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ
الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

(توبہ — ۱۱۱)

اللہ نے مومنین سے ان کی جانوں اور مالوں کو خرید لیا ہے
اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے وہ اللہ کی راہ میں لڑتے
رہتے ہیں، پھر مارتے رہتے ہیں اور مارے جاتے رہتے ہیں۔
یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے، تورات میں انجیل میں اور قرآن میں
اور اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے۔ پس
خوش ہو جاؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ سے کیا ہے اور
یہی بڑی کامیابی ہے۔

یہ ہجرت یا دوسرے لفظوں میں جائز مفادات کی قربانی انسان کی خداپرستی کا امتحان بھی ہے اور اسی کے ذریعہ سے خدا کا دین بھی خدا کی زمین پر قائم ہوتا ہے۔ یہ اعلاء کلمۃ اللہ کی جدوجہد کا لازمہ ہے۔ جو لوگ اس کام میں حصہ لینے کے لیے آگے بڑھیں، مگر ان کا حال یہ ہو کہ وہ دنیا میں اپنا مقام محفوظ کر لینے کے بعد آخرت کا کام کرنا چاہتے ہوں، جو اپنے معیار زندگی کو گھٹانے پر تیار نہ ہوں، جو اپنے بچوں کے مستقبل کو خطرے میں ڈالنا گوارا نہ کریں، جو دنیوی زندگی میں اپنی تمناؤں اور خواہشوں کو قربان نہ کریں، جو یہ نہ سوچیں کہ اپنی معاشی مصروفیات میں کمی کر کے دین کی خدمت کے لیے اور زیادہ وقت نکالنا چاہیے بلکہ اس کے برعکس ہمیشہ یہ سوچتے ہوں کہ کس طرح اور کوئی بڑا کام مل جائے تاکہ اپنے بڑھتے ہوئے اخراجات کو پورا کیا جا سکے۔ مختصر یہ کہ جن کے اندر اتنا حوصلہ نہ ہو کہ وہ آج کے فائدے پر کل کے فائدے کو ترجیح دے سکیں۔ ایسے لوگوں نے کبھی تاریخ میں دین کو سربلند نہیں کیا ہے اور جب تک یہ زمین و آسمان قائم ہیں آئندہ بھی ایسے لوگوں کے ہاتھوں یہ کام نہیں ہو سکتا۔

جہاد

اب جہاد کو لیجیے۔ جہاد کے معنی ہیں کسی چیز کے لیے اپنی آخری کوشش صرف کرنا۔ اتنی کوشش کرنا کہ آدمی تھک جائے۔ ہجرت کی طرح یہ جہاد بھی کسی وقتی کارروائی کا نام نہیں ہے بلکہ ایک ایسا عمل ہے جس کا تعلق ساری زندگی سے ہے۔ جہاد صرف میدان جنگ میں نہیں ہوتا بلکہ ایمان لانے کے بعد ہی سے اس کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور زندگی کے آخر لمحات تک جاری رہتا ہے۔ ایک غیر اسلامی معاشرہ میں جہاد کی مثال بالکل ویسی ہی ہے جیسی مارکس کے جدلیاتی فلسفہ میں ایک نظام کے اندر اس کے ضد کی ہوتی ہے۔ یہ ایک زبردست چیلنج ہے جو کسی نظام کے اندر اس کے ضد کی حیثیت سے ظاہر ہوتا ہے۔ جاہلی معاشرہ میں کسی کا اسلام قبول کرنا دراصل وقت کے خلاف فیصلہ کرنا ہے۔ یہ فیصلہ اگر صحیح شعور اور مکمل عزم کے ساتھ ہو تو بالکل لازمی نتیجہ کے طور پر معاشرہ کے ہر فرد اور اس کے تمام اداروں سے اس کا ٹکراؤ شروع ہو جاتا ہے۔ ایک طرف وقت کا معاشرہ ہوتا ہے جو اپنے تمام نظری اور عملی پہلوؤں کے اعتبار سے زندگی کے تمام شعبوں پر چھایا ہوا ہوتا ہے دوسری طرف یہ صاحب ایمان ہوتا ہے جو اس سے مختلف ایک اور ہی طرز زندگی کو اپنے گردوپیش کی دنیا میں دیکھنا چاہتا ہے۔ ماحول کے ساتھ اس کا یہ اختلاف اس کو ایک

ایسی تیز گیس کی مانند بنا دیتا ہے جو کسی محدود خول کے اندر بند ہو اور ہر آن اس سے نکلنے کے لیے بے قرار ہو۔ یہ کش مکش اور جدوجہد کا عمل آدمی کے اپنے نفس سے شروع ہوتا ہے اور تمدن کے مختلف گوشوں میں پھیلتا ہوا ہر اس معاملہ تک پہنچ جاتا ہے جس کا تعلق انسانی زندگی سے ہو۔ یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے اور دن بدن تیز سے تیز تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے جب یہ کش مکش اپنے آخری نقطے پر پہنچ جاتی ہے۔ باطل کا تبدٹوٹ جاتا ہے اور جاہلی نظام شکست کھا کر اسلام کے لیے جگہ خالی کر دیتا ہے۔

جہاد کی اصل حقیقت خدا کی راہ میں چلنے کے لیے اپنے آپ کو تھکانا ہے۔ قرآن میں خدا کے دین کو "نجد" کہا گیا ہے جس کے معنی بلند مقام کے ہیں اور اس دین پر عمل کرنے کو اونچائی پر چڑھنے سے تشبیہ دی گئی ہے (بلد ۱۱-۱۰) اس مثال سے ہم جہاد کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ دنیا میں زندگی گزارنے کی صرف دو راہیں ہیں۔ ایک نفس کی خواہش کے مطابق اور دوسری خدا کی مرضی کے مطابق۔ ایک غیر ذمہ دارانہ زندگی ہے اور دوسری ذمہ دارانہ زندگی۔ پہلی راہ بے حد آسان ہے اور دوسری راہ بے حد دشوار۔ پہلی صورت میں اوپر سے نیچے آنا ہوتا ہے اور دوسری صورت میں نیچے سے اوپر جانا۔ گاڑی کو ڈھلوان راستے پر چھوڑ دیجیے تو وہ خود بخود لڑھکتی چلی جائے گی۔ اس کے لیے کسی غیر معمولی کوشش کی ضرورت نہیں ہوگی۔ لیکن اگر اسی گاڑی کو کسی بلندی پر چڑھانا ہو تو مسلسل محنت کی ضرورت ہے۔ ایک تھکا دینے والی مشقت کے بغیر کوئی شخص اپنی گاڑی کو نیچے سے اوپر نہیں لے جا سکتا۔ یہی عمل جب وقت اور خواہش کے خلاف اپنی زندگی کو خدا کی طرف لے جانے کے لیے کیا جائے تو اس کو ہم جہاد کہتے ہیں۔

انسان جب یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ خدا کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرے گا، تو اس کو فوراً معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دو ایسی طاقتیں ہیں جو اس کے اس ارادہ کی راہ میں زبردست روک ہیں۔ ایک خود اس کا اپنا نفس، دوسرے طاغوت۔ نفس سے مراد انسان کا یہ جذبہ ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے لیے لذت اور آرام کو پسند کرتا ہے۔ اس کو ہمیشہ آسانی کی تلاش رہتی ہے وہ عزت اور برتری حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے بلکہ جدھر اس کا جی چاہتا ہے اس طرف نکل جاتا ہے۔ یہ جذبہ اس کو اکساتا ہے کہ ہر وہ کام کرے جس سے اس کی ان خواہشوں کو تسکین ملتی ہو اور ایسا کوئی کام نہ کرے جس سے اس کی ان خواہشوں پر ضرب پڑے۔ اور طاغوت سے مراد خارج کا وہ غلط اقتدار ہے جو ماحول کی روایات، وقت کے نظریات اور عوام الناس کی خواہشوں کی صورت میں آدمی کے اوپر دباؤ ڈالتا ہے۔ یہ طاغوت افراد کی زندگی میں متکبرانہ روش کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اجتماعی زندگی میں غیر خدائی اقتدار کی صورت میں۔ یہ خارجی قوتیں براہ راست بھی مزاحمت کرتی ہیں اور بالواسطہ بھی۔ بالواسطہ اس طرح کہ سوسائٹی پر عملاً قابض ہونے کی وجہ سے زندگی کے تمام گوشوں میں انھیں کے نظریات پھیل جاتے ہیں۔ انسان کے لیے اس کے سوا کوئی شکل نہیں ہوتی کہ ان کو مانے اور اپنے آپ کو ان سے ملوث کرے، اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور براہ راست اس لیے کہ اس طرح کے ایک ماحول میں حق پر چلنے کا ارادہ ان قوتوں

یہ چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے وہ رائج الوقت نظام کے لیے موت کی پیشین گوئی ہے۔ اس لیے جو لوگ اس قسم کا ارادہ لے کر اٹھتے ہیں وہ ان کو روکنے اور ان کو کچل دینے کے لیے اپنا پورا زور صرف کرتے ہیں اور اپنے دائرہ میں ان کو زندگی کے مواقع سے محروم کرکے رکھ دیتے ہیں۔

ان حالات میں جب کوئی شخص خدا کی طرف بڑھتا ہے تو اس کو اپنے اندر سے لے کر باہر تک خیالات سے لے کر عمل کی دنیا تک قدم قدم پر بے شمار رکاوٹوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ کہیں آرام کے مقابلہ میں تکلیف گوارا کرنا ہوتا ہے۔ کہیں ایک لذیذ رجحان کو چھوڑنے اور ایک خشک عقیدہ کو قبول کرنے کے لیے کش مکش کرنی پڑتی ہے۔ کہیں ملتے ہوئے ناجائز فائدوں کے ڈھیر کے بجائے ایک حقیر حاصل پر آمادہ ہونے کے لیے اپنے آپ سے زبردستی کرنی پڑتی ہے۔ کہیں عزت اور ناموری کے بجائے گم نامی اور ذلت پر قانع ہونے کے لیے مجاہدہ کرنا ہوتا ہے۔ کہیں اپنے جائز حقوق اور اپنے واقعی مفادات سے محرومی پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ غرض اس کے سامنے دو مختلف راہیں کھلی ہوتی ہیں اور اس کو پورا اختیار ہوتا ہے کہ جدھر چاہے چلا جائے۔ ایک طرف جانے میں دنیا کی ہر چیز ملتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور دوسری طرف جانے میں بظاہر کچھ بھی ملتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ اس کا نفس مجبور کرتا ہے کہ آسان راستہ کی طرف جائے۔ خارجی قوتیں اس مقصد کے لیے اپنا پورا وزن اس کے اوپر ڈال دیتی ہیں۔ مگر وہ ان ساری مزاحمتوں کے باوجود آسان اور پر لطف راستے کو چھوڑ دیتا ہے اور کھینچ کر اپنے کو مشکل راستہ کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی کش مکش کا نام جہاد ہے۔

جس چیز کو ہم اجتماعی انقلاب کہتے ہیں وہ بھی اسی کش مکش کا ایک قدرتی نتیجہ ہے جس کے بعد ماحول پر اسلام کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اجتماعی انقلاب برپا کرنا اسلام کا اصل مقصود ہے۔ کوئی کہتا ہے یہ مقصد نہیں بلکہ ذریعہ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک مسلسل عمل کا آخری انجام ہے۔ اسلام کے مطابق جینے اور مرنے کا ارادہ جو ابتداءً قلب کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ وہ جب عمل کی صورت اختیار کرتا ہے اور ذہن سے نکل کر ماحول میں پھیلنا شروع ہوتا ہے تو اسی پھیلاؤ کے ایک مخصوص دائرہ کو ہم اجتماعی انقلاب کہتے ہیں۔ انقلاب کو مصنوعی درخت کی طرح اگایا نہیں جا سکتا اور نہ اس کو بوریوں میں بھر کر کہیں باہر سے لایا جاتا ہے بلکہ وہ ایک عمل کے طبعی نتیجہ کے طور پر خود اپنی زمین سے ابھرتا ہے۔ جس طرح انڈے کے اندر ایک زندہ بچہ کا وجود یہ معنی رکھتا ہے کہ ایک روز اوپر کا خول ٹوٹ جائے اور جیتا جاگتا بچہ اس کے باہر آجائے۔ ٹھیک اسی طرح مخالف ماحول کے اندر ایک اسلامی گروہ کی موجودگی اس کے لیے موت کا حکم رکھتی ہے۔ اگر یہ گروہ اپنے ایمان میں مخلص ہے اور عقیدہ کو عمل کی شکل دینے کا تہیہ کر چکا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہر آن باطل کی دیوار کو متزلزل کر رہا ہے۔ ایسا ایک گروہ لازمی طور پر دیوار کو ڈھا دے گا۔ وہ اس کے اندر نہیں ٹھہر سکتا۔

جہاد ہر اس رکاوٹ سے لڑنے اور اس سے کش مکش کرنے کا نام ہے جو دین پر عمل کرنے کے سلسلے میں پیش آئے اور چونکہ یہ رکاوٹ انسان کے اندر سے بھی ہوتی ہے اور باہر سے بھی، اس لیے جہاد میں آدمی کبھی خود

اپنے نفس کے بالمقابل ہوتا ہے اور کبھی خارجی دنیا سے کش مکش کرتا ہے۔ اس کو کبھی خود اپنی خواہشوں سے لڑنا ہوتا ہے، کبھی زبان سے دوسروں کے طرزِ عمل پر گرفت کرنی ہوتی ہے اور کبھی ہاتھ کی قوت سے راہِ حق کی رکاوٹوں کو دور کرنا ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

جَاهِدُوْا اَهْوَاءَكُمْ كَمَا تُجَاهِدُوْنَ اَعْدَاءَكُمْ (مفردات امام راغب) — اپنی خواہشوں سے جہاد کرو جس طرح تم اپنے دشمنوں سے جہاد کرتے ہو۔

مگر جہاد اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے صرف کسی ظاہری عمل کا نام نہیں ہے بلکہ اس مخصوص کیفیت کا نام ہے جو کسی عمل کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہے۔ ظاہری شکلیں اسی کیفیت جہاد کو پیدا کرنے کے لیے ہیں نہ کہ خود ان ظاہری شکلوں کا نام جہاد ہے۔ ایک شخص رات دن کی کوشش سے اسلام پر ایک اعلیٰ درجہ کی کتاب لکھتا ہے۔ بظاہر یہ جہاد کی ایک شکل ہے۔ لیکن اس کا مقصد اگر یہ ہے کہ اس کتاب سے اس کی شہرت ہوگی یا اس کو مالی فوائد حاصل ہوں گے تو اس کے اس عمل کی کوئی قیمت نہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں وہ جہاد کہے جانے کا مستحق نہیں ہے۔ اس کے برعکس کوئی نیک کام کرتے ہوئے جب اس کے دل میں ایک غلط خیال گزرتا ہے اور اس تصور سے وہ کانپ اٹھتا ہے کہ اس طرح اس کا سارا کیا کرایا مٹی ہو جائے گا، اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں اور بے اختیار وہ کہہ اٹھتا ہے کہ ۔ "خدایا! مجھے شیطان کے حوالے نہ کر ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا ۔" تو یہ جہاد ہے۔

یہ بات صرف جہاد ہی سے متعلق نہیں ہے بلکہ دوسری عبادات کا بھی یہی معاملہ ہے۔ دین میں جو کام بھی کرنے کے لیے بتائے گئے ہیں وہ محض اپنی شکل کے اعتبار سے مطلوب نہیں ہیں۔ بلکہ حقیقت کے اعتبار سے مطلوب ہیں۔ جن اذکار اور دعاؤں کی فضیلت بیان کی گئی ہے جن عبادات کے ادا کرنے کو فرض قرار دیا گیا ہے، جن اخلاق و اعمال کو یہ اہمیت دی گئی ہے کہ ان کو اختیار کیے بغیر سرے سے دعوئے ایمان ہی معتبر نہیں ہوتا۔ ان سب کا مطلب دراصل یہ بتانا ہے کہ خدا پرستانہ زندگی کے مظاہر کیا ہوتے ہیں نہ یہ کہ کن مظاہر کا نام خدا پرستی ہے۔ اصل میں خدا کو جو چیز مطلوب ہے وہ یہ نہیں ہے کہ زبان سے اس کے لیے چند تعریفی کلمات کا ورد کر لیا جائے، نماز روزہ اور حج کے نام پر کچھ مخصوص عبادتی افعال انجام دیدیے جائیں۔ مال میں سے ایک مقررہ حصہ نکال کر غریبوں میں بانٹ دیا جائے۔ یا زبان و قلم کے ذریعے سے خدا کے دین کی تبلیغ کر دی جائے۔ بے شک یہی وہ اعمال ہیں جو خدا پرستانہ زندگی کے لیے لازمی پروگرام کی حیثیت رکھتے ہیں اور خدا پر ایمان جب بھی انسانی زندگی میں ظہور کرے گا وہ انھیں شکلوں میں ظہور کرے گا۔ ان کے ظاہر ہونے کا کوئی اور قالب اللہ تعالیٰ نے نہیں بنایا ہے۔ مگر ان خارجی شکلوں کے پیچھے وہ اصل چیز جو خدا کو مطلوب ہے اور جس کی موجودگی کسی آدمی کو اس بات کا مستحق بناتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جنتیں اسے حاصل ہوں، وہ دراصل دل کی یہ اندرونی کیفیت ہے کہ آدمی کے جذبات و خیالات بالکل خدا کی مرضی کے تابع ہو جائیں۔ اس کو وہی چیز پسند ہو جس کو خدا پسند کرتا ہے اور وہی چیز ناپسند ہو جس کو خدا ناپسند کرتا ہے۔ جو چیز خدا کی مرضی کے خلاف ہو اس کا وہ دشمن بن جائے اور جو چیز خدا کو محبوب ہو اس کو حاصل کرنے کے لیے وہ اپنا

آخری سرمایہ تک قربان کردے۔

قرآن کی اسی بتائی ہوئی زندگی کو پورا کرنے یا نہ کرنے پر ہمارے مستقبل کا انحصار ہے۔ ایک شخص جو اس حقیقت کو جان چکا ہو کہ اس دنیا کا ایک خدا ہے، اور پھر جو اس واقعہ پر بھی ایمان لایا ہو کہ آخرت کا ایک عظیم دن آنے والا ہے جب پوری نسل انسانی خدا کی عدالت میں کھڑی کی جائے گی۔ اس کی خواہش اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ قیامت کے اس ہولناک دن، جب وہ مالک کائنات کے سامنے کھڑا ہو تو اس کے بارہ میں اللہ تعالےٰ یہ کہہ دے کہ یہ میرا بندہ ہے جو دنیا کی زندگی میں میرا وفادار رہا۔ مگر یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ مقام کسی کو محض خواہش کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی معمولی حکومتوں کا یہ حال ہے کہ وہ کسی کو وفاداری کا سرٹیفکٹ صرف اس وقت دیتی ہیں جب کہ وہ اس کا دین، اخلاق اور ضمیر سب کچھ اس سے خرید لیتی ہیں۔ پھر خدا جو تمام حاکموں کا حاکم ہے، جو بے حد غیرت مند ہے جو اپنی خدائی میں کسی کی معمولی شرکت بھی گوارا نہیں کرتا، وہ کیا محض دل کی ایک خواہش یا زبان کی حرکت سے خوش ہو جائے گا اور کسی کو محض اس بنا پر وفاداری کا اعزاز بخش دے گا کہ وہ ایسا چاہتا ہے، خواہ اس نے اپنی وفاداری کو عملاً اس کے لیے خاص کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری تمام وفاداریوں کی طرح خدا کا وفادار بننے کی خواہش بھی ایک عظیم جدوجہد کا تقاضا کرتی ہے۔ دنیا کے اداروں میں کسی کی اہمیت صرف اس وقت تسلیم کی جاتی ہے جب وہ اپنی بہترین صلاحیتیں اس کے لیے وقف کر دے۔ ایک دکان اپنے اندر نفع کے امکانات کسی کے اوپر صرف اس وقت ظاہر کرتی ہے جب آدمی اپنا سب کچھ اسے دے دیتا ہے۔ حکومتوں کے نزدیک کوئی شخص صرف اسی وقت اعتماد اور احترام کا مستحق بنتا ہے جب وہ اپنے آپ کو پوری طرح اس کی نذر کر چکا ہو۔ ٹھیک اسی طرح اللہ تعالےٰ کے یہاں بھی وفاداری کا مقام صرف اسے حاصل ہوتا ہے جو اپنی قربانیوں کے ذریعہ اس کا استحقاق ثابت کر دے ــ شرکت نہ دنیا کے معبودوں کو پسند ہے اور نہ خدا کو۔

اس حقیقت کو سامنے رکھیے اور پھر اس دن کا تصور کیجیے جب ہم اور آپ اور تمام اگلے پچھلے پیدا ہونے والے خدا کے پاس اس حال میں جمع کیے جائیں گے کہ ایک رب العالمین کے سوا سب کی آوازیں پست ہو چکی ہوں گی۔ جس دن آدمی اپنے سوا ہر ایک کو بھول جائے گا۔ خواہ وہ اس کا دوست اور قریب ترین عزیز کیوں نہ ہو۔ جس دن صرف حق بات میں وزن ہوگا اور اس کے سوا تمام چیزیں اپنا وزن کھو چکی ہوں گی۔ جس روز آدمی حسرت کرے گا کہ کاش اس نے ساری عمر صرف آج کی تیاری میں صرف کر دی ہوتی۔ یہ فیصلہ کا دن ہوگا۔ ہمارے درمیان اور اس دن کے درمیان صرف موت کا فاصلہ ہے۔ وہ موت جس کے متعلق کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کب آجائے گی۔ آج جو لمحات ہم گزار رہے ہیں اس کے ہر لمحہ کا انجام ہم کو آئندہ کروڑوں سال تک بھگتنا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص ایک ایسے انجام کی طرف چلا جا رہا ہے جہاں اس کے لیے یا تو دائمی عیش ہے یا دائمی عذاب۔ زندگی کی مثال ایک ڈھلوان کی ہے جس پر سارے انسان نہایت تیزی کے ساتھ بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ ہر لمحہ جو گزرتا ہے وہ ہم کو اس آخری انجام سے قریب تر کر دیتا ہے جو ہم میں سے ہر ایک کے لیے مقدر ہے۔

ہم کو زندگی کے صرف چند دن حاصل ہیں۔ ایسے چند دن جن کا انجام کروڑوں اور اربوں سال نہیں بلکہ ابدالآباد تک بھگتنا پڑے گا۔ جس کا آرام بے حد خوش گوار ہے اور جس کی تکلیف بے حد دردناک۔ ہر بار جب سورج غروب ہوتا ہے تو وہ آپ کی عمر میں ایک دن اور کم کر دیتا ہے۔ اس عمر میں جس کے سوا آنے والے ہولناک دن کی تیاری کا اور کوئی موقع نہیں۔ ہماری زندگی کی مثال برف بیچنے والے دوکان دار کی ہے، جس کا اثاثہ ہر لمحہ پگھل کر کم ہوتا جا رہا ہو اور جس کی کامیابی کی شکل صرف یہ ہو کہ وہ وقت گزرنے سے پہلے اپنا سامان بیچ ڈالے ورنہ آخر میں اس کے پاس کچھ بھی نہ ہوگا اور دوکان سے اس کو خالی ہاتھ اٹھ کر جانا پڑے گا۔ پھر قبل اس کے کہ موت آ کر ہم کو اس دنیا سے جدا کر دے، جہاں صرف کرنا ہے، اور اس دنیا میں پہنچا دے جہاں کرنا نہیں بلکہ صرف پانا ہے، ہمارے لیے ضروری ہے کہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا صحیح مصرف سوچ لیں۔ ہم سب کو ایک روز مالک کائنات کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ بہت خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اپنے رب کے پاس اس حال میں پہنچیں کہ دنیا میں وہ حق کے لیے اپنا سب کچھ لٹا چکے تھے۔ کیونکہ اللہ تعالٰی سب سے پہلے انھیں پر نظر کرے گا۔

(تقریر اجتماع جماعت اسلامی ہند بمقام لکھنؤ، یکم مارچ ۱۹۵۸ء)

گلاب کی سات سو قسمیں

شمالی ہند کی سردیوں کے موسم میں گلاب کے پھول سب سے زیادہ اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ یہاں ایک عمدہ پھول ۲۰ پیسے میں مل جاتا ہے مگر اس پھول کی قیمت یورپ میں آٹھ روپیہ ہو جاتی ہے۔ یورپ کی پھول منڈیوں میں کروڑوں ڈالر کے گلاب فروخت ہوتے ہیں تاہم ہندوستان کی برآمدات میں گلاب کا کوئی حصہ نہیں۔

اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن نے ۱۹۶۹ء میں گلاب کے پھول یورپ بھیجنے کی کوشش کی تھی۔ مگر گلاب کی قیمت اسی وقت ہے جب کہ وہ اپنی فطری شادابی کی حالت میں اپنی منزل میں پہنچ جائے اس لیے کہ روانگی کا خصوصی اہتمام کرنا ہوتا ہے جس میں ہم کو کامیابی نہ ہو سکی۔ اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن کی رپورٹ میں کہا گیا ہے: "گلاب کے پھولوں کی یہ برآمد آزمائشی تھی مگر جب ہم نوآنشی، تازگی، پیکنگ اور ہوائی سفر کے مسائل کو حل کر لیں گے تو اس تجارت میں ہماری کامیابی یقینی ہے۔"

انڈین ایگریکلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے باغبانی کے شعبہ نے گلاب کی تقریباً ایک درجن قسموں کی نشاندہی کی ہے جو یورپ کی منڈیوں میں عام طور پر دوسرے ملکوں سے آتی ہیں۔ اس ادارہ نے گلاب کی پیدائش کے بعض ترقی یافتہ طریقے بھی معلوم کیے ہیں جو یورپی منڈیوں کی ضروریات کے لیے کارآمد ہو سکتے ہیں۔

گلاب کے برآمدی امکانات کو دیکھ کر دہلی کے اطراف کے تقریباً ۲۰ کسانوں نے اس کی کاشت میں دلچسپی لینا شروع کر دیا ہے۔ ڈاکر مین روز گارڈن، جس کو چنڈی گڑھ ایڈمنسٹریشن چلاتا ہے، اس نے بھی اس سلسلے میں کام شروع کیا ہے۔ مہاراج اردوا کے فارم میں ۷ ہزار گلاب کے پودے لگائے گئے ہیں۔ گلاب کا پھول قدیم زمانہ میں صرف شاعروں کے لیے مضمون بندی کا ذریعہ تھا، مگر آج وہ قیمتی زرمبادلہ حاصل کرنے کا ذریعہ بن گیا ہے۔

اسلام کا مطلب ہے اپنے آپ کو خدا کے آگے سپرد (SURRENDER) کر دینا۔ مسلمان وہ ہے جو اس بات پر یقین رکھتا ہو کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ وہ مرنے کے بعد ہر ایک سے اس کے کارنامہ زندگی کا حساب لے گا۔ اس کے بعد اپنے وفادار بندوں کے لئے دائمی جنت کا فیصلہ کرے گا، اور غیر وفادار بندوں کو دائمی جہنم میں ڈال دے گا۔ اس احساس کے تحت جو زندگی بنتی ہے، اس کو ایک لفظ میں آخرت رخی زندگی (AKHIRAT ORIENTED LIFE) کہہ سکتے ہیں۔

یہ احساس جب کسی دل میں پیدا ہو جائے تو اس کی پوری زندگی بدل جاتی ہے۔ وہ ہر وقت خدا سے ڈرنے لگتا ہے۔ کیوں کہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ خدا اس کو کھلے اور چھپے ہر حال میں دیکھ رہا ہے، بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے وہ ہمیشہ انصاف اور خیر خواہی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ ہر انسان کے پیچھے اس کا خدا کھڑا ہوا ہے۔ وہ کبھی اس بات کو نہیں بھولتا کہ بالآخر وہی چیز صحیح قرار پائے گی جس کو خدا صحیح کہے اور وہ سب کچھ غلط ٹھہرے گا جس کو خدا غلط ٹھہرائے۔

اسی کے ساتھ مسلمان کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کی اس حقیقت کو دوسری تمام قوموں تک پہنچائے۔ اس سنگین واقعہ سے لوگوں کو باخبر کرنے کے لئے پہلے انبیاء آتے تھے۔ ختم نبوت کے بعد یہ ذمہ داری نبی آخر الزماں کی امت پر ڈال دی گئی ہے، مسلمان پر جس طرح خود عمل کرنے کی ذمہ داری ہے، اسی طرح دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری ہے۔ ان میں سے کوئی ایک کام، دوسرے کام کے لئے خدا کے یہاں عذر نہیں بن سکتا۔

اسلامی مرکز کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کو دنیوی ہم کے بجائے اُخروی ہم کے طور پر سامنے لایا جائے۔ اس کا منصوبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر ان احساسات کو جگائے، اور دوسری قوموں تک حق کا پیغام پہنچانے کی تدبیریں اختیار کرے۔

اسلامی مرکز کے سامنے پہلا کام یہ ہے کہ اسلام کو وقت کے اسلوب اور زمانہ حاضر کی زبان میں لوگوں کے سامنے لایا جائے۔ تاکہ جس اسلام کو وہ تقلیدی طور پر مانتے ہیں، وہ ان کے ذہن کی غذا بن سکے، وہ ان کے اندر عمل کی حرارت پیدا کرنے لگے۔ وہ ان کی زندگی کا محض ایک ضمیمہ نہ ہو، بلکہ وہی ان کی کل زندگی بن جائے۔ ہر عہد کا ایک فکری معیار ہوتا ہے، اور کسی انسان کی زندگی میں کوئی فکر اسی وقت غالب فکر بن کر داخل ہوتا ہے جب کہ وہ اس کو اس فکری معیار پر ملے جس کے اندر وہ سانس لے رہا ہے۔

اسلامی مرکز کے سامنے دوسرا کام، مسلمانوں کو داعی گروہ کی حیثیت سے اٹھانا ہے۔ دعوت ہی واحد کام ہے جو مسلمانوں میں عمل کا حوصلہ ابھار سکتا ہے، ان کے اندر اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا کرتا ہے، ان کو خدا کی اجتماعی نصرتوں کا مستحق بناتا ہے۔ ان کو آخرت میں خدا کے گواہ کا درجہ عطا کرتا ہے جس سے بڑا کوئی درجہ انسان کے لئے نہیں۔

اسلامی مرکز انھیں دونوں مقاصد کے تحت قائم کیا گیا ہے۔ کسی قسم کی سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ مسلمانوں کو اور تمام انسانوں کو آنے والے یوم الحساب سے ہوشیار کرنے کی ایک ہم ہے۔ زندگی میں آدمی کو بے شمار مسائل نظر آتے ہیں۔ مگر موت کے بعد ایک ہی مسئلہ اس کے سامنے ہوگا۔ ہم چاہتے ہیں کہ موت سے پہلے آدمی اس مسئلہ سے آگاہ ہو جائے، موت سے پہلے وہ اس کی تیاری میں اپنے کو لگا دے۔

ہمارا پروگرام

۱ عربی، انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں میں رسائل کا اجراء جس کے ذریعہ مسلمانوں کو ان کی دعوتی ذمہ داری کی طرف متوجہ کیا جا سکے اور اسلام کو جدید اسلوب اور عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق مدلل کیا جائے۔

۲ قرآن کے ترجمے دنیا کی تمام زبانوں میں شائع کرنا اور ان کو رعایتی قیمت کے ساتھ لوگوں تک پہنچانا۔

۳ قرآنی علوم کی تدوین اور اسلامی انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت۔

۴ حدیث، سیرت، حالاتِ صحابہؓ، تاریخ اسلام (نہ کہ تاریخ فتوحات) پر سادہ، واقعاتی انداز میں کتابوں کی تیاری اور ان کو مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۵ ایسی درس گاہ کا قیام جس میں قرآن، حدیث، سیرت، تقابلِ مذہب، عربی زبان اور دوسری زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہو۔

۶ اسلامیات اور مختلف مذاہب کے مطالعہ کے لئے ایک مکمل لائبریری کا قیام۔

۷ مختلف علاقوں اور ملکوں میں تبلیغی وفود بھیجنے کا انتظام۔

۸ اسلام کے تاریخی آثار اور دستاویزات کا میوزیم قائم کرنا۔

۹ علمی طرز فکر اور حقیقت پسندانہ مزاج پیدا کرنا۔

۱۰ جدید طرز کے پریس کا قیام جہاں مختلف زبانوں میں اعلیٰ چھپائی ہو سکے۔

۱۱ ایسے ادارہ کی تشکیل جہاں تمام ضروری دینی شعبے قائم ہوں اور غیر مسلم وہاں آکر اسلام کو سمجھ سکیں۔

اسلامی مرکز کے سلسلہ میں تمام امور کے لئے براہ راست صدر سے رجوع کیا جائے

خطوط وغیرہ بر حسب ذیل پتہ تحریر کیا جائے:

مولانا وحید الدین خاں، صدر اسلامی مرکز، جمعیۃ بلڈنگ۔ قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

MAULANA WAHIDUDDIN KHAN
PRESIDENT, ISLAMI MARKAZ
JAMIAT BUILDING
QASIMJAN STREET, DELHI 6

Single Copy Rs. 2.00

[illegible]
[illegible]
NOVEMBER ۳ [illegible]

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI 6 (India)

محمد احمد پرنٹر پبلشر مسئول نے جے۔ کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ" جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع

الرسالہ

سرپرست : مولانا وحید الدین خاں

ایڈیٹر : ظفر الاسلام خاں ایم اے

چپ رہنا سیکھو، تاکہ تم فرشتوں کی سرگوشیوں کو سن سکو۔

اپنی قوتوں کو عمل میں لاؤ، تم خدا کی مدد کے مستحق ٹھہروگے۔

جس دل میں بندوں کی محبت نہ ہو، وہ خدا کی محبت سے بھی خالی ہوگا۔

لوگوں کو حقیر نہ سمجھو، ورنہ تم لوگوں کے خالق کی نظر میں حقیر ہو جاؤ گے۔

جو ارباب جاہ کی قربت ڈھونڈتا ہے، وہ خدا کی قربت سے دور ہوگا۔

کوئی شخص تم کو پتھر مارے تو اس سے لڑنے میں وقت ضائع مت کرو، بلکہ اپنے آپ کو اتنا اونچا اٹھاؤ کہ پتھر مارنے والے کا پتھر وہاں تک پہنچ ہی نہ سکے۔

جو لوگ دوسروں کی شکایت کرتے ہیں وہ صرف اس بات کا اعلان کر رہے ہیں کہ زندگی کی دوڑ میں وہ دوسروں سے پیچھے ہوگئے۔

جلد ۱ شمارہ ۲ | زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے، خصوصی تعاون: کم سے کم ایک سو ایک روپیہ | دسمبر ۱۹۷۶

تعاون فی پرچہ: دو روپیہ   بیرون ہند سے سالانہ: بیس ڈالر

ستمبر ۱۹۷۶ کی ۲۶ تاریخ تھی اور ساڑھے دس بجے کا وقت۔ عید کی نماز ختم ہو چکی تھی۔ میں جامع مسجد دہلی کی مشرقی سیڑھیوں سے ایک حیرت ناک منظر دیکھ رہا تھا۔

ایک طرف شاہجہانی مسجد اپنی تین سو سالہ عظمتوں کو لئے ہوئے کھڑی تھی۔ سامنے لال قلعہ کی اونچی دیواریں افق کو چھو رہی تھیں۔ درمیان میں ہرا بھرا پارک اور سرخ پتھروں سے بنا ہوا مینا بازار ـــــ اور پھر حد نظر تک تمام سڑکوں اور راستوں میں انسانوں کا حرکت کرتا ہوا سمندر، جو نماز عید سے فارغ ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں کو واپس جا رہا تھا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں ایک تاریخ کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ ایک زمانہ تھا کہ جامع مسجد، لال قلعہ اور مینا بازار کا یہ مجموعہ دہلی کا مرکز تھا۔ ہر قسم کی مذہبی، سماجی اور اقتصادی سرگرمیاں یہاں سے شروع ہو کر دار السلطنت میں پھیلتی تھیں اور پھر پورے ملک کو متاثر کرتی تھیں۔ مگر حالات نے دھیرے دھیرے اس کو ڈھک لیا تھا۔ حکومت نے ازسرنو اس پورے علاقے کی صفائی کرائی اور اس کی تزئین و تعمیر کر کے اس کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ ملک کی عظیم ترین تاریخ دوبارہ مسلمانوں کے نام الاٹ کر دی گئی۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ مسلمان ان ملے ہوئے مواقع کو کس طرح استعمال کرتے ہیں۔ کیا احتجاجی مشغلوں اور پرجوش تقریروں میں انھیں ضائع کر دیتے ہیں یا ان کو ایک نئی تعمیر کا عنوان بناتے ہیں۔ ہر نیا موقع بیک وقت دونوں امکان لے کر آتا ہے۔ یہ مواقع پانے والوں کے عزم و ہمت کا امتحان ہے کہ دونوں میں سے کس امکان کو وہ اپنے لئے واقعہ بناتے ہیں۔

وہ ابھی تک دستکاری کے دور میں ہیں

وہ لوگ جو اپنے کو اردو کا امین اور وارث سمجھتے ہیں، ان کے اندر ایک عجیب و غریب خصوصیت ہے جس میں شاید ساری دنیا میں کوئی ان کا ثانی نہیں۔ وہ کسی گروہ کی برائیوں کو لے لیتے ہیں اور اچھائیوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔

انھوں نے انگریزوں سے ان کی تہذیب لی، مگر ان کی سائنس نہ لی۔ نوآبادیاتی ماحول سے سیاست لی مگر تعمیر نہ لی۔ عیسائیوں سے مناظرہ بازی لی مگر مشنری اسپرٹ نہ لی۔ وغیرہ وغیرہ

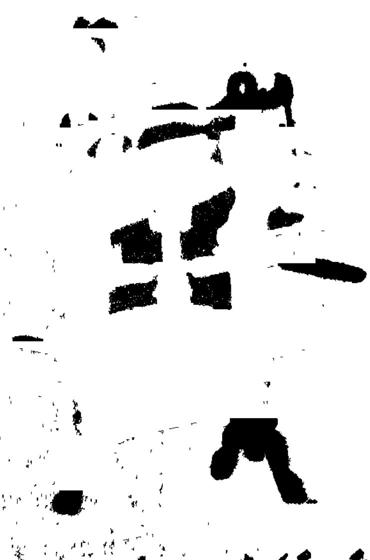
اسی سلسلے کی ایک مثال یہ ہے کہ اردو کی قوم نے ایرانیوں سے ادبی الفاظ اور شاعرانہ تخیل تو اتنی زیادہ لی کہ پوری زبان اس کے سانچے میں ڈھل گئی، مگر جدید دور میں جب ایرانیوں نے کتابت کے طریقے کو چھوڑ دیا اور اس کو آرٹ کے لئے خاص کرتے ہوئے اپنی عام چھپائی کے لئے عربی ٹائپ کو معمولی ترمیم کے ساتھ اختیار کر لیا تو اردو والوں نے اس دوسرے معاملہ میں ایران کی نقل نہ کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو آج دنیا کی تمام زبانوں میں سب سے زیادہ پس ماندہ زبان ہے۔ عربی، فارسی اور ہندی جو اردو کی جدّی زبانیں ہیں ٹائپ اختیار کر کے ترقی کر رہی ہیں، اور اردو مشینی عہد میں بھی اب تک دستکاری کے دور سے گزر رہی ہے۔ اردو کی ترقی جو اس کے رواج پر ہے کے بعد سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ابھی تک اس میں ٹائپ کا رواج نہ ہو سکا۔ ٹائپ کا

الرسالہ دسمبر ۱۹۸۶

مطلب کتابت کو مشینی ضرب دینا ہے۔ ایک ماہر کاتب کی کو جب ٹائپ میں ڈھال دیا جائے تو اتنے ہی وقت میں لاکھوں صفحے اسی خوش نمائی کے ساتھ چھپ سکتے ہیں جتنی دیر میں کاتب نے ایک صفحہ لکھا تھا۔

خوش قسمتی سے اردو کے لئے ہم کو نیا ٹائپ ایجاد کرنے کی ضرورت نہیں۔ عربی اور فارسی کا ٹائپ معمولی تبدیلی کے بعد اردو میں نہایت کامیابی کے ساتھ استعمال ہو سکتا ہے۔

عربی ٹائپ کو اردو کے لئے اختیار کرنے کا مزید



جو لوگ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں وہ [illegible] کا موضوع بن کر رہ جاتے ہیں [illegible] [illegible]

[illegible] بھی ہے کہ قرآن کا رسم الخط اور ہماری [illegible] رسم الخط دونوں ایک ہو جاتے ہیں مگر یہ دور [illegible] بھی ہمارے لئے کسی اقدام کا محرک نہ ہو گی۔

الرسالہ کے پروگراموں کا ایک جزء یہ بھی ہے کہ دہلی یا کسی دوسرے مرکزی مقام پر عربی ٹائپ کا پریس قائم کیا جائے۔ ہندوستان میں ایک اچھے عربی پریس کی شدید ضرورت ہے۔ یہ پریس نہ صرف عربی کتابوں کی طباعت کی ضرورت کو پورا کرے گا۔ بلکہ الرسالہ اور دوسری اردو کتابوں کو ٹائپ میں چھاپنے کا اہتمام بھی کرے گا۔ ہماری تمنا ہے کہ وہ دن آئے جب ادارۂ الرسالہ کی ساری چیزیں ٹائپ میں چھپ رہی ہوں۔ ہمارا یہ اقدام شاید اس دور کا آغاز بن جائے جب کہ اردو زبان کا تمام کام ٹائپ میں ہونے لگے، اور دوسری لسانی قومیتوں کی طرح ہم دستکاری کے دور سے نکل کر سائنس کے دور میں پہنچ چکے ہوں۔

اردو قوم کی ایک عجیب وغریب خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ خرید کر پڑھنا نہیں جانتی۔ ایک "رسالہ" اگر کسی کو پسند آجائے تو اگلے دن ایڈیٹر کو ایک خط ملے گا جس میں رسالہ کی تعریف کے بعد فرمائش ہوگی کہ اس کے "ادارہ" کو رسالہ اعزازی طور پر جاری کر دیا جائے۔ اس کی پسندیدگی اس کے لئے اس بات کا محرک نہیں بنے گی کہ وہ خود باقاعدہ خریدار بنے اور دوسروں کو اس کا خریدار بنائے۔ وہ اعزازی پرچے کے حصول کے لئے ایک خط لکھ دینا کافی سمجھتا ہے اور بس۔

اردو کی ترقی میں یہ دوسرا عامل بھی اتنی ہی بڑی رکاوٹ ہے جتنا کہ پہلا عامل۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۷۶

ملی تعمیر کا کام
سب سے پہلے
ملت کے افراد میں
شعور پیدا کرنے کا کام ہے
اس کی
بہترین صورت یہ ہے کہ
الرسالہ کو
ایک ایک بستی اور
ایک ایک گھر میں
پہنچایا جائے۔

پانچویں نہ بنو، ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے

ایک حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

كن عالما او متعلما او مستمعا او محبا ولا تكن الخامس فتهلك

تم علم کو جاننے والے بنو یا علم کو سیکھنے والے یا علم کو سننے والے یا علم سے محبت کرنے والے، اور پانچویں نہ بنو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔

اس حدیث میں علم سے مراد وہ علم ہے جو آدمی کو اللہ اور اللہ کی باتوں سے باخبر کرے۔ لوگوں میں کوئی پڑھا لکھا ہوتا ہے، کوئی جاہل۔ کوئی ذہین ہوتا ہے کوئی غبی۔ اس لئے آدمیوں کی مختلف حالت کے اعتبار سے آپ نے چار درجے مقرر کر دیئے۔ اور فرمایا کہ ہر حال میں تم کو ان چار درجوں میں سے کسی ایک درجہ پر ہونا چاہئے۔

یا تو تم وہ شخص بنو جس نے خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرکے دین خداوندی کو بخوبی سمجھ لیا ہو اور اس کے لئے وہ ضروری محنت و ریاضت کرلی ہو جو آدمی کو صحیح معرفت تک پہنچاتی ہے۔ اگر یہ مقام تم کو حاصل نہ ہو تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ تم اپنی اس کمی سے آگاہ ہو اور اس کو پورا کرنے کے لئے علم حقیقی کو سیکھنا شروع کر دو، قرآن و سنت کے طالب علم بن جاؤ۔ اگر تم اپنے حالات کے لحاظ سے یہ بھی نہ کر سکو تو تیسرا درجہ یہ ہے کہ تمھارے اندر اس واقعہ کا اعتراف پیدا ہو جائے کہ تم نہ صاحب علم ہو نہ طالب علم۔ ایسی حالت میں تمھارے لئے صحیح رویہ یہ ہے کہ تم سننے والے بن جاؤ۔ جہاں کہیں خدا کی باتیں ہوں، تم وہاں خاموشی سے بیٹھو اور جو کچھ بتایا جا رہا ہو اس کو غور سے سنو۔ پھر اگر کوئی اس درجہ پر بھی نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنی اس محرومی کا احساس کرے۔ اور اس احساس محرومی کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے دل میں ان لوگوں کے لئے محبت پیدا کرے جو اس متاع علم میں اپنا حصہ پائے ہوئے ہیں جس سے وہ اپنا حصہ نہ پا سکا۔ یہ چوتھا درجہ ہے جہاں دل کی طرف سے اس دنیا میں ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد جو پانچواں درجہ ہے وہ ہدایت کا نہیں بلکہ گمراہی کا درجہ ہے۔ وہ یہ کہ آدمی علم حقیقت سے باخبر نہ ہو، اس کے باوجود بحث و نزاع کرے، وہ علم دین کے بجائے کسی اور علم کا متکلم بن جائے۔ وہ سننے اور سیکھنے کے لئے ان مجالس کا انتخاب کرے جہاں دین کی باتیں نہیں ہوتیں۔ حتی کہ اس کے دل میں محبت و احترام بھی ان لوگوں کے لئے ہو جائے جو علم دین کے مالک تو نہیں ہیں البتہ دوسری قسم کی مہارتوں میں کمال رکھتے ہیں۔ انسان کی پانچویں حالت ہے۔ اللہ جن لوگوں کو اس حال پر پائے ان کو سمجھنا چاہئے کہ وہ ہلاک ہو گیا۔ الا یہ کہ وہ پہلے چار درجوں میں سے کسی ایک پر پہنچنے کی کوشش کرے۔

الرسالہ، دسمبر [illegible]

وہ سچائی کے ایک معلم کا انتظار کر رہے تھے، مگر جب سچائی کا معلم آیا تو انھوں نے اس کو نہ ماننے کے لئے طرح طرح کی دلیلیں تلاش کرلیں

۱۹۴۷ کا واقعہ ہے۔ ایک بدوی قبیلہ کے کچھ افراد شرق اردن کے علاقہ سے فلسطین کی طرف جا رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس کچھ غیر قانونی اشیاء تھیں، اس لئے انھوں نے عام گزرگاہ کو چھوڑ کر پہاڑی راستہ سے فلسطین میں داخل ہونا چاہا۔ اس سفر میں وہ بحر مردار کے شمال مغربی کنارے پہنچ گئے جس کو وادی قمران کہا جاتا ہے۔ یہاں وہ کچھ دیر آرام لینے کے لئے رکے۔ انھیں قریب کی پہاڑی میں ایک کھوہ نظر آیا۔ ان میں سے بعض افراد کھوہ کے اندر گھسے۔ حیرت انگیز طور پر انھوں نے پایا کہ کھوہ کے اندر کچھ مٹی کے برتن رکھے ہوئے ہیں۔ وہ ان کو نکال کر باہر لائے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے اندر شاید قدیم زمانہ کے سکے ہوں گے۔ مگر ان کے اندر سکوں سے بھی زیادہ قیمتی چیز تھی۔ یہ بائبل کے ابواب تھے جو قدیم طرز کے طومار میں لکھے ہوئے تھے اور ان کو حفاظت کی غرض سے ان برتنوں میں بند کر دیا گیا تھا۔

بدوؤں نے اولاً اس کو فلسطین کے ایک مسلم شیخ کے سامنے پیش کیا۔ اس نے سمجھا کہ یہ سریانی زبان کا کوئی مخطوطہ ہے۔ اس کے بعد وہ لوگ کئی آدمیوں کے پاس ہوتے ہوئے یروشلم کے ایک یہودی کے پاس پہنچے۔ یہودی نے دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ یہ عبرانی زبان میں ہے اور اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس کے بھی اجزاء کو خرید لیا۔ اس وقت سے اب تک ان کے بارے میں علماء کے درمیان زبردست بحث و تحقیق جاری



گول لپیٹے ہوئے چمڑے کے مسودات
جو برتن کے اندر رکھے ہوئے ملے ہیں۔

رہی ہے۔ یہ کام تمام تر یہودی اور مسیحی علماء نے کیا ہے مسلمانوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ متعدد ہاتھوں میں گردش کرنے کے بعد اب یہ تاریخی ذخیرہ یروشلم میں اسرائیل کے قبضہ میں ہے۔

چمڑے کے یہ طومار تعداد میں گیارہ ہیں جن میں کل سات کتابیں لکھی ہوئی ہیں۔ ان کی زبان عبرانی ہے۔ ان میں سے اکثر کتابیں مثلاً یسعیاہ، حبقوق وغیرہ موجودہ بائبل میں شامل ہیں، جو دسویں صدی عیسوی میں مرتب کی گئی تھی۔ دونوں کے متن میں بنیادی یکسانیت کے باوجود مکمل یکسانیت نہیں ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ قدیم زمانہ کے کچھ یہودی علماء نے بائبل کے متن کو محفوظ کرنے کے لئے یہ تدبیر اختیار کی تھی۔ سائنسی طریقوں سے ان کی عمر کا جو اندازہ کیا گیا ہے اس کے مطابق علماء نے ان کا زمانہ ۱۶۷ ـ ۷۰ مقرر کیا ہے۔ یہ اتنے نازک ہو چکے ہیں کہ جب ان کو کھولنے کی کوشش کی گئی تو ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

یہ طومار جن کو "ڈیڈ سی سکرولز" کہا جاتا ہے،



ثابت کرتے ہیں کہ پہلی صدی عیسوی کے یہودی ایک آنے والے نبی کے منتظر تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ موسیٰ کے بعد دو خاص نبی اور آنے والے ہیں ایک "مسیح" دوسرا "سچائی کا معلم"۔ مسیح "آخری دور میں آنے والے پیغمبر کی راہ ہموار کرے گا" اور سچائی کا معلم "بدروحوں کو ختم کرے گا، وہ آخری دنوں میں آئے گا"۔ حبقوق نامی کتاب کے مسودے میں آنے والے "سچائی کے معلم" کے سات براہ راست حوالے شمار کئے گئے ہیں۔

ڈیڈسی اسکرول پر جن علما نے تحقیقات کی ہیں ان کے لئے اب تک سب سے زیادہ مشکل مسئلہ یہ رہا ہے کہ "سچائی کا معلم" سے مراد کون ہے۔ اس سلسلے میں



مختلف نظریات قائم کئے گئے ہیں مگر ابھی تک علما کا کسی ایک رائے پر اتفاق نہ ہو سکا۔ ان کے نزدیک مسیح کو اس کا مصداق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ مسودات صاف لفظوں میں "سچائی کے معلم" کو مسیح سے الگ ایک شخصیت قرار دے رہے ہیں، دوسری کوئی مذہبی شخصیت پچھلے دو ہزار برس کے اندر، انھیں نہیں ملتی جس پر وہ عظیم اوصاف چسپاں ہوتے ہوں جو سچائی کا معلم کے لئے مسودات میں بتائے گئے ہیں۔ ان کے مطابق، آنے والا سچائی کا معلم دنیا سے بدروحوں کو ختم کرے گا، وہ خدا کی شریعت کو ہمیشہ کے لئے بگاڑ سے محفوظ کر دے گا، وہ خدا کی ابدی سچائی کا اظہار کرے گا، اس کا جلال قیامت تک ختم نہ ہوگا، وغیرہ۔ یہ الفاظ جس شخصیت پر چسپاں ہوتے ہیں وہ بلا شبہ وہی ہے جس کو کارلائل نے پیغمبروں کا "ہیرو" قرار دیا ہے، مگر انھوں نے پہلے سے فرض کر لیا ہے کہ یہ شخصیت بہر حال اس ذیل میں نہیں آتی۔

واضح ہو کہ عہد نامہ قدیم کی اکثر کتابیں آٹھویں اور تیسری صدی قبل مسیح کے درمیان قلم بند کی گئیں۔ مگر ان تمام کتابوں کے اصل مسودات ضائع ہو چکے ہیں۔

"ڈیڈسی اسکرول" کی ایک اہمیت علما کے پاس

کے مطابق یہ ہے کہ شاید ان میں سے بعض متعلقہ کتاب کا اصل ابتدائی مسودہ ہو۔

تاریخی طور پر اس سوال کا جواب ممکن نہیں کہ حضرت سلیمان کے بعد کے دور میں جب اسرائیل اور یہوداہ کی سلطنتیں برباد ہوئیں تو بائبل کے اصل مسودات کس طرح محفوظ رہے اور ان کی موجودہ نقلیں کس حد تک اصل کے مطابق ہیں۔

تیسری صدی قبل مسیح کے بعد اکثر یہودی فلسطین سے منتشر ہو کر دوسرے ملکوں میں چلے گئے۔ ان کی نسلیں عبرانی زبان بھول گئیں۔ دوسری صدی قبل مسیح میں بائبل کا یونانی ترجمہ تیار کیا گیا۔ اس ترجمہ کے بھی اب صرف نقل در نقل نسخے دنیا میں پائے جاتے ہیں۔

بعد کے دور میں بائبل کے جو قلمی نسخے رائج ہوئے ان میں بہت اختلافات تھے۔ دسویں صدی عیسوی میں کچھ یہودی علماء نے ان مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر ایک مستند متن تیار کیا۔ اسی کا نام آج عہد نامہ قدیم ہے۔

ہمارے اور آخرت کے درمیان صرف ایک غیر یقینی دیوار حائل ہے

چنالا (دھنباد) میں ایک پرانی کوئلہ کی کان تھی جو ۱۹۴۵ سے بند تھی۔ ساڑھے چار سو فٹ گہری اس کان میں دھیرے دھیرے پانی بھر گیا۔ اس سے ۰۰ فٹ کے فاصلہ پر دو سال پہلے ایک اور کان کھودی گئی۔ عالمی بنک اور بیرونی ماہرین کی مدد سے تیار کی ہوئی یہ کان جدید طرز کی مشینوں سے آراستہ تھی۔

۲۷ دسمبر ۱۹۷۵ کو اس کان میں ایک بھیانک حادثہ ہوا۔ دونوں کانوں کے درمیان ۰۰ فٹ کا فاصلہ کافی محفوظ فاصلہ سمجھا جاتا تھا۔ مگر اچانک اس کے اندر تقریباً ۶۰ فٹ چوڑا انشگاف ہو گیا اور اس کے اندر سے پرانی کان کا پانی نئی کان میں اتنی تیزی سے داخل ہوا کہ صرف تین منٹ کے اندر نئی کان بھر گئی۔ ۳۷۲ مزدور اور انجنیئر جو اس وقت کان کے اندر کام کر رہے تھے ایک سو ملین گیلن سے بھی زیادہ پانی کے سیلاب میں غرق ہو گئے۔ صرف ایک شخص بھگوان سنگھ (مونگیر) بچا جو حادثہ سے صرف چند منٹ پہلے باہر آ گیا تھا۔

یہ واقعہ حیرت انگیز طور پر ہماری زندگی کی تصویر ہے۔ ہماری موجودہ دنیا اور آخرت کی دنیا کے درمیان موت کی غیر یقینی دیوار حائل ہے۔ ہر آن یہ اندیشہ ہے کہ یہ دیوار ٹوٹ جائے اور آخرت کے حقائق ایک بے پناہ سیلاب کی طرح ہمارے اوپر پھوٹ پڑیں۔ اس وقت کوئی زور اور کوئی لفظی بازی گری کام نہ آئیگی۔ آدمی بالکل بے سہارا ہو کر اپنے مالک کے سامنے کھڑا ہوگا۔ وہ سارے لوگ ناکامی اور بربادی کے دائمی جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے جو دنیا کی دلفریبیوں میں اس قدر گم تھے کہ کوئی نصیحت کی بات سننے کے لئے تیار ہی نہ ہوتے تھے۔ صرف وہ شخص بچے گا جس نے مالک کائنات کے سامنے حساب کے لئے پیش ہونے سے پہلے خود اپنا حساب کر لیا ہوگا۔

سب سے زیادہ ہوشیار وہ شخص ہے جو اس آنے والے دن کی تیاری میں اپنے کو لگا دے۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۷۶

آپ کے پاس خدا کے فرشتے کھڑے ہوئے ہر وقت بتا رہے ہیں کہ آپ کو کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔

ایک بزرگ کو ان کے پڑوسی نے تکلیف پہنچائی۔ وہ اس سے سخت ناراض ہوگئے "اب میں نہ اس سے بات کروں گا اور نہ اس سے تعلقات رکھوں گا" انھوں نے اپنے دل میں سوچا۔ اس کے اگلے دن اتفاق سے ان کے لڑکے سے بھی ان کو ایک تکلیف پہنچی۔ وہ اس سے سخت ناراض ہوئے اور غصہ میں گھر سے باہر نکل آئے۔ رات تک ان کا غصہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ وہ سو گئے۔ اگلی صبح کو سو کر اٹھے تو انھیں محسوس ہوا کہ ان کے دل میں اپنے بچے کے لئے دوبارہ وہی محبت ہے جو پہلے تھی۔ انھوں نے اپنے لڑکے کو بلایا اور لطف و محبت کے ساتھ اس سے بات کر کے کل کے غصہ کی تلافی کی۔

"اگر میں اپنے لڑکے کا قصور معاف کر سکتا ہوں تو کیا اسی طرح میں اپنے پڑوسی کا قصور معاف نہیں کر سکتا" ان کے دل میں خیال آیا۔ اور اچانک انھیں محسوس ہوا کہ لڑکے کی غلطی کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے انھیں سبق دیا ہے۔ "اولاد جن مصلحتوں کے تحت دی جاتی ہے ان میں سے ایک مصلحت شاید یہ بھی ہے کہ انسان کو بتایا جائے کہ وہ کس طرح ایسا کر سکتا ہے کہ ایک قصوروار کا قصور معاف کر دے۔ اگر آدمی کو اولاد نہ دی جاتی تو اس اخلاقِ محبت کا عملی سبق کسی اور طرح اس کو نہیں دیا جا سکتا تھا" اس کے بعد انھوں نے اللہ سے معافی مانگی اور اپنے پڑوسی سے مل کر اس کو خوش کیا۔

اگر آدمی کے سینہ میں ضمیر زندہ ہو اور وہ خدا کے سامنے پیش ہونے سے ڈرتا ہو تو اسی طرح ہر دن وہ اپنے گرد و پیش خدا کی آواز سنتا ہے۔ وہ ہر موڑ پر دیکھ سکتا ہے کہ خدا کے فرشتے کھڑے ہوئے بتا رہے ہیں کہ اس کو کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ یہ آواز صرف ان لوگوں کو سنائی نہیں دیتی جن کے کان خدا کی آواز سننے کے لئے بہرے ہو چکے ہیں۔ وہ خدا کی آواز صرف اس وقت سنیں گے جب اسرافیل کی چنگھاڑ ان کے کان کے پردے پھاڑ دے۔

ایک بزرگ ایک شخص کے یہاں مہمان ہوئے۔ اس آدمی کے گھر سے ملی ہوئی مسجد تھی جس میں نمازی بہت کم آتے تھے۔ بزرگ نے اپنے سکون کی خاطر مسجد میں قیام کو پسند کیا۔ مسجد میں داخل ہونے کے بعد انھیں محسوس ہوا کہ عرصہ سے اس کی صفائی نہیں ہوئی ہے۔ یہ برسات کا زمانہ تھا۔ اس لئے ٹپکنے سے اور بوچھار سے مسجد کی صفیں جگہ جگہ سے بھیگ گئی تھیں اور ان میں بو بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اگلے دن سورج نکلا تو بزرگ نے ساری صفیں نکال کر باہر دھوپ میں پھیلا دیں۔ مسجد میں خوب صفائی کی۔ اس کے بعد صفوں کو سکھا کر اور جھاڑ کر اپنی جگہ دوبارہ بچھا دیا۔

بزرگ جب پہلی بار مسجد میں داخل ہوئے تھے تو اس کی حالت دیکھ کر انھیں سخت انقباض ہوا تھا۔ اب جو وہ

اس کی صاف ستھری فضا میں بیٹھے تو ان کے دل کو ایک خاص طرح کی خوشی محسوس ہوئی۔ انھوں نے دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ تعالے کا شکر ادا کیا کہ اس نے انھیں اس خدمت کی توفیق عطا فرمائی۔

عین اس وقت ان کے میزبان آگئے۔ "اس شخص سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ مسجد کی صفائی کرے" اس کو دیکھتے ہی ان کے اندر یہ احساس ابھرا "یہ دین کے اوپر لمبی لمبی تقریریں کرتا ہے۔ مگر عمل کا یہ حال ہے کہ اپنے پڑوس کے خانہ خدا کو درست نہیں کر سکتا" اس احساس نے بہت جلد ان کے لاشعور میں یہ جذبہ ڈال دیا کہ میں دین میں اس سے زیادہ ہوں۔ میری دین داری کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔"

دن گزر گیا۔ شام کو وہ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک اجنبی شخص اندر داخل ہوا۔ اس کا دبلا پتلا چہرہ اور اس کے پھٹے کپڑے بتا رہے تھے کہ وہ کوئی غریب مسافر ہے۔ بزرگ نے اس کے سلام کے جواب میں وعلیکم السلام تو کہا مگر دل میں سوچا "یہ شخص بھی کتنا بے وقت آیا ہے، اب اس کے لئے رات کے کھانے کا انتظام کرنا ہوگا۔ رات بھی شاید وہ اسی مسجد میں گزارے اور میری تنہائی میں خلل ڈالے۔" ابھی وہ اسی انقباض میں تھے کہ ان کے میزبان مسجد میں داخل ہوئے۔ مسافر کو دیکھ کر انھوں نے فوراً آگے بڑھ کر اس کو سلام کیا، اور مسکراتے ہوئے پوچھا کہاں سے آنا ہوا۔" پھر اس کے حالات معلوم ہونے کے بعد خود ہی بولے "آج آپ یہیں قیام کریں اور ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔" میزبان نے یہ ساری باتیں اس طرح کیں گویا یہ نو وارد ایک غریب مسافر نہیں، ایک نعمت ہے جو خدا نے اس وقت خصوصی طور پر ان کے لئے بھیج دی ہے۔

اس واقعہ کے بعد بزرگ نے محسوس کیا کہ ان کے دل میں نئی ہلچل پیدا ہو رہی ہے "مسجد کی صفائی کے معاملہ میں میں نے اپنے میزبان پر سبقت کی تھی۔ مگر مسافر کی خدمت کے معاملہ میں وہ مجھ سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے" انھوں نے اپنے دل میں کہا "اگر میرے اندر ایک خصوصیت ہے تو میزبان کے اندر دوسری خصوصیت ہے، اور کیا معلوم مسجد کی صفائی کے مقابلے میں غریب مسافر کی خدمت اللہ تعالے کو زیادہ پسند ہو" اس خیال کا آنا تھا کہ انھوں نے توبہ کی اور سجدہ میں گر کر اللہ سے دعا کی کہ وہ ان کو اور ان کے میزبان کو ہدایت دے اور اپنی رحمتوں میں حصہ دار بنائے۔

ہماری دنیا فتنوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں ہر وقت اندیشہ ہے کہ آدمی کسی گڑھے میں جا گرے۔ مگر اوپر کے واقعات بتاتے ہیں کہ اللہ نے یہاں بچاؤ اور اصلاح کے بھی بے شمار مواقع رکھ دیئے ہیں۔ اگر آدمی کے اندر ایمانی جذبہ زندہ ہو تو ہر فتنہ کے وقت اس کو اپنے قریب ہی ایک روشنی مل جائے گی جس سے فائدہ اٹھا کر وہ دوبارہ اپنے نجات کے راستہ کو پا سکتا ہے۔ مگر جب ایمان کی چنگاری بجھ جائے تو وہ بچاؤ کے الٰہی انتظام سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا پاتا۔ وہ ہر پھسلن پر گرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس آخری گڑھے میں پہنچ جاتا ہے جس سے پھر آدمی کو نکلنا نہیں ہے:

جو خدا سے ڈرنے والے ہیں جب ان پر شیطان کا گزر ہوتا ہے، وہ چونک جاتے ہیں پھر انھیں سوجھ آجاتی ہے اور جو شیطان کے بھائی ہیں، وہ ان کو کھینچے چلے جاتے ہیں پھر وہ کسی طرح نہیں تھمتے۔ (اعراف ۲۰۲)

مطالعہ

ڈاکٹر عبدالعلیم (۱۹۷۶ — ۱۹۰۵) نے برلن کے یہودی اور مسیحی پروفیسروں کے مشورہ سے ایک انگریزی مقالہ لکھا تھا۔ اس کا موضوع تھا "قرآن کا اعجاز"۔ یہ یہ مقالہ ۱۹۳۶ میں کتابی شکل میں شائع ہوا تھا۔

یہی وہ مقالہ ہے جس پر برلن یونیورسٹی نے موصوف کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔ اگرچہ یہ مقالہ علمی اعتبار سے اتنا ہلکا ہے کہ اس کو مقالہ کے بجائے محض ایک بیان کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔

مصنف کا کہنا ہے کہ قرآن کے اعجاز کا عقیدہ محض ایک اذعانی عقیدہ (Dogma) ہے۔ تاہم پورے مقالہ میں خود ان کے اپنے عقیدہ کے حق میں کوئی دلیل نہیں ملتی۔ مقالہ کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن محمدؐ کے اپنے مذہبی تجربات کا ایک اظہار ہے۔ ایک امی کی زبان سے طاقت ور زبان میں ایک کلام کا تیار ہونا قدیم عرب میں ایک انوکھا واقعہ تھا۔ ان حالات میں یہ بات چل پڑی کہ یہ خدائی کلام ہے اور ایسا کلام کوئی بنا نہیں سکتا۔ قرآن کے چیلنج کے جواب میں کسی نے دوسرا قرآن بنانا چاہا تو اس کو کچل دیا گیا اور اس کے بنائے ہوئے کلام کو بھی مٹا دیا گیا۔ اسود عنسی کے صرف ایک دو فقرے تاریخ میں باقی رہے۔ مسیلمہ اور ابن مقفع کی بنائی ہوئی کچھ آیتیں ملتی ہیں۔ مگر وہ اتنی معمولی ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسلمان نے خود ساختہ فقرے مذاق کے طور پر بنا کر ان کی طرف سے مشہور کر دیئے۔ قرآن کو معجزہ سمجھنے کا یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ چوتھی صدی ہجری کے آخر تک وہ جامد عقیدہ بن گیا۔ عوامی نفسیات ہے کہ بے بنیاد افواہیں وقت گزرنے کے بعد تاریخ کا جزو بن جاتی ہیں، اسی طرح یہ عقیدہ بھی تاریخ اسلامی کا جزو بن گیا۔

راقم الحروف کے لئے ناقابل فہم ہے کہ مندرجہ بالا قسم کی کوئی بات کس طرح یہ ثابت کرتی ہے کہ قرآن ایک انسانی کتاب ہے اور اس کے اس چیلنج کی کوئی حقیقت نہیں کہ اس کے جیسی کتاب کوئی نہیں بنا سکتا۔

مصنف کو اعتراف ہے کہ "ایک امی کی زبان سے غیر معمولی طور پر ایک طاقت ور کلام صادر ہوا"۔ ظاہر ہے کہ اس غیر معمولی واقعہ کی کوئی توجیہہ ہونی چاہئے۔ جب انسانی دائرہ میں اس کی کوئی توجیہہ موجود نہیں ہے تو اس کے بعد دوسرا مفروضہ یہی ہو سکتا ہے کہ یہ غیر انسانی ذہن سے نکلا ہوا کلام ہے۔ اس کے سوا کوئی اور توجیہہ ممکن ہے اور نہ مصنف نے پوری کتاب میں کہیں پیش کی ہے۔

لوگوں کا بنایا ہوا قرآن، مصنف کے دعوے کے مطابق اگر ضائع کیا گیا ہو تو یہ واقعہ بہر حال دور اقتدار میں ہوا ہوگا۔ اسلام کے اقتدار میں آنے سے پہلے ۲۰ سال تک قریش نے اور مخالف عربوں اور یہودیوں نے یہ کام کیوں نہ کیا۔ انھوں نے پیغمبر اسلام کو زیر کرنے کی تمام ممکن صورتیں اختیار کیں۔ مگر یہی ایک تدبیر نہ کی کہ قرآن کے چیلنج کے مطابق قرآن جیسا ایک کلام بنا کر پیش کر دیتے۔ حالاں کہ آپ کو زیر کرنے کا یہ سب سے آسان طریقہ تھا۔ اور بالفرض کسی وجہ سے ماضی کے نادان مخالف اس ممکن تدبیر کو اختیار نہ کر سکے تو آج عربی زبان کے بے شمار ماہرین دنیا میں موجود ہیں جو ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کی طرح قرآن کے انسانی کلام ہونے کے مدعی ہیں۔ انھیں

Dr. Abdul Aleem
Igazul Quran
Aligarh, 1936, pp. 54

کیا چیز [illegible] ہی ہے کہ وہ ایسا کلام بنا کر دنیا کے سامنے رکھ دیں۔ اس طرح [illegible] دعوے کو زیادہ بہتر طور پر ثابت کر سکیں گے۔

تاہم زیر نظر کتاب کے صفحہ ۱۸۰ پر اس کی ایک چھوٹی سی مثال موجود ہے۔ قرآن کی آیت لا یاتون بمثلہ (بنی اسرائیل - ۸۸) کے مفہوم کو مصنف نے اپنے طور پر یعجزون عنہ کے لفظوں میں لکھا ہے

عربی جاننے والوں کے لئے انھیں دونوں فقروں کا تقابل قرآن کے دعوے کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کیسی عجیب بات ہے، انسان اس ایک فقرے کے مانند بھی کوئی فقرہ وضع نہیں کر سکتا کہ "وہ ایسا قرآن بنا کر نہ لا سکیں گے"، پھر بھی اس کو اصرار ہے کہ قرآن کوئی ادبی معجزہ نہیں۔ سائنسی دور میں اس سے زیادہ غیر سائنسی موقف کی کوئی دوسری مثال نہیں ملے گی۔

وہ خوابوں کے فریب میں مبتلا ہے جو ۔ ۔ ۔

چوتھی صدی ہجری کے آخر میں جب اسپین میں طوائف الملوکی شروع ہوئی اور صوبوں کے گورنر مرکز سے بغاوت کرنے لگے تو چھوٹی چھوٹی بہت سی آزاد حکومتیں بن گئیں۔ مثلاً قرطبہ میں بنو حمود، اشبیلیہ میں بنو عباد، بطلیوس میں ابن افطس، وغیرہ۔ اشبیلیہ میں بنو عباد کی حکومت سنہ ۴۱۴ھ میں قائم ہوئی اور ۸۰ برس رہ کر ختم ہو گئی۔ شاہ مراکش یوسف بن تاشفین نے جب اسپین پر چڑھائی کی تو اس کا آخری فرماں روا معتمد بن عباد اشبیلیہ کے تخت پر تھا۔ ۴۸۴ھ میں اس نے معتمد کو گرفتار کر لیا اور اس کو مراکش کے ایک مقام اغمات میں قید کر دیا۔ چار سال قید میں رہ کر وہ ۴۸۸ھ میں مر گیا

معتمد بن عباد جس زمانہ میں قید میں تھا، عید کے دن اس کی لڑکیاں اس سے ملنے کے لئے آئیں، اس وقت اس کے غم انگیز تاثرات اشعار کی صورت میں ڈھل گئے۔ چند اشعار یہ ہیں:

فیما مضی کنت بالاعیاد مسرورا   فساءك العید فی اغمات مأسورا
تری بناتك فی الاطمار جائعة   یغزلن للناس ما یملکن قطمیرا
یطأن فی الطین والاقدام حافیة   کانها لم تطأ مسکا و کافورا
قد کان دهرك ان تامره ممتثلا   فردّك الدهر منهیا و مامورا
من بات بعدك فی ملك یُسرُّ به   فانما بات بالاحلام مغرورا

ماضی میں تو خوشی کے ساتھ عید مناتا تھا، مگر آج اغمات کے قید میں تیرے لئے عید کی کوئی خوشی نہیں۔
تو اپنی بیٹیوں کو دیکھ رہا ہے کہ وہ بھوکی ہیں، پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ وہ لوگوں کے لئے سوت کاتتی ہیں اور ان کے پاس کچھ بھی نہیں۔
وہ کیچڑ میں ننگے پاؤں چلتی ہیں، گویا کہ ان پیروں نے کبھی مشک اور کافور کو روندا ہی نہیں۔
ایک وقت وہ تھا کہ زمانہ تیرے حکم کا تابع تھا، آج زمانہ نے تجھ کو محروم و محکوم بنا دیا ہے۔
تیری اس حالت کو دیکھنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص حکومت پر خوش ہوتا ہے تو وہ خوابوں کے فریب میں مبتلا ہے۔

اور اسے ٹھیکہ مل گیا



دبئی خلیج فارس کی چھوٹی سی ریاست ہے۔ اس کی آبادی صرف دو لاکھ ہے۔ تاہم وہ تیل کی دولت سے مالامال ہے۔ دبئی کے شیخ نے منصوبہ بنایا کہ اپنے شہریوں کی رہائش کا انتظام کرنے کے لئے ۲۱۰۰ مکانات تیار کرائیں۔ ہر مکان کا تعمیری رقبہ ۲۵۰ مربع میٹر ہوگا۔

مختلف ملکوں میں اشتہار دیئے گئے۔ دنیا بھر سے تعمیری ٹھیکہ داروں نے اپنی اپنی درخواستیں بھیجیں حتی کہ ان کے نقشوں اور حسابات اور سامان تعمیر کے نمونوں سے کئی بڑے بڑے کمرے بھر گئے۔ مگر سادہ مزاج شیخ کو محسوس ہوا کہ محض نقشوں اور سامانوں کو دیکھ کر ان کے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ انھوں نے کہا کہ آپ مطلوبہ گھر کا ایک نمونہ بنا کر دکھائیں۔ تاکہ اندازہ ہو سکے کہ کس حد تک وہ ہمارے معیار کے مطابق ہے اور ہماری ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے۔

یہ شرط ٹھیکہ داروں کو منظور نہ تھی۔ وہ واپس چلے گئے۔ ان کو محسوس ہوا کہ نمونہ کا گھر بنا کر دکھانے

سے بجری [illegible] اپنی درخواست کو واپس لے لیں۔

تاہم پونا (مہاراشٹر) کا ایک ہندستانی انجینئر ہمت نہیں ہارا۔ اس نے کہا: میں آپ کی مطلوبہ شرط کو پورا کروں گا۔ اس نے شیخ کو بتایا کہ دبئی میں وہ جس قسم کے مکانات چاہتے ہیں، ویسے ہی کئی مکان اس نے مہاراشٹر میں بنائے ہیں۔ یہ مکانات بھی ایرکنڈیشنڈ ہیں۔ وہ خواہ صحرا میں کیوں نہ ہوں ان کے اندر کا درجہ حرارت باہر کی فضا سے دس درجہ سنٹی گریڈ کم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس سردیوں میں ان کا درجہ حرارت باہر کی فضا سے دس درجہ سنٹی گریڈ زیادہ۔ اس کے باوجود ان کا تعمیری خرچ عام مکانات سے تقریباً ۱۰ فی صد کم ہوگا۔

ہندستانی انجینئر مسٹر بالو راؤ جی۔ شر کے نے پیش کش کی آپ اپنے قابل اعتماد افسروں کی ایک ٹیم میرے ساتھ بھیجیے۔ وہ پونا میں چھ کارخانوں کے کنذر بنے ہوئے ہمارے مکانات کو دیکھیں۔ اس نے مزید کہا ان کا سفر خرچ ہمارے ذمہ ہوگا۔

اس پیش کش کے مطابق دبئی کے افسروں کی ایک ٹیم ہندستان آئی۔ اس نے یہاں کے مکانات کو دیکھا اور واپس جاکر شیخ کو اس کی رپورٹ پیش کی۔ ۲۲ اگست ۱۹۷۶ کو یہ ٹھیکہ ہندستانی فرم کو مل گیا۔ جس کی رقم ۷۵ کروڑ روپیے ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ظاہر حالات ہمیشہ اضافی ہوتے ہیں۔ جہاں لوگ ناامید ہو چکے ہوں، وہاں بھی امید کی ایک صورت موجود رہتی ہے۔ بشرطیکہ کوئی استعمال کرنے والا اس کو استعمال کرنا جانتا ہو۔ ناامیدی کا لفظ، بقول نپولین صرف بیوقوفوں کی ڈکشنری میں پایا جاتا ہے۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۷۶

مہابھارت سے

> موت کے بعد آدمی سورگ یا نرک میں چلا جاتا ہے
> وہ دوبارہ اس دنیا میں واپس نہیں آتا۔

" آدمی تپ اِس لوک میں کرتا ہے اور پھل دوسرے لوک میں پاتا ہے "

بن پرب، ادھیائے۔ ۹

"(مہابھارت کے) بھاری سنگرام میں جو مارے گئے، وہ کسی پرکار سے پھر نہیں آسکتے "

شانتی پرب، ادھیائے۔ ۱۷

"راجا نے چوری کی سزا دیتے ہوئے چور کے متعلق حکم دیا کہ دونوں ہاتھ کاٹ ڈالو "

شانتی پرب، ادھیائے۔ ۸

" بیاج کھانے والا اُن بھرشٹا کے سمان ہے "

شانتی پرب، ادھیائے۔ ۱۲

" پُن سے پاپ کا ناش ہوتا ہے۔
اس اسار سنسار میں رہنا کسی کو نہیں ہے۔

ایک مکالمہ میں دھرم راج نے دوسرے عالم کو دیکھ کر کہا:

" یہ دھرماتما نرک میں کیوں اور وہ پاپی دریودھن سورگ میں کیوں "

سورگ روہن پرب، ادھیائے ۲

یہ موہ سورگ کو پراپت کرنے والا نہیں

بھیشم پرب، ادھیائے ۲۔

نوٹ: مہابھارت میں صرف جنگ کا قصہ نہیں ہے بلکہ جنگ کے بعد دوسرے عالم میں کس کا انجام کیا ہوا، وہ بھی بتایا گیا ہے۔

تاج محل کو دیکھ کر

وہ مرنے والوں کی یادگاریں کھڑی کرتے رہے حالاں کہ وہ زندوں کی دنیا بھی تعمیر کر سکتے

ہر وہ شخص جس نے "تاج محل" کا نام سنا ہے، اس کے دل میں سنگ مرمر کی اس تاریخی یادگار کو دیکھنے کا چھپا ہوا شوق ضرور موجود رہتا ہے۔ ۱۶ جولائی کو میرے لئے وہ تاریخ آئی جب کہ میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ دہلی سے آگرہ کے لئے روانہ ہوا۔ تارکول کی چکنی سڑک پر ہماری گاڑی چالیس میل کی رفتار سے بھاگی چلی جارہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں ایک سنگ میل تیزی سے گزر کر بتاتا کہ اب منزل کچھ اور قریب آگئی ہے۔

شام کے تین بجے ہم آگرہ میں داخل ہوگئے "اب ہم تاج کے شہر میں آگئے ہیں"، یہ احساس میرے دل کی دھڑکنیں تیز کر رہا تھا۔ مگر شہر کی زندگی مجھے معمول کے مطابق دکھائی دی۔ لوگ اپنے اپنے کام میں اسی طرح مشغول تھے جیسے ہر شہر میں ہوا کرتے ہیں، جیسے یہ بات انھیں یاد ہی نہ ہو کہ وہ ایسے شہر میں ہیں جہاں دنیا کا



اس تصویر میں اوپر تاج محل ہے۔ اور نیچے جدید وضع کی کئی منزلہ عمارت

ایک مغربی سیاح ہندستان آیا اور ملک کی دوسری یادگاروں کے ساتھ تاج محل کو بھی اس نے خاص طور پر دیکھا۔ واپسی کے بعد اس نے اپنا جو سفرنامہ شائع کیا، اس میں لکھا تھا: "تاج محل کے دونوں طرف دو مسجدیں ہیں۔"

ظاہری مشاہدہ کے اعتبار سے اس کی بات صحیح تھی۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے صحیح نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ تاج محل کے پہلو میں صرف ایک مسجد ہے۔ مگر عمارتی توازن قائم رکھنے کے لئے یہ کیا گیا ہے کہ مسجد کے مقابل سمت میں ٹھیک اسی شکل کا ایک اور ڈھانچہ کھڑا کر دیا ہے۔ یہ دوسری عمارت مسجد نہیں ہے۔ اگرچہ بظاہر دیکھنے والے کو وہ مسجد ہی جیسی نظر آتی ہے

یہ واقعہ اس دور کی ایک یادگار ہے جب کہ عمارتوں میں توازن و تناسب کو ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اب مغربی ذوق نے اس کے برعکس طرز تعمیر کو ساری دنیا میں رواج دے دیا ہے۔

قدیم طرز تعمیر میں دو طرفہ توازن اور یکسانی عمارتی حسن کا ضروری جزء تھا۔ اب عدم توازن اور عدم یکسانیت کسی عمارت کے حسن کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ تعمیری یکسانی کی جگہ تعمیری عدم یکسانی نے لے لی ہے۔

سب سے بڑا عمارتی عجوبہ کھڑا ہوا ہے۔ تاج محل کے سامنے یہاں آنے والے زیادہ تر بیرونی سیاح تھے۔

"تاج شاید صرف ان لوگوں کے لئے تاج ہے" میں نے سوچا "جنھوں نے ابھی تاج کو نہ دیکھا ہو۔ جس نے ایک بار تاج کو دیکھ لیا ہو، اس کے لئے تاج کی کوئی اہمیت نہیں۔"

تاج محل شاہجہاں (۱۶۲۷ــ۱۶۵۸) نے بنوایا تھا یہ شاہجہاں کی بیگم ممتاز محل کا مقبرہ ہے جو ۱۵۹۲ میں پیدا ہوئی۔ شاہجہاں سے اس کا نکاح ۱۶۱۲ میں ہوا۔ چودہ بچوں کی پیدائش کے بعد ۱۶۳۱ میں اس کی وفات ہوگئی۔

تاج محل کی تعمیر ۱۶۳۱ میں شروع ہوئی اور ۱۶۵۳ میں وہ بن کر تیار ہوا۔ پہلے اس میں ممتاز محل دفن کی گئی تھی۔ اس کے بعد جب شاہجہاں کی وفات ہوئی تو اس کو بھی اس کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ دونوں کی قبریں ساتھ ساتھ ایک تہ خانہ کی سی غیر جاذب کوٹھری میں بنی ہوئی ہیں اور اس کے اوپر وہ عظیم الشان عمارت ہے جو تاج محل کے نام سے مشہور ہے۔

تاج محل کو دیکھ کر مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ ۲۲ برس میں بن کر تیار ہونے والی یہ عمارت بلاشبہ آرٹ کا ایک نمونہ ہے۔ مگر کاش وہ تعمیر اسلام کا ایک نمونہ ہوتا۔ ایک عورت کی قبر کے لئے اتنی عظیم الشان عمارت کھڑی کی گئی ہے، حالاں کہ انھیں پتھروں سے ایک عظیم علمی ادارہ بھی بنایا جاسکتا تھا۔ رشید رضا مصری ستر برس پہلے ہندستان آئے تو انھوں نے کہا تھا کہ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی سلطنت ایک ہزار برس تک رہی، مگر یہاں شاہی دور کی کوئی بڑی درس گاہ نہیں۔ مگر جن لوگوں کو قبر گاہ بنانے سے دلچسپی ہو، وہ ملت کی زندگی کے لئے درس گاہ کب تعمیر کر سکتے تھے

الرسالہ دسمبر ۱۹۷۶

شاعری

اور

تصنیف

کا فرق

ایک شاعر دو گھنٹہ تک قلم کاغذ میں مشغول رہ کر ایک "عمدہ غزل" کا خالق بن سکتا ہے مگر ایک زندہ اور مؤثر کتاب اسی وقت وجود میں آتی ہے جب کہ برسوں تک اس کے لئے علمی اور تحقیقی جدوجہد کی گئی ہو۔

ایک بہت بڑے شاعر کو میں نے ایک بار دیکھا۔ وہ ایک غزل لکھ رہے تھے۔ غزل کا آخری لفظ تھا: "انساں بنا دیا"۔ میں نے دیکھا کہ کاغذ کے کنارے انھوں نے بہت سے ہم وزن الفاظ لکھ رکھے ہیں۔ مثلاً گلستاں، چمنستاں، زنداں، خموشاں، ویراں، بہاراں وغیرہ۔ ان الفاظ کو ذہن میں رکھ کر مضامین سوچتے ہیں اور جب کوئی مضمون اس ردیف و قافیہ میں ڈھل جاتا ہے تو اس کو جلدی سے کاغذ پر لکھ لیتے ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دو گھنٹے کے بعد وہ اس پوزیشن میں تھے کہ مشاعرہ میں یہ کہہ سکیں کہ: "تازہ غزل حاضر ہے"۔

میں نے بزرگ شاعر سے کہا: آپ کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی صلاحیت دی ہے۔ آپ اردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں سے بخوبی واقف ہیں۔ آپ کو تو نثر کی چیزیں لکھنی چاہئیں۔ اس قسم کی شاعری آپ کے شایانِ شان نہیں"۔ انھوں نے جواب دیا: تم سچ کہتے ہو۔ مگر نثر میں لکھنے کے لئے مطالعہ اور تحقیق کی ضرورت ہے، اور وہ مجھ سے ہوتی نہیں۔ اگر مطالعہ اور تحقیق کے بغیر نثر لکھوں تو ایک پارۂ ادب ضرور تیار ہو جائے گا۔ مگر ایسی کوئی کتاب نہیں بن سکتی جس کی آج کی دنیا میں قدر و قیمت ہو"۔

یہ شعر کی مثال تھی۔ اب دیکھئے کہ ایک "کتاب" کس طرح لکھی جاتی ہے۔

ایک امریکی لاری کولنس (Larry Collins) اور فرانسیسی ڈامینیک لیپیری Dominique Lapierre نے مل کر ہندوستان کی آزادی پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے: "نصف شب کی آزادی"۔ اس کتاب کی تیاری میں ان کے چار سال سے زیادہ لگے۔ انھوں نے لندن کے اخبار ٹائمس میں اشتہار دیا کہ جن لوگوں نے ۱۹۴۷-۱۹۴۰ کے درمیان ہندستان میں کام کیا ہے، وہ اپنے پتے سے ہم کو مطلع کریں۔ جواب میں ان کو دو ہزار خطوط ملے۔ انھوں نے ان تمام لوگوں کے پاس اپنی ٹیم بھیج کر انٹرویو لئے اور رپورٹ تیار کی۔ انھوں نے ہندستان، پاکستان اور برطانیہ کے تین سفر کئے اور مختلف جاننے والوں سے مل کر بارہ ہزار انٹرویو تیار کئے۔ ان کی تحقیق اور دستاویزات اور انٹرویو کے کاغذات کا وزن ایک ٹن سے زیادہ تھا۔ مگر ان کے فرانس کے دفتر میں ان کو اس طرح ترتیب سے رکھا گیا تھا کہ ان کی خاتون سکریٹری کسی مخصوص کاغذ کو صرف ایک منٹ میں نکال سکتی تھی۔

اب انھوں نے کتاب لکھنا شروع کی۔ نصف حصہ کالنس نے انگریزی میں لکھا اور بقیہ نصف لیپیری نے فرانسیسی میں۔ ہر ایک دوسرے کے لکھے ہوئے کو دیکھتا، اس پر بےرحمانہ تنقید کرتا۔ جب دونوں مطمئن ہو جاتے تو آخری مسودہ کو ایک مقامی کسان کی بیوی کو پڑھنے کے لئے دیتے۔ اگر خاتون یہ کہتی کہ میں ٹھیک سے سمجھ نہ سکی تو وہ فرض کر لیتے کہ ابھی کچھ غلطی ہے اور اس حصہ کو دوبارہ لکھتے۔ آخری ایک سال انھوں نے روزانہ اٹھارہ گھنٹے کام کیا اور اس طرح اپنی کتاب تیار کی۔

مصنف نے یہ تفصیل بتاتے ہوئے انٹرویو رسے کہا:

We lived like hermits,
and we produced ---
'Freedom at Midnight'

ہم نے رہبانوں کی طرح زندگی بسر کی اور پھر ہم نے اپنی کتاب تیار کر لی ——— اب اگر "غزل" اور "کتاب" کا یہ فرق لکھنے والوں کی زندگیوں میں ظاہر ہو تو ہمیں تعجب نہ کرنا چاہئے، کیوں کہ اسباب کی دنیا میں دو مختلف عمل کبھی یکساں نتیجہ نہیں پیدا کرتے۔

پہلے وہ کہتے تھے کہ ہمارے کارخانوں کی چمنیاں جب تک دھواں اگل رہی ہیں، ہمارے لئے کوئی مسئلہ مسئلہ نہیں۔ مگر آج یہ بڑھتا ہوا دھواں ان کی زندگی کے لئے خطرہ بن گیا ہے۔

ڈوئس برگ (Duisburg) مغربی جرمنی کا ایک شہر ہے جو ملک کی لوہے کی صنعت کا مرکز ہے۔ مغربی جرمنی کی لوہے کی پیداوار کا ایک تہائی حصہ یہیں تیار ہوتا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے تک یہاں کے لوگ کہا کرتے تھے کہ ہماری چمنیاں جب تک دھواں اگل رہی ہیں ہمارے لئے کوئی مسئلہ مسئلہ نہیں۔ مگر آج اس علاقہ میں پیسہ کی بہتات کے باوجود" دھواں" عظیم ترین مسئلہ بن گیا ہے۔ کیونکہ اس نے فضائی کثافت" کا خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ ڈوئس برگ مغربی جرمنی کی دو ندیوں کے مقام اتصال پر واقع ہے اس لئے وہ ایک آئیڈیل صنعتی مقام ہے۔ کیونکہ دریاؤں کی وجہ سے نقل وحمل نہایت سستی قیمتوں پر ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس شہر کو زبردست ترقی حاصل ہوئی۔ یہاں چمنیوں کی تعداد تیزی سے بڑھتی رہی۔ مگر دھویں کے اضافہ نے یہاں کی پوری فضا کو کثیف بنا دیا۔ یہاں لوہے کے علاوہ تانبا، کوئلہ، کیمیکلس اور ہیوی انجینیرنگ کی صنعتیں قائم ہیں۔ بیشتر صنعتیں دریائے رین (Rhine) کے کنارے واقع ہیں جو شہر کے مغربی کنارے بہتا ہے۔

مغربی جرمنی کے سامنے اب یہ سوال ہے کہ کم ترقی پر راضی رہ کر اپنی زندگی کو بچائیں یا زیادہ مادی ترقی کی قیمت میں اپنے آپ کو قبل از وقت موت کے منھ میں پہنچا دیں۔ ایک افسر نے کہا:

Do we want to live longer with a Volkswagen or die earlier with a Mercedes

ہم ووکس ویگن پر قانع رہ کر زیادہ لمبی زندگی حاصل کرنا پسند کریں گے یا مرسیڈیز حاصل کرکے پہلے ہی مر جائیں گے۔ یورپ کی مادی ترقی آج خود اپنے ہی ہاتھوں شکست کھا رہی ہے۔

ڈاکٹر رینی ڈوبوز (Rene Dubos) راک فلر یونیورسٹی نیویارک میں انوائرمنٹل بایومیڈیسن (Environmental Biomedicine) کے صدر ہیں۔ انھوں نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے:

So Human an Animal

ڈاکٹر موصوف نے امریکی رسالہ لائف (۲۴ جولائی ۱۹۷۰) کے ایک مضمون میں دنیا کو تنبیہ کی ہے کہ وہ تیزی سے ایک نئے خطرہ کی طرف جا رہی ہے۔ وہ خطرہ یہ کہ نئے حالات انسان کی بہت سی خصوصیات اس سے چھین رہے ہیں۔ اگر اس نے زندگی کی نئی اہلیت اپنے اندر نہ پیدا کی تو مستقبل میں وہ کمتر درجہ کا انسان بن کر جائے گا۔

یہ خطرہ جو حیاتیاتی طبیعیات کی دنیا میں انسان کے لیے موجود ہے، وہی خطرہ اس کے لئے اخلاقی دنیا میں پیدا ہو گیا ہے۔ جدید دنیا میں انسان اپنے اخلاقی

الرسالہ دسمبر ۱۹۷۶

اوصاف کو تیزی سے کھوتا جا رہا ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو بالآخر وہ ایک قسم کا حیوان بن کر رہ جائے گا اور انسانی آبادیوں کی حیثیت ایک نئے قسم کے جنگل سے زیادہ نہ ہوگی۔

"میں یہ سنتے سنتے اکتا گیا ہوں" وہ لکھتے ہیں "کہ انسان فنا (Extinction) کے راستے پر جا رہا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں انسان ایسے خطرات سے دوچار ہے جو فنا سے بھی زیادہ ہولناک ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری ٹکنالوجی اور ہماری بے قید بڑھتی ہوئی آبادیاں نیویارک اور ٹوکیو جیسے شہروں کو غلاظت (Dirt) آلودگی (Pollution) اور شوروغل (Noise) سے بھر رہی ہیں۔ اور یہ سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔

جنگلی جانور چڑیا خانوں میں رہ سکتے ہیں۔ اس قیمت پر کہ وہ اپنی بہت سی فطری خصوصیات کھو دیں۔ اسی طرح انسان بھی اپنی ٹکنکی تہذیب کے بنائے ہوئے کثیف کٹہرہ میں رہ سکتا ہے۔ مگر ایسی حالت میں ہم اپنی انسانیت کی بہت سی چیزیں قربان کر دیں گے۔

ان کے نزدیک یہ خطرہ انسان کی صلاحیت مطابقت (Adaptabilit) میں ہے۔ فرانسیسی عالم حیاتیات لوئی پاسچر نے ۱۸۶۴ میں تجربہ سے ثابت کیا تھا کہ انسان کے ایک مجموعہ کو اگر ایک ایسے کمرہ میں بھر دیا جائے جس میں ہوا کا گزر کم ہو تو وہ دھیرے دھیرے اس سے مطابقت کر لیتے ہیں حتیٰ کہ اس احساس سے بھی خالی ہو جاتے ہیں کہ وہ کمتر ہوا میں سانس لے رہے ہیں اگرچہ اس مطابقت میں وہ اپنی صحت کا بڑا حصہ کھو دیں گے۔

پاسچر نے ایک چڑیا کو ایک ایسے پنجرے میں رہنے کا عادی بنایا جس میں ہوا بہت کم ملتی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے اس کی عادی ہو گئی۔ وہ زندہ تھی اگرچہ ایک غیر متحرک پرندہ کے طور پر۔ اس کے برعکس پاسچر نے اسی پنجرہ میں اچانک ایک اور پرندہ ڈالا تو وہ فوراً مر گیا۔



CONTINUAL EXPOSURE TO NOISE damages the physical structure of the ear. When incessant, such noise leads to mental stresses that can cause great loss of efficiency.

مشینی تمدن نے انسان کے لیے جو نئے نئے مسائل پیدا کیے ہیں، ان میں سے ایک مسئلہ "شوروغل" بھی ہے۔ تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ مسلسل شور کان کی طبعی ساخت کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اس سے دماغی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اور انسان کی کام کرنے کی طاقت گھٹ جاتی ہے۔

ڈاکٹر ہیوسن کے نزدیک آلودگی Pollution کا مسئلہ محض یہ مسئلہ نہیں ہے کہ انسان مر جائے گا بلکہ یہ کہ وہ انسانی اوصاف کھو دے گا۔ انسان کی خطرناک حالات سے مطابقت پیدا کر لینے کی صلاحیت اس کے لئے اصل مسئلہ ہے۔ اب انسان یا تو زندگی کی خصوصیات کو ترقی دے گا یا نئے تمدنی حالات میں وہ انسان سے کمتر درجہ کی ایک چیز ہو کر رہ جائے گا:

Man must improve the quality of life, or he may become something less than human

ڈاکٹر جانسی ایک (دہلی مرکز کمیٹی فور نیا یونیورسٹی) نے شور و غل کے مسئلہ کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، وہ بتاتے ہیں کہ شور و غل صرف کان ہی کو تکلیف نہیں دیتا بلکہ اس کی وجہ سے پورے جسم کا توازن درہم برہم ہو جاتا ہے۔

آواز کی کمی بیشی کو ناپنے کے لئے اس کی ایک اکائی مقرر کی گئی ہے جس کو ڈیسیبل کہتے ہیں۔ اگر بیس فیٹ کے فاصلے پر ایک ٹرک تیزی سے گزر جائے تو اس سے نوّے ڈیسیبلس آواز پیدا ہوگی۔ پانچ سو فیٹ کے فاصلے پر ریل گاڑی سیٹی بجائے تو اس سے بھی نوّے ڈیسیبلس آواز ہوگی۔ زیر زمین ریل گاڑی اگر پچاس فیٹ کے فاصلے پر گزر جائے تو اس سے جو آواز آئے گی وہ پچانوے ڈیسیبلس ہوگی۔ تعمیراتی کاموں کے سلسلے میں جہاں مختلف مشینیں استعمال کی جاتی ہیں وہاں تقریباً ایک سو دس ڈیسیبلس کے برابر شور ہوگا۔

جیٹ ہوائی جہاز جب پانچ سو فیٹ کے فاصلے پر اڑتا ہے تو ایک سو پندرہ ڈیسیبلس کے برابر شور ہوتا ہے۔

شور و غل کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جسم کے اندر پانی اور نمک کا توازن درہم برہم ہو جاتا ہے۔ دیر تک اگر شور ہوتا رہے تو اس سے مزاج میں چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے۔

ایک تاثر

دسترخوان پر ایک طرف دودھ، انڈا، سیب جیسی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف چاکلیٹ، پیسٹری اور مٹھائیاں۔ ماں کی ساری کوشش یہ تھی کہ اپنے بچہ کو دودھ، انڈا اور سیب کھلائے۔ مگر بچہ ان کو لینے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھا۔ وہ مسلسل چاکلیٹ اور مٹھائیوں پر ہاتھ مار رہا تھا۔

دنیا کا یہ عجیب قانون ہے کہ جو چیز جتنا زیادہ بے فائدہ ہو، اتنا ہی زیادہ وہ لذیذ اور خوبصورت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جو اہم اور مفید چیزیں ہیں ان میں نسبتاً کوئی ظاہری کشش نہیں ہوتی۔ شاید قدرت یہ دیکھنا چاہتی ہے کہ ہم اپنی تمیز کی قوت کو کس طرح استعمال کرتے ہیں۔

تماشے کی باتیں مثلاً شکاریات، فلمی اور جاسوسی کہانیاں، سکینڈل کے سنسنی خیز فیچر، عام انسان کے لئے اپنے اندر بے حد کشش رکھتے ہیں۔ اسی طرح جنگی داستانیں، فتوحات کے قصے، کشف و کرامت کے افسانے لوگوں کو ذہنی شراب کی طرح اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اس کے مقابلہ میں ایسے مضامین جن میں تعمیری سبق دیا گیا ہو، جو واقعات عالم کا سائنسی مطالعہ کرنا سکھاتے ہوں، جو یہ بتاتے ہوں کہ زندگی کو حقیقت پسندانہ بنیادوں پر کس طرح قائم کیا جا سکتا ہے، ان میں لوگوں کے لئے کوئی دلچسپی نہیں۔ لوگ زہر کی طرف دوڑ رہے ہیں، امرت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کے لئے بھی کسی کے پاس وقت نہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے ہی انسان بچے ہیں۔ کوئی عمر کے لحاظ سے بچہ ہے، کوئی سمجھ کے لحاظ سے۔

(ایم ایل) ایک کو کیچڑ دکھائی دیا، دوسرے کو ستارے

ڈیل کارنیگی کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے:

How to Stop Worrying and Start Living

اس کتاب میں اس نے جنگ عظیم ثانی کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔

تھامسن ایک امریکی فوجی تھا۔ اس کی ڈیوٹی کیلی فورنیا کے صحرائے موجاوی (Mojave) میں تھی۔ اس کی بیوی (Thelma Thompson) اپنے شوہر سے قریب رہنے کے لئے وہاں گئی اور قریب کی ایک بستی میں مکان لے کر رہنے لگی تھوڑے دنوں رہنے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ یہ جگہ اس کی پسند کے بالکل خلاف ہے۔ گرمی، ریت اور آندھی ہر وقت وہاں اس کا استقبال کرنے کے لئے موجود رہتے تھے۔ اس کے ساتھ تنہائی، کیونکہ اس کے شوہر کا بیشتر وقت فوجی گشت میں گزرتا تھا۔ اس کے واحد ساتھی اس کے دیہاتی پڑوسی تھے۔ مگر وہ لوگ انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے، اس لئے وہ ان سے بھی مانوس نہ ہو سکی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس جگہ کو چھوڑ دے اور اپنے گھر واپس چلی جائے اس نے اپنے والدین کو ایک مایوسانہ خط لکھا اور ان کو بتایا کہ وہ جلد ہی ان کے پاس لوٹ آنا چاہتی ہے۔

اس کے باپ کا جواب آیا۔ مگر وہ بہت مختصر تھا۔ باپ نے اپنے خط میں صرف دو سطریں لکھی تھیں:

Two men looked out from prison bars.
One saw the mud, the other saw the stars

دو آدمیوں نے قید خانہ کے جنگلے سے باہر نظر ڈالی۔ ایک کو کیچڑ دکھائی دیا۔ دوسرے کو ستارے۔

ان دو سطروں نے اس کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسی صحرائی گاؤں میں رہے گی اور یہاں اپنے لئے بہتر زندگی بنائے گی۔ اس نے محسوس کیا کہ جہاں کیچڑ ہیں، وہیں اس کے اوپر ستارے بھی چمک رہے ہیں۔ اس نے "کیچڑ" کے بجائے "ستاروں" کو دیکھنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس نے مقامی لوگوں میں اپنے دوست بنائے۔ ان کا کلچر اور زبان سیکھی۔ اس نے صحرائی زندگی کی رنگا رنگیوں کو سمجھا۔ اس نے صحرا میں ڈوبتے اور نکلتے ہوئے سورج کے حسن کا مشاہدہ کیا۔ دھیرے دھیرے اس کو اس علاقہ سے اتنی دلچسپی ہو گئی کہ اس کا شوہر جب اپنی فوجی ملازمت سے ریٹائر ہوا تو دونوں نے طے کیا کہ وہ اپنی آئندہ زندگی اسی مقام پر گزاریں گے حتی کہ اس نئے تجربہ نے مسز تھامسن کو ایک مصنف بنا دیا۔ اس نے اپنے تجربات کے متعلق ایک کتاب (Bright Ramparts) کے نام سے لکھی جو بے حد مقبول ہوئی اور اس کے کثیر ایڈیشن شائع ہوئے۔

اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک مصنف نے لکھا ہے:

The most important thing about suffering is
not what happens to us but how we react to it.

زیادہ اہم بات یہ نہیں ہے کہ ہمیں کن مشکلوں سے سابقہ پیش آرہا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم ان کے مقابلہ میں کس قسم کا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۷۶

ڈارون (۱۸۸۲—۱۸۰۹) کو یقین تھا کہ زندگی ایک ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے۔ کیڑے مکوڑے اپنے فضا میں ترقیاتی تبدیلیاں کرتے کرتے بکری بن گئے اور بکری نے ترقی کر کے زرافہ کی صورت اختیار کرلی۔ پچھلے سو برس کے دوران یہ ایک مسلمہ سائنسی عقیدہ بن گیا تھا۔ مگر حالیہ مطالعہ نے اس عقیدہ کو علمی حیثیت سے متزلزل کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر معلوم ہوا ہے کہ زمین کی عمر اس اندازہ سے بہت کم ہے جو ارتقائی طور پر زندگی کی انواع کو وجود میں لانے کے لئے ضروری ہے۔

اب علمائے حیاتیات کا قیاس یہ ہو رہا ہے کہ زمین سے باہر کائنات کے کسی مقام پر انسان جیسی تہذیب موجود ہے اور اس نے بالقصد زندگی کا جرثومہ اوپر سے زمین پر بھیجا ہے۔ مگر یہاں بھی ایک رکاوٹ درپیش ہے۔ کائناتی وقت اتنا کافی نہیں کہ اس کے اندر دو تہذیبیں ایک کے بعد ایک ترقی کر سکیں۔ ایک زمین پر، دوسری کسی اور سیارہ میں۔ گویا انسانی علم وہاں پہنچ گیا ہے جہاں اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ ایک قادر مطلق کے وجود کو تسلیم کرلے۔

ارتقاء کا مفروضہ قافلہ کائنات کی معلوم شاہراہوں میں اپنا راستہ نہ پاسکا



زمین پر زندگی کیسے شروع ہوئی، اس کے بارے میں حال ہی میں ایک چونکا دینے والا نظریہ سامنے آیا ہے۔ اس نظریہ کو پیش کرنے والے دو ممتاز مالیکیولر بیالوجسٹ ہیں۔ ایک، نوبل انعام یافتہ فرانسس کریک (Francis Crick) دوسرے لزلی آرگل (Leslie Orgel) اس نظریہ کے مطابق زمین پر زندگی کا آغاز نہ تو خود بخود ہوا اور نہ اس طرح کہ کچھ ملین سال پہلے ایک ابتدائی مادہ سے ایک جسم حیوانی (Organism) بنا اور اس سے تدریجی ارتقا کے ذریعے زندگی کی انواع وجود میں آئیں۔ بلکہ زندگی ایک ایسے تجربے کا نتیجہ تھی جو کچھ غیر ارضی ہستیوں (Extra- erccsrial Beings) نے کئی جگ پہلے منظم کیا تھا۔

کریک اور آرگل، یہ فرض کرتے ہوئے کہ ہمارے کہکشانی نظام کے دوسرے سیاروں میں ترقی یافتہ تہذیبیں موجود ہیں، یہ خیال کرتے ہیں کہ اسی قسم کے کسی سیارہ کے باشندوں نے کچھ ہزار ملین سال پہلے طے کیا کہ وہ اس بات کا تجربہ کریں کہ کیا ان کے پڑوسی سیاروں میں زندگی اپنے لئے نیا ماحول پیدا کر سکتی ہے چنانچہ انھوں نے ہماری کہکشاں کے کچھ سیاروں پر زندگی کے جراثیم ڈالے۔ اسی قدیم تجربہ کا نتیجہ ہماری موجودہ تہذیب ہے۔

انیسویں صدی میں ڈارون کے نظریہ کے بعد اہل مذاہب کا مخصوص تخلیق کا نظریہ علمائے سائنس کے درمیان ختم ہوگیا تھا۔ اس کے بعد سائنس داں اس سوال کا جواب معلوم کرنے میں سرگرداں تھے کہ زندگی شروع کس طرح ہوئی۔ اس بحث کے دوران سویڈن کے کیمسٹ ارہینیس (Arrhenius) نے انیسویں صدی کے آخر میں یہ تخیل پیش کیا کہ کچھ بیکٹیریائی اجزاء جو کسی ایسے سیارہ سے جہاں پہلے سے زندگی موجود تھی، زمین پر آگئے اور پھر تدریجی ارتقاء کے ذریعہ اقسام حیات کو وجود میں لانے کا سبب بنے۔ ارہینیس نے اس طریق عمل کو "پینس پرمیا" کا نام دیا۔ اس نظریہ کو اس تنقید کا سامنا کرنا پڑا کہ بیکٹیریا بین سیاراتی سفر میں خطرناک ریڈایشن کے مقابلہ میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ لارڈ کلون (Kelvin) نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا "ہو سکتا ہے کہ بیکٹیریا کسی شہابیے سے چپک گیا ہو اور اس پر سوار ہو کر زمین پر آیا ہو"

اگرچہ یہ ممکن ہے کہ بیکٹیریائی اجزاء شہابیے پر سوار ہو کر بین سیاراتی سفر کریں، تاہم پینس پرمیا کا نظریہ کبھی سائنس دانوں کے لئے قابل قبول نہ ہو سکا تھا۔ اس نظریہ کا اساسی مقدمہ یہ ہے کہ زندگی اس سے پہلے کہیں موجود تھی، جب کہ اس نظریہ میں اس کا جواب نہیں ملتا کہ دوسرے سیارہ پر زندگی کیسے وجود میں آئی۔

کریک اور آرگل، یہ مانتے ہوئے کہ بیکٹیریائی اجزاء کی اتفاقی ہجرت ناممکن ہے، کہتے ہیں کہ اس وقت یہ قابل قیاس ہو جاتا ہے جب کہ یہ مانا جائے کہ بالقصد کسی نے زندگی کے جراثیم کو زمین پر بھیجا ہو۔ وہ اس عمل کو معین پینس پرمیا (Directed Panspermia) کا نام دیتے ہیں۔

اس نئے نظریہ کے ثبوت میں کریک اور آرگل دو حیاتیاتی مسئلوں کا حوالہ دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک جینٹک کوڈ ہے۔ ہر ایک موجودہ زمانہ میں تسلیم کرتا ہے کہ زمین پر زندگی کی تمام قسموں کے لئے صرف ایک کوڈ ہے

زندہ جسم اگر محض طبیعی اور کیمیاوی قوتوں کے باہمی عمل سے بن گیا ہو تو اس کی ترکیب میں عناصر کا وہی تناسب پایا جانا چاہئے جو ہماری دنیا کے اندر موجود ہے۔ مگر زندہ جسم میں زمینی اجزار کا انعکاس نہ ہونا ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک ایسی چیز ہے جس کو کسی بنانے والے نے بالقصد ایک خاص شکل میں بنایا ہے، نہ کہ وہ محض اندھے عمل کا اتفاقی نتیجہ ہے۔

کوئی حیاتیاتی عالم اس عالمگیریت کی توجیہہ نہیں کر سکتا کہ سب کے لئے ایک ہی کوڈ کیوں ہے۔ آرگل اور کریک کہتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ حیات کا ایک ہی بیج تھا، جس سے زندگی شروع ہوئی، اس لئے فطری طور پر اس بیج کا جینٹک کوڈ، جو کئی جگ پہلے کسی دوسرے سیارے کے باشندوں نے زمین پر بھیجا تھا اپنا اعادہ ایک ہی جینٹک کوڈ کی شکل میں کرتا رہا۔

دوسری چیز مولب ڈینم (Molybdenum) نامی دھات کا وہ رول ہے جو حیاتیاتی نظام میں پایا جاتا ہے۔ اکثر انزائم سسٹم اپنی کارکردگی کے لئے اس کے اور صرف اس کے محتاج ہوتے ہیں۔ مولب ڈینم اتنا غیر معمولی طور پر اہم ہونے کے باوجود زمین میں پائی جانے والی کل دھاتوں کا صرف ۰۲ء۰ فی صد (دس ہزار میں دو) ہے۔ دوسری طرف بعض زیادہ مقدار میں پائی جانے والی دھاتیں مثلاً کرومیم اور نکل، جو کہ اپنی خاصیت میں مولب ڈینم سے بہت مشابہ ہوتی ہیں اور زمینی دھاتوں کا ۲ء۰ فی صد اور ۱۶ء۳ فی صد ہیں، حیاتیاتی نظام میں بالکل ہی کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ کریک اور آرگل کہتے ہیں کہ زمین کی جو کیمیائی ترکیب ہے وہ زمین پر وجود میں آنے والی زندگیوں کی بناوٹ میں منعکس ہونی چاہئے تھی۔ اور چونکہ ایسا نہیں ہے اس لئے ماننا پڑے گا کہ زندگی کچھ ملین سال پہلے زمین پر باہر سے بھیجی گئی۔

اگر معیّن پینس پرمیا کا نظریہ مان لیا جائے تو اس سے دو سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ (۱) کیا کائناتی وقت اتنا کافی ہے کہ اس کے اندر دو تہذیبیں ایک کے بعد ایک ترقی کر سکیں، ایک زمین پر اور دوسری کسی اور سیارہ میں (۲) کیا حیاتیاتی جرثومہ بین سیاراتی فاصلوں کو عبور کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ زندہ حالت میں پہنچایا جا سکتا ہے۔

کریک اور آرگل کا خیال ہے کہ ان کا نظریہ قبولیت حاصل کرے گا، اگر یہ ثابت ہو سکے کہ وہ عناصر جو زمینی زندگی کے اجزائے ترکیبی ہیں، وہ وہی ہیں جو بعض قسم کے ستاروں میں، ان کے قیاس کے مطابق کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

دو کردار — خوشی اور خفگی دونوں میں وہ انصاف پر قائم رہتے تھے

یرموک کی لڑائی میں خالد بن ولید (م ۶۴۲ء) اسلامی فوجوں کے سپہ سالار تھے اور ابوعبیدہ بن الجراح ان کے ماتحت افسر کی حیثیت سے جنگ میں شریک تھے۔ حضرت عمر خلیفہ ہوئے تو انھوں نے خالد بن ولید کو معزول کر کے ابوعبیدہ بن الجراح کو سپہ سالار مقرر کر دیا اور خالد بن ولید کو ان کے ماتحت کر دیا۔ یہ فرمان لے کر مدینہ سے جو شخص روانہ ہوا تھا، وہ مقام جنگ پر اس وقت پہنچا جبکہ طویل مقابلہ کے بعد لڑائی اپنے آخری انجام کو پہنچنے والی تھی اور فتح کے مقدمات ظاہر ہو چکے تھے۔ قاصد نے یہ فرمان اولاً ابوعبیدہ بن الجراح کو دیا۔ ابوعبیدہ فرمان خلافت کے مطابق فوراً سپہ سالاری کا جھنڈا اپنے ہاتھ میں لے کر فتح کا کریڈٹ وصول کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ خالد بن ولید کی ماتحتی میں بدستور لڑتے رہے:

فاخفى ابو عبيدة الخبر وصادق مكانه خلف خالد حتى ظهرت مقدمات النصر. وقد سئل عن عدم اخذه بلواء القيادة على الفور فقال: ما سلطان الدنيا اريد وما للدنيا اعمل

ابوعبیدہ نے خبر کو چھپایا اور خالد کی ماتحتی میں بدستور اپنے کو باقی رکھا یہاں تک کہ فتح کے مقدمات ظاہر ہو گئے۔ ان سے پوچھا گیا کہ قیادت کا جھنڈا آپ نے فوراً کیوں نہ لے لیا۔ فرمایا: میں دنیا کی بڑائی نہیں چاہتا اور نہ دنیا کے لئے عمل کرتا ہوں۔

آخرت کے لحاظ سے کریڈٹ یہ تھا کہ خبر کو چھپایا جائے۔ دنیا کا کریڈٹ اس میں ملتا تھا کہ اس کو ظاہر کر دیا جائے۔ ابوعبیدہ نے آخرت کا کریڈٹ لینا پسند کیا اور دنیا کے کریڈٹ کو نظر انداز کر دیا۔

اب خالد بن ولید کے کردار کو دیکھئے۔ یرموک کی فتح کے بعد جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ اس عظیم جنگ کے فاتح (خالد بن ولید) کو سپہ سالاری سے معزول کر دیا گیا ہے تو ان کے اندر سخت بے چینی پیدا ہو گئی۔ بہت سے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے، انھوں نے حضرت خالد کی بہادری اور جواں مردی پر تقریریں کیں اور ان کی معزولی پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ ان کو ابھارا کہ وہ خلیفہ کا حکم ماننے سے انکار کر دیں اور وعدہ کیا کہ ہم سب لوگ آپ کا ساتھ دیں گے (يحرضونه على عصيان امر الخليفة ويعدونه بانهم سيكونون معه) مگر خالد بن ولید نے اس قسم کے مشورہ کو ماننے سے قطعی انکار کر دیا اور اس پر راضی ہو گئے کہ ابوعبیدہ بن الجراح کی ماتحتی میں ایک معمولی فوجی بن کر اسلام دشمن طاقتوں کے خلاف لڑتے رہیں۔ اس وقت انھوں نے جو جملہ کہا وہ تاریخ نے ان الفاظ میں محفوظ رکھا ہے:

انا لا اقاتل فى سبيل عمر ولكن فى سبيل رب عمر

میں عمر کی راہ میں جنگ نہیں کرتا، بلکہ عمر کے رب کی راہ میں جنگ کرتا ہوں۔

اس تقسیم کار کا ایک فائدہ یہ بھی ہے

اسلام میں عورت اور مرد کے دائرہ عمل کو الگ الگ رکھا گیا ہے۔ عورت گھر کے لئے اور مرد باہر کے لئے۔ یہ تقسیم نہ صرف اس لئے صحیح ہے کہ حیاتیاتی اور عضویاتی اعتبار سے دونوں صنفوں میں فرق ہے۔ بلکہ اس میں بہت سے اجتماعی فائدے بھی ہیں۔ ان میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ اس تقسیم کے ذریعہ دونوں کو ایسے قابل اعتماد ساتھی مل جاتے ہیں جو ایک دوسرے کے لئے بہترین مشیر بن سکیں۔

خاندان، نسل انسانی کی اکائی ہے اور معاشرہ اس کا مجموعہ۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر انتہائی اہمیت رکھتے ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ زندگی کے ان دونوں میدانوں میں بار بار ایسے گمبھیر مسائل آتے ہیں جن میں وہ شخص بے لاگ رائے قائم نہیں کر پاتا جو خود مسئلہ کے اندر گھرا ہوا ہو۔ ایسے وقت میں ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی کے پاس ایک ایسا مشیر ہو جو خود مسئلہ سے متعلق نہ ہو تاکہ اس کی بابت غیر متاثر ذہن کے ساتھ رائے قائم کر سکے۔

عورت اور مرد کے درمیان تقسیم عمل سے یہ فائدہ بہترین طور پر حاصل ہو جاتا ہے۔ عورت اپنے شعبہ میں مصروف ہوتی ہے اور مرد اپنے شعبہ میں۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے کے معاملات سے براہ راست طور پر غیر متعلق ہو جاتے ہیں۔ ہر فریق اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ دوسرے فریق کے معاملہ میں غیر متاثر ذہن کے ساتھ سوچے اور اپنے بے لاگ مشوروں سے اس کی مدد کر سکے۔

اس بات کی وضاحت کے لئے یہاں عورت کی زندگی سے چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر جب غار حرا میں پہلی وحی اتری تو آپ کانپتے ہوئے اپنے گھر تشریف لائے اور فرمایا کہ مجھے کمبل اڑھا دو۔ گھر والوں نے آپ کو کمبل اڑھا دیا۔ کچھ دیر کے بعد جب آپ کی دہشت کم ہوئی تو آپ نے اپنی اہلیہ خدیجہ بنت خویلد سے وہ پورا قصہ بیان کیا جو غار حرا کی تنہائی میں آپ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ آپ نے فرمایا یہ واقعہ اتنا سخت تھا کہ مجھے اپنی جان کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ خدیجہؓ کے اس وقت کے الفاظ جو تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں وہ ایک رفیقہ حیات کے کردار کی نہایت اعلیٰ مثال ہیں۔ انھوں نے کہا:

کلا واللہ ما یخزیک اللہ ابدا، انک لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق	ہرگز نہیں، خدا کی قسم، اللہ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا آپ رشتہ داروں کے حقوق ادا کرتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ گم نام لوگوں کو کماتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کے معاملہ میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔

۲۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قریش مکہ سے وہ معاہدہ کیا جو معاہدہ حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے تو صحابہ

میں سخت بے چینی پھیل گئی۔ کیونکہ یہ معاہدہ بظاہر دب کر کیا گیا تھا اور اس میں کئی باتیں صریح طور پر مخالفین کے حق میں تھیں۔ لوگوں میں اس قدر غم و غصہ تھا کہ معاہدہ کی تکمیل کے بعد جب آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ قربانی کے جانور جو تم اپنے ساتھ لائے ہو، انہیں ذبح کر دو اور سر منڈا لو۔ تو ایک شخص بھی اس کے لئے نہ اٹھا۔ آپ نے تین بار اپنے حکم کو دہرایا پھر بھی سب لوگ خاموش رہے اور کوئی اپنی جگہ سے نہ اٹھا۔ آپ رنج کی حالت میں وہاں سے لوٹ کر اپنے خیمہ میں گئے جہاں آپ کی اہلیہ ام سلمہؓ موجود تھیں۔ انھوں نے آپ کو غمگین دیکھ کر پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ آج وہ ہوا جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے مسلمانوں کو حکم دیا مگر ان میں سے کوئی بھی میرے حکم کی تعمیل کے لئے نہ اٹھا۔ ام سلمہؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول، اگر آپ کی رائے یہی ہے تو آپ میدان میں تشریف لے جائیں اور کسی سے کچھ کہے بغیر اپنا قربانی کا جانور ذبح کریں اور سر منڈالیں۔ آپ خیمہ سے باہر نکلے اور کسی سے کچھ کہے بغیر اپنی قربانی ذبح کی اور نائی کو بلا کر سر منڈایا۔ جب صحابہ نے یہ دیکھا تو سب نے اٹھ کر اپنی اپنی قربانیاں ذبح کر دیں۔ اگرچہ ان کے رنج و غم کا عالم یہ تھا کہ جب وہ ایک دوسرے کا سر مونڈنے لگے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک دوسرے کو کاٹ ڈالیں گے۔

خدیجہؓ اور ام سلمہؓ کو ان نازک مواقع پر جو قیمتی بات سوجھی وہ اس لئے سوجھی کہ وہ اصل معاملہ سے الگ تھیں اور اس بنا پر اس پوزیشن میں تھیں کہ غیر متاثر ذہن کے تحت اس کے بارے میں رائے قائم کر سکیں۔ اگر وہ خود بھی معاملہ میں براہ راست شریک ہوتیں تو اس قسم کی بے لاگ رائے قائم کرنا ان کے لئے ممکن نہ ہوتا۔

غلطی کا انجام

محمود گواں دکن کی بہمنی سلطنت کا وزیر تھا وہ تاریخ ہند کے لائق ترین مدبروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ اس قدر محنت کا عادی تھا کہ اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرتا۔ اپنی ضرورتیں اس نے بہت محدود کر لی تھیں۔ چٹائی پر سوتا، مٹی کے برتن میں کھانا کھاتا اور نہایت سادہ زندگی گزارتا۔ اس کے ذاتی کتب خانہ میں تین ہزار کتابیں تھیں۔ اس نے بہمنی سلطنت کی راجدھانی بیدر میں ایک مدرسہ قائم کیا اور اپنی تمام کتابیں وہاں بھیج دیں۔ مدرسہ کی عمارت کے آثار اب بھی بیدر میں موجود ہیں۔ اس کے زمانے میں بہمنی سلطنت کو بہت ترقی ہوئی

محمود گواں کے زمانے میں بہمنی تخت پر محمود شاہ سوم تھا۔ یہ بادشاہ نہایت آرام طلب اور ناکارہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کا سارا انتظام عملاً محمود گواں کے ہاتھ میں آگیا۔

دربار کے بہت سے امراء اس کے اس قوت و اثر کو دیکھ کر اس سے جلنے لگے۔ انھوں نے خفیہ طریقہ سے محمود گواں کی سرکاری مہر حاصل کر لی۔ ایک جعلی خط اس کی مہر کے ساتھ تیار کیا جو وجے نگر کے راجہ رائے نرسنگھ کے نام لکھا گیا تھا۔ یہ فرضی خط انھوں نے بادشاہ کو دکھایا اور کہا کہ وزیر غدار ہے۔

بادشاہ امیروں کے دھوکے میں آگیا۔ اس نے ۱۴۸۱ء میں اس لائق وزیر کو قتل کرا دیا۔ بعد کو بادشاہ کو پتہ چلا کہ اس نے غلطی کی ہے، اس کو بے حد صدمہ ہوا، یہاں تک کہ خود بھی ایک سال کے اندر مر گیا۔

موت کے بعد آدمی کو وہ سب کچھ مضحکہ خیز دکھائی دے گا

آخری انجام

چو این لائی (۱۹۷۶–۱۸۹۸) چین کے اشتراکی انقلاب (۱۹۴۹) سے پہلے چیانگ کائی شیک کے ساتھی تھے۔ بعد کو وہ چیانگ سے الگ ہو گئے اور کمیونسٹ چین کے پہلے وزیر اعظم بنے۔ انھوں نے چین کے علاوہ فرانس، انگلینڈ، جرمنی اور جاپان میں تعلیم حاصل کی۔ چین کے سابق وزیر دفاع مسٹر لن پیاؤ آخری برسوں میں ان کے طاقت ور حریف کی حیثیت سے ابھرے۔ مگر ۱۹۷۲ میں وہ ان کو باغی قرار دے کر میدان سے ہٹانے میں کامیاب ہو گئے اور چین کے نمبر ۲ شخص بن گئے۔ تاہم وہ کینسر کے مرض سے اپنے کو نہ بچا سکے اور ۱۸ ماہ اسپتال میں رہ کر ۹ جنوری کو اس دنیا سے چلے گئے۔ چاؤ صرف ایک بچے کے والد بن سکے تھے جس کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا۔

سب مضحکہ خیز نظر آئیں گے

ماوزے تنگ (۱۹۷۶–۱۸۹۳) تقریباً ۳۰ سال تک ۸۰۰ ملین آبادی کے ایک عظیم ملک کے مختار کل رہنے کے بعد بالآخر اس دنیا سے چلے گئے۔ ۱۹۶۵ء میں انھوں نے اڈگر سنو (Edgar Snow) کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا:

A thousand years from now, all of us - even Marx, Engels and Lenin will look rather ridiculous

اب سے ہزار سال بعد ہم لوگ، حتی کہ مارکس انجلس اور لینن سب مضحکہ خیز دکھائی دیں گے۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۷۶

جس کو دنیا میں وہ اہم سمجھتا تھا اور جس کے پیچھے اپنی ساری زندگی لگادی تھی

یہ بات اگرچہ انھوں نے سیاسی اور اقتصادی نظریات کے پہلو سے کہی تھی، مگر موت نے شاید صرف دس سال بعد انھیں بتادیا ہوگا کہ یہ بات ایک اور معنی میں بھی صحیح ہے — موت سے پہلے آدمی اپنی ترقی کے لئے یا اپنی شخصیت کو بنانے کے لئے جو کچھ کرتا ہے وہ موت کے بعد کی زندگی میں بالکل بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس کو اچانک معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان چیزوں کی کوئی قیمت ہی نہیں جن کو سب سے زیادہ اہم سمجھا جاتا تھا اور ان کو حاصل کرنے کے لئے اپنی ساری زندگی لگادی تھی۔

کچھ کام نہ آیا

جنرلسمو فرانسسکو فرینکو (۱۹۷۵–۱۸۹۲) ۳۶ سال تک اسپین کے مطلق العنان ڈکٹیٹر رہے۔ آخر عمر میں ان کو نو قسم کی مہلک بیماریاں لگ گئی تھیں۔ ۳۲ ڈاکٹروں کی شب و روز موجودگی کے باوجود وہ پانچ ہفتہ تک بستر پر تڑپتے رہے اور بالآخر ۱۹ر نومبر کو ختم ہو گئے۔ اسپین کی سول وار (۳۹–۱۹۳۶) کے زمانہ میں ہٹلر اور مسولینی کی فوجی مدد سے وہ ملک کے اقتدار پر قابض ہوئے تھے۔ شاہ اسپین الفانسو سیزدہم ۱۹۳۱ میں ملک چھوڑ کر بھاگ گئے

گئے تھے۔ اب ان کا پوتا پرنس جوان کارلوز ڈی بوربون دوبارہ اسپین کا حکمراں ہے جس کو جنرل فرانکو نے اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا

عام اسپینی مزاج کے برعکس جنرل فرینکو میں دو نمایاں خصوصیتیں پائی جاتی تھیں احتیاط اور نرمی۔ فرینکو نے ایک بار سمندر میں مچھلی کا شکار کھیلنا چاہا۔ اس وقت سمندر میں طوفان تھا۔ انھیں مشورہ دیا گیا کہ وہ سمندر میں داخل نہ ہوں۔ مگر وہ مصر رہے۔ ان کی بیوی دونا کارمینا نے کہا "اگر آپ ان موجوں میں ڈوب گئے تو اسپین کا کیا ہوگا؟" فرینکو نے جواب دیا "خدا اسپین کی حفاظت کرے گا۔"

کھدائی ختم نہیں ہوئی

سر مورٹی مر وھیلر (۱۹۷۶ — ۱۸۸۹)

اسکاٹ لینڈ میں پیدا ہوئے۔ وہ آثار قدیمہ کے عالم تھے۔ انگلستان کے تین تاریخی مقامات (سٹنی ویرولامیم، میڈن کیسل) کی کھدائی کے بعد ان کو کافی شہرت حاصل ہوئی اور وہ رومن آرکیالوجی کے ماہر سمجھے جانے لگے۔ ۱۹۴۴ء میں وہ غیر منقسم ہندوستان میں آرکیالوجیکل سروے کے ڈائرکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ انھوں نے ہندوستان اور پاکستان کے مختلف تاریخی مقامات کی کھدائی کی اور آثار قدیمہ سے متعلق دوسرے اہم کام انجام دیئے۔

ہندوستان میں جب ان کا تقرر ہوا تو یہاں کے پریس میں ان کو نااہل ثابت کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ: "وہ رومن آرکیالوجی کے ماہر ہیں۔ ہندوستان کے علم الآثار میں وہ ہمارے کیا مددگار رہ سکتے ہیں؟" مگر اپنے اعلیٰ کام سے انھوں نے اتنی اہلیت ثابت کی کہ آزادی کے بعد بھی وہ ہمارے محکمۂ آثار قدیمہ کی طرف سے بار بار ہندوستان بلائے جاتے رہے۔ حتیٰ کہ آزادی سے پہلے اپنی چار سالہ ملازمت کے دوران انھوں نے پانڈیچری کے پاس آریکا میڈو کی کھدائی کر کے یہ بھی ثابت کیا کہ رومن ہندوستان تک پہنچ گئے تھے۔

سر وھیلر نہایت محنتی اور ذمہ دار آدمی تھے۔ ان کا قول تھا:

Every excavation is destruction unless it is properly recorded.

کھدائی کا ہر کام برباد کرنے کا کام ہے۔ جب تک کہ اس کو صحیح طور پر ریکارڈ کرنے کا انتظام نہ کیا گیا ہو۔

سر وھیلر کو اپنی پوری زندگی "کھدائی" کی زندگی نظر آتی تھی۔ شاید انھیں یہ احساس تھا کہ وہ ابھی تک اصل حقیقت تک نہیں پہنچے ہیں۔ انھوں نے اپنے بعد اپنی خود نوشت سوانح عمری چھوڑی ہے اور اس کا نام معنی خیز طور پر اب بھی کھدائی کرتے ہوئے STILL DIGGING تجویز کیا ہے۔

کوئی وقت نہیں

کرشن بھاٹیا (۱۹۲۵ — ۱۹۷۴) ان انتہائی چند ہندوستانیوں میں تھے جنھوں نے ملکی صحافت میں تجزیاتی تحریر (Analytical Writing) کی اعلیٰ مثال قائم کی۔ اپنی عمر کے آخری آٹھ سال انھوں نے واشنگٹن میں ہندوستان ٹائمس کے کرسپانڈنٹ کی حیثیت سے گزارے۔

۱۰ دسمبر ۱۹۷۴ کو جب ریڈیو نے بتایا کہ اچانک حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے واشنگٹن میں ان کا انتقال ہو گیا تو بہت سے لوگ اچنبھے میں پڑ گئے۔ کیونکہ موت کے وقت کرشن بھاٹیہ پوری طرح تندرست اور توانا تھے اور عمر کے اس آخری مرحلہ پر پہنچ چکے تھے جب کہ آدمی اپنی صلاحیتوں کو کامیاب ترین شکل میں استعمال کرتے

کے قابل ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر آنے سے پہلے

نرنجن سنگھ طالب (۱۹۰۱ - ۱۹۷۶) نئی دہلی میں اپنے مکان پر تھے۔ انھوں نے ایک پیالی چائے پی۔ اس کے بعد ہی انھیں سینہ میں درد محسوس ہوا۔ فوراً قریبی ڈسپنسری سے ایک ڈاکٹر بلایا گیا۔ ڈاکٹر ان کے مکان پر پہنچا تو اس کے لئے صرف یہ مقدر تھا کہ وہ مریض کو دیکھ کر یہ اعلان کرے کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے۔

نرنجن سنگھ طالب پنجاب کانگرس کے صدر اور راجیہ سبھا کے ممبر تھے۔ اس سے پہلے وہ پنجاب کی کابینہ میں وزیر بھی رہ چکے ہیں۔ انھوں نے نیتاجی سبھاش چندر بوس کے ہندستان سے بھاگ کر جرمنی پہنچنے میں مدد کی تھی۔ جس کے نتیجہ میں ان کے اوپر انگریزوں نے مقدمہ چلایا۔ ۱۹۲۳ میں وہ اپنے صوبہ پنجاب سے نکال دیئے گئے۔

نئی تاریکی

پچھلے ستمبر میں دو اہم عمر رسیدہ فن کاروں کے لئے موت کا پیغام آگیا۔ ایک، بنگال کے باغی شاعر قاضی نذرالاسلام (۱۸۹۹-۱۹۷۶) دوسرے مرہٹی کے سماجی ناول نگار دی ایس۔ کھنڈیکر (۱۸۹۸ - ۱۹۷۶)۔ دونوں کو غیر معمولی شہرت اور عزت ملی۔ مگر دونوں مسلسل بیماری اور حادثات کا شکار رہے۔ حتیٰ کہ دونوں اپنی آنکھ سے محروم ہو چکے تھے۔ قاضی نذرالاسلام کی آنکھ ۱۹۴۲ میں فالج کے حملہ میں ختم ہو گئی۔ کھنڈیکر کی آنکھ عرصے سے نہایت کمزور ہو چکی تھی۔ موت سے تقریباً تین سال پہلے وہ بالکل ہی اندھے ہو گئے۔

کھنڈیکر سے آخر عمر میں ایک اخبار نویس نے سوال کیا کہ آنکھوں کے چلے جانے کے بعد آپ کیا محسوس کرتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا:

I have adjusted myself
to this new darkness.

میں نے اپنے آپ کو اس نئی تاریکی سے ہم آہنگ کر لیا ہے۔

مرداں چنیں کنند

لارڈ ٹامسن (۱۹۷۶ — ۱۹۲۳) کی پیدائش کناڈا میں ہوئی۔ انھوں نے اخبارات کو صنعت کی حیثیت سے شروع کیا اور اس میں اتنی کامیابی حاصل کی کہ اب تک اخبارات کے کسی بھی دوسرے تاجر نے حاصل نہ کی تھی۔ کناڈا، برطانیہ، امریکہ اور دوسرے ملکوں کے ایک سو سے زیادہ اخبارات "ٹامسن ایمپائر" کا حصہ تھے۔

ٹامسن بے حد شریف آدمی تھا۔ اخلاقی حیثیت سے کبھی اس سے کسی کو شکایت نہیں ہوئی۔ ایڈیٹروں کے انتخاب میں وہ انتہائی چھان بین کرتا تھا۔ مگر جب کسی شخص کو کسی اخبار کا ایڈیٹر مقرر کر دیتا تو اس کو اپنے دائرہ عمل میں مکمل آزادی دے دیتا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے اڈیٹروں کو یہ حق بھی تھا کہ وہ خود ٹامسن کے خلاف مضامین لکھ سکیں۔

ٹامسن کی سوانح عمری رسل بریڈن نے لکھی ہے جس کا نام ہے:

Roy Thomson of Fleet [illegible]

سوانح نگار لکھتا ہے کہ ٹامسن کی واحد کمزوری یہ تھی کہ وہ "لارڈ" بننے کا بہت زیادہ حریص تھا۔ اس نے دیکھا کہ اپنے ملک کناڈا میں اس کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکے گی۔ کیونکہ کناڈا نے لارڈ کا خطاب دینے کے برطانوی طریقے کو ختم کر دیا تھا۔ چنانچہ ٹامسن نے برطانوی شہریت اختیار کر لی۔

اسے یقین تھا کہ برطانیہ آنے کے بعد وہ ضرور لارڈ بننے کا خواب پورا کر سکے گا۔ مگر یہاں بھی ایک رکاوٹ سامنے آگئی۔ ہرولڈ میکلن کے بعد لارڈ ہوم برطانیہ کے وزیر اعظم (۶۴ — ۱۹۶۳) مقرر ہوئے۔ ٹامسن کے مشہور اخبار "ٹائمز" کے ایڈیٹر اس وقت ڈینس ہملٹن تھے۔ انھیں اس تقرر پر اعتراض تھا۔ انھوں نے خاموش رہنے کے بجائے کھلم کھلا نئے وزیر اعظم کے خلاف لکھنا شروع کر دیا۔

ٹامسن کے لئے یہ ایک انتہائی نازک صورت حال تھی۔ انھوں نے اپنے اڈیٹر کو گفتگو کے ذریعے قائل کرنے کی کوشش کی۔ مگر جب وہ اپنی رائے بدلنے پر تیار نہ ہوا تو انھوں نے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ بلکہ یہ کہہ کر معاملہ کو ختم کر دیا:

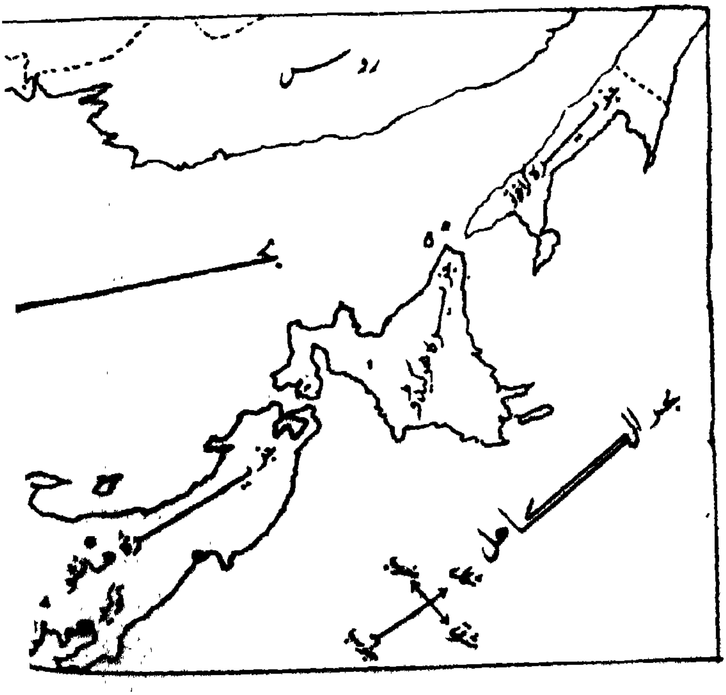
What you say is your own province

یعنی یہ تمھارے اپنے دائرہ کار کا معاملہ ہے۔ تم کو اختیار ہے کہ جو کچھ لکھنا چاہتے ہو لکھو۔

برطانوی شہریت اختیار کرنے کے باوجود ٹامسن کے لئے اب بظاہر "لارڈ" بننے کا امکان ختم ہو چکا تھا۔ ان کا اخبار برابر برطانوی وزیر اعظم پر تنقیدی مضامین شائع کر رہا تھا۔ مگر سر الیک ڈگلاس ہوم نے بھی عالی ظرفی سے کام لیا۔ صاحب اقتدار ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اپنے دل میں ٹامسن کے خلاف کوئی انتقامی جذبہ پیدا ہونے نہیں دیا۔ اور ان کے لئے لارڈ کے اعزاز کی منظوری دے دی۔

یہی عالی ظرفی ہے جو افراد اور قوموں کو ترقی کے اگلے مقام کی طرف لے جاتی ہے۔

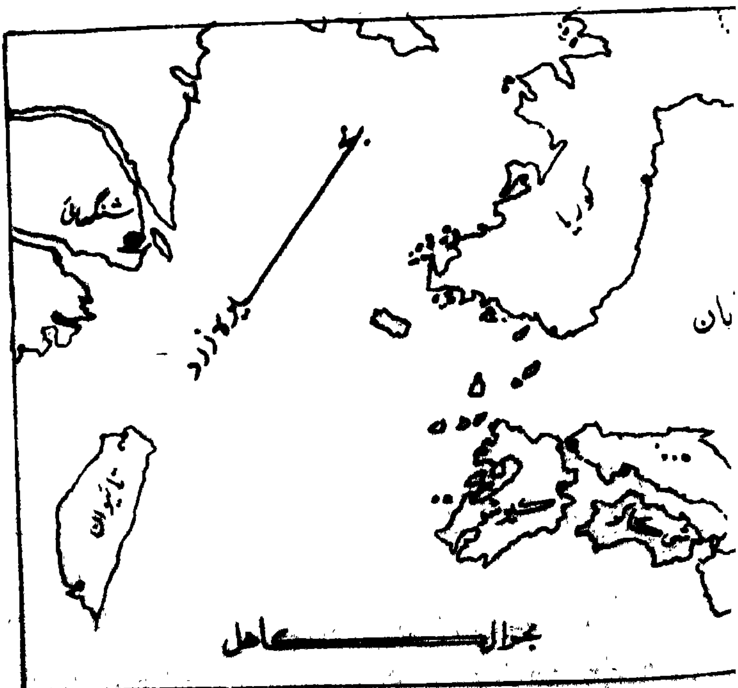
[illegible] الاسلام فضلی (بی اے، بی ٹی علیگ)
۴۵ سال پہلے جاپان گئے تھے۔ ہندستانی حکومت نے
ان کا تقرر ٹوکیو کے اسکول آف فارن لینگویجز میں اردو
اور فارسی لکچرر کی حیثیت سے کیا تھا۔ ۵ دسمبر ۱۹۳۰
میں سمندری جہاز سے جاپان پہنچے اور اپریل ۱۹۳۲
تک وہاں مقیم رہے۔ جاپان کے حالات اور اپنے سفر
کی روداد پر اسی وقت انھوں نے چار سو صفحات پر
مشتمل ایک کتاب (حقیقت جاپان) لکھی تھی جو ۱۹۳۴
میں انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد دکن) نے شائع کی تھی۔
مطبع کا نام کتاب پر "جامع برقی پریس دہلی" لکھا ہوا ہے۔
یہاں اس کتاب کا ایک حصہ نقل کیا جاتا ہے۔
" ۸ ستمبر ۱۹۳۱ کو ایک ہندستانی مسلمان تاجر
مسٹر احمد ٹوکیو آئے تھے۔ مجھ سے ملنے کے لیے مکان پر
تشریف لائے۔ ان کے والد تاسک کے رہنے والے تھے
اور ان کی والدہ ایک چینی خاتون تھیں۔ یہ ہانگ کانگ
میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم پائی۔ ہندستان کبھی نہیں گئے
بائیس سال سے جاپان میں ہیں۔ یہیں ایک جاپانی خاتون
سے شادی کر لی ہے۔ اب سن لائف انشورنس کمپنی کے
ایجنٹ ہیں۔ مسٹر احمد انگریزی، اردو اور جاپانی زبانوں
میں گفتگو کر سکتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ کوبے (جاپان)
میں ہندستانی مسلمانوں کی تعداد ساٹھ اور روسی
مسلمانوں کی تعداد سو سے زائد ہے۔ کوبے کے مسلمان
اب تک جمعہ اور عیدین کی نمازیں ہندستانی کلب کی عمارت
میں ادا کرتے ہیں مگر تقریباً دو سال سے یہ تحریک جاری
ہے کہ ایک مسجد تعمیر کی جائے۔ ستر ہزار ین تخمینہ ہوا ہے مگر اب
تک اس کام کے لیے چندہ سے تیرہ ہزار ین جمع ہوئے"



ہیں۔ یہ رقم بھی اُن ہندوستانی مسلمان تاجروں نے دی ہے جو کوبے میں اپنا کاروبار کرتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی چندے کی تحریک کی گئی ہے مگر ہنوز کچھ وصول نہیں ہوا۔ چندہ وصول کرنے اور مسجد تعمیر کرانے کے لئے ایک انجمن قائم ہے۔ مسٹر احمد اس انجمن کے سکریٹری ہیں۔ چنانچہ احمد صاحب ٹوکیو اسی غرض سے آئے تھے اور اراکین سلطنت سے ملنے کے لئے ایک روسی مسلمان کا خط قربان علی آفندی کے نام لائے تھے، جو ٹوکیو میں روسی مسلمانوں کے امام ہیں اور نہایت حکام رس اور ذی اثر آدمی ہیں۔

۱۰ ستمبر کو مسٹر عبدالغنی، مسٹر احمد اور میں قربان علی آفندی سے ملنے کے لئے گئے۔ متوسط العمر، فربہ اندام اور وجیہہ آدمی ہیں۔ بڑے تپاک و خلوص سے ملے۔ گیارہ برس سے جاپان میں مقیم ہیں۔ جاپانی زبان خوب بولتے ہیں، مگر انگریزی زبان نہیں جانتے۔ ان سے معلوم ہوا کہ ٹوکیو میں روسی مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ سو سے زائد ہے۔ یہ لوگ نسلاً تاتاری ہیں، مگر روسی سلطنت کے باشندے ہیں۔ حکومت سوویت روس نے ان کو جلا وطن کر دیا ہے۔ جاپان میں یہ لوگ مزدوری پیشہ ہیں۔ جفاکشی اور دیانت سے روزی کماتے ہیں۔ ان سب کا قیام ایک ہی محلہ میں ہے: قربان علی آفندی کی مساعی جمیلہ سے ایک مسجد، ایک اسلامی مدرسہ اور ایک قبرستان بن گیا ہے۔

اخراجات کے لئے آپس میں چندہ کر لیتے ہیں۔ چندہ کی رقم اس قدر دیانت داری اور کفایت شعاری سے خرچ ہوتی ہے کہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ پس انداز ہوتا رہتا ہے۔ اس رقم سے ایک پریس بھی قائم کیا ہے اور ترکی زبان میں ایک سہ ماہی رسالہ بھی نکلتا ہے۔ قربان علی صاحب سے



انسائیکلوپیڈیا میں اسلام پر مقالہ لکھنے کے لئے ایک جاپانی فاضل نے اسلام کا مطالعہ کیا، وہ اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اسلام قبول کرلیا

دیر تک گفتگو رہی۔ اپنی انجمن کے حالات سناتے رہے۔ بعد ازاں اپنے ہمراہ لے جاکر مسجد و مدرسے کی سیر کرائی۔ یہیں ایک کمرے میں پریس ہے۔ یہاں قربان علی صاحب نے اپنے رسالہ "زاپون مجبری" کے کئی نمبر اور اپنے پریس کے چھپے ہوئے تصویری پوسٹ کارڈوں کا ایک سٹ علیحدہ علیحدہ ہم تینوں کو عنایت فرمایا۔

اگلے دن شام کو ہم ان کے مکان پر گئے، کھانے میں بڑا تکلف کیا تھا۔ انواع و اقسام کے ترکی اور جاپانی کھانے میز پر آئے۔ ترکی کھانے نہایت لذیذ تھے، اور ہندستانی اور ایرانی کھانوں سے بہت زیادہ ملتے جلتے تھے۔ دورانِ گفتگو میں آفندی نے ہمیں بتایا کہ تاتاری لوگ گوشت میٹھا اور چائے بہت استعمال کرتے ہیں۔

وزیر اعظم جاپان کے پرائیویٹ سکریٹری بھی شریک طعام تھے اور ان کو خاص مصلحت سے اس وقت مدعو کیا گیا تھا۔ تعارف تو کھانے سے قبل ہو چکا تھا۔ مگر کھانے کے بعد مطلب کی گفتگو ہوئی۔ آفندی نے سکریٹری صاحب کے سامنے مسٹر احمد کے آنے کی غرض اور کوبے کی مجوزہ مسجد کی تعمیر کا ذکر کیا۔ اور یہ درخواست کی کہ ہم لوگ وزیر اعظم سے اس غرض کے لئے ملنا چاہتے ہیں کہ حکومت بھی اس کام میں کچھ امداد فرمائے، آپ ملاقات کا انتظام کر دیجئے۔ اور خود بھی وزیر صاحب موصوف سے سفارش کر دیجئے۔ انھوں نے دونوں باتوں کا وعدہ کیا

جمعہ کے روز نماز کے لئے مسجد گیا۔ پچاس نمازی جمع ہوئے۔ ہر شخص ہیٹ کے نیچے ایک گول مخمل کی ٹوپی پہن کر آیا تھا۔ نیچے کی منزل میں اور زینے پر بہت سی کھونٹیاں دیوار پر لگی ہوئی ہیں۔ ہیٹ اُن پر ٹانگ دی، اور گول ٹوپی پہن کر اوپر کے ہال میں جہاں نماز ہوتی ہے جمع ہوئے۔ بعض لوگوں نے نیچے کی منزل میں وضو بھی کیا۔ نماز کے بعد تمام نمازیوں سے مصافحہ ہوا۔ یہیں ایک جاپانی صاحب سے بھی تعارف ہوا۔ یہ بھی نماز میں شریک تھے۔

ایک روسی مسلمان مسٹر صابر جمیل نے مجھ کو اور جاپانی مسلمان صاحب کو جن کا نام مسٹر سبورو تھا اسی وقت چائے نوشی کی دعوت دی۔ صابر صاحب مسجد کے قریب ہی ایک چھوٹے سے خوبصورت مکان میں رہتے ہیں۔ ان کی اہلیہ محترمہ عائشہ نے میہمانوں کی بڑی خاطر مدارات کی۔

مسٹر سبورو سے اسلام کے متعلق گفتگو ہوئی۔ میں نے دریافت کیا کہ اسلام کی کس خوبی نے آپ کو اس طرف مائل کیا۔ انھوں نے بیان کیا کہ ان سے جاپانی انسائیکلوپیڈیا میں اسلام کے متعلق آرٹیکل لکھنے کے لئے کہا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اسلام کا مطالعہ کیا۔ مطالعہ اور تحقیق کے بعد خود بخود اسلام کی حقانیت ان پر روشن ہوگئی۔ اور بغیر کسی خارجی تحریک کے مشرف بہ اسلام ہوگیا۔

انھوں نے کہا کہ اسلام کی بے شمار خوبیاں ہیں۔ مگر دو خوبیوں نے خصوصاً ان پر بڑا اثر کیا۔ اولاً توحید اور ثانیاً مذہبی رواداری۔ مسٹر سبورو ٹوکیو میں تنہا جاپانی مسلمان ہیں۔ ان کے علاوہ تمام جاپان میں صرف چند جاپانی مسلمان ہیں۔" سیاحت جاپان ۱۳۱-۱۱۱

یہ کام نہیں، کام کے مواقع کو برباد کرنا ہے

موجودہ دور کے مسلم مصلحین سے ایک بڑی اجتہادی غلطی یہ ہوئی ہے کہ انھوں نے سمجھا کہ جن ملکوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں اور جہاں ان کا سیاسی اقتدار قائم ہے، وہاں وہ اس پوزیشن میں ہیں کہ "قانون اسلامی کے نفاذ" کے مطالبہ سے اپنی مہم کا آغاز کر سکیں۔ یہ ایک اور دہشت قسم کا غلط اندازہ تھا جس سے عملاً اس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا کہ وہ اپنے ملکوں میں حزب مخالف کا پارٹ ادا کر کے ختم ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم اقلیت کے ملکوں میں جو مسئلہ مقامی غیر مسلم اکثریت کی طرف سے ہے، وہی مسلم اکثریت کے ممالک میں عالمی حالات کی جانب سے ہے۔ مزید یہ کہ مسلم ملکوں کے تمام حکومتی شعبوں پر چونکہ وہی لوگ قابض ہیں جن کی تعلیم مغربی طرز کے اداروں میں ہوئی ہے کیونکہ وہی جدید دور کی ایک ریاست چلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اس لیے مسلم ملکوں کا برسراقتدار طبقہ بھی، اسلام سے طبعی ہمدردی رکھنے کے باوجود، مزاجاً، اس حد تک جانے کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ وہ اپنے یہاں خالص مذہبی ریاست کے قیام کا اعلان کر دے۔ مصر، پاکستان، انڈونیشیا وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ ان ملکوں میں موجودہ صدی کے وسط میں جو اسلامی تحریکیں اٹھیں، وہ اپنی ساری مقبولیت اور ترقی کے باوجود، اسلامی قانون کے نفاذ میں تو کامیاب نہیں ہوئیں، البتہ مسلم ملک ہونے کی وجہ سے وہاں ان کو اسلامی دعوت کے کام کو مؤثر طور پر چلانے کے لئے جو خصوصی مواقع حاصل تھے وہ بھی اختلافی اور احتجاجی سیاست کے نتیجہ میں برباد ہو گئے۔ قاضی ابو یوسف (۹۸) اور شیخ احمد سرہندی (۱۵۶۴ — ۱۶۲۵) نے بالترتیب عباسی خلیفہ ہارون الرشید اور مغل شہنشاہ جہانگیر سے مل کر جو اسلامی خدمات انجام دیں، اگر موجودہ زمانہ کے مصلحین نے بھی اس ڈھنگ پر کام کیا ہوتا تو اب تک اظہار دین اور غلبۂ اسلام کا وہ کام انجام پا چکا ہوتا جس کے لئے ابھی ہم صرف غور و فکر کر رہے ہیں۔

لطیفہ

ابن الرومی (۲۸۳ — ۲۲۱ھ) ایک شاعر تھا وہ لوگوں کی ہجو کیا کرتا تھا۔ خلیفہ معتضد باللہ کے وزیر ابوالحسین قاسم بن عبداللہ کو ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ وہ اس کی ہجو کر کے اس کو عوام میں ذلیل نہ کرے۔ یہ وزیر بڑا بے رحم تھا۔ اس نے اس مسئلہ کا حل یہ سوچا کہ اس کے وجود ہی کو ختم کر دیا جائے۔ ایک بار جب ابن الرومی وزیر کے دسترخوان پر کھانا کھا رہا تھا وزیر نے چپکے سے اس کے کھانے میں زہر ڈال دیا۔ ابن الرومی زہر آلود کھانے کے کچھ لقمے کھا چکا تو اس کو احساس ہوا۔ وہ فوراً کھانے سے اٹھ گیا۔ اس کے بعد دونوں میں جو گفتگو ہوئی وہ یہ ہے۔

وزیر: ابن الرومی! کہاں جا رہے ہو۔

ابن الرومی: جہاں تم مجھ کو بھیجنا چاہتے ہو۔

وزیر: دیکھو وہاں پہنچ کر میرے والد کو میرا سلام پہنچا دینا۔

ابن الرومی: لیکن جہنم سے میرا گزر نہیں ہوگا۔

جدید مسئلہ کیا ہے؟

انسانی تاریخ کو دو بڑے دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ——— دورِ سائنس سے پہلے اور دورِ سائنس کے بعد۔ وہ چیز جس کو "دورِ جدید" کہتے ہیں، وہ حقیقۃً دورِ سائنس کا دوسرا نام ہے۔ یہ دور ممتاز طور پر سترھویں صدی میں شروع ہوا اور دوسری جنگ عظیم (۴۵-۱۹۳۹) تک اپنے آخری عروج پر پہنچ گیا۔

انسان خارجی طور پر جو عمل کرتا ہے، اس کے لئے اس کے پاس دو قدرتی ذریعے ہیں: حواس اور طاقت۔ حواس کے ذریعے وہ اشیاء کا علم حاصل کرتا ہے، اور طاقت کے ذریعے اپنے ارادہ کو ان کے اوپر نافذ کر کے ان کو اپنے لئے کارآمد بناتا ہے۔ یہ دونوں عمل قدیم ترین زمانے سے جاری ہیں۔ پچھلے زمانہ میں اشیاء کو جاننے کے لئے اس کے پاس صرف وہ قدرتی عملیات تھے جن کو حواس خمسہ کہا جاتا ہے اور خارجی دنیا میں تصرف کرنے کے لئے اس کے پاس اپنے ہاتھ پاؤں تھے یا حیوانی طاقت، مثلاً اونٹ، گھوڑے، ہاتھی، بیل وغیرہ۔ تاہم ان ابتدائی قدرتی عملیات کے علاوہ زمین میں بے شمار ایسی چیزیں تھیں جو اس بات کو ممکن بناتی تھیں کہ ان کو حاصل کر کے آدمی اپنے حواس اور طاقت دونوں کی مقدار کو بڑھا سکے۔

اضافہ کا یہ عمل نامعلوم زمانہ سے جاری تھا۔ مردہ تہذیبوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے دوروں میں بھی انسان اس میدان میں بڑی بڑی ترقیات حاصل کرتا رہا ہے۔ تاہم ماضی کی تمام ترقیاں ابتدائی فطری حدود کے اندر ہوتی تھیں۔ مثلاً پتھر کی جگہ لوہے کو کام میں لانا یا پہیہ دار گاڑی بنا کر جانوروں کو سواری کے لئے استعمال کرنا۔ موجودہ دور کو یہ اولیت حاصل ہے کہ اس نے معلوم تاریخ میں پہلی بار طاقت کو "مشین" کی حیثیت سے دی اور فطری حواس کے لئے ایسے میکانکی اور آلاتی معاون دریافت کر لئے جو ہمارے دیکھنے اور تجربہ کرنے کی صلاحیت کو لاکھوں کروڑوں گنا زیادہ بڑھا سکتے تھے۔

اس دریافت کا براہ راست فائدہ تو صرف یہ تھا کہ انسانی تمدن کے لئے مادی ترقی کا ایک نیا وسیع تر دروازہ کھل گیا۔ انسان کے لئے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ اپنے سفر کی رفتار کو بے اندازہ مقدار میں بڑھا سکے۔ زمین کے جن وسائل تک روایتی ذرائع سے اس کی دسترس نہیں ہو سکتی تھی، ان کو حاصل کر کے اپنی بستیوں کو ناقابل قیاس حد تک ترقی دینے کرنے۔ تخریب و تعمیر کے لئے، مقدار اور نوعیت دونوں اعتبار سے، اتنے زیادہ سامان فراہم کرے جس کا خواب بھی پچھلے انسانوں نے نہیں دیکھا تھا۔

تاہم انسانی تاریخ کا اتنا بڑا واقعہ بالواسطہ اثرات پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے دھیرے دھیرے انسانی افکار پر بھی اپنے اثرات ڈالنے شروع کئے یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخر تک یہ عالم ہو گیا کہ سارے علوم انسانی اس سے متاثر ہو کر رہ گئے۔ مذہب، اخلاق، فلسفہ، قانون، معاشیات، سیاسیات، غرض

کوئی ذہنی رعب نہ تھا، ایسا نہ تھا جس نے کسی طرح یہاں سے اثر قبول نہ کیا ہو۔ مغربی طرز یا کسی طرح بھی فکری مسلم سائنس کے اوپر اپنی چھاپ نہ ڈال سکے، وہ صرف سائنس کے عملی غلبہ کا شکار ہو کر رہ گئے۔

سائنس اپنی ابتدائی شکل میں فکری علوم کی معاون تھی نہ کہ مخالف۔ انسان اگر نظام شمسی کی حرکت کا نقشہ معلوم کر لے، یا آٹومیٹک مشین کے ذریعہ کام لینے لگے تو اس میں اخلاق یا انسانی اقدار سے ٹکراؤ کا پہلو کیا ہے۔ تاہم سائنس کے ظہور کے ساتھ چند باتیں ایسی پیش آئیں جنھوں نے سائنس کو فکری علوم، خاص طور پر مذہب و اخلاق سے، متصادم کر دیا۔

۱۔ مذہب کے ماننے والوں نے سائنس کے ظہور سے پہلے روایتی معلومات کے تحت اپنا ایک فکری نظام بنا رکھا تھا۔ سائنس کی دریافتیں سامنے آئیں تو معلوم ہوا کہ ان میں سے بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو سائنس کی معلوم کردہ دنیا سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ اب چونکہ سائنس زیادہ ترقی یافتہ ذرائع معلومات کے حوالے سے کلام کر رہی تھی، قدرتی طور پر سمجھا گیا کہ وہی بات صحیح ہے جو سائنس کی طرف سے آئی ہے۔ اس واقعہ نے مذہب کو لوگوں کی نظر میں بے اعتبار بنا دیا۔ اس میں مزید شدت اس واقعہ سے پیدا ہوئی کہ اہل مذہب، خصوصاً عیسائی حضرات نے اپنے روایتی عقائد کے تحفظ کے لئے سائنس کے خلاف نہایت سخت رد عمل اختیار کیا۔ ان کے اس رد عمل نے لوگوں میں یہ تاثر پیدا کیا کہ مذہب اور سائنس کا ٹکراؤ حقیقی ہے، اور جب دلائل کی منطق صریح طور پر سائنس کی طرف ہے تو یقیناً مذہب ایک بے اصل چیز ہے۔ اس کی حقیقت توہم پرستی کے سوا اور کچھ نہیں۔

۲۔ دوسری غلطی سائنس والوں یا کم از کم سائنس کے حوالے سے بولنے والوں نے کی۔ عالم طبیعیات میں اپنی فتوحات سے وہ اس غلط فہمی میں پڑ گئے کہ وہ اس حیثیت میں ہیں کہ وسیع تر فلسفیانہ مسائل کے بارے میں رائے زنی کر سکیں۔ حالاں کہ، جیسا کہ بعد کو خود سائنس کی مزید دریافتوں سے معلوم ہوا، عالم طبیعی کے بارے میں ان کے مشاہدات، فلسفہ یا عالم افکار کے نازک مسائل کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کے لئے انتہائی ناکافی تھے۔

یہاں ہم اپنے مدعا کی وضاحت کے لئے دونوں قسموں کی ایک ایک مثال بیان کریں گے۔

زمین اور سورج کی گردش کے بارے میں قدیم یونان میں دو نظریے پیش کئے گئے تھے۔ ایک ارسطو کا نظریہ، جس کا مطلب یہ تھا کہ زمین قائم ہے اور سورج اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ دوسرا ارسٹارکس (Aristarchus) کا نظریہ جس کے مطابق زمین سورج کے گرد گھوم رہی تھی۔

عیسائیوں کے درمیان ارسطو کا نظریہ بہت مقبول ہوا کیونکہ مرکزیت زمین کے نظریہ (Geocentric Theory) میں زمین کو بنیادی اہمیت حاصل ہو رہی تھی اور چونکہ انھوں نے حضرت مسیح کو خدائی کا مقام دے رکھا تھا۔ اس لئے ان کا خیال یہ ہو گیا کہ وہی کرہ نظام شمسی کا مرکز بن سکتا ہے جہاں خداوند مسیح پیدا ہوئے ہیں۔ حتی کہ مرکزیت زمین کے نظریہ کو انھوں نے اپنے علم کلام میں داخل کر لیا۔ کوپرنیکس (۱۵۴۳-۱۴۷۳) نے جب مرکزیت آفتاب کا نظریہ (Heliocentric Theory) پیش کیا تو یورپ میں عیسائی پیشواؤں کو اقتدار حاصل تھا۔ انھوں نے اپنے

چرچ کے تقدس کے لئے کوپرنیکس کے خلاف عدالتی سزا کا حکم جاری کر دیا۔ خداوند کی جنم بھومی کو تابع (Satellite) قرار دینا ایک ایسا جرم تھا جو کسی طرح معاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔

مگر یہ مسئلہ روایتی عیسائیت کا تھا نہ کہ حقیقی معنوں میں خدائی مذہب کا۔ چنانچہ مسلمان جو اس اعتقادی پیچیدگی میں مبتلا نہ تھے کہ پیغمبر کو خدا سمجھے تھیں، انھوں نے مرکزیتِ آفتاب کے نظریہ کو زیادہ معقول پاکر اسے قبول کر لیا۔ ان کے یہاں یہ سوال نہیں اٹھا کہ شمسی مرکزیت کا نظریہ مذہبی تعلیمات سے ٹکراتا ہے:

"ارسطو کے احترام کے باوجود عرب کائنات کے بارے میں ارسطو کے نظریہ پر تنقید کرنے میں نہیں ہچکچائے، جس کا مطلب یہ تھا کہ زمین آسمانی اجرام کا مرکز ہے اور تمام اجرام اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ اس کے برعکس عربوں نے اس امکان کو تسلیم کیا کہ زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہوئی سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔"

Edward McNall Burns
Western Civilization, P.264

سائنس دانوں کی غلطی کی ایک مثال اصول تعلیل (Causation) میں ملتی ہے۔ اشیاء کے مشاہدہ سے جب یہ حقیقت ان کے سامنے آئی کہ واقعات کے پیچھے ایک سبب کارفرما ہوتا ہے، مثال کے طور پر اجرام سماوی کی گردش کے پیچھے جذب وکشش کا قانون یا قوس قزح کے پیچھے بارش کے قطرات سے سورج کی شعاعوں کا گزرنا، تو انھوں نے سمجھ لیا کہ ان کو اس سوال کا جواب مل گیا ہے جس کے لئے فلسفہ ہزاروں سال سے "علت کائنات" کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ حالاں کہ علت کائنات کا مسئلہ نہایت گہرے سوالات سے جڑا ہوا تھا اور سائنس دانوں کا طبیعی مشاہدہ کسی بھی درجہ میں اس قابل نہ تھا کہ اس کو اس نازک اور گہرے سوال کے جواب کے لئے استعمال کیا جائے۔ تاہم انھوں نے استعمال کیا۔ حتی کہ اس کو خالق کے انکار کا سب سے بڑا ثبوت سمجھ لیا۔ مگر بیسویں صدی کے آغاز میں خود سائنس نے ایسے حقائق دریافت کئے جس کے بعد الحاد کی یہ بنیاد ہمیشہ کے لئے منہدم ہوگئی۔

یہ ہے مختصر طور پر وہ فکری پس منظر جس میں جدید تاریخ کا وہ واقعہ وجود میں آیا جس کو مذہب اور سائنس کا تصادم کہا جاتا ہے۔

سائنس نے جدید دور کے ہر پہلو پر اتنی شدت اور وسعت کے ساتھ اثر ڈالا کہ علم کے تمام شعبوں اور فکر کے تمام گوشوں پر اس کی چھاپ پڑ گئی۔ جس قدیم روایتی ڈھانچہ میں لوگوں نے اسلام کو پایا تھا، وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ چکا تھا اور نیا فکری ڈھانچہ جو سائنس کے زیر اثر بنا، اس کے تحت اسلامی افکار کی تشکیل نو نہ کی جا سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نسل کی نسل تذبذب اور انتشار ذہنی کا شکار ہو کر رہ گئی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس دور میں ایسے لوگ معدوم ہو گئے جو اسلام کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہوں۔ بلا شبہ ایسے لوگ تھے اور کروروں کی تعداد میں تھے۔ مگر انھوں نے اسلام کو روایتی سطح پر پایا تھا، شعور کی سطح پر نہیں پایا تھا۔ اس کمی کا نتیجہ صرف یہ نہیں ہوا کہ لوگ ایمان کی اس اعلیٰ فکری سطح کو نہ پہنچ سکے جہاں آدمی گرد و پیش کے تمام واقعات کو اس طرح اپنے شعور حق کا جزو بنا لیتا ہے کہ ہر طرف اس کو خدا کا جلوہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ بڑا اجتماعی نقصان یہ ہوا کہ اس دور میں مسلمانوں کے جو مذہبی

رہنما اٹھے، وہ خود بھی چونکہ ایسے تھے جنھوں نے فکر حاضر میں اپنے دین کو نہیں پایا تھا، بلکہ ماضی کے روایتی ڈھانچہ میں پایا تھا۔ اس لئے وہ دور جدید کے مطابق اسلامی مہم کی منصوبہ بندی نہ کر سکے۔ انتہائی اخلاص مگر انتہائی نادانی کے ساتھ وہ مسلمانوں کو ایسی راہوں میں دوڑاتے رہے جن کی ساری قیمت ماضی کے نقشہ میں تھی، عہد حاضر کے نقشہ میں وہ اپنی قیمت کھو چکے تھے۔ وہ تاریخ ماضی میں حال کا ڈراما کھیلتے رہے۔ اس کا نتیجہ صرف ایک دردناک شکست تھا۔ چنانچہ ہر محاذ پر شکست ہوئی اور شکست نے بالآخر مایوسی اور جھنجلاہٹ اور بے حوصلگی کا شدید تر تحفہ دے کر پوری قوم کی قوم کو موت کے کنارے پہنچا دیا۔

شعوری سطح پر دین کو پانے کا مطلب وقت کے افکار کے مقابلے میں دین کو پانا ہے۔ معرکہ بدر (۶۲۴ء) کے مجاہدین نے أَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ (انفال-۶۰) کی تفسیر "تلوار" میں پائی تھی۔ مگر شاملی (۱۸۵۷ء) کے مسلمان بھی اگر آیت کی تفسیر یہی پائیں تو کہا جائے گا کہ انھوں نے قرآن کو عہد حاضر کی نسبت سے نہیں پایا۔ آج اس آیت کی تفسیر کو تلوار کی شکل میں پانا، قرآن کو گزرے ہوئے ماضی کے نقشہ میں پانا ہے، جب کہ تجدید کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کو وقت کے نقشہ میں پایا جائے۔ خیالات کے اظہار کے لئے شعر و خطابت کی زبان استعمال کرنا، احیائے اسلام کی تحریکوں کا سیاسی رخ اختیار کرنا، وعظ خوانی اور فتوے کو اصلاح امت کے لئے کافی سمجھنا، سب اسی کے مظاہر ہیں۔ دور جدید میں ہمارے جو مصلحین اٹھے انھوں نے اگر فکر حاضر میں اپنے اسلامی شعور کو پایا ہوتا تو وہ جانتے کہ آج کے وہ کون سے افکار و عوامل ہیں جو اجتماعیات میں فیصلہ کن بن گئے ہیں اور ان کے مقابلہ میں احیائے اسلام کی منصوبہ بندی کس طرح ہونی چاہئے۔ ان کے پاس صرف روایتی عقیدہ کا سرمایہ تھا۔ بس اسی کو لئے ہوئے وہ وقت کے سمندر میں کود پڑے۔ بدلے ہوئے زمانے میں اس قسم کا جوش ایمان انھیں کہیں نہیں پہنچا سکتا تھا اور نہ اس نے کہیں پہنچایا۔

انیسویں صدی میں یہ بات پوری طرح نمایاں ہو چکی تھی کہ مذہب کا روایتی ڈھانچہ اس جدید ڈھانچہ میں اپنی جگہ نہیں پا رہا ہے جو سائنس کے زیر اثر بنا ہے۔ اس وقت ضرورت تھی کہ گہرائی کے ساتھ صورت حال کا جائزہ لے کر نیا فکری ڈھانچہ تیار کیا جائے جس میں اسلام دوبارہ اپنی جگہ پا سکے۔ اگر بروقت یہ کام ہو جاتا تو سائنس یا دور جدید صرف یہ کہ مذہب کے حریف نہ بنتے بلکہ اس کو تقویت دے کر اس کو نئی زندگی عطا کرنے والے بن جاتے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ مسیحیت نے سیاسی اقتدار سے محرومی کے بعد ماڈرنزم کی شکل میں سائنس سے سمجھوتہ کر لیا۔ مسلمان دین حق کے حامل ہونے کی وجہ سے اس پوزیشن میں تھے کہ تاریخ جدید کے اس اہم کردار کو ادا کر سکیں، جس طرح انھوں نے نویں صدی عیسوی میں بغداد اور قرطبہ میں وقت کی سائنس اور فلسفہ کے مقابلہ میں اسی قسم کے کردار کو ادا کیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے یہ وہ وقت تھا جب کہ مسلمان قومیں زوال کا شکار ہو چکی تھیں۔ ان کے اندر نہ حوصلہ تھا نہ فکری بلندی۔ مزید یہ کہ جدید اقتصادیات میں اپنی محرومی کی وجہ سے وہ اس قابل نہ رہے تھے کہ اس قسم کے کسی مؤثر کام کی قیمت ادا کر سکیں۔ اپنی پس ماندگی کی وجہ سے مسلمان اس کا ثبوت بھی نہ دے سکے کہ وہ وقت کے اس مسئلہ کو صحیح طور پر سمجھتے ہیں۔ کجا کہ ان سے یہ امید کی جائے کہ وہ گہرائی کے ساتھ اس کا جائزہ لیتے اور زندگی کے جدید نقشہ میں مذہب کو اس کا مقام عطا کرتے۔

موجودہ حالات نے ہمارے لئے جو مسائل پیدا کئے ہیں، وہ دو قسم کے ہیں، فکری اور عملی۔

پہلی جہت کے سلسلے میں اہم ترین کام یہ ہے کہ اسلام کے عقائد و احکام کو جدید استدلالی انداز میں مرتب کیا جائے تاکہ [illegible] آج کی چیز معلوم ہونے لگیں۔ نہ یہ کہ پڑھنے والا یہ سمجھے کہ وہ اس دور کی چیزیں ہیں جب کہ انسان قبائلی دور میں سانس لیتا تھا۔

جدید انداز سے مراد یہ ہے کہ اسلوب تحریر اور مواد استدلال دونوں اعتبار سے وہ جدید علمی معیار کے مطابق ہو۔ موجودہ زمانے میں اسلوب تحریر مکمل طور پر بدل گیا ہے۔ قدیم روایتی اسلوب میں خطیبانہ انداز غالب ہوتا تھا۔ اب سائنسی اور تجزیاتی انداز کو پسند کیا جاتا ہے۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ عبارت کے درمیان اشعار نقل کر دینا۔ زور الفاظ کا مظاہرہ کرنا یا مسجع فقرے لکھنا نفس مضمون کی قیمت میں اضافہ کرتا ہے۔ اب یہ ساری چیزیں معیوب قرار پا چکی ہیں۔ قدیم تصور ادب میں تیر و نشتر قسم کے جملے، مخاطب کے اوپر تیز تیز ریمارک، جذباتی قسم کی عبارتیں انتہائی پسندیدہ ہوتی تھیں۔ مگر اب یہ تمام چیزیں علمی وقار کے خلاف سمجھی جاتی ہیں۔ قدیم ذوق کے مطابق مبالغہ آمیز الفاظ، رنگین ترکیبیں اور استعارے اور تشبیہات ادب کا کمال سمجھے جاتے تھے۔ مگر اب کوئی تعلیم یافتہ آدمی اس قسم کے مضمون کو پڑھنا بھی پسند نہیں کرتا۔

یہی حال مواد کا ہے۔ پہلے زمانے میں یہ بات بھی کسی چیز کو ثابت کرنے کے لئے کافی تھی کہ آدمی اپنے نقطۂ نظر کے حق میں ایک مثال پیش کر دے یا ایک حکایت بیان کر دے۔ مگر اب اس کو غیر معتبر سمجھا جاتا ہے کہ کوئی شخص اس قسم کی چیزوں سے اپنی بات ثابت کرنے لگے۔ پہلے زمانے میں کسی حوالے کے لئے اعدادی قطعیت یا واقعاتی تعین ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا، مگر جدید ذوق کے لئے وہ کلام بے معنی ہے جس میں تعیناتی زبان استعمال نہ کی گئی ہو۔ قدیم طریقے میں استدلال کی بنیاد تمام تر قیاسی منطق ہوا کرتی تھی۔ مگر اب قیاسی منطق بے قیمت ہو گئی ہے۔ اب تاریخی، مشاہداتی اور تجزیاتی انداز میں بات کو ثابت کرنے کا نام ثابت کرنا ہے۔ قدیم انداز میں آدمی مناظر اور مبلغ بن کر ایک وکیل کی طرح بالکل برہنہ انداز میں اپنے نقطۂ نظر کی طرف سے بولتا تھا۔ اب غیر شخصی جائزے کو معیاری انداز سمجھا جاتا ہے۔

پچھلے سو برس میں ہمارے یہاں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے بہت سی کتابیں بجائے خود قیمتی بھی ہیں۔ مگر دور جدید کے اعتبار سے ان کی افادیت محض جزوی ہے۔ کیونکہ وہ بیشتر خطیبانہ نثر کا نمونہ ہیں۔ سائنسی طرز استدلال پر تحریری کام ابھی تک ہمارے یہاں تقریباً صفر کے درجے میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان اسلام کو سمجھنے کے لئے بھی مستشرقین کی کتابیں پڑھتے ہیں جو، خواہ ہمارے نزدیک غلط ہوں، تاہم وہ اپنے انداز اور اسلوب کے اعتبار سے جدید معیار کی حامل ہوتی ہیں۔ مسلم مصنفین کی لکھی ہوئی کتابیں ان کو اپیل نہیں کرتیں۔

عملی مسائل کی فہرست، جن کے حل کے لئے وقت کے نظام اجتماعی میں تغیر ضروری ہے، بہت طویل ہے۔ وقت کا اجتماعی نظام، قومی اور بین اقوامی دونوں اعتبار سے، سراسر غیر خدائی بنیاد پر قائم ہے۔ اس کے ڈھانچے میں رہتے

الرسالہ دسمبر ۱۹۷۶ء

ہم

ہوئے دین کے اجتماعی قوانین پر عمل کرنا ممکن نہیں رہا ہے۔ مگر یہاں اسلام نے جو راہ عمل تجویز کی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو ایک انقلاب پسند لیڈر عام طور پر اختیار کرتا ہے۔

اس کا حل موجودہ زمانے کی اسلامی جماعتوں نے یہ نکالا ہے کہ نظام حاضر سے ٹکرا جائیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ اجتماعی ایمان اگر ہمیں حاصل نہیں تو اس کے حصول کی خاطر موت تو ہمارے بس میں ہے۔ پھر کیوں نہ ہم "بے ایمان" زندگی کے مقابلہ میں "ایمان دار" موت کو ترجیح دیں۔

یہ خطرناک غلط فہمی اس لئے پیدا ہوئی کہ اس دور میں اٹھنے والے مصلحین امت اس نکتہ کو نہ سمجھ سکے کہ اجتماعی اسلام کے لئے جدوجہد کا مقام آغاز اجتماعی اسلام نہیں، دعوت ہے۔ ہمارے کام کا آغاز اسلامی نظام کے قیام کے لئے براہ راست اقدام سے نہیں ہوگا بلکہ اساسات اسلام کی طرف دعوت سے ہوگا۔ مکہ میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلامی جدوجہد کا حکم دیا گیا تو یہ نہیں کہا گیا کہ مکہ کی پارلیمنٹ (دارالندوہ) میں نمائندگی حاصل کرنے کا مطالبہ کرو یا کعبہ کی تولیت پر قبضہ کرنے کی کوشش کرو۔ بلکہ توحید اور مواساۃ بنی آدم سے متعلق سادہ تعلیمات بھیجی گئیں اور حکم ہوا کہ لوگوں میں ان کی تبلیغ کرو۔ اس سے آگے کی چیزیں، جن کے حصول کے لئے اجتماعی انقلاب ضروری ہے، ان کے بارے میں حکم دیا گیا کہ انھیں چھیڑنے کے بجائے ان کو برداشت کرو اور اس وقت کا انتظار کرو جب اللہ حالات میں ایسا تغیر فرمائے جب کہ بقیہ مسائل کے حل کی راہ نکل سکے۔ (یونس۔ آخر)
اس معاملہ میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ ممکن دائرہ میں دین پر عمل کرتے ہوئے دعوتی جدوجہد شروع کر دو، اور بقیہ تمام امور کو متوقع نصرت الٰہی کے خانہ میں ڈال دو۔ یہی مطلب ہے حکم دعوت کے بعد یہ کہنے کا کہ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (مدثر) اساسات دین کی طرف پر امن دعوت اور غیر اسلامی تسلط کی وجہ سے جو مشکلات و مسائل پیش آئیں، ان پر صبر، یہی تمام انبیاء کا طریقہ رہا ہے اور یہی آج بھی ان لوگوں کا طریقہ ہونا چاہئے جو مخالف ماحول میں اسلام کے احیاء کے لئے اٹھیں۔

اس کا محرک دنیاداری ہے نہ کہ دین داری

"مولوی صاحب" ایک صاحب نے تیز و تند لہجے میں کہا "آپ لوگ اپنی دینی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں بالکل ناکام ثابت ہوئے ہیں۔"

"کیوں"

"آپ لوگ اب تک عوام کو یہ نہ بتا سکے کہ نس بندی جائز ہے یا ناجائز۔ کوئی مولوی کہتا ہے جائز ہے، کوئی کہتا ہے ناجائز ہے۔"

آج کل اکثر اس قسم کی باتیں سننے میں آتی ہیں۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو زندگی کے معاملات میں جائز اور ناجائز جاننے کی بہت زیادہ فکر ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس معاملہ میں انھیں اسلام کا ٹھیک ٹھیک حکم معلوم ہو جائے تاکہ اس پر وہ صدق دل کے ساتھ عمل شروع کر دیں۔ واقعات بتاتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ اس سے پہلے بے شمار امور میں علمار نے متفقہ طور پر صاف صاف فتوے دیئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ صاحب نصاب کے لئے اپنے مال سے ہر سال زکوٰۃ نکالنا فرض ہے۔ اگر ایک شخص صاحب نصاب ہوتے ہوئے زکوٰۃ نہیں نکالتا تو اس کا سارا مال اس کے لئے حرام ہے تاوقتیکہ وہ اس کی باقاعدہ زکوٰۃ نہ نکالے۔ کیا اس مسئلہ کو بیان کرنے کے بعد سارے مسلمان اپنے اموال سے باقاعدہ زکوٰۃ نکالنے لگے۔

علمار نے بار بار شریعت کا یہ حکم مسلمانوں کو بتایا ہے کہ ایک مسلمان کے لئے دوسرے مسلمان کی جان، مال اور آبرو حرام ہے۔ کیا اس کے بعد ایسا ہوا کہ ہر مسلمان اپنے دوسرے بھائی کی ان چیزوں کو خنزیر کی طرح حرام سمجھ کر اس سے بچنے لگا۔ علمار نے کتنی ہی بار اپنی تقریروں اور تحریروں میں بتایا ہے کہ "استمداد" صرف اللہ کے لئے

قناعت

شفیق احمد انبالہ والے، دہلی

کہا جاتا ہے کہ مالک دینارؒ، رابعہ بصریؒ کی خدمت میں آئے۔ دیکھا کہ وہ ٹوٹے ہوئے لوٹے سے وضو کر رہی ہیں، پرانی چٹائی کا بستر ہے اور تکیہ کی جگہ اینٹ رکھی ہوئی ہے۔ افسوس کے ساتھ بولے:

"اے رابعہ! میری ملاقات دولت مندوں سے ہے۔ اگر اجازت ہو تو ان سے کہہ دوں،"

رابعہ بصریؒ نے جواب دیا: "کیا ایک ہی خدا سب کو روزی نہیں دیتا۔ کیا وہ درویشوں کو روزی دینا بھول گیا ہے اور دولت مندوں ہی کی روزی یاد رکھتا ہے؟"

مالک دینارؒ نے کہا: "نہیں"

رابعہ بصری نے جواب دیا: "پھر اس کو یاد دلانے کی کیا ضرورت ہے؟"

ہے۔ غیر اللہ کو پکارنا یا اس سے مدد چاہنا مطلق حرام ہے۔ کیا اس کے بعد سارے مسلمان غیر اللہ سے استعانت چھوڑ کر صرف اللہ سے امیدوار بن کر اس سے لپٹ گئے۔

اس طرح کی بے شمار مثالیں ثابت کرتی ہیں کہ علماء کے کھلے کھلے فتاوی کے باوجود لوگوں نے شریعت کے حکم کی کوئی پروا نہیں کی اور ان کی زندگی کی گاڑی بدستور اپنی ڈگر پر چلتی رہی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ نس بندی کے معاملے میں لوگ اتنا زیادہ بے تاب ہیں کہ شریعت ان کی رہنمائی کرے۔

اس کی وجہ لوگوں کی دنیا پرستی ہے نہ کہ آخرت پسندی۔ دراصل لوگوں کی صاحب اولاد ہونے کی تڑپ نے انھیں اس معاملہ میں اتنا پرجوش بنا دیا ہے نہ کہ صاحب شریعت ہونے کی تڑپ نے۔ ایسے معاملات جن میں وہ خود اپنے دنیا پرستانہ ذہن کی وجہ سے پرشوق ہیں، ان میں وہ شریعت کو بھی اپنے ساتھ ایک تائیدی عنصر کی حیثیت سے شامل کر لینا چاہتے ہیں اور جن معاملات کو ان کا دنیا پرستانہ ذہن کوئی اہمیت نہیں دیتا، ان میں انھیں شریعت کا حکم جاننے کی بھی ضرورت نہیں۔

ایک مثال لیجئے، آزادی کے بعد حکومت نے فیصلہ کیا کہ سرکاری تعلیم گاہوں میں سیکولر تعلیم دی جائے گی۔ کسی خاص مذہب کی تعلیم و تربیت ممنوع ہوگی۔ یہ کتنا اہم مسئلہ تھا۔ مگر اس کے لئے مسلمانوں میں کوئی خاص بے چینی پیدا نہیں ہوئی۔ کیوں۔ اس لئے کہ اس فیصلہ سے ان کی دنیا پرستانہ زندگی پر کوئی براہ راست زد نہیں پڑتی تھی۔ جس چیز کے بگڑنے کا اندیشہ تھا وہ آخرت تھی نہ کہ دنیا۔ اور جب دنیا سلامت ہو تو کسی کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۷۶

آپس کا لڑائی جھگڑا

آسمان سے آئی ہوئی مدد کو

دوبارہ لوٹا دیتا ہے

اسلام میں اتحاد و اتفاق کو بے حد اہمیت دی گئی ہے۔ اس کا سب سے زیادہ نازک پہلو یہ ہے کہ وہ مسلم گروہ خدا کی نصرت سے محروم ہو جاتا ہے جس کے افراد آپس میں ایک دوسرے سے جھگڑنے لگیں۔ حدیث میں ہے کہ لیلۃ القدر کے تعین کا علم صرف اس لئے اٹھا لیا گیا کہ مدینہ میں دو مسلمان باہم لڑ پڑے تھے:

عن عبادۃ بن الصامت قال خرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم لیخبرنا بلیلۃ القدر فتلاحی رجلان من المسلمین فقال خرجت لاخبرکم بلیلۃ القدر فتلاحی فلان وفلان فرفعت

عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز نکلے کہ ہم کو شب قدر کے بارے میں بتا دیں کہ وہ کس شب میں ہے۔ اس وقت دو مسلمان آپس میں (ایک قرض کے بارے میں) لڑ پڑے۔ آپ نے فرمایا، میں اس لئے نکلا تھا کہ تم کو شب قدر کی خبر دے دوں۔ مگر فلاں اور فلاں آپس میں لڑ پڑے۔ پس اس کا علم اٹھا لیا گیا۔

ابن کثیر لکھتے ہیں "اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام لڑائی جھگڑے کو کس قدر برا سمجھتا ہے، یہاں تک کہ اس کی وجہ سے بڑی بڑی برکتیں اٹھالی جاتی ہیں۔"

تعمیرِ ملت

مصر کے سلطان صلاح الدین (۱۱۹۳ـــ۱۱۳۷) اور ہندستان کے سلطان ٹیپو (۱۷۹۹-۱۷۵۱) دونوں جوشِ ایمان اور شجاعت اور جنگی اہلیت کے اعتبار سے یکساں حیثیت کے مالک تھے۔ دونوں کو "مغربی طاقت" سے مقابلہ پیش آیا۔ مگر اول الذکر فلسطین کا فاتح بنا جب کہ دوسرے کے حصہ میں صرف یہ آیا کہ حریف سے شکست کھا کر شہید ہو جائے۔ اس فرق کے پیچھے کوئی طلسماتی راز نہیں، ایک سادہ سی حقیقت ہے: سلطان ٹیپو کو اٹھارویں صدی کا زمانہ ملا جب کہ جنگی صنعت میں مغرب نے اجارہ داری حاصل کرلی تھی۔ اس نے روایتی دستی ہتھیاروں کی جگہ بہتر قسم کے دور مار ہتھیار دریافت کر لئے تھے اور سمندری طاقت پر مکمل طور پر اپنا قبضہ قائم کر لیا تھا۔ اس کے برعکس سلطان صلاح الدین کو بارھویں صدی عیسوی میں کام کرنے کا موقع ملا جب کہ مسلمان جنگی صنعت میں دنیا کی امامت کر رہے تھے۔ اس زمانے میں شام و مصر اور عراق میں کثرت سے ایسی کارگاہیں تھیں جہاں اس وقت کی دنیا کے سب سے بہتر آلاتِ حرب تیار ہوتے تھے۔ عباسی دور میں رومی حملوں کی مدافعت اور صلیبی جنگوں کے دور میں یورپی قوموں کی یورشیں روکنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ خاص طور پر صلیبی جنگوں کے زمانے میں اس علاقے میں جنگی صنعت کو بڑا فروغ ہوا۔ حتی کہ صلیبی لڑائیوں کے دور میں جب کوئی صلح کا وقفہ ہوتا تو اہل یورپ خاص طور پر ہتھیار خریدنے کے لئے شام و مصر کے بازاروں میں آتے تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں مسلم علماء کو فتویٰ دینا پڑا کہ مسیحیوں کے ہاتھ اسلحہ فروخت کرنا حرام ہے، کیونکہ ہم سے خریدے ہوئے ہتھیاروں کو وہ دوبارہ ہمارے ہی خلاف استعمال کریں گے۔

یہی وہ قوت ہے جس کو قرآن میں قوتِ مرہبہ (انفال ــ ۶۰) کہا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ اس کو اس حد تک حاصل کرو کہ دوسروں کے اوپر تمہارا رعب قائم ہو جائے۔

قوتِ مرہبہ کے دو درجے ہیں۔ ایک وہ جو تمام مسلمانوں سے متعلق ہے اور ہر مسلم گروہ اپنی بساط کے مطابق اس کے حصول کی جدوجہد کر سکتا ہے۔ دوسرے وہ جس کا تعلق صرف اس مسلم معاشرہ سے ہے جو بااقتدار ہو۔ موجودہ زمانے میں ان دونوں قوتوں کے معنی کیا ہیں اور ان کو کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے، اس کی وضاحت کے لئے ہم جاپان اور روس کی مثال دیں گے۔

دوسری جنگِ عظیم (۱۹۳۹-۴۵) میں جب جاپان کو شکست ہوئی اور اس کو غیر مسلح کر کے امریکی فوجوں نے جاپان پر قبضہ کر لیا۔ تو جاپان کے لئے عسکری اور سیاسی عزائم کے دروازے بند ہو گئے۔ اس موقع پر شہنشاہ جاپان ہیروہٹو (۱۹۰۱-   ) نے تقریر کی اور کہا کہ "ہمیں ایک ناقابل برداشت کو برداشت کرنا ہے، تاکہ ہم جاپان کی اگلی نسلوں کی تعمیرِ نو کر سکیں۔" اب پورا جاپان غیر سیاسی میدانوں میں ترقی کی راہ پر لگ گیا۔ انھوں

نے اپنے ماسٹروں کو منسٹروں کی تنخواہ اور مجسٹریٹوں کے اختیارات دے دیئے تاکہ تعلیم کے معیار کو انتہائی حد تک بلند کر سکیں۔ صحافت کو اتنی ترقی دی کہ آج دنیا میں سب سے زیادہ چھپنے والا اخبار جاپانی اخبار ہے۔ سائنس اور صنعت میں اتنا زیادہ کمال پیدا کیا کہ لوہا نہ ہونے کے باوجود وہ دنیا کی سب سے بڑی مشین (سپر ٹینکر) بناتے ہیں۔ انھوں نے اپنی مصنوعات کو کوالٹی کے اعتبار سے اتنا بلند کیا کہ اس کو نقص بدرجہ صفر (ZERO DEFECTS) کے مقام تک پہنچا دیا۔ قومی احساس اور نظم و ضبط میں اتنی ترقی کی کہ آج دنیا کی کوئی قوم اس معاملہ میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ ترقیاں اگرچہ بظاہر غیر عسکری اور غیر سیاسی تھیں۔ مگر وہ اتنی طاقت ور ثابت ہوئیں کہ اس کے بعد کسی مقابلہ کے بغیر امریکہ نے جاپان کی سرزمین سے اپنی فوجوں کو واپس بلا لیا۔

تعمیر و ترقی کا یہ میدان، اپنی بساط کے مطابق، ہر مسلمان گروہ کے لئے کھلا ہوا ہے خواہ وہ اقلیت میں ہو یا اکثریت میں۔ بے اقتدار ہو یا با اقتدار۔ اسی ترقی کی بدولت افریقہ کے متعدد ملکوں میں یہ حال ہے کہ ملک کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے مگر عملاً سیاست اور دوسرے اجتماعی شعبوں پر عیسائی قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ کیونکہ وہ علم و سائنس، صنعت و حرفت اور نظم و ضبط میں مسلمانوں سے بڑھے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر نیجیریا کی آبادی میں مسلمانوں کی تعداد ۶۵ فی صد ہے اور عیسائیوں کی صرف ۲ فی صد۔ مگر ۱۹۷۴ میں وہاں کی پندرہ رکنی کابینہ میں ۵ مسلم وزیر تھے اور ۱۰ عیسائی وزیر۔ اس فرق کی وجہ تعلیم میں عیسائیوں کی برتری اور مسلمانوں کی پس ماندگی ہے۔ سرکاری مدارس میں مسلم طلبہ کی تعداد ۲۵ فی صد سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اعلیٰ مراحل کی تعلیم میں تناسب اور بھی کم ہو جاتا ہے جب کہ عیسائی طلبہ ملک میں دو فی صد ہونے کے باوجود تعلیمی اداروں میں بھرے ہوتے ہیں۔

دوسری نوعیت کی ایک مثال روس ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ نے اپنے حریف سوویت روس کے خلاف یہ اسکیم بنائی کہ وہ اس کے سرحدی ملکوں سے معاہدے کر کے وہاں اپنے فوجی اڈے قائم کرے اور اس کو اپنے گھیرے میں لے لے۔ ناٹو (NATO)، سیٹو (SEATO) اور سنٹو (CENTO) اسی قسم کے معاہدات تھے جن کے ذریعے امریکہ نے اپنی جنگی مشین کو اٹلانٹک پار کر کے یورپ، شمالی افریقہ اور ایشیا تک پہنچا دیا، اس طرح اپنے دور دراز فوجی اڈوں کے ذریعے وہ اس پوزیشن میں ہو گیا کہ کمیونسٹ دنیا کو عین اس کی سرحدوں کے پاس نشانہ بنا سکے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ روس کو تو اپنے دشمن پر وار کرنے کے لئے زمین کے گولے کی ایک چوتھائی مسافت طے کرنی ہوگی۔ جب کہ امریکی اڈے اس کی سرحد کے اتنے قریب ہیں کہ وہ پانچ سے دس منٹ کے اندر سوویت روس کے تمام اہم ترین نشانوں پر پہنچ سکتے ہیں۔

اب روس نے یہ کیا کہ سائنس دانوں کی ایک فوج اس کام پر مامور کر دی کہ وہ ایسا تیز رفتار ہتھیار دریافت کریں جس کے ذریعہ ماسکو کے حکمراں اپنے ملک میں بیٹھے بیٹھے امریکہ کے ٹھکانوں کو نشانہ بنا سکتے ہوں۔ ستمبر ۱۹۵۹ میں روسی راکٹ لیونک نمبر ۲ کا ٹھیک اندازہ کے مطابق چاند پر پہنچنا اس بات کا خاموش اعلان تھا کہ تحقیق کامیاب ہو چکی ہے۔ زمین سے چاند کا فاصلہ روس سے امریکہ کے فاصلہ کے مقابلہ میں پچاس گنا زیادہ ہے۔

اب [illegible] ٹنوں کا بکس چاند پر پہنچا سکتا ہے، وہ بم کے گولے بھی دور دراز ملکوں میں گرا سکتا ہے۔ ریڈیائی [illegible] اہلیت کا مظاہرہ خلائی پرواز میں ہوا، وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم [illegible] زمینی نشانوں پر نہایت صحت کے ساتھ گرائے جا سکتے ہیں۔ اس دریافت کا سامنے آنا تھا کہ امریکہ کی فوجی حکمت عملی اچانک بے بنیاد عمارت کی طرح زمین پر آگئی۔

روس کو زمینی چیلنج دیا گیا تھا۔ اس نے اس کا آسمانی حل دریافت کر لیا۔ معلوم ہوا کہ اس دنیا میں ترقی کی کوئی آخری حد نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ نے طاقت و قوت کے بے پناہ امکانات رکھ دیئے ہیں اور حوصلہ اور ہمت ہو تو ہر مشکل کا ایسا بالاتر حل دریافت کیا جا سکتا ہے کہ دشمن کی ساری کارروائیاں بطل ما کانوا یعملون (اعراف — ۱۱۸) کا مصداق ہو کر رہ جائیں۔

اگرچہ اس دنیا میں اہل ایمان کا اصل مشن دعوت و تبلیغ ہے۔ مگر یہ واقعہ کہ یہ دنیا ایک مادی دنیا ہے اور یہ واقعہ کہ یہاں ہمیشہ حق کی مخالفت کرنے والے گروہ موجود رہتے ہیں، اہل ایمان کے لئے ضروری کر دیتا ہے کہ وہ مادی اسباب کی فراہمی میں بقدر وسع پوری جدوجہد کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کے ۱۳ ویں سال مکہ سے انتہائی بے سروسامانی کے ساتھ ہجرت کی۔ مگر اس کے دس برس بعد جب آپ نے فتح مکہ کے لئے مارچ کیا تو ایک طرف تبلیغی کام اس حد تک پھیل چکا تھا کہ دس ہزار مردان کار آپ کے ہمرکاب تھے۔ دوسری طرف تیاری کا یہ عالم تھا کہ ان میں سے دو ہزار آدمی اس طرح زرہ پوش تھے کہ ان کی صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں (لا یری منھم سوی الحدق، طبری)

موجودہ زمانے میں اس سنت پر عمل کرنے کی اہمیت پہلے سے بھی زیادہ شدید ہو گئی ہے۔ آج کی جنگوں میں عضلاتی طاقت کے بجائے مشین کی اہمیت اتنی زیادہ بڑھ چکی ہے کہ فوجی نسلوں (MARTIAL RACES) کا قدیم تصور زمانہ ماضی کا افسانہ بن گیا ہے۔ اسی طرح اقتصادی ذرائع نے موجودہ زمانہ میں اس قدر وسعت اختیار کی ہے کہ پوری انسانی زندگی اس کے تابع ہو گئی ہے۔ قدیم زمانہ میں دعوت و تبلیغ کا کوئی براہ راست تعلق اقتصادیات سے نہ تھا مگر آج اگر آپ علم کو دعوت و تبلیغ کے لئے استعمال کرنا چاہیں تو عظیم اقتصادی وسائل کے بغیر اس کو موثر طور پر استعمال ہی نہیں کر سکتے۔ پھر جب اس واقعہ کو دیکھا جائے کہ دوسرے مذاہب ہوائی جہازوں اور ریڈیو اسٹیشنوں کے ذریعے اپنے دین کی تبلیغ کر رہے ہیں تو یہ اقتصادی ضرورت سیکڑوں گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح شخصی ضرورت کے لئے بھی آج اقتصادی وسائل کی اہمیت پچھلے تمام ادوار سے زیادہ ہے۔ آج انسان کی حقیقی ضروریات اتنی بڑھ چکی ہیں کہ قدیم طرز کی افسانوی سادگی کے ساتھ زندگی گزارنا ممکن ہی نہیں۔

مسلمان کی اصل ذمہ داری اگرچہ دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری ہے۔ مگر مندرجہ بالا وجوہ تقاضا کرتے ہیں کہ اسی کے ساتھ یہ جدوجہد بھی بھرپور طور پر کی جائے کہ مسلمان جدید اقتصادیات میں اپنا جائز حصہ پا سکیں۔ انفرادی حیثیت سے بھی اور قومی حیثیت سے بھی۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۷۶

آواز: قدرت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ

ہم جو الفاظ بولتے ہیں، وہ بے آواز لہروں کی صورت میں ہوا پر اسی طرح سفر کرتے ہیں جس طرح پانی کی سطح پر موجیں پیدا ہوتی ہیں اور بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ ایک شخص کے منھ سے نکلی ہوئی آواز کے آپ تک پہنچنے کے لئے درمیان میں ہوا کا ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ درمیانی واسطہ نہ ہو تو دو قریب بیٹھے ہوئے آدمی ایک دوسرے کا ہونٹ ہلتے ہوئے دیکھیں گے مگر وہ ایک دوسرے کی بات نہ سن سکیں گے۔

اس کو مثال کے ذریعہ یوں سمجھ سکتے ہیں کہ شیشہ کے ایک فانوس کے اندر برقی گھنٹی رکھ کر اسے بجایا جائے تو اس کی آواز صاف سنائی دے گی۔ لیکن اگر فانوس کے اندر کی ہوا کو پوری طرح نکال کر اسے بند کر دیا جائے اور اس کے بعد گھنٹی بجائی جائے تو آپ شیشہ کے اندر گھنٹی کو بجتا ہوا دیکھیں گے، مگر اس کی آواز نہ سنیں گے۔ کیونکہ گھنٹی کے بجنے سے جو ارتعاش پیدا ہوتا ہے، اس کو قبول کر کے آپ کے کانوں تک پہنچانے کے لئے شیشہ کے اندر ہوا موجود نہیں ہے۔

مگر ریڈیائی خبر رسانی کے لئے ہوا کا ذریعہ بالکل ناکافی ہے۔ کیونکہ ہوا کے ذریعہ ہماری آواز پانچ سکنڈ میں صرف ایک میل کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہوا کا ذریعہ صرف قریبی ماحول میں گفتگو کے لئے کارآمد ہے۔ وہ ہماری آواز کو دور تک نہیں پہنچا سکتا۔ اس کا اندازہ آپ اس طرح کر سکتے ہیں ہندستان سے اگر ہم اپنی آواز کو امریکہ بھیجنا چاہیں تو اسی رفتار سے وہ اپنی منزل پر سات گھنٹے میں پہنچے گی۔ ظاہر ہے کہ دوسری طرف سے جواب آنے میں بھی اتنی ہی دیر لگے گی۔ گویا نئی دہلی کا ایک شخص نیویارک میں اپنے ایک ساتھی کو ٹیلی فون کر رہا ہو تو اس رفتار سے اپنے ایک فقرہ کا جواب سننے کے لئے اس کو چودہ گھنٹہ تک انتظار کرنا پڑے گا

اگر آواز صرف ہوا کے ذریعے پھیلتی تو اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا ممکن نہ ہوتا۔ مگر قدرت نے اس کے لئے ہمیں ایک اور انتہائی تیز رفتار ذریعہ مہیا کیا ہے۔ یہ روشنی یا برقی رو ہے جس کی رفتار ایک سکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل سے بھی زیادہ ہے۔ ریڈیائی پیغامات میں اسی ذریعہ سے کام لیا جاتا ہے۔

جب کوئی بولنے والا ریڈیو اسٹیشن میں لگے ہوئے مائکرو فون کے پاس آواز نکالتا ہے تو مائکرو فون آواز کو لے کر اسے برقی رو میں تبدیل کر دیتا ہے اور تار کے ذریعہ اس کو فی الفور آلہ نشر (ٹرانس میٹر) تک بھیج دیتا ہے۔ آلات نشر آواز کے پہنچتے ہی مرتعش ہو کر فضا میں دوبارہ وہی ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں جو مقرر کے بولنے سے ہوا تھا۔ اس طرح پانچ سکنڈ میں ایک میل چلنے والی آواز برقی لہروں میں تبدیل ہو کر ایک سکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کی رفتار حاصل کر لیتی ہے۔ اس طرح آواز ایک سکنڈ کے ۸ ویں حصے میں پوری دنیا میں پھیل جاتی ہے کیونکہ زمین کا پورا گھیرا صرف ۲۵ ہزار میل ہے۔ یہی تیز رفتار لاسلکی موجیں ہیں جن کو ہمارے ریڈیو سٹ کی آواز گیر مشین لیتی ہے اور پھر بلند آواز میں ان کا اعادہ کر دیتی ہے۔ اس طرح ہزاروں میل دور بولی ہوئی آواز کو ہم کسی تاخیر کے بغیر سننے لگتے ہیں۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۷۶

مصری ریڈیو کے ہفت روزہ ترجمان مجلۃ الاذاعۃ والتلیفزیون (۱۰ر جون ۱۹۷۶) نے مولانا وحیدالدین خاں کی تازہ عربی کتاب الاسلام والعصر الحدیث پر جو تبصرہ شائع کیا ہے، اس کا خلاصہ یہاں دیا جا رہا ہے۔ اس طرح کے تبصرے عرب دنیا کے تقریباً تمام قابل ذکر اخبارات و رسائل میں نمایاں طور پر شائع کئے گئے ہیں۔ یہ تبصرے بتاتے ہیں کہ سارا عالم اسلام آج ایک نئی اسلامی دعوت کے انتظار میں ہے، ایک ایسی دعوت جو ایک طرف اہل اسلام کے اندر از سر نو ایمانی حرارت پیدا کرے اور دوسری طرف دیگر اقوام تک خدا کا پیغام پہنچانے کی منصوبہ بندی کرے۔

ہندستانی اسلامی مفکر علامہ وحیدالدین خاں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ انھوں نے اس سے پہلے اسلامی کتب خانہ کو الاسلام یتحدیٰ، الدین فی مواجہۃ العلم، حکمۃ الدین جیسی کتابیں دی ہیں۔ وہ ہمارے ان بہت سے اسلامی مصنفین کی طرح نہیں ہیں جو محض لکھنے پر قادر ہوتے ہیں ان کے سلسلہ میں صرف یہ ہوتا ہے کہ ہزاروں صفحات سیاہ کرکے ان سے بیسیوں کتابیں بنا لیں، جن سے لائبریریاں تو بھر جاتی ہیں، مگر نہ وہ ہمارے اندر کوئی گونج پیدا کرتیں اور نہ ان مسلم نوجوانوں پر کچھ اثر ڈالتی ہیں جو کہ سنجیدہ اسلامی فکر کے پیاسے ہیں۔ ہمارا یہ عظیم اسلامی مفکر ان چند اصحاب قلم میں سے ہے جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ جنھوں نے اپنے لئے ایک نہایت مشکل راستہ اختیار کیا ہے، کیونکہ وہ مفکرانہ صلاحیت کے حامل ہیں نہ کہ صرف صاحب قلم ہیں۔ یہ مشکل راستہ ان چیلنجوں کا سامنا ہے جو اسلام کو داخلی اور خارجی دونوں حیثیتوں سے درپیش ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں ساٹھ سے زیادہ صفحات نہیں معمولی قاری اس کو ایک گھنٹے سے بھی کم میں پڑھ لے گا۔ مگر صاحب علم قاری کے لئے اس کو سمجھنے میں کئی دن لگ جائیں گے۔ کیونکہ یہ کتاب حجم کے اعتبار سے اگرچہ مختصر ہے، مگر کیفیت کے اعتبار سے وہ گہری سوچ کی طالب ہے کیونکہ وہ نہایت اہم سوالات پر بحث کرتی ہے۔ ان سوالات پر اس سے پہلے بھی بحثیں کی جا چکی ہیں مگر جو چیز یہاں نئی ہے وہ اس کے مفکر مولف کا منہج اور طریقہ جو کہ موضوعی اور مجرد ہے۔ اور عاقلانہ منطقیت پر مبنی ہے نہ کہ اس دینی جوشیلے پن پر جو کہ ہمارے علاقائیت پسند اسلامی مصنفین کے محدود افکار پر چھایا رہتا ہے۔

اس عظیم اسلامی مفکر نے فقط میسر شدہ دینی حوالوں پر اکتفا نہیں کیا ہے جن پر عموماً مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے اعتماد کر لیا جاتا ہے۔ بلکہ انھوں نے دنیا کی جدید فکری تحریکوں کا مطالعہ کیا ہے خصوصاً ان تحریکوں کا جو فکر اسلامی سے متصادم ہیں۔ انھوں نے ان تحریکوں کے نقائص اسی معیار استدلال سے واضح کئے ہیں جو کہ ان تحریکوں کے نزدیک قابل اعتماد ہیں۔ اس طرح یہ عظیم مفکر اس پر قادر ہوا ہے کہ عام انسانیت کی سطح پر اسلامی فکر کے لئے جگہ پیدا کرے۔

زیر تبصرہ کتاب الاسلام والعصر الحدیث جو کہ ہمارے

الإســلام .. والعصــر الحديث

"للعلامة وحيد الدين خان"

المفكر الاسلامي الهندي العلامة وحيد الدين خان ،
س في حاجة الى التعريف به ، فهــو الذي قدم
للمكتبة الاســلامية من قبل .. الاسلام يتحــدى
- الدين في مواجهة العلم - حكمة الدين .. وهــو

ليس ككثير من كتابنا الاســلاميين الذين يملكون
- فحسب - القدرة على الكتابة ، وفي استطاعتهم
ان يســودوا آلاف الصفحات ليحــولوها الى عشرات
الكتب ، تتخم بها المكتبات دون ان يكون لها صدى

في نفوسنا ، او تاثير في تفكير شبابنا المســلم
المتعطش الى الفكر الاسلامي الجاد .. وانما مفــكرنا
الاسلامي الكبير من الكتاب القلائل ، الذين يعدون
على الاصابع ، والذين قد اشتقوا لانفسهم طريقــا

مرا ، لانهم يملكون القدرة على التفكير لا القدرة
على الكتابة وحدها .. هذا الطريق الوعر هو طريق
المواجهة بالاسلام ضد التحديات التى تهب عليه من
خلفه ومن خارجه على السواء ..

ان صفحات الكتاب لم تتجاوز الستين صفحة ،
، يقرؤه القــارئ العادى فى اقل من ساعة ، لكن
القارئ المثقف لا يستوعبه الا فى بضعة ايام ، لان
الكتاب على تواضعه من حيث الكم ، يحتاج الى تامل
عميق من حيث الكيف ، لانه يناقش قضــايا على

جانب من الاهمية ، هذه القضــايا ، هى : الثورة
الفكرية قبل الثورة التشريعية - حوار مع المتغربين -
امكانيات لم يستخدمها العالم الاسلامى - الايمان
حركة الايمانية - ثم نحو بعث جديد .. ومثل

هذه القضايا قد بحثت من قبل ونوقشت لكن الجديد
هنا هو منهج الكاتب المفكر ، المنهج الموضوعي
المجرد ، القائم على المنطق الواعي لا على العاطفة
الدينية التى تشــكل عقليات الكثير من كتــابنا
الاسلاميين التقليديين فى تفكيرهم المحدود ..

فالمفكر الاسلامى الكبير فى بحثه ، لا يعكف على
النصوص الدينية الميسرة له ، ليعتمد عليها وحدها
مجردة فى مناقشة القضايا ، بل يتابع مسار الحركة
الفكرية الحديثة فى العالم ، ولا سيما المعارض منها

للفكر الاسلامى ، ليكشف عن قصورها بنفس المقاييس
المنهجية عند أصحابها ، وبذلك يستطيع المفكر الكبير
ان يفسح مكانا للفكر الاسلامى على مستوى الانسانية
العامة ..

وبعد - فان الدراسة التى بين ايدينا .. الاسلام
والعصر الحــديث .. والتى قامت بنشرها دار ..

المختار الاسلامى بالقاهرة .. دراسة جادة بكل ما فى
هذه الكلمة من معنى ، تجعلنــا نزداد اقتناعا بان

المفكر المســلم العلامة وحيد الدين خان يتميز بانه
كاتب يخطط لما يكتب ، ويرسم المنهج لما يفكر ،
ليصل الى النتيجة التى يبتغيها ، والنتيجة عنده ذات

شــعب ثلاث : الاولى مواجهة الافكار التى تتحدى
الاسلام وتتربص به ، والثانية : الضرب على الافكار
الدخيلة على الاسلام ، التى ابتلى بها الاسلام على

فترات من الغفلة ، والثالثة والاخيرة ، صــياغة
الفكر الاسلامى صياغة جديدة تجعله جديرا بان يحتل
المكان اللائق به ، وجديرا ايضا بان يمثل الاسلام
الصحيح الذى رضيه الله لعباده دينا ..

مجلة الإذاعة والتليفزيون (القاهرة) ١٧/٦/١٩٧٦

[illegible] ہے جس کو قاہرہ کے المختار الاسلامی نے شائع کیا ہے۔ اپنے پورے مفہوم کے اعتبار سے ایک وسیع مطالعہ ہے۔ اس نے ہمیں اس مزید یقین سے ہم کنار کیا ہے کہ مسلم مفکر علامہ وحید الدین خاں کا امتیاز یہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، پہلے اس کی پلاننگ کرتے ہیں۔ اپنی تفکیر کا منہج خود طے کرتے ہیں تاکہ اپنے مطلوبہ نتیجہ تک پہنچ سکیں۔ نتیجہ ان کے یہاں تین شقوں میں تقسیم ہوتا ہے: اول، اسلام کو چیلنج کرنے والے اور اس کا نشانہ بنانے والے افکار کا سامنا کرنا۔ دوم، ایسے افکار کی سرکوبی جو اسلام کے اندر گھس آئے ہوں اور جو غفلت کے زمانوں میں اسلام کے لئے آزمائش بنے۔ سوم، اسلامی فکر کو نئے طریقے سے اس طرح ترتیب دینا کہ وہ اس مقام کو حاصل کرسکے جس کا وہ مستحق ہے اور اس قابل ہوجائے کہ اس حقیقی دین کی نمائندگی کرسکے جس کو اللہ نے اپنے بندوں کیلئے پسند فرمایا ہے۔

وہ صحافت کو حقیر پیشہ سمجھتے ہے

شیخ علی یوسف انیسویں صدی کے ایک مصری ادیب تھے جو ایک عربی جریدہ "المؤید" کے اڈیٹر تھے۔ انھوں نے مصر کی ایک خاتون سے شادی کی جس کا نام صفیۃ السادات تھا۔ یہ ایک صوفی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور اپنے والد کی اجازت کے بغیر شیخ علی یوسف سے شادی کرلی تھی۔ بعد کو جب ان کے خاندان والوں کو معلوم ہوا کہ ان کے شوہر ایک صحافی ہیں تو یہ بات انھیں اپنے خاندانی وقار کے خلاف معلوم ہوئی کہ ان کے یہاں کی ایک لڑکی ایسا گھٹیا پیشہ رکھنے والے ایک آدمی سے شادی کرلے۔ انھوں نے خاتون پر زور ڈال کر انھیں راضی کیا کہ وہ عدالت میں تفریق کی درخواست دے کیونکہ ان کا شوہر شریعت کے مطابق ان کا کفو نہیں ہے اور وہ صحافت جیسا غیر شریف پیشہ کرتا ہے۔ یہ دعوی قاضی شرع (شیخ ابو خطوۃ) کی عدالت میں پیش ہوا اور قاضی نے مقدمہ کی سماعت کے بعد فیصلہ کیا کہ ایک شخص جو صحافی ہو، وہ ایک شریف خاتون کا کفو نہیں ہے اور شیخ علی یوسف اور ان کی بیوی کے درمیان تفریق کرادی۔

سید جمال الدین افغانی (۱۸۹۷ - ۱۸۳۸) جن دنوں آستانہ (ترکی) میں تھے، ان کی ملاقات شیخ حسین الجسر (۱۹۰۹ - ۱۸۴۵) سے ہوئی۔ شیخ جسر اپنے زمانے میں شام کے بڑے علماء میں تھے۔ تاہم وہ جریدہ طرابلس میں مقالات لکھا کرتے تھے۔ جمال الدین افغانی کو ان کے بعض خیالات سے اختلاف تھا۔ اتفاقاً دونوں کی ملاقات المابین (سلطانی سرای) میں ہوئی۔ جمال الدین افغانی نے ان پر تنقید شروع کی۔ شیخ حسین جسر نے جواب میں کچھ کہا۔ اس کے بعد جمال الدین افغانی بلند آواز سے بولنے لگے۔ شیخ حسین جسر نے کہا: آہستہ بولئے، کہیں المابین کے لوگ سن نہ لیں کہ میں صحافی ہوں اور رسائل میں مضامین لکھتا ہوں۔ یہ سن کر جمال الدین افغانی غضبناک ہوگئے اور کہا: ولماذا یا استاذ تحاذر ھذا وتأبی الانتساب الی الصحافۃ (آپ اتنی ڈرتے کیوں ہیں اور صحافت سے اپنی نسبت کا انکار کررہے ہیں) صحافت ایک اچھا کام ہے۔ میں خود صحافی ہوں۔ پیرس سے میں نے العروۃ الوثقیٰ کے نام سے ایک رسالہ نکالا تھا۔ شیخ جسر نے اس کو نہیں مانا۔ انھوں نے کہا:

ان مثلہ فی انتسابہ الی علم الدین ینبذی بہ فی نظر الناس الاشتغال بالصحافۃ

ان کے (شیخ جسر) جیسا ایک شخص جو علم دین کا حامل ہونے کی حیثیت سے متعارف ہے، اس کا صحافت میں مشغول ہونا اس کو لوگوں کی نظر میں گرا دے گا۔

الجوریہ، ۲۱۱

ایک ملاقات

ناندیڑ، تقسیم سے پہلے ریاست حیدرآباد کا حصہ تھا۔ اب وہ مہاراشٹر کا ایک ضلع ہے۔ دہلی سے ۱۶۵۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر آباد اس علاقہ میں اگر آپ اس کے ماضی کے آثار دیکھنا چاہیں تو وہ اس کی روزمرہ کی سرگرمیوں میں کہیں نظر نہ آئیں گے۔ اس واقعہ کو آپ گزری ہوئی کہانی کے طور پر ہی کسی سے سن سکتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ یہاں ایسے لوگ تو بہت ہیں جو بے رحم حال کو اپنی محرومیوں کا ذمہ دار سمجھتے ہوں۔ مگر ایسے لوگوں کی تلاش سعی لاحاصل سے زیادہ نہیں جو زندگی کی اس حقیقت سے آگاہ ہوں کہ حال دراصل ماضی ہی کا دوسرا نام ہے۔ افراد ہوں یا قومیں۔ اپنے آنے والے دنوں میں وہ وہی چیز کاٹتی ہیں جس کا بیج انھوں نے اپنے پچھلے دنوں میں بویا تھا۔

جولائی ۱۹۷۵ء کا آخری اور اگست کا پہلا ہفتہ میرا اس علاقہ میں گزرا۔ ناندیڑ سے ۵۰ میل کے فاصلے پر اس کا ایک قصبہ بھیسڑ ہے۔ یہ حیدرآباد سے ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ بھیسڑ میں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی، ان میں سے ایک قابل ذکر شخص کشن جیونت راؤ پٹیل (پیدائش ۱۹۴۳) ہیں۔ چھایا اسٹوڈیو کے نام سے یہاں ان کی فوٹوگرافی کی دکان ہے۔ ان کی مادری زبان مرہٹی ہے۔ ہندی بھی اچھی جانتے ہیں۔ انھوں نے ہندی زبان میں متعدد اسلامی کتابیں پڑھی ہیں۔ قرآن کا ہندی ترجمہ روزانہ اہتمام سے پڑھتے ہیں۔ چار بار مکمل ترجمہ پڑھ چکے ہیں۔ اب پانچویں بار پڑھنا شروع کیا ہے۔

۲۶ جولائی کی شام کو ہم ان کے کھیتوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ برسات کے موسم کی وجہ سے ہر طرف ہریالی چھائی ہوئی تھی۔ ہرے بھرے کھیتوں سے دور پہاڑ کا منظر اس میں مزید حسن پیدا کر رہا تھا۔ "آپ کی فصل ماشاء اللہ آس پاس کے سب کھیتوں سے بہتر ہے"۔ میں نے کہا۔ "یہ خدا کی دین ہے، ورنہ ہم نے تو کوئی خاص کوشش نہیں کی تھی" انھوں نے جواب دیا۔ ایک اور صاحب جو اس وقت ہمارے ساتھ تھے انھوں نے بتایا کہ کشن پٹیل صاحب اپنی پیداوار میں سے باقاعدہ عشر نکالتے ہیں۔ "یہ اسی کی برکت ہے" انھوں نے اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا اور کشن پٹیل صاحب نے مسکرا کر اس کی تصدیق کی۔

قرآن کے سلسلے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ اس میں مجھے کوئی قابل اعتراض بات نہیں آئی۔ سب نہایت عمدہ باتیں ہیں۔ آدمی اگر ان کو اپنا لے تو اس کی زندگی سدھر جائے۔ میں نے کہا بطور اعتراض نہ سہی، تاہم بطور سوال آپ کے دماغ میں کچھ باتیں ہو سکتی ہیں، ان کو بتائیے تاکہ ان پر گفتگو کی جائے۔

انھوں نے ایک سوال یہ رکھا کہ عبادت نماز روزہ کا نام ہے یا عمل کا۔ میں نے کہا عبادت اصلاً تو نماز روزہ ہی ہے۔ تاہم جب آدمی کے اندر صحیح معنوں میں نماز روزہ پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے اخلاق و معاملات میں بھی لازمی طور پر اس کی جھلک آنے لگتی ہے۔ اس لحاظ سے عمل بھی عبادت کے تقاضوں میں شامل ہے۔ انھوں نے بعض اسلامی کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس میں لکھا ہے کہ نماز عملی زندگی کے لئے ٹریننگ ہے۔ میں نے کہا اس کا مطلب یہ ہے

گزاری آدمی کی اصل زندگی سے الگ نہیں۔ جب ایک آدمی حقیقی معنوں میں نمازی بن جاتا ہے تو اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے اندر ایک ایسی طبیعت ابھرتی ہے جو برائیوں سے نفرت کرنے لگتی ہے اور بھلائیوں کو چاہنے لگتی ہے۔
باقی جہاں تک نماز کی اصل حقیقت کا تعلق ہے، تو نماز اللہ سے نزدیکی کا نام ہے، جیسا کہ قرآن کی سورہ نمبر ۹۶ میں آپ نے دیکھا ہوگا۔ یہ بات قرآن و حدیث میں بھی بتائی گئی ہے اور تجربہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آدمی جب سجدہ میں سر رکھتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالکل خدا کے پاس پہنچ گیا ہے۔ یہ نزدیکی کا احساس کسی بھی دوسری چیز سے حاصل نہیں ہوتا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ایک بندہ کے لئے سب سے بڑی چیز یہی ہے کہ وہ اپنے مالک کے نزدیک ہو جائے۔
سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۶۹ کے تحت انھوں نے سوال کیا کہ اس سے تو یہی بات نکلتی ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ یہودی اور عیسائی وغیرہ بھی نجات یافتہ ہیں۔ اسی طرح سورہ حج آیت نمبر ۴۰ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسجدوں کے علاوہ گرجوں وغیرہ میں خدا کا جو نام لیا جاتا ہے، قرآن اس کی بھی تصدیق کر رہا ہے۔
پہلی آیت کے سلسلے میں میں نے کہا کہ اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ نجات کا تعلق کسی گروہ یا نسل سے نہیں ہے خواہ وہ مسلمانوں کا گروہ ہو یا یہودیوں کا یا عیسائیوں کا۔ بلکہ عمل سے ہے، اور عمل نام ہے اس کا کہ آدمی خدا پر ایمان لائے، آخرت پر یقین کرے اور عمل صالح کی زندگی اختیار کرے۔ اس آیت میں گروہی نجات کی نفی کرتے ہوئے عقیدہ و کردار کو نجات کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ اسی طرح دوسری آیت میں مسئلہ یہ نہیں ہے کہ خدا کا حقیقی ذکر کہاں ہوتا ہے۔ اس میں دراصل اللہ کا یہ قانون بتایا گیا ہے کہ وہ کسی ایک گروہ کو مستقل طور پر اقتدار پر قابض رہنے نہیں دیتا۔ اگر ایسا نہ ہو تو حکمراں طبقوں میں اجارہ داری کی ذہنیت پیدا ہو جائے اور ان کا ظلم اس قدر بڑھ جائے کہ وہ نہ صرف اپنے سیاسی مخالفوں کو قتل کریں بلکہ معاشرہ کے بے ضرر طبقات کو بھی روند ڈالیں، حتیٰ کہ عبادت خانوں میں خاموشی کے ساتھ خدا کا نام لینے والے لوگوں کو بھی۔
"حضرت اسود جس کو حج میں چومتے ہیں، یہ کیا چیز ہے، کیونکہ قرآن میں حج کے جو احکام ہیں ان میں حضرت اسود کا کوئی ذکر نہیں"۔
یہ "حضرت اسود" نہیں بلکہ حجر اسود ہے۔ اس کے معنی ہیں کالا پتھر۔ یہ کعبہ کے ایک کونے میں لگا ہوا ہے اور وہیں سے طواف شروع کرتے ہیں۔ اس کے چومنے کے بارے میں میں نے بتایا کہ اس کا کوئی تعلق حجر اسود کے "حضرت" ہونے یا مقدس سمجھنے سے نہیں ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر نے فرمایا، یہ ویسا ہی ایک پتھر ہے جیسا کہ عام پتھر۔ حج کے موقع پر جب ایک مسلمان حجر اسود کو چومتا ہے یا کعبہ کے غلاف سے لپٹتا ہے تو یہ اس کے اس جذبہ کا اظہار ہے کہ وہ اپنے رب سے لپٹ جائے اور اس کے قدموں کو چوم لے۔ اس میں ہرگز ایسا کوئی عقیدہ نہیں ہوتا کہ حجر یا غلاف کعبہ کے اندر خود کوئی تقدس ہے یا وہ آدمی کو نفع نقصان پہنچا سکتے ہیں۔
پھر یہ معاملہ صرف حجر اسود تک محدود نہیں، حقیقت یہ ہے کہ مومن کی زندگی میں ایسے مواقع بار بار آتے رہتے ہیں۔ جب وہ سجدہ میں اپنا سر رکھتا ہے تو زمین کا وہ ٹکڑا اس کے لئے "حجر اسود" بن جاتا ہے جہاں

پیشانی اپنے رب کی دھرتی کو چھو رہی ہو۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا سر خدا کے قدموں سے لپٹ گیا ہے۔ یہاں تک کہ یہ کیفیت کبھی اتنی شدت سے طاری ہوتی ہے کہ اس کا جی چاہتا ہے کہ اپنا سر ہی نہ اٹھائے۔ اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ درخت کی ایک ہری پتی کو دیکھتا ہے یا ایک خوبصورت پھول اس کے سامنے آتا ہے، تو خدا کی یاد اور محبت ایسے جذبہ کی صورت میں ڈھل جاتی ہے کہ وہ اس پتی اور پھول کو خدا کا ایک جلوہ سمجھ کر اس کو اپنی آنکھوں سے لگا لیتا ہے۔ خدا سے چمٹ جانے اور اس کے قدموں کو چوم لینے کا یہی جذبہ جو مومن کی زندگی میں روزانہ کسی نہ کسی شکل میں ظہور میں آتا ہے، وہ حج کے موقع پر حجر اسود کو چومنے یا غلاف کعبہ سے لپٹنے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ حجر اسود مومن کی عام اور روزمرہ زندگی ہی کا ایک تجربہ ہے، وہ نہ کوئی راز ہے اور نہ کوئی منفرد اور مخصوص چیز۔ اگرچہ عام انسان اس خاص پتھر سے اس کیفیت کو پاتے ہیں جو کعبہ میں نصب ہے، مگر جو لوگ گہرائی کے ساتھ خدا کو پا لیتے ہیں، ان کی نظر تعینات سے بلند ہو جاتی ہے۔ ان کے لئے زمین کا ہر ذرہ حجر اسود ہے اور درخت کا ہر پتہ غلاف کعبہ۔

"سورۂ آل عمران آیت نمبر ۳۷ میں ہے کہ حضرت مریم کے پاس جب حضرت زکریا آتے تو وہ ہمیشہ ان کے پاس رزق پاتے۔ یہ رزق کیا آسمانی پھل ہوتا تھا"

"عوام میں یہی مشہور ہے کہ وہ آسمانی پھل ہوتا تھا، مگر خود آیت میں اس کی تردید موجود ہے۔ آیت میں بتایا گیا ہے کہ وکفلھا زکریا یعنی حضرت مریم کی کفالت حضرت زکریا کرتے تھے۔ اب ظاہر ہے کہ جب ان کے کفیل اور ان کی ضروریات کے ذمہ دار حضرت زکریا تھے تو آسمان سے ان کا کھانا آنے کی کیا ضرورت تھی۔ آسمان سے اس قسم کی مدد کبھی خواہ مخواہ نہیں آتی بلکہ صرف حقیقی ضرورت کے وقت اور انتہائی مخصوص حالات میں آتی ہے۔

یہ رزق حقیقۃً رزقِ معرفت تھا۔ جب ایک شخص کے اندر ایمان کا اجالا پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کی طرف مائل ہو جاتا ہے تو ساری دنیا اس کے لئے علم و معرفت کا دسترخوان بن جاتی ہے۔ ہر واقعہ اور ہر مشاہدہ میں اس کو خدائی انوار دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اس کی روح کو ایک اعلیٰ رزق کی خوراک پہنچنے لگتی ہے۔ حضرت مریم کی باتوں میں اسی "رزق" کے جلوے حضرت زکریا کو نظر آئے تھے۔

"قرآن میں بار بار کہا گیا ہے کہ زمین و آسمان پر غور کرو، کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن یہ چاہتا ہے کہ لوگ سائنس کے علوم پڑھیں"

میں نے کہا، یہ صحیح ہے کہ سائنس زمین و آسمان ہی کے علوم کا نام ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ سائنسی علوم سے خدا کی معرفت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مگر جہاں تک قرآن کے اس قسم کے ارشادات کا تعلق ہے، اس سے مراد معروف سائنس کے علوم نہیں ہیں۔ بلکہ زمین و آسمان کی آیات (نشانیوں) پر غور کرنا ہے۔ زمین و آسمان کا سائنسی مطالعہ اور زمین و آسمان کی نشانیوں پر غور کرنا، دونوں میں بہت فرق ہے۔ سائنسی مطالعہ یا تو مجرد مطالعہ ہے یا افادی مطالعہ۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس داں کی ساری توجہ ٹکنکل پہلوؤں پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس قرآن یہ چاہتا ہے کہ زمین و آسمان کے نظام میں جو بے شمار سبق کے پہلو ہیں، ان پر لوگ غور کریں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جس طرح قرآن میں اللہ تعالے نے

اپنے علم کو کھولا ہے، اسی طرح اس نے کائنات کے اندر اپنی معرفت کے شرارے رکھ دیئے ہیں۔ جو لوگ اس نظر سے کائنات پر غور کرتے ہیں، وہ اس کے اندر ایمان و معرفت کے اتھاہ خزانے پا لیتے ہیں۔ حتی کہ اس مشاہدہ کے آخری مقام پر پہنچ کر وہ پکار اٹھتے ہیں کہ کتابیں صرف دو ہیں: قرآن اور کائنات۔

" قرآن کی سورہ نمبر ۳۳ میں کہا گیا ہے کہ منھ بولا بیٹا (لے پالک) بنانا غلط ہے۔ دوسری جگہ قرآن میں ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی سے کہہ دے کہ تجھ کو طلاق ہے تو اس پر طلاق پڑ جاتی ہے۔" یہ سوال پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا " ایک جگہ قرآن کہہ رہا ہے کہ منھ بولے لفظوں سے کوئی کسی کا بیٹا نہیں ہوتا۔ دوسری جگہ منھ سے کچھ الفاظ نکال دینے سے ایک شخص کی بیوی اس کی بیوی نہیں رہتی۔"

میں نے کہا کہ یہ سوال میرے لئے نیا ہے اور اس کا جواب میں کل دوں گا۔ اگلے روز میں نے بتایا کہ دونوں مثالوں میں فرق ہے۔ بیوی کا معاملہ یہ ہے کہ نکاح کے ذریعے ایجاب و قبول سے وہ کسی کی بیوی بنتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ رشتہ لفظوں کے ذریعے قائم ہوتا ہے، اس لئے لفظوں ہی سے وہ ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ مگر بیٹے کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ بیٹا پیدائش سے وجود میں آتا ہے۔ اس لئے لفظوں کے ذریعے نہ کوئی کسی کا بیٹا بن سکتا نہ لفظوں کے ذریعے وہ کسی کی فرزندی سے الگ ہو سکتا۔

" مسلمانوں میں جو لوگ ایسے ہیں کہ محض مسلمان کے گھر میں پیدا ہو گئے ہیں مگر اسلام پر ان کا عمل نہیں، وہ باعتبار حقیقت کافروں کی مانند ہیں۔ پھر آپ ایسے لوگوں کو مسلمان کیوں کہتے ہیں، ان کے کفر کا اعلان کیوں نہیں کرتے۔"

میں نے کہا اسلام کا اصل تعلق آخرت سے ہے، وہاں کسی شخص کو جو چیز ملے گی، وہ اس کی اصل حقیقت کی بنیاد پر ملے گی نہ کہ محض شہرت اور نام کی بنیاد پر۔ باقی جہاں تک دنیا کا تعلق ہے، یہاں اس کے سوا کوئی اور قابل عمل صورت نہیں کہ جو شخص اپنے کو مسلمان کہتا ہے، ہم اس کو مسلمان سمجھیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو معاشرہ کے اندر بڑا انتشار پیدا ہوگا۔ ان کی اصلاح کے لئے تو ہم ان سے سب کچھ کہہ سکتے ہیں، مگر ہم ان کے اوپر جج بن کر نہیں بیٹھ سکتے۔

" ایک شخص کا نام رابرٹ سن ہے، مگر وہ خدا اور رسول پر ایمان رکھتا ہے اور ان ساری باتوں کو مانتا ہے جو اسلام میں بتائی گئی ہیں۔ اگر وہ رابرٹ سن نام کے ساتھ ہی مر جاتا ہے تو اس کی نجات ہوگی یا نہیں۔"

میں نے کہا کہ آخرت کی نجات کا کوئی بھی تعلق نام یا اعلان سے نہیں ہے۔ حنظلہ ایک مسلمان صحابی کا نام تھا اور حنظلہ بن ابو سفیان ایک کافر بھی تھے جو بدر میں مارے گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو واقعات ملتے ہیں، ان میں آپ نے صرف چند ہی لوگوں کے نام تبدیل کئے۔ مثلاً ایک شخص کا نام عبد شر تھا۔ آپ نے اس کا نام عبد خیر رکھ دیا۔ اس کے علاوہ آپ سے پہلے جو انبیاء دوسری قوموں اور دوسری زبانوں میں آئے، ان کے یا ان کے ساتھیوں کے نام عربی نہ تھے بلکہ ان کی اپنی زبان یا رواج کے مطابق تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ نجات کا معاملہ تمام تر خدا اور بندے کے درمیان کا ایک معاملہ ہے۔ اس نجات کے لئے اصل چیز اگرچہ ایمان ہے مگر ایمان کی کچھ علامت اس کی زندگی میں بھی ظاہر ہونی چاہئے۔ کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ انھوں نے کہا ہم آپ پر ایمان لاتے ہیں مگر ہم نہ زکوٰۃ دیں گے

نماز پڑھیں گے۔ آپ نے فرمایا: لاخیر فی دین لا رکوع فیہ (اس دین میں کوئی بھلائی نہیں جس میں خدا کے آگے جھکنا نہ ہو) جب ایک شخص دل سے خدا کو مانتا ہے تو اس کے جسم اور اس کے مال اور تعلقات میں بھی خدا پرستی کا اظہار ہونا چاہئے۔ کوئی آدمی میرے ایمان اور خدا پرستی کو نہ جانے تو کوئی حرج نہیں مگر خدا کو تو جاننا چاہئے۔ خدا کے سامنے تو بہرحال اس کا اظہار ہونا چاہئے خواہ پردہ کے اندر چھپ کر ہی کیوں نہ ہو۔

"عشر کس کو دینا چاہئے"

میں نے کہا کہ عشر و زکوٰۃ ایک قسم کا اجتماعی ٹیکس ہے۔ اس کی ادائگی کی اصل صورت تو یہ ہے کہ ایک اجتماعی ادارہ ہو اور وہ اس کو وصول کر کے مقررہ مدوں میں اس کو خرچ کرے۔ مگر آج چونکہ ایسا کوئی ادارہ قائم نہیں ہے، اس لئے موجودہ صورت میں تو یہی ہو سکتا ہے کہ اپنی سمجھ کے مطابق اس کو ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا جائے، یا اور جو مدیں قانونی طور پر مقرر ہیں، ان میں اس کو خرچ کر دیا جائے۔

انھوں نے بتایا کہ فوٹو گرافی کا کام چھوڑ کر میں کوئی دوسرا دھندا کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کام کی تبدیلی کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ ہم نے اس کام میں کافی پیسہ کمایا اور اب بھی میرے لئے اس میں اچھا میدان ہے۔ مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ اب میں اس کام کے قابل نہیں رہا۔ فوٹو گرافی کے کام میں کامیابی کے لئے نمائشی ذہنیت اور موقع پرستی بہت ضروری ہیں۔ مگر اب میرا مزاج بدل گیا ہے۔ اب میں سادہ زندگی اور جائز کاروبار کو اپنانا چاہتا ہوں، اور اس طرح کی زندگی کے ساتھ فوٹو گرافی کے کام کا جوڑ نہیں بیٹھتا۔ اس لئے اب میں نے سوچا ہے کہ اپنی موجودہ دکان کے اوپر کچھ کمرے بنوا کر فوٹو گرافی کا کام کسی کی شرکت میں اوپر منتقل کر دوں، اور نیچے خود کرانہ کی دکان کھول لوں۔

[redacted]

سوال و جواب

سوال: قرآن میں ہے کہ "اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو"۔ یہ آیت مجھے بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کیوں کہ بظاہر اس میں ہلاکت اور خطرہ والے راستہ سے بچ کر چلنے کی تعلیم ہے۔ مگر اسی کا نام تو ہلاکت ہے کہ آدمی خطرات کے راستہ پر چلنے سے ڈرے اور رسک نہ لینا چاہے۔ فرد کا معاملہ ہو یا قوم کا، تمام بڑی بڑی ترقیاں انھیں کو ملتی ہیں جو اپنے آپ کو جان جوکھوں میں ڈال کر اقدام کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ زندگی کی اس حقیقت کو اسمٰعیل میرٹھی نے بڑی خوب صورتی سے دو شعروں میں بیان کر دیا ہے:

گھوڑ دوڑ میں کدائی کی بازی تھی ایک دن — ترکی پہ کوئی تازی پہ اپنے سوار تھا
جو ہچکچا کے رہ گیا سو رہ گیا ادھر — جس نے لگائی ایڑ وہ خندق کے پار تھا

جس قوم کا نظریہ یہ ہو کہ "خطرات سے بچ کر چلو" وہ قوم کبھی اونچی کامیابیاں حاصل نہیں کر سکتی۔

جواب: زندگی کی حقیقت جو آپ نے بیان کی، وہ صدفی صد صحیح ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ رسک کے بغیر کوئی کامیابی نہیں ہوتی۔ مگر آیت کا جو مطلب آپ نے لیا، اصل مطلب اس کے بالکل برعکس ہے۔ پوری آیت یہ ہے:

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّہْلُکَۃِ وَاَحْسِنُوْا — اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو (کہ خرچ کرنے سے رک جاؤ) اور کام کو خوب اچھی طرح کرو۔

بقرہ — ۱۹۵

دین کی ضرورتوں میں اپنے جان و مال کو خرچ کرنا، اپنی ذاتی ضرورتوں میں کمی کئے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہا گیا کہ خواہ اپنی ذات کے لئے کمی کرنا پڑے، مگر دین کے لئے جد و جہد کو بہر حال جاری رکھو۔ کیوں کہ اجتماعی زندگی برباد ہو جائے تو فرد بھی اپنے آپ کو بربادی سے بچا نہیں سکتا۔ اسی لئے ان راہوں میں خرچ کرتے رہو جن سے اجتماعی زندگی طاقت ور ہوتی ہے

اس آیت کے سلسلہ میں حضرت حذیفہ اور حضرت ابو ایوب انصاری کی روایت حدیث کی کتابوں میں آئی ہے جو اس کے مفہوم کو پوری طرح واضح کر دیتی ہے۔ ان کے نزدیک ہلاکت میں ڈالنے کا مطلب ہے اپنے مال اور اپنے گھر میں بیٹھ رہنا اور جہاد کو چھوڑ دینا (التہلکۃ الاقامۃ فی الاھل والمال وترک الجہاد کشاف)

بخاری نے حضرت حذیفہ سے اس آیت کی مختصر شان نزول نقل کی ہے۔ اس کی صراحت حضرت ابو ایوب انصاری کی حدیث میں ہے جس کو ابو داؤد، ترمذی، حاکم، نسائی، ابن حبان وغیرہ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے شرط شیخین پر اس کو صحیح کہا ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاری فرماتے ہیں کہ ہم انصار لوگ جب کچھ لڑائیاں آنحضرت کی ہمراہی میں لڑ چکے تو ایک دن ہم میں سے کچھ لوگوں نے آپس میں خفیہ مشورہ کیا کہ اب تو رسول اللہ

کے ساتھ صحبت (اہل اسلام جمع ہو گئے ہیں، اگر ہم چند لوگ لڑائیوں میں آپ کے ساتھ نہ جائیں تو اپنی اقتصادیات کو درست کر سکتے ہیں اور مدتوں باہر رہنے سے جو گھر بار اجڑ گئے ہیں ان کی تلافی کی جا سکتی ہے اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔ اور آگاہ کیا کہ اس طرح کے اخراجات سے ہاتھ روکنا ہلاکت کا باعث ہے، اپنے آپ کو اس ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اور دین کے لئے جان و مال خرچ کرنے میں لگے رہو۔

یہ آیت خطرات اور اندیشوں کے علی الرغم حق کی راہ میں اقدام کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ نہ یہ کہ آدمی خطرات اور اندیشوں سے گھبرا کر ایسا اقدام کرنے سے رک جائے۔

Americans turning religious

سائنس اور صنعت کی ترقیاں انسان کو خدا سے دور نہیں کرتیں

عام طور پر مشہور ہے کہ امریکہ ایک سیکولر اور تشکک قوم ہے۔ مگر گیلپ پول کے ذریعہ دو سال تک جائزہ لینے کے بعد جو حقائق سامنے آئے ہیں، وہ اس کی تردید کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا ہے کہ امریکی لوگ غیر معمولی حد تک مذہبی ہیں اور یہ ملک فی الواقع احیائے روحانیت کے نئے مرحلے میں ہے۔

امریکہ کے ۹۴ فی صد لوگ خدا کے معتقد ہیں۔ ۶۹ فی صد زندگی بعد موت پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہ انکشاف ایک رپورٹ میں کیا گیا ہے جو واشنگٹن سے "ریلیجن ان امریکا" کے عنوان سے چھپی ہے۔

رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں کیا کیا مذہبی عقائد ہیں اور ان کے رہن سہن کے طریقے کیا ہیں۔ گیلپ انٹرنیشنل نے یہ جائزہ چارلس ایف۔ کیٹرنگ فاؤنڈیشن کی فرمائش پر کیا ہے۔

رپورٹ بتاتی ہے کہ امریکی عوام تمام صنعتی قوموں میں سب سے زیادہ مذہبی لوگ ہیں۔ مذہب پر عقیدہ کا خاتمہ ممکن طور پر بعض یورپی ملکوں اور دنیا کی بعض دوسری قوموں میں متوقع ہو سکتا ہے۔ امریکہ کا تقابل صرف افریقہ اور مشرق بعید سے کیا جا سکتا ہے جہاں اب بھی عوام پر مذہب کی گرفت مضبوط ہے۔ جاپان اور سکینڈے نیویا کے عوام، تمام ترقی یافتہ قوموں میں سب سے زیادہ غیر مذہبی پائے گئے ہیں۔

۱۹۶۰ کے بعد کے سالوں میں جب کہ امریکہ بحران سے دوچار تھا، لوگوں میں مذہب سے دلچسپی اور مذہبی عمل کم ہو گیا تھا۔ مگر اب صورت حال اس سے مختلف ہے امریکی عوام کی ۵۶ فی صد تعداد نے جائزہ کے دوران بتایا کہ مذہبی عقیدہ "بہت اہم" ہے، ۳۰ فی صد نے اس کو "مناسب حد تک اہم" بتایا۔ صرف ۵ فی صد نے یہ جواب دیا کہ مذہب کی کوئی اہمیت نہیں۔

(ہندستان ٹائمس ۲۲ جولائی ۱۹۷۶)

اسلامی مرکز کا مقصد، اسلام کا پیغام سارے انسانوں تک پہنچانا ہے۔

ختم نبوت کے بعد، امت محمدی مقام نبوت پر ہے۔ مسلمانوں کو اب قیامت تک ٹھیک وہی کام انجام دینا ہے جس کے لئے اس سے پہلے پیغمبر آتے تھے۔ پیغمبر اپنے رب کے یہاں صرف اس وقت بری الذمہ ہو سکتے تھے جب کہ وہ اس پیغام کو اپنے تمام مخاطبین تک پہنچا دیں جو ان کو وحی آسمانی کے ذریعے دیا گیا ہے۔ اسی طرح امت محمدی کی نجات کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ قوموں کے سامنے خدا کے دین کی گواہ بن کر کھڑی ہو، وہ لوگوں کو آنے والے یوم الحساب سے آگاہ کرے۔ اگر امت اس دعوتی ذمہ داری کو ادا نہیں کرتی تو کوئی بھی دوسری چیز اس کو نجات دینے والی نہیں بن سکتی، نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔

پیغام آخرت کا حامل ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کی لازمی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ دوسری قوموں سے وہ دنیوی مفادات کے لئے کشمکش کرنے سے مکمل پرہیز کریں۔ ان کے ساتھ حق تلفی کی جائے جب بھی اپنے دنیوی مسائل کے سلسلے میں ان کے لئے واحد صحیح رویہ "صبر" ہے۔ یعنی خود اپنی تعمیری کوششوں پر بھروسہ کرنا۔ دوسروں کے خلاف احتجاج اور مطالبات کی مہم چلانے کے بجائے اپنے خداداد مواقع میں اپنے لئے رزق تلاش کرنا۔ مسلمانوں کے لئے دوسری تمام قومیں مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے لئے جائز نہیں کہ اپنے کسی عمل سے ان کو اپنا سیاسی اور معاشی حریف بنالیں۔ جنہیں ان قوموں کو دعوت حق کا مخاطب بنانا ہے، نہ یہ کہ دنیوی مسائل کے نام پر ان سے جھگڑا کر کے ان کو اپنے سے دور کر دیا جائے۔

اسلامی مرکز کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان کی اصل ذمہ داری کے لئے تیار کیا جائے اور موجودہ زمانہ کے تقاضوں کے لحاظ سے خدا کے پیغام کو اس کے تمام بندوں تک پہنچانے کی منصوبہ بندی کی جائے۔

مسجدیں عالم اسلامی کی نگہبان ہیں۔ مغلوں نے تیرھویں صدی عیسوی میں مشرق کی جانب سے عالم اسلام پر حملہ کیا اور اس کے بڑے حصے کو تاراج کر ڈالا۔ مگر وہی مسجدیں جن کو ہلاکو نے سمرقند سے حلب تک اپنے راستہ میں تباہ کیا تھا، اس کے پوتوں نے دوبارہ ان کی تعمیر کی اور ان کی چھتوں کے نیچے خدائے واحد کے آگے سجدہ کیا۔ مسجد ایک قسم کا دارالاسلام ہے۔ وہ اللہ کی یاد کی جگہ ہے۔ وہ اسلامی اتحاد کا مرکز ہے، وہ مسلمانوں کے اعتماد علی اللہ کا نشان ہے۔ جب اسلام زندہ تھا تو مسجد صرف مسجد نہ تھی بلکہ وہاں اسلامی زندگی کے تمام شعبے قائم ہوتے تھے۔ مثلاً عبادت گاہ، مدرسہ، دارالقضاء، اجتماع گاہ، اسپتال، کتب خانہ، مسافرخانہ، تبلیغی مرکز، مقام مشورہ وغیرہ ——— اسلامی مرکز میں ہم چاہتے ہیں کہ مسجد کو دوبارہ اس کی اصل حیثیت میں زندہ کریں۔

راقم الحروف نے ہفت روزہ الجمعیۃ، ۲۷ نومبر ۱۹۷۰ء میں ایک مضمون شائع کیا تھا جس میں مسلمانوں کی پچھلی ڈیڑھ سو سالہ کوششوں کا جائزہ لینے کے بعد کہا گیا تھا کہ اس مدت میں بے شمار بڑی بڑی تحریکوں کے وجود میں آنے کے باوجود اسلام کو زندہ نہ کیا جاسکا۔ اس سلسلہ میں تجزیہ کرتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ اس ناکامی کی واحد بڑی وجہ یہ تھی کہ ہمارے مصلحین کی کوششوں کا رخ تعمیر کے بجائے سیاست کی طرف رہا۔ آخر میں یہ تجویز درج تھی:

"موجودہ حالات میں احیائے اسلامی کے کام کا آغاز جہاں سے ہونا چاہئے، اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ اعلیٰ پیمانہ پر ایک اسلامک سنٹر کا قیام عمل میں لایا جائے۔ یہ اسلامک سنٹر ہر قسم کے عصری ذرائع سے اس قدر مسلح ہو کہ وہ تمام مسلمانوں کے لئے پاور ہاؤس کا کام دے۔ وہ اسلامی بھی ہو اور رحانی بھی اور جدید بھی۔ (صرف ایک استثناء کے ساتھ: وہ کسی بھی معنی میں سیاسی نہ ہو)"

اس تجویز کو پچھلے چھ برسوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ یہ پورا مضمون عربی میں ترجمہ ہو کر ۴۲ صفحات کے کتابچہ کی شکل میں قاہرہ اور بیروت سے شائع ہوا اور اس کے متعدد ایڈیشن نکل گئے۔ ملکی و دینی جرائد میں اس کے بارے میں نہایت حوصلہ افزا تبصرے شائع ہوئے۔

اب مختلف حضرات کے شدید اصرار پر اسلامی مرکز کا قیام عمل میں آگیا ہے۔ الرسالہ اسی کے ترجمان کے طور پر نکالا جارہا ہے۔ تاہم سب سے بڑا مسئلہ اس کے لئے جگہ کی فراہمی ہے۔ فی الحال عارضی طور پر اس کا دفتر ایک مکان میں رکھا گیا ہے۔ مگر اس کی وسعت اور اہمیت کے اعتبار سے ضروری ہے کہ اس کے لئے مستقل عمارت ہو جہاں اس کے تمام شعبوں کو زیر عمل لایا جاسکے۔

بہتر یہ ہے کہ یہ مرکز کسی مسجد کے ماحول میں قائم ہو۔ کوئی قدیم مسجد ہو تو اس کے گرد و پیش کچھ تعمیر کرائے جاسکیں، اگر خالی جگہ ملے تو وہاں مسجد کے ساتھ ضروری تعمیرات کرائی جائیں۔ اس سلسلہ میں جو لوگ کسی قسم کا تعاون کرسکتے ہوں وہ تفصیلات سے مطلع فرمائیں۔

ایڈیٹر کے نام

داعی نہ سیاح ہوتا نہ شعبدہ باز، وہ اپنے مدعو گروہ کے درمیان اسی طرح کام کرتا ہے جس طرح ایک باغبان اپنے باغ میں

کرمی جناب ایڈیٹر صاحب تسلیم

الرسالہ کا پہلا شمارہ نظر سے گزرا۔ رسالہ میں کئی مضامین جزوی یا کلی طور پر محل نظر ہیں۔ لیکن اس وقت خاص طور پر "سوال و جواب" کے حصے کے متعلق کچھ گزارشات پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے جناب والا اگلے شمارے میں وضاحت فرمائیں گے۔

آپ فرماتے ہیں کہ "مسلمانوں کا کوئی الگ کلچر ہی نہیں" اور "داعی کے مشن کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے مدعو سے کلچرل یگانگت پیدا کرے نہ کہ کلچرل بے گانگی"

اگر مندرجہ بالا اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو ان احادیث کی آپ کی نظر میں کیا حیثیت ہے جن میں تشبّہ بالیہود سے منع فرمایا گیا ہے۔ ثانیاً کیا داعی اور مدعو کے کلچرل یگانگت کا تقاضہ یہ بھی ہوگا کہ اگر کسی "برہنہ کلب" کے ممبر یا ایسے شخص کو دعوت دینی ہو جو عورتوں کی طرح سر پہ چوٹی رکھتا ہو تو کیا ان سے بھی داعی کو کلچرل یگانگت پیدا کرنی چاہئے۔ نیز یہ کہ یکے بعد دیگرے اگر مختلف کلچرل گروہوں کو دعوت پیش کرنی ہو تو کیا داعی کو بار بار اپنی وضع قطع میں تبدیلی کرنا پڑے گی۔

ایک اور بات وضاحت طلب ہے۔ اور وہ یہ کہ سورہ انعام کی آیت ۹ کے ترجمے میں آپ نے "لباس پہنانے" کا جو مفہوم شامل کیا ہے۔ کیا تمام مفسرین خلف و سلف اس کا ترجمہ اسی طرح کرتے آئے ہیں یا یہ آپ کی ذاتی تحقیق ہے؟

کیا میں امید کروں کہ قارئین کے استفادہ کے لئے آپ ان امور کا مبسوط جواب آئندہ شمارے میں شریک اشاعت فرمائیں گے۔

صبیح الدین احمد ایم اے
بٹلا ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی

الرسالہ: "کلچرل یگانگت" کی بات ہم نے اس لفظ کے اجمالی مفہوم میں کہی ہے نہ کہ انتہائی مفہوم میں۔ اور یہ زبان و ادب کا عام طریقہ ہے۔ پیغمبروں کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے: وہ سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے تھے (فرقان - ۲۰) ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا کام بس یہ تھا کہ کھانا کھائیں اور بازاروں میں چلتے رہیں۔ اسی طرح اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اکل طعام اور مشی فی الاسواق کی تمام رائج قسموں میں ہر اعتبار سے وہ مکمل طور پر دوسروں کی مانند تھے۔ بات خواہ عمومی الفاظ میں کہی جائے، وہ ہمیشہ کسی خاص مفہوم ہی میں ہوتی ہے، اور موقع کلام اس کے حدود کو متعین کرتا ہے۔

وہ چیزیں جو شریعت میں حرام ہیں، مثلاً برہنگی وہ ہمارے مسلمہ عقیدہ کے مطابق خود بخود یگانگت کے عموم سے خارج ہو جائیں گی۔ اسی طرح جو چیزیں کسی گروہ کا مذہبی شعار ہوں، مثلاً صلیب کا نشان، ان میں بھی یگانگت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہر مذہب کے اپنے مخصوص مذہبی شعار ہوتے ہیں اور کوئی مذہب

ان میں کبھی سمجھوتہ کی اجازت نہیں دیتا (تشبہ بالیہود سے ممانعت اسی دوسرے مفہوم میں ہے) تاہم یہ ضروری نہیں ہے کہ غیر مسلم کا جوتا گول کنارے کا ہے تو ہم نوک دار کنارے کے جوتے کو اسلامی جوتا سمجھیں۔ یا غیر مسلم گھروں میں پیتل کا برتن رائج ہو تو ہم تانبے کے برتن کو اسلامی آداب قرار دیں۔ الرسالہ (اکتوبر ۱۹۷۶) میں جو بات کہی گئی تھی، وہ بس اسی محدود مفہوم کے اعتبار سے ہے اور ہندستان میں جنوب کے علاقہ کے مسلمانوں کی لنگی اس کی ایک مثال ہے۔

۲، سورۂ انعام کی آیت ۹ کے سلسلہ میں عرض ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس اور ان کے شاگردوں سے اس سلسلے میں تین تفسیریں منقول ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں لبس بمعنی التباس ہے۔ یعنی اگر اللہ تعالےٰ فرشتوں کو رسول بناکر بھیجتا تب بھی ان کو انسان کی صورت میں بھیجتا اور مخاطبین کو پھر وہی اشکال ہوتا جو اشکال وہ اب کر رہے ہیں۔ اکثر مفسرین نے اسی مفہوم کو اختیار کیا ہے، دوسرا مفہوم تحریف کا لیا گیا ہے اور اہل کتاب کو اس کا مصداق قرار دیا گیا ہے (تفسیر طبری)

تیسری رائے وہ ہے جس کو ہم نے الرسالہ میں نقل کیا ہے۔ تفسیر کی جو کتاب عبداللہ بن عباس کی طرف منسوب ہے، اس میں اسی رائے کو اولیت دی گئی ہے یہاں ہم اس کے الفاظ نقل کرتے ہیں:

(ولوجعلناہ) یعنی الرسول (ملکا لجعلناہ رجلا) فی صورۃ رجل آدمی حتی یقدروا ان ینظروا الیہ (وللبسنا علیہم) علی الملائکۃ (مایلبسون) مثل مایلبسون من الثیاب، (تفسیر عبداللہ بن عباس، مطبع محمدی، ۱۰۲ھ)

اگر ہم رسول کو فرشتہ بناتے تو اس کو بھی آدمی کی صورت میں بھیجتے تاکہ وہ اس کو دیکھ سکیں اور ان فرشتوں کو وہی کپڑے پہناتے جو کپڑے یہ لوگ پہنتے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مفسرین میں مولانا حمیدالدین فراہی نے آیت کا یہی مفہوم لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

قد جعل اللہ الانبیاء ھداۃ خلقہ فالبسھم لباس البشریۃ ۔۔۔ النبی یبعث فی قوم یصلحھم ویدعوھم الی الصراط المستقیم، فلا بد ان یکون مثلھم فی الزی والشمائل والا کان خلاف البعثۃ کما قال: ولو جعلناہ ملکا لجعلناہ رجلا وللبسنا علیھم مایلبسون

القائد الی عیون العقائد، ۳۱ـ۱۳۰

اللہ نے پیغمبروں کو اپنی خلق کا ہادی بنایا ہے۔ اس لئے انھیں بشری لباس پہنایا۔ پیغمبر کسی قوم میں اس لئے آتا ہے کہ اس کی اصلاح کرے اور اس کو صراط مستقیم کی طرف بلائے۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ پوشاک اور عادات میں انھیں کی طرح ہو۔ ورنہ مقصد بعثت کے خلاف ہوگا۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے ۔ ۔ ۔ ۔

۳۔ "یکے بعد دیگرے اگر مختلف کلچرل گروہوں کو دعوت پیش کرنی ہو تو کیا داعی کو بار بار اپنی وضع قطع میں تبدیلی کرنا پڑے گی" ــــــــ یہ اعتراض بتاتا ہے کہ دعوت اسلامی کے کام کو صحیح طور پر سمجھا نہیں گیا ہے۔ دعوت کوئی شعبدہ یا نٹ کا تماشا نہیں ہے کہ آج یہاں دکھایا جائے اور کل وہاں۔ وہ ایک انتہائی سنجیدہ اور انتہائی طویل عمل کا نام ہے۔ داعی سیاح نہیں یا خانہ بدوش نہیں ہوتا ہے۔ وہ ایک مخاطب گروہ کا قیم

کر کے اس کے ساتھ اپنے کو وابستہ کر دیتا ہے۔

وہ اس کا گہرا مطالعہ کر کے اس کو سمجھتا ہے، حقیقت پسندی کے تمام تقاضوں کے مطابق وہ ان کے درمیان کام کا نقشہ بناتا ہے۔ وہ ان کے اوپر ان کا خیر خواہ بن کر کھڑا ہوتا ہے۔ وہ ان کو راہ حق پر لانے کے لئے اپنی ساری عمر لگا دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا ایک کام کسی خاص گروہ کا پابند ہو کر ہی انجام دیا جا سکتا ہے، نہ اس طرح کہ روزانہ نئے نئے گروہوں کے سامنے اپنا جلوہ دکھایا جائے۔ یہ ایک قسم کا اعلانی و سپردگی کا معاملہ ہے نہ کہ تقریری مشاعروں کے دعوت نامے قبول کرنے کا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص نے اپنی دعوت کے لئے کسی مستقل مدعو کا انتخاب نہیں کیا ہے، وہ سرے سے داعی ہی نہیں ہے۔ دعوت تو پوری عمر کا ایک فیصلہ ہے۔ اس کو اس تلون کے ساتھ کس طرح انجام دیا جا سکتا ہے کہ آدمی ہر دن کسی نئے مقام پر تقریری کرتب دکھانے کے لئے پہنچ جائے۔

پھر بھی ان کے بستر کانٹوں کے بستر نہیں بنے

مشہور پلے بیک سنگر مکیش چندما تھر (۱۹۲۳-۱۹۷۶) امریکہ کے ایک سفر میں تھے کہ اچانک انتقال کر گئے۔ ان کے حالات جو اخباروں میں آئے ہیں، ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ اردو زبان بہت اچھی جانتے تھے۔ ابتداءً وہ ہندی سے ناواقف تھے۔ بعد کو اپنے پیشہ کی ضرورت کے تحت سخت محنت کر کے ہندی زبان سیکھی۔ کیونکہ انھوں نے اپنی زندگی میں جو دس ہزار گانے ریکارڈ کرائے ہیں، ان میں سے ایک تلسی داس کی رامائن بھی ہے جس کو انھوں نے تین سال میں مکمل کیا تھا۔

۱۹۴۷ء میں ہندستان آزاد ہوا تو برادران وطن میں اس طرح کے بے شمار لوگ تھے جنھوں نے اپنے اسکولوں میں اردو پڑھی تھی۔ پنجابیوں کا سیلاب یہاں پہنچا تو اس طرح کے لوگوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ آزادی کے انقلاب کے بعد تقریباً چوتھائی صدی تک اس ملک کی عام زبان اردو ہی تھی۔ ہم نہایت آسانی کے ساتھ اردو کے ذریعہ ان سب لوگوں تک خدا کا وہ پیغام پہنچا سکتے تھے جس کے پہنچانے کی لازمی ذمہ داری ہمارے سپرد کی گئی ہے۔

اب یہ لوگ اٹھتے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ دوسری نسل لے رہی ہے۔ داعی اور مدعو کے درمیان لسانی بعد بڑھتا جا رہا ہے، جو کام پہلے ہم اپنی مادری زبان میں کر سکتے تھے، اس کے لئے اب ہم کو دوسری زبانیں سیکھنی ہیں اور ان کے اندر مہارت پیدا کرنا ہے۔ ایک کام جو پہلے آسان تھا، مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ اس کے باوجود لوگ راتوں کو اطمینان کی نیند سوتے ہیں، ان کے بستر ان کے لئے کانٹوں کے بستر نہیں بنے۔ شاید انھیں یاد نہیں رہا کہ ان کو مرنا ہے اور مرنے کے بعد خدا کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ جب خدا پوچھے گا کہ تم نے ہمارا پیغام ہمارے بندوں تک کیوں نہ پہنچایا تو ہم کیا جواب دیں گے۔ اور اگر ہم کو "خدا کی گواہی چھپانے" کا مجرم قرار دے دیا جائے جس کے مجرم یہودی قرار دیئے گئے تھے تو ہمارے پاس اس سے بچنے کی کیا سبیل ہوگی۔

فہرست

حکمت کی باتیں	۱
جامع مسجد کی سیڑھیوں سے	۲
ابھی تک دستکاری کے دور میں	۳
پانچویں نمبر پر	۵
ڈیڈسی اسکرول	۶
ہمارے اور آخرت کے درمیان	۸
فرشتے ہر وقت بتا رہے ہیں	۹
مطالعہ کتب	۱۱
خوابوں کے فریب میں	۱۲
ٹھیکہ مل گیا	۱۳
مہابھارت سے	۱۴
تاج محل کو دیکھ کر	۱۴
شاعری اور تصنیف کا فرق	۱۶
صنعتی کثافت کا مسئلہ	۱۸
کیا یہ لوگ بچے ہیں	۲۰
ایک نے کیچڑ دیکھا، دوسرے نے ستارے	۲۱
قرینۂ ارتقاء	۲۲
اسلامی کردار	۲۵
مرد وعورت کے درمیان تقسیم عمل	۲۶
غلطی کا انجام	۲۷
موت کے بعد	۲۸
لارڈ ٹامسن کا واقعہ	۳۱
جاپانی کا قبول اسلام	۳۲
مواقع کی بربادی	۳۵
لطیفہ	۳۵
جدید مسئلہ کیا ہے	۳۶
دنیا داری اس کا محرک ہے	۴۲
اسلام کا مطلب	۴۲
اختلاف کے نقصانات	۴۳
تعمیر ملت	۴۴
آواز	۴۷
عربی ہفت روزہ کا تبصرہ	۴۸
ایک ملاقات	۵۱
سوال و جواب	۵۶
امریکہ میں مذہب	۵۷
اسلامی مرکز	۵۸
ایڈیٹر کے نام	۶۰
نازک مسئلہ	۶۲

اعلان

۱۔ الرسالہ کے لئے رجسٹری یا امانت بھیجتے ہوئے پتہ پر شخصی نام نہ لکھیں بلکہ تمام چیزیں منیجر الرسالہ کے نام روانہ فرمائیں۔

۲۔ ایجنٹ حضرات کے لئے مطلوبہ پرچے ۲۵ فی صد کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ ہوں گے۔ ڈاک خرچ ادارۂ الرسالہ کے ذمے ہوگا

Single Copy Rs. 2.00

Regd. No. [illegible]
DECEMBER 1976

AL-RISALA MONTHLY

1036, KISHANGANJ, DELHI-110006 (INDIA)

محمد احمد پرنٹر پبلشر مسئول نے امپیریل پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ ۱۰۳۶ کشن گنج دہلی سے شائع کیا

الرسالہ

سرپرست: مولانا وحیدالدین خاں

ایڈیٹر: ظفرالاسلام خاں ایم اے

ہر غروب کے لئے ایک نیا طلوع مقدر ہے

سورج پچھم میں غروب ہوتا ہے تاکہ دوبارہ پورب سے نئی شان کے ساتھ طلوع ہو۔ یہ ایک روشن نشانی ہے جو آسمان پر ظاہر ہوکر ہر روز ہمیں بتاتی ہے کہ خدا نے اپنی مملکت کا نظام کس طرح بنایا ہے۔ یہ اس حقیقت کا ایک کائناتی اعلان ہے کہ خدا کی اس دنیا میں کوئی "غروب" آخری نہیں۔ ہر غروب کے لئے ایک نیا طلوع مقدر ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی کے اندر حوصلہ ہو۔ غروب کا واقعہ پیش آنے کے بعد وہ از سر نو اپنی جدوجہد کا منصوبہ بنائے۔ زندگی کی شاہراہ پر دوبارہ اپنا سفر شروع کردے۔

...ا شمارہ [illegible]	زرتعاون سالانہ ۲۴ روپے، خصوصی تعاون: کم سے کم ایک سو ایک روپیہ	اکتوبر ۱۹۷۷

مسلم قیادت موجودہ زمانے میں سب سے زیادہ ناکام قیادت ثابت ہوئی ہے۔ اس کی وجہ اس کی یہ غلطی ہے کہ اس نے مسلمانوں کے مستقبل کو تعمیر کے بجائے سیاست میں تلاش کیا۔ سیاست بازی کا مطلب ہے اپنے مسائل کے حل کے لئے دوسروں کے خلاف مہم چلانا۔ جب کہ تعمیر یہ ہے کہ اپنے مسائل کے لئے خود اپنے اوپر عمل کیا جائے۔

کرنے کا اصل کام یہ تھا کہ قوم کو اس حیثیت سے تیار کیا جائے کہ لوگوں کے عقائد مضبوط ہوں، ان کے اندر اخلاق کی طاقت ہو، وہ تعلیم میں اونچے ہوں، ان میں باہم اتحاد ہو اقتصادی شعبوں میں انھوں نے اپنی جگہ بنائی ہو۔ سماجی بہبود کے ادارے ان کے درمیان چل رہے ہوں۔ وہ زمانے کو پہچانیں اور اس کے مطابق کام کرنا جانتے ہوں۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے اندر وہ شعور ابھارا جائے کہ وہ صاحب نظریہ افراد کی حیثیت سے لوگوں کے درمیان رہ سکیں۔ انھیں چیزوں کے اوپر کسی قوم کی زندگی کا دارو مدار ہے لیکن مسلمانوں نے دوسروں کے خلاف سیاسی ہنگامہ آرائی تو خوب کی، خود اپنی تعمیر کے لئے کوئی کام نہ کیا۔

مزید نادانی یہ ہے کہ سیاست بازی سے جب وہ کامیاب نہ ہو سکے تو اب انھوں نے دوسرا مشغلہ یہ اختیار کیا ہے کہ اپنی ناکامی کے لئے دوسروں کو ذمہ دار ٹھیرا رہے ہیں۔ حالانکہ اس قسم کی باتوں سے وہ صرف یہ بات ثابت کر رہے ہیں کہ قرآن کے الفاظ میں انھوں نے کلمۂ طیبہ کا درخت نہیں اگایا تھا، بلکہ کلمۂ خبیثہ کا درخت اگایا تھا۔ کیونکہ کلمۂ طیبہ کے درخت کے لئے خدا کا اعلان ہے کہ کوئی اس کو اکھاڑ نہیں سکتا۔ یہ انجام صرف کلمۂ خبیثہ کے درخت کے لئے مقدر ہے کہ جو چاہے ہاتھ بڑھا کر اس کو اکھاڑ لے۔ (ابراہیم)

الرسالہ کا مقصد تعمیری اور اصلاحی ذہن پیدا کرنا ہے

اردو زبان، دستور ہند کی لسانی فہرست میں چودھویں نمبر پر ہے۔ مگر ملک میں اخبارات و رسائل کی تعداد کے اعتبار سے اس کا نمبر تیسرا ہے۔ ایسی حالت میں ایک نیا اردو رسالہ نکالنے کا ارادہ ہم نے کیوں کیا۔ جواب یہ ہے کہ تعداد کی کثرت کے باوجود اردو صحافت میں بعض خانے خالی تھے۔ اور رسالہ کے ذریعہ ہم انھیں خانوں کو پُر کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارا مقصد مختصر لفظوں میں "تعارف اسلام" ہے۔ مسلمان، ختم نبوت کے بعد، نبوت کے قائم مقام ہیں۔ انھیں بعد کے زمانوں میں خدائی پیغام رسانی کے ٹھیک اسی کام کو انجام دینا ہے جو پچھلے زمانوں میں انبیاء کرتے رہے ہیں۔ پیغام رسانی کا یہ اہتمام اللہ نے اس لئے کیا ہے کہ قیامت میں کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہم کو ایک ایسے معاملہ میں پکڑا جا رہا ہے جس کی بابت ہم کو بتایا نہیں گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم دوسروں کو خدا کی مرضی سے آگاہ نہ کریں تو دوسروں سے پہلے خود ہم کو پکڑا جائے گا کہ اپنے فرض منصبی کو ادا کیوں نہ کیا۔ یہ اتنی سنگین بات ہے کہ اس ذمہ داری سے غفلت برتنے کے بعد کوئی بھی ذاتی عمل مسلمانوں کو خدا کے یہاں بچا نہیں سکتا۔

مگر مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ دوسری قوموں کے سامنے اسلام کی پیغام رسانی کا کام نہیں کیا، بلکہ اپنے عمل سے اسلام کا الٹا تعارف کرایا ہے۔ پچھلے ڈیڑھ سو برس کے اندر جو تحریکیں ہمارے درمیان اٹھیں ان کا تجربہ ہے کہ حکومت الٰہیہ، علیحدہ قومیت مناظرہ بازی، سیاسی محاذ آرائی اور حقوق طلبی لوگوں کی نظر میں اسلام بن گئے ہیں۔ حالاں کہ قرآن میں جو اسلام ہے اس کا ان چیزوں سے کوئی تعلق نہیں۔ قرآن کا اسلام تو بس یہ ہے کہ: انسان اپنے مالک سے ڈرے، اس احساس کے ساتھ زندگی گزارے کہ مرنے کے بعد اس کو خدا کے یہاں حساب دینا ہے ——— اسلام اس لئے آیا تھا کہ انسانوں کو آخرت کے مسائل کی طرف متوجہ کرے، ہم نے اس کو دنیوی مسائل کی طرف متوجہ کرنے کا عنوان بنا دیا۔

مسلمانوں کو داعی کی حیثیت سے اٹھانا، آج ملت اسلامیہ کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ اس ذمہ داری کو چھوڑنے کی وجہ سے وہ خدا کی نصرت سے محروم ہو گئے ہیں اور دوبارہ اسی ذمہ داری کو پورا کر کے وہ خدا کی نصرتوں کے مستحق بن سکتے ہیں۔

اس کام کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ الرسالہ کم از کم پانچ زبانوں میں جاری ہو: اردو، ہندی، عربی، فارسی، انگریزی۔ یہ اللہ کا فضل خاص ہے کہ ہم کو ایسے افراد حاصل ہیں جو ان زبانوں میں اعلیٰ معیار کا ماہنامہ مرتب کر سکتے ہیں۔ مگر ان کو شائع کرنا اور چھپائی اور تقسیم کے تمام مراحل کے اخراجات، ان سب کے لئے کثیر مالی وسائل کی ضرورت ہے۔ تاہم جس خدا نے قحط الرجال کے اس دور میں ہم کو انسانی وسائل دیئے ہیں ہمیں امید ہے کہ وہ خدا فراوانی دولت کے اس دور میں مالی وسائل بھی ضرور مہیا فرمائے گا۔ انشاء اللہ جلد وہ وقت آئے گا جب کہ الرسالہ کے اڈیشن متعدد دوسری زبانوں میں بھی نکلیں اور تمام اقوام تک اس کے خیالات کی اشاعت ممکن ہو سکے۔

الرسالہ کے ساتھ ایک مکتبہ بھی ہوگا جس میں خصوصیت کے ساتھ اسلام کے تعارف پر کتابیں شائع کی جائیں گی۔ ہماری کوشش ہوگی کہ مثبت انداز میں بغیر کسی تعبیری یا کلامی اضافہ

قرآن، حدیث، سیرت، حالات صحابہ اور تاریخ اسلام پر کتابیں تیار کی جائیں اور ان کو مختلف زبانوں میں شائع کیا جائے۔ اسی کے ساتھ ایک لٹریچر تیار کرنا بھی ہمارے پروگرام میں شامل ہوگا جو وقت کی زبان اور عصر حاضر کی اصطلاحوں میں اسلام کی تشریح کرے۔ اس کے علاوہ ایسی کتابوں کی بھی ضرورت ہے جو مسلمانوں کے اندر تعمیری ذہن اور حقیقت پسندانہ مزاج پیدا کریں۔ ان کو بتائیں کہ قوموں کی زندگی کا راز دوسروں سے لاحاصل مقابلہ آرائی میں نہیں بلکہ خود اپنی تعمیر میں ہے۔ اسی طرح کچھ ایسی کتابیں بھی درکار ہیں جو علمی انداز میں تیار کی جائیں اور اسلام کے داعیوں کے لئے معاون کا کام دیں۔ مثلاً تاریخ انبیاء، مذاہب کی تاریخ، قاموس الاسلام، فکر جدید کا تعارف وغیرہ۔

یہ کام ایک انتہائی اہم کام ہے اور پوری طرح انجام دینے کے لئے بہت زیادہ وسائل و ذرائع چاہتا ہے۔ بلکہ ضرورت تو یہ ہے کہ دہلی یا اور کسی مناسب مقام پر ایک اعلیٰ معیار کا اسلامی مرکز قائم کیا جائے جو ان تمام ضرورتوں کی تکمیل کے لئے سرگرم ہو۔ اس میں تقابلی مذہب کے مطالعہ کا ادارہ ہو۔ عربی اور دوسری زبانوں کی تعلیم کا اعلیٰ مدرسہ ہو۔ مختلف زبانوں کا معیاری دار الاشاعت ہو۔ غیر مسلموں سے ربط قائم کرنے کے لئے ہر قسم کے عمدہ انتظامات ہوں، اسلام اور دیگر مذاہب و فلسفہ پر وسیع کتب خانہ ہو۔ لکچر ہال اور ریڈنگ روم ہو۔ تحقیق و تصنیف کے ادارے ہوں۔ پھر اس میں جدید ترین طرز کا ایک اسلامی میوزیم ہو جس میں اسلام کی تاریخی چیزوں کو تصویروں کے ذریعے پروجکٹ کیا جائے۔ یہ میوزیم اس بات کا ایک خاموش اعلان ہوگا کہ اسلام مکمل طور پر ایک تاریخی مذہب ہے نہ کہ محض دور قدیم کی ایک داستان جو غیر معتبر کہانیوں کے ذریعے چلی آرہی ہے۔

ستمبر ۱۹۷۵ میں سری نگر میں ایک اعلیٰ سطح کی میٹنگ ہوئی جس کے چیرمین وزیر اعلیٰ کشمیر شیخ محمد عبداللہ تھے۔ اس موقع پر مرکزی وزیر سیاحت مسٹر راج بہادر نے بتایا کہ مغربی ایشیا اور خلیج فارس کے ملکوں کے سیاحوں کو ہندوستان کی طرف مائل کرنے کے لئے حکومت ہند بہت سے نئے اقدامات کر رہی ہے۔ ٹورزم ڈیولپمنٹ کارپوریشن نے ایک فلم تیار کی ہے جس میں انڈین کلچر کے ذیل میں خصوصی طور پر اسلام کو دکھایا گیا ہے

(ہندوستان ٹائمس۔ ۲۴ ستمبر ۱۹۷۵ء)

نومبر ۱۹۷۵ میں دہلی میں قرأت قرآن کے مقابلے کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے وزیر ریلوے مسٹر شفیع قریشی نے کہا کہ یہاں ایک "قرآن گھر" قائم ہونا چاہئے جس کا خاص مقصد یہ ہو کہ قرآن کے ترجمے مختلف زبانوں میں تیار کرکے سارے ملک میں پھیلائے جائیں۔

جون ۱۹۷۶ء کے پہلے ہفتہ میں بمبئی میں بیت الحجاج کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ یہ ۲۰ منزلہ عمارت ۵ر۲ کروڑ روپے کی لاگت سے بنائی جائے گی۔ حکومت مہاراشٹر نے اس کے لئے زمین اور ایک لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔ صوبائی کانگریس نے ۱۵ ہزار اور مسٹر کے این مودی نے ۵۰ ہزار روپئے دیئے۔ عطیات کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ نائب وزیر خارجہ مسٹر بپن پال داس نے بتایا کہ وزیر اعظم اندرا گاندھی اس منصوبہ میں خصوصی دلچسپی لے رہی ہیں۔

اس تقریب کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے صدر جمہوریہ ہند فخرالدین علی احمد نے کہا کہ وقت آگیا ہے کہ اسلام کی تعلیمات کو پھیلایا جائے اور اس کے بارے میں غلط فہمیاں دور کی جائیں۔ انھوں نے کہا "دنیا آج روحانی بحران سے گزر رہی ہے اور آج سب سے زیادہ اس کو خدائی روشنی کی ضرورت ہے۔"

اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں جو اشارہ کر رہے ہیں کہ یہ بہترین موقع ہے جبکہ اسلامی مرکز کی اسکیم کو وجود میں لایا جائے۔ اس قسم کا مرکز اگر معیاری انداز سے قائم ہو جائے تو وہ اس ملک میں اسلام کا ایک تاج محل ہوگا جو شاہجہاں کے تاج محل سے بھی زیادہ مسلم ممالک کے سیاحوں کو ہندوستان کی طرف کھینچنے کا سبب بنے گا۔

یہ جدوجہد حیات کا ایک سبق ہے

رمضان کا مہینہ آدمی کے لئے اپنے نفس اور اپنی خواہشات سے لڑنے کا مہینہ ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جبکہ مومن شیطانی طاقتوں کو زیر کرکے اس کے اوپر قابو پاتا ہے اور دوبارہ خدا کی بندگی کا عزم لے کر نئے سال میں داخل ہوتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ روحانی مقابلہ کا یہ مہینہ اسلام کی تاریخ میں فوجی مقابلہ کا مہینہ بھی رہا ہے۔ اسلام اور غیر اسلام کے کئی تاریخی معرکے اسی مبارک مہینہ میں پیش آئے ہیں۔ مثال کے طور پر:

غزوۂ بدر (۲ھ ۶۲۴ء) جس نے پیغمبر اور آپ کے ساتھیوں کو قریش کے اوپر فیصلہ کن فتح دی۔

فتح مکہ (۶۳۰ء) جس نے پوری عرب دنیا پر اسلام کو غالب کر دیا

غزوۂ تبوک (۶۳۲ء) جس نے رومیوں کے اوپر اہل اسلام کی دھاک قائم کردی۔
(رجب میں شروع ہوکر رمضان میں ختم ہوا)

معرکۂ عین جالوت (۱۲۶۰ء) جس نے تاتاریوں کو شکست دے کر بغداد کی مسلم سلطنت کو دوبارہ زندہ کیا

مصر۔ اسرائیل جنگ (۱۹۷۳ء) جس نے نہر سوئز اور صحرائے سینا کے تیل کے چشموں کو دوبارہ مصر کے قبضہ میں دے دیا۔

یہ واقعات بتاتے ہیں کہ روزہ اور جدوجہد حیات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ روزہ کی بھوک پیاس آدمی کو کمزور نہیں کرتی۔ بلکہ وہ اس قابل بناتی ہے کہ زندگی کے معرکہ میں وہ زیادہ جاں فشانی کے ساتھ حصہ لے سکے۔

ایک واقعہ

ابوبکر بن عباس خوارزمی (۳۸۳ھ۔ ۳۲۳ھ) ذہانت و حافظہ میں ضرب المثل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ارجان میں صاحب بن عباد وزیر سے ملنے گئے۔ دروازہ پر پہنچے تو دربان اندر گیا اور صاحب سے جاکر کہا کہ دروازہ پر ایک ادیب آپ سے ملنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ وزیر نے کہا ان سے کہو: "میں نے طے کر لیا ہے کہ میرے پاس کوئی ادیب اس وقت تک نہیں آئے گا جب تک اسے عرب کے ۲۰ ہزار اشعار زبانی یاد نہ ہوں"۔ خوارزمی نے یہ بات سنی تو دربان سے کہا کہ جاؤ ان سے دریافت کرو کہ ۲۰ ہزار اشعار مردوں کے یا عورتوں کے۔

یہ سنکر وزیر ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے کہا "یہ ابوبکر خوارزمی معلوم ہوتے ہیں" اور فوراً اندر بلالیا۔

ان کا مقصد اللہ کے بچھڑے ہوئے بندوں کو اللہ سے ملانا تھا

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خیبر فتح کرنے کے لئے بھیجتے ہیں حضرت علیؓ نے پوچھا "یا رسول اللہ! کیا جاتے ہی قتال شروع کردوں؟ حضور نے فرمایا "وہاں جاکر ٹھہرو اور لوگوں کو لا الٰہ الا اللہ کی طرف بلاؤ۔ اگر نہ مانیں تو دوسرا معاملہ کرنا" اس لئے کہ لان یھدی اللّٰہ منک رجلاً خیر لک من الدنیا و ما فیھا۔ ایک آدمی کو بھی تمہارے ذریعہ اللہ تعالیٰ ہدایت کردے تو وہ تمہارے لیے دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ تم کو جوان اونٹوں کے ملنے سے بھی یہ بہتر ہے۔

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ عرب سے کیوں نکلے؟ وہ عراق میں پہنچے۔ شام، ایران، افغانستان، سندھ، یوپی، بہار اور جنوب میں دکن تک پہنچے۔ یہاں تک کیوں پہنچے؟ ان کا مقصد کیا تھا؟ کیا ملک فتح کرنا تھا؟ دولت لوٹنی تھی؟ ہرگز نہیں! ان کا اصل مقصد صرف لا الٰہ الا اللہ کی دعوت دینا تھا۔ دنیا کو سچے دین پر لانا تھا۔ اللہ کے بچھڑے ہوئے بندوں کو اللہ سے ملانا تھا۔ اور دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کرنا تھا۔ بعد والوں نے بے وقوفی کی کہ دنیا کے پیچھے پڑ گئے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہند میں باہر سے آنے والے مسلمانوں کی تعداد صرف چار یا پانچ لاکھ تھی۔ مگر تقسیم ہند کے وقت دس کروڑ پچیس لاکھ مسلمان تھے۔

ہمارے بزرگ اسلاف نے اور اولیاء کرام نے تبلیغ دین کے لئے بہت ہی کوششیں کیں۔ ایک انگریز سمتھ لکھتا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی

الرسالہ۔ اکتوبر ۱۹۷۶

لوگوں کو دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کرنا تھا

رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک پر نوے لاکھ مسلمان ہوئے۔ ان کے پاس کیا تھا؟ کونسی فوج تھی؟ فقط اللہ کی معرفت کا خزانہ تھا۔ ہر جگہ اللہ کے سچے بندے گزرے ہیں جنھوں نے دین کی تبلیغ کی۔ میں نے تاریخ ترکی میں دیکھا کہ ترک قوم کے تین لاکھ خاندان ایک دن میں مسلمان ہوئے۔ اللہ کا کرم کہ تبلیغ کی کوشش وہ پھل لائی کہ ایک زمانے میں بعض حکام کو یہ تدبیر کرنی پڑی کہ وہ اپنی رعایا کو مسلمان ہونے سے روکیں سنہ ۱۰۰ھ میں خلافت عمر بن عبد العزیز کے زمانے میں خراسان کے حاکم کو یہ خطرہ ہوا کہ جزیہ بند ہونے سے خزانہ خالی ہو جائے گا۔ اس لئے اعلان کرنا پڑا کہ کسی کا اسلام اس وقت تک قبول نہ کیا جائے گا۔ جب تک کہ وہ ختنہ نہ کرلے۔ بوڑھوں کے لئے تکلیف دہ بات تھی۔ اس حکم کے جاری ہونے سے اسلام کی ترقی رک گئی۔ اب خلیفہ کو اطلاع ملی کہ والیٔ خراسان نے اسلام پر پابندی لگادی ہے تو آپ نے اس کو معزول کرکے دوسرے کو مقرر کردیا اور فرمایا۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے آئے تھے کہ اس پر اسلام کو موقوف رکھا جائے؟

ہمارے اسلاف کی کوششوں سے اہل اللہ علماء کرام اور عام مسلمانوں کی کوششوں سے دس کروڑ پچیس لاکھ مسلمان ہوگئے۔ اگر غلط کاری نہ ہوئی ہوتی تو یقیناً ملک کا اکثر حصہ مسلمان ہو جاتا۔

تقریر بمقام ارکونم (مدراس) ۲۶ جولائی ۱۹۵

دوسروں کو کم تولنا اور اپنے لئے پورا تول لینا

"آج میں تم کو اچھے حال میں دیکھ رہا ہوں، مگر مجھے ڈر ہے کہ کل تم پر ایسا دن آئے گا جس کا عذاب سب کو اپنے گھیرے میں لے لے گا" (ہود-۸۴) یہ پیغمبرانہ انداز حضرت شعیب علیہ السلام کی تھی جو انھوں نے ساڑھے تین ہزار برس پہلے مدین والوں کو سنائی۔

مدین، قدیم عرب میں بحر احمر کے کنارے ایک شہر تھا۔ حضرت ابراہیم (۱۹۸۵-۲۱۶۰ ق م) کی بیوی قطورہ کے بطن سے آپ کے ایک صاحبزادے مدین نامی پیدا ہوئے۔ انھیں کی نسل ابتداءً یہاں آباد ہوئی اور ان کے نام پر شہر کا نام مدین رکھا گیا۔ انھیں مدین کی نسل سے، حضرت ابراہیم کے تقریباً ۵ سو برس بعد، حضرت شعیب پیدا ہوئے۔ اس وقت تک مدین کی قوم میں کافی بگاڑ آ گیا تھا۔ اللہ نے حضرت شعیب کو پیغمبری عطا کی اور ان کو مامور کیا کہ حضرت ابراہیم کی اس بگڑی ہوئی اولاد کو حق کا پیغام سنائیں۔ قوم مدین کی کیا خرابی تھی جس کی وجہ سے ان کے بارے میں کہا گیا کہ تم اپنے آج کے اچھے حال پر خوش مت ہو۔ کیونکہ آئندہ تمہارے لئے شدید عذاب کا اندیشہ ہے۔ وہ قرآن کے بیان کے مطابق یہ تھا کہ وہ ناپ تول پورا نہیں کرتے تھے اور لوگوں کو چیزیں دینے میں کمی کرتے تھے (اعراف-۸۵) اس اخلاقی بیماری کو قرآن میں دوسرے مقام پر ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے "خرابی ہے گھٹانے والوں کے لئے، جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے لیں تو پورا پورا لیں اور جب ان کو ناپ یا تول کر دیں تو کم کر دیں۔ کیا یہ نہیں جانتے کہ ایک بڑے دن یہ اٹھا کر لائے جانے والے ہیں، اس دن جب کہ سارے لوگ مالک کائنات کے سامنے کھڑے ہوں گے" (التطفیف)

"اپنے لئے بھرپور لینا اور دوسروں کو دینے میں کمی کرنا" ایک وہ ہے جو دکان داروں کے یہاں ملتا ہے۔ جو دکان دار ایسا کرتا ہے کہ اپنے لئے ناپتا اور تولتا ہو تو زیادہ لینے کی کوشش کرے اور دوسروں کو دینا ہو تو چاہے کہ کسی نہ کسی طرح اس میں گھٹا دوں، خواہ ناپنے اور تولنے میں کمی کر کے یا ملاوٹ اور خلاف نمونہ چیز دے کر، وہ خدا کے یہاں ملعون ہے اور اس کی ساری کمائی حرام کی کمائی ہے۔ اپنے اس دھوکے بازی کے کاروبار سے وہ خواہ کتنا ہی نفع حاصل کر رہا ہو، آخرت کے دن وہ سخت ترین گھاٹے میں ہوگا۔

تاہم اس ذہنیت کا تعلق صرف دکان داری سے نہیں ہے بلکہ انسانی تعلقات کے تمام پہلوؤں سے ہے۔ صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کہ "جو اہل علم اپنے معاصر فضلاء کی تعظیم و توقیر کا حق ادا نہیں کرتے وہ بھی اس آیت کے ذیل میں آجاتے ہیں" اسی پر ان تمام دوسری صورتوں کو قیاس کیا جا سکتا ہے جب کہ آدمی اپنے لئے تو چاہتا ہے کہ اپنے واقعی حق سے بھی زیادہ وصول کر لے اور دوسرے کو اس کے واجبی حق کے بقدر دینے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتا۔

ایسی شاندار چیزیں خدا کے یہاں کہاں!

نئی دہلی کے بین اقوامی صنعتی میلے (۱۹۶۱) میں امریکہ کی طرف سے ایک ہوائی موٹر کی نمائش کی گئی تھی۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ زمین پر بھی دوڑتی تھی اور ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوا میں بلند ہو کر بھی اڑتی تھی۔ ایک نوجوان سادھو جب نمائش کے مختلف مجوبوں اور رنگینیوں کو دیکھتا ہوا امریکی پویلین کے پاس پہنچا اور اس جادوئی گاڑی کو اڑتے اور دوڑتے ہوئے دیکھا تو اس کے ذہن میں ایک نیا سوال پیدا ہو گیا۔ کیا میں تیاگ اور قربانی کی زندگی کو چھوڑ کر مادی ترقیات کی دنیا میں اپنے حوصلوں کی تسکین ڈھونڈوں" سادھو نے کہا۔ گیروے کپڑے میں ملبوس اور لمبے بکھرے ہوئے بالوں والا یہ ہندستانی نوجوان ۲۰ منٹ تک اس امریکی موٹر کو دیکھتا رہا جس کو نمائش کے ذمہ داروں نے "مستقبل کی کار" کا نام دیا تھا۔ جب اس کے بارے میں سادھو کا تبصرہ پوچھا گیا تو اس نے گہرے تاثر کے ساتھ جواب دیا: "اس نے مجھے اس سوچ میں ڈال دیا ہے کہ دونوں دنیاؤں میں سے وہ کون سی دنیا ہے جس کو میں اپنے لئے زیادہ بہتر سمجھوں" (ہندوستان ٹائمس۔ ۲۰ نومبر ۱۹۶۱ء)

اسی قسم کا ایک اور واقعہ پڑھئے۔

جولائی۔ اگست ۱۹۷۵ء میں بہار میں ہولناک سیلاب آیا تھا۔ اس میں بہت سے خاندان بے گھر ہو کر مجبور ہوئے کہ کسی دوسری جگہ اپنے لئے پناہ گاہ تلاش کریں۔ انھیں مصیبت زدگان میں ایک غریب مسلم خاندان دہلی آیا۔ گھر کا مرد طوفان میں ختم ہو چکا تھا۔ ۱۲ سال کے یتیم لڑکے شریف اور اس کی دبلی اور بیمار ماں کو جو امید دہلی لائی، وہ یہ تھی کہ اس کا ماموں یہاں رکشا چلا کر اپنی روزی کما رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ رکشا کھینچنے والا ایک شخص دو خاندانوں کی پرورش کس طرح کر سکتا تھا۔ شریف کو ملازمت تلاش کرنی پڑی۔ اولاً کچھ دنوں ایک معمولی ہوٹل میں پلیٹیں دھوتا رہا۔ اس کے بعد ایک خوش حال مسلم خاندان میں اس کو گھریلو کاموں کے لئے ۵۰ روپے ماہوار پر جگہ مل گئی۔

شریف ایک انتہائی غریب خاندان کا لڑکا تھا۔ اس دنیا میں آنکھ کھولنے کے بعد اسے جو بستر ملا وہ زمین پر بچھا ہوا ایک ٹاٹ تھا۔ اب تک کی زندگی اس نے اس طرح گزاری کہ نہ کبھی اس کے پاؤں میں جوتا پڑا اور نہ جسم پر پورا لباس پہننے کو ملا۔ سردیوں کی رات کے معنی اس کے نزدیک صرف یہ تھے کہ لکڑی کے ٹکڑے اور پتیاں جمع کر کے کچھ دیر آنچ اور دھوئیں میں گزارے جائیں اور اس کے بعد ایک پھٹا ہوا ٹاٹ بچھا کر دوسرا پھٹا ہوا ٹاٹ اوپر سے لپیٹ لیا جائے۔

دسمبر کی ایک صبح کو جب کہ شریف مالک مکان کا بستر سمیٹ رہا تھا۔ اچانک ایک خیال اس کے دماغ میں رینگا۔ مسہری کے اوپر بچھا ہوا موٹا نرم گدا، اس کے اوپر خوبصورت چادر اور مخملی کپڑے میں بنا ہوا شاندار لحاف، ان چیزوں نے اس کو تھوڑی دیر کے لئے مبہوت کر دیا۔ "آپا" وہ مالک کی لڑکی سے بولا "کیا اللہ میاں کے یہاں ایسا بستر ہوگا" وہ اپنے اس سوال میں اتنا گم تھا کہ وہ یہ بھی نہ سن سکا کہ لڑکی یہ کہتی ہوئی چلی گئی ہے "بیوقوف وہاں تو اس سے بھی اچھے بستر ہوں گے"

گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو موجودہ زمانے میں سارے لوگ اسی نفسیات میں مبتلا نظر آئیں گے، چھوٹے بڑے امیر غریب، عالم جاہل، سب کے سب دنیا کی دلفریبیوں پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ لذت، دولت، شہرت، عزت، مرتبہ اقتدار، غرض دنیا کی چیزوں میں سے کسی چیز کا ایک ذرہ بھی اگر کسی کے سامنے آگیا ہے تو وہ اس کی طرف اس طرح دوڑتا ہے

گویا زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہو "خدا کے یہاں بھلا ایسی شان دار چیزیں کہاں ملیں گی، پھر کیوں نہ اسی دنیا میں جو کچھ ملے اس کو حاصل کر لیا جائے۔"

سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں مذہبی لوگوں کا حال بھی وہی ہے جو دوسرے اہل دنیا کا ہے۔ موجودہ زمانے میں جو دنیوی امکانات ان کے لئے کھلے ہیں ان کی طرف دوڑ بھاگ میں وہ دوسروں سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہیں ——— عہدوں اور مناصب کی دھوم، صدارت و نظامت کے اعزازات، جلسوں اور جلوسوں کی نمائش۔ بین اقوامی کانفرنسوں کے لئے پرواز، ایڈریس اور استقبال کے تماشے، اخبارات کی سرخیوں میں چھپنا اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کا شوق ان کو بھی اتنا ہی ہے جتنا کسی عام دنیا دار کو ہو سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص آخرت پر تقریر کر رہا ہے اس کو بھی آخرت کا یقین نہیں۔ اگر ہے تو بہت کم۔

ایک کامیاب ترین انسان جب موت کے دروازہ پر پہنچتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ دروازہ کے دوسری طرف اس کے لئے مایوسی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں

ہوورڈ ربارڈ ہیوز امریکہ کا ایک ممتاز ترین ارب پتی تھا۔ اپریل ۱۹۷۶ میں ایک ہوائی سفر کے دوران اس پر دل کا حملہ ہوا۔ اس نے ہوائی جہاز کو فوراً ہاؤسٹن میں اتار لیا۔ مگر اسپتال پہنچنے سے پہلے وہ ختم ہو چکا تھا۔

اپنے قانون داں باپ سے اس کو ایک ملین ڈالر بطور وراثت ملے تھے۔ مگر اس نے اپنی غیر معمولی تجارتی صلاحیت سے اپنے سرمایہ کو ۲۰۰۰... کرور ڈالر سے بھی زیادہ بڑھا لیا۔ اس کے ہوائی جہاز کا عملہ جو اس کے ساتھ شریک سفر تھا اس نے اس کے آخری لمحات کے بارے میں جو چشم دید تاثرات بیان کئے اس کی بنیاد پر مشہور امریکی آرٹسٹ شرل سالومن نے اس کا خاکہ تیار کیا ہے۔ اس خاکہ میں اس کے سفر حیات کے آخری لمحات کو مصور کیا گیا ہے ——— امریکہ کا کامیاب ترین تاجر اس خاکہ میں وحشت، مایوسی، بے چارگی، ناکامی اور بے یقینی کا مجسمہ نظر آتا ہے۔ امریکی تاجر کی یہ وحشت ناک تصویر اس کیفیت کو مجسم کر رہی ہے جو ایک آدمی کی اس وقت ہوتی ہے جب وہ موت کے دروازے پر پہنچ چکا ہو اس کے پیچھے وہ زندگی ہو جس کو وہ چھوڑ چکا اور آگے وہ زندگی ہو جس میں اب وہ ہمیشہ کے لئے داخل ہو جائے گا۔



This is how a multi-millionaire looked in the last moments of his life—a sketch of the American legendary figure, Howard Hughes, who died en route from Acapulco (Mexico) to Methodist Hospital, Houston. The sketch was drawn by an artist on the basis of details furnished by the pilots who flew him.

روزہ

غالباً ۱۹۴۳ کی بات ہے۔ گورکھپور میں ایک بڑے مسلم افسر رہا کرتے تھے۔ رمضان کے مہینے میں کچھ روز کے لئے ان کے یہاں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ ان کے بنگلہ کے سامنے ایک علیٰحدہ بیٹھک بنی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ روزانہ صبح کو ایک "حافظ صاحب" قرآن بغل میں لئے ہوئے آتے ہیں۔ کچھ دیر بیٹھ کر تلاوت کرتے ہیں، پھر واپس چلے جاتے ہیں۔

"یہ کون صاحب ہیں جو روزانہ صبح کو یہاں آتے ہیں" کئی روز تک یہ منظر دیکھنے کے بعد میں نے صاحب خانہ سے پوچھا۔ میرا سوال سن کر پہلے وہ ہنسے۔ اس کے بعد جواب دیا: "بات یہ ہے کہ میں روزہ نہیں رکھ پاتا۔ اس لئے میں نے حافظ صاحب کو مقرر کر دیا ہے کہ وہ رمضان کے پورے مہینے میں میرے یہاں آکر قرآن پاک کی تلاوت کر دیا کریں۔ مہینہ کے ختم پر ان کی کچھ خدمت کروں گا۔"

یہ ایک "بے روزہ دار" کا قصہ تھا۔ اب روزہ داروں کو دیکھئے۔ ایک بار میں نے اذان کی آواز آنے سے پہلے گھڑی دیکھ کر افطار کر لیا۔ کئی لوگ سنجیدگی سے اس شبہ میں پڑ گئے کہ میرا روزہ نہیں ہوا۔ آج کل کے روزہ داروں کا حال یہ ہے کہ وہ اس کا سخت اہتمام کریں گے کہ طلوع سحر سے کچھ منٹ پہلے کھانا پینا بند کر دیں اور غروب آفتاب کے کچھ منٹ بعد افطار شروع کریں۔ اس کا نام انھوں نے "احتیاط" رکھا ہے۔ ایک طرف اوقاتِ روزہ میں احتیاط کا یہ عالم کہ سحری میں تعجیل اور افطار میں تاخیر کی حد تک اس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ صریح طور پر سنت کے خلاف ہے۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ میری امت اس وقت تک خیر پر رہے گی جب تک وہ افطار میں تعجیل (جلدی) کرتی رہے گی۔ دوسری طرف مقاصد روزہ میں بے احتیاطی کا یہ حال ہے کہ وہ اس کو ضروری نہیں سمجھتے کہ روزہ رکھ کر کسی کی برائی نہ کریں، کسی سے جھگڑا نہ کریں، منھ سے جھوٹ بات نہ نکالیں۔ حالانکہ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص روزہ رکھ کر جھوٹ بات کرے تو اس کا روزہ، روزہ نہیں۔ اسی طرح دوسری حدیث میں ہے کہ کوئی روزہ دار کسی مسلمان کی غیبت کرے تو گویا اس نے خدا کی حلال کی ہوئی چیز سے روزہ رکھا اور اس کی حرام کی ہوئی چیز سے افطار کر لیا۔

یہ دونوں واقعات بظاہر ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ ایک جگہ روزہ داری ہے، دوسری جگہ بے روزہ داری۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو دونوں کی شعوری سطح ایک نظر آئے گی۔ دونوں عبادت یا روزہ کو ایک قسم کا رسمی عمل سمجھ رہے ہیں نہ کہ ایک ایسا عمل جو انسان کی اندرونی گہرائیوں سے نکلتا ہے، جو اس کے پورے وجود کا نمائندہ ہوتا ہے۔

عبادت کا ایک مطلب یہ ہے کہ وہ ایک زندہ عمل ہو۔ دوسرا یہ کہ وہ محض ایک رسم ہو۔ زندہ عمل آدمی کے پورے وجود سے نکلتا ہے۔ وہ اس کی مکمل ہستی کا ایک اظہار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس رسم کی حیثیت محض ایک بے روح خارجی عمل کی ہوتی ہے۔ آدمی قلب و روح کو اس میں شامل کئے بغیر اوپری طور پر اسے انجام دے دیتا ہے۔ مثال کے طور پر تنہائیوں میں اللہ کو یاد کر کے رونا ایک عبادت ہے جب کہ اپنے دنیوی دھندوں میں مشغول رہتے ہوئے تسبیح کے دانوں پر "اللہ اللہ" شمار کرنا محض ایک رسم ہے۔ تنہائی میں مومن کی آنکھ سے جو آنسو نکلتے ہیں وہ اس کی پوری ہستی کا نچوڑ ہوتے ہیں جبکہ لفظ "اللہ" کو شمار کرنے والا صرف یہ کرتا ہے کہ پلاسٹک کے دانوں کو مقررہ تعداد میں دھاگے میں پرو لیتا ہے اور اپنے مشاغل میں مصروف رہتے ہوئے محض انگلیوں کی حرکت کے ذریعہ اس کو گنتا رہتا ہے۔ زندہ عمل میں آدمی اور اس کے عمل کے درمیان گہرا نفسیاتی ربط ہوتا ہے جب کہ رسم میں دونوں کے درمیان اس قسم کا کوئی ربط نہیں ہوتا۔

موجودہ زمانہ میں روزہ کی حیثیت ایک قسم کی سالانہ رسم کی ہو گئی ہے۔ لوگوں کی اصل زندگی بدستور اپنے ڈھرے پر چلتی رہتی ہے۔ روزہ کا زمانہ آتا ہے تو وہ بس ہجری کیلنڈر کے نویں ماہ میں داخل ہوتا ہے۔ لوگوں کی زندگیوں میں داخل نہیں ہوتا۔ روزہ رکھ کر نہ لوگوں کے دل نرم پڑتے۔ نہ ان کے اندر عجز پیدا ہوتا، نہ جائز اور ناجائز کے معاملہ میں ان کی قوت شامہ میں کوئی اضافہ ہوتا۔ ان کے نزدیک روزہ کے معنی صرف یہ ہیں کہ ایک خاص وقت سے خاص وقت تک کھانا پینا بند رکھا جائے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اس طرح بھوکے رہنے سے خدا خوش ہو جائے گا ——— ایسی حالت میں ایک بے روزہ دار کیوں نہ سوچے کہ جب خدا کو خوش کرنے کے لئے کچھ رسم ہی ادا کرنی ہے تو جیسا روزہ کی رسم ویسا تلاوت کی رسم —— ایک رسم نہ کی، دوسری رسم کر لی۔ خدا جیسے اس رسم سے خوش ہوتا ہے، اسی طرح وہ دوسری رسم سے بھی خوش ہو جائے گا۔

اصل یہ ہے کہ روزہ محض ایک خارجی رسم نہیں۔ بلکہ وہ ایک باطنی عمل ہے۔ وہ مومن کی نفسیاتی حالت کا ایک جسمانی اظہار ہے۔ مومن کا مطلب ہے ایک ایسا شخص جو دنیا کی زندگی میں برائیوں سے بچ کر رہے۔ "جو کرنے اور نہ کرنے" کے بارے میں خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں کی پابندی کرے۔ روزہ اسی قسم کی پابند زندگی کی مشق ہے۔ روزہ میں کھانا پینا چھڑانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو روزمرہ زندگی میں "یہ کرو اور وہ نہ کرو" کے ایک لازمی کورس سے گزار کر اس کو سبق دیا جائے کہ اسی طرح تم کو پوری زندگی گزارنی ہے۔ اسی طرح ساری عمر کے لئے تم کو "روزہ دار" بن جانا ہے جب کہ تم خود اپنے ارادہ سے ایک طرح کی زندگی کو چھوڑ دو اور دوسری طرح کی زندگی کو بالقصد اختیار کر لو۔ روزہ کے مہینے کی پابند زندگی دراصل پورے سال اور ساری عمر کے لئے پابند زندگی کی ایک علامت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے سارے معاملات میں "روزہ داری" کے اسی طریقے پر عمل کرے جو اس نے رمضان کے مہینے میں کھانے پینے کے معاملہ میں کیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو حدیث کے الفاظ میں "اللہ کو اس کی حاجت نہیں کہ کوئی شخص محض اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔"

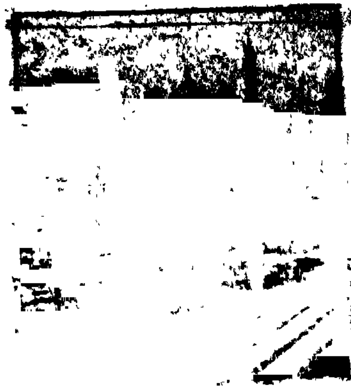
اگر روزہ دار لوگ اپنے عمل سے حقیقی روزہ داری کا نمونہ پیش کریں تو غیر روزہ داروں کو ہمت ہی نہیں پڑے گی کہ وہ سوچیں کہ اپنے روزہ کی تلافی کے لئے کسی حافظ صاحب کی خدمات بالمعاوضہ حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس کے بعد انھیں یہ عمل بالکل مضحکہ خیز دکھائی دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ روزہ کی یہ بے قدری روزہ داروں نے کی ہے نہ کہ بے روزہ داروں نے۔ بے روزہ دار تو اسی کو روزہ سمجھیں گے جس کا نمونہ روزہ دار دکھا رہے ہوں۔

زمانہ کا فرق کہاں سے کہاں پہنچا ہے

ناوابستہ ملکوں کی کانفرنس جو کولمبو میں اگست ۱۹۷۶ کے دوسرے ہفتہ میں ہوئی اس کی خبروں میں سے ایک خبر یہ تھی کہ ۲۵ مسلم ملکوں کے سربراہ اور ان کے ساتھی جو اس کانفرنس میں شریک ہوئے انھوں نے ۱۳ اگست کو جمعہ کی نماز مقامی جامع مسجد میں ادا کی۔ اس کے انتظام کے لئے جو کمیٹی بنی، اس کے صدر الحاج بدیع الدین تھے جو سری لنکا کی حکومت میں ایک وزیر ہیں۔

ایشیا اور افریقہ کے اس علاقہ کی نمائندگی کرنے والی کوئی کانفرنس اگر پچاس برس پہلے "کولمبو" میں ہوتی تو ہم اس قسم کی خبر اخبار میں نہ پڑھتے۔ کیونکہ اس وقت ان "۲۵" اسلامی ملکوں کے نمائندے مسلمان سربراہ نہ ہوتے بلکہ یورپی ملکوں کے گورنر اور وائسرائے ہوتے۔ موجودہ زمانہ نے اسلام کو زندہ کرنے کے بہت سے نئے امکانات کھول دیئے ہیں۔ مگر شاید ابھی تک لوگوں کو اس کی خبر نہیں۔

اسلام کی عظمتیں اسلام کی چوکیدار ہیں



دہلی کی جامع مسجد، شاہجہاں کی ایک حیرت انگیز یادگار ہے۔ یہ عظیم مسجد چھ سال (۵۶-۱۶۵۰) میں بن کر تیار ہوئی۔ چھ ہزار کاریگروں اور مزدوروں نے مسلسل اس میں کام کیا۔ اور اس کی تعمیر پر دس لاکھ روپے خرچ ہوئے۔ یہ تین سو برس پہلے کی بات ہے جب کہ ایک مستری کی اجرت دو پیسے اور مزدور کی ایک پیسہ یومیہ ہوتی تھی۔ نیز مسجد کے قیمتی پتھر اور عمارتی سامان راجاؤں کی طرف سے مفت پیش کئے گئے تھے۔ اس مقدس عمارت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انتہائی سادہ ہونے کے باوجود انتہائی پرکشش ہے۔ تاج محل نے اپنے رومانوی پہلو کی وجہ سے غیر معمولی شہرت پائی۔ مگر تناسب شکوہ اور لطیف حسن جس طرح جامع مسجد کے سرخ و سپید پتھروں میں ڈھل گئے ہیں، اس کی کوئی دوسری مثال زمین پر مشکل سے ملے گی۔

شاہجہاں کے زمانے میں جامع مسجد کے ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کا خصوصی اہتمام ہوتا تھا۔ جامع مسجد اور لال قلعہ اور مینا بازار کا مجموعہ اس زمانے میں دنیا کے چند انتہائی پرکشش مقامات میں سے ایک سمجھا جاتا تھا۔ مگر ۱۸۵۷ کے انقلاب کے بعد وہ گندگی کا علاقہ بنتا چلا گیا۔ مسجد کے چاروں طرف دکانوں کے لاتعداد گھروندے کھڑے ہو گئے اور اس کی عالی شان سیڑھیاں گداگروں کا اڈہ بن گئیں۔ مولانا محمد علی جوہر (۱۹۳۱ــ۱۸۷۸) کو ایک بار ایک پیشہ ور مصور نے ایک روغنی تصویر فروخت کے لئے پیش کی۔ یہ جامع مسجد دہلی کی تصویر تھی۔ اس کی سیڑھیوں پر ایک بھکارن عورت کو اپنی دو بچیوں کے ساتھ کھڑے ہوئے دکھایا گیا تھا جامع مسجد کی سیڑھیوں کے لئے یہ اتنا عام منظر تھا کہ محمد علی اس کی تردید نہ کر سکے البتہ اس کو بامعنی بنانے کے لئے انھوں نے کہا: میں تمھاری تصویر کو خرید لوں گا، تم تصویر کے نیچے یہ جملہ لکھ دو:

Her Fathers Built It

اس کے بزرگوں نے اسے بنایا تھا۔

مسجد کے چاروں طرف جو تعمیری گھروندے کھڑے ہوئے تھے ان کو ہٹانے کا کام ۲۲ نومبر ۱۹۷۵ کو شروع ہوا تھا۔ ساڑھے سات سو دکانوں کے ہٹانے کے بعد اب ایسا نظر آتا ہے جیسے کوئی سرخ پہاڑ تھا جس کو ملبہ نے ڈھک لیا تھا اور اب اس کو اچانک کھول دیا گیا۔ بلند چٹان پر بنی ہوئی مسجد اپنی تمام عظمتوں کے ساتھ نمایاں ہو کر سامنے آگئی۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے چاروں طرف عظمت کے چوکیدار کھڑے ہو گئے ہیں" میرے ایک دوست نے مسجد کے نئے منظر کو دیکھ کر کہا "ایک عظیم وجود خود ہی اپنا چوکیدار ہوتا ہے، اگر اس کو پستیوں سے ڈھانک نہ دیا جائے"

مجھے خیال آیا کہ اسلام کی عظمت کو بھی اسی طرح اس کے پیروؤں نے اپنی پستیوں سے ڈھانک رکھا ہے۔ اگر ہم اپنی پستیوں کے نشانات کو اس کے گرد و پیش سے ہٹا دیں تو معلوم ہوگا کہ ـــــ اسلام کی عظمتیں خود ہی اسلام کی چوکیدار ہیں۔ اس کو اپنی عظمت کا منارہ کھڑا کرنے کے لئے کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں۔

۱۹۴۷ کے ہنگامہ کے بعد دہلی کے مسلمان جب دوبارہ آباد ہوئے تو ان کا رجحان زیادہ سے زیادہ جامع مسجد کے گرد جگہ حاصل کرنے کا تھا۔ یہاں وہ اپنے کو ایک قسم کی پناہ کے اندر

محسوس کرتے تھے۔ مگر یہ کوئی صحت مند رجحان نہ تھا۔ کیونکہ زندگی کا راز پھیلنے میں ہے نہ کہ سمٹنے میں۔ حکومت کے تازہ عمل نے مسلمانوں کو دوبارہ جد وجہد کے پھیلے ہوئے میدان کی طرف دھکیل دیا ہے۔ یہ ایک قسم کی مہمیز ہے جو ان کے لئے ترقی اور عروج کا ایک نیا وسیع تر راستہ کھول دے گی۔ اس معاملہ میں حکومت کی تعمیر پسندی کے ثبوت کے لئے یہ واقعہ کافی ہے کہ جامع مسجد سے جن دکانداروں کو ہٹایا گیا ہے، ان کو نئی زیادہ بہتر دکانیں حکومت کی طرف سے بنا کر دے دی گئی ہیں۔ پہلے ان کی دکانیں اگر کھوکھوں میں تھیں تو اب وہ سرخ پتھروں سے بنے ہوئے "مینا بازار" میں اپنی دکانیں سنبھالے ہوئے ہیں۔ شاہجہاں کا دور نئی شکل میں دوبارہ واپس آگیا ہے۔

جامع مسجد کے علاقہ کے لئے حکومت کا یہ منصوبہ اچانک طور پر پیدا نہیں ہوا ہے۔ تقریباً ۲۰ برس پہلے جامع مسجد کی ترقیاتی اسکیم بن چکی تھی۔ اس اسکیم کا محرک دراصل ہندستان میں سیاحت کو ترقی دینا ہے۔ سیاحت موجودہ زمانہ میں ایک انڈسٹری بن گئی ہے۔ ۱۹۷۴ میں عالمی سیاحوں کی تعداد ۲۱۰ ملین تھی۔ آج تمام ممالک اپنے تاریخی مقامات اور قدرتی مناظر کو ترقی دے رہے ہیں تاکہ وہ بیرونی سیاحوں کو اپنی طرف کھینچ سکیں جو اپنے ساتھ بیرونی دولت کی بہت بڑی مقدار لے آتے ہیں۔ پچھلے برسوں میں پٹرو ڈالر کے ظہور نے سیاحت کے عالمی نقشہ پر عربوں کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے۔ ہندستان اب تک سیاحت کی انڈسٹری میں پیچھے رہا ہے۔ ۱۹۷۴ میں ۲۳۲۰۰ کروڑ روپے سیاحوں کے ذریعہ گردش میں آئے۔ مگر ان کا ایک فی صد سے بھی کم حصہ ہندستان پہنچا۔ نی سیاحوں کی ۸۰ فی صد تعداد صرف ۲۰ ملکوں میں جاتی ہے۔ حالانکہ اس عظیم ملک میں وہ سب کچھ ہے جو اس کو عالمی سیاحت کا مرکز بنانے کے لئے کافی ہے۔ خاص طور پر مغربی ایشیا کے مسلم ملکوں کے سیاح اور اس علاقہ سے آنے والی اہم شخصیتوں کو دکھانے کے لئے ہمارے یہاں کسی بھی دوسرے ملک سے زیادہ سامان موجود ہے۔ ان میں بھی تاج محل کے بعد شاہجہانی مسجد اور لال قلعہ اپنی منفرد خصوصیات کی وجہ سے اہم ترین درجہ رکھتے ہیں۔

حکومت کے اس اقدام نے اس علاقہ کو اچانک مقامی اہمیت کے ایک بازار سے اٹھا کر بین اقوامی اہمیت کا بازار بنا دیا ہے۔ یہ علاقہ عنقریب ہندستان میں سیاحوں کی آمد و رفت کا سب سے بڑا مرکز بن جائے گا۔ یہاں سفراء اور وزراء اور حکومتوں کے سربراہ آئیں گے۔ اہم شخصیتوں کے پروگرام میں اس کو خصوصی اہمیت حاصل ہوگی۔ مسلمان اس راز کو جان لیں تو موجودہ "توڑ پھوڑ" کو اپنے لئے عظیم تعمیر نو کی بنیاد بنا سکتے ہیں۔ اس علاقہ کے دکان دار اگر اپنی دکانوں کو بین اقوامی معیار کے مطابق ترقی دیں اور بیرونی مہمانوں کی دلچسپی کی چیزیں فروخت کے لئے رکھیں تو وہ عالمی سطح پر اپنے خریدار پا سکتے ہیں

آخری اہم ترین بات یہ ہے کہ اس علاقہ میں ایک "اسلام میوزیم" قائم کیا جائے۔ یہاں اسلام کی تاریخی چیزیں رکھی جائیں اور ملکی اور دیگر قوموں کی زبانوں میں اسلامی لٹریچر فراہم کیا جائے۔ یہاں آنے والے سیاح اور بڑی بڑی شخصیتیں اس سے خصوصی دلچسپی لیں گی۔ اور وہ نہ صرف تجارتی حیثیت سے کامیاب ہوگا بلکہ اسلام کی بین اقوامی اشاعت کا ایک اہم مرکز بن جائے گا۔

جامع مسجد کا نیا منظر پیدا ہونے کے بعد خود دہلی کے غیر مسلم اور ملکی سیاح بڑی تعداد میں یہاں آنے لگے ہیں۔ ان

جامع مسجد دہلی کی نئی تعمیر نے اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے نیا مستقبل کھول دیا ہے

یہاں اسلام کی بین اقوامی اشاعت کا ادارہ قائم کیا جاسکتا ہے

لوگوں کی بیاآمدان کے درمیان اسلام کے تعارف کا بہت قیمتی ذریعہ بن سکتی ہے۔ اگر جامع مسجد کے قریب کوئی اسلام بھون قائم ہو وہاں ملک کی مختلف زبانوں میں لٹریچر ہو اور ہندی اور دوسری زبانوں کے جاننے والے لوگ وہاں ان سے ملاقات اور گفتگو کے لئے موجود ہوں تو وہ کثرت سے وہاں آئیں گے اور اسلام کے متعلق معلومات حاصل کریں گے۔ مسلمانوں کی غلط سیاست نے ان کے لئے جو مشکلات پیدا کی ہیں ان کو دور کرنے کی اس سے بہتر کوئی صورت نہیں۔ جامع مسجد کے علاقہ کو حکومت جس طرح کروڑوں روپیہ صرف کر کے خوبصورت بنا رہی ہے۔ اس میں ہمارے لئے ایک زبردست روشنی ہے۔ "مسجد" مسلمانوں کا ایک خالص مذہبی نشان ہے۔ اس کے باوجود اس میں دلچسپی لینے کے لئے کوئی تعصب حائل نہ ہو سکا۔ یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ اس ملک کے لوگوں میں کس قدر رواداری ہے وہ اگر کسی چیز کو پسند کرلیں تو ہر قسم کے تعصب سے بالا ہو کر اس میں اپنی بہترین قوت صرف کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جامع مسجد کے معاملہ کو بے تعصبی کا معاملہ بنا کر حکومت نے اسلام کے معاملہ کو بے تعصبی کا معاملہ بنا دیا ہے۔ اس واقعہ نے بہترین طور پر وہ فضا پیدا کر دی ہے جس میں اسلام کے تعارف و اشاعت کا کام نہایت کامیابی کے ساتھ کسی مزاحمت کے بغیر کیا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ مواقع سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت ہمارے اندر موجود ہو۔

حضرت یحییٰ بن زکریا (متوفی ۳۰ء) بائبل کے الفاظ میں، بیابان میں پکارنے والے کی آواز تھے۔ مگر آج پریس کا زمانہ ہے۔ آج پیغمبرانہ دعوت کو پھیلانے کے لئے ضروری ہے کہ پریس کی طاقت کو استعمال کیا جائے۔

الرسالہ کوئی تجارتی پرچہ نہیں، یہ تعمیر ملت اور احیائے اسلام کی اشاعتی مہم ہے۔ اس کے زندہ رہنے اور مؤثر بننے کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ آپ اس کو اپنا کام سمجھیں اور اس میں بڑھ چڑھ کر تعاون فرمائیں۔

الرسالہ کا صرف عام چندہ اس کی زندگی کا ضامن نہیں بن سکتا۔ رائج الوقت دوسرے ذریعے بھی اس کی مالی تقویت کے لئے اختیار کرنا ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں اس کی زندگی کی واحد صورت یہ ہے کہ آپ اس کی خصوصی خریداری قبول فرمائیں۔ خصوصی خریداری کے لئے کم سے کم ایک سو ایک روپیہ سالانہ (ہندستان کے لئے) رکھا گیا ہے۔ زیادہ کی کوئی حد نہیں۔

ملت اسلام کے مستقبل کو بدلنے کے لئے ایک نئی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ الرسالہ اسی جدوجہد کا ایک عنوان ہے۔ اگر اس مہم کو آپ کا خصوصی تعاون مل گیا تو ہو سکتا ہے کہ اس آغاز سے وہ انجام ظہور میں آئے جس کا صدیوں سے زمین و آسمان کو انتظار ہے۔

نئے حالات نے مذہب کو پھیلانے کا نیا دروازہ کھول دیا ہے

سفر کی سہولتوں نے موجودہ زمانہ میں بین اقوامی سیاحت کو ایک مستقل انڈسٹری بنا دیا ہے۔ آج جو لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک میں سفر کرتے ہیں، ان میں بڑی تعداد سیاحوں کی ہوتی ہے۔ ہندستان میں پچھلے چند برسوں کے اعداد و شمار کا جو تجزیہ کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے اندر آنے والے سیاحوں میں تہائی کی تعداد میں وہ لوگ تھے جن کی عمریں ۱۷ سال اور ۳۰ سال کے درمیان تھیں۔ ان میں بھی ۲۷ فی صد وہ نوجوان تھے جو اپنے اپنے ملکوں میں زیر تعلیم ہیں یہ سیاحت کی دنیا میں ایک نئی چیز ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے اس قسم کی سیاحت کے لئے زیادہ تر بوڑھے لوگ نکلا کرتے تھے۔

سیاحوں کی فہرست میں نوجوانوں کا اضافہ بہت معنی خیز ہے۔ جوانی کا زمانہ جوش و خروش کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں زندگی امنگوں اور حوصلوں سے لبریز ہوتی ہے۔ وہ کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ تحقیق سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ نوجوان، قدیم سیاحوں سے مختلف ہیں اور کچھ نئی چیزوں کے طالب ہیں۔ قدیم سیاح آرام دہ ہوٹل، ایرکنڈیشنڈ کار اور کھانے پینے کے عمدہ انتظام کا مطالبہ کرتے تھے۔ یہ نوجوان سیاح ان چیزوں کی پروا نہیں کرتے وہ اوسط درجہ کے انتظام پر بالکل مطمئن ہو جاتے ہیں۔ وہ آرام اور فیشن کی تلاش سے زیادہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے لئے ڈاکومنٹری فلم، کلچر اور تعلیم یافتہ گائڈ کا انتظام ہو، جو ان کو ملک کی تہذیبی وراثت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات دے سکے۔

اس کا ذکر کرتے ہوئے ایک اخبار نے اپنے اڈیٹوریل میں لکھا تھا: "یہ نئے قسم کے سیاح محض تماش بین نہیں ہیں جو وقت گزاری کی خاطر یہاں آتے ہیں۔ ان کے اندر علم کی پیاس ہے۔ وہ ہندستان کے آرٹ اور کلچر کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔"

انڈین اکسپرس، ۸ مارچ ۱۹۷۶

یہ دراصل اس عام ردعمل کا ایک نمونہ ہے جو ساری دنیا میں نئی نسل کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ آج کی نئی نسل، خاص طور پر ترقی یافتہ ملکوں کی نئی نسل، اپنے ماحول سے غیر مطمئن ہے۔ یہ ماحول اس کو مادی مواقع دیتا ہے۔ مگر اس کے ذہنی اور روحانی سوالات کا جواب اس میں نہیں ملتا۔ چنانچہ جدید دنیا میں عام طور پر ماضی کی طرف دیکھنے کا ذہن ابھر رہا ہے جب کہ انسانی سماج مشین کی پیدا کردہ الجھنوں سے پاک تھا۔ آج کا انسان یہ سمجھتا ہے کہ جس سوال کا جواب حال میں موجود نہیں، اس کا جواب شاید ماضی کے خزانہ میں اسے مل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق میں مغربی سیاحوں کی آمد بڑھ رہی ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ مشرق میں وہ ماضی ابھی تک محفوظ ہے جو مغرب میں بڑی حد تک ضائع ہو چکا ہے۔

اس صورت حال نے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کا ایک نیا دروازہ کھول دیا ہے۔ مزید یہ کہ بین اقوامی سیاحی نے مدعو کو خود داعی کے پاس پہنچا دیا ہے۔ جن لوگوں کو پانے کے لئے ہمیں سمندر پار کا سفر کرنا پڑتا وہ خود ہمارے قریب آکر کھڑے ہو گئے ہیں۔ مگر داعیوں کا حال یہ ہے کہ مسلم تاریخی مقامات پر آنے والے سیاحوں کو وہ اپنے لئے تجارت کا مال سمجھتے ہیں، نہ کہ دعوت کا موضوع۔ دہلی کی جامع مسجد میں نماز کے اوقات میں ان کے لئے داخلہ ممنوع ہے حالاں کہ اس وسیع مسجد میں اگر نماز کے وقت غیر مسلم آئیں اور قرآن کے بتائے ہوئے طریق عبادت کو دیکھیں تو یہ ان کو اللہ کا پیغام پہنچانے کے ہم معنی ہوگا اور اس حکم خداوندی کی تعمیل ہوگی جو سورہ توبہ آیت ۶ میں بیان کیا گیا ہے۔

نماز سے آغاز

دو برس پہلے کی بات ہے، میں اپنی کتاب "الاسلام" کی ترتیب کے دوران ایک سوال سے دوچار تھا: "موجودہ زمانہ تجربوں اور مشاہدوں کا زمانہ ہے۔ آج کا انسان اگر مجھ سے پوچھے کہ کیا اسلام کی صداقت کو ہم تجرباتی طور پر جان سکتے ہیں تو میرا جواب کیا ہوگا" اسی اثنا میں ۱۳ اور ۱۴ جولائی ۱۹۷۴ کی درمیانی شب کو میں نے دہلی میں خواب دیکھا کہ میں کچھ غیر مسلموں کے ساتھ ہوں اور ان کو اسلام کی باتیں بتا رہا ہوں۔ یہ غالباً یورپ کے کچھ لوگ تھے اور مجھ سے ٹھیک یہی سوال کر رہے تھے۔ عجیب بات ہے کہ وہ سوال جس کو میں حالت بیداری میں حل نہ کر سکا تھا، اللہ تعالیٰ نے حالت خواب میں اس کو کھول دیا۔ میں نے دیکھا کہ میں اس سوال کے جواب میں ان سے پورے اعتماد کے ساتھ کہہ رہا ہوں: "ہاں اسلام کی تجرباتی آزمائش ممکن ہے اور اس کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ نماز کا تجربہ کریں" مخاطب کی رعایت سے خواب کی یہ گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔ میری نیند کھلی تو اپنا ایک جملہ مجھے لفظ بہ لفظ یاد تھا۔ میں نے ان سے کہا تھا:

Without being a Muslim, you can experience Namaz

(مسلمان نہ ہوتے ہوئے آپ نماز کا تجربہ کر سکتے ہیں) جہاں تک یاد آتا ہے، اس کے بعد ان لوگوں نے وضو کیا اور میرے ساتھ نماز پڑھی۔ "نماز کا یہ تجربہ" ان کے لئے اتنا مؤثر ہوا کہ اس کے بعد انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔

تاریخ میں کثرت سے اس کی مثالیں موجود ہیں کہ لوگ صرف نماز کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہند جگر خوار کے اسلام سے متاثر ہونے کا ابتدائی سبب نماز ہی تھی۔ مسلمان جب مکہ میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوئے تو انھوں نے وہاں ظلم اور گھمنڈ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بلکہ مسجد میں جا کر اللہ کے سامنے اپنے عجز اور بندگی کا اقرار کیا۔ ابن مندہ نے روایت کیا ہے کہ ہند نے اپنے شوہر ابوسفیان سے کہا کہ میں اسلام قبول کرنا چاہتی ہوں۔ ابوسفیان نے کہا، تم تو ابھی کل تک اسلام کی سخت مخالف تھیں۔ انھوں نے جواب دیا ہاں، مگر رات جو منظر میں نے دیکھا اس نے میرے ذہن کو بالکل بدل دیا ہے:

واللہ ما رأیت اللہ تعالیٰ عبد حق عبادتہ فی ھذا المسجد قبل اللیلۃ، واللہ ان باتوا الا مصلین قیاما و رکوعا و سجودا	خدا کی قسم آج کی رات سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ اس مسجد میں خدا کی عبادت اس طرح کی گئی ہو جیسا کہ اس کی عبادت کرنے کا حق ہے۔ خدا کی قسم یہ لوگ ساری رات نماز پڑھتے رہے۔ انھوں نے قیام اور رکوع اور سجود میں رات گزار دی۔

افریقہ کی تاریخ کا ایک مبصر لکھتا ہے:

"وسط افریقہ میں اسلام کی اشاعت بہت بڑی حد تک سیاحوں اور عرب تاجروں کے ذریعہ ہوئی۔ ان کا سب سے بڑا معجزہ جس سے افریقہ میں اسلام کی اشاعت ہوئی، نماز تھا۔ جہاں یہ لوگ ایک امام کے پیچھے ایک صف میں کھڑے ہوئے اور ان کے چہروں سے خدا کا خوف ظاہر ہوا دیکھنے والے ششدر ہو کر رہ گئے۔ لوگ ایک طرف اپنی ذلیل بت پرستی پر نادم ہوئے، دوسری طرف اسلامی عبادت نے ان کو اپنی طرف کھینچا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف نماز نے وسط افریقہ کی اکثر آبادی کو اسلام میں داخل کر دیا"

Winwood Reade, Martyrdom of Man, P.32

شاہجہاں کے زمانے میں منگولوں سے مغل سلطنت کا مقابلہ پیش آیا۔ اورنگ زیب اس وقت شہزادہ تھا۔ اس کو مقابلے کے لئے بھیجا گیا۔ اس نے منگولوں کو سنکیانگ تک دھکیل دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جس وقت اورنگ زیب اور جے سنگھ کی فوجیں سنکیانگ کے صحرا میں منگولوں کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ ظہر کی نماز کا وقت آگیا۔ اورنگ زیب گھوڑے سے اتر گیا اور میدان جنگ میں رومال بچھا کر نماز ادا کرنے لگا۔ منگولوں نے دیکھا کہ بادشاہ "ڈنڈ بیٹھک" کی طرح کوئی عمل کر رہا ہے۔ انھیں اس عمل پر سخت حیرت ہوئی۔ نماز کے آداب کو قریب سے دیکھنے کے لئے انھوں نے جنگ روک دی اور اورنگ زیب کا محاصرہ کر لیا۔ وہ سکون کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا۔ اور منگول چاروں طرف اس کو گھیرے ہوئے حیرت کے ساتھ اس کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہے تھے جب بادشاہ نے سلام پھیرا تو منگولوں نے پوچھا کہ یہ آپ کیا کر رہے تھے۔ اورنگ زیب نے جواب دیا: "میں اس خدا کی عبادت کر رہا تھا جو سب سے بڑا اور سب سے زیادہ مہربان ہے"

بادشاہ کا یہ جواب سن کر منگول کانپ اٹھے۔ ان کا حوصلہ پست ہو گیا۔ انھوں نے یہ سوچ کر ہتھیار ڈال دیئے کہ ایسے بہادر انسان کو زیر کرنا ممکن نہیں۔ یہ ۱۶۴۷ء کا واقعہ ہے۔

محمد حسنین ہیکل (سابق ایڈیٹر الاہرام) نے لکھا ہے کہ جمال عبد الناصر جب پہلی بار روس گئے تو اس وقت کے روسی وزیر اعظم نکیتا خروشچوف نے گفتگو کے دوران نماز سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔ یہ ۲۹ ر اپریل ۱۹۵۸ کا واقعہ ہے:

"خروشچوف کو مسلمانوں کے نماز پڑھنے کا منظر دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جب خروشچوف کے گھر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد صدر ناصر ظہر کی نماز کے لئے ماسکو کی مسجد جانے لگے تو خروشچوف نے سوالوں کی بھرمار کر دی۔ ناصر جتنی دیر وضو کرتے رہے، خروشچوف بذات خود تولیہ لئے کھڑا رہا۔ اس نے بڑی عقیدت و احترام کا مظاہرہ کیا"

علم الانسان پر جدید تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ معبود کی پرستش کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے جو ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر موجود رہتا ہے۔ کوئی بھی چیز اسے ختم نہیں کر سکتی۔ نماز اسی فطری جذبے کے اظہار کا فطری طریقہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے آداب اور طریقوں میں یہ فطری تقاضا اس طرح سمیٹ دیا گیا ہے کہ نماز میں اور انسان میں خاص مناسبت پیدا ہو گئی ہے۔ نماز انسانی فطرت کی عکاس بن گئی ہے۔ جون ۱۹۷۶ء میں ایک بار مجھے ایک غیر مسلم کے مکان پر نماز ادا کرنے کا موقع ملا۔ ہم دو آدمی تھے۔ جب تک ہم لوگ نماز پڑھتے رہے، چھ افراد کا پورا خاندان دم بخود ہو کر ہم کو دیکھتا رہا۔ نماز سے فراغت کے بعد صاحب خانہ نے کہا: "آپ کی نماز کو دیکھ کر میرے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ جی چاہتا تھا کہ میں بھی اس میں شریک ہو جاؤں" اس قسم کا تجربہ مجھے اپنی زندگی میں کئی بار پیش آیا ہے۔

ہماری یہ لازمی ذمہ داری ہے کہ ہم اللہ کے دین کو اس کے تمام بندوں تک پہنچائیں۔ اس سلسلے میں ایک سوال یہ ہے کہ اس کے آغاز کی عملی شکل کیا ہو۔ دین کو ان کے لئے بحث کا موضوع کس طرح بنایا جائے۔ موجودہ حالات میں اس کی ایک قابل عمل شکل نماز نظر آتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ نماز کی "اٹھ بیٹھ" بعض لوگوں کو عجیب سی چیز معلوم ہوگی۔ جیسا کہ مکہ میں ابو طالب کے ساتھ پیش آیا تھا۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ان کے صاحبزادے علی بن ابی طالب ابتداءً نماز ہی کو دیکھ کر اسلام سے متاثر ہوئے تھے، اور پھر اسلام کے سب سے بڑے جاں باز ثابت ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسری اقوام تک دین کو پہنچانے کے لئے نماز نہایت کامیاب ذریعہ ہو سکتی ہے۔ فطری کشش تو اس کے اندر ہمیشہ سے تھی، مگر موجودہ زمانے کے تجرباتی اور مشاہداتی مزاج نے اس کے اندر ایک "سائنسی" اہمیت پیدا کر دی ہے۔ آج کا انسان چاہتا ہے کہ کسی بات کو ماننے سے پہلے اس کو عملی شکل میں جانے، وہ اس کا ذاتی تجربہ کر سکے۔ نماز اس ضرورت کو کامل درجہ

عین پکار رہی ہے۔ جب ایک شخص نماز میں مشغول ہوتو وہ حیرت انگیز طور پر محسوس کرتا ہے کہ یہ خود اس کی اندرونی مانگ کا جواب ہے۔ نماز کے مختلف اعمال میں خود اس کے اپنے معانی تقاضے پورے ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کی پوری ہستی نماز میں اس طرح شامل ہوجاتی ہے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اور حقیقت اعلیٰ دونوں ایک دوسرے میں جذب ہوگئے ہیں۔ حتیٰ کہ جو شخص دور سے صرف نماز کا مشاہدہ کر رہا ہو، وہ بھی اس کی سادگی، اس کی عظمت اور انسانی وجود کے ساتھ اس کی مطابقت پر حیران رہ جاتا ہے۔ وہ کھلم کھلا محسوس کرنے لگتا ہے کہ معبود کی پرستش کا اس سے بہتر کوئی طریقہ ممکن نہیں۔

جہاں تک نجات آخرت کا سوال ہے آدمی کے لئے باایمان نمازی ہونا ضروری ہے۔ مگر اس کی کیفیات کو پانے کے لئے رسمی ایمان کی ضرورت نہیں۔ ایک شخص اگر وہ سنجیدہ ہو، ایمان لائے بغیر بھی نماز کے مقررہ طریقے میں اپنے آپ کو مشغول کرکے نماز کی کیفیتوں اور لذتوں کا ایک حصہ پا سکتا ہے۔ نماز کا یہ پہلو اس کے اندر ایک دعوتی قدر پیدا کر دیتا ہے۔ مکہ کی تاریخ اس کی عملی تصدیق بھی کر رہی ہے۔ کیونکہ مکہ میں، اسلام کے ابتدائی دور میں، قرآن کے بعد نماز ہی سب سے زیادہ لوگوں کو دین سے قریب کرنے کا ذریعہ بنی تھی۔

دوسری قوموں میں دین کی اشاعت کے لئے موجودہ زمانے میں ہمیں جو کام کرنے ہیں ان میں سے ایک کام یہ ہے کہ عالمی سطح پر مسلم نوجوانوں کی ایک تنظیم قائم کی جائے۔ اس تنظیم کا خاص مقصد نماز پڑھنا اور پڑھانا ہو۔ اس کے افراد تمام شہروں میں ہوں اور وہ ہر دن کسی نہ کسی ایسے پارک میں جائیں جہاں غیر مسلم مرد اور عورتیں تفریح کے لئے آتے ہوں۔ وہاں وہ ایک دو گھنٹے اس طرح گزاریں کہ ان کی گفتگو اور اٹھنے بیٹھنے میں مکمل طور پر سنجیدگی کا اظہار ہو۔ ان کے پاس قرآن کا ترجمہ ہو یا ایسی کوئی کتاب ہو جس میں پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کے اخلاقی اور ایمانی واقعات درج ہوں۔ وہ آپس میں بیٹھ کر اس کو پڑھیں۔ بالقصد اپنی طرف سے کسی کے اوپر تبلیغ کی کوشش نہ کریں۔ البتہ اگر کوئی شخص خود سے ان کے حلقہ درس میں بیٹھنا چاہے تو اس کو عزت کے ساتھ بٹھائیں۔ کوئی سوال کرے تو انتہائی نرمی اور سنجیدگی کے ساتھ اس کا جواب دیں۔ جواب معلوم نہ ہو تو صفائی کے ساتھ کہیں کہ ہمیں اس کا جواب معلوم نہیں۔ ہم تحقیق کرکے اگلے دن آپ کو بتائیں گے۔ ان کے پاس نماز اور دوسری اسلامی تعلیمات کے بارے میں چھوٹے چھوٹے کتابچے مختلف زبانوں میں ہوں جو وہ شائقین کو مفت دے سکیں۔ پارک کے اس پروگرام کا سب سے اہم جزو نماز ہو۔ اس مقصد کے لئے غالباً عصر کی نماز زیادہ موزوں ہوگی۔ سب نوجوان مل کر نماز ادا کریں۔ نماز خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں۔ ایسا ہرگز نہ کریں کہ جلدی جلدی پڑھ کر سلام پھیر دیں۔ چار رکعت نماز میں لگ بھگ ۲۰ منٹ صرف کئے جائیں۔ نماز اس طرح پڑھی جائے گویا ہم فی الواقع اللہ کے سامنے کھڑے ہیں اور اس کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار کر رہے ہیں۔

یہ کام اگر کچھ برسوں تک مسلسل نہایت خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ کیا جائے تو اس کے غیر معمولی نتائج برآمد ہوں گے۔ مسجدوں میں نماز کی تحریک مسلمانوں کی اصلاح کے لئے کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے۔ اسی طرح پارکوں میں نماز کی تحریک غیر مسلموں تک دین کا پیغام پہنچانے کے لئے چل پڑے تو ہماری ذمے داری کے دونوں تقاضے پورے ہو جائیں گے۔ اور دنیا میں اگر خدانخواستہ اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو آخرت میں انشاء اللہ ہمارا شمار ان لوگوں میں ہوگا جنھوں نے خلق اللہ کے سامنے حق کی گواہی دی تھی اور ایک مومن کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

یہ بھی انتہائی ضروری ہے کہ یہ کام نظم کے ساتھ ہو۔ جو لوگ اس پروگرام میں شریک ہوں وہ باہم مشورہ سے ایک شخص کو منتظم مقرر کریں۔ وہی شخص کتاب پڑھے اور وہی شخص بوقت ضرورت بولے۔ بقیہ لوگ بالکل خاموش رہیں اور منتظم کے حق میں دل ہی دل میں دعا کرتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرمائے اور اس کی زبان سے وہی کلمات نکالے جس میں حق اور خیر ہو۔

A Spiritual Turn To American Life

امریکہ کا صدارتی الیکشن ۲ نومبر ۱۹۷۶ء کو ہوگا۔ ڈیموکریٹک پارٹی نے اس کے لئے جمی کارٹر کو اپنا نمائندہ چنا ہے۔ ریپبلکن پارٹی اس وقت جس حالت انتشار میں ہے اس کے پیش نظر اکثر مبصرین کا خیال ہے کہ امریکہ کے ۳۹ ویں صدر جمی کارٹر ہوں گے۔ یہ امریکہ کی سیاسی تاریخ میں ایک نمایاں واقعہ ہوگا۔ کیونکہ ۱۸۴۹ کے بعد پہلی بار امریکہ کے جنوبی علاقہ کا کوئی شخص اقتدار کی کرسی پر بیٹھے گا۔

جمی کارٹر (پیدائش ۱۹۲۴) امریکہ کی جنوبی ریاست جارجیا کے رہنے والے ہیں۔ چند ماہ پہلے تک باہر کی دنیا میں انھیں کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ ان کے مقابلہ میں تقریباً ایک درجن امیدوار تھے۔ ان میں بعض عالمی شہرت کے مالک ہیں مثلاً ہیوبرٹ ہمفری۔ ایسی حالت میں جمی کارٹر کی کامیابی کا راز کیا ہے۔

اس کی وجہ امریکی عوام کی موجودہ نفسیات ہیں۔ ۱۹۴۵ میں جاپان کو ایٹم بم سے تباہ کرنے کے بعد امریکہ نے سمجھ لیا تھا کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ مگر ویٹ نام اور کمبوڈیا کی پسپائی، روس کا متوازی ایٹمی طاقت کی حیثیت سے ابھرنا۔ سمندروں پر امریکی بالا دستی کا خاتمہ، عرب۔ اسرائیل قضیہ میں یک طرفہ کارروائی کے مواقع ختم ہو جانا۔ ایسے واقعات تھے جنھوں نے امریکی باشندوں کے احساس برتری کا خاتمہ کر دیا۔ اسی طرح پٹرول اور خام مواد میں امریکہ کا دوسرے ملکوں پر انحصار، مادی فراوانی کے باوجود ٹکنالوجی کے پیدا کردہ پیچیدہ مسائل اور اس طرح کی دوسری چیزیں ہیں جنھوں نے امریکی شہریوں کے اس بے پناہ فخر و یقین کو کھو دیا ہے جس سے جنگ عظیم ثانی کے بعد ہر امریکی سرشار نظر آتا تھا۔

جمی کارٹر ذہنی یا علمی اعتبار سے کسی غیر معمولی شخصیت کے مالک نہیں ہیں۔ ان کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانی حقوق اور قدیم اقدار کی باتیں کرتے ہیں۔ ان کی تقریروں میں ایک قسم کا اخلاقی اور مذہبی رنگ پایا جاتا ہے۔ وہ خدا کا نام لیتے ہیں اور بائبل کے حوالے دیتے ہیں۔ حال میں ایک تقریر میں انھوں نے کہا:

> There is more - much more - to this nation than money, property and inherited advantage. Materially, we are a great and powerful nation and proud of it. But it is our principles and our spirit that we value above all.

کچھ چیزیں ہیں جو امریکی قوم کے لئے دولت، جائداد، پیدائشی مواقع سے بھی زیادہ بڑی ہیں۔ مادی اعتبار سے ہم ایک عظیم اور طاقتور قوم ہیں اور ہمیں اس پر فخر ہے۔ مگر ہمارے اصول اور ہماری اسپرٹ اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔

(اسٹیٹسمین ۱۷ جولائی ۱۹۷۶ء)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ جمی کارٹر امریکی صدر بننے کے بعد اپنے ملک میں اخلاقی اور مذہبی حکومت قائم کر دیں گے — یقینی طور پر ایسا کوئی سیاسی معجزہ پیش آنے والا نہیں ہے۔ تاہم اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دور جدید کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوم کو اس کے مادی سفر نے بالآخر کہاں پہنچایا ہے۔ جمی کارٹر جس روحانی احیاء

(Spiritual Renaissance)

کا نام لیتے ہیں، وہ ان کے اپنے صدارتی عزائم سے زیادہ امریکی ووٹروں کی موجودہ نفسیات کو بتاتی ہے۔ اس نفسیاتی طلب کا جواب فراہم کرنا کسی سیاسی لیڈر کے لئے ممکن نہیں۔ اس کو تو کوئی خدا پرستانہ تحریک ہی انجام دے سکتی ہے اور وہی اسے انجام دے گی۔ خواہ آج یا آج کے کئی سو برس بعد۔

آج ساری دنیا میں ایک نیا عمل جاری ہے — دو سو سال کی عارضی مادہ پرستی کے بعد دوبارہ مذہب اور روحانیت کی طرف واپسی۔

دور صحابہ
کے طرز کے
مدرسے

تعلیمات اسلامی کا ایک ادارہ قائم کرنے کی ضرورت

سر آرتھر کیتھ (۱۸۶۶ – ۱۹۵۵) نے مصر کی قدیم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے لکھا ہے "مصر کو مسلمانوں کی تلوار نے فتح نہیں کیا بلکہ قرآن نے فتح کیا"۔ یہی بات ایشیا اور افریقہ کے اس پورے خطہ کے لئے سچ ہے جس کو آج ہم اسلامی دنیا کے نام سے جانتے ہیں۔ ایسا کیوں کر ہوا کہ یہ ساری قومیں نہ صرف اپنا مذہب بلکہ زبان تک بدل کر اسلامی برادری میں شامل ہو گئیں۔ جواب یہ ہے کہ مدرسوں کے ذریعہ۔ دور اوّل کے مسلمان عرب سے نکل کر اطراف کے تمام ملکوں میں پھیل گئے۔ انھوں نے اپنی اسلامی مہم کے مرکز کے طور پر جگہ جگہ اسلامی مدرسے قائم کئے۔ ان مدرسوں میں لوگوں کو عربی زبان سکھائی جاتی تھی اور قرآن و حدیث پڑھایا جاتا تھا۔ ان مدرسوں سے جو لوگ پڑھ کر نکلتے، وہ اپنی اپنی بستیوں میں جاکر دوبارہ اسی قسم کے ادارے قائم کرتے۔ مدرسوں کو بنیاد بناکر کام کرنے کا یہی طریقہ تھا جس نے ایک سو برس کے اندر اندر اس وقت کی آباد دنیا کے بڑے حصے کے مذہب، تہذیب اور زبان کو بدل ڈالا۔

قرآن ایک دائمی معجزہ ہے۔ خالق کائنات نے اس کے ذریعے اپنے بندوں سے کلام کیا ہے وہ اس دنیا میں خدا اور بندہ کا مقام اتصال ہے، وہ دلوں کو گرماتا ہے اور شعور کو بیدار کرتا ہے۔ اس کے اعلیٰ مضامین اور اس کا آسمانی ادب اتنا اثر انگیز ہے کہ جو شخص بھی قرآن کو سمجھ کر پڑھتا ہے، اس کی صداقت کو ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح رسول کی زندگی اور آپ کے اصحاب کے حالات انسانی تاریخ کا انتہائی حیرت ناک انقلابی واقعہ ہیں جو زندگیوں کو گرمانے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ دور اول کے مدرسے بس انھی چیزوں کو زندہ کرنے کے ادارے تھے۔ وہ سادہ طور پر عربی زبان سکھا کر آدمی کو قرآن و حدیث سے وابستہ کر دیتے تھے۔ اس کے بعد آدمی ایمان اور حرارت کے ان خزانوں سے براہ راست اپنا دین اخذ کرنے لگتا تھا۔ علم دین اس کے لئے صحبت رسول اور صحبت صحابہ کے ہم معنی ہو جاتا تھا۔ خدا کی کتاب اس کی فطرت کو جگاتی تھی۔ رسول اور آپ کے اصحاب کی انقلابی زندگیاں اس کے سینہ میں عمل کی آگ بھر دیتی تھیں۔ اس طرح زندہ انسانوں کی وہ فوج تیار ہوتی تھی جو خدا کے لئے جینے اور خدا کے لئے مرنے کے سوا کوئی اور بات اس دنیا میں نہ جانتی تھی۔

آج ہمارے یہاں پہلے سے بھی زیادہ بڑی تعداد میں مدرسے قائم ہیں مگر آج ان مدرسوں کا وہ فائدہ ظاہر نہیں ہو رہا ہے جو دور اول میں ظاہر ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مدرسے اپنے ڈھانچے کے اعتبار سے اس سے بالکل مختلف ہیں جو صحابہ و تابعین نے قائم کئے تھے۔ موجودہ زمانہ کے مدرسوں میں تعلیم دین کو ایک فن بنا دیا گیا ہے۔ قرآن اس لئے اترا کہ اس کو پڑھ کر لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہوں اور ان کے دل خدا کی یاد سے دہل اٹھیں۔ مگر ان مدرسوں کے نصاب میں قرآن کو صرف ضمنی مقام حاصل ہے۔ رسول کی زندگی اور صحابہ کے حالات جو تاریخ انسانی میں آتش فشاں کی حیثیت رکھتے ہیں ان کو سرے سے پڑھایا ہی نہیں جاتا۔ احادیث و آثار کا مقام ہمارے مدارس میں صرف یہ ہے کہ ان کو عنوان بنا کر جزئیات فقہ کے کچھ خود ساختہ مسائل پر لا متناہی بحثیں جاری رکھی جا سکیں۔ اسی کے ساتھ "علوم آلیہ" کے نام پر جو فنون پڑھائے جاتے ہیں وہ اتنے فرسودہ

ہیں کہ ذہن کو جمود اور لاتعلقی مو شگافیوں کا عادی بنانے کے سوا کوئی دوسری خدمت انجام نہیں دے سکتے۔ اسلامی مدرسہ کی فضا کو اللہ کی بڑائی کے چرچے سے معمور رہنا چاہئے۔ مگر ہمارے موجودہ تعلیمی ادارے زوال کی جس سطح پر ہیں وہ یہ ہے کہ ہر ایک نے اپنے کچھ بزرگ اور اکابر بنا رکھے ہیں اور مدرسہ کی تمام سرگرمیاں بس انھیں بزرگوں کی کبریائی کا سبق دینے کے لئے وقف رہتی ہیں۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ یہاں لوگوں کو ایمانی حرارت کا سبق ملے، یہاں اعلیٰ انسانی کردار ڈھلیں۔ یہاں خدا اور آخرت کی تڑپ رکھنے والے لوگ پیدا ہوں، یہاں سے اسلام کا وہ سیلاب اٹھے جو دور اول کے مدرسوں سے اٹھا تھا اور ایک عالم پر چھا گیا تھا۔

ضرورت ہے کہ دوبارہ دور اول کے طرز کے مدرسے قائم ہوں اور ان کو بنیاد بنا کر اصلاح امت کا کام کیا جائے۔ ان مدارس کا نصاب بالکل سادہ اور غیر فنی ہونا چاہئے۔ موجودہ حالات کے لحاظ سے ہم اس کو چار مرحلوں پر تقسیم کر سکتے ہیں:

پہلا مرحلہ: عربی زبان اور قرآن
دوسرا مرحلہ: حدیث، سیرت رسول، حالات صحابہ، اسلامی تاریخ وغیرہ (عربی زبان میں)
تیسرا مرحلہ: عالمی زبانیں، دیگر مذاہب اور ان کی تاریخ۔ فلسفہ جدید، ضروری سائنسی معلومات
چوتھا مرحلہ: اختصاصی مطالعہ کسی ایک اسلامی موضوع پر (عربی میں ایک مقالہ تیار کرنا)

اس قسم کا ایک مدرسہ اعلیٰ معیار پر قائم ہو جائے تو بلاشبہ وہ دور جدید کا سب سے بڑا کام ہوگا۔

اصل کام علوم قرآنی کو زندہ کرنا ہے

مولانا ابوالکلام آزاد

اس بوالعجبی پر ہمیشہ ماتم کیا جائے گا کہ تمام علوم اسلامیہ کے درس و تدریس کا اصل مقصود قرآن تھا اور سب کے سب اس کے لئے بمنزلہ آلات و وسائل تھے۔ مگر اجرام سماوی کا مطالعہ کرنے والا دوربین کے بنانے میں ایسا غرق ہوا کہ اسے آسمان کی طرف نظر اٹھانے کی مہلت ہی نہ ملی یعنی معقولات اور فلسفہ و کلام اصل مقصود بن گئے اور قرآن اور علوم قرآن بالکل نظر انداز کر دیئے گئے پھر یہ حالت یہاں تک بڑھی کہ یہ سمجھنا مشکل ہو گیا کہ ہمارے مدارس کا اصل مقصود کیا ہے۔ ارسطو اور اس کے بہت بعد کے کج فہم ترجمانوں کی پرستش یا قرآن حکیم و حدیث نبوی کا فہم و درس (ہمارے مدارس میں) معقولات قدیمہ کے لئے تو متون و شروح کے بوجھ سے ماغوں کو کچلا جاتا ہے۔ مگر قرآن اور علوم قرآن کے لئے صرف جلالین و بیضاوی کے چند اجزا ہی کافی سمجھ لئے گئے ہیں۔ اور پھر کیا ان کتابوں کے ذریعے قرآن اور علوم و معارف قرآن سے کوئی حقیقی مناسبت پیدا ہو سکتی ہے

چند معاصرین

فیروز شاہ تغلق	شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی
سلطان محمد شاہ بہمنی	شیخ زین الدین
شہنشاہ بابر	شیخ عبد القدوس گنگوہی
شہنشاہ اکبر	ملا عبد النبی
شہنشاہ جہانگیر	شیخ احمد سرہندی
احمد شاہ ابدالی	شاہ ولی اللہ دہلوی
نظام حیدرآباد	شیخ حسین احمد مدنی

پچاس برس پہلے کی بات ہے جب کہ ساری دنیا میں یورپ کی مسیحی قوموں کا غلبہ تھا۔ قاہرہ کے ایک عیسائی مشنری مسٹر وانسن سے ایک شخص نے پوچھا: کتنے دنوں سے آپ یہاں تبلیغ کے میدان میں کام کر رہے ہیں۔ "پچاس سال سے" پادری نے جواب دیا۔ "اتنے دنوں میں کتنے مسلمانوں نے عیسائیت کو اختیار کیا"؟ اس کا اگلا سوال تھا۔ "تقریباً ڈیڑھ سو" پادری نے کہا۔ اور پھر فوراً ہی بولا: "مگر پھر بھی آپ کو خبردار رہنے کی ضرورت ہے"۔

سوال کرنے والے کے لئے پادری کا یہ جملہ غیر متوقع تھا۔

"اس سے آپ کی کیا مراد ہے" اس نے دوبارہ پوچھا۔ اس کے بعد پادری نے جو جواب دیا وہ یہ تھا:

> They are apt to become Christian for material motives. Then at their death they recant.

وہ مادی محرک کے تحت عیسائی ہو جاتے ہیں اور پھر موت کے وقت توبہ کر لیتے ہیں

Stanwood Cobb,
Security For A Failing World,
Baha'i Publishing Trust
P.O. Box 19, New Delhi 1
1971, P. 91

ہماں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا ایں جا است

افریقی ریاست گابون کے صدر البرٹ برنارڈ بانگو (پیدائش ۱۹۳۵) نے ستمبر ۱۹۷۳ء میں اسلام قبول کر لیا۔ اس طرح کی خبریں مسلسل آتی رہتی ہیں جب کہ نہ صرف عوام بلکہ ممتاز افراد اسلام کی صداقت کا اعتراف کرتے رہتے ہیں مسٹر تیشی تناکا جاپان کے محکمہ پولیس کے ڈائرکٹر تھے۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد وہ سیاست میں داخل ہوئے اور جاپانی پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں وہ ٹوکیو کے اسلامی مرکز میں آئے اور کلمۂ شہادت پڑھ کر اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ مسٹر ٹامسن امریکہ کے ۳۱ سالہ صحافی ہیں، انھوں نے فارسی زبان سیکھی ہے۔ فل برائٹ اسکالرشپ کے تحت وہ ایک سال سے افغانستان میں ہیں اور مولانا روم کی مثنوی کا انگریزی زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے قرآن کا ترجمہ پڑھا اور اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کیا۔ وہ اسلام سے متاثر ہو گئے۔ ۱۷ اپریل ۱۹۷۶ء کو وہ اجمیر میں مسلمان ہو گئے۔ ان کا اسلامی نام معین الدین ٹامس رکھا گیا۔ شاہجہانی مسجد درگاہ خواجہ صاحب میں مولانا محمد یحییٰ صاحب نے ان کو کلمۂ شہادت پڑھایا۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں نے بے شمار تحریکیں اٹھائیں۔ حتیٰ کہ ان کی تحریکوں کے غلغلہ سے فضائے آسمانی گونج اٹھی۔ مگر وہی ایک کام انھوں نے نہ کیا جو ان کے خدا نے سب سے زیادہ ان پر فرض کیا تھا یعنی اللہ کے دین کو اس کے تمام بندوں تک پہنچانا۔ تاہم مسلمانوں کی کسی کوشش کے بغیر دین فطرت لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب کہ دنیا میں کہیں نہ کہیں یہ واقعہ پیش نہ آتا ہو کہ اللہ کے بندے اللہ کے دین کو قبول کر کے اس میں داخل نہ ہو رہے ہوں۔ مسلمانوں کو تو یہ توفیق بھی نہ ہو سکی کہ وہ کوئی ایسی اجتماعی

قائم کرتے ہیں نو مسلموں کے اعداد و شمار جمع کر کے شائع کرتی۔ البتہ عالمی ادارہ مذہب (World Religions Institute) نے حال میں کچھ اعداد و شمار شائع کئے ہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۷۱ سے ۱۹۷۵ تک کے پانچ سالوں میں تقریباً پانچ لاکھ آدمیوں نے اسلام قبول کیا۔ یہ اعداد و شمار صرف یورپ اور امریکہ سے متعلق ہیں۔ افریقہ میں مسلمانوں کی پس ماندگی اور عیسائی مشنریوں کی غیر معمولی جدوجہد کے باوجود عیسائی بننے والوں کے مقابلہ میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ السٹریٹڈ ویکلی کے ایڈیٹر مسٹر خوشونت سنگھ نے اپنے افریقی دورہ کے تاثرات کے ذیل میں لکھا تھا:

"کینیا اور یوگنڈا کے اپنے آخری سفر میں میں نے عیسائیوں اور مسلمانوں کی ان تبلیغی کوششوں کا جائزہ لیا جو مختلف قبائل کے درمیان جاری ہیں۔ عیسائیوں نے تسلیم کیا کہ مسلم عرب بردہ فروشوں کی ناخوش گوار یادوں کے باوجود افریقہ کے سیاہ فام باشندوں میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد عیسائی بننے والوں سے زیادہ ہے"

(السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا۔ ۷ جولائی ۱۹۷۴، صفحہ ۲۷)

اگرچہ ہمارے پاس قطعی اعداد و شمار نہیں ہیں تاہم یہ اندازہ مبالغہ آمیز نہیں کہ آج بھی کسی خاص تبلیغی کوشش کے بغیر دنیا بھر میں جو لوگ مسلمان ہو رہے ہیں ان کی تعداد سالانہ دو لاکھ سے زیادہ ہے۔ اگر ان نومسلموں سے روابط قائم کئے جائیں اور ان سے معلوم کیا جائے کہ اسلام کی کون سی خصوصیت نے انھیں متاثر کیا اور پھر ان معلومات کی روشنی میں عالمی سطح پر اسلام کی اشاعت کی منصوبہ بندی کی جائے تو صرف دس بیس برس میں اسلام کی سربلندی کا وہ خواب پورا ہو سکتا ہے جس کو دوسری راہوں سے دو سو برس سے حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے مگر وہ حاصل نہیں ہوتا۔

لطیفہ

شیخ سعدی شیرازی (۱۲۹۲-۱۱۹۳) کی عمر کا بیشتر حصہ بے سر و سامان درویشوں کی طرح سفر میں گزرا۔ ایک مرتبہ دمشق میں تھے، وہاں کے لوگوں سے کسی بات پر ناراضگی ہوئی تو فلسطین کے بیابان میں چلے گئے۔ یہ صلیبی جنگوں کا زمانہ تھا۔ وہاں عیسائیوں نے ان کو پکڑ لیا اور طرابلس الشرق (لبنان) کے علاقہ میں خندق کھودنے کے کام پر دوسرے قیدیوں کے ساتھ لگا دیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ اس مشقت کو برداشت کرتے رہے۔ مدت کے بعد حلب کا ایک معزز آدمی اس طرف سے گزرا۔ وہ شیخ سعدی کو جانتا تھا۔ انھیں اس حال میں دیکھ کر اس کو بہت افسوس ہوا۔ دس دینار دے کر شیخ کو قید فرنگ سے چھڑایا اور اپنے ساتھ حلب لے گیا۔ وہاں عزت کے ساتھ اپنے گھر رکھا اور مزید عنایت یہ کی کہ اپنی ناکتخدا بیٹی سے ان کا نکاح ایک سو دینار مہر موجل پر کر دیا۔ مگر بیوی سخت بدمزاج اور تیز زبان نکلی۔ اس نے شیخ کو بے حد پریشان کر دیا۔ ایک روز طعنہ دیتے ہوئے کہا: "تم وہی ہو جس کو میرے باپ نے دس دینار میں خریدا تھا" شیخ سعدی نے فوراً جواب دیا:

"ہاں میں وہی ہوں جس کو آپ کے باپ نے دس دینار میں خریدا اور سو دینار میں آپ کے ہاتھ بیچ ڈالا"

بدلتی ہوئی دنیا

موجودہ صدی کی آٹھویں دہائی نے حیرت انگیز تبدیلیاں دیکھی ہیں۔ پٹرول کی طاقت، جس کا تین چوتھائی حصہ اسلامی دنیا کی زمین کے نیچے ہے۔ اس نے ظاہر ہو کر دنیا کا اقتصادی اور سیاسی نقشہ بالکل بدل دیا ہے۔ امریکہ اپنی خارجہ سیاست بدلنے پر مجبور ہو گیا، جاپان کی معجزانہ صنعتی ترقی ٹھپ ہو گئی۔ برطانیہ جو کبھی شرق اوسط کا حکمراں تھا۔ آج شرق اوسط کے ملکوں سے قرض لے رہا ہے۔ وغیرہ۔ "ساتویں صدی عیسوی میں جبکہ اسلامی فوجیں عرب جزیرہ نما پر چھا گئیں تاکہ وہ محمد کے پیغام کو پھیلائیں" نیوز ویک (نیویارک) نے ۱۰ فروری ۱۹۷۴ کے ایک خصوصی مضمون میں لکھا "اس کے بعد عربوں نے اپنی تاریخ میں پہلی بار اس قسم کی کامیابی حاصل کی ہے۔ کسی زمانے میں اگر تمام سڑکیں روم کو جاتی تھیں تو آج تمام سڑکیں ریاض کو جا رہی ہیں جہاں ہر روز مغربی قوموں کے نمائندے اتر رہے ہیں تاکہ وہ جدید دنیا کے قارون (شاہ فیصل) سے ملاقات کر سکیں" اس قسم کی باتیں لکھتے ہوئے امریکی میگزین نے اعتراف کیا تھا:

The mountain, at last, is coming to Mohammad

اس جملہ کا پس منظر یہ ہے کہ صلیبی جنگوں کے بعد جب یورپ کی مسیحی قوموں نے پیغمبر اسلام کو "جھوٹا پیغمبر" ثابت کرنے کے لئے فرضی قصے گھڑنے شروع کئے تو انھیں میں سے ایک بنا وٹی کہانی وہ تھی جو اتنی پھیلی کہ مغربی لٹریچر میں بطور ضرب المثل مشہور ہو گئی۔ فرانسس بیکن (۱۶۲۶ـ۱۵۶۱) نے اپنے مضمون جرأت (Boldness) میں لکھا ہے "ایک جری آدمی محمد جیسے معجزے بار بار دکھا سکتا ہے۔ محمد نے لوگوں کو یقین دلایا کہ وہ ایک پہاڑ کو اپنے پاس بلائیں گے اور وہ ان کے پاس آ جائے گا۔ لوگ اس معجزے کو دیکھنے کے لئے جمع ہوئے۔ محمد نے پہاڑ کو اپنے پاس آنے کے لئے کہا۔ وہ بار بار پکارتے رہے۔ جب پہاڑ بدستور اپنی جگہ کھڑا رہا تو وہ ذرا بھی نہ شرمائے۔ اب انھوں نے کہا: اگر پہاڑ محمد کے پاس نہیں آیا تو محمد تو پہاڑ کے پاس جا سکتے ہیں"

حقیقت یہ ہے کہ آج کی دنیا میں تیزی سے ایک تبدیلی آ رہی ہے۔ اور اگر ہم گہرائی کے ساتھ دیکھ سکیں تو اس تبدیلی کا رخ کھلے طور پر اسی منزل کی طرف ہے جس کو امریکی میگزین نے لطیفہ کے طور پر ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے — "پہاڑ بالآخر محمد کی طرف آ رہا ہے"

پہلی انجمن اقوام ۱۹۲۰ میں جنیوا میں قائم ہوئی تو روس اور امریکہ ابتداءً اس کے ممبر نہ ہو سکے تھے۔ دوسری بار ۱۹۴۵ء میں اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا تو اس کا چارٹر ماسکو میں تیار کیا گیا اور امریکہ اس کا مستقل صدر مقام بنا۔ اب اگرچہ کسی نئی عالمی تنظیم کے وجود میں آنے کا بظاہر امکان نہیں، تاہم اقوام متحدہ کا ادارہ تیزی سے تیسرے انقلاب کی طرف جا رہا ہے۔

اقوام متحدہ کے ابتدائی قیام کے وقت یہ صورت حال تھی کہ ایشیا اور افریقہ کے بیشتر حصہ پر مغربی طاقتیں قابض تھیں اور وہی ان کی سیاسی نمائندہ بنی ہوئی تھیں۔ اس طرح عالمی برادری کی تنظیم میں مغربی طاقتوں کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ افریشیائی قوموں کو آزادی ملی تو ایک تیسری دنیا وجود میں آئی اور عالمی تنظیم میں اس کی بڑھتی ہوئی نمایندگی نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ان قوموں کو اکثریت دے دی جو اقوام متحدہ کے قیام کے وقت براہ راست نمائندگی سے محروم تھیں۔ ۱۹۴۵ میں

اقوام متحدہ کے ایک ادنیٰ ممبر تھے۔ ۱۹۷۵ء میں ان کی تعداد ۱۴۰ ہو چکی ہے۔

اس طرح قدیم توازن ٹوٹنے لگا۔ ۱۹۷۱ء میں جب امریکہ کی مرضی کے خلاف فارموسا کے بجائے کمیونسٹ چین کو چین کا نمائندہ تسلیم کیا گیا تو ظاہر ہو گیا کہ اب عالمی سیاست میں مغربی طاقتوں کا کلی غلبہ ختم ہو رہا ہے۔ پھر اکتوبر ۱۹۷۳ء کی عرب۔اسرائیل جنگ کے بعد عربوں کی طرف سے تیل کے جزوی بائیکاٹ اور تیل کی قیمت میں اضافہ نے اس عمل کو آخری مقام پر پہنچا دیا اور یہ نوبت آگئی کہ سلامتی کونسل کے علاوہ اقوام متحدہ کے تمام دوسرے اجلاسوں میں مغربی طاقتوں کے علی الرغم عربوں کے حق میں فیصلے ہونے لگے۔ امریکہ نے دھمکی دی کہ "بلاک ووٹنگ" کا سلسلہ جاری رہا تو وہ سخت کارروائی کرے گا۔ جب یہ دھمکی کارگر نہ ہوئی تو ستمبر ۱۹۷۵ء میں امریکہ نے یونیسکو کو دی جانے والی ۲۲ ملین ڈالر سالانہ کی امداد روک دی۔ کیونکہ اس ادارہ سے اسرائیل کو نکال دیا گیا تھا۔ مگر اس کے بعد جو ہوا وہ صرف یہ کہ عربوں نے اس کے فوراً بعد یونیسکو کو ۲۵ ملین ڈالر دینے کا اعلان کر دیا۔

عالمی سیاست میں ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے۔ عربی کا اقوام متحدہ کی چھٹی سرکاری زبان قرار دیا جانا اور عربوں کے مقابلے میں اسرائیل اور اس کے حلیف امریکہ کا احتجاجی پوزیشن میں پہنچ جانا بتاتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب کہ اقوام متحدہ کا رخ "مغرب" کے بجائے "مشرق" کی طرف ہو جائے۔

عربی زبان نئی اہمیت اختیار کر رہی ہے

بیروت عربوں کے لئے چھٹیاں گزارنے کا مقام تھا۔ بیروت کی غیر یقینی صورت حال کے بعد بمبئی نے، کم از کم عارضی طور پر یہ حیثیت حاصل کر لی ہے۔ جنوری۔اگست ۱۹۷۶ء کے درمیان بمبئی میں آنے والے مغربی ایشیا کے سیاحوں کی تعداد ۲۱ ہزار تھی۔ یہ سیاح زیادہ تر سعودی عرب، ایران، مصر اور دبئی کے رہنے والے ہیں۔ ان میں سے کچھ صرف اس لئے آئے کہ "اپنے ملک میں تیل کی بارش دیکھنے کے بعد ہندوستان میں پانی کی بارش بھی دیکھیں" کچھ تجارت کے لئے اور کچھ علاج کے لئے یہاں آئے۔

عرب سیاحوں کی یہ کثرت دیکھ کر ہندوستان کے محکمہ سیاحی نے اپنا ایک آفس کویت میں کھول دیا ہے۔ دوسرا ایران میں کھولا جانے والا ہے۔

عرب سیاح عام طور پر اپنی بیوی بچوں کے ساتھ آتے ہیں اور زیادہ تر اپنے ہوٹل میں مقیم ہوتے ہیں۔ وہ روزانہ جو رقم خرچ کرتے ہیں اس کی تعداد ہوٹل کے ذمہ داروں کے بیان کے مطابق فی کس تین ہزار سے پانچ ہزار روپے تک ہے۔ ایک عرب سوداگر نے اپنے بمبئی کے زمانہ قیام میں ۱۷ ہزار روپے خرچ کئے اور تین ہزار ٹپ کے طور پر دیئے۔

ان عربوں کے لئے سب سے بڑا مسئلہ زبان کا ہے۔ ان کی تین چوتھائی تعداد صرف عربی جانتی ہے۔ جو لوگ انگریزی جانتے ہیں، ان کی انگریزی بھی بہت معمولی ہوتی ہے۔ ان کی اس کمی نے ترجمانوں کی بہت بڑی مانگ پیدا کر دی ہے۔

ہمارے عربی مدارس کے نوجوان اگر عربی بول چال کی مشق کر لیں اور اس کے ساتھ انگریزی زبان بھی سیکھ لیں تو ہندوستان اور ہندوستان کے باہر بہت معقول کام اپنے لئے پا سکتے ہیں۔

جب کوئی قوم سیاسی یا اقتصادی اعتبار سے اٹھتی ہے تو اس کے ساتھ اس کی زبان بھی اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔ یہی اس وقت عربی زبان کے ساتھ ہو رہا ہے۔ عرب پٹرول نے عربی زبان کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے۔ بے شمار نئے نئے لسانی کام وجود میں آگئے ہیں۔ مگر ان نئے مواقع سے وہی لوگ پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو عربی کے ساتھ کم از کم ایک اور بین اقوامی زبان جانتے ہوں۔ اور جو شخص عربی جیسی زبان جان لے، اس کے لئے دوسری زبان سیکھنا کچھ مشکل نہیں۔

الرسالہ اکتوبر ۱۹۷۶ء

غلط اقدام کبھی صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچا سکتا

خواہ اس کو کرنے والے کتنے ہی مخلص اور مقدس ہوں

مولانا حمید الدین فراہی (۱۹۳۰-۱۸۶۳) ایک بلند پایہ محقق اور مفسر تھے۔ اردو کے علاوہ عربی، فارسی انگریزی اور عبرانی زبانیں بخوبی جانتے تھے۔ تقدس اور اخلاص اور اتباع سنت میں ان کو کاملیت کا مقام حاصل تھا۔ اردو یونیورسٹی کا تخیل جس نے بالآخر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی صورت اختیار کی انھیں کے ذہن کی تخلیق تھی۔ اگرچہ جغرافی اور زمانی حقائق نے ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد اس کا خاتمہ کر دیا۔ عالم اسلام میں ذہنی انقلاب پیدا کرنے کے لئے انھوں نے اپنی عربی تفسیر نظام القرآن لکھنا شروع کی، مگر اس کی تکمیل سے پہلے اس دنیا سے چلے گئے۔ وہ شریعت کی بنیاد پر سیاسی نظام قائم کرنے کو مسلمانوں کی اصل اجتماعی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ "ملکوت اللہ" کے نام سے انھوں نے اس موضوع پر ایک عربی رسالہ بھی لکھا ہے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جماعت اسلامی کی حکومت الٰہیہ کسی حد تک انھیں کے افکار کی عملی صورت تھی۔ مگر ہند و پاک اور بنگلہ دیش میں یہ جماعت حالات کی چٹان سے ٹکرا کر اسی طرح ختم ہو رہی ہے جس طرح اس دور کی بہت سی دوسری سیاسی تحریکیں طوفان کی طرح اٹھیں اور بلبلوں کی طرح ختم ہو گئیں۔

مولانا فراہی کے شاگرد خاص مولانا امین احسن اصلاحی نے ان کے حالات کے ذیل میں لکھا ہے:

"علی گڑھ میں مولانا نے انگریزی اور دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ خاص توجہ کے ساتھ فلسفہ جدید کی تحصیل کی۔ اس زمانہ میں علی گڑھ میں فلسفہ کے پروفیسر مشہور انگریزی مستشرق ڈاکٹر آرنلڈ تھے۔ مولانا نے فلسفہ کے درس تو ان سے ضرور لئے لیکن ان سے خوش نہیں تھے۔ وہ آرنلڈ صاحب کو بھی اسی بساط سیاست کا ایک مہرہ سمجھتے تھے جو انگریزوں نے علی گڑھ میں بچھا رکھی تھی۔ علی گڑھ کا حلقہ ڈاکٹر آرنلڈ صاحب کی کتاب "پریچنگ آف اسلام" کا بڑا مداح تھا۔ لیکن مولانا اس کتاب کے سخت مخالف تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے اندر سے روح جہاد ختم کرنے کے لئے لکھی گئی ہے۔" ترجمہ قرآن مجید، صفحہ ۱۲

انیسویں صدی کے نصف ثانی اور بیسویں صدی کے نصف اول میں جو مفکرین اٹھے وہ تقریباً سب کے سب اسی قسم کے خیالات رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں جو بڑی بڑی تحریکیں اٹھیں، انھوں نے سیاسی انقلاب کو اسلام کے احیار کا واحد راستہ سمجھا۔ دنیوی نتائج کی حد تک یہ تمام تحریکیں ناکام رہیں تاہم اس سے بھی زیادہ بڑا نقصان یہ ہے کہ ناکامی سے دوچار ہونے کے بعد اس قسم کے لوگوں کو اب کرنے کا کوئی کام ہی نظر نہیں آتا۔ وہ تحریکیں جو آسمانی عزائم کے ساتھ اٹھی تھیں، اب بے یقینی اور پست حوصلگی کی سطح پر آکر ٹھیر گئی ہیں۔ پورے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان تحریکوں نے اپنے سیاسی جہاد میں جو دولت و طاقت خرچ کی ہے اس کو وہ دعوت و اشاعت کے ان غیر سیاسی طریقوں میں خرچ کرتیں جن کا تاریخی ریکارڈ "پریچنگ آف اسلام" میں جمع کیا گیا ہے، تو اسلام کا احیار شاید آج ایک واقعہ بن چکا ہوتا۔ اس دور کے مفکرین کی بہت بڑی غلطی تھی کہ انھوں نے

قتال اور سیاسی معرکہ آرائی کو وہ چیز سمجھ لیا جس کو شریعت میں جہاد کہا گیا ہے۔ امت مسلمہ کا جہاد، دعوت ہے نہ کہ قتال اور سیاسی معرکہ آرائی۔ یہ بات قرآن میں انتہائی طور پر واضح ہے۔ مگر اس دور کے مجاہدین سے اس بارے میں سخت ذہول ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پوری ایک صدی تک یہ لوگ سیاست کے میدان میں قربانیاں دیتے رہے۔ اور کسی نے بھی اس اصل ضرورت کا احساس نہ کیا کہ دین حق کی پیغام رسانی کے لئے دعوتی مہم کا آغاز کیا جائے۔ اگر یہ فکر ہوتا تو دعوتی انداز کا لٹریچر تیار کیا جاتا۔ دعوتی انداز کی تعلیم قائم ہوتی۔ دعوتی انداز کی سرگرمیوں کے لئے منصوبہ بندی کی جاتی۔

اس دور میں دعوت الی اللہ کے زبردست نئے امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ مگر وہ سب غیر استعمال شدہ حالت میں پڑے رہے اور تمام لوگ سیاسی قربانیوں کا ٹائٹل لے کر اس دنیا سے چلے گئے۔

اس اندوہناک غلطی کی تلافی یہ ہے کہ دعوتی بنیادوں پر از سر نو کام کا آغاز کیا جائے۔ صرف دعوتی کام ہی ہم کو دنیا و آخرت میں سرخرو کر سکتا ہے۔ اس کے سوا جتنے کام ہیں خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق ہیں۔

غلط اقدام کبھی صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچا سکتا۔ خواہ اس کی پشت پر ہم نے اخلاص اور تقدس کی کتنی ہی مقدار جمع کر دی ہو۔

ایک تقابل

صوفی نذیر احمد کاشمیری

اگر مہاتما بدھ کے انتقال کے دو سو برس بعد مہاراجہ اشوک بدھ ازم میں داخل نہ ہوتے اور حضرت مسیح کے دنیا سے چلے جانے کے ساڑھے تین سو برس بعد شہنشاہ قسطنطین عیسائیت کو قبول نہ کرتے تو یہ مذاہب شاید ہی عالمی مذاہب بن کر کوئی تاریخی حیثیت اختیار کر سکتے۔ شاید یہ دونوں اپنے اپنے وقت کے مذاہب (برہمن ازم اور یہودیت) کی بے اعتدالیوں کے خلاف محض احتجاجی قسم کے فرقوں کی حیثیت سے آگے نہ بڑھتے۔ اس کے برعکس اگر اسلام کو اپنی اسی ابتدائی صورت میں سو برس تک کام کرنے کا موقع مہیا رہتا جس صورت پر اس کو حضرت خاتم الانبیاءؐ نے قائم کیا تھا اور جو صرف حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے دور کے خاتمے تک جوں کی توں قائم رہی، تو یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ شاید دنیا کا اکثر حصہ مسلمان ہو جاتا' اور كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً کی عملی تعبیر چودہ سو برس پہلے ہو چکی تھی۔ لیکن دور ملوکیت کے بھرپور قیام نے ملت اسلامیہ کو كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ اور لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ کے مقام سے گرا کر اور اسے ایک دنیادار ملت بنا کر بالکل بنی اسرائیل اور برہمنوں کی طرح کنبہ داری، تحاسد و تباغض و تنافر کا شکار کر دیا اس کا ابتدائی سہرا تو بنو امیہ کے سر ہے بعد میں بنو ہاشم نے اسے آج تک جاری رکھا ہے۔ گویا جس ملوکیت نے بدھ ازم اور عیسائیت کو عالمی مذاہب بنا کر ان میں چار چاند لگا دیئے، وہی ملوکیت اسلام کی عالم گیری کے مقابل سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی۔ (۴۷)

اسی طرح یہ بھی ایک افسوسناک تقابل ہے کہ جہاں راہبان مسیح نے مختلف کشف و رؤیا و الہام کا سہارا لیتے ہوئے اپنی دعوت کا رخ بنی اسرائیل سے ہٹا کر سارے عالم کی طرف کر دیا، وہاں ملت اسلامیہ کے ارباب کشف و سلوک نے انہیں کشفیات و رؤیا کے سہارے امت اسلامیہ کو اپنے عالمی مشن سے ہٹا کر اس کا رخ ایسی باطنیت کی طرف کر دیا۔ جو امت میں عالمگیر تفرقے کو جنم دے کر ایک خواب و خیال کی دنیا بنا چکا ہے۔ (۸۰)

کبھی پیچھے ہٹنا سب سے بڑا اقدام ہوتا ہے
مگر اس کو وہی لوگ جانتے ہیں
جو بڑے دل والے ہوں

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات (۱۱ھ) کے بعد ۲۰ سال تک فتوحات اسلام کا زبردست سلسلہ جاری رہا۔ ہر مہینے کسی نہ کسی بڑے علاقہ کے فتح کی خبر آتی تھی۔ مگر تیسرے خلیفہ کی شہادت (۳۵ھ) کے ساتھ جو باہمی لڑائیاں شروع ہوئیں، انھوں نے تقریباً ۱۰ سال تک فتوحات کا سلسلہ ختم کر دیا۔ وہ شخص جس نے اس بند دروازہ کو دوبارہ کھولا، وہ حضرت امام حسنؓ تھے۔ ۴۱ھ میں آپ کی خلافت سے دست برداری بظاہر میدان عمل سے واپسی کا ایک فیصلہ تھا۔ مگر اس واپسی نے اسلامی تاریخ میں اقدام عمل کے نئے امکانات کھول دیئے۔

حسن بن علی بن ابی طالب شعبان ۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ربیع الاول ۵۰ھ میں وفات پائی۔ آپ کے والد حضرت علیؓ کی شہادت ۱۷ رمضان ۴۰ھ کو کوفہ میں ہوئی تو آپ کی عمر ۳۷ سال تھی۔ اس وقت صرف عراق اور ایران حضرت علیؓ کے زیر خلافت رہ گئے تھے۔ اس کے علاوہ یمن، حجاز، شام، فلسطین، مصر وغیرہ میں امیر معاویہ کی حکومت قائم تھی۔ حضرت علیؓ کے زیر خلافت علاقہ میں بھی بہت سے لوگ درپردہ آپ کے مخالف تھے۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد لوگوں نے امام حسن کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی جو آپ کے سب سے بڑے صاحب زادے تھے۔

حضرت حسن نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے خلافت کی ذمہ داری کو قبول کر لیا۔ مگر ان کے اندر چونکہ اقتدار کی ہوس نہ تھی، انھوں نے بہت جلد اس حقیقت کو محسوس کر لیا کہ موجودہ حالات میں ان کا خلافت پر اصرار کرنا صرف ملت کے انتشار میں اضافہ کے ہم معنی ہوگا۔ انھوں نے ایک حقیقت پسند انسان کی طرح ایک بار اپنے چھوٹے بھائی حضرت حسین سے کہا تھا:

"میں جانتا ہوں کہ نبوت و خلافت دونوں ہمارے خاندان میں جمع نہیں رہ سکتیں"

اسی نزاکت کی وجہ سے آپ نے بیعت کے وقت لوگوں سے یہ اقرار لے لیا تھا کہ "میں جس سے جنگ کروں تم اس سے جنگ کروگے، میں جس سے صلح کروں تم اس سے صلح کروگے"

حضرت علیؓ کے بعد کوفہ کے لوگوں نے حضرت حسن کو خلیفہ بنایا۔ دوسری طرف حضرت امیر معاویہ کے لئے حضرت علی کا اس دنیا سے جانا گویا راستہ صاف ہونے کے ہم معنی تھا۔ انھوں نے حضرت علی کی شہادت کی خبر ملتے ہی اپنے لئے "امیر المومنین" کا لقب اختیار کر لیا اور یہ منصوبہ بنایا کہ بقیہ اسلامی علاقوں (عراق و ایران) کو بھی اپنے ماتحت کرکے اپنی حکومت کو مکمل کر لیں۔ امیر معاویہ تجدید بیعت سے فارغ ہونے کے بعد ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر دمشق سے کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ کوفہ میں داخلہ سے پہلے انھوں نے امام حسن کو پیغام بھیجا کہ جنگ سے بہتر یہ ہے کہ آپ مجھ سے صلح کر لیں اور مجھ کو خلیفہ وقت تسلیم کر لیں۔ امام حسن کے پاس بھی اس وقت ساٹھ ہزار کا لشکر تھا جو لڑنے مرنے پر تیار تھا۔ مگر امام حسن نے مسلمانوں کو باہمی خوں ریزی سے بچانا زیادہ ضروری سمجھا۔ وہ اپنے حق خلافت سے از خود دست بردار ہو گئے اور صرف چھ ماہ خلیفہ رہ کر امیر معاویہ کے ہاتھ پر کوفہ کی مسجد میں بیعت کر لی۔

امام حسن کے پرجوش حامیوں کے لئے یہ "ذلت" ناقابل برداشت تھی۔ انھوں نے اس فیصلہ کے خلاف بہت شور و غل کیا۔ آپ کو عار المسلمین (مسلمانوں کے لئے ننگ) کا خطاب دیا۔ کہا کہ آپ کافر ہو گئے ہیں۔ آپ کے کپڑے نوچے، حتی کہ آپ پر تلوار سے حملہ کیا۔ مگر آپ کسی بھی حال میں مقابلہ آرائی کی سیاست اختیار کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ بلکہ فرمایا:

"خلافت اگر معاویہ بن ابو سفیان کا حق تھا تو ان کو پہنچ گیا۔ اور اگر یہ میرا حق تھا تو میں نے ان کو بخش دیا"

ایک شخص کے پیچھے ہٹ جانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں کا باہمی اختلاف باہمی اجتماعیت میں تبدیل ہو گیا اور [illegible] تاریخ میں صفین و جمل کے بعد یہ تیسری سب سے بڑی باہمی خون ریزی کا عنوان بنتا، عام الجماعت کے نام سے پکارا گیا۔ وہ اختلاف کے بجائے اتحاد کا سال بن گیا۔ مسلمانوں کی قوت جو آپس کی لڑائیوں میں برباد ہوتی، اسلام کی اشاعت و توسیع میں صرف ہونے لگی۔

حقیقت یہ ہے کہ کبھی پیچھے ہٹنے ہی کا نام آگے بڑھنا ہوتا ہے اگرچہ بہت کم لوگ ہیں جو اس حقیقت کو جانتے ہوں۔

رعایت نہیں صلاحیت

ہمارے ملک کی مسلم قیادت نے مسلمانوں کے مسئلہ کے حل کا جو آخری راز دریافت کیا ہے، وہ یہ کہ "مسلمانوں کو وہ رعایتیں دی جائیں جو شیڈیولڈ کاسٹ کے لئے مخصوص کی گئی ہیں" اولاً تو یہ ممکن نہیں۔ اور بالفرض یہ ناممکن اگر ممکن بھی ہو جائے تو یہ مسئلہ کا حل نہیں۔ کیونکہ اس قسم کی کوئی رعایت زندگی کے وسیع تر حقائق کا بدل نہیں بن سکتی۔ یہ دنیا استعداد کی بنیاد پر جگہ حاصل کرنے کی دنیا ہے۔ یہاں محض رعایت سے کوئی شخص بلند مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

وی نے کرپال اور گووند کیلکر نے شیڈیولڈ کاسٹ اور قبائل کی موجودہ حالت کا جائزہ لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان رعایتوں نے ان طبقات کی حالت میں کوئی حقیقی تبدیلی پیدا نہیں کی ہے۔ اب بھی اگر کوئی ہریجن کامیاب ہے تو وہ وہی ہے جس نے اپنے اندر کوئی خاص صلاحیت پیدا کی تھی۔ مثلاً ڈاکٹر امبیدکر، شری جگ جیون رام، شری کے۔ آر۔ نارائن وغیرہ۔

لکشمن ہلدر ایک مزدور تھے، پھر انھوں نے کچھ تعلیم حاصل کی اور ٹائپ کرنا سیکھا۔ اس کے بعد ان کو مرکزی حکومت میں ریزرو سیٹ کے تحت کلرکی کی ایک جگہ مل گئی۔ مگر ان کی انگریزی کمزور تھی۔ ان کے افسر نے ان کی کتاب میں لکھ دیا:

His English is weak

اس قسم کی رپورٹ تین سال تک درج ہوتی رہی۔ قاعدہ یہ ہے کہ اگر تین سال تک مسلسل کسی کے خلاف "بیڈ رپورٹ" ہوتی رہے تو اس کی ملازمت ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ لکشمن ہلدر کو ختم ملازمت کا نوٹس مل گیا۔ تاہم انھوں نے دوڑ دھوپ کی۔ ایک ڈائرکٹر کو ان پر رحم آگیا اور اس نے ان کی ملازمت میں چھ ماہ کی توسیع کر دی۔ اب لکشمن ہلدر نے محنت شروع کی اور مدت ختم ہونے تک انگریزی بولنے کی اچھی صلاحیت پیدا کر لی۔ اس کے بعد وہ دوبارہ ملازمت میں لے لئے گئے۔ (اسٹیٹسمین ویکلی ۲۴ اپریل ۱۹۷۶)

لکشمن ہلدر کو بالآخر جس چیز نے جگہ دی وہ ان کی صلاحیت تھی نہ کہ رعایت۔ یہی بات ہر ایک کے لئے صحیح ہے، چاہے وہ ہریجن ہو یا غیر ہریجن۔

مطالعہ کتب

دورِ جدید کے ہندو مفکرین میں سوامی دیویکانند (۱۹۰۲ — ۱۸۶۳) ایک نمایاں نام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا انتقال صرف ۳۹ سال کی عمر میں ہوگیا۔ مگر وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے انگریزی زبان میں ہندو فلسفہ کی تشریح کی اور مغربی دنیا میں اس ایشیائی مذہب کے پرچار کی ابتدائی بنیادیں رکھیں۔ اگرچہ اس سے پہلے خود مغرب میں کئی ایسے مفکرین پیدا ہو چکے تھے جنھوں نے مغرب کو ہندو فلسفہ سے آشنا کیا۔ مثلاً شوپنہار (۱۸۶۰ — ۱۷۸۸) ایمرسن (۱۸۸۲ — ۱۸۰۳) اور میکس مولر (۱۹۰۰ — ۱۸۲۳) وغیرہ مگر خود بھارت کی طرف سے اس خدمت کو انجام دینے والوں میں پہلا قابلِ ذکر نام دیویکانند ہی کا ہے۔ ۱۸۹۳ میں جب شکاگو کی پارلیمنٹ آف ریلیجنز میں وہ اجنبی سنیاسی کے روپ میں کھڑے ہوئے اور اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے کہا:

(امریکہ کے بہنو اور بھائیو)

SISTERS AND BROTHERS OF AMERICA

تو ان کے اس اندازِ خطاب پر کئی منٹ تک تالیاں بجتی رہیں۔ امریکہ کے لوگ جو لیڈیز اینڈ جنٹلمین (حاضرین اور حاضرات) جیسے خشک فقرے ہی سننے کے عادی تھے اس برادرانہ خطاب سے بہت متاثر ہوئے۔ اس کے بعد عرصہ تک امریکہ میں ان کا چرچا ہوتا رہا اور وہاں انھوں نے پہلا ویدک سنٹر قائم کیا۔

حال ہی میں سوامی دیویکانند کے انگریزی خطوط کا مجموعہ ساڑھے چار سو صفحات پر شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں بہت سے دلچسپ خطوط ہیں جو سوامی جی کی زندگی اور خیالات کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ یہاں ہم اس مجموعہ سے خط نمبر ۱۷۵ کا ترجمہ درج کر رہے ہیں۔ سوامی جی نے یہ خط المورڑہ سے ۱۰ جون ۱۸۹۸ کو لکھا تھا:

" ادویتا واد مذہب اور فکر کی دنیا میں آخری لفظ ہے اور واحد پوزیشن ہے جہاں سے ایک شخص تمام مذاہب اور فرقوں کو محبت کی نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل کی روشن خیال انسانیت کا مذہب یہی ہوگا۔ ہندوؤں کو یہ کریڈٹ مل سکتا ہے کہ وہ اس نظریہ تک دوسری نسلوں سے قبل پہنچے۔ تاہم عملی ادویتا جو تمام انسانیت کو خود اپنی طرح دیکھتی ہے اور اسی کے مطابق سلوک کرتی ہے کبھی ہندوؤں میں پیدا نہ ہو سکی۔ دوسری طرف میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی مذہب قابلِ لحاظ حد تک اس مساوات تک پہنچا ہے تو وہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اسی لئے میں قطعی طور پر یہ خیال رکھتا ہوں کہ عملی اسلام کی مدد کے بغیر، ویدانت کے نظریات، خواہ وہ کتنے ہی عمدہ اور حیرت انگیز ہوں، وہ وسیع انسانیت کے لئے بالکل ہی بے قیمت ہیں یا ہو سکتے ہیں۔ ہماری مادرِ وطن کے لئے جو دو عظیم نظامات ہندوازم اور اسلام کا سنگم اتحاد ہے، ویدانت کا دماغ اور اسلام کا جسم ہی واحد امید ہے۔ میں اپنے تصور کی نگاہ سے دیکھ رہا ہوں کہ مستقبل کا معیاری ہندوستان موجودہ انتشار اور اختلاف سے نکل کر شاندار اور غیر مفتوح بن رہا ہے، اور یہ ویدانت کے دماغ اور اسلام کے جسم کے ذریعہ ہو رہا ہے (صفحہ ۴۵۳)

I SEE IN MY MIND'S EYE THE FUTURE PERFECT INDIA RISING OUT OF THIS CHAOS AND STRIFE, GLORIOUS AND INVINCIBLE, WITH VEDANTA BRAIN AND ISLAM BODY. (P. 453)

ادویتا واد (یعنی خدا اور مخلوقات میں دوئی نہیں سب ایک ہیں) میں بلاشبہ بظاہر ایک فلسفیانہ حسن ہے۔ مگر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ اخوتِ انسانی کے مسئلے سے اس کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں جس کے لئے ایک نظریاتی بنیاد کے طور پر پیش

زمانہ کے فلسفیوں نے اس کو وضع کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وحدت وجود کے مقابلہ میں وحدت الٰہ اور وحدت بنی آدم کا عقیدہ انسانی اخوت و مساوات کی بالکل کافی بنیاد ہے اور اسلام کی تاریخ کم از کم تجرباتی طور پر اس کی حقانیت کا بھی ایک واضح ثبوت پیش کر رہی ہے۔

اخوت اور مساوات کی نظریاتی بنیاد ہمیں اس وقت مل جاتی ہے جب ہم دریافت کرتے ہیں کہ سارے انسان ایک ہی آدم کی اولاد ہیں۔ اس کے بعد یہ ضروری نہیں رہتا کہ اس سلسلۂ نسب کو خدا تک بھی پہنچایا جائے۔ اصل مسئلہ مخلوق اور مخلوق کے درمیان ٹکراؤ کو ختم کرنا ہے نہ کہ مخلوق اور خدا کے درمیان۔ اس لئے مخلوق کی نسلی یکسانیت مانتے ہی یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس رشتہ کو خدا تک وسیع کرنے کی کوشش مقصد کے اعتبار سے غیر ضروری ہے اور عملی اعتبار سے غیر ثابت شدہ اور ناقابل فہم۔

دوسری بات یہ کہ وحدت وجود کے نظریہ کو ماننے کے بعد صرف خدا اور انسان ہی ایک کل کا جزو نہیں بنتے بلکہ انسان اور بھیڑیا بھی ایک سطح پر آجاتے ہیں خواہ وہ انسانی بھیڑیا ہو یا حیوانی بھیڑیا۔ گویا ٹکراؤ کے جس مسئلہ کو ختم کرنا مقصود ہے وہ دوبارہ ایک نئی شکل میں لوٹ آتا ہے۔

Letters of Swami Vivikanand
Advaita Ashram
5, Dehi Entally Road
Calcutta 14 (1970, pp.463)

اسلام نے اس کے اندر نئی طاقت پیدا کردی

فریدہ خانم
ایم اے

خنساء (م ۲۴ھ) اسلامی دور کی شاعرہ ہے۔ اس خاتون کا اصل نام تماضر بنت عمرو بن الشرید سُلَمِیَّہ ہے خنساء اس کا لقب تھا جس کو وہ اسی سے مشہور ہوگئی۔

وہ ایک بڑے خاندان میں پیدا ہوئی۔ اس کا باپ مضر کے قبیلہ بنو سلیم کا سردار تھا۔ اس کے دو بھائی جاہلی جنگ میں مارے گئے۔ اس کا اسے بہت صدمہ ہوا۔ اپنے بھائیوں کے قتل سے پہلے وہ دو یا تین اشعار سے زیادہ نہ کہتی تھی۔ مگر جب وہ مارے گئے تو اس کی آنکھوں سے آنسو اور دل سے اشعار امڈنے لگے۔ اس نے دونوں بھائیوں خصوصاً صخر کے لئے انتہائی دردناک مرثیے لکھے۔ وہ برابر مرثیہ کہتی رہی اور روتی رہی، یہاں تک کہ اس کی دونوں آنکھیں جاتی رہیں۔

فتح مکہ کے بعد اپنے قبیلہ کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور اسلام قبول کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کو اس نے اپنے کچھ اشعار سنائے تو آپ بہت متاثر ہوئے اور فرمایا "اور سناؤ خنساء"۔ چنانچہ اس نے مزید اشعار آپ کو سنائے۔

مگر جوانی کی عمر میں جو عورت اپنے بھائی کی موت کو برداشت نہ کرسکی تھی، اسلام نے اس کے اندر وہ طاقت پیدا کی کہ بڑھاپے کی عمر میں اس نے خود اپنے لڑکوں کو خدا کی راہ میں نثار کردیا۔ اس کے چار جوان بیٹے تھے۔ چاروں کو اس نے جنگ قادسیہ میں جانے کے لئے آمادہ کیا۔ چنانچہ چاروں گئے اور چاروں لڑکر شہید ہوگئے۔ جب اس کو خبر ملی کہ اس کے چاروں بیٹے ختم ہوگئے تو اس نے رونے یا مرثیہ کہنے کے بجائے نہایت صبر و سکون کے ساتھ اس خبر کو سنا اور بولی: "خدا کا شکر ہے جس نے مجھے ان کی شہادت سے عزت بخشی۔ میں امید کرتی ہوں کہ وہ مجھے ان سے ملا دے گا۔"

الأستاذ الامام محمد عبده

السيد جمال الدين وجه كل عنايته للسياسة

قال السيد جمال الدين الأفغاني

ان أهل أوروبا مستعدون لقبول الاسلام ، اذا أحسنت الدعوة اليه فقد قارنوا بين الدين الاسلامي وبين غيره فوجدوا البون شاسعا من حيث يسر العقائد وقرب تناولها ، وأقرب من أهل أوروبا الى قبول الاسلام أهل أمريكا لأنه لا يوجد بينهم وبين الأمم الاسلامية عداوات موروثة ولا أضغان مدفونة مثلما هو الحال بين المسلمين والاوربيين .

والقرآن من أكبر الوسائل فى لفت نظر الافرنج الى حسن الاسلام ، فهو يدعوهم بلسان حاله اليه ، لكنهم يرون حالة المسلمين السوآى من خلال القرآن فيقعدون عن اتباعه والايمان به ، فاذا أردنا اليوم أن نحمل غيرنا على الدخول فى ديننا ، وجب علينا قبل كل شيء أن نقيم لهم البرهان — على أننا متمسكون بخصال الاسلام .. والا لم نكن مسلمين كاملين .

وأفاض السيد فى (بيان) مزايا القرآن وتعاليمه السامية : من ذلك أنه (أى القرآن)أول من دلنا على الوصول الى الحقائق بالطريقة الفلسفية وهى (لمه) و (ولماذا) ، اذ أن معظم آيات القرآن واردة فى معرض : لم كان الأمر كذا ؟ ولماذا كان الأمر كذا ؟ وتكليف المخاطبين أن يعطوا الجواب المعقول على هذا السؤال ، وليست الفلسفة سوى ذلك .

قال : ومن مزايا القرآن « أن العرب قبل انزال القرآن عليهم كانوا فى حالة همجية لا توصف ، فلم يمض عليهم قرن ونصف من الزمان حتى ملكوا عالم زمانهم ، وفاقوا أمم الارض سياسة وعلما وفلسفة وصناعة وتجارة ، وكل هذا لعمرى لم ينتج الا عن هدى القرآن — فالقرآن وحده الذى كان كافيا فى اجتذاب الامم القوية وهدايتها جدير أن يكون كافيا اليوم أيضا فى اجتذاب الامم الحديثة وهدايتها .

السيد جمال الدين رجل عالم وأعرف الناس بالاسلام ، وحالة المسلمين ، وكان قادرا على النفع العظيم بالافادة والتعليم ، ولكنه وجه كل عنايته الى السياسة فضاع استعداده هذا واتى أعجب لجعل نبهاء المسلمين وجرائدهم — كل همهم فى السياسة ، واهمالهم أمر التربية الذى هو كل شيء ، وعليه يبنى كل شيء !

ان السيد جمال الدين كان صاحب اقتدار عجيب لو صرفه ووجهه للتعليم والتربية لأفاد الاسلام أكبر فائدة ، وقد عرضت عليه حين كنا فى باريس أن نترك السياسة ونذهب الى مكان بعيد عن مراقبة الحكومات ، ونعلم ونربى من نختار من التلاميذ على مشربنا ، فلا تمضى عشر سنين الا ويكون عندنا كذا وكذا من التلاميذ الذين يتبعوننا فى ترك أوطانهم والسير فى الأرض لنشر الاصلاح المطلوب فينتشر أحسن الانتشار ! فقال : انما أنت مثبط !

۱۸۸۴ میں جبکہ سید جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہ پیرس میں تھے، انھوں نے جان لیا تھا کہ سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اہل مغرب کے درمیان اسلام کی اشاعت کی جائے اور اس کام کا سب سے مؤثر ذریعہ قرآن ہے۔ مگر انھوں نے اور ان کے بعد تقریباً تمام بہترین صلاحیت کے لوگوں نے اپنی عمریں اور اپنے ذرائع و وسائل لاحاصل قسم کی سیاسی مقابلہ آرائی میں کھو دئے

سید جمال الدین افغانی نے کہا: یورپ کے لوگوں کے سامنے اگر اسلام کی دعوت اچھی طرح پیش کی جائے تو وہ اسلام قبول کرنے کے لئے بالکل تیار ہیں۔ کیونکہ انھوں نے اسلام اور دوسرے ادیان کا تقابلی مطالعہ کیا تو انھوں نے پایا کہ عقیدہ و عمل کی آسانی کے اعتبار سے دونوں میں بہت فرق ہے۔ اور مغربی اقوام میں قبول اسلام کے اعتبار سے سب سے زیادہ قریب امریکہ کے لوگ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اور اسلامی قوموں کے درمیان اس طرح کی قدیم عداوتیں نہیں ہیں جو مسلمانوں اور یورپی قوموں کے درمیان ہیں۔

اہل مغرب کو اسلام کی طرف متوجہ کرنے کے لئے سب سے بڑا ذریعہ قرآن ہے۔ قرآن کی دعوت اصل اسلام کی طرف ہے۔ مگر وہ قرآن کے حاملین کی بگڑی ہوئی حالت کو دیکھتے ہیں اور اس کی وجہ سے اس سے دور ہو جاتے ہیں۔ اب اگر ہم چاہتے ہیں کہ دوسری قومیں اسلام کی طرف سے آئیں تو ہر چیز سے پہلے ضروری ہے کہ ان پر بیان قائم کریں۔ اس طرح کہ ہم اسلام کی صفات پر عمل ... سے پہلے مسلمان ... پا سکے۔

قرآنی تعلیمات کے فضائل کے بارے میں سید افغانی نے فرمایا: قرآن ہی وہ کتاب ہے جس نے سب سے پہلے فلسفیانہ طریق سے حقائق تک پہنچنے کا راستہ بتایا۔ قرآن کی بیشتر آیات میں اس طرح کے سوالات قائم کئے گئے ہیں: ایسا کیوں، ویسا کیوں۔ اور مخاطب سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اس کا معقول جواب دے۔ اور فلسفہ اس کے سوا کسی اور چیز کا نام نہیں۔

انھوں نے کہا: قرآن کے اترنے سے پہلے عرب کے لوگ انتہائی پست حالت میں تھے۔ مگر ان پر ڈیڑھ سو سال بھی نہیں گزرے کہ انھوں نے اپنے وقت کی آباد دنیا کو فتح کر لیا۔ اور دنیا کی قوموں سے سیاست، علم، فلسفہ، صنعت تجارت ہر چیز میں بڑھ گئے، اور بخدا یہ سب کچھ قرآن کا کرشمہ تھا۔ قرآن تنہا پچھلی قوموں کو کھینچنے اور ان کو ہدایت پر لانے کے لئے کافی تھا۔ وہی آج بھی جدید قوموں کو کھینچنے اور ہدایت دینے کے لئے بالکل کافی ہے۔

سید جمال الدین ایک بڑے عالم تھے اور اسلام اور مسلمانوں کی حقیقت کو خوب سمجھتے تھے۔ ان کی ذات سے لوگوں کو بہت بڑا فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ مگر انھوں نے اپنی ساری توجہ سیاست کی طرف موڑ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی صلاحیتیں ضائع ہو گئیں۔

مجھے حیرت ہے کہ موجودہ زمانہ میں تمام اہل صلاحیت

کے مسلمانوں کی اصلاح اور ان کے جوانوں کے جانے نے اپنی ساری توجہ سیاست کی طرف موڑ دی اور تربیت و تعلیم کے کام کو چھوڑ دیا جو کہ سب سے زیادہ اہم تھا اور جس پر تمام دوسری چیزوں کا انحصار تھا۔

سید جمال الدین عجیب و غریب کمالات کے حامل تھے۔ مگر انھوں نے اپنے آپ کو تعلیم و تربیت کے کام میں لگایا ہوتا تو وہ اسلام کو بہت بڑا فائدہ پہنچا سکتے تھے۔ میں نے یہ بات ان کے سامنے رکھی تھی جب کہ ہم پیرس میں تھے۔ یہ کہ "ہم سیاست کو چھوڑ دیں اور حکومت کی فکروں سے دور جا کر نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کریں۔ اگر ہم ایسا کریں تو دس برس میں ہمارے پاس ایک ٹیم تیار ہو جائے گی اور وہ ساری دنیا میں اصلاح و تبلیغ کا کام نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دے گی۔" انھوں نے جواب دیا: "تم تو حوصلہ پست کرنے والی باتیں کرتے ہو۔"

اعلان

جمہوریہ لیبیا کے صدر معمر القذافی کی "الکتاب الاخضر" لیبی انقلاب کی بائبل سمجھی جاتی ہے۔ اس کتاب کا پہلا اردو ترجمہ انشاء اللہ جلد ہی پیش کیا جائے گا۔

اس کے علاوہ لیبی انقلاب اور جدید عرب دنیا کے بارے میں دوسری اہم کتابوں کے اردو ترجمے شائع کرنا بھی ادارہ کے پروگرام میں شامل ہے۔

تفصیل اعلان آئندہ ملاحظہ فرمائیں

الرسالہ بک ڈپو، ۱۰۳۶، کشن گنج ۔ دہلی-۶

یہ کامیابی محض پُرجوش اقدام کا نتیجہ نہ تھی بلکہ سوچے سمجھے منصوبہ کے ذریعہ حاصل کی گئی

"بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے" اس طرح کے الفاظ نے مسلمانوں میں ناعاقبت اندیشانہ اقدام کا ذہن پیدا کیا ہے۔ حالاں کہ خود اس شعر میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے وہ ایک سوچی سمجھی پیش قدمی تھی نہ کہ محض ایک پرجوش چھلانگ۔

ھ۱۶ میں اسلامی فوج سعد بن وقاص کی قیادت میں عراق کے علاقوں کو فتح کر رہی تھی۔ بہرہ شیر کو فتح کر کے جب وہ آگے بڑھی تو سامنے دریائے دجلہ تھا اور اس کے دوسری طرف مدائن جو ایرانیوں کا ایک اہم شہر تھا اور وہاں انھوں نے زبردست قلعہ بنا رکھا تھا۔ ایرانیوں نے بہرہ شیر سے بھاگتے ہوئے دجلہ کے پل کو توڑ دیا تھا اور دور تک کوئی کشتی بھی نہ چھوڑی تھی جس سے اسلامی لشکر دریا کو عبور کر سکے۔

سعد بن وقاص اگلے دن اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور یہ کہہ کر گھوڑا دریا میں ڈال دیا:

نستعین باللہ ونتوکل علیہ حسبنا اللہ ونعم الوکیل ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العظیم

ہم اللہ سے مدد چاہتے ہیں اور اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین مددگار ہے۔ عظیم و برتر خدا کے سوا کسی کے پاس کوئی طاقت نہیں۔

آپ کو دیکھ کر دوسروں کو بھی جرأت ہوئی اور پورا لشکر اپنے گھوڑوں کے ساتھ دریا میں تیرنے لگا۔ یہ لوگ نصف سے زیادہ دریا پار کر چکے تھے کہ ایرانی تیر اندازوں نے تیروں کی بارش شروع کر دی جو دریا کے دوسرے کنارے پہلے سے موجود تھے۔

دریا میں تیرتا ہوا لشکر اس ناگہانی آفت کا خود مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر کیا چیز تھی جس نے فوج کو برباد ہونے سے بچایا۔ یہ کوئی اتفاق نہ تھا اور نہ محض جوش کا کرشمہ تھا۔ یہ سوچی سمجھی منصوبہ بندی تھی۔ جو کچھ ہوا، وہ عین اس نقشہ کے مطابق ہوا جو پہلے سے طے کر لیا گیا تھا۔

صورت حال پیش آنے کے بعد سعد بن وقاص نے باقاعدہ مشورہ کیا۔ سعد بن وقاص جہاں نصرت الٰہی پر یقین کرتے ہوئے دریا میں کود پڑے، وہیں انھوں نے حالات کا مکمل جائزہ لے کر اس آنے والی آفت کا بھی پیشگی اندازہ کر لیا تھا۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ جب انھوں نے گھوڑا دریا میں ڈالنے کا ارادہ کیا تو لشکریوں سے فرمایا کہ "تم میں کون ایسا بہادر سردار ہے جو اپنی جمعیت کے ساتھ اس بات کا وعدہ کرے کہ وہ ہم کو دریا عبور کرنے کے وقت دشمن کے امکانی حملہ سے بچائے گا۔ عاصم بن عمرو نے اس کی ذمہ داری لی اور چھ سو تیر اندازوں کی ایک جماعت لے کر دجلہ کے اِس کنارے ایک اونچے مقام پر کھڑے ہو گئے۔ جیسے ہی ایرانی تیر اندازوں نے دجلہ میں تیرتے ہوئے اسلامی لشکر پر تیر پھینکنے شروع کئے، عاصم بن عمرو کا دستہ فوراً متحرک ہو گیا۔ اس نے ایرانی تیر اندازوں پر اتنی قوت کے ساتھ مسلسل تیر برسائے کہ انھیں دفاع کی پوزیشن میں ڈال دیا۔ کثرت سے ایرانی مجروح اور ہلاک ہونے لگے حتی کہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس درمیان میں اسلامی لشکر دریا پار کر کے دوسرے کنارے پہنچ گیا اور ایرانی لشکر پر سخت حملہ کر کے مدائن پر قبضہ کر لیا۔

اختلاف کا نقصان کہاں تک جاتا ہے

عرب کے جزیرہ نما سے اسلام کا جو سیلاب اٹھا تھا، وہ اطراف کے تمام ملکوں پر اس طرح چھایا کہ ان کی زبان اور تہذیب تک بدل گئی۔ اس میں صرف ایک استثنا ہے، اور وہ ایران کا ہے۔ یہ تاریخ کا ایک اہم سوال ہے کہ وہ اسلام جس نے اپنے تمام پڑوسی ملکوں کی زبان اور تہذیب بدل دی، وہ ایران میں مذہبی تبدیلی کی حد تک کامیاب ہونے کے باوجود وہاں کی زبان کو کیوں نہ بدل سکا۔

اس سوال کا جواب ہم کو امویوں اور عباسیوں کی سیاسی لڑائی میں ملتا ہے۔ اموی خلافت کی جگہ عباسی خلافت قائم کرنے کی تحریک جو دوسری صدی ہجری میں شروع ہوئی۔ اس میں ایک طرف وہ لوگ تھے جو سیاسی عزائم کے تحت یہ کام کر رہے تھے۔ اس گروہ کے سردار محمد بن علی بن عبد اللہ بن عباس بن مطلب تھے۔ دوسری طرف مذہبی لوگ تھے جو اصلاحی جذبہ کے تحت اس مہم میں شریک ہو گئے۔ عبد اللہ بن محمد بن حنفیہ بن علی بن ابی طالب کا تعلق اسی دوسرے گروہ سے ہے۔ محمد بن علی کے لڑکے ابراہیم تھے جو ۱۲۴ ہجری میں اپنے والد کے انتقال کے بعد اس تحریک کے امام مقرر ہوئے۔ ابو مسلم خراسانی جس نے عباسی سلطنت کے قیام میں اہم حصہ ادا کیا ہے، ایک معمولی مزدور تھا جو چار جامہ سینے کا کام کرتا تھا۔ اس کی زبردست شخصیت اور غیر معمولی صلاحیت کو دیکھ کر امام ابراہیم نے اس کو اپنے کام کے لئے چن لیا اور اس کو اپنا نائب مقرر کرکے خراسان بھیج دیا۔

جب عباسیوں کو غلبہ حاصل ہوا تو انھوں نے چن چن کر بنو امیہ کے افراد کو قتل کرنا شروع کیا تاکہ مستقبل میں ان کے سیاسی اقتدار کو چیلنج کرنے والا کوئی باقی نہ رہے۔ اس زمانے میں امام ابراہیم نے ابو مسلم کو تاکید کے ساتھ لکھا کہ "خراسان میں کسی عربی بولنے والے کو زندہ نہ رکھنا"۔ خراسان میں بنو امیہ کے طرف دار وہی عرب قبائل تھے جو خراسان کی فتح کے بعد وہاں جا مقیم ہو گئے تھے۔ ان کے علاوہ جو خراسانی باشندے تھے، وہ سب نو مسلم تھے اور آسانی عباسی اقتدار کو قبول کر سکتے تھے۔ جب کہ عرب قبائل سے یہ اندیشہ تھا کہ ان کی عربیت انھیں بنو امیہ کا حامی بنا کر نئے ارباب اقتدار کے لئے مسئلہ نہ پیدا کر دے۔

ابو مسلم ایرانی النسل ہونے کی وجہ سے خود بھی اپنے ملک سے عربوں کے استیصال کا دل سے خواہش مند تھا۔ امام ابراہیم عباسی کی ہدایت پانے کے بعد وہ پوری طرح اس محبوب مہم کے لئے سرگرم ہو گیا۔ اس نے خراسان میں آباد سارے عرب باشندوں کا ایک طرف سے صفایا کر دیا۔ یہ عرب قبائل جو اس وقت خراسان میں آباد تھے، دوسرے پڑوسی ملکوں کی طرح یہاں کی زبان، معاشرت، تمدن کو عربی بنانے میں مصروف تھے۔ ان کے مذہب کو بدلنے میں انھوں نے کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اب زبان اور تہذیب کو بدلنے کا عمل کامیابی کے ساتھ جاری تھا۔ مگر ابو مسلم کی طرف سے ان کے قتل عام کے بعد یہ عمل یکایک رک گیا۔ ایرانی زبان اور ایرانی تہذیب مرتے مرتے دوبارہ زندہ ہو گئے۔ ایران و خراسان جو مصر و شام و عراق وغیرہ کی مانند آج عرب دنیا کا ایک حصہ ہوتا۔ دوبارہ فارسی ملک بن گیا۔

تاریخ میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ سیاسی حوصلہ مندوں کی سیاست بازیوں کی وجہ سے ضروری قسم کے تعمیری کام ہوتے ہوتے رک گئے جس کے نتائج بعد کو اندوہناک صورت میں برآمد ہوئے۔ چند افراد کے وقتی عزائم کی قیمت قوموں اور ملکوں کو صدیوں تک انتہائی بھیانک شکل میں دینی پڑی۔

الرسالہ اکتوبر ۱۹۷۶

سبق آموز

مغربی پاکستان کے سابق گورنر امیر محمد خاں (متوفی ۱۹۶۷ء) نے یورپ میں زرعی سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ صدر ایوب کی حکومت کے زمانہ میں پاکستان میں جو "سبز انقلاب" آیا تھا، اس کا سہرا دراصل ملک امیر محمد خاں ہی کے سر ہے جو اس وقت پاکستان کے قفائی زرعی کمیشن کے صدر تھے اور بعد کو اپنی خدمات کے اعتراف میں گورنر بنا دیئے گئے۔ وہ مشرقی تہذیب کا نمونہ تھے گورنر ہاؤس میں نماز روزہ کی سختی سے پابندی کرتے اور ان کے گھر کی خواتین ہمیشہ پردہ کے اندر رہتیں۔

جب پاکستان کے تیسرے منصوبہ میں خاندانی منصوبہ بندی کے لئے ۳۰ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی تو انھوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ بات بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ صدر ایوب نے جھنجلا کر کہدیا کہ اگر آبادی کی روک تھام نہ ہوئی تو ایک وقت وہ آئے گا جب اناج کی کمی کی وجہ سے ایک پاکستانی دوسرے پاکستانی کو بھون کر کھائے گا خوشی صرف اس بات کی ہے کہ اس وقت میں زندہ نہیں رہوں گا۔

ملک امیر محمد خاں نے ستمبر ۱۹۶۶ میں گورنری سے استعفا دے دیا۔ اور اپنے آبائی وطن کالا باغ چلے گئے۔ جہاں ان کے کھیت اور باغات تھے۔ یہاں ان کے گھر پر جائداد کا جھگڑا شروع ہوا۔ بالآخر ایک روز وہ خود اپنے بیٹے ملک محمد اسد خاں کے خلاف رائفل لے کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے اپنے بیٹے پر گولی چلائی مگر وہ کندھے کو زخمی کرتی ہوئی نکل گئی۔ اب بیٹے کی باری تھی۔ اس نے چھ گولیاں اپنے باپ کے جسم میں اتار دیں۔ اور وہ وہیں موقع پر ختم ہو گئے۔

وہ شخص جس نے خاندانی منصوبہ بندی کو ناجائز قرار دے کر گورنری کے عہدہ کو چھوڑ دیا تھا، بالآخر خود اپنے بیٹے کے خلاف بندوق لے کر کھڑا ہو گیا اگرچہ اس مقابلہ میں جوان بیٹا بوڑھے باپ پر غالب آیا اور نتیجہ برعکس شکل میں برآمد ہوا۔

مولانا شبلی نعمانی (۱۹۱۴ - ۱۸۵۷) نے اسّی برس پہلے اپنی کتاب الکلام میں لکھا تھا کہ "دوسری دنیا کے وجود کو عقلی ذرائع سے ثابت نہیں کیا جا سکتا"۔ ان سے پہلے امام غزالی بھی یہی بات کہہ چکے ہیں۔ مگر آج دوسری دنیا کا وجود اسی طرح ایک ثابت شدہ چیز بن رہا ہے جیسے ہماری موجودہ دنیا۔

اگلے صفحہ پر جو مضمون درج کیا جا رہا ہے، وہ ایک نمونہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جدید سائنس نے کس طرح ان مذہبی حقائق کو "عقلی طور پر" ثابت کر دیا ہے جن کو اس سے پہلے صرف قیاسی بحث کا موضوع سمجھا جاتا تھا۔

سائنس کے طریقوں سے حقیقت کی تلاش کرنے والے اب اس رائے پر پہنچ رہے ہیں کہ کائنات ایک جوڑے کی شکل میں ہے۔ ہماری دنیا کے ساتھ ایک اور دنیا ہے جو اس کے متوازی اپنا وجود رکھتی ہے۔ وہ دنیا ہماری دنیا سے زیادہ پائدار ہے مگر چونکہ وہ ہمارے ورلڈ کا اینٹی ورلڈ ہے، اس لئے یہ دوسری دنیا ہم کو موجودہ آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتی۔

یہ ٹھیک وہی بات ہے جو قرآن میں ڈیڑھ ہزار برس پہلے بتا دی گئی تھی۔ قرآن نے کہا تھا کہ ہر چیز کو اللہ نے جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے۔ تاکہ تم سوچو کہ جب ہر چیز کا جوڑا ہے تو اس دنیا کا جوڑا کہاں ہے جس سے مل کر وہ مکمل ہو سکے۔ (ذاریات - ۴۹)

دنیا کا یہ جوڑا (آخرت) ۲۵ سال پہلے تک صرف ایک قیاسی چیز تھی، اب جدید علم نے خالص سائنسی طریقوں سے اس کے وجود کو معلوم کر لیا ہے۔ اس طرح کی بے شمار دریافتیں ہیں جنھوں نے موجودہ زمانہ میں الحاد کو بالکل بے بنیاد ثابت کر دیا ہے اور اگر ان کی مدد سے نیا علم کلام مرتب کیا جائے تو وہ قدیم علم کلام کے مقابلہ میں ایسا ہی ہوگا جیسے تلوار کے مقابلہ میں ایٹم بم۔

یہاں ایک اور مخفی دنیا ہے جو ہماری دنیا کے متوازی موجود ہے

۱۹۲۸ تک طبیعیات داں یہ سمجھتے تھے کہ تمام ایٹم صرف دو قسم کے ذرات کا مجموعہ ہوتے ہیں، مثبت برقی چارج رکھنے والے پروٹان اور منفی برقی چارج رکھنے والے الکٹران۔ مگر اسی سال پال اے ایم ڈیراک Paul A.M.Dirac نے، جو ایک انتہائی تخلیقی قسم کا ریاضیاتی طبیعیات داں تھا، ذرات کا ایک نیا نظریہ پیش کیا اور ایک نئے قسم کے ذرہ کی موجودگی کا امکان ظاہر کیا جو اب تک تجرباتی طبیعیات دانوں کے لئے نامعلوم تھا۔

اس نے کہا کہ "اس کا مقدار مادہ الکٹران جیسا ہے، مگر وہ اس کے مخالف برقی چارج رکھتا ہے۔ ہم اس ذرہ کو اینٹی الکٹران کہہ سکتے ہیں"۔ ۱۹۳۲ میں یہ اینٹی الکٹران دریافت ہو گیا۔ اس کو کے، اینڈرسن (K.Anderson) نے کاسمک شعاعوں میں دریافت کیا اور اس کا نام پازیٹران رکھا گیا۔ یہ پہلا اینٹی پارٹیکل تھا جو انسان کے علم میں آیا۔ اس وقت سے اب تک وہ سب سے زیادہ ایلمنٹری پارٹیکل ایٹم کے اندر دریافت ہو چکے ہیں اور اگر تمام نیوکلیر واقعات کو شمار کیا جائے تو یہ تعداد ۲۰۰ تک پہنچ جائے گی بشمول ان کے اینٹی پارٹیکل کے کیونکہ ایٹم کے ہر پارٹیکل کا ایک اینٹی پارٹیکل ہے۔ پروٹان ایک اینٹی پروٹان رکھتا ہے، نیوٹران کا ایک اینٹی نیوٹران ہے اور اسی طرح دوسرے۔ صرف تین مستثنیٰ اب تک معلوم ہو سکے ہیں: فوٹون اور دو قسم کے میسان۔ مگر ان کی حیثیت خود اپنے ہی اینٹی پارٹیکل کی ہے۔

ذراتی جوڑوں (Pair Particles) کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ جیسے ہی وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں وہ ایک دوسرے کو فنا کر دیتے ہیں۔ مگر فنا کا مطلب مادہ کا بالکل فنا ہو جانا نہیں ہے، جیسا کہ بعض فلاسفہ غلطی سے سمجھتے ہیں۔ طبیعیات میں "فنا" کی اصطلاح کا مطلب یہ ہے کہ مادہ رکھنے والا ایلمنٹری پارٹیکل مادہ یا انرجی کی کسی دوسری صورت میں تبدیل ہو جائے۔ یہ فوٹان کی شکل میں ہو سکتا ہے جبکہ زیرو مادہ کی حالت میں رہتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ایک پازیٹران اور ایک الیکٹران ٹکراتے ہیں، وہ فی الفور ایک دوسرے کو فنا کر کے دو فوٹان پیدا کر دیتے ہیں۔ اس سے یہ نکلتا ہے کہ ایک ایٹم اور ایک اینٹی ایٹم کا ٹکراؤ نہایت زبردست مقدار میں انرجی خارج کرے گا۔ فی الواقع مادہ اور اینٹی مادہ کا فنا ہونا یورینیم کے ذریعہ پیدا کی جانے والی انرجی کا ایک ہزار گنا اور تھرمو نیوکلیر کا ۲۳ گنا زیادہ توانائی خارج کرتا ہے۔ ایک دن آدمی اس قابل ہو جائے گا کہ اس کبھی نہ ختم ہونے والے ذریعہ توانائی پر قابو پا لے۔

جب ایک بار اینٹی پارٹیکل کو مان لیا گیا اور ان کا وجود متحقق ہو گیا تو اس کے بعد فطری طور پر یہ ہوا کہ سائنسی فکر اینٹی نیوکلیس اور اینٹی ایٹم کی طرف مڑ گیا۔ ایک اینٹی ہائیڈروجن ایٹم میں منفی برقی چارج رکھنے والا ایک اینٹی پروٹان ہوگا اور اس کے گرد مثبت برقی چارج رکھنے والا الکٹران (پازیٹران) اس کے گرد گھوم رہا ہوگا۔ ڈیوٹریم ہائیڈروجن کا ایک آئسوٹوپ ہے جس کے نیوکلیس میں ایک پروٹان اور ایک نیوٹران ہوتا ہے۔ اب اینٹی ڈیوٹریم کا نیوکلیس ایک اینٹی پروٹان اور ایک اینٹی نیوٹران پر مشتمل ہوگا۔ زیادہ دن نہیں گزرے کہ سائنس داں اس قسم کا اینٹی ڈیوٹریم پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اسی طرح اینٹی آکسیجن، اینٹی آئرن وغیرہ کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ فطری طور پر اس کے بعد دوسرا قدم اینٹی میٹر اور اینٹی ورلڈ کا

ہماری دنیا میں تمام اینٹی پارٹیکل غیر قائم (Unstable) حالت میں ہیں۔ مگر اینٹی ورلڈ میں وہ سب قائم (Stable) حالت میں ہوں گے کیونکہ تمام ایٹموں کے نیوکلیس منفی برقی چارج رکھتے ہوں گے اور تمام الکٹران مثبت برقی چارج۔ اینٹی ورلڈ کی موجودگی کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔ درحقیقت اس قسم کے ایک اینٹی ورلڈ کے موجود ہونے کا امکان پہلی بار ۱۹۳۳ء میں ڈیراک نے اپنے لیکچر میں بیان کیا تھا مگر اب تک کوئی سائنس داں اس کی نشان دہی نہیں کر سکا۔

اس راہ کی مشکلات کیا ہیں۔ اپنی دنیا میں دور کی چیزوں کو ہم فوٹان کی مدد سے پہچانتے ہیں جبکہ برقی مقناطیسی شعاعوں کے ذرات ہیں۔ اینٹی ورلڈ اگر اس کا وجود ہے تو وہ بھی اسی قسم کے فوٹان کا اخراج کرتی ہوگی جو کہ بیک وقت پارٹیکل بھی ہیں اور اینٹی پارٹیکل بھی۔ اینٹی ورلڈ، وہ دور ہو یا نزدیک، اس کی روشنی فوٹان کی شکل میں ہو سکتا ہے کہ مسلسل ہم تک پہنچ رہی ہو۔ مگر ہم اس کو اپنے پازیٹو ورلڈ کی چیزوں کی روشنی سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ اصولی طور پر نیوٹرینو کو ہمیں اینٹی ورلڈ کو جاننے میں مددگار ہونا چاہئے۔ مگر یہ نیوٹرینو نیز اینٹی نیوٹرینو بہت زیادہ گریز صفت ذرات ہیں اور ان کو پکڑنا انتہائی مشکل ہے۔

بہت سے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اینٹی ورلڈ ہم سے الگ اور ہماری دنیا کے متوازی اپنا وجود رکھتا ہے۔ اگر کائنات صرف پارٹیکل اور اینٹی پارٹیکل کے حساب سے اضافی نہیں ہے بلکہ میٹر اور اینٹی میٹر کے حساب سے بھی اضافی ہے تو ایک نیا اینٹی میٹر سے ترکیب یافتہ موجود ہونا چاہئے۔ تخلیق کے بارے میں عظیم دھماکہ (Big Bang) کا نظریہ فرض کرتا ہے کہ تقریباً ۱۰ سے ۲۰ بلین سال پہلے سارا مادہ مجتمع حالت میں ابتدائی ایٹم کی شکل میں تھا اور فوٹان انرجی پر مشتمل تھا۔ اگر کائنات واقعی متناسب ہے تو عظیم دھماکہ کے ساتھ فوٹان میٹر اور اینٹی میٹر کی صورتوں میں منتقل ہو گئے ہوں گے اور ورلڈ اور اینٹی ورلڈ کو بنانے کے لئے الگ الگ ہو گئے ہوں گے۔ یہ نظریہ پہلے سویڈش طبیعیات داں اوسکر کلین (Oskar Klein) نے پیش کیا تھا۔ اس کے بعد اس کی بنیاد پر مشہور طبیعی فلکیات داں ہینیز الفوین (Hannes Alfven) نے ۱۹۶۲ء میں ایک تفریقی میکانزم کا امکان ظاہر کیا جس کے ذریعہ ایک ہی کہکشاں میں میٹر اور اینٹی میٹر دونوں موجود رہتے ہیں۔ مگر ابھی تک تفریقی میکانزم کا کوئی طریقہ وضع نہیں ہو سکا ہے جس کے مطابق ہماری کسی معلوم کہکشاں کے قریب کوئی اینٹی کہکشاں موجود ہو یا ہماری دنیا سے متصل کوئی اینٹی دنیا پائی جاتی ہو۔

اب تک ہم نے ایک اینٹی ورلڈ پر غور کیا ہے جس میں صرف مادہ منفی ہوتا ہے۔ یہ ڈیراک کا اینٹی ورلڈ ہے۔ مگر جیسا کہ ہم جانتے ہیں، تمام مادہ، تمام اجسام مکان میں حرکت کرتے ہیں اور زمان میں اپنا وجود رکھتے ہیں۔ ہماری دنیا میں یہ تینوں اجزاء — مادہ، مکان اور زمان — مثبت ہیں۔ ڈیراک کے اینٹی ورلڈ میں جس کو ہم تلاش کر رہے ہیں، صرف مادہ منفی ہوگا جبکہ مکان اور زمان مثبت ہوں گے۔ مگر الجبرا کے عمل کی منفی مقداروں کی طرح ہم منفی زمان اور منفی مکان کے امکانی وجود کو بھی سوچ سکتے ہیں۔ ایسی حالت میں تینوں اجزاء — مکان، زمان اور مادہ — اینٹی ورلڈ کے سات الگ وجود بنائیں گے۔ ہماری مثبت دنیا (پازیٹو ورلڈ) کو ملا کر کل تعداد آٹھ ہو جائے گی۔ اینٹی ورلڈ کے سات وجودوں میں سے ایک، جس میں مکان، زمان اور مادہ سب منفی ہیں، بظاہر سب سے زیادہ حقیقی اینٹی ورلڈ ہے۔

سوویت یونین کے ڈاکٹر گستاف نان Gustav Naan نے اس مکمل طور پر منفی اینٹی ورلڈ کی ریاضیات کے ذریعہ ایسی ٹھوس احاطہ بندی کر دی ہے کہ اس کے مخالفین تک اس کو انتہائی زبردست قسم کا متوازن تصور مانتے ہیں۔ ڈاکٹر نان کے اینٹی ورلڈ میں ہر چیز — مکان، زمان اور مادہ — ایک دوسرے کے مخالف سمت میں بھاگ رہے ہیں۔ نظریاتی طور پر یہ ناممکن

مقناطیس کا ہر ٹکڑا اپنے دونوں سروں پر ایک دوسرے کی ضد ہوتا ہے۔ ایک سرے کو ساؤتھ پول (قطب جنوبی) اور دوسرے سرے کو نارتھ پول (قطب شمالی) کہتے ہیں۔ مقناطیس کے دو ٹکڑے لیجئے۔ اگر آپ دونوں کے ساؤتھ پول کو آمنے سامنے کریں تو وہ ایک دوسرے سے بھاگیں گے اور اگر ایک ساؤتھ پول دوسرے کے نارتھ پول کے سامنے لائیں تو وہ ایک دوسرے سے چمٹیں گے ——— حیوانات کے نر و مادہ سے لے کر ایٹم کے مثبت اور منفی ذرات تک ہر جگہ یہی اصول جاری ہے۔ ہر چیز اسی لئے "ایک" ہے کہ وہ "دو" ہے، اگر دو نہ ہو تو ایک بھی نہیں۔

نہیں۔ اس قسم کے اینٹی ورلڈ میں وہی طبیعیاتی قوانین، بالفاظ دیگر فطرت کے قوانین منطبق ہوتے ہیں، جیسا کہ ہم موجودہ دنیا میں جانتے ہیں۔ یہ انقلابی قسم کا اینٹی ورلڈ کہاں ہے۔ کیا وہ آج موجود ہے یا وہ "عظیم دھماکہ" کے ابتدائی ایٹم سے پہلے موجود تھا۔ اس ایک اینٹی ورلڈ کی موجودگی کو ہم بہت اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جس میں، قبل اس کے کہ وہ ابتدائی ایٹم کی صورت میں منجمد ہوا، ہر چیز الٹی شکل میں تھی۔ تب ایک انقلاب عظیم برپا ہوا زماں رک گیا اور اینٹی ورلڈ نے پازیٹو ورلڈ کی صورت اختیار کی جو کہ آج ہماری دنیا ہے۔

اس قسم کی ایک صورت حال کے لئے کوئی چیز ناممکن نہیں۔ مگر ڈاکٹر نان کا کہنا ہے کہ اس کو طبیعیات کے معلوم نظریات اور قوانین کے ذریعہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا یقین ہے کہ وہ منعکس دنیا آج بھی موجود ہے مگر وہ ہم سے آزاد اور ہماری دنیا کے متوازی اپنا وجود رکھتی ہے۔ اس ورلڈ اور اینٹی ورلڈ کے درمیان کیا رشتہ ہے۔ کیا کوئی مواصلاتی سلسلہ ہے جس کے ذریعے سے ہماری دنیا اینٹی ورلڈ سے تعلق قائم کرتی ہے۔ مادہ اور انرجی لاشے (Nothing) سے پیدا نہیں ہو سکتے۔ اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنا کوئی نشان چھوڑے بغیر مٹ جائیں۔ مگر ایک "بلیک ہول" کے بارے میں غور کرو۔ بلیک ہول ایک ختم شدہ ستارہ ہے جس کی طاقت ور کشش ثقل اس کی روشنی تک کو نکلنے سے روک دیتی ہے اور اس طرح اس کو ناقابل دید بنا دیتی ہے۔ اب تک کوئی بلیک ہول، بثبت طور پر شناخت نہیں کیا جا سکا ہے۔ مگر بہت سے فلکیات داں یقین رکھتے ہیں کہ کویسار (Quasars)، پلسار (Pulsars) درحقیقت بلیک ہول ہیں جو گیسوں کی ایکسرے شعاعوں کے پھٹنے سے اپنے وجود کو بتا رہے ہیں۔

امکانی طور پر کائنات میں وھائٹ ہول بھی ہیں۔ ان کے ذریعہ سے مادہ یا شعاعیں بالکل غیر متوقع طور پر خلا میں بکھر سکتی ہیں۔ مگر کیا بلیک ہول اور وھائٹ ہول میں کوئی رشتہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی سلسلہ ہو جو دونوں کو جوڑ رہا ہو۔ ممکن ہے کہ جو مادہ ایک بلیک ہول سے غائب ہو جاتا ہے، وہ دوبارہ ایک وھائٹ ہول میں ظاہر ہو جاتا ہو۔ ڈاکٹر نان کا خیال ہے کہ بلیک اور وھائٹ ہول کو ورلڈ اور اینٹی ورلڈ کے درمیان ایک مقامی واسطہ سمجھنا چاہئے مگر اب تک یہ سب کچھ مفروضہ ہے۔ نان کے اینٹی ورلڈ میں منفی انرجی رکھنے والے اجسام مخالف زمانی رخ پر سفر کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک زمان معکوس کی کائنات ہے۔ شاید یونیورس اور اینٹی یونیورس دونوں ایک دوسرے سے بندھی ہوئی اور باہم متعلق ہیں۔ ہر دنیا دوسری دنیا کے مقابلہ میں ایک اینٹی ورلڈ ہے۔ یہ ایک قسم کا اتحاد اور باہمی نفی اور اتحاد اور اپنے مخالف سے مقابلہ کی صورت ہے۔ کائنات سکڑتی ہے اور پھیلتی ہے اور یہی کائنات کے واقعات کا اصل سرچشمہ ہے۔

ویکلی لنک، ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۵

جب تعمیری حوصلے سیاسی عزائم میں تبدیل ہوجائیں

ابو علی محمد بن علی بن مقلہ (۳۲۸ - ۲۷۲ھ) ایک غیر معمولی صلاحیت رکھنے والا فن کار تھا۔ اس نے قدیم عربی خط (خط کوفی) میں اصلاحات کر کے اس کو حسین اور جامع بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ ابتدا میں وہ عباسی حکومت کے ایک دفتر میں چھ دینار ماہوار پر منشی تھا۔ پھر اس کا فنی کمال اس کو خلیفہ کے دربار تک لے گیا۔ یہاں اس نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ مسلسل تین بادشاہوں کا وزیر بنتا رہا۔ اولاً مقتدر باللہ عباسی (۳۲۰ - ۲۸۲) کا، پھر اس کے بھائی قاہر باللہ (۳۲۲ -   ) کا، اس کے بعد راضی باللہ (۳۲۹ - ۲۹۷) کا۔ واضح ہو کہ "وزیر" قدیم زمانے میں وزیر اعظم کے ہم معنی ہوتا تھا۔ کیونکہ بادشاہ کا صرف ایک وزیر ہوتا تھا اور اس کو سارے اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ مقتدر باللہ کے ابتدائی زمانے میں حامد بن عباس وزیر تھا۔ اس کے ساتھ اس نے علی بن عیسیٰ الجراح کو نائب وزیر بنایا تو لوگوں کو سخت تعجب ہوا۔ ایک شاعر کی نظم کا ایک شعر یہ ہے۔

اعجب من کل ما رأینا
ان وزیرین فی بلاد

سب سے عجیب بات جو ہم نے دیکھی
وہ یہ کہ ایک ملک میں دو وزیر ہیں

ابن مقلہ کے یہ مناصب اس کے فن کی ترقی میں بے حد مددگار ہو سکتے تھے۔ اگر ان ملے ہوئے مواقع کو وہ فن تحریر اور اس سلسلے کی دوسری چیزوں کی ترقی اور تحقیق میں لگاتا تو صرف یہ کہ عربی رسم الخط بہت پہلے اپنے معراج کمال کو پہنچ جاتا، بلکہ ہو سکتا ہے کہ تحریر اور کتابت کے میدان کی بہت سی دوسری ایجادیں جو اس کے بہت بعد سامنے آئیں اسی کے زمانے میں وجود میں آگئی ہوتیں۔ مثال کے طور پر کاغذ ابن مقلہ سے آٹھ سو برس پہلے ۱۰۵ء میں چین میں ایجاد ہوا۔ اس کا ایجاد کرنے والا سائی لون تھا جو ابن مقلہ کی طرح چینی شہنشاہ ہوتی کا وزیر تھا۔ روسی ترکستان میں عربوں اور چینیوں کی جنگ میں کچھ چینی قیدی جو مسلمانوں کے ہاتھ آئے وہ کاغذ بنانا جانتے تھے۔ سمرقند میں ان سے کاغذ بنوایا گیا۔ اس کے بعد ۷۹۵ء میں دستی کاغذ کی صنعت بغداد میں قائم ہوئی۔ تاہم مشین کے ذریعے کاغذ بنانے کا کام پہلی بار ۱۷۵۰ء میں ہالینڈ میں کیا گیا۔ مسلسل رول کی شکل میں کاغذ بنانے کی صنعت ۱۷۹۸ء میں فرانس میں شروع ہوئی۔ اسی طرح پرنٹنگ پریس پہلی بار غالباً چینیوں نے ۷۷۰ء میں دریافت کیا۔ یہ ابن مقلہ (۹۴۰ - ۸۸۵ء) کی پیدائش سے ۱۱۵ سال پہلے کا زمانہ تھا۔ پرنٹنگ کا قدیم ترین نمونہ اس سے بھی پہلے پانچویں صدی عیسوی کا چین میں دریافت ہوا ہے۔ یورپ میں ترقی یافتہ پرنٹنگ پریس ۱۵ویں صدی میں گوٹن برگ نے بنایا اور بائبل چھاپی۔ تاہم مسلم دنیا میں پرنٹنگ پریس نپولین کے ذریعے ۱۷۹۸ء میں پہلی بار مصر پہنچا۔

ابن مقلہ جو نہ صرف فن تحریر کا ماہر تھا بلکہ حیرت انگیز تخلیقی صلاحیت رکھتا تھا۔ اگر وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو اپنے میدان میں لگاتا تو کاغذ اور چھپائی اور اس طرح کی دوسری نعمتیں جو عالم اسلام کو بہت بعد کو ملیں شاید ابن مقلہ کے زمانہ ہی میں اس کو مل چکی ہوتیں۔ مگر وہ اس پر قانع نہ رہ سکا کہ اپنے آپ کو مخصوص میدان میں محدود رکھے۔ وزارت کے ملے ہوئے مواقع کو وہ تحریر اور کاغذ اور چھپائی کی ترقی میں استعمال کر سکتا تھا۔ اس کے برعکس اس نے ان مواقع کو عزت و ناموری کی طرف چھلانگ لگانے کے لیے ایک زینہ کے طور پر استعمال کیا۔ ابن مقلہ جب وزیر کے منصب پر پہنچ گیا تو اس کے ساتھ وہی حادثہ ہوا جس سے وہ لوگ بہت کم بچتے ہیں جن کو حالات کسی بلند مقام پر پہنچا دیں۔ اس کے فنی حوصلے اب سیاسی

عزائم میں تبدیل ہو گئے۔ خاموش تعمیری کاموں میں مشغول رہنے کے بجائے وہ سیاسی اور فوجی تحریکوں کا لیڈر بن گیا۔ اس نے منصوبہ بنایا کہ خلیفہ قاہر باللہ کو تخت سے اتار کر ابو احمد بن مکتفی کو عباسی سلطنت کا حکمراں بنا دیا جائے۔

راز کھل گیا۔ ابن مقلہ پر یہ الزام لگا کہ اس نے فوجی سردار مونس خادم کے ساتھ مل کر قاہر باللہ کی حکومت کو ختم کرنے کی سازش کی تھی۔ سازش کے انکشاف کے بعد ابن مقلہ کا گھر جلوا دیا گیا۔ ابو احمد بن مکتفی کو دیوار میں چن دیا گیا۔ تاہم ابن مقلہ کی ذہانت اس کے کام آئی۔ وہ فرار ہو کر بچ گیا اور اس کے بعد پانچ لاکھ دینار خلیفہ کو نذر کر کے دوبارہ وزارت حاصل کر لی۔ مگر اس کے سیاسی عزائم نے دوبارہ اس کے لئے مسائل پیدا کئے۔ یہاں تک کہ راضی باللہ نے اس کو وزارت سے معزول کر کے اس کے گھر میں نظر بند کر دیا اور اس کا دایاں ہاتھ کٹوا دیا۔ بلا شبہ یہ ایک سخت ترین سزا تھی جو کسی فن کار کو دی جا سکتی تھی۔ گھر کی قید میں جو اشعار وہ پڑھا کرتا تھا۔ اس میں سے ایک شعر یہ تھا:

لیس بعد الیمین لذۃ عیش
یا حیاتی بانت یمینی فبینی

دایاں ہاتھ کٹ جانے کے بعد زندگی میں کوئی لطف نہیں، اے میری زندگی جب میرا دایاں ہاتھ مجھ سے جدا ہو گیا تو تو بھی جدا ہو جا۔

ابن مقلہ کی غیر معمولی صلاحیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب اس کا دایاں ہاتھ کٹ گیا تو اس نے بائیں ہاتھ سے لکھنے کی مشق کی۔ یہاں تک کہ بائیں ہاتھ سے بھی وہ اتنا ہی اچھا لکھ لیتا تھا جیسا وہ دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا۔ پھر اس نے اپنے کٹے ہوئے ہاتھ میں ایک قلم باندھا اور اس سے لکھنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ ہاتھ کٹنے سے پہلے کے خط اور ہاتھ کٹنے کے بعد کے خط میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ یہ باکمال انسان اپنے گھر کے قید خانے میں ۵۶ سال کی عمر میں مر گیا۔

الرسالہ اکتوبر ۱۹۷۶

ابن مقلہ شاعر بھی تھا۔ اس نے اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کے ماتم میں بہت سے اشعار موزوں کئے۔ وہ کہتا تھا: "وہ ہاتھ جس نے قرآن کے فلاں فلاں نسخے لکھے، جس نے رسول اللہ کی فلاں فلاں حدیثیں لکھیں، جس نے مشرق و مغرب میں احکام لکھ کر بھیجے وہ چوروں کے ہاتھ کی طرح کاٹ دیا گیا۔"

ماضی کے ابن مقلہ کو تاریخ معاف کر سکتی ہے، مگر حال کے "ابن مقلہ" جو اپنے مناصب کو تعمیری جد و جہد میں نہیں لگاتے بلکہ اشتہاری قسم کے ذاتی عزائم میں اپنے قیمتی مواقع کو برباد کر رہے ہیں۔ ان کے پاس دوسری بار اس اندوہناک غلطی میں مبتلا ہونے کا کیا عذر ہے۔ کیا انھیں یاد نہیں کہ مومن کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ ایک بل سے دو بار نہیں ڈسا جاتا۔

پتھرائے ہوئے درخت

پانڈیچری سے ۱۴ میل کے فاصلے پر ایک مقام ہے تروو کاری۔ یہاں قدیم زمانہ سے درختوں کے تنے کی شکل کے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ عوام کا خیال تھا کہ یہ بھوتوں یا راکششوں کی ہڈیاں ہیں جن کو وشنو بھگوان نے ہلاک کیا تھا۔ حال میں ماہرین نے دریافت کیا کہ یہ دراصل فاسلس (FOSSILS) ہیں۔ یعنی قدیم زمانہ کے درختوں کے پتھرائے ہوئے تنے۔ اندازہ ہے کہ یہ درخت ۲۰ ملین سال پہلے پائے جاتے تھے۔ اس قسم کا ایک شجری فاسل نومبر ۱۹۷۰ء میں نئی دہلی لایا گیا اور یہاں نیشنل میوزیم میں عام نمائش کے لئے رکھا گیا ہے۔

قدیم زمانے میں لوگ ان پتھرائے ہوئے درختوں کے پاس جانے سے ڈرتے تھے کہ کہیں بھوت انھیں پکڑ نہ لیں۔ اب وہ تاریخ فطرت کے ایک صفحہ کی حیثیت سے ان کو دیکھیں گے اور ان سے زمین کے قدیم حالات کا اندازہ کریں گے

مفتی محمد عبدہ

ان کی زندگی کا بیشتر حصہ سیاست کی نذر ہوگیا۔ آخر میں انھوں نے تعمیری کام کرنا چاہا مگر اب موت کا وقت آپہنچا تھا۔

مفتی محمد عبدہ (۱۸۴۹ — ۱۹۰۵) اپنے وقت میں مصر کے مشہور ترین عالم تھے۔ اسلامی علوم کی تمام شاخوں میں انھیں غیر معمولی درک حاصل تھا۔ عربی اور فارسی کے علاوہ چالیس سال کی عمر میں فرانسیسی زبان بھی سیکھی اور اس میں بخوبی قدرت حاصل کرلی۔ وہ زندگی بھر جمال الدین افغانی کے کاموں میں ان کے دست راست رہے۔ بڑی بڑی سیاسی شخصیتیں مثلاً ریاض پاشا (وزیر مصر) سعد زاغلول (وزیر اعظم مصر) ان سے متاثر تھے۔ ساڑھے تین سالہ جلاوطنی کے بعد ۱۸۸۸ میں جب خدیو توفیق پاشا نے ان کو دوبارہ مصر میں داخل ہونے کی اجازت دی تو ان کی سفارش کرنے والوں میں لارڈ کرومر (۱۸۴۱ — ۱۹۱۷) بھی شامل تھے۔

۱۸۸۰ میں وہ حکومت مصر کے سرکاری ترجمان "الوقائع المصریہ" کے مدیر مقرر ہوئے تو انھیں خصوصی اختیار دیا گیا کہ حکومت کے محکموں کی کارکردگی پر تنقید کریں۔ حالاں کہ اس سے پہلے یہ رسالہ صرف سرکاری اطلاعات اور حکومت کے محکموں کے اعلانات کی اشاعت کا ذریعہ تھا۔ انھیں شعبۂ اشاعت کے اعلیٰ عہدیدار کی حیثیت سے ملک میں شائع ہونے والے تمام اخبارات پر نگرانی کا اختیار حاصل تھا۔ ۱۸۹۴ء میں جامعۂ ازہر کی اصلاح کے لئے ایک اعلیٰ اختیار رکھنے والی کمیٹی بنی تو مفتی محمد عبدہ اس کے روح رواں تھے۔ ازہر کے نظام کو تبدیل کرنے میں ان کو حکومت کا پورا تعاون حاصل تھا۔ مجوزہ اصلاحات کی قیمت ادا کرنے کے لئے سرکاری خزانہ سے ایک ہزار پونڈ سالانہ کی رقم منظور کرانے میں بھی انھوں نے کامیابی حاصل کرلی۔ ازہر کے اوقاف کو درست کرنے میں انھیں اس حد تک کامیابی ہوئی کہ اس کی سالانہ آمدنی چار ہزار پونڈ سے بڑھ کر تقریباً ۱۵ ہزار پونڈ ہوگئی۔ ۱۸۹۹ میں وہ مصر کے مفتی مقرر ہوئے تو ان کی شخصی عظمت کی وجہ سے یہ عہدہ نئی اہمیت کا مالک بن گیا۔ اس سے پہلے مفتی کا عہدہ حکومت کے مشیر قانون کے ہم معنی تھا۔ بجز ان امور کے جن کی بابت سرکاری محکمے مسئلہ دریافت کرتے یا قانونی مشورہ طلب کرتے، مفتی کسی معاملے میں بالکل دخل نہیں دیتا تھا۔ مگر انھوں نے عام اہل ملک کو شرعی امور میں مشورہ دینا شروع کردیا۔ اس طرح وہ عہدہ جس کی پہلے کوئی اہمیت نہ تھی بڑے اثر واقتدار کا ذریعہ بن گیا۔ حتیٰ کہ انھوں نے وقت کی فضا کے علی الرغم بعض بڑے انقلابی فتوے دیئے۔ مثلاً یہ کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے ذبح کئے ہوئے جانور کا گوشت کھانا مسلمانوں کے لئے جائز ہے۔ اسی طرح ڈاک خانوں کے سیونگ بینک میں روپیہ رکھنے اور اس سے سود لینے کا جواز۔ مصر کی محاکم شرعیہ (وہ عدالتیں جو نکاح، طلاق، خلع وغیرہ کی بابت شرعی فیصلے کرتی تھیں) کی کارکردگی کی تحقیقات کرائی گئی تو حکومت نے انھیں اس سلسلے کے کامل اختیارات دیدیئے۔ ۱۸۹۹ میں وہ مجلس قانون ساز کے مستقل رکن منتخب ہوئے۔ اپنی قوت تقریر اور قانونی صلاحیت کی وجہ سے وہ بہت جلد مجلس پر چھاگئے۔ ان کی رائے ہمیشہ مجلس کے اندر وزن کی مالک ہوتی تھی۔

مفتی محمد عبدہ فطری طور پر ایک اعتدال پسند شخصیت کے مالک تھے۔ اپنے ابتدائی دور میں وہ شیخ درویش نامی ایک صوفی کے گہرے عقیدت مند ہوگئے تھے جنھوں نے شیخ سنوسی سے طرابلس میں فیض حاصل کیا تھا۔ اس زمانے میں وہ اپنا بیشتر وقت صوفیانہ مشاغل میں صرف کرتے تھے۔ موٹے قسم کے کپڑے پہنتے اور معمولی غذا کھاتے تھے۔ ہمیشہ آنکھیں نیچی کئے ہوئے آہستہ

چلتے اور کسی سے اس وقت تک بات نہ کرتے جب تک شدید ضرورت پیش نہ آئے۔ ان کے اس دور کی یادگار ان کی کتاب "رسالات الواردات" ہے جو ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی۔

۱۸۷۱ء میں جب سید جمال الدین افغانی قاہرہ آئے تو کچھ نوجوانوں کے ساتھ محمد عبدہ کو بھی ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ جمال الدین افغانی ایک آتشیں شخصیت کے آدمی تھے۔ محمد عبدہ ان سے شدید طور پر متاثر ہوئے۔ جرجی زیدان کے الفاظ میں "انھوں نے جمال الدین افغانی کی مضطرب روح اپنے اندر جذب کرلی" اس تاثر نے انھیں تصوف اور ادب سے نکال کر سیاست کی راہ پر ڈال دیا۔ اعرابی پاشا کی بغاوت کے وقت انھوں نے فتویٰ دیا کہ خدیو کی بیعت فسخ کرنا جائز ہے۔ اس فتوے کی وجہ سے ان کو مصر سے جلاوطن کر دیا گیا۔ ان کے اس دور کے مضامین کا مقصد غیر ملکی مداخلت کے خلاف عوام کو اکسانا تھا۔ انھوں نے آزادی کے حصول کو قومی زندگی کا بنیادی مقصد قرار دیا اور جمہوریت اور آزادی کی حمایت میں پرجوش مقالے لکھے۔ جمال الدین افغانی کے انتقال کے بعد اگرچہ ان کے خیالات میں کافی تبدیلی آگئی تھی۔ اب ان کا خیال یہ ہو گیا کہ جو امور ہمارے اختیار میں ہیں ان کی انجام دہی میں لگنا چاہئے اور جو امور ہماری طاقت سے باہر ہیں مثلاً سیاست جس میں انگریزوں کو بے پناہ مادی اور فوجی تفوق حاصل ہے خدا پر چھوڑ کر اپنی دینی، اخلاقی اور تعلیمی اصلاح پر توجہ مرکوز کر دینا چاہئے۔ مگر اپنی سابقہ طبیعت کی وجہ سے اب بھی کبھی کبھی ان کی تحریر و تقریر میں سیاست کا رنگ آجاتا جس کی وجہ سے حکمران طبقہ کو موقع ملتا کہ وہ حال کے محمد عبدہ کو ماضی کے محمد عبدہ کی روشنی میں دیکھے اور ان کے خلاف احتیاطی کارروائی کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے مواقع ملنے کے باوجود وہ تسلسل کے ساتھ کسی ایک کام کو عرصہ تک نہ کر سکے۔

مفتی محمد عبدہ جامعہ ازہر کو عالم اسلامی کی اصلاح کا مرکز بنانا چاہتے تھے۔ مگر ۱۹۰۵ء میں انھوں نے جامعہ ازہر کی انتظامی کمیٹی سے استعفا دے دیا۔ اب ان کا خیال تھا کہ بطور خود کسی نئے اصلاحی ادارہ کا قیام عمل میں لائیں۔ اس وقت ان کی عمر ۵۶ سال ہو چکی تھی۔ مصر کے ایک بڑے رئیس نے جو ان کی تجویز سے ہمدردی رکھتا تھا اپنی زمین کا ایک معقول قطعہ ان کے لئے وقف کر دیا اور مجوزہ ادارہ کا خاکہ بھی تیار ہونا شروع ہو گیا۔ مگر جولائی ۱۹۰۵ء میں ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی نامکمل تفسیر قرآن کی طرح ادارہ کی تشکیل بھی ناتمام رہ گئی۔

مفتی محمد عبدہ کے ذہن میں ایک تجویز یہ بھی تھی کہ ایک مشترک کمپنی بنائی جائے اور وہ ایک اعلیٰ معیار کا عربی روزنامہ جاری کرے۔ اس کی مجلس ادارت میں انتہائی لائق افراد لئے جائیں اور اس کو ملک کی اصلاح کا ذریعہ بنایا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ایک خالص تعمیری پرچہ ہو۔ اور اس کو سیاسی باتوں سے بالکل پاک رکھا جائے۔ مگر موت کی وجہ سے یہ ارادہ بھی پورا نہ ہو سکا — ان کی زندگی کا بیشتر حصہ سیاسیات کی نذر ہو گیا۔ آخر میں جب ہوش آیا اور انھوں نے تعمیری کام کرنا چاہا تو موت کا وقت آپہنچا تھا۔

مفتی محمد عبدہ کی وفات پر ای۔ جی براؤن نے اپنے پیغام میں کہا تھا "موجودہ زمانے میں ان کا سا شخص نہ مغرب میں پیدا ہوا نہ مشرق میں" جرجی زیدان نے ان کا اعتراف ان لفظوں میں کیا تھا "قوموں کی تاریخ میں، خواہ وہ کتنی ہی قدیم کیوں نہ ہو ایسے افراد کم نظر آتے ہیں جن کی سرگرمیوں کا پیمانہ اتنا وسیع ہو جتنا کہ محمد عبدہ کے اصلاحی کاموں کا تھا" ایک ایسی شخصیت کا جو آخری انجام ہوا اس پر ان کے ایک معاصر کے الفاظ صادق آتے ہیں — "اس دن کے طلوع ہونے سے پہلے ہی وہ دنیا سے کوچ کر گئے جس کے طلوع کے لئے ان کی بے تاب فطرت سراپا انتظار تھی"

وہ خطاط بھی ہیں اور فن خطاطی کے تاریخ نگار بھی



ہر دور میں کچھ ایسے فن کار پیدا ہوتے رہے ہیں جو اپنے بعد ہمیشہ کے لئے اپنا فنی شاہکار چھوڑ جاتے ہیں ۔ استاد عیسٰی آفندی اور مکرمت خاں شیرازی نے تاج محل کا آرکیٹکچر تخلیق کر کے دائمی شہرت حاصل کر لی ۔ اسی طرح احمد معمار نے جامع مسجد شاہجہانی دہلی کا ڈیزائن بنایا جو زندۂ جاوید شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے ۔ عبدالحق شیرازی نے تاج محل کی محرابوں کی کتابت کر کے دنیا کو دائمی طور پر حیرانی میں ڈال دیا ۔

ایسے لوگ اکثر اپنے زمانے میں گمنام ہوتے ہیں بعد کو دنیا ان سے باخبر ہوتی ہے ۔ ایسی ہی ایک شخصیت سید احمد رام پوری (۸۱ سال) کی ہے جو خطاط اور گذشتہ ہونے کے ساتھ قدیم اسلامی تعمیری نمونے کے دلدادہ ہیں ۔ بڑے بڑے آرکیٹکٹ جو اسلامی تعمیرات کام شروع کرتے ہیں ، وہ عمارت کی فنی آراستگی کے سلسلے میں سید صاحب کو بلا کر ضرور مشورہ کرتے ہیں اور ان کے ماہرانہ مشوروں سے فائدہ اٹھاتے ہیں ۔

الخدمات الاستشاریۃ الہندسیۃ کے چیف آرکیٹکٹ مسٹر پارتھا گھوش ان کے بارے میں لکھتے ہیں :

"مسٹر سید احمد اسلامی تعمیری کام میں ہمارے بہت بڑے معاون ہیں وہ قدیم تعمیری سجاوٹ کے بہت مشورہ دینے والے اور اس کو خود کر کے دکھانے والے ہیں"

ایک تحریر میں سلطان مسقط کی شاہی عمارات کے ڈائرکٹر لکھتے ہیں : "مسٹر سید احمد نے اسلامی تعمیر انداز کے جدید و قدیم اسلوب کے بارے میں اہم

ڈپارٹمنٹ کو جو مفید مشورے دیئے ہیں اور خطاطی اور عربی ڈیزائن کا کام جس طرح انجام دیا ہے وہ بلاد عرب کے لوگوں کی نگاہ میں قابل صد مبارکباد ہے۔"

اسیما آرکٹکٹ کے روح رواں مسٹر ایم۔ یو۔ خان تحریر فرماتے ہیں: "سید احمد اپنے بعد اس دنیا میں ایسے فنی نقوش چھوڑ کر جائیں گے جو آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے حیرت کا سبب ہوں گے۔" آگے لکھتے ہیں: حضرت بل کی طویل ترین عمارت جس کی لمبائی ۱۳۰ فٹ آٹھ انچ اور چوڑائی ۲ ½ فٹ تھی، اس پر جب اسمار باری تعالے لکھے گئے اور دور سے دیکھا تو گمان گزرا عبدالحق شیرازی دوبارہ زندہ ہو گئے ہیں۔"

سید احمد رام پوری چند برسوں سے عربی خط کے ماخذ کے موضوع پر ایک تاریخ لکھ رہے ہیں۔ اس میں وہ بتانا چاہتے ہیں کہ موجودہ عربی خط کتنی کروٹوں اور اشتقاق کے بعد ہم تک موجودہ صورت میں پہنچا ہے۔ وہ رات دن اس کے مطالعہ میں اور مضامین اور خط کے ہزاروں نمونوں کی تیاری میں دنیا و مافیہا سے بے خبر لگے رہتے ہیں۔ وہ ہر قدیم عمارت میں جاکر ان کی عبارتوں کو پڑھتے ہیں اور اس پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ عربی خط کی تاریخ پر ان کی کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ صرف قدیم و جدید خطوط کے ڈیزائن کرنے میں ان کو پانچ برس گزر چکے ہیں۔ ان صفحات میں ہم سید صاحب کی کتاب کے خط کے دو نمونے ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ ایک نمونہ خط کوفی ابسس کا ہے، اور دوسرا ثلث کے طغری کے انداز کا۔ محض اپنے شوق کے تحت اس طرح کے فنی کام میں اس طرح مسلسل لگے رہنے کا مثال بہت کم ملے گی۔

سید احمد صاحب فن خطاطی کی تاریخ اور قدیم اسلامی آرٹ کی جیتی جاگتی انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ آپ ان کے سامنے کسی بھی زمانہ کی تعمیرات اور خطاطی کا ذکر کریں وہ آپ کے سامنے قدیم فنی کمالات کے حیرت انگیز انکشافات کریں گے، خواہ وہ گفتگو قصر الحمرا پر ہو یا تاج محل آگرہ پر۔ ترمذ اور خیوا کی اسلامی عمارات ہوں یا دہلی کی قدیم اسلامی تعمیرات، ان سب کے آرکیٹکچر، کنسٹرکشن اور ڈیکوریشن کے بارے میں ڈیزائن کے ذریعہ آپ کو مطمئن کر دیں گے۔ سید احمد صاحب ہمہ وقت انھیں چیزوں کی کھوج میں لگے رہتے ہیں۔ ان کے حلیہ کو دیکھ کر کوئی بھی نفسیاتی ماہر ان کو فن کار یا محقق نہیں کہہ سکتا۔ وہ سیدھا سادا لباس پہنتے ہیں اور دنیا کی بھیڑ سے دور رہنا پسند کرتے ہیں۔

ان کا دعویٰ ہے کہ کسی بھی دور کا عمارتی تزئین کا کام ہو وہ اس کو خود کر کے دکھا سکتے ہیں۔ سید احمد صاحب ہندوستان میں گم نامی کی زندگی بسر کرتے ہیں ان کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس قدر عظیم ہیں۔ وہ وقت نزدیک ہے جب آپ کے سامنے سید احمد صاحب کی برسہا برس کی محنت کتابی شکل میں آپ کے ہاتھوں میں ہوگی۔

"لا غالب الا اللہ" کا یہ طغریٰ کوفی خط میں ہے۔ سلطان قابوس والی عمان ومسقط کی مسجد النور کی چھت اسی سے مزین کی گئی ہے۔ ۴ × ۴ فٹ کے سائز کے طغرے کا یہ ڈیزائن سید احمد صاحب رام پوری نے تیار کیا تھا۔





بڑے امکانات آپ کا انتظار کر رہے ہیں

موجودہ وسائل سے آپ زیادہ نفع حاصل کر سکتے ہیں

کچھ لوگوں کے ساتھ ایک بار بستی (اتر پردیش) جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ہارٹی کلچر کے تحت حکومت کا بہت بڑا باغ ہے جس میں ہر قسم کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ ڈائرکٹر صاحب نے ہماری تواضع کے لئے چند گلاس رس منگوائے۔ ہم نے پیا تو وہ بہت لذیذ تھا۔ ڈائرکٹر صاحب نے بتایا کہ یہ تازہ امرود کا رس ہے جو ابھی ابھی درخت سے توڑ کر نکالا گیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اتر پردیش میں کثرت سے باغات ہیں مگر باغات کے مالک ان سے پورا فائدہ نہیں اٹھاتے۔ وہ باغ کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ کھیتوں میں درخت لگا کر چھوڑ دیا جائے اور فصل کے موقع پر پھل فروخت کر دیے جائیں حالانکہ جس طرح غلہ کی فصل کی دیکھ بھال اور آب پاشی کی جاتی ہے اسی طرح باغوں کی بھی ہونی چاہئے۔ اس طرح آپ بہت زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

پھر انھوں نے بتایا کہ ملک کے اندر اور باہر پھلوں کے رس کی بہت مانگ ہے۔ اگر کارخانے قائم کر کے پھلوں سے رس نکالے جائیں اور ان کو معیاری انداز سے پیک کر کے بازار میں لایا جائے تو بہت اچھا منافع کیا جا سکتا ہے۔ مصنوعی مشروبات جو آج کل بازار میں چل رہے ہیں ان سب سے زیادہ اس کو مقبولیت حاصل ہوگی اور پھر اس طرح آپ قوم کی صحت کا معیار بہتر بنانے میں بھی مددگار بن سکتے ہیں۔

یہ پندرہ سال پہلے کی بات تھی، اب پھلوں کا رس نکالنے کے متعدد کارخانے ملک میں قائم ہو چکے ہیں

شملہ۔ کالکا شاہراہ پر ایک مقام ہے جابلی۔ یہاں پھلوں کے رس کی ایک فیکٹری قائم کی گئی ہے۔ یہ فیکٹری جدید ترین طرز کی ہے۔ یہاں ہر سال سیب کے رس کے دو ملین پیکٹ تیار ہوا کریں گے۔ ۲۵ راگست ۱۹۷۷ء کو ہماچل پردیش کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر پرمار نے اس کا افتتاح کیا۔ یہ فیکٹری کوا پریٹو سیکٹر سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی لاگت ۷۰ لاکھ ۸۰ ہزار ہے یہاں پھلوں کے جو رس تیار ہوں گے وہ زیادہ تر باہر بھیجے جائیں گے۔ خلیج کے ملکوں میں اس کی بہت مانگ ہے۔

میں کوآپریٹو سوسائٹی نے اس کو بنایا ہے۔ اس میں ۲۵ باغات کے مالک اور دو چھوٹی چھوٹی کوآپریٹو سوسائٹیاں شامل ہیں۔ اس فیکٹری میں حکومت نے ۴۹۰۰۰۰۰ روپے دیئے ہیں اور بقیہ سرمایہ نجی اداروں سے حاصل کیا گیا ہے۔ فیکٹری روزانہ پانچ ٹن رس تیار کر سکتی ہے۔ اس میں زیادہ تر سیب کا رس تیار ہوگا۔ اس کے علاوہ دوسرے پھلوں کا رس بھی نکالا جائے گا۔ اس میں جام، جیلی، چٹنی وغیرہ بھی تیار ہوں گی۔ اور تازہ پھل صحت بخش طریقوں کے مطابق ڈبوں میں پیک کئے جائیں گے۔ فی الحال فیکٹری میں کام کرنے والوں کی تعداد ایک سو ہوگی۔

فیکٹری کی بلڈنگ ۱۴ لاکھ روپے میں تیار ہوئی ہے۔ چار لاکھ روپے پانی، بجلی اور سڑک کی مد میں خرچ ہوں گے۔ یہ منصوبہ مکمل طور پر ملکی ماہرین نے تیار کیا ہے۔ ۷۲-۱۹۷۱ میں جب ابتداءً اس کا منصوبہ بنایا گیا تو اندازہ تھا کہ وہ ۲۶ لاکھ روپے میں بن جائے گی۔ اس فیکٹری کے ساتھ ایک کولڈ اسٹوریج بھی بنایا گیا ہے، تاکہ فصل کے زمانہ میں اس کے اندر پھل محفوظ کر لئے جائیں اور موسم کے بعد فیکٹری کے کام آ سکیں۔ اس میں بیک وقت ۵۰۰ ٹن پھل رکھے جا سکتے ہیں۔

نئے طریقوں سے کام کرنے کے لئے سرمایہ کہاں سے آئے؟ اس کا جواب کوآپریٹو ہے۔ ایک ہزار آدمیوں کے پاس ایک ایک ہزار روپے ہوں تو وہ محض اپنے سرمایہ سے کوئی بڑا کام نہیں کر سکتے۔ مگر یہی لوگ اپنا اپنا سرمایہ ایک مشترک کمپنی میں لگا دیں تو ان کا سرمایہ دس لاکھ روپے ہو جاتا ہے اور پھر وہ کوئی بھی کام کر سکتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں تمام بڑے بڑے کاروبار مشترک سرمایہ ہی سے چل رہے ہیں۔ مل جل کر کام کرنا ہمیشہ بابرکت ہوتا ہے خواہ وہ دین کے معاملہ میں ہو یا دنیا کے معاملہ میں۔

الرسالہ اکتوبر ۱۹۷۷

طرابلس کی ایک تقریر

طرابلس کے دو ماہہ قیام (فروری مارچ ۱۹۷۷) میں وہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو تقریباً ایک درجن مواقع پر خطاب کرنے کا موقع ملا۔ یہاں ایک تقریر کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔ یہ طرابلس کو کی گئی تھی اور خود ہمارے لئے بھی سبق آموز ہے۔

طرابلس کے متحف (میوزیم) میں ایک بکری رکھی ہوئی ہے جس کی گردن کے اوپر دو سر ہیں۔ اس کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے کہا، اگر ایک شخص اس کو دیکھ کر آئے اور آپ اس سے پوچھیں کہ سب سے عجیب چیز متحف میں تم نے کیا دیکھی۔ تو شاید وہ جواب دے گا کہ "دو سروں والی بکری"۔ مگر میں آپ سے کہتا ہوں کہ میں نے سب سے عجیب چیز جو دنیا میں دیکھی وہ دو سروں والے انسان ہیں۔ طرابلس کے متحف میں تو صرف ایک ایسی بکری ہے جس کے دو سر ہیں۔ مگر میں نے اپنی ساری عمر میں جتنے انسان دیکھے سب دو سر رکھنے والے انسان تھے۔

آپ شاید تعجب کریں۔ ممکن ہے آپ میں سے کوئی کہے کہ اس شخص کو تقریر کی مجلس میں کھڑا کرنے کے بجائے آنکھ کے اسپتال میں بھیجنا چاہئے۔ آپ جو بھی سمجھیں، مگر یہ ایک واقعہ ہے کہ مجھے کوئی ایک سر کا انسان دکھائی نہیں دیتا۔

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اس کو مثال سے سمجھئے۔ آپ کا ایک لڑکا ہے۔ آپ اس کو کامیاب ڈاکٹر دیکھنا چاہتے ہیں آپ کیا کریں گے۔ آپ اس کو اسکول میں داخل کریں گے۔ بیالوجی کے ساتھ ہائی اسکول کرائیں گے۔ پھر بی۔ ایس۔ سی کرائیں گے۔ پھر اس کو ایم بی بی ایس کے کورس میں داخل کریں گے۔ پھر آپ کی کوشش یہ ہوگی کہ اس کو ایف آر سی ایس کرنے کے لئے لندن بھیجیں۔ ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد ہی آپ یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے دنیا میں اپنی جگہ

جو بات ایک شخص اپنی ذات کے بارے میں جانتا ہے وہی بات قوم کے بارے میں بھول جاتا ہے

بنائے۔ آپ میں سے کوئی شخص ایسا نہیں کرے گا کہ وہ اپنے لڑکے کو یوں ہی چھوڑ دے کہ وہ کھیلتا کودتا رہے۔ اس کے بعد جب وہ ۲۵ برس کا ہو جائے تو اس کا باپ اس کو ڈاکٹر بنانے کے حق میں پرجوش تقریریں شروع کر دے، وہ حکومت کو تار بھیجے کہ میرے لڑکے کو اسپتال میں سرجن مقرر کرو۔ یا یہ کہ اس کو "پس ماندہ" قرار دے کر ڈگری کے بغیر ڈاکٹر تسلیم کرلو۔ آپ میں سے ہر شخص خوب جانتا ہے کہ ڈاکٹر بننے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا لڑکا تعلیمی اور تربیتی کورس کو پورا کرے۔ محض مطالبہ کرنے سے کوئی شخص کبھی ڈاکٹر نہیں بن سکتا۔ یہ دنیا استحقاق کی دنیا ہے مطالبات کی دنیا نہیں۔

مگر یہی بات جو ہر آدمی اپنے ذاتی معاملہ میں جانتا ہے، قومی معاملہ میں وہ اس سے بے خبر ہے، جہاں کسی شخص کو قوم کا درد اٹھا اور وہ اصلاح کے میدان میں کھڑا ہوا، فوراً ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر ایک اور سر پیدا ہو گیا ہے جو بالکل دوسرے ڈھنگ سے سوچتا ہے۔ اب وہ "تیاری" کے بجائے "مطالبہ" کو کامیابی کا راز سمجھنے لگتا ہے۔ مفروضہ حریف کے خلاف پرجوش تقریریں کرنا، تار اور میمورنڈم بھیجنا، مطالبات کے ریزولیوشن پاس کرنا، بین اقوامی اداروں میں اپنا کیس لے جانے کی اسکیمیں بنانا، یہی اس کی تمام سرگرمیوں کا خلاصہ ہوتا ہے۔ وہی شخص جو اپنی اولاد کے بارے میں جانتا تھا کہ کامیابی صرف اس طرح ملتی ہے کہ پہلے اس کے لئے صلاحیت اور استعداد پیدا کی جائے، وہی شخص قوم کی اولاد کے بارے میں اپنی ساری سرگرمیوں کا نقشہ اس طرح بناتا ہے گویا تقریر اور مطالبات ساری کامیابیوں کا راز ہیں۔ یہ لاحاصل جدوجہد بالآخر جب ناکام ہو جاتی ہے تو وہ ہمت نہیں ہارتا۔ اب وہ اپنی مطالباتی مہم کو جاری رکھنے کے لئے نیا لفظ ڈھونڈ لیتا ہے، "ہم کو پس ماندہ قرار دے کر استحقاق کے بغیر ہی تمام مناصب پر بٹھا دو"۔ ایسے لوگوں کو اس کے سوا کیا کہا جائے کہ وہ دو سر رکھنے والے لوگ ہیں۔

اس مزاج کے معاملہ میں کسی مسلم قوم کی کوئی خصوصیت نہیں۔ ہر علاقہ کے مسلمان اسی دُہری ذہنیت کا شکار ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کسی کا "دوسرا سر" ایک کے خلاف کام کر رہا ہے، کسی کا دوسرے کے خلاف۔

مزید حیرت ناک بات یہ ہے کہ اس قسم کے الفاظ بولنے والوں کو لوگ رہنما سمجھتے ہیں اور ان کو قائد ملت، مجاہد قوم امام العالم جیسے خطابات سے نوازتے ہیں۔ گویا خواص ہی نہیں خود عوام بھی دو سر رکھنے والے لوگ ہیں۔ ایک ذاتی معاملہ کے لئے۔ دوسرا قومی معاملہ کے لئے۔ کوئی نہیں جو ایک سر سے سوچنا جانتا ہو ——— ایسی حالت میں اگر میں کہوں کہ میں نے اپنی عمر میں جتنے انسان دیکھے، سب دو سر والے انسان دیکھے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

سبق آموز

حضرت حمید الدین ناگوری شیخ طریقت ہونے کے ساتھ عالم اور محدث بھی تھے۔ ان کے ایک مرید آئے اور طریقت کی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے فرمایا: "ان دنوں میں حدیث کی تعلیم دینے میں بہت زیادہ مشغول ہوں۔ میرے پاس طریقت کی تعلیم کے لئے وقت نہیں"۔

تاریخ کا ایک سبق

قدیم ترکی میں دو شخصیتیں علمی و فکری حیثیت سے انتہائی نمایاں نظر آتی ہیں۔ ایک نامق کمال (۱۸۸۸–۱۸۴۰) دوسرے ضیا گوک الپ (۱۹۲۴–۱۸۷۵) دونوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ دونوں ترکی کے علاوہ عربی اور فرنچ زبانیں جانتے تھے۔ انیسویں صدی کی مسلم دنیا کی دوسری تمام شخصیتوں کی طرح اگرچہ یہ دونوں ہی سیاست سے متاثر تھے۔ اور سیاسی انقلاب کو سب سے بڑا کام سمجھتے تھے۔ تاہم دونوں میں یہ فرق تھا کہ نامق کمال نسبتاً معتدل اور متوازن فکر کے آدمی تھے۔ وہ عملی سیاست سے متاثر ہونے کے باوجود اسلامی اصطلاحوں میں سوچتے تھے اور "ترک اتحاد" کے بجائے "اسلامی اتحاد" کے الفاظ بولتے تھے۔ مزید یہ کہ نامق کمال کو ترکی کی جدید نسل میں مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ خالدہ ادیب خانم نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

> "نامق کمال ترکی جدید کی محبوب ترین شخصیت تھی۔ ترکی کے افکار و سیاسیات کی تاریخ میں ان سے زیادہ کسی دوسری شخصیت کی پرستش نہیں کی گئی"

Halde Edib, Turkey Faces West, P.84

دوسری طرف ضیا گوک الپ ایک آزاد خیال آدمی تھا۔ اس کے فکری نظام میں اسلام بنیادی عامل کی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اس نے دعوت دی کہ ترکی کی تعمیر نو خالص قومی اور مادی بنیادوں پر کی جائے۔ وہ اسلامی تہذیب کے بجائے مغربی تہذیب کا پرجوش علم بردار تھا۔

ترکی کی بعد کی تاریخ بتاتی ہے کہ ترکی میں نامق کمال جیسے لوگوں کے افکار کو غلبہ نہیں ملا۔ بلکہ ضیا گوک الپ جیسے لوگ عملاً وہاں کی سیاست و قیادت پر چھا گئے۔ اس کی کم از کم ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ضیا گوک الپ کے افکار کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کمال اتاترک (۱۹۳۸–۱۸۸۱) جیسا طاقتور اور مضبوط ارادہ کا آدمی مل گیا تھا۔

وہ اسلام پر کتاب لکھ رہے ہیں

ڈاکٹر آر۔ پی۔ ترپاٹھی مغل تاریخ پر سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب ہسٹری آف دی مغلس نے اپنے موضوع پر غیر معمولی شہرت حاصل کی ہے۔ وہ اردو، فارسی ہندی، سنسکرت اور انگریزی زبانوں سے بخوبی واقف ہیں۔ آج کل وہ لندن کے قریب اسکس میں مقیم ہیں اور اسلام پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں ۸۶ سال کی عمر کے باوجود وہ چار سال سے ہر روز کم از کم سات مکمل گھنٹے مطالعہ میں صرف کرتے ہیں

[illegible] مذہب کے بارے میں اپنی کتاب کے لیے [illegible] سکیں۔

[illegible] ترپاٹھی کی ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی جہاں ان کے والد سرکاری ملازمت میں تھے۔ بنارس یونیورسٹی سے انھوں نے ایم۔ اے کیا۔ اس کے بعد الہ آباد یونیورسٹی میں لکچرر کی جگہ مل گئی۔ اسی زمانہ میں ایک بار ایسا ہوا کہ ایک انگریز افسر نے اتفاقاً ان کا لکچر سنا۔ اس لکچر سے وہ متاثر ہوا اور اس نے اس کا اعتراف اس طرح کیا کہ لندن کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں ان کو اسکالرشپ دلوادی۔ یہ ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے مگر جب وہ لندن پہنچے تو اسکول کے پرنسپل نے کہا کہ میں آپ کو براہ راست ریسرچ میں داخلہ نہیں دے سکتا۔ پہلے آپ کو ہمارے یہاں سے ایم۔ اے کا امتحان پاس کرنا ہوگا۔

ڈاکٹر ترپاٹھی کو پرنسپل کی بات پسند نہیں آئی۔ وہ مشہور پروفیسر لاسکی سے ملے اور ان کو ساری بات بتائی۔ پروفیسر لاسکی نے کہا کہ آپ کسی بھی اپنے پسندیدہ موضوع پر ایک مضمون لکھ کر مجھ کو دکھایئے۔ انھوں نے مغل ایڈمنسٹریشن پر دس صفحات کا ایک مضمون لکھ کر پیش کیا۔ پروفیسر لاسکی کو وہ مضمون پسند آگیا۔ انھوں نے ان کے اسی مضمون پر انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دیدی۔ اور پھر لندن اسکول آف اکنامکس میں ان کو ریڈر کی جگہ دلوادی۔ جو اس زمانہ میں کسی ہندوستانی کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ وہ ۲۰ سال تک اس اسکول میں ریڈر اور پھر پروفیسر رہے۔

Dr. R.P. Tripathi
Hornchurch
Essex, England

ڈیڑھ سو برس پہلے

سرسید کی کتاب آثار الصنادید پہلی بار ۱۸۴۷ء میں چھپی تھی۔ اس میں انھوں نے دہلی کی جامع مسجد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

دروازہ شمالی اس مسجد کا پائے والوں کے بازار کی طرف واقع ہے۔ اگرچہ اس طرف بھی کبابی بیٹھتے ہیں اور سودے والے دکانیں لگاتے ہیں۔ لیکن بڑا تماشا اس طرف مداریوں اور قصہ خوانوں کا ہوتا ہے تیسرے پہر ایک قصہ خواں مونڈھا بچھاتے ہوتے بیٹھتا ہے اور داستان امیر حمزہ کہتا ہے۔ کسی طرف قصہ حاتم طائی اور کہیں داستان بوستان خیال ہوتی ہے اور صدہا آدمی اس کے سننے کو جمع ہوتے ہیں۔ ایک طرف مداری تماشا کرتا ہے اور بھان متی کا کھیل ہوتا ہے۔ اور بوڑھے کو جوان اور جوان کو بوڑھا بناتا ہے۔ صفحہ ۲۷۸

یہ انیسویں صدی کے وسط میں دہلی کے مسلم عوام کا حال تھا۔ خواص کا حال وہی تھا جو بشار بن برد (م ۱۶۷ھ) نے بنو امیہ کے بارے میں کہا تھا۔

ضاعت خلافتکم یا قوم فالتمسوا　　　خلیفۃ اللہ بین الزق والعود

اے قوم تمہاری خلافت ضائع ہو گئی۔ اب حال یہ ہے کہ اگر تم اپنے خلیفہ کو تلاش کرنا چاہو تو اس کو شراب و ستار کی محفل میں پاؤ گے

ایک سفر

۱۹ جنوری ۱۹۷۶ کو نئی دہلی کے لیبی سفارت خانہ کے پریس ایڈوائزر نے مجھے بتایا کہ حکومت لیبیا نے آپ کو ندوۃ الحوار الاسلامی المسیحی (۱-۵ فروری ۱۹۷۶ء) میں شرکت کے لئے مدعو کیا ہے۔ ۲۲ جنوری کو لیبی سفیر ڈاکٹر رجب الزروق سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے فوراً ہی ویزا اور ضروری کاغذات دے دیئے۔ دیگر رسمی کارروائیوں سے گزرنے کے بعد ۳۰ جنوری کو ایر انڈیا کے بوئنگ ۷۴۷ سے روانگی ہوئی کویت اور روم ہوتے ہوئے یکم فروری کو ہم طرابلس کے ہوائی اڈہ پر اترے۔

اس قسم کا سفر میرے لئے ہمیشہ وحشت کا باعث ہوتا ہے۔ ہم دہلی کے ہوائی اڈہ کی عمارت میں داخل ہوئے اور "صنعتی پنجروں" کی زندگی شروع ہوگئی۔ ہوائی اڈہ سے ہوائی جہاز میں، ہوائی جہاز سے کار میں، کار سے ہوٹل میں، ہوٹل سے آڈیٹوریم میں۔ غرض صنعتی تمدن کے پیدا کردہ خوبصورت پنجروں کا ایک غیر مختتم سلسلہ تھا اور ہم ایک سے دوسرے میں منتقل ہو رہے تھے۔ مشینوں کے معجزنے سائنسی کاریگری کے جلوے اور ٹکنکل ترقیوں کے کمالات کے درمیان خود انسان ایک غیر اہم وجود بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر ترقی یہی ہے تو یہ ترقی انسان کو انتہائی مہنگی قیمت پر ملی ہے۔ کھلی دھوپ، تازہ ہوا اور قدرت کی فضا سے محروم ہو کر ہم ایک مصنوعی زندگی میں بند ہوگئے ہیں۔ یہ زندگی بظاہر کتنی ہی حسین اور چمک دار نظر آتی ہو وہ ہماری فطرت کے مطابق نہیں۔ انسان جب قدرتی ماحول میں ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ سے بھی قریب ہوتا ہے اور خدا سے بھی۔ جب کہ صنعتی تمدن کے ماحول میں وہ دونوں چیزوں سے دور ہو جاتا ہے۔

مختلف مذاہب کے مشترکہ اجتماعات میں اسلام کی نمائندگی کرنے کا موقع مجھے کئی بار ملا ہے:

۱۔ آل مذاہب کانفرنس، سیوہارہ (بجنور)	نومبر	۱۹۶۹
۲۔ وشو دھرم سمیلن، الہ آباد	مئی	۱۹۷۰
۳۔ ورلڈ فیلوشپ آف ریلیجنز، نئی دہلی	فروری	۱۹۷۵
۴۔ مذہب، اخلاق، قانون پر انٹرنیشنل سیمینار، نئی دہلی	دسمبر	۱۹۷۴
۵۔ ندوۃ الحوار الاسلامی المسیحی، طرابلس	فروری	۱۹۷۶

طرابلس کے سیمینار کی خصوصیت یہ ہے کہ اس موقع پر دنیا کے دو سب سے بڑے مذاہب اس لئے جمع ہوئے کہ وہ باہم اتفاق کی بنیادیں تلاش کریں اور ایک مسیحی کے الفاظ میں "ماضی کو غرفۃ المحفوظات میں ڈال دیں"۔ اگرچہ یہ ایک واقعہ ہے کہ اس قسم کی کسی کوشش سے فائدہ وہی گروہ اٹھا سکتا ہے جو اس سے پہلے اپنی کوئی مثبت جدوجہد منظم کر چکا ہو اور اس کو باقاعدہ چلا رہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ویٹیکن نے اس موقع پر حکومت لیبیا سے یہ اجازت حاصل کر لی کہ وہ بن غازی میں اپنا ایک چرچ قائم کرے۔ جب کہ مسلمان اس سیمینار سے اس قسم کا کوئی ٹھوس فائدہ حاصل نہ کر سکے۔

سیمینار کا خاص مقصد دونوں مذاہب کے درمیان متفقہ بنیاد تلاش کرنا تھا۔ سب سے زیادہ طویل گفتگو جس مسئلہ پر ہوئی وہ یہ کہ مذہب کا تصور کیا ہے۔ مسلم جانب کا زور اس پر تھا کہ مذہب ایک مکمل قانون ہے۔ زندگی کے تمام معاملات اس کے دائرہ میں شامل ہیں۔ اس کے برعکس مسیحی جانب کا کہنا تھا کہ مذہب ایک روحانی چیز ہے، وہ بطور ایک قوت محرکہ کے انسان کی سرگرمیوں میں شامل رہتا ہے۔ مگر قوانین و ضوابط کی شکل میں وہ اپنا کوئی مخصوص ڈھانچہ نہیں رکھتا۔ کچھ لوگوں نے یہ بحث چھیڑ کر مجلس میں کافی گرمی پیدا کی کہ عیسائی حضرات فلسطین اور اس قسم کے دوسرے معاملات میں کھل کر مسلمانوں کی حمایت کیوں نہیں کرتے۔

میں نے اپنی تقریر میں اس پر زور دیا کہ "اس قسم کے

تمام مسائل ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اصل سوال اسلام کے مذہبی استناد کو تسلیم کرنے کا ہے جس کا عیسائی حضرات اب تک انکار کرتے رہے ہیں۔ اگرچہ ایسے عیسائی کثیر تعداد میں موجود ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو بطور واقعہ تسلیم کرتے ہیں۔ مگر ان کا یہ ماننا انفرادی طور پر ہے، کلیسا نے ابھی تک اس کو نہیں مانا ہے۔ لیبیا کے ایک پادری نے اپنی تقریر میں اعلان کیا کہ میں حضرت محمد کو سچا رسول مانتا ہوں۔ مگر ویٹیکن کے نمائندہ نے یہ کہہ کر اس کی تردید کر دی کہ یہ ان کی انفرادی رائے ہے۔ تاہم اس نے کہا کہ ویٹیکن نے ایک کمیٹی خاص اس مقصد کے لئے مقرر کی ہے جو اس بات کا جائزہ لے رہی ہے کہ کیا ہم حضرت محمد کی نبوت کو بطور واقعہ تسلیم کر سکتے ہیں۔

راقم الحروف نے اپنے مقالہ میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ وہ بنیادی نکتہ جہاں سے مسلمان اور عیسائی ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں، وہ "فارقلیط" کی تعبیر کا اختلاف ہے۔ یوحنا کی انجیل صاف طور پر بتاتی ہے کہ حضرت مسیح نے اس دنیا سے جاتے ہوئے اپنے شاگردوں سے کہا کہ میرے بعد خدا ایک تسلی دہندہ (یا ستودہ صفات) بھیجے گا جو ابد تک تمہارے ساتھ رہے گا۔ وہ کل سچائی کو ظاہر کرے گا، وہ دنیا کا سردار ہوگا، وہ ان باتوں کو بھی بتائے گا جو میں نے نہیں بتائیں۔

یہ اور اس طرح کی دوسری پیشین گوئیاں حضرت مسیح کے بعد کی شخصیتوں میں جس کے اوپر صادق آتی ہیں، وہ صریح طور پر پیغمبر اسلام کی ذات ہے۔ مگر مسیحیوں نے "تسلی دہندہ" کو روح القدس قرار دے کر سارے مفہوم کو الٹ دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ تسلی دہندہ روح القدس کی شکل میں حضرت مسیح کا پر ایمان والے کے اوپر آتا ہے اور ان کے ذریعہ ان سچائیوں کو ظاہر کرتا ہے جو حضرت مسیح نے نہیں بتائیں۔ اس تعبیر کے ذریعہ انھوں نے ان تمام اضافوں کو حق بجانب قرار دینے کا جواز ڈھونڈھ لیا جو حضرت مسیح کے بعد ان کے ماننے والوں نے حضرت مسیح کے مذہب میں کئیں۔ اس نے کلیسا کو حضرت مسیح کا دائمی اور مستند نمائندہ بنا دیا۔ اس طرح انھوں نے اپنے آپ کو اس آخری اور ابدی سچائی سے محروم کر لیا جو پیغمبر اسلام کے ذریعے ظاہر کی گئی ہے۔ "فارقلیط" کی صحیح تعبیر کی جائے تو اس سے نبوت محمدی کا اثبات ہوتا ہے اور اس کی غلط تعبیر کی جائے تو اس سے کلیسا کا مذہب برآمد ہو جاتا ہے۔

تاہم مسیحی جانب نے اس نقطہ نظر سے بچنے کی کوشش کی اس کی کوشش یہ رہی کہ اس اختلافی بحث کو نظر انداز کر کے اتفاق کی مشترک بنیادیں تلاش کی جائیں۔

مسیحی جانب کے بعض ذہین لوگوں نے یہ کوشش کی کہ مسیحیت کے جو عقائد اسلام کی نظر میں قابل اختلاف ہیں ان کی ایسی خوبصورت تاویل کی جائے کہ وہ قابل قبول نظر آنے لگیں۔ مثلاً مسیح کے ابن اللہ ہونے کا معاملہ۔ ایک مسیحی نمائندہ ڈاکٹر شوبیل نے کہا کہ مسیح کے ابن اللہ ہونے کا مطلب دراصل بشریت کے اعلیٰ معیار کو ممثل کرنا ہے۔ انسان ایک بشر کی حیثیت سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر اپنے اعلیٰ کردار کے ذریعہ اس کو خدا جیسا بننا ہے۔ مسیح کا خدا کا بیٹا ہونا اعلیٰ ترین انسانی بلندی کی تمثیل ہے۔ مگر یہاں فوراً یہ سوال تھا کہ مسیح کا ابن اللہ ہونا اگر تمثیلی معنوں میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان خدا کا بیٹا بن سکتا ہے۔ اس تعبیر کے بعد کفارہ کے عقیدہ کے لئے کوئی بنیاد نہیں رہتی جس پر موجودہ مسیحیت کی ساری عمارت قائم ہے ایک ملاقات میں جب میں نے ڈاکٹر شوبیکل کے سامنے یہ سوال رکھا تو انھوں نے کہا کہ یہ نقطہ نظر بلاشبہ ویٹیکن کے سرکاری عقیدہ کے خلاف ہے۔ مگر ہمارے یہاں فکری آزادی ہے۔

وہ واحد مسئلہ جس پر دونوں فریقوں کا سب سے زیادہ اتفاق ہو سکا وہ "انحراف الشباب فی جانبین" مسئلہ تھا یعنی مسلم اور عیسائی دونوں معاشروں کا مشترک مسئلہ

ہے کہ نوجوان طبقہ مذہبی روایات سے کٹ کر الحاد کی طرف چلا جا رہا ہے۔ متفقہ طور پر یہ رائے سامنے آئی کہ اس مسئلہ کے مقابلہ کے لئے دونوں کو مل کر کام کرنا چاہئے۔ مگر اس معاملہ میں کوئی ٹھوس پروگرام وضع نہ کیا جا سکا۔ ایک صاحب نے "بدء الحوار مع الملحدین" کی تجویز پیش کی۔ یعنی جس طرح مسلمان اور عیسائی یہاں بیٹھ کر گفتگو کر رہے ہیں، اسی طرح ملحدین سے بھی گفتگو کا آغاز کیا جائے۔ مگر یہ کوئی تجویز نہیں۔ اس قسم کی باتیں صرف یہ ثابت کرتی ہیں کہ مسئلہ کے احساس کے باوجود اس معاملہ میں ابھی تک زیادہ گہرائی سے سوچا نہیں جا سکا ہے۔

راقم الحروف کا تجربہ ہے کہ ۹۹ فی صد لوگ وقت اور موضوع کے حدود میں رہ کر بولنا نہیں جانتے۔ طرابلس کا سیمنار بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھا۔ بیشتر تقریریں اور مقالے غیر ضروری طور پر طویل اور موضوع سے ہٹے ہوئے تھے۔ ایک شخص کھڑا ہو کر یہ کہتا: انی لا احب الاطالة علیکم اور جب اس انتہا کے باوجود اس کی تقریر لمبی ہو جاتی تو آخر میں معذرت کرتا کہ: ایہا الاخوة اشکرکم علیٰ صبرکم۔ ایک شخص اصل موضوع سے ہٹ کر کسی دوسرے موضوع پر لمبی تقریر کر ڈالتا اور پھر یہ کہہ کر حاضرین کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا: وما اظن انی قد ابتعدت من الموضوع۔ کوئی شخص مقررہ وقت میں اپنی تقریر ختم کر دیتا تو یہ اتنی نادر چیز ہوتی کہ صدر جلسہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ الفاظ بھی ادا کرتا: شکر خاصة علیٰ تقیدہ بالوقت المحدد

ندوۃ الحوار الاسلامی المسیحی میں ایک جرمن پادری نے بائبل کے عربی ترجمہ کی خواہش ظاہر کی۔ اگلے دن انہوں نے نہایت عمدہ چھپائی اور نہایت عمدہ جلد کے ساتھ انجیل کا ایک نسخہ مجھے ہدیۃً پیش کیا۔ میں نے کہا۔ کیا مکمل بائبل عربی میں مل سکتی ہے۔ اس نے کہا ضرور۔ یہاں تو ہمارے پاس اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے۔ البتہ آپ اپنا پتہ دے دیں۔ ہم جرمنی سے بھجوا دیں گے۔

مسیحی مبشرین اپنی مقدس کتاب ہر زبان میں سارے عالم میں پھیلا رہے ہیں۔ کاش اسی طرح ہم قرآن کو ہر زبان میں ساری دنیا میں پھیلا سکیں۔

فروری کی ۳ تاریخ تھی اور شام ۶ بجے کا وقت۔ طرابلس کے مسرح التحریر میں ۷۰ سے زیادہ ملکوں کے تقریباً پانچ سو مسلمان اور عیسائی جمع تھے۔ اچانک کارروائی رک گئی۔ لوگ گیٹ کی طرف دوڑ پڑے۔ فوٹوگرافر بھاری بھاری کیمرے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے مسلسل شاٹ لینے لگے۔ معلوم ہوا کہ لیبیا کے صدر کرنل معمر قذافی آئے ہیں۔ وہ بالکل اچانک آئے تھے۔ لوگوں نے کوشش کی کہ ان کو ڈائس پر لے جائیں۔ مگر وہ عام لوگوں کے ساتھ ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گئے اور نہایت خاموشی کے ساتھ کارروائی سننے لگے۔

دبلا پتلا سا ایک آدمی، کھلا سر، کالے رنگ کا معمولی کوٹ پتلون جس پر ٹائی بندھی ہوئی نہیں تھی۔ ہر قسم کے نشان سے خالی ایک معمولی آدمی کی طرح اپنی کرسی پر خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

کارروائی بدستور جاری رہی۔ درمیانی وقفہ کے بعد دوسری نشست میں لوگوں نے صدر قذافی سے اصرار کیا تو وہ ڈائس پر گئے۔ وہاں بھی کسی امتیازی نشست پر نہیں بیٹھے بلکہ ایک عام کرسی پر بیٹھ گئے۔ درمیان میں تین بار سامعین نے لوگوں کی فرمائش پر تقریر کی۔ تینوں تقریریں سادہ الفاظ کے ساتھ کسی تمہید کے بغیر شروع ہوئیں اور بالکل اچانک ختم ہو گئیں۔ مسیحی جانب نے مذہب کا روحانی تصور پیش کیا تھا اور کہا تھا کہ مذہب کو حکومت وغیرہ کے معاملات میں دخل نہیں کرنا چاہئے۔ مذہب کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ قوت محرکہ (MOTIVE FORCE) کے طور پر تمام سرگرمیوں میں کام کرے۔ صدر قذافی نے اس کا جواب دیتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ واشنگٹن میں تو عیسائیوں کی حکومت قائم ہے وہ کیسے ہے۔

حوار مع «وحيد الدين خان» مؤلف «الإسلام يتحدى»

محمد سليمان
التايف

متى ... تم عب تقاليد أ... من أ... الدعوة للإسلام؟

وحيد الدين خان مفكر إسلامي .. مؤسس مدرسة إسلامية جديدة في الفكر الإسلامي المعاصر .. وهو رئيس تحرير « الجمعية الاسبوعية » اكبر المجلات الإسلامية في الهند واوسعها انتشارا . ومؤلف « الإسلام يتحدى » الذي يعد نهجا مستقلا في تقديم الإسلام باسلوب العصر وعلى ضوء العلم ونتائجه الباهرة . وهو مؤسس مدرسة إسلامية جديدة قوامها الدعوة الى الدين الإسلامي كما هو دون الخروج به الى ما تعكسه الظروف النفسية للمسلمين في العصر الحديث . وقوامها ايضا فهم العصر كما هو دون الخروج به الى ما تعكسه نفسيات المسلمين نتيجة للانبهار من جهة ونتيجة للجهل ايضا .

ان هذه المدرسة تؤمن بوجوب مواجهة التحديات التي يواجهها المسلمون بنفس المصطلحات والوسائل التي يستخدمها الاعداء .. ونبذ الاتجاه الى تحويل الإسلام من دعوة الى حزب سياسي . او من فكر روحي الى فكر سياسي او فكر ايديولوجي مركزا على النواحي العلمية في العصر باعتبارها المدخل الجديد لتقبل الإسلام . باعتباره الحقائق الوحيدة في هذا العالم في مجال العقيدة .

والمفكر الهندي هو الاخر صاحب مشروع المركز الإسلامي وقد عرض هذا المشروع في كتيب صغير بعد ان قام بدراسة ميدانية للتبشير في التاريخ الحديث .. وعمل اليابان واليهود في الولايات المتحدة الامريكية .

وقد جاءت قرارات مؤتمر الدعوة الإسلامية الذي انعقد في طرابلس الغرب في ديسمبر عام ١٩٧٠ اعمالا لهذا المشروع . وكذلك يوجد توافق كبير بين هذه المقترحات وبين قرارات المؤتمر الإسلامي الذي عقده المركز العام لجمعيات الشبان المسلمين في ابريل عام ١٩٧١ م .

ولقد كان لقاؤنا بهذا المفكر الهندي المسلم ابان انعقاد الحوار الإسلامي المسيحي في طرابلس، والذي حضره بصفته مراقبا . ونحن مع تقديرنا له لفتح قلبه لنا .. نتمنى ان يفتح القراء قلوبهم له فهو صاحب رغبة في ان يفهم فهما سليما بعيدا عن التصورات المسبقة التي تعوق ادراك الانسان عن الحكم الصحيح .

● هناك عدة مسائل نرغب في طرحها اودها تأملنا في مؤلفاتكم وبالذات « حكمة الدين » — اي اننا نريد ان نعرف عن ماذا تبنون رأيكم في المركز الإسلامي .. كمشروع يجب ان يقوم به المسلمون وتصوركم الشامل الذي عرضتموه في منشور خاص

لیبیا کے دوران قیام میں وہاں کے اخبارات کے نمائندوں نے صاحب مضمون سے ملاقاتیں کیں اور اس کی رپورٹیں شائع کیں۔ روزنامہ الفجر الجدید (طرابلس) کے ہفتہ وار ایڈیشن الاسبوع الثقافی (۲۶ مارچ ۱۹۷۶) میں جو تفصیلی انٹرویو شائع ہوا تھا اس کے ابتدائی حصہ کا چربہ مقابل کے صفحہ پر درج ہے۔ روزنامہ الجہاد (۵ فروری ۱۹۷۶) کے مضمون ملاقات کا پہلا پیراگراف یہ تھا

الجهاد الخميس ٥ من صفر ١٣٩٦

لقاءات سريعة

● من مفكري الاسلام المشاركين في اعمال المؤتمر الفكر الاسلامي وحيد الدين خان رئيس تحرير مجلة (الجمعية) التي تصدر في دلهي بالهند وصاحب الكتاب الشهير (الاسلام يتحدى) .

حول دراسته الاسلامية الجديدة قال (للجهاد) انه انتهى من اعداد دراسة شاملة تصدر في كتاب بعنوان (الاسلام) يبرز فيه [illegible] الباكستان كتاب ([illegible]) واحد [illegible]

جہازوں تک سے مسلح تھی، کوئی بھی کارروائی کرنے کی مکمل قوت رکھتی تھی مگر انھوں نے جان پر کھیل کر ریڈیو اسٹیشن پر قبضہ کر لیا اور اچانک اعلان کر دیا:

قامت قواتك المسلحة	آپ کی مسلح فوجوں نے
بالاطاحة بالنظام	رجعت پسند متخلف اور بدعنوان
الرجعي المتخلف المتعفن	حکومت پر قبضہ کر لیا ہے
وهكذا من الآن تعتبر	آج سے لیبیا آزاد اور
ليبيا جمهورية حرة	با اختیار ہوگا اور اس کا
ذات سيادة تحت اسم	نام ہوگا "جمہوریہ عربیہ
الجمهورية العربية	لیبیا"
الليبية (رئیس ابنی)	

اس سیمینار کا سب سے زیادہ مؤثر حصہ اس کا خاتمہ تھا۔ دونوں طرف کے نمائندوں نے نہایت مخلصانہ جذبات کا اظہار کیا۔ مسلم نمائندہ نے کہا: اذا مشيتم الينا ميلا مشينا اليكم ميلين، واذا اتيتم الينا مصافحين هرولنا اليكم معانقين۔ مسلم نمائندہ نے رواداری کی اہمیت بتاتے ہوئے کہا: نحن بما عندنا وانتم بما عندكم والكل راض۔ مسیحی نمائندوں کا رویہ بھی نہایت دوستانہ تھا۔ ایک مسلم نمائندہ نے اپنی تقریر میں بتایا کہ وہ فلاں مسیحی نمائندہ سے ملا تو گفتگو کے دوران اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کے بعد مسلم نمائندہ نے یہ آیت پڑھی: وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً

سیمینار کے بعد طرابلس میں دو ماہ قیام رہا۔ بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ بہت سے اجتماعات میں خطاب کرنے کا موقع ملا۔ اس کا ذکر علیحدہ تفصیل چاہتا ہے — ۸ فروری کو معمر قذافی (صدر جمہوریہ لیبیا) سے بھی ملاقات ہوئی۔ فوراً ہی انھوں نے کہا "میں آپ کی کتاب الاسلام يتحدى پڑھ چکا ہوں" عربی میں یہ کتاب اب تک دس سے زیادہ بار چھپ چکی ہے اور پورے عالم عرب میں پھیلی ہے۔ انھوں نے کتاب کو ایک عظیم کتاب بتایا۔ ملاقات کے دوران صدر قذافی نے اپنے ایک ساتھی سے راقم الحروف کا تعارف کراتے ہوئے کہا: هو مفكر ومؤلف كبير ونحن نقدره كا

الجہاد (طرابلس) ۸ فروری ۱۹۷۶

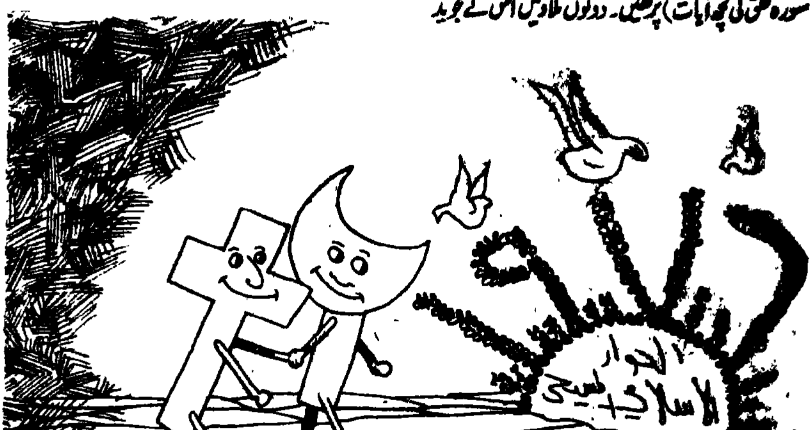
صدر قذافی انتہائی سادہ آدمی ہیں۔ بظاہر ان کو دیکھ کر کسی قسم کی عظمت کا تصور نہیں ہوتا "یہی وہ آدمی ہے جو لیبیا کا حکمراں ہے جس کے ہاتھ میں پیٹرو ڈالر کے خزانے ہیں" میں نے سوچا "اس معمولی سے آدمی میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس نے اس کو اس مقام تک پہنچایا" اور پھر میرے دل نے جواب دیا "خطرہ (RISK) مول لینے کی صلاحیت"۔ یکم ستمبر ۱۹۶۹ کو جب قاریونس کے معسکر (بیرک) سے اس معمولی افسر اور اس کے ساتھیوں نے بن غازی کی طرف مارچ کیا تو ہر لمحہ ان کے لئے موت کا لمحہ تھا۔ سابق شاہ ادریس جو اس وقت ترکی میں تھے حکمراں کی سکیورٹی فورس جو ہوائی

کانفرنسوں سے وہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جنھوں نے کانفرنس ہال کے باہر اپنی عمل بنیاد تیار کر رکھی ہو

یکن تیوا آمنوا ... (مائدہ ۸۲-۸۳) تاہم پیغمبر تکمیل دیکھنے میں آیا کہ تقریروں کے ساتھ تالیوں کی دھوم تھی۔ مگر جب ایک مسلم نمائندہ نے کہا "ہم گواہی دیتے ہیں کہ عیسیٰ کو اللہ تمام انسانوں کی طرف خدا کے پیغمبر تھے۔ اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کی طرف خدا کے پیغمبر ہیں" تو مسلمانوں نے دیر تک تالی بجائی مگر مسیحی نشستوں پر خاموشی طاری رہی۔

۸ فروری کی شام کو سمینار کا خاتمہ انجیل اور قرآن کی تلاوت پر ہوا۔ دونوں تلاوتیں ایک عیسائی عالم نے کیں۔ پہلے اس نے انجیل (متی باب ۲۵) عربی میں پڑھی۔ پڑھنے والا پادری نہایت خوش الحان تھا اور خالص عربی لہجہ میں پڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد اسی پادری نے قرآن (البقرہ، آخری آیات اور سورہ علق کی کچھ آیات) پڑھیں۔ دونوں تلاوتیں اس نے تجوید اور قرأت کے تمام قواعد کے ساتھ کیں۔ قرآن کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ساتھ شروع کیا اور آخر میں صدق اللہ العظیم کہا۔

اصل انجیل بلاشبہ ایک خدائی کتاب تھی۔ مگر اس کا موجودہ عربی ترجمہ ظاہر ہے کہ انسان کے قلم سے ہے۔ اس کے برعکس قرآن کی زبان الہامی زبان ہے۔ جب دونوں کتابوں کے حصے ایک ساتھ پڑھے گئے تو یہ گویا خاموش اعلان تھا کہ یہ انسانی کلام ہے اور وہ خدائی کلام۔ انجیل کی قرأت میں ساری کوشش کے باوجود کوئی شکوہ پیدا نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس قرآن حیرت انگیز طور پر ایک عظیم کلام کی مانند ہال کے اندر گونج رہا تھا۔ اس کی مجرد سماعت ہی یہ بتلانے کے لئے کافی تھی کہ یہ ایک بلند تر خدائی کلام ہے نہ کہ کوئی انسانی کلام۔



مسلم عیسائی سمینار کے بارے میں یہ عربی کارٹون طرابلس کے اخبار الجہاد (۸ فروری ۱۹۷۶) سے لیا گیا ہے۔

اُس کا حکم تھا کہ
موت کا لفظ
اس کے سامنے بولا نہ جائے
مگر عمر کے ۶۰ ساٹھویں برس میں پہنچ کر
اس کو معلوم ہوا کہ
کوئی شخص موت کو
جیت نہیں سکتا

اسپاین کے ڈکٹیٹر فرینکو، کئی دن بیماری سے جنگ کرنے کے بعد آخر کار اس دنیا سے چل بسے اب اس قسم کے دو لیڈر بچے ہیں۔ وہ ہیں یوگوسلاویہ کے مارشل ٹیٹو اور چین کے ماؤ سی تنگ۔ دونوں کی عمر ۸۰ برس سے زیادہ ہے۔

فرینکو کا عرصۂ حیات لمبا کرنے کی غرض سے سپین میں ڈاکٹروں نے جو رات دن کوشش کی اُس سے میڈیکل حلقوں میں بڑی زبردست بحث چھڑ گئی تھی کہ کیا اُس وقت جبکہ قدرت کے تمام قوانین کے مطابق اُن کے حواس جواب دے چکے تھے انہیں کچھ ہفتے پیشتر ہی مرنے دینا چاہیے تھا؟ یا کیا ڈاکٹر اس بات میں حق بجانب تھے کہ ہر قسم کی میڈیکل امداد انہیں مہیا کر کے کچھ دیر تک اور جسمانی طور پر زندہ رکھنے کے لئے اُن کے درجۂ حرارت کو عارضی طور پر منجمد کر دیتے۔ علاوہ بریں کیا یہ بات اخلاقی اصول کے مطابق ہے کہ قوم کے کسی لیڈر کی زندگی مصنوعی طور پر لمبی کرنا چاہیے یا کہ اُسے لمبا کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ میڈیسن کی دنیا میں ایک زبردست بحث چھڑنے کا سبب ہو سکتی ہے۔ بہت سے اسکالروں نے اس موضوع پر بحث کی ہے۔

یہ امر غیر معمولی طور پر اتفاقیہ ہے کہ اس معاملہ پر ایک کتاب ابھی حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس کی تصنیف پر ۱۳ سال لگ گئے تھے۔ مشہور مورخ پال مرے کینڈال نے یہ کتاب فرانس کے ۱۱ ویں بادشاہ لوئی کے بارے میں لکھی ہے جسے مرے ۵۰۰ برس ہو چکے ہیں۔ لوئی ایک ایسا بادشاہ تھا جو مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے اُس نے بہت کوشش کی کہ اُس کی زندگی کو طوالت دی جائے۔

ماؤ، ٹیٹو اور فرینکو کی مانند بادشاہ لوئی ایک ایسی قوم، جس کی مرکزی سرکار بہت مضبوط تھی، بنانے کے لئے ذمہ دار تھے۔ اور جو اُن کے آنکھ بند کرنے کے بعد انتشار یا خانہ جنگی کا شکار ہو سکتی تھی اُسے اس بات کا بخوبی علم تھا، جیسا کہ ہمارے جدید زمانہ کے لیڈروں کو علم ہے۔ ایک جیسے مسائل کے لئے اُس کے حل بھی ویسے ہی تھے۔ لوئی کی عمر ۵۸ سال کی تھی جب اُس پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ اُسے تب اس امر کا علم ہو گیا کہ وہ بہت دیر تک زندہ نہ رہ سکے گا۔ کیونکہ اُس کے پریوار میں کوئی بادشاہ اپنا ۶۰ واں جنم دن منا نہ سکا تھا۔

لوئی کسی محفوظ قلعے میں امن و شانتی سے رہنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے ایک محل میں رہنا شروع کیا جہاں بہت کم لوگوں کو داخلہ کی اجازت تھی۔ اس محل کی طرف جانے والی سڑکوں پر جنگلے لگا دیئے گئے تھے۔ اور محل کے چاروں طرف خندق کھود دی گئی تھی

چالیس تیرانداز پتھروں کی دیواروں پہ بیٹھے ڈیوٹی دیتے رہتے تھے۔ انھیں حکم تھا کہ اگر کوئی اجازت کے بغیر محل کے نزدیک آنے کی جرأت کرے تو اُسے قتل کر دیا جائے۔ علاوہ بریں ۵۰ گھوڑ سوار دن رات علاقہ میں گشت کرتے رہتے تھے۔ محل کے اندر لوئی بڑی عیش پرستانہ زندگی گذار رہا تھا۔ اُس کے کمرہ میں خوبصورت تصاویر آویزاں تھیں۔ ماہر راگی اپنا راگ سنا کر اُسے خوش رکھتے۔ بڑے بڑے پنجروں میں بند کتے اور پرندے جو وہاں رکھے ہوتے تھے اُسے بہت پسند تھے۔ زیادہ تر وقت وہ اپنے جسم کو اکٹھا کئے اور قابل رحم حالت میں آرام کرسی پر ہی گذارتا۔ اس کے سامنے ایک خوبصورت باغ تھا۔ جسے وہ اپنے محل کی دوسری منزل سے دیکھتا رہتا۔

اگرچہ وہ جسمانی طور پر کمزور ہو چکا تھا۔ اپنی قوم کی زندگی اور موت اُس کے اختیار میں تھی۔ اس پر بھی وہ فکرمند تھا کہ اپنی رعایا پر یہ امر کیسے واضح کرے کہ وہ سب سے بڑا حکمران ہے۔ اُس کو سب سے بڑا خدشہ یہ تھا کہ اختیارات کا خواہشمند کوئی امیر، منصب دار اُسے ہٹا کر خود اقتدار نہ سنبھال لے اور اُسے اپنے آخری ایام ایک دیوانہ بوڑھے کی مانند گزارنے نہ پڑیں۔

اپنے بڑھاپے میں لوئی ہر ایک پر شبہ کرنے لگا تھا۔ اُسے اپنے پرانے ملازموں پر بھی شک تھا۔ چنانچہ انہیں ہٹا کر اُن کی جگہ اُس نے غیر ملکی بھرتی کر لئے تھے۔ اور پھر اُن کو اور اُن افسروں کو بھی جو اُس کی حفاظت کے لئے مامور تھے۔ وہ متواتر تبدیل کرتا رہتا تھا۔ وہ اُن سے یہی کہا کرتا کہ قسمت کو تبدیلی بہت پسند ہے۔ سرکار کے کام کاج میں حصہ لینے کے لئے وہ کافی بوڑھا ہو چکا تھا۔ اُسے یہ فکر دامنگیر تھی کہ شاید رعایا اس بات کو بھی بھول جائے کہ وہ ابھی تک زندہ ہے۔ اُس کے ہمعصر ایک مورخ نے اُس کی نسبت تحریر کیا ہے۔ "اُس نے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ ابھی تک حکمران ہے ہر قسم کی چال چلی۔ وہ افسروں کو ڈسمس کر دیتا اور اُن کی جگہ نئے افسر مقرر کر دیئے جاتے۔ کسی کی وہ تنخواہ کم کر دیتا تو کسی کی تنخواہ میں اضافہ کر دیتا۔ اُس نے اپنا وقت افسروں کو مقرر کرنے اور اُن کا بھٹہ بٹھانے میں صرف کیا تھا۔"

لیکن یہ سب کچھ کافی نہ تھا۔ ۱۱واں لوئی ایک عظیم شکاری تھا۔ جانوروں سے وہ بہت انس کرتا تھا۔ اُس نے گھوڑے اور کتے منگانے کے لئے یورپ بھر میں اپنے نمائندے بھیجے۔ اور مارکیٹ کی قیمت سے بھی زیادہ دے کر انہیں خریدا۔ چنانچہ اٹلی، سویڈن اور جرمنی سے گھوڑے اور کتے آنے شروع ہو گئے۔ جب وہ اُس کے محل میں پہنچ جاتے، اُس کی صحت کمزوری کے سبب اس امر کی اجازت نہ دیتی کہ وہ انھیں دیکھ بھی سکے۔ یا جو لوگ اُن کو خرید کر لائے ہیں اُن سے بات تک بھی کر سکے۔ لیکن اُسے علم تھا کہ سارے یورپ میں اُس کی اس خریداری پر چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔

وہ ابھی تک زندہ تھا۔

اپنی صحت بحال کرنے کا وہ اتنا آرزومند تھا کہ اُس نے اس امر کا حکم دے رکھا تھا کہ موت کا لفظ اُس کے سامنے بولا ہی نہ جائے۔ اُس کا ذاتی معالج اُس کے ایک نوکر کی مانند کام کرتا تھا۔ اور بادشاہ کا وہ پسندیدہ بن گیا تھا۔ اُسے ۔۔۔۔ ماہوار دیئے جانے لگے تھے۔ اُس وقت ایک کسی میدان جنگ میں ۴۰ برس کام کر کے بھی ایک فوجی افسر اتنی رقم کما نہ سکتا تھا۔ اگر کوئی شخص اُس کی زندگی میں ایک دن کا بھی اضافہ کر سکے تو وہ اپنا سارا خزانہ لٹانے کو تیار تھا۔

کو جب اُس کا ۶۰ واں جنم دن نزدیک آنے والا تھا وہ اور بھی فکرمند ہو گیا۔ اُس وقت وہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ وہ مشکل سے لقمہ اُٹھا کر اپنے منہ میں ڈال سکتا تھا۔

اُس کے دل میں ایک خیال آیا۔ اُس نے ہزاروں سنہری سکے جرمنی، روم اور نیپلز کے گرجا گھروں اور مذہبی رہنماؤں میں تقسیم کرنا شروع کر دیئے۔ اُس نے تین بحری جہاز دے کر اپنے بہترین کپتان ایک جزیرہ کو بھیجے۔ تاکہ وہاں سے بڑے بڑے کچھوے لائے جائیں۔ اس کو بتایا گیا تھا کہ یہ بحری کچھوے زندگی بخش خواص کے مالک ہیں۔

اسے یاد تھا کہ فرانس کے بادشاہوں کو ان کی تاجپوشی کے وقت ایک خاص قسم کی کریم کا تلک لگایا جاتا ہے۔ یہ ایک کہاوت ہے کہ یہ کریم ۴۹۶ء میں قدیم زمانہ کے ایک بادشاہ کو ایک فاختہ نے مہیا کی تھی۔ اور وہ اس کی موت سے چند ہی دن پہلے ایک سنہری رتھ میں پہنچی تھی۔ لوئی نے تمام مذہبی ذرائع کو جو ممکن تھے اس مقصد کے لئے جتایا کہ وہ زیادہ عرصہ زندہ رہ سکے۔ آخر کار نیپلز کی ایک گپھا سے ایک جوگی اس امید کے ساتھ اُس کے محل میں لایا گیا کہ اس کی پرارتھنا سپھل ہو گی۔ لیکن وہ بے اثر ثابت ہوئی۔ تاہم لوئی اُسے اپنے نزدیک رکھنے کا اتنا خواہش مند تھا کہ اُس نے اپنے وزیر خزانہ کو حکم دے دیا تھا کہ اس جوگی کے لئے سنگترے خریدنے کے لئے خواہ سارا خزانہ کیوں نہ صرف کرنا پڑے ضرور خریدے جائیں۔

لوئی پر پھر فالج کا حملہ ہوا اور ۳۰ اگست کو وہ اس دنیا سے چل پڑا۔ اُس کے منہ سے آخری لفظ یہی نکلے۔

"میں اتنا بیمار تو نہیں ہوں جتنا آپ لوگ خیال کرتے ہیں"۔

فرانس کے عوام کو یہ بات بخوبی یاد ہے کہ کس طرح سے اپریل ۱۹۷۴ء میں صدر جارج پومپیڈو نے جب وہ کینسر کی وجہ سے مر رہے تھے اپنے آخری بیان میں کہا تھا۔

"میں اتنا بیمار تو نہیں ہوں جتنا آپ لوگ خیال کرتے ہیں"۔

اور چند روز بعد اس کی موت واقع ہو گئی۔ آخر کار ۱۱ ویں لوئی کو معلوم ہو گیا کہ کوئی شخص موت کو جیت نہیں سکتا۔ (ماخوذ)

ایجنسی کی شرائط

۱۔ الرسالہ کی جتنی تعداد ہر ماہ مطلوب ہو، اس کے مطابق پوری رقم بطور ضمانت دفتر الرسالہ میں جمع کرنا۔ (مثلاً ماہانہ دس پرچوں کے لئے ۳۰ روپے)

۲۔ کم از کم دس پرچوں پر ایجنسی دی جائے گی۔

۳۔ کمیشن ۲۵ فیصد

۴۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے ہمراہ بذریعہ وی۔ پی روانہ ہوں گے۔

۵۔ ڈاک اور پیکنگ خرچہ ادارہ کے ذمہ ہو گا۔

منیجر

شہاب ثاقب

۱۳ر نومبر ۱۸۳۳ کو شمالی امریکہ کے مشرقی علاقہ میں ایک مقام پر لوگوں نے دیکھا کہ آدھی رات سے لے کر صبح تک مسلسل شہاب ثاقب گر رہے ہیں۔ ان کی تعداد کا اندازہ تقریباً دو لاکھ کیا گیا ہے۔ برہنہ آنکھوں سے اس قسم کا مشاہدہ اگرچہ بہت کمیاب ہے۔ تاہم دوربین کے ذریعہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بھی کہیں زیادہ بڑی تعداد میں ہر وقت شہاب ثاقب کی بارش ہماری زمین پر ہوتی رہتی ہے۔ اندازہ ہے کہ روزانہ تقریباً دس کھرب شہاب ثاقب اوپر سے آتے ہیں جن میں سے دو کروڑ کے قریب زمین کی فضا میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کی رفتار رائفل کی گولی سے سیکڑوں گنا زیادہ تیز ہوتی ہے۔ یعنی کم و بیش ۲۶ میل فی سکنڈ بعض اوقات ۵۰ میل فی سکنڈ تک بھی دیکھی گئی ہے۔

زمین کے گرد ہوا کا کرہ ایک غلاف کی شکل میں تمام دنیا کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس کی ابتدائی بلندی تقریباً چھ سو میل ہے۔ اس غلاف کی وجہ سے شہاب ثاقب ہماری زمین تک پہنچ نہیں پاتے۔ بلکہ کرۂ ہوائی اوپری سطح تک پہنچتے ہی ہوا کے ساتھ ٹکرا جاتے ہیں اس رگڑ کے سبب سے اتنی حرارت پیدا ہوتی ہے کہ شہاب ثاقب جل اٹھتے ہیں۔ یہی جلنے کی روشنی ہے جو ہم کو ٹوٹتے ہوئے تارے کی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ اس ٹکراؤ سے شہاب ثاقب پاش پاش ہو کر باریک ذرات کی شکل میں ہوا میں منتشر ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ ہوا کا غلاف دنیا کے گرد نہ ہوتا تو شہاب ثاقب بہت بڑی تعداد میں نہایت شدت کے ساتھ زمین پر گرتے جن کے خلاف ہم کوئی بچاؤ نہیں کر سکتے تھے۔ اور ساری زمین چھلنی ہو کر رہ جاتی۔ چاند کی سطح پر کثرت سے جو غار پائے جاتے ہیں، خیال ہے کہ وہ اسی قسم کے شہابیوں کی بمباری سے پیدا ہوتے ہیں۔

زمین کی طرف آنے والے شہابیوں میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو زیادہ بڑے ہونے کی وجہ سے جل نہیں پاتے اور زمین پر گر پڑتے ہیں۔ چونکہ زمین کا تین چوتھائی حصہ پانی ہے اور خشکی کا بھی بہت بڑا حصہ جنگل اور بیابان وغیرہ کی شکل میں انسانوں سے خالی ہے۔ اس لئے یہ اتفاقی شہابئے عملاً یا تو سمندر میں ڈوب جاتے ہیں یا شہروں سے دور کسی جنگل بیابان میں گر پڑتے ہیں۔ چنانچہ دنیا کے مختلف حصوں میں ایسے بہت سے پتھر کے ٹکڑے پائے گئے ہیں جو غار میں پڑے ہوئے تھے اور اس طرح سمجھا گیا ہے کہ یہ اوپر سے آتے تھے۔ ان شہابی پتھروں میں ایک وہ ہے جو امیری زونا میں پایا گیا تھا جس کا وزن ۵ ٹن ہے۔ یہ زمین پر گر کر گیارہ فٹ تک زمین میں دھنس گیا تھا۔ اسی طرح ایک مقام پر ساڑھے ۳۶ ٹن کا ایک آہنی تودہ پایا گیا ہے۔ اس کو بھی اسی قسم کا آسمان سے گرا ہوا مادہ سمجھا جاتا ہے۔

بلاغت کیا ہے

عبداللہ بن المقفع (۱۴۲-۱۰۶ھ) اپنے زمانہ کا اعلیٰ ترین ادیب تھا۔ فارسی اور عربی دونوں میں اس کو غیر معمولی قدرت تھی۔ اس نے بلاغت کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے: "بلاغت یہ ہے کہ جب ایک جاہل اسے سنے تو سمجھے کہ وہ بھی اس طرح کی عمدہ عبارت لکھ سکتا ہے"

جواب —

ت کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ
ے کلچرل تحفظ کا مسئلہ ہے۔ آپ کی رائے اس
ے میں کیا ہے۔

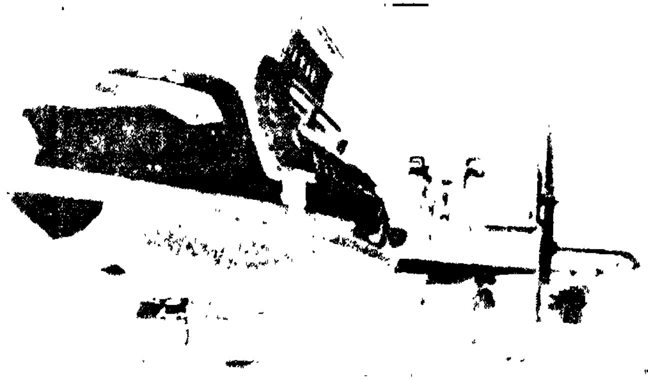
یا تحفظ کی بات کرنے والے لوگ سخت غلطی پر
حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی الگ کلچر ہی
ا جس کے تحفظ کی ضرورت ہو، اگر کسی چیز کے
کی ضرورت ہو سکتی ہے تو وہ دین و اخلاق ہے
کلچر۔

اس قسم کی باتیں اس لئے پیدا ہوتی ہیں کہ
مسلمان کی اصل حیثیت کو بھول گئے ہیں۔ مسلمان
صل حیثیت داعی اور پیغام بر کی ہے۔ داعی کے مشن
قاضا ہے کہ وہ اپنے مدعو سے کلچرل یگانگت پیدا
نہ کہ کلچرل بے گانگی۔ لباس اور زبان اور رہن
سہن وغیرہ جن کے مجموعہ کو کلچر کہتے ہیں، انہی میں اگر
داعی اور مدعو الگ الگ ہوں تو دونوں کے درمیان
اور قربت پیدا نہیں ہو سکتی اور جب تک انس اور
قربت نہ ہو سننے والا نہ سنانے والے کی آواز کو سنے
گا اور نہ اس پر دھیان دے گا۔

داعی اور مدعو کے اسی نازک رشتہ کی وجہ سے
پیغمبروں کو اسی قوم سے چنا گیا جس کے اندر انہیں
دعوتی کام کرنا تھا۔ پیغمبر وہی زبان بولتے تھے جو ان
کی مدعو قوم بولتی تھی۔ حتیٰ کہ جب کچھ لوگوں نے مطالبہ
کیا کہ نبی کو فرشتہ ہونا چاہئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا
کہ اگر ہم فرشتہ بھیجیں تب بھی اس کو تمہارے جیسا
آدمی بنا کر بھیجیں گے اور اس کو وہی لباس پہنائیں گے
جو تم پہنتے ہو۔ (انعام ـ ۹)

اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کا کلچر
بھی وہی تھا جو غیر مسلموں کا تھا۔ ان کے درمیان جو
اختلاف ہوا وہ اعتقاد اور عمل کی بنیاد پر تھا نہ کہ جدید
اصطلاح کے مطابق محض کلچر کی بنیاد پر۔

ایک کھیپ کابل کے لئے ہوائی جہاز پر چڑھائی جا رہی ہے۔ افغانستان سے یہ اس قسم کا دوسرا آرڈر ہے۔



Destination Kabul. An Escort tractor, part of a consignment of 400 tractors, being loaded aboard an Ariana Afghan Airlines plane.

Copy Rs. 2.00

(D) 552

BER 1976

AL-RISALA MONTHLY

1036, KISHANGANJ, DELHI-110006 (INDIA)

مجاہد پرنٹر پبلشر مسئول نے امپریل پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ ۱۰۳۶ کشن گنج دہلی سے شائع کیا